آئینوں کا شہر
فائزہ افتخار

پیش لفظ

''آئینہ'' دوست بھی ہے اور دشمن بھی......

کوئی آئینہ دیکھ کے اتراتا ہے' کوئی گھبراتا ہے۔

آئینہ کسی کو اپنائیت کا احساس دلاتا ہے تو کسی کو کراہیت کا۔

اور جب شہر ہی آئینوں کا ہو...... تو کوئی کہاں تک اپنے عکس سے بچے۔

اس ناول کو میں نے لکھا نہیں...... بلکہ اس کے ہر کردار کے سامنے آئینہ رکھ دیا۔ وہ کردار خود اپنا آپ لکھتے گئے۔

ان میں صاحبزادہ نفیس علی خان جیسے بھی تھے جن کو آئینہ اور سربلند کر دیتا تھا۔ اپنا عکس جن کے اندر فخر و غرور کی لہریں اور بھی تلاطم خیز کر دیتا تھا۔ ان میں شہزاد ملک بھی تھا' جس کو آئینہ دیکھنے سے نفرت تھی جس کو اپنے عکس سے گھن آتی تھی مگر زندگی نے قدم قدم پر اس کے لیے آئینے نصب کر رکھے تھے۔

کوئی صاحبزادہ عمیس تھا اور کوئی موتیا...... جن کے لیے پتھر بھی آئینہ بن جاتے تھے کیونکہ ان کا عکس ہی اتنا شفاف تھا۔

کوئی گل مہر...... جس کا عکس پانے کے بعد آئینہ پتھر ہو جاتا...... شاید رعب حسن سے سکتے میں آ کر۔

کوئی دعا تھی...... آئینہ جسے ایک نہیں' دو دو عکس دکھلاتا تھا......

اور کوئی بابر ہمایوں مغل...... جس سے آئینہ بھی گھبراتا تھا۔

اس کے علاوہ بھی ان گنت کرداروں کے بولتے عکس آپ کو اس آئینے میں نظر آئیں گے۔ کون سا عکس آپ کو اپنے ''آئینے'' جیسا لگا' یہ طے کرنا آپ کا کام ہے۔

فائزہ افتخار

یہ صاحبزادہ نفیس علی خان کے آنگن میں اترنے والی ایک صبح کا منظر ہے۔ بانس کی گھنی اور چوڑی باڑھ کے اس طرف سفیدے' املتاس' جامن اور امرود کے پیڑوں نے سورج کی چڑھتی تپش کا رستہ قدرے روک رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیش دالان کے پردے بندھے ہونے کے باوجود نیم تاریکی کے سے عالم نے اندر جانے والی غلام گردش تک اپنے سائے پھیلا رکھے ہیں۔

بغلی دالان میں بنی پکی چوکی پر' موتیے کی کلیوں کے ڈھیر لگائے بڑی بیگم' بیگم خلعت النساء جائے نماز کا کونا ذرا سا موڑے دو زانو بیٹھی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ گہرے سرمئی دانوں والی تسبیح ان کے گورے گورے ہاتھوں میں گہری سیاہ لگنے لگتی ہے۔ تسبیح کے دانوں کے گرنے اور ان کے باریک لبوں کے نامحسوس انداز میں ہلنے میں عجیب ہم آہنگی ہے۔ عبادت کرنے کے بعد انہوں نے اسی طرح انگلیوں میں تسبیح لٹکائے اپنے نازک سے ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے۔ سفید سادہ سے نقوش والے چہرے پہ ہاتھ پھیرنے کے بعد انہوں نے پہلی بار نیم وا آنکھیں پوری طرح کھولیں اور ایک دم ہی ان کا سادہ سا چہرہ جلالی لگنے لگا۔ سرمئی دھندلی آنکھوں نے اب تک رعب و دبدبے ایسے اشکارے چھپا رکھے تھے کہ پلکیں اٹھاتے ہی آناً' فاناً' ان کی نورانی شخصیت جلالی لگنے لگی۔ ہاتھ بڑھا کے انہوں نے سامنے پڑی تھالی سے چند ادھ کھلی کلیاں اٹھائیں اور نماز کے لیے اچھی طرح لپٹی چادر ذرا سی سرکا کے کانوں کے پیچھے اڑس لیں۔ دوسرا ہاتھ پیچھے کی طرف گیا اور چند سیکنڈ کچھ ٹٹولنے کے بعد واپس آ گیا۔

''دلگیر!''

کوئی جواب نہ ملنے پر یہی نام دوبارہ کڑکڑاتی آواز میں قدرے زور سے دہرایا گیا۔

''حاضر نواب بیگم۔ حاضر۔'' عقبی غلام گردش سے ہلکے پیلے گھیردار کرتے ہرے رنگ کے کھڑے پائجامے اور انہی دو رنگ میں چنے ہوئے دوپٹے کے ساتھ ایک منڈھے سر والا خواجہ سرا حاضر ہوا۔

''پاندان یہ رہا نواب بیگم۔'' لہراتی آواز میں لچکیلی اداؤں کے ساتھ پاندان پیش کیا گیا۔ نواب بیگم نے کڑی نظروں سے گھور کر سریلی کھکھی بند کروا دی۔

''کتنی بار کہا ہے' دلگیر' ہمیں بلند آواز میں پکارنا ہرگز پسند نہیں ہے۔ ہمارے آس پاس رہا کرو۔''

"میں صدقے بڑی بیگم کے، میرا بس چلے تو آپ کی چوکی سے بندھ کے رہ جاؤں، بیٹن میں اکیلی جان، دکھڑے ہزار، ادھر نعمت خانے میں۔"

بڑی بیگم نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید تقریر سے باز رہنے کا اشارہ کیا اور ایک قدم فرش پہ دھر کے چوکی سے اترنے کا ارادہ کیا۔ کلف سے کڑکڑاتا، سفید جھاگ لٹھے کا غرارہ کسمسایا، زنان خانے سے نکلتی چھوٹی بیگم، بیگم حرمت النساء کو آتے دیکھ کر انہوں نے اپنا پاؤں واپس اوپر کھینچ لیا اور پاندان کھینچ کے ان کے لیے گلوری تیار کرنے لگیں جو نہ صرف ان کی چھوٹی دیورانی تھیں بلکہ سگی ہمشیرہ بھی تھیں۔

"آداب بھابی آپا۔" جھک کر بڑی بیگم کو سلام کرنے کے بعد انہوں نے گردن کے خفیف سے اشارے کے ساتھ دلگیر کو پاس بلایا۔

"نواب صاحب، ہواخوری کے بعد سیدھے یہیں آئیں گے۔ آج مردان خانے کی بیٹھک بند رہے گی، انہیں اپنے کسی دیرینہ دوست کی جاگیر پہ دن گزارنا ہے۔ تم چلم تیار رکھو۔" نہایت نرم لہجے میں اسے تفصیلی حکم سنانے کے بعد انہوں نے ہلکا گلابی سوتی غرارہ نزاکت سے ذرا اونچا کیا اور چوکی کے دوسرے سرے پہ بیٹھ گئیں۔

"نصیب دشمناں، طبیعت ناساز تو نہیں آپ کی؟" بڑی ہمشیرہ کے چہرے کی سفیدی میں گھلی پیلاہٹ محسوس کر کے وہ فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

"خدا کا کرم ہے، اللہ سانس چلتے تک سلامت رکھے اور دشمنوں کی بھی خیر رکھے۔" گلوری ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے انہوں نے متانت سے جواب دیا۔

"عنایت بھابی آپا۔" چھوٹی بیگم نے عقیدت سے پان تھام کر منہ میں داب لیا اور کلیاں کان میں جھولتی بالیوں کے ساتھ اٹکانے لگیں۔

"اوں ہوں حرمت النساء کتنی بار کہا ہے نری سفید کلیاں مت ٹانکا کرو۔ ہم صبح روز تمہارے لیے بطور خاص یہ گلاب کی کلی یہاں رکھتے ہیں، سہاگن ہو پہلے یہ سرخ گلاب زینت کیا کرو۔" چھوٹی بیگم ہمیشہ کی طرح اپنی ہمشیرہ کی شفقت پر نہال ہو گئیں۔

"شکریہ بھابی آپا، آپ آرام فرمایئے میں ذرا صاحبزادیوں کو دیکھوں۔ ان کی صبح ہوئی یا نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اور یہ صاحبزادہ عمیص علی خان صاحب کھیل تماشے تمام کر آئے یا نہیں۔؟" گاؤ تکیے پہ سر ٹیکتے ہوئے، باریک ململ کا عطر اور خس کے عرق میں بھیگا دوپٹہ چہرے پہ پھیلاتے ہوئے انہوں نے حسب معمول اپنے اکلوتے فرزند کے بارے میں دریافت کیا۔

"صاحبزادی گل مہر۔ گل مہر بیٹا۔ اب جاگ جایئے۔ دن چڑھے کتنا سے ہو گیا ہے آپ ابھی تک سو رہی ہیں۔"

"اوں ہوں۔" صاحبزادی گل مہر نے کسمسا کے کروٹ بدلی لیکن بیگم حرمت النساء بدستور اس کا شانہ سہلاتی رہیں۔

"یوں دن چڑھے تک بستر میں اینڈنا اچھے گھرانے کی بچیوں کا شیوہ نہیں۔ آپ کے والد صاحب کچھ دیر میں تشریف لاتے ہی ہوں گے اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں وہ یہ رنگ ڈھنگ قطعی برداشت نہیں کر پاتے۔" اسے پیار چمکارے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر انہوں نے آخری حربہ آزماتے ہوئے نواب صاحب کا نام استعمال کیا اور مطمئن ہو کر نعمت خانے کی طرف چل دیں جانتی تھیں اب صاحبزادی گل مہر کی نیند بھک سے اڑ گئی ہو گی۔

"صاحبزادی الماس خاتون!"

چھوٹی بیگم کے انداز تخاطب پہ نعمت خانے میں دھرے بڑے سے چولہے کے پاس رکھی چوکی پہ بیٹھی اس دوشیزہ کی کشادہ پیشانی پہ ایک آدھ ناگوار سی شکن پیدا ہوئی جس کا تاثر اس نے لبوں پر۔ میٹھی سی مسکان بھر کے

پل میں زائل کر دیا۔

"آداب۔!"

"جیتی رہو، ناشتے پہ اہتمام خاطر خواہ رکھنا، آپ کے والد صاحب ناشتے کے فوراً بعد میاں صاحب کے ہمراہ جاگیر پہ جائیں گے، اللہ جانے کے سمے (کتنا وقت) لگ جائے سفر میں۔ پوریاں ضرور تل لیجئے گا۔"

"جی بہتر۔" تابعداری سے جواب دیا گیا۔

دلگیر میاں ناشتے کے لیے نعمت خانے سے متصل بیضوی تناول کدہ میں دستر خوان بچھا رہے تھے جب صاحبزادہ نفیس علی خان صاحب کی تشریف آوری ہوئی۔ چھوٹی بیگم نے دلگیر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، اس نے کھجورے سے بھرے نین مٹکا کے انکار میں جواب دیا۔ وہ فکر مند ہو گئیں، اگر ناشتا لگنے کے دوران صاحبزادہ عمیص علی خان کی آمد نہ ہوئی تو خان صاحب کے تمام تر عتاب کا نشانہ وہ بننے والی تھیں۔ ناشتے پہ تمام اہل خانہ کا دستر خوان پہ موجود ہونا پہلا اصول تھا اور صرف بڑی بیگم اس اصول سے مستثنیٰ تھیں کیونکہ تہجد کے بعد فجر تک وہ مسلسل عبادت میں مصروف رہتیں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ ناشتا تناول کرتیں اور کچھ دیر تسبیح پڑھنے کے بعد چاشت کی نماز تک آرام فرمایا کرتیں۔

دستر خوان سجاتے دلگیر کو اب کے انہوں نے ذرا سخت نظروں سے اشارہ کیا وہ ہاتھ پونچھتا، برے برے منہ بناتا داخلی دروازے کی جانب مڑ گیا اب اس کا کام صاحبزادہ عمیص علی خان کے آتے ہی اسے غسل کے لئے لے جانے کا تھا۔ اس کی اچھی قسمت یا پھر صاحبزادہ میاں کی ہی بختی ٹل گئی کہ وہ رانڈے سے آنگن میں قدم دھرتے ہی اسے عمیص علی خان یا ڑھ پھلانگتے نظر آئے، نیوی بلیو جاگنگ سوٹ پسینے سے تر تھا۔

"چلئے حضور، دستر خوان بچھ چکا ہے، بڑے نواب صاحب انتظار فرما رہے ہیں اور باندی آپ کو بحفاظت وہاں تک لے جانے کے لیے وفور شوق سے تڑپ رہی ہے۔"

"برے مروتم۔" پسینے سے شرابور صاحبزادہ میاں کو دلگیر کی ناز برداری ایک آنکھ نہ بھائی، ہاتھ کے ہلکے سے دھکے کے ساتھ خود پہ گرتے باندی یا باندے کو پیچھے دھکیلا۔ دھان پان سا خواجہ سرا بجری کی راہداری پہ گرتے گرتے بچا۔

"دہائی ہے چھوٹے نواب، یہ صلہ ہے ہماری محبتوں کا۔" شہادت کی انگلی پان سے رنگے لبوں میں دبا کے سسکی بھرتے ہوئے فریاد کی گئی جسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صاحبزادہ عمیص نے عقبی دروازے سے اندر کی راہ لی۔

"بھابھی صاحبہ کیسی ہیں؟" حسب معمول ان کا پہلا سوال یہی تھا۔ بھابھی صاحبہ یعنی بڑی بیگم سے ان کا سامنا کم ہی ہوتا تھا کیونکہ وہ عموماً "ناشتا ہی زنان خانے میں آکر کیا کرتے تھے وہ بھی ہفتے کے گنے چنے ایام میں اور یہ وقت ان کے آرام کا ہوتا تھا جب کہ باقی سارا دن وہ مردان خانے کی بیٹھک میں گزارا کرتے جہاں ان کے دوست احباب جمع ہوتے، شطرنج کی بازی جما کرتی اور گفتگو میں نوابی پھندنے سجا کرتے۔

سفید بے داغ دستر خوان چٹائی پہ بچھا تھا۔ پھولی پھولی پوریاں تھیں، سوجی اور میوہ بھرے چوکور خستہ میٹھے پراٹھے تھے، آلو کی ترکاری، انڈوں کا خاگینہ، آلو بخارے کی چار مغز والی چٹنی، بالائی دار دہی۔۔۔ وہ تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے بیٹھ گئے، اتنے میں چائے کی طشتری اٹھائے خوشبودار بھاپ کے مرغولے اڑاتی چھوٹی صاحبزادی تناول کدہ میں داخل ہوئی۔

"آداب ابا حضور۔!"

"تسلیم۔ جیتی رہیے۔ آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک بنی رہیے۔" بیٹیوں کو دعائیں دینے کے معاملے میں وہ سدا کے فراخ تھے۔

"صاحبزادی گل مہر کہاں ہیں؟"

"جی وہ۔ وہ نواب صاحب۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔" چھوٹی بیگم نے بہانا گھڑا۔

"منخیریت۔۔؟" ادھر سے تفصیل طلب کی گئی ادھر ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے (یا اللہ۔۔اب ایک اور جھوٹ) ان کی زبان بولنے سے پہلے ہی لڑکھڑا گئی چھوٹی صاحبزادی نے والدہ کی کیفیت بھانپ کر بات سنبھالی۔

"امتحانات کی تیاری میں بری طرح تھکان کا شکار رہی ہیں' کل آخری پرچہ تھا' ذہنی دباؤ کی وجہ سے کچھ طبیعت ست سی ہے' شب بھر جاگنے کے بعد کچھ دیر پہلے ہی آنکھ لگی ہے۔" تھوڑے سے سچ میں بہت سے مصلحت آمیز جھوٹ شامل کر کے تسلی دی گئی۔

"اور یہ صاحبزادہ عمیص علی خان۔۔۔" فرداً فرداً سب کی غیر حاضری نوٹ کی جا رہی تھی۔ اس بار بھی جواب بیگم سے طلب کیا گیا۔

"جی۔۔۔وہ۔۔" صاحبزادی کو معاملہ سنبھالتے دیکھ کے وہ ہلکی پھلکی ہو کے بیٹھنے جا رہی تھیں کہ نواب صاحب کے اگلے سوال نے گڑبڑا کے رکھ دیا۔

"غسل فرما رہے ہیں۔۔ لیجیے وہ آ گئے۔"

نواب صاحب نے نظر بھر کے سیڑھیاں اترتے جوان خوبرو بھتیجے کو مطمئن ہو کے دیکھا۔ سفید ململ کے سفید دھاگے سے کڑھے ہوئے کرتے اور گھیر دار شلوار میں ملبوس گیلے بال سنوارتے ہوئے صاحبزادہ میاں مودب سے ہو کر چچا حضور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ نفاست سے آدھی پوری ترکاری کے چند نوالوں کے ساتھ کھائی' گھی سے تر انگلیاں رومال سے صاف کی گئیں۔

"کیا ہوا میاں؟ اور لیجیے' جوان مرد ہیں اور خوراک بچوں کی سی۔۔۔ اور آپ تو آج کل کسرت کا بھی شوق فرما رہے ہیں ناں۔۔ ایسے میں خوراک پہ اور بھی توجہ دینی چاہیے۔"

صاحبزادہ نفیس علی خان نے ہلکے پھلکے انداز میں تاکید فرمائی تو چچی حضور کی طرف سے بصد اصرار پیش کیے جانے والے میٹھے پراٹھے کا بالائی میں ڈوبا لقمہ عمیص میاں کے حلق میں پھنس گیا۔

"جی۔۔۔وہ چچا حضور۔۔۔ کسرت وسرت کیا۔۔ بس یونہی ذرا بدن کو چست رکھنے کے لیے۔۔۔" وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔

"برخوردار یہ پہلوانوں والے کام پہلوانوں کے لیے رہنے دیجیے۔ آپ نے بدن چست رکھ کے کیا اکھاڑے میں دنگل لڑنا ہے یا مرغی خانے میں مرغیاں قابو کرنے کی نوکری کرنی ہے۔" ان کے ٹھنڈے لہجے کی مار نے چھوٹے نواب کے لب سی دیے اور وہ دیر تک اسی لقمے کو چبا کر نگلنے کی کوشش کرتے رہے۔

باہر میاں صاحب کی گاڑی کا ہارن بجا' صاحبزادہ نصیر علی خان نے الحمدللہ کہہ کر پانی کا گھونٹ بھرا اور ہاتھ دھونے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دلگیر' صاحب کی چلم اور گلوریاں تخت سے اٹھا لو۔" چھوٹی بیگم نے یاددہانی کروائی۔ وہ فوراً "یہ زادِ راہ لے کر میاں صاحب کی گاڑی کی جانب لپکا۔

"میاں عمیص ہو سکتا ہے مجھے اورنگ زیب میاں کی جاگیر پہ ایک آدھ روز لگ جائے۔ آپ اہل خانہ کا خاص خیال رکھیے گا' بیٹھک بند مت کیجیے گا' مجھ سے ملنے کے لیے آنے والے لوگ تواضع کیے بغیر واپس نہیں جانے چاہئیں اور اگر باغات کی طرف سے منشی حساب کتاب کے لیے آئے تو اسے میرے آنے تک روک کے رکھیے گا۔"

"جی بہتر چچا حضور!"

"آپ بیگم صاحبہ' بھابی حضور کو میرا سلام کہیے گا اور صاحبزادی گل مہر کی میری طرف سے خیریت دریافت کیجیے گا۔" شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے انہوں نے ہدایت نامہ جاری کیا۔ صاحبزادہ عمیص چچا حضور کے پیچھے پیچھے باہر تک آ گئے۔

چھوٹی صاحبزادی دسترخوان پہ بیٹھی باہر کی ہی جانب دیکھ رہی تھیں۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور

ساتھ ہی لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے صاحبزادہ عمیص بھی نمودار ہوئے۔

بلے بھئی بلے
جٹ چڑھیا کچہری
بلے بھئی بلے
او ہدی رانگلی مسہری
بلے بھئی بلے

چچا حضور کے سامنے دبی دبی آواز میں منمنانے والے عمیص میاں کے گلے میں اس وقت بانس فٹ تھے' دونوں ہاتھ کھڑے کیے ایک ٹانگ پہ بھنگڑا ڈالتے ہوئے وہ مسلسل بلے بلے الاپ رہے تھے۔ دلگیر ایک ہاتھ اپنی نازک کمر پہ اور ایک ہاتھ لبے باہر نکلے دانتوں پہ جمائے کھی کھی کر رہا تھا۔

جٹ کھڑا کاں والا آیا
پنج ست یاروی نال لیایا

اچانک چھوٹی صاحبزادی نے بھنگڑے میں شاندار انٹری دی اور اپنی آواز تایا زاد کی آواز میں ملائی۔

مچھاں وٹ کے
تھانے دار نسایا
او ہو تھانے دار نسایا
ہاں بھئی تھانے دار نسایا

غنیمت کہ چھوٹی بیگم اتنے سالوں لاہور بسنے کے باوجود پنجابی سے ذرا بھی شدھ بدھ نہیں رکھتی تھیں ورنہ گیت کے ان بولوں کی تہ میں اتر کے اپنی صاحبزادی کو اس گستاخانہ گلوکاری کا مزا ہی چکھا ڈالتیں۔ فی الحال تو وہ بے بسی سے بھنگڑے کا یہ سین ملاحظہ فرما رہی تھیں۔ انہیں اس ہنگامے سے باز رکھنا ان کے لیے ناممکن تھا اس لیے افسوس سے سر ہلاتی باہر چلی گئیں۔

"یا وحشت! یہ کیا طوفانی بدتمیزی برپا ہے؟" گل سرا اس درجہ شور شرابے سے گھبرا کے اپنے کمرے سے نکل آئیں۔

"زہے نصیب۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔" عمیص کی سیاہ گھور آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے اسے سامنے پا کے۔ وہ ایک ادا سے کورنش بجا لایا۔

"زہے نصیب۔۔۔ صاحبزادی گل مہر نے اپنی خواب گاہ سے قدم رنجہ فرمانے کی زحمت کیسے کی۔ آپ تو محو استراحت تھیں عالی حضرت۔۔۔ گستاخی معاف' کہیں بندہ گستاخ تو نیند میں خلل پیدا کرنے کی قبیح حرکت کا مرتکب نہیں ہوا۔ للہ اگر ایسا ہے تو بندہ حقیر پر تقصیر کی خطا معاف فرمائیے اور اگر طبع نازک پہ یہ فیاضی گراں گزرتی ہے تو بلا تاخیر اس ناچیز پہ اپنا عتاب نازل فرمائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں' دیدہ۔۔۔ 'وہ کیا ہوتا ہے۔ بس راہی ہوں آپ کے عتاب کو بھی خضاب۔۔۔ میرا مطلب ہے گلاب سمجھ کے زلفوں میں لگا لوں گا۔"

وہ ایک گھٹنا زمین پہ رکھ کے دایاں ہاتھ دل پہ رکھتے ہوئے جھکے سر کے ساتھ بیان نشر کرتا رہا' کچی نیند سے جاگی گل مہر منہ پہ ہاتھ رکھے مسلسل آتی جمائیاں روک رہی تھی۔ موتیا نے انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے حرفی اشارہ کرتے ہوئے عمیص کے ڈائیلاگز میں دخل اندازی کی۔

"ویل ڈن۔۔۔ آفت ہے۔۔ قیامت ہے۔۔۔ ایمان سے اس وقت دلگیر کی جڑواں بہن لگ رہے ہو۔"

"حد ادب لڑکی۔۔ حواسوں میں رہو۔۔۔ لگتا ہے تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں' دھیان رہے کہ اس وقت تم لکھنؤ کے نواب گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ اور ولی عہد سے مخاطب ہونے کی سعادت حاصل کر رہی ہو۔"

"نام ڈبو رہے ہیں آپ نواب گھرانے کا صاحبزادہ عمیص علی خان۔" عقب سے آتی بڑی بیگم کی خشک آواز

نے عمیص کی ساری ڈرامہ بازی ہوا کردی۔

"صبح بخیر ابی حضور"

"کیسی صبح برخوردار' دن چڑھے کئی پہر ہو گئے۔ غضب خدا کا نہ ایسا دیکھا' نہ سنا کہ لکھنؤ کے والیوں کے گھر یہ تماشے ہوا کریں۔ اور صاحبزادی الماس خاتون۔۔۔ یوں تو آپ خاصی سلیقے کی نظر آتی ہیں آخران حضرت کی صحبت میں آکر آپ کی جون کیوں بدل جاتی ہے۔ کیا صاحبزادیوں کو یوں کودنا پھلانگنا بلند آواز میں گنگنانا زیب دیتا ہے۔" اب انہوں نے موتیا کی خبر لی۔

"جی ہاں "صاحبزادیوں" بلکہ صاحبزادی "کو اس قدر گرمی میں پوریاں تلنا اور پراٹھے سینکنا تو زیب دیتا ہے ناں۔" اس نے دل ہی دل میں جل کر سوچا کہ بڑی بیگم یعنی تائی حضور کے سامنے جواب دینا آپ اپنی شامت بلانے کے مترادف تھا وہ تو شاید گھورنے پہ ہی اکتفا کرتیں' لیکن اس کی اپنی "امی حضور" نے زبان کی ساری شوخی اور طراری ہوا کردی تھی۔

"آپ کو ہزار ہا سمجھایا ہے بیٹا کہ اپنے اطوار میں شائستگی اور وقار پیدا کیجیے۔ نواب گھرانے کی بچیوں کے شان کی منافی ہیں یہ حرکات۔" ان کا لیکچر جاری تھا اور موتیا کے جلے دل کے پھپھولے دل کے اندر ہی پھوٹنے کا عمل بھی۔

"بالکل جی۔۔۔ نواب گھرانے کی بچیوں کا کھل کے ہنسنا' بولنا سب شان کے منافی ہیں اور جب یہی نواب زادی صبح سے شام تک اتنی بڑی حویلی میں بیک وقت دھوبن' باورچن حتیٰ کہ جمعدارنی تک کے فرائض ادا کرتی ہے تب کہاں جاتی ہے ساری نوابی۔" اس کے لب بند تھے لیکن عمیص بخوبی سن رہا تھا اس کے فی البدیہہ کرارے جوابات۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

خلعت النساء بیگم وضو کر کے واپس بغلی والان اپنی چوکی پہ براجمان ہونے چلی گئی تھیں۔ ان کے منظر سے غائب ہوتے ہی ہنسی ایک وبا کی طرح بھرے کمرے میں موجود نفوس میں پھوٹ پڑی تھی اور اس بار اس قل قل میں گل مہر بھی شامل تھی۔

"آہا۔۔۔ اتنا بھرپور اور زبردست ناشتا' لگتا ہے آج ابا حضور بیٹھک کے بجائے یہیں رونق افروز تھے اسی لیے یہ شاہانہ بندوبست سب کے لیے ہے ورنہ تو یہ الماس خاتون ٹرے سجا کے وہیں بھیج دیتی ہے اور ہمارے لیے رہ جاتے ہیں' چائے کیا پاپے یا پھر اچار پراٹھا۔"

اس نے پوریوں کا تھال اپنی جانب کھسکاتے ہوئے کہا۔ جواباً" موتیا نے ہاتھ جوڑے۔

"صاحبزادی گل مہر اگر تم حلف اٹھالو کہ آئندہ یوں منہ پھاڑ کے مجھے الماس خاتون کہہ کر نہیں پکارو گی تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایسی ہی ٹرے ہر روز بھر کے تمہارے کمرے تک بھی پہنچا دیا کروں گی۔"

"واہ واہ کیا انصاف ہے اور میں جو اتنے سالوں سے تمہیں موتیا کہہ کر نہیں تھک رہا۔۔۔ زبان جل جائے جو کبھی تمہیں فلاں خاتون کہہ کر پکارا ہو اور ہمیں ٹرے تو کیا ایک پرچ بھر نمکو تک نہیں بھیجی کبھی چائے کے ساتھ۔" اس نے ہاتھ نچا نچا کے طعنے دیے اور جم کے ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ ایک کے بعد دوسری سالم پوری اس کے حلق میں اترتی دیکھ کے موتیا رہ نہ سکی۔

"بھی ابا حضور کے سامنے تو لقمہ نہیں نگلا جا رہا تھا اب لگ رہا ہے برتن بھی سالم ڈکار جاؤ گے۔"

"فکر مت کرو' برتن تمہارے جہیز کے لیے سنبھال کے رکھ لوں گا صرف پوری اور پراٹھا ہی ڈکاروں گا' رہا سوال کہ چچا حضور کے سامنے۔۔۔ تو بی بی ان کے سامنے یا تو بندہ جی حضوری کر لے یا پیٹ بھر لے' حالانکہ ایکسر سائیز کے بعد اس قدر بھوک لگتی ہے لیکن ڈر رہا تھا کہیں زیادہ کھاتے دیکھ کر سوال نہ کر دیں کہ میاں پتھر توڑ کے آرہے ہو۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی اتنی احتیاط کے باوجود انہیں پتا چل ہی گیا۔"

"کیا۔۔۔؟" گل مہر کو کھانے سے کچھ فرصت ملی تو گفتگو میں حصہ لیا۔

"یہی کہ میں کسرت کرتا ہوں۔ نجانے کس نے مخبری کی ہے میرے جم خانہ جانے کی۔"

اس نے مشکوک نظروں سے دلگیر کو گھورا۔ اس کی دلگیری انتہا کو جا پہنچی۔

"قسم لے لیجیے میاں' ہاتھ ٹوٹ جائیں' پیر مڑ جائیں' زبان پہ آبلے پھوٹ آئیں' کوڑھ نکل آئے جوان سے ایک لفظ بھی کہا ہو تو۔" وہ فوراً "کانوں کو ہاتھ لگانے لگا عمیص نے بغور اس کی طرف آنکھیں سکوڑ کے دیکھا۔

"ارے دلگیر۔۔۔ یہ کیا۔۔۔؟ تمہارے پیر تو چھلاوے کی طرح مڑ رہے ہیں۔ اور۔۔۔ اور یہ نشان کیسے دیکھو ذرا کیسے دھبے سے جسم پہ نمودار ہو رہے ہیں کہیں کوڑھ یا برص کی علامت تو نہیں۔"

"ہائے میں مر گئی۔۔۔ ہائے اللہ۔۔۔ چھوٹی بیگم۔۔۔" وہ تصدیق کے لیے اندر بھاگا۔

"ایک تو یہ نمونہ ابا حضور نے نجانے کس لیے رکھ چھوڑا ہے گھر میں۔ اس قدر شرم آتی ہے جب کوئی دوست ملنے آئے اور آگے یہ نوٹنکی تماشا ہو رہا ہوتا ہے۔" گل مہر کے لہجے میں انتہا کی نفرت اور کراہیت تھی' جسے محسوس تو موتیا اور عمیص دونوں نے ہی کیا کہ بہرحال دلگیر کو وہ ہوش سنبھالتے ہی اس گھر میں دیکھتے آئے تھے اور اتنے سالوں کے ساتھ کے بعد ملازم تو کیا کسی بے جان چیز سے بھی وابستگی پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔

"اچھا ہے ناں' رونق لگی رہتی ہے اور یوں بھی اس کے دم سے گھر کا ماحول بھی درباری سا لگنے لگتا ہے اور تمہارے اور چچا حضور کے شاہانہ ذوق کی تسکین بھی ہو جاتی ہے۔"

"اس گھر کے ماحول کو شاہانہ رکھنے کے لیے ہمارا ہونا ہی کافی ہے۔" ایک ادا کے ساتھ ہاتھ پونچھتے ہوئے گل نے حسب معمول اپنی مدح سرائی کی اور برتن سمیٹتی موتیا نے ہاتھ روک کر بغور اس کا چہرہ دیکھا جہاں سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح حیرانی سے بھنویں اچکا کر رہ گئی اسے کبھی سمجھ نہیں آئی کہ گل مہر اتنی سنجیدگی کے ساتھ کس طرح اپنی تعریف خود ہی کر جاتی ہے خود اپنا تو اس کا یہ حال تھا کہ کوئی چند جملے بھی اس کی تعریف میں کر دیتا تو کان کی لوویں تک شرمندگی سے سرخ پڑ جاتیں۔

"آپ کی کیا بات ہے شہزادی صاحبہ! آپ جہاں براجمان ہو جائیں' وہیں آپ کی سلطنت قائم ہو جاتی ہے لیکن ماحول میں رنگ بھرنے کے لیے کچھ اور بھی چاہیے جیسے۔۔۔"

"چلیں۔۔۔" گل نے قطع کلامی کی۔ "ایسا کرتے ہیں شاہی مسخرے کا خطاب ہم تمہیں دے دیتے ہیں اور شاہی باورچن کا موتیا کو۔۔۔" موتیا کے تو آگ لگ گئی فوراً" بھڑک کے بولی۔

"میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں یہ جو بیٹھا ہے ناں تمہارے اوٹنگے بوٹنگے فرمودات سننے کے لیے' اسی تک اپنی گفتگو محدود رکھو۔" گل تلملا کے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ دلگیر بھاری پازیب چھنچھناتا پھر سے آگیا۔

"ہائے اللہ بڑی صاحبزادی خطاب بخش رہی ہیں' ایک ہمیں بھی عنایت کیجیے ناں۔۔۔" ٹھنک کر فرمائش کی گئی جسے صاحبزادہ عمیص نے فوراً" پورا کیا۔

"جاؤ دلگیر آج سے تم صاحبزادی گل مہر کے دربار کی شاہی رقاصہ ہو بلکہ ہیڈ رقاصہ۔۔۔"

"تم اسے نئے نئے عہدے مت سونپو پہلے یہ کام تو کر لینے دو جس کے لیے میں نے اسے بلایا تھا۔" موتیا نے عمیص کو مزید لایعنی گفتگو سے روکتے ہوئے دلگیر کو برتن اٹھانے کا اشارہ کیا۔

"ترکاری کسی رکابی میں نکال دینا اور پوریاں بھی خوان میں لپیٹ دینا۔ ہم تینوں میں سے تو شاید ہی اب کوئی دوپہر کا کھانا کھائے۔ لیکن امی حضور اور تائی حضور کے کھانے میں یہی کام آجائیں گی۔ اور تم ناشتے سے فارغ ہو کر باہر مت نکل جانا میرے ساتھ کچن کی صفائی کرواؤ اور ابا حضور جو چاول اور دالوں کے تھیلے رکھوا کے گئے ہیں وہ بھی چن دو۔ آج دوپہر کے کھانے کی تیاری سے فرصت ہے تو یہی کام نبٹا لیتے ہیں۔" اس کا ہدایت نامہ برتن اٹھائے راہداری تک مڑتے دلگیر کے پیچھے پیچھے تک گیا۔

"اف خدایا' موتیا تم کس قدر بورلڑکی بن کر رہ گئی ہو۔ ہمیں تو دیکھ کے حیرت ہوتی ہے۔ کہیں سے لگتا ہی نہیں تم ہماری یعنی صاحبزادی گل مہر کی بہن ہو اور وہ بھی چھوٹی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی تمہیں ناشتا تیار کرنے کی فکر لگ

جاتی ہے اور ناشتا کرنے سے بھی پہلے دوپہر کے کھانے کی۔ آج کیا پکے گا؟ گوبھی میں سنڈی آرہی ہے۔ اس سال بیل میں توری پکی ہوئی لگ رہی ہے کھاد اچھی نہیں ملی۔ دلکھو تم نے دال اچھی طرح صاف نہیں کر کے دی۔ چاول میں کنی نہ رہ جائے‘ آہا بادل آگئے میں بیسن کھول لوں‘ کڑھی پک جائے گی‘ اوہو پوری چپاتیاں بچ گئیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ تمہارے پاس کرنے کو اور کوئی بات نہیں۔"

"ہاں میرے پاس کرنے کو اور کوئی بات نہیں کیونکہ میرے پاس کرنے کو اور کچھ ہے بھی تو نہیں۔۔۔" موتیا جو برتن دھونے کے ارادے سے کچن کی طرف جانے ہی والی تھی‘ گل مہر کی بات کا تفصیلی جواب دینے رک گئی۔

اسے یوں تسلی سے جم کے بیٹھتے دیکھ کر عمیص سمجھ گیا کہ اب دنگل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

"اب میں اور کیا باتیں کروں۔۔۔ او گاڈ میرے ٹیلر نے آج کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن میرے ڈریسز دو دن اور لیٹ ہوگئے۔ یا پھر۔۔۔ نہیں نہیں آج میں فارغ نہیں ہوں ڈنر کا پروگرام پھر کسی دن رکھ لیتے ہیں۔۔۔ یا آج رات تو مجھے فلاں بیوٹی پارلر کی اوپننگ کرنے جانا ہے سوری میں آپ کی پارٹی کی چیف گیسٹ نہیں بن سکتی۔۔۔ یا اپنے جیولر کو فون پہ ڈانٹنا شروع کردوں کہ اس نے میرا سیٹ ہو بہو ویسا نہیں بنایا۔ جیسا ڈیزائن میں نے اسے دیا تھا۔ سوری ہمشیرہ صاحبہ میں آپ کی تسکین طبع کے لیے اس قسم کی گفتگو نہیں کر سکتی۔ لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں۔ بہرحال میرے پاس کہنے کے لیے کچھ تو ہے اور۔۔۔ تمہارے پاس تو یہ بھی نہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ ہمارا وجود بیکار ہے‘ ہم بالکل فارغ رہتے ہیں۔" حسب توقع گل بھڑک اٹھی۔ "یہ جو تم فضول فضول کاموں کا بوجھ سر پر لادے پھرتی ہو یہ تم نہ بھی کرو گی تو گھر کسی نہ کسی طرح چل ہی جائے گا دلکھو ہے‘ ای حضور ہیں۔ تمہیں خود ہی منتظم اعلیٰ بننے کا شوق تھا اسی لیے کالج چھوڑ کر چولہا ہانڈی میں جت گئیں حالانکہ تمہارے۔۔۔ کچن میں جانے سے پہلے بھی چولہے ٹھنڈے نہیں پڑے رہتے تھے اور نہ ہی گھر کی صفائی کا ٹھیکہ تمہیں ماننے سے پہلے یہاں ہر چیز گرد دھول میں اٹی رہتی تھی۔ اس لیے اپنی کارکردگی اور سگھڑاپے کا رعب ہم پہ جمانے کی قطعی ضرورت نہیں۔

تم تو سمپل ایف اے تک ڈھنگ سے نہ کر پائیں اس لیے ہمارا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ محنت صرف تم نہیں کرتیں ہم بھی کرتے ہیں سارا دن انسٹیٹیوٹ میں خواری‘ سر کھپانا ساری ساری رات جاگ کر اسٹڈی۔۔۔ جو ہم کرتے ہیں وہ ہمیں ہی کرنا ہے اور اپنے کرنا ہے دوسرا کوئی فرد ہماری مدد نہیں کر سکتا اور تم۔۔۔ ان معمولی کاموں میں بھی ہاتھ بٹانے کے لیے ہر وقت دلکھو تمہارے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اگر تم نہ بھی کرو تو چند سو روپوں کے عوض کوئی اور آکر یہ کام کردے گا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن چند سو روپوں کے عوض۔۔۔" موتیا نے بڑے سکون سے اس کا اشتعال انگیز بیان سنا اور اسی کمال سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"اور محترمہ گل مہر یہی چند سو روپے بچانے کے لیے میں سارا دن دھوبن‘ باورچن اور درزن بنی رہتی ہوں۔ لانڈری والے ایک کاٹن کے سوٹ کی دھلائی دس روپے اور پریس کرنے کے پچیس روپے لیتے ہیں۔ آپ خاصی لائق فائق ہیں حساب کر کے اندازہ لگا سکتی ہیں میرے ہفتے میں دو دن دھوبی گھاٹ لگا لینے سے کتنے روپے بچتے ہوں گے۔ ماسی نذیراں جو دو سال پہلے تک تین سو روپے ماہوار پر اتنی بڑی حویلی کی صفائی کیا کرتی تھی اس نے اچانک چھ سو روپے طلب کرنا شروع کردیے تھے۔ آپ بخوبی واقف ہوں گی اس بات سے اور یہی چھ سو روپے بچانے کے لیے اسے ہٹایا گیا تھا۔ درزی ایک سادہ سوٹ کی سلائی بھی سو روپے سے کم نہیں لیتا اور میں شکریے کا ایک لفظ تک نہیں وصولتی۔"

"کوئی احسان نہیں کرتی ہوں۔۔۔ تم مانو یا نہ مانو۔۔۔" اس نے عمیص کے روکنے کی پروا کیے بغیر اونچی آواز میں زور دے کر کہا۔ وہ بے چارہ بھی اس کو تو کبھی اس کو دیکھ کر رہ جاتا تھا۔ دونوں میں سے کسی ایک کے غصے کے آگے بند باندھنا بھی مشکل تھا۔

یہ ساری بچت کس کھاتے میں جاتی ہے کیا تم نہیں جانتیں۔ تمہارے مہنگے انسٹیٹیوٹ کی فیس ٹرانسپورٹ کے خرچے اور یہ تمہاری شاہانہ پوشاکیں۔ یہ اللے تللے کہاں سے پورے ہوں اگر میں بھی آج ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جاؤں‘ ابا حضور تمہارے ہزاروں کے اخراجات پورے کریں گے یا ملازمین کی فوج کی تنخواہیں بھریں گے۔ یہ جو مہینے میں دو تین سوٹ تمہارے سیتی ہوں ناں تو یہ میرا احسان ہی ہے مجھے شوق نہیں‘ مشین کی گھرر گھرر سننے کا لیکن جانتی ہوں تم نے تو باز نہیں آنا میں نہیں سیوں گی تو درزی کو دے آؤ گی اور پیسے بھریں گے ابا حضور۔۔۔"

"تم۔۔۔ تم الماس خاتون۔۔۔ تم ہمیں خوش دیکھ بھی نہیں سکتیں بلکہ خوش تو کیا تم ہمیں ہی نہیں دیکھ سکتیں‘ ہمارا وجود تمہارے لیے ناقابل برداشت ہے‘ سچ تو یہی ہے" وہ آنسو بہاتی گلوگیر لہجے میں فتویٰ صادر کرتی پلٹی اور دھڑام سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

عمیص نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا‘ وہی جانتا تھا کہ یہ دروازہ اب کتنے جتنوں کے بعد کھلے گا اور ظاہر ہے کہ یہ سارے جتن اسے ہی کرنے تھے۔۔۔ جس تن لاگے وہی جانے۔ اس نے شکوہ کناں نظروں سے موتیا کی جانب دیکھا جس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"آج کتنے دنوں کے بعد وہ یوں سب میں بیٹھ کے ناشتا کررہی تھی‘ اتنی ٹف اسٹڈی ہے اس کی اور تم۔۔۔ تم نے ضرور تیلی دکھانی ہوتی ہے۔"

"تم ہمیشہ اسی کی سائیڈ لیتے ہو‘ حالانکہ جانتے بھی ہو کہ پہل اسی کی جانب سے ہوتی ہے۔" اس نے جوابی گلہ کیا۔

"میں مانتا ہوں کبھی کبھی اس کا رویہ نامناسب ہوتا ہے لیکن تم اگنور بھی تو کرسکتی ہو۔ چلو ہمیشہ نہیں مگر کبھی کبھار بخش دیا کرو اگر وہ کچھ کہتی ہے تو‘ تم بتاؤ تم نے کبھی کسر چھوڑی ہے کوئی۔"

"وہ چلی گئی ہے اب تم شروع ہوجاؤ۔ ٹھیک ہے میں بھی مکمل فارم میں ہوں۔۔۔ شروع ہوجاؤ۔"

"توبہ کرو۔۔۔ میں اور تم سے لڑوں نہ بھئی مجھے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔ کہیں اور ٹکریں مارو۔۔۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور یہاں بیٹھی رہتی تو تمہارا کیا جاتا۔"

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"لیکن ایک بات بتاؤ۔۔۔ اگر وہ بیٹھی رہتی تو تمہیں کیا مل جاتا۔۔۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ جسے محسوس کر کے عمیص نے بے اختیار مسکراتے لب سختی سے بھینچ لیے لیکن اس کی سیاہ آنکھیں چمک کے جتا گئیں کہ اس کا یہ شریر سوال اسے کس قدر محظوظ کر گیا ہے۔

"بولو ناں کیا مل جاتا؟" اس نے سوال دہرایا۔

"میں بتاؤں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔" اس نے ایک بار پھر زور سے نفی میں سر ہلایا اور اس بار سر کافی دیر تک ہلتا رہا یہاں تک کہ عمیص نے چڑ کر اس پہ کشن دے مارا۔

☼ ☼ ☼

"ھک۔۔۔ ہا۔۔۔"

مختصر سے مگر آراستہ و پیراستہ ٹی وی لاؤنج میں دھرے کین کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کرم الٰہی نے سرد آہ بھری۔ صوفے کی پشت پہ وہ دیوار تھی جس میں موجود کھڑکی لاؤنج سے متصل کچن میں کھلتی تھی اور دونوں جانب موجود افراد کے لیے رابطے اور گفتگو کا ذریعہ بھی تھی۔

کچن میں موجود مٹر چھیلنے میں مصروف کرم الٰہی کی بیوی بلقیس عرف بالو نے ذرا سا جھانک کر اسے دیکھا اور ہاتھ دوپٹے سے صاف کرتی ہوئی فریج کی طرف بڑھ گئی۔ خوب ٹھنڈے دو عدد سندھڑی نسل کے آم نکال کر جب وہ کھڑکی کے آگے سے گزرتی ہوئی جوسر اور گرائنڈر والے کارنر کی طرف جارہی تھی تب اس کے کانوں میں پھر کرم الٰہی کا حسرت زدہ سا "ھک۔۔۔ ہا۔۔۔" گونجا

سر جھٹک کر اس نے ملک شیک بنانے والے جگ میں آم کا گودا، ملک پیک کا ہاف لیٹر پیک اور آدھا کپ چینی ڈالی اور بٹن آن کر دیا۔ گھوں گھوں کی آواز زوردار طریقے سے شروع ہوتی بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ آم کا گودا دودھ میں اچھی طرح شامل ہو گیا اور اب ہلکی سی سوں سوں کے ساتھ شیشے کے جگ میں اوپر نیچے گردش کر رہا تھا۔ سارا شور شرابا بس تب تک ہی ہوتا ہے جب پیسنا شروع کرو۔ جب چیز "پس" جائے پھر آواز بھی ختم۔ بٹن آف کرتے ہی اس نے پھر وہی آواز سنی۔

"ہعا... "اس بار درد زیادہ اور واویلا کم تھا۔

"خیر تو ہے۔ یہ ہائے وائے ویسے تو سارا دن ساری رات ہی چلتی رہتی ہے پر آج کچھ زیادہ ہی نہیں ہو رہی ہے۔" بالو نے شیشے کا یہ بڑا سا گلاس لبالب بھر کے اسے تھمایا۔

"وہ بھلیے لوکے، تو تو نہ مجھے ٹوکا کر، ہر وقت کی ٹوکا ٹاکی کے لیے تیرا پتر ہی کافی ہے۔ اب بھلا اور میں کیا کہتا ہوں اسے اور کہہ بھی کیا سکتا ہوں کچھ کہنے جوگا رہا ہی نہیں۔ پر یاد کرنے کو، سوچنے کو تو بڑا کچھ ہے ناں... جب یاد آتے ہیں وہ دن... وہ زمانہ تو پھر... ہک... ہا..." وہ گلاس ہاتھ میں پکڑے جھاگ دار گاڑھے مشروب کی سطح پر موجود برف کے چورے کو تیزی سے پگھل کر حل ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"پھر وہی ہک... ہا... دن تو کرم الٰہی یہ بھی برے نہیں، زمانہ تو یہ بھی شاندار ہے، ویلے... (فارغ) بیٹھے عیش کر رہے ہیں۔"

"مر پا گئے، ان دنوں کی بات ہی اور تھی، ٹور ہی اور تھی اس زمانے کی۔ ساری دنیا مانتی تھی مجھے، جانتی تھی پہچانتی تھی۔ پر اب تو بے نام ہو کر رہ گیا ہوں اور مزے کی بات کہ مجھے اجازت بھی نہیں کسی کو اپنا نام بتانے کی، اپنی شناخت نہ کرانے کا حکم ہے۔"

"بس وہی ناشکری کی باتیں۔ کرے چھوڑ دے یہ تھوڑدلی... (تنگ دلی) مان لے کہ یہی قدرت کا قانون ہے اور یہی اللہ سوہنے کا نظام ہے۔ کتنے لوگ ہیں جھونپڑی میں آنکھ کھولتے ہیں جھونپڑی میں ہی مرتے ہیں اور کتنے تو ایسے ہیں کہ اللہ معاف کرے پیدا محل میں ہوتے ہیں اور مرنا فٹ پاتھ پہ نصیب ہوتا ہے۔ تو نے شروع کی زندگی میں کیا کم سختیاں دیکھی ہیں اور میں نے بچپن میں کیا تھوڑی مار کھائی ہے غریبی کی۔ پر یہ اللہ ہی ہے، جس نے تیرے میرے دن پھیرے، تجھے نام دیا مجھے تیرے نام سے عزت، پھر کچھ دن اور سختی کے گزرے اچھے دن جیسے خواب کی طرح لگنے لگے۔ بھوک پھر سے دھمکانے لگی زمانہ تو کرم الٰہی وہ سخت تھا جب لوگ آنکھیں پھیرنے لگے تھے یاد ہے ناں تجھے وہ دن، لیکن قسمت میں پھر سنبھلنا لکھا تھا اس لیے آج پھر سے عزت سے اپنی چھت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھی حالت میں۔ اتنا بڑا خوبصورت مکان، گڈی (گاڑی)، نوکر، کھانے کو کھلا، پہننے کو اچھا اور سب سے اچھی بات بغیر ہاتھ پیر ہلائے مل رہا ہے۔ پہلے ذرا سی رقم دیکھنے کے لیے تجھے کتنی جان مارنی پڑتی تھی اب اولاد کے ہاتھوں سکھ مل رہا ہے تو شکر ادا کیا کر۔" بلقیس نے سمجھایا۔

"شکر ہے اللہ کا، لکھ کروڑ دفعہ شکر ہے اس کی ذات کا۔" کرم الٰہی نے چھوا اٹھا کے رب کے حضور شکرانہ ادا کیا۔

"بس تو سمجھ لے کہ یہ بھی قدرت کا قانون ہے کہ گزرا زمانہ انسان کبھی بھولتا نہیں ہے۔ چاہے بھی تو نہیں بھلا سکتا۔ تو کچھ بھی کہہ لے میں وہ دن مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ آج میں سکھی ہوں، خوشحال ہوں، عیش کر رہا ہوں، وہ دن بھی تھے کہ یاروں سے بچی ہوئی بیڑی مانگتا پھرتا تھا آج ولایتی سگریٹ دراز میں پڑے ہیں۔ بوسکی کا کرتا پہنا ہوا ہے۔ چیئرمین لٹھے کی چٹی دودھ شلوار... پتہ ہے مجھے کہ کبھی کپڑے کا ایک جوڑا ہوتا تھا اور دھونے کے لیے صابن تک نہیں خرید سکتا تھا، منتیں کر کر کے کسی سے پرانا جوڑا مانگ کے کام چلاتا تھا اور لوگ دو ڈھائی گز کے لیے پرانا لیرا (کپڑا) دیتے ہوئے بھی سو سو احسان جتاتے تھے لیکن بالو... اتنی محنت کر کے جب میں ذرا اونچا ہوا تو اپنا آپ بڑا شاندار لگتا تھا ان کڑے دنوں کے بعد جو ذرا خوشحالی آئی تھی وہ نہیں بھولتی مجھے۔ اب جو بھی ہے ا

میں میرا کیا کمال... یہ تو سارا بیٹے کے دم سے ہے۔"

"تو کیا بیٹا، تیرا نہیں۔ اسے نیکی کی توفیق اللہ نے دی۔ اللہ نے ہی قسمت بھی سوہنی بنائی اس کی لیکن آخر خون تو وہ تیرا ہی ہے۔ اتنے بھاگ لگے ہیں اسے، اس میں بھی تو تیرا کمال ہے... یا پھر... تو جلتا ہے اس کی کامیابی سے۔" بلقیس نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا تھا، کرم الٰہی تڑپ اٹھا۔

"ناں... ناں... ایہہ گل نہ کر۔ (ایسی بات نہ کر) ذات کا کمی سہی، دل کا کمینہ نہیں ہوں میں۔ لکھ لعنت ہو اس پہ جو اپنے پتر سے جلاپا کرے۔ میں تو خوش ہوتا ہوں اسے ترقی کرتا دیکھ کے۔ پھلتا پھولتا دیکھ کے۔ یہ کوٹھی، دفتر، روپے پیسے کی ریل پیل... بس ایک کسک سی ہوتی ہے کہ نام تو اس نے اپنا بنا لیا۔ اور باپ دادا کا نام... وہ اندھیرے میں ہی رہ گیا۔ بات تو جب ہے کہ وہ خاندان کا نام اونچا کرتا۔ جدی پشتی کام میں دل لگاتا۔ اللہ نے کامیابی اس کے نصیبوں میں لکھی تھی وہ اس پیشے میں بھی مل جاتی۔

بس یہی دکھ ہے کہ وہ "کسبی" نہیں ہے۔ "گنی" (ہنرمند) نہیں ہے۔ ہم کسبی لوگ ہیں گنی لوگ، کسب سے دل لگانے والے، اپنی میراث سنبھال سنبھال کر رکھنے والے۔ اس نے تو اپنی "پیٹر می" (تجو) ہی بدل ڈالی۔ کیا تھا جو یہی نام، یہی شہرت وہ باپ دادا کے پیشے میں کماتا۔"

"چلو جی اب بس کرو، کتنی بار کہا یہ ذکر کرنا ہی چھوڑ دو، پتا بھی ہے کہ اسے برا لگتا ہے۔ جو اس کے نصیب میں تھا اسے مل گیا اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس طرح جل کڑھ کے، بار بار یہی بات کر کے اسے کیوں غصہ دلاتے ہو جی تم۔"

"کیا کروں میرا ورثہ رل رہا ہے بالو... اور تو کہتی ہے چپ رہوں۔"

"برا نہ ماننا کرم الٰہی، جب نیا نیا پیسہ ملا تھا تجھے تب تو نے کون سا قدر کی تھی۔ ہوا ہی اور ہو گئی تھی تیری، تب باپ دادا کا کسب نہ یاد رہا۔ تو نے بھی تو وہ نام، وہ مرتبہ سنبھال کر نہ رکھا۔ جیسے دولت کمائی اس سے جلدی اڑا دی، جتنا نام کمایا اتنا ڈبو دیا، سارے گن تو تب ہی مٹی میں مل گئے تھے جب... خیر اب کیا پرانے ذکر چھیڑنا... شکر کرو جی کہ بیٹے کی بدولت بڑھاپا اچھا گزر رہا ہے، ورنہ وہ بھی کوئی کسب تھا ہوائی رزق، آج ہے کل نہیں۔"

"بس بالو بس... سب کہہ لے میں سن لوں گا اس رزق کو کچھ نہ کہہ، جس پہ میری پچھلی سات نسلیں پلی ہیں۔" کرم الٰہی نے گلاس جوں کا توں واپس میز پہ رکھ دیا۔ برف پگھل کر مشروب کو پتلا کر گئی تھی۔ سطح پہ گاڑھا سا فلول تھک کر بیٹھا تھا اور گلاس کے باہر ہلکے ہلکے نم قطرے... جیسے کسی پیشانی پہ ندامت بھرا پسینہ پھوٹ بہا ہو۔

☼ ☼ ☼

"کیوں نفیس صاحب کس سوچ میں کھو گئے حضرت؟" میاں اورنگ زیب مراد آبادی نے مرصع حقے کی نے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"جی اب کیا بولیں، آپ نے رائے ہی ایسے معاملے میں طلب کی ہے کہ مصلحت آمیز جواب دے کر پہلو تہی بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کی صاحبزادی ہماری بھی بٹیا ہیں۔" صاحبزادہ نفیس علی خان نے پرسوچ انداز میں نے لبوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"ایسا معاملہ ہے۔ نہیں صاحب آپ ہرگز نہ ہچکچائیں، بلا تکلف اپنی رائے کا اظہار فرمایئے۔" میاں صاحب ... ہو گئے۔ ان کی منجھلی بیٹی کے لیے کسی حاکم محی الدین کے گھرانے سے پیام آیا تھا اور وہ اپنے عزیز ترین ... سے رائے طلب کر رہے تھے یوں بھی صاحبزادہ نفیس تو ہندوستان کے چیدہ چیدہ اعلیٰ نسب گھرانوں کا شجرہ ... تھا اور اس سلسلے میں کوئی ان کی معلومات کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا اب اگر انہوں نے اس رشتے پہ تشویش ظاہر کی تو میاں صاحب کا بے چین ہو جانا تو لازمی تھا۔

"ہم نے سنا ہے وہ بھی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں، حاکم گھرانہ سے تعلق ہے، بڑی ریاستیں، جاگیریں تصرف

میں رہی ہیں۔“ انہوں نے وہ دہرایا جو انہیں بتایا گیا تھا۔

”جی ہاں ہم جانتے ہیں اور ان کے دادا سے تو بخوبی واقف ہیں خاصی دعا سلام رہی ہے ایک زمانے میں حاکم فصیح الدین اور ہمارے والد بزرگوار میں۔ اگرچہ نواب تو نہیں تھے، پھر بھی خاصی دھاک تھی ان کے شجرہ کی لکھنؤ میں۔ باقی ریاستیں وغیرہ تو یونہی شوشا چھوڑ رہے ہیں یہ نئی پود کے لونڈے، ہاں چند جاگیریں ضرور تھیں۔ لیکن میاں اورنگ زیب آپ سب بھلا ہی پچھلا دیکھیں گے یا موجودہ حالات پہ بھی غور فرمائیں گے۔“

”جی ہم سمجھے نہیں۔“ وہ تفصیل طلب نگاہوں سے انہیں تکنے لگے۔

”میاں آسان سی بات ہے، آپ نے ان کی موجودہ حیثیت کا تعین فرمایا؟ آج ان کے گھرانے کا کیا مقام ہے، کیا مرتبہ ہے؟ وہ حضرت جن کا پیام آیا ہے۔ کیا کرتے ہیں؟“ انہوں نے تابڑ توڑ سوالات کیے۔

”حاکم محی الدین کا تو بہت بڑا شاپنگ پلازہ کھڑا ہے شہر کے سب سے مہنگے علاقے میں۔ ان کے بڑے فرزند اپنا کاروبار کرتے ہیں اور وہ برخوردار جن کے لیے پیام آیا ہے بیرون ملک ملازمت کرتے ہیں۔ امریکہ کی کسی ریاست میں۔“ میاں اورنگ زیب مراد آبادی نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے جواب دیا اور ذرا دبے لہجے میں کہنے لگے۔

”اور جہاں تک مقام و رتبے کا تعلق ہے تو حضور معاف کیجئے گا۔ آپ سے برسوں پرانی یاری ہے اس لیے اس بے تکلفی کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ نے اپنی بڑی صاحبزادی کا بیاہ بھی کوئی مقام اور رتبہ دیکھ کے نہیں کیا۔ آپ کے داماد کی مالی حیثیت تو۔۔۔“

”قطع کلامی معاف میاں حضور، ہم نے خاندانی مقام اور رتبے کا ذکر کیا تھا۔ مالی حیثیت کا نہیں۔ ہمارے داماد اگرچہ آج مالی ابتری کا شکار ہیں، ان کے معاش کا کوئی تسلی بخش ذریعہ نہیں فی الحال لیکن قابل قدر بات تو یہ ہے کہ ان نامساعد حالات میں بھی انہوں نے خاندانی نجابت کو کھونے نہیں دیا۔ وقار کے ساتھ صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں لیکن تلخی حیات سے گھبرا کے اپنے شجرہ نسل کو بٹا لگانے کا سوچا تک نہیں اور یہ حاکم محی الدین آج جس مقام پہ ہیں، پاکستان آنے کے فوراً بعد انہیں نہیں مل گیا۔ آپ نے تقسیم پاک و ہند کے بعد پیدا ہونے والے اس عظیم مسئلے پہ وہ مشہور مصرعہ تو سن رکھا ہو گا کہ

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے اور کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے

صرف ہم آپ ہی نہیں جو اس بحران سے گزرے تقریباً ہم جیسے تمام ہی شرفاء تو زمین اور اعلیٰ نسب گھرانوں کا یہ المیہ رہا ہے کم نسل اور کم ذات لوگ ابھر گئے مانگ تانگ کے کمائی عزت اور چھینی ہوئی دولت کے بل بوتے پہ۔ البتہ ہم جیسے کم ہی رہے جنہوں نے عیش و عشرت کے بعد عسرت اور تنگ دستی برداشت کر لی اپنا خاندانی وقار داؤ پہ نہیں لگایا۔ سفید پوشی کا بھرم بھی قائم ہے اور نوابی جاہ و جلال بھی پوری تمکنت کے ساتھ زندہ ہے لیکن ایسے کم ظرف بھی ہوتے ہیں میاں جو ایک وقت کی بھوک برداشت نہیں کر پاتے اور ندیدوں کی طرح گندگی پہ منہ مارنے سے بھی نہیں چوکتے۔ حاکم محی الدین نے اپنے والد کی زندگی میں ہی منڈی میں مزدوری شروع کر دی تھی۔“

”واللہ۔۔۔ نہیں حضرت۔۔۔ سچ کہیے۔“ اس انکشاف پہ میاں اورنگ زیب بلبلا اٹھے۔

”سچ ہے اور ہم اس سچ کو حاکم کے منہ پہ کہنے سے بھی نہیں چوکیں گے۔ دو ڈھائی سال تک بوجھ ڈھونے والے ڈھور ڈنگر کا کام کرنے کے بعد ان حضرت نے بھاٹی میں پرچون کی دکان کھولی۔ چند سال بعد یہ دکان نیلا گنبد منتقل کر دی گئی اب اس میں پرچون کے ساتھ ساتھ دیگر گھریلو سامان بھی رکھ دیا گیا جیسے بچوں کے کھلونے، بچہ گاڑی، دیوار گیر گھڑیاں، عورتوں کے آرائش و سنگھار کے لوازمات، وقت گزرتا گیا۔۔۔ دکان کا رقبہ پھیلتا گیا اب وہ ایک شاپنگ پلازہ کے مالک ہیں خود کسی دکان پہ نہیں بیٹھتے سب کرایہ پہ چڑھا رکھی ہیں۔ عالی شان نئی طرز کا بنگلہ تعمیر کر کے پھر سے خود کو لکھنؤ کے نواب کی حیثیت سے متعارف کرانے لگے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ انہیں ایسا کہنے کا کوئی حق نہیں، آج پھر سے چار پیسے ہاتھ آ جانے کے بعد وہ خاندانی کہلانے پہ مصر ہیں، اس وقت اپنے خاندان کا

ناموس کا خیال کیوں نہ آیا۔ جب خچروں کی مانند کمر پہ بوریاں لادتے تھے اور آنے آنے کا سودا پڑیوں میں لپیٹ کے بیچتے تھے۔“

”اور ان کے بیٹے۔“ میاں اورنگ زیب کا لہجہ پست تھا۔

”بڑے والے تو پولٹری فارم کا ٹھیکہ لے بیٹھے اور چھوٹے نجانے کیا گل کھلا رہے ہوں گے پردیس میں، سنا ہے وہاں تو اچھے تعلیم یافتہ بھی میموں کے کتے نہلانے پہ مامور ہوتے ہیں۔ وہ تو یوں بھی بس واجبی سا ہی پڑھ پائے ہیں۔“

”تو پھر۔۔۔ اب؟“

”اب کیا؟ اجی سارا برا بھلا بتلا دیا۔ آگے آپ کی مرضی، جہاں بیٹی لینی ہو وہاں پھر بھی کچھ نظر انداز یا در گزر کیا جا سکتا ہے کہ بچی جس گھرانے میں آئے گی وہیں کے طور طریقے اپنا لے گی لیکن اگر بیٹی دینی ہو تو سو باتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ جس گھرانے سمدھیانہ قائم ہو رہا ہو اس کی سات پشتیں کھنگالنی پڑتی ہیں، ہڈی بوٹی، میں برابر ہونا جانچا جاتا ہے کہ اپنی نسل کی اپنے شجرہ کی ایک شاخ اس گھرانے تک پھیلانی ہوتی ہے۔“

”آپ صحیح فرماتے ہیں، نفیس صاحب، آپ کی عنایت کہ بندہ کو ایک غلط فیصلہ کرنے سے روکنے میں مدد فرمائی۔ سچ ہے دوست کی پہچان اس کے مشورے سے ہوتی ہے۔ اصل میں ہم تو ان زمینوں کے مسئلے میں ہی اس بری طرح الجھے رہتے ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا نہیں کچھ خبر نہیں ہو پاتی۔ مہینے کے بیس دن تو یہاں قصبے کی جاگیر میں گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو شہر جانا ہوتا ہے اتنا ملنا جلنا بھی نہیں، بس آپ سے محبت ہے، جو نبھائے چلے جا رہے ہیں۔“

”دنیا کی خبر رکھنی پڑتی ہے حضور۔۔۔ دیکھیے۔“ صاحبزادہ نفیس نے گہرا کش لے کر بڑے دانشورانہ انداز میں کہا۔

”دیکھیے، خاندانی ہونا اتنا بڑا وصف نہیں، یہ تو عطیہ خداوندی ہے، اس میں بندے کا کیا کمال وہ ذات پاک کسی کو کہیں بھی پیدا کر سکتی ہے، اسی لیے ہم تو یہی کہتے ہیں کہ خاندانی ہونا، اعلیٰ حسب نسب رکھنا کوئی کمال نہیں، بات تو جب ہے کہ بندہ اپنے حسب نسب کو برقرار بھی رکھ سکے، کسی بھی طرح، کیسے بھی حالات میں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلنے والے لوگ خاندان کو، نسل کو بھی نت نئے سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں۔“

”درست فرمایا۔ بجا ارشاد۔۔۔“ وہ سر دھننے لگے، ویسے بھی وہ اپنے اس دوست کو عقل کل مانتے تھے اور دنیا کے بارے میں ان کے تجزیات و تجربات کے بارے میں تو کوئی شبہ بھی نہیں رکھتے تھے۔

☼ ☼ ☼

صاحبزادہ نفیس علی خان کے آباؤ اجداد لکھنؤ کے والیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں اگرچہ ان کے ہاتھ سے بہت کچھ گیا لیکن صاحبزادہ نفیس نے اپنے ہوش سنبھالتے ہی جو شاہانہ شان و شوکت اور نوابی جاہ و جلال دیکھا وہ ان میں شاہانہ تمکنت پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ جشن نوروز میں فیل خانے سے نکلتی ”لیلی“ پر جب دونوں بھائی سوار نکلتے تو رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ سونے چاندی کے سکوں کی مٹھیاں بھر بھر کے پھینکتے دونوں بھائی اس ہجوم سے رستہ بناتے درگاہ پہنچتے، سونے کی تاروں سے مرصع چادر چڑھائی جاتی۔ سو ڈیڑھ سو دیگوں کی نیاز دلوائی جاتی، آس پاس کے تمام چھوٹے بڑے قصبوں اور دیہاتوں سے آئے لوگوں کی جانب سے پھینکے گئے پھولوں کی پتیوں سے بڑے صاحبزادے انیس علی خان اور چھوٹے صاحبزادے، نفیس علی خان کے ننھے وجود مکمل طور پر ڈھک جاتے۔

والد محترم صاحبزادہ اقدس علی خان کی بانسبت دونوں بھائی چچا حضور صاحبزادہ احمد علی خان سے زیادہ قریب تھے وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ ان دنوں بدلتے حالات، انگریزوں کی من مانیوں اور دخل اندازیوں کے سبب صاحبزادہ اقدس اپنے وہ تمام تر اختیارات رفتہ رفتہ کھوتے چلے جا رہے تھے جو انہیں ریاست کے والی ہونے کی حیثیت سے کبھی حاصل رہے تھے۔ اس کایا پلٹ نے ان کے حواس مختل کر دیے تھے۔ ہاتھ سے جاگیریں نکلنے کے غم

نے انہیں ڈھا کر رکھ دیا تھا۔ انگریز سرکار کے سامنے اپنا وجود چھوٹا چھوٹا سا لگنے لگتا' وہ اپنی عوام سے' خود سے حتی کہ اپنے اہل خانہ تک سے کتراتے کتراتے رہنے لگے۔

اگرچہ آج بھی اپنے محل میں وہ راجہ کی حیثیت رکھتے تھے لیکن در پردہ سارا انتظام صاحبزادہ احدر سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ ولایت سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے۔ اور اس ولایتی تعلیم نے ان کا نوابی پن ذرا بھی متاثر نہ کیا تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مزید نکھرتا جا رہا تھا۔ ہاں البتہ اس تعلیم نے انہیں انگریزوں سے آنکھ سے آنکھ ملا کے بات کرنے کا حوصلہ ضرور عطا کر دیا تھا۔ جب انگریز سرکار نے محلات کو اپنی تحویل میں لینا شروع کیا تو صاحبزادہ اقدس کا "اقدس محل" بھی زد میں آیا لیکن صاحبزادہ احدر نے اپنی وکالت کی تعلیم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عدالتی کارروائی کے ذریعے مہلت حاصل کر رکھی تھی۔

انہیں بدلتے سیاسی حالات سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں' انہیں پوری امید تھی کہ ہندوستان کے رہنما انگریز قوم کو پسپائی پہ مجبور کرکے اس سرزمین سے نکلنے پہ مجبور کریں گے۔ ان کا اندازہ درست نکلا' لیکن ہندوستان کی تقسیم نے انہیں اور صاحبزادہ اقدس کو بے حد پریشان کیا۔ ان کے پرکھوں کی ریاست ہندوستان میں ہی رہ رہی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ پاکستان تو لے جا نہیں سکتے تھے۔

"بھائی حضور آپ نے کیا فیصلہ فرمایا ہے۔" صاحبزادہ احدر نے تفکر میں ڈوبے بھائی سے سوال کیا۔

"ہم کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں' صاحبزادہ احدر' ہم تو یہ نہیں سمجھ پا رہے کہ سرزمین ہندوستان کو دو حصوں میں بانٹنے کے پیچھے آخر کیا مقصد رہا ہوگا۔ کیا فقط غاصب انگریز کو نکال باہر پھینکنا کافی نہیں تھا۔"

"انگریز جاتے جاتے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نفرت کے جو بیج بو گیا ہے اس کے پیش نظر یہ تقسیم ناگزیر تھی۔ وہ وقت بیت گیا بھائی حضور جب مسلمان بادشاہ کی ہندو رعایا اسے دل سے "ظل الٰہی" تسلیم کر لیتی تھی اور ہندو راجہ کی مسلم پرجا خلوص سے "جے جے کار" کیا کرتی تھی۔ اب ہندو مسلم کو اور مسلم ہندو کو ایک پل برداشت کرنے کو تیار نہیں' آپ برائے کرم جلد از جلد فیصلہ فرمائیں' وقت بہت کٹھن گزر رہا ہے۔"

"وقت کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو احدر میاں' ہم وقت کے ہاتھوں شکست تسلیم کرکے ہتھیار پھینکنے والے نہیں اور آپ بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے آباء نے ہمارے ہاتھوں میں کون سے ہتھیار تھمائے تھے۔ یہ ہتھیار ہیں خاندانی وقار' اعلیٰ نسب اور اقتدار کے۔ اور ہمارا وقار اس محل سے وابستہ ہے۔ ہمارا نسب اس مٹی تلے دفن ہے' ہماری اقدار ان فضاؤں میں زندہ ہیں۔ ہم اس مٹی سے اس فضا سے دور نہیں جا سکتے۔ ہرگز نہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ اٹل فیصلہ' اور اپنے فیصلوں میں معمولی سا رد و بدل کرنا بھی ہمیں گوارا نہیں۔ یہی بات ہم نواب مطیع الدولہ کو بھی کہلانا چاہتے ہیں۔ انہیں پیام بھجوا دیا جائے کہ بارات اسی روز روانہ ہوگی جس روز کا وعدہ کیا گیا ہے۔ شرفاء اور نوابین میں زبان دے کر پھرا نہیں جاتا۔"

"ان کا خدشہ بھی درست ہے' تقسیم کے موقع پر ہنگامہ آرائی اور لوٹ مار تو متوقع ہے ہی۔ ایسے میں۔۔۔" صاحبزادہ احدر نے دبے الفاظ میں اپنے خدشے کا اظہار کیا جسے صاحبزادہ اقدس نے پل میں مسترد کر دیا۔

"کون کرے گا ہنگامہ آرائی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ ہماری رعایا' ہمارے لوگ' یہ ہندو ہوں یا مسلم ہیں تو ہمارے ہی لوگ۔۔۔ آپ جانتے ہیں احدر میاں کہ ہماری ریاست میں ہمیشہ سے ہی زیادہ تعداد ہندوؤں کی رہی ہے۔ اور ہمیں ان کی وفاداری میں ذرہ برابر شبہ نہیں آج ہم ایک بے معنی سے خدشے کی وجہ سے آپ کے بیاہ کی تاریخ بدل دیں تو ہماری کتنی جگ ہنسائی ہوگی' نہیں صاحبزادہ احدر ہم بزدل یا مصلحت کوش نہیں کہلانا چاہتے۔ آپ کی بارات انشاءاللہ اسی تاریخ کو روانہ ہوگی اور پوری شان و شوکت سے روانہ ہوگی۔" انہوں نے آخری فیصلہ صادر کر دیا۔

اور سب نے دیکھا کہ پورے ہندوستان میں جس روز قتل و غارت کا بازار گرم تھا' خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی' وہاں ایک سہرا ایسا بھی تھا جس کے محل میں زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہی تھی۔

محل کے باہر بیرونی رستوں سے لے کر صدر دروازے تک لکڑی کے ستون کھڑے کیے گئے تھے اور ان

ستونوں کے اوپر گیندے' گلاب اور موتیا کی چھتیں تانی گئی تھیں۔ ایک ایک ستون سبک' سجل اور منقش تھا' جہازی سائز دروازے پہ مین پوری کے کاریگروں نے ہاتھی دانت کا کام کیا تھا۔ فیل خانے سے "لیلی" پہ رکھی پالکی میں سوار صاحبزادہ احدر علی خان باہر نکلے تو سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی' سرخ زری پوت کا پائجامہ سرخ استنبولی اطلس کا انگرکھا' کمر میں کارچوبی دوشالہ' مرصع قبضے کی تلوار لٹکائے' سونے کی تاروں کا بنا سہرا سجائے۔۔۔ وہ سچ مچ کے شہزادے ہی تو لگ رہے تھے۔

ہندو بھانڈ نے کان پہ ہاتھ رکھ کے تان لگائی۔

مالک نکلے ہیں سجن چھبن کے
کرنے نکلے ٹھکرائن سے بیاہ

بادلوں کا سایہ سر پہ
ہاتھ میں ہیرے جمانے بھر کے
انگریجن کے کیسے کیسے گھوڑا ہاتھی
کاٹ کے پھینکیں جیسے کھیرا ککڑی

"لیلی۔" اپنی سونڈ میں معطر پانی بھر بھر کے بارات پہ پھینک رہی تھی۔ نو سالہ صاحبزادہ نفیس علی خان کے حافظے میں وہ دو سہرا اچھی طرح محفوظ تھی۔۔۔ وہ ساری شان و شوکت' وہ دبدبہ وہ رونقیں ایسا لگتا تھا چھوٹی سی یہ جاگیر اس وقت پورے ہندوستان سے کٹ کر رہ گئی تھی۔۔۔ وہاں خون ابل رہے تھے یہاں عطر اچھالے جا رہے تھے۔

وہاں سر قلم ہو رہے تھے' یہاں پتیاں نچھاور ہو رہی تھیں۔

وہاں بستیوں کی بستیاں جل رہی تھیں یہاں گھی کے چراغ روشن تھے۔

اور اتنی خلقت تو بارات کے ساتھ نہ تھی' جتنی ولیمے کے روز جمع تھی۔ جس امن و سکون کے ساتھ بارات روانہ ہوئی اور جس خیریت کے ساتھ واپس پہنچی اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو مطمئن کیا جو اس شرانگیز ماحول میں ایسی تقریب میں شرکت کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ ولیمے کے روز بات ہی اور تھی۔ اتنے لہڑوں (سواری' پالکی وغیرہ کے جانور) تھے کہ اصطبل میں جگہ کم پڑ گئی۔ کنوؤں میں اس قدر شکر جھونکی گئی کہ پانی شیرہ بن گیا۔

"زنان محل" میں دولہا دلہن کے لیے نم گیرے کی مسند سجائی گئی۔ تین طرف چاندی لگے تخت بچھے تھے۔ دونوں کو لا کے بٹھایا گیا۔ سیندوری رنگ کے غرارے میں ملبوس گھٹنوں تک آتے گھونگھٹ میں چھپی چھپی دلہن زیورات سے لدی پھندی تھیں۔ میراثنیں شریر شریر گیت گاتے ہوئے بیگمات سے بخششیں لے رہی تھیں۔ صاحبزادہ نفیس اور صاحبزادہ انیس اپنی کم عمری کی وجہ سے ان زنانہ محفل میں موجود میراثنوں کے چٹکلوں پہ قہقہے بکھیر رہے تھے۔ جس میں دولہا کے علاوہ کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں ہوئی۔

ولیمے کی ضیافت میں مسلمان مہمانوں کے لیے بھی اتنا ہی اہتمام تھا' جتنا ہندوؤں کے لیے' مغلئی پلاؤ' تورتن قورمہ' نرگسی کوفتے' مہابت خانی پسندے۔ بشیش کباب' دم پخت مینڈھے' مرغ مسلم۔۔۔

ہندوؤں کے لیے جو چاندی کے تھال سجے تھے' ان پہ بھی کم رونق نہ تھی۔ پنیر کے کوفتے' مکھن میں پکی ملائی پالک' دیسی گھی میں تلی پوریاں بیسن کی پھلکیاں خوش رنگ ترکاری' رس ملائی گلاب جامن۔۔۔

لیکن ابھی تھالیاں پروسی ہی جا رہی تھیں کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہندو بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ بھگدڑ مچ گئی' عجب افراتفری کا عالم تھا۔ چند گھڑسواروں نے بندوق کے زور پہ ہزاروں کے مجمع پہ دہشت طاری کر دی۔

"اے۔۔۔ جو جو ہندو برادری سے ہے ایک طرف ہو جائے' ہمارا مطلب صرف ان مسلے نوابوں سے ہے۔۔۔ سالے سونا پہنتے ہیں۔ چاندی پہ سوتے ہیں اور ہیرے پھانکتے ہیں۔ آج ان کا پیٹ پھاڑ کے بھی سارا دھن ہمارا تو نکالیں گے' سالے کئی سو سالوں سے ہمارے اوپر راج کرتے رہے اب سارا دھن سمیٹ کر پاکستان لے جانا چاہتے ہیں۔ ارے بے خبرو تم ہی سے لوٹا ہوا تمہیں دان کرکے باندی بنا لیتے ہیں یہ مسلے راجے۔ چلو ہمارے

ساتھ ہو جاؤ اور ان سے نمٹنے میں مدد کرو ہماری۔" ایک گھڑسوار کی پاٹ دار آواز گونجی۔

اور صاحبزادہ اقدس نے حد درجہ حیرت سے ہندوؤں کے اس انبوہ کو ان کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جو ابھی کچھ دیر قبل ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ ان میں وہ یار دوست بھی تھے جن سے سالوں کے روابط تھے اور وہ نمک خوار ملازمین بھی جن کی سات پشتیں ان کی وفادار رہی تھیں۔ وہ رعایا تھی جن کی بہتری کے لیے اقدامات کرتے ہوئے انہوں نے کبھی مذہب کا امتیاز نہ برتا تھا۔ اور آج وہی لوگ۔۔۔ جو دوستی کا دم بھرتے تھے ایک طرف کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔

وہ نمک خوار جنہیں وفادار ہونے کا دعویٰ تھا۔ ان لٹیروں کے حکم پہ لوٹ مار میں برابر کے شریک تھے۔ ان کی بہو بیٹیوں کے زیورات نوچ رہے تھے' وہ بیگمات اور صاحبزادیاں جن کے آنچل کی جھلک تک نہ کسی نے دیکھی ہوگی' بے پردہ ہو گئیں۔

جاتے جاتے غضب ان ظالموں نے یہ کیا کہ شرفاء کی بیٹیاں تک اٹھا کے لے گئے۔ اس صدمے نے صاحبزادہ اقدس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے ذلت رسوائی اور سب سے بڑھ کر زعم ٹوٹنے کا غم انہیں لے ڈوبا۔ مرنے سے قبل اپنے دونوں بیٹے چھوٹے بھائی کے سپرد کرتے ہوئے گڑگڑا اٹھے۔

"احدر میاں' ہم غلط تھے' ہم غلط تھے۔ ہمارے قیاس غلط تھے' ہمارا بھروسا جھوٹا تھا' ہمارا اعتماد کمزور نکلا اور سب سے بڑھ کر ہمارا زعم۔۔۔ ہمارے اس زعم نے ہمیں فریب دیا کہ صدیوں کے ساتھ نے اس بے وفا قوم کے دل میں ہماری محبت ڈال دی ہے۔

نہیں احدر میاں یہ بچ قوم کسی کی نہیں بنتی۔ ہمارے آباء کا طرزِ عمل درست تھا انہوں نے رعایا کو پیروں تلے کچل کے رکھا۔ ہم ہی تھے جو وقت کے بدلتے تقاضوں کے پیش نظر ان سے رعایت کر بیٹھے اور دیکھیں ذرا کیا کیا' ہماری وفاداری کا دم بھرنے والے جانثار ملازمین نے کیا کیا' ہماری خواتین کو بے پردہ کیا۔ ہمارے بزرگوں کی قبروں کی بے حرمتی کی' ہمارے محل کی شان کو روند ڈالا۔۔۔ آہ۔۔۔ ہم تو مٹی میں مل گئے۔

احدر میاں' آپ سے درخواست ہے ہمارے صاحبزادوں کو لے کر دور چلے جائیے۔۔۔ جہاں آپ کو امان ملے' جہاں آپ کو عزت ملے۔۔۔ جہاں کوئی آپ کو اور ان معصوموں کو مسلمان ہونے کی سزا نہ دے' بس اتنا دھیان رہے یہ مت بھولیں اور نہ انہیں بھولنے دیں کہ یہ صاحبزادہ اقدس علی خان کی اولاد ہیں۔ رہتی دنیا تک میرے خاندان کا وقار قائم رہنا چاہیے ہم جان گئے ہیں کہ شان و شوکت محلوں' جاگیروں کی محتاج نہیں ہوتی۔۔۔ خون میں شامل ہوتی ہے۔ ہمارے خون کی تاثیر نہ بدلنے پائے۔ اتنا دھیان رہے۔"

چچا حضور نے تو عہد کیا ہی لیکن دونوں صاحبزادوں نے بھی والد محترم کی یہ آخری نصیحت گرہ سے باندھ لی اور گزرتے وقت کے ہر تند و تیز جھونکے یہ گرہ مضبوط کرتے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

چچا حضور اپنی دلہن اور بھتیجوں کو لے کر بچتے بچاتے پاکستان آپہنچے' ان کا دم نہ ہوتا تو نجانے ان ننھی جانوں کے جینے کا آسرا کیا ہوتا۔ وہی تھے جنہوں نے دعویٰ کر کے یہ حویلی اور چند باغات حاصل کیے۔ اگرچہ یہ حویلی اس "اقدس محل" کے آگے ذرہ بھی نہ تھی' مگر دونوں صاحبزادوں کے لیے یہی "اقدس محل" بن گیا کہ چچا حضور نے کبھی یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ محل سے نکل چکے ہیں وہی اقدار وہی آداب و تکلفات' وہی رکھ رکھاؤ۔۔۔

آنے والے چند سالوں میں چچا حضور کے گھر تین صاحبزادیوں کا اضافہ ہوا۔ صاحبزادی فرحت النساء صاحبزادی خلعت النساء اور صاحبزادی حرمت النساء' انہوں نے اگرچہ اپنے والدین کا آبائی محل دیکھ رکھا تھا نہ ہی نوابی دور پھر بھی چچی دلہن نے ان کی پرورش میں تمام تر شاہی اقدار کا لحاظ رکھا' یہی وجہ تھی کہ ان کی فطرت میں بھی وہی رکھ رکھاؤ' رچ بس گیا تھا جو ان کے گھرانے کا خاصہ رہا تھا۔ رہن سہن' اوڑھنے پہننے' بول چال ہر لحاظ سے یہ گھرانہ ابھی تک لکھنؤ کے اسی محل میں سانس لیتا تھا۔

چند باغات ان جاگیروں کا ازالہ تو نہیں کر سکتے تھے' لیکن گزر بسر عزت سے ہو جاتی تھی۔ ان دنوں باغات کی پیداوار بھی خاصی تھی۔ خوب آمدنی ہوتی۔ کئی صلاح داروں نے رائے دی کہ اس آمدنی سے کوئی اور کاروبار شروع کر کے مزید سرمایہ بنایا جا سکتا ہے' لیکن چچا حضور کو یہ گوارا نہ تھا۔

"اجی چھوڑیئے یہ ذکر۔۔۔ ہم اور اس بنئے پن کے کام میں گھسیں؟ دو اور دو چار بنانے میں مشغول ہو جائیں۔ یہ ہمارے وقار کے منافی ہے۔ ہمیں تو اس آڑھت سے بھی دلچسپی نہیں۔ شرم آتی ہے منشی سے آموں سنگتروں کا حساب کرتے ہوئے۔ آج تک بہی کھاتا نہیں کھولا۔ لاحول ولا اب صاحبزادہ احدر علی کا یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ منڈی کے بھاؤ تاؤ کا دھیان رکھیں۔ بس ٹھیک ہے زمینوں اور باغوں کے کاغذات پہ ہمارا نام لکھا ہے اس لیے اس کی آمدن وصول کر لیتے ہیں باقی کوئی سوال جواب ہم نے منشی سے کبھی نہیں کیا اگر ہم بھی یہ فکر رکھنے لگیں تو بھلا ہم میں اور اس تنخواہ دار منشی میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اور آپ۔۔۔ آپ حضرت ہمیں کاروبار کا مشورہ دے رہے ہیں۔۔۔ نوازش حضور۔۔۔"

اور پورے خلوص سے مشورہ دینے والے اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ وہ اپنی عزت و آن میں مگن و شاد تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ عزت چاہے وراثت میں ملی ہو چاہے خود کمائی ہو۔ چھننے میں دیر نہیں لگتی۔ اور ان کی عزت میں تو بڑی نازک چیزوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ تین آبگینوں کا۔

سب سے پہلے چچی دلہن نے بڑی دختر فرحت النساء کی صاحبزادہ نفیس علی خان میں بڑھتی دلچسپی کو بھانپا' شاید وہ خود بھی اپنی اس نازک سی عم زاد سے وارفتگی رکھنے لگے تھے۔ چچی دلہن نے شوہر سے دبے الفاظ میں ذکر کیا۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ فرحت النساء تینوں صاحبزادیوں میں بڑی تھیں۔ سولہ کا سن تھا' اصولاً شادی کی عمر تو ہو چلی تھی لیکن ان کا ارادہ نفیس علی کے بجائے انیس علی کی طرف تھا کہ وہ بڑے صاحبزادے تھے۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے حضور' پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ صاحبزادی فرحت النساء اور صاحبزادہ نفیس کی عمر میں کتنی مطابقت ہے اور وہ دونوں بھی تو تینوں صاحب زادیوں کی طرح آپ ہی کے لخت جگر ہیں۔ دونوں سے آپ ایک ہی جیسی محبت رکھتے ہیں' اس لیے تردد نہ کیجیے۔"

بیگم کے سمجھانے پہ وہ سبک سے ہو گئے۔ واقعی یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا یوں بھی انجانے لوگوں میں بیٹیاں دینے سے ان کا دل ویسے بھی گھبراتا تھا۔ دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا جس کی بھنک نجانے کس طرح صاحبزادہ نفیس علی خان کو ہو گئی۔ اب فرحت النساء کے لیے دل میں کچھ اور ہی استحقاق بھرے جذبات ابھرنے لگے۔

انہی دنوں میں چچی دلہن کی طبیعت کچھ ناساز رہنے لگی۔ معالج نے آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا اور چچا حضور انہیں صاحبزادیوں کے ہمراہ باغات کے ساتھ بنے چھوٹے سے مکان میں ٹھہرا آئے تاکہ آلودگی سے پاک کھلی تر و تازہ فضا پا کر ان کی سانس کی تکلیف میں افاقہ ہو۔

یہ قصبہ لاہور شہر سے زیادہ فاصلے پہ نہ تھا اس لیے سرِ شام ہی کوئی نہ کوئی ان تینوں میں سے شب بسری کے لیے خواتین کے پاس چلا جاتا۔ عموماً" چچا حضور جاتے یا پھر صاحبزادہ نفیس کیونکہ بڑے صاحبزادے اپنی تعلیم میں مصروف تھے ویسے ہر طرف سے بے فکری تھی' قابل بھروسہ ملازمین تھے۔ آس پاس کے دیہات آباد تھے اور خود اس مختصر سے قصبے کے لوگ بھی بے حد سادہ اور پر خلوص تھے۔ تنہا خواتین کو اپنی ذمہ داری جانتے ہوئے دن بھر جو کس رہتے۔ چاہے وہ تندور کی ماچھن مائی بخت ہو یا قصبے کا ماسٹر ہدایت اللہ' امام مسجد نور الدین ہوں یا چودھری فضل بخش۔۔۔ دائی کریماں ہو یا میراثی اللہ دتا۔۔۔ سب ہی خبر گیری کے لیے دن میں کئی پھیرے لگاتے' ماسٹرنی خورشید ہدایت اللہ کا تو چچی دلہن سے بہناپا بھی ہو گیا وہ لاولد تھیں اور کئی پہران کے ساتھ بتا دیتیں۔ اس لیے صاحبزادہ احدر علی اہل خانہ کی جانب سے زیادہ متفکر نہ تھے۔

اس دن انہوں نے شہر میں گردش کرتی خبر سنی کہ دریائے راوی کا پانی جوش میں ہے اور سیلاب کا امکان ہے۔ ان کے باغات جس قصبے میں تھے وہ شاہدرہ سے کافی آگے تھا اور قدرے بلندی پہ تھا پھر بھی انہوں نے

احتیاطاً" بیگم اور بیٹیوں کو واپس بلوانے کا ارادہ کر لیا کہ بہرحال سیلاب سے وہاں جانے کا رستہ تو بند ہو سکتا تھا اور اس بندش کی وجہ سے دونوں طرف موجود لوگوں کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے صاحبزادہ نفیس علی خان کو یہ ہدایت دے کر باغات کی جانب روانہ کیا کہ جتنی جلد ہو سکے انہیں واپس لاہور لے کر آئیں۔

زوال کے وقت جب وہ وہاں پہنچے تو چچی اور مائی بختے کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ ان کے استفسار پہ انہوں نے بتایا۔

"چودھری کی بیٹی کا آج نکاح ہے۔ پچھلی بار جب آپ کے چچا حضور یہاں تھے تو چودھری صاحب اور چودھرائن بی بی خود دعوت دینے آئے تھے اور انہیں شرکت کے لیے پرزور طریقے سے اصرار بھی کر کے گئے تھے۔ ہم ان کا انتظار ہی کرتے رہے، لیکن کل وہ نہیں آئے۔ شاید کوئی ضروری کام ہو لیکن آج صبح چودھرائن بی بی گلہ کرنے آئیں کہ کوئی ان کی بیٹی کی مایوں کے شگن میں شریک نہ ہوا۔ اس لیے ہم نے بچیوں کو ماشٹی خورشید کے ہمراہ آج کی دعوت پہ بھیج دیا۔

ہماری طبیعت تو اجازت نہیں دے رہی تھی ورنہ ہم خود بھی جاتے۔ آخر یہاں کے لوگ ہمارے لیے اتنا خلوص اور محبت جتاتے ہیں۔ وضعداری کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہم بھی اتنے خلوص سے ان کی خوشی میں شریک ہوں، آپ اگر زیادہ تکان کا شکار نہ ہوں تو ہمارا مشورہ ہے کہ نہا دھو کر وہیں چلے جائیں تاکہ آپ کے چچا کی نمائندگی بھی ہو جائے۔"

اور وہ جو اس چہرے کو نہ پا کر جز بز سے ہو رہے تھے۔ جس کی ایک جھلک ان کی طبیعت کی ساری کلفت دور کر دیتی تھی، وہاں جانے کا اذن پا کر بشاش ہو گئے ابھی غسل کا ارادہ ہی کیا تھا کہ کسی نے انتہا درجے کی بے چینی اور افراتفری کے عالم میں کواڑوں پہ دستک دی۔ دروازہ کھولنے پہ سامنے میراثی اللہ دتا کو سراسیمہ سے انداز میں دیکھا تو پیشانی پہ شکنیں پھیل گئیں۔

"یہ کیا طریقہ ہے دستک دینے کا۔"

"باؤ جی۔۔۔ حویلی میں ڈاکہ پڑ گیا ہے۔ نورے نے اندر گھس کر سب کو بندی بنا لیا ہے۔ ابھی تو جنج بھی نہیں آئی تھی۔"

"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ نورا۔۔۔ نورا ڈکیت وہ تو سنا ہے کہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔" صاحبزادہ نفیس سخت متوحش ہو گئے۔

"کی پتہ جی؟ پر میں نے اکھی دیکھا ہے۔ (چشم دید) وہ نورا ہی تھا۔ بارہ کے ٹولے کے ساتھ گھوڑے پہ آیا۔ فیرنگ (فائرنگ) کی اور حویلی گھس کے اندر سے پھاٹک بند کر لیا۔ تین جنے باہر کھڑے لوگوں کی رکھوالی کرنے لگے۔ میں دلے کی ہٹی (دکان) سے ذرا پرے تھا۔ دوڑ کے ادھر آ گیا کہ پلس کو فون کر دوں۔"

"یہ تم نے اچھا کیا، سیدھے ڈاکخانے جاؤ اور پولیس کو فون پہ اطلاع دے کر آؤ، میں حویلی کی طرف جاتا ہوں۔" اتنی اندوہناک اطلاع ملنے پر بھی انہوں نے بمشکل اپنے اعصاب قابو میں رکھے ورنہ دل انجانے اندیشوں سے لرز رہا تھا ان کے گھرانے کی عزت اس وقت اسی حویلی کی اونچی دیواروں میں مقید، بدنام زمانہ ڈاکو کی گرفت میں تھی۔

نورے کے متعلق تو انہوں نے بہت کچھ سن بھی رکھا تھا کہ وہ محض سونے چاندی کو سمیٹنے پہ ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ بڑے بڑے گھرانوں کے گوہر آبدار کو بھی نقب لگانے سے نہیں چوکتا۔

"کیا ہوا نفیس میاں؟ آپ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں، کون تھا دروازے پہ۔" اوٹ سے چچی حضور نے جھانک کر دریافت کیا۔ شاید ان کی چھٹی حس انہیں خبردار کر کے بستر سے دروازے تک کھینچ لائی تھی۔ ابھی وہ کوئی بہانہ گھڑ کے انہیں مطمئن کرنا ہی چاہتے تھے کہ مائی بختے جو ان سے چند قدم پیچھے بت بنی کھڑی یہ تفصیل سن رہی تھی، اچانک سکتے کی کیفیت سے نکل آئی اور دوہتڑ سینے پہ مارتی پیٹنے لگی۔

"ہائے ہائے غضب ہو گیا۔ نورا کم بخت حویلی گھس گیا۔ اب خیر نہیں، ہائے میری یتیم پوتری۔۔۔ میرے اللہ جی۔۔۔ غریب کی عزت سلامت رکھنا۔" اس کی آہ و بکا سن کر چچی دلہن بھی لڑکھڑا سی گئیں۔

ان کی تو ایک نہ دو پوری تین بیٹیاں اس وقت خطرے کی زد میں تھیں۔ سفید پڑتے چہرے کی ساتھ وہ ایک طرف کو جھکیں۔ تذبذب کا شکار صاحبزادہ نفیس نے ایک نظر ان کے ہوش و خرد سے بیگانہ وجود کو دیکھا اور پھر دوسری طرف کی خبر لانے کو زیادہ ضروری جانتے ہوئے باہر کی راہ لی۔ سرپٹ بھاگتے جب وہ حویلی کے نزدیک پہنچے تو ہر طرف اڑتی دھول اور گرد کے سوا کچھ نہ تھا۔ دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔ ہر شخص سہما کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر ہراس کے ساتھ ساتھ غم کے تاثرات بھی ہر چہرے پہ نمایاں ہو گئے، حویلی کے اندر سے رونے پیٹنے اور ماتم کی آوازیں باہر تک آ کر سب کے دل دہلا رہی تھیں۔

"امام صاحب۔۔۔ سب خیریت تو ہے ناں؟" اندر سے جھکے شانوں کے ساتھ نکلتے نڈھال سے امام مسجد سے انہوں نے دریافت کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی باہر کھڑے ہجوم میں سے بہت سے لوگ حویلی سے نکلتے افراد کی طرف صورتحال کی نوعیت جانچنے کے لئے لپکے، کچھ اصل واقعہ جاننے کی غرض سے اندر ہی چلے گئے۔

امام صاحب نے افسردہ نگاہوں سے مجمع کی طرف نظر دوڑائی۔

"چودھری صاحب کے سسر حاجی سردار کو گولی مار دی ظالموں نے۔"

"ہیں۔۔۔ وڈے چودھری ہوراں کو؟" سب چیخ اٹھے۔ تب ہی اندر سے ماتمی بین بلند ہو رہے تھے۔

"اور۔۔۔" وہ ہچکچائے۔ "بٹیا اٹھا کے لے گئے۔"

"ہائے ہائے۔"

"ظلم ہو گیا۔"

"چودھری صاحب تو لٹ گئے۔"

"ہائے تھوڑی دیر میں جنج آنے والی ہے اور وہ ہٹی۔۔۔"

سب اپنے اپنے طور پر اظہار کر رہے تھے۔ کہ امام صاحب کی اگلی آواز نے سکوت پھیلا دیا۔

"دلہن کے علاوہ دو بچیاں اور بھی تھیں جوان خبیثوں کے ہتھے چڑھ گئیں۔"

وہاں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا جس جس کی بھی بہن، بیوی بیٹی اندر موجود تھی۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ ابھی سب کو اندر جانے کی جلدی تھی اب اتنا ہی آگے بڑھتے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہر کوئی چپکے چپکے اپنی عزت کی سلامتی کی دعا کر رہا تھا، انہیں میں صاحبزادہ نفیس بھی شامل تھے لیکن شاید یہ داغ ان کے آن بان والے چچا حضور کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا کیونکہ دلہن کے علاوہ جن دو لڑکیوں کو نورا اور اس کے ساتھی اٹھا لے گئے تھے ان میں سے ایک تو تندور پہ روٹیاں لگانے والی ضعیف مائی بختے کی یتیم مگر الہڑ اور شوخ تیرہ سالہ پوتی رانی تھی اور دوسری صاحبزادہ احمد علی خان کی صاحبزادی فرحت النساء جس کا معصوم اور بے داغ حسن پریوں کو مات دیتا تھا۔ جس کی شرمگیں پلکیں اتنی بوجھل تھیں کہ شاید ہی کبھی کسی نے اٹھتے دیکھی ہوں۔

یہ خبر ملتے ہی صاحبزادہ نفیس دیوانوں کی طرح اس رستے پہ بھاگنے لگے۔ جہاں سے ڈاکو گزرے تھے لیکن سوائے گرد اور دھول کے وہاں کچھ نہ تھا۔ پلاؤ اور زردے کی دیگیں الٹی پڑی تھیں، سپاڑ اور برف کے گولے بنانے والے کے خوانچے اوندھے گرے تھے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے غم و غصے سے پاگل ہوتے نفیس میاں کو قابو میں کیا۔ انہیں آنے والے وقت سے خوف محسوس ہونے لگا۔ ہر منظر اندھیرے میں بسا ہوا لگتا۔ چچا حضور کو یہ اطلاع دینا سب سے مشکل امر تھا۔ اور پھر چچی حضور کی بگڑی صحت، انہیں سنبھالنا بھی ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔

قدرت نے ان کی ایک مشکل تو آسان کر ہی دی۔ غم سے چور چور وہ جب سہمی ہوئی خلعت النساء اور حرمت النساء کو لے کر گھر پہنچے تو چچی دلہن کا بے جان وجود انتظار کے مرحلے سے ماورا ہو چکا تھا۔ مائی بختے کی اپنی پوتی وہاں تھی وہ بھلا کیسے سب بھول بھال ان کی خبر گیری کرتی اس لیے یونہی چھوڑ کر حویلی دوڑ گئی اور موت نے ان پہ غلبہ پا لیا۔

پولیس آئی' صاحبزادہ احدر آئے اور۔۔۔ اور سیلاب۔۔۔ ہاں سیلاب بھی آگیا۔ ڈاکوؤں کا وہ ٹولہ راوی کے پاس بنے بیلے میں ہی پناہ گزین تھا ابھی وہ لوٹ مار کے بعد پل کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ سیلاب کے تندو تیز ریلے نے انہیں آلیا۔ سب بہہ گیا۔ سب کچھ۔ ڈاکو' ان کی رائفلیں' گھوڑے اور لوٹ کا مال۔۔۔ جس میں سونے چاندی کے زیورات اور کرنسی نوٹوں کی گڈیوں کے علاوہ تین جیتی جاگتی زندگیاں بھی تھیں۔ شاید خدا کو ان کی عزت محفوظ رکھنا منظور تھا اس لیے انہیں موت کی گود میں پناہ دی گئی۔

صاحبزادہ احدر علی خان پہ بس چند گھڑیاں مشکل گزریں۔ جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ ان کی دختر اغوا ہو چکی ہے انہیں لگا کہ جیسے اب دنیا میں کہیں جائے امان نہیں ملے گی۔ سانس تک لینا دشوار ہو جائے گا' ذلت کے اس احساس تلے دب کر۔ لیکن چند ہی منٹ بعد جب پولیس نے یہ اطلاع دی کہ لورا ڈاکو اپنے پورے ٹولے سمیت سیلاب کی لہروں کا شکار ہو کر غرق ہو چکا ہے۔ ان کے سینے سے بھاری سل ذرا سی سرک گئی۔ دنیا کے سامنے تماشا بن جانے کا خوف اپنی جگہ سلامت تھا اور بیٹی سے دائمی جدائی کا دکھ تو خیر رہتی دنیا تک رلائے گا لیکن دل کو تسلی تھی کہ وہ آبرو کے ساتھ مری۔ بڑے بھائی صاحبزادہ اقدس علی خان سے کیا گیا وعدہ' خاندانی عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کا وعدہ' کسی نہ کسی طرح نبھ ہی گیا۔ دل نے چپکے سے گلہ ضرور کیا۔

"بھائی صاحب' آپ نے کہا تھا کسی ایسی جگہ چلے جانا' جہاں امن ہو' سکون ہو' جہاں عزت ملے جہاں امان ملے۔ ہم اپنی حیات سمیٹ کر یہاں اس خطے پہ چلے آئے جس نے مسلمانوں کو امان دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ہوا کیا؟ وہاں غیروں نے لوٹا تھا تو یہاں اپنے ہی لٹیرے بن گئے۔ لیکن آپ ہی بتایئے اب ہم کہاں امان پائیں؟"

بیگم کی وفات کے بعد قد نکالتی بچیوں کا اس حویلی میں بھتیجوں کے ہمراہ رہنا انہیں کھلا تو جلد ہی دونوں بیٹیوں کا نکاح ان سے کر کے مطمئن ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد باغات و زمینوں کا انتظام از خود نفیس علی خان کے سپرد ہو گیا کہ وہ ان معاملات میں خاصے ہوشیار تھے۔

بڑے بھائی صاحب شروع ہی سے سادہ مزاج کے تھے۔ ان کا رہن سہن بھی دیگر اہل خانہ کی بہ نسبت سادہ تھا اگرچہ زبان وہ بھی لکھنوی استعمال کرتے' لیکن کبھی کبھی اپنے خاندانی لباس کے استعمال میں کوتاہی کر جانے میں کوئی تکلف بھی نہ کرتے۔ صاحبزادہ نفیس کو بڑے بھائی کو تہبند میں ملبوس دیکھ کر سخت کوفت محسوس ہوتی وہ چیں بہ جبیں ہوتے مگر احتراماً" اپنی ناگواری کا اظہار نہ کر پاتے" البتہ بڑی بیگم یعنی بھابھی خلعت النساء ان کی خوب خبر لیتیں وہ رعب دبدبے والی خاتون تھیں اپنے ابا حضور سے سارے نوابی سبق رٹ رکھے تھے۔

صاحبزادہ انیس علی خان ان سے دب کر رہتے' کچھ وہ مزاجاً" بھی صلح جو اور کم آمیز تھے البتہ چھوٹی بیگم صاحبزادی حرمت النساء مکمل طور پہ شوہر کے زیر اثر تھیں۔ ان کی پسند نہ پسند' مرضی ہر چیز انہی کے سانچے میں ڈھل چکی تھی۔

گزرتے سالوں نے اس حویلی کے مکینوں میں کئی اضافے کیے۔ اس حویلی کے در و بام بھی ننھی منی قلقاریوں سے گونجنے لگے۔ گود میں ہمکتے ترو تازہ مہکتے پھولوں نے جہاں ان چاروں کے دل سے صاحبزادہ احدر علی خان اور ان کی بیگم کی دائمی جدائی کا کرب کم کیا' وہاں صاحبزادی فرحت النساء کے ساتھ گزرنے والے سانحے کی اذیت بھی مدہم پڑنے لگی بس ایک نفیس علی خان تھے جن کے دل سے ملال نہ جاتا تھا کہ وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی ان کی حفاظت نہ کر سکے۔

بڑے صاحبزادے اور بیگم خلعت النساء کے ہاں ایک بیٹی یاسمین ناز اور بیٹا عمیص علی خان ہوئے جب کہ چھوٹے صاحبزادہ کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں۔ صاحبزادی گل مہر خانم اور صاحبزادی الماس خاتون۔

پاکستان آنے کے بعد چچا حضور نے دونوں بھتیجوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی' لیکن اپنی صاحبزادیوں کو حویلی سے نکالنا گوارا نہ کیا یہ الگ بات کہ ان کی تعلیم کے لیے چار دیواری کے اندر معقول انتظام کیا گیا۔ قرآن پاک مع تفسیر پڑھایا گیا۔ گلستان' بوستان' وغیرہ پڑھائی گئیں۔ یعنی قدیمی طرز تعلیم سے مکمل آراستہ کیا گیا۔ اب وقت بدل رہا

تھا اور بدلتے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر صاحبزادہ نفیس علی خان کو بھی ذرا روشن خیال ہونا پڑا بلکہ اس سلسلے میں زیادہ اہم کردار بڑے بھائی صاحب نے ہی ادا کیا۔ صاحبزادہ نفیس تو شاید ہچکچاتے ہی رہتے۔ لیکن یہ وہی تھے جنہوں نے عملی قدم اٹھایا اور صاحبزادی یاسمین ناز کو بھی صاحبزادہ عمیص کے ساتھ اسکول داخل کرا آئے۔ یعنی دونوں چھوٹی صاحبزادیوں کے لیے رستہ کھل گیا۔ ابھی ان کے دونوں بچے اسکول میں ہی تھے کہ ان کی وفات ہو گئی۔

سارے کنبے کی معاشی کفالت تو پہلے ہی صاحبزادہ نفیس کے ذمے تھی اب اخلاقی ذمہ داری کا بار بھی انہوں نے لے لیا۔ اپنے چچا حضور کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے یتیم بھتیجے اور بھتیجی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ باقی رکھی۔ جتنی محبت اور شفقت اپنی اولاد کو دی جاتی' اتنی ہی ان کے حصے میں بھی آئی۔ جو اصول اپنی اولاد کے لیے روا رکھے گئے' وہی بھائی کی اولاد کے ساتھ بھی تھے۔ لیکن ایک چیز ہوتی ہے فطرت۔۔۔

فطرت۔۔۔ جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

اور فطرت۔۔۔ جو ہر انسان اپنی اپنی الگ اور منفرد لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہی ہو گا کہ ایک ہی ماں کی تربیت میں پل کر پروان چڑھنے والے بچوں میں سے ہر ایک الگ نقطہ نظر لے کر اپنی دنیا بساتا ہے۔ یہی وہ فطرت ہے جسے نہ تربیت بدل سکتی ہے نہ بندہ بدل سکتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ تربیت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔۔۔ اچھی یا بری تربیت اچھی یا بری فطرت پہ اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔ فطرت کی بری خصلتیں اچھی تربیت اور کڑی نگہداشت کے نتیجے میں دب سکتی ہیں اور اچھی بھلی صاف ستھری فطرت لاپروا سرپرست کی کارکردگی کے نتیجے میں آلودہ ہو سکتی ہے۔ سرمال بدل نہیں سکتی۔

یہی حال اس حویلی کے مکینوں کا تھا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان اور انیس علی خان نے ایک ہی محل میں آنکھ کھولی۔ ایک جیسی ناز و نعم سے بھری زندگی سے ابتدا کی۔ ایک ہی جیسے بحران سے گزرے لیکن اس بحران نے ایک بھائی کو مزید پختہ عزم کر دیا اور دوسرے کو زندگی کی بے ثباتی سے بے زار' صاحبزادہ نفیس جتنے اصولوں کے پکے اور خاندانی حرمت و وقار کے بارے میں حساس تھے' بڑے صاحبزادے اتنے ہی بے نیاز' لیکن یہ چچا حضور کی تربیت کا اثر تھا یا ابا حضور کی مرتے دم نصیحت کا لحاظ کہ انہوں نے طبیعت کے تکدر کے باوجود تمام عمر ان اصولوں پہ کاربند رہنے کی کوشش کی۔

اور آج اس "نفیس محل" کے مکینوں کے مزاج میں بھی یہی رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ برسوں سے اس گھرانے کے سربراہ ہیں صاحبزادہ نفیس علی خان۔

سفید بے داغ کرتا پائجامہ میں ملبوس' جودھ پوری جوتا پہنے' ہاتھ میں منقش عصا جو ان کے والد محترم کی یادگار ہے۔ اور باہر نکلتے وقت زیب تن کیے جانے والی سیاہ' بادامی اور بھوری شیروانیاں' سرخ و سفید رنگ' اونچا مضبوط سراپا' بارعب آواز' بڑی بڑی شربتی رنگ والی جلالی آنکھیں۔۔۔ ان کی گزر بسر بھی تاحال انہی باغات کی آمدنی پہ ہے جو چچا حضور نے کلیم میں حاصل کیے تھے اگرچہ بھائی صاحب کی علالت کے دوران علاج معالجہ کے سلسلے میں ان باغات میں سے کچھ فروخت بھی کرنے پڑے اور اس وجہ سے ماہانہ آمدنی پہ اچھا خاصا فرق پڑا ہے۔ اس کے باوجود وہ بھی چچا حضور کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے مزید کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے سے گریزاں ہیں۔

ان کی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے گھریلو حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ حویلی کے اکثر بڑے بڑے کمرے خالی اور تاریک پڑے ہیں۔ چچا حضور کی خریدی گئی پرانے ماڈل کی مرسڈیز گیراج میں بند پڑی ہے۔ نہ مرمت کروانے کے لیے رقم ہے نہ ہی پیٹرول کے اخراجات برداشت کیے جا سکتے ہیں' مالی چوکیدار' باورچی' ماسی۔۔۔ ایک کے بعد ایک کر کے تمام ملازم فارغ کیے جا چکے ہیں بس لے دے کے ایک دلگیر رہ گیا ہے جسے بیس سال پہلے منشی نے باغات میں روتا ہوا پا کے صاحبزادہ نفیس کے حوالے کیا تھا وہ ہیجڑوں کے ایک گروہ سے فرار حاصل کر کے بھٹک رہا تھا۔ انہوں نے اسے حویلی میں پناہ دی وہ بے دام کا غلام بن کے رہ گیا۔ اس کے لیے اب سب کچھ

یہ حویلی اور اس کے مکین تھے۔

بڑی بیگم صاحبزادی خلعت النساء جنہوں نے بڑے ہی طمطراق سے زندگی گزارنے کے بعد اب دنیا کے ہنگاموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی وہ تھیں اور عبادت۔ بڑے صاحبزادے کے گزرنے کے بعد کسی نے انہیں رنگین ملبوسات میں نہیں دیکھا۔ بڑے لکھے کی خاتون تھیں۔ عادات و اطوار میں بالکل اپنے والد مرحوم پہ گئی تھیں۔ حدیث و فقہ پہ مکمل عبور حاصل تھا۔

ان کے برعکس چھوٹی بیگم صاحبزادی حرمت النساء دبی دبی سی شخصیت رکھتی تھیں۔ انداز و اطوار میں ان کے بھی شائستگی ٹپکتی تھی۔ اور نفاست برستی تھی لیکن نہ تو لہجے میں گھن گرج تھی نہ نگاہوں میں شرربار لپکے۔ بڑی ہی میٹھی طبیعت پائی ہے اور یہ ان ہی کا خاصہ ہے کہ اتنے برس صاحبزادہ نفیس کے مزاج کی دھوپ چھاؤں برداشت کرتے گزار دیئے۔ ان کی زندگی کا محور یہ گھر اور اس کے مکین ہیں۔ ان کی ہر دم کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو کسی دوسرے سے کوئی تکلیف پہنچے نہ شکایت پیدا ہو۔ ہے ناں عظیم کوششیں اور کٹھن جدوجہد۔

بڑے بھائی صاحب کی بڑی صاحبزادی یاسمین ناز کا بیاہ ان کے چچا حضور نے چند سال قبل کردیا تھا۔ ان کی طرح ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والے ایک خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے داماد‘ صاحبزادہ نفیس کے پیش نظر صرف خاندانی نجابت تھی اور شجرہ کا کھرا اور اٹل ہونا۔ جب بابر ہمایوں مغل اس کسوٹی پہ پورا اترا تو انہوں نے بلا تامل ہاں کردی۔ صرف داماد کے نام سے ہی مرعوب ہوگئے جو تینوں زاویوں سے شاہانہ دکھتا تھا۔ اس کی نسل تو پچھلی صدی تک کھنگال ڈالی تمرزات کے حوالے سے کوئی چھان بین نہ کی۔ بابر ہمایوں مغل خود کو مغل حکمرانوں کا جانشین سمجھتے ہوئے چھوٹا موٹا کام کرنے پہ تیار نہ تھے۔ نتیجتاً ”کچھ بھی نہ کرتے تھے۔

لیکن صاحبزادے کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ کوئی گرا ہوا نچلے درجے کا کام نہیں کرتے تھے۔ بھلے سے کچھ نہ کرتے ہوں۔ یاسمین انتہا درجے کی صابر و شاکر۔ سکون کے ساتھ آرام طلب شوہر کے ساتھ گزارا کررہی ہے۔ اسے چچا حضور کے خلوص پہ شبہ ہے نہ کوئی شکایت‘ راضی بہ رضا رہنا اس کی فطرت ہے۔

اور ان سے چھوٹے صاحبزادہ عمیص علی خان۔ اپنے والد مرحوم کی شخصیت کے کئی رنگ لیے پیدا ہوئے۔ اگرچہ لڑکپن سے چچا حضور کے زیر سایہ تربیت پائی لیکن نجانے کیوں ان کے اقوال و قوانین پہ دل سے ایمان نہ لاسکے۔ مزاجاً ”ضدی بھی ہیں۔ اڑیل بھی اور من مانی کرنے کا بھی خاصا شوق ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج تک چچا حضور سے کھل کر اختلاف رائے کی جرات نہیں کرسکے۔ وجہ خوف نہیں احترام ہے۔ یہ الگ بات کہ دل ہی دل میں کئی معاملات میں وہ ان سے شاکی ہیں جن میں سرفہرست آپا بیگم کی بابر ہمایوں مغل سے شادی ہے۔ اس شادی کے زمانے میں وہ اتنے بڑے نہ تھے کہ چچا حضور ان سے مشورہ لینے کی زحمت کرتے۔ اس بات کا انہیں سخت افسوس ہے حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ اگر وہ تب بااختیار ہوتے تب بھی تو ان کی ایک نہ چلتی۔

وہ لاکھ دلائل دیں اپنے چچا حضور کو ان کے رائج کردہ اصولوں سے انچ برابر نہ ہٹا سکتے تھے۔ صاحبزادہ عمیص اپنے بہنوئی کی بے حسی پہ کڑھ کڑھ جاتے۔ بہن کی کسمپرسی پہ ان کا دل رو رو پڑتا۔ لیکن وہ کچھ نہ کرپاتے۔ بابر ہمایوں مغل سسر کی شہ پہ مزید چکنا گھڑا بن چکے تھے۔ چار بچوں کی کفالت کیسے ہوتی ہے‘ کون کرتا ہے اس بات سے سراسر بے نیاز بنے وہ اپنے نوابی شوق پورا کرنے میں مگن رہتے۔ کبوتر بازی‘ شطرنج وغیرہ وغیرہ کبھی کوئی اس بابت زیادہ زور دے بھی دیتا تو گھڑا گھڑایا بہانا ہر وقت موجود ہوتا کہ شایان شان ملازمت نہیں مل پارہی۔ اب بابر ہمایوں مغل‘ اعلیٰ نسب اور خاندانی وصف کا حامل سیلز مین تو نہیں بن سکتا‘ نہ ہی گیٹ کیپر کی نوکری کرسکتا ہے۔ اس قسم کی ملازمتیں سن کر صاحبزادہ نفیس علی خان گھبرا جاتے اور سختی سے انہیں ایسے شرمناک کاموں سے دور رہنے کی تنبیہہ کرتے ہوئے مہینہ بھر کا راشن بھتیجی کے گھر ڈلوا آتے۔

عمیص یہ سب دیکھتے اور کڑھتے رہتے ظاہر ہے دو وقت کی روٹی ہی تو سب سے اہم ضرورت نہیں ہوتی۔ بڑھتے ہوئے بچوں کی سو ضروریات تھیں اور سب سے ضروری عزت نفس تھی۔ جس کی محرومی کی پرچھائیاں آپا

بیگم کے چہرے پہ ہمہ وقت لرزتی رہتیں۔ وہ بھائی کی حیثیت سے خود کو سخت بے بس پاتے کہ بابر ہمایوں مغل کی طرح فی الحال ان کا اپنا روزگار بھی کوئی نہ تھا اور اس کی وجہ ان کی ذاتی کوتاہی نہ تھی۔ بلکہ چچا حضور کی سخت طبیعت آڑے آتی تھی۔ اتنا سرمایہ تو نہ تھا کہ کوئی ذاتی کاروبار شروع کیا جاتا۔ نہ ہی عمیص اتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرپائے تھے کہ ڈاکٹر انجینئر یا پھر سرکاری افسر لگ جاتے اور خاندانی نجابت ہر لحاظ سے محفوظ قرار پاتی۔ سادہ سے بی اے کے ساتھ فی زمانہ جو ملازمت مل سکتی تھی‘ وہ ضرور کرلیتے اگر چچا حضور کی دل آزاری کا خدشہ نہ ہوتا۔

دل سے تو وہ اس تفریق کے کٹر مخالف تھے۔ رزق حلال میں کیسی شرم اور کیسی بے عزتی‘ بے عزتی اور بے غیرتی تو یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے ہوئے بھی ”بیرونی امداد“ حاصل کی جائے۔ وہ تنفر سے اپنے بہنوئی کو دیکھتے اور سوچتے اور پھر یہ سوچ کر لرز جاتے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی سہی لیکن بہرحال وہ بھی ایسی ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور ان چاہی‘ ناپسندیدہ زندگی گزارنے کی کوفت نے انہیں گھر کے ماحول سے رفتہ رفتہ بیزار کرنا شروع کردیا۔ لڑکپن سے ہی وہ ان نوابی طور طریقوں سے الرجک تھے۔ لیکن ایک معمول کی طرح کاربند تھے اب جب یہ کڑے قوانین ان کی فطرت سے ٹکرانے لگے۔ انہیں بندش میں جکڑنے لگے تو وہ رسیاں تڑانے لگے

بس چچا حضور کی محبت تھی‘ لحاظ تھا‘ یا پھر۔ نجانے کیا تھا جو یہ باغیانہ روش کھل کے سامنے نہ آپارہی تھی۔ صرف ایک جھنجلاہٹ تھی جس کا اظہار وہ وقتاً ”فوقتاً“ کرتے رہتے تھے۔

ایسا نہ تھا کہ اس بیزار‘ کوفت بھری بے بس زندگی میں کوئی ٹھنڈا جھونکا نہ تھا۔ موتیا کی پرخلوص دوستی ایک بڑا مضبوط سہارا تھا اور گل مہر۔ وہ تو شاید ان کی زندگی کی سب سے واضح اور ٹھوس وجہ تھی۔ وہ نہیں جانتے کب اور کس طرح گل مہر کی محبت نے ان کے دل میں اپنی جڑیں پھیلائیں۔ وہ نہیں جانتے اور شاید گل مہر بھی نہیں جانتی۔ یا پھر جانتی ہے مگر انجان بنی رہتی ہے۔

صاحبزادی گل مہر خانم‘ نفیس علی خان اور حرمت النساء بیگم کی پہلی اولاد ہیں۔ جتنا لاڈ پیار اور ناز و نعم ان کے حصے میں آیا۔ حویلی کے کسی اور بچے کو نہ ملا۔ صورت ہی اتنی پیاری تھی کہ اپنے تو اپنے‘ انجان لوگ بھی دیکھ کر بے ساختہ پیار کر بیٹھتے۔ نہ صرف اپنے والدین بلکہ تایا حضور اور آپا بیگم کی بھی چہیتی رہی ہیں۔ عمیص تو خیر سدا کے دیوانے ہیں البتہ چھوٹی بہن الماس سے ذرا کم ہی بنتی ہے۔ وجہ دونوں کے مختلف مزاج ہیں۔ اگرچہ مزاج کے لحاظ سے تو صاحبزادہ عمیص بھی ان کے مخالف گروپ سے ہی کہلائے جاسکتے ہیں‘ لیکن رعب حسن اور عشق بیار زبان بندی پہ مجبور کرتا تھا اور گل مہر کی ان سے تھوڑی بہت نبھ ہی جاتی تھی جب کہ الماس خاتون کو ایسی کوئی مجبوری لاحق نہ تھی وہ بے دھڑک بڑی بہن کی لاپروا‘ خود پسند اور مغرور شخصیت پہ بے لاگ تبصرہ کرتی اور زیر عتاب آتی‘ کیونکہ گل مہر کی آنکھ میں آنسو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آتے ہی جلد تھے۔

سنا ہے جن آنکھوں میں آنسو جلدی آجائیں وہ لوگ حد درجہ حساس ہوتے ہیں۔ شاید ایسا ہی ہو لیکن عمیص کے معاملے میں صاحبزادی گل مہر اتنی بے حس کیوں تھیں؟ ہوسکتا ہے یہ لاعلمی ہی ہو یا پھر انتہا درجے کی معصومیت کہ وہ بے ساختہ جذبے لٹاتی آنکھوں والے عمیص کے دل کا حال نہ جان پاتی تھیں۔ اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے ناں کہ وہ سب سمجھ کے انجان بن جاتی ہوں۔ جو بھی تھا صاحبزادی گل مہر کے اندر کیا ہے‘ کوئی نہیں جانتا‘ کوئی جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا‘ باہر ہی اتنی بھرپور کشش ہے کہ کوئی یہاں سے دل چھڑائے تو اندر تک جھانکے۔

ہاں ایک صاحبزادی الماس خاتون عرف موتیا ہیں جنہیں بندے کے اندر تک اتر کر راز چرا لینے کا دعویٰ ہے۔ اس صلاحیت کے صاحبزادہ عمیص تو معترف ہوچکے ہیں کہ ان کے دل میں گل مہر کی موجودگی کی اطلاع خود انہیں بھی موتیا نے ہی دی تھی‘ لیکن وہ موتیا کے اس فتوی پہ ایمان لانے کو تیار نہ تھے کہ گل مہر کو اپنی ذات کے سوا نہ کسی اور میں دلچسپی ہے نہ ہی وہ خود اپنے سوا کسی اور کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ اس انجانے پن اور بے نیازی کو بھی دلبری کی اک ادا ہی جاننے پہ مصر تھے اور موتیا ہولے سے ہنس دیتی۔

نہ وہ اقرار کرتا ہے، نہ وہ انکار کرتا ہے
ہمیں پھر بھی گماں ہے وہ ہمیں سے پیار کرتا ہے

ہاں ایک بات اور تھی جو موتیا اور عمیص میں مشترک تھی اور وہ تھی شاعری کا ذوق' ایک دوسرے کو اچھے اچھے شعر سناتے اور اپنے اپنے مطالعے کا تبادلہ کرتے کرتے دونوں نے ایک بڑی خوبصورت سی عادت اپنالی تھی کہ اکثر و بیشتر شاعری کی زبان میں ہی گفتگو کرتے۔ گل مہر کے دماغ کے اوپر سے گزر جاتیں یہ ذو معنی مصرعہ بازیاں اور وہ چڑ کے دونوں کے درمیان سے اٹھ جاتی۔

صاحبزادی گل مہر اپنی بہن کو بے شک کم علم' محدود ذہنیت رکھنے والی' سگھڑ بی بی ٹائپ اور قدرے جھگڑالو سی سمجھتی ہوں' لیکن سچ تو یہ تھا کہ الماس اپنے نام کی طرح ہی شفاف اور بے داغ بیش قیمت جوہر تھی' بڑی بہن کی طرح ڈگریاں نہیں سمیٹ رکھی تھیں مگر شعور اس سے بڑھ کے رکھتی تھی۔ عمیص کے خیالات و نظریات سے وہ بھی متفق تھی' ابا حضور کے حد سے بڑے تکبرانہ اصولوں اور نوابی طمطراق سے خائف بھی تھی لیکن باغیانہ روش سے دور دور ہی رہا کرتی۔ سب کے دلوں کے اندر تک اتر کر راز چرا لینے کا دعویٰ کرنے والی صاحبزادی الماس خاتون کے اپنے دل کے اندر کیا تھا' یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس سے دوستی کا دم بھرنے والے عمیص بھی نہیں۔

● ● ●

"گل مہر۔۔۔۔
"گل مہر خانم
کہاں ہو بھئی۔۔۔۔ گل مہر" صاحبزادہ عمیص کی بے تاب صدائیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ مگر اس نے جواب دینے کی زحمت کیے بغیر چائے پینے کا شغل جاری رکھا' جانتی تھی کہ پکارتا ہوا آخر وہ یہاں تک چلا ہی آئے گا۔ موتیا نے ناگواری سے اس کی بے نیازی ملاحظہ کی اور پالک کے پتے ہاتھ سے رکھتے ہوئے کچن کے دروازے سے باہر جھانکا۔ وہ گل مہر کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پہ ہلکی سی دستک کے ساتھ اس کا نام پکار رہا تھا۔

"عمیص یہاں چلے آؤ۔" عمر کے چار پانچ برس کے وقفے کے باوجود وہ بچپن سے اس کا نام لینے کی عادی تھی۔ نہ کبھی گل مہر کے نام کے آگے آپا بجیا کا دم چھلا لگایا نہ اس کو بھیا یا بھائی جان کہہ کے پکارا۔ امی حضور اس کی زبان کی اس بے دھڑک۔ بے تکلفی سے بالا آخر مفاہمت کر ہی بیٹھیں ورنہ پہلے پہل خاصی کوشش کرتی رہیں اسے باادب باملاحظہ' ہوشیار ٹائپ "صاحبزادی" بنانے کی۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ صاحبزادی یاسمین کو آپا حضور کہہ کے پکار لیتی تھی۔

"گل مہر کا پتہ ہے' کہاں ہو گی' کیا آج جلدی چلی گئی ہے؟" ایک قدم باہر اور ایک قدم کچن کے اندر دھرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔ اپنی دھن میں وہ دروازے کے اس طرف رکی مختصر سی ٹیبل کے پاس بیٹھی ناشتا کرتی گل مہر کو دیکھ بھی نہیں پایا۔

"یہ رہیں آپ کی مطلوبہ چیز۔" موتیا نے چھری کی نوک سے اشارہ کیا۔ اور پھر سے پالک کاٹنے میں مگن ہو گئی۔ گل مہر نے اگرچہ اس کے "چیز" کہنے پہ بڑی کڑی نظروں سے گھورا تھا۔

عمیص سرد آہوں کے تڑکے کے ساتھ شعر نشر کرتا اس کے برابر کی کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔ موتیا نے اس کے برجستہ شعر پہ بے اختیار مسکراتے ہوئے نظر اٹھائی اور گل مہر کے چہرے کے تاثرات جانچنا چاہے۔۔۔۔ وہاں ہمیشہ کی طرح بیزاری تھی۔ ناگواری۔۔۔۔ اور اکتاہٹ۔۔۔۔

موتیا نے عمیص کو ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا اور پھر سے پالک کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"گل!" عمیص نے بات شروع کرنی چاہی کہ اس نے ٹوک دیا۔
"گل مہر" تصحیح کرتے ہوئے وہ نیپکن سے منہ تھپتھپانے لگی۔
"صاحبزادی گل مہر خانم۔۔۔۔" وہ برا مانے بغیر تقریباً" کورنش بجالایا۔
"کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ آج کل کن مصروفیات میں گم ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے کل رات ہی یاد آیا کہ یہ ایگزام جو پچھلے ہفتے ختم ہوئے ہیں' فائنل ایگزام تھے تو پھر اب بھی اتنی باقاعدگی کے ساتھ تم کہاں جاتی ہو؟۔"

"تم سے مطلب؟۔" اس نے ابرو چڑھا کے پوچھا' عمیص کو اپنا سوال لوٹائے جانا پسند تو نہ آیا لیکن حسب عادت اس نے ساری غلطی اپنے سر لیتے ہوئے سوچا کہ "شاید میرے پوچھنے کا انداز ہی غلط تھا۔"

"یار خدا خدا کر کے تو جان چھوٹی ہے تمہاری اس ٹف شیڈول سے۔ ریلیکس کرو' عیش کرو' فرصت بھرے یہ دن انجوائے کرو۔۔۔۔ کہاں گرمی میں خوار ہوتی پھر رہی ہو۔" اس نے اپنے استفسار کو الگ ڈھنگ سے بیان کیا۔

"یہ فرصتیں اور عیش تمہیں ہی مبارک ہوں۔ تم ہی انجوائے کرو یہ سدا بہار قسم کی فرصت۔" اس نے عمیص کی فراغت پہ چوٹ کی جسے محسوس تو عمیص کو کرنا چاہیے تھا لیکن دل پہ لیا موتیا نے۔ پالک کے پتوں سے بھرا تھال زمین پہ پٹخنے کے بعد وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور پاؤں کی ٹھوکر سے پیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی۔ عمیص اس کی جھنجلاہٹ کو حیرت سے دیکھنے لگا۔
"ہم آج کل کچھ اسپیشل کورسز کر رہے ہیں۔" گل مہر نے اطلاع دی۔
"کمپیوٹر سے متعلق؟" عمیص نے دریافت کیا۔
"ہاں۔۔۔۔ دراصل یہ فیلڈ ہی ایسی ہے۔ اس میں انٹرسٹ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کمپیوٹر تو ہمارا کریز بنتا جا رہا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ گھر پہ کمپیوٹر نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس فیلڈ میں کچھ زیادہ کر نہیں پا رہے ورنہ ارادہ تو کچھ کری ایٹو کام کرنے کا ہے۔ اب دو نئے کورسز اسٹارٹ کیے ہیں جن سے کری ایشن میں خاصی ہیلپ ملے گی۔ ہم نے تو دو ہی دن میں سارا کچھ پک کر لیا تھا لیکن پرابلم وہی ہے۔۔۔۔ کمپیوٹر کی عدم دستیابی اس لیے مجبوراً" پہلے انسٹیٹیوٹ اور پھر ایک دو گھنٹے مزنی کے گھر کام کرنا پڑتا ہے۔"

مزنی سے اس کی دوستی تین چار سال پرانی تھی' وہ اچھی خاصی فیملی سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کے باوجود گل مہر کی شاہانہ شخصیت' پروقار خوبصورتی اور اس خستہ حال مگر پرشکوہ حویلی سے مرعوب تھی۔ ابھی بھی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد گل مہر اسی کے انتظار میں تھی کہ وہی سالوں سے اسے پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ڈیوٹی سنبھال رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔" عمیص نے یونہی سر ہلا دیا' موتیا نے دیکھا کہ اس کی ساری توجہ چائے کے کپ پہ تھرکتی گل مہر کی موی انگلیوں پہ تھی۔ وہ خوب دبا دبا کے بہتے پانی کے نیچے پالک دھونے لگی۔
"پتہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ کمپیوٹر کی فیلڈ میں اتنا آگے جائیں۔۔۔۔

"یونہی مانگے تانگے کے کمپیوٹر پہ کام کر کر کے۔۔۔۔" موتیا جو بڑی دیر سے اس کی لن ترانیاں اور عمیص کی جی حضوری ضبط کر رہی تھی' پنگا لے بیٹھی۔
"واٹ ڈو یو مین بائے "مانگے تانگے۔" گل مہر تڑپ کے پلٹی۔
"تم جانتی ہو کہ ہم نے آج تک کسی سے مانگ کے کچھ استعمال نہیں کیا۔ انسٹیٹیوٹ کی فیس بھرتے ہیں اور مزنی کا کمپیوٹر ایک دو گھنٹے استعمال کرتے ہیں تو ساتھ میں اس کی ہیلپ بھی کرتے ہیں تم دونوں جانتے تو ہو وہ ہمیشہ سے ہی ہمارے بنائے نوٹس پہ پاس ہوتی رہی ہے لیکچرز کی لینگویج اس کے سر سے گزر جاتی ہے اسی لئے تو وہ

کمبائن اسٹڈی کے بہانے ہمیں ساتھ لے جاتی رہی ہے۔اب بھی اس کا وہی حال ہے انسٹی ٹیوٹ سے آنے کے بعد بھی جب تک ہم سب کچھ نئے سرے سے ایکسپلین نہ کریں اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔"

"اسی لئے تو تمہاری اس سے بنتی ہے' وہ بچاری کچھ "سمجھ" جو نہیں پاتی۔"

"کیا مطلب! "گل مہر موتیا کی بات تو نہ جانچ سکی لیکن اتنا اسے پتہ تھا کہ وہ اس پہ طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے

ان دونوں کو بے معنی سی بحث میں الجھتا پا کر عمیص جھنجھلا کر رہ گیا۔جتنا وہ گل مہر سے دیر تک ہمکلام ہونے کے بہانے ڈھونڈا کرتا اتنا ہی موتیا کی وہاں موجودگی رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے پیش پیش ہوتی۔اس وقت بھی اس نے دہائی دینے کے سے انداز میں گل مہر کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

"ایک تو تمہارے شعر۔" اس نے نزاکت سے اپنی ناک چڑھائی۔

"موقع بے موقع فضول سے شعر داغتے رہتے ہو' چاہے ان کا کوئی مطلب ہو یا نہ ہو۔۔۔۔۔"

"ہائے۔۔۔۔" وہ اپنے شعروں کا مطلب اس پہ واضح نہ کرسکنے کی ناکامی پہ دلبرداشتہ ہو کر تقریباً" ڈھیر ہی ہو گیا۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

"ہمیں آج تک سمجھ نہیں آیا کہ تمہاری رگ شاعری آخر ہمیں ہی دیکھ کے کیوں پھڑکتی ہے جبکہ تم جانتے ہو ہمیں اس صنف سے کم ہی دلچسپی ہے۔"

جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے
میں اس کی بزم میں اک حرف زیر لب بھی نہیں

"چہ۔۔۔۔ چہ۔۔۔۔ چہ۔۔۔۔چہ" اب کے موتیا نے عمیص کی طرف ایک شعر اچھالا اور اظہار افسوس کو طنزیہ سی مسکراہٹ میں لپیٹ کر ہمدردانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"بس۔۔۔۔ یہ ہے ناں تمہارے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لیے۔اسی کو سنایا کرو اپنا حاصل مطالعہ ۔۔۔ ہمارا دماغ مت خشک کرو۔ویسے بھی یہ شاعری وغیرہ وغیرہ سب بے کار اور فارغ لوگوں کا کام ہے۔" اس نے دوسری بار بے کاری کا طعنہ دیا۔اس بار تو موتیا کو عمیص کی بے حسی پہ تاؤ سا آگیا۔

"ہم پریکٹیکل انسان ہیں۔۔۔۔"

"چلو عمیص اور میں تو بے کار ٹھہرے لیکن آپ۔صاحبزادی گل مہر خانم آپ کے نازک شانے کون سا عظیم بار اٹھائے ہوئے ہیں۔کیا آپ بتانا پسند کریں گی" جواب میں وہ کندھے اچکا کے رہ گئی۔

"پریکٹیکل۔۔۔۔" موتیا ہنس پڑی۔"یعنی عملی۔۔۔۔ اور وہ کوئی انسان تبھی ہو سکتا ہے جب وہ عمل کرنے پہ آمادہ ہو جبکہ تم کتنی پریکٹیکل ہو اس کا اندازہ تو اسی سے ہو سکتا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے تم تیار بیٹھی مزنی کا انتظار کر رہی ہو۔وہ کب آئے اور تمہیں اپنی کار میں بٹھا کر لے جائے۔اگر وہ نہ آئی تو ظاہر ہے تم بھی نہ جاؤ گی۔پچھلے چار سالوں سے یہی ہو رہا ہے اور اس پہ بھی تمہیں پریکٹیکل ہونے کا دعویٰ ہے۔" وہ کام نمٹا کے اب اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔گل نے ٹیبل پہ رکھے اپنے سن گلاسز چڑھائے' فائل سمیٹتے ہوئے وہ اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔عمیص نے اس کی سائیڈ لیتے ہوئے کہا۔

"اب اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہم بھی بس بحث برائے بحث کی عادی ہوتی جا رہی ہو موتیا۔"

"تعلق کیوں نہیں؟ جو خود کہیں آنے جانے کے لئے کسی کی مدد کا محتاج ہو اسے دوسروں پہ بے کاری اور

نکھراہی کے طعنے نہیں کسنے چاہئیں۔جو سڑک پہ جا رکشہ رکوانے یا بس اسٹاپ پہ دوسرے عام افراد کی طرح ویگن کے انتظار میں کھڑے ہونے کو اپنی ہتک گردانے' اس کے منہ سے "پریکٹیکل" ہونے کا دعویٰ عجیب سا لگتا ہے۔"

"اگر ہم رکشہ یا ویگن میں آنا جانا پسند نہیں کرتے تو یہ ہمارا معاملہ ہے صاحبزادی الماس خاتون۔۔۔۔ آپ کو اس مسئلے پہ تجزیے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" چبا چبا کر اس نے "الماس خاتون" کہا تو موتیا کھڑی ہو گئی اور عمیص زور سے ہنس پڑا۔

"گل کے پاس اچھا ہتھیار ہے تمہیں چپ کرانے کا۔تمہیں اور کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں' فقط الماس خاتون کہہ دینا کافی ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی' چپ چاپ ان کے آگے سے چائے کے کپ اٹھانے لگی۔اس کی خاموشی نے گل کو شہ دی۔

"حالانکہ اچھا بھلا نام ہے۔"الماس" معنویت کے لحاظ سے بھی خاصا پر اثر ہے بلکہ ہمارے خیال میں موتیا پہ فٹ بھی بیٹھتا ہے' نجانے اسے اتنی چڑ کیوں ہے اس نام سے۔"

"میں چڑتی نہیں ہوں بس مجھے یہ تفریق پسند نہیں' آپا حضور کا نام یاسمین' تمہارا گل مہر میرا گلاب' کنول' سندس رکھ دیتے تو کیا تھا۔تم دونوں کے نام اتنے مہکتے مہکتے۔پھولوں جیسے اور میرے حصے میں کنکر پتھر"

"کنکر؟۔پتھر؟" عمیص حیرت سے گویا ہوا۔

"لڑکی۔۔۔۔ الماس تو ایک بیش قیمت پتھر ہے۔جس کے نصیب میں یہ گوہر ہو اسے اور کیا چاہیے۔"

"رنگ۔۔۔۔ مہک۔۔۔۔" وہ دھیرے سے بولی۔"رنگ اور مہک تو گل میں ہی ہوتی ہے۔"

"تم میں اپنے نام کی ساری کوالٹیز موجود ہیں۔"

"اور پھر یہ نام تو خاصا بارعب بھی ہے' پروقار سا۔" گل مہر نے بھی خلاف عادت اس کی ذات کے حوالے سے کسی چیز میں دلچسپی ظاہر کی۔گفتگو کا یہ رخ کچھ دیر قبل ہونے والی تلخ بحث کے اثرات زائل کر رہا تھا۔

"اور پھر تمہارے مشہور زمانہ لقب یا خطاب نے بھی کیا تمہیں مطمئن نہیں کیا۔؟ تم پھولوں کی شیدائی ہو تاں موتیا بھی تو پھول ہی ہے' اس کی مہک تو گلوں کو مات کرتی ہے۔" عمیص نے تسلی دی۔

"مہک۔۔۔۔ صرف مہک ہی ناں۔۔۔۔ رنگ تو نہیں۔۔۔۔ رنگ تو بس۔۔۔۔" وہ خالی خالی نظروں سے گل مہر کو تکنے لگی جو مزنی کا ہارن سن کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اب اپنا بیگ شولڈر پہ لٹکا کے نکلنے کی تیاری میں تھی۔

آف وائٹ جارجٹ کے سادہ سے شلوار قمیص پہ کہیں کہیں براؤن پھول کڑھے ہوئے تھے' براؤن بڑا سا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے اور کسی قسم کے میک اپ سے بے نیاز چہرے کے ساتھ وہ اس سادگی میں غضب کی حسین لگ رہی تھی۔سات رنگوں نے جیسے اس کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔۔۔۔ ڈارک براؤن گھنے بالوں کی چوٹی' گلابی آمیزش کے ساتھ میدہ رنگ والا چہرہ۔اور سبز سائے تلے ہلکی بھوری جھیل سی آنکھیں۔اس کی آنکھوں میں سبز اور بھورے رنگ کا ملاپ بڑا ہی انوکھا تھا اور بے جاندار سرخ حدت لیے ہوئے وہ کشادہ دار لب۔جن کی اوٹ سے کبھی کبھار دودھ جیسے دانت۔جھلک مار دیتے تو ان کی [illegible] سے کہیں بڑھ کے نمایاں ہو جاتی

"رنگ ہی رنگ۔۔۔۔" وہ فراخ دلی سے اپنی بہن کی خوبصورتی تسلیم کر گئی جو ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر نکل رہی تھی۔موتیا نے عمیص سے کچھ کہنے کی غرض سے اس کی طرف رخ بدلا تو وہیں کی وہیں رک گئی۔

وہ ساکت بیٹھا۔۔۔۔ کھڑکی سے اسے لان میں سے گزرتا دیکھ رہا تھا۔اس کی سیاہ آنکھوں سے جیسے روشنیاں دا ہو کر اس کے پیچھے جا رہی تھیں۔وہ بیرونی گیٹ تک پہنچی جس کے نزدیک مزنی کی گاڑی کھڑی تھی' عمیص کا غیر ارادی طور پہ ذرا سا اور اٹھ گیا' شاید اسے زیادہ غور سے دیکھنے کی غرض سے۔وہ بیٹھی۔اور چلی بھی گئی۔لیکن صاحبزادہ عمیص علی خان ٹکٹکی باندھے ایک سحر کے سے عالم میں وہیں تکتا رہا' گرد و پیش کو یکسر فراموش کیے۔۔۔۔ موتیا نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کیا اور خاموشی سے اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

یہ "لکی الیس" پروڈکشن ہاؤس کمپنی کے چیئرمین کا آفس تھا، جہاں جاسوسی ٹائپ رسالوں میں سنسنی خیز کہانیاں لکھنے والا ادھیڑ عمر مصنف اپنے نئے ڈرامے کے اسکرپٹ کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔

"شعیب صاحب آپ یقین کیجیے یہ سیریل لوگوں میں تہلکہ مچا دے گا۔ کھلبلی سی پیدا ہو جائے گی۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا سیریل ہوگا پاکستان میں۔"

"بھائی میرے اسی لیے تو میں ہچکچا رہا ہوں۔ اپنی نوعیت کی پہلی چیزوں کے ساتھ یہ پاکستانی عوام بڑا برا سلوک کرتی ہے۔ یہ نت نئے تجربے رہنے دیں آپ حق نواز صاحب اور کوئی ہلکا پھلکا رومانٹک سا اسکرپٹ لائیں۔ پچھلے دنوں آپ سے جس کہانی پہ بات چیت ہوئی تھی، میرا خیال ہے اسی کو شہزاد صاحب سے ڈسکس کرلیں۔ کیوں شہزاد صاحب آپ کیا کہتے ہیں؟" شعیب لکی الیس پروڈکشن کمپنی کے پیش کردہ کئی کامیاب پروگراموں کے ڈائریکٹر تھے اور کمپنی کے چیئرمین شہزاد کے خاصے سرچڑھے بھی۔ شہزاد نے کسی سوچ میں گم یونہی سر ہلا دیا۔ شعیب نذر اسی کو رضامندی جان کر مزید تمہید باندھنے لگے۔

"کہانی تو ٹھیک ٹھاک تھی حق نواز صاحب آپ کی۔ بس مسئلہ یہ تھا کہ کردار بے حد کم تھے اسی لحاظ سے گلیمر بھی کم ہی تھا۔ اگر آپ چند کرداروں کا اضافہ کردیں تو ہم اسی کہانی پہ سیریل کا سوچ سکتے ہیں، ورنہ یہ جو آپ سپرمین ٹائپ آئیڈیا لائے ہیں یہ تو ایک دم بوگس ہے۔"

"کردار بھرتی کرنے کے لیے تو ساری کہانی تبدیل کرنا پڑے گی۔" وہ متذبذب ہوئے۔

"مرکزی کردار بھلے وہی رہنے دیں۔ بس دو چار لڑکیوں کی گنجائش پیدا کردیں۔ ہیروئن کی کزن یا سہیلیاں وغیرہ یا پھر ایسا کریں آپ کی کہانی میں ہیرو آسٹریلیا سے آتا ہے، آپ اسے ڈائریکٹ آتا نہ دکھائیں۔ بلکہ چند قسطیں وہاں بھی بنا لیتے ہیں، کچھ ایسی سچویشن بنا دیں کہ وہاں آسٹریلیا میں اس کی ایک گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ اس کے دو فائدے ہوں گے ایک تو مین ہیروئن کے ساتھ ساتھ ہیروئن کے طور پہ ایک الٹرا ماڈرن لڑکی دکھانے کی گنجائش نکل آئے گی اور دوسرا آسٹریلیا میں شوٹ کرنے سے سیریل کی ویلیو اور بھی بڑھ جائے گی۔"

"نہیں نہیں شعیب صاحب" شہزاد نے بے زاری سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"یہ دو دو تین تین ہیروئنز بھر کے آپ خود کو ہرانے والی بات کر رہے ہیں۔ مانا کہ آپ کے پچھلے دونوں سیریلز ہٹ گئے ہیں اور فلمی ہیروئنز اور ٹاپ ماڈلز کو چھوٹی اسکرین پہ پیش کرنے کا تجربہ بھی کامیاب رہا ہے لیکن یہ بات نظرانداز مت کریں کہ ویوورز ایک ہی چیز کو آخر کب تک ریپیٹ ہوتا برداشت کر سکیں گے اور ایسی صورت میں کہ جب آپ کے دیکھا دیکھی تقریباً" ہر چینل پہ اسی قسم کے سیریل چل رہے ہیں۔ اب تو آپ کو کچھ نیا سوچنا چاہیے بالکل الگ نوعیت کا۔۔۔ جس کی وجہ سے ہمارا یہ سیریل تمام پرائیویٹ چینلز پہ چلنے والے پروگراموں سے منفرد نظر آئے۔"

چیئرمین کو تجربہ کرنے پہ آمادہ دیکھ کر حق نواز صاحب

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ایسے ہی تو اس کم عمری کے باوجود آپ کی کمپنی نے پروڈکشن کی دنیا میں اپنی دھاک نہیں بٹھا رکھی۔ آپ لکیر کے فقیر نہیں۔ مشکل سے مشکل کام میں ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ ہے آپ میں۔ جب ہر طرف کراچی کے اداکاروں اور ماڈلز کی مانگ تھی، ہر ٹی وی اسٹیشن سے چلنے والے پروگراموں میں انہیں بلایا جاتا تھا، آپ نے لاہور کے ان فلمی چہروں کو لینے کا رسک لیا جو فلمی اسکرین پہ اب دھندلانے لگے تھے۔ آپ نے ان کی فنی زندگی کو نئی تازگی دی۔ اب ہر طرف لاہور کے ان ہی اداکاروں کا راج ہے جن کی یکے بعد دیگرے کئی فلمیں فلاپ ہونے کے بعد لوگ انہیں شوبز سے کنارہ کشی کا مشورہ دے رہے تھے۔ آپ جیسے نئی سوچ کے حامل افراد ہی تو تجربہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

تقریباً" ہر ڈرامے میں خاندانی چپقلش، دوسری شادی اور طلاق جیسے موضوعات دہرائے جا رہے ہیں ایسے ہی یہ سائنس فکشن تھرلر لوگوں کی بھرپور توجہ حاصل کرلے گا۔" وہ اپنے مافوق الفطرت اسکرپٹ کو معرکتہ الآرا ثابت کرنے پہ تلے بیٹھے تھے۔ شہزاد نے تائید طلب نگاہوں سے اپنی کمپنی کے تجربہ کار اور قابل اعتماد ہدایت کار کو دیکھا وہ ہنوز انکاری کیفیت میں سر ہلا رہے تھے۔

"نہ جی۔۔۔ خاک توجہ حاصل کرے گی بلکہ میں تو کہتا ہوں آپ کی ساری ساکھ برباد ہو جائے گی، مٹی پلید ہو کے رہ جائے گی۔ آج کے دور میں جب دنیا اتنی آگے نکل گئی ہے ایسی الف لیلیٰ کہانیاں کہاں متاثر کریں گی لوگوں کو، کسی سے ہضم نہ ہوگا آپ کے ہیرو کو ہوا میں اڑتا دیکھنا، نگاہوں کی مقناطیسیت سے کرشمے دکھلانا وغیرہ وغیرہ۔"

"کیوں نہ ہضم ہوگا۔۔۔" حق نواز جوش میں آگئے۔ "مانتا ہوں کہ دنیا بہت آگے جا چکی ہے لیکن فینٹسی میں دنیا کی دلچسپی جوں کی توں برقرار ہے یہی وجہ ہے کہ امریکہ تک میں جہاں زندگی اس قدر پریکٹیکل ہے، آج بھی ٹاپ رینکنگ میں اسپائیڈرمین اور اسپائی کڈز جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہم ہالی ووڈ کو فلمسازی کا استاد تسلیم کرتے ہیں پھر وہاں سے سبق کیوں نہیں حاصل کرتے۔ وہاں ہر طرح کی فلمیں بنتی ہیں اور چلتی ہیں، سمپل زندگی کے حقائق سے قریب تر فلمیں بھی اور ٹائم مشین، لیتھل ڈاٹ کام اور سائنز جیسی مافوق الفطرت بھی۔"

"وہ ہالی ووڈ ہے جی اور یہ لالی ووڈ۔ ہماری عوام تجربوں کی متحمل نہیں ہو سکتی یہاں بچوں کے لیے عینک والا جن تو بن سکتا ہے لیکن اتنے بڑے اسکیل پہ کروڑوں کا سرمایہ لگا کر ہم یہ آپ کا "شیر دل" پیش نہیں کر سکتے۔ یہاں ایسی چیزیں نہیں چل سکتیں۔"

"کیسے نہیں چل سکتیں۔ ہالی ووڈ کی فلمیں یہاں بھی چلتی ہیں اور خوب چلتی ہیں۔"

ان کے پرزور دلائل پہ شعیب نذر بڑبڑا کے رہ گئے اور شہزاد نے اپنی الجھن بھری خاموشی توڑتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو یہ طے ہے کہ "لکی الیس" کی نیکسٹ پروڈکشن "شیر دل" ہوگی۔ حق نواز صاحب کے پوائنٹس میں خاصا دم ہے اور آپ سب جانتے ہیں کہ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ یہ کمپنی صرف کامیاب ہی نہیں بلکہ ٹرینڈ سیٹر بھی کہلائے جہاں تک شعیب صاحب کا یہ کہنا ہے کہ سائنس فکشن پہ پاکستان میں اب تک بننے والے سیریلز اور فلمیں ناکام رہی ہیں تو اس کی وجہ ان کا بھونڈے طریقے سے کم سرمائے میں اور ناتجربہ کار افراد کے ہاتھوں بننا ہے۔ میری کمپنی کی ساکھ ایسی تو ہے کہ میں اس سیریل کے لیے تگڑے سے تگڑا فنانسر ڈھونڈ نکالوں گا اور حق نواز صاحب کے قلم کی طاقت پہ بھی مجھے کم بھروسہ نہیں، ان کے ایسے ہی کتنے تھرلر ناول مقبول ہو چکے ہیں اور شعیب صاحب آپ۔۔۔ اگر آپ خود کو اس کی ہدایت کاری کے لیے اہل پاتے ہیں تو ہامی بھریے میں اس ملک کے سب سے بہترین سینماگرافر، آرٹ ڈائریکٹر، ٹیکنیشنز اور کمپیوٹر گرافکس ایکسپرٹس کو آپ کی ٹیم میں شامل کردوں گا۔ ہم "شیر دل" کو بچکانہ انداز میں نہیں بلکہ جدید تر سہولتوں کو استعمال کرتے ہوئے نئی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کر کے پیش کریں گے۔"

شہزاد کو "شیر دل" بنانے پہ تلے دیکھ کر شعیب نذر کا سارا اختلاف جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اس بڑے پروجیکٹ کو اپنے ہاتھ سے کیسے جانے دیتے۔

"اگر آپ کہہ رہے ہیں تو بھلا مجھے ہامی بھرنے میں تامل کیوں ہو۔ میرا تجربہ اپنی جگہ اور آپ کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی اپنی جگہ میں تو کہتا ہوں شہزاد صاحب، عوام کی نبض پہ ہاتھ ہے آپ کا۔ اگر آپ کے خیال میں "شیر دل" ایک سودمند تجربہ ہے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ جس پروجیکٹ میں آپ بذات خود اتنی بھرپور توجہ دیں، اس کے شاہکار بننے میں پھر کونسی کسر باقی رہ جاتی ہے۔" خوشامد اور چاپلوسی کے تمام تر تقاضے پورے کیے گئے، شہزاد کے سنجیدہ چہرے پہ ہلکی ہلکی تمازت پیدا ہوئی، اس نے جلد ہی خود پہ قابو

پا کر پھر سے مدبرانہ انداز میں مصنف کو مخاطب کیا۔
"کاسٹ کے بارے میں تو آپ نے کچھ سوچ رکھا ہوگا۔"
شعیب کو اپنے سارے توصیفی کلمات ضائع ہوتے دکھائی دیئے۔ انہیں چیئرمین کا ایک مجہول سے رائٹر کو اتنا سر چڑھانا پسند نہ آیا۔
"ان سے کیا پوچھنا سر' ان کی ساری توجہ تو آپ اسکرپٹ تک ہی رہنے دیں۔ اس سر کھپائی کیلئے خاکسار جو موجود ہے۔ ویسے بھی اصولی طور پر یہ شعبہ مکمل طور پر ڈائریکٹر کے ہاتھ ہوتا ہے۔ ہدایت کار سے زیادہ کون اچھا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس کردار کیلئے کون سا اداکار موزوں ہے۔ میری رائے میں ٹی وی کا کوئی مخصوص اداکار لینے کے بجائے ہم فلم سے کوئی بندہ لے لیتے ہیں۔ دیکھیں ناں۔ جی ٹی وی کے منجھے ہوئے اداکار اس کردار میں سوٹ نہیں کریں گے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں سے انکار نہیں مگر پرسنالیٹی بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ سارے ہی پکی عمروں والے اور ڈھلکے جسموں والے ہیں۔ جو چند نئے لونڈے ہیں تو دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہیں مگر ٹیلنٹ ــــــ نہ جی نہ ــــ اتنے بڑے سیریل کا بوجھ کسی نئے لڑکے کے کاندھوں پہ ڈالنا بے وقوفی ہے۔"
حق نواز کے اعتراض پہ شعیب کا بمشکل ٹھیک ہوتا موڈ پھر سے بگڑ گیا۔ شہزاد نے ماحول کو قابو میں رکھنے کے لیے مفاہمانہ رویہ اختیار کیا۔
"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ لیکن شعیب صاحب کا نقطہ نظر اپنی جگہ درست ہے۔ ان کی نظر کیمرے کی نگاہ ہے واقعی یہ دھان پان سے لڑکے اس کردار کے تقاضے نبھا نہ سکیں گے۔ شعیب صاحب اور حل بتائیں میں ایسا کوئی چہرہ نہیں لانا چاہتا جسے پہلے عوام تمس بار خان کے رول میں بھگت چکے ہوں۔ یہ کردار فلمی ہیروز کے لیے نئی بات نہیں وہ کم و بیش ایسے ہی کارنامے فلموں میں دہراتے رہتے ہیں البتہ چھوٹی اسکرین کے لیے یہ نیا تجربہ ہے اور اس نئے تجربے کو میں آزمودہ چہروں کے روپ میں پیش نہیں کرنا چاہتا۔"
"پھر تو ایک ہی حل ہے ــــ نئی دریافت ــــ اور یہ کتنا مشکل ہے آپ بھی جانتے ہیں لڑکیاں تو پھر بھی مل جاتی ہیں۔ لڑکے بہت مشکل سے ملتے ہیں اور وہ بھی اچھے ــــ صلاحیتوں والے لڑکے نری دردسری ہے' اشتہار چھپوانا' انٹرویو لینا' اسکرین ٹیسٹ اور پھر ریہرسلز' پبلسٹی پہ الگ وقت برباد ہوگا' ظاہر ہے عوام کو اس نئے چہرے سے آشنا کرنے میں بھی تو وقت لگے گا۔"
"کیوں نہ ہم کوئی میل ماڈل تلاشیں۔ عرصے سے کسی میل ماڈل کو بھرپور چانس نہیں ملا۔ یہ کام قدرے آسان ہے۔ اخباری اشتہاروں' اسکرین ٹیسٹ سے تو نجات ملے گی۔ بس چند اچھی شہرت والی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ کسی ایسے ماڈل کا انتخاب مشکل مرحلہ نہیں جو دراز قد' وجیہہ بھی ہو' کیمرہ فیس بھی کر چکا ہو' ممکن ہے کسی ویڈیو میں کام بھی کر چکا ہو ــــ عوام کے لیے وہ چہرہ کچھ کچھ جانا پہچانا بھی ہوگا اور کچھ کچھ انجانا سا بھی ــــ"
شہزاد کی تجویز پہ مصنف اور ہدایت کار دونوں متفق ہوگئے۔ اس نے سکون بھرا سانس لیا۔
"باقی کی کاسٹ تو ظاہر ہے بدلتی رہے گی کیونکہ یہ سیریل سیریز نما ہے۔ چند اقساط کے بعد کہانی کا ٹریک بدل جایا کرے گا۔ نئے کردار نئے واقعات اور آف کورس نئے ایکٹرز ــــ"
"بالکل درست کہا حق نواز صاحب آپ نے۔ شعیب صاحب ہماری کمپنی ہر سال نئے ٹیلنٹ کو چانس دینے کے لیے ایکٹنگ کمپی ٹیشن کراتی ہے۔ یہاں کوئی مانا ہوا انسٹی ٹیوٹ تو ہے نہیں جو ہم جا کر چھانٹی کرلیں۔ اس لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوا ہے۔ پچھلے سال الحمرا میں ورائٹی پروگرام کے ساتھ جو کمپی ٹیشن کرایا تھا' اس میں حصہ لینے والے چھ لڑکوں اور دو لڑکیوں کو کئی پروگرامز میں بریک ملا۔ اس سال ہونے والے پروگرام کی ویڈیو ریکارڈنگ آپ دیکھیں۔ تمام لڑکے لڑکیوں کی فائل یہاں موجود ہے۔ جب جب کسی نئے اداکار کی ضرورت ہو

آزما لیں ــــ ان نئے لڑکے لڑکیوں کو چھوٹے موٹے رولز دینے کے دو فائدے ہیں لمبے عرصے تک چلنے والی سیریز میں کوئی اداکار دہرانا نہیں پڑتا اور دوسرا یہ کہ شوق کے مارے یہ بغیر معاوضے کے بھی کام کرنے پہ تیار ہوتے ہیں۔ رہے لیڈنگ رولز تو ان کے لیے آپ جہاں تک ہوسکے' منجھے ہوئے اور بڑے نام والے اداکاروں کو سائن کریں تاکہ ڈرامے کی ویلیو بڑھ سکے۔"
"اس میں جو ہیروئن کا کردار ہے شہزاد صاحب' وہ ایک گلوکارہ ہے کیوں نہ ہم ایسی لڑکی لیں جو واقعی گلوکارہ ہو' کم عمر ہو' حسین ہو' معصوم ہو اور اداکارانہ صلاحیتیں بھی رکھتی ہو۔" شعیب صاحب نے ذرا جھجکتے ہوئے نکتہ اٹھایا۔ صاف لگ رہا تھا کسی کی سفارش کے لیے تمہید باندھی جارہی ہے۔ لیکن حق نواز صاحب نے انجان بنتے ہوئے کہا۔
"ایسی گلوکارہ جو کم عمر بھی ہو' حسین بھی اور معصوم بھی؟ مجھے تو اس انڈسٹری میں ایسی کوئی گلوکارہ نظر نہیں آتی' اگر کم عمر ہے تو حسین نہیں ہے۔"
شہزاد نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے تائید بھری مسکراہٹ سے ڈائریکٹر کو دیکھا۔
"ہیرو کے لیے سر نے جو حلیہ پیش کیا تھا وہ میرے دل کو بہت بھایا یعنی ایسا چہرہ جو پبلک کے لیے کچھ کچھ جانا پہچانا بھی ہو اور کچھ انجانا سا بھی۔ ایسی ہی ایک نئی گلوکارہ ہے' ابھی تک اس کی نہ تو کوئی کیسٹ ریلیز ہوئی ہے نہ ہی کوئی گانا ہٹ ہوا ہے بلکہ ویڈیو تک نہیں بنا۔"
"تو کیا کوئی باتھ روم سنگر ہے؟" حق نواز نے مضحکہ اڑایا۔
"ٹی وی پہ ایک پروگرام نشر ہوا تھا اس میں ایک دو نئی آوازوں کو بھی موقع دیا گیا' انہی دو لڑکیوں میں سے ایک نے مجھے چونکا دیا۔ اپنی آواز سے اس نے سماں باندھ دیا تھا۔ شکل و صورت بھی لاکھوں میں تھی میری نظر نے اس کے اندر چھپی ایک بڑی فنکارہ کو بھانپ لیا تھا۔ آپ نے پہلے بھی مجھ پہ اعتماد کیا تھا' ایک بار اور کر کے دیکھیں۔ اس لڑکی نے تہلکہ نہ مچا دیا تو میرا نام بدل دینا۔" ان کے جوش سے متاثر ہو کر شہزاد نے کافی کا سپ لیتے ہوئے اس کا نام دریافت کیا۔
"ادا ــــ"
"ادا ــــ ادا ــــ" شہزاد کے لبوں سے سرسراتا ہوا یہ نام ادا ہوا۔ کافی کا مگ لبوں تک لے جاتے لے جاتے وہیں رک گیا۔
"جیسا نام ویسی شخصیت ــــ آپ دیکھیں تو فدا ہی ہو جائیں۔ جو حالت میری ہوئی۔ وہی اسے اسکرین پر دیکھ کے پبلک کی ہو جائے گی۔ اب تو ٹی وی کی سنسر پالیسی بھی خاصی کھلی ڈلی ہے۔ یہ سیریز تو پرائیویٹ چینل پر چلنے والا ہے اس لئے اور بھی موقع ملے گا حسن کے اس شاہکار کو مزید قاتل بنا کے پیش کرنے کا۔ ایمان سے کیا پرسوز آواز ہے' کیا نشیلی نگاہیں ہیں' کیا لچکدار بدن ہے' کیا نازک کمر ہے' کیا نشیب و فراز ہیں اس کلیوں سے سراپے میں' سر سے پیر تک مدہوش جوانی ہے سرخی ــــ مے سے بھری ہوئی صراحی' دیکھتے ہی دل چاہتا ہے بندے کا کہ ایک ہی گھونٹ میں خالی کردو۔"
شہزاد کی انگلیوں کی گرفت مگ پہ اور مضبوط ہوگئی۔ سختی سے بھینچے لب کچھ اور بھی زیادہ ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے' انگلیوں کی پوروں اور لبوں کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس کی حالت سے بے خبر شعیب نذر بدستور ادا کے حسن کا قصیدہ پڑھنے میں مگن تھے اب تو حق نواز بھی دلچسپی سے وہیں متوجہ تھے۔
"ورنہ آج کل تو حسن بے جان سا ہے جیسے بوتیک پہ کھڑے خوش رنگ و خوش شکل پتلے' لیکن اس لڑکی میں بات ہے وہ کسی کو بھی دیوانہ بنانے کے لیے کافی ہے' میں کہتا ہوں پہلی قسط میں ہی دیکھنے والے لٹ جائیں گے' ان کی نیندیں اڑ جائیں گی' ڈیزائنر سے کہہ کر خاص ایسے لباس تیار کروائیں گے کہ صاف چھپتے بھی نہیں'

سامنے آتے بھی نہیں والی بے قراری طاری ہو جائے گی نوجوان لڑکوں میں' سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ گانے بجانے والے خاندان سے ہونے کے باوجود ناچنے والی لگتی نہیں۔ ایسی ــــــ"

"ول یو پلیز شٹ اپ ــــــ" اچانک شہزاد کی دھاڑ نے سکتہ طاری کر دیا۔ شعیب الجھے انداز میں شہزاد کی سرخ پڑتی رنگت دیکھنے لگے۔

"بند کیجیے یہ فضول بکواس میں نے آپ کو بحیثیت ایک ہدایت کار کچھ زیادہ سر چڑھا لیا ہے۔ آئندہ اپنی اوقات میں رہیے۔ آپ "لکی ایس پروڈکشن کمپنی" کے چیئرمین کے آفس میں بیٹھے ہیں"

"جی ــــ آپ ــــ آپ زیادتی کر رہے ہیں سر ــــ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو آپ میری بزرگی کا بھی لحاظ نہیں کر رہے اور ــــ"

"آپ فی الحال میرے کمرے سے تشریف لے جائیے اپنی اس بزرگی سمیت۔ اس وقت میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

شہزاد نے ایک بار پھر بات کاٹتے ہوئے دائیں ہاتھ سے آفس کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جسے بھانپتے ہوئے شعیب نذر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے' خشمگیں نگاہوں سے دونوں کو باری باری گھورتے ہوئے لمبے لمبے قدم اٹھاتے آفس سے نکل گئے۔

شہزاد چیئر کی بیک سے سر لگا کر گہرے گہرے سانس بھرتا اپنے مزاج کو معمول پہ لانے کی کوشش کرنے لگا۔ حق نواز صاحب جن کی ان ڈائریکٹر سے ویسے بھی خاص بنتی نہ تھی مزید پھیل کے بیٹھ گئے۔

"یہ فلمی بندے کچھ بھی کر لیں اپنی خو بو نہیں بدل سکتے۔ فلموں میں لگاتار ناکام ہونے کے بعد ٹی وی لائن میں آ تو جاتے ہیں لیکن ایڈجسٹ نہیں ہو پاتے ظاہر ہے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ٹی وی میڈیا میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب زیادہ ہے۔ اچھے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں کام کرتے ہیں لیکن ساری عمر گجروں' پہلوانوں' بدمعاشوں کی چمچہ گیری کر کے اور طبلہ پیٹنے والوں' گھنگھرو چھنکانے والیوں سے چاپلوسی کروانے کے بعد جب یہ ہمارے آپ جیسے شریف پڑھے لکھے لوگوں میں آتے ہیں تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں پھر یہ ہائی کلاس ماڈل گرلز انہیں کہاں منہ لگاتی ہیں؟ ٹھرکی پن کی لت پوری نہیں ہوتی تو پھر سے اٹھا لاتے ہیں گانے بجانے والیاں۔ ان کا گزارہ نہیں طوائفوں کے بغیر۔

وہ فلمی ایکسٹرا لڑکیاں جنہیں فلموں میں کوئی ہیروئن کی سہیلی یا ہیرو کی بہن کا کردار بھی سو سو شرطوں کے بعد دیتا ہے' ان کی فیورٹ ہیں' ٹی وی کی سپر اسٹار بنانے پہ تلے بیٹھے ہیں۔ اب یہی دیکھیے' نجانے کون ہے یہ ادا جس نے اپنی زلفوں کا اسیر بنا کے آپ کے ہدایت کار صاحب کو اپنا ــــ بنا رکھا ہے۔"

"بکواس بند کرو حرام ــــــ" شہزاد کی گالیوں کا طوفان سا نکلا۔ حق نواز صاحب بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے کاغذات سمیٹتے الٹے قدموں باہر بھاگے شہزاد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے خود کو ٹیبل پہ گرا لیا۔

☼ ☼ ☼

"کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ حرمت النساء؟"

صاحبزادہ نفیس علی خان نے قہوے کا کپ تھامنے کے بعد سامنے کھڑی بیگم کو تذبذب کے عالم میں دیکھ کر بھانپ لیا کہ ہو نہ ہو وہ کچھ کہنے کے لیے ہمت مجتمع کر رہی ہیں۔

"جی وہ ہم آپ سے صاحبزادی یاسمین کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔" وہ حوصلہ پا کر قریب ہی رکھی تپائی پہ بیٹھ گئیں۔

"صاحبزادی یاسمین ــــ؟ کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟" وہ چونکے۔

"یہی تو علم نہیں' ہمارا مطلب ہے کہ عرصہ ہوا صاحبزادی کی تشریف آوری میکے نہیں ہوئی۔ آپ کو گئے بھی ماہ

سے اوپر ہو گیا۔ ان کی اور بچوں کی خیر خبر یا تو آپ کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہے یا پھر اگر وہ خود کبھی بھولے بھٹکے چکر لگا لیں تو ــــ دل میں عجیب وسوسے سے اٹھ رہے ہیں پہلے تو ماہ ڈیڑھ ماہ بعد آ جایا کرتی تھیں اس بار کچھ زیادہ ہی دن ہو گئے۔"

"اس میں وسوسہ پیدا کرنے والی کیا بات ہے حرمت النساء' شرفاء کی بیٹیوں کے یہی اطوار ہوا کرتے ہیں۔ بھاگ بھاگ کے میکے نہیں آیا کرتیں ہماری پھپھیاں' خالائیں سالوں بعد پالکی میں بیٹھتی تھیں' میکے والے خود ہی سال بعد مل آیا کرتے تھے اب تو وقت خاصا تبدیل ہو گیا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کئی گھرانوں میں بیٹیاں شادی کے بعد بھی سسرال سے زیادہ میکے میں وقت گزارا کرتی ہیں۔ خدا ہدایت دے ان کے عاقبت نااندیش والدین کو۔ ہماری صاحبزادی نے اپنا رکھ رکھاؤ برقرار رکھا ہوا ہے تو غنیمت جانیے۔"

"آپ کا کہنا درست ہم مانتے ہیں' صاحبزادی کا سسرال بھی وضع دار اور طریقے سلیقے والا ہے۔ بابر میاں بڑے اصول پرست انسان ہیں۔ بیوی کا بلاوجہ گھر سے باہر رہنا پسند نہیں کرتے لیکن دل کا کیا کیجیے' بیٹیوں کی جانب سے دھڑکے تو لگے رہتے ہیں اور پھر ایسی صورت میں جب بیٹی کے حالات بھی کچھ ــــ ہمارا مطلب ہے آپ سے کچھ ڈھکا چھپا تو نہیں ہے۔ وہ سسرال سے الگ رہتی ہیں' مالی حالت بھی دگرگوں ہے' ایسے میں اگر ہم بھی چشم پوشی اختیار کیے رکھیں تو کون پوچھے گا۔"

"چشم پوشی؟ کیا ہم نے چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے؟" وہ گرم ہو گئے۔

"واللہ ہم نے بھائی میاں کی اور اپنی اولاد میں بالکل فرق نہیں سمجھا اور صاحبزادی یاسمین کو ہم نے ہمیشہ اپنی بڑی صاحبزادی سمجھا ہے۔ جتنا ہم سے ہو سکتا ہے ہم کرتے ہیں۔ منشی سے حساب کرنے کے بعد جب ہم ہر ماہ گھر کے لیے سودا اور اناج خریدتے ہیں تو باقاعدگی سے گھی کا ایک کنستر' آٹے کی بوری اور چاول دالوں' چینی کی تھیلیوں کے ساتھ ساتھ موسمی پھلوں کی پیٹی بھی خود جا کر وہاں دے آتے ہیں۔"

"جی جی ہم جانتے ہیں۔ برسوں سے آپ کا یہی معمول ہے۔ لیکن نواب حضور ــــ زندگی کی اور بھی کئی ضروریات ہوتی ہیں آٹے گھی کے علاوہ اور وہ بھی چار چار بچوں کے ساتھ۔ بڑی صاحبزادی دلکش بابر تو قد بھی نکال رہی ہیں لیکن یاسمین تو بچوں کے تعلیمی اخراجات ہی اس قدر مشکل سے پورے کر پاتی ہیں ایسے میں بچی کے لیے کچھ بنا کر رکھنا تو بہت دشوار ہے۔"

"ہوں ــــ یہ مسائل تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں آپ ماں بن کر سوچتی ہیں' صاحبزادی یاسمین کے مسائل و مشکلات آپ کو افسردہ کر دیتے ہیں لیکن حقیقت پسندی سے کام لیجیے۔ آپ کا بیاہ ان کی بہ نسبت کہیں زیادہ کم عمری میں ہوا تھا۔ اور آپ کو تو میکے کی پشت پناہی بھی حاصل نہ تھی۔ اور ہم بھولے نہیں کہ کیا کیا مشکل دور گزار چکی ہیں آپ عملی زندگی کا آغاز کرنے۔ مرد ہو یا عورت سب کو وقت کے تند و تیز تھپیڑے کھانے ہی پڑتے ہیں۔ خدا کا کرم ہے کہ ہم نے اس سفید پوشی کا بھرم قائم رکھا اور کسی نہ کسی طرح ہاتھ پیر مارتے ہوئے زندگی کی گاڑی گھسیٹتے ہی رہے۔ بیٹی کے متعلق اتنا تردد ٹھیک نہیں گزار لیں گی وہ بھی یہ کٹھن دور۔" انہوں نے تسلی دینا چاہی لیکن بیگم حرمت النساء انہیں شکوہ کناں نظروں سے دیکھ کے رہ گئیں۔

"نواب حضور' ہمیں بھی یاد ہے بھائی حضور کی بیماری کے دنوں میں بڑے مشکل دن رات گزرے تھے اور اس سے بھی پہلے ابا حضور کی وفات کے بعد جو باغات کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا اور کئی ماہ تک منشی کے ہاتھ سے رقم لے کر جوں کی توں آپ وکیل کو تھما آتے تھے لیکن آپ کیوں بھول رہے ہیں اس کٹھن دور میں آپ ہمارے ساتھ تھے۔ محض قناعت اور صبر کے سہارے ہی یہ وقت نہیں کاٹا بلکہ ہمارے دل پہ تسلی بھرا ہاتھ رکھنے والے آپ تھے۔ ہم سکون کی نیند سوتے تھے۔ جانتے ہوئے کہ آپ کے ہوتے کم از کم اس حویلی میں فاقہ نہیں ہو سکتا لیکن صاحبزادی یاسمین ــــ انہیں یہ سہارا بھی نہیں' بابر میاں کا مزاج اب ہم بخوبی بھانپ گئے ہیں۔ انہیں گھر اور

بچوں کی چنداں پرواہ نہیں بس اپنے ہی کھیل تماشوں میں۔۔۔۔۔۔"

"بس۔۔۔ بس بیگم۔" صاحبزادہ نے ہاتھ اٹھا کے انہیں مزید بولنے سے باز رکھا۔

"آپ نواب گھرانے کے داماد کے متعلق بات کر رہی ہیں' احتیاط ملحوظ رکھیے۔ اللہ بخشے چچا حضور کے سوا ہمارا تھا ہی کون' ہم کو دودوں کھلایا تھا ہمیں لیکن آپ کو اور بھابھی آپا کو بیاہنے کے بعد خود میں اور ہم میں خود بخود ایک حد قائم کرلی۔ ہمارے والد کی جگہ تھے چچا حضور لیکن ہمیں دامادوں والی تعظیم دیتے رہے ہم بھی اسی اعلیٰ نسب چچا کے زیر سایہ پلے ہیں۔ کیسے اپنی اقدار کو ملیا میٹ کرتے ہوئے کھڑدلوں کی طرح داماد سے جواب طلبی کرنے کھڑے ہو جائیں۔

وہ بھی کیا کریں' ناز و نعم میں پلے بڑھے ہیں' ذرا احساس ذمہ داری کا فقدان ہے لیکن شکرانہ ادا کیا کیجئے کہ آج کے دور میں ایسا نجیب الطرفین سمدھیانہ نصیب ہوا ہے' بھلے سے روکھی سوکھی کھا رہے ہیں' عزت اور وقار کے ساتھ سربلند تو ہے۔ کوئی ہمیں آکر طعنے تو نہیں دے رہا کہ صاحبزادہ احمد علی خان کی نواسی کا شوہر اور صاحبزادہ نفیس علی خان کا داماد ورکشاپ میں کسی گاڑی کے نیچے منہ کالا کر رہا ہے یا پھر کمی کمینوں کی سائیکلوں کے پنکچر لگا رہا ہے۔ یہ برابر والے خواجہ صاحب بڑے اتراتے پھر رہے ہیں داماد کو شارجہ بھجوا کر لیکن اڑتی اڑتی سنی ہے کہ وہ وہاں قلعی گری کرنے کا کام کرتے ہیں' اس سب کی پرواہ ہی نہیں خواجہ صاحب کو بس بیٹی کو زیور لادے دیکھ اور نواسوں کو اونچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتا دیکھ نہال ہوتے رہتے ہیں۔ ہم کیسے اس سطح پہ اتر آئیں ہمارے لیے تو مرنے کا مقام ہوتا اگر خدا نخواستہ ایسا داماد ہمارا مقدر ہوتا۔ شکر ہے بابر میاں کا مزاج ہم سے میل کھاتا ہے وہ بھی متانت سے وقت بدلنے کے انتظار میں ہیں۔ ادھر ادھر ہاتھ مار کے روٹی تو فقیر بھی لے آتے ہیں اور کتے بھی۔" ان کے بلند لہجے میں اتنا کروفر تھا کہ بیگم حرمت النساء ہول کی رہ گئیں۔

"فقیر۔۔۔۔۔ فقیر بھی کم از کم اتنی مشقت تو کر لیتے ہیں کہ در در پھر کے صدائیں دیتے ہیں جبکہ ہمارے یہ داماد۔۔۔۔۔۔ یہ اصول پرست اور نجیب الطرفین داماد بابر ہمایوں مغل صاحب تو اس فقیر سے بھی بدتر ہیں۔ انہیں تو گھر بیٹھے امداد چاہیے۔ اگر جو سسر صاحب مہینے ہزار ڈیڑھ کا سودا نہ ڈلوا دیں تو کہاں سے کھائیں گے چپڑی روٹیاں۔"

باہر سے آتے عمیص کے کانوں میں چچا حضور کی گفتگو کا اختتامی حصہ پہنچا تو وہ محض سوچ کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بالو' بالو۔۔۔۔۔ کدر کونے میں گھسی رہتی ہے تو' کب سے آوازیں مار رہا ہوں۔"

کرم الٰہی نے بلغمی آواز میں چلاتے ہوئے کہا تو بھاری ڈیل ڈول سنبھالتی بلقیس سیڑھیاں اترتی نظر آئی۔

"آ گئی ہوں کرمے' آ گئی ہوں' ذرا چین نہیں تجھے' ذرا آنکھ سے اوجھل ہوتی ہوں' چلا چلا کے گھر سر پہ اٹھا لیتا ہے۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"کیا کام ہے؟" ساتھ ہی جھاڑ پونچھ کرتی ملازمہ کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔

"پہلے تو بتا' اوپر کیا کر رہی تھی؟"

"اوپر کے کمروں کی صفائی کروا رہی تھی' اور کیا گڈے پتنگیں چڑھانے گئی تھی' تو بھی ناں بس۔۔۔۔۔" بلقیس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں سر ہلایا اور ملازمہ سے سکنجبین کا گلاس لے کر غٹا غٹ چڑھانے لگی۔

"ناں میری سمجھ سے باہر ہے یہ اوپر کس کے لیے اتنے کمرے سجا کے رکھے ہوئے ہیں تیرے پتر نے اک میں خود رہتا ہے' اک میں کتابیں اور وہ کیا ہوتا ہے کمپوٹل شمپوٹل (کمپیوٹر)۔۔۔۔ وہ رکھا ہے' باقی تین کمرے پتہ نئیں کس واسطے بھرے پڑے ہیں سامان سے' ڈبل بیڈ' صوفے' قالین' اے سی' ہیٹر' پردے۔۔۔۔ یہ سب کس کے لیے تیار رکھا ہوا ہے۔"

"بس شوق ہے اس کا بڑے گھروں میں ایسے ہی دو چار کمرے مہمانوں کے لیے سجا کے رکھے جاتے ہیں۔" اب اس نے گلاس خالی کر کے رکھنے کے بعد سامنے پڑے آلو بخارے کھانے شروع کر دیئے۔

"کون سے مہمانوں کے لیے' رشتے داروں کو تو وہ منہ لگانا پسند ہی نہیں کرتا۔ میرے یا تیرے منہ کو کبھی کوئی بھولے بھٹکے پتہ کرنے آ بھی جائے تو نوابزادے کے ماتھے کے بل ہی نہیں گنے جاتے' کوئی پاگل کا پتر ہو گا جو اس کی شکل دیکھنے کے بعد اس کا مہمان بننا پسند کرے گا۔ نہ کوئی آتا ہے نہ کوئی جاتا ہے ایسے ہی مہمان خانے سجا بنا کے رکھے ہوئے ہیں۔"

"تو تجھے کیا کرمے' کیوں بے فضول میں کوئی نہ کوئی ٹین شن لے کر بولتا رہتا ہے۔ پھر کہے گا بلڈ پریسر زیادہ ہو گیا۔ مرضی اس کی تیرا کیا جاتا ہے۔"

"اور جو تجھے ہر دوسرے تیسرے دن سر کھپانا پڑتا ہے ان کمروں کی صفائی کے لیے۔ دو قدم تو تجھ سے اٹھائے نہیں جاتے۔ اتنی سیڑھیاں چڑھ کے اوپر جانا پھر گھنٹہ گھنٹہ مائی کے سر پہ کھڑے رہ کے صفائی کرانا کوئی آسان کام ہے۔"

"جھلیا! اپنے گھر کے کام میں تو اتنی خوشی ملتی ہے کہ کیا بتاؤں' کہاں ایسے سکھ دیکھے تھے میں نے کہ چار چار نوکرانیوں پہ حکم چلاؤں' کسی کو پراٹھے پکانے کا حکم دوں' کسی کو جھاڑو صحیح نہ لگانے پہ جھڑکی دوں' کسی سے ٹانگیں دبواؤں تو کسی کو تیرا حقہ تازہ کرنے کے لئے کہوں۔ اتنی بھاگم بھاگ والی زندگی گزارنے کے بعد اب تو سکھ سے آرام کرنے کے دن آئے ہیں۔

کہاں وہ دن کہ آدھی آدھی رات تک جاگنا' سویرے سارے گھر کے کام چھتی چھتی (جلدی جلدی) نمٹانے کی جلدی' دو تین گھنٹے تو ہوتے تھے میرے پاس' ہانڈی روٹی کرنا' جھاڑو لگانا' لیرے لتے (کپڑے) دھونا' پھر تیار شیار ہو کے کام پہ نکلنا۔۔۔۔۔ تیرا کام کچھ چل پڑا تو چلو میری تو چھٹی ہوئی لیکن کرمے تجھے ماننا پڑے گا تو کرائی تو نے بھی نہیں رکھ کے دی مجھے الٹا خوب کام کروائے آئے دن دعوتیں' کبھی پائے پک رہے ہیں یاروں کے لیے کبھی اوجھڑی بھنوا رہے ہو تو کبھی بسنت پہ اکٹھا کر کے گجریلے اور مچھلی کی دعوت ہو رہی ہے۔ پکا پکا کے ہی دم نکل جاتا تھا اب بڑی ہمدردی ہو رہی ہے مجھ سے۔"

"اتنے سالوں بعد بھی جتانے سے باز نہ آنا تو۔ تیرے بیٹے کی یہ عادت تجھ پہ ہی پڑی ہے احسان جتا جتا کے کام کرنے کی۔ وہ بھی اٹھتے بیٹھتے جتاتا رہتا ہے کہ میں نہ ہوتا تو اب تک بیٹھے ہوتے تکی لہٹھی کے ٹوٹے کوارٹر میں۔ میں کہتا ہوں بیٹا ہے وہ ہمارا اگر اس کے اچھے نصیب کے طفیل ہم بھی شادمان کی اس کوٹھی میں رہ رہے ہیں تو اتنا جتانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن آخر تیری تربیت ہے کیوں نہ جتائے۔ تو بھی تو بیس سال پہلے گجریلے اور تلی مچھلی کا احسان اب تک جتا رہی ہے۔"

"ہر وقت جلا بھنا ہی رہتا ہے کرم الٰہی تو تو۔۔۔۔۔ خوش رہا کر۔۔۔۔۔ ہائے ہائے بار بار گجریلے کا کہہ کہہ کر تو نے تو میری بھوک ہی تیز کر دی ایک دم ٹھنڈے میٹھے گجریلے کو جی چاہنے لگا ہے۔ نی رانئے' ذرا فریج میں دیکھ کتنی گاجریں ہیں' نکال کر۔۔۔ کش کر میں رحمت کو بھیجتی ہوں دودھ لینے کے لیے۔" وہ چپل پاؤں میں اڑسنے لگی تو کرم الٰہی نے سرد آہ بھری۔

"ہک۔۔۔ ہا۔۔۔ کیسے خوش رہوں۔۔۔۔۔ کاش تیری طرح میں بھی گجریلا کھا کے' رہو مچھی (مچھلی) کے پکوڑے کھا کے اور بادام کے شربت پی کے لمبا ساڈکار مارنے کے بعد لمبی تان کے سو جایا کروں' اسی میں خوش ہو جایا کروں لیکن میری خوشی تو تیرے بیٹے نے پی لی ہے مجھے جن کی طرح اس کوٹھی کی بوتل میں بند کر دیا ہے اتنا حبس ہے یہاں کہ میں پر ہی نہیں پھڑپھڑا سکتا' جینا اور وہ بھی خوشی خوشی جینا تو بہت دور کی بات ہے۔ قید میں بھی کوئی خوش رہ سکتا ہے۔" وہ بڑبڑانے لگا جسے سن کر کچن کی طرف جاتی بالو نے برا سا منہ بنایا۔

"تجھے اتنا سمجھاتی ہوں پر بے فضول ہی ہوتا ہے۔ تیرا ایک ہی رونا ہی۔ قید۔۔۔ قید۔۔۔۔ قید۔۔۔۔ کتنی محنت کرتا

ہے تیرا بیٹا کتنے عیش ہیں اس کی دم سے۔ سگریٹ، حقے اور شراب نے تیرے اندر کلکھ (نکا) بھی نہیں چھوڑا، اونچے سے اونچے ڈاکٹری مہنگی دوائیاں ہی ہیں جن کی وجہ سے چل پھر رہا ہے۔ اچھی خوراکوں نے چہرے پہ رونق لا رکھی ہے۔ پھر کیا ہے اگر وہ بدلے میں کچھ مانگ لیتا ہے۔ اس کی خوشی کا دھیان ہم نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا آخر اکلوتا بیٹا ہے وہ ہمارا۔“

”اسی لیے تو اس کی لگائی پابندیوں کو قبول کر لیتا ہوں کہ وہ ایک ہی تو سرمایہ ہے زندگی کا ورنہ تو کیا سمجھتی ہے میں ڈرتا ہوں اس سے۔“

”اچھا چھوڑ ساری باتیں۔ باورچی خانے جا رہی ہوں، جا پھلکا ڈالوں تیرے لیے۔ بھنڈی ڈالی ہے بکرے کے بٹھ کے گوشت میں اور ساتھ پالک کوفتے بھی ہیں۔“

”سبحان اللہ۔۔۔۔۔ بھنڈی اور وہ بھی بٹھ کی بوٹی کے ساتھ واہ واہ۔۔۔۔۔ سواد آگیا بادشاہو۔“ وہ سر دھنے لگا تو بلقیس اطمینان سے مسکراتی ہوئی اندر بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

”گریٹ آئیڈیا۔۔۔۔۔“

سفیان محمود نے توصیفی انداز میں سرہلایا۔

”آئیڈیا تو واقعی زبردست ہے، لیکن یار شہزاد دیکھ لینا کسی فلمی برانڈ ہدایت کار کے ہاتھ میں دے کر بیڑہ غرق نہ کروالینا اسکرپٹ کا۔“ روحیل قاضی نے تعریف کے ساتھ ساتھ تاکید بھی کی۔

”اب تم جو بھی سمجھ لو لیکن شعیب نذر اپنے کام میں بادشاہ بندہ ہے۔ اس کے بوسکی کے کرتوں، گریبان میں لگے سونے کے بٹنوں، پان سے رنگے ہونٹوں، انگلیوں میں پھنسی موٹی موٹی انگوٹھیوں اور پنجابی لہجے میں ملفوف گلابی اردو سے دھوکا مت کھاؤ۔ ہدایت کاری میں اس وقت کوئی دوسرا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ اسکرپٹ تو ویسے بھی ذرا فلمی ٹریٹ منٹ کا متقاضی ہے۔“ شہزاد نے کہا تو سفیان محمود نے تائید کی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ جو ہمارے پاکستانی ڈائریکٹرز ہیں اور ایکٹرز، ایکٹریسز ہیں، تکے سے اس لائن میں موجود ہیں نہ کسی انسٹی ٹیوٹ گئے نہ باقاعدہ اس فن کے رموز کے متعلق کچھ جانا جبکہ ہالی وڈ میں معمولی لائٹ مین اور اسپاٹ بوائے بھی باقاعدہ ٹریننگ لے کے آتے ہیں۔ اگر آپ ڈائریکشن کی فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں تو ڈائریکشن کی ڈگری لینا پڑے گی یونی ورسٹی سے اگر ایکٹنگ لائن میں آنا ہے تو ڈائیلاگ ڈلیوری، فیس ایکسپریشن، گرومنگ، رائڈنگ، سوئمنگ وغیرہ کی کلاس لینا ہوں گی جبکہ یہاں سارا مال ڈائریکٹ ”بازار حسن“ سے آتا ہے اور حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ باکمال بھی ہوتا ہے۔“

”تمہاری اس بات پہ مجھے ایک مشہور شخصیت کی ایک بڑی پرانی بات یاد آرہی ہے۔“ محب اللہ نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”کسی ڈرامے کی شوٹنگ سے کچھ دیر پہلے انہوں نے ہیروئن کو ریہرسل کرتے دیکھ کر ہی بھانپ لیا کہ اس کا تعلق اس بازار سے ہے۔ ان صاحب نے ہدایت کار سے کہہ دیا۔

”اس کے لب تو اچھے ہیں۔ مگر لب و لہجہ نہیں۔“

اور پھر ریکارڈنگ کے وقت اس نے ایسی جاندار اداکاری کی کہ بغیر گلیسرین کے روئی۔ سیٹ پہ موجود لوگ ناقص ڈائیلاگ ڈلیوری تک کو بھول گئے کہ جو وہ لفظوں سے ادا نہ کر سکی۔ اس نے چہرے کے کرب اور بھیگی آنکھوں سے ادا کر دیا تب ہدایت کار نے ان صاحب کو کہا۔

”یہ جو اس محلے سے آتے ہیں۔۔۔۔۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے لیکن تجربے میں ہم سے بڑھ کے ہوتے ہیں ہم کیا جانیں ان پہ کیا کیا گزرتی ہے۔ ہم زندگی کو اتنا قریب سے محسوس نہیں کر سکتے جتنا یہ کرتے ہیں اسی لئے یہ آنسو کیچل تھے یہ کسی پڑھی لکھی، ماڈرن اچھے آسودہ خاندان والی لڑکی کی آنکھوں میں نہیں آسکتے تھے۔“ محب

اللہ کے سنائے قصے پہ سفیان نے بے اختیار داد دی۔ شہزاد خاموشی سے پہلو بدلتا رہا۔ اس کے ماتھے کی شکنیں صاف بے زاری اور ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھیں جسے بھانپ کر روحیل قاضی نے ان دونوں کی موضوع سے ہٹتی گفتگو میں دخل دیا۔

”خیر وہ تو شہزاد جانیں اور ان کے ڈائریکٹر صاحب ہمارا تو جو کام ہے ہمیں فی الحال اسے ڈسکس کرنا چاہیے۔“ وہ شہزاد کے بگڑے مزاج سے یہی نتیجہ اخذ کر پایا کہ وہ جس سلسلے میں ڈسکشن کرنے آیا تھا۔ سفیان اسے اگنور کر کے محب اللہ جیسے بلا کے باتونی شخص سے قصے کہانیاں سننے بیٹھ گیا تھا۔

”آف کورس، آف کورس“ سفیان نے پھر سے فائل کھولی۔

”تو یہ ہیں وہ سارے کمالات وہ معجزات جو ”لکی الیس“ کی نئی پروڈکشن ”شیر دل“ سے رونما ہوا کریں گے۔۔۔ ہوں۔۔۔ انٹرسٹنگ۔ تو تم چاہتے ہو کہ کمپیوٹرز کس کے ذریعے ہم ان مناظر کو بالکل ایسے فلمانے میں تمہاری مدد کریں کہ دیکھنے میں یہ بالکل حقیقی لگیں۔“

”ہاں بالکل ایسے ہی جیسے پچھلے سیریل میں وہ خواب کا سیکوئنس پکچرائز کرانے میں تم نے بادلوں اور قوس قزح کے درمیان ہیروئن کو چلتا دکھایا تھا اور وہ کرائم سیریل میں ٹرین کا ایکسیڈنٹ کس قدر رئیل پکچرائز ہوا تھا بس وہی بات مجھے اس سیریل میں بھی چاہیے۔“

”لیکن یہ تقریباً سو اقساط تک چلنے والی سیریز ہے تم کب تک بھاگ بھاگ کر یہاں آتے رہو گے میں نے اپنے کمپیوٹر فرم میں سب سے پہلے دوستی کے ناتے صرف اور صرف تمہارے کہنے پہ ہی تمہاری سیریل کے لیے وہ ڈریم سین پکچرائز کرنے کی ہامی بھری تھی، کامیابی کے بعد مجھے اتنی آفر آئیں کہ اب میری فرم میں الگ ڈپارٹمنٹ ہے اس کے لیے، کئی ایڈورٹائزنگ ایجنسیز اپنے کمرشلز شوٹ کرانے کے بعد ایڈیٹنگ اور اسپیشل افیکٹس کے لیے بھی بھیجتی ہیں لیکن یار تمہارا تو پورا سیریز ہی اسپیشل افیکٹس کے سہارے چلے گا۔ ہر قسط میں ہی شیر دل صاحب کو اڑنا ہے، بلڈنگس ہتھیلی پہ اٹھا لینی ہیں، نگاہوں کے زور سے آگ بھڑکا لینی ہے۔ تمہیں تو کوئی کمپیوٹر ایکسپرٹ باقاعدہ طور پر ہائر کرنا پڑے گا جو کیمرہ مین، آرٹ ڈائریکٹر کے ساتھ ساتھ تمہاری ٹیم میں شامل ہو۔ ہر سین پکچرائز کرانے سے پہلے کیمرہ مین اور اس کی ڈیٹیل سے ڈسکشن ہو، ریکارڈ ہونے والا ہر سین اس کی ٹیبل تک پہنچے اور وہ ساتھ ساتھ اس کی نوک پلک سنوارتا جائے۔“

”تو ایسا کوئی قابل بندہ تم مجھے مہیا کروا اپنی ہی فرم سے چھانٹ کر۔“

”میری فرم سے لو گے تو تمہیں بڑا مہنگا پڑے گا۔ ظاہر ہے ایک اچھی بھلی لگی لگائی نوکری چھوڑ کے ایک ہائی کوالی فائیڈ شخص اگر تمہارے اس سیریز کے لیے کام کرے گا جو نجانے کتنے عرصے تک چلنے والا ہے تو پھر اس کی ڈیمانڈ بھی زیادہ ہوگی۔“

”تو۔۔۔ پھر؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”نیوز پیپر میں اشتہار دو۔ اس کے لیے کوئی خاص ہائی کوالی فیکشن ضروری نہیں بس بندے کا کمپیوٹر میں انٹرسٹ ہونا چاہیے اور نت نئے تجربے کرنے کا شوق بھی میرے خیال میں تو کوئی بھی ایسا ینگ گریجویٹ تمہارے لیے آئیڈیل ثابت ہو سکتا ہے جو نیا نیا کمپیوٹر کی فیلڈ میں داخل ہوا ہو اور اس کے اندر آئیڈیاز، ایکسپیریمنٹس ابل ابل کر بے تاب ہو رہے ہوں۔“

”تو تمہارے خیال میں میں صرف کم پے منٹ کا خیال کرتے ہوئے کسی ناتجربہ کار پہ بھروسہ کر لوں؟“

”وائے ناٹ، نیوبرین از ریلی فنٹاسٹک تم میری مان کے دیکھو، فائدے میں رہو گے۔“ سفیان محمود نے حتمی انداز میں کہہ کر ریموٹ اٹھایا اور چینل بدلنے لگا۔ آفس بوائے نے گرم گرم کافی کا بھاپ اڑاتا مگ سب کے سامنے رکھا۔

”ادے ہٹ جاؤ پیچھے۔۔۔ ہٹ جاؤ۔“

سفیان جس چینل پہ رکا وہاں ایک پنجابی اسٹیج ڈرامے کی ویڈیو چل رہی تھی۔ ایک اول جلول سے حلیے والے اداکار نے بڑھکیں مارتے ہوئے اسٹیج پہ انٹری دی جسے سن کر دوسرے ذرا عمر رسیدہ اداکار نے جگت لگائی۔

"کیوں بٹیں یہاں تیری بہن کا مجرا ہونے والا ہے۔"

"لاحول ولا۔" محب اللہ نے برا سا منہ بنا کر سفیان کو چینل چینج کرنے کا اشارہ دیا۔ پبلک اس عامیانہ فقرے پہ بلند و بانگ قہقہے لگا رہی تھی۔

"نجانے کیا ہو گیا ہے لوگوں کے سینس آف ہیومر کو گھٹیا اور فحش جگت بازی اور ذو معنی مکالمات کو مزاح کا نام دیا جا رہا ہے۔"

"یہ اسٹیج ڈرامے اور ان میں کام کرنے والے بھانڈ ان سب نے تو مزاح کا جنازہ ہی نکال دیا ہے۔ نرا پھکڑ پن ہے۔ فحش گوئی کی انتہا کر دیتے ہیں کبھی کبھار تو۔"

"کبھی کبھار کیوں' دو گھنٹے کے ڈرامے میں ہوتا ہی کیا ہے۔ شروع سے آخر تک گندگی ہی گندگی۔"

"میں تو کہتا ہوں یہ جو حکومت نے غیر ملکی تفریحی چینلز پہ پابندی لگائی ہوئی ہے۔ اس کے بجائے یہ ڈرامے بند ہونا چاہیے تھے۔ ہماری قوم تو ویسے بھی لائی لگ (لکیر کی فقیر) ہے۔ اس طرح گھر گھر یہ ڈرامے چلنے لگیں تو جلد ہی اخلاق کا جنازہ نکل جائے گا۔"

"کسی زمانے میں یہ بھانڈ میلوں ٹھیلوں پہ یا شادی بیاہ کی محفلوں میں ایک دوسرے کو جوتے مارتے ہوئے طعنہ زنی کا کام کرتے تھے اور لوگوں کو تماشے ہی تماشے میں ہنساتے تھے۔ لیکن سنا ہے کہ تب بھی خواتین کے سامنے یہ تماشا نہیں ہوتا تھا۔ مردوں کی الگ محفل سجا کرتی تھی لیکن اب تو لحاظ ہی نہیں رہا۔ تھیٹر میں سرعام ایک دوسرے کی ماں بہن کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔"

"یہی وجہ ہے کہ فیملیز نے تھیٹر آنا چھوڑ دیا ہے اور یہ کیبل والے زبردستی اس گھٹیا پن کو گھر گھر پہنچا رہے ہیں کس قدر افسوس کا مقام ہے۔" روحیل قاضی نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"یار تم کیوں نہیں کسی پروگرام میں یہ مسئلہ اٹھاتے۔ میرا تو خیال ہے ان بھانڈوں کو بین کر دینا چاہیے۔ لچر' بیہودہ۔" وہ شاید اور بھی کچھ کہتا لیکن اچانک ہی شہزاد کے چہرے کے بدلتے زاویوں پہ غور کرتے ہوئے رک گیا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں جبکہ چہرہ آنکھوں سے یکسر مختلف زرد پڑ رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے وہ کھڑا ہوا' کسی کی طرف دیکھے بغیر اپنا موبائل اور کی چین اٹھائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ارے شہزاد۔ شہزاد۔" سفیان محمود ہکا بکا رہ گیا۔ "یہ اسے کیا ہوا؟"

"بھئی حد سے زیادہ موڈی ہے یہ شخص۔" روحیل نے ناپسندیدگی سے منہ بنایا۔ "اب بھلا کوئی طریقہ ہے اس طرح میٹنگ سے اٹھ کے جانا۔"

"ایسا کبھی کیا تو نہیں شہزاد نے۔ موڈی تو وہ واقعی ہے 'پل میں تولہ اور پل میں ماشہ' مگر۔" وہ حیران تھا اور ذہن اس طرح اس کے اٹھ کے جانے کی کوئی بھی توجیہہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلکان ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد موتیا نے چائے سے بھرے دو مگ چھوٹی سی ٹرے میں رکھے جس میں پہلے سے ایک پیالی مونگ پھلی اور ریوڑیوں سے بھرا ہوا لفافہ تھا۔ کچن کی لائٹ آف کر کے اور دروازہ باہر سے اچھی طرح بند کرنے کے بعد وہ ٹرے اٹھا کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ راستے میں رک کے اس نے برآمدے میں جلتی واحد ٹیوب لائٹ بھی آف کر دی۔

گھر کا اندرونی حصہ تقریباً" تاریکی میں ڈوب گیا حالانکہ ابھی رات کے صرف ساڑھے نو بجے تھے۔ لیکن چونکہ ابا حضور کی طرف سے رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جانے کا سختی سے حکم تھا اس لیے سبھی اس معمول پہ کاربند تھے۔

آٹھ بجے رات کا کھانا کھایا جاتا اور ساڑھے آٹھ تک بڑے کمرے کی لائٹس آف کر کے سب اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ عشاء کی نماز بھی امی حضور اور تائی حضور وہیں ادا کرتیں اور جلد ہی سو جاتیں۔ حتیٰ کہ ابا حضور بھی مسجد سے آنے کے بعد مہمان خانے کا دروازہ بند کر دیتے اور بڑے کمرے میں بچھے تخت پہ محو استراحت ہو جاتے جوان کا رات بھر کے لیے ٹھکانہ تھا ورنہ ان کا دن کا بیشتر حصہ مہمان خانے میں گزرتا اور اس کمرے میں گھر کے بقایا نفوس وقت گزارا کرتے۔ یہیں گھر کا واحد ریڈیو تھا جس پہ ایف ایم ون ہنڈرڈ اتنی آواز میں لگا ہوتا کہ اس پہ نشر ہوتے گانے کچن میں کام کرتی موتیا تک تو بخوبی پہنچا کرتے مگر بیرونی طرف کھلنے والی بیٹھک یعنی مہمان خانے میں نہ پہنچ پاتے۔ یہیں پر امی حضور کی سلائی مشین دھری تھی جس پہ وہ تو اکثر ہی بیٹھی سینت سینت کے رکھے کپڑوں کو نئی نئی شکلیں دیتی رہتیں۔ کبھی اچھے وقتوں کی بنی کسی مخملیں بیڈ شیٹ کو زیادہ استعمال کے بعد گھس جانے کی صورت میں گل مہر یا موتیا کے جہیز کی رضائی کا غلاف بنا رہی ہوتیں۔ کبھی اپنی کسی پرانی گرم چادر کے کنارے خراب ہو جانے کی صورت میں کاٹ چھانٹ کر صوفے کی گدیوں کے غلاف بنا رہی ہوتیں کبھی کبھی موتیا بھی اپنے اور گل مہر کے کپڑوں کے علاوہ تایا حضور کے بچوں کے وہ کپڑے سی رہی ہوتی جن کے لیے بچا بچا کے رکھے ہوئے کٹ پیس تائی حضور اسے نکال کے دیتیں۔

اسی کمرے میں گھر کا واحد صوفہ رکھا تھا اور یہیں گھر کا اکلوتا بلیک اینڈ وائیٹ ٹی وی بھی تھا جو کسی زمانے میں تایا حضور یعنی صاحبزادہ انیس علی خان نے چھوٹے بھائی کی تمام تر مخالفت کے باوجود لیا تھا۔ عموماً" اس ٹی وی کو جاگنا نصیب ہی نہ ہوتا۔ ڈش اور کیبل سے محروم اس بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے پاس' صرف پی ٹی وی اور پی ٹی وی ورلڈ کے چینلز تھے جن پہ آٹھ بجے والا ڈرامہ واحد تفریح تھی جو کہ ابا حضور کے سب کے ساتھ بیٹھ کے رات کا کھانا اسی کمرے میں کھانے کی وجہ سے قربان ہو جاتا۔ دن کو اکیلے میں کئی بار موتیا اسے آن کر کر کے دیکھتی مگر کوئی قابل ذکر پروگرام نہ ہوتا۔ البتہ کرکٹ میچ کے دنوں میں عمیص اور وہ دونوں کئی کئی گھنٹے اس بے رنگ ڈبے کے آگے سے نہ ہلتے۔ ویسے بھی دن کے وقت ابا حضور کا گھر کے اندرونی حصے میں آنا اتفاق سے ہی ہوتا تھا اس لیے بے فکری سے کرکٹ کا شوق پورا کیا جاتا ورنہ اتنی دیر تک مسلسل ٹی وی دیکھتے رہنے پہ بجلی کے زیاں کا مفصل و مدلل لیکچر ہضم کرنا پڑتا۔ اب بھی موتیا اسی لیکچر کے خوف سے چائے اپنے کمرے تک لے جاتی اندھیرے برآمدے میں کھڑی گردن گھما گھما کے جائزہ لے رہی تھی کہ کہیں کوئی بتی جلی تو نہیں رہ گئی۔

برآمدے سے باہر لان میں نصب اونچا سا بلب جل رہا تھا جس کی روشن برآمدے تک روشن دان کے ذریعے آ رہی تھی۔ یہ واحد بلب تھا جو ابا حضور کی کڑی پابندی سے مستثنیٰ تھا لیکن فجر کی نماز کے لیے اٹھتے ہی سب سے پہلے موتیا اسی کا بٹن بند کرتی۔ صبح کے اس اولین کام کی طرح رات کا یہ آخری کام بھی موتیا ہی کی ڈیوٹی تھا اور وہ اپنی ذمہ دار فطرت کی بنا پہ دیگر امور کی طرح یہ ڈیوٹی بھی بخوشی نبھاتی تھی۔ جب سے تائی حضور کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی' ابا حضور کے حکم سے امی حضور نے اپنا بستر ان کے کمرے میں منتقل کر لیا تھا۔ ان کا کمرہ تو کافی دیر سے تاریک اور خاموش ہو چکا تھا۔ عمیص بھی بھلے جاگ رہا ہوتا مگر لائٹ آف ہی رکھتا۔ وہ مطمئن ہو کے اپنے اور گل مہر کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آہستگی سے اس نے دروازہ کھولا اور لمحے بھر کے لیے ٹھٹک گئی۔

پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن دائیں طرف کھلنے والی کھڑکی لان میں نصب بلب کی روشنی اور پورے چاند کی مدھم نرم چاندنی کو سیدھا اس بستر تک لا رہی تھی جس پہ سفید دودھ سی بے شکن چادر بچھی ہوئی تھی اور اس سفید چادر پہ سفید ہی شب خوابی کے لباس میں ملبوس گل مہر چاندنی کے عکس سے بلا کی مسحور کن لگ رہی تھی سفید تکیے پہ اس کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے' کمرے کی تاریکی نے ان کا سنہرا پن چھپا لیا تھا اور اب وہ رات ہی کے ہم رنگ محسوس ہو رہے تھے' تکیے کی سفیدی پہ بالوں کی بھوری سیاہی اور ان سے ابھرتی اس کے روشن چہرے کی ٹھنڈی سفیدی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن پلکیں لرز رہی تھیں اور پاؤں ہلکے ہلکے تھرک رہے تھے۔ یقیناً" وہ واک مین پہ اپنے پسندیدہ گیت سن رہی ہو گی۔ یہ واک مین اسے پچھلی سالگرہ پہ مزنی نے گفٹ کیا تھا۔

موتیا نے دروازہ لاک کیا اور اسے بغور دیکھتی اس کے قریب آ گئی۔ ٹرے ایک طرف رکھ کے اس نے خود کو ذرا سا جھکایا اور کان لگا کے اس کے سر پہ چڑھے ہیڈ فون سے ابھرتی آوازوں کو سننے لگی۔

"پر تو میرے نال ویاہ کر لے"

ابرار الحق کی "ترلوں منتوں" سے بھری آواز سن کے اس نے منہ بنایا۔ اس کی چوٹی گردن کے ایک طرف سے نیچے لٹک کے گل مہر کے ماتھے پہ جا لگی۔ اس نے بدک کے آنکھیں کھولیں اور خود پہ اسے جھکے دیکھ کے ایک بھرپور چیخ کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ موتیا نے مضبوطی سے اپنی ہتھیلی اس کے ادھ کھلے منہ پہ جما دی۔

"بدھو۔ میں ہوں موتیا۔" اس نے چند سیکنڈ بعد مطمئن ہو کے ہاتھ ہٹا دیا لیکن گل مہر کا منہ بدستور کھلا ہوا تھا' آواز اگرچہ نہیں نکلی مگر پھٹی پھٹی آنکھوں میں پھیلا خوف اور سراسیمگی رفتہ رفتہ حیرت میں بدلے اور پھر انہوں نے غیض و غضب کا لبادہ اوڑھ ہی لیا۔ جیسے ہی وہ اپنی جون میں آئی مختصر دورانیہ کا یہ سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔

"بدھو ہم ہیں یا تم۔۔۔" آواز دبا کے اس نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔ یقیناً" اس کے دل کی دھڑکن اب تک معمول پہ نہیں آئی تھی۔ یہ اس کا ہاتھ ظاہر کر رہا تھا جواب تک سینے پہ تسلی دینے کے انداز میں دھرا تھا۔

"چلو بدھو جو بھی ہے لیکن یہ تو ثابت ہو گیا کہ تم سے بڑا بزدل و ڈرپوک اور کوئی نہیں۔ اگر میں فوری طور پہ تمہارے اس اسپیکر کے آگے بند نہ باندھ دیتی تو تم نے تو ابھی سارا گھر اکٹھا کر لینا تھا۔"

"زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری جگہ تم ہوتیں تو دیکھتے تو بہ۔ ڈرا کے رکھ دیا۔ ایسی موٹی پلی پلائی چوٹی ہے تمہاری جیسے کوئی بھینس کی دم۔"

"اچھا تو تمہیں لگا کوئی بھینس اپنے باڑے سے بھاگ کر سب کی نظر سے بچ بچا کے ہمارے لان کا گیٹ پھلانگتی ہوئی' برآمدے کا دروازہ توڑ کے یہاں اس اندھیرے کمرے میں تمہارا چاند سا چہرہ اپنی دم سے سہلانے آئی ہے۔ پاگل ہو تم بھی۔۔۔ حد ہوتی ہے بزدلی کی ارے اس کمرے میں اس وقت سوائے میرے اور کون آتا ہے۔ جو تم چلا چلا کے تماشا کھڑا کرنے لگی تھیں۔" اس نے بھی دبی آواز میں گھرکتے ہوئے اسے چائے کا مگ تھمایا۔

"کوئی بھی آسکتا ہے۔ کوئی چور کوئی جن بھوت۔" گل مہر نے جھرجھری لی۔

"ویسے گل۔۔۔ ایک بات ہے۔" موتیا کے لہجے میں شرارت تھی۔ اس نے ایک چسکی بھرنے کے بعد مگ پھر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اپنی طویل دورانیے کی بے ہنگم ہنسی۔ اسٹارٹ کرنے والی ہے۔

"یار۔۔۔ کتنا مزا آتا اگر میں تمہارے لاؤڈ اسپیکر پہ ہاتھ نہ رکھتی۔ تم دلدوز چیخوں کے ساتھ سارا گھر اکٹھا کر لیتیں۔ بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ چور بھوت امی حضور' ابا حضور۔۔۔ سب اکٹھا ہو جاتے' لائٹ آن ہوتی اور پھر۔" وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے آگے کو جھکتی ہنسی دبانے کی کوشش کرنے لگی۔ گل مہر کے ہونٹوں پہ بھی متوقع صورت حال کا تصور کر کے مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اف اللہ کتنا مزا آتا جب سب دیکھتے کہ چور اور جن بھوت کے بجائے۔۔۔"

"چڑیل ہمارے سر پہ کھڑی ہے۔" گل مہر نے اس کی بات درمیان سے اچک لی۔

"کیا کہا؟ میں اور چڑیل۔۔۔ ذرا خود کو آئینے میں دیکھو بلکہ میں۔۔۔ ٹھہو ذرا میں تمہیں موم بتی جلا کے دی ہوں۔" موتیا جوش سے اٹھی اور دراز سے موم بتی نکال کے روشن کی۔ "لو اسے ہاتھ میں پکڑو اور اپنے اس سفید ڈھیلے ڈھالے چغے اور لمبے بکھرے بالوں سمیت آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاؤ۔۔۔ قسم اللہ کی کم از کم چار صدی پرا بھٹکتی روح لگو گی۔۔۔ چار سو سالوں سے خوار ہوتی ہوئی۔"

اس نے چائے کا کپ زبردستی اس کے ہاتھ سے چھین کے رکھا' سردی کے خوف سے جو بیچارہ پہلے ہی بھا اڑانا تک بند کر چکا تھا اور جلتی ہوئی موم بتی اسے تھمائی۔ اوپر کی طرف جاتے زرد ٹمٹماتے لپکے نے بیچ بیچ گل مہ کے خوابناک چہرے کو پل بھر میں اتنا خوفناک بنا دیا کہ موتیا پھر سے آگے کی طرف جھک کے اپنے قہقہے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ گل مہر بستر سے اتری اور تجسس کے مارے آئینے کی طرف چل پڑی۔ اپنی جھلک دیکھتے ہی اما

نے "ہائے اللہ" کہا اور پیچھے پلٹ کر بستر پہ اوندھی گری ہل ہل کے بے آواز ہنستی موتیا کو غصے سے گھورنے لگی لیکن اس کی ہنسی سے بے حال ہوتی حالت دیکھ کے وہ اپنے غصے پہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور خود بھی ہنسنے لگی۔ اسے موم بتی اٹھائے واپس اس طرف آتے دیکھ کے موتیا نے بمشکل اپنی ہنسی کو بریک لگائے اور گنگنانے کی کوشش کی۔

"انجان ہے کوئی۔" پھر سے حلق کے اندر دم توڑتے قہقہوں کی گھٹی گھٹی آوازیں۔

"گم نام ہے کوئی۔۔۔" بڑی مشکل سے اس نے یہ دو فقرے گنگنائے اور دوپٹہ تقریباً" پورا ہی منہ میں ٹھونس لیا تاکہ قہقہے کہیں قابو سے باہر نہ ہو جائیں۔ ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ وہ تو نجانے کس سین کا تصور کر کر کے مزے لوٹ رہی تھی لیکن گل کو اس کے ہنسنے پہ ہنسی آ گئی۔ کچھ دیر میں دونوں ہی ہاتھ منہ پہ جمائے بستر پہ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے ایک دوسرے پہ گرتی پڑتی ہنس ہنس کے بے حال ہو رہی تھیں۔ ہنسی دبانے اور آواز باہر نہ نکالنے کی کوشش انہیں اور بے قابو کر رہی تھی۔

کون یقین کر سکتا تھا کہ دن میں دس بار ایک دوسرے سے چونچ لڑانے کا شغل کرنے والی یہ دونوں بہنیں جو مزاجاً" فطرتاً" ایک دوسرے کی ضد ہیں' اس وقت رات کے اس پہر اس سوئی ہوئی افسردہ حویلی کے ایک مدھم روشنی والے کمرے میں یوں ایک دوسرے سے لپٹ کے قہقہے بکھیر رہی ہوں گی۔ یہ تو ان کا برسوں پرانا معمول تھا۔ دن میں کئی کئی بار ایک دوسرے سے الجھنے کے باوجود رات کو یہ دونوں اکٹھی ہی ہوتیں۔ دن میں ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے کا سرعام اعلان کر دینے کے باوجود دونوں اپنے اسی مشترکہ کمرے میں پناہ لیتیں۔

موتیا اکیلے میں گل کے ساتھ نارمل ہی رہتی بلکہ خاصے دوستانہ ماحول میں دونوں رات دیر تک ایک دوسرے سے اپنے محسوسات' خیالات شیئر کرتیں لیکن دن کو سب کے سامنے خصوصاً" عمیص کے سامنے اس کا رویہ اپنی بڑی بہن سے جارحانہ ہو جاتا شاید اس کی وجہ اس کی عمیص سے پرخلوص دوستی اور خیرخواہ جذبات تھے جبکہ گل مہر نہ صرف عمیص کے جذبات کا سرعام مذاق اڑاتی بلکہ بات بے بات اس کی تضحیک بھی کر جاتی جو عمیص تو پی جاتا لیکن موتیا سے برداشت نہ ہوتا اور وہ بہن کو کھری کھری سنا دیتی۔ اسے گل مہر کی دوسروں کے جذبات اور محبت سے کھیلنے کی عادت سے بھی نفرت تھی۔۔۔ اور اس کی بے حسی بھی اسے تاؤ دلا دیتی۔ خود اس نے ایف اے میں اچھا بھلا رزلٹ لانے کے باوجود آگے داخلہ نہ لیا کیونکہ ابا حضور اب ملازمین کے متحمل نہ رہے تھے اور گھر کی ذمہ داریاں اکیلی امی حضور کے بس سے باہر تھیں۔۔۔ وہ بخوشی سارا دن گھر کے چھوٹے بڑے لاتعداد کاموں میں الجھی رہتیں لیکن گل مہر جب کمبائن اسٹڈی کے بہانے کالج کے بعد بھی کئی کئی گھنٹے مزنی کے گھر گزارا کرتی تو اسے غصہ آ جاتا۔

گل مہر کو حویلی کے لگے بندھے اکتائے ہوئے معمول سے چڑ تھی' اسے اپنے گھر کی کم مائیگی سے شرم آتی تھی لیکن ابا حضور اس کے خیالات سے بے خبر صرف اس کی تعلیمی دلچسپی کا دھیان رکھتے ہوئے اسے مزنی کے گھر ٹھہرنے کی اجازت دیتے حالانکہ ان کے اصول و قواعد ہمیشہ سے اس معاملے میں بہت سخت رہے تھے اور ظاہر ہے کہ جب جب موتیا اسے اس نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے دیکھتی اسے غصہ آ جاتا غصہ دبانا اس کے لیے ناممکن تھا بالکل ویسے ہی جیسے اس وقت ہنسی دبانا مشکل لگ رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ اف۔۔۔ موتیا۔" گل مہر نے سب سے پہلے اپنی ہنسی پہ قابو پایا اور پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے کراہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہمارا تو حشر ہو گیا' پسلیاں تک دکھنے لگیں۔ لو یہ تو چائے بھی برف ہو گئی۔" اس نے کپ اٹھایا اور پھر سے پٹخ دیا۔

"موم بتی جل رہی ہے' اس پہ رکھ کے گرم کر لو۔" موتیا نے احمقانہ سی تجویز دی اور پھر سے ہنسنے لگی۔ گل مہر نے گھور کے اسے دیکھا۔

"ویری فنی۔" اسے مزید ہنسنے پہ آمادہ نہ پا کے موتیا نے بھی اپنا پروگرام سمیٹ لیا اور تمتماتے گال سہلاتے ہوئے کہا۔

"چلو ایک فائدہ ہوا' چائے بے شک ٹھنڈی ہو گئی لیکن میں تو گرم ہو گئی۔ ایمان سے ٹھنڈے برف یخ بستہ کچن میں یخ پانی سے اتنے برتن دھونے کے بعد میری تو قلفی جم گئی تھی اور اب دیکھو بغیر ہیٹر کے کیسے جسم گرم ہو گیا ہے۔"

"تائی حضور کو بھی تو بہت سردی لگتی ہے' ان کے جوڑوں میں درد شروع ہو جاتا ہے سردی سے۔ جاؤ یہ نادر نسخہ انہیں بھی بتا آؤ۔" گل مہر نے مونگ پھلی ٹونگتے ہوئے صلاح دی۔

"ویری فنی۔" موتیا نے بدلہ چکایا۔

"پتہ ہے گل... اگر تم چیخ پڑتیں ناں... تو سب سے پہلے عمیص بھاگا آتا۔ حالانکہ اس کا کمرہ سب سے دور ہے۔" اس نے ٹٹولتی نظروں سے بہن کو دیکھا جس نے بکھرے بال ایک ڈھیلے سے جوڑے میں لپیٹ لیے تھے لیکن کئی لٹیں اطراف سے اب تک اس کے بیضوی چہرے پہ لہرا رہی تھیں۔

"جیسے کسی جن کی جان طوطے میں بند ہوتی ہے ایسے ہی اس کی جان تم میں اٹکی رہتی ہے۔"

"فار گاڈ سیک موتیا' اب یہ طوطا مینا کی کہانیاں سنا کے بور مت کرو ہمیں۔" اس نے نزاکت سے ناک چڑھائی لیکن موتیا نے ہار نہ مانی آج وہ گل مہر کے اچھے موڈ اور اس مصالحانہ دوستانہ فضا کا فائدہ اٹھاتی ہوئی اس کے اندرونی جذبات جانچنا چاہ رہی تھی۔

"یہ طوطا مینا کی کہانی ہی تو اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے مائی سسٹر۔ تم یہ مان کیوں نہیں لیتیں کہ محبت کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔"

"ہم نہ اپنا نظریہ ہے۔" اس نے کاندھے اچکائے۔ "ہمارے خیال میں تو زندگی کو مکمل اور بھرپور بنانے کے لیے کچھ اور لوازمات ضروری ہیں۔ ایک آسودہ حال زندگی کے لیے اچھا کیریئر' بہت سارا روپیہ پیسہ' تمام آسائشات' سہولیات' ڈھیر ساری شہرت اور نام۔ کامیابیاں... یہ سب چاہیے ہوتا ہے۔ باقی رہی محبت... تو جیسے کسی بھی چیز کے مکمل ہو جانے کے بعد اس کی اضافی سجاوٹ اور آرائش کے لیے کچھ پھندنے ٹانک دیے جاتے ہیں تو بس ایسے ہی محبت بھی ہے۔ ہو تو ٹھیک ہے... زندگی "مزید" خوب صورت ہو جاتی ہے لیکن اگر نہیں تو نہ سہی اتنا سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد کسی کو اور چاہیے بھی کیا۔ کم از کم ہمیں تو ہرگز نہیں۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں گل۔" موتیا سنجیدہ ہو گئی۔ "تم یہ اس لیے کہہ رہی ہو کہ آج تمہیں سب کی محبتیں حاصل ہیں اور بھرپور توجہ بھی اس لیے تمہیں اس چیز کی قدر نہیں۔ لیکن کبھی لمحہ بھر کے لیے تصور کر کے دیکھو۔ کہ خدانخواستہ سب کچھ ملنے کے بعد اگر یہ محبتیں تمہارے پاس نہ رہیں تو کیا تم اپنی زندگی کو مکمل کہہ سکتی ہو۔"

"آف کورس ناٹ۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "یہ غلط ہے کہ ہمیں ان سب محبتوں کی قدر نہیں یا ضرورت نہیں۔ تم' امی حضور' ابا حضور... سب ہم سے محبت کرتے ہو تو یہ مت سمجھو کہ ہم تم سب سے محبت نہیں کرتے... دراصل ہم سمجھے تم اس فضول اسٹوپڈ سی محبت کے بارے میں بات کر رہی ہو... وہی طوطا مینا والی۔ یار یہ تو نری بکواس ہوتی ہے۔ جھوٹے لفظ' جھوٹے جذبے' سراسر جذباتیت...

"خیر سب پہ تو تم یہ فتویٰ صادر نہیں کر سکتیں۔ کم از کم عمیص تو ہرگز اس کیٹگری میں نہیں آتا۔ محبت کو سمجھنا سیکھو گل۔ زندگی میں بس ایک یہی ہنر کام آتا ہے اور کچھ آئے نہ آئے یہ فن ضرور آنا چاہیے کہ انسان سچی محبت اور سطحی جذباتیت میں تفریق کر سکے۔"

"چلو تم تو اس فن میں طاق ہو ناں۔ ہم جب ضرورت محسوس کریں گے تم سے گائیڈ لائن لے لیا کریں گے۔ لو اسی خوشی میں منہ میٹھا کرو یہ ریوڑی کھاؤ۔" اس نے ہنوز لاپروائی اور بے نیازی اختیار کر رکھی تھی۔ جس پہ موتیا چڑ گئی۔

"گل' عمیص تم سے محبت کرتا ہے۔" اس نے زور دے کر کہا جیسے وہ اسے ہر قیمت پر یقین دلانا چاہتی ہو۔

"وہ تمہیں چاہتا ہے' تمہاری ہر بات کو' تمہاری ہر ادا کو۔ تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"اوکم آن موتیا۔" وہ برا مان گئی۔ "وہ تو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا ہمارے لیے کیا کرے گا۔"

"بس تمہاری یہ ہی باتیں مجھے بری لگتی ہیں۔ تم ہر وقت یہ جلی کٹی باتیں کر کر کے اس کا دل دکھاتی رہتی ہو یہ ہے اس کی محبت کا صلہ۔"

"پلیز... پلیز ذرا حقیقت پسندی سے سوچو۔ محبت صلہ میں عنایت نہیں کی جا سکتی۔ کل کو کوئی بھی اٹھ کے تمہیں کہہ دے کہ وہ تمہیں چاہتا ہے تو کیا صرف اس کی محبت کا صلہ دینے کے لیے تم اس کی محبت کا اقرار کر لوگی چاہے تم اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی ہو... بولو کیا ایسا کر لوگی۔ نہیں ناں پھر یہ مان کیوں نہیں لیتیں کہ ہمیں اس سے محبت نہیں ہے بالکل بھی نہیں ہے پھر کیوں صرف اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرا مسکرا کے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ یہ بات زیادہ خطرناک ہو گی۔ ہمارا صاف صاف انداز ہی بہتر ہے۔"

"گل! وہ کوئی راستے پہ ملنے والا لفنگا نہیں جس کے اظہار محبت پہ تم چٹاخ سے طمانچہ مار کے خود کو حق بجانب ٹھہرا لو۔ وہ ہم میں سے ایک ہے۔ ہمارا اپنا ہے۔ اس کی محبت کا جواب محبت سے دینا تم پہ لازم نہیں مگر اس کی تضحیک کرنے اور اس کی خودداری کو مسلنے کا حق تمہیں کس نے دیا ہے۔ پلیز مت کیا کرو ایسا۔" سختی سے بات کرتے کرتے اچانک موتیا کے لہجے میں منت اتر آئی۔

"ہم کب ایسا کرتے ہیں۔" وہ صاف مکر گئی۔ "بس ہمیں پسند نہیں اس کا فدویانہ انداز اور بے سروپا شاعری۔ ہم خوامخواہ چڑ جاتے ہیں تم اسے بھی تو سمجھایا کرو ہم سے نارمل انداز میں رہا کرے۔ اگر وہ صرف کزن ہونے کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے گا تو ہم بھی اس سے کزن کا ہی برتاؤ کریں گے۔ اور ہم ایسا ہی کرتے ہیں جب بھی وہ اپنے جامے میں ہوتا ہے لیکن سر پھرے عاشق کے انداز میں ٹکرائے گا تو پھر یہی سلوک ہو گا کیونکہ راستے میں پڑے ہوئے دلوں کو ہم یونہی ٹھوکروں کے ساتھ پرے کیا کرتے ہیں۔" اس نے ناز سے گردن اٹھائی۔

"کب تک؟... صاحبزادی گل مہر خانم... آخر کب تک آپ دلوں کو ٹھوکریں مارتی رہیں گی۔"

"جب تک ہمارا راستہ ہمیں ہماری منزل تک نہیں پہنچا دیتا۔" اس نے تکیے سے ٹیک لگائی۔ "راستے میں ادھر ادھر گرے ہوئے دلوں کو جانچنے پرکھنے میں ہم اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتے۔"

"منزل؟ کیسی منزل؟"

"کچھ بن جانے کی کچھ کر دکھانے کی منزل۔ اپنے نام کے آگے ایک مضبوط حوالہ لگانا ہی ہماری منزل ہے اور ہمارا مقصد بھی۔"

"تو کیا اب ہمارے نام کے آگے لگا حوالہ مضبوط یا قابل فخر نہیں۔" موتیا برا مان کے بولی۔ "تم تو ہمیشہ ہی ابا حضور کی طرح اپنے خاندانی جاہ و جلال اور صاحبزادی ہونے پہ فخر کرتی رہی ہو۔"

"تو وہ فخر تو آج بھی برقرار ہے۔ یہ تو خدا کی دین ہے اس پہ فخر کرنا ہی چاہیے لیکن یہی تو سب کی غلطی ہے۔ تم نے ہمیشہ ہمیں ابا حضور کی جانشین ہونے کا طعنہ دیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کی طرح نہیں۔ ہم ان کی طرح بھی نہیں جسے اس بات کی پروا بھی نہیں کہ اس کے نام کے آگے لگا یہ نوابی ٹیگ کس طرح سینکڑوں لوگوں میں ممتاز کر دیتا ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہے اور ہم نے اسکول میں کالج میں ہر جگہ اس امتیاز کو محسوس کیا ہے۔ لیکن ابا حضور کی طرح ہم محض اپنے آباؤ اجداد کے بخشے اس اعزاز پہ ہی قناعت نہیں کر سکتیں نام کے ساتھ ساتھ حیثیت اور مرتبہ بھی چاہیے۔ ہم انتہا پسندی سے گریز کرتے ہیں جبکہ ابا حضور اور عمیص دونوں کا رویہ انتہا پسندانہ ہے۔ ابا حضور اپنی انتہا پسند سوچ کی وجہ سے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے آتے گئے وہ چاہتے تو اپنے نام کی بدولت بہت سے فائدے حاصل کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو آج ہم پاکستان میں بھی ... کے مالک ہوتے۔

ابھی حال ہی میں انہوں نے کتنا اچھا موقع گنوایا۔ اس ملک کی سب سے بڑی کمپنی اس حویلی کو منہ مانگے داموں خریدنے پہ تیار تھی تاکہ ادھر ایک گیسٹ ہاؤس بنایا جاسکے روایت و جدت کا شاہکار گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ۔ لیکن انہوں نے کھری کھری سنا کے انہیں لوٹا دیا۔ یہی حال **عمیص** کا ہے وہ بھی کچھ کرنا تو چاہتا ہے مگر وہی بیرونی وضعداری اور بزدلی۔۔۔ وہ نہ تو ابا حضور کو کنوینس کر سکتا ہے نہ ہی اپنی بات منوا سکتا ہے۔ چاہتا تو حویلی بیچنے کے معاملے میں دباؤ ڈال سکتا تھا ان پہ۔۔۔ آخر آدھے کا وارث تو وہ بھی ہے۔ بڑے آرام سے وہ لاکھوں کے سرمائے سے بزنس شروع کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا تو وہی خواب ہے۔۔۔ کہیں چند ہزار کی نوکری مل جائے اور اس سے بھی پہلے نوکری کرنے کی اجازت۔ ہم اس کے بزدولے پن سے عاجز ہیں۔۔۔ وہ صرف مجنوں یا شیخ چلی بن سکتا ہے۔ آگے بڑھ کے منزل حاصل کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اس میں۔۔۔ صرف اور صرف لفاظی۔"

"تو کیا تم میں حوصلہ ہے اپنی منزل خود حاصل کر لینے کا۔"

"وائے ناٹ؟ ہمارا رزلٹ آلینے دو۔ پھر دیکھو ہم کیا کرتے ہیں۔ اتنی محنت ہم بے کار میں نہیں کرتے رہے۔"

"اے۔۔۔ کہیں تم جاب کرنے کے خواب تو نہیں دیکھ رہیں۔"

"خواب کیوں؟ ہم ارادہ باندھ رہے ہیں۔"

"باندھو' بلکہ کس کے باندھو۔ زور کی گرہ لگا کے لپیٹ لپٹا کے ایک طرف رکھ دینا اپنا یہ ارادہ۔" موتیا نے مذاق اڑایا اور لیٹنے کی تیاری کرنے لگی۔

"ہمیں چیلنج مت کرو۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہم خالی خالی باتوں کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے والے لوگوں میں سے نہیں۔ جو چاہتے ہیں وہ حاصل کر کے رہیں گے اور جو کہہ رہے ہیں وہ کر کے دکھائیں گے۔" اس نے ایک ابرو چڑھا کے انگشت شہادت کھڑی کر کے اعلان کیا۔

"پہلے تو میں تمہیں آئینہ دکھا دوں پھر تم دیکھتی دکھاتی رہنا۔" موتیا نے اس کی طبیعت صاف کرنے کی ٹھانی۔ "بے چارہ **عمیص** پچھلے کئی سالوں سے دھکے کھا رہا ہے۔ ابا حضور اس کی بے روزگاری' بے کاری' بے زاری سب سے آگاہ ہیں گھر کے ابتر حالات سے بھی واقف ہیں اس کے باوجود نواب گھرانے کے اکلوتے فرزند کو ملازمت کر کے خاندانی عزت پہ بٹہ لگانے کی اجازت دینے پہ تیار نہیں۔ تم اس گمان میں مت رہنا کہ تم ان کی رضامندی سے "کیریئر وومن" بن جاؤ گی۔ کالج یونی ورسٹی جا کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور بات ہے اور اس تعلیم کے ذریعے مال کمانا اور بات ہے۔ تمہارے معاملے میں ان کا ردعمل **عمیص** کے مقابلے میں کہیں بڑھ کے شدید ہوگا۔ کسی دوسرے کی ملازمت کرنا اور وہ بھی چند ٹکوں کے لیے ان کے نظریے کے مطابق ویسے ہی ناقابل قبول ہے اور "صاحبزادی" کو آفسوں میں رلتے دیکھنا مزید یہ کہ اس کی کمائی کھانا اور بھی ناقابل عمل۔ تمہارا مطالبہ سن کر تو وہ کھڑے کھڑے تم پہ اس خاندانی رائفل کا اختتام کر ڈالیں گے جو کئی دہائیوں سے بیٹھک کی دیوار پہ آویزاں ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔ خاندانی رائفل۔۔۔" گل مہر نے تمسخرانہ ہنکارا بھرا۔ "تمہارے خاندان کی دیگر باقیات کی طرح وہ رائفل بھی بس دیکھنے لائق ہی ہے۔ پھپھسی ٹھس۔۔۔ تم شرط لو اگر جو ابا حضور اسی سے ایک بھی فائر کر سکے۔ سالوں سے لٹکے لٹکے اس میں زنگ لگ چکے ہوں گے۔ بھلے حضور باقاعدگی سے اس کی صفائی کرتے رہتے ہیں۔ اور ہماری یہ بات بھی لکھ کے رکھ لو تاکہ سند رہے اور وہ حضور کے قواعد و قوانین بھی اب ٹھس اور بے عمل ہو چکے ہیں۔ بھلے اپنی بندوق کی طرح وہ اپنے قوانین کی جھاڑ پونچھ بھی کرتے رہتے ہیں لیکن محض گرد صاف کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو زنگ ہے جو ہر سالخوردہ مقدر ہے اور اس کے جان لیوا حملے سے کچھ بچ نہیں پاتا۔ **عمیص** کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اسے بات منوانے کا ہنر نہیں آتا بلکہ اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ جس قسم کی ملازمت کے خواب وہ دیکھتا ہے 'ان کے بارے میں ابا حضور کا ردعمل بالکل فطری ہے۔ واقعی اب ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں کہ صاحبزادے

علی خان ولد صاحبزادہ انیس علی خان ولد صاحبزادہ اقدس علی خان نواب آف فلاں فلاں ریاست سیلزمین بن کے واشنگ پاؤڈر اور بنیانیں بیچتے پھریں یا کسی تھرڈ کلاس سے محکمے میں کلرک بادشاہ بن جائیں۔ بے فکر رہو۔ ہم آفسوں میں رلنے والی تعلیم نہیں حاصل کر رہے۔ اگر ہم رزلٹ ویسا ہی لے آتے ہیں جیسا کہ ہمیں توقع ہے تو یقین کرو ایک شاندار مستقبل ہمارا منتظر ہے۔ ہماری تو ابتدا ہی ایسی زبردست سیلری سے ہوگی کہ **عمیص** جیسے خالی خولی گریجویٹ اس کا صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

"تم چاہے ایک لاکھ ماہانہ تنخواہ والی نوکری ڈھونڈ لو۔ ابا حضور کے لیے تو وہ نوکری ہی ہوگی یعنی کہ۔۔۔ نوکر والی نوکری۔"

"خیر وہ تو ہم انہیں سنبھال لیں گے۔" اس نے بے فکری سے ہاتھ ہلایا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ان کے نزدیک ہر ملازمت ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ دلگیر ہماری کر رہا ہے لیکن جب وقت آئے گا تب دیکھیں گے۔"

"اتنی خوش فہم اور پر امید بننے کی ضرورت نہیں۔" موتیا کو غصہ آگیا۔ **عمیص** کو شیخ چلی کے خطاب سے نوازنے کے بعد خود وہ مسلسل شیخیاں بگھار رہی تھی۔ "وہ کبھی تمہاری ملازمت پہ راضی نہیں ہوں گے۔"

"انہیں ہونا پڑے گا۔" کمبل کی تہہ کھولتی گل مہر کو غصہ آگیا۔ "آخر ہمیں خود تو اپنی زندگی سہل اور بہتر بنانے کا حق ہے ناں۔ حالانکہ یہ ان کا بھی فرض تھا کہ وہ ہمیں وہ سب دیتے جو ہم ڈیزرو کرتے ہیں لیکن اگر اپنے خود ساختہ اصولوں کی خاطر وہ ایسا نہیں کر پائے تو ان کو کوئی حق نہیں کہ وہ ہمیں ہماری صلاحیتوں کے استعمال سے روکیں۔"

اس کے جارحانہ تیور پہ اب تک بات کو ہلکے پھلکے انداز میں لیتی موتیا ششدر رہ گئی۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد وہ ٹھیرے سے گویا ہوئی۔

"پلیز۔۔۔ ایسے مت کہو گل۔ یوں بے رحمی سے تو انہیں الزام مت دو۔ ان کی انتہا پسند سوچ سے میں بھی اختلاف رکھتی ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ان پر حقوق کی بجا آوری میں ناکام ہونے کا الزام لگا دیں۔ آخر ہماری سب ضروریات انہی نے پوری کی ہیں۔"

"یہ تو اپنی سوچ پہ منحصر ہے کہ کس کی کیا ضروریات ہیں اور وہ کس حد تک پوری ہوئی ہیں۔۔۔؟ یہ پوچھو کہ اپنا یہ تعلیمی کیریئر کن کن مشکلات سے گزر کر تکمیل تک لائے ہیں۔ محض فیس ادا کر دینے سے فرض تو نہیں ادا ہو جاتا۔ ہمارے کلاس فیلوز کے پاس مہنگی مہنگی ٹیوشنز ہوتیں' قیمتی ریفرنس بکس ہوتیں' نئے ماڈل کے کمپیوٹرز اور ہم۔۔۔ پوچھو کہ یہ سب تکالیف کس طرح برداشت کیں۔ صرف اور صرف ایک اچھے مستقبل کے لیے ایک اچھے کیریئر کے لیے اور ہم اپنی یہ سب جدوجہد ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ ہم ابا حضور پر واضح کر دیں گے کہ ہمارا میدان میں آنا اس گھر اور خاندان کے لیے کتنا ضروری ہے۔۔ وہ اپنے جس وارث پہ امید بھری نظریں لگائے بیٹھے ہیں وہ سوائے شعر رٹنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا اور شعر بھی دوسرے شعراء کے۔

اس میں تو اتنی قابلیت بھی نہیں کہ اپنا کوئی دیوان ہی چھاپ سکے' سنا ہے اب تو شاعر اور افسانہ نگار بھی اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔ خاصی مہنگی کتابیں ہوتی ہیں۔" اس نے مادیت پسندی کے ریکارڈ توڑتے ہوئے پوچھا تو موتیا افسردہ ہو گئی۔

"تم اس بیچارے کو ہر بات میں کیوں گھسیٹ لیتی ہو۔"

"کیوں نہ گھسیٹیں۔۔۔ آپی حضور اس کا درد سر ہیں نہ کہ ہمارا۔ ابا حضور نے ان کی شادی کر دی۔۔ بس ٹھیک ہے اب وہ جانیں ان کا گھر اور اگر زیادہ ہی مشکل ہے تو ان کا بھائی ہے ناں۔۔۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ لیکن نہیں ایک تو ویسے ہی گھر کے حالات اتنے خراب ہیں اور اوپر سے ان کے کنبے کا اضافی خرچہ الگ۔"

"اف خدایا۔۔۔ گل مہر خدا کا واسطہ ہے۔" موتیا نے باقاعدہ دونوں ہاتھ جوڑے۔ "خدا کا واسطہ ہے تم سو جاؤ۔" وہ ایک کے بعد ایک کے لتے لینے لگی تو موتیا اس وقت کو پچھتائی جب اسے چھیڑا تھا۔ گل مہر نے سر جھٹک کے

کروٹ لے لی۔

کمرے میں ایک دم ہی سناٹا چھا گیا۔ سرگوشیوں میں شروع ہونے والی گفتگو رفتہ رفتہ نامحسوس طریقے سے جوش جذبات میں بلند ہوتی گئی۔ اور اب ایک دم۔۔۔ سے اس کے کمبل سر تک تان لینے پہ خاموشی کا راج ہو گیا۔ موتیا کے ذہن میں گل کے دعوے اور عزائم تازہ ہونے لگے۔ دونوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہونے کے باوجود وہ دونوں دل کی باتیں بلا تکلف ایک دوسرے پہ عیاں کر دیا کرتیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے خیالات کی مخالفت ضرور ہو گی۔ اب بھی گل شاید پہلے سے آگاہ تھی کہ موتیا اس کی پلاننگ پہ اسے ڈرائے گی بھی اور دھمکائے گی بھی اسی لیے وہ اتنے پرزور دلائل رٹ کے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سارا لائحہ عمل اس لیے آگے کھول کے رکھ دیا تھا۔

"اور صاحبزادہ **عمیص** علی خان۔۔۔ تم تو اس سارے قصے میں کہیں ہو ہی نہیں۔" اس نے افسوس سے سوچا اور سونے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ دل میں تاک لگائے بیٹھے **عمیص** نے کمال پھرتی اور ہوشیاری سے بند پپوٹوں کے پیچھے آباد اس خفیہ دنیا میں چھلانگ لگائی اور یہاں سے وہاں تک بس وہ ہی وہ نظر آنے لگا۔ موتیا نے راز کھل جانے کے خوف سے فورا" آنکھیں کھول لیں اور چور نظروں سے دائیں جانب نظر گھمائی۔ گل مہر آنکھیں موندتے ہی حسب معمول گہری نیند میں جا چکی تھی۔

"خوش قسمت ہو گل۔۔۔ تمہاری آنکھوں میں کوئی گھات لگائے نہیں بیٹھا جو پلکیں گرتے ہی تمہیں اپنے بس میں کر لے۔۔۔ اور نیندیں خواب بن کے رہ جائیں۔"

گل مہر کی بے خبری سے مطمئن ہو کے موتیا نے سکون سے دوبارہ پلکیں موند لیں اور خود کو بے مہار چھوڑ دیا۔

عمیص۔

عمیص۔

اور صرف **عمیص**۔۔۔

● ● ●

"سر کوئی اے۔ ڈبلیو چوہدری صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

شہزاد کو آفس آئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کے پی اے نے اسے انٹر کام پر اطلاع دی۔

"اے ڈبلیو۔۔۔ چوہدری؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا اس نام کی کوئی اپائنٹمنٹ ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"نو سر۔"

"تو پھر چلتا کرو۔" اے ڈبلیو سے اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ آنے والی شخصیت کون ہو سکتی ہے لیکن چوہدری۔۔۔ یہاں آ کے وہ ٹھٹھک جاتا۔ "یہ چوہدری کب سے کہلانے لگا۔"

"سر ایکچو ئلی یہ صاحب کل بھی کافی دیر تک آپ کے انتظار میں بیٹھے رہے لیکن آپ میٹنگ کے بعد آفس واپس ہی نہیں آئے۔ آج چونکہ ابھی اگلے دو گھنٹے تک کوئی خاص اپائنٹمنٹ نہیں ہے اس لیے میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں شاید آپ ملنا چاہیں۔"

"کل بھی۔۔۔" اس نے اکتاہٹ سے پوچھا۔ اگر یہ وہی حضرت ہیں جن کا اندیشہ اسے تھا تو پھر ٹالنے کا فائدہ کوئی نہ ہوتا کیونکہ ان کی ہٹ دھرمی یا ڈھٹائی سے وہ بخوبی واقف تھا۔

"اور اگر یہ اے ڈبلیو واقعی وہی ہے تو ضرور کسی نہ کسی مقصد سے یہاں تک آیا ہو گا اور جب تک مطلب پورا نہ ہو جائے یونہی آتا رہے گا چاہے میں اسے روز کے دس چکر ہی کیوں نہ لگواؤں۔ بہتر ہے کہ آج ہی قصہ پاک کر دوں۔"

یہ سوچ کر اس نے پی اے کو اسے اندر بھیجنے کا آرڈر دے دیا۔

"او خیر میرے شہزادے پتر کی۔۔۔ ستے ای خیراں۔۔۔ سوہنے رب نے کیا رنگ لگائے ہیں۔۔۔

اپنی کراری پاٹ دار آواز میں نعرے لگاتا ڈھیلے کف والے بازو ہوا میں بلند کرتا وہ سیاہ رو شخص اندر آیا جسے دیکھ کر شہزاد کی پیشانی ان گنت بلوں سے بھر گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس بھر کے چھوڑا اور ناگوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا جو آفس کے چاروں طرف گردن گھما گھما کے جائزہ لیتا ہوا قصیدے پڑھ رہا تھا۔

اس کے چہرے کی سیاہی جوں کی توں تھی بلکہ ادھ گنجے سر سے بہتے تیل نے تارکول سے چمک بھی پیدا کر دی تھی اس چپچپی چمک دمک کے ساتھ اس کی ناک اور پچکے ہوئے رخساروں پہ موجود چیچک کے گڑھے نما نشانات اور نمایاں ہو رہے تھے۔ سر کے گنتی کے بال سستے سے خضاب سے چہرے کے ہم رنگ کر کے خوب کھینچ کھینچ کے اس طرح جمائے گئے تھے کہ بدوضع ننگی کھوپڑی کا بہت سا حصہ ڈھک گیا تھا۔ چنی منی عیار آنکھوں کے گدلے پن میں حرص چمک رہی تھی۔ پان رنگے ہوئے ہونٹوں کی اوٹ سے پیلے، سرمئی بڑے بڑے دانت باہر نکلے جا رہے تھے، مسلسل مسکرانے کی کوشش میں پانی کی پیک باچھوں سے بہہ بہہ جاتی تھی۔ کئی سالوں پرانا وہ بوسکی کا سوٹ شہزاد کا جانا پہچانا تھا، عموما" وہ لنگی بنیان ہی میں ملبوس رہا کرتا مگر باہر نکلتے ہوئے شلوار قمیص پہنی جاتی جو اب کثرت استعمال کے بعد بوسکی کی کم اور ٹشو پیپر کی بنی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ شہزاد نے بیزاری سے قمیص پہ موجود پرانی نشانیوں کو گھورا۔۔۔ وہی پان کے چھینٹے دامن پہ۔۔۔ وہی آستین پہ دو جگہ سے گہرے رنگ کے دھاگے کی رفوگری۔۔۔ وہی تین سفید اور ایک براؤن بٹن۔۔۔

"بڑا پھرتیں (شیخیاں) مارتا تھا تیرا باپ۔۔۔ میرا شہزادہ ایسا۔۔۔ میرا شہزادہ ویسا۔۔۔ اللہ پاک نے بڑے بھاگ جگائے ہیں میرے پتر کے۔۔۔ افسروں والا دفتر ہے۔۔۔ میں نے کہا چل بھئی اللہ وسایا اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آ رونق میلہ۔۔۔ بھئی سچل ہے سچل۔۔۔ حتیٰ کہتا تھا کرما کہ اس کا پتر شہزادہ ہے۔ واہ جی واہ۔۔۔ کیا نور ہے۔۔۔ کیا بات ہے۔ جی کیا بات ہے۔۔۔ میں قربان۔۔۔ میں صدقے۔۔۔ میں۔"

وہ لہرا لہرا کے اور بھی نجانے کیا کہتا رہتا کہ شہزادہ نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا۔

"اصل بات بتاؤ، کیسے آنا ہوا؟"

"اے لو جی، گل ای مک گئی۔۔۔ کیا میں اصل بات نہیں بتا رہا۔ سچی گل اے، میں تو صرف تیرے ٹھاٹھ اور عیش ہی دیکھنے آیا تھا۔" وہ کرسی پہ پھیل کے بیٹھ گیا اور ندیدے پن سے اس کے سامنے پڑے کافی کے مگ اور سینڈوچ کو دیکھنے لگا۔ شہزاد کا جی مکدر ہو گیا۔ اس نے اب تک کافی کو چھوا بھی نہیں تھا۔ خاموشی سے آگے سرکاتے ہوئے بادل نخواستہ اسے پیش کیا ورنہ دل اسے ایک پل بھی مزید بھٹکنے پر تیار نہیں تھا۔

"او ناں جی ناں، تسی کھاؤ۔" اس نے **تکلفا**" انکار کیا۔

"نہیں اور منگوا لیتا ہوں۔ تم لو۔" اس نے زیر لب فقرہ یوں مکمل کیا "اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"ہائے ہائے یہ کالا کوڑا زہر دفع۔" اللہ وسایا نے پیک کی پھواریں اڑاتے ہوئے ٹرے ہاتھ کے دھکے سے پرے کی۔ شہزاد کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔

"کتنا شیر جوان ہوتا تھا تو، یہ کالے ابلتے کاڑھے پی پی کے میرے شہزادے نے سارا رنگ روپ ہی ساڑ (جلا) لیا ہے۔ ہائے ہائے۔۔۔ کیا پاپا کی اکھ ہوتی تھی لال ڈوروں والی جیسے بھنگ کا کولا (پیالہ) چڑھا رکھا ہو۔ کیا لال لال گال تھے، سرخیا چوہ چوہ (ٹپک) پڑتی تھیں ہائے ہائے۔"

"خوراکاں کھایا کر میرے جوان۔۔۔ خوراکاں۔۔۔ یہ ڈبل روٹیوں میں سڑے بسے کباب **بھے بھے** کے (دبا دبا کے) کھاتا ہے تبھی سارا پنڈا، ساری چھب ہی بدل گئی ہے۔ ہائے صدقے خوراکیں تو ہماری ہوتی تھیں۔۔۔ میری [illegible] تیرے پیو (باپ) کی سویرے سویرے یہ بڑے بڑے پیتل کے گلاس پیڑوں والی لسی کے چڑھاتے، نالے مولے [illegible] بند (بن) نیر گھنٹہ دو گھنٹے بعد حلوے پوریاں درجنوں ہی کھا جاتی، ایک پوری میری ایک برکی (لقمہ) ہوتی تھی [illegible] سے اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے دوپہری ترے چار (تین چار) ککڑ میں نے اکیلے نے پھڑکا دینے۔۔۔ روغنی نان اور [illegible] لے موٹی ملائیاں والا دہی اور رات کو تو میں بلاناغہ وڈے بازار (بازار حسن) جاتا تھا پائے کھانے۔۔۔ **بھیجے** کی

ایک دیگ تو میرے اکیلے کے لیے ہوتی تھی۔۔۔ بڑا سواد تھا۔۔ بڑے عیش تھے ان دنوں۔۔۔ او شہزادے تیرے پیو نے اور میں نے پیسہ ان لکڑی کی کرسیوں پہ نہیں روڑا (بہایا) اپنے اوپر لگایا۔ اور اک تو ہے اپنی فکر نہ اپنے سگوں کی۔۔ بس مال پہ مال بنائے جا رہا ہے میں صدقے سوہنے پتر کے کوئی فیض ہمیں بھی تو ملنا چاہیے۔" خوشامدی انداز میں اس نے دونوں ہاتھ کہنیوں تک ملا کے ماتھے سے لگائے۔ شہزاد جواب تک کمال صبر سے خاموش بیٹھا اس ایک فقرے کا انتظار کر رہا تھا، سرہلا کے رہ گیا۔ اس کا ہاتھ والٹ تک گیا اور ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کے اس نے میز پہ رکھے۔

"یہ لو۔ تین چار ککڑ پھڑکاؤ' رات کو بھیجے کے سری پائے کھانے اپنے ننھیال بھی ہو آنا۔" طنز میں لپیٹ کے وہ بڑی کڑوی بات کہہ گیا۔ نوٹ کی طرف بڑھتے اللہ وسایا کے ہاتھ لمحے بھر کو تھم گئے۔ سیاہ چہرہ 'خوشامد اور چاپلوسی کا پردہ چاک کر کے پل بھر کو عیاں ہوا پھر اس کے لب دوبارہ پھیل گئے اور ہاتھ نوٹ تھام کر واپس گود میں آن گرے۔

"ناں پتر ناں ایسے نئیں کہتے ہمارا تو پیشہ ہی لوگوں کا حساب کتاب رکھنا ہے 'ان کے خاندانوں کا حساب 'ان کے اگلے پچھلوں کی کتاب ہمیشہ ہمارے کھیسے (جیب) میں ہوتی ہے۔ ہم سے زیادہ کسے پتا ہوگا کہ کس کا نانکا (ننھیال) کون سا ہے تو دادکا (ددھیال) کون سا ہے۔" اس نے سرسراتے لہجے میں آگے کی طرف جھک کے کہا تو شہزاد تپ گیا۔

"چلو اب چلتے بنو اور آئندہ میرے آفس تک نہ آنا۔" اس نے چٹکی بجا کے اسے نکلنے کا اشارہ دیا۔

"ہم تو تیرے بجن ہیں شہزادے 'تیرے پیو کے بیلی (دوست) اور تیرے خیر خواہ' ہمارے ساتھ اتنا او کھانہ بول' اس طرح رو کھانہ بن۔ حق بنتا ہے ہمارا تجھ پہ۔ آؤں گا اور سو سو دفعہ آؤں گا۔" اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دانت نکالے۔

"یہ پہلا واقعہ تھا اور میں اس وقت آفس میں اکیلا بھی تھا اس لیے بارہ منٹ تک برداشت کر لیا لیکن اگر آئندہ یوں منہ اٹھا کے میرے آفس تک آئے تو ـــــ میں تمہاری عمر کا بھی کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔"

"عمر کا نہ سہی 'رشتے کا ہی لحاظ کر لے شہزادے۔ میں نے کہا ہے ناں کہ ہمارا حق بنتا ہے۔ تجھ پہ تجھے اللہ نے اتنا نوازا ہے 'اتنے کرم کیے ہیں تو بھی کسی کو نواز' کسی پہ کرم کر۔ یوں ہزار دو ہزار دے کر حق تو نہیں ادا ہو جاتا۔ ایک بار دل وڈا کر کے ہمارے بھی رزق کی کوئی سبیل پیدا کر دے۔ میری اپنی کمائی میں برکت ہو گئی تو مجھے کیا لوڑ ہے بھاگ بھاگ کر تیرے پاس آنے کی۔"

"میں نے ایک بار نہیں 'تین بار تمہیں ٹکانے کی کوشش کی تھی مگر ہاتھ پیر ہلا کے روٹی کمانا تمہارے بس کی بات نہیں 'زبان چلا کے پیٹ بھرنے والے زمانے گزر گئے۔ اب تو جس نے ہمت کی محنت کی 'کامیابی اسی کی ہے۔ ٹی وی اسٹیشن پہ ملازمت دلوائی 'وہ تم نے چھوڑ دی۔ ہوٹل پہ لگوایا وہاں تم صرف ایک دن گئے دوبارہ گئے ہی نہیں اور تیسری دفعہ دکان ڈالنے کے لیے رقم دی جو تم نے پتہ نہیں کہاں اڑا دی۔ تمہیں ہڈ حرامی کی لت پڑ چکی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔"

"جب پتہ ہے کہ میں لاعلاج ہوں تو پھر سر کھپانے کی کیا لوڑ (ضرورت) تیرا پیو اور میں ایک ہی عمر کے ہیں وہ بھی تو بستر پہ لیٹا عیش کر رہا ہے 'پتر کما رہا ہے پھر میں کیوں رلتا پھروں 'ٹکے ٹکے کی نوکری کے لیے دھکے کھاتا پھروں۔ سمجھا کر شہزادے 'اب میرا زمانہ نہیں رہا' ہڈ حرامی کی تو نے اچھی کہی اوئے یہ میرے ہی ہاتھ تھے جو ساری ساری رات طبلے پہ پڑتے تھکتے نہ تھے 'اپنے وقت میں میں نے بھی کوئی تھوڑا نئیں کمایا بس اب ہمت جواب دے گئی ہے کچھ وقت بھی بدل گیا ہے۔ اب وہ تاتھیا تاتھیا والا دور نئیں رہا۔ اب کمائی کی باری ہم بڈھوں کی نئیں ہمارے بچوں کی ہے۔ کرمے کو تو نے کرم لگا دیے اب میری دھی کی باری ہے۔ رب سوہنا چاہے تو اس کے طفیل میرے بھی دن پھر جائیں گے۔"

شہزاد پل میں ساری بات سمجھ گیا۔ اس کے خاموش لب بھینچ گئے۔

"شعیب صاحب نے بڑی آس دلائی تھی کہ وہ ادا کو چانس دیں گے لیکن اب وہ کہہ رہے ہیں کہ بات نہیں بنی اور وجہ ــ وجہ تم ہو پتر۔ میں تو یقین ہی نئیں کر رہا تھا۔ ہائے ہائے اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پہ بجلیاں۔ تمہارے ہوتے ہمیں تو فکر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ گھر کی بات ہے تم چاہو تو ادا ایک دن میں چار چار ڈرامے سائن کر لے۔ لیکن تم نے تو خود اس کی راہ کھوٹی کر دی۔ اب کیا میں گلہ بھی نہ کروں۔"

"ادا اس لائن میں نہیں آئے گی۔" شہزاد نے مختصر فقرے میں بھرپور وار تنک دی جسے وہ کسی خاطر میں نہ لایا۔

"کیوں نہ آئے گی۔ اس لائن میں نہیں آئے گی تو کیا سرکاری اسکول میں چپڑاسن لگے گی۔ اس کے پاس ہنر ہے 'فن ہے 'سر ہے 'گلا ہے 'ٹھرک ہے۔ کیوں نہ آئے وہ تو شہزادے موقع ملنے پہ تہلکہ مچا دے گی۔ لیکن بس موقع ہی تو مل نہیں رہا۔ آج کل ہر طرف سفارش کا راج ہے۔ اچھے بھلے کروڑ پتیوں کی بیٹیاں ہمارے جدی پشتی رزق پر لات مارنے آ گئی ہیں۔ کوئی کسی وزیر کی بیٹی 'کوئی کسی افسر کی 'کوئی جرنیل کرنیل کی۔ اور میں کہتا ہوں جاؤ عیش کرو' سیٹھوں کی بیٹیاں ہو' سیٹھوں سے شادی کرو' بچے پالو' ہماری لڑکیوں کا دھندا کیوں کھوٹا کرتی ہو اور اگر اتنا ہی شوق ہے ان کی جگہ سنبھالنے کا تو پھر اپنی جگہ ہماری لڑکیوں کو دے دو۔ لیکن ناں جی۔ ناں۔ ہمارا حق لے لیتے ہیں 'اپنا نئیں چھوڑتے۔ ہمارے لیے تو دنیا ہی تنگ ہو گئی ہے۔ اب کیا کمی ہے اپنی ادا میں بالی عمر' سریلا گلا' من موہنی صورت۔۔۔ لیکن وہ پکی عمر کی خرانٹ عورتیں پلے سے پیسہ لگا کے ٹی وی اور اسٹیج پہ راج کر رہی ہیں اور میری بیٹی ـــ چانس ملنے کے انتظار میں ہے۔ خیر غیروں سے کیا گلہ۔ تم اپنے ہو کے ہاتھ نہیں تھام رہے تمہارے تو اپنے ڈرامے ہیں۔ اپنی کمپنی ہے چاہو تو۔۔۔"

"میں نہیں چاہتا' سنا تم نے۔ میں نہیں چاہتا۔" وہ چلایا۔

"ٹھیک ہے جی اللہ مالک ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تو بڑی امیدیں لے کے آیا تھا' سوچا تھا اپنا پتر ہے وسیلہ بن جائے گا لیکن۔۔۔ چلو جی غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ لیکن ایک بات میری لکھ کے رکھ لو شہزادے۔ فن کبھی چھپا نہیں رہ سکتا۔ آج نہ سہی کل سہی' دیر سے ہی سہی 'میری ادا ایک دن سر سنگیت کی دنیا پہ راج کرے گی۔"

"یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اسے اس گند میں گھسیٹنے کی کوشش مت کرنا ابھی اس کی عمر کیا ہے۔ آرام سے اسے تعلیم حاصل کرنے دو۔ چار پانچ سال بعد اچھے گھر بیاہ دینا۔ میں خود رشتہ ڈھونڈ لوں گا۔ تب تک تم ہر مہینے ایک معقول رقم خرچے کے نام پہ مجھ سے۔۔ یا ایسا کرو گھر جا کے ابا سے لے لیا کرو۔۔ تمہارا خرچہ چلتا رہے گا جب تک تم چاہو مگر اس کی کمائی کھانے کی تمنا دل سے نکال دو۔"

"اپنے خرچے اپنے پاس رکھو شہزادے۔ ہم فنی لوگ ہیں۔ جو فن ہمیں آتا ہے اسی کی روٹی کھاتے ہیں۔ فن کار کی بیٹی فن کار بنے اس میں شرم کی کیا بات۔ تم مدد نئیں کر سکتے نہ کرو۔ الٹے سیدھے مشورے دینے کی ضرورت نہیں۔" وہ دھپ دھپ چلتا دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک کچھ خیال آنے پہ شہزاد نے اسے پیچھے سے پکارا۔

"سنو' یہ تم اللہ وسایا سے اے ڈبلیو چوہدری کیسے ہو گئے؟" اس کے سوال پہ وہ پلٹ کے عجیب خباثت سے مسکرایا۔

"ویسے ہی۔" اس نے باریک تلوار سی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"ویسے ہی جیسے تم شہزاد ملک ہو گئے۔ تم ملک ہو سکتے ہو تو ہمیں چوہدری بنتے کیا موت آتی ہے شہزادے۔"

وہ کمرے سے جا چکا تھا' لیکن شہزاد چاروں طرف آئینے لگے دیکھ رہا تھا' قد آدم سچے منہ پھٹ آئینے۔

اس نے آنکھیں میچیں اور چیئر کی بیک سے سر ٹکا کر پیشانی مسلنے لگا۔ کانوں کے پاس ہلکی ہلکی سی بھنبھناہٹ ہونے لگی۔

"سریلی بیگم۔۔۔"

”سریلی بیگم۔“

بھنبھناہٹ رفتہ رفتہ بازگشت میں بدل گئی۔ اس نے جھنجلا کے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔

”سریلی بیگم۔“ اب صداؤں میں قہقہے بھی شامل ہو گئے۔

”نہیں۔“ وہ چلا اٹھا اور سامنے پڑا پیپر ویٹ اٹھا کے دیوار سے دے مارا۔

☼ ☼ ☼

”دل چیز کیا ہے آپ میری۔“

دلگیر نے آپ کو کچھ زیادہ ہی لمبا کھینچتے ہوئے کان پہ ایک ہاتھ رکھ کے اور دوسرا ہاتھ نزاکت سے فضا میں لہرا کے تان لگائی۔

”دل چیز کیا ہے آپ میری۔ جان لیجیے۔“

دونوں ہتھیلیاں جوڑ کے سینے سے دل نکال کے گویا عمیص کے قدموں میں رکھتے ہوئے اس نے گیت کا پہلا بول مکمل کیا اور عمیص نے بھنا کے اسے زور کا دھکا دیا۔ صاحبزادی خلعت النساء نے بھی اپنی جلالی نظروں سے اسے گھورا۔

”دلگیر۔“ ان کی فقط اتنی تنبیہہ کافی تھی ورنہ عمیص کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ دلگیر کے بال نوچ ڈالے۔ وہ اتنی سنجیدگی سے والدہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اول تو انہیں اپنی عبادات اور ذکر و وظائف سے ہی فرصت نہ ملتی تھی اور آج نجانے کیسے وہ بیٹے سے اس کے مستقبل کے حوالے سے تفکرات سننے پہ تیار ہو گئی تھیں اور صاحبزادے عمیص کے لیے تو صرف اتنا ہی کافی تھا کہ وہ کم از کم اسے سننے پہ تو رضامند ہوئیں۔

”امی حضور، آپ خود خیال کیجیے ایسا کب تک چلے گا۔ کب تک میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھا رہوں گا۔ کیا میری ساری زندگی یوں ہی گزر جائے گی۔“

”یہ ہم بھی نہیں چاہتے، مرد کی یہ شان نہیں لیکن صاحبزادہ عمیص آپ بھی یہ احتیاط لازم رکھیں کہ ہمارے خاندان میں ماشکیوں (پانی بھرنے والے) کی گنجائش نہیں۔“

”اوہ۔ امی حضور۔“ وہ سر تھام کے رہ گیا۔ کچھ روز قبل اسے ایک دوست کی وساطت سے بڑا اچھا کام مل رہا تھا۔ اس کی منرل واٹر کی کمپنی تھی۔ ڈیفنس کے پوش ایریا میں جہاں لوگ سرکاری نل کا پانی پینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، اس پانی کی ترسیل بڑے پیمانے پہ کی جاتی تھی، محض لیٹر کی بوتلوں سے کام نہیں چلتا تھا۔ موبائل سروس کے ذریعے مستقل کسٹمرز کے گھروں تک منرل واٹر کے ٹینک پہنچائے جاتے۔ اسے بھی یہی آفر ہوئی تھی کہ صرف تین گھنٹوں کے لیے ڈیفنس کے ایک مخصوص بلاک میں پانی پہنچانے کے عوض اسے ماہانہ چار ہزار ملیں گے کام بے حد آسان تھا۔ دو ملازمین کے ساتھ ایک ویگن چلا کے بڑی بڑی کوٹھیوں کے آگے ذرا دیر کو رکنا ہی تو تھا، ٹینک اتارنے اور چڑھانے کے لیے ملازم تو تھے ہی۔ لیکن صاحبزادہ نفیس علی خان یہ ذکر سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے اور اچھی بھلی معقول ملازمت کو ”ماشکی“ والا پیشہ قرار دے دیا اور اب اپنی امی حضور کی زبانی وہی الفاظ سن کر وہ بے بسی کی آخری انتہا پہ پہنچ گیا۔

”دونوں کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہیں۔“ اس نے سوچا لیکن پھر انہیں سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔

”خدارا امی حضور، ذرا کچھ تو اپنے خیالات کو بدلتے حالات کے ہم آہنگ کر کے دیکھیے۔ جتنی ہماری تعلیم ہے اس کے لحاظ سے مجھے ایسی ہی ملازمتیں ملیں گی۔ کاروبار شروع کرنے کے لیے کثیر سرمایہ چاہیے وہ میں کہاں سے لاؤں۔ چچا حضور تو بینک سے قرضہ لینے میں ہی اپنی ہتک سمجھتے ہیں ورنہ میں چھوٹے پیمانے پہ ہی سہی کوئی کاروبار تو شروع کر لیتا۔ حالانکہ اس میں بھی سو قباحتیں تھیں۔ کپڑے کا شروع کرتا تو ان کی نظر میں جولاہا ٹھہرتا، گروسری اسٹور کھولتا تو پرچون فروش کا خطاب ملتا۔ بڑا کاروبار کرنے کے لیے بڑی رقمیں چاہئیں، وہ کہاں سے لاؤں؟“

”الگ سے کاروبار کرنے کی آپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اپنے چچا کے ساتھ زمینداری کیجیے، جاگیرداری

سنبھالیے۔“ والدہ کی صلاح پہ سکون سے گفتگو کرتا عمیص جھنجلا اٹھا۔

”پلیز امی حضور، اس خود فریبی سے خود کو نکال لیجیے۔ کیسی زمینداری اور کہاں کی جاگیرداری۔ چند باغات کو آپ جاگیروں کے نام دے رہی ہیں۔ چچا حضور ان کا انتظام بخوبی سنبھالے ہوئے ہیں، منشی بھی بھروسے کا آدمی ہے اس کے باوجود مجھے ان کا ہاتھ بٹانے میں کوئی عار نہیں لیکن اس سے حاصل کیا ہو گا۔ میری بے کاری کا خاتمہ ہو جائے گا، چچا حضور کا بوجھ کم ہو جائے گا لیکن آمدنی تو اتنی ہی رہے گی۔ میری وجہ سے زمینیں بڑھ تو نہ جائیں گی۔ میں یہی بات تو آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان باغات سے آنے والی آمدنی اب ہمارے لیے ناکافی ہے۔ اخراجات نہ چاہتے ہوئے بھی دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں جبکہ تعیشات اور سہولیات کا نام و نشان تک نہیں اس حویلی میں برسوں سے یہی ایک بلب اور تین ٹیوب لائیٹس رات کے چند گھنٹوں کے لیے روشن ہوتے ہیں اور یہی دو پنکھے ساری گرمی چلتے ہیں لیکن آپ کے بھی علم میں ہو گا کہ بجلی کا بل ہر سال پہلے کی نسبت کتنا بڑھ جاتا ہے۔ امی حضور ہماری قناعت پسندی اب تھکنے لگی ہے ہم سب جتنا ہو سکتا ہے، حالات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر بچت۔ بچت اور مسلسل بچت یہ کفایت شعاری مہنگائی کے قد آدم دیو سے آخر کب تک نبرد آزما رہے گی۔ مان جائیے کہ میری ملازمت اب ناگزیر ہو چکی ہے۔“

”ہمیں آپ کے دلائل سے چنداں اختلاف نہیں مگر جو بات آپ ہم سے منوانا چاہ رہے ہیں وہ ناممکن ہے۔ بھائی میاں آپ کے فارغ رہنے کے حق میں نہیں نہ ہی انہیں آپ کے مزاج کی تلخی اور پژمردگی قبول ہے لیکن وہ بھی کیا کریں۔ کیسے چند ٹکوں کے لیے خاندانی نجابت گروی رکھ دیں۔“ انہوں نے سرد آہ بھری۔ ”آج آپ کہہ رہے ہیں کہ اتنی تعلیم کے ساتھ ایسی ہی ملازمت ملے گی، کاش آپ پہلے ہی اپنی تعلیم کو سنجیدگی سے لیتے۔“

”کیسے سنجیدگی سے لیتا۔“ وہ تلخ ہو گیا۔

”امی حضور، میرے آس پاس کا ماحول کبھی مجھے پرامید یا خوش آئند ہونے نہیں دیتا تھا۔ کس امید پہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کوشاں ہوتا؟ بتائیے۔ کس کے لیے؟ کیا ابا حضور کا حال میرے سامنے نہ تھا۔ کیا انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود وکالت کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن یہ تعلیم ان کے کس کام آسکی؟ نانا حضور کے حکم کے مطابق انہوں نے اپنی وکالت کی ڈگری فریم کروا کے دیوار پہ نصب کرا ڈالی مگر پریکٹس کرنے کا خواب تک نہ دیکھ سکے کیونکہ ان کے چچا حضور کو یہ گوارا نہ تھا کہ نواب گھرانے کا چشم و چراغ عادی مجرموں، قاتلوں اور اچکوں کے مقدمے لڑے۔ یہ بے بسی انہیں وقت سے پہلے کھا گئی۔“

صاحبزادی خلعت النساء کی بلوریں آنکھیں بھیگ گئیں،

”ایسے نہیں کہتے صاحبزادے۔ ہر فرد کے لیے اجل نے ایک وقت طے کر رکھا ہے یہ سچ ہے کہ آپ کے ابا حضور عین عالم شباب میں ہی۔“ ان کی سپاٹ آواز ذرا سا کپکپائی پھر انہوں نے کمال ضبط سے قابو پایا۔ ”یہ درست ہے کہ ان کی جانے کی عمر نہیں تھی مگر صحت کی پیچیدگیاں اتنی بڑھ گئیں کہ مسلسل علاج بھی ناکام رہا۔ آپ اس سانحے کے ذمہ دار ہمارے مرحوم والد کو نہیں ٹھہرا سکتے۔“

”معذرت چاہتا ہوں امی حضور۔!“ وہ پشیمان سا ہوا۔ ”میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وقت بدل گیا ہے لیکن ہماری حویلی پہ وقت یونہی تھما ہوا ہے کئی سالوں سے کچھ بھی نہیں بدلا میں کس امید پہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا۔ بالفرض اگر میں ڈاکٹر بھی بن جاتا تو چچا حضور یہی فتویٰ صادر فرماتے کہ کمی کمین، گندے مندے مریضوں کو سرنج گھونپنا ہمارے خاندان کی شان کے منافی ہے، مبادا ان کے کم نسب خون کا چھینٹا کہیں مجھے چھو نہ جائے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا تو صاحبزادی خلعت النساء دنگ رہ گئیں۔

”اتنا تنفر۔ صاحبزادہ عمیص علی خان۔ اس درجہ بے باکی اور گستاخی۔؟ کیا ہمیں آپ کو یہ یاد دلانا ہو گا کہ آپ کس سے مخاطب ہیں اور کس کے بارے میں یہ ناشائستہ کلمات کہہ رہے ہیں۔“ اپنی حیرت پہ جلد ہی قابو پا کر انہوں نے اپنے مخصوص جلالی انداز میں لوٹتے ہوئے کہا تو بڑھ چڑھ کے بولتے عمیص کو گویا سانپ سونگھ گیا، والدہ

کے اس روپ سے اس کی جان جاتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتی صاحبزادی حرمت النساء بھی ٹھٹک کے رک گئیں۔

"ہمیں آپ کے لہجے سے بغاوت کی بو آ رہی ہے صاحبزادے اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ بے زاری کی اگلی منزل بغاوت ہے اور بغاوت سے آگے نفرت اور حقارت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ آپ گھر کے ماحول اور خاندانی قواعد و ضوابط سے ہمیشہ بے زار رہے ہیں یہ ہم بخوبی جانتے تھے لیکن یہ علم نہ تھا کہ آپ اتنی جلد بے زاری کو پھلانگ کے بغاوت اور تنفر پہ اتر آئیں گے۔ آپ کے حق میں بہتر یہی ہو گا کہ اپنے بڑھتے قدم یہیں روک لیں۔ اس سے آگے جانا نہ آپ کے لیے اچھا ہے اور نہ ہم سب کے لیے۔ ہمارا مزاج گستاخی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نافرمانی اور سرکشی ہمیں پسند نہیں۔" وہ گرجتی رہیں اور عمیص چپ چاپ سر جھکائے سنتا رہا۔ صاحبزادی حرمت النساء ٹکر ٹکر کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دونوں کو تکتی رہیں۔

"دلگیر..." انھوں نے پاٹ دار آواز میں پکارا۔ جھانجھریں چھنکاتا دلگیر آنا "فانا" سامنے تھا۔

"قربان بڑی بیگم۔"

"ہمیں دالان تک لے چلو۔ ہم چاشت کی نماز وہیں ادا کریں گے۔ دھوپ تو نکلی ہو گی۔" انھوں نے تسبیح اور مجموعہ وظائف اٹھاتے ہوئے دریافت کیا۔

"کوئی ایسی ویسی؟ بڑی بیگم لشکارے ہی لشکارے ہیں سنہری گرم دھوپ کے... لیکن مزاج بخیر۔ عمیص میاں... آپ کے چہرے پہ کڑکتی دھوپ کیوں برس رہی ہے۔" اس نے ابرو نچا نچا کے پوچھا۔

"دھوپ ہی تو رہ گئی ہے نصیبوں میں۔" وہ بڑبڑایا۔ چھوٹی بیگم نے بوکھلا کے آنچل درست کرتی بڑی بہن کی جانب دیکھا کہ کہیں یہ بڑبڑاہٹ ان تک تو نہیں پہنچ گئی۔ ان کا موڈ کبھی کبھار ہی آپے سے باہر ہوتا تھا مگر یہ جلال خاصا زور آور ہوتا تھا۔ جس سے زیادہ نقصان خود ان کی اپنی ذات کو ہی پہنچا کرتا کہ وہ بلند فشار خون کے عارضے میں مبتلا تھیں اور صاحبزادی حرمت النساء کی کوشش ہوتی کہ وہ ممکن حد تک پر سکون رکھیں انہیں... جو ان کی بڑی بہن بھی تھیں اور بھاوج بھی۔

"ہونہہ سمجھ گیا۔ ضرور وہ پرسوں والے معاملے کے سلسلے میں سفارش کی جا رہی ہو گی۔ ارے عمیص میاں ایسے بات نہیں بنے گی۔ ہم بتاتے ہیں آپ کو ایک نایاب نسخہ... یوں کھڑے ہو جائیے۔" اس نے دونوں ایڑیاں ملا کے جسم کمان سا دوہرا کیا۔

"اب یوں دیکھیے۔" اس نے ایک ابرو اوپر چڑھا کے دوسرا نچاتے ہوئے اشارہ کیا۔

"اب صدا لگائیے۔"

"دل چیز کیا ہے... آپ میری جان لیجیے۔"

جیسے ہی اس نے جان لے کر عمیص کے قدموں میں نچھاور کرنا چاہی اس نے بھنا کے اسے دھکا دیا۔ بڑی بیگم نے بھی کڑے تیوروں سے گھورا۔ وہ کہنی سہلاتا انہیں تھام کے دالان تک لے گیا۔

"ہمیں بھی نہ بتائیں گے صاحبزادے...؟" چھوٹی بیگم نے عمیص کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا سر سہلا کے پوچھا۔

"کیا بتائیں چچی حضور وہی پرانا مسئلہ ہے چچا حضور اور امی حضور... دونوں ایک جیسے ہی اٹل ہیں اپنے اصولوں میں۔ انہیں اپنے اصول و ضوابط سے روگردانی منظور نہیں، چاہے اس کے نتیجے میں ان کی اولادوں کو کتنی ہی مشکلات اور مصائب کیوں نہ سہنا پڑیں۔ وہ صدیوں پرانے نسب کو زیادہ عزیز جانتے ہیں مگر ان کا وہ سرمایہ جو اولاد کی صورت میں خدا نے انہیں دیا ہے، اس کے احساسات و جذبات کی انہیں بالکل پروا نہیں۔ نہ ہی ان کی ضروریات و خواہشات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

"کیا نہیں عمیص کہ وہ دونوں آپ سے محبت نہیں کرتے یا انہیں آپ کے جذبات کی مطلق پروا نہیں۔ اتنا

احساس تو انہیں بھی ہے کہ آپ محض اپنی کسی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لیے ضد نہیں باندھے ہوئے ہیں بلکہ خاندان بھر کی بھلائی اور سہولت کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جو طریقہ آپ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ ان کے لیے قابل قبول نہیں۔ وہ بھی مجبور ہیں... یہ ان کی ضد یا انا نہیں خون میں گردش کرتا وہ غرور ہے جو آپ کے نانا حضور اور دادا حضور کی جانب سے انہیں قسم کی طرح دیا گیا تھا۔" وہ اسے تسلی دے کر باہر چلی گئیں۔ آخر بہن کی دلگیری بھی تو کرنا تھی۔

"آئیے بی بی آئیے... دیکھیں ذرا یہ بیٹھے ہیں بے درد، ہرجائی۔" دلگیر موتیا کو کھینچتا ہوا اندر لایا اور سر جھکا کے افسردہ بیٹھے عمیص کی جانب شکایتی نظروں سے دیکھ کے منہ بسورا۔

"ذرا پوچھیں تو سہی، ایسی کیا خطا کر ڈالی ہم نے کہ لے کر ہمیں دیوار سے دے مارا۔ دھتکار کے رکھ دیا۔ اف ہماری نازک کلیا۔" وہ اپنی کھردری چرمخ کلائی سہلانے لگا۔ عمیص کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی موتیا اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"سوری یار... تم بھی تو غصہ دلا دیتے ہو۔ اب کوئی موقع تھا تمہارے گلوکاری کے مظاہرے کا میں پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا اوپر سے تمہارے مجرے۔"

"ہوا کیا؟ آخر وجہ بھی تو ہو گی جلنے بھننے کی۔"

"کیا کرو گی جان کے تم بھی میرے مسئلے کی تائید کرنے کے بعد چچا حضور اور امی حضور کے اپنے موقف پہ ڈٹے رہنے کو ان کی مجبوری بتلاؤ گی۔ پھر مجھ سے ہمدردی کرنے کے بعد میری کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے معذوری ظاہر کرو گی۔" اس نے بے دلی سے اسے ٹالا وہ بھی خاموش ہو گئی شاید جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اس حویلی میں کوئی بھی اس سے زیادہ اس کی مدد کرنے کا مجاز نہیں۔

"لیکن ہم جو آپ کی مدد کر رہے تھے اس کا کیا۔ واہ ہماری خدمات کی قدر ہی نہیں، ہمارے خلوص کی کوئی قیمت ہی نہیں۔" دلگیر بلبلا اٹھا۔

"چلیں جی ارشاد۔" عمیص نے طبیعت پہ چھائے اضمحلال کے باوجود صرف اس بے ضرر معصوم ذی روح کا دل رکھنے کے لیے کہا۔

"ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ بڑے نواب کے پاس اچھا سا عطر لگا کے، جودھ پوری جوڑا پہن کے کلائی میں گجرا اور وہ بھی چنبیلی کا لگا کے... یوں سونگھتے ہوئے جائیے۔" اس نے کلائی ناک سے لگا کر ٹھمک ٹھمک چلتے ہوئے کہا۔ موتیا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"لاحول ولا..." عمیص نے خود کو تصور میں اس طرح چٹک مٹک کرتے دیکھا اور وہ بھی چچا حضور کے سامنے اور متوقع تواضع سے لرز کے لاحول پڑھی۔

"ہاں تو پھر اپنا مدعا دوہرائیے۔ اگر ان کی طبع نازک پہ گراں گزرے تو یوں التجا کریں۔ آہم۔" اس نے کھنکار کے گلا صاف کیا اور پھر سے امراؤ جان ادا بننے کی کوشش کی۔

"دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجیے۔
بس ایک بار...
ہاں... ں..." وہ بل کھا کے گھوما۔

"بس ایک بار میرا کہا مان لیجیے۔" اس نے دانتوں میں انگلی دبا کے پلکیں ناز سے پٹپٹائیں۔ موتیا ہنسے جا رہی تھی۔ عمیص نے امی حضور کی چپل اٹھائی اور گن کے سات بار دلگیر کے سر سے وارنے کے بعد اس کی کمر پہ دے ماری۔

☆ ☆ ☆

"ہائے... تمہارے اس ہم پہ ہی تو ہم مرتے ہیں۔" مزنی نے دل پہ ہاتھ رکھ کے بڑے اسٹائل سے گل مہر کو

چھیڑا جو منہ پھلائے مسلسل کی بورڈ پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔

"ہمیں تنگ مت کرو منزی۔" اس کی صبیح پیشانی پہ ایک دلکش شکن نمودار ہوئی۔ سر کو جھٹکا دینے سے وہ خم دار لٹ پھر سے گال پہ جھومنے لگی جسے چند منٹ پہلے ہی بال پین کی نوک کی مدد سے کان کے پیچھے اڑسا تھا۔

"تنگ تو تم مجھے کر رہی ہو۔" منزی نے کی بورڈ پہ متحرک اس کی انگلیوں پہ اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ پلیز کام کرنے دو ہمیں۔" وہ زچ ہو گئی۔

"اب بس بھی کرو ناں۔ کب سے کمپیوٹر سے چپکی بیٹھی ہو۔ تمہاری دوست میں ہوں یا ذلیل کمپیوٹر۔"

"لینگویج پلیز۔" اس کی نفیس طبیعت پہ منزی کی بے تکلفی گراں گزری۔

"اف۔" منزی نے پیشانی ہتھیلی پہ ٹکالی۔

"اے مغلیہ دور کی آخری نشانی! اے البیلی مغرور حسینہ۔ اے ناز پرور دوشیزہ! اے حسین و طرحدار شہزادی۔ اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

"پتہ ہے جب تم ایسے ڈرامے کرتی ہو تو ہمیں کون یاد آتا ہے۔" گل مہر نے ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگا کے ادھر ادھر گھومتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"سچ۔ تمہیں بھی کوئی یاد آتا ہے؟ کون۔ کون؟" اشتیاق دیدنی تھا۔

"دلکھو۔" اطمینان سے کہنے کے بعد اس نے پھر کمپیوٹر آن کر لیا۔

"تم بھی ناں۔ بس۔ وہ ہی ہو وہ جو میں تمہیں کہہ نہیں سکتی ورنہ تم آؤ دیکھو گی نہ تاؤ اپنا بیگ اٹھا کے چلتی بنو گی۔ اب کوئی اتنا نازک مزاج بھی نہ ہو کہ اس کا دوست غصہ آنے کے باوجود نہ تو اس پہ لعنتیں بھیج سکے اور نہ ہی تگڑی تگڑی گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال سکے۔"

"چلو، ہمارے ڈر سے ہی سہی تم تہذیب کے دائرے میں تو رہتی ہو۔"

"تصحیح کر لو میری جان، تمہارے ڈر سے نہیں، تمہاری ناراضگی کے ڈر سے۔ جو انتہائی صبر آزما اور طویل دورانیے کی ہوتی ہے۔"

"او گاڈ، سب غلط ہو گیا۔ توبہ منزی کتنا بولتی ہو تم اور وہ بھی سراسر فضول۔ تمہاری بے سروپا باتوں میں ہمارے اسائنمنٹ کا حشر ہو گیا۔ ہمارا خیال ہے تم نہ صرف خود کچھ کرنے کے موڈ میں نہیں بلکہ کسی اور کو بھی نہیں کرنے دو گی اس لیے۔" اس نے آف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کام کل پہ چھوڑ دیتے ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" وہ پر جوش ہو گئی۔

"چلو اب جلدی سے پھوٹو، کل کتنے بجے سڈنی سے فون آیا تھا اور کیا کیا باتیں ہوئیں۔"

"ہیں؟ تمہیں کیسے پتہ کل سڈنی سے جنید کا فون آیا تھا اور یہ بھی کہ میں تمہیں اسی کے بارے میں بتانا چاہ رہی ہوں۔"

"الہام ہوا تھا۔" وہ چڑ کے بولی۔ حالانکہ یہ تو صاف ظاہر تھا، جس طرح وہ بار بار گل مہر کو کام کرنے سے روک رہی تھی اور بار بار اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی وہ تبھی بھانپ گئی تھی کہ ہو نہ ہو کل منزی کی جنید سے طویل ٹیلی فونک رومانٹک گفتگو ہوئی ہو گی، جس کی الف سے یے تک روداد جب تک وہ اپنی اکلوتی دوست کو چسکے لے لے کر سنا نہ ڈالے گی، اسے چین نہیں آئے گا اور اسی وجہ سے گل مہر متواتر کنی کترا رہی تھی، اس کا بور ہونے کا ارادہ نہ تھا نہ ہی وہ یہ ہزار بار کی سنی ہوئی پریم کہانی پھر سے سننے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن اسے ٹلتے نہ دیکھ کے بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے اور جنید نامہ سننے کے لیے تیار ہو ہی گئی۔

جنید منزی کا کزن تھا اور وہ دونوں تب سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے جب منزی میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی اور انہی دنوں اس کی نئی نئی دوستی گل مہر سے ہوئی تھی۔ بس وہ دن اور آج کا دن اسے اپنی داستان محبت سنانے کے لیے اچھا شکار ہاتھ آ گیا۔ جنید دو سال سے سڈنی میں مقیم تھا مگر جانے سے پہلے دونوں کی پر زور فرمائش پہ ان کی منگنی کر

دی گئی تھی۔

"بس اسی سال کے اینڈ تک وہ آ جائے گا۔ ہم نے سب کچھ فائنل کر لیا ہے۔" ساری تفصیل سنا کے اس نے اگلا پروگرام سنایا۔

"ہم شادی سے پہلے ایک آخری عید انجوائے کریں گے۔"

"انجوائے؟ عید غالباً "منائی جاتی ہے" اور بائی دا وے شادی کے بعد کیا عیدیں منانے یا انجوائے کرنے کا رواج ختم ہو جاتا ہے؟"

"نہیں یار، تم سمجھی نہیں۔ بڑی ہی ان رومانٹک ہو۔ بعد کی عیدوں میں وہ مزا کہاں۔ چھپ چھپ والی عیدیں اور پھر دو سالوں سے ہم ایک دوسرے سے دور ہیں۔ ذرا ان کھٹ مٹھی ملاقاتوں کا مزا دوبارہ سے لیں گے۔ بعد میں تو خیر ہر روز روز عید ہو گا اور ہر شب شب برات۔" اس نے لفنگے پن سے آنکھ ماری تو گل مہر جھینپ گئی۔

"شرم کرو۔"

"اور پتہ ہے کیا؟ عید کے فوراً "بعد شادی" شادی کے فوراً "بعد ہنی مون۔ ہم انشاء اللہ اگلا ویلنٹائن ڈے اپنے ہنی مون پیریڈ میں ہی منائیں گے۔ واؤ، سچ آ رومانٹک تھنکنگ۔ ایک تو ہنی مون دوسرا ویلنٹائن ڈے اور تیسرا سوئٹزر لینڈ کے حسین و دلکش نظارے۔"

"تم شادی کے بعد سڈنی چلی جاؤ گی منزی۔" گل مہر کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی افسردگی گھل گئی۔

"آں۔" وہ بھی چونک گئی۔

"تم بھی چلو نا میرے ساتھ۔"

"پاگل ہوئی ہو کیا، تمہیں کیا کم جہیز ملے گا جو ہمیں ساتھ لے کر جانا ہے۔"

"ارے تم جہیز تھوڑا ہی ہو۔ تم تو سوغات ہو، ایک انمول، نایاب تحفہ۔" گل مہر ذرا سا کترائی اس نے انمول اور نایاب ہونے کی تردید تو نہیں کی مگر سر جھٹک کے اس کے گال تھپتھپانے لگی۔

"بی ایبنگ لیڈی مائی فرینڈ، امیچور اینڈ سینس ایبل لیڈی۔ زندگی میں یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ ہر انسان کی عمر کے چند دور ہوتے ہیں۔ ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں جانے کے لیے پچھلے دور کی عادتیں بھلا کے نئے دور کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ ہمیں تمہاری دوستی پہ ناز ہے اور تمہارے خلوص اور محبت پہ کوئی شبہ بھی نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ جو تم ہمیں چھوڑ کر جانے پر لمبے لمبے ڈائیلاگ جھاڑ رہی ہو، کل کو جنید کے سامنے بیٹھی قسمیں کھا رہی ہو گی کہ سچ تم سے ملنے سے پہلے دنیا اتنی ویران تھی، تم اتنی دیر سے کیوں ملے۔" اس نے پرانی ہیروئنوں کی طرح لمبی لمبی سانسیں بھر کے کہا۔

"چل بے ایمان۔" منزی نے اسے دھپ لگائی۔ "سب کو خود جیسا بے وفا اور کٹھور سمجھ رکھا ہے۔ جنید کا میری زندگی میں اپنا ایک مقام ہے، تمہاری اپنی ایک الگ جگہ ہے۔ ہاں تمہارا البتہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ سیرے جانے کے بعد تم مجھے یاد بھی رکھو گی یا نہیں۔"

"یہ تو ہم بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔" گل مہر نے شانے اچکائے۔

"دیکھا۔ دیکھا۔ یہ ہے تمہاری محبت چلو مجھ پہ تو الزام ہے کہ جنید کی محبت میں تمہیں بھلا دوں گی لیکن تم۔ گل مہر تم تو میرے دور ہوتے ہی مجھے اپنے دل سے دور کر دو گی اور اگر جو تمہاری شادی ہو گئی اور سونے پہ سہاگہ تمہیں ہمارے جیجا جی سے محبت شحبت بھی ہو گئی تو پھر تو اللہ ہی حافظ۔" اس نے ہاتھ جھاڑے پھر کچھ خیال آنے پہ اس کے قریب سرک آئی۔

"سنو، ہے کوئی پروگرام۔ میرا مطلب ہے کہ شادی وادی کا۔"

"ابھی سے؟ ابھی تو ہم اس بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے۔" اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟ تمہاری شادی والی سوچ پہ بین لگا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ لیکن ابھی شادی کا وقت ہی کب آیا ہے۔"

"کیوں کیا تمہیں پندرہواں سال لگا ہے۔ روبی کو ھیا اور پاپی کو مم کہتی ہو۔"

"فار گاڈ سیک' فضول باتیں مت کیا کرو۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری پلاننگ میں شادی کا ابھی دور دور تک کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔"

"کیا آپ اپنی پلاننگ کے چیدہ چیدہ پوائنٹس سے آگاہ کرنا پسند فرمائیں گی۔" مزنی نے ہیر برش کو مائیک بناتے ہوئے اس کے سامنے کیا۔

"آف کورس۔" وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔

"ہماری پلاننگ میں سر فہرست ہماری ایجوکیشن ہے جس کے لیے تم ہماری سنجیدگی سے واقف ہی ہو۔ اب جبکہ چند دنوں میں ہمارا رزلٹ آنے والا ہے' ہماری پلاننگ پریکٹیکل ہونے کی تیاری کر رہی ہے۔ پتہ ہے مزنی ہمارا خواب کیا ہے' ایک اچھا شاندار کیریئر۔ جو ہم نے صرف اپنی صلاحیتوں اور ذہانت کے بل بوتے پہ بنایا ہو۔ جس پہ نا صرف خود ہمیں فخر ہو بلکہ ہماری ساری فیملی ہم پہ فخر کرے۔"

"کیریئر۔ یو مین تم جاب کرو گی؟" اس کے سوال پہ گل مہر نے اثبات میں سر ہلایا تو مزنی کی حیرت دگنی ہو گئی۔

"امیزنگ۔ جہاں تک میں تمہیں جانتی ہوں تم نے کبھی ایسے دعوے نہیں کیے جنہیں تم کبھی پورا نہ کر سکو' نہ ہی تم نے کبھی ایسے خواب دیکھے ہیں جن کی تعبیریں تمہارے اقدار سے ٹکراتی ہوں اور اتنے سالوں کے ساتھ کے بعد میں تمہاری فیملی سے بھی اتنی ہی واقف ہو گئی ہوں جتنی کہ تم سے اور میرا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"کبھی بھی کا لفظ تو مت استعمال کرو۔ اس دنیا میں ایسا کیا ہے جو کبھی بھی نہیں ہو سکتا اور پھر ہم کسی تھرڈ کلاس آفس میں اسٹینو یا ٹیلی فون آپریٹر کی جاب تو نہیں کرنے جا رہے۔ یہ ہماری منزل بھی نہیں۔ ہمیں صرف گھر سے باہر نکلنے' آزادانہ ملازمت کرنے یا خاندان سے بغاوت کرنے کا شوق نہیں۔ ایسا ہوتا تو اتنے خراب حالات میں اتنی مہنگی تعلیم نہ حاصل کرتے۔ بی ایڈ کر کے ٹیچر لگ جاتے لیکن ہمارے سامنے ایک مقصد ہے۔ ہمیں اپنے خاندان پہ غرور ہے اسے بٹا لگانے کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے اس کے برعکس ہماری خواہش ہے کہ ہماری وجہ سے اس خاندان کی عزت اور شان کو چار چاند لگ جائیں۔ ہم کچھ ایسا کرنا چاہتے ہیں کہ ابا حضور کو اس پہ اعتراض نہ ہو کم از کم یہ اعتراض تو نہ ہو کہ ہم کوئی غلط کام کر رہے ہیں۔ ہاں شاید انہیں ہمارے گھر سے نکلنے پہ یعنی کمانے پہ اعتراض ہو لیکن ہمارے پاس خود کو منوانے کے لیے دلائل ہیں اور مزنی ہمارا دعوی ہے کہ ہماری کوئی خواہش ایسی نہیں جو ہم پوری نہ کروا سکیں۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" مزنی نے اس کی خوابوں سے چور چور آنکھوں کی چکا چوند سے متاثر ہو کر صدق دل سے دعا کی۔

"گل۔ میرے انکل سفیان محمود کی اپنی کمپیوٹر فرم ہے سوفٹ ویئر کا بزنس ہے۔ وہ ہمیشہ نئے ٹیلنٹ کو ایپری شیٹ کرتے ہیں کیا میں ان سے تمہارے متعلق بات کروں۔"

"نو۔ ہم سفارش سے کچھ حاصل نہیں کرنا چاہتے۔"

"سفارش کون احمق کر رہا ہے۔ بتایا تو ہے کہ وہ ہمیشہ ہی ٹیلنٹ کو تجربے پہ ترجیح دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس کوئی جگہ ہو۔۔۔ اور اگر انہیں تمہارے اندر کوئی صلاحیت نظر آ گئی تو شاید وہ تمہیں ایڈجسٹ کر لیں۔ اب اس قصے میں سفارش کہاں سے آ گئی۔ بے فکر رہو میں تمہارے کوئی قصیدے نہیں پڑھوں گی۔"

"ہاں اگر ایسا ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔" وہ مصالحت آمیز انداز میں سر ہلا کے بولی۔

"گڈ' یہ ہوئی نہ بات۔۔۔ یہ ہے تمہارے پریکٹیکل لائف میں آنے کا پہلا ثبوت' یار کہیں نہ کہیں کمپرومائز تو کرنا پڑتا ہے۔ سفارش' اپروچ اور حوالے میں بہت فرق ہے۔"

☆ ☆ ☆

یہ اندرون لاہور شہر میں واقع مشہور موچی گیٹ سے منسلک ایک خستہ حال مگر وسیع پر ہیبت قدیم عمارت کے ایک حصے کا ذکر ہے۔ ایسی عمارتوں کو عرف عام میں کٹڑی بھی کہتے ہیں۔ ایک ہی احاطے کے ارد گرد بنے رہائشی کمروں کو لوگ فرضی حد بندی کے ذریعے الگ الگ حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں یوں اس کٹڑی میں بھی اس وقت تقریباً" سات کنبے آباد تھے اس کے علاوہ بیرونی طرف بنے وہ کمرے جو اس عمارت کی قدیم تعمیر کا حصہ نہیں بلکہ آج سے آٹھ نو برس قبل ہی بنائے گئے ہیں' ان کابک نما' کچی چھتوں والے کمروں میں وہ "چھڑے" آباد تھے جو دور دراز کے قصبوں' دیہاتوں سے مزدوری کرنے کے لیے لاہور آ کے آباد ہوئے تھے۔ ان کے کنبے وہیں دیہاتوں میں مقیم تھے۔ کسی کسی کمرے میں چار چار افراد بیک وقت رہائش پذیر تھے لیکن یہ بات ان کے لیے مسئلے کا باعث نہیں بنتی تھی۔

ان کا مقصد تو محض شب بسری تھا۔ منہ اندھیرے رزق کی تلاش میں سڑکوں پہ نکلنے والے یہ مسکین شام ڈھلے ان کوٹھڑیوں میں لوٹتے اور گٹھڑی کی طرح کسی نہ کسی چھلنگا نما چارپائی یا دری پہ گر کے بے سدھ سو جاتے۔ ان میں سے کوئی بھٹے کی ریڑھی لگاتا ہے' کوئی کانجی کی۔۔۔ کوئی بانس پہ چڑھا کے غبارے بیچتا ہے کوئی برتن قلعی کروالو کی صدائیں دیتا پھرتا تو اکثر ان میں سے دیہاڑی دار مزدور تھے۔ کھانا پینا بھی ان کا سستے سے تندوروں پہ ہوتا۔۔۔ ان کی سائیکلیں اور ریڑھیاں' خوانچے یہیں کٹڑی کے بڑے سے سالخوردہ گیٹ سے اندر آنے والی تاریک ڈیوڑھی میں لگے ہوتے۔ پہلے پہل جب ماکھا گجر نے یہ کمرے اس بے کار احاطے میں کھڑے کرنے چاہے تو کٹڑی کے اندر بسنے والے کنبوں نے خاصا واویلا مچایا۔ سب کو خدشہ تھا کہ یہ چھڑے چھانٹ مزدور جن میں سے اکثریت صوبہ سرحد سے آنے والے مہاجر افغان یا پٹھانوں کی ہے' ان کی بہو بیٹیوں کے لیے پریشانی کا باعث بنیں گے۔ تب ماکھا گجر نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کرائے داروں کا تعلق عمارت کے بیرونی حصے تک محدود رہے گا' وہ اندر کے ماحول اور پردے پہ اثر انداز نہ ہوں گے اور یہی ہوا۔۔۔ سبھی مسکین سے نظر آنے والے مزدور اندر سے چاہے گنوں پورے ہوں لیکن سالوں سے بغیر کسی کو شکایت کا موقع دیے یہاں رہتے چلے آ رہے تھے۔ لاہور شہر میں باعزت طریقے سے اتنی سستی جگہ سر چھپانے کے لیے میسر آ جائے تو کوئی احمق ہی ہو گا جو ذرا سے ٹھرکی پن کے لیے فٹ پاتھ پہ آ جائے جہاں فاقوں سے گھبرائے نچلے درجے کا کانسٹیبل اور حوالدار ایسے بے ٹھکانہ لاوارثوں کی تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں' آخر رشوت لے کر جن قانون شکن اور مجرم عناصر کو چھوڑتے ہیں ان کی جگہ پر کرنے کے لیے اور کاغذی کارروائیوں کا بھرم رکھنے کے لیے کسی نہ کسی کو تو حوالات میں ٹھونسنا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے بحالت مجبوری ہی سہی' مگر یہ لوگ شرافت سے رہنے پہ مجبور تھے۔ آنکھیں سینکنے کے لیے تو بازار بھرے پڑے تھے۔

عمارت کے اندر کی حالت اور بھی خراب تھی۔ کئی سالوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ گھرانے ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگرچہ کئی عارضی حد بندیاں قائم تھیں مگر پھر بھی کئی ایک گھرانے غسلخانے' صحن اور باورچی خانے کو مشترکہ استعمال کرنے پہ مجبور تھے۔ عرصہ ایک ساتھ گزارنے کی بدولت ان میں آپس میں انسیت اور لگاؤ تو تھا ہی مگر رقابت اور لڑائی جھگڑے کا تناسب زیادہ تھا کسی ایک سے دوسرے کا دکھ درد پوشیدہ تھا نہ ہی کوئی کمزوری چھپی ہوئی تھی۔ کس کا لڑکا نشہ کرنے لگا' کس کی لڑکی کا "ٹکا" کس باؤ سے چل پڑا' کس کی ساس کتنی کٹنی ہے۔۔۔ سب معلومات ہر ایک کی مٹھی میں تھیں۔ کس کے گھر آج کیا پکا ہے اور کس نے بچوں کو بھوکا ہی سلا دیا۔۔۔ یہ سب بھی چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ جذبات و محسوسات کی عجیب رنگا رنگی تھی یہاں۔۔۔ اگر کسی ہمسائے کے فاقے کا علم ہو تو دوسرا اپنی دال روٹی لے کر وہاں فوراً" پہنچ جاتا لیکن ساتھ ہی ساتھ اگر ساتھ کے کمرے سے گوشت بھننے کی مہک آئے تو طعنے مارنے میں بھی دیر نہ لگائی جاتی کہ "ہاں' ہاں سوکھی روٹیاں کھانے والوں کو حرام کے لقمے میسر آ گئے۔۔۔ نہ پوچھیں ہمیں۔۔۔ ہم کیا بھوکے بیٹھے ہیں۔"

اور انہی سات کنبوں میں سے ایک بابر ہمایوں مغل کا بھی تھا۔ بابر ہمایوں مغل۔
جو شمشیر نایاب مغل کا بیٹا ہے اور جس کا دعویٰ ہے کہ اس کی دادی آخری مغل فرمانروا کی لاڈلی نواسی تھی۔ اب پتہ نہیں اس دعوے میں حقیقت کتنی ہے اور مبالغہ آمیزی کتنی لیکن صاحبزادہ نفیس علی خان کو اس پر یقین ہے۔

صاحبزادہ نفیس علی خان جن کے بڑے بھائی مرحوم صاحبزادہ انیس علی خان کا اکلوتا داماد ہے بابر ہمایوں مغل۔
اور جن کی بھتیجی۔۔۔ جنہیں انہوں نے اپنی اولاد کے برابر ہی سمجھا بلکہ اپنی اولاد میں سب سے بڑا ہونے کا اعزاز بھی بخشا۔۔۔ صاحبزادی یاسمین خانم۔۔۔ بابر ہمایوں مغل کی شریک حیات ہیں۔ ان کے چار بچوں کی ماں جن میں سے دلکش بابر سب سے بڑی ہے۔ پھر تین بیٹے، جن میں سے دو کے نام انہوں نے اپنے والد کے نام پہ رکھے ہیں، شمشیر بابر مغل اور نایاب بابر مغل جبکہ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام صاحبزادہ نفیس کی فرمائش پہ یاسمین خانم کے دادا نواب اقدس علی خان کی یاد میں اقدس بابر رکھا گیا۔ بابر ہمایوں مغل اور صاحبزادی یاسمین اپنے بچوں کو ان شاہانہ تمکنت والوں ناموں کے علاوہ اپنے خاندانی ورثے میں سے کچھ اور نہ دے سکے اور کچھ ان کے پاس ہے بھی نہیں صرف نام۔۔۔ صرف اور صرف نام۔

"امی جان، یہ نایاب ہمارے قابو نہیں آتا۔" دلکش نے چھوٹے بھائی کی شکایت جڑی۔
"کیا ہو گیا ہے دلکش۔ آپ اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔ دیکھ تو رہی ہیں کہ ہم کام کر رہے ہیں۔" یاسمین نے مشین کی سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے کہا جو پچھلے دس منٹ میں تیسری بار ٹوٹ گیا تھا۔
"نجانے سلائی مشین کو کیا ہو گیا ہے۔ بار بار دھاگا توڑ رہی ہے۔ ایسے ہی رہا تو یہ سوٹ شام تک مکمل نہ ہو پائے گا۔" وہ بڑبڑائی۔
"اللہ۔۔۔ امی آپ ہماری بھی تو سنیے، یہ نایاب بالکل بھی نہیں پڑھ رہا۔ ہم زبردستی لکھوانا چاہتے ہیں تو دھمکی دیتا ہے کہ کل اسکول نہیں جائے گا۔ جب تک اس کا یونیفارم نہیں سل جاتا، وہ اسکول نہیں جائے گا۔ بچے اس کی پھٹی ہوئی قمیص اور چھوٹی پتلون کا مذاق اڑاتے ہیں۔"
"ہوں۔۔۔" یاسمین بیٹی کی زبانی نایاب کا مطالبہ سن کر بھی سلائی میں مگن رہی۔
"امی جان آپ سن رہی ہیں ہم کیا کہہ رہے ہیں۔"
"سن لیا۔۔۔ بیٹے سن لیا۔ اسے کہہ دیں کہ گھر کا کام مکمل کر لے۔ کل چھٹی ہرگز نہیں ہو گی یہ امی جان کا حکم ہے۔ رہا یونیفارم تو بس ایک دن اور صبر کر لے، یہ سوٹ سل جائے تو اس کی اجرت سے ہم کل صبح ہی بانو آپا سے قمیص اور پتلون کا کپڑا منگوالیں گے اور سلائی کرنے میں بھلا ہمیں کتنی دیر لگے گی لیکن چھٹی ہرگز نہیں ہونی چاہیے، امتحان سر پہ ہیں، ایسے میں پڑھائی کا حرج ہو گا اور ہم خرچے میں سے کھینچ تان کے آپ لوگوں کی فیس اس لیے نہیں ادا کرتے کہ آپ دو دو سال ایک جماعت میں لگائیں۔" یاسمین نے بلند آواز میں دلکش کے ذریعے اپنے دوسرے نمبر کے بیٹے تک اپنا آرڈر پہنچایا جو اسی کمرے کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا با آسانی یہ تنبیہہ سن رہا تھا۔
"اے یاسمین بہن۔۔۔ سوٹ سل گیا ہو تو دے دو۔ میں ملکوں کے گھر بھانڈے (برتن) دھونے جا رہی تھی، وڈی ملکانی کل بھی اپنے جوڑے کا پوچھ رہی تھی۔ میں نے بھی یہی کہا تھا کہ کل کام پہ آتے ہوئے لیتی آؤں گی۔" برابر کے کمرے میں رہنے والی بانو نے بغیر دستک دھڑام سے دروازہ کھول کے اندر آتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ وہ موچی گیٹ سے ملحقہ علاقے پریم گلی کے بہت سے خوشحال گھرانوں میں صفائی اور برتن دھونے کا کام کرتی تھی۔
حالانکہ اس کا شوہر قلعی کرنے کا کام کرتا تھا اور اچھا خاصا کما لیتا تھا اس کے علاوہ اس کا اکلوتا بیٹا بھی کسی ورکشاپ میں "چھوٹا" تھا اور روز کے تیس چالیس گھر لے ہی آتا تھا لیکن شومئی قسمت کہ اس کی تین بیٹیاں تھیں جن میں سے صرف ایک ہی کی شادی اس نے اس سال کی تھی اور جہیز تو ہر طبقے کے لوگوں کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دینا ہی پڑتا ہے۔ اسی لیے وہ پچھلے کچھ سالوں سے گھروں میں ملازمت کر رہی تھی۔ یوں جوڑ جوڑ کے اس نے بڑی بیٹی

کو تو اپنے طور پر خاصے باعزت طریقے سے ایک قلی سے بیاہ دیا تھا اور اب دوسرے نمبر والی کی بھی بات طے کر کے اس کی فکر میں تھی۔
اسی کی ہمت و محنت دیکھ کے یاسمین کو بھی خیال آیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے طور پہ اولاد کے کسی کام تو آ سکتی ہے۔ گھر سے باہر نکلنے کا تو وہ تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بابر کا رویہ اس معاملے میں اس کے میکے والوں سے بڑھ کے سخت اور انتہا پسند تھا۔ اسے بس یہ سلائی کڑھائی کا کام آتا تھا۔ اس نے اسے ہی کام میں لانے کا ارادہ کیا مگر اس کے آس پاس رہنے والی عورتوں کی اکثریت بیگمات کی اترن پہ گزارا کرتی، درزنوں سے سلوانے کے چونچلے وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ایسے میں بانو آگے بڑھی اس نے نہ صرف یاسمین کی ہمت بندھائی بلکہ ان گھروں میں اس کی سلائی کی تعریف کر کر کے اس کے لیے کام بھی لائی جہاں وہ کام کیا کرتی تھی۔ یاسمین کے ہاتھ میں صفائی تھی اگرچہ گھر تک محدود رہنے کی وجہ سے وہ جدید فیشن سے لاعلم تھی لیکن بیگمات اسے جیسے ڈیزائن بھیجا کرتیں، وہ ہو بہو اتار لیتی۔
"بس بانو آپا، صبح سے اسی میں لگے ہوئے ہیں۔ نجانے مشین کے ساتھ کیا مسئلہ ہے، بار بار دھاگا ٹوٹ جاتا ہے اسی میں دیر ہو گئی ورنہ کب کا مکمل ہو جاتا آپ بیٹھیے، یہی کوئی پانچ منٹ کا کام باقی ہے۔ دلکش خالہ جان کے لیے چائے بنائیے۔" اس نے ہاتھ کی حرکت تیز کرتے ہوئے بانو کو تسلی دی اور ساتھ ہی بیٹی کو مہمان کی تواضع کی ہدایت کی۔
"وہ۔۔۔ امی جان۔۔۔" وہ متردد ہوئی۔ "دودھ تو صبح ہی ختم ہو گیا۔" اس نے دبی آواز میں بات بتائی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ صبح اس کا باپ بابر دودھ لائے بغیر ہی گھر سے نکل گیا تھا اور ناشتے کے بعد کسی نے بھی چائے نہیں پی تھی۔ خود یاسمین کے سر میں بھی درد بڑھتا چلا جا رہا تھا لیکن کام میں مگن وہ وقتی طور پہ یہ فراموش کر گئی تھی۔ بیٹی کے یاد دلانے پہ اسے دھیان آیا۔
"اچھا، پھر قہوہ ہی بنا دو، سردی تو خاصی ہے۔"
"جی اچھا۔" وہ مستعدی سے کھڑی ہوئی اور کمرے کے دروازے کے باہر رکھے چولہے پہ پانی چڑھا کے اس میں افغانی قہوے کے چند پتے ڈالے۔
"امی جان، الائچی ختم ہے۔"
"سونف کے چند دانے ڈال دیں۔" اس کے سوٹ مکمل کرتے کرتے قہوہ بھی بن گیا۔ بانو نے گرم گرم قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے تعریفی انداز میں سر ہلایا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
"بہن تم چولہا کمرے کے اندر کیوں نہیں رکھ لیتیں۔ باہر تو اچھی خاصی ٹھنڈ ہے۔ ہم سب تو سردیوں میں چولہا تو اندر لے جاتے ہیں، کمرے گرم رہتے ہیں اور ہیٹر کے بغیر بھی گزارا ہو جاتا ہے یا پھر صحن میں دھوپ میں رکھ لیتے ہیں۔ تم نے ایک تو کمرے کے باہر سیڑھیوں کے نیچے اسے رکھا ہوا ہے اور پھر اوپر سے سامنے چق بھی لگوالی ہے تاکہ ذرا سی دھوپ اور روشنی بھی نہ آئے۔"
"آپا آپ تو جانتی ہیں کہ ان کے ابا پردے کے کتنے پابند ہیں۔ اب نہ تو ہم دن میں کئی بار سارے میں سے گزر کے صحن تک ہانڈی روٹی کے لیے جا سکتے ہیں نہ ہی دلکش کو بھیج سکتے ہیں۔ یہاں ہی اوٹ میں پکانا ٹھیک ہے۔"
"تو فی الحال کمرے میں رکھ لو۔ سردی تو گزر جائے۔ گرمیوں کے آتے ہی نکال دینا۔"
"نہیں آپا، یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ دلکش کے والد کو مسالوں کی بو سے اختلاج ہوتا ہے۔"
"ہیں؟ کیا ہوتا ہے؟" اس کے اچھو لگ گیا۔
"انہیں پسند نہیں ہے کہ کمرے کی فضا میں لہسن، ہلدی اور سبزیوں کی بو پھیلی ہو۔"
"اے ہے، بہن انہیں کچھ پسند بھی ہے یا نہیں۔ جب دیکھو تم ان کا ناپسند نامہ ہی سنا رہی ہوتی ہو۔ توبہ توبہ۔ یہ مرد اپنی زندگی بھی مشکل بنا لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی۔" اس نے ناک چڑھائی تو یاسمین کی

وضع داری اور پردہ پوشی کو ٹھیس پہنچی۔

"ایسی بات نہیں آپا۔ وہ مزاج کے تلخ نہیں نہ ہی عادت کے برے ہیں۔ اگر کوئی بات انہیں ناگوار گزرتی ہے تو اس کا خیال رکھنا تو ہمارا فرض ہے۔ اس میں مشکل کیسی۔" اس نے رسانیت سے وضاحت پیش کی جسے دیوار سے ملی دیوار کے اس طرف رہنے والی بانو کسی خاطر میں نہ لائی۔

"اے رہنے دو بہن' کوئی مشکل سی مشکل' منہ اندھیرے تم گھر کے کام نمٹانا شروع کرتی ہو تاکہ میاں کے جاتے ہی سلائی مشین سنبھال لو۔ اور کمر تختہ کیے گھنٹوں دھڑا دھڑ سلائی کیے جاتی ہو کیونکہ شام ڈھلنے سے پہلے تمہیں یہ مشین اور یہ سلے ان سلے کپڑے چھپانے ہوتے ہیں کہیں تمہارے میاں کو پتہ نہ چل جائے تم اجرت پہ سلائی کرتی ہو۔ اے میں کہتی ہوں یہ چھپانے والی نہیں جتانے والی بات ہے' تمہیں چاہیے ڈنکے کی چوٹ پہ سلائی کرو اور سینہ ٹھونک کے میاں کو جتلاؤ کہ یہ بچے صرف اور صرف میرے میکے کی عنایت اور میری اپنی محنت کی وجہ سے پل رہے ہیں۔ دیکھنا کیسے ساری اکڑفوں جھاگ ہو جائے گی۔" اس نے مفت کے مشورے سے نوازا جسے سن کر یاسمین کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"آپا' برامت منایئے گا' ہمیں ایسی گفتگو بچوں کے سامنے پسند نہیں۔ ان کے معصوم ذہن پہ برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بلکہ ہمیں یہ بھی پسند نہیں کہ کوئی ہمارے معاملات میں دخل دے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ سخت ہو گیا جس کا احساس ہوتے ہی وہ خود شرمندہ ہو گئی لیکن بانو دل کی صاف اور طبیعت کی لاپرواہ عورت تھی' ہاتھ ہلا کے کہنے لگی۔

"بھئی میں تو کہتی ہوں کھری بات' چاہے وہ تمہیں دخل اندازی لگے یا زبردستی رہی بات بچوں کے سامنے کی۔ تو اب جو بات ہو گی ان کے سامنے ہی تو ہو گی' ان کے ابا کو تم گھر میں روک نہیں پاتیں اور ان معصوموں کو جھانکنے کی اجازت نہیں۔ کیسے کملا کے رہ گئے ہیں نمانے۔ اوروں کے بچے کیسے بھاگتے' کودتے' پھلانگتے پھرتے ہیں۔ تم انہیں قید ہی کیے رکھتی ہو اور برا ماننے کی تم نے اچھی کہی۔ بھلا تمہاری کسی بات کا کیا برا منانا۔ لاؤ رکھ دو لفافہ' اب کہاں ڈھونڈتی پھرو گی صاف لفافہ۔ ایسے ہی لے جاتی ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کے سلا ہوا جوڑا بغل میں دبایا۔

"آپا' سلائی کے پیسے ضرور لے آنا اپنی ملکانی سے۔ کہیں کل پہ نہ ٹال دیں ہمیں سخت ضرورت ہے۔ نایاب کتنے دنوں سے اسکول جاتے ہوئے روتا ہے۔ اس کا یونیفارم بہت خراب ہو چکا ہے۔ بلکہ ایک مہربانی اور کیجئے کام سے واپسی پہ بازار سے اس کے یونیفارم کا کپڑا لیتی آیئے گا۔ ہم سے ہو سکا تو رات بھر میں ہی سی لیں گے قمیص کا سفید سوتی کپڑا اور پتلون کا خاکی رنگ کا۔"

"پیسے تو میں لے ہی آؤں گی' بازار جانے میں بھی مجھے کیا تکلیف۔ میرے تو راستے میں پڑتا ہے لیکن تم نے سفید قمیص اور خاکی پتلون کا ذکر کیا تو مجھے دھیان آیا' اونچے چوبارے والے مکان کی استانی جی کے بیٹے کی بھی وردی ہے۔ تمہارے نایاب سے سال دو بڑا ہی ہو گا۔ کل استانی جی مجھے کہہ رہی تھیں کہ اپنے بچوں کے لیے وردی لی جانی ہے تو لے جاؤ۔ میرا باؤ کون سا اسکول جاتا ہے' جاتا بھی ہوتا تو کون سا اسے وہ وردی پورا آنا تھا۔ تمہارے نایاب کے ناپ کی ہو گی' زیادہ پرانی نہیں' ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ کہو تو لے آؤں۔"

"نہیں آپا' مہربانی ہم نے کبھی بچوں کو اترن نہیں پہنائی۔ آپ بس اتنی عنایت کر دیجئے کہ بازار سے کپڑا دیجئے اور اگر پیسے بچ رہیں تو ایک پاؤ دودھ' دو انڈے اور آدھ کلو آلو لا دیجیے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ جیسے دھوم دھڑکے سے آئی تھی' ویسے ہی کواڑ بجاتی نکل گئی۔ دلکش نے سب سے چھوٹے اقدس کو اشارہ کیا کہ وہ دروازہ ٹھیک سے بند کرے۔ پوری کٹڑی میں یہ واحد کمرہ تھا جس کا دروازہ ہر وقت بند رہا کرتا۔

یاسمین نے مشین پرے سرکا کے کب سے سمٹی ہوئیں ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکائیں' کمر سیدھی کر کے

جسم کا جوڑ جوڑ کھولنے لگی۔

دروازے کھڑکیاں سختی سے بند رکھنے کی وجہ سے ساٹھ والٹ کے بلب کی روشنی دن میں بھی اس کمرے کے لیے ناکافی محسوس ہوتی جو اوپر تلے رکھے سامان کے ساتھ اٹا پڑا تھا' پچھلی کوٹھڑی میں ایک جست کی پیٹی اس کے جہیز کے لحافوں' بستروں سے بھری تھی' ایک پیڈسٹل فین' رات کو زمین پہ بچھانے والی دری اور چٹائی' دو پرانے صندوق جن میں اس کے اور بچوں کے کپڑے رکھے تھے اور چند پیتل کے بڑے بڑے دیگچے اور سینیاں جو اس کے جہیز میں سے باقی بچ رہی تھیں۔ اس کے کہنے پہ شمشیر نے سلائی مشین اٹھا کے اسی کوٹھڑی کے ایک کونے میں رکھ دی اور خود دوبارہ سے آ کر کمرے کے دوسرے کونے میں بچھی چارپائی پہ بیٹھ کے ہوم ورک کرنے لگا۔ اسی چارپائی کے اوپر دیوار سے ایک سستا سا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ یاسمین کے ہاتھ سے بنے کڑھے ہوئے یا اللہ اور یا محمد کے نقش بھی آویزاں تھے۔ دوسری طرف کی دیوار میں ایک کھڑکی باہر آنگن میں کھلتی تھی' مگر کبھی کھلتی ہی نہ تھی' اسی کھڑکی کے نیچے وہ چارپائی بچھی تھی جس پہ وہ اس وقت بیٹھی اپنے شانے خود ہی دبا رہی تھی۔

رات کو اسی چارپائی پہ وہ اور دلکش سوتیں دوسری بابر کے لیے مخصوص تھی۔ تینوں لڑکے نیچے دری اور چٹائی بچھا کے سوتے۔ تیسری طرف کی دیوار کے ایک جانب پچھلی کوٹھڑی کا دیمک زدہ دروازہ تھا تو دوسری جانب کھونٹی تھی جس پہ بابر کے کپڑے اور بچوں کے اسکول کے بستے لٹکے رہتے۔ سامنے کی دیوار جس میں داخلی دروازہ تھا' دروازے کے ایک طرف دو کرسیاں تھیں جن کی پچکی ہوئی بے جان گدیوں پہ بدرنگ سا چیک کا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔

پھر دروازے کے اس طرف ایک بغیر پالش کی لکڑی کی پرانی پھٹیوں کو جوڑ کے ایک اسٹینڈ نما الماری سی تھی جس کے دروازے نہ تھے البتہ چار چوڑے چوڑے خانے تھے۔ سب سے اوپر والے خانے میں قرآن مجید' جائے نماز اور ایک بڑا آئینہ رکھا تھا' اس سے نچلے خانے میں تیل' کنگھا' پاؤڈر اور ایک ڈبہ تھا جس میں ضرورت کی چیزیں قلم' قینچی' ازار بند ڈالنے کی سلائی' فیتہ' دھاگے' بٹن اور چند معمولی نوعیت کی دوائیں مثلاً" ڈسپرین وغیرہ رکھی تھیں۔ تیسرے اور چوتھے خانے میں عام استعمال کے برتن دو دیگچیاں' چار اسٹیل کے اور دو بھدے سے کانچ کے گلاس' نام چینی کی چار بڑی پلیٹیں اور تین پیالے' پلاسٹک کی چھوٹی چار پلیٹیں آدھ درجن مگ اور ایک اسٹیل کا جگ رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی رکھی چوکی پہ دلکش بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی ساتھ ہی پاس بیٹھے اسکول کا کام کرتے بھائیوں کو پڑھا بھی رہی تھی۔

لکڑی کا یہ اسٹینڈ بھی اس نے تب بنوایا تھا جب ان کے تصرف میں موجود آخری فالتو کمرہ بھی ہاتھ سے نکل گیا اور وہ اس کمرے' اس کے آگے بنے تین فٹ چوڑے اور گیارہ فٹ لمبے کچے احاطے' اور پچھلی جانب بنی اندھیری کوٹھری تک اپنے چار بچوں سمیت محدود ہو کے رہ گئی۔ احاطے میں پردے کی خاطر اس نے اپنے پاس موجود آخری سونے کی بالیاں بیچ کے چق لگوائی' سیڑھیوں کے نیچے چولہا دھرا۔ مستری کو پیسے دے کر وہیں ایک نلکا بھی لگوایا۔ بقایا پیسے یہیں رہنے والے چمن چاچا' جو بڑھئی کا کام کرتے تھے' ان کو دے کر یہ اسٹینڈ بنوایا تاکہ کم جگہ پہ زیادہ سامان ٹھکانے لگایا جا سکے اور اب سامان رہ ہی کتنا گیا تھا۔ اس کو جہیز میں ملنے والے نواڑی پلنگ' سنگھار میز اور لوہے کی الماری کب کی بک چکی تھی۔ شمشیر کی پیدائش پہ چچا حضور نے جو لکڑی کا خوب صورت پنگھوڑا بنوایا تھا وہ نایاب کے پیدا ہونے سے پہلے ہی بابر بیچ چکا تھا اور باقی دونوں بیٹے اس کے چھلنگا نما چارپائی پہ ہی لیٹے لوریاں سنتے رہے۔ بری کے نام پہ ملنے والی دو چوڑیاں' چاندی کی کئی سو سال پرانی جھانجھریں' جھومر اور جہیز میں ملنے والا امی حضور کا خاندانی کنگن' چچا حضور کی طرف سے بنا کے دیا سونے کا واحد سیٹ یہ سب تو کب کا ہی بک چکا تھا' ساتھ ساتھ پیتل کے بڑے بڑے دیگ نما پتیلے' چاندی کے چمچے' شنیل کی رضائیاں اور خوب صورت ڈنر سیٹ۔ سب کے پیسے بابر کھرے کر چکا تھا ایسا نہ تھا کہ اس نے صرف یاسمین کے جہیز کا سامان بیچنے پہ ہی اکتفا کیا تھا بلکہ وہ اب بھی وہ عدت ہوئی گنوا چکا تھا' جو کہ اس کا اپنا تھا۔

جب صاحبزادی یاسمین خانم بیاہ کے یہاں آئی تو ادھر ایسی بھی کسمپرسی اور زبوں حالی نہ تھی۔ حویلی نما عمارت

کے پچھلے چار کمرے اور پچھلا آنگن کرائے پہ چڑھایا گیا تھا جبکہ سامنے کا سارا حصہ بابر کے والد شمشیر نایاب مغل
کے تصرف میں تھا۔ یہ حویلی انہیں پاکستان ہجرت کے بعد کلیم میں حاصل ہوئی تھی اور ایسی کئی حویلیاں وہ پیچھے
ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ خود کو مغلیہ شاہی خاندان کا بتاتے تھے اور ٹھاٹھ باٹ بھی شاہانہ ہی تھے۔ سامنے کا
حصہ جہاں اب خوانچہ فروشوں کے کچے کمرے بنے ہوئے تھے، پہلے ایک طویل و عریض احاطے پہ مشتمل تھا۔
جہاں مغل صاحب کی چمچماتی بگھی کھڑی ہوتی، دو سفید گھوڑے ہنہنا رہے ہوتے۔ ایک جانب پرانی سی فوکسی
ترپال کے سائے میں کھڑی ہوتی اور قطار در قطار بنے وہ کمرے ہی کمرے۔۔۔ جن میں سے کچھ تو خالی تھے
مغل صاحب کا ایک ہی اکلوتا بیٹا تھا بابر۔۔۔ مغل بی بی سنجیدہ خاتون حد درجہ عبادت گزار اور متقی خاتون تھیں،
یاسمین کے کئی سال ان کے سہارے خاصی تقویت سے گزرے۔ مغل صاحب اور صاحبزادہ نفیس علی خان کی
جان پہچان ہوئی تو جلد ہی انہوں نے اپنی اولادوں کو اس رشتے میں باندھ دیا۔ صاحبزادہ نفیس نے مغل صاحب کی
خاندانی نجابت اور شجرہ دیکھا تھا، ساتھ ہی ساتھ ان کی شرافت اور سادگی بھی لیکن یاسمین کی قسمت کہ اس کے بیاہ
کر سسرال آنے کے چند ماہ بعد ہی مغل صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کا ذریعہ معاش حویلی کے پچھلے کمروں کا کرایہ
اور وہ چند زمینیں تھیں جن پہ انہوں نے کپاس اگا رکھی تھی۔ کاشت کاری اور زمینداری جیسا دردِ سر بابر نے مول
لینا گوارا نہ کیا اور والد کے چالیسویں سے بھی پہلے زمین بیچ کر فارغ ہو گیا۔ وہ مختارِ کل تھا، مغل بی بی کو عبادت و
وظائف سے فرصت نہ تھی یوں بھی وہ بے لگام بیٹے کی سرکشی اور بدزبانی سے خائف تھیں اس لیے اس کے ہر
معاملے میں خاموش ہی رہا کرتیں، بابر کے جوہر والد کی وفات کے بعد کھل کے سامنے آئے۔ شادی کے اول روز
سے ہی اس نے عام سی شکل و صورت والی باپردہ صاحبزادی یاسمین خانم کو زیادہ گھاس نہیں ڈالی تھی، اس کا بیشتر
وقت گھر سے باہر گزرا کرتا، وہ یار باش بندہ اور کھلنڈرا مزاج تھا اس کا اندازہ تو یاسمین کو جلد ہی ہو گیا لیکن اب اس
کے علم میں آیا کہ گھر سے باہر بابر کی دلچسپیوں کا مرکز کیا ہے، وہ نہ صرف جوئے کی لت میں گرفتار تھا بلکہ یاروں
دوستوں کے ساتھ عیاشی کرنا اس کا معمول تھا۔ اگر جوئے میں رقم جیت بھی جاتا تو وہیں خوشامدی دوستوں میں لٹا
دیتا، پینے پلانے سے بھی شغف تھا خود بھی پیتا اور یاروں کو بھی پلاتا۔
باپ کے مرنے کے بعد اس شاہ خرچی میں اور اضافہ ہوا۔ زمین کی رقم ہفتوں میں اڑ گئی اور یاسمین جو یہ سوچے
بیٹھی تھی کہ اسے اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کرنے کا مشورہ دے گی بات کرنے کے ارادے ہی باندھتی رہ گئی
۔ دلکش کے ایک سال بعد شمشیر پیدا ہوا تو تب تک فوکسی بگھی اور گھوڑے تک بک چکے تھے۔ والدہ کے بازپرس
کرنے پہ اس نے عذر تراشا کہ والد ہی کے پرانے قرض چکانے کے لیے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ وہ بخوبی جانتی تھیں کہ
ان کے شوہر کو قرضہ لینے کی عادت نہ تھی مگر مصلحتاً خاموش رہیں ایک بار پھر نرمی سے بیٹے کو اس کی ذمہ داریوں
احساس دلانا چاہا، چار افراد کے کنبے کا واحد کفیل ہونے کا احساس دلایا، بچوں کی وجہ سے بڑھتے اخراجات کی طرف
توجہ دلائی۔۔۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اور آمدنی بڑھانے کا بہانہ کر کے ایک ایک کر کے حو
کے سارے کمرے کرائے پہ چڑھنے لگے۔۔۔ یوں یہ عالی شان عمارت کٹڑی میں تبدیل ہو گئی۔ بھانت بھانت
لوگوں نے اس قدیم تاریخی ورثے کا حشر نشر کر دیا۔
مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں وہ کرائے کی رقمیں بٹور کے لے جاتا، جوئے، شراب اور مجرے جیسے اعلیٰ خاند
اوصاف میں اڑانے کے بعد وہ گھر کے خرچے عموماً "ماکھا گجر سے ادھار لے کر پورے کرتا اور ایک وقت ایسا آیا
سود خور ماکھا گجر نے کرائے اور سود کی مد میں نجانے کہاں کہاں دستخط کروا کے سارے کرائے پہ اٹھے کمرے ا
نام کروا لیے، آخر میں ان کے پاس فقط تین کمرے اور ایک باورچی خانہ رہ گیا۔ تہجد گزار مغل بی بی ایک شب ا
سجدے میں گئیں کہ دوبارہ نہ اٹھیں۔ تب یاسمین کی گود میں دو ہفتے کا اقدس تھا۔ تجہیز و تدفین کے خرچے کے
ایک بار پھر ماکھا گجر کے آگے ہاتھ پھیلایا گیا بابر کے سابقہ ریکارڈ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے قرضہ دینے سے ا
کر دیا تب ناچار اسے یہ باقی کا حصہ گروی رکھنا پڑا۔ دو سال کی مدت میں وہ قرضہ تو ادا نہ کر سکا گروی رکھے اس

سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اب وہ تین سال سے اسی مختصر سے حصے میں مقیم تھی۔
بابر کا حال وہی تھا۔ وہی شراب، جوا اور آوارہ گردی۔ وہی نوابی رکھ رکھاؤ۔ اگر بازی ہارتا تھا تو گھر کی کسی نہ کسی
چیز کی شامت آجاتی، یاسمین کے جہیز کا سارا زیور اور سامان یونہی ٹھکانے لگا تھا اور اگر جیت جاتا تو اپنے کپڑوں،
شراب اور تکے مرغوں پہ اڑا دیتا۔ سگریٹ بھی مہنگا والا پیتا۔ اسے ہوش نہ تھا کہ بچے کون سی جماعت میں پڑھتے
ہیں اور کیسے پڑھتے ہیں، صاحبزادہ نفیس ہر ماہ باقاعدہ آتے اور گھر کے ضروری سامان خصوصاً "اشیائے خورد و نوش
لے کر آتے کیونکہ وہ بھی جانتے تھے کہ داماد کا واحد ذریعہ معاش کرایہ تھا جس کی اب کوئی امید نہیں لیکن وہ اپنے
اعلیٰ نسب داماد کے دیگر مشاغل سے ناواقف تھے اس لیے یہی سمجھتے تھے کہ برخوردار ضرور کسی نہ کسی روزگار کی
تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ اسی میں مطمئن تھے کہ مسلسل بے روزگاری اور تنگ دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر بابر
میاں نے کسی کمتر کام میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کسی کام میں ہاتھ نہ ڈالنے کی وجہ ان کا کر و فر
نہیں بلکہ ہڈحرامی تھی۔ ورنہ ذلالت کی جس آخری حد پہ وہ جا پہنچا تھا اس سے کمتر درجہ تو اور کوئی رہ ہی نہیں گیا
یاسمین بھی چچا حضور سے یہ تذکرہ کر کے انہیں آزردہ نہیں کرنا چاہتی تھی نہ ہی ان کی دل شکستگی اور
شرمساری مطلوب تھی اس لیے خاموشی سے ان کی اتنی ہی امداد کو بھی غنیمت جانتی کہ ان کی وجہ سے چولہا تو
روشن تھا۔ بڑھتے ہوئے بچوں کے بقایا اخراجات وہ سلائی کر کے پورے کرتی۔ اپنی اس مصروفیت کو بھی اس نے
شوہر سے خفیہ رکھا ہوا تھا البتہ اس کا ماں جایا، اس کا اکلوتا بھائی صاحبزادہ **عمیص**، بہن کی تکالیف، جدوجہد اور صبر
سے بخوبی واقف تھا، وہ اکثر و بیشتر بہن کے پاس آتا رہتا اور اس کی زبوں حالی سے بڑھ کر اپنی بے بسی پہ کڑھتا کہ وہ
چاہتے ہوئے بھی بہن کی مدد کے قابل نہیں۔
"کیا ہوا امی جان، سر میں بہت درد ہے کیا؟" دلکش کی آواز نے اس کے تکلیف دہ خیالات کا تسلسل توڑا۔
"جی بیٹا، صبح سے چائے نہیں پی اور دوسری وجہ یہ کہ کئی گھنٹوں سے نظر سلائی پہ لگائی ہوئی ہے۔ لگتا ہے ہماری
نظر پہ بھی اثر پڑنے لگا ہے۔" اس نے کنپٹیاں سہلاتے ہوئے کہا۔
"قہوہ بچ گیا ہے، کہیں تو گرم کر دوں؟" اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ اس نے جھٹ قہوے کا گرم کپ اسے
تھمایا اور خود اس کا سر دبانے لگی۔
"یہ تو پھیکا ہے؟" اس نے پہلا گھونٹ لیتے ہی کہا۔
"جی امی جان، چینی ختم ہو گئی۔"
"پہلے بتاتیں، ہم بانو آپا سے انڈے کی بجائے چینی ہی منگوا لیتے۔" چھوٹے اقدس کو زکام کی شکایت تھی اس
لیے اس نے دو انڈے منگوائے تھے تاکہ ابال کر اسے دے۔
"اب کیا کیا کہتے، وہ سمجھتیں ہمارے گھر کچھ بھی نہیں ہے۔"
"تو کیا انہیں بھی پھیکا ہی قہوہ دے دیا۔۔۔ وہ تو بہت چینی لیتی ہیں میٹھے کی رسیا ہیں۔" یاسمین کو افسوس ہوا۔
"زیادہ تو نہیں البتہ جتنی بھی تھی ان کے کپ میں ڈال دی۔ ڈبہ ہی جھاڑ دیا تھا۔ امی جان نانا حضور کب آئیں
گے۔" اس نے شاید سودا سلف ختم ہونے کے خیال سے انہیں یاد کیا۔
"آنے ہی والے ہوں گے بیٹا۔۔۔ وہ بھی کیا کریں۔ آرام کی عمر ہے اور ہزار فکریں۔"

● ● ●

"چائے کے ساتھ کیا کچھ ہے؟"
گل مہر نے بڑے عجلت بھرے انداز میں کچن میں جھانک کر دریافت کیا۔ جواباً "موتیا نے ایک نظر سامنے رکھی
پلیٹوں پہ دوڑاتے ہوئے نام گنوا دیے۔
"شامی کباب، سموسے اور چاٹ میں نے خود بنائی ہے۔ یہ میٹھی ٹکیاں امی حضور نے بنائی ہیں، یہ بسکٹ ابھی ابھی
عمیص دے کر گیا ہے اور یہ بالوشاہیاں تو ہیں ہی جوابا حضور صبح ہی ٹوکرا بھر کر لے آئے تھے۔ تمہاری دوست مزنی

جو چاکلیٹ کیک لائی ہے کیا وہ بھی ساتھ رکھ دوں؟"

"اوں۔" اس نے کچھ سوچا پھر انکار کر دیا۔

"نہیں' اچھا نہیں لگتا' وہ لائی ہے اور اسی کے آگے رکھ دیں۔ بس ٹھیک ہے' اتنے آئٹم کافی ہیں۔۔۔ اینڈ تھینک یو مائی نسٹر۔" وہ جاتے جاتے مڑ کے تھینک یو کہہ گئی تو کھولتے پانی میں پتی ڈالتی ہوئی موتیا مارے حیرت کے اس سے اس درجہ شائستگی اور تہذیب کا مظاہرہ کرنے کی وجہ دریافت تک کرنا بھول گئی۔

"حیرت انگیز' خلاف معمول۔۔۔ بلکہ خلاف فطرت۔" حالانکہ یہ خلاف معمول' خلاف فطرت مظاہرہ اس لیے ہوا تھا کہ حیرت انگیز طور پر آج صاحبزادی الماس خاتون عرف موتیا اپنی بڑی ہمشیرہ کی سہیلیوں کے لیے پر تکلف چائے ناک بھوں چڑھائے بغیر تیار کر رہی تھیں۔ ورنہ اس کی دوستوں کے آگے ایک سوکھا سڑا بسکٹ بھی چائے کے ساتھ رکھنا اسے ناگوار گزرتا۔۔۔ کجا کہ وہ اتنی خاطر مدارات کرتی۔۔۔ مگر آج بات کچھ اور تھی۔ بات خاص الخاص تھی اور اس بات کا تعلق چونکہ صاحبزادی گل مہر سے تھا سو آج کے دن کی خاص الخاص شخصیت بھی وہی تھیں آج اس کا ایم سی ایس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا اور اس نے شاندار نمبرز کے ساتھ نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔ یہ چاؤ چونچلے اسی خوشی میں اٹھائے جا رہے تھے۔ صبح سے گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔

صاحبزادہ نفیس علی خان نے رزلٹ سے پہلے ہی اپنے مخصوص حلوائی کو بلوا کر دیسی گھی کی کڑاہی رکھوادی تھی۔ یہ ان کا برسوں پرانا معمول تھا صاحبزادی کی ذہانت و قابلیت پہ بھروسہ ہی اس قدر تھا کہ رزلٹ والے روز پہلے ہی سے حلوائی کو بلوا لیا جاتا' ٹیچرز کو دینے کے لیے پھولوں کے گلدستے منگوائے جاتے۔ تائی حضور ان معاملات سے لاتعلق تھیں مگر آج ان کے چہرے پہ بھی خوشی تھی۔ دیور کی سرشاری ظاہر کر رہی تھی کہ ان کی لائق فائق بھتیجی نے کوئی ایسا ویسا امتحان نہیں پاس کیا بلکہ کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل کی ہے۔ صاحبزادی حرمت النساء کے شکرانے کے نوافل ہی مختصر نہیں ہو رہے تھے۔ عمیص جانتا تھا کہ آج مبارکباد دینے کے لیے گل مہر کی دوستوں کا تانتا بندھا رہے گا سو اس نے چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے لوازمات اور ان کی تیاری کے لیے دیگر اشیاء موتیا کے سامنے لا کے ڈھیر کر دی تھیں۔

"یہ کیا؟ تم اپنا ولیمہ کر رہے ہو کیا؟" موتیا نے حیران ہو کر قیمہ' دہی' پکوڑیاں' بیسن' انڈے' بسکٹ' دودھ' نمکو وغیرہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"احمق لڑکی' تم کیا میرا ولیمہ اس آدھا کلو گائے کے قیمے پہ ٹرخانا چاہتی ہو' صاحبزادہ عمیص علی خان' اس گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ کا ولیمہ۔۔۔ اور اس قدر۔۔۔ اس قدر" اسے کوئی مثال نہ سوجھی تو موتیا نے مدد کی۔

"اس قدر غریبانہ' مسکین اور لٹا پٹا ولیمہ۔ عزیز دوست' یہ جو سامان تم اپنے ذاتی خرچے سے لائے ہو' اگر ولیمہ بھی اپنے ذاتی خرچے سے کرنا چاہو تو شاید ایسا ہی نظارہ پیش کرے۔"

"تم کبھی میرے حوالے سے پر امید مت ہونا۔" اس نے منہ پھلا لیا۔

"پر امید۔۔۔" آٹا گوندھتے ہوئے اس کے ہاتھ تھم گئے "اور وہ بھی تمہارے حوالے سے۔۔۔ میں؟۔ کاش میں پر امید ہونے کی ہمت کر پاتی۔"

"اے۔۔۔ کیا سوچنے لگیں یار' ویسے بھی سارا دن لگی تو رہتی ہو پھر یہ چار چیزیں بنانے میں کیوں نخرے کر رہی ہو۔ جو بھی ہے' آخر گل مہر کی زندگی کا اتنا اہم دن ہے آج اس کی سالوں کی محنت کا پھل مل رہا ہے۔ کیا تم اس کی خوشی میں خوش نہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو عمیص۔" اس نے سر جھٹکا۔

"گل مہر میری بہن ہے' ہمارے درمیان کیسی ہی نوک جھونک یا تو تو میں میں چلتی ہو تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ۔۔۔ اچھا بتاؤ کیا بنایا جائے۔"

"کچھ بھی چٹپٹا بنا لینا۔ اس کی ساری دوستیں چٹوری ہیں۔"

"ہاں وہ خود تو جیسے نہیں ہے۔" موتیا نے چڑایا۔

ہم سے نہ کہو کیسا ہے وہ
ہم سے پوچھو ذرا کیسا ہے وہ

عمیص نے ٹھنڈی سانس بھر کے شعر سنایا۔

"تم شعر ہی پڑھتے رہنا" اس کی رفتار مت ناپنا۔ جانے بھی ہو اس کے خیالات کہاں تک پرواز کر رہے ہیں۔"

موتیا کو اس کی شاعری سے دو رات پہلے کی اپنی اور گل کی گفتگو یاد آ گئی کہ کس طرح اس نے عمیص سے بے زاری ظاہر کی تھی۔

"عمیص' میری بات کو مذاق مت سمجھو۔ وہ واقعی بہت۔۔۔"

"اونہوں' آج کے دن کوئی بدگمانی نہیں۔" عمیص نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

آشفتگی ہے اس کی اسے بے وفا نہ جان
عادت کی بات اور ہے دل کا برا نہیں

وہ ایک اور شعر گنگناتا ہوا پلٹا۔

امجد وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر
ان میں کوئی بھی عکس تیرے نام کا نہیں

موتیا کی آواز پہ وہ باہر نکلتے نکلتے تھم گیا۔

"عکس آنکھوں میں نہیں' دل میں تلاشنے چاہئیں' آنکھوں میں وہی عکس ہوتا ہے جو سامنے ہو جبکہ دل میں۔۔۔"

اس نے مسکرا کے موتیا کو یاد کرایا۔

"اور دل میں۔۔۔ دل میں ہمیشہ وہ ہوتا ہے جو سامنے نہ ہو۔" اس کے جانے کے بعد موتیا نے ہواؤں سے سرگوشی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

ریشمی بادامی رنگ کے کرتے اور سفید لٹھے کی شلوار میں ملبوس وہ اپنے بکھرے بال سنوارتا ساجد علی کی کار سے نکلا جو اسے پریم گلی تک ڈراپ کرنے آیا تھا۔ اس سے آگے اس کی پرانے ماڈل کی مرسڈیز جا بھی نہیں سکتی تھی یہ وہی مرسڈیز تھی جو کبھی نواب شمشیر نایاب مغل کے تصرف میں تھی مگر چند واجبات کی ادائیگی کے سلسلے میں بابر ہمایوں مغل کو اپنے والد کی یہ نشانی بھی اپنے دوست ساجد علی کے حوالے کرنا پڑی۔

"کل کا کیا پروگرام ہے؟" اس نے شیشے سے جھانک کر پوچھا۔

"وہیں پہنچ جانا تم بھی۔"

"کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا یار۔ دراصل پاس کے بغیر۔۔۔"

"ارے جگر' کس کی ہمت ہے کہ ساجد علی کے یار سے پاس مانگے۔ تم وہیں استقبالیہ پہ رک کے میرا انتظار کرنا۔ میرے ایک مہمان ملک مقبول صاحب بھی آنے والے ہیں انہیں لے کر ہی پہنچوں گا۔"

"یہ ملک مقبول وہ تو نہیں جو پہلے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔"

"ہاں ہاں وہی یار' بڑی اونچی چیز ہے۔ اب وزیر بے شک نہیں رہا مگر ٹھکے وہی ہیں۔ کھڑے کھڑے کسی بھی ملک کا ویزا لگوا سکتا ہے امریکہ' لندن' کینیڈا' کویت۔۔۔ سوچ رہا ہوں یہ مرغا اگر پھنس جاتا ہے تو ایک ثقافتی طائفہ لے کر میں بھی کہیں پھیرا لگا ہی آؤں۔ سنا ہے لوگوں کے ایک ہی پھیرے میں دن پھر جاتے ہیں۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔۔۔ اچھا چلو۔۔۔ کل دیکھیں گے۔" وہ اسے ہاتھ ہلا تا گلی کے اندر مڑ گیا۔ اعلیٰ قسم کی چرس والے سگریٹ کا سرور ساری رات کے بعد بھی اب تک ہلکا ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی ترنگ میں وہ گنگنا تا

ڈولتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ "لبوں کی شان' عنایت کے پان" والے کھوکھے سے عنایت بھٹی کی آواز آئی۔

"مغل صاحب' کدھر؟"

"ہاں بھئی' عنایت... کیسے ہو میاں؟" اسپیشل پان کی طلب کچھ ایسی یکایک بھڑکی کہ بابر ہمایوں مغل کے قدم خود بخود اس جانب بڑھ گئے اور اس وقت اسے قطعی یہ یاد نہ رہا کہ وہ عنایت بھٹی پنواڑی کا آٹھ سو روپے کا مقروض ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے پچھلے دو چار ہفتوں سے وہ گھر تک جانے کے لیے پچھلی گلی کا راستہ استعمال کر رہا ہے۔

"میاں لگاؤ ذرا ایک خاص الخاص پان۔"

"مغل صاحب' آج مہینے ڈیڑھ مہینے بعد آپ کا دیدار ہو رہا ہے' خیر تو ہے۔" عنایت نے پان لگانے کی بجائے گدی کے نیچے سے حساب والی بوسیدہ سی کاپی نکالی جس کے اکھڑے ورق دیکھ کے اچانک ہی بابر کو یاد آگیا کہ ایک مہینے تک اس سے کترائے پھرنے کی وجہ کیا تھی۔ اچانک اس کے بوجھل دماغ سے نشے کا سرور کم ہونے لگا۔

"مغل صاحب' کچھ تو خدا کا خوف کھایئے' پچھلے سات مہینوں کا حساب ہے یہ... پورے آٹھ سو روپے ہم پچاس سو کی دیہاڑی والے ماڑے (غریب) لوگ ہم سے اتنے لمبے لمبے حساب کتاب نہ رکھا کرو جی۔ یہ کاپی دیکھ لیں کسی کا دس' کسی کا بیس... حد ہے تو کسی کا پچاس پچپن... آپ تو لگتا ہے ساری عمر کا حساب اکٹھا ہی چکاؤ گے۔" اس کے تیور خاصے اکھڑے اکھڑے تھے۔

"چلو عنایت میاں' تمہیں اتنا تو اعتبار ہے ناں کہ ہم حساب چکا ضرور دیں گے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اعتبار کیا جی... محلے داری ہے اور... سب سے بڑھ کے بڑے مغل صاحب کا لحاظ۔ ساری عمر انہوں نے کسی کا ایک پیسے کا حق روک کر نہیں رکھا اور آپ..."

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔" اسے برا لگ گیا۔

"ایک تو تم لوگ بے دید اور بے مروت بہت جلد ہو جاتے ہو۔ ایک آٹھ سو کے لیے برسوں کی واقفیت منٹوں میں بھلا دیتے ہو۔"

"ہاں جی سولہ آنے درست۔" اس نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔

"بے دید ہی سہی' بے مروت ہی سہی... آپ ہمارا حساب تو چکتا کریں جی۔"

اسے کسی طرح نہ ٹلتا دیکھ کے بابر ہمایوں مغل نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک ہزار کا اور تین پانچ پانچ سو کے کرارے نوٹ دھیرے سے سہلائے اور جی کڑا کر کے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال لیا کل رات ایک عرصے کے بعد اس کی قسمت جاگی تھی ورنہ اب تو وہ بازی کھیلتے ہوئے ڈرنے لگا تھا۔ مسلسل ہار نے تاش کے پتوں پر سے اس کا اعتماد ختم کر دیا تھا اب تو بیچنے لائق کچھ رہا بھی نہیں تھا۔ مگر پرانی محبت لڑکپن کی محبت... پتوں سے یہ محبت کبھی کبھی اچانک جوش مار دیتی تھی اور وہ سب بھلائے پھر سے بازی لگا بیٹھتا' رات بھی ایسا ہی ہوا... ایک تو یاروں کی محفل' دوسرا نشے کی خماری اور تیسرا سب کے درمیان سبکی کا احساس کہ دوسرے کیا سوچیں گے' بابر ہمایوں مغل اتنا قلاش ہو چکا ہے کہ ایک بازی تک نہیں لگا سکتا۔ پہلی بازی وہ حسب توقع ہار گیا۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی وہ دوسری بازی لگا بیٹھا اور خلاف توقع جیت گیا۔ مگر یہ جیت بھی سوائے حیرانی اور جوش کے کچھ نہ دے سکی۔ کیونکہ جیتے ہوئے سات ہزار میں سے پانچ ہزار تو پہلی ہاری ہوئی بازی کے دینے پڑے... جس کے لیے وہ سوچ سوچ کر اپنا نشہ خراب کر رہا تھا کہ کہاں سے چکائے گا۔ دو ہزار جیب میں پڑے تھے اس لیے دل بے ایمان ہو رہا تھا' کچھ جیت نے بھی حوصلہ اور لالچ بڑھا دیا تھا اور کچھ یاروں کا اصرار۔

"چلو ڈبل کرتے ہیں۔" کسی نے رائے دی۔

"ڈبل... یعنی چودہ ہزار... نہیں میاں۔"

"کمال ہے بابر مغل... مغل ہو کے بھی شاہوں والی بات نہیں کرتے۔" یہ طعنہ کاری رہا اور اس نے ڈبل پہ اپنے فقط دو ہزار لگا دیے۔ ایک بار پھر ہار ہی مقدر بنی۔ مگر جو جیتا تھا اس کا جوش و خروش اسے مزید رسک لینے پہ اکسا رہا تھا۔ وہ آدمی مزید کھیلنے پر مصر تھا۔

"ایک اور ڈبل... اٹھائیس ہزار۔"

"یہ کچھ زیادہ ہی ہے اور ہم لوگ تو جو لائے تھے وہ تقریباً" سارا ہی تم بٹور چکے ہو کچھ کم کرو۔"

"چلو بیس کی چلتے ہیں۔"

پر وہی ہوا' بابر تقریباً" بھاگنے کو تھا۔ مگر دوستوں نے زبردستی بٹھا لیا۔ اس نے بھی سوچا' زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا ہار جاؤں گا... جہاں چودہ چکانے ہیں وہاں بیس اور سہی... اور اس وقت اسے ذرا احساس نہ ہوا کہ فی الحال وہ چودہ اور بیس تو کیا' پانچ ہزار والی مالیت کی کوئی چیز بھی نہیں رکھتا۔ لیکن یہ بے فکری اسے اپنے ان دوستوں کی جانب سے عطا کردہ تھی جو ہر وقت اسے قرض دینے پہ تیار رہتے تھے' خصوصاً" ساجد علی۔

اور تب وہ خود ہکا بکا رہ گیا جب وہ بیس ہزار جیت گیا۔ سالوں بعد اتنی رقم یکمشت جیتنا... اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ چودہ تو اسی وقت ساجد علی کے چکائے جو کچھ دیر پہلے ہاری بازی کے لیے اس سے لیے تھے۔ پچھلے ہفتے لیاقت سے جو دو ہزار لیے تھے وہ بھی اس کے مانگنے پہ دے دیے۔ پندرہ سو یاروں کی دعوت پہ اڑا دیے۔ باقی ڈھائی ہزار جیب میں ڈالے وہ یہ سوچ کر گھر جا رہا تھا کہ چلو ایک ہفتہ تو مانگے کی شراب اور ادھار کے سگریٹ کے بغیر گزرے گا کہ یہ پنواڑی کا بچہ سامنے آ گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک نوٹ اسے نکالنا ہی پڑا۔

"یہ لو میاں' تم خوش رہو' ہمارا کیا ہے کر لیں گے گزارا کسی نہ کسی طرح۔" اس نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے ان پانچ سو کے علاوہ اس کے پاس دھیلا تک نہ ہو۔

"بس پانچ سو؟"

"پانچ نہیں میاں' چار... چار سو کاٹ لو تم فی الحال' باقی کے چار سو ایک دو روز تک لوٹا دوں گا۔ اب یوں خالی ہاتھ مجھے بھیجتے کیا تمہیں اچھا لگے گا' چلو نکالو ایک سو روپیہ۔"

"چلیں مغل صاحب' چار سو ہی سہی مگر باقی رقم اسی ہفتے تک دے دیجئے گا۔ آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ ہم تو دیہاڑی دار لوگ ہیں۔ روز کے پچاس سو گھر لے کر جاتے ہیں ہمارے ساتھ ایسے لمبے لمبے حساب نہ رکھا کریں۔ میرے بڑے لڑکے کا دسویں کا داخلہ جانا ہے اگلے ہفتے... اس لیے مہربانی کر کے۔" اس نے سو کا نوٹ لوٹاتے ہوئے یاد دہانی کرائی۔

"ضرور ضرور..." وہ سرہلاتا آگے بڑھ گیا۔ کنٹری سے چند قدم کے فاصلے پہ اسے پھر سے رکنا پڑا۔ گیٹ کے اس طرف بچھی ماکھا گجر کی جہازی سائز چارپائی سے آواز آئی تھی۔

"او خیر ہووے... مغل جی آئے۔"

نشہ ٹوٹنے کے بعد درد سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا اوپر سے عنایت کی بک بک نے اور ایک پانچ سو کے نوٹ کے ساتھ چھوڑ جانے نے مزید دل جلایا ہوا تھا۔ ایسے میں ماکھا گجر کی پرتپاک صدا بھی اسے سخت ناگوار گزری مگر اسے زبردستی کی مسکراہٹ سجا کے اس طرف مڑنا ہی پڑا۔ یہ بھاری بھرکم پایوں والی بڑی سی چارپائی آس پاس کے علاقے میں "ماکھا دا منجا" کے نام سے مشہور تھی۔ اس پر بیک وقت دس بارہ لوگ آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں' یہ "منجا" ہر شام ہی آباد ہو جاتا۔ خوب گپیں لگتیں' چائے یا لسی کے دور چلتے۔ ماکھا گجر راجہ اندر بن کے بیٹھا ہوتا۔ اس وقت وہ تقریباً" اکیلا تھا۔ اکیلا اس لیے کہ کوئی اور پہلوان' دکاندار یا کنٹری کا رہائشی موجود نہ تھا اور تقریباً" اس لیے کہ اس کی بھاری ستونوں جیسی آبنوسی پنڈلیاں جو دھاری دار تہبند سے باہر نکلی ہوئی تھیں' ان کو دبانے کے لیے زمین پہ پیروں کے بل بیٹھا ہوا شیدا مصلی موجود تھا' ایک ٹانگ موڑ کے اور دوسری نیچے شیدا مصلی کی گود میں لٹکا کے بیٹھا ماکھا گجر نور جہاں سے مالش کرا رہا تھا۔ نور جہاں ایک ریٹائرڈ ہیجڑا تھا جو عمر زیادہ

ہونے اور شوگر جیسی بیماری کا شکار ہونے کے بعد گروپ سے نکال دیا گیا تھا اور اب اس کی گزر بسر کمیٹی کے لوگوں سے ملنے والی امداد اور ماکھا گجر کی سیوا سے ملنے والی رقم پہ ہوتی تھی۔

"آؤ شہزادے' بڑے دنوں بعد متھے لگے ہو۔" اگرچہ آج کل وہ ماکھا کا مقروض ہرگز نہیں تھا مگر بابر سے اس ٹون میں بات کرنا اس کی عادت بن چکی تھی۔

"بس یار' مصروفیت ہی کچھ ایسی۔" اس نے کہنا چاہا کہ ماکھا فلک شگاف قہقہہ لگا کے رہ گیا۔

"ہاں بھئی' مصروفیت۔" اس نے شیدا مصلی اور نور جہاں کو بھی ٹھٹھا لگاتے ہوئے ہنسنے پہ اکسایا۔ نور جہاں شانے پہ رکھا میلا چیکٹ "پرنا" منہ پہ رکھ کے ہنسنے لگا اور شیدا کے بھی پیلے پیلے دانت نکل آئے۔ بابر کو سخت ناگواری محسوس ہوئی۔

"ہاں بھئی' بڑے لوگوں کے بڑے کام۔ تسی ہماری طرح ویلے نکمے تو ہو نہیں جو بیٹھے منجا توڑتے رہو۔" اس نے منہ پکا کر کے طنز کیا۔

"اوئے کدھر سرکار' بیٹھو ہمارے پاس آؤ کوئی ناشتا' کوئی لسی' کوئی پوریاں۔" اس نے اسے پلٹتے دیکھ کے پکارا اس کے سامنے اس وقت بھی پیڑوں والی میٹھی لسی کا تانبے کا فل سائز گلاس بھرا رکھا تھا۔ دہی کا خالی دونا' پوریوں اور کچوریوں کی بچی کھچی باقیات بھی نظر آرہی تھیں۔

"نہیں شکریہ۔" بمشکل وہ اپنا موڈ ٹھکانے پہ رکھ پا رہا تھا ورنہ ماکھا گجر کی طنزیہ تمسخرانہ مسکراہٹ اور کمیوں کے سامنے ہنسی ٹھٹھول اس کا پارہ چڑھا رہا تھا۔

"مجھے اس وقت سخت تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ رات کو منجے پہ ملاقات ہو گی۔"

"اگر مصروفیت نہ ہوئی تو۔۔۔" اس نے جاتے جاتے پھر پیچھے سے فقرہ کسا۔

"میرا مطلب ہے تمہاری مصروفیت۔ میرا کیا ہے اسی منجی پہ صبح سے رات اور رات سے سویر کر دیتا ہوں۔ بھئی تم بڑے لوگ ہو' مصروف لوگ۔"

"ذلیل انسان' کمینہ' سحری کے وقت گھر گھر جا کے اپنی دو سوکھی سڑی بھینسوں کا پاؤ پاؤ دودھ بیچنے والا وقت بھول گیا۔ آج مجھ پہ فقرے کس رہا ہے۔ احسان مانے میرا جو اس کی چکنی چپڑی میں پھنس کے اونے پونے ساری جائیداد گروی رکھ بیٹھا۔ بدلحاظ' احسان فراموش۔" بکتا جھکتا وہ راستے میں ملنے والے ہر انسان کے سلام کا جواب ایک زبردست گھوری سے دیتا اپنے کمرے تک پہنچا۔ ایک ٹھوکر دروازے پہ رسید کی۔

قمیص کی ترپائی کرتی یاسمین نے ہڑبڑا کے حسب عادت قمیص' سوئی اور دھاگہ تکیے کے نیچے چھپانا چاہا پھر اسے خیال گزرا کہ یہ اجرت پہ سلنے والے کپڑے تو ہیں نہیں جو وہ چھپاتی پھرے' یہ تو اقدس کی قمیص تھی۔ نایاب کی یونیفارم کے کپڑے میں سے یہ پیس بچ گیا تو یاسمین نے سوچا چھوٹے کی قمیص ہی سی لے حالانکہ وہ ابھی اسکول نہیں جاتا تھا۔ یاسمین گھر پہ ہی اسے بھائیوں کی پرانی کتابوں سے ابتدائی جماعتوں کے سبق پڑھا رہی تھی لیکن اسے یونیفارم پہننے کا بہت شوق تھا۔ بے چارے کو کتابوں کی طرح کپڑے بھی بڑے بھائیوں کے پرانے پہننے پڑتے۔ شمشیر نے خاصا قد نکال لیا تھا' وہ ہو بہو اپنے دادا کی تصویر تھا۔ وہی اونچا قد' مضبوط کاٹھی' سرخ و سفید رنگت بابر بھی پہلے تو ٹھیک ٹھاک ہی صحت مند تھا مگر اب نشے نے اسے بالکل ڈھانچہ کر کے رکھ دیا تھا' قد بھی مناسب ہی تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے دل سے اترے کپڑے اب معمولی سی کاٹ چھانٹ کے بعد شمشیر کے استعمال میں آ لگتے تھے اور وہ اس کے لیے تقریباً "نئے" ہی تھے کیونکہ بابر کی شاہ خرچیوں کا وہی عالم تھا۔ بھلے گھر میں کھانے کو کچھ ہو یا نہ ہو' اسے دوستوں کی محفل میں اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ ہر حال میں قائم رکھنی تھی۔ یاسمین اس کے دم ہوئے کلف لگے کپڑے' جما جما کے استری کرتی' بچوں کے بے ڈھنگے' سالوں پرانے' رنگ اڑے کپڑے اسے نظر آتے مگر کیا کر سکتی تھی اور اقدس۔۔۔ وہ تو جب سے پیدا ہوا تھا شاید ہی اس نے کبھی بھائیوں کی اترن کے علاوہ کچھ

پہنا ہو۔ امی حضور ہر سال عید شب برات پہ بچوں کے کپڑے بھیجتیں شمشیر اور نایاب بڑھتی عمر کے بچے تھے ہر سال پچھلی عید کی شلواریں ٹخنے چھوٹے لگتیں اور وہ انہیں اقدس کے لیے نئے کپڑے بنانے سے منع کر دیتی کہ بھائی کے پرانے پہن لے گا۔ اس کے بدلے وہ ان سے دبے الفاظ میں داماد کے لیے ریشمی کرتے کی فرمائش کر ڈالتی۔

"یہ صبح صبح یہ پوشاکیں سینے بیٹھ گئی ہو؟" اس نے تنقیدی نظروں سے گھورا۔

"جی وہ۔۔۔ بس فارغ بیٹھے تھے تو سوچا اقدس کی قمیص ہی سی ڈالیں۔"

"اسکول جانے لگا ہے یہ۔۔۔؟"

"جی نہیں ابھی تو گھر پہ قاعدے پڑھا رہے ہیں ہم۔ اگلے سال انشاء اللہ پہلی جماعت میں داخل کرائیں گے۔"

"کیا ضرورت ہے؟ اتنی ہی فارغ ہوتی ہو تو یہ "ملبوسات" کی سلائی کی بجائے اسے بھی پڑھاتی رہا کرو۔ دس جماعتیں تو پڑھ رکھی ہیں ناں تم نے۔ پھر۔۔۔ یا اسے چار پانچ جماعتیں بھی گھر نہیں پڑھا سکتیں۔ اسکول جائے گا تو خرچہ ہی بڑھے گا۔"

"سرکاری اسکولوں کا خرچہ کیا ہوتا ہے۔"

"خرچہ نہیں ہوتا؟" وہ بپھر گیا۔

"خرچہ نہیں ہے تو پھر ہر مہینے رونے کس بات کے روتی ہو۔ کبھی کتابوں کے پیسے' کبھی دوات قلم کے' کبھی کاپی خریدنی ہے۔"

"یہ تو لینا ہی پڑتا ہے' فیس برائے نام ہے مگر کتابیں تو وہ مفت نہیں دیتے اقدس کا کیا ہے بھائیوں کی پرانی کتابیں۔۔۔"

"زبان چلاتی رہنا تم۔" وہ اچھل کے پلنگ سے کھڑا ہو گیا "شوہر ساری رات کے بعد اب گھر لوٹا ہے بجائے اسے چائے ناشتا پوچھنے کے سبق سنا رہی ہو کیا چاہتی ہو تم؟ بالکل ہی گھر نہ آیا کروں۔" اس کے زور زور سے دھاڑنے پہ اقدس سہم کے بہن کی گود میں دبک گیا جس کا اپنا رنگ ہلدی ہو رہا تھا نایاب اور شمشیر اسکول میں تھے۔

"دلکش! اپنے والد کے لیے ناشتا بنایئے۔" اس نے بیٹی کو وہاں سے ہٹانا چاہا۔

"تمہارے کیا ہاتھ پیر ٹوٹ گئے ہیں یا شوہر کی خدمت کرنا تمہاری شان کے خلاف ہے۔ ہاں بھئی نواب زادی

"ناشتے میں کیا لیں گے؟" اس نے تحمل سے پوچھا اور سلیپر پہننے لگی۔

"کیا ہے؟"

"رات کی دال بچی ہے' روٹی پکا دیں؟ ایک انڈا بھی نعمت خانے میں دھرا ہے اگر ڈبل روٹی کھانا چاہیں تو ہم اقدس سے منگوا دیتے ہیں۔"

"تم لوگوں نے کیا کھایا ہے؟" اسے پتہ تھا کل ناشتے میں وہ دو انڈے لایا تھا' ایک کل کھا کر نکلا تھا' اور ایک پڑا ہوا ہے۔

"دونوں بچے چائے میں باقر خانی بھگو کر کھاتے ہیں۔ وہ تو کل سے ختم ہیں اس لیے آج چائے کے ساتھ پراٹھا کھا گئے ہیں۔ ہم تو صرف چائے لیتے ہیں' دلکش نے رات کے دال چاول کھائے تھے اور اقدس کو بچے ہوئے چاولوں میں شکر ڈال کر دے دی تھی۔"

"ہوں۔" ساری تفصیل جاننے کا مقصد یہ تھا کہ آیا اس کے سسر صاحبزادہ نفیس علی خان کا چکر لگا یا نہیں۔ وہ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد آتے تو اناج' دالیں گھی کے ساتھ ساتھ پھل' مرغی بھی دے جاتے اور بچے چند روز تک اچھا کھا پی لیتے۔

"رہنے دو ناشتا' ایک کپ چائے بنادو۔" رات کے ڈھائی بجے اس نے ہیرا منڈی سے پائے' دیگی روسٹ اور روغنی نان خود بھی کھایا تھا اور دوستوں کو بھی کھلایا تھا۔ ناشتے کی گنجائش تھی بھی نہیں وہ تو ویسے ہی ٹٹول رہا تھا۔

"یہ چائے ہے؟ تمہیں پتہ نہیں کہ میں بالائی کے بغیر چائے نہیں پیتا۔" وہ نئے سرے سے گرم ہو گیا۔ عنایت بھٹی اور ماکھا گجر کی جانب سے دیا گیا سارا ڈپریشن اور تمام فرسٹریشن باہر نکال پھینکنے کے لیے یاسمین سے بہتر سہارا اور کوئی نہ تھا۔

"آدھ کلو دودھ پہ آخر کتنی بالائی آئے گی۔ دو چمچے بمشکل آتی ہے۔"

"تو وہ دو چمچے کیا تم اپنی دوزخ میں ڈال لیتی ہو۔"

"یہ کل کے دودھ کی چائے ہے اور اس کی بالائی آپ کی کل کی چائے پہ لگ چکی ہے۔" اس نے پھر سے قیصر پکڑلی۔

"آج کیا موت گزری ہے اللہ داد پہ۔"

"پتہ نہیں۔" اس نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بابر سے کم سے کم مخاطب ہو تاکہ وہ اس کی کم سے کم تضحیک کر سکے مگر وہ اپنا ابال نکالنے کے لیے بہانے تک ڈھونڈنے کی زحمت نہیں کرتا تھا اور کسی بات کے بنا ہی فضول سوالات کی بوچھاڑ کر کے اسے زچ کر ڈالتا۔

"تمہیں نہیں پتہ تو کیا برابر کے گھر والی صفو کو پتہ ہو گا۔"

"وہ پچھلے دس دن سے رقم کا تقاضا کر رہا تھا۔ دو ماہ کا حساب اکٹھا ہو گیا ہے شاید اسی لیے آج دودھ دینے نہ آیا ہو۔ چائے بھی ہم نے تھوڑی بنائی تھی اور اقدس کے چاولوں میں بھی صرف شکر ہی ملائی تاکہ آپ کی چائے کے لیے دودھ بچ جائے۔"

"اور وہ تمہارے چچا حضور۔ وہ صاحبزادہ نفیس علی خان۔" بالآخر وہ زہر اگلتے لہجے میں ان کے بارے میں پوچھ ہی بیٹھا۔

"ان کی سواری باد بہاری نہیں آئی؟"

وہ چپ رہی تو چڑ کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا پیالہ سامنے دیوار پہ دے مارا۔

"ایسے چھپکلی جاتی ہیں لڑکیاں تمہارے خاندان میں؟ یہ حور پری میرے گلے ڈال کر دوبارہ پوچھنے تک نہیں کوئی آیا۔"

"کوئی۔۔۔ کوئی مجبوری ہو گی ہو سکتا ہے ان کی طبیعت ناساز ہو۔" وہ افسوس سے زمین پہ کرچی کرچی ہوا پیالہ اور دور تک پھیلی چائے دیکھنے لگی۔ بچے کو ضد سے روتا چھوڑ کر اس نے یہ ذرا سا دودھ بچایا تھا' اس بے فیض شخص کی چائے کے لیے جسے رشتوں کے ساتھ ساتھ رزق کا احترام بھی بھولتا جا رہا تھا۔

"ہونہہ طبیعت ناساز؟" اس نے ہنکارا بھرا۔

"ارے ہٹے کٹے ہیں۔ ہماری طرح رات کی دال اور سوکھی روٹی پہ نہیں پل رہے۔ چرڑی کھاتے ہوں گے اسی لیے بدن کے ساتھ ساتھ چربی آنکھوں پہ بھی چڑھ گئی ہے۔"

وہ چچا حضور کے بارے میں ایسے گستاخانہ کلمات برداشت نہ کر سکی اور کرچیاں سمیٹ کر پھینکنے کے بہانے باہر نکل آئی دروازے کے ساتھ رکھے ایک پرانے کنستر میں کرچیاں پھینکیں جو کوڑے دان کا کام دے رہا تھا۔ دوپٹے کے پلو سے بے ساختہ بہتے آنسو صاف کر کے اندر جانے کو مڑی تو اقدس کو اسٹیل کا ڈول تھامے باہر نکلتے دیکھا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"ابا جان نے یہ دیا ہے۔" اس نے خوشی سے دمکتے چہرے کے ساتھ سو کا نوٹ دکھایا جیسے ابا جان نے یہ سو روپیہ اسے گولیاں ٹافیاں کھانے کے لیے دیا ہو۔

"اور کہا ہے کہ اللہ داد کی دکان پہ نہ جانا' اس سے ذرا آگے نئی دکان کھلی ہے اس سے ایک کلو دودھ اور ایک پاؤ

جلیبی لے کر آؤ۔"

"ایک منٹ رکیں۔" وہ اندر مڑی۔

"سنیے' ایک کلو دودھ اکٹھا مت منگوائیے۔ موسم گرم ہے پڑا پڑا کل تک خراب ہو جائے گا آدھ کلو اب منگوالیں' آدھ کلو کل منگوالیجئے گا۔"

خلاف توقع وہ کوئی جلی کٹی کہے بغیر صرف سرہلا کے رہ گیا۔ یاسمین نے اقدس کو دوبارہ تاکید کی اور دل ہی دل میں کچھ سوچتی اندر چلی آئی۔ اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو بابر کے پاس اچھی خاصی رقم ہے اگر سو دو سو ہوتا تو وہ کبھی گھر کے استعمال کی کوئی چیز منگوانے کی حماقت نہ کرتا لیکن اس شک کا اظہار کر کے وہ نیا طوفان نہیں کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ بابر ریڈیو کا اسٹیشن ڈھونڈ رہا تھا۔ بالآخر ایک جگہ اس کی پسند کا گانا آ ہی گیا۔ چند بول سرہلا کر سننے کے بعد اس نے ہاتھ مار کے ریڈیو بند کر دیا۔

"اس گلوکارہ کو سننے میں نہیں' دیکھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔" وہ پلنگ پہ نیم دراز ہو کے چسکے لے لے کر تبصرہ کرنے لگا۔ یاسمین نے آنکھ کے اشارے سے دلکش کو منظر سے غائب ہونے کے لیے کہا وہ چپ چاپ دروازے کے دہلیز کے پاس رکھی چوکی پہ آ کر بیٹھ گئی سامنے جالی کی دیوار پہ بوسیدہ چادر کا پردہ پڑا تھا جس کے اس پار سے مشترکہ صحن سے آتی مختلف آوازیں اس کا دھیان بانٹنے لگیں۔ سبھی گھروں کے مرد' لڑکے کام پہ نکل چکے تھے' اسکول کالج جانے کا رواج یہاں کم ہی تھا۔ چند عورتیں بھی جو دوسروں کے گھروں میں کام کرتی تھیں' جا چکی تھیں۔ اب اسی کی عمر کی لڑکیاں گھروں پہ صفائی اور کھانا پکانے کی ڈیوٹی انجام دے رہی تھیں یا پھر چھوٹے چھوٹے بچے اپنی وقتی آزاد بے فکر زندگی کو انجوائے کرتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے اکثر لوگوں نے چولہے کمروں سے باہر صحن میں رکھے ہوئے تھے اس لیے چولہے کے نزدیک بیٹھی وہ ساری نوعمر لڑکیاں بلند آواز میں ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔ ان کی آوازوں کے شور میں اندر سے آتی بابر ہمایوں مغل کی آواز دب سی گئی جس میں وہ اب تک اپنی پسندیدہ گلوکارہ کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

"عورت ہو ایسی کہ گزرتے سال اس کے چہرے اور سراپے کو چھوئے بغیر گزر جائیں نہ کہ سالی اپنی بیوی جیسی بوسیدہ لاش۔" اس نے حقارت سے یاسمین کے سادہ سے سراپے کو دیکھا جو ڈھیلے ڈھالے سوتی جوڑے میں ملبوس تھی۔ کمرے کے اندر اپنے شوہر کے سامنے بھی ململ کا گہرا نیلا دوپٹہ اس کو مکمل ڈھانپے ہوئے تھا۔ لمبے بال جن میں کہیں کہیں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے' سیدھی چٹیا میں قید تھے۔ گہری بھوری اداس آنکھیں' پیلی رنگت جو کبھی صاف ہوا کرتی تھی مگر اب جس پہ زردیاں کھنڈی تھیں' رخساروں اور ماتھے پہ چھائیوں کے نشانات جو ہر زچگی کے بعد کمزوری کی وجہ سے نمودار ہوتے گئے' آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے جو سلائی پہ مسلسل نظر جمانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ خشک لب سخت کھردرے ہاتھ پیر اور بے لوچ سپاٹ آواز۔

"لاش ہی تو ہے' تبھی کسی بات کا جواب نہیں ملتا۔" یاسمین کی خاموشی اسے اور تلملا دیتی تھی۔

"کیا بولیں ہم۔" وہ لاچاری سے اسے دیکھنے لگی۔

"اگر کچھ کہتے ہیں تو آپ زبان درازی کا الزام عائد کرتے ہیں۔"

"وکیل کی بیٹی ہو' جرح تو کرو گی بھلے دسویں تک ہی کیوں نہ پڑھا ہو۔ چلو شکل و صورت تو اللہ کی طرف سے ملی ہے۔ طریقہ سلیقہ تو خود آ جاتا ہے۔ شوہر سے کیسی باتیں کرتے ہیں' کیسے اس کا دل بہلاتے ہیں' تمہیں کبھی نہیں آیا۔"

"مگر شوہر سے نباہ کیسے کرتے ہیں' یہ ہنر تو ہمیں بخوبی آتا ہے۔" وہ صرف سوچ کے رہ گئی۔ اقدس کو آتے دیکھ کر اٹھی۔

"ہم چائے بنا کے لاتے ہیں آپ کے لیے۔" اور اس کے سامنے چائے اور جلیبیاں رکھتے ہوئے اس نے بالآخر ہمت کر ہی ڈالی۔

"ہم سوچ رہے تھے کہ آپ سے چچا حضور کی طرف جانے کی اجازت طلب کریں۔ تقریباً" تین ساڑھے مہینے ہو گئے وہاں جا کے نہیں دیکھا بچے بھی کہہ رہے تھے۔"

"ہونہہ، چچا حضور۔" وافر مقدار میں ڈالے گئے دودھ سے بنی خوشبودار چائے اور گرما گرم جلیبی نے شاید ا موڈ قدرے گوارا کر دیا تھا اس لیے محض ہنکارا بھرنے پہ اکتفا کیا گیا ورنہ اس کے میکے جانے کے مطالبے پہ وہ سے باہر ہو جایا کرتا تھا یاسمین اسی وجہ سے کئی کئی ماہ گزار دیتی تاکہ اسے غضب میں آنے کا بہانہ نہ ملے اور بابر بیوی کو وہاں جانے سے روکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ کم سے کم سسرالیوں کا سامنا کرنا چاہتا تھا اسے خدشہ تھا کہ اس کے سسر پہ اس کی چرس کی لت، شراب نوشی اور جوا کھیلنے کی عادت آشکارا نہ ہو جائے اور صاحبزادہ نصیر خان جو یوں تو خاصے جہاندیدہ سمجھتے تھے خود کو مگر اتنے سالوں میں داماد کے طور طریقوں سے واقف نہ ہو سکے ا اڑتی کبھی سنی بھی تو دھیان نہ دیا، صرف اتنا جانتے تھے کہ داماد صاحب بے روزگار ہیں اور مسلسل، مستقل روزگار ہیں۔ یاسمین نے کبھی منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹ کے دیا۔ بس اس کی اجڑی اجڑی آنکھیں اور ات دیکھتے اور ہر مہینے گھر میں ڈیڑھ دو ہزار کا راشن ڈال آتے، ان کے خیال میں شاید یہی تمام دکھوں کا مداوا ہو۔ کس تک یہ سچ بھی تھا، تمام نہ سہی چند دکھوں کو تو وہ ٹھیک ہی جایا کرتے۔

"نہیں تو توفیق نہیں ہوتی کہ تمہاری خیر خبر ہی دریافت کر جایا کریں۔ سر سے کسی بوجھ کی طرح اتار پھینکا یتیم بھتیجی کو۔ جب وہ کنی کتراتے ہیں کہ کہیں کچھ دینا دلانا نہ پڑ جائے تو تمہیں کیوں ہڑک اٹھ رہی ہے۔"

"یوں تو مت کہیے ہر ماہ باقاعدگی سے آتے ہیں۔ اس بار چند روز اوپر ہو گئے ہیں ضرور کوئی وجہ ہو گی ہم اس بھی جانا چاہتے ہیں کہ کہیں خدانخواستہ وہ علیل نہ ہوں اور دوسری وجہ یہ کہ صاحبزادی گل مہر کا رزلٹ نکل آ یا آج کل میں آنے والا ہو گا اس کی مبارکباد بھی دے دیں گے۔"

"اچھا اچھا کل صبح میرے ساتھ ہی... نہیں تم تیاری کر لو شام کو مجھے کہیں جانا ہے تمہیں چھوڑتا ہوا گا۔" اچانک ہی اسے یاد آ گیا کہ آج کی اور کل کی رات تو اسے باہر گزارنا ہے، اچھا ہے گھر خالی ہو گا کوئی فکر گی۔ آج رات اسے ساجد علی کے کسی کام سے ملتان جانا تھا اور کل رات بھی ساجد ہی کے ایک میوزیکل فنک میں شرکت کرنا تھی۔ ساجد علی ایک پروموٹر تھا، شادی بیاہ پہ چھوٹے موٹے فنکشنز کراتا اب وہ میوزیکل نا کروانے لگا تھا۔ اس کے گروپ میں چند فوک سنگرز جو زیادہ اونچا نام نہیں رکھتے تھے، فلموں کی ناکام ایکٹ بازار حسن کی چند طوائفیں شامل تھیں۔ امراء اپنے گھر پہ ایسے فنکشنز آئے دن منعقد کراتے رہتے تھے او کی بار تو ساجد علی نے خاصا لمبا ہاتھ مارا تھا ایک مشہور اداکارہ کو پھنسا کر اس کی تاجپوشی کی ایک تقریب من تھی جس میں نامور گلوکاراؤں کی پرفارمنس کے ساتھ چند بھڑکیلے ڈانس آئٹمز بھی رکھے گئے تھے اس س اس نے ملتان کے بازار کی چند رقاصائیں ہائر کی تھیں جنہیں لانے کی ذمہ داری اس نے اپنے پرانے دوس ہمایوں مغل کے سپرد کی تھی بابر کو ایسے کاموں میں کیا غرض تھا ڈرائیور اسے سی والی پجارو، چٹپٹی بازاری عو ساتھ اور بدلے میں ہزار دو ہزار کی رقم الگ جو اگلے ہی روز کے فنکشن میں ڈانسرز کے اوپر نچھاور کرنے میں ہو جاتی تھی۔

"ہم ایک دو روز رہ لیں؟" اتنی جلد اجازت مل جانے پر یاسمین کا حوصلہ بڑھا۔

"بس ایک روز۔" اس نے تنبیہہ کی۔ "زیادہ پھیلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ویسے بھی وہ جانتا تھا ک ختم ہو چکا ہے، تبھی تو بچے چائے کے ساتھ روٹی کھا رہے ہیں ورنہ ان کے نانا حضور وافر مقدار میں دیسی گھی باقرخانیاں، پھینیاں، نان خطائیاں لا دیتے۔ اب یہ جائیں گے تو ظاہر ہے کہ خالی ہاتھ تو نہ لوٹیں گے۔

"وہ..." اس نے ہچکچاتے ہوئے مطالبہ کرنا چاہا۔

"کچھ روپے ہوں گے۔"

جواباً بابر نے تیوری چڑھا کے اسے گھورا۔ وہ گڑبڑا گئی۔

"اگر نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں ہم تو بس۔"

"اقدس، بقایا کتنے روپے بچے۔" اس نے بیٹے کو آواز دی۔ وہ فوراً" تپائی پہ رکھے نوٹ آگے بڑھانے لگا۔

"پتہ نہیں ابا جان، یہ رہے۔"

"بس اٹھہتر روپے۔" اس نے گنتے ہوئے پوچھا بچہ بے چارہ سہم کے سر جھکا کے رہ گیا۔ وہ یہ حساب کتاب جانے۔

"آدھ کلو دودھ بارہ روپے کا اور شاید دس روپے کی جلیبی آئی ہو گی۔" یاسمین نے وضاحت کی۔ بابر نے ایک کا نوٹ اور چند سکے اس کی طرف پھینکے اور بقایا بیس روپے جیب میں ٹھونستے ہوئے بڑا احسان جتایا۔

"میکے جا کر کوئی میری ذات پہ احسان نہیں کر رہی۔ ہونہہ شوق خود کو اٹھ رہے ہیں گھر سے بھاگنے کے، جرمانہ کروں۔ مصیبتوں سے ساری رات جاگ کے یہ ایک نوٹ کمایا تھا اس پہ تم نے نظر لگا رکھی ہے لو، رکھو کیا رو گی۔"

یاسمین چپ چاپ نوٹ مٹھی میں دبوچے بیٹھی رہی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ساری رات جاگ کے اس قسم کی محنت کی تھی شروع شروع میں جوئے اور ریس میں کبھی کبھار جیتے یہ نوٹ اسے کسی کریہہ غلاظت طرح لگتے تھے مگر اب مجبوراً" وہ انہیں قبول کر لیا کرتی تھی۔ ویسے بھی اس سو پچاس روپے کی نوبت بھی مہینوں آیا کرتی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ بیس روپے بابر نے صرف یہ جتانے کے لیے اپنی جیب میں رکھے ہیں کہ اس پاس اس سو کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لیکن وہ بابر کی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھی۔ جس قسم کے اس کے تھے وہ بیس روپے میں تو پورے نہیں ہو سکتے تھے اسے یقین تھا کہ ضرور اس کے پاس اچھی خاصی رقم ہے

☼ ☼ ☼

"ہاں تو بیٹا، ہم کیا بات کر رہے تھے۔" سفیان محمود نے ریسیور رکھتے ہوئے گل مہر سے سلسلہ تعلیم دوبارہ جوڑا اور وہ جو انہیں گفتگو میں مصروف پا کر کی آرائش کا جائزہ لے رہی تھی، چونک کے رہ گئی۔

"آپ غالباً" ہمیں لنچ کی آفر کر رہے تھے۔" مزنی نے ہوا میں تیر چلایا۔ گل مہر نے سٹپٹا کے اسے کہنی بھی ماری ڈھٹائی سے مسکراتی رہی۔

"ہاں بھئی، لنچ ٹائم تو ہو چکا ہے۔" سفیان محمود نے رسٹ واچ پہ نظر ڈالی۔

"تو پھر انکل دیر کس بات کی۔ یہ راہٹ یا ڈکسی؟" مزنی کو بھوک شاید کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی البتہ گل مہر اس ان کے ساتھ لنچ پہ جانے کا تصور کر کے گھبرا گئی۔ بے شک وہ مزنی کے انکل تھے اور مزنی اس کی بیسٹ فرینڈ سے وہ اس کے گھر آتی جاتی رہی تھی مگر بہرحال اس کے لیے تو وہ غیر ہی تھے۔ ان کے ساتھ ہوٹلنگ۔ پھر کل بھی سفیان محمود نے آسان کر دی۔

"مزنی، بیٹا تم تو جانتی ہو کہ میں لنچ لیتا ہی نہیں اور پھر بیس منٹ بعد میری بہت امپورٹنٹ میٹنگ بھی ہے ایسا میں تمہارے لیے تمہاری پسند کا لنچ منگوا لیتا ہوں ساتھ ساتھ کام کی بات بھی ہو جائے گی۔ کیوں گل مہر اور آپ لنچ میں کیا لیں گی؟"

"؟" ان کے ساتھ ریسٹورنٹ میں لنچ کرنا جتنا مشکل تھا، اس آفس میں ان کے سامنے بیٹھ کر کرنا بھی اتنی جلد بے تکلف ہونے کی اس کی عادت نہیں تھی۔ جھجک کے مارے وہ کچھ کہہ نہ سکی مزنی اس کی بھانپ گئی۔

"انکل، ہمیں شوق نہیں اس قدر بور لنچ کا آپ گل مہر سے اطمینان سے بات کر لیں۔ اس کے بعد ہم میں اور گل لنچ کرنے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ ہم آپ کے مہمان ہیں بھلے آپ ساتھ جائیں یا لنچ تو آپ ہی کرائیں گے۔"

"تم اب اتنی منی بھی نہیں رہیں' ہے ناں۔" وہ ہنسنے لگے۔

"لو کیا یاد کرو گی' تمہیں اور تمہاری فرینڈ کو فائیو اسٹار کا لنچ بوفے کراتے ہیں۔" انہوں نے ایک کارڈ والٹ سے نکالا۔

"کبھی کبھی کسی پارٹی سے میٹنگ کے دوران لنچ آور آجائے تو میں چاہے اس کا عادی ہوں یا نہیں مگر انہیں لے جانا پڑتا ہے فائیو اسٹار بوفے میں میرا پرمننٹ کارڈ بنا ہوا ہے' یہ لے جاؤ۔"

"واؤ انکل' زبردست۔ ویسے بھی گل مہر کے اتنے اچھے رزلٹ پہ میں نے اسے ٹریٹ تو دینی تھی' چلو یہی سہی۔"

"بہت خوب یعنی حلوائی کی دکان پہ نانا جان کی فاتحہ۔" ان کی برجستہ مثال پہ گل مہر بھی مسکرا دی۔

"ہاں تو بیٹا' ایسا ہے کہ رزلٹ آپ کا واقعی بہت شاندار ہے' انگلش بھی کمال کی ہے۔ رہا ایکسپیرینس تو وہ بھی آجائے گا۔ لیکن میرے پاس پارٹ ٹائم کی گنجائش نہیں ہے۔ میں آپ کو گرافک ڈیزائنر یا سیکرٹری کی جاب آفر کر سکتا ہوں مگر نائن ٹو سکس والی اور بہت اٹریکٹو پیکج کے ساتھ۔"

"تھینکس سر لیکن ہم آگے پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان فیکٹ پارٹ ٹائم جاب ہم اپنی اسٹڈیز کے لیے ہی کرنا چاہتے ہیں۔ فل ٹائم جاب کے بعد ہمارے پاس اتنا ٹائم ہی کہاں بچے گا کہ ہم پڑھ سکیں۔ ہمیں فی الحال اٹریکٹو پیکج سے زیادہ اس سیلری کی ضرورت ہے۔ جس سے ہماری ایجوکیشن کے اخراجات آسانی سے پورے ہو جائیں۔ ہم ایوننگ کلاسز میں ایڈمیشن لے لیں گے اگر کوئی نو سے ایک یا دو بجے تک کی جاب ہو یا پھر۔۔۔"

"سوری بیٹا' میں بتا چکا ہوں لیکن پھر بھی میں دیکھ لیتا ہوں۔ شاید کوئی گنجائش نکل آئے۔ ویسے مجھے یہ بات پسند آئی کہ آپ ایجوکیشن کو اتنی اہمیت دے رہی ہیں۔ آپ نے یہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں آپ کو کتنی سیلری آفر کر رہا ہوں۔ یہ نہیں سوچا کہ اگر اتنی کوالیفکیشن کے ساتھ بھی آسانی سے جاب مل رہی ہے تو مزید پڑھنے کا کیا فائدہ۔"

"سر ہمارا مقصد صرف جاب کرنا نہیں ہے بلکہ اپنا ایک نمایاں نام اور الگ حیثیت بنانا ہے۔ ہم آگے جانا چاہتے ہیں بہت آگے۔ سیکرٹری کی سیٹ ہماری منزل نہیں ہاں البتہ ہم جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لیے ہم وقتی طور پہ ایسی ملازمت ضرور کر سکتے ہیں مگر شرط وہی ہے کہ کام چند گھنٹوں کا ہو۔"

"ہوں۔۔ ایسا ہے کہ ایک کام ہے میری نظر میں میری فرم میں تو نہیں مگر میرا ایک بہت اچھا دوست ہے اسے کسی ایسے فریش مائنڈ کی ضرورت ہے جو کمپیوٹر کی مدد سے نئے نئے تجربے کر سکے کام آپ کی دلچسپی کا ہے اور خاصا کری ایٹو بھی اور میرا خیال ہے یہ پارٹ ٹائم والی شرط پہ بھی پورا اترے گا ایکچوئیلی اس کا ایک پروڈکشن ہاؤس ہے۔ "لکی ایس" شاید آپ نے نام سنا ہو۔"

"ہاں انکل یہ تو بہت معروف نام ہے۔ آج کل بھی پرائیویٹ چینلز پہ چھایا ہوا ہے۔ بہت سے ہٹ ڈرامے اور پروگرامز ان کے کریڈٹ پہ ہیں۔" مزنی نے تائید کی۔

"آج کل ایک بہت بڑے پروجیکٹ پہ کام کر رہے ہیں یہ لوگ' اندازہ ہے کہ یہ پاکستان میں اب تک کا سب سے مہنگا سیریز ہوگا جس قسم کا یہ سبجیکٹ ہے اس میں اسپیشل افیکٹس کی بہت ضرورت پڑے گی بلکہ اصل میں تو سارا کام ہی کمپیوٹر کا ہے۔ پتہ نہیں آپ کا انٹرسٹ ہے یا نہیں لیکن میرا مشورہ ہے کہ آپ ایک بار مل ضرور لیں۔"

"لیکن سر' ڈرامہ سیریل آئی مین یہ شوبز وغیرہ اس طرف ہم جانا نہیں چاہتے۔"

"او کم آن بیٹا' آپ نہ تو اسٹوڈیو جا رہی ہیں نہ کسی شوٹنگ پہ' آپ کا ٹیبل ورک ہے جو "لکی ایس" کے آفس میں ہی پورا ہو جائے گا۔ آپ اپنا نام بنانا چاہتی ہیں ناں۔۔ تو یہ تو ایک گولڈن چانس ہے آپ کے لیے۔ اگر یہ ڈرامہ ہٹ ہو جاتا ہے جس کے ہنڈرڈ پرسنٹ چانسز ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا سارا کریڈٹ اس کی کمپیوٹرائیڈ ٹیکنگ

اسپیشل افیکٹس کو ملے گا۔" انہوں نے قائل کرنے کی پوری کوشش کی گل مہر بھی پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگی۔

"اوکے سر ہم سوچ کر جواب دیں گے۔"

"ہاں بالکل ضرور سوچیں مگر ایک دو دن ہی ہیں آپ کے پاس۔ میں ابھی وہاں فون کر دوں گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ وہاں ایک بار ہو آئیں' وہاں کا ماحول اور کام دیکھ لیں پھر سوچیں۔ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔"

"اوکے سر۔" وہ رضامند ہو گئی۔

سفیان محمود نے اسے "لکی ایس پروڈکشن" کا ایڈریس تفصیلاً بھی سمجھایا اور کارڈ بھی دے دیا۔ اسے ایک بار پھر وہاں جانے کی پر زور تاکید کرتے ہوئے انہوں نے یقین دہانی کرائی کہ وہ خود فون پہ بات کر کے گل مہر کے بارے میں بتا دیں گے۔ مزنی کو وہاں سے نکلنے کی گل سے زیادہ جلدی تھی۔

"لنچ کے بعد میرے ساتھ شاپنگ پہ چلنا۔" پارکنگ میں کار لگاتے ہوئے اس نے پروگرام بتایا۔

"یہ اچانک شاپنگ کا پروگرام کیسے بنا لیا۔ نہیں بھئی' ہمیں تو گھر پہ ڈراپ کر دینا۔ ہم دوپہر دو بجے تک کا ہی کہہ کے آئے ہیں اور ڈیڑھ بج رہا ہے۔"

"فی الحال تو بارہ بج رہے ہیں اور وہ بھی میرے تھوبڑے پہ۔ یار قسم سے زبردست بھوک لگی ہے چلو' ٹوٹ پڑو۔" اس نے بوفے ہال میں داخل ہوتے ہی ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اکا دکا فیملیز تھیں' زیادہ تر کاروباری افراد ان اوقات میں یہاں لنچ کے لیے آیا کرتے۔

"ہاں اب بتاؤ گفٹ کیا لو گی مجھ سے؟" مزنی اپنی پلیٹس تقریباً" ہر ڈش سے بھرنے کے بعد اب تسلی سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

"گفٹ تو تم نے دے ہی دیا ہے۔ آئی مین' یہ جاب۔"

"اوہ تو تم نے فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ سوچنے کا وقت کس لیے مانگا؟"

"فیصلہ تو ہم یہاں آنے سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ رہا وقت لینے کا سوال تو وہ ہم نے اپنے سوچنے کے لیے نہیں' ابا حضور کے سوچنے کے لیے لیا ہے۔" اس نے سلاد کھاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"ویسے یار تمہیں اپنے گھر میں بات پہلے کرنی چاہیے تھی بعد میں یہاں آتیں۔ بالفرض تمہاری فیملی نہیں مانتی تو۔"

"کیوں نہیں مانیں گے وہ۔" اس نے تڑپ کے بات کاٹی۔

"ہم کیا غلط کام کرنے جا رہے ہیں۔ فلموں میں ناچنے لگے ہیں یا محفلوں میں ٹھمریاں گانے لگیں گے یا کسی بد قماش سے کورٹ میرج کرنے جا رہے ہیں۔"

"ہا۔۔ہاہاہا۔۔۔" مزنی نے طنزیہ قہقہہ لگانے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

"ساری باتیں ایک طرف اور یہ تمہارے تین مفروضات ایک طرف۔ ویسے سوچنے اور سوچ سوچ کر مزا لینے والی بات ہے کہ آنسہ صاحبزادی گل کسی پنجابی فلم میں ستاروں والی سلیولیس میکسی پہن کے فل چنگھاڑتے میک اپ اور بھونڈی سی وگ کے ساتھ بارش میں بھیگتے ہوئے ہیرو کے سوجے ہوئے منہ پہ صدقے واری ہوتے ہوئے' "چیندی اے برسات وے' نہ جائیں آج رات وے۔" پہ ہوشربا رقص پیش کرتے ہوئے کیسی لگیں گی۔"

"اسٹاپ اٹ مزنی۔" اس نے یہ سارا تصور کرتے ہوئے ناگواری سے جھرجھری لی۔

"اور پی ٹی وی کے رات بارہ بجے نشر ہونے والے پروگرام' کسی محفل و حفل میں زمین پہ بیٹھی' بنارسی ساڑھی کا پلو مروڑتے ہوئے' یہ بڑا سا گلوبند پہنے' لمبی لمبی مصنوعی پلکیں لگائے' ہارمونیم کی بے سری ریں ریں ٹیں اور طبلے کی پٹاپٹ ٹکاٹک کے ساتھ۔" آ۔۔ آ۔۔ آموھے بالما۔" کی تان لگاتے ہوئے کیسی لگیں گی۔"

"ولس تو بچ مزنی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی جسے اس نے کمال ہوشیاری سے چھپایا۔

"ارے زبردست سین تو وہ ہوگا جس میں تم بقول اپنے اس بد قماش شخص کے ساتھ کورٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہوگی گولڈن کام والا لہنگا' برائیڈل میک اپ اور۔۔۔"

"اب ہم کچھ مار بیٹھیں گے تمہیں۔" بات اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ مزنی نے بھی بمشکل اپنی زبان قابو کی شاید اسے خود بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ اوور ہو رہی ہے یا پھر واقعی وہ گل مہر کی دھمکی سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سر' آپ کے لیے دو بار سفیان سر کا فون آ چکا ہے۔"

آفس آتے ہی اسے اطلاع ملی۔ وہ سر ہلا کے رہ گیا۔ دو کیا چار بار موبائل پہ بھی سفیان محمود رنگ کر چکا تھا مگر شہزاد نے اس کا نمبر دیکھتے ہی ہر بار موبائل آف کر دیا۔ شاید اسی لیے اس نے آفس فون کیا تھا۔ وہ ابھی ابھی ریکارڈنگ روم سے آ رہا تھا۔ ڈیفنس' کینال ویو اور گارڈن ٹاؤن میں اس نے تین مختلف طرز کے بنگلے اسٹوڈیو کی شکل میں ریکارڈنگ کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔ روایتی اسٹوڈیوز میں عارضی سیٹ لگا کے شوٹنگ کرنے کی بجائے وہ ان بنگلوز میں ڈرامے عکس بند کیا کرتا اس سے قدرتی ماحول زیادہ بہتر طریقے سے ابھرتا۔ سین کی ڈیمانڈ کے مطابق ان بنگلوز کا انٹیریئر چینج ہوتا رہتا تھا۔ جب سے اس کا کام بڑھا تھا وہ ان تین بنگلوز کو بھی ناکافی سمجھنے لگا تھا۔ ویسے ذاتی طور پہ تو وہ آج کل صرف ایک ہی پراجیکٹ میں انٹرسٹ لے رہا تھا اور وہ تھا "شیر دل" لیکن اس کے علاوہ ان گنت تفریحی و معلوماتی پروگرامز تھے جنہیں اس کی کمپنی پروڈیوس کر رہی تھی اس لیے مذکورہ پروگرامز کے ڈائریکٹرز انہی تین مقامات پہ شوٹنگ کرتے تھے۔

رائے ونڈ میں کئی کنال کا پلاٹ اس نے کئی سال پہلے خریدا تھا۔ تب جب اس کے ابتدائی پروگرامز کو کامیابی ملی تھی اور تب یہ زمین اسے تقریباً "کوڑیوں کے بھاؤ" مل گئی تھی۔ شہر کی آبادی سے دور' گہما گہمی اور دیگر سہولیات سے محروم اس علاقے میں یہ بے رونق و بے آباد جگہ اسے جدید طرز کے اسٹوڈیو کے لیے بڑی مناسب لگتی تھی۔ پچھلے سال ہی اس نے اپنے اس دیرینہ خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کام شروع کیا تھا۔ کچے پکے چند مکانوں' ایک دو کھیتوں پہ مشتمل ایک مختصر سا دیہات' قدیم طرز کی ایک حویلی' کنواں' مصنوعی نہر اور آبشار وغیرہ اس منصوبے کا ایک حصہ تھے جن پہ تیزی سے کام جاری تھا۔ یوں وہ دو جانب سے بری طرح مصروف تھا' ایک تو اس ذاتی اسٹوڈیو کی تعمیر کے سلسلے میں اور دوسرا اپنے دو درجنوں پروگرامز کے لیے' جو مختلف پرائیویٹ چینلز پہ چل رہے تھے یا چلنے والے تھے۔ کمپی ٹیشن خاصا بڑھ چکا تھا اور وہ اپنے موجودہ معیار کو اور ساکھ کو برقرار رکھنا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے برسوں محنت کی تھی۔

"سر' آپ کے لیے سفیان صاحب کا فون ہے۔"

انٹرکام پہ ملنے والی اطلاع پہ وہ جھنجلا کے رہ گیا اگرچہ سفیان محمد سے اس کی خاصی دوستی تھی لیکن اس طرح اس سے کترائے پھرنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ پرسوں اس کے آفس سے وہ جس موڈ سے میٹنگ ادھوری چھوڑ کے نکلا تھا۔ یہ طرز عمل بعد میں دیر تک اسے شرمندہ ہونے پہ مجبور کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس وقت بھی سفیان اس سے اس غصے اور ناراضگی کی وجہ جاننے کے لیے ہی بار بار رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شہزاد کے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا اور اگر تھا تو وہ دینا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اس کا فون اٹینڈ کرنے سے اجتناب کر رہا تھا لیکن کب تک۔۔۔ سفیان محمود سے اس کے ذاتی ہی نہیں بلکہ کاروباری مراسم بھی تھے۔ ناچار اس نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا دل ہی دل میں وہ اس کے متوقع سوالوں کے جواب میں کچھ مناسب سی توجیہات بھی گھڑ رہا تھا مگر خلاف توقع سفیان نے میٹنگ میں ہونے والے اس عجیب و غریب' ناقابل فہم مگر نامناسب رویے کا ہلکا سا ذکر تک نہ کیا۔ بلکہ شہزاد سیریز کی اسپیشل افیکٹس اور کمپیوٹرائیڈ ایڈیٹنگ کے لیے ایک کوالی فائیڈ اور سوٹ ایبل امیدوار کو بھیجنے کا تذکرہ کیا۔

"ٹھیک ہے یار' اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میری خواہش تو تھی کہ کوئی تجربہ کار ورکر مل جاتا لیکن اگر تمہاری نظر میں وہ بہتر ہے تو آزمانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" شہزاد نے آمادگی ظاہر کی۔

"ہاں ٹھیک ہے' کل ہی بھیج دو نام کیا ہے؟ کیا۔۔۔ لڑکی؟ یار ایک لڑکی۔۔۔ وہ بھی ناتجربہ کار تم تو جانتے ہو ہمارا کام ذرا سی بھول چوک کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیا؟ تمہیں پورا بھروسہ ہے چلو۔ پھر میں تمہارے بھروسے پہ بھروسہ کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ ہاں ہاں۔۔۔ ظاہر ہے چند گھنٹوں کا کام ہی ہوگا۔ بلکہ روز تو شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ جیسے جیسے سینز شوٹ ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ہی ایڈیٹ ہوں گے اوکے۔۔۔ ہاں ضرور۔۔۔ پرسوں روحیل کی پارٹی میں ملاقات ہوگی۔"

اس نے ریسیور رکھا اور لمبی سانس کھینچ کر سر چیئر کی بیک سے ٹیک کر خود کو ریلیکس کرنے لگا۔ روحیل قاضی کی گیٹ ٹوگیدر کا دعوت نامہ ایک ہفتے سے اس کے پاس رکھا تھا مگر پرسوں کی میٹنگ میں ہونے والے ناخوشگوار واقعے کے بعد سے وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہ پا رہا تھا کہ ان کا سامنا کرتا۔

"کیا سوچیں گے وہ؟ میں اس طرح بغیر کچھ کہے وہاں سے کیوں نکلا؟ ان کی کونسی بات مجھے مشتعل کرنے کا باعث بنی؟ یہ سب سوال تو ان کے ذہنوں میں پیدا ہوئے ہوں گے اور وہ ظاہر ہے کہ مجھے کریدیں گے مجھ سے اصل بات اگلوانے کی کوشش کریں گے خاص طور پہ وہ روحیل قاضی۔ میں کیا کہوں گا ان سب سے۔" یہ سب سوچ کر اس نے پارٹی میں نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی خدشے سے وہ سفیان سے بات کرنے سے بھی کترا رہا تھا لیکن اب سفیان نے جس طرح اس واقعے کا ذکر گول کر دیا' وہ خود بہ خود بڑے اس بوجھ سے رفتہ رفتہ ہلکا ہونے لگا۔

"پوچھ بھی لیا تو۔۔۔ تو کیا میں کچھ بھی کہہ کے انہیں مطمئن نہیں کر سکتا؟ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں اتنے برسوں سے یہی تو کرتا آ رہا ہوں۔ اب تک کامیاب بھی رہا ہوں اور پھر کس کی ہمت ہے جو مجھے کرید سکے "ڈی کی ایس" کے چیئرمین شہزاد ملک کو' اب میں وہ نہیں رہا' وہ۔۔۔ شہزادہ۔۔۔ جسے ہر کوئی بلا جھجک اس کی اوقات یاد دلا جایا کرتا تھا۔ یہ پردے میں نے بڑی محنت سے اور بڑی قیمت ادا کر کے خریدے ہیں' انہیں ہر کوئی ایسے ہی نہیں نوچ سکتا۔"

اور یہ سچ تھا' یہ ایک دو برس کی بات نہیں تھی پچھلے دس سال اپنی زندگی کے دس سنہرے سال اس نے مشقت میں جھونک دیے تھے' نہ پیسے کے لیے' نہ بنگلے کے لیے۔۔۔ نہ کار کے لیے نہ اس پروڈکشن ہاؤس کے لیے بلکہ صرف نام کے لیے اور اپنی حیثیت کے لیے۔ یہ دس سال تو کیا' اس کے بس میں ہوتا تو وہ اسی وقت یہ نام خرید لاتا جب پہلی بار اسے "شہزادے اوئے" کہہ کے پکارا گیا تھا۔

شہزادہ۔ سننے میں کتنا اچھا لگتا ہے' مگر تب' جب کوئی سچ مچ شہزادہ ہو۔ شاہ زادہ۔۔۔ جبکہ اس کے لیے یہ نام ایک مذاق تھا' ایک بھونڈا مذاق اور جس مناسبت سے اسے یہ نام دیا گیا تھا' وہ مناسبت اور وہ حوالہ ایسا نہیں تھا جس پہ وہ فخر محسوس کرتا۔ فخر محسوس کرنے کے لیے تو خیر اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا البتہ منہ چھپانے کے بڑے مواقع تھے۔ کونسا دن تھا جب وہ اسکول سے روتے ہوئے نہیں آتا تھا' ابا ہمیشہ سویا ہوا ملتا' نائٹ ڈیوٹی سے تھکا جو ہوتا تھا' اماں کو کبھی اس کے دکھ سمجھ ہی نہیں آئے تو ان کا مداوا کیا کرتی۔ پھر ایک وقت آیا جب اس نے رونا چھوڑ دیا' وہ سسکیاں سلے لے کر' آنسو پونچھ پونچھ کے تھک گیا تھا' ان سب کا بھلا کیا فائدہ تھا' وہ بات جو اسے گھنٹوں رلاتی رہتی' ابا اور اماں کو جھنجھوڑے بغیر گزر جاتی۔ یہ دکھ اس اکیلے کا دکھ تھا اور اس کا حل بھی اسے اکیلے ہی نے نکالنا تھا۔ اس نے آخری بار آنسو پونچھے' کان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیے' آنکھیں سامنے کی جانب مرکوز کر دیں اور قدم تیز تر وقت نے اسے اس کے حصے کا شعور بہت پہلے دے دیا تھا اور اب یہ وقت ہی اس نوازش کا بھرپور خراج وصول رہا تھا۔

وہ وقت جو بے فکری سے یاروں دوستوں کی محبت میں گزارنے والا ہوتا ہے وہ اس نے پریس کی مشینوں کے ساتھ راتیں جاگتے گزارا۔ پریس کی یہ جاب بھی صرف اس کی انتھک محنت کی بدولت ملی تھی ورنہ نہ تو اس کے

پاس تجربہ تھا نہ ہی اعلیٰ ڈگریاں ابھی تو اس کی تعلیم جاری تھی کہ فارغ وقت میں کیے چھوٹے موٹے کورسز کام میں آئے اور اس نے نائٹ شفٹ کی یہ ملازمت کرلی۔ ابا نے اس کے اس فیصلے کی خاصی مخالفت کی تھی مگر اس نے تو کان بند کر رکھے تھے ناں۔۔۔ نہ صرف باہر والوں کے لیے' بلکہ گھر والوں کے لیے بھی۔۔۔ اوھر اس کے ماس کمیونیکیشنز میں ماسٹرز کرنے کی خبر ملی' ادھر اس کی پروموشن ہو گئی۔ اب وہ پرنٹنگ پریس کی بجائے پریس رپورٹنگ کے شعبے میں چلا گیا' پتہ نہیں یہ اتفاق تھا۔۔۔ یا بہرحال اسے شوبز رپورٹری پوسٹ ملی۔ تعلقات بڑھے' واقفیت پیدا ہوئی ایک نئے کھلے پرائیویٹ چینل کے لیے اس نے تجرباتی طور پہ ایک سیریل لکھا۔ یہ وہ دور تھا جب پرائیویٹ پروڈکشنز خال خال بنا کرتیں اور یہ نیا چینل تو حال ہی میں کھلا تھا اور اس نے کئی نئے ناموں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔ انہی نئے ناموں میں مرتضیٰ حسین بھی تھا جو فارن سے فلم میکنگ کورس کرکے آیا تھا اور یہاں کے لگے بندھے اصولوں پہ کام کرنے کی بجائے کچھ نیا کرنا چاہتا تھا۔ شہزادے اس کی دوستی ہوئی تو اس نے جلد ہی اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور جب اس نے مرتضیٰ کو اس تھرلر کے بنانے کا مین آئیڈیا دیا تو اس نے شہزاد کو ہی یہ ذمہ داری سونپ دی۔

مرتضیٰ کے اکسانے پہ شہزاد یہ سیریز لکھنے پہ آمادہ ہوا۔ خلاف توقع اس سیریز کو خاصا اچھا رسپانس ملا۔ رائٹر کے علاوہ ڈائریکٹر بھی نیا تھا اس لیے نئی ملنے والی ہر آفر کو وہ دونوں قبول کرتے گئے۔ خصوصاً" شہزاد کے لیے تو ان دنوں معیار سے اہم مقدار تھی اب یہ اس کی خوش قسمتی کہ اس کے ہاتھ آئے درجن بھر پروجیکٹس ہی سے چار پانچ سپر ہٹ ہو گئے۔ یہ درجن بھر سیریلز دو ڈھائی سالوں کے دوران چلے اور ان کے ذریعے شہزاد نے خاصا نام کما لیا اب وقت تھا پیسہ کمانے کا وہ ڈائریکشن کے میدان میں کود پڑا' اس سے سیریل لکھوانے کی آفر لے کر آنے والے ہر پروڈیوسر کے سامنے وہ یہ آفر رکھ دیتا کہ اگر ڈائریکشن اسے سونپ دی جائے تو وہ بحیثیت ایک رائٹر کے اپنا معاوضہ نصف کرنے پہ تیار ہے۔ تب تک وہ اپنی اتنی مضبوط ساکھ تو بنا ہی چکا تھا کہ ہر پروڈیوسر اسے بطور رائٹر منہ مانگے معاوضے پہ لینے کو تیار تھا۔ ایک آدھ نے رسک لیتے ہوئے اسے ڈائریکشن کے فرائض بھی سونپ دینے کا ارادہ کر لیا۔ شہزاد نے پچھلے تین سالوں میں اندھا دھند لکھنے کے ساتھ ساتھ سیٹ پہ ہونے والی ساری کارروائیوں پہ بھی گہری نظر رکھی تھی۔ بنیادی طور پہ وہ ذہین ہی نہیں' خطرناک حد تک ذہین بندہ تھا۔ اس کے زیرِ ہدایت بننے والا لانگ پلے ہر اعتبار سے معیاری تھا۔ اتنی مضبوط ہدایت کاری کہ کوئی ماننے پہ تیار ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ کسی نئے ہدایت کار کا کارنامہ ہے۔ اس لانگ پلے کے بعد اس دوسرے پروڈیوسر کا بھی حوصلہ بڑھا جو شہزاد کو اپنے تیرہ اقساط والے سیریل کے لیے بطور مصنف اور ہدایت کار لے تو چکا تھا۔ مگر چند خیر خواہوں کی وجہ سے بار بار ڈانواڈول ہو جاتا تھا' اس کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی آفرز آئیں۔ اب شہزاد کے پاس اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ لکھنے اور ہدایت کاری کے دونوں شعبوں کو بھرپور اور مساوی وقت دے پاتا۔

دوسری طرف پانچ سال پہلے پرائیویٹ پروڈکشنز کی جو وبا پھیلی تھی اب اس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پی ٹی وی کے علاوہ دو تین نئے پرائیویٹ چینلز کھل چکے تھے۔ اس لیے پروگرامز کی بھی بھرمار تھی۔ سالوں سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے فارغ فنکاروں کے پاس بھی کام کی کمی نہیں رہی تھی اور شہزاد تو اس وقت اپنے عروج پر تھا۔ اپنی کم عمری کے باوجود اس نے بڑے بڑوں کی شہرت کو دھندلا کے رکھ دیا تھا۔ وقت کی کمی کا مسئلہ ایک طرف مگر آئے دن آنے والی پرکشش آفرز ایک طرف۔۔۔ آخر اس نے اسسٹنٹ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کہانی کا مین آئیڈیا اس کا ہوتا مگر اسکرین پلے اور ڈائیلاگز رائٹنگ کے لیے اس نے ایک علیحدہ چینل بنا دیا' ان ابھرتے ہوئے رائٹرز کا جو چانس کی تلاش میں تھے' اسکرپٹ کی نوک پلک شہزاد خود سنوارتا' ہر بار کی پہ نظر رکھتا یوں ڈرامے کے کریڈٹ پہ ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ کہانی' اسکرین پلے اور ڈائیلاگ کے آگے بھی اسی کا نام چمک رہا ہوتا اور وہ رائٹرز جو اس کے لیے کام کرتے تھے' چند ہزار لے کر منہ بند کر لیتے' ان کی ضرورت پیسہ تھا' نام نہیں جبکہ شہزاد کو پیسے سے زیادہ نام کی ہوس تھی۔

یہی وجہ تھی کہ دس سالوں میں اس نے جتنا کمایا' اتنا ہی لگایا۔۔۔ ڈائریکشن سے جو کمایا' وہ پروڈکشن میں لگا دیا۔ یہ پروڈکشن ہاؤس اس نے دو سال پہلے ہی قائم کیا تھا مگر اتنے ہیوی بجٹ کے ساتھ کہ دو ہی سالوں میں یہ کمپنی ملک کی سب سے بڑی کمپنی بن چکی تھی۔ اور اب اس کا اگلا قدم اپنا ذاتی چینل شروع کرنے کا تھا کہ سینئر رائٹرز حق نواز صاحب "شیرِ دل" کا آئیڈیا لے کر آ گئے۔ ذاتی طور پہ اسے یہ آئیڈیا اتنا پسند آیا کہ وہ اس میں بھرپور دلچسپی لے رہا تھا۔ اس سیریز کو فائنلائز کرنے کے ساتھ ہی اس نے ایک اور بات فائنل کر دی اور وہ یہ کہ یہ ہیوی بجٹ سیریز جو جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کے ساتھ پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد پروگرام ہو گا' کسی دوسرے چینل کے بجائے "لکی الیس" کے اپنے چینل سے کاسٹ ہو گا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے اپنے دونوں کاموں کی رفتار اور تیز کر دی' پروگرام کا ٹیبل ورک مکمل کرنے کا کام اور چینل قائم کرنے کا کام۔

اپنی اس تیز رفتاری میں وہ کسی قسم کا رخنہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔۔۔ اس کے سرپٹ بھاگتے قدموں کو جیسے کوئی اڑنگا دے کر نیچے گرا دیتا تھا وہ منہ کے بل جا گرتا اور گرد و دھول سے اٹے چہرے کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتا۔ کوئی تالیاں پیٹ کے نعرہ بلند کرتا۔

"او شہزادے اوئے۔۔۔ کدھر ہے تیری سریلی بیگم۔"

"اوئے رونقی شہزادے' ذرا رونق تو لگا۔"

"یہ کیا لگائے گا' رونق میلہ' اصل رونق تو گھر پہ ہے۔"

نعرے تمسخر سے ڈوب کے اور زہریلے ہوتے جاتے۔ تالیاں بج بج کر گونجتی جاتیں وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کے پھر سے بھاگنا شروع کر دیتا۔ ہر بار گرنے کے بعد اس کی رفتار اور تیز ہو جاتی۔ اس بار بھی یہی ہوا وہ پراجیکٹ جو تقریباً" ایک سال کا دورانیہ لینے والا تھا' مہینوں میں نمٹنے لگا۔

"مجھے اب بھاگنا نہیں' اڑنا ہے۔ بھاگتے ہوئے پھر بھی اٹکنے کا ڈر رہتا ہے مگر۔۔۔ ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار مجھے پر لگ جائیں تو۔۔۔ کبھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھوں گا' کچھ نہیں سنوں گا۔"

✡ ✡ ✡

"خیر تو ہے یہ آج۔ چن کہاں سے چڑھ آیا ہے؟" بلقیس بیگم نے اللہ وسایا کو اندر آتے دیکھا تو حیرت اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ایک بھرپور طنزیہ فقرہ اچھالا۔ وہ کرم الٰہی کے لیے پیچ چھیل رہی تھی لیکن اپنے نندوئی کو اندر آتے دیکھ کر اس نے فروٹ باسکٹ نامحسوس طریقے سے اوٹ میں کر دی۔ کرم الٰہی بھی چونک کے اسے دیکھنے لگا جو چہرے پہ اپنی مخصوص عیارانہ' چاپلوسانہ مسکراہٹ سمائے اس کے سامنے بیٹھ رہا تھا۔

"جیو میری بھرجائی' یعنی تیرے دم سے اب بھی دنیا میں کوئی باقی بچا ہے' مجھے "چن" کہنے والا۔"

"نہ بھرا' تو وہ والا چن نہیں جو نکلتا ہے تو تو وہ والا چن ہے جو چاڑھا جاتا ہے۔" اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر کہا۔ اس کاٹ دار محاورے کے استعمال پہ اللہ وسایا کا سیاہ چہرہ پل بھر کے لیے نیلا پڑا پھر اس نے ہنس کر ٹالنے کی کوشش کی۔

"بڑی اچھی عادت ہے بھرجائی کی۔ ہنسی مخول کرتی رہتی ہے۔"

"ہنسی مخول تو تو نے بنایا ہوا ہے بھرا اللہ وسایا۔" بلقیس کو اس پہ بڑی پرانی خار تھی' دستیاب وہ آج ہوا تھا اس لیے اس نے بھی تکلفات میں پڑے بغیر حساب صاف کرنا چاہا کرم الٰہی کے اشاروں کو وہ کسی خاطر میں نہ لائی۔

"مطلب نہ ہو تو سال سال شکل نہیں دکھاتے جب ضرورت پڑے تو کرما' کرما اور بھرجائی بھرجائی کرتے"

"ہاں تو وقت پہ اپنے ہی یاد آتے ہیں اور یہ سال سال شکل نہ دکھانے کی اچھی بات ہے' ابھی عید سے دو چار دن پہلے تو میں آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے روزہ میں نے کرمے کے ساتھ ہی کھولا تھا۔"

"تو میرے بھرا' عید کو گزرے بھی چھ سات مہینے ہو گئے ہیں۔ تو شہزادے سے پیسے لے کر گیا تھا ناں کہ دکان کھولی ہے' مال ڈلوانا ہے اور جب کرمے نے دوکان کا پتہ پوچھا تھا تو نے پکی کی تھی کہ عید کے اگلے دن دکان کی

بوہنی "افتتاح" تو اسی کے ہاتھ کرائے گا اور اسے خود آکر ساتھ لے جائے گا۔ کرما سویرے سے تیار بیٹھ گیا کہ اللہ وسایا آنے والا ہو گا۔ پتہ نہیں یہ بار بار تیرے جھانسے میں کیسے آجاتا ہے مجھے تو تب بھی پکا یقین تھا کہ دکان وکان تو نے خاک ڈالنی ہے' چار دن میں اڑا دیا ہو گا سب کچھ شہزادے کو بھی منع کیا تھا کہ کیوں محنت کی کمائی بے دردی پہ لٹاتے ہو مگر اپنے باپ کے کہنے کی لاج رکھتے ہوئے اس نے تجھے رقم دے دی۔ وہ دن اور آج کا دن' تیری شکل نہیں دیکھی ہم نے نہ ہی کوئی خیر خبر آئی۔"

"بھرجائی' اپنا غصہ تو نکال لیا' میری ناراضگی کا بھی حق بنتا ہے' میرا گلہ بھی سن لو۔" اس نے چہرے پہ مسکینی اور لاچاری بھری جسے دیکھ کے بلقیس نے حقارت سے ہنکارا بھرتے ہوئے زور کا سر جھٹکا جیسے کہہ رہی ہو کہ "جو مرضی ڈرامے کر لو' سب جانتی ہوں۔" اللہ وسایا نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور رخ کرم الٰہی کی طرف موڑ کے اسے اپنی کتھا سنانے لگا۔

"میں اگر چھ سات مہینے نظر نہیں آیا نہ ہی کوئی خیر خبر دی تو بھائی میرے' میں کوئی راہ چلتا اٹھائی گیرا تو نہیں تھا کہ نامعلوم ہو گیا میرا گھر بار' میرا ٹھکانہ کیا کچھ بھی تم لوگوں کو نہیں پتہ' یا تم لوگ پتہ نہیں کروا سکتے تھے کہ اللہ وسایا غریب پہ کیا آفت آن پڑی جو اپنے بھرا اور بھرجائی سے ملنے بھی نہیں آسکا۔"

"خیر تو ہے وسایا' کاکی تو ٹھیک تھی ناں؟ تو تو ہٹا کٹا نظر آ رہا ہے کیا ہو گیا تھا؟" کرم الٰہی نے بغور اس کا معائنہ کیا۔

"ہونا کیا تھا بھرا' بس غریب پہ مصیبت آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی ساتھ دو چار عذاب اور لے آتی ہے۔ شہزادے کے منتیں ترلے کر کے رقم لے تو گیا کہ دکان میں مال ڈلوا لوں گا۔ پکا ارادہ تھا کہ عید کے دوجے دن "بوہنی" بھی کراؤں گا اپنے بھرا کے برکت والے ہاتھوں سے آخر دنیا میں اب میرا ہے ہی کون تمہارے سوا۔ لیکن پتہ نہیں رجے پہلوان کو کیسے خبر ہو گئی کہ میرے کھیسے (جیب) میں مال ہے۔ وہ تو رات کو ہی پہنچ گیا بدمعاش لے کر تجھے تو پتہ ہے میری طرف اس کا پرانا حساب نکلتا ہے۔ اچھا بھلا اس سے معاملہ طے ہوا تھا کہ نیا کام شروع کرنے والا ہوں' روز کی کمائی سے آدھا تیرے ڈیرے پہنچا دیا کروں گا' سال دو سال میں سارا حساب صاف ہو جائے گا۔ میری روزی روٹی بھی چلتی رہے گی مگر یہ بدمعاش طبقہ کسی سے رعایت کر جائے تو ان کی بدمعاشی کیسے زور چڑھے۔ زبردستی چھین کے لے گئے ساری رقم۔ میں نے ہاتھ پیر مارے تو دو جنے مجھے خوب پھینٹی لگا گئے۔ وہ تو شکر ہے میری کاکی اس رات گھر نہیں تھی۔"

"کدھر گئی تھی دعا؟" بلقیس نے ساری رام کہانی نظر انداز کرتے ہوئے دعا کے بارے میں استفسار کیا۔

"پورا ہفتہ میں سینکائی کرتا رہا' اتنی مار لگا کے گئے وہ سانڈ بوڑھی ہڈیوں میں اب کہاں وہ جان رہی ہے۔" اس نے بلقیس کا سوال ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالا اور وہ بدستور کرم الٰہی کو اپنی مظلومیت سے متاثر کرنے کی سر توڑ کوشش جاری رکھی جو زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔

"تیری ہڈیاں بوڑھی ہیں وسایا تو میں کونسا ڈنڈ بیلتا ہوں یا اکھاڑے اترتا ہوں۔ اچھا بھلا پتہ ہے تجھے کہ سالوں سے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں بڑی ہمت کی تو ڈاکٹر کے پاس چلا گیا' تیرا حال چال پچھنے کیسے آتا مجھ سے تو یہ گلہ فضول ہے۔ میں تو خود بیمار آدمی ہوں رہی تیری بھرجائی تو وہ بیچاری میری وجہ سے گھر سے بندھی ہے نہ کہیں آتی ہے نہ جاتی ہے ورنہ تو تو جانتا ہے بالو گھر پہ مشکل سے ٹکتی تھی' سارا ٹبر برادری اس اکیلی نے اپنی ملنساری سے سنبھالا ہوا تھا۔ میں تو کام دھندے میں مصروف رہتا تھا اب وہی حال میرے شہزادے کا ہے بیچارے کو نہ دن کی خبر ہے نہ رات کی۔"

"ہاں بھرا' ایک تو بیچارہ' ایک تیری گھر والی بیچاری' ایک تیرا پتر بیچارہ۔" اللہ وسایا کو ساری اداکاری اکارت جاتے دیکھ کے تپ چڑھ گئی۔

"دو دو گڈیاں (کار) باہر کھڑی ہیں کونسا میری طرح ٹانگوں' ویگنوں پہ انجر پنجر ہلا کے آنا پڑتا ہے' فون لگا ہوا ہے' چھ نمبر گھماؤ اور جس کی مرضی خیریت پوچھ لو۔ میں نے اپنے دو دو گوانڈیوں (ہمسایوں) کے نمبر تجھے دیے ہوئے ہیں

سیدھی بات کرو کہ غریب رشتے داروں کو منہ ہی نہیں لگانا چاہتے۔"

"دیکھ بھرا' زیادہ اوکھا بولنے کی ضرورت نہیں۔ تو نے جو گلہ کرنا تھا' کر لیا' اور ہم نے بھی سن لیا۔ اب مطلب کی بات کر۔" بلقیس کرمے کو اللہ وسایا کے آگے بے بس پڑتا دیکھ کے پھر میدان میں اتری۔

"واہ بھرجائی واہ' اب ہماری محبت کو مطلب کا نام دیا جا رہا ہے۔ میں تو بس اپنے بھرا اور بھرجائی کی خیر خبر لینے آیا تھا۔ اتنے دن جو ہو گئے تھے دیکھے ہوئے۔"

"ہاں ہاں اچھا کیا' جا۔ بالو جا کر کوئی کھانے پینے کا انتظام کر۔"

"ہانڈی پکی پڑی ہے اور کیا انتظام کروں؟ ابھی پونا ایک بجا ہے۔ ڈیڑھ دو بجے روٹیاں پکوانے کا کہوں گی۔" وہ اٹھنے پہ آمادہ نہیں تھی کہ کہیں اللہ وسایا پھر سے کرمے کو باتوں میں پھنسا کر کچھ ہتھیا نہ لے۔

"خیر سے کیا پکایا ہے میری بھرجائی نے۔" اللہ وسایا ایک تو دیر سے اٹھا تھا' دوسرے یہاں آنے کے خیال سے اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ روٹی کے وقت وہاں جائے گا تو وہ کھلائے بغیر تو نہیں بھیجیں گے۔

"کرمے کے لیے پھیکے۔ بغیر تیل کے کھانے پکاتی ہوں۔ آج ٹینڈے پکائے ہیں بغیر مرچ اور تیل کے' نمک بھی ذرا سا ڈالا ہے۔ میرے لیے رات کے مٹر والے چاول پڑے ہیں' دہی ڈال کے کھا لوں گی' آج سویرے سے پیٹ کچھ بھاری بھاری ہے' شہزادہ تو دوپہر کی روٹی گھر پہ کھاتا ہی نہیں۔" اس نے جان بوجھ کے جتایا۔ حسب توقع اللہ وسایا کا چہرہ اتر گیا اور وہ جلد مطلب کی بات پہ آگیا۔

"ہائے ہائے' زمانہ بڑا ظالم ہے۔ کیا جوانی تھی میرے بھرا کی پورا بکرا اکیلا ڈکار جاتا تھا۔ چھ چھ پراٹھے' دو دو کلو دہی اور اب یہ وقت آگیا ہے کہ ابھی سبزیاں کھانی پڑ رہی ہیں ہائے ہائے۔" اس نے مزید رقت پیدا کی۔

"ایک تو ہے بھرا کرمے' رزق اللہ نے دل کھول کے دیا ہے مگر کھا نہیں سکتا ایک میں ہوں' چپڑی کھانے کو ترس گیا ہوں مگر۔ خیر یہ تو اللہ کی مرضی ہے' اس کے رنگ نرالے۔" آہوں' سسکیوں بھرے اس ڈائیلاگ کا کرم الٰہی پہ خاطر خواہ اثر ہوا اس نے فوراً بلقیس سے کہا۔

"رات کو مٹروں والے چاول کے ساتھ قورمہ اور آلو قیمہ بھی تو بنا تھا' ختم ہو گیا؟"

"ہاں تو کیا پڑا ہوا ہے؟" وہ چمک کے بولی۔ "یہ جو جتھے کا جتھا نوکروں کا ہے ان کے پیٹ بھی تو ساتھ لگے ہوئے ہیں' گھر تو نہیں رکھ کے آتے۔"

"تو جا کسی نوکرانی کو کہہ کے چھیتی (جلدی) سے مرغی پکوا دے۔"

"نہ بھرا رہن دے۔ کیوں بھرجائی کو تکلیف دیتا ہے۔" اس نے تکلفاً منع کیا۔

"زیادہ ہی ہے تو پھر ادھر سامنے کی دکانوں سے پکا پکایا کچھ منگا لے۔" اس پیشکش پہ بلقیس نے جی بھر کے اسے گھورا مگر بولی کچھ نہیں کرم الٰہی نے فوراً ملازمہ کو تین سو روپے دے کر روغنی نان' چرغہ اور نہاری منگوائی۔ اللہ وسایا کے چہرے کی رنگت بحال ہو گئی اور لہجے میں مزید ترنگ آگئی۔

"بڑا سواد آئے گا آج دنوں کے بعد اپنے بھرا اپنے یار کے ساتھ روٹی کھانے میں۔"

"ہوں کہہ کہ مفت کا چرغہ کھانے میں۔" بلقیس دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

"پرسوں اپنے شہزادے کو میں یہی بتا رہا تھا کہ کیسے ہم دونوں جوانی میں دیگ کی دیگ صاف کر جایا کرتے تھے۔ کیا خوراکیں تھیں ہماری۔"

"شہزادہ تجھے کہاں ملا؟" بلقیس چونکی۔

"ملنا کہاں ہے۔ میں ہی گیا تھا اس کے دفتر دراصل کچھ دنوں سے تم سب کی یاد اتنی آ رہی تھی کہ جائے بغیر رہا نہیں گیا۔ پرسوں اپنے چن شہزادے سے مل کے آیا' آج ادھر آگیا۔"

"وہاں جانے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا وسایے۔" پہلی بار کرم الٰہی کے لہجے میں بھی سختی آئی۔

"وہ تو پہلے ہی گرمی کھائے بیٹھا تھا تو نے اپنی کاکی کو جس کام لگا دیا ہے' مت پوچھ شہزادے کو کتنا برا لگا۔"

"اور تو اور اب تو دعا کو راتیں بھی باہر بھیجنے لگا ہے۔ یہی بتایا تھا ناں ابھی؟" بلقیس نے بھی لعن طعن کی۔

"راتیں؟ توبہ توبہ... وہ اپنی سہیلی کی مہندی پہ گئی تھی اس رات مجھے تو اتنے بندے کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کے فنکشن پہ بھیجو' نئے سال کی پارٹی پہ پروگرام ہے' بچے کے عقیقے یا ولیمے کی دعوت ہے' ہزاروں ملتے ہیں' امیروں کے گھر ایسے فنکشن پہ دو چار گانے گا کر لیکن میں ادا کو ایسے کاموں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ خدا نے اسے بڑا سریلا گلا دیا ہے' سروں کی پہچان بھی دی ہے وہ تو دوسری لتا ہے۔ بھرجائی' میں اسے بہت آگے پہنچانا چاہتا ہوں۔ بہت ترقی کرے گی وہ' بس ایک بار چانس مل جائے' کوئی ہاتھ پکڑ لے تو اس رستے پہ آگے بڑھنا آسان ہو جائے گا میری بچی کے لیے۔ اسی لیے میں شہزادے پتر سے بات کرنے گیا تھا۔ اس کی بڑی پہنچ ہے۔ بڑے سے بڑا پروڈیوسر' ڈائریکٹر اس کی بات مانتا ہے اور ٹی وی تو سمجھو اس کا اپنا ہے' گھر کی بات ہے۔ کیا حرج ہے اگر وہ اپنے کسی پروگرام میں ادا کو چانس دے دے مگر ہاں جی۔ اس نے تو چٹا انکار کر دیا' الٹا مجھے' اپنے پھوپھڑ کو اپنے چاچے کو سو باتیں سنائیں۔ یہ تو بھرا کرے تیرا لحاظ تھا جو میں چپ کر گیا ورنہ تو خود سوچ میرا اس کا دوہرا رشتہ ہے اس کی پھوپھی کا گھر والا ہوں' اس کے پیو کا چچیرا بھی ہوں' کیا اسے میری بے عزتی کرنی چاہیے تھی؟"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تجھے مجھ سے پوچھ کے جانا چاہیے تھا۔ وہ پاگل نہیں' جو بغیر وجہ کے لوگوں کی بے عزتی کرتا پھرے۔ ہاں اسے غصہ ذرا جلدی آجاتا ہے اور یہ تو بات بھی غصے والی تھی' وہ دعا پتر کے گانا گانے اور ٹی وی پہ آنے کو بالکل پسند نہیں کرتا اور یہ بات وہ کئی بار تجھے صاف لفظوں میں بتا چکا ہے پھر بھی تو اسے اس طرف دھکا دینے سے باز نہیں آیا۔ عید کے تیسرے دن کے پروگرام میں اس نے خود اسے ٹی وی پہ گانا گاتے دیکھا وہ تو شکر ہے اس کے چھ مہینے تک تو ادھر نہیں پھٹکا ورنہ اس کا غصہ اس سے بھی زیادہ ہوتا۔"

"اور تو چلا تھا اس کی مدد مانگنے کہ وہ خود دعا کو آگے آگے کرے' کہ یہ میری پھوپھی کی لڑکی ہے' میری بہن لگتی ہے' میرے خاندان کی عزت ہے اس کو گانا گانے کا موقع دو۔ اپنی فلم میں اس کا ایک ڈانس رکھوا دو۔ واہ جی۔ ایک تو اس کا اچھا بھلا نام بدل کے ادا رکھ دیا اب اس کی اچھی بھلی سیدھی سادی زندگی بدلنے چلا ہے۔"

"اپنی اولاد کی زندگی پہ سب کا حق ہوتا ہے اور پھر میں اس کی زندگی بدل رہا ہوں' اجاڑ تو نہیں رہا۔ اس میں ہنر ہے' وہ کیوں نہ اس کا فیدہ اٹھائے۔"

"او جھلیا' تو سمجھتا کیوں نہیں۔ دعا بھولی بھالی سی بچی ہے کیوں اسے اس گند میں گھسیٹنا چاہتا ہے۔ کچھ تو اپنی اور خاندان کی عزت کا خیال کر۔"

"خاندان؟... عزت؟" کرم الٰہی کی بات پہ اللہ وسایا نے آنکھیں پھاڑ کے دہرایا۔

"یہ گانے بجانے یا ٹی وی فلم پہ کام کرنے سے ہمارے خاندان کی عزت پہ کب سے فرق پڑنے لگا؟ اور یہ جس جگہ کو تو گند کہہ رہا ہے۔ اسی جگہ سے تو نے پیسہ کمایا' نام بنایا اس کا مطلب ہے تو نے گند سے روٹی اٹھا اٹھا کے اولاد کو کھلائی ہے۔"

"بکواس نہ کر وسائے۔" کرمے زور سے دہاڑا مگر یہ دہاڑ اسے بڑی بھاری پڑی' اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ بلقیس اس کی کمر سہلاتے ہوئے وسایا کو ملامتی نظروں سے گھورنے لگی۔

"معاف کرنا بھرا۔ چھوٹا ہوں چھوٹے منہ سے بڑی بات کہہ دی مگر تو خود سوچ' جس کام سے اپنی روزی روٹی وابستہ ہو اس کو برا کہنا درست تو نہیں۔ آخر تیرا شہزادہ پتر بھی تو اسی جگہ سے مال کما رہا ہے۔ گانے نہیں گاتا' ٹھمکے نہیں لگاتا' طبلہ نہیں بجاتا۔ مگر لوگوں سے تو لگواتا ہے اوروں کو تو نچاتا ہے' بات تو ایک ہی ہے۔"

"بات ایک نہیں ہے وسائے۔ وہ مرد ہے تیری دھی ہے تجھے اس کا خیال کرنا چاہیے۔ مردوں کا کیا ہے' دھی نمانیوں کی عزت بڑی نازک ہوتی ہے' وہ گھر کے اندر ہی جچتی ہیں۔"

"بھرا' یہ بات تو آج کہہ رہا ہے کیونکہ آج تیرے پاس کوٹھی گڈی' پیسہ' کماؤ پوت' نوکر چاکر سب کچھ ہے۔ تیری سات لڑکیاں بھی ہوتیں تو تو انہیں گھر بٹھا سکتا تھا لیکن وہ وقت بھول گیا جب بھرجائی تیرے ساتھ کام کرتی

تھی۔ آج بھرجائی مجھے لعنتیں دے رہی ہے کہ میں نے دعا کا نام بدل دیا' اسے خود آگے کر رہا ہوں گانا گوانے کے لیے۔ وہ بھی تو وقت تھا جب بھرجائی خود سریلی بیگم کے نام سے گاتی تھی۔"

"بھرا اللہ وسایا' کرمے نے اپنے خاندان کی بات کی ہے اور میں جب فلموں میں کورس میں کھڑے ہو کے گاتی تھی تب اس کے خاندان میں نہیں تھی۔ شادی کے بعد تھوڑے دن تک ہی میں نے یہ کام کیا پھر چھوڑ دیا۔ اب میرا بھی وہی خاندان ہے جو کرمے کا اور تیرا ہے اور اس خاندان میں زنانیاں (عورتیں) کبھی اس دھندے سے نہیں لگیں اور میں بھی صرف کورس میں گانا گاتی تھی' فلموں میں شکل تو نظر نہیں آتی تھی اور تو بات کر رہا ہے دعا کو ٹی وی بھیجنے کی اور میں نے پتہ لگایا ہے تو اسے شادیوں بیاہوں پہ بھی گروپ کی ساتھ بھیجنے لگا ہے بھلے تو انکار کرے مگر مجھے سب خبر ہے۔" بلقیس نے اس کا طنز ٹھنڈے مزاج کے ساتھ پیا اور بڑے ٹھوس لہجے میں وضاحت کی۔ وہ من من کرتا کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ وہ پھر سے بول پڑی۔

"ماں کے بعد تو اب بیٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گیا ہے۔ اسی لیے تو وہ بدنصیب' کرموں جلی لڑکی پیدا کرتے ہی دکھ سے مر گئی۔ مجھے گانے کا طعنہ دینے سے پہلے اتنا تو سوچا ہوتا کہ میں میلوں' ٹھیلوں میں مجرے نہیں کرتی تھی' اور تو بیٹی کو اسی طرف لگانا چاہتا ہے۔"

"بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔" کرم الٰہی نے تائید کی۔ "آج کل کا وہ ماحول نہیں رہا فلموں کا۔ خیر عورتوں کے لیے تو کبھی بھی ٹھیک نہیں رہا۔ یہ بات تیرے اور میرے سوا کون بہتر جانتا ہے۔" اس نے بیوی سے نظریں چرائیں۔

"ٹھیک ہے یہ ہمارا اجدی پشتی کام ہے۔ مگر اسے اپنے تک ہی رکھو' لڑکی کو اس طرف مت لا۔ ہم لوگوں کی بھی کوئی عزت ہے۔ فنکار ہیں' گنی لوگ ہیں' بازاری تو نہیں اگر ہماری عورتیں بھی ناچنے گانے لگ گئیں تو پھر ہم میں اور کوٹھے والوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

"بھرا' تو بیٹے کا باپ ہے اس لیے چھاتی ٹھونک کر عزت اور خاندان کا نام لے سکتا ہے۔ میرا سوچ' میرے بڑھاپے کا ایک سہارا ہے' یہ آخری دنوں کی اولاد' تین بیٹے ہوئے' کوئی دو دن' کوئی چار دن جیا' آج زندہ ہوتے تو تیرے شہزادے' جتنے ہوتے تو پھر مجھے کیا ضرورت تھی لڑکی کو کمانے بھیجنے کی' لیکن یہ آخری اولاد ہی زندہ بچی اور وہ بھی لڑکی ذات' اب کیا عزت کی خاطر فاقے مروں؟ اور چلو فاقے کی چھوڑو' سب سے بڑی بات جو تو نے ابھی کہی کہ یہ ہمارا اجدی پشتی پیشہ ہے۔ یہ فن ہی نہیں ہمارا ورثہ ہے ایسے ہی تو ہم "میراثی" نہیں کہلاتے۔ ہم میراث سنبھال کے جینے والی قوم سے ہیں۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے' سونے کا تاج کیوں نہ سر پہ آجائے' ہیروں کا ہار کیوں نہ گلے ڈل جائے' انگلیاں پارس کیوں نہ بن جائیں' یہ پیشہ' یہ ورثہ تو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ شہزادے نے کسی طرح بھی سہی' تیرا نام تو آگے کیا۔ چاہے کرسی پہ بیٹھ کے ہی سہی مگر ترقی تو اسی ورثے کو دے رہا ہے جو اسے باپ دادا سے ملا۔ میرا کیا بنے گا؟ میں اپنے ورثے کو کیسے مٹی میں رلتا دیکھوں۔"

"لیکن وسائے۔"

"نہیں بھرا' پہلے میری بات پوری سن۔ دیکھ تجھے کسی نے غلط اطلاع دی ہے کہ میں ادا کو شادی بیاہ پہ گروپ کے ساتھ گانے بھیجتا ہوں۔ میرا یقین نہیں تو جا کے اس سے خود پوچھ لے۔ کیوں بھرجائی' وہ تجھے ماں نہیں ماں سمجھتی ہے ناں تجھ سے جھوٹ تو نہیں بولے گی۔ ہاں میں اسے ایک دو بار ٹی وی اسٹیشن لے کر ضرور گیا ہوں حالانکہ شہزادے کے ہوتے مجھے کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں' وہ چاہے تو گھر بیٹھے ادا کو کام ملے لیکن۔ خیر کام تو بڑی منتوں کے بعد ایک ملا' وہی پروگرام جو تم نے کہا کہ شادی اور دوسرے فنکشنوں پہ یا اسٹیج پہ ہونے والی موسیقی کی شاموں میں کام دلوا دیتا ہوں' تھوڑا نام کما لے گی تو پھر ٹی وی تک بھی پہنچ جائے گی لیکن میں نے ابھی تک ہامی نہیں بھری۔ میری بچی فنکار ضرور ہے' پیدائشی فنکار... مگر بڑی بھولی بھالی... دنیا کی چالاکیاں نہیں سمجھتی اس لیے میں چاہتا تھا سیدھے طریقے سے ٹی وی تک پہنچے میں اسے ڈانسر یا طوائف کی بجائے صرف گلوکارہ

دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم شہزادے سے کہہ کے اسے اس ڈرامے میں چانس دلا دو تو.... میں نے سنا ہے کہ اس میں ایک گلوکارہ کا بڑا اچھا کردار ہے اور سو قسطوں تک یہ کردار رہے گا۔ اگر یہ چانس اسے مل گیا تو پھر کیا ضرورت ہے مجھے کسی ایرے غیرے کی منت کرنے کی۔"

"اچھا اچھا میں موقع دیکھ کے بات کروں گا اس سے۔" وہ جانتا تھا اللہ وسایا ایسے ٹلنے والا نہیں اس لیے کچا پکا سا وعدہ کرلیا۔

"لیکن کرے، تجھے پتہ تو ہے کہ اسے دعا کا...." بلقیس نے مناسب نہ جانا کہ اللہ وسایا جیسے ڈھیٹ اور لیچڑ بندے کو لارے میں رکھا جائے۔

"بھرا، کیسا باپ ہے تو کہ بیٹے سے ایک بات نہیں منوا سکتا۔ اس کے لیے کیا مشکل۔ کونسا کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔ اس کا اپنا ڈرامہ ہے، سارے فیصلے وہی کرتا ہے۔ اگر اپنے ہی اپنوں کا خیال نہیں رکھیں گے تو پھر تو مجبوراً "غیروں کے آگے ہی ہاتھ پھیلانا پڑے گا اور غیر تو پھر ایسے ہی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور الٹے سیدھے مشورے دیتے ہیں اچھا یہی ہے کہ تو شہزادے کو منالے ورنہ کسی غیر کے الٹے سیدھے مشورے پہ عمل کر بیٹھا تو شکایت نہ کرنا۔"

"یوں کہہ کہ تو نے پکا ارادہ کرلیا ہے بیٹی کو محفلوں میں بھیجنے کا الزام ہمارے سر رکھنا چاہتا ہے۔" بلقیس اس کی دھونس پہ کھول اٹھی۔

"بھرجائی، کسی طرح تو جینے دو یا میری مدد کردو یا مجھے خود کچھ کرنے دو۔ اگر ادا کو اپنے بیٹے کے ذریعے آگے بڑھانے سے انکار کر رہی ہو تو پھر بعد میں میری کسی حرکت پہ اعتراض نہ کرنا.... واہ جی واہ۔ پابندیاں لگانے، اعتراض کرنے اور برا ماننے میں سارے اپنے بن جاتے ہیں، جب مدد کا وقت آئے تو۔ تو کون میں کون۔"

"میں نے کہہ دیا کہ میں بات کروں گا۔ پھر کیوں بحث کیے جا رہا ہے یا لوسے۔" اب کے کرم الٰہی ذرا سنجیدگی سے وعدہ کرنے پہ مجبور تھا۔

"مگر تب تک تم دعا کو کہیں مت بھیجنا۔"

"تو یہ کروجی میں کیوں بھیجوں۔" وہ ٹرے میں کھانا آتے دیکھ کے فوراً "فرمانبردار بن گیا۔

"آپ اس کے بڑے ہو" آپ فیصلہ کردو گے۔" کھاپی کے، لمبے چوڑے وعدے لے کر وہ چلتا بنا تو بلقیس نے کرم الٰہی سے گلہ کیا۔

"یہ اچھا نہیں کیا، خواہ مخواہ اس منحوس کو لارا دے دیا۔ اب اس بہانے ہر روز آن مرے گا اور اپنے پتر کا تو تجھے پتہ ہے، وہ کبھی نہیں مانے گا۔"

"پھر بھی میں کوشش تو کروں گا۔ آخر اسے اپنوں کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے۔"

"تو کیا تو بھی یہ چاہتا ہے کہ دعا ڈراموں میں کام کرے۔"

"نہیں.... مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اس کا باپ ہے "اس کا والی وارث، کمینہ ذلیل انسان ہے "اپنی کرنے پہ آیا تو کھڑے کھڑے بیٹی بیچ دے گا۔ اس نے طے کرلیا ہے کہ اسے فلموں ڈراموں میں لا کے رہے گا۔ اب میرے سمجھانے یا تیرے طعنے مارنے سے وہ باز نہیں آنے والا۔ ہمارا اس سے زیادہ کچھ کرنے کا حق ہی نہیں ۔ ماموں ہوں مگر۔ کیا کرسکتا ہوں اس کاکی کے لیے اچھا یہی ہو گا کہ وہ شہزادے کے ساتھ کام کرے۔ کم از کم وہ محفوظ تو ہو گی۔ وہ اس کا خیال رکھے گا اگر وسایا اسے واقعی گروپوں کے ساتھ ناچنے گانے کے لیے اوباشوں کے گھر بھیجنے لگا تو ہم بھلا اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔"

"اس کا کوئی کیا بگاڑ لے گا، زہر شکل.... منحوس کیسے منہ بھر بھر کے میرے بیٹے کو گن رہا تھا "تیرا بیٹا ہے کرے، کماؤ پوت کا باپ ہے تو، بڑا مال کما رہا ہے.... توبہ توبہ۔ اس کی نظر تو پتھر پھاڑ دے "میں نے اسی لیے اس کے آتے ہی پھل کی ٹوکری صوفے کے نیچے کردی کہ تیرے نوالے گن کر جائے گا اور یہ تو میرے اکلوتے بیٹے کو ہی سو دفعہ

نظر لگا گیا، آجائے شہزادہ صدقے کا بکرا وار کے در سے بھیجوں گی۔"

"جھلی ہے تو بھی نہ کہا کر ایسے بڑے بول اللہ کو پسند نہیں اور پھر جو بھی ہے وہ ہے تو میرا بہنوئی۔ چچیرا ہے وہ الگ بات، یاری بھی بڑی رہی ہے۔ جوانی میں مگر آخر اسے بہن دی تھی "اس طرح اونچی "اور کڑوی بات نہ کیا کر اس کے ساتھ۔"

"وہ اسی قابل ہے اور جو بہن دی تھی، وہ تو اب رہی نہیں پھر کہاں کی عزت "کہاں کے ٹھاٹھ۔ ہونہہ، تجھے تو اسے منہ ہی نہیں لگانا چاہیے میں تو سچ کہوں گی "تیری بہن کو وقت سے پہلے مارنے والا یہی تھا۔"

"ہک ہا۔" کرم الٰہی نے اپنا مخصوص تاسف سے ڈوبا نعرہ بلند کیا۔

"جانتا ہوں سب پتہ ہے لیکن کیا کروں، بہن اکیلی مری ہے "اس کاکی کو نہ چھوڑ کے جاتی تو کاہے کو منہ لگاتا میں اس بے غیرت کو مگر دعا.... وہ میری بہن کی آخری نشانی.... بس اس کی وجہ سے.... صرف اس کا خیال ہے۔"

● ● ●

دکھائی دیے یوں.... کہ بے خود کیا....

"آہا......" اللہ وسایا نے گھر میں داخل ہوتے ہی، ہارمونیم کی لے کے ساتھ ابھرتی نوعمری کا کچا پن اور برسوں کی ریاضت کے نتیجے میں سمیٹی مشاقی۔ بیک وقت بکھیرتی وہ آواز سنی اور سواد لینے کے انداز میں سر دھن کر کہا۔

جبیں سجدہ کرتے ہی.... کرتے گئی۔

حق بندگی ہم ادا کر چلے....

دکھائی دیے.... یوں....

"آہا" ادا کر چلے.... واہ.... اپنا نام بھی بیچ میں سجالیا۔" وہ بدستور سر دھنتا اندر آگیا۔ جہاں اس کی اکلوتی بیٹی دعا عرف ادا اپنے استاد جی ماسٹر عنایت اللہ دکنی سے سبق لے رہی تھی۔ ماسٹر جی نے اس ماہرانہ تبصرے پہ منہ بگاڑ کے اللہ وسایا کو دیکھا۔ جواب تخت پہ لمبا ہو تا ڈکار رہا تھا "ادا نے بھی ہارمونیم سے ہاتھ اٹھالیا۔

"یہ وہ والا ادا نہیں، اس لفظ کا مفہوم...." ماسٹر جی سے اس دل کو چھو لینے والے کلام کی ایسی ناقہمی اور بے قدری برداشت نہ ہوئی "ابھی وہ اس غزل کی مکمل تشریح کرنے ہی والے تھے کہ اللہ وسایا نے ٹوک دیا۔

"او چھڈو جی، مطلب وطلب کو.... بات تو ساری سروں کی ہے اور میں صدقے جاؤں سوہنے رب کے، واری جاؤں آپ کی استادی کے۔ کہ جس نے اس کل کی بچی کے گلے میں سروں کا میلہ لگا دیا ہے۔ اب سوہنے کے سوہنے کام، کسے پتا تھا کہ مجھ بے سرے کے گھر بھی ایسی سروں کی ملکہ پیدا ہو سکتی ہے۔ واہ ماسٹر جی، آپ نے استادی کا حق ادا کردیا۔"

"میاں، ہماری محنت ایک طرف اور اس بچی کی ریاضت ایک طرف۔ ساری استادی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اگر کسی میں سیکھنے کی دھن نہ ہو۔ میں سروں کی پہچان کرا سکتا ہوں، بڑے سے بڑا راگ سکھا سکتا ہوں "مگر گلے میں سوز اور آواز میں لوچ تو عطیہ خداوندی ہے۔ ادا کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کہ اسے سروں کے ساتھ ساتھ شاعری کی بھی پہچان ہے۔ اساتذہ کے کلام کو ایسے سمجھ کے گاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا ہے۔ میں تو ہمیشہ اسے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے سروں کو پاک رہنے دینا، تمہاری آواز گلے سے وضو کر کے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ نکھری نکھری، پاکیزہ معطر.... اسے آج کل کی موسیقی سے آلودہ مت ہونے دینا۔ یہ تو خدا کے عطیے کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔"

"اوہو ماسٹر جی پٹھی مت (الٹی باتیں) نہ دو اس جھلی کو، پہلے ہی یہ میری باتیں نہیں سمجھتی اب اسے وضو "ور پاکی ناپاکی کی طرف لگادو۔ بلے بھئی، بلے۔ قربان تمہاری گلاں تے.... جو فن سکھانے کی فیس لیتے ہو، وہ سکھاؤ، باقی سب یہ بچپن میں مولوی جی سے پڑھ چکی ہے۔"

"تم میری بات نہیں سمجھے اللہ وسایا' میرا کہنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ آج کل موسیقی کے نام پہ جو اخلاق باختہ گیت گائے جارہے ہیں' ذو معنی اور لچر بولوں والے' یہ موسیقی کی روح کو خراب کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ طوائفیں بھی منتخب کلام گایا کرتی تھیں' اب اچھے گھرانوں کی لڑکیاں پردے پہ فحش بولوں والے گیتوں پہ تھرکتی ہیں۔"

"ٹیم ٹیم کی بات ہے ماشٹر جی' وہ اور ٹیم تھا' تب تماش بین بھی گھگھرا (شرارہ) پھیلا کر بیٹھی طوائف کی ریں ریں سکون سے سن لیتے تھے۔ اب تو جب تک وہ اپنا انگ انگ نہ پھڑکالے' سمجھو' تماش بین کے پیسے ہی وصول نہیں ہوتے۔ یہ سجدوں والی غزلیں' ٹھمریاں آپ سو واری سکھاؤ' لکھ واری سکھاؤ' ٹکا نہیں کوئی دینے والا' بلکہ سننے والا ہی نہیں۔ اور ذرا "مینوں نوٹ وکھا' میرا موڈ بنے" پر کوئی لک (کمر) ہلالے تو گڈیاں کی گڈیاں نکال کر وار دیتے ہیں تماش بین۔"

"اللہ وسایا' نہ تم سمجھو گے نہ میں سمجھا سکوں گا' پھر بھی آخری کوشش کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ تماش بینوں پہ ضائع کرنے والی چیز نہیں' اس کی قدر کرو' اس کی ساری خوبصورتی اس کا "سچا" پن ہے اسے نوٹوں میں نہیں قدر دانوں کی داد میں تول کر دیکھو۔"

"ماشٹر جی' آپ کی ہو گئی عمر۔" اس نے ماتھا پیٹا۔

"قدر دان جائے چولہے میں' وہ ہنر کس کام کا' جو چار پیسے نہ لاسکے۔ میں نے سوچا تھا آپ نے بڑی بڑی گلوکاروں کو آگے کیا ہے۔ میری لڑکی کے سر پہ ہاتھ رکھو گے تو اس کے ستارے بھی چمک جائیں گے۔ آپ کی شاگردی کا رعب جھاڑ کے کام دلوادوں گا پر ناں جی' ادھر تو بے استادوں کا راج ہے۔ ماشٹر جی' آپ تو ساٹھ سالوں سے ادھر ہو۔ اس نگری میں بڑی واقفیت ہوگی۔ آخر بڑے بڑے موسیقار اور گانے والے آپ کو دیکھتے ہی آپ کے پیر پڑتے ہیں' کسی کو بھی کہہ کر کام دلواسکتے ہو میری ادا کو۔"

"او بھولے میاں' اگر پیر میں گرنے والے' استاد جی استاد جی کہہ کر ہاتھ چومنے والے' کام دیتے ہوتے تو میں گھر گھر جاکر سرکیوں بیچتا پھرتا۔ ہا۔ اپنے وقت کے استاد عنایت اللہ کنی کو انہوں نے پھیری والا بنادیا ہے۔ گلی کوچوں میں آوازیں لگاتا پھرتا ہوں۔ راگ بھیر دیں' پچاس روپے فی گھنٹہ' راگ درباری سو روپیہ فی گھنٹہ۔" وہ سرد آہیں بھرتے ہوئے اپنے سوکھے چمرخ پیروں میں گرد آلود کو لہا پوری چپل پھنسانے لگے۔ جس پہ موچی بھی ٹانکے لگا لگا کر تھک چکا تھا۔

"ٹیم پورا ہوگیا لگتا ہے ماشٹر جی کا' تو سنا کڑیے' کتنی باقی رہتی ہے تیری پڑھائی؟" اس نے ماسٹر عنایت اللہ کنی کے نکلتے ہی دعا کو مخاطب کیا جو کب سے ہارمونیم کی سطح پہ انگلیاں پھیرتی ہوئی گم صم بیٹھی تھی' اس کی آنکھیں اس کے گہری سوچ میں ہونے کا پتا دے رہی تھیں۔ شاید اسی لیے اللہ وسایا کے بلند آواز میں دوبارہ پوچھنے پہ وہ یوں چونکی جیسے بہت دور سے واپس آئی ہو۔ اور باپ کو تکتی اس کی خالی خالی نظریں یہ بھی ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ ابھی پوری طرح واپس نہیں آئی۔

"بولتی کیوں نہیں؟ یا جواب دینے کے لیے سُر ڈھونڈ رہی ہے؟"

وہ اپنی دانست میں بڑا نفیس مذاق کرنے کے بعد خود ہی ہنس پڑا۔ دعا لب کاٹتی ہوئی سوچنے لگی کہ "آخر ابا نے کیا پوچھا ہوگا۔" پھر اس نے خود ہی اس کی یہ مشکل آسان کی۔

"بس بہت ہوگیا' ایک دو نہیں' پورے نو سال ہوگئے ہیں' اس ماشٹر کو سبق دیتے دیتے' یہ کون سی پڑھائی ہے' اتنے میں تو بندہ ڈاکٹر بن جائے۔ میرے سے نہیں پوری پڑتی اس کی ہر مہینے کی فیس' کل سے چھٹی ماشٹر جی کی۔ تیرا کیا خیال ہے؟" سوال کرتے ہی اس نے بغیر جواب کا انتظار کیے خود ہی کہنا شروع کردیا۔

"ہور کی؟ (اور کیا؟) نو سال کم نہیں ہوتے اور اگر اب بھی تجھے استاد کی ضرورت ہے تو پھر یہ سارے تیرے مکر

ہیں۔ اپنی ماں والے مکر۔ ہاتھ پھیر پھلائے بغیر روٹی چاہیے تجھے بھی۔ بس کڑیے کہہ دیا میں نے' بڑی روٹیاں توڑلیں تو نے۔ اب میری ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں رہا۔ اب تیری باری ہے۔ کمانے کی اور میرے آرام کے دن ہیں۔"

وہ پھر بھی خاموش رہی' خود ہی بکنے جھکنے کے بعد اللہ وسایا نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور پسیج گیا۔

"چل جھلی نہ ہو تو' میری باتوں کو ایسے دل سے نہ لگایا کر۔ ایک تو ویسے ہی چپ چپ رہتی ہے اوپر سے میرا بھی دماغ خراب ہے۔ جو باہر کی تپ آکر تجھ پہ اتار دیتا ہوں۔ ناں تو تو میری بڑی اچھی۔ بڑی بی بی دھی ہے۔ کرماں والی' گنوں والی' یہ ماشٹر بڑا بے بدا ہے' اور تو کوئی پچھتا نئیں ان ماشٹوں کو' بس اس ایک جگہ ٹکا ہوا ہے نو سال سے' ہاں بھئی' کون لگی لگائی روزی کو لات مارتا ہے۔ اس کا خیال ہوگا اسی طرح لارے میں رکھ کے تجھے سارے گاما سکھاتا رہے گا۔ اور اگلے نو سالوں تک میری بوٹیاں کھاتا رہے گا۔ وڈا آیا تان سین کا پتر ———— مجھے کیا پتا نہیں کہ میری دھی کو کیا آتا ہے۔ کیا نہیں' آیا وڈا مجھے یہ بتانے والا کہ ابھی سر کچے ہیں۔" اس کی صلواتوں کا رخ اب ماسٹر عنایت اللہ کی طرف ہوگیا۔

"ابا جی' ماشٹر جی ایسے نہیں' وہ تو بڑی نیک نیتی سے مجھے۔" اس نے اپنے محترم استاد کی طرف داری کی۔

"پتہ ہے مجھے' پتہ ہے مجھے' زیادہ وکالت نہ کر۔" وہ تیز لہجے میں اس کی بات کاٹتا ہوا بولا پھر دھیما پڑا۔

"مولا خوش رکھے پتر' بندہ کوئی بھی ماڑا' (برا) نہیں ہوتا۔ ماڑا ہوتا ہے اس کا پیٹ اور کمینی ہوتی ہے پیٹ کی بھوک' اور یہ ماشٹر بھی تو بندہ بشر ہی ہے۔ پیٹ والا' بھوکے پیٹ والا۔ تو ابھی بڑی نمانی ہے۔ تجھے کیا پتا کہ یہ پیٹ بندے کو کیسے نچاتا ہے' یہ جو فرشتے ہوتے ہیں کڑیے' یہ اسی لیے تو فرشتے ہوتے ہیں کہ ان کے پیٹ نہیں لگے ہوتے۔ جو مولا بڑی شان والا ان کو بھی پیٹ دے دیتا تو پھر۔"

"تو پھر۔" پہلی بار دعا نے اللہ وسایا کی بات کاٹی۔

"تو پھر وہ فرشتہ نہ رہتے' اور اگر اللہ سوہنا آدم کو پیٹ نہ دیتا تو نہ اسے بھوک لگتی نہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر دانہ توڑتا۔"

"ہاں ابا جی آپ سچے ہو' پیٹ تو تب سے ہی بندہ بشر کو انگلیوں پہ نچاتا آرہا ہے۔ اس پیٹ کی خاطر ہی انسان نے سب سے پہلے اللہ کو ناراض کیا تھا اور اب بھی بندہ صرف اس پیٹ کو خوش رکھنے کی خاطر رب کو ناخوش کرتا آرہا ہے۔"

"مولا خوش رکھے' آگئی ناں' میری دھی کو بھی عقل' لے فیر۔ اسی گل پہ ہوجائے اک اک دودھ پتی' او ہو' یہ تو روٹی کا ویلا ہے اور تو نے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔ تیری ماسی نے تیرے لیے مٹروں والے چاول اور چرغے کی بوٹی بھیجی ہے۔ میں تو کھا آیا ہوں' ناشتا کر کے نہیں نکلا تھا اس لیے بھوک جلدی لگ گئی' چل شاباش میرا پتر' تو اٹھ کے کھالے۔ بڑا سوادی چرغہ تھا اور چاول تو تیری ماسی نے آپ بنائے تھے۔ تیری ماں سے ہی سیکھا تھا۔ اس نے پکانا اس لیے وہی سواد ہے وہی چسکا۔"

"ابا جی' آپ ماما جی کے گھر گئے تھے۔" اٹھتے اٹھتے وہ پھر سے بیٹھ گئی اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ حیرت تھی۔

"ہاں کام تھا بڑا ضروری۔" اس نے ٹالا۔

"وہی کام جس کے لیے آپ پہلے شہزادی جی کے دفتر گئے تھے۔" اس نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔ اللہ وسایا ہار مان کے چڑ گیا۔

"آہو' آہو' وہی کام' اور کیا میں نے ان کی منجیوں (چارپائیوں) کی ادوائن کسنے جانا تھا یا ان کے چوباروں پہ جھاڑو پھیرنے جانا تھا۔" وہ پھر سے گرم ہوگیا۔

"ابا جی' کیوں جاتے ہیں وہاں یہ سوال لے کر' جب کہ آپ کو پتہ ہے کہ ماما جی پسند نہیں کرتے۔" اس نے

کہنے کی کوشش کی حالانکہ جانتی تھی اللہ وسایا کبھی کسی کی پوری بات سننے کا عادی نہیں۔

"او پتہ ہے مجھے اچھی طرح تیرے مامے کا۔۔۔ ہونہہ 'پسند۔۔۔ نہیں کرتا۔ اس کی پسند کی تو۔۔۔" اس نے زیرِ لب توانا سی گالی دی۔

"کھوسٹ ہو گیا ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں 'زن مرید ہو کے رہ گیا ہے۔ او بندہ پوچھے 'بڑھاپا کس پہ نہیں آتا' اولا کس کی نہیں جوان ہوتی 'مگر یہ کہ ماتو ہاتھ پیر توڑ کے بالکل ہی بے جان ہو گیا ہے۔ جو پتر کہے گا وہ اس نے کرنا ہے جو زنانی سکھائے گی وہ اس نے بولنا ہے 'اور کیا کہنے اس کے پتر 'اور اس کی زنانی کے۔ ان دونوں کو تو میرے ہر کام میں کیڑے نکالنے ہوتے ہیں۔

خیر میں بھی کھری کھری سنا آیا ہوں۔ کر ما ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ تیری مامی البتہ ابھی تک بیٹھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دے رہی تھی۔ اسے رہ رہ کے اس رقم کی "پیڑ" (درد) اٹھ رہی تھی جو میں عید سے پہلے شہزادے سے لے کر گیا تھا۔"

"ابا جی آپ نے بھی تو حد کر دی تھی۔ جس کام کے لیے رقم لی تھی 'اس کی بجائے۔ میں تو مارے شرمندگی کے اسی لیے اتنا عرصہ ماما جی کے گھر نہیں گئی حالانکہ آپ کو پتا تو ہے کہ میرا اور ہے ہی کون 'لوگوں کے تو رشتے دار ہوتے ہیں۔ میرا ایک لے دے کر یہ ماما جی اور مامی 'ان سے بھی آپ کی وجہ سے کترائی پھر رہی ہوں۔"

"وہ زمانے چلے گئے 'جب رشتے داروں کے ساتھ ویلا (وقت) گزر جاتا تھا اب تو وہ سکھی جس کے کم رشتے دار ہوں۔ تڑی دے آیا ہوں تیرے مامے کو۔ اب دیکھتا ہوں اسے تیرا کتنا خیال ہے 'کتنا اپنا ہے وہ تیرا۔"

"لیکن شہزادی۔۔۔"

"نام مت لے اس کا میرے سامنے 'آپے سے باہر ہو رہا ہے۔ شوخا 'وہ ہوتا کون ہے مجھ پہ پابندیاں لگانے والا مجھے یہ بتانے والا کہ میں اپنی اولاد کے ساتھ کیا کروں اور کیا نہیں۔ ہر کوئی اپنے اگائے درخت کے نیچے ستاتا ہے۔ اگر میں چاہتا ہوں تو اس میں برائی کیا ہے۔ ٹھیک ہے نہ مدد کرے۔۔۔ فن اپنا رستہ آپ بناتا ہے۔ دیکھ لینا ایک دن تو شہرت کی ایسی بلندی پہ پہنچی ہو گی کہ اس جیسے منہ اٹھا اٹھا کے بھی تجھے نہ دیکھ سکیں گے۔"

"ابا جی 'آپ نجانے کن خوابوں میں رہتے ہیں۔" وہ اکتا کے اٹھنے لگی۔

"خواب تو سارے دیکھتے ہیں۔ پورے کسی کسی کے ہوتے ہیں۔ اور میں بھی خواب ایسے بے فضول میں نہیں دیکھ رہا 'مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میری دھی رانی میں کتنے گن ہیں۔ اسی لیے تو نو سال سے پیٹ کاٹ کاٹ کر تیرے اس ماشٹر جی کی فیس بھر رہا ہوں۔ اور یہ بھی میرا ہی جگرا (حوصلہ) ہے ورنہ دوجے کہاں ان "دھپڑ ولوں" (چکروں) میں پڑتے ہیں۔ سرخی پوڈر لگایا۔ میک (مائیک) ہاتھ میں پکڑا۔ کوئی بھی پھڑکتا ہوا گانا شروع کیا۔ ساتھ میں آنکھیں مٹکاتے گئے 'لک (کمر) ہلاتے رہے اور جی گانا ہو گیا۔ مگر یہ بازاری لوگوں کے لچھن ہیں 'ہم ٹھہرے "خاندانی" اور "ٹُنی" لوگ 'طریقے سلیقے سے فن کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہماری رزق روٹی ہی نہیں 'ہماری پہچان بھی ہے ہمارا نام ہے یہ 'اسے چور گلی سے نہیں بیچ سکتے۔ اسی لیے میں نے "خاندانی" طریقے سے تیری تعلیم کا بندوبست کیا۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے کڑیئے اور وہ یہ کہ جس طرح پرانی ریت نہیں چھوڑنی چاہیے اسی طرح نئے زمانے کے نئے رواجوں سے بھی ایک دم پلہ نہیں چھڑوایا جا سکتا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں 'یہ ساری بے سریاں کیسے راج کر رہی ہیں 'پھر دماغ میں خیال آتا ہے کہ انہوں نے راج کرنے میں کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑ رکھی۔ تجھے میں جب بھی کہیں لے کر گیا ہوں 'یہی ململ کے دوپٹے کی بکل یہی نارے میرے کے تیل میں لش لش کرتی گت (چٹیا) ٹی وی پہ کوئی تجھے دکھائے بھی تو کیا سوچ کر 'ذرا اپنا خیال رکھا کر چندریے۔ کوئی پہن اوڑھ 'ذرا چج (ڈھنگ) کے بال بنا 'طریقے سے بات چیت کر۔ تجھے کالج اسی لیے بھیجا تھا کہ بول چال اچھی سیکھ جائے۔ الٹا تیری تو بالکل ہی بولتی بند ہو گئی کالجے جا کر۔ چھ سات مہینے بعد ہی گھر بیٹھ گئی۔"

"کیا فائدہ تھا ابا جی وہاں جانے کا 'آپ نے داخلے کی اجازت دی تو میں سمجھی آپ مجھے میری مرضی کی زندگی

گزارنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ لیکن جب سمجھ میں آیا کہ آپ مجھے تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ظاہری لیپا پوتی کی غرض سے بھیج رہے ہیں تو میں نے اس ہارمونیم کے آگے بیٹھنا زیادہ بہتر سمجھا۔ ٹھیک بھی ہے 'انسان کام کوئی بھی کرے مگر پوری دیانت داری اور یکسوئی کے ساتھ۔" وہ سوچتی رہی 'کہہ نہ سکی۔

"خیر ہووے۔۔۔ تین سے اوپر ٹیم ہو گیا۔ چل شاباش روٹی کھالے۔ خیر میرے لیے چاء بنا۔" اس کی خاموشی سے اللہ وسایا نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اس کے مشورے پہ غور کر رہی ہے۔

"روٹی میں کھا چکی ابا جی۔۔۔"

"کھا چکی؟ پر میں تو سویرے کج دے کر نہیں گیا تھا پکانے واسطے۔"

"تھوڑی رات کی دال تھی 'ایک پیاز کاٹ کر نمبو (لیموں) نچوڑ لیا تھا۔"

"ہائے ہائے ذرا صبر نہیں 'باہر گیا تھا تو کج لے کر ہی مرتا ناں 'بڑا شوق ہے تجھے ماں کی طرح باسی روٹیاں پتلی دال میں ڈبو کر کھانے کا۔ چٹنی سے رگڑ رگڑ کر پیٹ بھرنے کا۔ اتنا سوادی چرغہ 'دل کر رہا تھا سارا کھا جاؤں 'پر تیرے لیے اپنی بھوک روک لی۔ ٹانگ کی بوٹی ثابت رکھ کے لیے آیا۔"

"دودھ پتی کے ساتھ گرم کر کے لے آتی ہوں۔" وہ جانتی تھی 'اس کے ابا کی بھوک سدا بہار جوان رہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

کیا اہلِ ہُنر، کیا اہلِ شرف سب ٹکڑے ردی کاغذ کے
اس دور میں ہے وہ انسان بڑا جو روز خبر میں رہتا ہے

عمیص نے گویا فتویٰ صادر کر دیا۔

"فضول کا فلسفہ 'جو لوگ نہ ہنر سے کام لے سکیں نہ شرف کسی کام آ سکے ان کے۔۔۔ وہ کھسیاہٹ چھپانے کو ایسے ہی فتوے صادر کرتے پھرتے ہیں۔" گل مہر نے ناک چڑھائی۔

"اور بالفرض تمہاری یہ بات مان بھی لی جائے تو صاحبزادہ **عمیص** 'خبر میں رہنے کے لیے بھی یا تو اہلِ ہنر ہونا ضروری ہے یا پھر اہلِ شرف۔۔۔"

"اچھا اور وہ جو اشتہاری مجرموں یہ پورے کے پورے صفحے چھپتے ہیں ان کا تعلق کس کیٹگری سے ہوتا ہے۔"

"بحث کرنے کے لیے بھی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے 'اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارے پاس صرف اشعار کا کوٹا بھرا ہوا ہے 'باقی سب خالی ہیں۔"

"بحث کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ **عمیص** آپ ہی باز آجائیں گل مہر کی زندگی کا اتنا اہم دن ہے 'کیوں ستا رہے ہیں انہیں؟" صاحبزادی یاسمین نے ان دونوں کی وجہ سے ماحول میں تناؤ پیدا ہوتے دیکھا تو صلح کا پرچم بلند کیا۔ وہ آج صبح ہی یہاں پہنچی تھیں۔

"ہماری زندگی کا ہر دن اہم ہے 'کم از کم ہمارے لیے۔" گل مہر نے چڑانے کے سے انداز میں **عمیص** کو دیکھا۔

"کسی اور کے لیے بھی ہو سکتا ہے 'تم اپنا ایک دن دینے پہ تیار تو ہو۔" اس کی بڑبڑاہٹ صرف نزدیک بیٹھی موتیا نے سنی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

"اب خالہ جان کی شادی ہو گی ناں۔" شمشیر نے اپنے تئیں بہت بڑا بنتے ہوئے نہ جانے دریافت کیا تھا یا انکشاف کیا تھا۔ مگر اس کی یہ بات وہاں موجود سب نفوس کے لیے جھٹکے کے مترادف تھی۔ گل مہر نے پہلے تو چائے کا کپ رکھ کے اسے گھورا پھر اس کی والدہ محترمہ کو 'کہ شاید یہ پٹی انہوں نے صاحبزادے کو پڑھائی ہو۔ موتیا کی نظریں غیر ارادی طور پر **عمیص** کی جانب اٹھ گئیں۔ جب کہ وہ شمشیر کی اس بات کو کھل کے انجوائے کرتا ہوا۔ سر ہلا ہلا کر مسکرا رہا تھا۔

"یہ تم سے کس نے کہا؟ آپا حضور نے۔۔۔" گل مہر نے شمشیر کو آنکھیں دکھائیں پھر صاحبزادی یاسمین کی

طرف متوجہ ہوئی۔

"اور آپ کو۔۔۔؟ یقیناً" امی حضور نے کوئی کھچڑی پکائی ہو گی۔ تب ہی ہم سوچ رہے تھے کہ آج آپ کی سواری کہاں ہمارے غریب خانے میں اتر آئی۔ رزلٹ کی مبارکباد دینے کا تو بہانا تھا۔ اصل میں تو یہ میٹنگ رکھنی تھی، ہے نا؟"

"ارے رے۔۔۔ گل مہر۔" وہ گھبرا گئیں۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ہم اور آپ کی شادی۔۔۔ ہمارا مطلب ہے کہ یہ ہمارے طے کرنے کا کام تو نہیں۔ اور چچی حضور یا چچا حضور نے اس بارے میں اگر کچھ طے کر رکھا ہے تو بخدا ہم اس سے واقف نہیں۔ رہا شمشیر تو وہ تو بچہ ہے، ایسے ہی ایک بات منہ سے نکل گئی" آپ سنجیدہ ہو گئیں۔

"کمال ہے آپا حضور، آپ تو یوں بوکھلا رہی ہیں جیسے ان محترمہ کے قتل کی گھناؤنی سازش کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہیں۔" **عمیص** کو ان کو اس طرح گھگھیا کر وضاحتیں دینا پسند نہ آیا۔

"اور تم اتنا بھڑک کیوں رہی ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بدک کیوں رہی ہو۔ بچے نے چاؤ میں آ کر اپنا ایک ارمان ہی تو بیان کیا ہے۔ تم پہ کوئی دفعہ تو نافذ نہیں کر دی جو تم ہر ایک کو کٹہرے میں گھسیٹنے کے درپے ہو بھی آپا حضور۔۔۔ تو کبھی چچی حضور، بالفرض وہ لوگ ایسا کچھ سوچ بھی رہے ہیں تو اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم بیچ میں مت بولو۔" اس نے چبا چبا کے کہا۔

"ہونہہ! ارمان۔۔۔ ارمان پورے کرنے کے لیے ایک ہم ہی رہ گئے ہیں کیا؟"

"نہیں تم اکیلی کیوں؟ میں بھی ہوں نا۔" اس نے بھولپن سے منہ پکا کر کے کہا۔ یاسمین کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھ پہ بھی بصد شوق سارے ارمان نکالے جا سکتے ہیں۔" اس نے کھلی دعوت دی۔

"پہلے تم خود اپنے ارمان پورے کرنے کے قابل تو ہو جاؤ۔" اس نے بڑا کاری طعنہ مارا۔ چند لمحوں کے لیے **عمیص** خاموش ہو گیا۔ اتنے میں موتیا کچن میں برتن رکھ کے واپس آ چکی تھی، پیچھے پیچھے ٹھک ٹھک چلتا **دلگیر** بھی تھا۔

"ہائے ہائے چھوٹی بی بی، ہم کس کام کے اگر سب کچھ آپ نے ہی کرنا ہے۔ میں کہتی ہوں، یہ نازک کلائیاں خم کھا جائیں گی، بس آپ بتاتی جائیں، میں بناتی جاؤں گی۔" وہ منتیں کر رہا تھا مگر موتیا سخت اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"اوفوہ! **دلگیر** میں نے کہا ناں، کھیر میں خود پکاؤں گی۔ بڑی امی حضور نے خاص تاکید کی ہے۔"

"ہونہہ، ہمیں تو کوئی کسی قابل سمجھتا ہی نہیں۔" وہ دھپ سے وہیں برآمدے کے ننگے فرش پہ بیٹھ گیا۔ پیروں میں **جھنکتی پازیبیں** جھنجھنا اٹھیں۔

"بڑی بی بی خیر سے اتنے بڑے امتحان میں پاس ہوئی ہیں۔ ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں، ہمارا بھی دل کرتا ہے اس خوشی میں شریک ہوں، ناچیں گائیں۔"

"اور پھر چچا حضور سے پھینٹی کھائیں۔" **عمیص** نے اپنے مختصر دورانیے کی احتجاجی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

"اوں ہوں صاحبزادہ **عمیص**، آپ کیسی زبان بولنے لگے ہیں۔" یاسمین نے سرزنش کی۔

"ارے آپا حضور، غنیمت جانیے، ورنہ یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ لاہور میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے، انہی گلی کوچوں میں کھیلے اور "لاہوری" نہ بن سکے۔ کمال ہے کیا جی دار، بادشاہ لوگ ہوتے ہیں یہ بھی اور کیا زبردست زبان ہے، یہ پنجابی بھی۔ ایمان سے کہہ رہا ہوں، بڑا رعب ہے اس زبان میں۔ ویسے دیکھا جائے تو میں بھی لاہوری کہلایا جا سکتا ہوں، آخر اسی شہر کی پیدائش ہے تو پھر اگر بول چال میں ذرا سا لاہوری پن ٹپک پڑے

"بھیا جی، زبان کوئی بھی بری نہیں ہوتی البتہ ہر زبان میں کچھ اچھے یا برے لفظ ضرور ہوتے ہیں۔ شائستگی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر ممکن حد تک نرم الفاظ استعمال کیے جائیں۔"

"اور **دلگیر** کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اپنے دل کے ارمان نکالنے کا پورا موقع دیا جائے۔" **دلگیر** نے خود پہ سے توجہ ہٹتے دیکھ کر پھر سے دہائی دی۔

"اب اور کیا کرنا چاہتے ہو تم۔ صحن میں جھنڈیاں لگانا ہیں یا شہر بھر میں لاؤڈ اسپیکر پہ اعلان کروانا ہے کہ تمہاری بڑی بی بی پاس ہو گئی ہیں۔"

"کوئی دھوم دھڑکا ہونا چاہیے۔" وہ مصر تھا۔

"**مثلاً**" کوئی محفل موسیقی، رقص ہوشربا۔"

"لو۔۔۔ کوئی خالہ کی شادی تھوڑا ہی ہے جو یہ سب ہو گا۔" اب کے سب سے چھوٹے اقدس کی سوئی شادی پہ اٹک گئی۔ یاسمین سٹپٹا کے رہ گئیں۔ جب کہ موتیا اور **عمیص** اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

"دیکھا۔۔۔ دیکھا۔۔۔ ہم نہ کہتے تھے کہ کوئی چکر ضرور ہے۔ آخر ان بچوں کے کان میں کچھ پڑا ہے۔ تو وہ بار بار اس طرف آ رہے ہیں۔"

"ہاں ان کے کان میں نواب بیگم نے سرسوں کے تیل سے بھرے پھائے ٹپکائے ہیں۔" **دلگیر** نے اپنی ہانکی۔

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم اس طرح بار بار بھڑک کیوں رہی ہو۔ اول تو ایسی کوئی بات ہی نہیں، دوسرا یہ کہ اگر ہوتی تو تم سے پوشیدہ رکھ کے کیا حاصل اور بالفرض اگر ہو بھی تو ایسی قابل اعتراض بات بھی نہیں کہ تم یوں ناک بھوں چڑھاتی پھرو۔ آخر کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو تمہاری شادی ہونا ہی ہے۔" موتیا نے اس کے سٹپٹانے پہ الجھ کے کہا۔ یاسمین نے بھی تائید کی۔

"ہاں، اور اب تو بڑا مناسب موقع ہے۔ آپ کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی ہے، کمال ہے ابھی تک کسی کو یہ خیال کیوں نہ آیا۔ ہم سے تو یہ بچے اچھے ہیں جن کی توجہ دلانے پہ ہم سوچ رہے ہیں کہ امی حضور اور چچی حضور سے ذکر کر کے دیکھیں کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔"

"پلیز آپا حضور، ہمارے لیے مشکلات مت کھڑی کریں۔ اور یہ بھی بتا دیں ہم کہ تعلیم کبھی مکمل نہیں ہوتی۔" وہ اس قدر رکھائی اور بے گانگی سے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی کہ یاسمین چپ کر گئیں مگر موتیا جو اس کے ہاتھوں کسی کی بھی تذلیل ہوتے دیکھ کر میدان میں کود پڑتی تھی اب بھی پیچھے نہ رہی۔

"نہیں کیا ضرورت ہے تمہارے لیے مشکلات کھڑی کرنے کی۔ یا تمہاری اسی سو کالڈ "تعلیم" کی راہ میں رکاوٹ بننے کی۔ تم بھلے سے بوریاں بھر بھر کے ڈگریاں سمیٹو، تمہیں اتنا احساس نہیں کہ ابا حضور کی کمر تمہاری فیس ادا کرتے کرتے جھک گئی ہے، تمہیں مہنگے مہنگے انسٹیٹیوٹ میں جانے کا خبط ہے اور کچھ نہیں۔"

"ابا حضور کی کمر جھکانے کے لیے اور بھی بہت سے خرچے ہیں۔" اس نے اپنی مخروطی انگلیوں کو پھیلا کر ناخنوں کا جائزہ لیتے ہوئے دانستہ طور پہ یہ سرسری سا لہجہ اور بے نیازی اپنائی ورنہ در پردہ وہ جس پہ یہ وار کرنا چاہ رہی تھی، وہ جانے پہ بیٹھا تھا۔ صاحبزادی یاسمین کا چہرہ پل بھر کے لیے تاریک ہوا، پھر وہ نظریں جھکا کے رہ گئیں۔

"اور ویسے بھی ہم نے طے کیا ہے کہ اب ہم اپنے اس واحد شوق بلکہ جنون کی تکمیل کے لیے ابا حضور پہ مزید بار نہیں ڈالیں گے، تم ہماری پوری بات سنے بغیر ہم پہ بے حسی کا فتویٰ صادر نہیں کر سکتیں۔" اس نے موتیا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ مزید ایجوکیشن ضرور حاصل کریں گے۔ ہر حال میں کریں گے مگر اس کے اخراجات پارٹ ٹائم جاب سے پورے کریں گے۔" اس نے گویا دھماکا کر دیا۔ یاسمین تو یاسمین، موتیا تک گنگ رہ گئی۔ حالانکہ چند روز پیشتر گل مہر اس پہ اپنا یہ ارادہ واضح کر چکی تھی۔ مگر اس نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا لیکن اب

اس طرح سب کے درمیان بیٹھ کر یا تگمڈیل یہ اعلان کرتا۔۔۔ یہ بتا رہا تھا کہ بات واقعی سیریس ہے۔ اور عمیص جو اس ساری گفتگو کے دوران مسلسل خاموشی سے گل مہر کو تک رہا تھا' ایک جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"جاب۔۔۔؟ پارٹ ٹائم جاب۔۔۔؟ اور تم۔۔۔؟" وہ بے یقینی سے اس کے قریب سرک آیا۔

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہم جو کہتے ہیں' پہلے سے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں' تمہاری طرح نہیں کہ کسی اور کو تو تمہاری بات کی کیا سمجھ آئے گی' خود کو نہیں پتا ہوتا کہ کیا ہانک رہے ہو۔"

"فی الحال تو یہی رائے میں تمہارے بارے میں قائم کر رہا ہوں' غالباً" تم خود نہیں جانتیں کہ محض موتیا کے اشتعال انگیز طعنے کے جواب میں تم جو دعوی کر رہی ہو' اس کا خالی خولی اظہار بھی اس گھر میں بھونچال لا سکتا ہے' اس پہ عمل درآمد کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"ہم تمہاری طرح بودے دعوے نہیں کرتے' اور رہا بھونچال آنے کا مسئلہ' تو ظاہر ہے خود کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے کے بعد ہی ہم یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔"

"بصد شوق اٹھایئے' صرف قدم ہی نہیں' بے شک آپ خود اٹھ جائیں۔۔۔ میرا مطلب ہے جہان سے مگر یہ بھول جاؤ کہ اپنے سابقہ شوق اور ضدیں جس طرح تم مختلف حیلوں' حربوں' سے منواتی آئی ہو' یہ بھی چچا حضور سے منوالوگی۔ میری مثال سامنے ہے تین سال ہو گئے' جوتیاں چٹخاتے ہوئے' نہ کوئی ڈھنگ کا بقول چچا حضور' باعزت کام ملتا ہے نہ ہی وہ اس بات پہ تیار ہوتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو میں کسی اچھے اسٹور پہ سیلز مین ہی لگ جاؤں۔ ڈیفنس والے ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہ اچھے بھلے۔ ساڑھے پانچ ہزار مل رہے تھے سیلز مین کرنے کے اور وہ پزا پارلر والے ڈلیوری بوائے کے طور پہ چھ ہزار دینے کو تیار تھے۔ شروعات تو ایسے ہی ہوتی ہے لیکن چچا حضور مانیں تو تب' کوئی کام ایسا نہیں جو ان کے شایان شان ہو۔"

"تم نے ان کے شایان شان کام ڈھونڈنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔ اور تم کوشش کرتے بھی کیا۔ اس خالی بی اے کی ڈگری کو آج کل کون پوچھتا ہے' ہمارا دماغ تو نہیں خراب' جو پچھلے کئی سالوں سے سارا آرام سکون چھوڑ کر ان موٹی موٹی کتابوں میں غرق ہوئے ہیں۔ محنت کبھی بے کار نہیں جاتی۔

ابھی تو ہمارا رزلٹ بھی آؤٹ نہیں ہوا تھا کہ دھڑا دھڑ جاب کی آفرز آنے لگیں۔ لیکن ایک تو ہم فل ٹائم جاب کرنا نہیں چاہتے تھے کہ ہماری پڑھائی کا حرج نہ ہو اور دوسرا یہ کہ ہماری کوشش تھی کہ کام بے شک ہو مگر ہو ہمارے انٹرسٹ کا یعنی کری ایٹو ہو۔ صرف آفس ورک یا روٹین ورک ہمیں بور کر دیتا۔ اسی لیے ہم نے صرف مزنی کے انکل کی آفر پہ ہی سیریسلی سوچا ہے۔"

"کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم ابا حضور کے بارے میں بھی سیریسلی سوچ لیتیں۔" موتیا نے طنز کیا۔

"دیکھو گل مہر! بات صرف اتنی سی نہیں کہ چچا حضور کو اپنے خاندان کی ناموس کم حیثیت والی ملازمت کی وجہ سے خطرے میں پڑتی نظر آتی ہو۔" عمیص نے اب اسے سنجیدگی سے سمجھانا چاہا۔

"ٹھیک ہے کہ میرے ساتھ انہیں صرف اتنا سا ہی اختلاف ہے اور یہ بھی درست کہ واقعی میری قابلیت کے لحاظ سے مجھے ایسی ہی ملازمت مل سکتی ہے۔ سجے سجائے آفس' پرکشش اور بارعب عہدے کا خواب دیکھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں لیکن اگر تمہیں ایسی کوئی جاب مل رہی ہے' تب بھی چچا حضور کا ماننا ناممکنات میں سے ہے۔ جس طرح مجھے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کے شرٹس بیچتے دیکھنا یا گھر گھر پزا ڈلیور کرتے دیکھنا انہیں گوارا نہیں' ایسے ہی اپنی "صاحبزادی" کا گھر سے باہر نکلنا اور وہ بھی حصول رزق کے لیے' انہیں قطعی منظور نہیں ہوگا۔ حصول علم کے لیے ان کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی' اس کا مطلب تم یہ مت لے لینا کہ ایسی ہی روشن خیالی کا مظاہرہ وہ ہر معاملے میں کرتے رہیں گے۔ تمہیں گورنر کا عہدہ بھی مل جائے تو ان کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔"

"کیا تم سب یہ طے کر کے بیٹھے ہو کہ ہر حال میں ہماری مخالفت کرنی ہے۔"

حقیقت کا سامنا کرنے کو وہ ہرگز تیار نہیں تھی۔ اگرچہ یہ سب باتیں وہ بھی جانتی تھی مگر دانستہ ان سے نظریں چرا کے خود کو بہادر ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب عمیص کا حقیقت پسندانہ تجزیہ اسے جھلانے پر مجبور کر رہا تھا۔

"ابا حضور تک تو جب بات جائے گی تو جائے گی۔ کم از کم پہلے تم لوگوں میں سے تو کوئی ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو۔ ابا حضور سے بھی ہم خود بات کر لیں گے' کسی سے مدد کی بھیک نہیں مانگیں گے کہ وہ ہماری حمایت میں ان کے سامنے جائے مگر کم از کم تم لوگ ہمیں مورل سپورٹ تو دے سکتے ہو' ہماری ہمت تو بندھا سکتے ہو۔"

"ہاں' تم تو جیسے دوسروں کے لیے اب تک یہی کرتی آئی ہو۔" موتیا بڑبڑائی۔

"گل مہر! پلیز۔۔۔ دیکھو رونا مت۔" عمیص اس کی آنکھوں کے فرش گیلے ہوتے دیکھ کے ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھا۔ موتیا نے ناگواری سے اس کی بے چینی ملاحظہ کی۔

"کہاں تو تم اتنے لمبے چوڑے دعوے کر رہی تھیں' کہاں ابھی سے کمزور پڑ گئیں۔ میں تمہاری ہمت کم نہیں کر رہا تھا' صرف تمہیں تمہارے فیصلے کے نتیجے میں ہونے والے ردعمل سے آگاہ کر رہا تھا تاکہ تم ذہنی طور پر تیار رہو۔ جہاں تک مورل سپورٹ کی بات ہے تو میں صرف مورل یعنی زبانی کلامی ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی سپورٹ کے لیے تیار ہوں۔ میں تو پہلے ہی ان فرسودہ روایتوں کے خلاف ہوں۔ ارے یہ کیسی عزت ہے جو کئی نسلوں سے قائم ہونے کے باوجود اتنی ناپائیدار ہے کہ سانس لینے سے ٹوٹ جائے گی۔ آخر کبھی تو ان کا خاتمہ ہوگا۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم اب تک کنوئیں کا مینڈک بنے بیٹھے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گل مہر اور ہم دونوں مل کر چچا حضور کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوں گے کہ بدلتے وقت کے تقاضوں کے مطابق اب ان کا اپنے قوانین میں ترمیم کرنا کس قدر ضروری ہو چکا ہے۔"

اس کو اتنی آسانی سے گل مہر کے جال میں پھنستا دیکھ کے موتیا نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر خاموش کر گئی۔ یاسمین نے سر جھٹک کے بچوں کی طرف توجہ کی۔ اقدس تو دلگیر کے کاندھے پر سوار ہو کے دالان میں نکل چکا تھا۔ دلکش کو موتیا نے سلاد بنانے بھیجا تھا جبکہ شمشیر اور نایاب منہ اٹھا کے یہ ساری بحث سن رہے تھے۔ یاسمین کا دل بھر آیا۔ وہ اپنے بچوں کو اپنے گھر کے گھٹے ہوئے ماحول سے بمشکل آزاد کرا کے کبھی کبھار چند دن یہاں گزارنے آیا کرتی تھی۔ سہمے ہوئے اور محبت و تحفظ کے احساس سے قطعی ناآشنا یہ بچے یہاں آ کر چند گھڑیاں ماموں اور خالہ سے چہلیں کر لیتے تھے۔ نانی سے لاڈ اٹھوا لیتے تھے اور نانا سے فرمائشیں کر لیا کرتے تھے مگر اس وقت اقدس اور شمشیر کی نظروں سے وہی ہراس ٹپک رہا تھا جو اپنے باپ کو سامنے دیکھ کر پیدا ہو جاتا تھا۔

"اور اگر صاحبزادی گل مہر نے عمیص میاں کی شہ پا کر آج ہی چچا حضور پر اپنا عندیہ ظاہر کر دیا تو پھر۔۔۔" وہ گھبرا گئیں اور دل ہی دل میں اس مسئلے کو تب تک ٹلے رہنے کی دعا مانگتے ہوئے بچوں کو کھانے کے لیے اٹھانے لگیں۔۔۔ جب تک کہ وہ یہاں تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ابا جی! یہ نہیں ہوگا مجھ سے۔"

"کیوں نہیں ہوگا۔ میں کیا لکی ایرانی سرکس میں رسی پر سائیکل چلانے کا کہہ رہا ہوں تجھے۔ وہی کام کرنے کا کہہ رہا ہوں جس کی تجھے "جاچ" (ہنر) ہے اور جس کو سیکھنے میں تو نے اپنی زندگی کے نو سال اور میرے ہزاروں روپے برباد کیے ہیں۔ میں بھی تو دیکھوں تیری فنکاری۔" اللہ وسایا نے دعا کو ڈپٹتے ہوئے کہا جو یہ سنتے ہی ہراساں ہو گئی تھی کہ اللہ وسایا نے پرموٹر ملک مقبول کے کہنے پر اس محفل موسیقی میں دعا کو بھیجنے کی ہامی بھر لی ہے۔ جو اس شہر کے روسا اور امراء کے لیے بڑے پیمانے پر منعقد کی جا رہی ہے بلکہ اس نے تو ایڈوانس میں ملنے والے تین ہزار بھی پکڑ لیے تھے۔

"ابا جی! ماسٹر جی کے سامنے گانا اور بات ہے' اتنے لوگوں کے سامنے گانا دوسری بات۔

"توکیا ساری عمر ماسٹر کو سامنے بٹھا کے گاتی رہے گی۔ جو دیتا خاک نہیں' الٹا ڈیڑھ ہزار ہر مہینہ اڑا کے لے جاتا ہے۔ ایسے چھوٹے موٹے فنکشن کرے گی تو آہستہ آہستہ جھجک دور ہوگی۔"

"لیکن ابا جی!" وہ منمنائی مگر اللہ وسایا نے ایک نہ سنی۔

"بس بڑی ہو گئی تیری من مانی' ایسے فنکشنوں پر بڑے بڑے ہدایت کار اور موسیقار بھی آتے ہیں' اسی طرح تو نظروں میں آئے گی۔ اوئے ادھر آگے آنے کے لیے آپ ہی ہاتھ پیر مارنے پڑتے ہیں۔ کوئی کسی کا پلہ (پلو) نہیں پکڑتا۔ ساری دنیا آزما بیٹھا ہوں اور دیکھ لیا ہے تیرے مامے کو بھی۔ بڑا "ماما" بنا پھرتا ہے۔ کسی کا وڈا بننے کے لیے بہت کج کرنا پڑتا ہے۔ یہ کرما تو چاہتا ہے کرے بھی کج ناں۔۔۔ اور تیرا وڈا بھی بنا رہے' دفع دور۔ تیرا ابا ابھی زندہ ہے۔ سب کج کر سکتا ہے تیری خاطر۔ ملک صاحب بھی ایسے ہی نہیں مان گئے۔ بڑی خاطر' منت' واسطے کرنے پڑے ان کے۔ دراصل موسیقی کے نام پر گانا سننے تو دو چار لوگ ہی آتے ہیں۔ باقیوں کو تو چاہیے "تھڑ تھلی" (افراتفری) مچا دینے والے ڈانس شانس۔ بارہ ڈانس رکھے ہیں انہوں نے تین گھنٹے کے پروگرام میں۔ درمیان میں ڈانسروں کو وقفہ دینے کے لیے چار گانے والیاں بلائی ہیں۔ دو اسٹیج کے مسخرے بھی بلائے ہیں۔ اب یہ تیری ہمت ہے کہ تو اپنے حصے میں آئے دس بارہ منٹ کا کیسے فائدہ اٹھاتی ہے اور خدا کا واسطہ ہے چندیئے' وہ اپنے ماسٹر جی کے سکھائے اشلوک نہ گان بیٹھ جائیں۔ کوئی مشہور پرانا گانا گانا یا۔۔۔ بس کچھ ایسا ہو کہ لوگ اٹھ کے ناچنے لگ جائیں۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اللہ وسایا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی ایک نہ چلنے دے گا اور اسے ہر حال میں اس شو میں پرفارم کرنا پڑے گا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایڈوانس میں ملے تین ہزار وہ اب تک اڑا چکا ہوگا' اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر وہ مزید بولا۔

"یہ لے ہزار روپیہ' کپڑا لتا تو اس میں نیا نہیں آسکتا۔ ابھی جائے تو اتنی جلدی سل کر تیار کیسے ہو۔ تیری مامی کے پاس بڑی وریا (عمدہ) ساڑھیاں ہیں لیکن اس کے پاس تو جانا نہیں میں نہیں چاہتا کہ پہلے سے ادھر ساروں کو پتا چل جائے تیرے پروگرام کرنے کا اور وہ کوئی دپھڑ (مسئلہ) ڈال دیں۔ جب ہر طرف تیری واہ واہ ہوگی تو آپوں آپ آئیں گے مٹھائیاں لے کر۔ خیر میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔ کرامت مسیح سے بات کرتا ہوں' اس کے پاس کوئی نہ کوئی انتظام ہوگا۔"

کرامت مسیح ان کے محلے کا درزی تھا مگر دکان اس کی بڑے بازار میں تھی' جہاں کی نامی گرامی عورتیں اپنے "ڈیوٹی" میں پہننے کے لیے بھڑکیلے ڈریسز اسی سے سلواتیں' وہ انڈیا کی ہر ہیروئن کے لباس کو جوں کا توں اتار لیا کرتا تھا۔ اللہ وسایا سے اس کی پرانی یاری تھی۔

"ابا جی! میں نے فنکشن میں گانا گانے جانا ہے یا۔۔۔" وہ تنگ کر بولی۔

"تو ریڈیو پہ گانے نہیں جارہی۔ گانا تو بعد میں گائے گی' پہلے تو تیری شکل ہی نظر آئے گی نا سامنے بیٹھے ہوؤں کو۔ اس طرح اٹھ کے اسٹیج پہ چلی گئی تو گندے ٹماٹر اور انڈے ہی پڑیں گے۔ آخر ٹیپ ٹاپ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"میں گلوکارہ ہوں ابا جی! جسے میرا گانا پسند آئے گا' وہ ان کپڑوں اور بالوں کے ساتھ بھی آسکتا ہے اور جو۔۔۔"

"زیادہ سیانی بننے کی کوشش نہ کر۔" اللہ وسایا نے حسب عادت بات کاٹی۔

"تو کیا بہت بڑی گلوکارہ ہے؟ اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا۔ دیکھا نہیں' اعلیٰ سے اعلیٰ گلوکارہ اور پائے کی فنکارہ بھی ہیروں سے لدے بغیر اور مہنگی ساڑھیاں پہنے بغیر گانا نہیں گاتی۔ تو ہورے کسی زمانے کی پیداوار ہے۔ چل چل بوہتے نخرے نہ کر۔ جیسے کہہ رہا ہوں' ویسا کر۔ یہ سب تیرے ہی بھلے کو ہے۔" وہ آرڈر دیتے ہوئے باہر نکلنے لگا کہ پیچھے سے دعا کی ہچکچاتی ہوئی سی آواز آئی۔

"وہ ابا جی۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر۔۔۔ اگر ماما جی۔۔۔ اور شہزادی جی کا کہنا ہے کہ پرائیویٹ فنکشن میں میرا

پرفارم کرنا مناسب نہیں تو ضرور کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی جو وہ منع کر رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ ایک بار پھر ان سے بات کرلیں۔"

"پرائیویٹ فنکشن ہے' کوئی موت کا کنواں تو نہیں۔ ایسے ہی ان باپ بیٹے کو ہر جگہ اپنی چلانے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ وڈے پردھان بنے پھرتے ہیں۔ بتا دوں گا انہیں کہ اللہ وسایا بھی کوئی خالی ہاتھ نہیں ہے جس کے پاس تیرے جیسی گنوں والی دھی ہو' اسے پتر کا کیا گھاٹا' (کمی)۔

☼ ☼ ☼

"یار کرامت! تجھ سے ایک کام پڑ گیا ہے۔" اس نے گلی میں واقع کرامت مسیح کی تنگ سی دکان میں جاتے ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

"بغیر کام کے تو نے آج تک کسی کو اپنی شکل دکھائی ہے۔" وہ بھی اس کا پرانا یار تھا' دانت کاٹنے کی دوستی تھی' اس کی ہر عادت سے واقف تھا۔

"چل کرلے مخول تو بھی۔ اپنی تو زندگی ہی مخول بن کے رہ گئی ہے۔ ساری عمران ناچنے والوں کی تھا تھیا کے پیچھے طبلے پیٹے ہیں' آج یہ ڈیک لگا لگا کر ٹھمکے مارتی ہیں اور ہمارے رزق کا ستیاناس کر کے خود ان بازاروں سے نکل کر اب کوٹھی والیاں کہلاتی ہیں۔ ہاں بھئی! طبلچی' سارنگی نواز' بانسری نواز ساروں کے خرچے ختم۔ جو کمایا' اپنے بٹوے میں ڈالا' ایسے ہی تو کوٹھے سے کوٹھی تک کا سفر طے ہوتا ہے۔ ہم بے چارے تو رل کے رہ گئے ہیں۔ کیا کریں' جدی پشتی جو کام کیا ہے' اس کے علاوہ آتا بھی تو ککھ نہیں۔ طبلے کے چکنے پنڈے پر پڑنے والے ہاتھ اینٹیں کیسے ڈھوئیں۔ تجھ سے جو کوئی یہ دھاگے' قینچی' مشینیں چھین کر استرا پکڑا دے تو تیرا کیا بنے گا۔ وہی حال میرا ہوا ہے اور کوئی کام آتا نہیں۔ جو آتا ہے اسے کوئی پوچھتا نہیں۔ خیر۔۔۔ اللہ کی ذات بڑی کرماں والی ہے' رنگ والی ہے۔ سو رنگ ہیں میرے سوہنے کی قدرت کے۔ ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ صدقے جاؤں' لکھ واری قربان جاؤں۔۔۔ کیا چانس دیا ہے میری دھی کو اس نے۔ ملک مقبول جو بڑی بڑی گانے والیوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ خود میری ادا کے لیے گھر چل کے آیا۔ اپنے ڈانس پروگرام میں اس کے پورے دو گانے رکھوائے ہیں۔"

"اچھا تو اب وہ اسٹیج پر ڈانس کرے گی۔" وہ اچنبھے سے بولا۔

"پراوقت آنے کا مطلب یہ تو نہیں وسائے کہ تو۔۔۔۔"

"تجھے بولنے کی بڑی کال (جلدی) ہوتی ہے۔ پہلاں پوری بات تو سن لیا کر۔ خیری صلاوہ کیوں ناچے۔ ناچتی تو وہ ہیں جن کے پاس کوئی گن نہ ہو۔ نہ گلا' نہ سر' نہ تان' نہ لے۔۔۔ بس زور زور سے پیر مار لیے یا لک ہلا لیا۔ میری کرماں والی' گناں والی دھی نے پورے نو سالوں تک ریاض کیا ہے۔ کسی ایسے ویسے کی شاگرد نہیں۔ ماسٹر عنایت اللہ کی شاگرد ہے۔ بڑا پکا گلا ہے۔ وہ اسٹیج پر ناچنے نہیں' اپنے فن کا مظاہرہ کرنے جائے گی۔"

"لے بھئی! پھر مبارکاں' لکھ لکھ مبارکاں۔" کرامت مسیح اٹھ کے اس سے بغل گیر ہوا۔

"پر مجھے برا گلا ہے۔ جو تو اتنی بڑی خبر خالی ہاتھ سنانے آگیا۔ نہ کوئی کھوئے والے پیڑے' نہ جلیبی۔۔۔"

"شودا (تنگ دل) میں نہیں کرامت! شودی تو میری تقدیر ہے۔ کھل کے خوش بھی نہیں ہونے دیتی۔ اب بڑی مشکل سے اتنا بڑا پروگرام ملا ہے ادا کو' پر اس کے پاس چج کے کپڑے لیرے بھی نہیں جو وہ پہن کے جائے۔ اپنی بھرجائی کا بھی تجھے چنگی طراں پتا ہے' وہ بہشتن بھی لیروں کی شوقین نہیں تھی کہ ادا ماں کا ہی کوئی پرانا جوڑا پہن لے۔ شیدائن (پاگل) کل سے روئی جارہی ہے کہ فنکشن پر کیا پہنوں۔ میں نے اسے کہا کہ تو فکر نہ کر' میں تیرے چاچے کے پاس جاتا ہوں' وہ ضرور کچھ نہ کچھ مدد کرے گا۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں یار! تیری بھرجائی سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔ پر یار! اس کے کپڑوں میں تو تیری چار لڑکیاں پوری آجائیں اور کاکی تو میری کوئی ہے نہیں۔"

"یہ تو مجھے پہلاں ہی پتا ہے۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ یہ جو اتنے لشکتے لشکتے (چمکدار) جوڑے ٹانگ رکھے ہیں' ان میں سے کوئی سا ایک' تین گھنٹوں کے لیے ادھار دے دو۔"

"ناں یار! ناں' کیوں میری روزی پر لات مارنی ہے۔ یہ ان میڈموں کے "ڈیوٹی" والے کپڑے ہیں۔ خاص آرڈر پر بنواتی ہیں۔ ذرا داغ لگ جائے یا کپڑا پھٹ جائے تو میری تو آگئی ناشامت۔ یہ...... کسی کا لحاظ کرتی ہیں۔" اس نے اپنی میڈموں کی شان میں اعلیٰ نسل کی گالی بکی۔

"یہ تو بندے کی جیبیں خالی کروانا جانتی ہیں صرف...... کوئی ان کا پیسہ خراب کر کے تو دیکھے' زمین آسمان ایک نہ کردیں۔ میری توبہ۔ چلو میں اپنی طرف سے نقصان پورا کر بھی دوں' بازار سے دوجا جوڑا لا کر ویسا ہی سی بھی دوں مگر میری گاہکی تو خراب ہو گئی۔ پھر بندے کا اعتبار نہیں رہتا۔ ویسے بھی ان کے لیے شہر میں بوتیکیں کم تو نہیں۔ آگے پیچھے تو یہ بڑے اونچے درزیوں کے فیشنی کپڑے پہنتی ہیں لیکن تماش بینوں کے سامنے کیا پہننا ہے' یہ فن وہ درزی کیا جانیں۔ یہ تو وہ راز ہے جو ان گلیوں میں پل کر جوان ہونے والے ہی جان سکتے ہیں۔ ان کی مجبوری ہے کہ ڈیوٹی کے بھڑکیلے لہنگے اور گھاگھرے ہم سے سلوانے پڑتے ہیں۔ میں نے تئیس سالوں میں اپنا بڑا نام بنایا ہے۔ آج تک کسی کی طرف سے کوئی لامہ (گلہ) نہیں آیا۔ نہ بھرا' یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تو کپڑا لے آ' میں رات ساری جاگ کے بھی سی دوں گا اور وہ بھی بالکل مفت' اب بتا۔" اس نے صاف جواب دینے کے ساتھ ساتھ پیشکش بھی کردی۔

"اب مجھے کیا پتا کون سا کپڑا لانا ہے' کتنا لانا ہے۔" وہ جھلا کر بولا۔

"میرے پلے اتنے پیسے تو ہیں نہیں کہ بڑھیا جوڑا لا سکوں اور گھٹیا پہن کر ادا فنکشن میں جا لی بڑی اچھی لگے گی' ہے ناں؟ اپنی عزت کی پڑی ہوتی ہے ساروں کو' دوجے کی عزت جائے کھوہ (کنویں) میں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھنے لگا تو کرامت نے اس کا ہاتھ تھام کے بٹھایا۔

"ایک تو یہ عادت نہیں جاتی تیری' گھڑی گھڑی رُس (ناراض) جاتا ہے۔ ساری جوانی تیرا ہاتھ کھینچ کھینچ کے تجھے مناتے گزر گئی۔ بھرجائی نے بڑی عادتیں خراب کی ہوئی تھیں تیری۔ اب بس کر' گزر گیا ویلا تیرے نخروں کا۔ بڈھا ہو کر بھی چوچلے چھڑوں والے۔" اس نے بمشکل اسے دوبارہ بٹھایا

"تو خوش ہو جا ساڈی خیر اے' دیکھتا ہوں کوئی جوڑا۔ مگر یہ خیال رہے کہ صرف چند گھنٹے کے لیے اور بڑی احتیاط سے' بڑے دھیان سے کڑی کو کہنا' کھانے پینے کا کوئی داغ نہ لگے اور نہ ہی خوشبو لگائے۔ یہ بڑی خرانٹ عورتیں ہیں' منٹ میں پتہ لگالیں گی۔"

اسے درازوں میں سے مختلف کپڑے الٹ پلٹ کر نکالتے ہوئے دیکھ کر اللہ وسایا نے کہا۔

"یہ جو اتنے سارے لٹکا رکھے ہیں' ان میں سے کوئی دے دو۔"

"ناں جی' پہلی بات تو یہ کہ تو نے ان لہنگوں کی قمیصوں کو نہیں دیکھا۔ گٹھ گٹھ (بالشت بھر) کی ہیں اور ہیں بھی جالی کی۔ میں کوئی ایسا جوڑا دیکھ رہا ہوں جسے پہن کر تیری بچی فنکارہ لگے' بازاری عورت نہیں اور دوجی بات یہ کہ پتہ نہیں اس فنکشن میں کون کون آرہا ہے۔ یہ نہ ہو جس میڈم کا جوڑا تیری کاکی پہنے وہ بھی اسی شو میں ڈانس کرنے والی ہو۔ میری جان تو آگئی ناں سیاپے میں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے' میڈم نوری کی عمر بھی ہوگئی ہے اس لیے اسٹیج ڈانس تو وہ کرتی نہیں بلکہ شادیوں عقیقوں پہ بھی ناچنے نہیں جاتی۔ کبھی کبھی اپنے آفس میں ضرور ٹائم لگالیتی ہے۔ اس کا قدبت بالکل کڑیوں والا ہی ہے۔ یہ جوڑا لے جا' ہے تو یہ بھی جالی کا مگر اس کے نیچے شمیز بھی ہے۔ واہ جی...... اس کا تو دوپٹہ ہی کوئی دو ہزار کا ہو گا' اتنا باریک کام ہے اس پہ' بس یہ خیال رکھنا' کوئی کھونچ نہ لگ جائے۔ ابھی میں نہیں دے رہا۔ کیا پتہ تیرے گھر کوئی چوہی یا نڈی ٹک جائے' جس دن جانا ہو اس دن لے جانا۔ میڈم نوری ابھی ملتان گئی ہوئی ہے' اپنی نانی کے مرنے پہ چالیسویں سے پہلے آنے والی نہیں۔"

☼ ☼ ☼

"یہ دیکھا ہے آپ نے؟" شہزادے نے ایک انویٹیشن کارڈ لہراتے ہوئے باپ سے پوچھا۔ وہ ابھی کچھ دیر قبل آفس سے آیا تھا۔ ایک تو پہلے ہی کرم الٰہی اس کے وقت سے پہلے آنے پہ ٹھٹک گیا تھا' اس پہ مستزاد اس کا غصہ...... وہ اپنے طور پہ اندازے لگانے لگا کہ آخر وہ کیا وجہ ہو سکتی ہے جس پہ اس قدر گرم ہو رہا ہے۔

"یہ پروموٹر ملک مقبول کی طرف سے مجھ سمیت اس شہر کے پچاس "عزت داروں" کو بھجوایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سات آٹھ سو کی تعداد میں جو لوگ ٹکٹیں خرچ کر کے آئیں گے وہ الگ اور کچھ پتہ ہے یہ کس قسم کا دعوت نامہ ہے۔ محفل موسیقی کے نام پہ جدید طرز کے پروگرام سے سجائی گئی رات کا دعوت نامہ۔ جس میں چار چاند لگانے والی بازاری عورتوں کی لسٹ میں آپ کی لاڈلی اور ہونہار بھانجی کا نام بھی جگمگا رہا ہے۔ یہ دیکھیں فہرست میں...... ساتویں نمبر پہ۔" اس نے کارڈ باپ کے سامنے پھینکا اور پیر کی ٹھوکر سے چیئر کو آگے کی طرف گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"ہائے ہائے خیری صلا میرا پتر اتنے غصے میں لے دودھ سوڈا پی" بالو اس کے دھاڑنے پہ جلدی سے دودھ سوڈے کا جگ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ شہزادے نے ہاتھ سے اس کا پیش کیا گلاس پرے کیا۔ کرم الٰہی اب تک کارڈ ہاتھ میں لیے اس کی چکنی سنہری سطح پہ بنے خوب صورت نقش و نگار اور وہ ناقابل فہم خطوط دیکھ رہا تھا' جنہیں پڑھنے کا مشورہ اس کے اکلوتے بیٹے نے ابھی ابھی اسے دیا تھا...... یہ یکسر فراموش کرتے ہوئے کہ اس کا باپ ایک انگوٹھا چھاپ ہے۔

"سنا تھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اب یقین بھی آگیا۔ آیا تھا اس دن آپ کا جگری یار' خود کو اے ڈبلیو چوہدری بنا کر۔" وہ زہر خند لہجے میں پھر سے بولنا شروع ہو گیا۔ کرم الٰہی نے کارڈ کو اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"اتنا سمجھایا اسے' دھمکی بھی دی...... رشوت بھی دی۔ سوچا کہ ہزار دو ہزار سے منہ بند کر لے گا۔ یہاں تک کہا کہ ہر ماہ آکر تین ہزار لے جایا کرو مگر یہ ہٹ چھوڑ دو۔ لیکن جن کے منہ کو حرام کی لگ چکی ہو' انہیں حلال کی راس نہیں آتی۔"

"حرام...... حلال۔" کرم الٰہی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا...... اسے...... اپنے اکلوتے گبرو بیٹے کو...... جس کی تند خوئی سے خائف ہو کے وہ عموماً اس کے سامنے خاموش ہی رہا کرتا تاکہ اس کی بزرگی کا کچھ تو بھرم رہے اور یہ بھرم جتنا بھی قائم رہ سکا تھا' کرم الٰہی کی اس خاموشی کی وجہ سے ہی تھا ورنہ شہزادے نے کبھی اس کا لحاظ باقی نہ رکھا تھا۔ اب بھی اپنے اندر ابھرتے سوالوں کو وہ خاموشی کی ایڑیوں سے روند روند کر کچل رہا تھا۔ ورنہ دل سے تو وہ بڑی تفصیل سے یہ جاننے کا خواہش مند تھا کہ اس کے ہونہار سپوت کے نزدیک حرام اور حلال کا معیار کیا تھا۔ اور اس نے جن لقموں پہ اسے پال پوس کے اس قابل کیا ہے' آیا وہ حرام کے زمرے میں آتے ہیں یا انہیں حلال کا درجہ حاصل ہے اور جس روپے سے وہ یہ عیش انہیں کرا رہا ہے وہ حلال کی بابرکت روزی ہے یا حرام کی ہوائی روزی۔

"شہر کی ٹاپ کی بازاری عورتوں کی لسٹ میں آج آپ کی بھانجی کا نام جگمگا رہا ہے' مبارکباد پیش کروں؟" باپ کو سر نیہوڑائے گم صم دیکھ کر اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بس بھی کر شہزادے۔ پیو کو کیوں سنا رہا ہے؟ دیکھتا نہیں اسے تو آپ چپ لگ گئی ہے تجھ سے یہ خبر سنتے ہی۔ وہ کب چاہتا تھا کہ دعا یہ کام کرے۔ آخر تیری پھوپھی مرتے ہوئے کرمے سے یہ قسم لے کر گئی تھی کہ وہ دعا کو دسائے کے ہتھے نہیں چڑھنے دے گا۔ اس کی تو ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اپنی بہن سے کیے وعدے کی خاطر دسائے سے بنا کر رکھے۔ اس کی ہر پیڑی چنگی (بری بھلی) برداشت کی کہ پتھے دماغ کا بندہ ہے کسی دن دعا کو لے کر راتوں رات غائب نہ ہو جائے۔ ابھی پرسوں دو گھنٹے اس کے ساتھ مغزماری کی کہ شہزادے کو پسند نہیں اس کا گانا یا اداکاری کرنا اس لیے سیدھے سیدھے کڑی کا نکاح کسی شریف بندے سے پڑھا کے اسے گھربار کا کر۔ پر وہ وسایا ہی کیا جو کسی کی بات مان لے۔"

"تو وہ یہاں بھی آیا تھا۔۔۔ پرسوں اور مجھ سے ذکر تک نہیں کیا گیا۔" وہ نئے سرے سے مشتعل ہو گیا۔ کرم الٰہی نے بالو کو گھورا' جسے سختی سے اسی دن تنبیہہ کر دی تھی کہ اس کی آمد کی ہوا تک شہزاد کو لگنے نہ پائے۔

"ہاں۔۔۔ وہ اچھا نہیں بتایا۔۔۔ ہاں یاد نہیں رہا ہو گا۔۔۔ کی کراں' عمر بھی تو ہو گئی ہے۔" سٹپٹا کر اس نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

"خیر کرے نے بھی اس کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی خراب کی۔" بالو نے بیٹے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"کہہ رہا تھا شہزادے سے کہہ کر اسے اس ڈرامے میں رکھوا لو جس پہ آج کل کام ہو رہا ہے۔ میں نے کہا' شہزادہ ساہ نہ پی لے دعا کا' اگر اس نے ٹی وی پہ شکل بھی دکھائی تو۔ مگر یہ ہے ہی بے غیرت انسان۔ نہ دھمکی میں آتا ہے نہ پیار سے مانتا ہے۔ چھمال وچاری ساری حیاتی اس کے ساتھ خوار ہوتی رہی' آخر کلپتی مرگئی۔ ہم تم کس گنتی میں آتے ہیں۔ بتیرا سر کھپائی کی کرے نے اس کے ساتھ۔"

"سر کھپائی کرنے کی بجائے اگر اسے رکھ کے دو لگائی ہوتیں تو اس کا دماغ ٹھکانے آ جاتا۔"

"شہزادے۔" بالآخر کرم الٰہی اپنی کھڑکھڑاتی بلغم زدہ آواز میں چلا اٹھا۔

"کسے دو لگاتا؟ وسائے کو؟ تیرے پھوپھڑ کو؟ اوئے بے ہدایتا وہ میری بہن کا گھر والا ہے' میرے پیو کا جوائی' کوئی ملک ہو چاہے کمی ہو' جوائیوں کی عزت سارے ہی اپنی اپنی اوقات کے مطابق کرتے ہیں۔ وہ چاہے کتنا بھی بدذات کیوں نہ ہو' میں اس کا لحاظ کرنے پہ مجبور ہوں۔ ٹھیک ہے وہ عزت کے لائق نہیں' مگر بے عزتی کرانے والا بھی نہیں ہے اس کا رشتہ۔"

"ٹھیک ہے پھر آپ کرتے رہیں لحاظ' اور چھوٹ دیتے رہیں اسے' ایک دن آئے گا جب بات اسٹیج سے نکل کر فلم تک پہنچے گی۔ آخر سوسائٹی میں میری بھی کوئی عزت ہے۔ آج کوئی نہیں جانتا' کل کو ساری دنیا جانے گی کہ یہ ایکٹریس' یہ سنگر میری کزن ہے اور اس شعبے سے تعلق رکھنے والی عورتیں گلا پھاڑ پھاڑ کے ہی کیوں نہ چلائیں کہ وہ شریف خاندان سے ہیں' لوگ یقین نہیں کرتے' الٹا نداق اڑاتے ہیں۔ آپ لوگ چاہتے ہیں میں چپ چاپ اپنا تماشا بننے دوں۔"

"تو ہم کر کیا سکتے ہیں شہزادے۔ وہ اس کی بیٹی ہے۔ وہ کم بخت اس کا والی وارث مختار ہے۔"

"اگر وہ اس کا سب کچھ ہے تو تب ہی اس سے اور اس لڑکی سے پیچھا چھڑا لینا تھا جب گیارہ سال پہلے پھوپھی مری تھی۔ اگر ہمارے سارے رشتے صرف پھوپھی کے دم سے تھے اور اب اس کے بعد ہمارا اس پہ کوئی حق نہیں رہا تو کیا ضرورت تھی اتنے تعلق واسطے کی۔ کم از کم اس ذلت اور شرمندگی کے حصے دار تو نہ بنتے' آرام سے اسے پہچاننے سے انکار کر دیتے۔"

"خون کہیں بھی ہو' پکار اٹھتا ہے جھلیا۔"

"میں نہیں مانتا ایسی پرانی کہاوتوں کو' رشتہ وہ جس کا کوئی حق بنتا ہو۔ اگر اس خون کے رشتے کے حوالے سے میں دعا کو اس کام سے نہیں روک سکتا تو پھر یہ رشتہ کمزور ہی ہوا۔"

"کیسے سمجھاؤں تجھے شہزادے' کسی کسی رشتے کا حق ساروں سے بڑھ کے ہوتا ہے۔ وہ باپ ہے اس کا۔ ہم صرف منت ترلا ہی کر سکتے ہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ ہاں ایک طریقہ ہے۔۔۔" بات کرتے کرتے اچانک بالو کو خیال آیا کہ کیوں نہ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ شہزادے سے وہ بات کر لے' جو بارہا اس کے دل میں آئی مگر زبان تک لانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"اگر دعا کا رشتہ اس گھر سے اتنا پکا ہو جائے کہ اس کا باپ بھی دخل اندازی کرنے کی جرات نہ کر سکے۔" اتنا کہہ کر وہ رکی اور باری باری دونوں باپ بیٹے کے چہروں کی جانب دیکھا۔

"تو دعا سے ویاہ کیوں نہیں کر لیتا۔" اس نے شہزاد کے نزدیک جیسے بم ہی پھوڑ ڈالا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ مارے طیش کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اماں' کچھ پتہ بھی ہے کہ کیا بات کر رہی ہیں آپ اور کس سے کر رہی ہیں؟"

"اپنے سوہنے پتر سے اس کا گھر بسانے کی بات کر رہی ہوں۔ آخر اور کب تک ایسے پھرتا رہے گا' میں تو کب سے اس آس میں جی رہی ہوں کہ میرے پتر کے چن جیسے ماتھے پہ کب خیر کا سہرا بندھے گا' کب کوئی کرموں والی اس ویہڑے میں اترے گی' کب میں پوترے پوتریوں کو گود میں ہلا دے دوں گی۔ اتنے سالوں سے تو لارے میں رکھتا آ رہا ہے' کبھی کام کا بہانہ تھا' پھر کہا کہ اپنا گھر بنانا ہے' پھر کاروبار نیا نیا تھا اس کے لیے تجھے زیادہ وقت چاہیے تھا' اب اور کتنے بہانے بنائے گا۔"

"درست کہہ رہی ہے تیری ماں۔ شہزادے یہی صحیح ویلا ہے۔ خیر سے تیرا کام جم گیا ہے' بسم اللہ کر کے ہاں کر دے۔ اس دسمبر میں تو بتیس سال کا ہو جائے گا۔" کرم الٰہی جس نے کبھی خواب میں بھی دعا کے مخدوش مستقبل کے لیے ایسا کوئی حل نہیں سوچا تھا' بلقیس کے آئیڈیے پہ پرجوش ہو کے بیٹے کو صلاح دینے لگا۔

"ہائے ہائے' تسی تے بالکل ای ناں۔۔۔۔" اس نے ناگواری سے ہاتھ جھلاتے ہوئے شوہر کو ٹوکا۔

"ایسے منہ بھر کے سال گنتے ہیں بھلا' شالا جوانیاں مانے میرا پتر۔"

ان کی نوک جھونک سے یکسر لاتعلق شہزاد اپنا سر دونوں ہاتھوں پہ گرائے خود پہ ضبط کی کڑی حدیں لگاتا ایک طوفان سے گزر رہا تھا۔

"بول ناں شہزادے' یہ صحیح ہے ناں؟" اس نے بیٹے کو شانے سے تھام کے ہلایا۔ جواباً شہزادے نے سر اٹھا کے سرد نگاہوں سے ماں کو دیکھا جو بڑے اشتیاق سے اس کے جواب کی منتظر تھی۔ اس نے لبوں کو سختی سے بھینچ لیا مبادا سخت غصے کی حالت میں وہ کچھ ایسا ویسا نہ بک دے' کرم الٰہی نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا۔

"جھلی نہ بنا کر بالو۔ یہ کوئی کھیڈ (کھیل) ہے کہ وہ جھٹ سے تجھے ہاں یا ناں میں جواب دے۔ ساری حیاتی کا سوال ہوتا ہے۔ چنگی طرح سوچنے دے اسے۔ ہاں شہزادے کوئی جلدی نہیں' تو ہر طرح سے سوچ سمجھ لے۔" اس نے بیٹے کو پچکارا۔

"سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔" شہزادے نے پل بھر میں اس قصے کو تمام کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کی خاموشی صرف اس پیشکش کے نتیجے میں اس کے اندر اٹھنے والے غضب ناک ابال کو دبانے کی وجہ سے تھی۔ لیکن وہ مزید خاموش رہ کے اس معاملے کو ہوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ سوچنے کا وقت دے کر وہ اس بات کو بار بار چھیڑ سکتے تھے اور وہ بار بار اس ذہنی اذیت سے گزر سکتا تھا۔

"پتہ نہیں فارغ بیٹھے کیسے فضول قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں آپ کے دماغوں میں' دعا جائے بھاڑ میں میری بلا سے وہ جو مرضی کرتی پھرے۔ بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا میں نے صرف یہ چاہا تھا کہ ایک معصوم کم عمر لڑکی اس مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ نہ ہی ڈالے تو بہتر ہے' اس شعبے میں لڑکیوں کے لیے اور وہ بھی ایسی لڑکیوں کے لیے جن کا فیملی بیک گراؤنڈ زیادہ مضبوط نہ ہو' نری ذلالت ہے لوگ انہیں مفت کا مال سمجھتے ہیں۔ لیکن میری ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں آپ۔ جہاں تک اس کی شادی کا سوال ہے تو یہ ٹھیک ہے کہ اسے اس کے باپ کے ارادوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی شادی کر دینا ہی بہتر ہے لیکن کیا زمانے کے سارے لڑکے مر کھپ گئے ہیں۔ وہ آپ کی عزیز از جاں برادری کہاں گئی' ڈھونڈ نکالیں اس میں سے کوئی' نہیں تو یہ فریضہ بھی میں انجام دینے کو تیار ہوں۔ دو دن کے اندر اندر کوئی معقول شریف بندہ ڈھونڈ کر سامنے کھڑا کر دوں گا۔ شادی کا سارا خرچہ بھی سر لے لیتا ہوں کتنا چاہیے' دو لاکھ' تین لاکھ' پانچ لاکھ۔۔۔ ایسی شان سے تو آپ کا قابل احترام بہنوئی اپنی بیٹی کو رخصت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر بیٹی بیاہتے ہوئے اتنی ہی جان نکلتی ہے اس کی تو ہر مہینے پانچ ہزار اس کے نام بھیج دیا کروں گا۔ مدد صرف اس حد تک کی جا سکتی ہے۔ میرا دماغ نہیں خراب کہ کسی کی زندگی سنوارتے سنوارتے اپنی خراب کر لوں۔"

"نہ۔۔۔ نہ سوہنیا نہ برے بول نہ نکال۔" بالو لرز گئی۔

"بدشگنوں کی باتیں ہو رہی ہیں' تو کیوں ایسی بات کر رہا ہے۔ میرے پتر کی زندگی تو اللہ پھولوں سے زیادہ ہلکی اور سونے سے زیادہ بھاری کرے۔"

"ہونہہ۔ صرف دعائیں۔۔۔ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے' نیت بھی تو اچھی ہونی چاہیے۔ آج دیکھ لیا میں نے کہ جن ماں باپ کے سکھ کی خاطر میں اتنی محنت کرتا ہوں وہ میرے لیے "کتنا اچھا" سوچتے ہیں۔ مجھے برباد کرنے' میری زندگی کو شرمناک بنانے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔"

"آخر ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔ ایک بات ہی تو کی ہے' تجھے نہیں پسند تو نہ سہی۔ زبردستی تو تیرے ساتھ ہم نے تب بھی نہیں کی تھی جب تو انگلی تھام کے چلا کرتا تھا اب تو سیانا ہو گیا ہے۔ تیری مرضی کے خلاف تو میں دعا کو "نوں" (بہو) بنا کے نہیں لا سکتی۔ پھر اتنا تتا گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لیکن بات کرنے سے پہلے کچھ سوچنا تو تھا۔ ایک نظر دیکھنا تو تھا۔ کہاں وہ' کہاں میں۔ کتنے سال ہو گئے سر پٹختے پٹختے' دن رات ایک کر دیا محنت میں' صرف اس لیے کہ ایک پہچان بنا سکوں۔ کیا یہ سب اس دن کے لیے کیا تھا کہ میری ماں مجھے ایک گانے والی۔۔۔ ایک طبلچی کی بیٹی سے شادی کرنے کا مشورہ دے۔" اس کا طیش کم نہ ہو رہا تھا۔

"اور تو۔۔۔ تو کیا ہے؟" کرم الٰہی جتنا ہو سکتا تھا' چپ ہی رہا کرتا تھا مگر بات تب اس کے بس سے باہر ہو جایا کرتی تھی۔ جب وہ اس کی ذات برادری پہ رکیک جملے کسا کرتا تھا' وہ اپنی اور اپنے کسب کی بے عزتی برداشت نہ کر سکتا

"کیا ہے تو' ایک بھانڈ کی اولاد' میراثی کا بچہ۔" وہ چلایا۔

اس کی پسلیاں کھڑکھڑا اٹھیں۔ بالو اس کی سانس اکھڑنے کے خدشے سے اس کی کمر سہلاتے ہوئے خاموش رہنے کا کہنے لگی۔

"اور یہ تیری ماں۔۔۔ یہ بھی گانے والی ہے۔ تیری جنت بھی اسی کیچڑ میں چھپی ہوئی ہے۔ جس کے چھینٹے تک تو دامن پہ لگنے نہیں دیتا۔"

وہ کہتا رہا۔ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ شہزاد زور سے دروازے کو بند کرتا' دھپ دھپ کرتے قدموں کے ساتھ باہر نکل چکا ہے۔

"بھانڈ کی اولاد۔۔۔ میراثی کا بچہ۔"

یہ نوکیلی نیزوں جیسی آواز بند دروازے کے پار سے بھی اس کے کانوں کے پردے چیرے دے رہی تھی۔ اس نے دونوں ہتھیلیاں کانوں پہ جما کے تکیے پہ سر پٹخا۔

"بھانڈ کا بچہ۔۔۔ میراثی۔۔۔"

آوازیں مدھم بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئیں۔

"چھا جی۔۔۔"

ایک نرم سی۔۔۔ معصوم سی آواز پہ وہ سن ہو گیا۔ اس کے سماعتوں نے برسوں بعد اس لفظ سے شناسائی حاصل کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے سننا چاہا۔ لیکن اب سناٹا تھا۔۔۔ ایک مہیب سناٹا۔

☼ ☼ ☼

بہت عجیب ہے روایت میرے بزرگوں کی
کہ پگڑیوں کو سروں سے عزیز رکھتے ہیں

صاحبزادہ **عمیص** نے سرد آہ بھرتے ہوئے موتیا کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑا۔ موتیا اس کی گود سے ننھے اقدس کو لیتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی ساری توجہ اقدس کی نئی ڈرانئینگ کی جانب تھی۔

"خیریت دوست' آج میرے شعر کے جواب میں شعر نشر نہیں کیا؟"

"ضروری تو نہیں' ہر بار تمہارے کہے الفاظ میرے اندر تک اتریں۔"

"اوہو۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔" وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"یعنی کہ۔۔۔ ناراضگی۔۔۔ بڑے دنوں بعد یہ بخار چڑھا ہے تمہیں۔ مگر پتہ تو چلے کہ ناراضگی ہے کس سلسلے میں؟"

"نہیں ناراض نہیں صرف غصہ ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"چلو یہی بتا دو کہ یہ غصہ ہے کس بات پر؟"

"تم پر۔" اس نے شانے اچکائے۔

"لیکن آج سے پہلے تو کبھی یہ ابر کرم مجھ پہ نہیں برسا۔" وہ ہنس پڑا۔

"آج سے پہلے تم نے اس قدر اعلیٰ درجے کی بےوقوفی بھی تو نہیں فرمائی۔"

"گویا کہ اس سے پہلے میں انتہائی حقیر اور ادنیٰ قسم کی بےوقوفیاں کرتا رہا' اسی لیے تم نے نوٹس نہ لیا۔" اس نے کہتے کہتے ذرا سا رک کر موتیا کو دیکھا جو اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

"اور اب جب میں اعلیٰ درجے کی ہائی فائی حماقتوں پہ اتر آیا ہوں تو تم خوفزدہ ہو گئی ہو' تمہیں غصہ آ رہا ہے کہ میں تمہاری برابری پہ کیسے آ گیا۔" اس کے تجزیے پہ سر ہلاتی موتیا ایک دم ٹھٹک گئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا' ڈھائی کلو کی کھوپڑی ہل چکی تھی۔ وہ منہ پھاڑ کر ہنستے **عمیص** کو گھورنے لگی۔

"یار دوستوں میں کیسی مقابلہ بازی۔ احمق اعظم کا خطاب تم بصد شوق اپنے پاس رکھو۔"

"مذاق میں مت اڑاؤ۔ میں سیریس ہوں۔"

"میں بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ تمہیں تمہارا ٹائٹل لوٹا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' تمہیں میری بات نہیں سننا تو مت سنو۔" وہ اقدس کو پھر سے **عمیص** کی گود میں منتقل کرتے ہوئے سوچے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھنے لگی تو **عمیص** کو اپنی جون میں واپس آنا ہی پڑا۔

"کہاں جا رہی ہو؟۔۔۔ کمال ہے یار' ایک تم ہی تو ہو جس کے ساتھ چار ہلکی پھلکی باتیں کر لیتا ہوں ورنہ مذاق کرنے کو کس کم بخت کا دل کرتا ہے۔ زندگی خود ایک مذاق بن کے رہ گئی ہے۔ اب کیا خود اپنا دل بھی نہ بہلاؤں؟" اس نے ہاتھ سے پکڑ کے اسے پھر سے اپنے برابر بٹھایا۔

"اچھا اب بتاؤ' کیا کر دیا ہے میں نے جو تم اتنا بگڑ رہی ہو؟"

"تمہیں میں جس بات سے خبردار کرتی آئی ہوں' جس چیز سے بچنے کا کہتی رہی ہوں' تم نے پھر سے وہی کام کیا ہے۔ کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ گل مہر صرف اپنے مطلب کے لیے تمہیں استعمال کرتی ہے اور تم ہو کہ خوشی خوشی بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہو۔ بعد میں بھی وہ تمہاری واقف بنی ہے؟"

"اچھا تم اس بات کا ذکر کر رہی ہو۔" وہ سمجھ گیا کہ موتیا کو گل مہر کے سلسلے میں اس کی حمایت کرنا برا لگا ہے۔

"دیکھو موتیا' میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ تمہارے اندر جو دل ہے وہ سب کو خوش رکھنا چاہتا ہے' سب کو "اچھا" دیکھنا چاہتا ہے۔ خواہش بری نہیں۔۔۔ البتہ ناممکن یا یوں کہہ لو۔ ناقابل عمل ضرور ہے۔ تمہیں گل کے ارادوں سے اور کچھ مطلب ہو نہ ہو' صرف یہ خدشہ ہے کہ اس کی جاب کے ذکر سے گھر کے ماحول میں تلخی آئے گی' چچا حضور کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ایسا نہ کر کے خود اس کے دل پہ کیا گزرے گا۔ اس کی خواہش کوئی ناجائز بھی نہیں۔"

"ایسا ہی ہے تو وہ خود کیوں نہیں یہ معرکہ انجام دے لیتی۔ تمہیں کیوں آگے کر رہی ہے۔ تم کیا بھول گئے' اس کا بچپن سے یہی وطیرہ ہے۔ ہمیشہ تمہیں یا مجھے آگے کر کے اپنا مقصد بھی حاصل کر لیتی تھی' ضد بھی منوا لیتی تھی اور معصوم بھی بن جایا کرتی تھی۔ ہم دونوں البتہ ضدی اور ہٹ دھرم مشہور ہو گئے۔ مجھے تو اب عقل آ گئی ہے' اس لیے اس کی کسی چال میں نہیں آتی لیکن تم وہی کے وہی ہو۔ اب بھی اس کے ذرا سے آنسو بھر لانے پہ سب کرنے کو تیار ہو جاتے ہو۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کی ضد پوری ہو یا نہ ہو تمہارے اور ابا حضور کے تعلقات میں بگاڑ اور

تلخی پیدا ہو جائے گی۔"

"اس کا اندازہ تو مجھے ہے لیکن صرف اس ڈر سے میں گل کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا اور پھر اس نے مجھ سے بالکل نہیں کہا کہ میں اس سلسلے میں چچا حضور سے بات کروں' وہ یہ کام خود کر لے گی۔ میں تو صرف اس کی ہمت بندھا رہا ہوں۔ ہاں وقت پڑنے پہ کھل کے مدد بھی کر سکتا ہوں۔"

"تمہارا ابھی تو تین سال سے کبھی معاملہ پھنسا ہوا ہے۔ اسے تو کبھی توفیق نہیں ہوئی' مدد کرنا تو در کنار کبھی تسلی حمایت کے دو بول کہنے کی۔ الٹا اس نے ہمیشہ تمہاری دل شکنی کی ہے' دل آزاری کی ہے۔"

"دل شکنی۔ دل آزاری۔۔۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

"اس کا دل ہے' جو مرضی کرے۔" یہ فقرہ اس نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ مگر حرف حرف آنکھوں میں روشن ہو گیا جسے پڑھتے ہی موتیا ہارمان کے چپ کر گئی۔

"جب کوئی خود ہی اپنا وجود کسی کے ہاتھ میں کھلونا بن کر سونپنے پہ تیار ہو تو۔۔۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"تو ابھی تک تیار نہیں ہوئی کڑیے۔" اللہ وسائے نے تیسری بار کمرے میں جھانکا اور اسے اسی حالت میں پلنگ پہ ایک ٹانگ موڑ کے اور دوسری نیچے لٹکا کر بیٹھے دیکھ کر جھلا کے کہا۔

"بس۔ ابھی ہو جاتی ہوں۔۔۔ اباجی۔" دعا نے بمشکل یہ چند الفاظ ادا کیے۔ اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی جیسے اب ایک قدم بھی اور اٹھانا محال ہو مگر چلنا پڑے۔۔۔ دور تلک۔

"شاوا۔ چھیتی ہو جا۔ ملک صاحب گڈی بھیج رہے ہیں۔ پورے آٹھ بجے گڈی آ جائے گی۔ سات تو تو نے منجی توڑتے توڑتے بجا دیے ہیں۔ اٹھ جا اب۔" وہ سختی سے تاکید کر گیا۔

دعا نے گہری سانس بھر کے سامنے پھیلے ہوئے اس مانگے کے جوڑے کو دیکھا جو نجانے کس طوائف کی گاڑھی محنت کی کمائی سے تیار ہوا تھا اور اس کے بدن کی زینت بننے والا تھا۔ سیاہ جالی کی تنگ اور مختصر سی قمیص جس پہ سفید نگینے اور کہیں کہیں چاندی کی تاریں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ سلک کی ہاتھوں سی پھسلتی نرم جھاگ سی سیاہ شلوار اور شمیز' شلوار کے پائنچے چست اور نگینوں سے سجے ہوئے تھے۔ بڑا سا جالی کا سیاہ دوپٹہ جو چاند کے تاروں' روپہلے دبکے اور سفید نگینوں سے بری طرح اٹا پڑا تھا۔ لباس تو اس نے پہن لیا مگر دوپٹہ شانے پہ پھیلاتے ہی اسے سنبھالنے کے خیال سے گھبرانے لگی۔ وہ وزنی کامدار دوپٹہ دوبارہ سے بستر پہ پھیلا کر اس نے اپنے ہلکے گیلے بال پنکھے کے نیچے کھڑے ہو کے سلجھائے۔ سیدھے گھنے چمکدار بال اس نے یونہی کھلے چھوڑ دیے یوں بھی اسے سوائے سیدھی چٹیا کے اور کسی طرح کے بال بنانے آتے بھی نہ تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگا کر اس نے گلے میں سفید موتیوں والا وہ ہار پہنا جو کل اباجی کے ساتھ جا کر انار کلی سے خریدا تھا' اسی کے ساتھ کے جھمکے پہن کے وہ تیار ہو گئی۔

"دوئی' تو تو بالکل پہچانی نہیں جا رہی۔"

دوپٹہ اٹھا کے شانے پہ ڈالتے ہوئے وہ باہر نکلنے کو پلٹ ہی رہی تھی کہ اس فسوں خیز آواز پہ کرنٹ کھا کے پلٹی۔ یہ آواز برسوں کی مسافت طے کر کے آج پھر اس تک پہنچی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کے چاروں طرف دیکھا۔ کہیں کوئی نہ تھا۔ سالخوردہ آئینے کے مدھم سطح پہ اس کا عکس روشن تھا۔

"چھاجی۔" اس کے لب نامحسوس سی سرگوشی کر کے رہ گئے۔

● ● ●

"چھاجی!"

وہ وہیں تھمی رہ گئی اور نجانے کب تک بت بنی اس ایک بازگشت کے سحر میں گرفتار رہتی کہ اللہ وسایا کی آواز نے اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ باہر ملک مقبول کی گاڑی آ چکی تھی۔ وہ خود کو گھسیٹتی باہر نکل گئی۔

اتنی آرام دہ سواری میں بیٹھنے کا اس کا تجربہ کم کم ہی تھا۔ وہ گھر سے کم ہی باہر نکلا کرتی۔ اگر کبھی نکلنا بھی ہوتا تو سواں چھوٹی لوکل ویگنیں ہی نصیب میں لکھی تھیں لیکن اس تجربے کو بھی وہ کھل کے محسوس نہ کر سکتی تھی۔ سماعتوں میں ابھی تک اس ایک لفظ کی تکرار ہو رہی تھی۔ جیسے یہ لفظ اسے پکار رہے ہوں۔ کھینچ رہے ہوں۔ کہیں دور لے جانے کے لیے۔۔۔

بہت دور۔۔۔

جب وہ ہوتی تھی اور "چھاجی!"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا خوابیدہ ذہن دھیرے دھیرے گزرے سالوں کی گرد ہٹاتا ان رستوں پر دوبارہ سفر کرنے لگا جن پر وہ کب کی گزر آئی تھی۔ اس نے ایک نظر سامنے دیکھا۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا اللہ وسایا بڑے جوش سے نجانے کس موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ اسے لب ہلتے اور ہاتھ اٹھتے نظر آ رہے تھے مگر سماعتوں پر تو فی الوقت ایک ہی گونج کا راج تھا۔ اس نے گردن موڑ کر شیشے کے اس پار دیکھنا چاہا۔۔۔ کئی متحرک سی تصویریں اوپر تلے گزرتی نظر آئیں مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ کسی منظر کو پہچان نہ سکی۔ پہچان کے سارے ذائقے ایک ہی منظر کو چکھ کر سیر ہو چکے تھے۔ اس نے ہار کر سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ایک دھندلا سا منظر ذہن کے پردے پر دھیرے دھیرے ابھرنے لگا۔

ایک چار پانچ سال کی بچی سراسیمہ انداز میں بھاگتی ہوئی اپنے گھر سے نکلی اور اونچی آواز میں رونے کی کوشش کرتی ہوئی گلی میں سرپٹ بھاگنے لگی۔ وہ پورا منہ کھول کر رونا چاہتی تھی مگر اس کی آواز نہ نکل پا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے گھر کے اندر اس کے ابا کے ہاتھ میں اس کی اماں کی نہیں بلکہ اس کی اپنی گردن دبی ہو۔ بھاگتے بھاگتے اسے ٹھوکر لگتی ہے' اوندھے منہ کیچڑ میں گرتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر ننگا پیر کیچڑ سے لت پت ہونے کی وجہ سے پھر پھسل جاتا ہے اور وہ جو ذرا سی اٹھ چکی ہوتی ہے پھر منہ کے بل نیچے جا گرتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے سے خشک ہوتے بدبودار کیچڑ میں گرتے قطروں کو دیکھ کر اسے پتا چلتا ہے کہ صرف اس کی منہ سے ہی رونے اور چلانے کی آواز نہیں نکل پا رہی' ورنہ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے آنسو ایسی کسی بھی دہشت سے آزاد ہیں۔ پانی کے نمکین قطروں کے ساتھ ساتھ چند سرخ قطرے گرتے دیکھ کر وہ اور ہراساں ہو جاتی ہے۔ اس کم عمر معصوم بچی کو سمجھ نہیں آتا کہ خون کے یہ قطرے کہاں سے نکل رہے ہیں۔ وہ بے چینی سے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتی ہے' کسی درد کا احساس نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ گھٹنے اور کہنیوں میں ضرور درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اپنی ہتھیلیاں پھیلا کر سامنے کرتی ہے۔ کیچڑ کے چند قطرے مہندی کی طرح سجے ہوتے ہیں۔ دوبارہ پھسلنے کے ڈر سے اس نے اب تک پھر اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے گلی میں کھیلتے بچوں کے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ اچانک اس کی نظر اپنے سامنے رکتے قدموں پر پڑی۔ اس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کے اوپر دیکھا۔ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اوپر اٹھتے ہی وہ جیسے پہچان کے بولا۔

"دوئی؟"

"چھاجی!" وہ حلق پھاڑ کے چلائی۔

سیٹ سے ٹیک لگائے بیٹھی دعا فوراً سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہی ادھورے منظر۔۔۔ بھاگتے دوڑتے۔۔۔ سمجھ میں نہ آتے منظر۔۔۔ خالی منظر۔۔۔ آوازوں سے محروم منظر۔۔۔ اور ڈرائیور کے ساتھ ہلتے مگر بے آواز لبوں کے ساتھ گفتگو کرتا اللہ وسایا۔ ہر طرف ایک سناٹا تھا۔ اس نے دوبارہ اسی منظر میں اترتے ہوئے آنکھیں موندیں۔

"چھاجی۔۔۔!" اس بچی نے چلا کر یہ سناٹا توڑا تھا۔ وہ کب سے چلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر آواز تھی کہ دہشت کے نکل نہ پا رہی تھی۔ پتا نہیں اس پندرہ سالہ دبلے پتلے' لمبے سے ناراض چہرے والے لڑکے کے

سامنے آنے سے اسے کیسا حوصلہ ملا کہ وہ پوری طاقت سے چلانے لگی۔ اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں میں اس بچی کا نازک وجود کیچڑ میں لگے کنول کی طرح بھر لیا۔ اسے گود میں اٹھا کر اپنے کرتے کے دامن سے اس کے چہرے اور بالوں پر لگا کیچڑ صاف کیا۔ اس کی ناک سے بہتے خون کو روکنے کے لیے رومال رکھ کے اس پر ہاتھ رکھنے کا کہتے ہوئے اس لڑکے کی آواز ذرا سی کپکپائی۔ دعا نے سسکیاں لیتے ہوئے رومال ناک سے لگا کر اوپر اپنا مریل سا زرد ہاتھ جما دیا۔ اب وہ لڑکا پوچھ رہا تھا کہ وہ اس بھری دوپہر میں گلی میں کیا کر رہی ہے اور کیسے گری۔

"چھاجی! اندر اباجی اماں کو زور زور سے مار رہے ہیں۔ مولوی جی بھی میرے ہاتھ پر چھڑی ماریں تو اتنا درد ہوتا ہے..... اتنا درد ہوتا ہے..... کہ بس..... اور اباجی کے پاس جو ڈنڈا ہے ناں وہ تو مولوی جی کی چھڑی سے بہت ہی زیادہ موٹا ہے۔ اباجی کی چپل بھی اتنی بڑی اور سخت ہے۔ اماں کو لگی تو ان کا خون نکل آیا۔ میں ماما جی کو بلانے جا رہی تھی کہ وہ آ کر اباجی کو روکیں..... بھاگتے بھاگتے میں گر گئی چھاجی!" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بتانے لگی۔

اس لڑکے کی آنکھیں جو پانی سے بھرتی جا رہی تھیں' اچانک دعا کے خاموش ہونے پر سرخ ہو گئیں۔ اس نے دعا کو ایک بار پھر گود میں اٹھا لیا اور تیز تیز چلتا ہوا اس کے گھر کی طرف بڑھا۔ دعا کو اب تک یاد تھا۔ اماں دیوار کے ساتھ لگی دونوں ہاتھ اوپر کیے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور اباجی پیروں اور ہاتھ میں پکڑے چارپائی کے ٹوٹے ہوئے پائے کی مدد سے انہیں مار رہے تھے۔ اسے ایک بار پھر رونا آ گیا۔ روتی ہوئی دعا کو چارپائی پر بٹھا کے وہ لڑکا آگے بڑھا اور اس نے اباجی کا اٹھا ہوا ہاتھ تھام لیا' نہ صرف یہ..... بلکہ دوسرے ہاتھ سے پایا چھین کر پرے پھینک دیا۔ اباجی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس لڑکے کی آنکھوں میں نہ خوف تھا' نہ ڈر بلکہ کچھ اور تھا جو دعا کی سمجھ میں اس وقت نہ آ سکتا تھا۔ البتہ اس کے اباجی اس چیلنج..... اس دھمکی کو بھانپ گئے۔ وہ خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی کہ اب اباجی کیا کرتے ہیں..... مگر وہ حیران رہ گئی جب اس نے انہیں اس لڑکے کا ہاتھ جھٹک کر باہر نکلتے دیکھا۔ اب وہ لڑکا زمین پر گری اماں جی کو سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔

اماں جی کی حالت دعا کو لرزائے دے رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ چارپائی سے نیچے اتر کر اماں جی سے لپٹ جائے۔ ان کے ہونٹوں اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس لڑکے نے ایک بار پھر اپنے کرتے کا دامن استعمال کیا۔ انہیں پانی پلایا' سر سے خون صاف کر کے پٹی باندھی' کمر اور ٹانگیں دبائیں۔ اماں جی تب سے چپ تھیں اور اس کے کہنے پر چپ چاپ ہی تخت پر کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔ وہ لڑکا اٹھا' اس کے پاس آیا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا کہنے لگا۔

"دوئی گندی بچی! اٹھو اپنا ہاتھ منہ دھوؤ' کپڑے بدلو' میں بازار جا رہا ہوں' دوا اور دودھ لے آتا ہوں۔ پھوپھی جی کو دونوں چیزیں پلا دینا' تمہیں کچھ چاہیے.....؟"

"چھاجی....." وہ زور سے اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس کی کمر سہلا کے تسلی دے کر نکل گیا۔

یہ چھاجی تھا' دوئی کا چھاجی' شہزاد' ماما جی کا بیٹا' اماں جی کا لاڈلا بھتیجا شہزاد۔ جو دعا کے ہوش میں محفوظ پہلی پہلی یاد کا ایک ہیرو تھا..... ایک نجات دہندہ..... ایک مسیحا۔

اسے یاد نہیں اس نے اسے چھاجی کہنا کب شروع کیا تھا اور کیوں کیا تھا مگر مامی جی بتاتی ہیں کہ وہ جب بولنا سیکھی تو اپنی توتلی زبان میں "شہزاد" کو "چھاج" کہہ کر بلاتی تھی پھر یہی لفظ رفتہ رفتہ چھاجی میں بدل گیا اور اب تو عرصہ ہوا اس نام سے اسے پکارے ہوئے۔ عمر اور رشتوں کی بدلتی نوعیت نے ایک جھجک سی حائل کر دی تھی' ایک تکلف سا آ گیا تھا۔ اب وہ بڑے احترام سے انہیں "شہزاد جی" کہہ کر پکارتی مگر کب پکار لی..... عرصہ ہو گیا ان کا سامنا کیے ہوئے۔ ان کا تو پتا نہیں مگر دعا کے گریز کی وجہ وہ ایک لمحہ تھا جو اس کی عمر میں وقت سے پہلے جست لگا کر آ پہنچا تھا' اتنا اچانک..... اتنا قبل از وقت..... کہ ابھی تک تو وہ خود کو تیار بھی نہیں کر پائی تھی کہ اس لمحے کا سواگت کیسے کرے۔ وہ لمحہ اسے جو احساس بخش گیا تھا' وہ اس احساس کی پذیرائی کے قرینے نہیں جانتی تھی۔ وہ اس کو سنبھالنے کے فن سے ناواقف تھی..... یہی وجہ تھی کہ وہ احساس جو کسی کی بھی زندگی کا سب سے حسین احساس

ہوتا ہے' دعا کے لیے ایک کانٹا بن کے رہ گیا تھا۔

وہ لمحہ جو نصیب سے کسی کے حصے میں آتا ہے' دعا کے اناڑی پن اور ناواقفیت نے اس لمحے کو ایک پچھتاوا بنا کے رکھ دیا تھا اور وہ اس کانٹے کی چبھن لیے..... اس پچھتاوے کی کسک لیے کیسے اس کا سامنا کرتی۔ اس کا..... جو ہمیشہ اس کے لیے ڈھال بنا رہا۔ ٹھنڈی چھاؤں بنا رہا۔ ایک دوست..... ایک ہمدم..... ایک مسیحا.....

اسے یاد تھا کیسے وہ بغیر کہے اس کی ہر خواہش جان لیا کرتا تھا۔ اس کے دل میں ابھرنے والی تمنا وہ بھانپ جاتا تھا..... پتا نہیں کیسے..... مگر ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس نے بھلا کب خواہشیں بیان کرنا یا فرمائشیں کرنا سیکھی تھیں۔

اس کی ماں نے اپنی گہری چپ کافی حد تک اس کے اندر بھی اتار رکھی تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ دعا کی آنکھیں کبھی کبھار بول اٹھتی تھیں اور شاید چھاجی یہ زبان بہت اچھی طرح سمجھتا تھا جبکہ اماں جی..... نہ صرف ان کا دل چپ کی بکل مارے ہوئے تھا بلکہ ان کے لبوں پر بھی تالے لگے تھے اور تو اور ان کی آنکھیں تک کسی بے جان پتھر کی مانند لگتیں۔ بس کبھی کبھار..... بہت کم..... ایسا ہوتا کہ دعا کو دیکھتے دیکھتے اس پتھر پر ہلکا سا شگاف پڑتا..... وہ ہاتھ بڑھا کے اسے گود میں بھر لیتیں۔ تب دعا بھی ہمت کر کے ان سے کوئی نہ کوئی فرمائش کر دیتی۔ کبھی گرم گرم حلوے کی..... کبھی نرم نرم کیلے کی..... ایسے ہی ایک روز اس نے ماں سے گڑیا کی فرمائش کر کے انہیں سوچ میں ڈال دیا۔ ایسی گہری سوچ کہ جسے دیکھ کر دعا کو اپنی فرمائش ایک جسارت لگنے لگی۔ وہ سہم گئی..... مگر اگلی صبح جب اماں نے اسے رات بھر جاگ کر بنائی کپڑے کی گڑیا تھمائی تو وہ خوشی سے ناچ اٹھی۔

رنگ برنگی کترنیں جوڑ کے بنائی نرم سی گڑیا جس کی آنکھوں' ناک اور ہونٹوں کو دھاگے کے ٹانکے سے واضح کیا گیا تھا۔ بالوں کی بجائے اون کے گچھے چوٹی کی صورت میں قید تھے۔ وہ اس گڑیا کو سینے سے بھینچے باہر گلی میں نکل گئی۔ اپنی سہیلیوں کو دکھانے جن کے پاس موجود گڑیاں اور کھلونے دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ ایسی کوئی چیز اس کے پاس بھی ہونی چاہیے لیکن وہاں جا کر اور ان کی گڑیاں دیکھ کے اسے احساس ہوا کہ اس کی گڑیا اور ان کی گڑیا میں کیا فرق تھا۔

وہ جس جگہ رہا کرتی تھی' وہ بہت زیادہ خوشحال لوگوں کے رہنے کا علاقہ نہیں تھا' عام سے لوگ تھے۔ کسی کا باپ ریڑھے پر سبزی بیچتا تھا' کسی کا تانگا چلاتا تھا' کسی کا مزدوری کرتا تھا تو کسی کے بھائی تندور پر روٹیاں لگاتے تھے' کسی کے بھائی ویلڈنگ یا مکینکی کرتے تھے اور ان سب ہی کی مائیں بھی کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتی تھیں۔ زیادہ تر کوٹھیوں میں دھلائی کا کام کرنے جاتیں' چند ایک مشین پر کپڑے سیا کرتیں اور کسی کسی کی ماں کارخانے بھی جایا کرتی۔ کام تو اس کی اماں بھی کرتی تھی' ان کے ہاتھ میں بڑی صفائی تھی۔ سوئی دھاگے سے بڑی بڑی چادروں پر ایسے ایسے پھول پتے بناتیں کہ دعا انہیں چھونے کو مچل جاتی لیکن جب وہ یہ سارے کپڑے بیگم صاحبہ کو دے کر پیسے لاتیں' وہ سارے کے سارے اباجی لے لیتے اور خود اباجی کیا کرتے تھے' یہ اسے نہیں پتا تھا۔ سارا دن تو وہ انہیں تخت پر سویا ہوا دیکھتی۔ ان کی وجہ سے اسے اس ایک کمرے کے گھر میں چلنا بھی مشکل لگتا کہ کہیں کسی کھٹکے پر ان کی آنکھ کھل گئی تو اسے مار سے بچانے کے لیے اماں جی فوراً "یہ الزام اپنے سر لے لیں گی اور پھر کتنی دیر تک پٹتی رہیں گی۔

اسے بڑا غصہ آتا جب اماں جی اسے شور مچانے اور کھیلنے سے یہ کہہ کر منع کرتیں کہ "تمہارے اباجی رات بھر کے تھکے ہوئے ہیں' انہیں سونے دو۔" وہ حیران ہوتی کہ یہ کون سا کام ہے جو رات کو ہوتا ہے۔ ایسے ہی اماں جی اسے کونے میں بٹھا رہنے کے لیے کہتی رہتی ہیں' ورنہ اور ساروں کے ابا تو دن کو کام پر جاتے ہیں اور رات کو سوتے ہیں۔ یہ تو اباجی کو نیند ہی زیادہ آتی ہے اسی لیے رات کو تو سوتے ہی ہیں اور دن کو بھی سوئے رہتے ہیں۔ رات کو بھلا کیا کام کیا جا سکتا ہے۔ وہ جب یہ سوال اماں جی سے کرتی تو وہ ایسے ہی زرد پڑ جاتیں جیسے سبق بھول جانے پر وہ مولوی جی کے سامنے پڑ جایا کرتی تھی۔

ایک بات اور بھی تھی کہ اگر اباجی واقعی رات کو کام پر جاتے ہیں تو پھر ضرور وہ دوسروں کے ابا کی طرح پیسے بھی

لاتے ہوں گے پھر اماں جی ہر وقت پیسے نہ ہونے کی وجہ سے روتی کیوں رہتی ہیں۔ وہ حسرت سے اپنی سہیلیوں کو دیکھتی جو ریڑھی سے ہی سہی مگر گلے سڑے سستے پھل کھا تو لیتی تھیں۔ گلی میں سے گزرنے والے پھیری والوں سے بھٹا، مرونڈا یا قلفی لے لیتیں۔ اس کے پاس تو چونی بھی نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھار ماما جی ملنے آتے تو اسے چونی یا اٹھنی تھما جاتے لیکن وہ بھی اماں جی لے لیتیں۔

گلی کے سارے بچے، نئے کپڑے پہنتے جوان کے لیے تو نئے ہی ہوتے تھے چاہے ان کی مائیں اپنے مالکوں کے بچوں کی اترن ہی کیوں نہ لاتی ہوں۔ کپڑوں کے ساتھ ساتھ وہ مالکوں کے بچوں کے دل سے اترے کھلونے بھی لے آتیں۔ بیٹری ختم ہوئے جہاز، ٹانگ ٹوٹی گڑیا۔۔۔ مگر یہ پرانے کھلونے بھی دعا کی نئی گڑیا کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اسے اپنی بھدی گڑیا پر ایک دم ہی بہت زیادہ شرمندگی محسوس ہوئی۔ سب کے مذاق اڑانے پر دوڑتی ہوئی گھر واپس آئی۔

اندر اماں جی کے پاس چھا جی بیٹھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس کی لیے میٹھی گولیاں بھی لائے تھے جنہیں اس نے بڑی بے دلی سے تھاما تھا۔ چھا جی نے حیرت سے اس کے بجھے بجھے چہرے اور زمین پر پڑی رنگ برنگی کترنوں والی گڑیا کو دیکھا مگر ایک سوال تک نہ کیا اور اگلے روز وہ حیران رہ گئی۔ جب چھا جی نے اسے ایک بالکل نئی پلاسٹک کی گڑیا لا کر دی جو اماں جی کی بنائی گڑیا کی طرح بھس بھری نہیں تھی بلکہ اس کے پلاسٹک کے گلابی بازو اور ٹانگیں ادھر ادھر حرکت بھی کرتی تھیں۔ وہ جتنا چاہے ان کو موڑ سکتی تھی۔

اون کے دھاگوں کی بجائے سنہری گھنگھریالے بال ربن سے بندھے تھے۔ لکیر کی طرح کھنچی ناک اور ——— ——— نیلی آنکھیں تھیں جن کی پلکیں بے حد لمبی تھیں۔ گود میں لٹانے پر وہ آنکھیں زور سے بند کر لیتی تھی جبکہ ذرا سا اوپر کی طرف سیدھا کرتے ہی آنکھیں خود بخود کھل جاتیں۔ اس کے ہاتھوں کی ایک ایک انگلی واضح تھی۔ وہ ہاتھ پھیر کے اس کے سرخ لبوں کی ابھری ہوئی ساخت کو بھی محسوس کر سکتی تھی اور سب سے حیرت انگیز چیز اس کے نزدیک اس گڑیا کی مسکراہٹ تھی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ یہ ایک کھلونا ہے، ایک بے جان اور چیزیں مسکرایا نہیں کرتیں۔۔۔ تو پھر اس گڑیا کے لبوں اور آنکھوں میں پھیلی مسکراہٹ کا راز کیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک گڑیا کوئی بہت قیمتی نہیں تھی مگر دعا کے لیے زندگی کا پہلا تحفہ تھا جو نہ صرف من پسند تھا بلکہ بن مانگے ملا تھا۔

ایسے ہی اس کی دوسری خواہش بھی چھا جی کے توسط سے ہی پوری ہوئی۔ وہ سات سال کی ہو چکی تھی مگر اماں جی یا ابا جی کو اسے اسکول داخل کرانے کا خیال تک نہ آیا اور اسے یہ خیال تب آیا جب اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ گلی میں کھیلنے والے سب بچے اب دن کو گلی میں نہیں ہوتے۔ دن کو جب بقول اماں جی کے ابا جی تھک ہار کے سو رہے ہوتے تھے تو وہ تنگ آ کر گلی میں نکل جایا کرتی۔ کب تک کمرے کے ایک کونے میں بغیر بولے بغیر کھیلے پڑی رہتی مگر اب وہ اسی خاموشی سے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی گلی میں کھیلتے ان بچوں کو دیکھنے لگتی جو اس سے عمر میں خاصے چھوٹے تھے اور ابھی اسکول نہیں جاتے تھے اور جو اس کی عمر کے تھے جن کے ساتھ وہ سالوں سے کھیلتی آ رہی تھی، وہ سفید شلواریں، نیلی قمیص پہنے، بستے اٹھائے اسکول جا چکی ہوتیں۔ اب ان کے کھیل بھی بدل چکے تھے۔ برف پانی اور چھپن چھپائی کی بجائے ساری لڑکیاں "اسکول اسکول" یا "مس مس" کھیلتیں یا پھر ایسی نظمیں اونچی اونچی پڑھتیں جو دعا کو نہیں آتی تھیں۔ وہ ان سے کٹتی جا رہی تھی، اکیلی ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے ہی ایک روز وہ چوکھٹ پر بیٹھی جھاڑو کے تنکے سے مٹی میں لکیریں کھینچ رہی تھی کہ چھا جی اسے بازو سے تھام اندر لے گئے، ہاتھ منہ دھلوایا اور اماں جی سے کہا۔

"پھوپھی جی! دعائی کے کپڑے بدل دیں، میں اسے اسکول داخل کرانے جا رہا ہوں۔" وہ حیرت سے صابن کا جھاگ دھونا بھول گئی۔ اماں جی دبے لفظوں میں اسکول کے اخراجات کے بارے میں اعتراض کرنے لگیں جنہیں چھا جی کسی خاطر میں نہ لائے۔

"میں اسے کسی مہنگے اسکول میں نہیں ڈال رہا، یہ جو پرلی گلی کے نکڑ میں ہے، وہ والا سرکاری اسکول۔ فیس

ڈھائی روپے ہے اور کتابیں کون سا روز روز لینی ہیں۔ میں سال بھر کی کتابیں، کاپیاں اور پنسل لا دیا کروں گا اور صرف اب نہیں بلکہ ہمیشہ۔ جب تک دعائی پڑھے گی۔"

"مگر شہزادے بیٹے! تمہاری تو اپنی فیس کا خرچہ، کیا میں نہیں جانتی تم کتنی محنت کر کے اسے پورا کرتے ہو۔"

"کیونکہ میرے نزدیک تعلیم سب سے اہم ہے اور آپ کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ آپ اس قدر محنت کرتی ہیں، اپنی آنکھوں کو تباہ کر لیا ہے کڑھائی کر کر کے۔ کیا فائدہ اپنی بینائی ضائع کرنے کا اگر ان کے بدلے آپ اپنی اکلوتی اولاد کو علم کی روشنی تک نہ دے سکیں۔ اگر آپ کو مشکل لگتا ہے اپنے مجازی خدا کے خرچے میں سے کٹوتی کر کے اولاد پر لگانا۔۔۔ تو کوئی بات نہیں۔ میں خود اس کی فیس بھر دیا کروں گا اور باقی کا سارا خرچہ بھی۔ بس آپ اسے پڑھنے سے نہ روکیں۔"

پھر وہ بھی اسکول جانے لگی اور جب وہ دوسری جماعت میں تھی تو ایک روز اماں جی چپ چاپ کچھ کہے سنے بغیر گزر گئیں۔ نو سال کی عمر میں وہ اتنی نا سمجھ نہ تھی کہ خود پر پڑنے والی افتاد کو محسوس نہ کر سکتی۔ اس نے محسوس کیا اور پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی اماں جی اب بہت دور جا چکی تھیں، بہت دور۔۔۔ کبھی بھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اب وہ انہیں دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ یہ احساس اسے دھاڑیں مار مار کے رونے پر مجبور کر رہا تھا لیکن غم کی شدت پر بھی اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ ایک کمی اس کی زندگی میں کتنی ڈھیر ساری "کمیاں" لانے والی ہے۔

ماما جی پیار تو پہلے ہی کرتے تھے۔ اب مامی جی نے اور بھی خیال رکھنا شروع کر دیا۔ چھا جی بہت زیادہ مصروف ہو گئے تھے۔ وہ پڑھتے بھی تھے، پڑھاتے بھی تھے اور ایک اور جگہ کام بھی کرتے تھے لیکن جب ملتے، حوصلہ دلاتے، پڑھائی پر توجہ دینے کی نصیحت کرتے۔ اس کی پڑھائی کا خرچہ اٹھانے کا وعدہ وہ خوب نبھا رہے تھے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی پڑھائی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کا وعدہ نبھا نہیں پاتی تھی۔ اتنی سی عمر میں ذمہ داری ہی اتنی بڑھ گئی تھی۔ چھوٹے سے گھر کے واحد کمرے، مختصر سے صحن کی صفائی بھی اس کی ننھی سی جان کو ہلکان کر دیتی۔ ابا جی کے لیے روٹی ڈالتے ہوئے کتنی بار ہاتھ جلتا، کبھی مامی آ جاتیں تو وہ ہانڈی پکا دیتیں، ساتھ ساتھ اسے سکھا بھی دیتیں، یہ کہتے ہوئے۔

"میں نے تو خود تیری ماں سے سیکھا تھا سب کچھ۔ اسے رب سوہنا حیاتی دیتا تو وہ خود سارے چاج تجھے سکھاتی لیکن اسے کیا پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی چلی جائے گی۔ پتا ہوتا تو تجھے لوریاں سنانے کی بجائے یہی سب کچھ سکھاتی جاتی۔"

اب مامی جی اور چھا جی کا آنا کم کم ہو گیا تھا، خصوصاً" چھا جی کا۔ وہ لوگ اس محلے سے چلے گئے تھے۔ ماما جی اور مامی جی تو پھر بھی ہر ہفتے آ جاتے، چھا جی اب کام میں بہت مصروف رہنے لگے تھے۔ کبھی کبھی مامی جی ابا جی کو کہہ سن کر اسے دو چار دنوں کے لیے ساتھ لے جاتیں تو وہ چھا جی سے مل لیتی۔ وہ اور بھی لمبے ہوتے جا رہے تھے مگر اب اتنے دبلے پتلے نہیں رہے تھے۔ گورا رنگ بھی سانولا پڑ گیا تھا۔ اس نے چھا جی کو کھل کر ہنستے پہلے ہی کم دیکھا تھا، اب تو وہ مسکراتے بھی مشکل سے تھے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے اور سوچتے ہوئے ان کی آنکھیں اس طرح چمکتیں جیسے انہوں نے سونے، چاندی اور ہیروں کا ڈھیر دیکھ لیا ہو۔ اسے ان کی آنکھوں میں ایک دم چمک اٹھتے دیکھنا بڑا اچھا لگتا تھا۔

پھر ایک دن ابا جی کو نجانے کیا سوجھی، وہ ماسٹر جی کو گھر لے آئے۔ پہلے دعا سمجھی کہ ابا جی نے یہ ماسٹر جی اسے ٹیوشن پڑھانے کے لیے رکھے ہیں۔ وہ بہت حیران ہوئی کہ ابا جی کو اس کی پڑھائی سے یکایک کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، وہ تو ہمیشہ ہی اس کے اسکول جانے پر چڑ جاتے ہیں لیکن تب حقیقت جان کر مزید حیران ہوئی کہ یہ ماسٹر جی پہاڑے یاد کرانے اور املا کروانے والے ماسٹر جی نہیں بلکہ گانا سکھانے والے ہیں۔

وہ گیارہ بارہ برس کی تھی اور اس کی عمر کی سب سہیلیاں کچھ نہ کچھ سیکھ ہی رہی تھیں۔ کوئی اپنی بہن سے

کڑھائی کے ٹانکے سیکھ رہی تھی کوئی خالہ سے کپڑوں کی سلائی کوئی ماں سے سویٹر بننا سیکھ رہی تھی اور کوئی اس کی طرح ہانڈی روٹی سیکھ رہی تھی مگران میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو راگ دھرپد سیکھ رہی ہو۔ مرکنیاں نکھارنے کی مشق کررہی ہو۔ لے سر اور ترنم کی تشریح یاد کررہی ہو۔

پہلے پہل اس دوہری پڑھائی سے اسے خاصی کوفت ہوئی۔ ماما جی نے تو نہیں البتہ مامی جی نے ابا جی سے خوب سوال جواب کیے۔ چھاجی بھی پوچھ گچھ کرنے آئے بلکہ وہ تو ابا جی سے الجھ ہی پڑے لیکن ابا جی نے صاف کہہ دیا۔

"دعا میری بیٹی ہے میں جو چاہوں گا کروں گا' ہے کسی میں ہمت جو روک سکے۔"

اور سب خاموش ہوگئے۔

دعا حیرت اور افسوس سے سوچتی رہی۔

"اس کا مطلب ہے 'میں واقعی صرف اور صرف ابا جی کی بیٹی ہوں اور کسی کی کچھ نہیں لگتی تو پھر کیا مامی جی جھوٹ کہتی ہیں کہ میں تیری ماں کی جگہ ہوں اور ماما جی یہ کیوں کہتے ہیں کہ دعا تو میری بیٹی ہے۔"

سب ابا جی کے اس دوٹوک اعلان کے بعد نہ صرف خاموش ہوگئے تھے بلکہ پیچھے بھی ہٹ گئے تھے۔ ہر ہفتے کا آنا' پندرہ دن اور پھر مہینے تک پر محیط ہوگیا۔ اسے سب بے تحاشا یاد آتے 'ابا جی صاف کہتے۔

"چربی چڑھ گئی ہے تیرے ماموں کے دیدوں پر۔ بیٹے کی کمائی پر پھٹنے والا ہو رہا ہے۔ اب ماڑے (غریب) رشتے دار کہاں یاد رہتے ہوں گے۔"

لیکن گزرتے وقت نے اسے جو شعور دیا تھا' وہ اسے باور کرا گیا کہ ان کا گریز ایک طرح کا اظہار ناراضی تھا۔ وہ اس کی موسیقی کی تعلیم کے خلاف تھے اور ابا جی اسے راتوں رات پائے کی گلوکارہ بنانا چاہتے تھے۔

وہ چودہ سال کی تھی جب چھاجی نے ذاتی گھر خریدا۔ یہ وہ والا بنگلہ نہیں تھا جہاں وہ آج کل رہتے ہیں بلکہ پہلے انہوں نے گلشن اقبال میں ایک پانچ مرلے کا مکان خریدا تھا جو اس مکان سے زیادہ اچھا تو نہیں تھا جہاں وہ کرائے پر رہ رہے تھے مگر بہرحال اپنا تو تھا۔ ماما جی ساری عمر اچھا خاصا کمانے کے باوجود اپنا گھر نہ بنا سکے۔ اس خوشی میں میلاد شریف اور دعوت کا اہتمام تھا۔ مامی جی آکر اسے دو روز پہلے ہی لے گئیں۔ وہ تین چار ماہ بعد اس طرح ان کے ہاں رہنے جا رہی تھی 'اس کی خوشی الگ تھی اور چھاجی سے ملنے کا اشتیاق الگ۔ ان سے ملے ہوئے تو سال ہونے کو آیا تھا۔ ابا جی سے تلخ کلامی کے بعد وہ کبھی ان کے ہاں آئے ہی نہیں اور دوبارہ وہ گئی تو وہ گھر پر نہیں ملے۔ پچھلی بار تو وہ صرف ان سے ملنے کی خاطر رک بھی گئی تھی لیکن وہ اس رات گھر ہی نہیں آئے۔ کسی شوٹنگ کے سلسلے میں یونٹ کے ساتھ مری چلے گئے تھے۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ وہ ٹی وی کے لیے کام کرتے ہیں لیکن کیا کام کرتے ہیں اس کے بارے میں کچھ صحیح اندازہ نہیں تھا۔

شروع شروع میں جب مامی جی نے بتایا کہ شہزاد جی کا ڈرامہ ٹی وی پر آنے والا ہے تو وہ بے حد پرجوش ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کے چھاجی ہی ڈرامے کے ہیرو ہوں گے۔ اس کے گھر ٹی وی تو تھا نہیں' ماما جی کے ہاں ہی آکر دیکھا اور اسے سخت مایوسی ہوئی جب پورے ڈرامے میں ایک بار بھی چھاجی کا چہرہ نظر نہیں آیا جبکہ وہ اسکول میں اپنی ساری سہیلیوں کو بتا آئی تھی کہ چھاجی۔ اس کے ماما جی کے بیٹے ہیرو بن گئے ہیں۔ تب چھاجی نے اسے بتایا تھا کہ وہ صرف ڈرامے کی کہانی لکھتے ہیں اور یہ تو بہت پرانی بات تھی۔ سنا تھا "ڈھائی تین سال پرانی۔ اس نے سنا تھا کہ اب چھاجی صرف کہانیاں ہی نہیں لکھتے' پورے کا پورا ڈرامہ خود بناتے ہیں۔

"شاید اسی لیے زیادہ مصروف ہوگئے ہیں۔" وہ سوچا کرتی۔ لیکن کبھی اس کے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ چھاجی اس روتی بسورتی مریل سی بچی کو بھول گئے ہوں گے جس کے آنسو وہ اکثر صاف کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اتنی زیادہ مصروفیت کے باوجود ہر ماہ اس کی فیس اسکول میں جمع ہوجاتی تھی اور پچھلے سال تو چھاجی نے اسے سرکاری اسکول سے اٹھا کر انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ اس کی کتابیں' کاپیاں' مہنگا اسکول بیگ' سلا سلایا یونیفارم' باٹا کے جوتے اور رنگ برنگی طرح طرح کی پنسلیں۔ شاہنہ اور رہ مامی جی گھر پہ پہنچا دیتیں۔ اس سے

اطمینان کو یہی کافی تھا کہ چھاجی اس سے غافل نہیں ہیں۔

میلاد شریف اگلے روز صبح دس بجے شروع ہونا تھا۔ خاندان اور محلے کی عورتیں مدعو تھیں۔ زیادہ نہیں تو پھر بھی پچاس ساٹھ لوگوں کے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کرنا تھا اور یہ مامی جی کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اب تو چھاجی نے ان کے لیے ایک ملازمہ بھی رکھ دی تھی۔ اور پھر۔ دعا خود بھی تو تھی۔ وہ اسی لیے تو پہلے آگئی تھی کہ مامی کا ہاتھ بٹا سکے۔

رات کی دعوت کا انتظام چھاجی نے کسی ہوٹل کو دے رکھا تھا' وہیں سے پکا پکایا کھانا آنا تھا۔ لوگ بھی زیادہ تھے ان کے سارے دوست' ساتھ کام کرنے والے لوگ' مامی جی کو اس دعوت کی خاص فکر نہ تھی۔ البتہ چھت کی آرائش وغیرہ کا جائزہ لینے وہ بار بار سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی تھیں اس لیے دعا کو بھیج دیتیں۔ دعا نے اپنا ڈیڑھ مرلے کا گھر سجانے کی کبھی نہ کوشش کی نہ خواہش۔ اسے کیا پتا تھا کہ پھولوں' آرائشی قمقموں اور قالینوں کی ترتیب درست ہے یا نہیں۔ کرسیوں کی رو توازن میں ہے یا بے ترتیب وہ ہونق انداز میں ایک نظر دیکھ کر نیچے اتر آتی۔

"مامی جی بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔" ہر بار اس کا یہی تبصرہ ہوتا۔

آخری بار میلاد ختم ہونے کے بعد اور کھانا لگنے سے کچھ دیر قبل وہ پھر اوپر گئی۔ قدرے کم چوڑائی کی۔ گول انداز میں خم لیتی ہوئی جدید طرز کی سیڑھیوں پہ وہ بے دھیانی میں چڑھتی جا رہی تھی کہ اوپر سے آتے چھاجی سے جا ٹکرائی وہ اس سے ایک سیڑھی اوپر تھے اور پھر ان کا قد تو پہلے ہی چھ فٹ کے قریب تھا اس لیے دعا کو یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی ناک کس طوفان میل سے ٹکرائی ہے۔ پورا منہ اوپر اٹھا کے دیکھنا پڑا اور جیسے ہی اپنی مختصر سی خوش نما ناک سہلاتے ہوئے آنکھوں میں غصہ بھر کے اس نے سامنے والے کے چہرے کی جانب دیکھا تو حیرت آمیز خوشی کے ساتھ چلا اٹھی۔

"چھاجی۔۔۔"

رات وہ دیر تک ان کا انتظار کرنے کے بعد سوئی تھی' حالانکہ مامی جی نے کہا بھی تھا کہ ان کے آنے کا کوئی مقررہ وقت نہیں 'کبھی کبھی وہ صبح چار ساڑھے چار بھی آتے ہیں مگر وہ نہ مانی اور انتظار کرتی رہی۔ مگر نو بجے تک سو جانے کی عادی دعا بس ساڑھے بارہ بجے تک ہی جاگ سکی اور پھر وہیں لاؤنج میں سوگئی۔

صبح اٹھی تو پتا چلا کہ چھاجی سو رہے ہیں اور پھر دس ساڑھے دس تک یعنی میلاد شریف ہونے سے پہلے وہ کتنے ہی پھیرے ان کے کمرے کے لگا چکی تھی۔ مگر بند دروازے کو دیکھ کر پلٹ جاتی۔ اس کی بے چینی کی وجہ اس کا ٹسٹ کا رزلٹ تھا۔ جب چھٹی جماعت سے اٹھا کر چھاجی نے اسے اس انگلش اسکول میں داخل کرایا تو پہلے پہل وہ بہت گھبرائی تھی۔ اپنے سرکاری اسکول میں وہ ہر سال اول آتی رہی تھی۔ پتا نہیں اس اسکول میں چل سکوں گی یا نہیں۔ "کہیں فیل نہ ہوجاؤں۔ چھاجی کیا سوچیں گے۔" یہ سوچ اسے پریشان کردیتی اور وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ محنت کرتی رہی۔ شاید تب ہی چھاجی سے آخری بار ملاقات ہوئی تھی۔ گھر کے کام۔ موسیقی کی مشق۔ ابا جی کی کڑوی کسیلی باتیں' ایسے میں نئے اسکول کا نیا ماحول پڑھائی پہ توجہ دینا ہی بہت مشکل تھا اور نمایاں مقام حاصل کرنا تو خیر ناممکن۔ اس کے باوجود اس نے چند ماہ میں ہی اتنی محنت ضرور کرلی کہ چھٹی کا امتحان کسی مضمون میں فیل ہوئے بغیر پاس کرلیا۔ اسے یاد تھا کہ نئی کلاس کے کورس اور بیگ کے ساتھ مامی جی اس کے لیے ایک سوٹ' دو سو روپے اور ایک گھڑی بھی لائی تھیں۔ سوٹ ان کی طرف سے' روپے ماما جی کی طرف سے اور گھڑی چھاجی نے بھجوائی تھی۔ وہ بلیک اسٹریپ والی نازک سی گھڑی کو ہاتھ میں لیے نم آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

"چھاجی' جب میں چھوٹی تھی ناں تو حیران ہوتی تھی کہ چھاجی کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ میرا دل گڑیا لینے کو چاہ رہا ہے۔ چاکلیٹ کھانے کو جی مچل رہا ہے۔ یا یہ کہ میں کبھی بجلی والے جھولے پہ نہیں بیٹھی۔ میں تو ان سے کبھی کہتی نہیں۔ بلکہ کسی سے بھی نہیں کہتی پھر انہیں کیسے پتا چل جاتا ہے' پھر ایسا ہوا چھاجی کہ میں بڑی ہوگئی۔

میں ہو نہیں ہی۔ شاید مجھے لگا کہ میں بڑی ہو گئی ہوں۔ کیونکہ میری سمجھ میں آنے لگا تھا کہ آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ضرور آپ میری آنکھوں سے پڑھ لیتے ہوں گے' سنا ہے آنکھوں سے دل کی ہر بات پتا چل جاتی ہے لیکن میں غلط تھی۔ میں بڑی نہیں ہوئی میں اب بھی چھوٹی ہوں۔ اتنی ہی چھوٹی۔ مجھے اب بھی سمجھ نہیں آرہا کہ آپ کو کیسے پتا چلتا ہے کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے' مجھے کیا خواہش ہو رہی ہے۔ آپ نے تو کب سے میری آنکھیں نہیں دیکھیں۔ اتنی دور سے... بغیر ملے... آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ میں... میں کیا چاہتی ہوں۔"

نئے اسکول میں جانے کے بعد ہر لڑکی کی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوتا۔ اول تو اس کے خیال میں گھڑی صرف مردوں کے استعمال کی چیز تھی اور وہ بھی بڑی عمر کے مردوں کی۔ جنہوں نے کام پہ جانا ہوتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اسے یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اسکول میں گھڑی کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باوجود بھی کبھی کسی لڑکی کی گھڑی کی خوبصورتی اسے بری طرح للچا دیتی۔ اور پیپرز کے دوران اسے بھی گھڑی کی اشد ضرورت محسوس ہوتی۔ ایک مقررہ وقت میں پورا پرچہ حل کر کے دینا ہوتا تھا۔ اکثر وہ ایک ہی سوال کو حل کرتے ہوئے اتنا وقت لگا دیتی کہ بقایا پیپر تسلی سے نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر اس نے ٹائم کا حساب رکھنے کے لیے ساتھ بیٹھی کلاس فیلوز سے بار بار ٹائم پوچھنا شروع کر دیا۔ جس پہ ٹیچر سے الگ ڈانٹ پڑی۔ اس سمسٹر میں بھی یہی ہوا' مگر اس نے بہت محنت کر کے پچھلے ایگزامز کی نسبت خاصے اچھے نمبر لے لیے۔

اور وہ یہی خبر چھاجی کو سنانا چاہتی تھی مگر وہ تھے کہ "دستیاب" ہی نہ ہو رہے تھے۔ اب اس اچانک ٹکراؤ پہ وہ خوشی سے بے قابو ہو گئی کیونکہ اس نے اب ان سے ملنے کی امید چھوڑ ہی دی تھی کہ چند گھنٹوں بعد وہ رات کی تقریب میں مصروف ہو جائیں گے۔

"چھاجی..." وہ نعرہ مارتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی جو آنکھوں میں بے تحاشا تحیر سمیٹے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اسکائی بلیو کلر کا نائٹ سوٹ' شکنوں سے پر' بکھرے بے ترتیب بال' ہلکے سرخ ڈوروں والی حیران پریشان آنکھیں ... ذرا ذرا سی متورم تھیں۔ شاید رات بھر نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے' شیو بڑھی ہوئی۔ اور ایک مزید اضافہ وہ مونچھیں جوان کے کھلے سانولے چہرے کو خاصا بارعب بنا رہی تھیں۔ چھاجی کی خاموشی اسے خائف کر گئی۔

"شاید مجھے ایسے چلانا نہیں چاہیے تھا۔" وہ سوچنے لگی۔ کچھ چھاجی کا سراپا بھی اسے رعب میں لا رہا تھا۔ وہ اس سے بڑے تو تھے ہی اور سنجیدہ کم گو بھی ہمیشہ ہی کے تھے۔ لیکن آج کچھ زیادہ ہی بڑے لگ رہے تھے۔ شاید ان مونچھوں کی وجہ سے۔ یا شاید اس طویل خاموشی کی وجہ سے' ان کی سنجیدگی اور اپنے اور ان کے درمیان عمر کے بارہ تیرہ برس کے فرق کے باوجود اسے ہمیشہ ان کی ذات سے ایک دوستانہ اپنائیت کا احساس ہوا۔ اس نے بولنا سیکھا تو سیدھا ان کا نام لیا۔ "چھاج" (شہزاد) نہ بھیا۔ نہ بھائی جان۔ لیکن ایک احترام تھا جو اسے عمر کے ساتھ ساتھ خود بخود اس نام کے آگے "جی" کا اضافہ کرنے پہ مجبور کر گیا۔

"دوئی؟" بہت دیر بعد وہ بولے تو آواز میں بوجھل پن کے ساتھ ایک ناقابل یقین سا استفسار تھا اور وہ جو پلٹ کر نیچے اترنے کو تھی' ایک دم کھل گئی۔

"چھاجی! میں کب سے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پتا ہے کلاس سیونتھ کے فرسٹ سمسٹر کا رزلٹ آگیا ہے اور میں نے پورے ۷۵ پرسنٹ مارکس لیے ہیں۔ ویسے میری پوزیشن تو ٹاپ ٹین میں بھی نہیں لیکن سکستھ کے اینول رزلٹ سے تو بہت اچھے مارکس ہیں' ہیں نا چھاجی! اور میں اب اور بھی محنت کروں گی' بہت زیادہ زیادہ پڑھوں گی۔ سیونتھ کے اینول رزلٹ میں ضرور ٹاپ تھری میں سے ایک پوزیشن تو لوں گی۔" وہ جوش سے بتاتے بتاتے رک گئی۔

"دوئی! تم کتنی بدل گئی ہو؟" چھاجی کی حیرت میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ وہ اب آنکھوں کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی اتر آئی تھی۔ دعا جھینپ گئی۔

"شاید... نہیں یقیناً... وہ میرے اتنا زیادہ بولنے کی وجہ سے کہہ رہے ہیں۔ پہلے میں کب اتنا زیادہ بولتی تھی... اور وہ بھی چھاجی کے سامنے؟ یہ سب اس نئے اسکول کی وجہ سے ہے' پرانے اسکول کی استانیاں اور وہ گندی مندی لڑاکا لڑکیاں' ان کو تو منہ لگانے کو دل ہی نہ چاہتا تھا اور اس نئے اسکول میں آنے کے بعد پہلے تو مجھے لگا جیسے میری بولتی ہی بند ہو گئی ہو پھر اتنی اچھی اچھی ٹیچرز... کتنے پیار سے بات کرنے والی اور وہ اتنی اچھی نئی فرینڈز۔ میں واقعی اب بہت بولنے لگی ہوں۔ صبح مامی جی کے ساتھ جب کھیر بناتے ہوئے انہیں اسکول کی باتیں بتا رہی تھی تو تب وہ بھی تو ماتھے پر ہاتھ مار کے کہنے لگی تھیں۔

"ہائے نی کڑیے' تو کتنی پٹر پٹر کرنے لگی ہے۔ میرا تو سر دکھا دیا ہے تو نے۔ چل نکل باورچی خانے سے' میں آپ بنالوں گی کھیر۔"

شاید چھاجی کو بھی میرا پٹر پٹر کرنا اچھا نہیں لگا۔

"سوری چھاجی! وہ... دراصل بہت عرصے بعد آپ کو دیکھا ناں... تو دل کر رہا تھا ساری باتیں ابھی کر دوں۔ پتا نہیں آپ پھر کب ملیں... ورنہ میں اتنی زیادہ باتیں نہیں کرتی... سچ۔" وہ کھسیانی ہو کر وضاحت دینے لگی تو ایک مدت کے بعد اس نے چھاجی کو ہنستے دیکھا... اور ہنستے سنا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا... میں تو... اچھا چلو آؤ' نیچے چل کے بیٹھتے ہیں۔ تم نے جتنی باتیں کرنی ہیں' ایک سال سے جو جو خبریں جمع کی ہوئی ہیں' سب سنا ڈالو۔" وہ اسے ہاتھ کا اشارہ کرتے سیڑھیاں اترنے لگے۔ وہ بھی پیچھے ہی تھی۔

"نہیں چھاجی! میں تو میلاد سے اٹھ کے آئی ہوں۔ بس اب دعا ہونے والی ہے اور پھر کھانا لگے گا۔ ابھی تو بالکل ٹائم نہیں ہے۔ ویسے آپ کل رات کتنے بجے آئے تھے' میں کافی دیر آپ کا انتظار کرنے کے بعد وہیں لاؤنج میں سو گئی۔" اس کی بات پر چھاجی ایک دم کرنٹ کھا کے پلٹے... یوں کہ ان سے ایک قدم پیچھے دعا لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچی۔ وہ حیران ہو کے ان کو دیکھنے لگی جن کا رنگ پہلے سرخ اور اب زرد ہو گیا تھا۔

"تو... رات لاؤنج میں تم تھیں...؟" سرسراتے لہجے میں کیے سوال پر وہ صرف اثبات میں گردن ہلا سکی۔ اس نے دیکھا کہ ان کی متورم آنکھوں کے سرخ ڈورے پھیل کر ساری آنکھوں کو لہو رنگ کر گئے۔

"کیوں؟" وہ دھاڑے۔ وہ گھبرا کے ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر ایک سیڑھی چڑھ گئی۔

"یہ کوئی طریقہ ہے' جہاں دل چاہا' وہیں سو گئے۔ آخر تم..." کچھ کہتے کہتے رک کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئے۔ جب کہ دعا کو یہ چند زینے طے کرنا محال ہو گیا۔

"کیا واقعی ابا جی ٹھیک کہتے ہیں' دولت انسان کو مغرور اور بد دماغ کر دیتی ہے۔ کیا یہی چھاجی ہیں' کیا واقعی انہیں اس بات کا غصہ ہے کہ میں ان کی اجازت کے بغیر ان کے نئے سجے سجائے گھر کے قیمتی صوفے پر سو گئی۔ ٹھیک بھی تو ہے' چاہے یہ میرے ماما جی کا گھر ہے لیکن مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا' جہاں مامی جی کہتیں' وہیں سوتی۔ کتنا برا لگا ہے چھاجی کو۔" وہ افسردہ سی کچن تک آئی' جہاں چھاجی' مامی جی سے الجھ رہے تھے۔

"جب کسی کی لڑکی کو گھر لاتے ہیں تو پھر ذمہ داری بھی اٹھاتے ہیں۔ خود آپ کمرے میں بند ہو گئیں اور اسے اکیلی کو لاؤنج میں سلا دیا۔ اگر کچھ ہو جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا۔"

"آئے ہائے پتر! کیا ہونا تھا' وہ کوئی بچی ہے۔ جو ڈر کے جاگ جاتی اور پھر گھر کے اندر ہی سوئی تھی"

"اور گھر کے اندر کون کون تھا' آپ کو پتا بھی تھا کہ میں ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے کر گیا تھا' وہ باہر برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اگر لاؤنج کا دروازہ بے دھیانی میں کھلا رہ جاتا تو... اور وہ پنڈ سے آئے آپ کے دونوں بھانجے جو چھت پر سوئے ہوئے تھے۔ کیا پتا رات کو نیچے اتر آتے... اور شاید اترے بھی ہوں۔" وہ مٹھیاں بھینچنے لگے۔ ان کی اضطراری کیفیت دیکھ کر دعا گھبرانے لگی۔ اتنی ناسمجھ تو نہیں تھی کہ جان نہ پائی کہ اصل میں اس کے اکیلے لاؤنج میں سونے پر چھاجی کا اعتراض کیا تھا' بلکہ اسے نہ صرف اپنی سابقہ سوچ پہ تاسف ہوا بلکہ اصل وجہ جان کر خوشی

بھی ہوئی کہ وہ اس کی کتنی فکر کرتے ہیں' کتنا خیال رکھتے ہیں۔

شام کی دعوت کے لیے مامی جی نے اس کے لیے خاص طور پر جوڑا بنوایا تھا۔ ویسے تو صبح میلاد پر سفید چکن کا کرتا شلوار بھی انہوں نے ہی دیا تھا لیکن اس سبز اور زرد شلوار قمیص کی چھب ہی نرالی تھی جس پر سلور تلے کا بڑا ہلکا مگر خوبصورت کام تھا۔ مامی جی نے اسے اپنی چاندی کی جھمکیاں بھی دی تھیں جن پر نئی پالش ہوئی تھی اور کانچ کی سبز چوڑیاں اور ریشمی زرد پراندہ' پہلی بار بالوں میں رنگین پراندہ ڈالتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے بال عام لڑکیوں کی طرح سیاہ یا بھورے نہیں بلکہ سنہری ہیں۔ ہمیشہ سے گھر کے بنے ہوئے کالے پراندوں میں تیل سے لپٹے بال گوندھتے ہوئے کبھی اس نے اپنے لمبے بالوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس نئے اسکول میں تیل لگا کر آنا منع تھا۔ کتنے ہی دن اسے سر خالی خالی سا لگا۔ رزلٹ آنے کے بعد چھ چھٹیاں ملیں تو اس نے بھر کے سرسوں کے تیل کی پیالی اپنے روکھے سر میں انڈیل لی۔ اسی شام مامی جی اسے دو دن کے لیے لینے آ گئیں۔ کل کا دن ایسے ہی ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام کراتے گزر گیا۔ صبح میلاد کے لیے اس نے نہا دھو کے سفید چکن کا جوڑا پہنا۔ پہلی بار شیمپو کی خوشبودار جھاگ سے دھوئے بال ابھی سوکھے بھی نہیں تھے کہ مہمان عورتوں کے آنے کی وجہ سے اس نے انہیں گیلا گیلا ہی جوڑے کی شکل میں لپیٹ لیا۔ اب شام کی تیاری کرتے ہوئے اس نے اس جوڑے کو کھولا تو شیمپو کی مہک اس کے حواسوں میں چھانے لگی۔ کنگھے سے بال سلجھانے لگی تو ریشم کے گچھے سلجھتے ہی چلے گئے۔ سنٹ میں ریشمی آبشار شانوں پر بہنے لگی۔

"ہائے کتنا اچھا ہوتا ہے یہ شیمپو۔ زور لگا لگا کر بالوں کی الجھن نہیں دور کرنی پڑتی اور خوشبو بھی کتنی ہے' چمک بھی رہے ہیں۔"

اور ہو سکتا ہے یہ چمک ہمیشہ سے اس کے بالوں کا حصہ ہو مگر اس نے کبھی غور ہی نہ کیا ہو۔ بالکل ایسے جیسے اس کے بالوں کی سونا سی رنگت بچپن سے تھی لیکن محسوس اسے آج ہوئی۔ جب گہرے زرد پراندے میں سے سنہری پن جھلک رہا تھا۔ چمکتا دمکتا نیا قیمتی ریشمی جوڑا پہنے' پیروں میں تلے والا کھسہ ڈالے' کانوں میں جھمکیاں اور کلائی میں چوڑیاں پہننے کے بعد خود بخود ہی اس کے ہاتھ سنگھار میز پر رکھے دوسرے سامان کی طرف بڑھنے لگے۔ مامی جی خاصی شوقین مزاج تھیں۔ پھیلے ہوئے وجود اور پکی سانولی رنگت کے ساتھ بھی خوب شوخ رنگوں کا استعمال اور بننے سنورنے کا شوق انہیں نمایاں رکھتا تھا۔ اس نے کاجل کی لکیر اپنی سبز آنکھوں کے نیچے پھیری۔ گلابی لپ اسٹک بھی لگالی۔ باقی اشیاء کا استعمال اسے نہیں آتا تھا' اس لیے رہنے دیا۔ کمرے سے تو وہ نکل آئی مگر اوپر جاتے ہوئے جھجک سی گئی تھی۔ پہلی بار میک اپ کیا تھا' ڈر بھی لگ رہا تھا کہیں مامی جی ڈانٹ نہ دیں۔ ابا جی ہی نہ بولنے لگے۔ وہ اسی سوچ میں تھی کہ چھا جی کی آواز آئی۔

"دوئی! تم.... تم تو پہچانی ہی نہیں جا رہیں۔"

وہ اور گھبرا گئی۔ بے اختیاری میں اپنا ہاتھ لبوں پر جما لیا تاکہ لبوں کا گلابی پن زیادہ نہ ظاہر ہو۔

"تمہیں میک اپ کی ضرورت تو نہیں تھی۔" وہ قریب آ کے گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کی آواز اور بھی بوجھل اور بھاری لگ رہی تھی۔ وہ چونک کے دیکھنے لگی۔ کہ یہ تعریف تھی یا تنقید.... اس کی نظر پڑتے ہی واضح طور پر چھا جی کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹے' جیسے.... جیسے.... آگے کوئی کھائی.... کوئی گڑھا

"میرا مطلب ہے کہ تم تو ابھی بہت چھوٹی' ہو' بہت چھوٹی۔" وہ یوں زور دے رہے تھے جیسے اس کی بجائے خود کو یقین دلانا چاہتے ہوں۔ وہ پہلے ہی اس میک اپ کی وجہ سے نروس تھی' ان کی بات پر اور گھبرا گئی۔

"میں اچھی نہیں لگ رہی چھا جی! بولیں ناں کیا میں اچھی نہیں لگ رہی۔" اس کے سوال پر چھا جی کے چہرے پر بے بسی کے آثار نمایاں ہوئے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر روک رہے ہوں خود کو۔

یا جیسے وہ خود کو روکنا چاہتے ہوں کچھ کہنے سے.... مگر کہنا پڑ رہا ہو۔

"نہیں' اچھی تو.... بس بڑی بڑی لگ رہی ہو.... اور دوئی! تمہیں اتنی جلدی بڑی ہونے کی ضرورت کیا ہے۔"

وہ اس کے سر پر چپت لگا کر چلے گئے مگر دوپٹے کے پلو سے ہونٹوں کو رگڑتی ہوئی دعا سوچ رہی تھی۔

"چھا جی! آپ کو میرا بڑا ہونا پسند نہیں تو مجھے بھی نہیں ہونا بڑا۔ مگر میں کیسے خود کو بڑا ہونے سے روکوں۔" سر جھٹکتے ہوئے اس نے آگے بڑھنا چاہا تو لگا جیسے بالوں کے اوپر اب تک چھا جی کا ہاتھ دھرا ہو۔ وہ ڈر کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سر پر ہاتھ پھیر کے بھی دیکھا.... مگر لمس بھی بھلا کبھی نظر آتے ہیں۔ وہ تو مساموں کے اندر تک اتر کر ہو ہاؤ مچا دیتے ہیں اور دعا کے اندر بھی ایک لطیف سا احساس مست ہو کے ناچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاری بھاری سی ہو رہی تھی۔ وزنی قدم گھسیٹ رہی تھی۔ منوں بوجھ تلے دبی پلکیں بدقت اٹھا رہی تھی اور زبان ہلانا تو گویا سب سے مشکل کام لگ رہا تھا۔

مامی جی نے اس کی تھکن پر محمول کر کے ابا جی کو اسے ساتھ لے جانے سے روک دیا۔ وہ بھی نجانے کس موڈ میں تھے' مان گئے۔

"خیر سے شہزادے نے گڈی لی ہے' اپنی دوئی کو خوب گھمائیں پھرائیں گے۔"

اگلے دن شام کو چھا جی خاصی جلدی آ گئے اور ماما جی اور مامی جی کی حیرت سے ظاہر ہوتا تھا جیسے انہوں نے عرصے بعد چھا جی کو اس وقت گھر پر دیکھا ہے۔ دعا کو یہ گمان ہی ہواؤں میں اڑانے کو کافی تھا کہ چھا جی صرف اس کے لیے جلدی آئے ہیں۔ مامی جی ساتھ جانے کو تیار تھیں' انہیں گھومنے پھرنے کا ویسے بھی بہت شوق تھا مگر عین وقت پر ماما جی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ گھر پر رک گئیں۔ چھا جی کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی لگا جیسے وہ ٹھیک کہتے ہیں.... واقعی وہ خاصی بڑی بڑی لگنے لگی ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ چھا جی ہلکے نیلے رنگ کی جینز اور سفید سوتی شرٹ جیسے سادہ لباس میں بہت اچھے لگ رہے تھے' ان کے چہرے پر گہرا سیاہ چشمہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ہوا سے اڑتے بال انہیں تنگ کرتے تو اسٹیرنگ سے بار بار ہاتھ اٹھا کے ماتھے سے بال پیچھے کرتے ہوئے وہ اور بھی اچھے لگنے لگتے۔

"کیا دیکھ رہی ہو دوئی!" حالانکہ وہ سامنے سڑک پر دیکھ رہے تھے مگر پتا نہیں انہیں پتا کیسے چل گیا کہ وہ ان ہی کا جائزہ لے رہی ہے۔

"جی.... کچھ نہیں۔" وہ سٹ پٹا کے سارا دھیان راستے کی گہما گہمی پر دینے لگی مگر دھیان تھا کہ اسی کالے چشمے کے اسرار میں اٹکا ہوا تھا۔ دل تھا کہ بار بار بالوں کو انگلیوں سے پیچھے کرنے والے منظر میں کھویا ہوا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے.... اگر چھا جی کو نظر لگ گئی تو۔ ٹھیک ہے' وہ اچھے لگ رہے ہیں مگر یوں نظریں پھاڑ کے نہیں دیکھنا چاہیے۔ مامی جی بتاتی ہیں' چھا جی کا خون بہت ہلکا ہے' نظر فوراً" لگ جاتی ہے۔ مجھے ماشاء اللہ کہنا چاہیے۔" اسے ماشاء اللہ کہتے سن کر چھا جی نے استفسار کیا۔

"بس.... ایسے ہی.... وہ.... وہ بچہ.... وہ بچہ بہت پیارا لگا مجھے' اس لیے۔" بوکھلا کر وہ ہکلانے لگی پھر ذرا فاصلے پر نظر آتے بچے کی طرف اشارہ کر کے بات بنائی۔ چھا جی پھر ڈرائیونگ میں مگن ہو گئے مگر وہ اپنے ہی اس رد عمل پر جی بھر کے حیران ہو گئی۔

"بھلا میں اصل بات چھا جی سے کیوں چھپا گئی کہ میں نے یہ لفظ ان کے لیے ادا کیا ہے۔ اس میں شرمانے والی کون سی بات تھی۔ میں تو ایسے گھبرا گئی جیسے کوئی جرم کرتے پکڑی گئی ہوں۔" اس کے اس سوال کا جواب دل نے کچھ ایسا دیا تھا کہ وہ اور حیران ہو گئی۔

"کیوں؟ میں کیوں نہیں بتا سکتی چھا جی کو کہ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ کیا یہ بری بات ہے یا چھپانے والی بات" آگہی کے نئے در وا کرتا دل اسے کچھ حقیقتوں سے روشناس کرانے لگا۔

"تو کیا یہ "اچھا لگنا" وہ والا "اچھا لگنا ہے؟" اس نے پھر دل سے سوال کیا۔ جواب ملا۔ "شاید۔"

اسے اس بری طرح شرم آئی کہ وہ اپنی ہی انگلی چبا بیٹھی۔ زور سے آنکھیں میچ کر اس نے دل کے اس بے دھڑک تجزیے کی تردید کرنی چاہی مگر دل ثبوت کے طور پر پھر سے اس کے بالوں پر ان کے ہاتھوں کا لطیف لمس

جگانے لگا۔

”نن۔۔۔ نہیں چھاجی نہیں۔۔۔ وہ نہیں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہائے اللہ! چھاجی کی تو عادت ہے میرے دل کی ہر بات جان لیتے ہیں۔ اگر یہ بات بھی انہیں پتا چل گئی تو کیا سوچیں گے کہ دعا کتنی گندی لڑکی ہے۔ ایسی باتیں سوچتی ہے۔“ وہ اور شدت سے ناخن چبانے لگی۔

”بہت بھوک لگی ہے کیا؟ شکل پر بارہ بج رہے ہیں۔ آؤ پہلے کچھ کھالو پھر تمہیں اندر لے جاتا ہوں۔“

جوائے لینڈ کے آگے کار پارک کرتے کرتے انہوں نے دوبارہ سے ریورس کی اور دعا جھنجلا کے رہ گئی۔ کہاں تو وہ یہ سوچ کر سہم گئی تھی کہ اس کی اس سوچ کی بھنک چھاجی کو نہ پڑ جائے اور کہاں ان کے غلط اندازے پر بجھ گئی کہ وہ اس بار اس کے دل کی بات کیسے نہ بھانپ سکے۔ اسے سیدھا جوائے لینڈ لے کر آنا بھی اسے غصہ دلا رہا تھا۔

”مجھے بالکل ہی بچی سمجھتے ہیں کیا۔ سیونتھ میں ہوں اور چودہ سال پانچ ماہ کی ہوں۔ اگر جلدی اسکول داخل کرا دیتے تو اب نائنتھیا میٹرک میں ہوتی۔“

ان کے ساتھ ”شیزان“ کے سحر انگیز ماحول میں داخل ہوتے ہوئے وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھی۔ آرڈر بھی انہوں نے اس کی خاموشی سے تھک کے خود ہی دے دیا۔

”ہائے شہزاد۔“

ایک مترنم سی آواز پر اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ مانوس سے چہرے والی جو بھی تھی‘ بے انتہا حسین اور ماڈرن تھی۔۔۔ اور چھاجی سے ایسے مل رہی تھی جیسے دو گہرے دوست۔ اس کی چست جینز اور بغیر آستین کی شرٹ دیکھ کر دعا کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئیں اور پھر جس طرح وہ ہاتھ ملانے کے بعد بھی اب تک چھاجی کا ہاتھ تھامے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مر مٹ جانے والے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ اسے اور بھی عجیب۔۔۔ اور کچھ کچھ برا لگ رہا تھا۔

”واؤ‘ ہاؤ پریٹی۔ کون ہے یہ انوسنٹ بے بی؟“ اچانک اس نے دعا کو دیکھا۔ پریٹی اور انوسینٹ کے الفاظ یقیناً اسے مسرور کر جاتے‘ اگر بے بی کا اضافہ نہ ہوتا۔ وہ بد تمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاپروائی سے کیچپ میں ڈبو ڈبو کر چپس ٹونگنے لگی۔ اس کے نظر انداز کر دینے پر چھاجی نے خفت محسوس کی۔

”یہ دوئی ہے مگر پتا نہیں آج ناراض ناراض سی کیوں ہے۔ اسے جوائے لینڈ لے کر آیا تھا تاکہ اس کا موڈ کچھ ٹھیک ہو سکے۔“

”یہ دوئی ہے‘ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ صاف کہتے۔۔۔ کہ یہ دعا ہے‘ دعا نور‘ میری کزن۔۔۔ اف لفظ کزن پر یہ چھپکلی کیسے جل بھن جاتی۔“

ان دنوں ”کزن“ لفظ اس کے نزدیک خاصا رومینٹک تھا۔ اس کی کتنی ہی کلاس فیلوز اپنے اپنے فیورٹ کزنز کے قصے سنایا کرتیں۔ کوئی بہت ہینڈسم تھا‘ کسی کا اکیڈمک ریکارڈ شاندار تھا‘ کوئی زبردست ایتھلیٹ تھا‘ کسی کا سینس آف ہیومر کمال کا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہتی۔ کبھی خیال نہ آیا کہ وہ بھی چھاجی کا ذکر چھیڑے۔ چھاجی آج سے پہلے اس کے لیے صرف چھاجی تھے‘ نہ کزن‘ نہ دوست‘ نہ بھائی۔۔۔۔ بس چھاجی۔۔۔ ایک مہربان سایہ لیکن آج دل ایک الگ ہی راگ الاپ رہا تھا اور اپنے کچے پن میں دل کے ہاتھوں ڈھلتی جا رہی تھی جس جس سانچے میں بھی وہ اس کی سوچ کو اتارنا چاہتا‘ وہ اتار دیتی۔ یہ کھٹ مٹھی سوچیں‘ یہ نظروں کی بے ایمانیاں‘ یہ دل کا دھڑکنا‘ یہ من ہی من میں ناراض ہونا‘ اندر ہی اندر کڑھنے کرنا۔۔۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔

اس رات وہ جاگتی رہی‘ سوچتی رہی۔۔۔ بوجھل پلکیں جھپکنا تک دشوار ہو گیا تھا مگر وہ زبردستی انہیں کھولے ہوئے تھی۔ نیند کے ہاتھوں وہ اتنی خوبصورت سوچیں ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ صبح فجر کی نماز ادا کر کے اس نے لاؤنج کے پردے کھینچے تو باہر چھاجی کی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔ اسے یاد آیا وہ جینز والی لڑکی سے کہہ رہے تھے کہ رات کو شوٹنگ پر ملاقات ہوگی۔

”اس کا مطلب ہے وہ اب تک واپس نہیں لوٹے۔ اسی چھپکلی کے ساتھ ہوں گے۔“

نوعمری کی محبت راتوں رات ہر جذبے ہر کسک سے نواز گئی تھی۔

جلاپے کی یہ تڑپ بھی اس کچی پکی محبت کا اعجاز تھی۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اتنی بے چین کہ باہر نکل گئی اور نومبر کی اس آخری صبح کی اولین ساعتوں میں ننگے پیر گھاس پر ٹہل کے ان کا انتظار کرنے لگی۔ ہلکا سا سوتی جوڑا بھی اسے خنکی کا احساس نہ دلا سکا۔ اس کی جان میں جان آئی جب آدھ گھنٹے بعد چھاجی کی کار اس مختصر سے پورچ میں داخل ہوئی۔ وہ بے تابی سے آگے بڑھی۔ چھاجی کا چہرہ سخت تھکن کا شکار تھا۔ آنکھیں اسی طرح سرخ۔۔۔ اور قدم بوجھل۔ اسے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔

”تم اتنی صبح سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو؟ نہ شال‘ نہ سویٹر‘ ننگے پیر۔۔۔ چلو اندر‘ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“

وہ تو ہمیشہ سے ہی اس کے ساتھ ایسے پیش آتے تھے‘ خیال رکھتے تھے مگر آج یہ توجہ اس کا دل بھرا گئی۔

”اور آپ ساری ساری رات کہاں غائب رہے۔ آپ تو کہہ رہے تھے آج رات میری کوئی شوٹنگ نہیں۔“

”ہاں تھی تو نہیں مگر نکلی۔۔۔ وہ ماڈل جو رات کو ریسٹورنٹ میں ملی تھی‘ اس کے پہلے پلے کی پہلی شوٹنگ تھی‘ اس نے بلایا تھا تاکہ اس کی ہمت بندھی رہے۔ وعدہ کیا تھا‘ لہٰذا جانا ہی پڑا۔“

”اتنا خیال ہے آپ کو ان کا۔“ وہ رشک و حسد سے ملے جلے جذبے سے مغلوب ہو کے بولی۔ لہجے میں ہلکی سی کسک اس کی بھی تھی کہ یہ توجہ صرف میرے لیے نہیں بلکہ کسی اور کے لیے بھی ہے۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھنے لگے مگر دعا کو اس خاموشی میں عجیب اسرار محسوس ہوا جیسے وہ اقرار کر رہے ہوں کہ ہاں نیلی میرے لیے بہت خاص ہے‘ بہت خاص۔

”چھاجی! کیا آپ اس سے محبت کرتے ہیں؟“

بہت سی باتوں کی طرح دعا آج تک یہ بھی نہیں جان پائی کہ یہ جملہ اس کے لبوں سے کیسے آزاد ہوا۔۔۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے بعد کہے جانے والے اور بہت سے فقرے۔ بس ایک قیاس تھا اور وہ یہ کہ یہ لمحہ۔۔۔ یہ جذبہ وقت نے اسے عمر سے بہت پہلے سونپ دیا تھا اور آداب محبت اور اقرار کے قرینے جو عمر نے ابھی اسے سکھانے تھے‘ وہ ان سے ناواقف تھی۔ اسے تو بس یہ پتا تھا کہ یہ جذبہ جو ایک کونپل کی صورت دل کی کچی مٹی میں سے جھانک رہا ہے‘ کسی نہ کسی طرح اسے اپنے چھاجی کی نگاہ میں لانا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بے دھیانی میں وہ اسے کچل کر آگے چلتے بنیں۔ اسی خوف سے زرد پڑ کے وہ یہ سوال پوچھ بیٹھی تھی۔

”کیا آپ اس سے محبت کرتے ہیں؟“

چھاجی کے بڑھتے قدم رک گئے۔ چند لمحے تو وہ سامنے دروازے کو ہی گھورتے رہے پھر ماتھے پر شکنیں لیے گردن موڑ کے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے؟“

ہائے! کاش وہ یہ سوال نہ کرتے بلکہ کچھ بھی نہ کہتے‘ چپ چاپ اندر چلے جاتے۔ کچھ کہنا اتنا ہی ضروری تھا تو بس ہاں یا ناں میں جواب دے دیتے اور اگر برا لگا تھا تو بے جھجک ڈانٹ دیتے مگر انہوں نے پوچھا بھی تو کیا۔

”ہاں۔“ دعا نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”مجھے پتا ہے محبت کیا ہوتی ہے‘ وہی۔۔۔ جو مجھے آپ سے ہے۔“

ایک دھماکا تھا جو دعا نے کیا مگر گونج چھاجی کے تھپڑ کی تھی جو اس انکشاف کے اگلے لمحے اس کے گال پر پڑا تھا۔ اس چھ فٹے لمبے چوڑے تنومند‘ غصے سے بپھرے مرد کے آہنی پنجے کے وار سے وہ چار فٹ کی چھوٹی سی کومل لڑکی منہ کے بل گر گئی۔ اس کے ماتھے پر گملا لگا تھا‘ اس کے زخم سے خون رس رہا تھا‘ دونوں زخموں سے۔۔۔ ماتھے کے زخم سے بھی۔۔۔

اور ہونٹ کے زخم سے بھی۔۔۔ جہاں چھاجی کے وزنی ہاتھ کی پہلی انگلی میں موجود پلاٹینم کی ہیرا جڑی انگوٹھی

کی ضرب لگی تھی۔

ایک زخم اور بھی تھا۔ مگر اس کی حالت اتنی بری تھی کہ وہ خون بہانا تک بھول گیا تھا۔ یہ اس کے جلد باز دل کا ادھڑا ہوا زخم تھا۔

وہ سر جھکائے مٹی سے لتھڑے ہاتھوں پر گرتے خون اور آنسوؤں کے قطرے دیکھتی رہی اور اسے کیچڑ میں گری اس پانچ سالہ بچی کے آنسو اور خون یاد آتے رہے جسے چھاجی نے اپنے کرتے کے دامن سے صاف کیا تھا۔ چھاجی کے قدم اس کے مٹی میں دھنسے ہاتھوں کے نزدیک آ کے رکے۔ اس نے سر اٹھایا اور نو سال پہلے والے درد کی ٹیسیں جاگ اٹھیں۔

"چھاجی!" اس کے سوجے ہوئے ہونٹوں سے کراہ نکلی مگر اس بار چھاجی نے اس روتی ہوئی شکایتیں کرتی آنکھوں والی بچی کو کیچڑ میں لگے کنول کی طرح بانہوں میں نہیں بھرا۔ اس نے اسے گالی دی۔ بڑی سنگین گالی۔ وہ رونا بھول کے پورا سر اٹھا کے اس شخص کو دیکھنے لگی جس کی زبان ہمیشہ اس کے لیے پھول برساتی تھی مگر آج وہاں کف بہہ رہا تھا۔ غلیظ گالیوں کا طوفان امنڈ رہا تھا۔

"ذات اپنا رنگ دکھا کے رہتی ہے گندا خون جوش مار ہی بیٹھتا ہے۔ میں سمجھتا تھا تو ایسی نہیں' میری توجہ اور اچھے اسکولوں کی تعلیم تجھے اس ماحول کا حصہ نہیں بننے دے گی۔ مگر یہ بھول گیا تھا کہ میں تجھے طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی لے سے دور نہیں کر سکا تو تیرے اندر ٹھاٹھیں مارتے خون کی کمینگی کیسے دور کر سکتا ہوں۔ شرم نہیں آئی تجھے' اس عمر میں تیرا یہ حال ہے' جوانی میں تو باپ کو خوب عیش کرائے گی۔ ایک دن کار میں کیا گھوم لیا' ہوٹل میں کھانا کیا کھا لیا' اچھے کپڑے کیا پہن لیے' فوراً باپ کی پڑھائی پٹیوں پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تیرا باپ تجھے اس مقصد کے لیے یہاں چھوڑنے پر تیار ہوا ہے۔ ایسا نہیں کہ میں اللہ وسایا کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہوں بلکہ غلط فہمی مجھے تیرے متعلق تھی۔ میرا خیال تھا کہ پھوپھی جی کو دیے وعدے کو پورا کرتے ہوئے میں نے تجھے اس گندے ماحول سے دور رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور تجھ پر اپنے خاندان کی ان لڑکیوں کا ذرا اثر نہیں ہوگا جن کا کام ہی عشق و محبت کے نام پر لوگوں کو لوٹنا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ اللہ وسایا بھی اس بھولی صورت اور معصوم سوچ کو آلودہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ اب پتا چلا ہے کہ یہ خود ساختہ معصومیت بھی ایک ہتھیار تھا۔ رہی ناں تو وہی ایک ہیرا منڈی میں بیٹھنے والے طبلچی کی بیٹی۔"

☼ ☼ ☼

"چل اتر اوا پتر! ایہیں ہونا ہے تیرا پروگرام۔"

اللہ وسایا کی آواز پر دعا بھرپور انداز میں چونکی۔ خالی خالی نظروں سے کتنی دیر تک اسے' اس گاڑی کو۔ اور سامنے کھڑی پروقار و عالیشان عمارت کو دیکھتے رہنے کے بعد بھی اسے یاد نہ آیا' وہ کہاں ہے اور کیسے ہے۔ اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ رخسار پر پھیرا۔ وہاں اب تک ایک پرحدت سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے ماتھے اور لبوں کو ہاتھ سے چھو کر آنکھوں کے سامنے کیا' نہ خون تھا نہ مٹی۔۔۔ نہ آنسو۔ وہ خشک تھی۔۔۔ بالکل خشک۔

"او کیا ہو جاتا ہے تجھے۔ مجھے لگتا ہے تجھے سرسام ہو گیا ہے۔ جھلی سودائی کی طرح پٹر پٹر تکنے لگتی ہے۔" وہ ڈپٹنے لگا۔ دعا آہستہ آہستہ حال میں واپس آنے لگی۔

"یہ جو بوتھے پہ بارہ بجائے ہوئے ہیں' چھیتی سے ٹھیک کر۔ پتا نہیں کون سے نمبر پر تیری باری آئے۔ اس شکل کو کوئی اسٹیج پر جانے ہی نہیں دے گا۔ اپنا بھی بیڑہ غرق کرائے گی تو اور اپنے بڈھے پیو کا بھی۔"

اتنی خوراک کافی تھی دعا کے حواس ٹھکانے کے لیے۔ وہ چپ چاپ اپنا بھاری کامدار دوپٹہ سنبھالے اتری۔ اس کے لبوں پر اب ایک پھیکی سی بے جان مسکراہٹ سجی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او ربا عشق نہ ہووے۔۔۔

او ربا عشق نہ ہووے۔۔۔

ربا عشق۔۔۔"

عمیص نہ جانے کہاں سے یہ گانا سن آیا تھا جس کی تکرار صبح سے جاری تھی اور خاصے زور و شور سے جاری تھی۔ یہاں تک کہ موتیا تنگ آ کر کچن سے نکلی۔

"یہ تم اس قدر چیپ چیپ گانے کہاں سے سن آتے ہو۔"

"جہاں سے چیپ چیپ کپڑے خرید کر لاتا ہوں اور جہاں سے اتوار کو چیپ چیپ سبزیاں چن کر لاتا ہوں۔۔۔ یار میری زندگی میں سب کچھ چیپ چیپ' یعنی سستا ہی تو رہ گیا ہے۔ ایکسپینسو میں بے چارہ بے روزگار افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔" اس کی صاف گوئی پر موتیا کی رگ شرارت پھڑکی۔ اس کے قریب آ کر رازداری سے سرگوشی کی۔

"تو پھر دل اتنی اونچی جگہ کیوں پھنسا لیا' مسٹر بے چارے۔ کیا تمہارا بجٹ کا مارا ہوا دل اتنی پرتعیش قسم کی 'دلگی' افورڈ کر سکتا ہے؟"

تم کو چاہا تو اوقات سے بڑھ کے چاہا
پاؤں پھیلائے تو پھر دیکھی نہیں چادر ہم نے

وہ بے چارگی سے گنگنایا۔

"اوقات۔۔۔؟ چہ۔۔۔ چہ۔۔۔" موتیا کو عمیص کی زبانی یہ اعتراف سچ مچ کے تاسف میں مبتلا کر گیا۔

"میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی مگر تم تو سیریس ہو گئے۔ خوامخواہ کا احساس کمتری پال رکھا ہے تم نے۔ ایک طرف اپنے جذبے کو عشق کا نام دیتے ہو' دوسری طرف عشق کے اصولوں کی نفی کرتے ہو۔ تم نے سنا نہیں۔

تجھ کو چاہا' تیری دہلیز کو سجدہ نہ کیا
وہ میرا عشق تھا یہ میری خودداری ہے

"مگر تمہاری ساری خودداری تو نجانے کیوں اسے سامنے پا کر اڑن چھو ہو جاتی ہے۔"

"یہ دہلیز کو سجدہ نہ کرنے والوں کے فلسفے تم نے سن رکھے ہوں گے ہم تو فقط اتنا سن پائے ہیں کہ۔

بات انا کی چھوڑیے عشق کے اس وبال میں

یا۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔"

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ میرے سامنے ہی سب یاد آتا ہے تمہیں۔ اس کے سامنے تو بولتی بند ہو جاتی ہے۔" اس نے جھنجلا کر اس کے آگے چائے کا کپ پٹخا جو اس بحث میں تقریباً ٹھنڈا ہو چلا تھا۔

"یار! چائے دینا ہی ہے تو مہمانوں کی طرح دو۔ بیویوں کی طرح کیوں دیتی ہو۔" اس کی اس بات پر کچن کی طرف پلٹتی موتیا کا دل جھنجھنا کے رہ گیا۔ اس کے کان کی لوئیں تک سرخ ہو گئیں۔

"کیا فضول بکواس ہے یہ۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ایک تو تمہارا چائے پٹخنے کا یہ قاتلانہ اسٹائل' اوپر سے چائے ٹھنڈی بھی ہے اور بغیر چینی کے بھی۔"

"میں چائے گرم ہی لائی تھی' تم نے بے کار کی بحث میں شروع کر دی اور جب کوئی چھ سات منٹ تک چائے کا کپ کنیزوں کی طرح اٹھائے کھڑے رہے مگر کوئی ہاتھ کپ تھامنے آگے نہ بڑھے تو اسے یونہی پٹخا جاتا ہے۔ رہی چینی تو بندہ بشر ہوں بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔"

اس کی زبان پتا نہیں اور کتنی دیر فراٹے بھرتی کہ راہداری سے صاحبزادہ نفیس علی خان کے کھنکارنے کی آواز سن کر فوراً "بریک لگائی۔ سر پر دوپٹہ ٹھیک طرح سے جما کر تخت پر پھیلے اخبار سمیٹنے لگی۔ عمیص بھی فوراً سے پیشتر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا تھا' ورنہ اس سے پہلے تخت پر اوندھا گرا ٹانگیں جھلاتا ہوا گانے گا رہا تھا۔

صاحبزادی حرمت النساء اور صاحبزادی خلعت النساء دونوں پیش دالان میں سنگی تخت پر بیٹھ کے دھوپ کے مزے لے رہی تھیں۔ ساتھ میں وظیفہ جات پڑھے جا رہے تھے۔ آج جمعہ کا مبارک دن تھا اور دونوں ہی سب معمولات پس پشت ڈال کر فجر سے لے کر نماز جمعہ تک وظیفے اور نفلی نمازیں پڑھتیں۔ بھابھی آپا تو عرصے سے گھریلو معمولات سے کنارہ کش تھیں مگر اس روز صاحبزادی حرمت بھی عبادت کو ہی ہر چیز پر ترجیح دیتیں۔ وقفے وقفے سے جب موتیا انہیں چائے وغیرہ دینے آتی تو وہ اسے بھی تلقین کرتیں۔

"صاحبزادی الماس" کام تو چلتے ہی رہتے ہیں' اس مبارک دن کی ہر ساعت سے فیض اٹھانا چاہیے۔ آپ نے چاشت کی نماز ادا کی۔ سورۃ واقعہ کی تلاوت کی؟"

"نہیں امی حضور" نماز تو نہیں۔۔۔ تلاوت میں نے فجر کی نماز ادا کرنے کے ساتھ ہی کر لی تھی اور سورۃ مزمل کی بھی تلاوت کر لی تھی۔"

"ماشاءاللہ۔ اب ضروری کاموں سے فراغت کے بعد غسل کر کے آجائیں تاکہ بھابھی آپا نماز تسبیح شروع کروا سکیں۔"

"جی بہتر۔"

مگر کچن میں نہ رکنے والے کاموں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو اسے جانے سے روکتا رہا۔ جمعہ کی صبح ابا حضور نے چند ایک دوستوں کو ناشتے کی دعوت دی تھی۔ خاصا اہتمام تھا اور مزید یہ کہ یہ پر تکلف ناشتا دو نشستوں میں چلا۔ یعنی کہ اس کا کام دوگنا ہو گیا۔ پہلے جو مہمان آئے ان کے لیے الگ سے پراٹھے اترے اور پوریاں تلی گئیں انڈے ابلے۔۔۔ دوسری بار آنے والے مہمانوں کے لیے دوبارہ سے سب کچھ تازہ بہ تازہ گرما گرم پیش کیا گیا۔ ناشتے کے بعد چائے' قہوے کے دور چلے۔ چائے بھی دو تین طرح کی بنی۔ کشمیری سبز چائے' لیموں اور ادرک کا قہوہ۔۔۔ سادہ چائے یا بالائی دار۔ ان سب سے نمٹنے کے بعد اب وہ دلگیر کے ساتھ مل کر برتن دھو رہی تھی۔ نانا حضور کا لایا ہوا نفیس برتنوں کا سیٹ جو کبھی کبھار نکلتا تھا' آج مہمانوں کے سامنے رکھا گیا تھا' اس لیے موتیا خاص احتیاط سے کام لے رہی تھی ورنہ عموماً" برتن دلگیر ہی دھو لیا کرتا۔ اب عمیص کے سامنے چائے' بقول اس کے "دیٹنج" کے وہ غسل کرنے کے لیے ہی جانے والی تھی تاکہ کم از کم جمعہ کی نماز وقت پر ادا کرے۔ نماز تسبیح اسے پتا تھا کہ امی حضور اور تائی حضور نے انتظار کر کر کے ادا کر لی ہو گی اور اگر یہ عمیص فضول۔۔۔ اپنے جیسی فضول بحث میں نہ الجھا لیتا تو وہ اس کام سے بھی فارغ ہو چکی ہوتی۔ کم از کم ابا حضور کے سامنے اس میلے کچیلے حلیے میں تو نہ آنا پڑتا۔

اس نے خجالت سے انہیں سلام کیا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان اسے دعاؤں سے نوازنے کے بعد تخت پر بیٹھے اور فرصت سے دونوں کا جائزہ لیا تو ناگواری کے اثرات چہرے پر نمایاں ہو گئے۔

عمیص اپنے جاگنگ سوٹ کے ٹراؤزر کے ساتھ لمبا سا کرتا پہنا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے' چپل اتنی لاپروائی سے پہنی ہوئی کہ آدھا پیر چپل سے باہر تھا۔ تیزی سے منہ چلاتے ہوئے وہ شاید چیونگم یا سپاری چبا رہا تھا۔ سامنے تپائی پر رکھا چائے کا کپ گول گول گھما رہا تھا جس سے چائے کے قطرے چھلک رہے تھے۔

صاحبزادی الماس خاتون کے بالوں کی حالت بھی خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ کل کی گوندھی چوٹی میں سے کئی لٹیں نکل کر بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ مسلا ہوا لباس جس پر جا بجا ہلدی' چکنائی کے داغ لگے تھے۔

"کیا بات ہے صاحبزادی الماس خاتون! کیا آج مصروفیات معمول سے ہٹ کر تھیں۔"

ان کے اس سوال پر موتیا کی جان جل کے رہ گئی۔

"کمال ہے' کیا ابا حضور آج کے ناشتے میں پیش کیے گئے وہ سب لوازمات اتنی جلدی فراموش کر گئے۔ وہ نہاری' وہ سری پائے' پوریاں' پورن پوری' چنے' آلو کے پراٹھے' سادہ ورقی پراٹھے' سوجی کا حلوہ' گجریلا' وہ دو تین طرح کی چائے' آملیٹ' ابلے انڈے۔۔۔ کیا یہ سب معمول سے ہٹ کر نہیں تھا۔ عام طور پر اگر پراٹھے بن جائیں تو آملیٹ کی زحمت نہیں کی جاتی کہ چائے یا رات کے سالن کے ساتھ کھا لیے جائیں گے اور اگر آملیٹ بن جائے تو پھر پراٹھوں پر گھی ضائع کرنے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ اف۔۔۔ ابا حضور۔۔۔ آپ کی یہ مہمان نوازیاں۔۔۔ بھرم بازیاں۔۔۔ اور اس سے بھی بڑھ کے نظر اندازیاں۔۔۔"

باقی سب کی طرح اسے بھی صاحبزادہ نفیس علی خان سے۔۔۔ اپنی والدہ سے۔۔۔ کچھ شکایات تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ یہ گلے دل ہی دل میں کر لیا کرتی تھی۔ زبان سے کہہ کر ان کا وقار کم نہیں کرنا چاہتی تھی' نہ اپنی نظر میں۔۔۔ نہ کسی اور کی نظر میں۔

"اور صاحبزادہ عمیص آپ۔۔۔ آج جمعہ ہے۔ غسل کیجیے' نماز کا اہتمام کیجیے' اس طرح اوندھے سیدھے لیٹ کے۔۔۔ اور وہ بھی ناوقت۔۔۔ کس لیے نحوست پھیلا رہے ہیں۔ پہلے کیا آپ کے ستارے بہت زیادہ روشن ہیں جو اب دین سے بھی منہ موڑ کے اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں۔"

چونکہ اس وقت وہی دونوں "دستیاب" تھے' لہٰذا صاحبزادہ نفیس انہی دونوں پر اپنا کرم کرنے پر مجبور تھے۔

"بھابھی آپا اور بیگم؟" انہوں نے اختصار سے سوال کیا۔

"جی وہ نماز تسبیح ادا کر رہی ہیں۔"

"اور صاحبزادی گل مہر؟" اب توجہ اس طرف چلی گئی۔

"جی۔۔۔ وہ غالباً "مزنی کی طرف گئی تھیں۔" موتیا کی اطلاع پر انہوں نے ابرو چڑھائے۔

"غالباً"۔۔۔ کیا مطلب؟ کیا وہ مطلع نہیں کر کے گئیں کہ وہ کہاں جا رہی ہیں اور کس مقصد سے جا رہی ہیں۔ مزید یہ کہ کب تک لوٹیں گی۔"

ابھی۔۔۔ موتیا ان کے اس اعتراض کی مناسب توجیہ بیان کرنے ہی والی تھی کہ پھر کہہ اٹھے۔

"اب تو صاحبزادی گل مہر کی پڑھائی کا سلسلہ بھی تمام ہوا۔ کم از کم اب تو انہیں گھر پر زیادہ وقت گزارنا چاہیے۔ کتنے ہی روز ہو گئے' ان سے تفصیل سے گفتگو ہوئی نہ ہی جی بھر کے دیکھا۔"

"اور وہ صاحبزادی جو دن کے چوبیسوں گھنٹے اسی حویلی میں گزار دیتی ہے' اس کے ساتھ تو کبھی تفصیل سے گفتگو کرنے کو دل نہ چاہا' نہ ہی جی بھر کے دیکھنے کی خواہش ہوئی۔" وہ سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

"لگتا ہے گل مہر آگئی۔" مزنی کی گاڑی کے مخصوص ہارن پر عمیص نے کہا تو ایکدم سے موتیا کو یاد آگیا کہ صبح گھر سے نکلتے ہوئے گل مہر کیا اعلان کر کے گئی تھی۔

"بس فیصلہ ہو گیا' اب ہم اور اس بات کو التوا میں نہیں ڈال سکتے۔ تین دن بعد ہمیں انٹرویو کے لیے جانا ہے اور اس سے پہلے پہلے ہم یہ بات ابا حضور تک پہنچانا چاہتے ہیں' ان کا رد عمل بھلے کچھ بھی ہو۔"

"کچھ بھی؟" وہ اس بے رحم لاتعلقی پر حیران رہ گئی۔

"ہاں' آج نہیں تو کل یا پرسوں بھی یہ بات ہمیں کرنا ہی ہے پھر آج کیوں نہیں۔ پرسوں کے بعد تو گنجائش بھی نہیں کیونکہ اس سے اگلے روز ہمارا انٹرویو ہے بلکہ انٹرویو بھی کیا ہے' سمجھو سلیکشن ہے۔ ہم آج ہی بات کریں تاکہ انہیں جو غصہ ہونا ہے' وہ انہی دو دنوں میں ہو لیں۔" اس کی لاپروائی اور سنگ دلی پر موتیا دنگ رہ گئی۔ حالانکہ یہ اس کے لیے اتنی نئی چیز بھی نہ تھی۔

اور اب اس کی آمد کے ساتھ ہی اس کی ساری بات پھر سے موتیا کو دہلانے لگی۔

"کیا پتا وہ یونہی ڈینگیں مار رہی ہو۔ جو بھی ہے' آخر ابا حضور کے سامنے یہ بات کرنا آسان کام نہیں۔" وہ اپنے آپ کو جھٹلانے لگتی مگر اندر سے کوئی ہنس پڑتا۔

"کہاں تھیں آپ صاحبزادی گل مہر!" اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد صاحبزادہ نفیس نے دریافت کیا تھا۔ اس نے سکون کے ساتھ چادر اتار کے تہ کی۔ شانے پر پڑا دوپٹہ پھیلا کے سر پر لیا اور ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔

"ایک کام کے سلسلے میں مزنی کے ساتھ اس کے انکل کے آفس گئے تھے ہم۔"
"انکل کے آفس؟ ایسا کیا کام تھا آپ کو جوان کے ہاں جانا پڑا۔" ان کی آواز میں گرج پیدا ہو گئی۔
"ایک جاب کے سلسلے میں ان سے کچھ معلومات لینا تھیں۔"
اس کے سکون میں ذرا برابر فرق نہ پڑا۔ موتیا سن ہوتے قدموں کو گھسٹ کر وہیں نزدیکی موڑھے پر بیٹھ گئ
کی التجائیہ نظریں گل مہر کے سنگلاخ حسین چہرے پر جمی تھیں۔ عمیص نے بے چینی چھپانے کے لیے م
ٹھنڈا کپ اٹھا کے لبوں سے لگا لیا۔
"کیسی جاب؟" وہ بالکل نہ سمجھے۔
"تمہارے لیے ایک جاب ڈھونڈی ہے انہوں نے۔"

● ● ●

دسمبر کا کپکپا دینے والا دن تھا۔
اگرچہ دھند بھری صبح گزرے ایک پہر بیت چکا تھا اور اب سورج کی روپہلی کرنیں آنگن میں اتر چکی تھی
سفیدے، سموک کا ہی اور شیتل کے درختوں سے چھن چھن کر آتی یہ کرنیں بھی رات بھر وند نالی سردی
اب تک پوری طرح ختم نہ کر پائی تھیں۔ برآمدے کی سنگی سیڑھیاں برف کی سل بن چکی تھیں اور ستون
لپٹی منی پلانٹ کی بیل سے قطرہ قطرہ اوس ٹپکتی پورے ستون کو ایک نم خنکی بخش رہی تھی۔
اس سرد ماحول کا ایک حصہ موتیا کا یخ بستہ وجود بھی تھا۔ اس کے ننگے پیر انہی برف کی سلوں پہ دھرے
رہے تھے اور اس نے انہی گیلے گیلے ستونوں سے ٹیک لگا رکھی تھی جن کی خنکی اس کی ریڑھ کی ہڈی کو
دے رہی تھی۔ لیکن اس کا وجود ساکت تھا۔ وہ نہ کپکپا رہی تھی نہ لرز رہی تھی۔ بس بت بنی بے بسی
کو کبھی مہمان خانے کے بند دروازے کے آگے تو کبھی گل مہر کے کمرے کے بند دروازے کے آگے
آنسو بہاتی دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں اپنا اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کر چکنے کے بعد اب اپنے کمروں میں
چلے تھے۔ گل مہر جو کہہ چکنے کا تہیہ کر بیٹھی تھی، وہ کہہ کر دھماکہ کر چکی اور اس دھماکے کے بازگشت کے رد
طور پہ صاحبزادہ نفیس جتنی گھن گھرج سے احکامات نازل کر سکتے تھے وہ بھی کر چکے۔ نہ گل مہران کے رد
خائف نظر آ رہی تھی نہ ہی صاحبزادہ اس کے دلائل سے متاثر نظر آتے تھے۔ دونوں کے رویوں سے ظا
کہ یہ بحث ابھی کئی روز تک چلنے والی ہے کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنے موقف سے ہٹنے تیار نہ
کے لیے سب سے حیران کن چیز گل مہر کی دلیری بلکہ دیدہ دلیری تھی۔ اتنا تو وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ اس
بچپن سے خود سری، ہٹ دھرمی اور خود غرضی کے جراثیم پال رہی تھی لیکن یہ حقیقت تو اس کے گمان
تھی کہ اس نے انہیں پال پال کر پھن پھیلائے ناگ بنا لیا ہو گا۔ جب پہلی بار اس نے بڑی بے خوفی
کیا تھا کہ وہ کل ہر صورت میں ابا حضور کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گی تب بھی اس کی آنکھوں سے
غرض سفاک چمک سے خوفزدہ ہونے کے باوجود موتیا یہ یقین کرنے کو دل سے تیار نہ تھی کہ وہ واقعی ابا
سامنے اس جرات کا مظاہرہ کر سکے گی۔
ابا حضور کا شدید ردعمل اس کے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ بلکہ وہ تو حیران تھی کہ انہوں نے اپنی صاحبزا
سے اتنا کچھ سن کیسے لیا۔ وہ تو وہی دیکھنے، سننے اور کہنے کے عادی تھے جو ان کے اصولوں سے مطابقت ر
متوقع چیز تو تھی گل مہر کے مدلل جواز اور گستاخانہ انداز بحث جو وہ ابا حضور کے طیش کو خاطر میں نہ ا
خاصے سکون سے دہراتی رہی۔ زبان اس کی فراٹے بھر رہی تھی اور ٹانگیں موتیا کی بے دم ہوتی جا رہی
اس نے اپنا آپ نزدیکی تخت پہ گراتے ہوئے بے جان نظروں سے امی حضور کی جانب دیکھا۔ ان
بھربھری ریت کی طرح ڈھے دیکا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو کبھی یوں پوری آنکھیں کھول کر دیکھتے نہیں
آج دیکھ رہی تھیں۔ شاید بغیر پلکیں جھپکے وہ غور سے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ منظر جو ا

ری سفاکی کے ساتھ جاری ہے، حقیقت کا حصہ ہے یا کوئی شر انگیز منحوس خواب۔
بای حضور کے پرجلال چہرے پہ یک بیک اتنی دراڑیں پڑ گئیں کہ شمار ممکن نہ تھا۔
عمیص خود پہ چھائی بے چینی سے گھبرا کر بغیر کچھ کہے، حویلی سے نکل گیا۔ موتیا نے رشک سے اسے نکلتے
دیکھا۔
"کاش میں بھی اس وقت یہاں سے۔ اس منظر سے غائب ہو سکتی۔ میں یہ سب دیکھنا نہیں چاہتی، نہ دیکھ سکتی
ہوں مگر دیکھنا پڑ رہا ہے۔ میں یہ سب سننا نہیں چاہتی نہ سن سکتی ہوں مگر سننا پڑ رہا ہے۔"
"ابا حضور، اب وقت بدل رہا ہے خدارا اپنے مدار سے باہر نکل کر دیکھیے، دنیا کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہے اور آپ
ابھی تک حویلی، خاندان اور نسب کے تردد میں قید ہیں۔ ہم خدانخواستہ کوئی اس خاندان کے نام پہ بٹا تو نہیں لگانے
جا رہے، جس خاندان سے وابستگی پہ ہمیں ہمیشہ فخر رہا ہے۔"
"محض فخر کر لینے سے اس وابستگی کا حق ادا نہیں ہو جاتا، صاحبزادی گل مہر اس وابستگی کا خراج ادا کرنے کے لیے
بہت جان مارنی پڑتی ہے۔ ہر مصلحت، بدلتے وقت کے ہر تقاضے سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ اپنے نفس اور دنیاوی
مالی طلب کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔"
"ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، خود کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اپنی خواہشات سے بے نیازی نہیں برت سکتے۔"
اس کے ہٹ دھرمی سے کہنے پہ اور سب کے ساتھ ساتھ خود صاحبزادہ نفیس نے بھی حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ
لمحہ بھر کے لیے مارے حیرت کے خاموش ہو گئے تھے۔ گل مہر نے اس خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید دلائل
دینے کی کوشش کی۔
"ہم مانتے ہیں خدا نے ہمیں اس اعلیٰ نسب گھرانے میں پیدا کر کے ہمیں ایک خاص حیثیت اور مرتبے
سے نوازا ہے اور یہ واقعی ایک عطیہ خداوندی ہے، جو ہر ایک کے مقدر میں نہیں ہوتا۔ لیکن زندگی، حیثیت سے کہیں
زیادہ انمول ہے اور یہ بھی تو اللہ کی نعمت ہے اس کے تقاضوں سے منہ کیسے موڑا جا سکتا ہے۔"
"آپ کی زندگی کا ایسا کون سا تقاضا ہے جسے ہم نے نظر انداز کیا ہو۔ ایسی کون سی ضرورت ہے، جو ہم نے پوری
نہ کی ہو۔" ابا حضور کی گرجدار آواز ذرا سی۔ پست ہو گئی۔
"یہ بحث تو بہت طویل ہو جائے گی ابا حضور۔" وہ قدرے اکتاہٹ بھرے انداز میں بولی۔
"ہم نے آپ کی محبت پہ کوئی شبہ نہیں ظاہر کیا۔ ضرورتیں تو بلاشبہ ہماری پوری ہوتی گئیں۔ مگر فقط ضرورتیں
[illegible] ضرورتیں اور وہ بھی آپ جس طرح پورا کرتے رہے ہیں ہم بخوبی واقف ہیں۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ
آپ کی مشکلات میں مزید اضافہ کرنے کی بجائے آپ کا بوجھ ہلکا کر دیں۔"
"ابھی صاحبزادہ نفیس علی خان پہ اتنا برا وقت نہیں آیا کہ وہ اپنا بوجھ صاحبزادیوں کے شانے پہ منتقل کر دیں۔"
[illegible] پست ہوتے لہجے کو گل مہر کی گستاخانہ پیشکش نے ایک بار پھر بلند کر دیا۔ ان کا سرخ و سپید چہرہ توہین کے
[illegible] سے سلگ گیا۔
"[illegible] کم از کم اپنا بوجھ تو اٹھانے دیں۔ اپنی خواہشات اپنے بل بوتے پہ تو پوری کرنے دیں۔" وہ ترخ کے
[illegible] مصلحت کے تحت نرم کیا لہجہ اور ابا حضور کے بارے میں ہمدردی میں کہے کلمات اکارت جاتے
[illegible] کے سامنے آ گئی۔ صاحبزادی حرمت النساء نے آگے بڑھ کر اپنی گستاخ اور بے ادب صاحبزادی کو
[illegible] چاہا۔ مگر لڑکھڑا کے رہ گئیں۔
"[illegible] خواہشات؟ ایسی کون سی خواہشات ہیں جو ایک باعزت، معزز زندگی سے بڑھ کے ہیں۔ صاحبزادی گل
[illegible] خاندان کی بی بیوں کی نظر سیر ہوتی ہے، آج سے نہیں نسلوں سے۔ ان کے دلوں میں کم ذاتوں کی طرح
[illegible] خواہشات نہیں پیر پسارے رہتیں۔ آپ کو شکر ادا۔۔۔"
"ابا حضور، ہماری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" اس نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ہم اپنے خاندانی وقار اور اقدار کو فراموش نہیں کر رہے۔ نہ ہی ہمارے دل میں کم درجہ چیزوں کی بے نام خواہشیں پل رہی ہیں۔ نہ ہم معمولی ہیں نہ ہماری تمنائیں معمولی ہیں۔ ہم صرف خود کو منوانا چاہتے ہیں۔ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بھی کچھ کر سکتے ہیں اور آپ اطمینان رکھیے ایسا کرتے ہوئے ہم اپنی خاندانی اقدار کو فراموش نہیں کریں گے۔ ہم کوئی کم درجہ کام نہیں کر رہے۔ ہمیں ہماری قابلیت کی وجہ سے اس سیٹ کے لیے چنا گیا ہے، پرکشش معاوضہ' الگ آفس' صاف ستھرا ماحول اور آزادانہ کام نہ ہم کسی کے انڈر کام کر رہے ہیں نہ ہی ہمیں کہیں مارے مارے پھرنا ہو گا۔ یہ سراسر تخلیقی کام ہے' ٹیبل ورک۔" اس نے مصلحتاً "ابھی تک یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ ایک فلم اور ٹی وی ڈرامے بنانے والی کمپنی میں جاب کرنے جا رہی ہے۔

"آپ کسی وزیر' کسی گورنر کے عہدے تک بھی پہنچ جائیں تو یہ ہمارے لیے ناقابل قبول ہو گا۔ یہ حقیقت آپ ذہن نشین کر لیں صاحبزادی گل مہر۔ ہمیں کسی قیمت پر بھی آپ کا غیر مردوں کے ہمراہ کام کرنا گوارا نہیں۔"

ان کے دوٹوک الفاظ نے گل مہر کی تلملاہٹ میں مزید اضافہ کر دیا۔

"آپ کو ہمارا گھٹ گھٹ کے جینا گوارا ہے' اپنی ہر خواہش ہم اپنے ہاتھوں فنا کر ڈالیں یہ قبول ہے' ایک بے نام بے مقصد زندگی جیتے جائیں یہ منظور ہے مگر اپنے اصولوں سے روگردانی قطعی گوارا نہیں۔"

اس کی آواز شدت جذبات سے کپکپا گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی چند آنسو رخساروں پہ پھیل کے اس کی پسپائی کا اعلان کر گئے اور یہی وہ وقت تھا جب عمیص نے اس منظر سے غائب ہونا بہتر جانا۔ پتہ نہیں وہ گل مہر کے آنسوؤں کی تاب نہ لا سکا تھا یا خود کو موتیا کی ہدایت کے مطابق اس معاملے سے الگ رکھنے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے فرار ہوا تھا اور موتیا بے بسی سے اپنی "موجودگی" کی سزا بھگت رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب دیکھنے اور برداشت کرنے پہ مجبور تھی۔ آنکھوں میں بے شمار التجائیں لیے وہ مسلسل گل مہر کو تک رہی تھی مگر وہ تھی کہ دانستہ کسی کی بھی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی کہ کہیں کسی کی خاموش نظروں کی بے بسی اسے ایموشنل بلیک میلنگ میں نہ گرفتار کر لے۔

"آپ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کے بھرم کو بنائے رکھنے کے لیے کوئی اپنے آپ کو کس حد تک اذیت پہنچاتا ہے۔ تو جب آپ کو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تو پھر یہ قربانی کس لیے دی جائے۔" رونے سے اس کی آواز پہلے کی نسبت اور بلند ہو گئی تھی۔

"ہم اپنے خوابوں کو آپ کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔ پلیز ابا حضور' ہمارے مقصد کے حصول کے لیے ہماری مدد کیجیے' راہ میں رکاوٹیں مت کھڑی کیجیے' ہمیں آپ کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے' حوصلہ شکنی کی نہیں۔ آپ اس وقت طیش میں ہیں۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیے اور خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کے فیصلہ کیجیے' ہمارا جاب کرنا کسی بھی طرح آپ کے خاندانی وقار کے منافی نہیں۔ اس طرح جذباتیت میں آ کر ہم پر قدغن مت لگائیں ورنہ ہم ۔۔۔ ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہمیں اسی طرح خود کو ثابت کیے بغیر ایک بے مقصد سی زندگی گزارنے پر جبراً" مجبور کیا گیا تو ہم اپنے ہاتھوں اس زندگی کو ختم بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ کھلے عام اپنا فیصلہ اور دھمکی دونوں سناتے ہوئے کمرے میں بند ہو گئی۔ صاحبزادہ نفیس علی خان کے ہاتھوں کی گرفت ان کے مرصع عصا پہ اور مضبوط ہو گئی۔ وہ کتنی ہی دیر چوبی دروازے کے بند کواڑوں کے درمیان باریک سی درز سے آتی ہلکی روشنی کی لکیر کو گھورتے رہے۔ جب پلٹے تو ان کے قدموں سے شکستگی واضح ہو رہی تھی۔ صاحبزادی خلعت النساء جو اپنے تخت پہ بیٹھی شدومد سے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں' ایک طویل سانس بھر کے رہ گئیں۔ انہوں نے تسبیح جائے نماز کے سرہانے دھری اور پھر سے نفل نماز کی نیت باندھ لی۔ صاحبزادی حرمت النساء خانم ابھی تک بے یقینی کے عالم میں بیٹھی فرش پہ کوئی نامعلوم کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہی تھیں۔

موتیا نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا اور من من بھر کے قدم گھسیٹتی امی حضور کی جانب بڑھی۔ اس نے ان کے شانے کے گرد بازو پھیلا کر گویا ایک خاموش دلاسا دینا چاہا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگیں' ان کے

لب کچھ کہنے کی کوشش میں محض کپکپا کر رہ گئے۔ الفاظ کے ذریعے کچھ کہنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد انہوں نے اپنی خاموش نظروں کا سہارا لیا اور پہلے گل کے اور پھر مہمان خانے کے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے سسکی سی بھری۔ موتیا نے انہیں بازوؤں میں بھینچ لیا۔ ان کی بے بسی اس سے دیکھی نہ جا رہی تھی۔ وہ خود ان حالات سے حد درجہ مایوس ہونے کے باوجود انہیں تسلی دینے لگی۔

"فکر مت کیجیے امی حضور' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

مگر فی الحال اس کی نوبت نہ آ سکی تھی۔ شام سے رات ہوئی' رات سے صبح ۔۔۔ مگر نہ گل مہر کے کمرے کا دروازہ کھلا نہ ہی ابا حضور کے کمرے کا' رات نجانے کس وقت عمیص گھر واپس لوٹا تھا۔ وہ تو کافی دیر تک اس کا انتظار کرنے کے بعد اندر آ گئی تھی۔ صبح فجر کی نماز کے بعد اس نے دلگیر سے عمیص کی بابت دریافت کیا۔ وہ بھی لاعلم تھا کہ عمیص کی واپسی کب ہوئی۔ البتہ اس نے یہ ضرور بتایا کہ ابھی دس بارہ منٹ پہلے اس نے صاحبزادہ عمیص کو باہر نکلتے دیکھا ہے۔ تب سے وہ دالان کی یخ بستہ سیڑھیوں پہ بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی اور امی حضور کی بے تابیاں بھی دیکھ رہی تھی۔ وہ کبھی ابا حضور تو کبھی گل مہر کے دروازے کے آگے جاتیں۔ متذبذب انداز میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد سست قدموں سے واپس پلٹ جاتیں۔ موتیا ان کے تذبذب کی وجہ جانتی تھی۔ وہ ان کے دل کی ہر کیفیت کو اپنے دل پہ گزرتا محسوس کر رہی تھی۔

گل مہر کی ضد اور ہٹ دھرمی سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ ماں ہونے کے لحاظ سے اس کی فطرت کے ہر پسندیدہ اور ناپسندیدہ پہلو سے آگاہ تھیں۔ انہیں پتہ تھا جس ضد کی خاطر وہ اس حد تک اتر آئی ہے' اب اس ضد سے کنارہ کش وہ ہرگز نہیں ہو گی۔ اس کی دھمکی ان کا دل دہلائے دے رہی تھی۔ اسی لیے وہ بار بار اس کے بند دروازے کے آگے آ کھڑی ہوتی تھیں۔ مگر دستک دیے بغیر واپس پلٹ جاتیں۔ شاید وہ یہ سوچ کر اسے سمجھانے کی ہمت ہار دیتیں کہ ان کے دلائل' ان کی محبت' ان کی نصیحتیں گل مہر کی ضد کے آگے بہت کمزور ہیں۔ جب وہ اپنے ابا حضور کے سامنے اس درجہ دلیری اور بے باکی کا مظاہرہ کر سکتی ہے جنہوں نے اولاد سے محبت کے باوجود ہمیشہ لحاظ و ادب کا ایک فاصلہ برقرار رکھا ہے تو ماں کو اپنے سامنے کمزور پڑتا دیکھ کے وہ پتہ نہیں کتنی زیادہ کھل کے سامنے آ جائے ۔۔۔ یا شاید یہ ان کا اظہار خفگی تھا جو انہیں گل مہر کے کمرے کے آگے لے تو آیا تھا اور یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کل سے بھوکی پیاسی اندر بند مسلسل رو رہی ہو گی' وہ اسے متوجہ کیے بغیر چلی جاتی تھیں۔

اور صاحبزادہ نفیس علی خان کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی تمام تر ہمتیں صرف اس شرمندگی کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ دیتی تھیں جو صاحبزادی گل مہر خانم کی ماں ہونے کے ناتے کل سے ان کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

یہ احساس بھی ایک عجیب احساس ہے۔

کہنے کو اولاد سانجھی ہوتی ہے۔۔۔ ماں کی بھی اور باپ کی بھی۔

لیکن پتہ نہیں کیا وجہ ہے کہ اولاد کے کسی ناپسندیدہ فعل اور ناگوار عمل کے ردعمل کے طور پہ شرمندگی صرف اسے جنم دینے اور پرورش کرنے والی کے حصے میں آتی ہے۔

اس وقت بھی صاحبزادی حرمت النساء خانم اپنے حصے کی شرمندگی کا بوجھ اٹھائے سب سے نظریں چراتی پھر رہی تھیں۔ یہ شرمندگی انہیں اپنی تربیت پہ تھی۔ یہ بوجھ اولاد کے اعمال کا تھا جو خود بخود ان کے شانوں کو جھکا گیا تھا اور صاحبزادہ نفیس ۔۔۔ شرمندہ تو شاید وہ بھی تھے ۔۔۔ مگر اس بات پہ نہیں۔ ان کی شرمندگی اس محبت کی وجہ سے تھی جس نے انہیں اتنا کمزور کر ڈالا کہ ان کی صاحبزادی یوں انہیں دھمکانے کی ہمت کر بیٹھی۔

شرمندگی اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ لاکھ مضبوط اعصاب اور آہنی ارادہ رکھنے کے باوجود اس دھمکی سے خائف ہو گئے تھے۔

"صاحبزادی الماس' دیکھیے آپ کی تائی حضور وظیفے سے فراغت پا چکی ہوں تو انہیں چائے بنا دیجیے" انہوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

امی حضور کی آواز پہ اس کے کب سے ساکت و جامد وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ان کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اتنا حوصلہ نہ تھا اس میں کہ وہ اس شکستگی کو دیکھ پاتی جو گزری رات کی ہر ساعت ان کے چہرے پہ رقم کر گئی تھی۔

اٹھتے اٹھتے اس کی نظر سامنے سے آتے عمیص پہ ٹھہری اور وہ اندر کی جانب مڑنے کی بجائے وہیں ستون سے لگ کے کھڑی ہو گئی۔ سست قدموں سے اندر بڑھتے عمیص کی رفتار اسے سامنے پا کر اور بھی سست پڑ گئی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو اتنی سردی میں؟"

اس کے سامنے رک کر کچھ دیر تک سامنے کے دروازے سے نظر آتے حویلی کے اندرونی منظر کی ویرانی کو دیکھنے کے بعد اس نے سر جھکائے کھڑی موتیا سے پوچھا۔

"تم کل کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

"میں..." وہ سوچ میں پڑ گیا جیسے خود بھی نہ جانتا ہو کہاں گیا تھا۔

"چچا حضور... کیسے ہیں وہ؟" جھجکتے ہوئے اس نے پوچھا تو موتیا حیرت سے سر اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔ وہ تو منتظر تھی کہ ابھی وہ کل مہر کے بارے میں استفسار کرے گا اور وہ اس کی اس بے حس دیوانگی پہ دل ہی دل میں کڑھتی رہے گی۔ عمیص کا یہ سوال... ابا حضور کے بارے میں اس کی تشویش کا اظہار اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

"کیسے ہو سکتے ہیں وہ؟" اس کے لہجے میں نمی تھی۔

"کل سے بیٹھک میں بند ہیں۔ میری تو ہمت نہیں پڑتی دستک دینے کی۔ امی حضور بھی اس وقت ان کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی ہیں کہ کہیں کل کی ساری تلخی ان پہ نہ انڈیل دی جائے اور تائی حضور کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی اس لیے امی نے خود انہیں جانے سے روک دیا ہے ورنہ وہ تو ابا حضور کی دلجوئی کے لیے جانا چاہ رہی تھیں... تمہیں تو پتہ ہے ان کے بلڈ پریشر کا۔ ایک دم ہی ہائی ہو جاتا ہے اور ایک دم ہی لو۔"

صاحبزادی خلعت النساء کی طبیعت کی خرابی کا سن کر عمیص مزید وہاں نہ ٹھہر سکا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے اب تک کل مہر کی بابت دریافت نہ کیا تھا نہ ہی کل کے تلخ واقعے کے حوالے سے کچھ کہا تھا۔ موتیا کو زیادہ حیرت اس بات پہ تھی کہ وہ کل کے بارے میں اتنی دیر تک لاتعلقی کیسے دکھا سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"بابر شہزادے میرے تو تم بہت کام کی ہو۔"

ملک مقبول جیسے بندے کے منہ سے نکلا یہ تعریفی کلمہ بابر ہمایوں مغل کو مسرور و مغرور کر سکتا تھا مگر الٹا اس کی پیشانی شکنوں سے پر ہو گئی۔ ملک مقبول نے کچھ الجھ کر اس کی ناگواری کو دیکھا پھر ساجد علی کی بات ذہن میں گونجتے ہی جیسے سارا معاملہ سمجھ گیا۔

"ملک صاحب، یہ خالی ہاتھ بندہ آپ کے بہت کام آئے گا۔ اس کی جیب خالی سہی مگر شہر کے رؤسا اور نوابوں سے اس کے خاندانی مراسم ہیں اور آپ کو تو پتہ ہے کہ ایسے لوگ کتنے شوقین مزاج ہوتے ہیں۔ اسے باقاعدہ کمیشن دے کر اس کام پہ رکھا جائے تو بدک جائے گا نوابی خون ہے 'مغلوں کی ذات' ہے۔ معاوضہ لے کر ہماری گانے والیوں کو گاہک دلوانے کا کام کرنا اس کے لیے گالی ہو گا۔ لیکن کیا ہے ملک صاحب کہ ہاتھ اور جیب کے ساتھ ساتھ اس کی کھوپڑی بھی خالی ہے۔ آپ اس کی لچھے دار خوب صورت گفتگو پہ مت جائیں... یہ صرف گفتار کا غازی ہے۔ میں اسے عرصے سے جانتا ہوں۔ اسے گولی دینا اور الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا مشکل نہیں۔ بلکہ یہ باقاعدہ معاوضے پہ رکھے "بروکرز" سے کہیں زیادہ سستا پڑے گا۔ بس اسے دوستی کا جھانسا دے دیں۔ دوست بن کر اس کی خاندانی عظمت اور گزرے جاہ و جلال سے مرعوبیت کا اظہار کر کے اس سے جتنے مرضی کام نکلوا لو دوستی اور واقفیت کے نام پہ وہ بروکر تو کیا... بھی بننے کو تیار ہو گا۔ بس اس کا نشہ پانی چلتا رہے۔ آنے جانے کا کرایہ دے دیں، ناچنے گانے والیوں کے ساتھ چھیڑ خانیاں کرتا مگن رہے گا۔"

"تو یار بات تو ایک ہی ہوئی نا... تنخواہ نہ لی روز کا کرایہ لے لیا، روٹی کھالی، شراب چڑھالی، سگریٹ پی لیے۔"

"میں نے آپ کو بتایا ہے ناں ملک صاحب" اس کا دماغ ذرا کھسکا ہوا ہے۔ اپنی عزت بے عزتی کے معاملے میں ذرا احساس ہے۔ مفت کی پینے اور مفت کے کھانے کو وہ دوستی کا حق قرار دیتا ہے اور اپنی طرف سے وہ جو حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا وہ آپ کے لیے فائدہ مند ہو گا۔ آپ کس جہاں میں ہیں ملک صاحب۔ یہ بڑے بڑے رؤسا اب بھی اپنے گھریلو اور کاروباری فنکشنز پہ دبئی یا ممبئی سے عورتیں منگاتے ہیں۔ سال میں دو پارٹیاں بھی اگر بابر کی وجہ سے ایسی مل جایا کریں تو آپ کے تو ہو گئے وارے نیارے۔ بس یہ خیال رکھیں کہ اسے اپنی توہین یا اپنے ملازم ہونے کا احساس نہ ہو۔"

اور اسی وقت ملک مقبول کو احساس ہوا کہ شاید اسے کا بابر ہمایوں مغل کو یوں بے تکلفی سے "بابر شہزادے" اور "چیز" کہہ دینا اسے ناگوار گزرا ہے۔ وہ چیں بہ جبیں ہو گیا۔ اس نے بھلا کہاں اور کب کسی سے آپ جناب کر کے گفتگو کی تھی۔

"ایہہ چنگی مصیبت اے۔" وہ بڑبڑایا۔

"بھئی پتر برا نہ منانا۔ تم میرے بیٹے کی عمر کے ہو۔ اگرچہ تمہارا تعارف مجھ سے ساجد علی نے کرایا تھا اور وہ میرا جگری یار ہے اس لحاظ سے تم بھی دوست ہوئے لیکن عمر کے فرق کی وجہ سے میرا دل خود ہی تمہارے ساتھ بے تکلفی برتنے کو چاہتا ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہیں آپ حضرت۔" بابر کسمسایا۔

"آپ ہمارے لیے محترم ہیں۔ آپ کی محبت... برا ماننے کی جسارت ہم بھلا کیسے کر سکتے ہیں۔"

"ایہہ ہوئی نا گل یاروں، دوستوں والی۔" وہ ریلیکس ہوا کہ کم از کم اب اسے آپ جناب والے تکلف کی اذیت سے نہیں گزرنا پڑے گا۔

"شہزادے تمہارے جیسے دوستوں کے تو ہم قدر دان ہیں۔ کنچن بائی کے ڈیرے کی لڑکیاں کبھی کوٹھے سے نہیں اتری تھیں۔ جس کو انہیں سننا یا دیکھنا ہوتا تھا اسے بالا خانے کی سیڑھیاں چڑھنا ہوتی تھیں۔ خود وہ اتر کر کبھی کسی کے محل تک نہیں گئیں تو فنکشن کرنے کیا آتیں۔ یہ تمہارا ہی کارنامہ ہے جو کنچن بائی کی دو لڑکیوں کو ہمارے اس فنکشن تک لے آئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا شکریہ کیسے ادا کریں۔ یہ ایک حقیر سا تحفہ ہے جو تمہارے شایان شان تو پتہ نہیں ہے یا نہیں۔ لیکن بھئی ہماری پہنچ تو یہاں تک ہی تھی۔" اس نے ایک قیمتی امپورٹڈ شراب کی خوش وضع اور خوش رنگ بوتل نکال کر اس کے سامنے رکھی ساتھ میں عمدہ قیمتی سگریٹ کا بڑا پیکٹ تھا جس کے سہارے بابر جیسے بلا کے سگریٹ نوش شخص کے بھی دو ہفتے با آسانی گزر سکتے تھے۔

"یہ کیا ملک صاحب۔" اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی مگر تکلفاً "آنا کانی" کرنے لگا۔

"ایسا کیا خاص کیا ہم نے آپ ہمارے دوست ہیں تو ہم نے بھی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ کنچن بائی کے اصول اس کی ہڈیوں کی طرح اب بھربھرے ہونے لگے تھے اور پھر ہمارے دلائل کے آگے بھلا کون ہے جو زیادہ دیر مزاحمت کر سکتا ہے۔ آپ تو بلاوجہ تردد میں پڑ گئے۔ اس کی بھلا کیا ضرورت تھی۔"

"بھئی دوست مانا ہے تو دوست کی جانب سے تحفہ سمجھ کے رکھ لو۔"

اس بار بابر ہمایوں مغل نے مزید پس و پیش کرنا مناسب نہ جانا۔

"اور ہاں شہزادے، مجھے پتہ ہے تمہاری ناک بہت اونچی ہے۔ گھر میں روز بروز گاڑی بھیجنے لگوں تو تمہاری خودداری کو ٹھیس پہنچے گی۔ دوسری طرف مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے کاموں سے تم ادھر ادھر مارے پھرو۔ اس لیے یار یہ کچھ پیسے رکھ لو، میں تمہارے لیے گاڑی بھیجتا ہوں تو لگتا ہے جیسے تمہیں حکم دے کر بلوا رہا ہوں۔ تم اپنی مرضی سے آؤ جاؤ، یہ تمہارا اپنا دفتر ہے۔" اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ بابر کو رقم تھامنے میں ذرا جھجک نہ ہوئی۔

جیب میں بارہ سو روپے رکھ کے لبوں سے مہنگا سگریٹ لگا کر اور بغل میں کاغذ میں ملفوف امپورٹڈ شراب کی موجودگی کو محسوس کر کے اسے بن پیے ہی سرور چڑھنے لگا۔

"جھلی نہ ہوئے تے کوگل پھڑکے بیٹھی اے۔"

ٹھیٹھ پنجابی زبان اور جھلائے ہوئے لہجے میں کہا گیا یہ فقرہ ملک مقبول کے آفس سے باہر نکلتے بابر کے کان میں پہنچ گیا تو اس نے دانستہ اپنے قدموں کو سست کرتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر جھلی پہ ڈالنا چاہی اور اس کی نظر جیسے پلٹنا بھول گئی۔

اکیس بائیس سال کے بھرپور شباب کو سمیٹے وہ ہراساں ہرنی اس ماحول کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس وقت اس کی یہاں موجودگی، اس کے ساتھ بیٹھا وہ ٹیپکل بازاری حلیے والا شخص اور خود اس کا بھڑکیلا سیاہ اور روپہلا لباس ظاہر کر رہا تھا کہ اس کا تعلق بھی اس فنکشن میں ناچنے یا گانے کے لیے آنے والی دیگر لڑکیوں کی طرح اس بازار سے ہے۔ مگر اس کے علاوہ اور بہت کچھ تھا جو اسے اس جگہ سے الگ ظاہر کرتا تھا۔

اس کا معصوم بھولا بھالا چہرہ....

گھبرایا گھبرایا ڈرا ڈرا انداز۔

اٹھتی گرتی پلکوں کی اوٹ سے جھلک دکھاتی باحیا نظریں....

اور سب سے بڑھ کے اس کے کومل وجود سے پھوٹتی پاکیزگی اور منہ بند کلی ہونے کا واضح احساس۔

بابر ہمایوں مغل کے قدم خود بخود اس کی جانب بڑھ گئے۔ اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کے وہ نروس سی حسینہ کچھ اور سمٹ گئی۔ اس کے ہاتھ شانے پہ پڑے دوپٹے کو درست کرنے لگے۔

"کوئی مسئلہ ہے تو ہمیں بتائیے؟" اس شائستہ انداز اور مہذب لہجے پہ دعا نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کے دیکھا۔ الفاظ و انداز کے قطعی برعکس اس کی دیکھتی نظریں خاصی غیر شائستہ تھیں وہ اب صرف نظریں ہی نہیں، سر بھی جھکا کر رہ گئی۔ اللہ وسایا، بابر ہمایوں مغل سے واقف تو نہیں تھا مگر ملک مقبول کے آفس سے نکلنے والا یہ بندہ کوئی غیر متعلق شخص تو نہیں ہو سکتا، اتنا اندازہ اسے تھا۔ پھر بابر کی ظاہری وضع قطع بھی اسے مرعوب کر رہی تھی۔ وہ اسے بھی "صاحب لوگوں" میں شمار کرتا ہوا انکساری سے کہنے لگا۔

"کوئی بات نہیں جناب! بس کڑی ذرا گھبرا رہی ہے۔ پہلا پہلا شو ہے ناں میری کاکی کا ڈر رہی ہے۔"

بابر نے حیرت سے گود میں دھرے لرزیدہ ہاتھوں کی انگلیاں بے چینی سے مسلتی اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ کہیں سے بھی "شو" کرنے والی لڑکیوں میں سے نہیں لگ رہی تھی۔ ان لڑکیوں کی تو معصومیت اور بھولپن میں بھی ایک ادا اور بناوٹی پن ہوتا ہے، جو بابر جیسے گھاگ سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ جبکہ [illegible] گھبرائی سہمی سی لڑکی کی معصومیت سچی تھی۔

"پہلا شو؟" اس نے تصدیق کرنا چاہی۔

"نہیں پرفارم کرنے کا کچھ تجربہ بھی ہے بڑے میاں یا یونہی لا بٹھایا ہے۔"

"کیوں نہیں جناب۔ بڑی گنی ہے میری دھی۔ ایک دو نہیں پورے نو سالوں تک استاد عنایت اللہ کی شاگردی [illegible] ہے۔ روزانہ چار چار گھنٹے کا ریاض ہے... بس سیکھی ہوئی فیشنی کڑیوں کی طرح مائیک پکڑ کر تھرکنا نہیں آتا [illegible] ورزی [illegible]"

[illegible] بازاری ماحول [illegible] کسی باعزت یا متمول گھرانے کی فرد نہیں [illegible] لڑکیاں بھی شوقیہ گاتی ہیں مگر وہ ایسے پرائیویٹ شوز کرتا اپنی [illegible] والی عورتیں ہی کرایا کرتی ہیں اور اس کی گھبراہٹ اور [illegible] ہے، صرف کنارے پہ کھڑی ہے۔

[illegible] صرف مائیک تھام کر تھرکنا آتا ہے، سر کی الف بے

سے بھی وہ واقف نہیں ہیں۔ آپ کو تو بڑا اعتماد ہونا چاہیے کہ آپ باقاعدہ تربیت یافتہ ہیں۔ ابھی یہاں قدردانوں کی کمی نہیں سر اور فن کو سمجھنے والے بہت سے ہیں۔ یقین کیجیے اگر آپ کے اندر ٹیلنٹ ہے تو آپ کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

وہ خوامخواہ بے تکلفی کی فضا قائم کرنے لگا۔ دعا کو بھی تقویت کا احساس ہوا بابر کی ہمت افزائی سے نہیں بلکہ اس کثیف ماحول میں ایک سلجھی ہوئی گفتگو کرنے والے شخص کی موجودگی سے یہاں آنے کے بعد اس آدھے گھنٹے میں اس نے ایک سے ایک بے تکے جاہل شخص کی بے سروپا گفتگو برداشت کی تھی اور قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہاں کسی ڈھنگ کے شخص کی موجودگی بھی پائی جا سکتی ہے۔

"کیا پیش کرنے والی ہیں آپ؟" وہ اس کے نزدیک دھری کرسی پہ پھیل کے بیٹھ گیا۔ اس لڑکی کا نروس ہونا اور اس اجڈ شخص کی مرعوبیت اس کے حوصلے بڑھا گئی۔

"ملکہ ترنم کی گائی ہوئی فیض احمد فیض کی ایک غزل۔"

اس نے مدھم سروں میں مختصراً بتایا تو بابر ہمایوں اس کی موہنی صورت کے ساتھ ساتھ اس کی سریلی آواز پہ بھی فدا ہو گیا۔

"آپ کے بغیر گائے بھی ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ آواز سروں میں ڈھل کے اور راگوں کو اوڑھ کے کیا کیا ستم ڈھاتی ہو گی۔ واللہ، اس عمر میں ایسی پختہ آواز ہم نے کبھی نہیں سنی۔ اس آواز کے پس منظر میں تو گویا پورا سازینہ بج رہا ہے آپ کو ماشاءاللہ سازوں کی ضرورت تو نہ پڑتی ہو گی۔ سارنگی کی لے، جھرنے کا ترنم، کھنک، تھپک، دھمک ... سبھی کچھ تو ہے۔"

"مولا خوش رکھے سرکار، کیا صحیح پہچانا ہے آپ نے، ٹھیک کہا ہے سیانوں نے فن کی پرکھ قدردانوں کو ہی ہوتی ہے۔" اللہ وسایا اس پذیرائی پہ جھوم جھوم اٹھا۔

"ناچیز کو بابر ہمایوں مغل کہتے ہیں۔ لاہور کی قدیم اور مشہور مغل حویلی ہماری ہی ہے۔ یوں تو آپ اپنا تعارف آپ ہیں لیکن اگر ناگوار نہ گزرے تو کیا آپ کا نام دریافت کر سکتے ہیں ہم؟"

دعا ٹپٹا کے ابا جی کو دیکھنے لگی جو حویلی کے نام سے ہی مرعوب ہو گیا تھا اور فقرے کے اگلے حصے میں صرف لفظ "نام" کو ہی سمجھ پایا تھا باقی کی تمہید اس کے سر پہ سے گزر گئی تھی۔

"ادا۔" کچھ ہچکچاتے ہوئے دعا نے اپنا وہ نام بتایا جو اس جگہ یہ اس کی پہچان تھا۔ اسی نام سے وہ یہاں پرفارم کرنے آئی تھی اسی لیے اپنا اصل نام بتانے کی بجائے اس نے اپنے ابا جی کا دیا ہوا وہ نام دہرایا جو اسے کبھی پسند نہ رہا تھا۔

"ادا... نام بے شک خوبصورت ہے۔ مگر معاف کیجیے گا آپ کے شایان شان نہیں۔ جس نے بھی آپ کا یہ نام رکھا، گستاخی معاف، اس نے آپ کی ذات پہ غور کرنے کا تکلف نہیں کیا ورنہ آپ کو دیکھنے کے بعد [illegible] جس شدت سے آپ کے قرب کی دعائیں مانگنے لگتا ہے اس مناسبت سے [illegible] دعا کہنا چاہیے۔"

وہ جو اس کے کھلے ڈلے اظہار پہ جز بز ہو رہی تھی، اس نام پہ [illegible] الٹا [illegible] ضرور وہ اس کے اصل نام سے واقف ہو گا جبھی یہ بات کر رہا ہے۔ اس کے چونکنے [illegible] مسکرایا۔

"حسن اگر اپنی اہمیت سے ناواقف ہو تو اور بھی دلکش لگتا ہے۔" دل ہی دل میں یہ مقولہ دہراتے ہوئے [illegible] جال پھیلانے لگا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو دیا؟ میں کچھ دیر ریلیکس کرنے آیا تھا تمہارے [illegible] کے اور تم ہو کہ..."

شہزاد روحیل قاضی کے اصرار پہ اس کی [illegible] اسپورٹس میں بیٹھ تو گیا مگر اب [illegible]

پھنسنے دیکھ کر جز بز ہونے لگا۔ کام کے دباؤ سے تھوڑی دیر کے لیے مہلت لے کر وہ اکثر ایسے ہی بے تکلف دوستوں سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ یہ بات اس کے تھکے ماندے دماغ کو تازہ دم کرنے کا کام کرتی تھی۔ آج بھی وہ آفس سے فارغ ہونے کے بعد گھر جانے کی بجائے سیدھا روحیل کی طرف آگیا تاکہ اس کے ساتھ ڈنر کر سکے مگر وہ شاید کہیں جانے کے لیے تیار تھا اور اسے بھی ساتھ گھسیٹنے لگا۔ شہزادیوں بن بلایا مہمان بن کر جانا نہیں چاہتا تھا مگر روحیل جیسے ضدی کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ اس نے خود ہی شہزاد کے ڈرائیور کو گاڑی واپس لے جانے کا حکم دے دیا اور وہ بے بسی سے اس کے ساتھ جانے پہ رضامند ہو گیا۔

"ہاں تو گپ شپ بھی ہوتی رہے گی اور رہا تمہارے ریلیکس ہونے کا سوال تو وہ میری ذمہ داری ہے۔ فکر مت کرو تمہیں کسی خشک سی بزنس میٹنگ یا فارمل ڈنر میں نہیں لے جا رہا۔"

"جو بھی ہے یوں بن بلائے اٹھ کر چلے جانا مجھے مناسب نہیں لگ رہا۔"

"تم میرے ساتھ جا رہے ہو یار' روحیل قاضی کے ساتھ اور روحیل قاضی اس فنکشن کا چیف گیسٹ ہے۔ مہمانِ خصوصی کے ساتھ آنے والے مہمان بھی خصوصی ہوتے ہیں۔"

"کس قسم کا فنکشن ہے؟"

"میوزیکل نائٹ ہے اور تمہیں تو پتہ ہے کس قسم کی ہوتی ہے۔ ایک آدھ ٹاپ کی اسٹیج ایکٹریس کی پرفارمنس کے زور پہ آڈینس کھینچ لاتے ہیں۔ باقی سارے ایکسٹرا لڑکیوں کے آئٹم ہوتے ہیں۔ چلو۔ اور کچھ نہیں تو دو ڈھائی گھنٹے اس تماشے میں گزر ہی جائیں گے' ذرا شغل میلہ رہے گا۔ کبھی کبھی ایسے فنکشن بھی اٹینڈ کر لینے چاہئیں۔ ہائی فائی گیدرنگز اور فارن ڈیلی گیشن کے ساتھ کیے جانے والے خشک ڈنر کے علاوہ بھی ملک مقبول کا نام تو سنا ہو گا تم نے ماضی میں چند بھڑکیلی پنجابی فلمیں بنائی ہیں اس نے آج کل اسٹیج پروگرامز کے حوالے سے بڑا نام ہے اس کا خصوصاً "بیرون ملک وہ جو شوز کرتا ہے ان میں پرفارمنس کرنے کے لیے چوٹی کی اداکارائیں اپنے ٹائٹ شیڈول میں سے وقت نکالنے پہ تیار رہتی ہیں۔ دبئی میں ہونے والے نیو ایئر نائٹ میں اس نے انڈیا کے بھی دو چار آرٹسٹ بلائے تھے۔"

"ہاں۔۔۔ تو کیا اسی ملک مقبول کے فنکشن میں۔۔۔" وہ الجھ گیا۔ اسے ملنے والا وہ انوی ٹیشن بھی تو اسی شخص کی جانب سے بھیجا گیا تھا' جس میں دعا کا نام پڑھتے ہی وہ بھڑک گیا تھا۔ لیکن اسے یاد تھا کہ مہمان خصوصی کے طور پہ کسی وزیر کا نام درج تھا دعوت نامے پر' اس نے اس الجھن کو دور کرنے کے لیے مزید سوال کیا۔

"یہ وہی فنکشن تو نہیں جو شاہ نور اسٹوڈیو والے روڈ پہ واقع سفید کوٹھی میں ہو رہا ہے' "رم جھم نائٹ" کے نام سے؟"

"ہاں ہاں بالکل تو کیا تمہیں بھی انوی ٹیشن آیا تھا۔"

"ہاں لیکن اس میں تو چیف گیسٹ کے طور پہ ایک ایم این اے کا نام درج تھا۔" اسے اب بھی امید تھی کہ جس جگہ وہ جا رہا ہے' یہ وہ فنکشن نہ ہو۔

"ہاں لیکن یار' تمہیں تو پتہ ہے کہ ان وزیروں کو اپنی ریپوٹیشن کی کتنی فکر ہوتی ہے اور "رم جھم نائٹ" کے نام سے ہونے والے اس میوزیکل فنکشن میں اس وقت کی ٹاپ کی ڈانسر کا ایک بارش میں بھیگتا آئٹم نمبر ون ہے جس کی پبلسٹی پہ یہ اتنے مہنگے ٹکٹس بکے ہیں۔ اب اس وزیر کی خاطر ملک مقبول یہ گانا پروگرام سے نکلوا کر پبلک کے ہاتھوں ذلیل تو نہیں ہو سکتا ناں۔ اس لیے عین وقت پر ان وزیر صاحب سے معذرت کر لی گئی۔ مجھے بھی ایک ڈیل کے تحت چیف گیسٹ بنایا ہے اس مت نے پتہ ہے کیا؟" وہ ہنسنے لگا۔ مگر شہزاد وہاں جانے کے خیال سے ہی اتنا ڈسٹرب ہو چکا تھا کہ کوئی ردعمل ظاہر نہ کر سکا۔ وہ خود ہی بتانے لگا۔

"ملکہ کی تاج پوشی کرنا چاہتا تھا ملک مقبول اور اس وقت ملکہ وہ واحد فلم ایکٹریس ہے جو اسٹیج پروگرامز میں پرفارم کرنا اپنے معیار سے کم گردانتی ہے۔ اس کے کریڈٹ پہ اب تک ایک بھی اسٹیج پروگرام یا ڈانس آئٹم نہیں

ملک بڑا گھاگ بندہ ہے اس کی تاج پوشی کے بہانے اسے اسٹیج تک گھسیٹنا چاہتا ہے تاکہ اسے خوب پبلسٹی مل سکے اور ٹکٹیں مہنگے داموں بک سکیں۔ ملکہ کو راضی کرنے کا کام اس نے مجھے سونپا اور ساتھ ہی چیف گیسٹ ہونے کا اعزاز بھی۔ ملکہ کو ذرا طریقے سے ہینڈل کرنا پڑا اور بس۔۔۔ وہ تاج پوشی کے لیے تیار ہو گئی۔"

وہ مزے سے اپنا کارنامہ سناتا رہا اور شہزاد اپنی بے بسی پہ پیچ و تاب کھاتا رہا روحیل کی گاڑی اس وقت شاہ نور اسٹوڈیو سے چھ منٹ کی ڈرائیو کے فاصلے پہ تھی جبکہ اس کے گھر سے بیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔ اسے روحیل کا اپنی گاڑی' بمعہ ڈرائیور واپس بھیج دینا اب برا لگ رہا تھا حالانکہ پہلے اس اپنائیت بھری ادا کو وہ دوستانہ استحقاق سمجھ کر ہنس پڑا تھا۔

"یار روحیل پلیز مائنڈ مت کرنا۔ میں ایسے فنکشنز ذرا اوائڈ ہی کیا کرتا ہوں۔ اگر مجھے وہاں جانا پسند ہوتا تو میرے پاس بھی تو پرسوں سے انوی ٹیشن آیا ہوا تھا۔ تم مجھے یہیں اتار دو میں ٹیکسی لے لیتا ہوں۔"

"کم آن یار' تم ایسے مردم بیزار تو کبھی بھی نہیں رہے اور میں تو اس خیال سے بھی تمہیں ساتھ لیے جا رہا تھا کہ تم آج کل "ٹیلنٹ ہنٹ" مہم پہ ہو' وہاں ایک سے ایک نیا ٹیلنٹ ہو گا جو چانس ملنے کی تمنا میں مرا جا رہا ہے' کر لینا چھانٹی اور اب تو تمہارا یہ اعتراض بھی باقی نہیں رہا کہ تم بن بلائے مہمان ہو۔ ظاہر ہے بھئی' تمہارے پاس تو مجھ سے پہلے دعوت نامہ پہنچا تھا اور یار تم خود سمجھ دار ہو' جانتے ہی ہو کہ جس فیلڈ میں انسان قدم جمالے' اس فیلڈ سے اتنی بے زاری اچھی نہیں۔ تمہیں اس سرکل میں سروائیو کرنے کے لیے صرف محنت اور لگن سے ہی نہیں بلکہ پی آر بڑھانے سے بھی مدد ملے گی۔"

شہزاد نے مزید ضد کرنا مناسب نہ جانا' اسے پتہ تھا کہ روحیل کس قدر حجت کرنے والا شخص ہے۔ وہ اس کے کترانے کی اصل وجہ جاننے کے لیے سوال پہ سوال اور بحث برائے بحث کرتا جائے گا اور شہزاد یہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے' لیکن دل ہی دل میں دعا ضرور مانگنے لگا۔

"اللہ کرے' کسی وجہ سے وہ یہاں پرفارم کرنے نہ آ سکے اور اگر ایسا نہیں تو کم از کم وہ فضول شخص اس کے ہمراہ نہ ہو اور اگر ہو تو یا اللہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں میرا اس سے سامنا مت کرانا۔"

☼ ☼ ☼

عمیص کافی دیر سے صاحبزادہ نفیس علی خان کے کمرے میں تھا۔ موتیا نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس وقت ان کے پاس جائے۔ اسے ڈر تھا کہ ابا حضور کل سے جس طیش کو اپنے اندر دبانے کی کوشش کر رہے ہیں' عمیص کی وجہ سے اسے ابلنے کا موقع نہ مل جائے۔ اس کے برعکس اس نے دبے لفظوں میں عمیص سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ گل مہر کو سمجھانے کی کوشش کرے کہ وہ اپنی ضد کو زندگی موت کا مسئلہ بنا کر اپنے بڑوں کو کسی امتحان میں ڈالنے کی اوچھی حرکت مت کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ صاحبزادہ سے بات کرنے پہ مصر تھا۔

"گل سے بات کرنا فضول ہے موتیا۔ وہ اس وقت ضد پہ ڈٹی ہوئی ہے اور میرا سمجھانا اس کے غصے کو دگنا کر دے گا اور تم بتاؤ کہ غصے کی حالت میں کوئی کیسے ڈھنگ کی بات سمجھ سکتا ہے جبکہ چچا حضور طیش کے عالم میں' شاک کے عالم میں ہیں۔ ان کی ذہنی حالت منتشر کرنے کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ ان کی بیٹی نے ان کے اصولوں کو چیلنج کیا ہے۔ میں اس وقت انہیں سمجھانے نہیں جا رہا نہ ہی تم میرے متعلق ایسے فضول اندازے لگاؤ کہ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گل کے ساتھ ساتھ اپنی بھی منوانا چاہتا ہوں۔ میں صرف انہیں اس شاک کے عالم سے نکالنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ تو کہیں' بھلے غصہ کریں' کسی طرح ان کا غبار ہلکا ہو اور ڈیئر کزن۔۔۔"

"ان کا غصہ باہر لانے کے لیے میری ایک جھلک ہی کافی ہے۔"

لیکن ایک جھلک کی بات کرنے والا ایک ڈیڑھ گھنٹے سے نجانے کن مذاکرات میں مصروف تھا۔ موتیا دالان میں ٹہلتے ہوئے اندازے لگا لگا کر ہلکان ہو رہی تھی۔ امی حضور کے چہرے پہ بھی تردد تھا۔ بالآخر بیٹھک کا دروازہ کھلا

عمیص ٹرے ہاتھ میں لیے باہر نکلا جو وہ اندر جاتے ہوئے ساتھ لے گیا تھا۔ ٹرے میں موجود برتنوں کو خاصی حد تک خالی دیکھ کر امی حضور کو کچھ اطمینان ہوا اور عمیص کے عقب سے نظر آتے ابا حضور کو دیکھ کر موتیا کو تسلی ہوئی۔

صاحبزادہ عمیص علی خان کے مضمحل وجود سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ گزشتہ رات انہوں نے کس طرح ٹوٹتے بکھرتے گزاری ہوگی۔

ایک ہی رات نے انہیں برسوں کی مسافت سے چور کر ڈالا تھا۔ چوڑے شانے جھکے جھکے سے اور پر جلال نگاہیں بجھی ہوئی سی نظر آرہی تھیں۔ بڑے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ حسب عادت زور سے کھنکارے تائی حضور جو ابھی ابھی تلاوت کے بعد تخت پہ نیم دراز ہوئی تھیں، اٹھ کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ امی حضور نے دلگیر کو اشارہ کیا کہ وہ چلم تازہ کر کے لے آئے۔

"ابا حضور! چائے اور پیجئے گا؟" موتیا نے ان کی خاموشی سے گھبرا کر سوال کیا۔

"نہیں... خواہش نہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا، پھر صاحبزادی خلعت النساء سے ان کا احوال دریافت کرنے لگے۔ اگرچہ وہ خود کو معمول کے مطابق ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر لہجے کا ملال اندرونی کیفیت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"صاحبزادی گل مہر کہاں ہیں؟ انہیں کہلوائیے کہ ہم نے یاد کیا ہے؟" اچانک انہوں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تو موتیا چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اب وہ عمیص کے تاثرات کھوجنے لگی، وہ پرسکون تھا۔ صاحبزادہ نفیس کا گل مہر کی بابت دریافت کرنا جو موتیا کے لیے قطعی غیر متوقع تھا اس کے لیے متوقع نظر آ رہا تھا۔

"نجانے عمیص نے ابا حضور سے کیا بات کی ہے اور کس طرح کی ہے کہ وہ گل کو اتنی جلدی اپنے حضور حاضری کا علم دے بیٹھے۔ اب پتہ نہیں ان کا اگلا فرمان کیا ہو؟ گل کو من مانی کرنے کی اجازت دینا تو ناممکنات میں سے ہے اور عمیص ہمارا اتنا با اختیار کب سے ہو گیا کہ وہ ابا حضور کو ہتھیار ڈالنے پہ اتنی جلد رضامند کر سکے۔ ایسی امید [illegible] منوا [illegible] یاد [illegible] ہو سکتی ہے... کہیں ابا حضور [illegible] ات والا قصہ نئے سرے سے تو نہیں شروع کرنا چاہتے... تو یہ [illegible] ایک نئی مصیبت... خود تو گوشہ نشین ہو گئی ہے بھگتنے کو ہم لوگ۔"

اپنے آپ سے الجھتی اندر ہی اندر کڑھتی وہ گل مہر کے دروازے کے آگے جا کھڑی ہوئی اور کتنی ہی دیر تک دروازے کو گھورتی رہی۔

"اب ان صاحبزادی کی منتیں بھی کرنا پڑیں گی دروازہ کھولنے کے لیے۔ اگر ابا حضور نے خود نہ کہا ہوتا تو میں کبھی یہ بیڑا اٹھانے کی... اری نہ لیتی۔ آسانی سے تھوڑا ہی کھلے گا یہ دروازہ۔"

اور واقعی ہی ہوا کئی بار دستک کے جواب میں اس کی بپھری ہوئی مگر قدرے دبی ہوئی آواز آئی۔

"کیا بات ہے...؟ کون ہے؟"

"دروازہ کھولو میں ہوں موتیا۔" اسے بھی آواز دبا کے بولنا پڑا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے، جاؤ تم یہاں سے۔"

"مجھے بھی تمہیں کچھ نہیں دینا۔" اسے غصہ آگیا۔

"سوائے اس پیغام کے... ابا حضور تمہیں بلا رہے ہیں۔"

کچھ لمحے خاموشی رہی... شاید وہ سوچ رہی تھی کہ ابا حضور کے سامنے جانے کے لیے کون سا مناسب بہانہ گھڑے۔

"ایسے کام انسان کرے ہی کیوں کہ بعد میں اپنے بڑوں سے منہ چھپانا پڑے۔" موتیا منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے

رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ گل کم از کم دس بہانے تو ضرور بنائے گی اور اسے دس بار ہی اس کی منتیں کرنی پڑیں گی مگر انگلی دستک کے لیے اٹھا اس کا ہاتھ "اٹھا کا اٹھا رہ گیا جب دروازہ کھلا اور چادر لپیٹتی گل برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے پہ گزشتہ روز کی کسی تلخی کا ملال نہ تھا۔ صاحبزادہ نفیس کے برعکس وہ خاصی پرسکون نظر آ رہی تھی اور کمرے کے اندر... بیڈ پہ اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد تو جیسے موتیا کی جان ہی جل کے رہ گئی۔ واک مین، کیسٹ اور بسکٹ کے خالی ریپر پتا رہے تھے کہ بند کمرے کے اندر اس کی کیا مصروفیت رہی ہے۔

"اور ہماری سادہ سی امی حضور کے آنسو بار بار اسی تصور سے چھلک پڑتے تھے کہ ان کی لاڈلی اور نازک اندام و نازک مزاج صاحبزادی بھوکی پیاسی ہچکیوں کے ساتھ روتی رہی ہوگی۔"

"اسلام و علیکم ابا حضور... صبح بخیر۔" وہ کمال اعتماد سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

"جیتی رہیے۔" قدرے توقف سے ملنے والے اس دعائیہ جواب میں ایک اجنبیت اور گریز واضح تھا جو صرف موتیا اپنی حساسیت کی وجہ سے محسوس کر پائی۔

"ہم نہیں جانتے صاحبزادی گل مہر کہ آپ کی اور صاحبزادی الماس خاتون یا صاحبزادی یاسمین اور صاحبزادہ عمیص کی پرورش میں ہم سے کیا کوتاہی ہوئی ہم نے تو اپنی بساط کے مطابق آپ سب کو ہر آسائش اور سہولت مہیا کرنے کی کوشش کی تھی اور ساتھ ہی اعلیٰ اخلاقی اوصاف پیدا کرنے اور بلند پایہ تربیت کرنے کی بھی مقدور بھر سعی کی تھی۔ ہاں مگر جو بھی کیا اپنی بساط کے مطابق کیا کہ بساط سے باہر ہو جانا کم حیثیت لوگوں کا شیوہ ہے۔ ہم مطمئن تھے کہ ہم نے اپنی ذمہ داری خوب نبھائی مگر آپ نے ہمارے اس سکون کو درہم برہم کر دیا ہے یہ کہہ کر ہم نے آپ کی صرف بنیادی ضروریات پوری کی ہیں 'خواہشات کی تکمیل کی طرف توجہ نہیں دی۔ ایک والد' ایک بزرگ' ایک سرپرست کی حیثیت سے ہم آپ کو آگاہ کرنا... بلکہ متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ خواہشات کبھی بھی پوری نہیں ہوتیں' اگر وہ پوری ہونے لگیں تو پھر "خواہشات" نہیں کہلائیں گی۔ یہ ہمارے برسہا برس کے تجربے مشاہدے اور اپنے آباء سے حاصل کردہ نصیحتوں کا نچوڑ ہے لیکن اگر آپ ہر چیز خود آزمانے پہ مصر ہیں تو ہم آپ کو ایک موقع دینے پہ تیار ہیں مگر مشروط طور پہ... وہ یہ کہ آپ دنیا آزمالیں... مگر ہمیں اور اپنے خاندان کو کسی آزمائش میں مت ڈالیے گا۔ اگر آپ اب بھی اپنی ضد پہ قائم ہیں اور ہر حال میں وہ کام کرنا چاہتی ہیں جس میں ہماری رتی برابر بھی دلی رضامندی نہیں... تو ہم آپ کو مجبوراً "روک" کر اپنی ذات پہ مزید کوئی الزام نہیں لے سکتے۔ آپ..." انہوں نے اس طویل بیان کے اختتام پہ گہری سانس بھری اور تھکے سے لہجے میں کہا۔

"آپ کر سکتی ہیں... جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔"

موتیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اب تک وہ یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ کل جیسا رویہ گل نے اپنایا اور جس حد تک جارحانہ طرز عمل اپنایا' اس سے زیادہ غیر متوقع اور حیران کن چیز کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی مگر اب وہ کہہ سکتی تھی کہ ابا حضور کا اتنی آسانی سے اپنی کہی بات سے دستبردار ہو جانا اور گل کی خاطر اپنے اصولوں سے روگردانی کرتے ہوئے اسے ملازمت کی اجازت دینا بلاشبہ اس کی مختصر سی زندگی کا سب سے حیران کن واقعہ ہے اور شاید یہ صرف اسی کے لیے ایک شاک نہ تھا بلکہ صاحبزادی حرمت النساء اور صاحبزادی خلعت النساء بھی انگشت بدنداں نظر آرہی تھیں۔ صاحبزادی خلعت النساء خانم کے چہرے پہ تو ناگواری بھی مترشح تھی۔

"البتہ ہماری ایک شرط ہے اور چند قواعد' جن پہ عمل کرنے کا حلف لے کر ہی آپ اس حویلی سے قدم باہر نکال سکتی ہیں۔ قواعد سے تو آپ بخوبی واقف ہوں گی۔ ہماری تربیت کے رنگ اتنے کچے ہیں نہ ہمارا خون اتنا ہلکا ہے کہ آپ کو ان قواعد کی یاد دہانی کرانی پڑے... یا زبردستی ان پر عمل درآمد کرانا پڑا۔ اسی اعتماد کے ساتھ ہم آپ کو اجازت دے رہے ہیں اور شرط یہ ہے کہ اپنی اس "خواہش" کے پورا کرنے کے لیے آپ کے پاس صرف ایک سال کی مہلت ہے۔ اس مہلت پہ آپ راضی ہیں تو ٹھیک بصورت دیگر ہم مزید رعایت نہیں دے سکتے نہ ہی اس سلسلے میں ہم سے بحث کرنے کی کوشش کی جائے۔ اصولی طور پہ تو آپ کی تعلیم کے مکمل ہونے پر ہمیں اس مرحلے پہ آپ

کے لیے کچھ اور سوچنا چاہیے مگر یہ ایک سال مکمل طور پہ ہم آپ کو سونپتے ہیں "اس وعدے کے ساتھ کہ اس کے بعد آپ کو اپنی زندگی کے اگلے سال ہمیں سونپنا ہوں گے۔"

ان کی جانب سے ملنے والی اجازت پر مسرور ہوتی گل مہر اس آخری بات پہ الجھ گئی۔ لبوں کے گوشے جن سے کچھ پالینے کی مسکان چھلک رہی تھی سکڑ سے گئے اور ابرو بھینچ گئے۔ کچھ دیر تک وہ پلکیں جھکائے اس شرط پہ غور کرتی رہی پھر فیصلہ کن انداز میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے ابا حضور' ہمارے لیے یہ ایک سال بھی بہت ہے' ہم اس کے لیے بھی آپ کے شکر گزار ہیں اور یہ عہد کرتے ہیں کہ ہماری وجہ سے کبھی آپ کو شرمسار نہ ہونا پڑے گا۔"

اس کے اس دعوے پہ صاحبزادہ نفیس علی خان نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ ان کی حزن سے بھری آنکھیں ایک ہی سوال کر رہی تھیں۔

"اس سے زیادہ شرمساری کیا ہو گی کہ آج صرف آپ کی وجہ ہمیں اپنے جان سے عزیز اصولوں میں ترمیم کرنا پڑ رہی ہے۔"

لیکن گل مہر کو آنکھوں میں تحریر سوال پڑھنے کا ہنر بھلا کب آتا تھا۔

* * *

"پہلے میں حیران تھی کہ آخر ابا حضور اتنی آسانی سے مان کیسے گئے۔ لیکن ان کی شرائط خصوصاً" آخری والی جان کر مجھے اندازہ ہوا کہ تم نے اپنے پتے کس آسانی سے کھیلے ہیں۔"

عمیص کو تنہا پا کر موتیا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"دنیا میں کہیں بھی' کچھ بھی ہوا کرے' تم سب سے پہلے مجھ ہی سے بدگمان ہو جایا کرو۔"

"یہ جو ابھی ابھی کارنامہ انجام دیا ہے' کیا اس کی داد بھی نہ دوں؟"

"کارنامہ تو خیر میں نے کیا ہی ہے۔ اب تم بھلے اس کو کھلے دل سے تسلیم نہ کرو۔۔۔ یہ تمہارے ظرف پہ منحصر ہے۔ کیا چچا حضور کو گل مہر کی ضد مان لینے پہ رضامند کرنا۔۔۔ اور گل مہر کا بغیر کسی پس و پیش کے ان کی شرط پہ ہاں کر دینا۔۔۔ یہ آسان کام تھے؟"

"آسان تو نہیں تھے' مگر سیدھے کام بھی نہ تھے اور مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ بظاہر سیدھا سادا نظر آنے والا میرا یہ دوست اندر سے اتنا چالباز اور چار سو بیس نکلے گا۔"

"حد ادب لڑکی' تم بغیر کسی سر پیر کے مجھ پہ الزام عائد کر رہی ہو۔" وہ ابھی بھی سنجیدہ نہ لگ رہا تھا جبکہ موتیا کی سنجیدگی بلکہ رنجیدگی قابل دید تھی۔

"اس سے زیادہ حد میں کیا رہوں کہ صرف زبانی کلامی الزام ہی عائد کر رہی ہوں ورنہ دل تو چاہ رہا ہے کہ۔۔۔۔"

اس نے مٹھیاں بھینچیں۔

"ابا حضور کو یہ شرطوں والی پٹی تم نے ہی پڑھائی ہو گی۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے صاف انکار کیا۔

"مکرنے کی ضرورت نہیں تمہارے سوا اور کون یہ کر سکتا ہے جبکہ ان کی شرط سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کس کے مفاد میں جائے گی۔ تم نے ابا حضور کو یہ سمجھایا ہو گا کہ گل کو ایک سال کی مہلت دینے کے ساتھ ساتھ اس کی عمر کے باقی سالوں کا تمام تر اختیار مانگ لیجیے وہ خود بخود اپنی ضد سے دست بردار ہو جائے گی' ابا حضور نے بھی سوچا ہو گا کہ واقعی گل مہر کہاں اس کڑی شرط پہ راضی ہو گی۔ دوسری طرف تمہارا خیال ہو گا کہ اگر ابا حضور کا اندازہ درست نکلا تو وہ تمہارے قدر دان ہو جائیں گے کہ کیا حل نکالا اس مشکل کا اور اگر بالفرض گل مہر نے یہ شرط مان لی تب بھی تمہارے وارے نیارے' کیونکہ بقائمی ہوش و حواس تو وہ تمہیں قبولنے سے رہی۔ تم بھلے کتنی ہی غزلیں گنگناتے رہو۔ دل سے تم بھی متفق ہو کہ اس کی سوچوں اس کے جذبات سے بہت دور تک تمہارا عمل

دخل نہیں۔ ایسے میں اس شرط کا آسرا ہی ہے' جس کے سہارے تم گھر کے بڑوں کو سیڑھی بنا کے اسے حاصل کر سکتے ہو اس شرط کو منظور کر کے گل کے ہاتھ تو خود بخود بندھ جائیں گے پھر وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں کہاں ہو گی۔

بہت خوب' عمیص علی خان' بہت خوب۔"

"بہت خوب الماس خاتون' بہت خوب۔" اتنے سارے سنگین الزامات کو سن کر نیم دراز عمیص اٹھ ہی بیٹھا اور شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتا ہوا اس نام سے مخاطب کر بیٹھا' جس سے ہمیشہ وہ چڑتی رہی ہے اور چاہے' جسے دانستہ نادانستہ چڑانے میں پیش پیش رہتے ہوں مگر عمیص اس نام سے پکارنے سے پرہیز ہی کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی بار اس کی زبان سے یہ بھاری بھر کم نام سن کر موتیا کے غیض و غضب میں اور اضافہ ہو گیا۔

"بہت خوب' اتنی دور کی کوڑی لانے پر آپ یقیناً" داد کی مستحق ہیں۔ ناحق آپ اتنی دیر سے میری غائبانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں اپنا زور بیاں صرف کر رہی ہیں' لائق تحسین تو آپ کا دماغ ہے' جو ایسی ایسی قلابازیاں کھاتا ہے کہ۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔ تم مجھ سے بدگمان جلد ہو جاتی ہو' یہ تو میں جانتا تھا مگر یہ اندازہ آج ہوا کہ تمہاری نظر میں میرا یہ مقام ہے۔ تمہارے نزدیک میں اتنا کم ظرف اور چالباز انسان ہوں۔ ہے ناں؟"

اچھی طرح طعنے تشنعوں سے نوازنے کے بعد عمیص نے وضاحت کی۔

"میں نے چچا حضور کو صرف یہ احساس دلانا چاہا تھا کہ ضد اور سرکشی میں بہت فرق ہے' جس طرح وہ اپنا کوئی بھی فیصلہ ہم پر جبری طور پر مسلط کرتے ہوئے ہماری محبت سے دستبردار نہیں ہوتے اسی طرح ہم بھی اگر ان کی کسی بات سے اختلاف ظاہر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے دلوں میں ان کے لیے محبت یا احترام نہیں ہے۔"

"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جو کچھ گل نے کیا وہ بڑی محبت سے کیا۔ جس طرح ابا حضور کو جھکانے کی کوشش کی' بڑے احترام سے کی۔"

"نہیں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ماں باپ یا بزرگ پیار محبت کے ساتھ ساتھ کبھی زور۔۔۔ کبھی زبردستی' کبھی دھمکی' تو کبھی اموشنل بلیک میلنگ سے کام لے لیتے ہیں۔ کبھی کبھار اپنی ذاتی خواہشات اور پسند ناپسند کی تکمیل اولاد کے ذریعے چاہتے ہیں تو اس سے ان کی فطری محبت جو اللہ نے ان کے دلوں میں اولاد کے لیے بھر رکھی ہے' کم تو نہیں ہو جاتی۔ ہم ان کی محبت پہ شک تو نہیں کر سکتے؟ پھر ایسا کیوں ہے کہ اولاد اگر اپنی پسند ناپسند کی بات کرے تو اسے سرکشی پہ محمول کیا جاتا ہے۔ اگر ضد پہ آجائے تو اسے نافرمانی تصور کیا جاتا ہے اور یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس کے دل سے والدین کی محبت و عزت رخصت ہو چکی ہے۔ بس اتنا سا نکتہ تھا جو میں نے انہیں بتلایا اور پتہ نہیں کون سی گھڑی تھی۔ جس میں وہ یہ بات سمجھ بھی گئے ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ مقام۔۔۔ اللہ اللہ تم مجھ سے قسم اٹھوا لو میں نے نہ تو گل کی حمایت میں ایک لفظ بولا نہ ہی اس کی سفارش میں کوئی دلیل دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے اپنی منوانے کے عادی رہے ہیں۔ اولاد کی جانب سے ایسا رویہ انہیں دل شکستگی کے ساتھ ساتھ شرمساری میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں صرف انہیں اس احساس سے باہر نکالنا چاہتا تھا یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔۔۔۔ خیر چھوڑو' تم کب مانو گی میری بات۔"

"نہیں' میں۔۔۔۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ آئم سوری عمیص پتہ نہیں کیوں میں نے ایسا سوچا۔"

"مگر مجھے پتہ ہے کہ تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

"کیوں سوچا؟"

"وہ اس لیے کہ تم صاحبزادہ نفیس علی خان کی لخت جگر ہو اور تم صاحبزادی گل مہر خانم کی ہمشیرہ ہو' اس لیے مجھ [illegible] عتاب کرانا تم پہ خاندانی روایت کی طرح فرض ہے۔"

"اب تم مجھ سے بدگمان ہو رہے ہو۔ ویسے ایک بات سچ سچ بتانا۔ گل مہر کا اتنی آسانی سے ابا حضور کی شرط مان [illegible] خوش فہم تو بنا گیا ہو گا کیوں؟ ایسا ہی ہے ناں؟"

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔ بلکہ اگر وہ کچھ سوچ سمجھ کے 'وقت لے کر۔۔۔ یا بادلِ نخواستہ اس شرط پہ راضی ہوتی تو میں سمجھتا کہ وہ واقعی اپنے تمام اختیارات چچا حضور کو سونپنے پہ تیار ہو گئی ہے۔ مگر سونیا تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں جانی اور ہاں کر دی صاف لگ رہا تھا کہ وہ فی الوقت صرف اپنی منوانا چاہتی ہے اور اس ایک سال کے عرصے کی مہلت کو غنیمت جان کر ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اب ایک سال کے بعد کیا ہو گا۔"

"دوران سب باتوں کے باوجود تم ابا حضور کو یہ یقین دلا رہے ہو کہ گل کی سرکشی بغاوت ۔ اور اس کی ضد کا مطلب نافرمانی نہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ بار بار اس دھچکے سے گزریں؟"

"نہیں سونیا میری نیت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔۔۔ میں تو جو خود ان کے بارے میں سوچتا ہوں جیسے جذبات رکھتا ہوں وہی میں نے ان کو بتا دیا ہے' یہ درست ہے کہ ایک عرصے ہمارے درمیان بہت سی باتوں میں اختلاف موجود ہے۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کی مداخلت پسند نہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں اپنے دل میں ان کے لیے اپنے والد سے بھی زیادہ محبت اور احترام رکھتا ہوں اسی طرح مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ بھی مجھے کم پیار نہیں کرتے ہوں گے۔ یہی سوچ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ضرور گل بھی اپنی تمام تربدتمیزیوں کے باوجود اندر سے ایک مشرقی لڑکی ہی ہو گی جسے باپ کا سر اونچا دیکھنا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اپنا قد بڑھانے کے لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ شاید کوئی غلطی ہو گئی ہے۔۔۔ لیکن میں' میں کیا کرتا چچا حضور کو جھوٹے بہلاوے میں رکھنا تو نہیں چاہتا تھا مگر ان کا واحد علاج یہی سوجھا۔

ایک ایسا شخص جس نے تمام عمر سر اٹھا کے بتائی ہو' اسے یہ احساس ہو جائے کہ اس کا سر جھکانے پہ مجبور کرنے والی ہستی خود اس کی اپنی ہی عزیز ترین ہو' تو اس کا کیا حال ہو گا؟ وہی جو چچا حضور کا ہوا اور انہیں اس حال سے باہر نکالنے کے لیے مجھے یہ کہنا پڑا۔"

"اب تو اللہ سے یہی دعا ہے۔ گل اس گمان کو یقین میں بدل دے' جس گمان میں تم نے ابا حضور کو پھر سے سب کا سامنا کرنے پہ تیار کیا ہے۔"

شو شروع ہوئے آدھا گھنٹہ [illegible] تھا اور [illegible] پہلو بدل بدل کر تھک گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی کچھ ہی دیر میں [illegible] کے ضبط کا کڑا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ کسی بھی ورائٹی پروگرام میں مشہور اداکاراؤں اور رقاصاؤں کی [illegible] بریک کے بعد ہوتی ہے۔۔۔ ابتدا میں ابھی نوآموز گلوکاراؤں اور ڈانسرز کے ذریعے شائقین کو گرمانے کی [illegible] کی جاتی ہے۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ اس کی اندرونی کیفیت ساتھ بیٹھے روحیل قاضی یا کسی اور پر [illegible]۔۔۔ پہلے ہی ایک بار اس کے آفس میں وہ غیر ضروری ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اپنے [illegible] تجسس کر چکا تھا اور اب نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی اور کمزوری کسی کے ہاتھ لگے۔ دوسری [illegible] یہ بھی خدشہ تھا کہ اللہ وسایا اسے دیکھ کر سب کے سامنے ہی اس سے تعلق کا اظہار نہ کر دے۔ خود پہ [illegible] کی کوشش تو وہ جتنی کر سکتا تھا' کر رہا تھا اور اس میں خاصی حد تک کامیاب بھی تھا (ابھی تک) مگر اللہ [illegible] کا زور نہیں تھا۔ پتہ نہیں اب کہاں سے وہ نکل آئے اور "میرا شہزادہ' میرا چن" کہتا ہوا لپٹ جائے۔ [illegible] لوگوں کی موجودگی میں تماشا بننے سے خوف آ رہا تھا۔

[illegible] نے انتھک محنت کے ذریعے اس خوف سے نجات حاصل کر لی تھی اور اب ایک عرصے بعد [illegible] تھا۔

[illegible] جانے کا خوف۔

[illegible] کا خوف' جس کو سنتے سنتے اس کا سارا بچپن خود سے منہ چھپاتے گزرا۔

[illegible] بھری آواز آئی۔

"شہزادہ وولد بلبلہ ہاہاہا بلبلہ کا بچہ۔" کوئی تالی پیٹ کر پھبتی کستا۔

"واہ جی چنگڑوں کے ٹھاٹھ تو دیکھو" کسی نے طنز کیا۔

وہ گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ اگلی نشست پہ روحیل قاضی کے ساتھ بیٹھا تھا اور یہاں سے اسے دور دور تک اس شخص کا نام و نشان نہیں مل رہا تھا جس کی غیر موجودگی ہی اس کے لیے ایک دہشت تھی۔

"اور اب آپ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے جو فنکارہ آ رہی ہیں' وہ اسم بامسمٰی ہیں۔ آپ انہیں بہار کا پہلا جھونکا کہہ سکتے ہیں' منہ بند کلی کہہ سکتے ہیں' صبح کی پہلی کرن بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو بھی کہیں وہ کم ہے۔"

چرب زبان کمپیئر ایک تواتر کے ساتھ ہر آنے والی گلوکارہ اور رقاصہ کی شان میں ایسے ہی تعارفی اور تعریفی کلمات ادا کر رہا تھا' جن میں سے بعض تو ایسی تھیں کہ اس کمپیئر کو جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنے کی پاداش میں باقاعدہ سزا دی جا سکتی تھی۔ مگر اس بار اس کے تعریفی کلمات کچھ زیادہ ہی کچھے دار ہو گئے تھے۔ لوگ خود بخود ہی اس نئی فنکارہ کی آمد کے مشتاق ہو گئے۔

"اگرچہ یہ ان کا پہلا شو ہے۔ اتنے لوگوں کے سامنے پرفارمنس کرنے کا پہلا پہلا تجربہ مگر آپ یہ پرفارمنس دیکھنے کے بعد میری اس بات پہ ایمان لے آئیں گے کہ اس کم عمر فنکارہ کے گلے میں بڑے بڑے تجربہ کار گلوکاروں کا تجربہ بول رہا ہے۔ ان کا اعتماد' ان کا فن دیکھنے کے لائق ہے اور سب سے بڑھ کے یہ کہ۔۔۔ یہ ان گنی چنی گلوکاراؤں میں سے ایک ہیں جنہیں صرف سننا ہی نہیں' بار بار دیکھنا بھی اچھا لگتا ہے۔۔۔ خوش اندام' کم عمر' معصوم' الھڑ' جانِ محفل' جانِ بہار' جانِ ادا۔۔۔ ادا۔"

تالیوں کی گونج میں شہزاد کو اپنے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے اور اسٹیج پہ سیاہ چمکیلے لباس میں اس کی آمد کے ساتھ ہی اسے اپنی آنکھوں میں [illegible] چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

وہ ایک طویل عرصے بعد اسے روبرو دیکھ رہا تھا۔

خاصی بدل گئی تھی وہ۔۔۔ پہلے کے مقابلے میں قدرے بڑی بڑی۔ اور پہلے کے مقابلے میں کئی گنا حسین بھی۔

اس نے اپنے اندازے کی تصدیق کی خاطر بے ارادہ ہی پلکیں کھول کے دیکھا۔ وہ سر جھکا کے تعارفی تالیوں کا [illegible] رہی تھی۔ [illegible] تالیاں صرف اس کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھیں۔ شہزاد کی کن پٹیوں [illegible] دھماکے ہونے لگے۔ اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔

دعا کی نگاہ ابھی تک شہزاد پہ نہیں پڑی تھی۔ اس لیے اس نے اب تک اس اعتماد کو سنبھالے ہوا تھا جو اسٹیج کے پیچھے ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کے بڑی مشکل سے مجتمع کیا تھا۔ [illegible] ٹھیک تھا اور جذب کے عالم میں آنکھیں موند کے [illegible]۔

[illegible] فنکاراؤں کے بھڑکیلے ڈانسز اور شوخ گیتوں پہ اچھل [illegible] عالم میں دم سادھے بیٹھے سروں کا ست رنگ میلہ دیکھ رہے تھے۔ [illegible] وقت صرف اس کی آواز کے 'وج' اور فن کی گہرائی میں کھویا ہوا تھا۔

[illegible] بے پناہ تالیوں کا شور اور ونس مور کی گونج نے دعا کو شاید نروس کر دیا۔ وہ [illegible] ساتھ پلٹنے کو تھی کہ چند بے قابو شائقین اسٹیج پہ چڑھ آئے اور اس پہ پانچ سو اور ہزار کے [illegible] لگے۔ شہزاد اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور ہر مصلحت کو بھلائے' خود پہ قابو پانے کا عہد توڑتے [illegible]

[illegible]

"[illegible]"

[illegible] لگا جیسے ہر طرف لگے اسپیکرز سے ایک صدا گونجی ہو۔ وہ باہر نکلتے نکلتے ایک دم پلٹا تھا۔

”چھاجی!“
وہ باہر نکلتے نکلتے ایک دم پلٹا تھا۔
اسٹیج خالی تھا۔ تالیوں کی گونج اس قدر تھی کہ اگر کسی نے اسے پکارا بھی ہوتا تو آواز کا اس کے کانوں تک پہنچنا محال تھا۔
”تو پھر یہ صدا۔۔۔؟ یہ پکار۔۔۔؟“ وہ الجھا۔
”کیا ہوا شہزاد۔۔۔؟“ تالیوں کا شور ذرا تھما تو اسے بت بنا کھڑا دیکھتے روحیل قاضی نے دریافت کیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ کوئی جواب دینے کے قابل نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو بھلا کیا جواب دیتا۔ وہ خود نہ سمجھ پایا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ یہ صدا اتنے سالوں کا فاصلہ طے کر کے اچانک اس کی سماعتوں تک کیسے پہنچی جب کہ وہ اس کے تمام راستے بند کر آیا تھا۔
”میں نے پوچھا ہوا کیا ہے طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ روحیل آسانی سے جان بخشنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ شہزاد اس کے مسلسل استفسار پہ چڑ گیا۔ انگلیوں سے پیشانی مسلتے ہوئے اس نے سردرد کا بہانہ کیا اور مزید وہاں نہیں رکا پارکنگ تک آتے آتے بھی وہ مائیک کے ذریعے بکھرنے والی کمپیئر کی بھاری آواز سن رہا تھا جو ایک نئی ڈانسر کا تعارف کرا رہا تھا اور جب وہ یہاں سے کار ریورس کر کے روڈ پہ نکال رہا تھا تب تک ایک خوب دھوم دھڑکے والا پنجابی گانا شروع ہو چکا تھا۔ روڈ پہ آگے بڑھتے ہی یہ آواز مدھم سے مدھم ہوتی چلی گئی۔ دوسری بہت سی آوازیں تھیں جو اس کا دھیان بانٹ رہی تھیں رکشوں اسکوٹروں کا شور۔۔۔ ویگنوں بسوں کے چنگھاڑتی ہارن اور کاروں میں لگے ڈیک پہ بجتے تیز میوزک کا شور۔۔۔ اس نے سردرد کا صرف بہانہ بنایا تھا مگر اب وہ واقعی شدید ترین درد میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کے سر میں درد کی تیز لہریں اٹھ رہی تھیں جس سے اسے آنکھیں کھولے رکھنا بھی محال لگ رہا تھا۔ ہر نئی لہر پہ وہ تکلیف کی شدت سے بے ساختہ پلکیں زور سے میچ لیتا تھا۔ کنپٹیوں پہ مسلسل بڑھتا دباؤ دماغ کو سن کر رہا تھا۔ تھک ہار کے اس نے کیمپس کے اندر پاس کے نزدیک بنے چائے پان کے ایک کھوکھے کے پاس کار روک لی۔ کیمپس ایریا میں تو رات کے دس گیارہ بجے ہی سناٹا چھا جاتا تھا اس وقت تو ہو کا عالم تھا دور دور لگی لائٹس کی روشنی تھی یا کبھی کبھار گزرتی کسی کار کی ہیڈلائٹس۔۔۔ کھوکھے کا مالک بھی شاید اندر کہیں اونگھ رہا تھا۔ اس نے اگنیشن سے چابی نکالی اور اسٹارٹ انجن کی ہلکی سی گھوں گھوں بھی بند ہو گئی۔
”چھاجی!“
وہی صدا اس سناٹے میں پھر سے گونجی اور وہ جو سمجھ رہا تھا کہ کسی وہم کی طرح ستانے والی یہ صدا اب واپس گزرے سالوں کی گم گشتہ راہوں کی دھول میں اٹ کر لاپتہ ہو گئی ہے، جان گیا کہ عرصے بعد نظر آنے والا دعا کا چہرہ کسی جادو کی کنجی کی طرح ان سب دروازوں کو کھول گیا ہے جہاں جہاں وہ فراموشی کے تالے لگا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اب وہی صدا بار بار ان دروازوں سے رستہ بناتی اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔
تنگ آ کر اس نے ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا۔ تیز کرخت آواز والے ہارن نے اس کے کانوں تک کسی اور آواز کو آنے ہی نہ دیا۔ شدید سردرد میں بھی یہ اندر تک چبھنے والی آواز اسے ایک نعمت کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔
”صاب جی۔۔۔ کیا ہوا صاب جی۔۔۔؟ کیا چاہیے؟“
پان والا بھاگتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا اور اب شیشہ کھٹکھٹاتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ شہزاد نے ہارن پہ سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔
”ایک پیکٹ گولڈ لیف کا۔“ اس کے پاس سگریٹ تھا مگر اپنے اس ہارن کا کوئی جواز تو بنتا تھا اسے۔
”صاحب جی، پان بھی لگاؤں؟“
وہ انکار کرنا چاہتا تھا۔ مگر ڈر تھا کہ یہ شخص مزید اصرار کے بہانے اور بھی اس کے سر پہ مسلط ہونے کی کوشش کرے گا اس لیے اثبات میں سر ہلا کے اسے ٹالا۔

”کون سا والا پسند کریں گے صاب، الائچی سپاری والا، میٹھی پتی والا یا گٹکے والا۔۔۔ بڑی اسپیشل کلکتے کی گٹکا پتی ہے صاب جی۔“
اس سوال پہ صرف اثبات یا نفی میں سر ہلا کے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے چند لمحے خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد شہزاد نے اگنیشن میں پھر سے چابی گھما دی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر پان والا بوکھلایا۔
”کیا ہوا صاب جی، بتاؤ گے نہیں کون سا پان۔۔۔“ مگر صاب جی گاڑی آگے لے جا چکے تھے۔
”کوئی دو نمبر ٹائپ بندہ لگ رہا تھا۔“ پان والا بڑبڑایا۔
”کہیں کوئی واردات ہی نہ کر کے بھاگا ہو۔“ اس نے ادھر ادھر سر اٹھا کے جائزہ لیا کوئی ذی روح نہ نظر آیا۔ وہ سر جھٹک کے اپنے کھوکھے کی جانب بڑھ گیا۔

✲ ✲ ✲

بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا

ریڈیو سے ابھرتی غلام علی کی پر سوز آواز نے پان چباتے بابر ہمایوں مغل کی ساری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ اس نے آگے بڑھ کے آواز اونچی کی اور وہیں چارپائی پہ بازوؤں کا تکیہ بنا کے نیم دراز ہو گیا۔

چھلکاتے ہوئے چلنا خوشبو لب لعلیں کی

اگلے مصرعے کی تکرار نے کل کا وہ حسین منظر پھر سے اس کے تصور میں روشن کر دیا۔ وہ سراپا غزل۔۔۔ وہ خوش ادا۔۔۔ خوش گلو۔۔۔ نازک اندام انجان کم سن حسینہ جو پہلی ہی نظر میں اسے چونکا گئی تھی۔ بابر نے اپنی زندگی میں بہت حسن دیکھا تھا، بہت سوں کو خراج تحسین پیش کیا تھا، بہت سوں کا وقت بھی خریدا تھا اور توجہ بھی۔۔۔ مگر وہ واحد تھی جس کی ایک پل کی توجہ کے لیے وہ خود بن مول بک جانے کو تیار تھا۔ پہلی ہی نظر میں اتنی اچھوتی، اتنی منفرد لگی تھی وہ اسے۔۔۔ وہ پلکیں موند کے ذہن میں اس کا ایک ایک نقش دہرانے لگا۔

چھلکائے ہوئے چلنا خوشبو لب لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے مہکائے ہوئے رہنا

بند ہونٹوں کے پیچھے اس کے تصور نے واقعی اک گلستاں مہکا رکھا تھا۔ بابر نے گہری سانس کھینچ کے اس مہک کو اپنے اندر کھینچا اور اندر تک شاد ہو گیا۔

اس حسن کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا، شرمائے ہوئے رہنا

بے چینی سے وہ کروٹ بدل کے رہ گیا۔ وہ کل اس کے بارے میں جتنا اشتیاق دکھا رہا تھا وہ اتنا ہی گریز اور احتیاط ظاہر کر رہی تھی اور گھاگ بابر اتنا تو جانتا ہی تھا کہ یہ گریز بازاری اور پیشہ ور عورتوں والا بھاؤ بڑھانے کا نخرہ نہیں تھا۔ وہ سچ مچ زیادہ ہی محتاط اور سمٹی سمٹائی لگ رہی تھی۔ اس کا کنی کترانا اس کی کم سنی کی گھبراہٹ تھی اور یہ گھبراہٹ اسے لوٹ کر لے گئی تھی۔

اک شام سی کر رکھنا، کاجل کے کرشمے سے
اک چاند آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

اس کی گھور سیاہ دمکتی آنکھیں بس ایک پل کو اس کی جانب اٹھی تھیں، باقی کا وقت وہ بس اس کے گلگلوں رخساروں پہ اس کی لانبی گھنی پلکوں کے لرزاں سائے ہی دیکھتا رہا تھا۔ مگر ایک پل کے لیے بھی اس کی آنکھوں کی چاہ میں کھونا اس کے لیے کافی تھا۔ وہ اس قدر بے چین ہو گیا کہ اب اس کروٹ میں بھی اسے سکون نہ مل رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔۔۔ یہ غزل ختم ہو چکی تھی مگر اس کے تصور میں سجی رنگا رنگ محفل تھی کہ اس کی رونقیں ہی تمام

نہ ہو رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ریڈیو آف کیا۔

صاحبزادی یاسمین کافی دیر سے مٹر کے دانے نکالتے ہوئے بابر ہمایوں مغل کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ زور سے کروٹ بدل لیتا، کبھی سرد آہیں بھرنے لگتا۔۔۔ کبھی آپ ہی آپ مسکرانے لگتا۔۔۔ کبھی گنگنانے لگتا۔ اب وہ اسے پیروں میں چپل پھنساتے دیکھ رہی تھی۔

"کہاں۔۔۔ چلیں گے آپ؟" دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی وہ اس کے آگے کھڑی فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ چارپائی پہ ٹانگیں جھلاتا بیٹھا خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ ملگجے سے رنگ کے سوتی لباس میں ڈھکے سراپے اور معمولی شکل والی یہ بے کشش عورت، جس کی نہ آواز میں لوچ ہے نہ نقوش میں جاذبیت، نہ عادات میں نزاکت ہے نہ انداز میں دلربائی۔۔۔ اس کے سر پہ زبردستی کے عذاب کی طرح تھوپ دی گئی تھی، ایسا طوق جسے اب اسے عمر بھر گلے میں ڈالے پھرنا تھا۔ ایسا رشتہ، جسے نہ چاہتے ہوئے بھی نبھانے پہ مجبور تھا۔

یہ بھی صرف اس کی خوش فہمی تھی کہ وہ اس رشتے کو "نبھا" رہا ہے۔ ورنہ اس نے اس بندھن کے تقاضے کس حد تک نبھائے تھے ان کی حقیقت تو صرف یاسمین ہی جانتی تھی اور یہ بھی یاسمین کی بڑائی تھی کہ اس نے اپنے مجازی خدا کی یہ کوتاہی کسی اور کو بتانا تو در کنار، خود بابر تک کو اس کا احساس دلانے کی ہمت نہ کی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس کے قیاس کے گھوڑے بس یہیں تک جا سکتے تھے۔ بابر کی ساری خوش مزاجی ہوا ہو گئی بے حد اکتائے ہوئے انداز میں اسے دیکھ کر وہ ایک طنزیہ ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

"اس گھر میں۔۔۔ اس چھت کے نیچے۔۔۔ تمہارے جیسی عورت کے ساتھ رہتے ہوئے کسی کی طبیعت ٹھیک رہ سکتی ہے۔"

یاسمین بچوں کے سامنے ہونے والی اس بے عزتی پہ زرد پڑ گئی۔ حالانکہ اب تک اسے عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ خجل سی ہو کر پلٹنے لگی۔ بابر کا اکیلے میں مسکرانا اور سکون سے لیٹ کر بے فکری کے انداز میں ٹانگیں جھلانا اسے اس خوش گمانی میں مبتلا کر گیا تھا کہ اس کے شوہر نامدار کا مزاج آج خلاف معمول خاصا خوشگوار ہے۔ ورنہ گھر میں ہوتے ہوئے وہ بات بے بات جھلاتا رہتا۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ۔۔۔ یاسمین کو بلاوجہ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اس طرح سکون سے خاموش لیٹے لیٹے موسیقی سننا۔۔۔ یہ منظر یاسمین نے بھلا کب دیکھا تھا۔

"اب منہ چھپا کے کہاں جا رہی ہو؟"

"ہمیں بھلا کیا ضرورت ہے منہ چھپانے کی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ضرورت کیوں نہیں ضرورت تو اچھی خاصی ہے۔ ایسے منہ کو چھپانے کی ہی تو ضرورت ہے جسے دیکھ کر اچھے بھلے انسان کا پارہ ہائی ہو جائے۔" اس کی تاؤ دلانے والی بات کو بھی یاسمین نے تحمل مزاجی سے درگزر کیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

"اونہہ۔۔۔ اتنا طنطنہ۔۔۔ ابھی اگر خدا نے ذرا اچھی صورت دے دی ہوتی تو نجانے ہماری زوجہ محترمہ کے مزاج کس درجہ بلند ہوتے۔۔۔ آہ۔۔۔ ایک وہ انجان حسینہ تھی۔۔۔ ادا۔۔۔ جسے خود اپنی اداؤں کے قاتلانہ حد تک جان لیوا ہونے کا احساس تک نہ تھا۔ ہائے۔۔۔ وہ حسن بے پرواہ۔۔۔"

دعا کا خیال آتے ہی اس کا کڑوا کسیلا موڈ پھر سے رس گھولنے لگا۔ وہ ایک بار پھر باہر نکلنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے، پیر چپلوں سے نکالنے کے بعد چارپائی پہ نیم دراز ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"اللہ موتیا تم ہی بتاؤ ناں ہم کیا پہن کر جائیں؟"

صاحبزادی گل مہر نے اپنی گنتی کے چند اچھے سوٹ الٹ پلٹ کرتے ہوئے بالآخر موتیا سے مدد مانگی۔

"کوئی تو مشورہ دو۔"

"بڑی جلدی خیال آیا کسی سے مشورہ مانگنے کا۔" موتیا نے جل کر کہا۔ ابا حضور اجازت تو دے بیٹھے تھے لیکن

اس کے بعد ایک گہری چپ تھی جو اس حویلی کے سبھی نفوس نے اوڑھ رکھی تھی اور اس چپ کے اندر کیا کچھ نہ تھا۔۔۔ ملال، تاسف، مایوسی۔۔۔ امی حضور کا چہرہ اترا ہوا تھا، تائی حضور سب سے خفا خفا الگ رہی تھیں۔ ابا حضور نے تو دو دن ہوئے مہمان خانے سے نکلنا ہی گوارا نہیں کیا تھا۔ عیص بھی نجانے کہاں مارا مارا پھرتا اور تو اور اس افسردہ سی فضا نے دلگیر کی بھی جھانجھریں خاموش کر ڈالی تھیں اور ایک یہ تھیں۔۔۔ صاحبزادی گل مہر خانم۔ جو اپنی منوا لینے کے زعم میں اڑی اڑی پھر رہی تھیں۔ موتیا نے تاسف سے اس کے نکھرے چہرے کو دیکھا جہاں اپنی وجہ سے گھر بھر کو ایک امتحان میں ڈال دینے کا کوئی ملال تھا نہ افسوس کتنے جوش و خروش سے وہ کل کے انٹرویو کی تیاری کر رہی تھی۔

"عزیز ہمشیرہ، آج آپ بتا ہی دیجئے کہ ہم نے آخر آپ کا بگاڑا کیا ہے۔ جو ہر وقت انگارے چباتی رہتی ہیں آپ پلیز کبھی تو ہمارے ساتھ نارمل ٹون میں بات کر لیا کریں۔ ہر وقت طنز، ہر وقت طعنے۔" گل نے آخر کار اس کے خفا خفا انداز پہ تنگ آ کے پوچھ ہی لیا۔

"تم بتا دو کہ تم نے سنوارا کیا ہے؟ میرا یا کسی اور کا؟ گل۔۔۔ کیوں سب کے لیے مشکلات کھڑی کرتی ہو؟ تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری یہ جاب۔۔۔" اس نے دیکھا کہ گل خود اس سے ناراضگی کا سبب پوچھ رہی ہے تو سوچا لگے ہاتھوں سمجھانے کا فریضہ بھی انجام دے ڈالے مگر اس نے موتیا کی بات ہی کاٹ ڈالی۔

"اب کیا مسئلہ ہے موتیا؟ ابا حضور خود ہمیں اجازت دے چکے ہیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے پھر تم کیوں نئے سرے سے پرابلم کری ایٹ کر رہی ہو۔"

"پرابلم میں نہیں تم کری ایٹ کر رہی ہو بلکہ ہمیشہ سے کرتی آئی ہو۔"

"لٹ پلیز۔" گل نے ساری مصلحت آمیزی ایک طرف رکھ دی۔ ابھی دو دن پہلے اتنا بڑا ہنگامہ نمٹا لینے کے بعد وہ کوئی نیا مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر موتیا کی مسلسل تاؤ دلانے والی گفتگو نے اس کی ساری وقتی نرم مزاجی ہوا کر دی۔

"تمہیں شاید احساس نہ ہو کہ آج کا دن ہماری زندگی کا کتنا اہم دن ہے آج سے ہم ایک نئے موڑ میں داخل ہونے والے ہیں اور تم بجائے ہمارے لیے بیسٹ وشز ظاہر کرنے کے یہ کڑوی کسیلی باتیں کر کے ہمیں فضول میں غصہ دلا رہی ہو۔ ویسے تو بقول تمہارے۔۔۔ ہم ہی برے ہیں، نہ کسی کا احساس ہے نہ ہی دل رکھنا آتا ہے اور ایک تم بڑی حساس اور ذمہ دار۔۔۔ محبت کرنے والی ہستی سمجھتی ہو۔ مگر یہ ہے تمہاری اصلیت۔ ہماری کامیابی تم سے ہضم نہیں ہو رہی۔ جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہی ہو تاکہ ہمارا موڈ خراب ہو اور ہم تمہاری وجہ سے چڑ کر وہاں نہ جا سکیں مگر صاحبزادی الماس خاتون، یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہم نے فضول لوگوں کی فضول باتوں پہ کان دھرنا چھوڑ دیا ہے۔"

آخری فقرہ بڑے ہی شاہانہ انداز میں ادا کرنے کے بعد وہ پچھلی بقر عید پہ بنایا جانے والا آسمانی اور گرے کنٹراسٹ کا سوٹ خود سے لگا کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے فقرے کا موتیا پہ کیا اثر ہوا ہے۔ یہ دیکھنے کی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا تلملاہٹ کے مارے کیا حال ہو گا۔ اسی لیے تو اس نے جان بوجھ کر اسے لفظوں کی مار ماری تھی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ چند لمحے اسے خونخوار نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد وہ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی تھی۔

گل نے آسمانی اور گرے سوٹ کو بیڈ پہ پھینک دیا۔

"یہ کچھ زیادہ ہی لائٹ کلر ہے۔"

اب اس نے میرون پہ زرد کڑھائی والا مرینہ کا گرم سوٹ اٹھایا۔

"اونہوں۔۔۔ پتہ نہیں امی حضور نے یہ کلر کمبی نیشن کیا سوچ کر استعمال کیا ہے۔۔۔ ویسے ہماری دل جلی ہمشیرہ نے کڑھائی خوب دل لگا کر کی ہے، ماننا پڑے گا مگر کیا فائدہ۔۔۔ کلر اسکیم ایک دم جاہلانہ ہے۔" نخوت سے ناک

چڑھانے کے بعد یہ سوٹ بھی مسترد ہوا بالآخر۔۔۔ اللہ اللہ کر کے ہلکے گلابی رنگ کا لینن کا سوٹ منتخب کیا گیا جس پہ قدرے گہرے گلابی رنگ کے پھول جا بجا کڑھے ہوئے تھے۔ یہ بھی موتیا کے ہنرمند ہاتھوں کا کمال تھا ساتھ میں انہی دو شیڈز میں رنگا ٹائی اینڈ ڈائی دوپٹہ۔۔۔ یہ بھی کفایت شعار اور ہر فن مولا موتیا نے گھر پہ ہی رنگا تھا۔ یہ سوٹ اس نے گل کو اس کی برتھ ڈے پہ گفٹ کیا تھا اور تب گل کو نہ یہ رنگ پسند آیا تھا نہ ہی کڑھائی۔

"ایسے پینڈو کلرز آج کل کون پہنتا ہے موتیا۔ آج کل تو ارتھ کلرز ان ہیں اور یہ اتنے اتنے بڑے گلاب کے پھول۔ اسے پہن کر تو ہم "گلابو" لگیں گے۔ خوامخواہ تم نے اپنی آنکھیں پھوڑیں کم از کم ہم سے کلر پوچھ کر اور ڈیزائن پسند کروا کے تیار کرتیں تو تمہاری اتنی محنت ضائع تو نہ جاتی۔" اتنے نقص نکالتے ہوئے اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر موتیا کے دھواں دھواں چہرے کو نہ دیکھا تھا جو اپنی فگار انگلیاں مسل رہی تھی۔ کئی روز وہ سوٹ ایسے ہی اس کی الماری میں پھینکنے کے سے انداز میں پڑا اپنی ناقدری کا سوگ مناتا رہا۔ اس کے انسٹی ٹیوٹ میں فیئر ویل تھا جب اس نے چند روز پہلے سلایا جانے والا آسمانی اور گرے سوٹ پہنا تھا۔ مگر اسے پک کرنے کے لیے آنے والی مزنی کے خیال میں یہ سوٹ اور اس کا ڈل کلر آج کے فنکشن کے لیے مناسب نہ تھا اور پھر اس کے لاکھ بہانے بنانے پر بھی مزنی اس کی الماری پوری کھولے اس کے لیے کسی اور لباس کا انتخاب کرنے لگی۔ گل نہیں چاہتی تھی مزنی پہ اس کی مفلوک الحال "وارڈروب" کا بھید کھلے مگر مزنی نے بھی اس کی ایک نہ سنی اور نجانے کہاں سے ہاتھ مار کے یہی گلابی سوٹ گول مول کیا ہوا نکالا۔

"واؤ' واٹ آ کلر۔۔۔ گل تم اس میں سچ مچ گل گلو گی۔"

☼ ☼ ☼

"یہ تیز گام کہاں سے چھوٹی ہے؟"

گل اور اپنے مشترکہ کمرے سے جل بھن کر نکلتی موتیا سامنے سے آنے والے **عمیص** سے بری طرح جا ٹکرائی۔ اب وہ اپنی ناک مسل رہی تھی اور **عمیص** مسکرا کر اس کی تیز رفتاری کا سبب دریافت کر رہا تھا۔۔۔ وہ بس تیوریاں ماتھے پہ سجا کے اسے گھور کے رہ گئی۔ جب بھی گل سے اس کی جھڑپ ہوتی' **عمیص** بے چارہ اسے خوامخواہ ہی برا لگنے لگتا۔

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے میرے دل میں پڑی ہو جیسے

عمیص کھلی کھڑکی سے گل کو کمرے میں ادھر سے ادھر بڑے مسرور اور مصروف انداز میں ٹہلتے دیکھ چکا تھا۔ یہ بات بھانپنے میں اسے دیر نہ لگی کہ ضرور موتیا اسی پتھر سے سر پھوڑ کے آ رہی ہو گی تبھی مزاج برہم برہم ہے۔ اسی لیے صرف اس کے غصہ کا درجہ نیچے لانے کے لیے باتیں بگھارنے کھڑا ہو گیا۔ جانتا تھا موتیا جب تک گل پہ آیا غصہ' اس کو کڑوی کسیلی سنا کر اپنی بھڑاس نہ نکال لے گی ایسے ہی جلتی کڑھتی رہے گی۔ وہ ایسے مواقع پہ اپنا آپ بخوشی اس کے آگے پیش کیا کرتا تھا۔

"جی ہم نے پوچھا' نصیب دشمناں طبیعت تو ناساز نہیں آپ کی؟ یہ رخ روشن پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں اور وہ بھی جاڑے کی راتوں کے؟ کس نے توڑا ہے دل حضور کا۔۔۔؟" وہ گنگنانے لگا۔

"جس نے ٹھکرایا تیرا پیار۔" موتیا نے فوراً گیت کے اگلے بول میں معمولی سی ترمیم کر کے بدلہ چکایا۔

عمیص خوشدلی سے اس کا طنز سہہ گیا۔

"پھر تو منہ میرا لٹکنا چاہیے' آنکھیں میری بھر آنی چاہئیں۔ تم کیوں غم و غصہ کا اشتہار بنی پھرتی ہو۔ تمہیں کیا دکھ ہے بچہ؟"

دوسروں کے لیے جو زندہ ہیں
ان کے دکھ بے حساب ہوتے ہیں

موتیا نے آہ بھر کے ستون سے ٹیک لگائی۔ واقعی۔۔۔ اسے کوئی ایک دکھ تو نہ تھا۔ **عمیص** کے جذبوں کی گل کے ہاتھوں بے قدری بھی اسی کا دکھ تھا۔ اس گھر اور گھر کے اصولوں کی پامالی کا خدشہ بھی اسے دکھی کر دیتا اور ابا حضور کی دہشت اور سراسیمگی پھیلانے والے انداز سے ہر دم نالاں رہنے کے باوجود اب اس سے ان کی گہری چپ اور ہارا ہارا انداز بھی نہ دیکھا جا رہا تھا۔ یہ اس کی سب کے لیے بے تحاشا محبتیں ہی تھیں جو اسے فکرمند اور ملول رکھتیں۔

جن سے روشن ہو دل کی دنیا
وہ آدمی ماہتاب ہوتے ہیں

عمیص نے اگلا شعر پڑھ کے گویا اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ مسکرا دی۔ (ہاں خود کو جلا کر راکھ کر دینے کے بعد ہی کسی کے دل کی دنیا روشن کی جا سکتی ہے۔)

"ہاں اب بتاؤ' صبح صبح کس بات پہ چونچ لڑائی ہے؟"

"اسی سے پوچھو' جس کی تمہیں فکر ہے کہ کہیں میں نے تمہاری نازک مزاج گل مہر کا دل نہ دکھا دیا ہو۔" موتیا نے ویسے ہی اسے تنگ کرنے کو کہا ورنہ جانتی تھی کہ **عمیص** جتنا مستقل مزاج محبت کے بارے میں ہے اتنا ہی حساس اپنی دوستی کے لیے بھی ہے۔ وہ موتیا کو بھی کبھی اداس یا دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا' اس کے باوجود موتیا کو اس کی گل کے لیے فیلنگز کبھی پسند نہیں آئیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس بات سے حسد میں مبتلا ہو جاتی تھی بلکہ اسے لگتا تھا کہ گل مہر کسی لحاظ سے **عمیص** کے لیے مناسب نہیں۔

"صاحبزادی گل مہر کا دل کوئی ہم جیسے عام انسانوں کے دلوں کی طرح گوشت پوست کا نہیں بنا ہوا۔۔۔ جو دکھ جائے گا۔ وہ تو بڑا اسپیشل دل ہے۔" **عمیص** نے ہنسی میں اڑایا۔

"ہاں سیسے میں ڈھلا' جست کی دیواروں میں محفوظ سیل بند۔۔۔ میخیں لگا ہوا۔" وہ بھی ہنس پڑی۔

"اس کے باوجود تم سر توڑ کوششیں کرنے سے باز نہ آؤ گے کہ کسی طرح لوہا موم ہو جائے۔"

"ہمت مرداں' مدد خدا۔۔۔"

"اور میں چونکہ مرد نہیں ہوں اس لیے جلد ہی گل کے آگے ہمت ہار کے فرار ہو گئی ہوں۔" اس نے اپنی اور اس کی ساری گفتگو **عمیص** کے آگے دوہرا دی۔ **عمیص** کو گل کے موتیا کے بارے میں ایسے ریمارکس واقعی ۔۔۔ لگے مگر کہا تو یہ کہ۔۔۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی جب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تو کیوں بے کار میں ید لیڈ کر انگارے دہکا رہی ہو۔ اب وہ جو کرتی ہے' کرتی رہے۔۔۔ تمہارے کہنے سے۔۔۔"

"مجھے پتہ تھا تم اس کی سائیڈ لو گے۔" اس نے **عمیص** کی پوری بات نہ سنی۔

"اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ یہ تمہیں ٹھیک نظر آ رہا ہے۔ پہلے بھی اس حویلی میں ... نے نہیں بجا کرتے تھے نہ ہی بگل کی صدائیں گونجا کرتی تھیں مگر اب پچھلے دو دن سے تو گویا سوگ اور ماتم کا ... ہے اور یہ صرف اس ایک لڑکی کی وجہ سے ہے اس کی ضد کے ہاتھوں ابا حضور مجبور ہو گئے ہیں کیا ایک بیٹی ... دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی ہار پہ ایسے جشن برپا کرتی پھرے۔ اس کی بے فکری اور بے حسی کا عالم تو دیکھو' ... افسردگی پہ نہ کوئی افسوس ہے نہ اپنے کیے پہ شرمندگی۔۔۔ بلکہ وہ تو ابا حضور کی مشکور و ممنون بھی نظر نہیں آتی ... اس کی محبت کے ہاتھوں' صرف اور صرف اس کی ایک بے جا خواہش کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے نہ ... دل سے اپنے برسوں پرانے کڑے اصول کو خود اپنے ہاتھوں توڑا۔ کم از کم اسے ان کا یہ احسان تو ماننا ... ان کی دل جوئی کرنا چاہیے۔ معذرت کا اظہار ہی کرنا چاہیے۔ وہ تو فخر سے ایسے اتراتی پھر رہی ہے جیسے ... انجام دے دیا ہو۔"

"... مانو' ہے تو یہ کارنامہ ہی۔ کیا اس سے پہلے کوئی تصور کر سکتا تھا کہ نواب گھرانے کی ایک لڑکی بغیر کسی ... کے اپنا اتنا بڑا مطالبہ منوانے میں کامیاب ہو گئی ہو۔"

"ہاں بہت بڑا کارنامہ ہے یہ۔" اس نے طنز سے چبا چبا کر کہا۔

"کارنامے تو اب ہوا کریں گے صاحبزادہ عمیص۔ ابا حضور نے پتہ نہیں کس کمزور لمحے کی زد میں آ کر اجازت تو دے دی ہے مگر آنے والے دنوں کی تلخیاں مجھے ابھی سے محسوس ہو رہی ہیں۔ ہر روز اس کے گھر سے نکلنے پہ وہ ہر بار ایک عذاب میں گھر جایا کریں گے۔ یہ بھڑاس وہ وقتاً فوقتاً ہم لوگوں بالخصوص امی حضور پہ نکالا کریں گے ظاہر ہے وہ محترمہ تو گل کھلا کے نکل چکی ہوں گی۔ یعنی کہ اب یہ تلخی روز کا معمول ہو گی اور ابا حضور نے جو شرط کی بیخ لگا کر اجازت دی ہے وہ بھی ایک سال پورا ہونے کے بعد یاد دلانا نہ بھولیں گے مگر گل مہر جو ابھی سے قابو نہیں آ رہی ان کے بعد میں کیا لحاظ رکھے گی۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں وہ کیا اور اس کے وعدے کیا۔ ایک سال بعد جو طوفان آنے والا ہے میں تو ابھی سے اس کا تصور کر کر کے خوف زدہ ہو رہی ہوں۔"

"اور مجھے بھی کر رہی ہو۔" عمیص اکتا گیا۔

"کس قدر ڈراؤنی چیز ہو گئی ہو تم۔ ان سردیوں میں تم ایسی کسی مصروفیت میں نظر نہیں آ رہیں جیسا کہ عموماً سردیوں میں تم نے پال رکھی ہوتی ہیں مثلاً حلوے یا گجریلے کے لیے گاجریں کدوکش کرنا۔ بادام کے حلوے کے لیے بادام پیسنا۔ اور"

"میرے لیے تمہاری بڑی گھریلو خواہشات ہیں کہ میں ہر وقت مسالے بھونتی اور سبزیاں کاٹتی رہوں اور وہ گل۔ اس کے لیے تو ترقی کا ہر پیمانہ کم ہے۔ بہت خوب۔" وہ مایوس سی ہو کر اٹھنے لگی۔

"ارے یار، مذاق کر رہا ہوں میں کہاں چل دیں؟"

☆ ☆ ☆

"چن۔ میرے شہزادے۔ اتنی دیر؟ کب سے تجھے اڈیک رہی ہوں۔ اتنی ککر (یخ) ٹھنڈ ہے اور تو رات کے دو دو بجے تک باہر رہتا ہے میرا تو کلیجہ کانپتا رہتا ہے۔ کہیں میرے چن پتر کو ٹھنڈ نہ لگ جائے، کسی ہوائی چیز کی گندی نظر نہ لگ جائے۔"

شہزاد کے اندر آتے ہی صوفے پہ پھیل کر بیٹھی، چلغوزے اور ریوڑیاں کھاتی بالو نان اسٹاپ شروع ہو گئی۔ شہزاد تائی کی نات ڈھیلی کرتا وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے ماں کے تشویش بھرے بیان کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ نہ کوئی وضاحت۔ نہ تسلی۔ ویسے بھی وہ اس وقت کسی کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پہ تیار نہ تھا۔ اسی لیے تو فنکشن ادھورا چھوڑ کر نکل آنے کے بعد بھی ڈیڑھ گھنٹے سڑکوں پہ بے مقصد گاڑی دوڑاتا رہا تاکہ جب گھر لوٹے تو سب سوئے ہوں۔ اور سب تھے کون ایک ابا اور ایک اماں ابا کے بارے میں تو اسے پکا پتہ تھا کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد ان سے بمشکل آدھ ایک گھنٹہ ہی جاگا جاتا ہے، اماں کے بارے میں خدشہ تھا کہ وہ ضرور اس کی چوکیداری کرنے پہ کمربستہ رہتی تھیں۔ اب بھی اسے ان کا سامنا کرنا۔ مزید ان کے سوالوں کا جواب دینا ایک عذاب لگ رہا تھا۔

"روٹی لگاؤں یا کھا کے آیا ہے؟" بالو کے پوچھنے پہ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ جس سے وہ کچھ نہ سمجھ سکیں کہ اس کا مطلب کیا تھا۔

"کیا نہیں؟ کھا کر نہیں آیا۔ یا لگانے کو منع کیا ہے۔"

"نہیں کھائی۔" بہت مشکل سے اس نے پتھر کی طرح یہ دو لفظ اگلے۔

"یاروں دوستوں کے ساتھ ہو گی آج تیری روٹی۔" اب کے بلقیس بیگم نے قیاس آرائی کی۔

"کسی ہوٹل شوٹل میں گئے تھے یا گھر پہ بندوبست تھا؟ بڑے دن ہو گئے شہزادے، تو نے کسی دوست کی روٹی نہیں کی گھر پہ۔ اچھا لگتا ہے کوئی آئے، کھائے۔ دسترخوان سجے رہیں تو برکت رہتی ہے۔ تو سارا دن تو گھر ہوتا نہیں، رات کو بھی اکثر کھا پی کے آتا ہے اور ہمارا کوئی سجن ہے نہیں جس کے لیے تردد ہو۔ اک میں بڈھی، اک تیرا پیو دونوں بیماریوں کے مارے۔ اس کی شوگر زیادہ رہتی ہے میرا بلڈ پریشر، ہر اللہ کی نعمت بند ہے۔ باورچی خانہ اداس ہو

کے رہ گیا ہے۔ میرے ہاتھوں سے تو زلیقہ (ذائقہ) بھی روٹھ گیا ہے، چھکیے اپلے کھانے پکا پکا کر۔ میں کہتی ہوں شہزاد، کسی روز اپنے یاروں کو روٹی پہ بلا۔ چل کھا نہیں سکتی مگر اپنے من پسند چسکے والے کھانے پکا کر چاہ تو پورا کروں گی اور تیرے یاروں کو بھی پتہ چلے کہ شہزاد ملک کی ماں آخر چیز کیا ہے۔" سارا دن کسی دسراہٹ کو ترستی بالو نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی اس کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ اسے سن رہا ہے یا نہیں۔ جواب دے رہا ہے یا نہیں۔ اور اس کے آخری جملے پہ تو بے زاری سے۔ سر صوفے کی پشت سے ٹیکے، آنکھیں موندے شہزاد کو بھی چونک کے سنبھلنا پڑا۔ اس کا ذہن اس وقت کہیں اور پرواز کر رہا تھا۔ ماں کی آوازاسے کہیں دور سے ایک ان چاہے شور کی طرح سنائی تو دے رہی تھی مگر وہ کیا بات کر رہی ہے یہ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کسی ادھیڑبن میں مگن اس کے دماغ نے بس یہی ایک آخری فقرہ غور سے سنا تھا اور وہ چونک گیا تھا۔

"تیرے دوستوں کو بھی تو پتہ چلے کہ شہزاد ملک کی ماں آخر چیز کیا ہے۔"

اس نے ذرا دھیان سے جانچنے کے لیے یہ فقرہ دل ہی دل میں دوہرایا اور بے ساختہ کہہ اٹھا۔

"اللہ نہ کرے۔"

اس کی سرگوشی پہ بالو نے قطعی دھیان نہ دیا۔ ایک تو ویسے ہی اب وہ قدرے اونچا سننے لگی تھی، دوسرا اسے سامنے والے کی سننے سے زیادہ اپنی کہنے سے دلچسپی تھی۔

"ادھر بھی دیگچے کھڑکنے کی آوازیں آئیں، کڑاہی میں تلنے کی شاں شاں آئے۔ ہائے۔ کان ترس گئے ایسی آوازوں کو اب تو یخنی بن جاتی ہے، سبزی ابال لی، بوٹی بھی ابلی ہوئی۔ بڑا جی کرتا ہے، بارہ پندرہ جی (لوگ) روٹی پہ آئیں، میں پلاء (پلاؤ) دم دوں، نہاری پکاؤں بونگ والی، توے والی قیمے کی ٹکیاں تلوں بیسن والی سچھی (مچھلی) گڑ والے چاول ڈھیر سارا بادام ڈال کر اور میٹھے کا دیسی گھی والا حلوہ جس میں رج کے پستہ ڈالا ہو۔"

پیروں کو شوز اور موزوں سے آزاد کرنے کے بعد شہزاد نے انگلیاں ذرا سی ہلائیں چلائیں اور کوٹ اتار کر صوفے پہ پھینکتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

"چاء لے کر آؤں۔"

بالو کے پوچھنے پہ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہلاتے رہ گیا۔ چائے یا کافی کے ایک گرما گرم مگ کی اسے شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ لیکن اگر اماں چائے کے بہانے اس وقت اس کے کمرے میں آ جاتی تو صبح سے پہلے اس کا نکلنا محال تھا اور وہ اس وقت چائے سے زیادہ جس چیز کا حاجت مند تھا۔ وہ تنہائی اور یکسوئی تھی۔ اس لیے انکار کر کے فوراً "اندر چلا گیا اور اس سے پہلے کہ دوسری جانب سے کوئی اور سوال آتا" اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

وہ کپڑے تبدیل کیے اور لائٹ آن کیے بغیر بیڈ پہ آڑا ترچھا لیٹ گیا۔ صرف سائیڈ ٹیبل پہ پڑا لیمپ ہاتھ بڑھا کے آن کر لیا۔ مدھم روشنی اور پرسکون تاریکی بھی اس کے اعصاب کو سہلانے میں ناکام تھی۔ باہر سے آتی بالوں کی چپل گھسٹنے کی آواز، ہلکی سی ناقابل فہم بڑبڑاہٹ اور کچن، ڈرائنگ روم اور بیرونی دروازہ کے زور زور سے کھلنے اور بند ہونے کے دھماکے اسے پریشان کر رہے تھے۔ بالو کو سونے سے پہلے بار بار دروازوں کے لاک چیک کرنے کی عادت تھی۔ آخر کار اس کے کمرے کا دروازہ زور سے بند ہوا اور کافی دیر تک پھیلے رہنے والے سناٹے نے شہزاد ملک کو احساس دلایا کہ اب اماں بھی سونے چلی گئی ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔

"اماں مجھے معاف کرنا۔ ایسا نہیں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ ایسا بھی نہیں کہ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی عزت یا احترام نہیں۔ ہاں میں تم سے دور بھاگتا ہوں۔ ابا کے حوالے کو اپنے لیے قابل شرمندگی جانتا ہوں مگر اس کی ایک وجہ ہے۔ یہ وجہ صرف میں جانتا ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ آپ دونوں بھی اس کو جانیں مگر آپ لوگ نہ جان سکے نہ احساس کر سکے۔ یہ دکھ صرف میرا دکھ ہے۔ آپ دونوں تو اسے سرے سے کوئی دکھ تک ماننے سے انکاری رہے، میرا درد کیا بانٹتے۔ یہ درد صرف میرا درد ہے اسے میں نے تنہا سہا ہے یہ دکھ میرے ساتھ پل کر جوان ہوا ہے۔ جب ہر تکلیف میں نے اکیلے سہی ہے تو مجھے اکیلے رہنے کی عادت تو ہونی تھی۔

☼ ☼ ☼
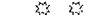
اسے اپنے بچپن کے ابتدائی واقعات تو یاد نہ تھے۔ یعنی کہ شروع کے دو چار سالوں کی باتیں مگر اماں کی زبانی سنا تھا کہ تب ابا کے مالی حالات ٹھیک نہ تھے۔ وہ نیا نیا لاہور شہر آیا تھا اور ابھی اس کے قدم ٹھیک طرح سے جمے نہ تھے کہ اس نے بلقیس بیگم سے شادی کر لی۔ بلقیس بیگم جو شادی سے پہلے فلموں میں کورس میں شامل ہو کے گانے گاتی تھی اور جسے میڈم نور جہاں' مالا بیگم اور رونا لیلیٰ بننے کی تمنا تھی۔ شہزاد کا ابا' کرم الٰہی اس سے اسٹوڈیو میں ہی ملا تھا۔ وہ بھی ان دنوں فلموں اور ڈراموں میں کام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس کا باپ یعنی شہزاد کا دادا اپنے زمانے کا نامور کامیڈین تھا۔ اس کو پاکستان میں اسٹیج ڈراموں کے بانی کامیڈین میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ ابتدا میں وہ میلوں' ٹھیلوں میں لوگوں کو ہنسانے کا کام کرتا تھا اور یہ کام اس کا جدی پشتی تھا یعنی وہ خاندانی بھانڈ تھا' عرف عام میں میراثی' قیام پاکستان کے بعد ایک میلے میں ہی ایک نامور فلمساز نے اس کی برجستہ گوئی اور کمال کی حسن مزاح سے متاثر ہو کر اسے اپنی فلم میں چانس دیا۔ فلم کی شوٹنگ اسی گاؤں میں ہو رہی تھی اور فلمساز کو اس دور کے پائے کے کامیڈین وغیرہ دستیاب نہیں تھے اس لیے اس نے اس تجربہ کار مسخرے سے استفادہ کیا۔ اس کی قسمت کہ نہ صرف فلم ہٹ ہوئی بلکہ اس کا مختصر سا کام بھی پسند کیا گیا۔ تب پنجابی فلمیں چلتی بھی خوب تھیں۔

کرم الٰہی کے باپ کو مزید فلمیں ملیں تو وہ خاندان سمیت لاہور منتقل ہو گیا۔ اس کے خاندان کے بہت سے لوگ ابھی ابھی اپنے موروثی پیشے سے وابستہ تھے' وہی شادی بیاہ اور میلوں پہ جگت بازی کے ذریعے لوگوں کو ہنسانے کا کام اس کا اصل نام تو کوئی اور تھا مگر فلموں میں وہ بادشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے پنجابی فلموں کی کامیڈی کا بے تاج بادشاہ تصور کیا جاتا تھا۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ پنجابی فلموں کا دور ختم ہونے لگا۔ اردو فلموں کی مانگ بڑھ گئی۔ اردو فلموں کے لحاظ سے بادشاہ قطعی ان فٹ تھا۔ اس کے زوال نے اس کی فیملی کو ایک بار پھر سے بحران میں مبتلا کر دیا۔ پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا بادشاہ نے ناکامی کا یہ عذاب بہت کم دنوں تک بھگتا اور دنیا چھوڑ گیا۔

کرم الٰہی نے بھی وہ پیشہ چنا جو اس کا واحد ہنر تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ ویسے بھی کچھ صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں اور اس میں لوگوں کو ہنسانے کی صلاحیت قدرتی تھی۔۔۔ اور بے پناہ تھی۔ باپ کی وجہ سے وہ بہت سے فلمی حلقوں میں جانا جاتا تھا۔ اسے بھی اکا دکا فلموں میں بھرتی کا رول مل ہی جایا کرتا۔ یہیں اس کی ملاقات بلقیس بیگم سے ہوئی جو سریلی بیگم کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس سے شادی کا فیصلہ کرم الٰہی کے حق میں نیک شگون ثابت ہوا۔ اسے چند اہم فلموں میں کام ملنا شروع ہو گیا۔ اردو سافٹ رومینٹک فلموں کا جادو کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مولا جٹ ٹائپ کی پنجابی فلموں نے دھوم دھڑکے کی راہ پھر کھول دی تھی۔ ان مار کٹائی اور تشدد سے بھرپور فلموں میں توازن قائم کرنے کے لیے دو ہی عناصر کام آتے ایک تو بجی سنوری صحت مند ہیروئن کے بھڑکیلے رقص اور دوسرا کسی مضحکہ خیز صورت والے کامیڈین کے پھکڑ اور عامیانہ مذاق۔ انہی دنوں تھیٹر کے بھی بھاگ جاگ گئے۔ سنجیدہ تھیٹر پیش کرنے والے مایوس ہو کر گھر بیٹھ چکے تھے۔ جگت بازوں کا راج قائم ہو چکا تھا۔ کرم الٰہی کی بھی چاندی ہو گئی۔ وہ ببلہ کے نام سے شہرت اور دولت سمیٹنے لگا۔ اس کے اور بالو کے گھر میں ایک ہی پھول کھل سکا۔ شہزاد۔۔۔ جسے اس نے اپنے باپ کی مناسبت سے شہزادہ کا خطاب دیا۔ بالو کا گلوکارہ بننے کا جنون ابھی تک قائم دائم تھا مگر کوئی اسے کورس سے نکال کر آگے کرنے کا رسک نہیں لیتا تھا۔ ببلہ کے نام کی شہرت بھی اس کے کسی کام نہیں آئی تھی۔ شہزاد کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد تک بھی وہ یہ کام کرتی رہی پھر مایوس ہو کر۔۔۔ یا شاید خوشحالی کی وجہ سے اس نے یہ کام مکمل ترک کر دیا۔

کرم الٰہی عرف ببلہ کا اٹھنا بیٹھنا اب اچھے لوگوں میں تھا۔ وہ چار خانے والے تہبند اور کڑھے ہوئے ململ کے کرتوں کی بجائے اب بوسکی کی شلوار قمیص اور راسلک کے کرتے پہنتا تھا۔ پیروں میں ملتانی "کھیڑی" کی بجائے سلیم شاہی اور باٹا کے بند جوتے ہوتے۔ لبوں میں دو آنے کی بیڑی کی بجائے گولڈ لیف اور کے ٹو کا سگریٹ دبا ہوتا۔ گلے میں چاندی کے بٹن' اللہ والا طلائی لاکٹ' انگلیوں میں قیمتی پتھروں سے سجی انگوٹھیاں۔۔۔ اس کی تو رہی

الگ تھی۔ کرائے کا گھر تھا مگر رہن سہن میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ صوفے' ڈبل بیڈ' بڑے آئینے والی سنگھار میز' ٹی وی۔۔۔ بالوں کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے۔ بات بات پہ گالی بکنے کی عادت بڑی مشکل سے ترک کی۔ اب بڑی بڑی فلمی تقریبات میں شوہر کے ساتھ بن ٹھن کے شرکت کرنا ہوتی تھی۔

کرم الٰہی کے دل میں نئے ارمان جاگنے لگے۔ پیسہ کھلا آیا تو سوچ بھی کھل گئی۔ اس نے اکلوتے بیٹے کو شہر کے سب سے اعلیٰ انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرایا جس کا نام وہ اکثر لوگوں سے سن چکا تھا۔ بس یہیں سے اصل خرابی کا آغاز ہوا۔ اگر وہ اپنے اصل کو بدل نہیں سکتا تھا تو اسے اپنے بیٹے کو ایک الگ ماحول میں بھیجنے کا تجربہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس نے ایسا ہی کیا اور یہ شہزاد کے حق میں بہت برا ہوا۔ اتنا برا کہ اس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہا تھا۔

اس اسکول میں شہر کے سبھی رؤسا اور شرفاء کے بچے پڑھتے تھے۔ اپنے وقت کے دو نامور فلمی ہیروز کے بچے بھی یہیں زیر تعلیم تھے جن کا تعلق اونچے کاروباری گھرانوں سے تھا اور وہ اتفاقیہ یا شوقیہ طور پہ فلموں میں آئے تھے۔ ان کی وجہ سے شہزاد کو جلد ہی پورے اسکول میں "ببلہ کا بیٹا" کے طور پہ متعارف کرا دیا گیا۔ اس سے پہلے وہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ "ببلہ" کا بیٹا ہونا کوئی ہنسی کی بات ہے یا اس کے باپ کا نام اتنا مضحکہ خیز ہے کہ لوگ قہقہہ مار کے ہنس پڑتے ہیں۔ وہ تو اتنا ہی سمجھتا تھا کہ مشہور اداکاروں کی طرح اس کا باپ بھی ایک اداکار ہے۔ اتنا ہی مشہور ہے جتنا کہ وہ۔۔۔ مگر اب وہ ہیرو اور کامیڈین کا فرق جاننے لگا تھا۔ اسے بھانڈ اور میراثی ہونے کا مطلب سمجھ میں آنے لگا تھا اور جیسے ہی وہ اس فرق سے روشناس ہوا' شرم سے منہ چھپانے لگا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔ کسی کا باپ اعلیٰ سرکاری افسر تھا' کسی کا وکیل' کسی کا ڈاکٹر تو کسی کا وزیر۔۔۔ جبکہ اس کا باپ' ببلہ تھا۔ فلم میں گدھے اور بندر جیسی شکلیں بنانے والا۔

ہیروئن کے ہاتھوں تھپڑ کھا کے ناچنے والا

ولن کے ہاتھوں پیٹھ پہ جوتی کھانے والا

ہیرو کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کروا کے بے غیرتوں کی طرح ہنسنے والا۔

اپنے ذو معنی فحش مکالموں اور پھکڑپن کو جھولی جگت بازی کی وجہ سے سنجیدہ فلم بینوں کی نظر میں معیوب کہلائے جانے والا ایک تھرڈ کلاس مسخرہ۔

اس کی کوئی بھی نئی مووی آنے کے بعد اسکول میں لڑکے اس کے سامنے مزے لے لے کر تبصرے کرتے۔

"یار تو نے نئی فلم دیکھی اس میں ببلہ کو منہ کالا کر کے گلے میں جوتیوں کے ہار پہنا کے گدھے کی سیر کرائی گئی ہے"

"ہاں اور ہیرو کا وہ ڈائیلاگ کتنا مزے دار تھا۔ ہنس ہنس کر ہم سب لوٹ پوٹ ہو گئے جب اس نے کہا' سفید گدھے پہ کالا گدھا سواری کر رہا ہے۔"

اور شہزاد ذرا سیانا ہوا تو ایسے تبصرے سن کر گھر آنے کے بعد باپ سے الجھنے لگا۔

"ابا کیا ضرورت تھی فلم میں اتنی مار کھانے کی۔"

"او پتر' فلم فلم ہوتی ہے' کوئی سچ مچ کی مار نہیں پڑی ہے کسی کی ہمت تو ہو کرم الٰہی کو ہاتھ لگائے۔" وہ بہلاتا۔

"مگر سب کو تو یہی نظر آتا ہے ناں کہ آپ کو مار پڑ رہی ہے' سب اتنا مذاق اڑاتے ہیں کہ تمہارے ابا کو تو ہر فلم میں مار کھانے یا گدھا اور بندر کی نقلیں اتارنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔"

"اور تو چپ چاپ سن لیتا ہے۔ پوچھا کر کہ تم لوگوں کے باپ کو یہ سب بھی آتا ہے؟ یہ فن ہے فن' ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔"

"ان لوگوں کو اور بہت کچھ آتا ہے۔ قاسم کا ڈیڈی ڈاکٹر ہے اور شبیر کا پائلٹ۔۔۔ جہاز اڑاتا ہے۔ آپ کو جہاز اڑانا آتا ہے؟ لمبی گاڑی چلانی آتی ہے؟ انگریزی بولنی آتی ہے؟ مجھے حساب کے سوال سمجھانے آتے ہیں؟"

"اوہو" کیا الٹی سیدھی باتیں سیکھ کے آجاتا ہے تو اسکول سے 'جھلیا' ہر کسی کے کام وکھرے (الگ) ہوتے ہیں۔ یہ جو تیرے یار کا پیو ڈاکٹر ہے اسے دوسرے والے کی طرح جہاز اڑانا نہیں آتا ہوگا۔ جہاز اڑانے والے کو ٹیکہ لگانا نہیں آتا ہوگا۔ تجھے ان میں سے ایک بھی کام نہیں آتا' اسی طرح ان لوگوں کے بس سے باہر ہے وہ کام۔۔۔ جو میں کرتا ہوں۔"

"ہاں تو یہی کہہ رہا ہوں میں کہ کیوں کرتے ہیں آپ یہ کام اور بھی تو اتنے کام ہیں۔ کسی دفتر میں کام کر لیتے۔ کوئی دکان کھول لیتے۔۔۔ کچھ بھی کر لیتے۔"

"او تیرے دادے کا دادا بھی کبھی ٹک کر بیٹھنے والا کوئی کام نہیں کر کے گیا تو میں کیسے دکان کھول کے بیٹھ جاؤں۔ ہماری ہڈی میں چین نہیں' میراثی لوگ ہیں ہم۔" اس نے فخریہ چھاتی پھلائی۔

"ہمارا فن ہماری روٹی ہے۔ اس فن سے کماتے ہیں' اسی کا کھاتے ہیں اور اللہ کی دکھی مخلوق کو ہنسانا تو بڑے ثواب کا کام ہے۔ فنکار کی جو عزت ہے وہ ڈاکٹر یا افسر کی کہاں۔"

لیکن شہزاد ان بہلاووں میں آنے والا نہیں تھا۔ فنکار کی اور خصوصاً "بلبلہ جیسے فنکار کی معاشرے میں کیا عزت تھی یہ اسے معلوم ہو چکا تھا اور یہ علم اتنا تکلیف دہ تھا کہ اس کا سارا بچپن اپنے ہونے پہ شرمندہ رہا۔

اسکول میں ہونے والے کسی فینسی ڈریس شو یا ڈرامے میں حصہ لینے کی خواہش کی تو ساتھی طلباء تو ایک طرف ٹیچرز بھی دبا دبا مذاق کرنے سے نہ چوکے۔

"ہاں بھئی' بلبلہ کا بیٹا یہ کام نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا۔ خون پکار ہی اٹھتا ہے۔"

اور وہ ایسا پیچھے ہٹا کہ ساری اسٹوڈنٹ لائف میں ایسی ایکٹی وٹیز میں حصہ لینا تو ایک طرف' اس نے ایسے فنکشنز میں آنا ہی ترک دیا۔

"نہیں۔۔۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔ ابا پتہ نہیں کن لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں جو انہیں اس بات کا احساس تک نہیں کہ لوگ ہمیں اور ہمارے خاندان کو کن نظروں سے دیکھتے ہیں شاید ان کے دوست' ساتھی سب انہی کے جیسے ہیں۔ اگر وہ بھی میری طرح ایسے اسکول میں پڑھے ہوتے' اتنے لوگوں کا سامنا کیا ہوتا تو حقیقت جان جاتے۔ جیسے میں جان چکا ہوں کہ اس پیشے کی کتنی عزت ہے۔ لوگوں کے لیے ہماری ذات ہی ایک مذاق ہے۔ ہمارا وجود ہی کراہیت آمیز ہے۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔ میں اپنی پہچان بدلوں گا۔ وہ وقت ضرور آئے گا جب زمانہ مجھے بلبلہ کا بیٹا' بادشاہ کا پوتا سمجھنا بھول جائے گا' میرا اپنا حوالہ میرے لیے باعث عزت ہوگا۔"

بہت چھوٹی عمر میں سہی تلخیوں نے اسے اتنا پر عزم کر دیا تھا کہ وہ یہ ارادہ کر بیٹھا۔

پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے گھریلو ماحول سے دور ہوتا گیا۔ گھر میں ہوتے ہوئے بھی وہ گھر میں نہ ہوتا۔ اپنے قریبی عزیزوں اور رشتے داروں سے اس نے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ یہ بات کرم الٰہی اور بالو دونوں کو بہت کھلتی۔ فطرتاً" وہ دونوں بہت با اخلاق اور مروت والے تھے۔ چار پیسے ہاتھ آجانے کے بعد انہوں نے غریب رشتے داروں سے کنی کترانے والی حرکت نہ کی تھی۔ ان کے گھر اب بھی ایسے لوگوں کا آنا جانا تھا کہ محلے کے کسی اور گھر کا یہ دروازہ کھٹکھٹاتے تو یقیناً "اندر سے کوئی جھڑک کے بھگا دیتا۔۔۔ کہ "جاؤ بابا معاف کرو۔"

خصوصاً "بالو کی رشتے کی بہنیں اور سہیلیاں اب بھی سڑکوں پہ گھا گھرے ہلاتی گڑوی بجا کے گاتے ہوئے بھیک مانگنے کا کام کرتی تھیں۔ خود وہ بھی کئی سال اس کام سے وابستہ رہی۔ فلمیں دیکھنے کی شوقین تھی اور ہیروئین کی فین۔ ایک جگہ ایک ہیروئن کی فلم کی شوٹنگ دیکھنے رکی اور اسے گڑوی بجا کے گانا بھی سنایا۔ اس نے تو دس کا نوٹ انعام دیا اور اس یونٹ کے ایک کارندے نے اس کی کراری پاٹ دار آواز سے متاثر ہو کے اسے گانوں کے پیچھے کورس میں گانے والی لڑکیوں میں شامل کر لیا۔ وہ اپنا اصل نہ بھولی تھی' اب بھی جب چار پرانی سہیلیاں جمع ہو جایا کرتیں تو گڑوی بجا کے تانیں بکھیرتے ہوئے پرانی یادیں تازہ کی جاتیں۔

شہزاد کا قد اونچا ہوا تو پہلے اس نے ماں کے ہاتھ سے گڑوی چھین کے باہر پھینکی۔ پھر اس کا نام "سریلی بیگم"

اس گھر میں لینا ممنوع قرار دیا اور تو اور اس گھر میں بھانت بھانت کی خانہ بدوش عورتوں کے آنے پہ پابندی لگا دی۔ بالو ماں تھی۔۔۔ بیٹا بھی اکلوتا۔۔۔ اور جوانی میں قدم رکھتا ہوا اس لیے دب گئی' مان گئی۔ مگر کرم الٰہی بھڑک گیا۔ وہ ابھی کھا کما رہا تھا' بیٹے کے رعب میں کیا آتا۔ مگر کب تک؟ یہ ہوائی رزق کب تک ساتھ دیتا ہے۔ کئی سالوں تک اس نے فلموں کے ذریعے شہرت اور نام سمیٹا' اسٹیج ڈراموں کے ذریعے دولت کمائی مگر اب نئے نئے ابھرتے ناموں نے اس کی مانگ کم کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے کام ملنا بند ہو گیا۔ اب اس کے کام میں دم بھی نہ رہا تھا' سگریٹ اور شراب نے باپ کی طرح اس کے پھیپھڑے بھی تباہ کر دیے تھے۔ اسٹیج پہ تو وہ بالکل بھی کام نہ کر سکتا تھا۔ مسلسل بولنا اور اونچی آواز نکالنا اب اس کے بس میں نہ تھا۔ کمائی ختم ہوئی تو دم خم بھی نکل گیا۔ دوسری طرف شہزاد تعلیمی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ عملی میدان میں بھی خوب سرگرمی دکھاتا رہا۔ لوگوں سے بھاگنے اور کترانے کی کوشش میں اس نے کم عمری میں ہی کئی مصروفیات تراش لی تھیں۔ اسکول کے زمانے سے ہی وہ ٹیوشن پڑھانے اور دکانوں میں سیلز بوائے کا کام کرنے لگا۔ اپنے پیروں پہ آپ کھڑے ہونے کی وجہ سے ہی جب کرم الٰہی کا کام ماٹھا ہوا تب بھی اس کی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھنے کی روٹین ڈسٹرب نہ ہوئی۔ وہ اپنے تعلیمی اخراجات خود ہی برداشت کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے اپنی پھوپھی کی بیٹی دعا کا تعلیمی خرچ بھی اٹھا رکھا تھا۔ حالانکہ اسے اپنے سبھی رشتے داروں سے نفرت تھی۔ وہ اپنے ماں باپ سے تو نفرت نہیں کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً "ان کے حصے کی نفرت بھی ارد گرد بانٹ دیا کرتا۔ مگر پھوپھی سے اسے خاص انس تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی کم گوئی نرم مزاجی اور سادگی کی وجہ سے خاندان کی دیگر عورتوں سے مختلف تھی۔

ہاں پھوپھا ویسا ہی تھا جیسا کہ اس کی برادری کے اکثر مرد تھے وہ کرم الٰہی کا چچیرا بھائی بھی تھا۔ طبلہ نواز تھا' ایک موسیقار کا سازندہ تو تھا ہی ساتھ میں رات کو بازار حسن کی ایک نامی گرامی طوائف کے پیچھے بھی تھاپ لگاتا تھا۔ دعا میں پڑھنے کا ذوق دیکھ کر شہزاد کو خود بخود اپنے بچپن کی محرومی یاد آجاتی۔ وہ صرف اپنی ہی پہچان نہیں بدلنا چاہتا تھا بلکہ اپنے خاندان' ذات اور برادری کی آنے والی نسلوں میں ایک الگ شناخت چاہتا تھا اس لیے اس نے صدق دل سے یہ تمنا کی کہ دعا بھی اس سارے ماحول سے دور رہے اور اچھے گھرانوں کی بیٹیوں کی طرح پلے بڑھے۔ پھوپھی کے ہوتے اسے امید تھی کہ ایسا ہی ہوگا مگر ان کی وفات کے بعد اسے پھوپھا کی جانب سے کوئی خوش فہمی نہ رہی۔ اس نے ماں کو مشورہ بھی دیا کہ دعا ابھی چھوٹی ہے ماں کے بغیر نہ رہ سکے گی اور اگر پھوپھا نے دوسری شادی کر لی تو اس معصوم کا کیا مستقبل ہوگا اس لیے اسے پھوپھا سے مانگ لو اور اپنی بیٹی بنا کر مستقلاً "یہاں رکھ لو۔ ماں نے ایک بار کوشش بھی کی مگر اللہ وسائے نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اکلوتی بیٹی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس کی اس محبت کا راز جلد ہی کھل گیا جب اس نے بیٹی کو موسیقی سیکھنے پر لگا دیا۔ شہزاد بس غصے کے مارے پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کا دھیان بانٹنے کے لیے اور بھی بہت سی مصروفیات تھیں۔ وہ ایک نہیں چار چار جگہ ہاتھ پھنسائے بیٹھا تھا۔ اسے ایک اخبار میں بھی جاب مل گئی اور سوئے اتفاق اس کے ذمے شوبز کے صفحات لگے۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی نگار خانوں کی طرف رخ کرنا پڑتا اور تب اسے اندازہ ہوا کہ اس شعبے سے صرف اس کے باپ جیسے لوگ ہی وابستہ نہیں بلکہ اکثر پڑھے لکھے باشعور افراد بھی شامل ہیں جو باعزت گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور دولت و شہرت کے ساتھ ساتھ عزت بھی سمیٹ رہے ہیں تب اسے اندازہ ہوا کہ اگر حوالہ قابل محترم ہو تو اس شعبہ میں بھی عزت سے سروائیو کیا جا سکتا ہے یعنی کہ یہ کام بذات خود برا نہیں۔ اسی لیے جب اسے بحیثیت ایک رائیٹر کے ایک ڈرامہ لکھنے کی آفر ہوئی تو وہ ذرا سا ہچکچانے کے بعد آمادہ ہو گیا۔

اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنانے کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی دھیان رکھا کہ کسی پہ یہ حقیقت آشکار نہ ہو کہ وہ ماضی کے کامیڈین بلبلہ کا بیٹا ہے۔ کسی کو یہ تحقیق کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی وہ اپنے اطوار و ذہانت سے ایسے بیک گراؤنڈ کا لگتا بھی نہیں تھا۔ بلبلہ بھی اب گھر کا ہو کے رہ گیا تھا۔ اس میں اس کی بیماری کے ساتھ ساتھ شہزاد

کی پابندیوں کا بھی اثر تھا۔ اس لیے لوگوں کو یہ فنکار اب یاد بھی نہ تھا خصوصاً "نئی نسل کے لیے یہ نام اتنا جانا پہچانا نہ تھا۔ یاد رکھنے کے لیے ہیروز کے نام ہوتے ہیں نہ کہ مسخروں کے۔

رائٹر یا ڈائریکٹر بننا اس کی منزل نہ تھی۔ وہ بزنس مین بننا چاہتا تھا۔ یہ احساس پوری طرح تھا کہ شوبز کی کمائی او شہرت دونوں وقتی ہوتے ہیں۔ اگر پائیدار استحکام حاصل کرنا ہے تو ایک کامیاب کاروبار میں قدم جمانے ہوں گے۔ مگر اتنے سال شوبز جرنلسٹ کے طور پہ اور پھر رائٹر اور ڈائریکٹر بن کر پہچان بنانے کے بعد جب وہ کاروبار جمانے کی پوزیشن میں آیا تو اسی شعبے میں کاروبار شروع کر سکا۔ اس کی ساری جان پہچان 'شناخت نہ چاہتے ہوئے بھی شو کے حوالے سے تھی۔ تب اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ سوچا۔

وہ پیشہ وارانہ طور پہ انتہائی کامیاب جا رہا تھا مگر اندر سے ایک تنہا اور گھبرایا ہوا شخص بنتا جا رہا تھا۔ جتنا اب وہ زیادہ لوگوں میں پہچانے جانے لگا تھا اتنا ہی خوفزدہ رہنے لگا تھا کہ کسی کو اس کی اصلیت کے بارے میں علم نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں اس کی کی جانے والی شعوری اور غیر شعوری حرکتیں 'دانستہ اور نادانستہ کوششیں۔۔۔ کرم الٰہی سے اس کے اختلافات کو بڑھاتی جا رہی تھیں۔ اس کا احساس کمتری بڑھتے بڑھتے اس کے قد سے بھی اونچا ہو گیا تھا۔ اب وہ چاہے بھی تو اس سے نجات نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

عمر کے سنہری سال اس قد سے اونچے بڑھتے سائے سے لڑتے گزر رہے تھے۔ وہ جس شعبے میں تھا وہاں ایک سے ایک حسین چہرہ اور رنگینی بھی تھی مگر بے باکی کی یہ فضا بھی اس کے اندر کوئی لطیف جذبہ نہ جگا سکی۔ کیونکہ ان حسین چہروں کے پس منظر سے گونجتی طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی چھن چھن اسے ان سے وقتی یا دل لگی کا رشتہ تک قائم کرنے سے روکتی تھی۔ وہ جس چیز سے الرجک تھا۔۔۔ دور بھاگتا تھا اسے اپنی قربت میں کیسے آنے دیتا۔

دوسری طرف فطری تقاضے اسے کبھی کبھی ایسا سوچنے اور چاہنے پہ مجبور بھی کر دیتے مگر وہ بڑی ہی کامیابی کے ساتھ اپنے اندر کے اس دیو سے لڑتا تھا۔ اسے انتظار تھا ایسے وقت کا جب وہ اس مقام تک پہنچ جائے گا جہاں اس معاشرے کے سب سے عزت دار طبقے میں بھی احترام کے ساتھ پہچانا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنی شہرت بے داغ رکھنی تھی۔ وہ کسی ایسے ویسے ٹائم پاس اسکینڈل میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔

اس کی یادداشت میں اب تک وہ واقعہ کنڈلی مارے بیٹھا تھا جب اس کے پہلا ذاتی گھر خریدنے پہ اس نے اماں کی فرمائش پہ گھر میں ایک میلاد کا اہتمام کیا۔ ان کی خوشی کی خاطر اس نے اس روز انہیں اپنی عزیز و اقارب کو بلانے کی اجازت بھی دے دی مگر دن کے وقت۔۔۔ رات کو وہ اپنے کاروباری ساتھیوں کو ڈنر دے رہا تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ ان کا سامنا اس کی برادری کے لوگوں سے ہونا تو درکنار' اس کے باپ تک سے نہ ہو بس یہ پہلا اور آخری واقعہ تھا جس کے بعد اس نے ماں اور باپ دونوں پہ مکمل پابندی عائد کر دی کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کو گھر تک نہیں لا سکتے نہ ہی ان سے ملنے جا سکتے ہیں۔ یعنی یہ ایک طرح سے پوری ذات برادری سے قطع تعلق کر لینے کا حکم نامہ تھا۔ جس پہ وہ دونوں نہ صرف جز بز ہوئے بلکہ سخت احتجاج بھی کیا۔ مگر وہ اب تک اس فیصلے میں معمولی سی ترمیم تک کرنے پہ تیار نہ تھا اور پوری ثابت قدمی کے ساتھ پچھلے کئی سالوں سے قائم تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اب اپنے کسی بھی واقف کار کو گھر تک لانا چھوڑ دیا۔ اب وہ سارے تکلفات اور اہتمام کسی ہوٹل میں ادا کر لیتا۔ اس کی اپنی ایک الگ زندگی تھی مگر اس الگ ڈگر پہ چلتے چلتے بھی وہ اس واقعے کو کبھی چاہنے کے باوجود بھی بھلا نہ پایا تھا۔

وہ حسب معمول ایک فلم کے پریمیئر شو سے واپس آ رہا تھا۔ حسب دستور وہاں پینے پلانے کی محفل بھی زوروں پہ تھی۔ وہ عادی نہ تھا مگر یاروں کے اصرار پہ کبھی کبھار چکھ لیا کرتا تھا اور عادی نہ ہونے کی وجہ سے ہی یہ ذرا سا چکھنا بھی اسے خاصی حد تک مدہوش کر دیا کرتا۔ اسی لیے وہ اس چیز کو ہاتھ لگانے سے احتراز کیا کرتا تھا۔ لیکن اس رات بھی چند بے تکلف دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے وہ ایک آدھ پیگ پی گیا۔ گھر آنے پہ اس نے ہمیشہ کی طرح ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھولا' لاؤنج میں نائٹ بلب کی ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی کچن میں سے وہ

لمبا سا لڑکا مگ لے کر نکلتا دکھائی دیا تو شہزاد ٹھٹکا۔

"سلاماں لیکم پائی جان۔" اس نے اجڈپن سے سلام جھاڑا تو شہزاد کو یاد آیا کہ کل میلاد کی تقریب میں شرکت کے لیے اماں کے چند رشتے داروں نے آج ہی نکانے سے آنا تھا۔ اس نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیا۔

شہزاد نے صوفے پہ ٹائی اور کوٹ پھینکنا چاہا تو ٹھٹک گیا۔ ایک گٹھڑی سا بنا وجود اسے اس مدھم روشنی میں ناقابل شناخت لگ رہا تھا۔ اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی نسوانی وجود ہے ظاہر ہے کہ اماں تو اتنی مختصر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا مگر ایسا نہ کر سکا رگوں میں وحشی پن کے ساتھ دوڑتے خمار نے اسے ذرا سی بددیانتی کرنے پہ اکسایا۔ اپنے کمرے کی جانب بڑھتے اس کے قدم تھم گئے وہ پلٹا' ٹیبل لیمپ آن کیا۔ نائٹ بلب کی ہلکی زرد روشنی کے ساتھ اب لیمپ کی چھن چھن کے آتی مدھم روشنی بھی خوابناک سا فسوں پیدا کرنے لگی۔ وہ صوفے کی جانب بڑھا۔ وہ جو بھی تھی' کمبل گردن تک اوڑھے سمٹی سمٹائی مختصر سے صوفے میں پوری آ رہی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں آدھا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھیں۔ بے اختیار ہی اس کی لرزتی انگلیاں اس کے چہرے سے زلفیں ہٹانے لگیں۔ اس لڑکی کے ذرا سا کسمسانے پہ اس نے کرنٹ کھا کے ہاتھ پیچھے کیا۔ وہ جو بھی تھی' بہت کم سن اور بلا کی خوب صورت تھی۔ اتنی مدھم روشنی میں اس کے نقوش واضح نہ تھے لیکن کم سنی کی چھاپ اور رعب حسن دور سے نمایاں تھا۔ خواب میں نجانے کیا دیکھتے ہوئے وہ بالکل چھوٹے بچوں کی طرح مسکرائی تھی۔ اس کے نامحسوس انداز میں پھیلتے نازک لبوں کو دیکھ کر شہزاد بیک وقت دو جذبوں سے مغلوب ہوا۔ اس کے اندر کا وحشی جو نشے کے زیر اثر تھا' اپنے اندر پھوٹتی ناپاک جسارتوں میں مزید آگے بڑھنے پہ اکسانے لگا۔ دوسری طرف اس کا دل معصومیت کے اس مظاہرے پہ شرم کے مارے سمٹ کے رہ گیا۔

صبح آنکھ کھولتے ہی یہ واقعہ اس کی یادداشت میں تازہ ہو گیا۔ حواس جمع ہوتے ہی سب سے پہلا خیال اس کچن سے نکلتے لڑکے کی طرف گیا۔

نجانے کون تھا کمین ذات اور رات کو واقعی چائے بنانے آیا تھا یا لڑکی کے بے سدھ سوئے رہنے کا فائدہ اٹھانے' پتہ نہیں کب سے نیچے تھا اور مجھے دیکھ کر فرار ہوا۔ اماں سے پوچھتا ہوں کیا ضرورت تھی اس لڑکی کو وہاں سلانے کی۔

ساری جھنجلاہٹ اپنے دل کی بے ایمانی پہ تھی۔ نشہ ٹوٹنے کے باوجود اندر سے ایک خواہش جاگ رہی تھی کہ ایک بار پھر وہ چہرہ سامنے آئے اور وہ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ پورے اجالے میں اسے دیکھ سکے۔ وہ کمرے سے نکل کر اماں سے بات کرنے آ رہا تھا جب تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ایک نوعمر لڑکی سے بری طرح ٹکرایا۔ سفید شلوار کرتا اور سفید ہی بڑے سے دوپٹے میں سر ڈھانپے وہ لڑکی اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے' پورا سر اٹھائے اسے دیکھتی رہی پھر اچانک حیرت اور خوشی سے چلا اٹھی تھی۔

"چھاجی۔۔۔"

اور وہ اس کچھ کچھ جانے پہچانے چہرے کو یہ سوچ کر پہچاننے سے ہچکچا رہا تھا کہ جلد وہ اتنی بڑی بڑی کیسی لگ سکتی ہے 'فوراً" جان گیا کہ یہ وہی ہے اور محض ڈیڑھ برس کے وقفے سے نظر آنے کے بعد اب اتنی مختلف نظر آ رہی ہے۔

"دوئی۔۔۔" پہچان لینے کے بعد بھی اس کے لہجے میں ایک ناقابل یقین سا استفسار تھا اور پھر وہ مان گیا کہ وہی دوئی تھی۔ دیکھنے میں وہ کچھ الگ الگ سی ضرور لگ رہی تھی مگر تھی وہی۔۔۔ اسے دیکھ کر پٹر پٹر باتیں کرتی جوش و خروش سے اسکول کے واقعات سناتی۔ پھر بھی کچھ تھا جو پہلے والی دعا سے الگ تھا۔ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"دوئی تم کتنی بدل گئی ہو۔" وہ جھینپ گئی۔

"سوری چھاجی' دراصل کب سے آپ سے ملی نہیں ناں۔۔۔ اس لیے دل چاہا سب باتیں ایک دم ہی کہہ ڈالوں۔ رات کو بھی کافی دیر تک آپ کا انتظار کرتے رہنے کے بعد وہیں صوفے پہ سو گئی۔"

اور اس کے ساتھ قدم بہ قدم سیڑھیاں اترتا شہزاد ٹھٹھک کے رک گیا۔

"تو۔۔۔ رات تم تھیں لاؤنج میں؟"

وہ صرف گردن ہلا سکی۔

"کیوں؟" اس کے دھاڑنے پہ وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ گئی اور گرتے گرتے بچی۔

"یہ کوئی طریقہ ہے' جہاں دل چاہا سو گئے۔" وہ کتنی دیر فضول میں ڈانٹتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خیال آیا کہ وہ بلاوجہ خود پہ آیا غصہ اس پہ نکال رہا ہے۔ یہ ڈانٹ تو اس کے بے ایمان دل اور کمزور ایمان کو پڑنی چاہیے جو مدہوشی میں اس بچی تک کو نہ پہچان سکا۔ جسے گود میں کھلایا تھا اور انگلی تھام کے چلنا سکھایا تھا۔ رات بے دھیانی میں اس کے بارے میں سوچے غلط خیالات اسے اس حد تک نادم کرنے لگے کہ وہ کترا کے وہاں سے غائب ہو گیا۔

مگر کچھ دیر بعد وہ پھر سے سامنے تھی۔ ایک نئے روپ میں' اک نئی سج دھج کے ساتھ۔

● ● ●

وہ چاہنے کے باوجود خود کو پہلی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نگاہ ڈالنے سے روک نہ سکا' کھلتے ہوئے سبز اور بجھے بجھے سے زرد رنگ کے امتزاج سے تیار سادہ تراش کا شلوار قمیص اس کی چھب ہی بدل گیا تھا۔ صبح موتیے رنگ کے جوڑے میں وہ خود بھی موتیے کی منہ بند کلی لگ رہی تھی اور اب اس بہار رنگ پیراہن میں وہ بہار کا سارا شباب سمیٹے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ چاندی کی جھمکیاں بار بار اس کے رخساروں کو چھوتی ہوئی ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔۔۔ کسی بات پہ وہ زور کی ہنسی دباتے ہوئے آگے کو جھکی تو رنگین پراندے میں مقید اس کی سنہری زلفوں کے کتنے ہی ریشمی پھندے پھسل کر چہرے کے اطراف آن گرے۔ شہزاد نے ایک بار پھر نظر پھیری۔۔۔ مگر دل ایسی ہلکی پھلکی سرزنش کو کسی خاطر میں نہ لا رہا تھا۔۔۔ اگلے ہی پل وہ پھر اسے دیکھنے پہ مجبور تھا ۔۔۔ جواب وہاں سے اٹھتے ہوئے اسی جانب آ رہی تھی اور بے پروائی سے چوٹی میں سے نکل آنے والی سونے سی لٹوں کو انگلی کی مدد سے کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی' کان کا جھمکا۔۔۔ اور اس کی لرزش ایک بار پھر نمایاں ہو گئی ورنہ زلفوں کی سنہری چمک نے ان کی نقرئی دمک کو چھپا لیا تھا۔ اب رخساروں پہ پھر سے سونے کی بجائے چاندی کے عکس پڑ رہے تھے۔ کلائیوں میں ڈولتی کانچ کی چوڑیاں اونچی آواز میں اس کے بانکپن کی گواہی دے رہی تھیں۔ سمٹی سمٹائی چلتی وہ اچانک اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"چھا جی۔۔۔!"

نجانے اسے سامنے پا کے وہ ایسے بے تابی اور حیرت آمیز مسرت کے ساتھ چلا کیوں اٹھتی تھی جیسے عرصے تک تلاشنے کے بعد کوئی کھوئی ہوئی چیز اچانک سامنے آ گئی ہو۔

شہزاد نے اپنا خشک ہوتا حلق تر کرنے کی کوشش کی۔

"دوئی۔۔۔"

پرزور لہجے میں اس کا نام دہراتے ہوئے وہ درحقیقت خود کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ وہ کوئی اور نہیں۔۔۔ دوئی ہے' وہی دوئی۔۔۔ جو لمبے سے میلے فراک میں اپنا ہی پاؤں اٹکنے کے بعد منہ کے بل گر جایا کرتی تھی اور پھر دھول مٹی سے اٹے چہرے اور بالوں کے ساتھ گلا پھاڑ کے رویا کرتی تھی۔۔۔ تب وہ آگے بڑھ کے اس کا الجھے بالوں والا سر سہلاتا تھا' آنسوؤں اور مٹی گرد سے میلا ہوتا چہرہ اپنے رومال سے صاف کرتا تھا' فراک جھاڑتا تھا۔۔۔ اس نے تصور میں دعا کا وہی چھولا نے کی کوشش کی مگر سامنے ہر رخ سے چمکتا۔۔۔ کسی تراشیدہ ہیرے کی مانند اس کا وجود تصور کے تمام رستے بند کیے ہوا تھا۔ وہ تھک گیا۔۔۔ خود سے لڑتے لڑتے ہار گیا۔۔۔ نظریں چراتے چراتے

"دوئی! تم۔۔۔ تم تو پہچانی نہیں جا رہیں۔"

بالآخر وہ تسلیم کر بیٹھا اور ایک شکست خوردہ سا اعتراف بھی۔ وہ گھبرا گئی نجانے کیوں بے اختیار ہی اس کی

نازک سی گلابی ہتھیلی لبوں تک چلی گئی۔ شہزاد نے حیرت سے اس کی اس حرکت کو دیکھا۔ لمبی لمبی دودھیا انگلیوں کی اوٹ سے بھی پنکھڑی جیسے لبوں پہ سجا گلال جھلک مار رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ دانستہ طور پہ اس سے اپنا میک اپ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"تمہیں میک اپ کی ضرورت تو نہ تھی۔"

پتہ نہیں اس کے لہجے میں غیر معمولی پن تھا یا آواز اجنبی سی لگی تھی کہ سر جھکائے کھڑی دعا پوری آنکھیں کھول کے اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ان آنکھوں کے واضح ہوتے ہی باقی سب کچھ مدھم ہو گیا۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ وہ نرم سفید موی انگلیاں بھی۔

وہ سونے کی سی رنگت والی زلفوں کی مدھم مدھم سی خوشبو بھی۔۔۔

وہ گداز لبوں کی گدگداتی گلابی مسکان بھی۔۔۔

گورے رخساروں پہ ڈولتے' چاندی کی جھمکیوں کے لرزاں سائے بھی۔۔۔

لچکیلی سبز شاخ جیسا اس کا موزوں و نوعمر سراپا بھی۔۔۔

بس واضح تھیں تو صرف وہ دو آنکھیں۔۔۔ وہ آنکھیں وہی تھیں۔۔۔ وہی آنکھیں جو دو سالہ دوئی کی تھیں۔۔۔ پانچ سالہ دوئی کی تھیں۔۔۔ آٹھ سالہ دوئی کی تھیں۔۔۔ وہ اب پوری طرح پہچان گیا' یہ جو سامنے کھڑی تھی' یہ اور کوئی نہیں' دوئی تھی' وہی دوئی جو چوٹ لگنے پہ سیدھا اس کے پاس بھاگی آتی تھی۔ شہزاد کی سوچوں کے بے لگام گھوڑے ایک دم ہی اپنی منہ زوری سے تائب ہو گئے۔ وہ ٹھٹک کے یوں رکا جیسے آگے کوئی کھائی۔۔۔ کوئی گڑھا ہو۔

"تم تو ابھی بہت چھوٹی ہو بہت چھوٹی۔"

یہ وہ اسے نہیں بتا رہا تھا' خود کو یاد دلا رہا تھا۔

"کیا میں اچھی نہیں لگ رہی چھا جی۔"

وہ بھی شاید اپنے اس نئے روپ سے گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھی اس لیے نروس انداز میں پوچھنے لگی اور اس بات کا جواب دینا تو شہزاد کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ کیسے بتاتا کہ اس وقت وہ اسے کیسی لگ رہی ہے۔ یہ بات تو اسے خود کو بتاتے بھی مجرمانہ سی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی' فقط اتنا کہہ کے رہ گیا۔

"نہیں' اچھی تو۔۔۔ مگر بڑی بڑی لگ رہی ہو۔۔۔ اور دوئی۔۔۔" اچانک شہزاد کی آواز میں گلہ اتر آیا۔

"دوئی' تمہیں اتنی جلدی بڑا ہونے کی ضرورت کیا ہے؟" عجیب بے چارگی سے اس نے گلہ کیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

وہ رات شہزاد پہ بہت بھاری گزری۔ اسے رہ رہ کر گزری رات یاد آ رہی تھی جب ملگجے اندھیرے میں اس نے صوفے پہ اس کا سمٹا سمٹایا وجود دیکھا تھا اور رگوں میں دوڑتے مکروہ سیال کی ذلالت نے اس کی سوچوں کو وحشت ناک حد تک پراگندہ کر ڈالا۔ وہ تو عین وقت پہ اس کے اندر کے مہذب انسان نے اسے تھام لیا اور اس نے آگے بڑھتا ہاتھ واپس کھینچ کر اپنا نشے سے ڈولتا وجود وہاں سے ہٹا لیا۔

"ساری خرابی' اس ذلیل اور مکروہ شے کی تھی۔ جبھی تو اسے حرام قرار دیا گیا ہے' اس کو پینے کے بعد اچھے برے حرام حلال' گناہ ثواب کی تمیز جو نہیں رہتی۔ اگر میں مکمل ہوش و حواس میں ہوتا تو کیا اپنے ہاتھوں کھیل کر بڑی ہونے والی دوئی کو پہچان نہ پاتا اور کیا پہچان لینے کے بعد بھی اس کو ایسی ویسی نظر سے دیکھنے کی ہمت کر پاتا۔۔۔ ہرگز نہیں یہ سارا فساد اسی شراب کی وجہ سے ہے۔ آئندہ کوئی لاکھ کہے' مگر اسے ہاتھ نہیں لگاتا۔"

اس نے سارا الزام شراب پہ دھر دیا اور خود کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی مگر سینے پہ پڑا یہ بوجھ سرک ہی نہیں رہا تھا۔

اس کے اندر سے سوال ابھرا۔ ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ اس صبح اس نے اس لڑکے کے بارے میں کیا ریمارکس دیے تھے' وہ لڑکا جو آدھی رات کو اسے کچن سے چائے لے کر نکلتا دکھائی دیا تھا اور شہزاد کو خدشہ تھا کہ کہیں اس

نے دعا کے بے سدھ سوئے رہنے کا فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ تب بے ساختہ اس کے لبوں سے نفرت کی تھوک سے لتھڑی ایک گالی اس لڑکے کے لیے نکلی تھی۔

"کمین ذات۔"

یہ سرسراتا لفظ ایک بازگشت کی طرح اسے یاد آیا اور وہ لرز اٹھا۔ ایسے لگا جیسے یہ گالی اس نے خود کو دی ہو۔ کیونکہ اس لڑکے کے بارے میں تو اسے صرف شک تھا جب کہ خود وہ ایسی ناپاک جسارت کرتے کرتے رہ گیا تھا۔ نہ صرف نشے کی حالت میں۔۔۔ بلکہ آج دن بھر تو مکمل حوش و حواس میں بھی وہ اپنی نیت اور سوچ کو اس ملاوٹ سے روک نہ پا رہا تھا۔

"تو کیا میں واقعی کمین ذات ہوں؟"

منہ چھپاتے ہوئے اس نے خود سے دریافت کیا اور جواب ایسا ملا کہ وہ دوبارہ سے منہ چھپانے پہ مجبور ہو گیا۔

"تو اور کیا ہو تم' شہزادہ ولد بلبلہ ولد بادشاہ' غیرت' شرافت اور پاکیزگی سے تمہارا کیا واسطہ' تمہاری سات نسلیں خود کو گالی دے کر روٹی کھاتی آ رہی ہیں' سینکڑوں کے مجمع کے سامنے منہ پہ جوتا مار کے رزق کمانے والوں کے اندر غیرت کے جراثیم کیسے برقرار رہ سکتے ہیں۔ دوئی بڑی ہو گئی ہے تو کیا ہوا؟ اسے بڑا ہونا ہی تھا۔ لوگوں کی بہنیں' بیٹیاں بھی بڑی ہوتی ہی ہیں۔۔۔ تو کیا ان سب کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے؟ نہیں یہ خاصیت تو تمہارے خون میں تھی۔ جو اس کے بدلنے پہ تمہاری نیت بدلنے لگی۔"

اس طعنے پہ وہ بلبلا اٹھا۔

"نہیں میں کمینہ نہیں ہوں' بے غیرت اور ذلیل بھی نہیں۔ میں بہک گیا تھا۔ مگر میری نیت نہیں بدلی۔ دوئی اب بھی میرے لیے وہی دوئی ہے' معصوم سی بچی' جس کے بچپن میں میں اپنا کھویا ہوا تشنہ بچپن تلاشا کرتا تھا۔ جس کے آنسو پونچھتے ہوئے میرے زخم سلنے لگتے تھے اور جس کے لبوں پہ روٹھی ہوئی مسکان واپس لانے کے بعد مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے زمانے بھر کی خوشیاں سستے میں خرید لی ہوں۔ وہ وہی دوئی ہے' اپنے چھاجی کو عقیدت کی حد تک چاہنے والی' مجھے شرم آنی چاہیے اس کی معصومیت کے بارے میں ایسی باتیں سوچتے ہوئے۔ میں یہ ثابت کر دوں گا کہ میں کمین ذات نہیں۔"

شہزاد نے بڑی کامیابی کے ساتھ خود کو اس وقتی پراگندگی سے آزاد کر لیا۔ اگلی صبح وہ پھر سے چھاجی تھا اور دعا وہی معصوم سی دوئی' خود کو مزید آزمانے کی خاطر وہ اس رات دوئی کو اپنے ساتھ گھمانے بھی لے گیا' یا شاید وہ لاشعوری طور پہ اپنی اس پل بھر کی ذہنی بے ایمانی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ دانستہ یا نادانستہ' وہ دوئی سے ہمیشہ سے کہیں بڑھ کے ایک ننھی سی بچی کی طرح پیش آ رہا تھا۔ اس نے محسوس تک نہ کیا کہ اس کے غیر معمولی "بڑے پن" کے برتاؤ سے دعا الجھ رہی تھی۔ اس کے چپ چپ رہنے کو وہ اس کی جھجک سمجھ رہا تھا۔ وہ پہلے کبھی ایسے تفریحی مقامات اور ہوٹلوں تک آئی بھی تو نہیں تھی۔ وہیں ریسٹورنٹ میں نیلی سے بھی اتفاقیہ ملاقات ہوئی' اس کے ساتھ بھی دوئی کا رویہ عجیب رو کھا تھا۔ اپنے طور پہ اسے خوب گھما پھرا کے' شاپنگ اور ڈنر کرا کے شہزاد نے سمجھا کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے۔

"بس ہو گیا ثابت' نہ میں کمینہ ہوں نہ ذلیل۔ آج بھی کئی گھنٹے تک وہ اکیلی میرے ساتھ رہی' کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں ارے ہو گا کیا' وہ تو دوئی ہے' بچی ہے' ہمارے سامنے کی بچی' اتنی سی تھی جب میں اسے گود میں لے کر چپ کرانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں بھلا میرے دل میں الٹا سیدھا خیال کیسے آ سکتا ہے' مجھے عادت ہو گئی' خود اذیتی کی۔ اپنے اندر کے احساس کمتری سے الجھے رہنے کی۔۔۔ میرا یہ احساس کمتری مجھے نیچا دکھانے سے کبھی نہیں چوکتا' مجھے ضمیر کی عدالت میں شرمندہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس بار بھی اس نے یہی کوشش کی اور بڑی گھٹیا کوشش کی۔ اس میں شراب کا بھی کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ سب میری اپنے اندر کی جنگ تھی' جس میں بے چاری دوئی کا بے ضرر معصوم وجود خوامخواہ آ گیا۔ اگر جو اسے پتہ چل جائے تو۔۔۔ نہیں نہیں

اسے پتہ نہیں چلنا چاہیے' اور چلے گا بھی کیسے۔۔۔ وہ تو خواب میں بھی ایسا نہیں سوچ سکتی۔"

وہ فتح سے سرشار تھا۔ یہ فتح خود کو شکست دینے کی تھی۔ عجیب انسان تھا وہ بھی اپنے آپ سے نفرت کرتا تھا اور اپنے آپ کو ہی قابل محبت اور قابل احترام بنانے کی کوشش میں سرگرداں رہا کرتا تھا۔ اپنے آپ سے لڑتا رہتا تھا اور اپنے آپ کو ہی ٹوٹنے بکھرنے سے بچانے کی جدوجہد کرتا تھا۔ خود کو ہی شکست دیتا تھا' اپنی ہی فتح پہ جشن مناتا پھرتا تھا۔

اس رات پھر سے پارٹی میں چند دوستوں کے کہنے پہ وہ پی بیٹھا' رات کو دیر سے گھر آیا' کار لاک کر کے اندر جانے والا تھا کہ مختصر سے لان میں اسے دعا نظر آئی۔ ننگے پیر ہلکا سا سوتی جوڑا پہنے ہوئی تھی۔ شہزاد نے رسٹ واچ پہ ٹائم دیکھا۔ صبح کے سوا چار بج رہے تھے پو ابھی تک نہیں پھوٹی تھی' بلا کی سردی تھی۔ اس نے نشے سے بوجھل ہوتا سر جھٹکا۔

"تم اتنی صبح سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو؟ سویٹر' نہ شال' اندر چلو' سردی لگ گئی تو بیمار ہو جاؤ گی۔"

"آپ ساری رات کہاں غائب تھے؟" اس کا سوال نظر انداز کر کے دوئی نے پوچھا۔ وہ اس کے لہجے کی بے تابی پہ جی بھر کے حیران ہوا۔ وہ تو اکثر اسی وقت گھر آیا کرتا تھا' کام ہی ایسا تھا' اکثر رات رات بھر شوٹنگ چلا کرتی اور آج تو نیلی کے پہلے پلے کی پہلی شوٹنگ تھی اور اس کے بعد اس پہلی شوٹنگ کی خوشی میں وہیں اسٹوڈیو میں پارٹی تھی۔ چونکہ نیلی کو ماڈلنگ سے ایکٹنگ کی دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا اس کے سر تھا اس لیے یہ پارٹی ایک طرح سے اس کے اعزاز میں تھی۔ یہی بات اس نے مختصراً" اور سرسری انداز میں دعا کو بتائی مگر اس کا ردعمل حیران کن تھا اور اگلا سوال اس سے بھی زیادہ عجیب۔

"چھاجی' کیا آپ اس سے محبت کرتے ہیں؟"

وہ آگے بڑھتا رک گیا۔ چند لمحے اس کے چہرے پہ اس سوال کی "وجہ" کھوجنے کی کوشش کی وہاں ہمیشہ کی طرح ایک نرم سی پاکیزگی اور حیران سا بچپنا تھا۔ اب شہزاد کی باری تھی حیران ہونے کی۔ "بھلا یہ سوال اس نے کیوں کیا؟"

"تمہیں پتہ بھی ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے؟"

وہ ایسے بولا جیسے کسی بچے کے منہ سے اس کی عمر سے زیادہ سیانی بات سن کر کسی کو خوامخواہ ہنسی آ جائے۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"مجھے پتہ ہے چھاجی کہ محبت کیا ہوتی ہے' وہی جو مجھے آپ سے ہے۔"

اس نے ایک دھماکا کر دیا۔ شہزاد کو اپنے کانوں سن کر بھی یقین نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"شاید اس کا مطلب کچھ اور ہو۔" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھی' پوری بے خوفی اور جرات سے یہ آنکھیں دوئی کی نہ تھیں۔۔۔ وہ ان آنکھوں کو پہچاننے سے انکاری ہو گیا جہاں بچپنے کی [illegible]ت اور گیلے گیلے سے تبسم کی بجائے نوخیز نگریلا خیز عشق کارت جگا سرخیاں چھلکا رہا تھا۔ وہ اس قدر تلملایا اتنا بپھرا۔ بے ساختہ اس کا تومند ہاتھ گھوما اور دعا کے رخسار پہ گرتا اسے نیچے کی طرف دھکیل گیا۔ نیچے رکھا گملا اس [illegible] ماتھے پہ لگا تھا' شہزاد کے ہاتھ کی پلاٹینیم کی انگوٹھی اس کا نازک لب چھیل گئی تھی۔ دونوں زخموں سے خون [illegible] رہا تھا مگر اتنا نہیں جتنا خون اس وقت شہزاد کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔ نشے نے ویسے بھی اس کا کنٹرول خود [illegible] اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہر مصلحت سے بے نیاز اسے بے نقط سناتا رہا۔ غلیظ سے غلیظ گالی سے نوازتا رہا۔ ویسے بھی [illegible] ہر گالی دعا کے لیے کم لگ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے محبت کے کھلم کھلا اظہار کے ذریعے [illegible] سنگین گالی دعا نے اسے دی ہے اس کے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔

"ذات اپنا رنگ دکھا کے رہتی ہے' گندا خون جوش مار ہی بیٹھتا ہے۔ اس عمر میں یہ حال ہے' جوانی میں تو باپ کو [illegible]ب عیش کرائے گی۔"

اس کا رنگ پہلے ہلدی کی طرح پیلا پھٹک ہوا مگر شہزاد نہ رکا اس کی زبان ایسے ہی زہر اگلتی رہی۔

"اب پتہ چلا کہ یہ خود ساختہ معصومیت بھی ایک ہتھیار تھا۔ رہی ناں تو وہی ایک ہیرا منڈی میں بیٹھنے والے طبلچی کی بیٹی۔"

اس آخری گالی پہ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس نے نہ اپنی صفائی میں کچھ کہا نہ اس سے بے رحم الفاظ میں کمی کی گزارش کی۔ وہ تب بھی کچھ نہ بولی جب وہ اسے بازو سے دھکیلتے ہوئے اپنے گھر سے نکال کر لے گیا۔ وہ اس وقت بھی چپ رہی جب اس کے بوسیدہ مکان کے آگے کار روک کر اسے کسی تعفن زدہ چیز کی طرح باہر پھینکتے ہوئے اس نے کراہیت آمیز نفرت کے ساتھ حکم دیا تھا۔

"اپنی خیریت چاہتی ہو تو آئندہ یہ منحوس شکل لے کر میرے سامنے مت آنا۔"

اسے یہ حکم بھی اتنا عزیز تھا کہ پچھلے کئی سال تک وہ اس کا جی جان سے پاس کرتی آرہی تھی۔ اگلے کچھ عرصے تک جب شہزاد کا سامنا دعا سے نہ ہوا تو رفتہ رفتہ اس کے غصے کی شدت میں بھی کمی آگئی۔ وہ متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ ایک طرف وہ ابھی تک اس کی یہ جسارت کھلے دل سے معاف کرنے پہ تیار نہ تھا' دوسری جانب اسے اپنا ردعمل ضرورت سے زیادہ ہی سخت محسوس ہوتا تھا۔

"شاید میں زیادہ ہی سختی برت گیا اس کے ساتھ' مجھے اس پہ ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا یا کم از کم اسے اتنے برے انداز میں جھڑکنا نہیں چاہیے تھا۔"

اسے اب تک اپنا لفظ لفظ یاد تھا' جس پہ وہ حیرت زدہ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے سب سہہ کیسے گئی۔ کیا وہ کامنی سی نازک سی کم عمر لڑکی اتنے مضبوط اعصاب کی مالک تھی؟

"اب کبھی دوبارہ ملی تو میں مناسب الفاظ میں معذرت ۔۔۔" وہ اس بات کو ڈھنگ سے سوچ بھی نہ پاتا کہ ایک دوسری سوچ حملہ آور ہوتی۔

"میں نے جو کیا' وہ انتہا پسندانہ حد تک شدید ضرور تھا مگر غلط نہیں۔ کبھی کبھی کڑوی دوا بھی زبردستی پلانا پڑتی ہے' میں نے بالکل ٹھیک کیا۔ وہ غلط تھی' کیا اسے نہ بتاتا؟ کیا وہ راہ چلتی کوئی لڑکی تھی جس کی ناگوار حرکت میں سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتا؟ اتنا حق تو میرا بنتا تھا کہ میں اس سے بازپرس کرتا۔ اگر میرے تھپڑ اور گالیوں سے ہی وہ سنبھل سکتی تھی تو میرا یہ علاج بالکل بروقت اور درست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تین سال ہونے کو آئے' اس کے بارے میں کوئی غلط حرکت کی خبر نہیں سنی ورنہ جو کمال کی شروعات اس نے کی تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر اس پہ بند نہ باندھے گئے تو آگے جا کر کیا کیا طوفان برپا ہونے تھے۔"

یہ تین سال گزرے پھر اس کے کالج میں داخلہ لینے کی خبر سنی۔ بالو اسے مبارک باد دینے گئی تو وہ چاہنے کے باوجود اس کے لیے کوئی تحفہ نہ بھجوا سکا۔ اگرچہ قطع تعلق کی اس رسم کا آغاز اس کی جانب سے ہوا تھا مگر صلح کا جھنڈا لہرانے سے وہ ہنوز ہچکچا رہا تھا۔ البتہ اس نے سرسری انداز میں ماں سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ اسے ایک آدھ روز کے لیے گھر لے آئے عرصہ ہوا اسے یہاں آئے ہوئے مگر واپسی پہ ماں کو اکیلے آتے دیکھ کے وہ نہ پوچھ سکا کہ اس نے نہ آنے کا بہانہ کیا بنایا۔

پھر جلد ہی اس کے کالج کی تعلیم چھوڑنے اور کچھ ہی دن بعد باقاعدہ گلوکاری کا آغاز کرنے کی خبریں سنائی دیں۔ صلح اور معافی پہ آمادہ اس کا دل پھر سے دعا سے برگشتہ ہو گیا اور اس دن سے تو وہ باقاعدہ اس کے نام تک سے خار کھانے لگا جب سے اللہ وسایا نے اس سے اپنے نئے ڈرامے میں دعا کو بطور اداکارہ اور گلوکارہ کے متعارف کرانے کی سفارش کی تھی۔ وہ اسے دھمکی دے کر آیا تھا کہ خیریت چاہیے تو آئندہ اسے اپنی شکل نہ دکھائے مگر یہ دھمکی عجیب رنگ میں اس کے اپنے سامنے آموجود ہوئی۔

آج اتفاقیہ طور پہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس روپ میں اپنے سامنے پا کر وہ تھرا اٹھا تھا۔ اسے اس طرح تماشا بنا دیکھنا تو شہزاد نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ اسے شمع محفل بنے ہزاروں تماش بینوں کے سامنے نغمہ سرا ہوتے دیکھ کر اس

کی اپنی خیریت رخصت ہو گئی۔

"تمہاری اس غلطی کو میں نے تمہارے بچپنے پہ محمول کرتے ہوئے ایک وقتی لغزش سمجھ کے جلد ہی معاف کر دیا تھا مگر دعا نور تمہارا یہ جرم قابل معافی نہیں۔ اب میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا' کبھی بھی نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔"

☼ ☼ ☼

لینن کے بے شکن لائٹ پنک کلر کے سوٹ میں وہ بڑی فریش فریش سی نظر آرہی تھی۔ یوں تو ہر رنگ ہی اس پہ جچتا تھا مگر پنک کلر کے کسی بھی شیڈ میں تو وہ غضب کی نظر آیا کرتی۔ اسی حوالے سے اب یہ کلر عمیص کا فیورٹ کلر بن چکا تھا۔ لائٹ پنک قمیص کے دامن پہ روز پنک کلر کے بڑے بڑے خوب صورت گلاب کے پھول نفاست و مہارت سے کاڑھے گئے تھے' لگتا ہی نہ تھا کہ یہ پھول ریشمی دھاگوں سے بنے گئے ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے اس کی تازگی اور نزاکت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے دامن میں گلاب ہی گلاب پھینک دیے ہوں۔

وہ کلائی پہ رسٹ واچ باندھ رہی تھی جب عمیص دستک دے کر اندر آیا۔ وہ شاہانہ انداز میں اندر آنے کی اجازت دینے کے بعد اب ہنوز لاپرواہی سے اپنے کام میں مشغول تھی۔ واچ باندھنے کے بعد وہ جھک کر بیڈ کے نیچے سے اپنی اسکن کلر ۔۔۔ چپل نکالنے لگی۔ نازک گلابی پیروں میں بغیر ہیل کی چپل ڈالنے کے بعد وہ اپنا شولڈر بیگ کھول کے اس کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے کبھی ہیل والی سینڈل یا چپل نہیں پہنی تھی' اس کی سرو قامتی ان مصنوعی سہاروں کی محتاج نہیں تھی بلکہ وہ سراپا مصنوعی پن سے عاری تھی۔ ظاہری طور پہ بھی۔ اور باطنی طور پہ بھی۔ اس کے دل میں جس کے خلاف عناد یا گلہ ہوتا' محض لحاظ یا تکلف میں چھپانے کی کوشش نہ کرتی اور جس کے لیے دل میں قطعی گنجائش نہ پاتی' مروتاً بھی اس سے اخلاق برتنے کی کوشش نہ کرتی۔ اب یہ قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ ایسے لوگ شاذ ہی تھے جن سے اسے کوئی شکوہ نہ ہوتا یا جن کے لیے اس کے دل میں گنجائش ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمہ وقت وہ کسی نہ کسی سے اور کوئی نہ کوئی اس سے الجھتا ہی نظر آتا۔

عمیص چپ چاپ کھڑا اس کی سرگرمیاں ملاحظہ کر رہا تھا۔ شولڈر بیگ میں موجود تمام ضروری اشیاء کا اطمینان کر کے اس نے بیڈ پہ پھیلی اپنی پنک گرم شال اٹھائی جس کے کناروں پہ اسکن کلر کی کڑھائی تھی۔ اپنا اسکارف سر پہ اچھی طرح پھیلاتے ہوئے اس نے ریشمی بالوں کو ڈھانپا۔ کانوں کے ہلکے سے آویزے بھی اسکارف کی اوٹ میں چلے گئے اور شانوں کے اردگرد شال لپیٹ کر اب وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ آئینے میں خود کو ایک بار پھر دیکھ کر وہ آگے بڑھی۔ مجبوراً اب اسے بے اعتنائی کا چولا اتار کے راہ میں ایستادہ عمیص سے پوچھنا ہی پڑا۔

"کیا بات ہے؟ کچھ کہنا ہے ہم سے؟"

"ہوں۔" وہ سینے پہ ہاتھ باندھ کے دروازے سے یوں ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا کہ وہ چاہتی بھی تو اس کی بات سنے بغیر یہاں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اس کو جسے دیکھ کر گل مہر کی صبیح پیشانی شکن آلود ہو گئی البتہ عمیص پہ اس کی تلملاہٹ کا ذرہ برابر اثر نہ تھا۔ وہ مزے لیتا ہوا اس کے دھلے دھلے میک اپ سے بے نیاز چہرے کو دیکھنے لگا جو خوبصورتی سے بندھے اسکارف کے ہالے میں کس قدر معصوم اور پاکیزہ سا لگ رہا تھا اور جہاں اب تلملاہٹ کے بعد ہلکی سی جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔

"اب کہو بھی' ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔"

مانا کہ رنگ رنگ تیرا پیراہن بھی ہے
پر اس میں کچھ کرشمہ عکس بدن بھی ہے

اس نے بھرپور نظروں سے سامنے کھڑے گلابی وجود کو دیکھا' جس کو بغور دیکھنے پہ بھی صحیح اندازہ نہ ہو پاتا تھا کہ لباس کی گلابیاں کہاں تک ختم ہوتی ہیں اور اس کے پیکر رعنا کی گلابیاں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔

"بس ہے۔ کہہ دیا اب ہم جائیں؟"

خلاف عادت اس نے بڑی تحمل اور بردباری سے **عمیص** کا شعر ہضم کیا ورنہ عموماً" اس کے اشعار اس کا پارہ چڑھا دیا کرتے تھے اور یہ شعر تو بطور خاص **عمیص** نے خود کو ذہنی طور پہ تیار کر کے "نشر" کیا تھا کہ جواباً" اس کا رد عمل شدید بھی ہو سکتا تھا اور شدید تر بھی۔ لیکن اس کی مودبانہ اجازت "ہم جائیں" پہ وہ جز بز ہو گیا۔

"ہاں ضرور۔" اس نے باقاعدہ کورنش بجالا کے ہاتھ سے اشارہ کیا' جہاں نکلنے کی ذرا بھی جگہ نہ تھی۔

"تم کیا یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ہمیں جانا ہے تو تمہاری لاش سے گزر کے جانا ہو گا۔" ٹھہر ٹھہر کے کہتی ہوئی درحقیقت وہ اپنے اندر اٹھتے طیش کے ابال دبا رہی تھی جو خوامخواہ ہی **عمیص** کی صورت دیکھتے ہی اس کے اندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا تھا اور اس کے اشعار۔۔۔ اور اس کا فدویانہ انداز یہ سب تو جلتی پہ تیل کا کام کرتا تھا۔ لیکن **عمیص** اپنے جنون میں اس کے گریز' بے اعتنائی اور کڑوی کسیلی باتوں کو بھی اس کی ادا اور ناز سمجھ کے دل سے قبول کر لیتا تھا۔

"الٰہی خیر۔۔۔ کیسی لاش' کس کی لاش۔" قریب سے گزرتے دلگیر نے عادت سے مجبور ہو کے سن گن لی اور بغیر پوری بات سنے اودھم مچا دیا۔

"اف' یہ ایک نیا تماشا۔" گل نے کوفت سے اسے دیکھا۔

"لاش نہیں' لاشیں۔" **عمیص** نے ڈرامائی انداز میں کہتے ہوئے اس کو مزید سراسیمہ کیا۔

"ایک چھپکلی اور دو کاکروچوں کی لاشیں۔ ایک کاکروچ کی لاش تو ناقابل شناخت ہو چکی ہے۔ اس کے لواحقین کا بھی کوئی اتہ پتہ نہیں۔ جاؤ جلدی سے اپنی ایمبولینس' یعنی جھاڑو اور ڈسٹ بین لاؤ اور ان بے گور و کفن لاوارث لاشوں کو ان کے آخری سفر پہ لے جاؤ۔"

"ہائے اللہ جی' **عمیص** میاں آپ کتنی گندی باتیں کرتے ہیں اوئی توبہ۔۔۔ آخ تھو۔۔۔ سارا ناشتہ حلق میں آگیا ہے۔" وہ ابکائیاں روکتا وہاں سے رفو چکر ہوا۔

"یہ منحوس قسم کی بے سروپا گفتگو کیا ہمارے کمرے کے دروازے پہ کھڑے ہو کے ارشاد کرنا بہت ضروری ہے؟ آخر تمہیں دوسروں کے وقت کا احساس کیوں نہیں ہے **عمیص**۔" بالآخر وہ زچ ہو بیٹھی۔

"اپنے وقت کی تو خیر تم نے کبھی قدر کی ہی نہیں کم از کم دوسروں کا وقت تو مت برباد کرو۔ جانتے بھی ہو کہ ہمارا آج وقت پہ پہنچنا کتنا ضروری ہے۔"

"میں اسی لیے آیا تھا' چلو میں تمہیں آفس چھوڑ آتا ہوں۔" وہ تہذیب کے دائرے میں آ ہی گیا۔

"کس پہ؟ مرسڈیز پہ۔۔۔ یا اپنی نئی ہنڈا اکارڈ پہ۔۔۔؟" وہ تمسخر سے ابرو اچکا کے پوچھنے لگی۔ اس کا یہ طنز **عمیص** نے ہمیشہ کی طرح خندہ پیشانی سے سنا اور شاہانہ انداز میں کہا۔

"میں ان چھوٹی موٹی گاڑیوں پہ سفر نہیں کرتا۔ میں تمہیں ڈائیو پہ چھوڑ کے آؤں گا۔" اس نے شہر میں چلنے والی نئی اور بڑی پبلک بس کا نام لیا۔

"ہم بھی جانتے ہیں' یہاں سے چار نمبر کی ڈائیو سیدھا ڈیوس روڈ پہ اتارتی ہے اور فکر مت کرو ہم اکیلے نہیں' ڈائیو میں بیک وقت ساٹھ پچاس افراد تو سوار ہوتے ہی ہیں' ایک تمہارے ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔"

"پھر بھی۔۔۔ پہلی بار اکیلے جانا مناسب نہیں اور تم انٹرویو دینے جا رہی ہو' میں مورل سپورٹ کے لیے تمہارے ساتھ ہوں گا تو تمہاری ہمت بندھا تا رہوں گا۔ اچھا ایسا کرتے ہیں' میں تمہیں ٹیکسی پہ چھوڑ آتا ہوں۔" پتہ نہیں کیوں اس کا دل گل مہر کے اکیلے وہاں جانے پہ ٹھہر نہیں رہا تھا۔

"مگر ہم فضول میں ٹیکسی کا کرایہ نہیں دے سکتے۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"تم سے کون مانگ رہا ہے۔ میں لے جا رہا ہوں' میں ہی دوں گا۔"

"اور تم۔۔۔ تم کہاں سے دو گے؟ ابا حضور سے لے کر۔۔۔ تو بات تو وہی ہوئی ناں۔" عجیب چبھتے انداز میں کہتی

ہوئی وہ یوں آگے بڑھی کہ اگر **عمیص** خود سائیڈ پہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً" اسے دھکا دے کر گزر جاتی۔ اس نے آخری بات اتنی کڑوی کی تھی کہ ٹھنڈے مزاج کا **عمیص** بھی لب دبا کے چپ کا چپ کھڑا اسے لمبے سے دالان سے گزر کر باہر کی طرف جاتا دیکھتا رہا۔ بیٹھک کی جھاڑ پونچھ کر کے نکلتی موتیا نے بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے **عمیص** کو وہاں بے حس و حرکت کھڑا دیکھا تو جھاڑن کونے میں پھینکتی ہوئی اس کی جانب بڑھی۔ **عمیص** کے چہرے پر تکلیف اور رنج کے آثار اتنے نمایاں تھے کہ وہ چونک اٹھی' جانتی تھی کہ وہ معمولی باتوں کو دل سے لگانے والا نہیں۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو بیرونی دروازے سے نکلتی گل مہر کو دیکھ کر وہ سارا معاملہ بھانپ گئی۔

"ضرور آج کل گل مہر کے دانت ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہوئے ہوں گے ورنہ تمہاری ڈھٹائی تو قابل رشک ہے۔" اس نے کونے میں لگے بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کیا۔

"آج تو یہاں لاشیں گر رہی تھیں موتیا بی بی۔" دلگیر نے اطلاع دی گویا معاملے کی سنگینی سے باخبر کیا۔ پھر **عمیص** کو ڈھیلے قدموں کے ساتھ برآمدے میں جاتے دیکھ کر مزید تبصرہ کیا۔

"لگتا ہے آج گل بی بی' **عمیص** میاں کو تگڑا ناشتا کرا گئی ہیں۔" اس نے اسے برآمدے میں رکھے تخت پہ بیٹھتے پایا تو آگے بڑھ کر چق اٹھانے لگا تاکہ دھوپ اندر تک آسکے۔

"دلگیر تمہارے **عمیص** میاں کا جی کبھی تو نہیں بھرتا اس تواضع سے۔" وہ بھی گیلے ہاتھ اپنی گرے شال سے پونچھتی اسی تخت پہ آن بیٹھی۔

"اب اگر بدہضمی ہو گئی ہے تو بھگتنی تو پڑے گی۔" اس نے مزید کہتے ہوئے کینو کی ٹوکری اپنی جانب کھسکائی۔ مقصد صرف اسے بولنے پہ اکسانا تھا اور وہ بول ہی پڑا۔

"بھگت ہی تو رہا ہوں۔ ویسے بھی گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔"

"کانٹا لگا۔۔۔ اوئی لگا۔۔۔ ہاں رے۔۔۔ ہاں رے۔۔۔ ہاں لگا اوئی ماں۔"

دلگیر کی رگ رقاصہ پھڑکی اور وہ لہک لہک کر لہرا لہرا کر ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ موتیا نے اس کی کمر میں موٹا سا کینو دے مارا اور وہ "اوئی ماں" کر کے کمر سہلانے لگا۔

"بدتمیز' تائی حضور اندر ہیں۔" موتیا نے دبی آواز میں اسے خبردار کرتے ہوئے کینو مارنے کی اصل وجہ بتائی مگر اب دیر ہو چکی تھی' دلگیر کی سریلی آواز اور رقص کے ہوشربا مظاہرے کی داد دینے کے لیے صاحبزادی خلعت النساء بانفس نفیس کمرے سے باہر تشریف لا چکی تھیں۔ دلگیر اپنی ننھی سی انگلیاں موڑتے ہوئے جھانجھر دل والا چرخ پیر پٹختے ہوئے ان سے معافیاں طلب کر رہا تھا اور اس کا ناز نخرہ دیکھ دیکھ کر وہ دونوں ہنسے جا رہے تھے۔ پھر بڑی بیگم کی جانب سے کوئی سخت سی سزا ملنے پہ اس نے احتجاجاً" بلند آواز میں دہائی دی۔ ان کے دوبارہ کمرے میں جانے پہ وہ سرد آہ بھرتا' پرانی فلموں کی ہیروئن کے اسٹائل میں بازو موڑ کے ماتھے پہ رکھتا کچن کی جانب بھاگا۔

کس چھلیے پہ یہ دل آیا
پتھر سے شیشہ ٹکرایا

اس کی دل جلی صدا پہ **عمیص** کے مسکراتے لب ایک بار پھر سمٹ گئے۔۔۔ پتھر سے شیشہ ٹکرایا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" موتیا نے کینو چھیل کر اس کی طرف بڑھایا۔

"سوچ رہا ہوں' دنیا میں کچھ بھی' کوئی بھی بے مقصد اور ارزاں نہیں۔ اب دلگیر کو ہی دیکھ لو۔ ساری دنیا کہتی ہے اس مخلوق کا بھلا کیا مصرف۔۔۔ ان کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے لیکن میں سوچتا ہوں موتیا کہ ہمارے گھر میں دلگیر کا وجود کتنا ضروری ہے۔ اگر یہ معصوم ذی روح اس حویلی میں موجود نہ ہو تو ہم لوگ تو شاید مسکرانا ہی بھول جائیں۔۔۔ ہے ناں۔"

"ہاں بہت سے لوگ ہوتے ہیں' جن کے نہ ہونے کا تصور ہی دل لرزا دیتا ہے۔

"شرم کرو عمیص' کس دل سے تم اس کی کڑوی کسیلی برداشت کرتے ہو اور کس لیے کرتے ہو؟ محبت ایک اعلیٰ وارفع جذبہ ہے' اسے یوں ارزاں تو مت کرو۔ خودداری اور آن بان بھی محبت کے اوصاف میں شامل ہوتے ہیں تم تو اس کے آگے خود کو بالکل ہی۔۔۔" اسے مسلسل تحمل سے مسکراتے دیکھ کر وہ اور جھلا اٹھی۔

"تم یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ صاحبزادی گل مہر خانم ان لوگوں میں سے ہیں جو سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ وہ صرف سمجھانا جانتے ہیں۔ اگر تم ایسی ہی ثابت قدمی اور ڈھٹائی سے اس کا دل جیتنے کے خواہش مند ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"پھر میں کیا کروں موتیا۔ تمہارے پاس بھی میرے لیے سوائے ڈانٹ پھٹکار کے اور کچھ نہیں ہوتا نہ کوئی مشورہ۔۔۔ نہ کوئی رائے۔"

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ دل کے معاملے کو خدا پہ چھوڑ دو اور خود کو یوں ضائع کرنے کی بجائے منوانے کی کوشش کرو۔"

"دو سال سے منوانے کی کوشش ہی تو کر رہا ہوں۔۔۔ نہ گل مانتی ہے نہ چچا حضور۔" اس کے منہ لٹکانے پہ موتیا کو ہنسی آگئی۔

"ملازمت ملنا تو اب کسی سہانے خواب کی طرح ہو گیا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں چچا حضور بھی ٹھیک کہتے ہیں اس تعلیم کے ساتھ اور بغیر تجربے کے ملازمت کیا ملے گی' ڈیڑھ دو ہزار والی معمولی سی۔۔۔ مجھے معمولی کام کرنے میں عار نہیں مگر معاوضہ بھی تو ملے۔ صرف دو ہزار کی خاطر چچا حضور کی ناراضگی بھی مول لینے کا کیا فائدہ۔ اس سے بہتر ہے کہ میں کم سرمائے سے محدود پیمانے پہ ہی سہی' اپنا کوئی کاروبار شروع کر لوں' اگرچہ اس پہ بھی چچا حضور سو اعتراض کریں گے' خفا ہوں گے مگر میں اس آس پہ رسک لوں گا کہ کم از کم گھر کے حالات تو سدھریں گے میں نے سوچ لیا ہے موتیا' میں کوئی غلط کام کرنے تو نہیں جا رہا نہ کوئی چوری نہ ڈاکا۔۔۔ کاروبار ہی شروع کرنا ہے' اگر چچا حضور ناراض بھی ہوئے تو منا لوں گا۔ بس کسی طرح تھوڑی بہت رقم کا انتظام ہو جائے۔ کم سے کم پیمانے پہ بھی کام شروع کرنے کے لیے ہاتھ میں کچھ تو ہو۔"

"ایسا کون سا کاروبار ہو سکتا ہے عمیص جس کے لیے سرمایہ ہمارے گھر سے باآسانی نکل آئے"

"بہت سے کام ہیں موتیا' بس کرنے کا حوصلہ اور پکا ارادہ ہونا چاہیے۔ ہونے کو تو محض ڈھائی ہزار سے بھی بندہ کام شروع کر سکتا ہے۔ ایک ریڑھی' چند برتن' دو دیگچے خرید کے تمہارے ہاتھ کے بنے چھولے اور حلیم بھی اسٹیشن پہ بیچ سکتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"پانچ ہزار ہوں تو سائیکل پہ ٹوکرا رکھ کے پھل' سبزی بھی بیچ سکتا ہوں بلکہ محض پانچ سو ہوں تو بغیر سائیکل کے ان قدموں پہ چلتا ہوا' ڈنڈے پہ غبارے لٹکا کے بھی بیچ سکتا ہوں۔"

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔" وہ اس کے ارادوں کی تفصیل جان کر ہکا بکا رہ گئی۔

"نہیں۔۔۔ ابھی تک خراب نہیں ہوا اس لیے ان امکانات کو محض سوچا ہی ہے' عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کوئی دکان کرائے پہ لے کر گفٹ شاپ' اسٹیشنری' بکس وغیرہ کی شاپ یا پھر جنرل اسٹور کھول لوں۔ لیکن دکان کا ایڈوانس' سیکورٹی وغیرہ پہ ہی کم از کم پچاس ہزار چاہئیں' اتنے کا یا اس سے ذرا سا کم کا سامان۔۔۔ لگ بھگ ایک لاکھ کا خرچا ہے' جو میری بساط سے باہر اور چچا حضور کی استطاعت سے زیادہ ہے۔ بس اسی لیے تذبذب کا شکار ہوں کہ چچا حضور سے بات کروں یا نہ کروں۔ کام اگر ان کی مرضی کے مطابق ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کے میری مدد بھی ضرور کرتے مگر اپنی مرضی کے خلاف تو وہ مجھے ایک آنہ تک نہ دیں گے۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ تم کچھ کچھ حقیقت پسند ہوتے جا رہے ہو۔ میرا اشارہ ابا حضور کے بارے میں تمہارے درست اندازے کی طرف ہے۔" وہ چھلکوں کو سمیٹتے ہوئے اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج کافی عرصے کے بعد وہ بہن کی طرف جا رہا تھا اس لیے خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں لگا۔ اس لیے ایک اسٹاپ پہلے اتر کر وہ بھائی کے نزدیک لگنے والے اتوار بازار کی جانب مڑ گیا۔ اگرچہ کٹڑی کے آس پاس بھی پھل اور مٹھائیوں وغیرہ کی دکانیں اور ریڑھے وغیرہ کھڑے ہوتے تھے مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دکانوں پہ ملنے والی سستی مٹھائیاں نہ صرف باسی ہوتی تھیں بلکہ مضر صحت اجزا سے تیار ہوتی تھیں اسی طرح پھل بھی گلے سڑے ہوتے تھے اور بازار سے نصف قیمت پہ بکا کرتے۔ اس علاقے کے لوگ مہنگے اور عمدہ پھل خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے' بچوں کے ہاتھ میں جو روپیہ دو روپیہ رکھتے' اس سے وہ گلے ہوئے کیلے' کیڑا لگے امرود اور نرم پڑے بیر لے کر کھا لیتے۔ اسی لیے وہ اتوار بازار آیا تاکہ خود دیکھ کر سستا مگر تازہ پھل خرید سکے۔ امرود اور مالٹے موسمی کا موسم تھا اس لیے ان کا نرخ سب سے کم اور عام آدمی کی بساط میں تھا البتہ سیب' کیلا اور انگور وغیرہ خاصے مہنگے تھے۔ اس نے ایک کلو امرود اور دو درجن فروٹر خریدے موسمی نسبتاً مہنگی تھی اس کی بجائے اس نے چھ کیلے لے لیے۔ جانتا تھا کہ دلکش کو کیلے بہت مرغوب ہیں۔ وہیں نمکو اور مسالا جات وغیرہ کے اسٹال سے اس نے پاؤ بھر مکس فروٹ جیم اور اتنی ہی مقدار میں نمکو خریدی۔ بھنی مونگ پھلی بھی پیک کروائی۔ پلاسٹک کے کھلونوں والے اسٹال سے دس دس روپے میں ملنے والے کئی آئٹم خریدے۔ چھ پنسلوں کا پیک' رنگین مارکرز کا چھوٹا پیکٹ' رنگ برنگے کلپ' پانی پھینکنے والا پستول اور میوزک بجانے والا نقلی موبائل۔

صاحبزادی یاسمین اسے اتنے اسباب کے ساتھ دیکھ کر ناراض ہو گئی۔

"یہ کیا عمیص' آپ اتنا کچھ اٹھا لائے۔ ان سب کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپا' آپ کے خیال میں تو بس جینے کے لیے ہوا' پانی اور ایک وقت کے کھانے کی ضرورت ہے' اس کے علاوہ کچھ اور نہیں' لیکن یہ بچے ہیں آپا۔۔۔ ان کا بھی دل ہے اور ہر مصلحت' ہر سمجھوتے سے بالکل پاک دل ان کا بھی چاہتا ہو گا کھیلنے کو' رنگ برنگی پنسلوں سے تصویریں بنانے کو سالن روٹی سے ہٹ کر کبھی پھل' کبھی چاکلیٹ کبھی بسکٹ کھانے کو۔"

"ہم نے انہیں دل مارنا سکھا دیا ہے میرے بھائی۔" وہ یاسیت سے مسکرائی۔

"اتنے معصوم دلوں کو مارنے کا حق آپ کو کس نے دیا آپا۔ ماں ہو کر بھی آپ یہ حق نہیں رکھتی ہیں۔ ان کا دل فطرت کے اصولوں کے عین مطابق اس اللہ نے بنایا ہے جو ہمیں ستر ماؤں سے بڑھ کے چاہتا ہے۔ قناعت کا درس دینا آپ کا فرض ہے مگر ان کے اندر ابھرنے والی فطری اور جائز خواہشوں کو تو مت کچلیے۔"

"تو ہم کیا کریں عمیص۔ کیا ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے بھی دوسرے بچوں کی طرح کھیلیں' ہنسیں اور کھائیں پئیں مگر آپ تو جانتے ہیں ہم ان کی بنیادی ضرورتیں بھی کس مشکل سے پوری کر پاتے ہیں۔ چچا حضور کا سایہ خدا ہم پہ رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ ماہ کے ماہ' وہ اناج کے تھیلے رکھوا جاتے ہیں۔ آٹا' چاول' چینی' دالیں اور گھی ختم نہیں ہونے پاتا کہ وہ اگلے ماہ پھر رکھوا جاتے ہیں لیکن جینے کے لیے اور بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے' ہم بچوں کو دال روٹی یا چاول چینی نہیں کھلا سکتے روز کی صرف سبزی لانے پہ ہی تیس پچیس روپے آسانی سے اٹھ جاتے ہیں۔ تینوں بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے ہیں' زیادہ خرچہ نہیں مگر کل ملا کے سو سوا سو روپے فیس تو ہو جاتی ہے۔ کتابوں' کاپیوں کا خرچہ۔ دلکش کو ان کے ابا نے گھر تو بٹھا لیا مگر ہم اسے ایسے جاہل رکھ کے اس کی زندگی تو برباد نہیں کر سکتے۔ اللہ بھلا کرے کوثر بی بی کا جو دلکش کو روز دو گلیاں چھوڑ کر رہنے والی استانی جی کے ہاں خود لے جاتی اور واپس بھی بحفاظت لے آتی ہے۔ ان کے ابا کو اس کا علم نہیں' ویسے بھی وہ اکثر شام کو گھر نہیں ہوتے۔ ہوں تو ہم دلکش کو اس شام نکلنے نہیں دیتے۔ استانی جی بھلی خاتون ہیں' صرف ڈیڑھ سو روپیہ لے کر پڑھا رہی تھیں کہ اس سال آٹھویں کا امتحان دلوا دیں گی۔ مگر ہم سوچتے ہیں کہ یہ کیسے ہو گا' ان کے ابا تو۔۔۔"

"آپ اس کی فکر مت کیجیے' جب داخلہ بھجوانا ہو مجھے بتا دیجیے گا' میں فیس جمع کرا دوں گا۔ بابر بھائی کی پروا مت کیجیے وہ چچا حضور کے سامنے دم نہیں مار سکتے' ویسے جتنے مرضی طرم خان بنے پھرتے ہوں۔"

"اونہوں **عمیص**۔" صاحبزادی یاسمین کو اپنے مجازی خدا کے بارے میں بھائی کی زبانی یہ کلمات پسند نہ آئے۔

"وہ آپ کے بہنوئی ہیں' بڑے بھائی جیسے۔۔۔"

"آپا' آپ جانتی ہیں کہ میں کسی کو عزت محض اس کے رشتے کے حوالے سے نہیں دے سکتا' اسے عزت کروانے کے لائق کوئی عمل بھی کرنا چاہیے۔ چچا حضور کا احترام میں صرف اس لیے نہیں کرتا کہ انہوں نے ہمارے والد کی وفات کے بعد ہماری پرورش کی ہے اور اس وقت وہ ہمارے واحد بزرگ اور ہمارے مرحوم والد کے عزیز بھائی ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ واقعی قابل احترام اور لائق پرستش ہیں۔ اگرچہ بہت سے معاملات میں میں ان سے اختلاف رکھتا ہوں بلکہ کئی گلے ہیں مجھے ان سے لیکن وہ سب ثانوی باتیں ہیں۔ اپنے چند قواعد کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ اٹل ہونے کے علاوہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لیے ناپسندیدہ ہو۔ وہ ایک باشعور شہری' ایماندار انسان' ذمہ دار شوہر مشفق باپ اور۔۔۔"

"خیر تو ہے **عمیص** میاں' آج چچا حضور کی بہت تعریف و توصیف ہو رہی ہے؟" صاحبزادی یاسمین نے ماحول کو ہلکا پھلکا بنانے کی غرض سے اسے چھیڑا۔ وہ جھینپ گیا۔

"میرا کہنے کا مقصد تھا' میں ان سے بات کروں گا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے دلکش کو وہاں لے آئیں۔ وہ خود لینے آئیں گے تو بابر بھائی نہ انکار کر سکیں گے نہ اعتراض امتحانات سے کچھ عرصہ قبل آ جائے گی تو میں اور موتیا اسے اور اچھی طرح پڑھا بھی دیں گے۔ بس آپ ہمت نہ ہاریں' نہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں۔ مجھے اپنی بہن کی یہ بات ہی تو پسند ہے کہ وہ شوہر کی جانب سے قطعی مایوس ہونے کے باوجود اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہے نہ خود پہ سے اعتماد کھویا ہے۔ آپ دن رات محنت کر کے ان بچوں کو تعلیم دلا رہی ہیں۔ دیکھیے گا آپا' اللہ آپ کی اس محنت کا اجر ضرور دے گا۔"

"بس بھائی' تم ایسے ہی ہمت بندھاتے رہا کرو' ہمیں اور کیا چاہیے' آئندہ یہ تردد مت کرنا۔۔۔ اتنا سب لانے کا۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ آپ کے اپنے روزگار کی فی الحال کوئی سبیل نہیں۔ ایسے میں اپنا مہینے بھر کا خرچ بہن اور اس کے بچوں پہ لٹا کر خالی ہاتھ پھریں گے۔ کیا یہ ہمیں اچھا لگے گا؟"

"جیب خرچ۔۔۔ آپا پیاری' وہ تو میں نے کافی عرصے سے لینا بند کر دیا' چچا حضور خاصے جزبز ہوئے تھے مگر میں نہ مانا۔ عجیب شرم سی آتی ہے اب بچوں کی طرح جیب خرچ لیتے ہوئے۔ اب ان کی عمر دینے اور میری عمر ہاتھ پھیلا کے لینے والی نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ اب آرام کریں اور میں۔۔۔ مگر یہ بھی صرف ان کی ضد کی وجہ سے ناممکن بنا ہوا ہے۔"

"تو پھر یہ سب۔۔۔؟" یاسمین نے حیرت سے اردگرد پھیلے سامان پہ نظر ڈالی۔ پھل' بسکٹ' سموسے' برفی اور کھلونوں پہ زیادہ نہیں تو کم از کم پانچ سو تو لگایا ہی ہو گا **عمیص** نے۔

"یہ سب تیاری ہے۔" وہ مبہم انداز میں مسکرایا۔

"کیسی تیاری؟" وہ یہ بجھارتیں سمجھ نہ پا رہی تھیں۔

"اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی تیاری آپا' میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں اب کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لوں۔ کام ایسا ہو کہ چچا حضور کے اصولوں پہ زیادہ دراڑ بھی نہ پڑے۔ ہلکی پھلکی دراڑ کی میں گارنٹی نہیں دے سکتا کہ وہ تو محض میرے اس ارادے کے ظاہر ہونے سے بھی پڑ سکتی ہے۔ بہرحال میری کوشش تو یہ ہے کہ ایسا کام کروں' جس سے وہ وقتی ناراضگی بے شک دکھالیں مگر بعد میں تسلیم کر لیں کہ اس کام سے ان کے خاندان کی عزت پہ ہرگز کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

"ایسا کیا کام ہو سکتا ہے؟ اور اس کے لیے آپ سرمایہ کہاں سے لیں گے؟"

"کام تو بہت سے ہیں آپا۔ میری نظر سے دیکھیں تو ہر کام ہی باعزت ہے۔ جس سے حلال طریقے سے روزی روٹی

کمائی جا سکے چاہے وہ جوتے گانٹھنے والا موچی ہو' چاہے سامان ڈھونے والا قلی' چاہے گھوڑے ہانکنے والا تانگہ بان لیکن بات میری نظر کی نہیں' مسئلہ چچا حضور کے نظریے کا ہے۔ ان سے احترام اور محبت کا تقاضہ ہے کہ میں ان کے نظریے کا احترام کروں۔ ان کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچنے دوں اور اس کے لیے میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ کوئی دکان کرائے پہ لے کر فوٹو اسٹیٹ مشین رکھ لوں' ساتھ پی سی او کھول لوں۔ کم از کم چچا حضور کو یہ چیز نہیں ستائے گی کہ میں آنے دو آنے کا سودا پڑیوں میں رکھ کے بیچ رہا ہوں حالانکہ نہ اب آنہ رہا ہے نہ پڑیا۔ جتنی کمائی ان جنرل اسٹور زدالوں کی ہے اتنی کسی اور دھندے میں نہیں۔ خیر شروعات تو ایسی ہونی چاہیے جس پہ وہ کم سے کم اعتراض کر سکیں۔ ایک واقف کار ہیں جو پی سی او کا پرمٹ بھی دلا دیں گے اور دکان کی سیکورٹی اور ایڈوانس میں مناسب حد تک کمی بھی کرا دیں گے۔ اس کے باوجود کم از کم تیس پینتیس ہزار تک رقم تو چاہیے بلکہ ہو سکتا ہے لاگت میرے اس محتاط تخمینے سے بڑھ کر پچاس ہزار تک چلی جائے۔"

"تو اس کا بندوبست کہاں سے ہو گا؟ کیا آپ نے چچا حضور سے بات کی؟"

"نہیں۔۔۔" **عمیص** نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"اور اس کا فائدہ بھی کوئی نہیں میں ایک بار کام شروع کر لوں تو مجھے یقین ہے کہ ذرا سی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد وہ خود مطمئن ہو جائیں گے یہ دیکھ کر کہ اس کام میں آمدنی بھی ہے اور عزت بھی۔ مگر بغیر کر کے دکھائے انہیں یہ اطمینان دلانا قدرے مشکل ہے۔ وہ ہرگز مجھے اس کام کے لیے رقم دینے پہ آمادہ نہیں ہوں گے اور اگر بالفرض مان بھی جائیں تو دیں گے کہاں سے' میں اچھی طرح جانتا ہوں ان کے پاس اس زمین اور چند باغات کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو کماتے ہیں وہ ہم سب پہ اور ان کی وضعداری و روایتی مہمان نوازی پہ لگ جاتا ہے۔ ان کے پاس کوئی جمع جتھا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا کہ وہ اپنا کوئی باغ بیچ کر یہ رقم مہیا کریں گے۔ نہیں آپا میں انہیں مزید تنگ دست نہیں کرنا چاہتا۔ کر لوں گا کوئی نہ کوئی انتظام میرا وہ دوست جو پی سی او کا پرمٹ دلا رہا ہے' بیس ہزار تک ادھار دینے پہ تیار ہے۔ باقی کی رقم جمع کرنے کے لیے میں آج کل۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا؟۔۔۔ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"کچھ خاص نہیں آپا۔" اس نے صرف ٹالا۔ "بے فکر رہیے' چوری نہیں کر رہا' نہ ڈاکا ڈالوں گا۔ حلال طریقے سے کما کر جمع کر رہا ہوں تاکہ جلد از جلد باعزت طریقے سے اپنا کاروبار شروع کر کے خود اپنی نظروں میں سرخرو ہو سکوں۔ اپنی یہ حالت اور کم مائیگی خود مجھ سے برداشت نہیں ہوتی' تو دوسرے میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں' اس کا تصور ہی مجھے شرم سے پانی پانی کر دیتا ہے۔"

"یہ احساس ہی زندہ رہے تو بڑی بات ہے **عمیص** میاں۔" یاسمین کچھ سوچ کر افسردہ ہوئیں۔

"کم از کم آپ کو اس پہ شرمندگی تو ہے۔ یہ شرمندگی ہی خود کو ابھارنے' کچھ کرنے پہ اکساتی ہے اور اگر کسی کے اندر یہ شرم ہی باقی نہ رہے' تو وہ کیا خود کو پیروں پہ کھڑا کرنے کی آرزو کرے گا۔ دعا کیجیے آپ کے بہنوئی کے اندر بھی اللہ یہ شرم ڈال دے مگر آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کیا کام کر رہے ہیں' کہیں خدانخواستہ کوئی ایسا کام۔۔۔ **عمیص**' ہم نہیں چاہتے' چچا حضور کے دل میں آپ کے خلاف۔۔۔"

"آپا' بات یہ ہے کہ اس کا ڈر مجھے بھی ہے۔ لیکن میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ چچا حضور کو اس کا علم نہ ہو۔ ویسے بھی میرا ارادہ تو کچھ اور ہے۔ یہ سب وقتی ہے اور اپنے ارادے کی تکمیل کی خاطر ہی تو یہ کام کر رہا ہوں۔ ہاتھ پہ ہاتھ باندھے رکھ کے بیٹھنے سے کیا ملے گا۔ جب میں جانتا ہوں کہ اپنے لیے جو کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے تو پھر کس بات کا انتظار؟ کیا امداد غیبی کا؟ آپا۔۔۔ اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتا ہے۔ میں آج سے نہیں پچھلے چار ماہ سے ہاتھ پیر مار رہا ہوں اور اللہ میری مدد بھی کر رہا ہے۔ ان چار ماہ میں میں نے کم از کم بارہ ہزار پس انداز کر لیے ہیں۔ بیس ہزار تک کی رقم جمع ہو جائے تو اللہ کا نام لے کر اسٹور کھول لوں گا۔"

"خدا آپ کو آپ کے مقاصد میں کامیاب کرے۔" صاحبزادی یاسمین نے دل سے دعا کی۔

"اب آئے ہو تو کھانا کھا کر جانا" ہمیں باتوں میں دھیان ہی نہ رہا کہ اٹھ کے خود آپ کے لیے کچھ تیار کرتے' عموماً" اس وقت دلکش ہی کچھ نہ کچھ بنا لیتی ہے۔ ہم ان کے ابا کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر سلائی کا کام کر لیتے ہیں۔"

"کہاں ہیں بابر بھائی؟ اب تک آئے کیوں نہیں؟ رات ہونے کو ہے۔"

"وہ رات ہونے پہ ہی تو گھر سے نکلتے ہیں۔ دن بھر تو آرام فرمایا جاتا ہے۔" یاسمین نے تلخی سے کہا۔ عموماً" وہ ایسی شکایات دل ہی دل میں کر لیا کرتی تھی' کسی سے کہتی نہیں تھی مگر عرصے بعد ماں جائے سے اکیلے میں ملنے پہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو جی چاہنے لگا۔

"صبح بچوں کے اسکول جانے کے بھی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد جاگتے ہیں۔ ناشتا کر کے کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے شوق پورے کیے جاتے ہیں۔ گھر پہ رہنے کی جھلاہٹ وقتاً" فوقتاً" ہم پہ اور دلکش پہ اتاری جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر پھر سے سو جاتے ہیں۔ بچوں کو ہم باہر کٹڑی کے دیگر بچوں کے ساتھ خود ہی کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے' کچھ عجیب سا ماحول بن گیا ہے اس جگہ کا عجیب قماش کے لوگ ہیں' ہم نہیں چاہتے کہ بچے ان سے کوئی غلط اثرات لیں مگر یہاں اس کمرے کے اندر محبوس رہ کر بھی بیچارے سہمے رہتے ہیں۔ باپ کی نیند میں خلل نہ پڑے اس لیے اونچی آواز میں بات تک نہیں کر سکتے' کھیلنا تو درکنار۔ شام ڈھلے اٹھ کر بناؤ سنگھار کر کے باہر نکل جاتے ہیں۔ رات دو ڈھائی سے پہلے واپسی نہیں ہوتی۔ ہم ان کے جانے کے بعد سلائی مشین سنبھال لیتے ہیں' بچے اسکول کا کام کرتے ہیں اور دلکش برابر کی کوثر آپا کے ہمراہ استانی جی سے پڑھنے چلی جاتی ہے۔ جانے سے پہلے کھانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست بھی کر جاتی ہے۔"

یاسمین نے تفصیل سے اپنے دن بھر کی مصروفیت اور معمول سے آگاہ کیا۔ جس میں سب سے دلچسپ بات عمیص کو بابر بھائی کا "بناؤ سنگھار" کرنا لگی۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"لیکن آپا' بابر بھائی بناؤ سنگھار کر کے جاتے کہاں ہیں؟ نظر رکھا کریں بھئی' زمانہ خراب ہے۔"

"زمانہ کہاں خراب ہے بھائی' زمانے والے ہی خراب ہیں اور انہیں کہاں جانا ہے' کسی نہ کسی دوست کے ہاں یا پھر۔۔۔" وہ بتاتے بتاتے رک گئی۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنا اور بات تھی' سارے راز ظاہر کر کے خود اپنا بھرم کھو دینا دوسری بات۔ عمیص بابر کی جوئے کی لت اور دوستوں کے ساتھ کھانے پینے رقم اڑانے اور جگہ جگہ سے ادھار لینے کی عادت سے تو بخوبی واقف تھا مگر اب تک یاسمین کمال مہارت سے اپنے شوہر کی شراب کی لت اور چرس کے نشے پہ پردہ ڈالے ہوئے تھی۔ اسی طرح اس کے دیگر اوصاف مثلاً" کوٹھے پہ جانا طوائفوں پہ پیسے لٹانا بھی ان لوگوں سے چھپے ہوئے تھے اور یہ بھی کہ اس کی محنت سے کمائی رقم اور چچا حضور کے کبھی کبھی دیے چند سو روپے بھی وہ اکثر چھین کر لے جاتا اپنے یہی شوق پورے کرنے۔

"ویسے آج سواری کہاں گئی ہے؟"

"کسی محفل غزل میں گئے ہیں۔ ان کے دوست کے گھر ہو رہی ہے۔" یاسمین نے بتایا تاکہ وہ مزید سوال نہ کرے اور بات کا رخ موڑنے کو دلکش کو آواز دینے لگی۔

"دلکش' ماموں یہیں کھانا کھائیں گے' کیا بنا ڈالا؟ ہم سے پوچھ تو لیتیں۔"

"ماموں کو کھانا کھلائے بغیر تو ہم بھی نہ جانے دیتے امی جان۔" چودہ سالہ دبلی پتلی۔۔۔ ہو بہو موتیا کے لڑکپن کی تصویر' دلکش بابر لاڈ سے اکلوتے ماموں کے شانے پہ ہاتھ پھیلا کر بولی۔

"ہم جانتے ہیں ماموں کو چاول پسند ہیں۔ مٹر پلاؤ بنایا ہے' نایاب سے کہہ کر پاؤ بھر دہی منگوا دیں ہم نے پودینہ پیسا ہے' رائتہ بنا لیں گے۔"

"وہ تو منگوا لیں گے مگر آپ کوئی سالن ہی بنا لیتیں ساتھ کبھی کبھی تو ماموں آتے ہیں۔"

جواب میں دلکش خاموشی سے سر جھکائے کھڑی رہی۔ یاسمین بھانپ گئیں کہ سالن کے لیے کچھ موجود نہ ہو

"مٹر پلاؤ تو میرا پسندیدہ ہے اور وہ بھی دلکش کے ہاتھ کا اس نے میری فیورٹ ڈش بنائی ہے اور بدلے میں تم سب کی پسند کی چیز لے کر آتا ہوں۔ شمشیر' نایاب۔۔۔ کیا چلے گا' تکے یا نان کباب؟"

بچے چپ چاپ ماموں کی شکل دیکھنے لگے۔ ایسی چیزوں کے صرف نام سنے تھے' کھائی کبھی نہ تھیں اگرچہ باپ جوئے کی رقم سے روز رات کو ایسے ہی کھانے اڑاتا تھا۔ ان کا جی تو چاہ رہا تھا مگر ماں کی رضامندی کے بغیر وہ کیسے جواب دیتے۔ یہ یاسمین کی کڑی تربیت تھی۔

"رہنے دو عمیص' پہلے ہی آپ اتنا سب لے کر آئے۔"

"آپا' آپ تو چپ ہی رہیں۔ دلکش تم کھانا لگاؤ۔ میں دہی اور نان مچھلی لے کر آتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"آج لنچ کے بعد کوئی خاص اپائنٹمنٹ تو نہیں؟ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ چار بجے تک لوٹ آؤں گا۔ وہ جو میگزین سے کسی جرنلسٹ نے انٹرویو کے لیے آنا تھا' اسے تو تم نے پانچ بجے کا ٹائم دیا ہے ناں؟"

شہزاد نے آفس آنے کے بعد چند ضروری فون کالز کیں' پھر انٹر کام پہ اپنے سیکرٹری سے دریافت کیا۔

"یس سر' وہ جرنلسٹ اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ ساڑھے پانچ بجے شام کو آئے گا' اس نے دوبارہ یاددہانی کرائی تھی کہ وہ آپ کا ایک فوٹو شوٹ بھی لے گا اس لیے آپ تیار رہیں۔ اس کے علاوہ تو سر لنچ کے بعد کوئی اہم یا غیر اہم اپائنٹمنٹ نہیں ہے۔۔۔ ہاں رات کو شاہ جی کی فلم کے پریمیئر کا انویٹیشن آیا ہوا ہے' سر کیا آپ جانا پسند کریں گے۔"

"ہوں۔۔۔ دیکھتا ہوں اگر موڈ ہوا تو۔۔۔ ایسی فلمی گیدرنگ میں وہی ٹیپیکل فلمی ماحول اور اوٹنگے بوٹنگے شیخی خورے قسم کے لوگ۔ خیر' جانا تو پڑے گا۔ شاہ جی سے پرانی ایسوسی ایشن ہے' یاری دوستی کے لحاظ میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور وہ فوٹو شوٹ اس کے لیے تو پھر مجھے سائٹ سے چار بجے تک ہر حال میں آ جانا ہو گا تاکہ میں فریش ہو سکوں۔ ایسا کرو مختار' تم اس جرنلسٹ کو فون کر کے یہاں آفس آنے کی بجائے پی سی میں ہائی ٹی پہ انوائیٹ کر لو۔ اس کے دو فائدے ہوں گے' ایک تو ایسے للو پنجو جرنلسٹس کو ذرا اچھی قسم کی چائے پینے کو مل جائے گی تو انٹرویو چھاپتے ہوئے کم کھیلے کرے گا' دوسرا میں سائٹ سے سیدھا گھر جا کر فریش ہونے اور چینج کرنے کے بعد وہیں پی سی چلا آؤں گا۔"

"تو سر آپ لنچ کے بعد آفس نہیں آئیں گے۔"

"لنچ کے بعد ہی نہیں بلکہ میں لنچ سے پہلے بھی آفس نہیں ہوں گا۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں اپنے اسٹوڈیو کو کم سے کم مدت میں تکمیل پاتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ کام کا پریشر پچھلے کچھ دنوں سے اتنا زیادہ تھا کہ میں سائٹ پہ جا ہی نہ سکا کہ دیکھ سکوں کام کی رفتار کیا ہے اور کام میری مرضی کے مطابق تسلی بخش طریقے سے ہو رہا ہے یا نہیں۔ آج اتفاقاً" ایک عرصے کے بعد ایسا ہوا ہے کہ نہ کوئی اہم میٹنگ ہے نہ میری اپنی پروڈکشن کی ایسی شوٹنگ یا سیٹنگ جس میں میرا ہونا ضروری ہو تو یہ پروگرام بنا ڈالا۔" وہ موبائل' والٹ اور کی رنگ اٹھا تا نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔

"لیکن سر' لنچ اور سے پہلے کا ٹائم آپ نے اس امیدوار کو دے رکھا ہے' جس کی سفیان صاحب نے سفارش کی تھی' وہ شیر دل والے پراجیکٹ کے سلسلے میں۔"

"اوہ۔۔۔ آئی سی' کیا ٹائم دیا تھا تم نے اسے۔"

"سر' بارہ بجے کا اور سوا گیارہ تو ہو ہی چکے ہیں۔"

"لیکن سر' ایک بات پوچھوں۔" مختار واپس جاتے جاتے پھر سے پلٹا اور کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ شہزاد نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"سر آپ تو سفارش پہ بلیو نہیں کرتے نہ ہی سفارشی افراد کو چانس دیتے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا مختار' لیکن یہ صرف سفارش نہیں ہے۔ سفیان کوئی بے وقوف شخص نہیں کاروباری آدمی

ہے اور پھر میرا پرانا دوست بھی۔ بہتر سمجھتا ہے کہ میری ڈیمانڈ کیا ہے۔ میں نے اس سے اپنی پرابلم ڈسکس کی تھی اور اس نے اس کے حل کے لیے جو مشورہ دیا' میرے خیال میں یہی بہتر تھا کہ ہم اس پراجیکٹ کو ایسے ہی اسٹائل میں ہینڈل کریں جو اس کی ڈیمانڈ ہے اس کے لیے پروڈکشن کے لگے بندھے فلمی روایتی اسٹائل کی بجائے ہمیں پروفیشنل ٹیم بنانی پڑے گی۔ اس کے لیے پہلا انتخاب بھی سفیان نے خود ہی مہیا کر دیا۔ وہ کمپیوٹر کی فیلڈ کا بندہ ہے۔ اگر اس کے خیال میں یہ خاتون ہمارے پروجیکٹ کے لیے سب سے عمدہ چوائس ہیں تو یقیناً" ایسا ہی ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

"تھینکس گاڈ' مزنی تم مل گئیں۔" گل مہر کافی دیر سے اسٹاپ پہ کھڑی تھی' مزنی کی کار اس کے سامنے رکی تو وہ شکر کا کلمہ پڑھتی فوراً" اس کے برابر کی سیٹ پہ بیٹھ گئی۔

"تمہارا خیال ہے میں نے تمہیں راستے میں اتفاقیہ کھڑے دیکھ کے لفٹ دی ہے۔۔۔ جی نہیں محترمہ۔۔۔ اپنی دوست کے بارے میں الٹے سیدھے اندازے لگانا چھوڑ دیں میں خاص طور پہ تمہیں لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ انکل نے بتایا تھا کہ یہ شخص۔۔۔ شہزاد ملک جو کہ ایس پروڈکشن ہاؤس کا کرتا دھرتا ہے' خاصا خردماغ شخص ہے بلکہ الٹی کھوپڑی کا ہے' اپنی کرنے پہ آئے تو یاری دوستی۔۔۔ کچھ نہیں دیکھتا اس لیے میں خود آگئی کہ کہیں تم دین پابس نہ ملنے پہ لیٹ ہو جاؤ اور اتنا اچھا چانس ہاتھ سے نکل جائے۔ اب بتاؤ' دیر کیوں ہوئی۔"

"کیا کریں' ہم تو گھر سے ٹائم پہ ہی نکلے ہیں' وین ہی کوئی خالی نہیں مل رہی تھی' اب ہم بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنس ٹھنسا کے جانے سے تو رہے۔ تم تو جانتی ہو ہمیں رکشے کی آواز سے گھبراہٹ ہوتی ہے اور دو ٹیکسیاں بھی گزریں' ہم روکنے لگے مگر اچھا ہوا انہیں روکیں' ان کے ڈرائیورز کی شکلیں ہمیں ٹھیک نہیں لگیں۔" وہ بتاتے ہوئے بیک ویو مرر کو اپنی جانب کر کے اسکارف سے نکلنے والے بال ٹھیک کرنے لگی۔

"توبہ۔۔۔ تمہارے نخرے۔" مزنی نے سر جھٹکا۔

"محترمہ ٹیکسی میں بھی تب بیٹھیں گی جب اس کا ڈرائیور ان کے دل کو بھائے گا۔ بارہ بجے کا ٹائم تھا اور اب صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔"

"تم تیز چلاؤ ناں' جتنی رفتار سے تمہاری زبان فراٹے بھر رہی ہے' اتنی ہی رفتار کار کی بھی رکھو تو ہم وقت پہ آفس پہنچ جائیں۔"

"آفس جانا ہے ہاسپٹل نہیں۔" مزنی نے اسے چڑایا مگر بہرحال بارہ بج کر سات منٹ پہ اس نے کارڈیوس روڈ کے کاروباری علاقے کی مصروف ترین شاہراہ پہ بنی اس بلڈنگ کے آگے روک ہی دی جس کے سیکنڈ فلور پہ لکی ایس پروڈکشن ہاؤس کا آفس تھا۔

"میں پارکر جا رہی ہوں۔ اگر تم ایک گھنٹے سے پہلے فارغ ہو جاؤ تو واک کرتے ہوئے وہیں آجانا۔ ورنہ ایک سوا ایک تک میں تو آ ہی جاؤں گی' تمہاری جاب کی خوشی میں زبردست ٹریٹ لوں گی اوکے۔" اس نے تاکید کرتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔

"مس' آپ پورے بارہ منٹ لیٹ ہیں۔"

سیکرٹری نے اس کا تعارف حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے یہ اطلاع دی۔

"اور سر کافی دیر سے آپ کا ویٹ کر رہے ہیں انہوں نے اپنی ایک ضروری اپائنٹمنٹ کینسل کی ہے' صرف آپ کے لیے۔" مزید شرمندہ کیا گیا۔ وہ اندر ہی اندر خاصی پریشان ہو گئی رہ رہ کے مزنی کے الفاظ یاد آنے لگے۔

"خاصا خردماغ شخص ہے بلکہ کسی قدر الٹی کھوپڑی کا مالک۔"

"ہوا کرے' ہمیں کیا؟" دفعتاً" اس کے اندر کے نوابی خون نے جوش مارا۔ اس نے شانے جھٹک کے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"خردماغ تو اپنے گھر میں ہو گا۔ بارہ منٹ لیٹ ہی تو ہوئے ہیں۔ کوئی جان بوجھ کر دیر تو نہیں کی کر کے تو دیکھے ہمارے ساتھ ذرا سی بھی بدلحاظی۔ ہم بھی کوئی ایرے غیرے نہیں' صاحبزادی گل مہر خانم ہیں۔۔۔ ساری الٹی کھوپڑی پل بھر میں سیدھی کر دیں گے۔"

خود کو حوصلہ دلانے کی خاطر وہ اپنے اندر کی گھبراہٹ کو ایسے ہی کھوکھلے دلاسوں سے ڈھانپتی رہی۔ سیکرٹری نے انٹرکام پہ اطلاع دے کر اجازت ملنے پہ اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ایک شاہانہ سی تمکنت تو ویسے بھی گل مہر کی شخصیت کے ہر ہر انداز سے چھلکتی تھی۔ اس وقت ارادتاً" بھی اس کا سر کچھ اور بلند ہو گیا' گردن مزید تن گئی' ابرو شاہانہ انداز میں کمان سے ہو گئے اور مضبوط قدم اٹھاتی وہ اندر داخل ہوئی۔

"ہم اندر آسکتے ہیں سر؟"

اگرچہ الفاظ اجازت مانگنے کے تھے مگر لہجے میں دبدبہ اور آواز میں رعب اس قدر تھا جیسے وہ آنے کی اجازت نہیں طلب کر رہی ہو بلکہ اپنی آمد سے خبردار کر رہی ہو۔ شہزاد نے چونک کر سامنے دیکھا' ذرا سا دروازہ وا کیے وہ ایک نوجوان لڑکی تھی' اس کے اندازوں سے یکسر مختلف۔۔۔ پہلے اس کے خیال میں وہ ایک تیس' پینتیس سالہ عینک لگائے خاتون ہو گی' سفیان کے مطابق ذہین فطین سی' کمپیوٹر جینئس۔۔۔ کل جب سفیان نے باتوں میں ذکر کیا کہ وہ اس کی بھتیجی کی دوست ہے تب اس کی عمر کا اندازہ لگانے کے بعد اس نے تصور میں جو خاکہ کھینچا اس کے مطابق وہ ایک انیس بیس سالہ فیشن زدہ اپر کلاس کی لڑکی ہو گی' رنگے ہوئے تراشیدہ بالوں' لینس لگی آنکھوں' بے تحاشا کیے ہوئے میک اپ والے چہرے اور مغرب زدہ لباس والی بگڑی ہوئی امیرزادی' منہ ٹیڑھا کر کے انگلش بولنے والی جسے نیا نیا شوق چرایا ہو گا پروفیشنل لائف میں جانے کا اور اپنا کیریئر بنانے کا۔۔۔ مگر اس کے بالکل برعکس وہ ایک بیس اکیس سالہ دوشیزہ تھی۔۔۔ سراپا مشرقی انداز لیے ہوئے۔۔۔ روایتی تراش والے گلابی شلوار قمیص میں جو پوشی کے تمام تر تقاضے پورا کر رہا تھا' جدید انداز کے مطابق شلوار کے پائنچے اور آستین میں لمبے سے چاک رکھ کے اس لباس کی مشرقیت کو تباہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ نہ صرف سر اسکارف سے اچھی طرح ڈھانپا گیا تھا بلکہ شال بھی باوقار انداز میں اس کے سراپے کو ملفوف کر رہی تھی' اس کا چہرہ حسن و جاذبیت کا ایک ایسا شاہکار تھا جسے کسی مصنوعی سہارے کی حاجت نہیں تھی۔ چہرے پہ وہی رعب اور شاہانہ جاہ و جلال تھا جو لہجے سے چھلک رہا تھا۔ شہزاد نے ایک دم ہی بے پناہ متاثر ہوتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"ہم معذرت خواہ ہیں' ہماری وجہ سے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔"

بے حد شستہ' شائستہ اور رواں لہجے کی اردو میں اس نے اسی بے نیازی سے معذرت پیش کی' جیسے اجازت طلب کی تھی نہ وہ اجازت' اجازت لگ رہی تھی' نہ یہ معذرت' معذرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے شاہانہ انداز اور لب و لہجے سے محفوظ ہوا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مس گل مہر۔"

"صاحبزادی گل مہر خانم۔"

اس نے تصحیح کی۔

اب محظوظ ہوتا شہزاد اب مرعوب بھی ہو گیا۔

● ● ●

"صاحبزادی گل مہر خانم۔۔۔"

شہزاد نے زیرِ لب دہرایا۔ جیسے اس نام کو ذہن نشین کر رہا ہو۔ اپنے نام کا ورد کرتے سن کر اور خود پہ جمی اس کی پر سوچ نگاہوں سے الجھن محسوس کرتے ہوئے گل مہر کے چہرے پہ قدرے ناگواری کے تاثرات پیدا ہوئے۔ شہزاد سنبھل گیا۔

"آیئے تشریف رکھیے۔"

تحریم۔" وہ وقار سے اس کے سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھی اور اپنی فائل آگے کی۔
"ہمیں سفیان انکل نے بھیجا ہے لیکن اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ ہم محض ان کی سفارش پہ آپ کے ادارے میں ناجائز طور پہ داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ ذرا سا مسکرائی اور کمال اعتماد سے دعویٰ کیا۔
"چونکہ ہمیں تو کیا ہماری پوری فیملی میں آج تک کسی کو ملازمت کا تجربہ نہیں ہوا اس لیے ہم نے اس سلسلے میں ان سے مدد ضرور طلب کی تھی اور ان کے ریفرنس سے یہاں تک پہنچے ہیں لیکن آپ اطمینان رکھیے آپ کو ہمارا انتخاب کرتے ہوئے کسی قسم کی پریشانی یا افسوس کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ہم آپ کے ادارے کے معیار اور ڈیمانڈ کے مطابق اپنی بہترین صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔"
شہزاد کی دبی دبی مسکراہٹ کھل کے واضح ہوئی۔ اسے انٹرویو دینے کا یہ با اعتماد اور پر تکبر انداز پسند آیا۔
"کیا آپ اپنی سی وی دکھانا پسند کریں گی؟"
"شیور۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ تھرو آؤٹ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن آپ کا اکیڈمک ریکارڈ تو بہت اچھا ہے لیکن میرا کام ایسا ہے جس کے لیے میں صرف ڈگریوں پہ انحصار نہیں کر سکتا۔ میں کام کی اپروچ سے متاثر ہونے والا بندہ ہوں۔ آپ اگر محض انٹر پاس بھی ہوتیں لیکن میری ڈیمانڈ کے مطابق میرے کام کا رزلٹ پیش کریں گی تب بھی مجھے منظور ہے۔ بہر حال میں آپ کی تعلیمی قابلیت کو جھٹلا تو نہیں رہا۔ یہ یقیناً "ایک اضافی کوالٹی ثابت ہو گی۔"
اس کی باتوں سے گل مہر کو اندازہ ہوا کہ وہ اسے اس جاب کے لیے سلیکٹ کر چکا ہے۔ پہلی بار میں ہی کامیابی حاصل کر لینے کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔
"تو سر ہم کب سے جوائن کریں؟"
"چاہیں تو آج سے ہی۔۔۔ لیکن ابھی کچھ دن آپ کو صرف یہاں کے سسٹم کو آبزرو کرنا ہو گا۔ جس سیریل کے لیے میں نے آپ کی خدمات حاصل کی ہیں' اس کا پیپر ورک اور ریسرچ مکمل ہو چکی ہے۔ اگلے ہی ہفتے وہ سیٹ پہ چلا جائے گا اور میری کوشش ہے کہ ہم پہلی دس اقساط کی ریکارڈنگ ریکارڈ ٹائم میں شوٹ کریں۔ آپ کو اس کا مکمل اسکرپٹ دیا جائے گا تاکہ آپ بھی اپنا ہوم ورک مینٹین کر لیں کہ اس سیریل کی کیا ڈیمانڈز ہیں۔ اپنی ہر اہم سیریل کی فائنل ایڈیٹنگ میں کرتا ہوں۔ میرے اسسٹنٹ ایڈیٹرز ہر ایپی سوڈ میری ٹیبل تک پہنچائیں گے تب آپ کا کام شروع ہو گا' جہاں جہاں گرافکس اور اسپیشل ایفیکٹس کی ضرورت ہو گی وہاں وہاں آپ کو ایڈیٹنگ کے دوران اپنا کام دکھانا ہو گا۔ اسی لیے آپ کا روز آنا ضروری نہیں لیکن ابتدائی چند روز تک آپ کو ایڈیٹنگ کی تکنیک سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے روز آنا ہو گا۔ یہ چیز آپ کے کام کو مزید آسان کر دے گی۔
اس کے علاوہ ایک اور بات واضح کر دوں۔ شوبز کو نجانے آپ کیا سمجھتی ہیں۔۔۔ یا آپ نے اس کے متعلق پتہ نہیں کیا کیا سن رکھا ہو لیکن میری کمپنی شوبز سے متعلق ہونے کے باوجود ایک ڈسپلنڈ اور پنکچوئل کمپنی ہے وقت کے زیاں اور ناقدری کو میں بزنس کی موت سمجھتا ہوں۔ میرا کام میرے لیے بزنس ہے۔۔۔ ناٹ اونلی شوبزنس۔۔۔ یہاں ہر کام پروفیشنل اپروچ سے ہوتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں آپ بھی وقت کی پابندی اور قدر کریں گی۔ آپ کو جو تاریخ دی جائے گی کام کے لیے' اس تاریخ کو آپ کا میرے ریکارڈنگ روم میں آنا لازمی ہے اور جتنا وقت دیا جائے گا کام مکمل کرنے کے لیے' اس مقررہ وقت کے دوران آپ کو کام ختم کرنا ضروری ہے۔"
"اوکے سر' ہم بھی گھر سے کام کرنے کی نیت سے نکلے ہیں اور پوری کوشش کریں گے کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔۔۔ لیکن سر اس کے علاوہ ہمارا مطلب ہے کہ ایڈیٹنگ کے دوران آپ کی ہیلپ کرنے اور کمپیوٹر ورک کے علاوہ ہمارا شوٹنگ پہ آنا یا کسی بھی قسم کی پریس کوریج کا سامنا کرنا تو ضروری نہیں۔"
وہ ابا حضور کی اجازت ملنے پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی لیکن ابھی آپے سے باہر نہ ہوئی تھی' ان کی جانب سے عائد کردہ ان تمام حدود و قواعد سے آگاہ تھی جن کی یاد دہانی تک کرانا انہوں نے بوجہ ناراضگی ضروری نہ سمجھا

تھا۔ اسی لیے احتیاطاً" پوچھ رہی تھی۔
"ناٹ ایٹ آل یہ آپ کی مرضی پہ ڈیپنڈ کرتا ہے۔ اگر آپ اس شعبے کے علاوہ کسی اور کام میں بھی دلچسپی رکھتی ہیں اور آگے چل کر اس میں بھی قسمت آزمائی کرنا چاہتی ہیں تو آپ شوق سے شوٹنگ پہ آ سکتی ہیں اور میرے کسی بھی ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو اسسٹ کر سکتی ہیں مثلاً" آرٹ ڈائریکشن' اسکرپٹ رائٹنگ' کیمرہ ورک وغیرہ وغیرہ۔ بصورت دیگر آپ کا کام شوٹنگ کے بعد ایڈیٹنگ ٹیبل پہ آنے والی ریل سے شروع ہو گا۔ ہاں اسکرپٹ پہ ڈسکشن کرنے کے لیے آپ کو کسی بھی وقت میٹنگ میں بلایا جا سکتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"دیکھا میں نہ کہتا تھا۔ فن اپنا راستہ آپ بناتا ہے۔ وڈا تیرا ماما' بڑا اکڑ کے کہتا تھا کہ اس رستے میں خواری ہی خواری ہے' دھی کو سیاپے میں نہ ڈال۔ اب ذرا آ کر دیکھے وہ' کیسی خواری' کیسا سیاپا۔ بس لوگ کسی کو ترقی کرتے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ خوامخواہ ڈرانے لگتے ہیں تاکہ اگلا بندہ سہم کے گھر بیٹھ جائے' ان سے آگے نہ نکل جائے۔ محنت کرنے والے کو خواری کا کیا ڈر۔ کچھ پانے کے واسطے کچھ نہ کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ یہاں تو رب سوہنے کا ایسا کرم ہوا ہے کہ کھونے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ویسے ہی اس کی پاک ذات نے نواز دیا ہے۔" اللہ وسائے کی بات سن کر دعا کو دھچکا سا لگا۔
"تو اس کا مطلب ہے ابا جی' پانے کے لیے کچھ کھونے پہ آپ تیار تھے؟"
"کیسی باتاں کرتی ہے؟ جھلی نہ ہووے تے۔۔۔ میں پیو ہوں تیرا۔ تیرے سر کی چھت۔ اسی لیے تو ہر جگہ تجھے ساتھ لیے پھرتا ہوں کہ کوئی تیری نادانی اور معصومیت سے فائدہ نہ اٹھائے۔" وہ گڑبڑا گیا۔ دعا اسے بتا نہ سکی کہ اس قسم کے باپ کا ساتھ ہونا نہ ہونا ایک برابر ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بے منت تھمانے کے بعد ان لوگوں کو یہ فکر یا لحاظ نہیں ہوتا کہ وہ ایک لڑکی کے باپ کے سامنے اسے اپنی ہوس زدہ نظروں یا چھبے دار ذو معنی باتوں سے رجھا رہے ہیں۔ اس کے سامنے ہی جب جس کا دل چاہتا' شاباشی دینے کے بہانے اس کے گال سہلا جاتا' شانے پہ دیر تک تھپکی دیتا رہتا۔۔۔ وہ اندر ہی اندر کسی بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی رہ جاتی' مدد طلب زخمی نگاہوں سے اسے دیکھتی مگر وہ۔۔۔ وہ تو نوٹ گننے میں مگن ہوتا تھا۔
"ابھی تو تو نے بہت آگے جانا ہے۔۔۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔"
"کیا۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ دہل گئی۔
"اور آگے۔۔۔؟" اس کے تصور میں وہ گندے مکروہ ہاتھ اس کے گالوں اور شانے سے بہت آگے تک کا سفر طے کرنے لگے۔
"نہیں ابا جی۔۔۔ نہیں۔" اس نے جھٹکا لے کر ان نادیدہ ہاتھوں سے بچنے کی کوشش کی۔
"کیا نہیں؟ ابھی تو شروعات ہے کڑیے۔۔۔ وہ تو پہلا شو تھا۔ میرے لیے اتنا بھی بہت تھا کہ ملک صاحب نے تجھے چانس دیا۔ اتنے بڑے بڑے ناموں میں تجھے بھی فن دکھانے کا موقع ملا۔ ہاں یہ ان کی مہربانی کہ پہلی بار میں ہی تجھے تھوڑا بہت ہی سہی لیکن پیسہ تو ملا۔ اس شو کے بعد بہت سے لوگوں نے تیری آواز پسند کی۔ وہ وقت دور نہیں جب تیرے نام پہ میں منہ مانگا پیسہ لوں گا۔ کل کے شو کے لیے بھی میں نے پورے بیس ہزار مانگے ہیں۔ تھوڑی بہت بحث کے بعد پندرہ ہزار پہ بات بن گئی ہے۔ بس دو تین شو اور ہو جائیں پھر تیس چالیس بھی منہ سے مانگوں گا تو کوئی انکار نہیں کرے گا۔"
"تیس ہزار؟" وہ حیران رہ گئی۔ ابھی تک با معاوضہ شو اس نے ایک ہی کیا تھا اس میں بھی بڑی بڑی گلوکاراؤں اور فنکاراؤں کے درمیان اس نے بڑی کوشش اور ہمت کی تھی۔ اس کے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ محض ایک ہی بار میں چند گھنٹوں کے دوران تین یا چار گانے گانے پر کوئی اسے پندرہ ہزار دے سکتا ہے۔
یہ بات وہ بخوبی سمجھنے لگی تھی کہ ابا جی اس کی تمام تر ناپسندیدگی اور رشتے داروں کی مخالفت کے باوجود اسے

اس شعبے میں کس لیے لائے۔ کالج میں پڑھنے کے دوران وہ گھریلو حالات اور اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے اس قدر ڈپریس تھی کہ انٹر پرائیویٹ کرنے کا سوچتے ہوئے گھر بیٹھ گئی اور جب ابا جی نے موسیقی کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی اسے پروفیشنل لائن میں لانے کا ارادہ کیا تو وہ ہر ممکن حد تک اس سے بچنے کی خاطر کسی اور ملازمت کے حصول کے لیے بھی کوشش کر بیٹھی۔ اس نے مختلف اسکولز میں 'پی سی اوز میں آپریٹرز' پرائیویٹ چھوٹے موٹے آفسز میں سیکریٹری کی جابز کے لیے ہاتھ پیر مارے۔ اس نامکمل تعلیم اور ناتجربہ کاری کے ساتھ اگر کوئی جاب دینے پہ رضامند بھی ہوا تو ہزار ڈیڑھ ہزار سے زیادہ تنخواہ کے ساتھ نہیں۔

اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پر ہجوم بازاروں اور مصروف شاپنگ سنٹرز میں بنے پی سی اوز میں مالکان لیڈی آپریٹرز کس مقصد کے لیے رکھتے ہیں۔۔۔ صرف اور صرف چند بد قماش لوگوں کا ٹھرکی پن دور کرنے کے لیے اور زیادہ سے زیادہ کسٹمر گھیرنے کے لیے۔ ان پی سی اوز میں بیٹھی مجبور اور کم تعلیم یافتہ غریب لڑکیوں کی اس نے پیشہ ور گانے بجانے والیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تذلیل ہوتی دیکھی تو گھبرا گئی۔ تنگ و تاریک بوسیدہ بلڈنگز میں بنے اسٹیٹ ایجنسز' پراپرٹی ڈیلرز' ہاؤسنگ کمپنیز اور دیگر گمنام اداروں کے دو دو کمروں پہ مشتمل دفتروں میں جو ٹائپسٹ اور سیکریٹری رکھی جاتی ہے اس کا مقصد بھی جلد اس پہ واضح ہو گیا۔ ان کے مقابلے میں اسکول ٹیچر کے لیے معاشرے میں عزت اور مقام ضرور تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ جتنی اس کی تعلیم تھی اس کے لحاظ سے گلی محلے میں بنے پرائیویٹ پرائمری اسکول ہی اسے ملازمت دے سکتے تھے اور ان کی تنخواہ تو ان پی سی او پہ بیٹھ کر ادائیں دکھا کر کسٹمرز کو لبھانے والی آپریٹرز اور باس کو خوشگوار کمپنی دینے والی سیکریٹری کے مقابلے میں بھی آدھی تھی۔

وہ اکثر فلموں' ڈراموں یا افسانوں میں طوائفوں کی مجبوری کے بارے میں پڑھ کے طنز سے ہنس دیا کرتی تھی۔

"ہونہہ' مجبوری۔۔۔ سب ڈھکوسلے ہیں۔ جھوٹ بولتی ہیں سب کی سب کہ صرف پیٹ پالنے کی خاطر ہم اس مکروہ دھندے سے وابستہ ہیں۔ نری بکواس۔۔۔ کیا پیٹ پالنے کے لیے کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ڈھونڈا جا سکتا' سچ تو یہ ہے کہ بازاری پن ان کی رگوں تک میں اتر چکا ہوتا ہے۔ بن سنور کر مردوں سے داد وصولنے کا چسکہ کسی اور کام میں کیسے پورا ہو سکتا ہے ورنہ دو وقت کی روٹی تو کسی فیکٹری میں پیکنگ گرل بن کے یا کسی اسکول میں بچوں کو پڑھا کے بھی کمائی جا سکتی ہے۔"

یہ اس کی اس وقت کی سوچ تھی۔

بعد میں پریکٹیکل لائف میں آنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ اس حقیقت سے روشناس ہوئی کہ فیکٹری میں پیکنگ کر کے' کسی چھوٹے موٹے اسکول میں ٹیچنگ کر کے یا پھر۔۔۔ سیلز گرل بن کے دو وقت کی روٹی تو کمائی جا سکتی ہے مگر صرف اپنے لیے۔۔۔ اور آسمان سے تو کوئی بھی فرد اکیلا نہیں اترتا۔ ہر کسی کے ساتھ صرف اس کا پیٹ ہی نہیں کئی دوسرے پیٹ بھی لگے ہوتے ہیں۔ رشتے تو ان طوائفوں کے بھی ہوتے ہیں۔ ماں' باپ' بہن' بھائی اور کئی کے بچے بھی اور پھر روٹی ہی تو زندگی کی سب سے اہم یا واحد ضرورت نہیں۔ سر چھپانے کی چھت' تن ڈھانپنے کا کپڑا۔۔۔ بچوں کی تعلیم کا بندوبست۔۔۔ اب اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ طوائفوں کو اپنے پیشے سے چمٹے رہنے کی آخر کیا مجبوری ہے۔ اگر کسی اور روزگار میں انہیں اپنی سب بنیادی اور جائز ضروریات پوری ہوتی نظر آئیں تو وہ اس مجبوری سے پیچھا نہ چھڑا لیں۔

اور اب یہ جان کر۔۔۔ کہ اسے گلوکاری کے شعبے میں ابتدائی دور کے دوران ہی ہزاروں میں رقم مل رہی ہے۔۔۔ وہ یہ راز بھی جان گئی کہ خاندانی اور جدی پشتی طوائف زادیوں کے علاوہ اس جیسی دیگر نچلے اور متوسط طبقے کی خواہشات کی ماری' مجبوریوں کی ڈسی لڑکیاں ذوق و شوق سے اس پیشے کو کیوں اپنا رہی ہیں۔

"ایڈوانس آٹھ ہزار ملا ہے۔ اس دفعہ تجھے مانگے کا جوڑا پہن کے نہیں جانا پڑے گا۔ یہ لے تین ہزار تو رکھ لے اور کوئی سلا سلایا جوڑا' جوتی وغیرہ لے آ۔۔۔ اور ذرا طریقے سے پہننا۔ اس شو کی فلم بھی بن رہی ہے۔ ٹی وی

چلے گی یا ویسے ہی دکانوں میں کرائے پہ چڑھے گی۔ اس کا بھی بڑا فیدا ہوتا ہے۔ جتنے لوگ فلم میں تجھے دیکھیں گے اتنی ہی تیری مانگ بڑھے گی اس لیے ذرا بننے سنورنے پہ توجہ دینا۔ منہ اٹھا کے نہ چل پڑنا۔ پچھلی بار اتنا اچھا لشکیں مارتا جوڑا پہنا تھا اور دھلا منہ لے کر اسٹیج پہ چڑھ آئی تھی۔ جگہ جگہ دکانیں کھلی ہیں میک اپ شیک اپ کی۔ کسی میں جا کر سونے سے بال بنوا' سرخی پوڈر لگوا' پیسے کم پڑ جائیں تو کوئی گل نہیں' ہور لے لینا میرے سے۔ جھلیے جتنا پیسہ لگائے گی' دگنا ہو کر ملے گا۔ تو نے دیکھا نہیں بڑی بڑی گانے والیاں' سیروں سونا اور منوں پوڈر چڑھا کے گانے آتی ہیں۔ ہزاروں روپے والی ساڑھیاں۔۔۔ تب ہی تو تماش بین بے خود ہو کر ہزار ہزار کے نوٹ وارتے ہیں۔"

ابا جی کی زبانی یہ تاکید سن کر دعا کو سخت گھن آئی۔ اس نے باپ کی جانب سے منہ تک پھیر لیا۔ اسے بیٹی کی ناگواری کی نہ پرواہ تھی نہ دھیان۔ وہ اپنی ہی الاپتا رہا۔

"میرے ساتھ جانے کا تو فیدہ نہیں بھلا مجھے نئے فیشنوں کا کیا پتہ' ویسے بھی مجھے ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ تو دیر نہ کر۔۔۔ آ تجھے رکشے میں بٹھا دیتا ہوں۔ سیدھی انار کلی جا اور چنگا سا جوڑا لے کر آ۔۔۔ لال سوہے رنگ۔۔۔ یا بسنتی رنگ کا۔"

"ہر باپ کے دل میں بیٹی کو سوہا جوڑا پہنانے کی آرزو ضرور ہوتی ہے مگر اس ڈھنگ سے نہیں۔ ابا جی آخر آپ میرے لیے ویسے باپ کیوں نہیں بن سکتے۔۔۔؟"

"کیا سوچ رہی ہے؟" اسے ہزار ہزار کے تینوں نوٹوں پہ ٹکٹکی باندھے دیکھ کر اللہ وسایا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔" دعا نے اکتاہٹ بھرے انداز میں نوٹ ایک طرف پھینکے۔

"اب کسی کو کیا بتاؤں' کیا سوچ رہی ہوں' کوئی سمجھنے والا ہی نہیں۔"

"لے۔۔۔ میں سمجھ گیا۔۔۔ آخر پیو ہوں تیرا۔" اللہ وسایا کے وثوق بھرے انداز نے دعا کے اندر امید بھرا تجسس جگا دیا۔

"اچھا' پھر بتائیں میں کیا سوچ رہی تھی۔"

"تجھے یہی فکر ہے ناں کہ اکیلی بازار کیسے جائے گی' اتنے بڑے بڑے نوٹ۔۔۔ کہیں گر نہ جائیں' کوئی چرا نہ لے ہے ناں' میری چڑی' اتنے چھوٹے حوصلوں کے ساتھ گزارا نہیں ہونے والا۔ ہمت پیدا کر تو اب دنیا کا سامنا کرنے نکلی ہے' تجھے اپنا خیال آپ رکھنا ہے۔" اس نے خود کو بیٹی کے سر کا سایہ بننے کی ذمہ داری سے بھی آزاد کرا لیا۔ دعا نے ایک طویل ٹھنڈی آہ بھری۔

"تو۔۔۔ اس آخری فرض سے بھی سبکدوش ہوئے ابا جی اب میں اس بات کی توقع بھی نہ رکھوں کہ بھری دنیا میں کوئی ایک شخص میرا محافظ ہے۔۔۔" اس نے درد سے آنکھیں موند لیں۔

کوئی اسے زمین سے اٹھا کر اس کے گرد آلود لباس کو جھاڑ رہا تھا۔

کوئی اس کے آنسوؤں کو مہربان پوروں سے پونچھ رہا تھا۔

کوئی اس کے بکھرے الجھے بالوں کو سہلا کر سنوار رہا تھا۔

کوئی اسے سینے سے لگائے اس کی سسکیوں کو تسلی دے رہا تھا۔

"چھا جی۔۔۔!" اس نے بڑی پیاس سے پکارا' لیکن۔۔۔ لیکن ایک زوردار دھکے کے ساتھ وہ پھر سے دھول میں گری ہوئی تھی' وہ مہربان وجود اب مٹھی بھر بھر کے اس کے بالوں میں خاک ڈال رہا تھا۔ وہ بلک رہی تھی۔۔۔ تڑپ رہی تھی۔۔۔ لیکن وہ ہاتھ رکے۔۔۔ نہ ہی زبان۔

"رہی ناں تو وہی۔۔۔ ایک طبلچی کی بیٹی۔"

"لے' اس میں رونے کی کیا بات' ایک تو بات بات پہ تیرے اتھرو نکل آتے ہیں۔" اللہ وسایا نے اس کو رخ پھیر کے آنسو بہاتے دیکھ لیا تھا۔ دعا نے معاملہ نمٹانے کی غرض سے نوٹ دوبارہ مٹھی میں دبا لیے اور آواز کی

”تم کیا کہتی ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے خیال میں میں کہاں جاتا ہوں؟“
”میرے خیال سے تم جاتے ہی کہاں ہو؟“ موتیا نے بڑی مشکل سے اس برجستہ فقرے کو نوک زبان تک آنے سے روکا۔
”بھئی مجھے بھی تو پتہ چلے کہ میرے اس عزیز دوست کو جو میرے اندر تک اترنے کا دعویٰ ہے‘
”میرے خیال میں تو تم گل مہر کے پیچھے جاتے ہو؟“
”کیا؟۔۔۔ یہ تم سچ کہہ رہی ہو یا مذاق کر رہی ہو؟“
”جو سچ ہے وہی کہا ہے۔ وہ گھر بھی تو تم نکلنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ جس طرح تمہارے ڈیرے ان دونوں اس کے کمرے کے دروازے۔۔۔ یا زبان عاشقی میں کہا جائے تو چوکھٹ پہ ہوتے تھے‘ اسی طرح اب تم اس کے آفس کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہو گے۔“
”چہ‘ چہ۔۔۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہو رہا ہے‘ اس بات پہ نہیں کہ تم میرے بارے میں ایسے خیالات رکھتی ہو‘ اس بات پہ بھی نہیں کہ تم نے مجھ پہ یہ انتہائی بے سروپا الزام عائد کیا ہے بلکہ اس بات پر کہ۔۔۔ میں اب اس پہ کبھی فخر نہیں کر سکتا کہ میرا ایک دوست ایسا ہے جو میرے اندر تک اتر کے سارے راز پالیتا ہے۔ چہ چہ۔۔۔ افسوس صد افسوس۔“
”زور کس پہ ہوا؟ اندر تک اترنے پہ۔“ موتیا رتی برابر شرمندہ نہ ہوئی۔
”یعنی کہ راز پانے کے لیے اندر تک اترنا ضروری ہوتا ہے۔ پہلے تم نے اپنے اندر تک جانے والے رستوں پہ پہرے نہیں بٹھائے ہوئے تھے اب تم خود ہی بند بند رہتے ہو تو میں کیا خاک اندر اتروں۔۔۔ باہر کھڑے ہوؤں کو کیا اندازہ‘ بند کواڑوں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔“ اس کے انداز میں ہلکا سا گلہ بھی تھا ایک اپنائیت بھرا گلہ۔۔۔ ایک جتاتا ہوا سا شکوہ۔
”بتا دوں گا سب بتا دوں گا۔ وقت آنے پہ سب بتا دوں گا اور یہ وعدہ رہا کہ سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گا۔ فی الوقت اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جلد ہی تم میری جانب سے ایک خوش خبری سنو گی۔ عرصے سے خود کو سیٹ کرنے کے لیے جو ہاتھ پیر مار رہا تھا‘ اسی کاوش میں ایک سرا ہاتھ تو لگا ہے اسی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہوں‘ زیادہ وقت نہیں بس چند مہینے اور شاید دو یا تین۔۔۔ پھر میں اپنا کاروبار شروع کرنے والا ہوں۔“
”یہ ہوائی تو تم نے کچھ دن پہلے بھی چھوڑی تھی اور ساری بحث کی تان یہاں آ کے ٹوٹی تھی کہ کاروبار کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔“
”اس کا رستہ بھی نکل آیا ہے‘ اسی تگ و دو کے لیے روزانہ۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
”یا روزانہ؟“ موتیا نے بے تابی سے دریافت کیا۔
”کہیں ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تو نہیں جوائن کر لیا؟“
”ڈاکے دن دیہاڑے نہیں ڈالے جاتے۔“
”ارے تم کیا جانو آج کے ڈاکوؤں کو بہت دیدہ دلیر ہو گئے ہیں۔ تم سے اس دیدہ دلیری اور بے خوفی کی امید کم ہے۔ جو شخص دن دہاڑے ‘محبت کے اظہار سے گھبراتا ہو وہ ڈاکے کیا خاک ڈالے گا۔ چلو تمہاری کم ہمتی نے یہ تو بچایا کہ تم کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہو کے نواب خاندان کی عزت کو بٹہ نہیں لگاؤ گے۔“
”میرے بارے میں تم کیسے کیسے عظیم خیالات رکھتی ہو موتیا‘ قسم سے دوستی کی اس ادا پہ نثار ہونے کو دل چاہ رہا ہے“ عمیص نے گلا دبا دینے والی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا وہ ہنس پڑی۔
”ہاں۔۔۔ اور سنو‘ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔۔۔ ڈاکے تم ڈال نہیں سکتے‘ چوری کی ہمت نہیں‘ قرضہ تمہیں ملا نہیں‘ لے دے کر ایک کام بچتا ہے۔۔۔ کہیں کسی ٹریفک سگنل پہ رکی ہوئی گاڑیوں کے آگے نقلی

کپکپاہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔
”ٹھیک ہے ابا جی‘ آپ جائیں۔“ وہ اس وقت تنہا رہنا چاہتی تھی‘ بالکل تنہا۔۔۔ آج عرصے بعد ان گالیوں کی بازگشت پھر سے پتھروں کے اسے سنگسار کر رہی تھی اور وہ کسی کو اپنا لہولہو وجود دکھانا نہیں چاہتی تھی۔
”سمجھ گیا‘ تجھے ماں یاد آ رہی ہے۔ دھیوں کو ایسے موقعوں پہ اپنی مائیں یاد آتی ہیں۔ لیکن پتری‘ وہ کہاں والی جیتی ہوتی تب بھی میری طرح تیری کوئی مدد نہ کر پاتی۔ اسے تو خود شوق نہیں تھا بننے سنورنے کا۔ اک تو تیری کوئی سہیلی بھی نہیں‘ کڑیوں بالیوں کی دس دس سہیلیاں ہوتی ہیں۔ رل مل کے بازاروں میں جاتی ہیں‘ اک دوجے کی صلاح سے چیزیں خریدتی ہیں۔“
”ابا جی میں نے کہا ناں کوئی مسئلہ نہیں۔ میں چلی جاؤں گی بازار۔“
وہ تنک کے بولی تو اللہ وسایا نے اس کی جان چھوڑی۔

☼ ☼ ☼

”تم آج کل گھر سے کچھ زیادہ ہی غائب رہنے لگے ہو۔“
وہ تیار ہو کر بس نکلنے کو ہی تھا کہ موتیا نے اسے عین موقع پہ آڑے ہاتھوں لیا۔
”یا پھر یہ سمجھا جائے کہ اب گھر میں رکے رہنے کا جواز ختم ہو گیا ہے؟“ اس کے چبھتے ہوئے طنز کی تہ میں اتر کے عمیص مسکرا دیا۔
”مثلاً۔۔۔ مثلاً“ کس قسم کا جواز؟“ اس نے مزید چھیڑا۔
”وہ تم زیادہ بہتر جانتے ہو۔“ موتیا نے شانے اچکائے۔
”یائی دادے‘ اتنا بن سنور کر نکلتے ہو‘ آخر جاتے کہاں ہو؟“
”تم سے تو اللہ ہی بچائے‘ پہلے اس پہ طعنے مار مار کے ادھ موا کر دیا کرتی تھیں کہ پردہ نشین بی بیوں کی طرح گھر میں کیوں پڑا رہتا ہوں اب باہر نکلنے پہ اعتراض ہو رہا ہے۔ نہ صرف خالی خولی‘ روکھا پھیکا اعتراض‘ بلکہ ساتھ میں مشکوک قسم کا الزام بھی عائد کیا جا رہا ہے۔۔۔ یعنی بننے سنورنے کا۔۔۔ بی بی آخر آپ نے ہمیں کیا بناتے اور کیا سنوارتے دیکھ لیا ہے؟“
”آپ کو بال بناتے اور حلیہ سنوارتے دیکھا ہے جو یقیناً“ معمول کے مطابق نہیں اور غیر معمولی باتوں پہ چونکا بھی جاتا ہے‘ کرید ابھی جاتا ہے‘ ساتھ ساتھ حسب توفیق شبہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔“ وہ مزے لیتی ہوئی اس کے بالکل سامنے بیٹھے۔ مسلسل اسے زچ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی لیکن وہ بھی عمیص تھا۔۔۔ صاحبزادہ عمیص علی خان‘ اپنے نام کا ایک۔ بلا کا متحمل مزاج اور دوسروں کی برداشت کے امتحان میں صد فی صد پورا اترنے والا۔
”چلو ٹھیک ہے تم اپنے شکوک و شبہات ایک ایک کر کے بیان کرو‘ میں تسلی بخش طریقے سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔
”سب سے پہلے تو یہ واضح کرو کہ یہ سواری باد بہاری ہر روز کدھر کا رخ کرتی ہے؟“
”کسی ماہ رخ کے گھر کا رخ نہیں کرتی اس لیے بے فکر رہو۔“
”آپ جناب جو ”شیروں کے منہ نہیں دھلا کرتے“ کے مقولے پہ عمل پیرا رہتے تھے آج کل رگڑ رگڑ کے شیو کرنے اور بلا ناغہ غسل فرمانے کے بعد استری شدہ کپڑے پہن کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں جبکہ اس سے پہلے آپ بلا تکلف گھڑے سے نکلے کپڑے بھی زیب تن کر لیا کرتے تھے۔“
”میرا گھڑا ٹوٹ گیا ہے۔“ اس کے جواب پہ موتیا خود زچ ہو گئی۔
”ٹالو مت‘ مجھے صاف صاف بتاؤ چکر کیا ہے؟“

ایکسرے اور میڈیکل رپورٹس دکھا کے امداد تو طلب نہیں کرتے "کہ بھائی صاحب' چھ جوان بہنیں ہیں' والد نابینا ہے۔ پڑھا لکھا نوجوان ہوں لیکن کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا' علاج کے لیے رقم نہیں' اللہ کے نام پہ مدد فرما کے ثواب......"

"اب تو میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔" وہ سچ مچ ناراض ہو کر اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"قسم خدا کی' ایسے موقعوں پہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ کاش اور کچھ مانگ لیا ہوتا اس قبولیت کی گھڑی میں... مگر ہم یہ ہرگز نہیں کہیں گے۔"

بابر ہمایوں مغل نے ایک دم اس کے سامنے آتے ہوئے نثار ہو جانے والے لہجے میں کہا۔

"ہم نے تو یہی مانگا تھا کہ آپ سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے اور وہ ہو گئی' اگر دوبارہ یہ قبولیت کی گھڑی ہماری زندگی میں آئی تب بھی ہم یہی مانگیں گے' بار بار مانگیں گے... ہر بار مانگیں گے۔"

وہ بڑے دلیرانہ انداز میں ایسی سرگوشیاں کر رہا تھا کہ اگر ادا بالکل اس کے نزدیک نہ کھڑی ہوتی تو ہرگز نہ سن پاتی۔ وہ راہداری کا موڑ مڑ رہی تھی جب بابر اچانک اس کے مقابل آ گیا اور آڈیٹوریم کی اس تنگ' خنک اور سنسان راہداری کی دیوار پہ اپنا بازو جما کے اس کا آگے جانے کا راستہ تقریباً" بند کر دیا۔ گھبراہٹ میں وہ چند قدم پیچھے تک ہٹنا بھول گئی۔ اس پہ مستزاد... بابر کے ڈائیلاگز اور عاشقانہ نگاہیں اسے بوکھلائے دے رہی تھیں۔

"کوئی اس سے دلکش نظارہ لا کر دکھائے تو ہم مانیں... کہ اللہ سے مانگنے کے لیے اور بھی کچھ رکھا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں ایسا ہوگا نہیں۔ سب ہیچ ہے' سب ہیچ ہے ان قاتل نگاہوں' گلاب رخساروں اور کونپل سے لبوں کے سامنے۔"

ادا سٹپٹا کے نگاہیں جھکا کے رہ گئی۔

"اس پہ حیا کے یہ سات دھنک رنگ... واللہ ہم تو بن مول بک گئے ادا جی' بابر ہمایوں مغل کو آپ نے لوٹ لیا ہے۔" اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اس کے کھڑے قدموں گر جانے کا پورا پورا سامان پیدا کر دیا۔

"بڑے عرصے بعد آپ کو موڈ میں دیکھا ہے نواب صاحب۔"

ادا اپنا خشک ہوتا حلق تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس بے باک عاشق کو راستہ چھوڑنے کا کہنے کی ہمت مجتمع کر رہی تھی جب ایک لوچ دار آواز پہ وہ خود ہی جھٹکے کے ساتھ پلٹا۔ ادا نے اس کی پشت پہ ایک جواں سال بنی سنوری لڑکی کو معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھا۔

"نگاہ تم؟" اس کی زبان ذرا سی لڑکھڑائی جیسے وہ اس وقت اس کی آمد سے خائف ہو گیا ہو۔

"جہاں جہاں آپ کی نگاہ اٹھے گی سرکار' نگاہ کو رستے میں پائیں گے۔" اس نے ناز سے اپنے بھاری گلوبند پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ادا کی نگاہیں اس کی اس حرکت پہ گلوبند سے ہوتی ذرا نیچے کی جانب پھسلیں تو وہ لاحول پڑھ کے رہ گئی۔ غالباً" اس دانستہ یا نادانستہ حرکت کا مقصد دوسروں کی توجہ اس جانب لانا ہی تھا۔ ڈارک میرون جھلمل ساڑھی کمر سے خاصی نیچے باندھ گئی تھی اور اسی رنگ کا مخملیں بلاؤز جو قابل اعتراض حد تک مختصر گریبان والا تھا' موزوں و متناسب کمر کی ساری خوب صورتی واضح کر رہا تھا۔ اس کی کمر کا لوچ اور بناوٹ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ خاصی منجھی ہوئی رقاصہ ہوگی اور بے باکانہ انداز و ادائیں اس کا تجربہ کار ہونا بھی بیان کر رہے تھے۔ جو بھی تھا... اپنے لباس' انداز اور گفتگو کے لحاظ سے وہ کتنی ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو' اس وقت اس کی آمد ادا کو امداد غیبی سے کم نہ لگی۔ بابر کو پلٹ کے اس کی طرف متوجہ ہوتے پا کر وہ ترچھی ہو کے اس تنگ راہداری کا موڑ مڑ گئی جو میک اپ روم کی طرف جاتا تھا اور جہاں بیٹھ کے اسے اپنی باری کا انتظار کرنا تھا۔ نگاہ نامی یہ رقاصہ بھی اسی جانب سے نمودار ہوئی تھی۔

میک اپ روم میں پہلے سے دو گلوکارائیں اور تین رقاصائیں موجود تھیں۔ اسٹیج پہ اس وقت ایک لوک فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا' اس کے بعد مونا نامی ڈانسر کا آئٹم تھا' وہ کلاسیکی رقص کا مظاہرہ کرنے والی تھی۔ تیسرے نمبر پہ پچھلی دو دہائیوں سے ٹی وی اسٹیج اور فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگانے والی گلوکارہ شمع نے آنا تھا۔ ادھیڑ عمر اور ڈھلکے بدن والی شمع بیگم اس وقت پان اور سگریٹ سے دل بہلا رہی تھی۔ اتنے عرصے سے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اس کا زیادہ نام تھا نہ ڈیمانڈ حالانکہ ٹھیک ٹھاک گا لیتی تھی۔ دراصل جوانی میں بھی بے چاری کے پاس گزارے لائق شکل تھی اور سراپا تو خیر ان دنوں بھی انتہا سے زیادہ بے ڈھب اور بے ڈول... خالی خولی آواز کے سہارے وہ کتنے شو لوٹ سکتی تھی۔ برائے نام جوانی نے بھی سالوں ہوئے... ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بدن اور پھیل گیا' چہرہ مزید بے کشش ہو گیا' آواز البتہ اب تک بیٹ دار تھی۔ اکثر پروگرامز میں پرانے اور مقبول فلمی گیت گانے کے لیے اسے بھرتی کیا جاتا۔ مونا اپنا مخصوص کلاسیکل ڈریس پہنے' بھاری زیورات اور بے تحاشا میک اپ کے ساتھ بالکل تیار اپنے پیروں میں بندھے گھنگھرو سہلا رہی تھی۔ چونکہ اگلا آئٹم اس کا تھا اس لیے وہ ذہنی طور پہ ابھی سے خود کو اسٹیج پہ محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میک اپ روم کے ماحول سے بالکل الگ تھلگ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی واحد مہارت بھی رقص پہ مکمل عبور تھا اور وہ بھی کلاسیکل کتھک رقص' جواب شاذ و نادر ہی پیش کیا جاتا تھا۔ گہری سیاہ رنگت' نامعلوم سی حدود والی بے کشش آنکھیں اور موٹے ہونٹوں کی اوٹ سے جھانکتے بدوضع پیلے دانت... کسی کو نظر نہ آتے جب اس کے برق سے پیر طبلے کی تھاپ سے تھرکتے اور اس کا پھرکی سا وجود پتنگ کی طرح لہراتا۔

شمع بیگم کے بعد ریتا اور ٹینا کا آئٹم تھا۔ وہ دونوں بہنیں تقریباً" ایک سی شکل و صورت اور بالکل ایک سے سراپے کے ساتھ ایک جیسا ہی ڈانس اکٹھے پیش کیا کرتیں۔ لباس بھی ایک سا ہوتا۔ ڈانس کے دوران دونوں کا ہر انداز' ہر قدم' ہر ادا ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہوتا۔ جدید طرز کے رقص پہ تو انہیں مہارت تھی ہی مگر دونوں کا ایک ساتھ ایک ہی جیسا مظاہرہ کرنا مجمع کو لوٹ لیتا۔ وہ دونوں اس وقت آئینے کے سامنے ایک دوسرے کی نوک پلک مزید سنوارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے بعد ادا کی باری تھی۔ ایک گانا اور ایک رقص... یہی اس شو کا فارمیٹ تھا۔ ادا کے بعد نگاہ کا مشہور آئٹم تھا۔ وہ فلموں میں بھی رقص کے مظاہرے کر چکی تھی اور آج وہ اسٹیج پہ اپنے ایک مشہور فلمی گیت کو ہو بہو اس ڈھنگ سے پیش کرنے والی تھی جیسا کہ اس نے فلمایا تھا مگر سنسر کی قینچی سے وہ پردہ سیمیں پہ الگ انداز میں پیش ہوا۔ آخر میں مشہور فلمی گلوکارہ کی باری تھی جو اب تک نہ آئی تھی اور جس کے نام پہ اس شو کا نام رکھا گیا تھا۔

ادا خاموشی سے ایک جانب بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی ٹینا اور ریتا نے تو پلٹ کر اس کی جانب نہ دیکھا' مونا البتہ خیر سگالی کے طور پہ مسکرا کے پھر سے اپنے مراقبے میں چلی گئی۔ شمع بیگم سگریٹ کے کش لیتے ہوئے گاہے بگاہے ایک کڑوی سی نظر ضرور اس پہ ڈال لیتی۔ حالانکہ ادا نے خاص طور پہ اس کا سینئر ہونے کا احترام کرتے ہوئے قریب آ کے سلام کیا تھا مگر بے رغبتی سے فقط سر ہلا کے جواب ملنے اور رقیبانہ نظروں سے خائف ہونے کے بعد وہ خود ہی فاصلے پہ بیٹھنے پہ مجبور ہو گئی۔ اس کی چبھتی ہوئی نظریں خود پہ محسوس کر کے وہ الجھن محسوس کر رہی تھی۔

مونا اپنی باری پہ گھنگھرو چھنکاتی میک اپ روم سے اسٹیج کی بیک سائیڈ پہ جانے والے دروازے کی طرف نکلی تو اسی وقت میک اپ روم کا دروازہ کھول کے نگاہ اندر آئی۔ ادا کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی وہ سیدھی اس کے قریب آئی۔

"ہوں... ادا... اچھا نام ہے' تم پہ سوٹ البتہ نہیں کرتا۔ ادا کس چڑیا کو کہتے ہیں' کچھ پتہ بھی ہے؟" وہ خود ہی قہقہہ مار کے ہنس پڑی۔ ادا اس بے تکی بات پہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

"ایسے قاتل لب ہیں' مسکراتی مقتولوں کی طرح ہو۔" وہ پھر سے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسی۔ ادا کے لب خجل ہو کر سمٹ گئے۔

"کس کی تربیت ہے' میرا مطلب ہے کس سے ٹریننگ لی ہے کوئی بڑا ماٹھا استاد ہوگا جو اس نے سارے داؤ پیچ سکھا کے میدان میں نہیں اتارا۔"

"نہیں' میرے استاد جی تو بہت جانے مانے ماسٹر ہیں مجھ سے ہی سیکھنے میں کوتاہی ہو گئی ہوگی۔" اس سے اپنے محترمہ استاد کی شان میں گستاخی برداشت نہ ہوئی۔

"ماسٹر عنایت اللہ دکنی سے پورے نو سال تک سر سیکھے ہیں میں نے۔"

نگاہ کے بے ڈھنگے قہقہے پھر سے ابل پڑے۔ وہ حیرت سے اسے حلق پھاڑتے دیکھتی رہی۔

"ماسٹر عنایت اللہ دکنی۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔" اس نے مشکل سے ہنسی پہ قابو پایا۔

"ٹھیک کہتی ہو' بہت قابل اور نامی گرامی استاد ہیں مگر اس تعلیم کی نہیں دوسری والی کی بات کر رہی ہوں۔ کیا ماں نے کوئی آنٹی نہیں رکھوا کے دی ٹریننگ کے لیے؟"

وہ اس کے سوال کی گہرائی میں اترے بغیر صرف ماں کے نام پہ ہی افسردہ ہو گئی۔

"میری امی کی وفات بہت پہلے ہو گئی تھی' میرے بچپن میں۔"

"وہ۔۔۔ تبھی۔۔۔ یعنی خاص توجہ نہیں ملی تمہیں۔۔۔ اسی لیے ہتھیاروں سے انجان ہو۔ حالانکہ اس میدان میں اترنے کے لیے پوری طرح مسلح ہونا پڑتا ہے تاکہ ہر طرح کے دشمن کا ہر طرح کا وار روکا جا سکے۔ ابھی تمہیں باہر دیکھا تھا میں نے۔۔۔ کس طرح پر کٹی کبوتری کی طرح آنکھیں بند کیے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔" وہ مزے لیتے ہوئے پھر سے ہنسنے کی تیاری کرنے لگی۔

"اچھا تو ماں کے بعد کوئی تو سیانی ہوگی ڈیرے پہ۔۔۔ ویسے تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟ شاید میں نے سن رکھا ہو۔"

"زبیدہ۔۔۔ زبیدہ خاتون۔"

"یہ نام تو۔۔۔" وہ مایوسی سے سر ہلانے لگی۔

"کیا کرتی تھی' میرا مطلب ہے مجرے کرتی تھی یا تیری طرح صرف گا کر گزارا کرتی تھی؟" وہ پوری پوری چھان بین کرنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ ادا اس سوال پہ کرنٹ کھا کے اچھلی۔ اب تک تحمل اور نرمی سے جواب دیتے دیتے وہ اچانک بپھر گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میری امی ایسی نہیں تھیں۔ وہ۔۔۔ وہ تو۔" شدت جذبات سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

"وہ ایسا کچھ نہیں کرتی تھیں۔ گھریلو' پردہ دار عورت تھیں۔۔۔ وہ تو محلے کے بچوں کو سیپارے بھی پڑھاتی تھیں۔"

نگاہ چپ کر گئی۔ چند ثانیے کے بعد اس کی آواز آئی۔

"وہ تو تم خاندانی نہیں ہو۔۔۔ شوقیہ بھی نہیں لگتیں کیونکہ کسی شوق کا رنگ تمہارے چہرے پہ نہیں ہے۔ یعنی یہ نام بھی اصل نہیں۔۔۔ تبھی میں کہوں نام کا اثر شخصیت پہ کیوں نہیں۔ اصل نام کیا ہے تمہارا؟"

"دوعا۔۔۔" بے ساختہ کہہ دینے کے بعد وہ چونکی پھر تصحیح کی۔

"دعا' دعا نور۔"

نگاہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ عجیب انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں کسی کی دعا نہیں لگی؟ کیسے پہنچیں تم یہاں تک؟ گھر سے بھاگی تھیں؟ کسی عاشق نے دھوکا دے کر ساتھ چھوڑ دیا؟ یا کوئی زبردستی اٹھا لایا؟"

ادا نے شرمندہ انداز میں سر جھکا لیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں میں اپنی مرضی سے یہاں ہوں۔ مجھے گلوکارہ بننے کا شوق تھا۔ اسی لیے ابا جی نے ماسٹر جی کی شاگردی میں رکھوا دیا۔"

"شوق۔۔۔ ابا جی؟" اس نے زیر لب دہرایا اور پھر جیسے سب سمجھ گئی۔ اس کے پردہ ڈالنے پہ بھی سب بھانپ

گئی۔ وہ سر ہلا ہلا کر کہنے لگی۔

"ہاں۔۔۔ مٹی ہے۔۔۔ بالکل مٹی۔۔۔ ہوتے ہیں ایسے ابا جی بھی بیٹیوں کے شوق کی خاطر سب کر گزرنے والے۔۔۔ پتہ ہے میرے ابا جی بھی ایسے تھے۔۔۔ بس وہ ابا جی نہیں تھے' بابا تھے میرے جانتی ہو میرا نام کیا ہے نگاہ؟ نہیں یہ تو بہت بعد میں۔ میری ماں نے میرا نام بڑے ارمانوں سے رکھا تھا۔ جیسے تمہاری ماں نے ہزار دعاؤں کے حصار میں لے کر تمہیں دعا نور کا نام دیا تھا ویسے ہی میری بیمار ماں نے میرا نام پاک بی بی رکھا تھا۔" اس کی آواز کپکپا گئی۔

"کہتے ہیں روز قیامت انسان کو اس کے پیدائشی نام سے پکارا جائے گا اور وہ بھی ماں کے نام کے ساتھ۔ ڈرتی ہوں میری ماں کے نام کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ میرے نام کے ساتھ لگ کے۔۔۔ اور بھلا مجھے میرے پیدائشی نام کے ساتھ کیسے پکارا جا سکتا ہے۔ اللہ تو جانتا ہے میں اب پاک بی بی نہیں رہی۔ ویسے تو میں نے دعائیں مانگنی چھوڑ دی ہیں۔ اگر کبھی اللہ کے آگے ہاتھ اٹھاتی بھی ہوں تو صرف یہ مانگنے کے لیے کہ روز محشر مجھے ماں کا سامنا نہ کرانا' وہ بڑی نیک عورت تھی' اس کی نیکی کا اجر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے اس کی بیٹی کے کرتوتوں سے لاعلم رکھا جائے۔"

وہ بلند د بانگ قہقہے لگانے والی اب زار زار رو رہی تھی۔ اس کا لچکیلا بدن ہچکیوں کے ساتھ لرز رہا تھا۔ اس کا سارا میک اپ پھیل گیا تھا۔ ادا نے پریشان ہوتے ہوئے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ اپنا رومال اس کی جانب بڑھایا مگر وہ جیسے اس وقت یہاں موجود نہیں تھی۔۔۔ ابھی سے روز محشر میں تھی۔

"یہ تم کہاں پھنس گئی ہو؟ ادا تمہارا ہی نام ہے ناں؟" ریتا نے اچانک اس کے سر پہ کھڑے ہو کے اس سے پوچھا۔ وہ چونک کے سر ہلانے لگی۔

"ہاں' کیوں؟"

"کیوں۔۔۔؟ واہ۔۔۔ بھنگ پی کے بیٹھی ہو باہر تمہارا نام اناؤنس ہونے والا ہے۔ میں اور ٹینا ابھی آئٹم کر کے لوٹے ہیں۔"

وہ ہڑبڑا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب مونا کی باری ختم ہوئی' کب شمع بیگم گئی' کب واپس آئی اور کب ریتا ٹینا کی باری بھی تمام ہوئی۔

"پہلے شکل تو ٹھیک کر لو' بارہ بج رہے ہیں۔ لگتا ہے اس نگاہ نے تجھے بھی دو گھونٹ پلا دیے ہیں۔ اس کی تو عادت ہے' پوری بوتل چڑھا کے اسٹیج پہ آتی ہے۔" اس نے ابھی تک ہچکیاں لے کر روتی ہوئی نگاہ کو دیکھ کر کہا۔

"کہتی ہے ہوش میں ناچ ہی نہیں سکتی ہوں۔" ٹینا نے لقمہ دیا۔ وہ دوستانہ انداز میں ادا کے بال اور دوپٹہ سنوار رہی تھی۔ اسٹیج سے کمپیئر کی آواز آ رہی تھی جو ابھی تک ایک گھسا پٹا لطیفہ سنا رہا تھا۔

"لیکن آج کچھ زیادہ ہی ڈوز چڑھ گئی ہے۔ پتہ نہیں اس حالت میں اسٹیج پہ جا سکے گی یا نہیں۔ چل اس کو چھوڑ' جانے دے اسٹیج پہ' پہلے اس شدائن کو ہوش میں لانے کی فکر کر۔"

بڑی مشکل سے خود پہ قابو پاتے ہوئے وہ اسٹیج تک گئی۔ آج کے لیے اس نے ایک شوخ گانے پہ تیاری کی تھی اب اس موڈ کے ساتھ اس شوخ رومانٹک گانے کے تقاضے پورے کرنا اس کو اپنے بس سے باہر لگ رہا تھا۔ حالانکہ نگاہ سے اس کا کوئی تعلق تھا نہ واسطہ۔۔۔ یہ ان کی پہلی باضابطہ ملاقات تھی اس کے باوجود جس طرح وہ اس کھلی اپنی انتہائی ذاتی زندگی کے کچھ اوراق اس پہ کھول گئی اور جس طرح اس کے سامنے اپنی ماں کے غم میں بلک بلک کے رو دی' اس نے ادا کے دل پہ بہت اثر کیا۔ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی' بہت سے سوال کرنا چاہتی تھی' جاننا چاہتی تھی کہ اپنی ماں کی پاک بی بی' لاکھوں مردوں کی منظور نظر نگاہ کیسے بنی۔ مگر اس کا موقع نہ مل سکا۔ پتہ ہی نہ چلا اور اس کے اسٹیج تک جانے کا وقت آ گیا۔ اس موقع پہ ماسٹر عنایت اللہ دکنی کا وہ سبق بھرپور طریقے سے کام آیا کہ کس طرح موسیقی کو اپنے اندر سے ہم آہنگ کر کے نئے سر بکھیرے جا سکتے ہیں۔ اپنے بجھتے ہوئے موڈ کو اس نے اسی ہنر کی مدد سے نکھارا اور اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کرتی ہوئی لوٹی تو ٹینا' ریتا کی کاوشوں کی

...ت نگاہ اب اپنے حواسوں میں تھی۔

ادا نے نوٹ کیا کہ وہ اس کی جانب دیکھنے سے بھی کترا رہی تھی۔ خود اس نے بھی دوبارہ اسے مخاطب کرنا ...اسب نہ جانا کہ کہیں وہ پھر سے بکھر نہ جائے۔ ویسے بھی اب اس کی انٹری کا وقت تھا۔ اپنا کام ختم کرکے وہ میک ...پ روم کے حبس زدہ ماحول سے نکلی اور اباجی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ بیک اسٹیج کی یہ جگہ ...یک دم سنسان تھی۔ میک اپ روم میں چند آرٹسٹ تھے یا پھر ملک مقبول کے آفس میں اسٹاف کے اکا دکا ارکان ...باہر کی طرف نکلنے والے راستوں کی جانب مڑتی یہ نیم تاریک خنک راہداری پھر سے اس کا امتحان لے رہی تھی۔

...بر ہمایوں مغل ایک دم سے دوبارہ نمودار ہو گیا۔

"آپ تو مسلسل ہمیں چونکائے دے رہی ہیں ادا خانم۔"

اس نے گلاب کی ادھ کھلی کلی اس کی جانب بڑھائی۔ وہ تذبذب کے عالم میں دیکھتی رہی۔ اسٹیج پہ گلوکاری کے مظاہرے کے دوران بہت سے منچلے تماشائی ناچتے ہوئے اوپر چڑھ آئے تھے اور پانچ سو، ہزار کے نوٹ اس پہ وارتے ہوئے پھینکے تھے۔ اسے اس حرکت سے سخت گھن آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے فن کی داد نہ دی گئی ہو بلکہ اس پہ تیزاب میں بھیگے کاغذ اچھالے گئے ہوں۔ اس کے برعکس بابر کرنسی نوٹوں کی بجائے ایک مہکتی ہوئی گداز و لطیف کلی سے اسے خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ اس کی بابر کے متعلق ناگواری قدرے کم ہوئی۔

"اس روز آپ غزل سرا ہوئیں تو لگا غزل تو بنی آپ کے لیے ہے، آپ کے جادو سر گلے سے ابھرنے کے لیے اور یہ جو آپ نے آج بہار کا گیت گایا ہے تو واللہ ہمیں ایسے لگا ہے جیسے بہار ابھی۔۔۔ اسی وقت آئی ہو، صرف آپ کی آواز میں یہ گیت سننے کے لئے یہ ہماری جانب سے یہ ہدیہ قبول فرمائیے اس کلی کی قسمت جاگ جائے گی۔۔۔ یہ گلاب اپنے اصل مقام پہ ہی جچے گا۔" کچھ **جھجکتے** ہوئے بالآخر اس نے ہاتھ آگے بڑھا لیا۔

"شکریہ۔"

"آپ کے لب کھلتے ہیں تو صرف سر بکھرتے ہیں۔ آپ کی آواز سے زیادہ سحر انگیز آواز بابر ہمایوں مغل نے آج تک نہیں سنی۔"

"شکریہ۔" وہ اس لفظ کے دہرانے کے سوا اور کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کی متلاشی نظروں میں اور بے چینی آگئی۔ اسٹیج سے اترتے ہوئے اس نے پلٹ کے دیکھا تھا۔ پردے کرنے کے دوران ہی اباجی ندیدے پن سے اسٹیج پہ بکھرے نوٹ سمیٹنے بے تابی سے چڑھ آئے تھے اور اس کے اندازے کے مطابق اب تک انہیں اسے لینے کے لیے آجانا چاہیے تھا۔

"آپ سے ملاقات کے لیے کیا اپنی دعاؤں پہ ہی انحصار کرنا پڑے گا۔۔۔ کیا صرف قبولیت کی گھڑی کا ہی انتظار کرنا پڑے گا، اس رخ روشن کا دیدار کرنے کے لیے۔"

اس کی تعریف و توصیف کا انداز حد سے زیادہ دلکش اور مرصع سہی، بیان خاصا لچھے دار سہی مگر مسلسل ایک ہی بات کی تکرار سے ادا کا دل الجھنے لگا۔ وہ زچ ہو گئی۔

"مجھے اجازت دیجئے۔" اس نے آگے بڑھنے کا قصد کیا تاکہ وہ خود ہی ایک جانب ہو کے راستہ چھوڑ دے مگر ...ت قدمی۔۔۔ یا دوسرے لفظوں میں ڈھٹائی اس پہ ختم تھی۔

"اجازت تو آپ ہمیں دیجئے کہ ہم کبھی کبھار اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے آپ کے در پہ حاضری دے دیا کریں۔"

"میرے گھر کے دروازے شارع عام نہیں کہ جس کا دل چاہے اٹھ کے آجائے۔" وہ سختی سے کہتی ہوئی اس انداز میں آگے بڑھی کہ بابر کو لگا اب بھی وہ پیچھے نہ ہٹا تو شاید وہ اسے روندتی ہوئی آگے گزر جائے۔ اس لیے مجبوراً وہ ہٹ گیا اور دور تک ادا کو تیزی سے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کے خبیث چہرے پہ سجی عیار مسکراہٹ مزید گہری ہوتی گئی۔

"شارع عام پہ چلنا تو ہمارا شیوہ بھی نہیں ہے ادا خانم جس در پہ ہم دستک دیں وہ صرف ہمارے لیے مخصوص ہو جاتا ہے، صرف ہمارے لیے۔"

☆ ☆ ☆

"امید ہے اب تک آپ اپنے کام کے متعلق تفصیلی اور ضروری نوعیت کی معلومات سے آگاہ ہو چکی ہوں گی۔ کل پہلی ریل ایڈیٹنگ کے لیے، میرے پاس آئے گی اور کل سے ہی ہمارا پہلا کام باقاعدہ طور سے شروع ہو گا۔ آپ کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتی ہیں۔" شہزاد نے اسے فرسٹ ایپی سوڈ کی شوٹنگ کے بارے میں چیدہ چیدہ باتیں بتانے کے بعد کہا۔

"نہیں سر، اب پوچھنے کا نہیں کرنے کا وقت ہے۔ آپ کے ساتھ کام کر کے اندازہ ہوا کہ کام جاننا اتنا اہم نہیں جتنا اسے کرنے کا سلیقہ اہم ہے۔ آپ درست کہتے ہیں اس پروفیشن میں اکیڈمک ریکارڈ اور ڈگری ہولڈرز سے زیادہ ہارڈ ورک اور لگن پہ ایمان رکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ آپ نے چند ہی دنوں میں ہمیں یہ سکھا دیا ہے کہ علم کو کم سے کم وقت میں۔ بہتر سے بہترین طریقے سے کس طرح اور کہاں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ جاب کرنا ہماری ضرورت تھی، فنانشلی نہیں بلکہ اموشنلی۔ کیونکہ ہم میں آگے بڑھنے خود کو ثابت کرنے کی دھن سوار تھی۔ ہم بس کسی نہ کسی طرح پروفیشنل لائف میں آنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بتایا ہے کہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کا تو درکنار مردوں تک کا ملازمت اختیار کرنے کا رجحان نہیں ہے اس لیے انکل کی یہ تجویز کردہ جاب ہم نے مصلحتاً اس لیے قبول کر لی کہ کم از کم اس بہانے ہمیں کچھ تجربہ تو گین کرنے کا موقع ملے گا ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم خود اس کام سے مطمئن نہ تھے۔"

وہ سچائی بیان کرتے ہوئے شرمندہ سے انداز میں مسکرائی۔ شہزاد سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ہماری سوسائٹی میں اس پروفیشن کو زیادہ باعزت طور پہ نہیں لیا جاتا خصوصاً اس سے وابستہ افراد۔۔۔ اب چاہے وہ کسی بھی انداز میں اس سے وابستہ ہوں، گانے بجانے یا لکھنے لکھانے کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پہ دیگر شعراء کے مقابلے میں فلمی شاعروں کو کم۔۔۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر اہمیت دی جاتی ہے۔ فلمی مصنفین کو ان کی قلمی خدمات کے جواب میں مصنف یا ادیب ہونے کا مقام نہیں ملتا۔ اس لیے پہلی ہی آپ کے اتنے بڑے ادارے میں جاب ملنے کی کامیابی پہ ہم خوش ضرور تھے لیکن اپنے کام کے حوالے سے زیادہ پر امید نہیں تھے۔ ہمارا نہیں خیال تھا کہ ہمیں اپنے ایجوکیشن اور کوالیفکیشن سے کوئی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔"

"اب ہمارے رائے یکسر بدل گئی ہے۔ یہاں ہر کام بہت پروفیشنل اپروچ اور سسٹم کے تحت ہوتا ہے جس کے لیے آپ کا رول قابل تعریف ہے۔ آپ نے درست کہا تھا، آپ کے لیے یہ آپ کا بزنس ہے، ناٹ اونلی شو بزنس۔ اب ہم واقعی مطمئن ہیں کہ ہم نے آگے بڑھنے اور اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے بالکل صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے۔ ان فیکٹ ہمیں تو ایڈیٹنگ اور گرافکس کے ذریعے اپنی کمپیوٹر نالج سے نت نئے کام لیتے ہوئے مزہ آرہا ہے۔"

"ویٹ از۔" شہزاد نے اطمینان سے پیپر ویٹ گھماتے ہوئے ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگائی۔

"یہی میں چاہتا ہوں کہ یہاں کام کرنے والے ہر شخص کو اپنے کام میں مزہ آئے۔ اسے نائن ٹو فائیو والی روٹین جاب کی طرح ایک ٹینشن کے طور پہ سر پہ سوار نہ کیا جائے بلکہ ہر ورکر خود اپنے کام سے لطف اٹھائے اور اس لطف۔۔۔ اس **سیٹسفیکشن** کو بڑھاتے رہنے کے لیے اپنے کام کرنے کی اسپرٹ کو بھی بڑھاتا جائے۔ ابھی تو جب آپ باقاعدہ کام کرنا شروع کریں گی تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ہماری نہ صرف اپروچ مختلف ہے بلکہ رزلٹ بھی ہم مارکیٹ سے بالکل الگ اور بہتر پیش کرتے ہیں ورنہ درجنوں چینلز والے اس دور میں پرائیویٹ پروڈکشنز کی بھرمار میں خود کو نمایاں اور کامیاب رکھنا آسان بات نہیں۔ آپ نے بھی فرق محسوس تو کیا ہو گا، ہماری پروڈکشن کا

معیار دیگر پروگرامز کے مقابلے میں کتنا بہتر ہوتا ہے اور یہ سب ٹیم ورک کا نتیجہ ہے' رائٹر اور ایکٹرز ہماری پروڈکشنز میں بھی وہی ہوتے ہیں جو دیگر پروڈیوسرز ہائر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارے ٹیکنیشن ہائی کوالیفائڈ ہوتے ہیں۔"

"جی' ضرور ہوتا ہوگا فرق ہم اس بارے میں زیادہ دعویٰ اس لیے نہیں کرسکتے کہ ہمیں اب تک ٹی وی دیکھنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا۔ یوں کہیے کہ اتنا غور کرنے کا موقع نہیں ملا کہ کس پروڈیوسر کا کیا مقام ہے' کس پروگرام کا معیار بہتر ہے۔ ایک تو ہم ابتدا ہی سے اپنی تعلیم کے سلسلے میں خاصے سیریس رہے' دیگر ایکٹی ویٹیز کی جانب دھیان ہی نہیں گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول بھی ہمیں اس جانب راغب ہونے سے روکتا رہا۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ آج کے دور میں جب جھونپڑیوں اور کچی آبادیوں تک میں ڈش اینٹینا لگے ہیں' ہمارے گھر میں اب تک کیبل کنکشن نہیں آیا۔"

"ویری انٹرسٹنگ' آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟"

"ہمارا تعلق لکھنؤ کے نواب گھرانے سے ہے۔ ہمارے پردادا والیٔ لکھنؤ تھے۔ ہجرت کے بعد یہاں ہمارے دادا نے قیام کیا۔ ہمارے والد کا واحد مشغلہ نوابی ہے یا پھر زمینوں' باغات اور جاگیروں وغیرہ کی دیکھ بھال کرنا۔"

شہزاد نے مرعوبیت سے سر ہلا دیا۔ وہ ان جاگیروں کی تفصیل میں نہ گیا جو ایک لحاظ سے گل مہر کے حق میں بہتر تھا۔ ورنہ ساری زمینداری کا بھانڈہ پھوٹ جاتا۔ گنتی کے دو تین باغات اور چند ایکٹر زمین کو وہ کمال تکبر سے جاگیروں کا نام دے رہی تھی۔

"او کے مس گل مہر' میں امید کرتا ہوں کل ہمارے کام کی ابتدا حسب توقع شاندار طریقے سے ہوگی۔" اس نے اجازت دینے والے انداز میں کہا کیونکہ اس گفتگو کے دوران وہ کئی بار اسے رسٹ واچ کی جانب بے چینی سے دیکھتے پا چکا تھا۔

"انشاء اللہ سر۔۔۔ اینڈ تھینک یو" وہ فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی مخصوص باوقار چال کے ساتھ آفس سے نکل گئی۔ شہزاد کی پرسوچ نگاہیں دیر تک بند دروازے پہ ٹکی رہیں۔

"کیا ہے اس لڑکی میں جو اسے سب سے ممتاز ظاہر کرتا ہے' سب سے الگ سب سے منفرد بتاتا ہے۔۔۔ کیا اس کا حسن۔۔۔؟ جو یقیناً" مسحور کن ہے مگر ایسا غیر معمولی بھی نہیں۔ حسن میرے لیے کبھی غیر معمولی چیز نہیں رہا۔ اس کی ذہانت؟۔۔۔ ہاں ہو سکتا ہے مگر یہ اسے منفرد تو ظاہر کرسکتی ہے مجھے اس سے مرعوب نہیں کرسکتی۔ ذہانت ایسی چیز ہے جس سے میں متاثر تو ہو سکتا ہوں مگر مرعوب نہیں اور نہ ہی حسد محسوس کر سکتا ہوں کیونکہ مرعوبیت یا حسد اس چیز سے محسوس ہوتا ہے جو آپ کے پاس نہ ہو اور میرے پاس۔۔۔ ہاں شاید میرے پاس وہ خود اعتمادی نہیں جو اس لڑکی کے ہر انداز سے چھلکتی ہے اور جسے محسوس کر کے مجھے اپنا آپ اس کے آگے چھوٹا لگنے لگتا ہے۔

ہاں بس یہ ایک چیز ہے جسے میں لاکھ جدوجہد کے بعد بھی حاصل نہیں کرپایا۔ یہ وہ دولت ہے جو میں دن رات کی محنت کے بعد بھی نہیں کما سکتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تک میں شاید کبھی نہ پہنچ پاؤں۔۔۔ اسے حاصل کرنے میں میری دولت' میرا بزنس اسٹیٹس' میرا بینک بیلنس' میری شہرت' میرے تعلقات کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ خود اعتمادی کی یہ نعمت نہ دولت و شہرت کی عطا کردہ ہے نہ ہی ذہانت کی مرہون منت ہے۔ یہ تو عطیہ خداوندی ہے۔ جو خدا اپنے ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے جو اپنے ہونے پہ شرمندہ نہ ہوں۔ وہ جس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس کا حوالہ ہی اس کا سر اونچا رکھنے کے لیے کافی ہے۔ کاش ایسا ہی کوئی حوالہ میرے نصیب میں بھی ہوتا۔"

اس نے حسرت سے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"اس شخص بابر مغل سے ذرا بچ کے رہنا۔ ہے تو ذات کا مغل اور خود کو بڑا رئیس بھی ظاہر کرتا ہے لیکن اصل

میں سات طوائفیں مری ہوں گی تو اس ایک کا خمیر اٹھا ہوگا۔" نگاہ نے نفرت سے گالی دیتے ہوئے ادا کو خبردار کیا۔

یہ ان کی دوسری ملاقات تھی جو اتفاقیہ ہرگز نہیں تھی۔ ادا اپنی باقی کی پے منٹ لینے ابا جی کے ساتھ خود ملک مقبول کے آفس گئی ہی اس لیے تھی کہ نگاہ کا ایڈریس لے سکے۔ وہ لڑکی اگرچہ اس ٹائپ کی نہ تھی اور اس لائن میں آنے کے بعد ایسی چلتی پرزہ ٹائپ چیزوں سے وہ بدک کر دور بھاگتی تھی مگر نگاہ میں نجانے ایسا کیا تھا جو اسے اس کی جانب کھینچ رہا تھا۔ اس روز گھر آنے کے بعد بھی دیر تک اس کی باتیں ذہن میں گونجتی اور دل کو جھنجھوڑتی رہیں۔

"تمہیں کسی کی دعائیں نہیں لگیں؟" وہ اس کا تعجب۔

"ہاں ہوتے ہیں ایسے ابا جی بھی۔" وہ اس کا تمسخرانہ انداز۔

"اس میدان میں اترنے کے لیے ہر طرح سے مسلح ہونا پڑتا ہے' ہر طرح کے دشمن کے ہر طرح کے وار سے نمٹنے کے لیے۔" وہ اس کی تنبیہہ۔

"ڈرتی ہوں روز حشر میری ماں کے نام کی بے حرمتی نہ ہو جائے میرے نام کے ساتھ لگ کے۔"

وہ اس پہیلی سی لڑکی کو سلجھانے کے لیے بے چین تھی یا شاید خود اپنی ذات کی گرہیں کھولنے کے لیے۔ اس کا ایڈریس لینے کے بعد' جب اس نے اسی وقت وہاں جانے کا قصد کیا تو ابا جی نے قطعی کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ وہ خوش تھا کہ اس کی بیٹی اپنے خول سے باہر آرہی ہے' نئی دوستیاں پیدا کررہی ہے اور وہ بھی ایسے حلقوں میں وہ تو الٹا مطمئن نظر آنے لگا۔

نگاہ کرشن نگر کے ایک پر رونق بازار کی ایک پرانی سی عمارت کے تنگ و تاریک فلیٹ میں رہتی تھی' دو کمروں اور ایک مختصر سے کچن پہ مشتمل اجڑے ہوئے رنگ و روغن' خستہ حال دروازوں اور لاتعداد دراڑوں والی چھت کا فلیٹ۔ نگاہ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ سے اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ ان حالوں میں رہتی ہوگی' ڈیمانڈ تو خاصی تھی اس کی۔ وہ بھی ادا کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوئی۔ پرتپاک انداز میں اس کا سواگت کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دوستانہ انداز میں گپ شپ لگاتے ہوئے وہ اسے بابر ہمایوں مغل کے بارے میں خبردار کرنے لگی۔

"وہ ظاہرا" کتنا ہی نفیس اور ستھرا کیوں نہ لگتا ہو' اندر سے کسی بازاری۔۔۔ چوک پہ بیٹھنے والی عورت سے بھی گیا گزرا ہے۔"

"تم اسے بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ کیا بہت پرانی جان پہچان ہے؟" اس نے کریدا۔

"کیا خاک؟ اس جیسے شخص کو جاننے کے لیے نگاہ کی ایک نگاہ ہی کافی ہے۔ بھیڑیوں کے اس جنگل میں چودہ سال کی عمر میں آنکلی تھی۔ پندرہ سال سے ان خون آشام بھیڑیوں کے منہ میں ہاتھ ڈال ڈال کر اپنے حصے کا رزق نکال رہی ہوں۔ کیا اب بھی نہ جانتی کہ کون کیسا ہے؟" ادا اس انکشاف سے دم بخود رہ گئی۔

"تم کہیں سے بھی تیس سال کی نہیں لگتیں۔"

"تیس نہیں' ایک کم تیس اور یہ بھی صرف تمہیں بتایا ہے ورنہ اوروں کے لیے میں پچھلے چار سالوں سے بائیس سال کی ہوں اس سے پہلے کئی سال انیس سال کی رہی۔" وہ قہقہہ مار کے ہنس پڑی۔

"کیا ستم ہے' چودہ سال کی عمر میں میرے بابا نے مجھے سولہ سال کا بتا کر بیچا تھا۔ تب بکنے کے لیے مجھے خود کو بڑا ظاہر کرنا پڑا اور اب بکنے کے لیے عمر کم بتانا پڑتی ہے۔"

"تمہیں' تمہیں تمہارے بابا نے تمہارے اپنے باپ نے بیچا؟" وہ حیران رہ گئی۔

"ہاں میرا باپ بنوں کا پٹھان تھا۔ پٹھان بڑے غیرت مند ہوتے ہیں۔۔۔ ہے ناں' یہی مشہور ہے اور کچھ غلط بھی نہیں۔ واقعی بڑے غیور ہوتے ہیں' ناموس پہ جان دینے والے۔ لیکن کہیں کہیں خون بھی اثر بدل جاتا ہے' ذات بھی رستہ بدل لیتی ہے' میرا دادا پردادا سب ویسے ہی تھے' روایتی پٹھان' پردہ بڑا سخت تھا ہمارے خاندان میں ویسے بھی شہر میں تھوڑا ہی رہتے تھے ہم۔۔۔ بنوں کے قریب ایک قصبے کے رہنے والے تھے۔ ماں تو پکی پہاڑن تھی' ساری زندگی کسی نے اس کا چہرہ نہ دیکھا تھا حتیٰ کہ غیر خاندان کی عورتوں نے بھی۔ تبھی تو ایسا نور چمکتا تھا اس کے چہرے

سے پھر پتہ نہیں کیسے میرے بابا کو نشہ لگ گیا۔ زمین بیچ بیچ کے وہ نشہ پورا کرنے لگا۔ دادا مرا تو چچا نے بابا کو بیوی بچوں سمیت گھر سے نکال دیا۔ وہ اب گھر سے چیزیں تک چرا چرا کے بیچنے لگا تھا۔ بابا ماں کو' مجھے اور میرے دونوں بڑے بھائیوں اور دو چھوٹی بہنوں کو لے کر چارسدہ آ گیا۔ وہاں وہ لکڑیوں کے ٹال پہ کام کرنے لگا۔ بھائی بھی اس کے ساتھ جانے لگے۔ خود تو بابا نشے کی وجہ سے کام زیادہ نہ کر سکتا تھا۔ ماں سارا دن گھر میں ازار بند بنتی' مہندی کے پتے سکھا کے پیستی' ہاتھ کے پنکھے بناتی اور لمبا سا گھونگھٹ اوڑھ کے بازاروں میں بیچتی لیکن بابا کا نشہ تھا کہ پورا ہی نہ پڑتا تھا۔ پہلے اس نے میرے ایک بھائی کو ایک عربی شیخ کے ہاتھ بیچا' جو اسے اونٹوں کی ریس میں کام لانے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا اور ظاہر ہے کہ واپس نہ لایا' بابا کو چھ ہزار اس نے بیٹا واپس کرنے کے تو نہ دیے تھے۔

ماں اس واقعے سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ مر گئی۔ کاش مرنے سے پہلے ہم تینوں بہنوں اور اکلوتے بھائی کو بھی مار جاتی جو بابا کے دیکھا دیکھی نشہ کرنے لگا تھا۔ وہ بھائی بھی کسی کام کا نہ رہا تو بابا کی نظر مجھ پہ پڑی۔ پشتو فلموں کے ایک پروڈیوسر نے مجھے دس ہزار میں خریدا۔ چند دن استعمال کیا' دو تین گانے فلمائے جو پتہ نہیں کسی فلم کے لیے تھے یا یونہی عیاشیوں کی تفریح طبع کے لیے۔۔۔ پھر ایک سال بعد ہی مجھے پچیس ہزار میں لاہور کے ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ دیا۔" وہ اچانک مسکرانے لگی۔

"دیکھا ایک ہی سال میں میں کتنی منافع بخش ہو گئی۔ خیر اس سیٹھ میں شاید گناہ ثواب کا کچھ خوف تھا جو اس نے باقاعدہ نکاح کر کے مجھے تین سال تک اپنے ساتھ رکھا۔ حالانکہ دو بیویاں اس کی پہلے سے تھیں مگر خاندانی۔۔۔ ادھر ادھر منہ مارنے کی عادت کو وہ یوں پورا کرتا کہ حرام کام کو بھی ضمیر مطمئن رہنے کی خاطر حلال کر کے کرتا۔ تین سال بعد کوئی اور اس کے دل کو بھا گئی تو میں فارغ۔ اس دوران میں نے بابا سے بھی رابطہ رکھا۔ بھائی کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی' بہنیں بھی قد نکال رہی تھیں۔ میں ڈرنے لگی کہ میرے بعد ان کا حشر بھی میرے جیسا نہ ہو۔ بابا نے لوگوں کو یہی بتایا کہ میں ہیضے کا شکار ہو کے مر گئی۔ مجھ مری ہوئی بیٹی نے اس پورے کنبے کا بوجھ اٹھا لیا۔ سیٹھ نے مجھے فارغ کرنے کے بعد حق مہر کے دو لاکھ اور وہ سب زیور بھی دیے جو تین سال کے دوران میں نے بنوائے تھے۔ میں چاہتی تو باقی عمر آرام سے گزار دیتی کوئی بھی باعزت پیشہ اپنا کے مگر اکیلی' حسین اور جوان لڑکی کے لیے باعزت پیشہ اپنانا مشکل تھا۔ وہ وقت بھی تو عین شباب کا تھا۔ اٹھارہ سال کی چلتی پھرتی قیامت تھی میں۔ سیٹھ کے حلقے میں بہت سے لوگ مجھے جاننے لگے تھے' یہ خبر ملتے ہی کہ میں دیو کی قید سے آزاد ہو چکی ہوں بہت سے طلب گار منڈلانے لگے۔ میں اب خود پہ کسی کے نام کی مہر نہ لگوانی چاہتی تھی۔ اس میں نرا خسارہ ہی خسارہ تھا۔ تین سال میں جتنی راتیں اس بڈھے سیٹھ کے نام کیں اگر چاہتی تو اتنے عرصے میں کروڑ جمع کر سکتی تھی۔

بابا سے میں نے ایک معاہدہ کر لیا' وہ میرے بھائی کا علاج کرائے گا' میری بہنوں کی شادی کر کے عزت سے انہیں اپنے گھر کا کرے گا اور میں اس کے بدلے ہر ماہ اسے معقول رقم دوں گی۔ سو۔۔۔ یہ کہانی شروع ہو گئی۔ شروع میں میں نے سب کچھ کیا۔۔۔ وہ سب کچھ جو تم جان جاؤ تو شاید میرے گھر کے برتن میں پانی تک پینا گوارا نہ کرو۔ لیکن میری نظر سے دیکھو تو یہ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ ایک میں اکیلی کیچڑ میں آن گری تھی تو سب کا ہاتھ تھام کے انہیں غلاظت میں کیوں دھکیلتی۔ بہتر تھا بغیر کسی کی مدد طلب کیے خود ہی اندر تک دھنستی رہوں۔ ایک بہن بازار میں بیٹھ گئی تو لیا ہوا' دو تو گھروں کی ہوئیں اور کیا شان سے ہوئیں۔ بھائی کا علاج چل رہا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا تو اسے کوئی کاروبار بھی سیٹ کر دوں گی۔ بابا اب جتنی جلدی ہو سکے مر جائے تو اچھا ہے۔۔۔ حیران مت ہو' اس کی موت کی دعائیں میں اس لیے نہیں مانگتی کہ اس کی وجہ سے میں بکنے والی چیز بنی' پاک بی بی سے ناپاک بنی۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ بہنوں کی شادی کے بعد بھی اب تک وہ ہر مہینہ ہزاروں روپیہ یہ کہہ کر مجھ سے بٹور لیتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو وہ میرے بارے میں میری بہنوں کے سسرال تک سب کچھ بتا دے گا۔ میرا ماضی' میرا حال۔۔۔ میرا کردار' میرے کرتوت۔۔۔ بلیک میلر۔ اسی وجہ سے لاکھوں کمانے کے بعد بھی میں اب تک اس حال میں ہوں۔ بس چند سال اور۔۔۔ پھر میں آزاد ہو جاؤں گی اس بیگار سے۔"

ادا کتنی ہی دیر کچھ نہ کہہ سکی۔

"نکاح میں تم سے بس یونہی ملنے چلی آئی تھی اب احساس ہوا کہ اللہ مجھے تم سے کیوں ملوانا چاہتا تھا' صرف یہ احساس دلانے کے لیے کہ دنیا میں مجھ سے بھی خراب حالوں میں کتنے ہی لوگ جی رہے ہیں میرے ابا جی تو صرف ۔۔۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اب ایک پتے کی بات سن لو اور گرہ باندھ لو۔ اگر دامن صاف رکھ کے اس پیشے میں رہنا ہے تو پاک دامن ظاہر کرنا چھوڑ دو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ خود کو ویسا ظاہر کرو جیسا کہ اس پیشے سے وابستہ عورتیں ہوتی ہیں۔ شریف عورت مرد کے لیے بہت بڑا چیلنج ہوتی ہے۔ گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھی عورت کا شرافت کے بارے میں دعویٰ وہ پھر بھی برداشت کر لیتا ہے لیکن اگر کوئی عورت گھر سے نکل کر چادر اتار کر بھی خود کو باحیا اور شریف کہے تو وہ اسے ڈھکوسلا گردانتا ہے اور پورے جی جان سے اسے جھوٹ ثابت کرنے پہ تل جاتا ہے اس لیے خود کو ایک چیلنج بنا کے مت پیش کرو۔ تمہاری آواز اچھی ہے' صورت بھی لاکھوں میں ایک ۔۔۔ اگر جسم بچا کے رکھنا چاہتی ہو آواز' شکل اور اداؤں کو کیش کروا لو۔ یہ چوائس ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے' اگر دنیا کے ہاتھ میں اختیار دو گی تو وہ صرف جسم پہ جھپٹے گی۔ خود کو بچا کے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بھوکے کتوں کے آگے کچھ نہ کچھ ڈالتی رہو' روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہی سہی ورنہ ان کی بھوک بے تاب ہوئی تو تمہاری بوٹی بوٹی نوچ لیں گے۔"

"یعنی میں پیشہ ور طوائفوں کی طرح مرد کو لبھانا لوٹنا شروع کر دوں؟" وہ اپنی ناگواری نہ چھپا سکی۔

"پیشہ ور تو تم بن چکی ہو ادا۔ مانو یا نہ مانو اور پیشہ بھی تم نے طوائفوں والا چنا ہے' یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ فن اور آرٹ کے نعرے جتنے مرضی لگوا لو' حقیقت تو یہی ہے۔ چاہے کوئی کوٹھے پہ محفل سجائے' کسی کے دربار میں یا اسٹیج پہ پروگرام کرے' بات تو ایک ہی ہے۔ ہاں اگر تم ہوتیں کسی نامی گرامی وکیل کی بیٹی' کسی مشہور سیاستدان کی بھانجی بھتیجی یا کسی بیوروکریٹ یا انڈسٹریلسٹ کی نور نظر۔۔۔ تو اور بات تھی۔ تب تمہارا فن واقعی فن کہلاتا۔ لیکن ابھی تو سب تمہارے شجرے سے واقف ہیں اور شجرہ باپ سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہاری ماں بھلے بچوں کو سیپارے پڑھاتی تھی' تمہیں دعا نور بنانا چاہتی تھی مگر تمہارے باپ کی قسمت میں طبلے کی تھاپ نے نہ نور باقی رہنے دیا نہ دعا۔۔۔ وہ ان ۔۔۔ کی اداؤں سے واقف تھا جنہیں تاتھیا کر کے نچاتا تھا' اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے صرف ادا تھی۔

میری ماں نے بے شک عمر کے بیالیس سال پردے کے پیچھے گزار دیے تھے مگر بابا۔۔۔ اس کی آنکھ کی شرم اور غیرت کا پردہ تو نشے کی لت نے کھا لیا' میری رگوں میں خون تو باپ کا ہی تھا۔ روز محشر شاید تجھے بھی اور مجھے بھی ماں کی پاکیزگی کے صدقے عزت سے پکارا جائے لیکن یہ دنیا۔۔۔ یہاں ہم باپ کے حوالے سے ذلت سمیٹتے سمیٹتے مر جاتے ہیں' ہمت کر ادا۔۔۔ میری بات مان تو خود کو چیلنج مت بنا۔ بلکہ خود ان مردوں کو چیلنج کر۔ یہ چیلنج تب قبول کرتے ہیں جب کوئی انہیں پکارے کہ آؤ مجھے فتح کرو' میں ناقابل شکست ہوں' تمہارے ہاتھ آنے کے لیے نہیں ہوں۔۔۔ البتہ خود شکار ہونے کی بجائے انہیں شکار کرنے نکلو تو بڑی آسانی سے خود کو پیش کرتے ہیں۔"

"یعنی اب مجھے صرف نام کی نہیں بلکہ سراپا "ادا" بننا پڑے گا" دعا نور نے آخری بار دعا بن کے سوچا۔ اب وہ ادا بننے کو تیار تھی۔

• • •

جانے کس نے بانٹ دیے ہیں آ کر گھر گھر خواب
سچی بات ہے میں نے دیکھے خواب کے اندر خواب

عمیص کی قدرے بلند آواز میں یہ بڑبڑاہٹ سن کر صحن کے دوسری جانب برآمدے میں بچھے تخت پہ بیٹھی دھلے کپڑے تہہ کرتی ہوئی موتیا نے ہلکے سے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

اس کی یاد میں سویا ہوں تو ٹوٹ کر بکھرا ہوں
میں تھا' نیند اک شیشے جیسی اور وہ پتھر خواب

ایک عدد سامع کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی **عمیص** کی رگ شاعری اور شدت سے بھڑک اٹھی۔ اب خود کلامی کی بجائے داد لینے کا سا انداز نمایاں تھا۔ موتیا نے دھوپ کو روکنے کے لیے لٹکائی جانے والی چق اوپر کی جانب سرکا دی۔

مغرب اور عصر کے درمیان کا وقت تھا۔ دھوپ کی شدت اگرچہ کم ہو چکی تھی' شام کی آمد آمد تھی اس کے باوجود سارے دن کی تپش سے تندور ہوتے فرش اور دیواریں اب تک جھلس رہے تھے۔ موتیا نے حیرت سے **عمیص** کو دیکھا جو برآمدے کے عین سامنے بنے سنگی چبوترے پہ نیم دراز کھلے آسمان پہ اٹکھیلیاں کرتی ایک ہلکے سبز رنگ کی پتنگ پہ نظریں جمائے شعر پہ شعر نشر کر رہا تھا۔

"تمہیں گرمی نہیں لگ رہی؟ اندر آ کر لیٹو' کم از کم پنکھا تو چل رہا ہے۔ اس قدر گرم فرش پہ تم کتنے مزے سے براجمان ہو جیسے ایئر کنڈیشنڈ روم میں کسی آرام دہ صوفے پہ بیٹھے پاک انڈیا ون ڈے میچ دیکھ رہے ہو۔"

اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اب **عمیص** نے اپنی نگاہیں ہلکے نیلے آسمان کی وسعتیں ناپتی ہلکی سبز پتنگ کی بجائے لال اینٹوں سے چنی دالان کی بیرونی دیوار پہ پھدکتے غٹرغوں کرتے سفید کبوتر پہ فوکس کر دیں۔

دیکھیں اس دیوار پہ اتریں کیسے جا کر خواب
جب سے اس کو دیکھا میں نے ہوئے کبوتر خواب

وہ گنگنایا۔ موتیا سر ہلا کے رہ گئی۔

"آج بڑے عرصے بعد دورہ پڑا ہے' اللہ خیر کرے۔" اس نے کپڑے تہہ کر کے الگ الگ ڈھیر بنائے۔

"**دلگیر**... امی حضور اور تائی حضور کے کپڑے ان کی الماری میں رکھ آؤ۔"

میرا بابو چھیل **چھبیلا** میں تو ناچوں گی
او میرا بلما رنگ رنگیلا میں تو ناچوں گی

وہ حسب معمول پائلیں چھنکاتا بوتل کے جن کی طرح ایک ہی آواز پہ نجانے کس کونے سے نمودار ہوا۔

"چلو... یک نہ شد دو شد... ایک حضرت پہلے ہی شمع محفل سنبھالے بیٹھے تھے' یہ دوسرے بھی اپنا تازہ ترین کلام سنانے تشریف لے آئے۔"

او کنگنا سجا کے' گجرا سجا کے
میں شرماؤں رے او میرا بلما رنگ...

"خدا کا واسطہ ہے **دلگیر**' تم بلما نانجار کو جتنا مرضی چھیل **چھبیلا**' رنگ رنگیلا بنا لو' ناچنے کا دل ہے تو بیٹھ گھنٹہ بھر ناچ لو... مگر میرے ان بندھے ہاتھوں کی لاج رکھ لو' تمہیں قسم ہے کہ شرمانا مت۔" موتیا نے فوراً ہاتھ جوڑ کے اسے شرمانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ وہ منہ بسورتا کپڑے اٹھا کے پلٹنے لگا۔

"میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر خدا کی قسم... **دلگیر** کا شرمانا نہیں' یہ واحد چیز ہے جس کو سہنے کی ہمت میں تاب ہے نہ مجال۔" اس نے **عمیص** کو مخاطب کیا جو اب کبوتر کی جان بخشی کرنے کے بعد لیموں کے خندہ پودے کو گھور رہا تھا۔

"آج کئی دنوں بعد تمہیں اس وقت گھر دیکھا تو سوچا' خوب گپ شپ رہے گی لیکن لگتا ہے تم گھر پہ موجود تو ہو مگر حاضر نہیں۔ دماغ کہیں اور ہی مٹر گشت کرتا پھر رہا ہے۔" وہ جل کے بولی۔

"تائی حضور ٹھیک فرماتی ہیں' خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور تمہارے خالی دماغ پہ تمہارے ہی جیسے کسی کاہل اور سست الوجود قسم کے شیطان نے بسیرا کر لیا ہے جو گھنٹے سے خلاؤں میں نظر بازیاں کر رہے ہو۔ لو' اب کیا حشرات الارض پہ ریسرچ کرنے کا ارادہ ہے؟" اس بار اسے نزدیکی کیاری میں غور فرماتے دیکھ کر تبصرہ کیا گیا۔

"میں اک خواب بن رہا ہوں۔" کتنی دیر کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوا... جب موتیا اس کی جانب سے کسی جواب کے ملنے کی امید ختم کر کے اٹھنے کو تھی۔

"ابھی تک... کتنا لمبا خواب ہے' جس کی بنائی ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔" اس کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی **عمیص** کی سنجیدگی ختم نہ کر پا رہی تھی۔

دل بھی کیسی شے ہے دیکھو پھر خالی کا خالی
گرچہ اس میں ڈالے میں نے آنکھیں بھر بھر خواب
سعد اکیلے رہنا ہو تو ایسی شان سے رہنا
جیسے رکھ کے بھول گیا ہو اک اناگر خواب

بڑے جتن کے بعد **عمیص** اس کی زبان سے یہ جوابی شعر سن پایا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور چہرہ اس کی جانب موڑ کے کہنے لگا۔

"بجا ارشاد... لیکن اگر کوئی۔ "اکیلے" رہنا چاہے تو پھر ناں۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ اگر کوئی "شان" سے رہنا چاہے تب ناں۔"

"ہائے شان چھوٹی بی بی' یہ کس کا نام لے لیا آپ نے۔" دلگیر تڑپ کے نعمت کدہ سے نکلا۔

"ہائے وہ شان کی بھولی صورتیا' قاتل نیناں... اور وہ جب لب دبا کے ہولے سے مسکراتا ہے... تو ہائے ہائے... وہ **پنکھڑی** سے نازک لب' وہ سونے سی رنگت۔"

"یار **دلگیر**' یہ تم شان کے حسن کے قصیدے پڑھ رہے ہو یا ریما کے؟" اس کی بے قراری و وارفتگی پہ مشکوک ہو کے **عمیص** نے پوچھا۔

"ناں جی' اپنے شان کی' پورے لور میں ایک ہی تو شاہزادہ ہے' جو آپ کی اس کنیز کے خوابوں میں آتا ہے۔"

"لیجیے' خوابوں نے ان کی بھی لٹیا ڈبو دی۔" موتیا نے سر ہاتھوں پہ گرا لیا۔

او' منڈا سونے رنگ دا... دل لے گیا

میرا سوں رب دی...

دلگیر تو شان کے عشق میں گنگناتا پھر سے غائب ہو گیا۔ موتیا نے اس اداس اترتی شام کی اولین ساعت میں **عمیص** کا چہرہ ذرا غور سے دیکھا۔ وہ اب اٹھ بیٹھا تھا اور ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اپنی کسلمندی کو بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ہلکی بڑھی ہوئی شیو دھیرے دھیرے اترتی شام کے سنہری سائے میں یوں لگ رہی تھی جیسے پورے چہرے پہ کسی نے سونا چور چور کر کے پھینک دیا ہو۔ اس کے بال بھورے تھے' جو کبھی تو گہرے بھورے شہد رنگے لگتے تو کبھی روشن دن میں کرنوں کا عکس پا کر... یا شام کے استقبال میں رخصت لیتے سورج کے الوداعی بوسے لے کر ہلکے بھورے بالکل سنہری لگنے لگتے۔

"نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟"

اپنی طویل انگڑائی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے ہوئے **عمیص** کو نجانے کیسے پتہ چل گیا کہ وہ اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اپنی چوری پکڑی جانے پہ وہ سٹپٹا گئی۔

"نظر کیسے لگاؤں گی' تمہاری قابل رشک ہستی کو؟... جو صبح سے اترنے کا نام نہیں لے رہی یا پھر مشہور زمانہ بڑائی کو' جس کے ڈنکے دور دور تک بج رہے ہیں یا پھر تمہارے اس یکطرفہ مگر بلا خیز عشق کو' جس کے انجام تک

پہنچنے کے آثار نظر نہیں آتے۔"

"شام کا وقت ہے یار' کوئی اچھی بات منہ سے نکالو سنا ہے یہ وقت قبولیت کا ہوتا ہے۔"

"یہ تم اتنے وہمی کب سے ہو گئے؟"

"محبت بڑی وہمی ہوتی ہے۔"

"تمہارے معاملے میں یوں کہنا چاہیے کہ محبت بڑی جھکی ہوتی ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے تم جھک مارتے آ رہے ہو۔"

"میری محبت ہے' میں جھک ماروں یا بک بک کروں' تمہیں کیا تکلیف ہے؟" آخر کار وہ چڑ گیا۔

"میری تکلیف ہے' تمہیں کیا؟" وہ بدلہ چکا کر جانے لگی۔

"سنو' گل کب تک آجاتی ہے؟" اس کے پکارنے پہ وہ پلٹی۔

"آنے والی ہوگی۔" کوئی کرارا سا' دل جلا جواب دینے کی خواہش پہ اس نے مشکل سے ضبط کیا۔

"خاصی دیر ہو گئی۔" وہ فکر مندی سے اٹھ کر چبوترے کی سیڑھی سے اچک کر گھنے درختوں کی باڑ کے اس طرف نظر آتی سنسان گلی میں نظر دوڑانے لگا۔

"دیر تو تم نے کر دی ہے عمیص۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ عمیص کہ خوابوں کی دنیا سے باہر نکلنے کا ارادہ کرو۔ خوابوں کی چادر جتنی مرضی بنتے رہو فائدہ کوئی نہیں' یہ چادر اوڑھنے کے کام تو آئے گی نہیں اوڑھ بھی لو تو نہ حالات کی گرمی سے بچاؤ ممکن ہوتا ہے نہ ہی لاتعلقی کی برف سے خنکی سے... اگر تم گل کے حوالے سے خود کو خواب دیکھنے سے روک نہیں پاتے تو کم از کم اسے ان خوابوں کا رازدار ہی بنا ڈالو۔ اسے کھل کر سب کچھ کہہ کیوں نہیں دیتے۔"

وہ اس کے چہرے پہ پھیلے سونے اور آنکھوں سے پھوٹتی ہیرے کی کنی جیسی دمک سے نظریں چراتے ہوئے بڑی دلسوزی سے مشورہ دے رہی تھی۔ یہ تو وہ ہی جانتی تھی کہ ایسا کہنا اس کے لیے شاید آسان ہو مگر یہ کہنا کتنا مشکل ہوگا کہ عمیص گل سے... اس نے اپنے لب کاٹ کر خود کو اس اذیت ناک تصور کی قید سے آزاد کرایا۔

"تو کیا وہ جانتی نہ ہوگی موتیا۔" اس لمحے اسے عمیص بے حد معصوم لگا۔

"کیا مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت ہے؟ کیا میرے جذبوں کی تپش میری محبت کی آنچ... اس تک ذرہ بھی نہ پہنچتی ہوگی کیا وہ میری آنکھوں سے یہ سب جان نہ گئی ہوگی۔"

"ضرور جان گئی ہوتی' اگر اس نے تمہاری آنکھوں میں جھانکا ہوتا۔" موتیا نے اپنی نظریں جھکا لیں... حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو مسلسل گیٹ کی جانب نکلنے والے راستے پہ نظر جمائے ہوئے تھا۔

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ اپنی محبت کی آنچ' جذبوں کی تپش لیے بڑی آس سے جس شخص کے پاس کھڑے ہوتے ہیں اس کے اپنے اندر اتنے بھانبھڑ جل رہے ہوتے ہیں کہ وہ کسی اور تپش کو محسوس ہی نہیں کر پاتا۔" وہ عمیص کے بالکل نزدیک بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"آپ اپنی آنکھوں کو سارے راز افشا کر دینے کی مکمل اجازت دے دیتے ہیں مگر وہ شخص... اس کی اپنی آنکھیں کسی اور جانب اٹھنے کی خواہش مند نہیں ہوتیں۔" اس نے اپنی جھکی پلکیں اٹھا کے عمیص کے خفا چہرے کو قریب سے دیکھا... بے حد قریب سے۔

"تو ایسے میں اگر وہ پل بھر کو نظریں اٹھا کے ان آنکھوں میں جھانک لے... اپنے اندر کی چنگاریوں کو ہوا دینا بند کر کے کوئی ایک کھڑکی ذرا سی کھول دے تو شاید سب راز جان لے... ہر آنچ محسوس کر لے۔" وہ بے خود ہو کے یہ تمنا کر رہی تھی... مگر اسے پر سوچ انداز میں بدستور سامنے دیکھتے پا کر مسکرا دی۔ وہ سن تو رہا تھا... بڑے غور سے سن رہا تھا مگر صرف وہ... جو وہ کہہ رہی تھی' وہ نہیں جو وہ کہنا چاہتی تھی۔

"لیکن ایسا ہوتا ہی تو نہیں۔" اس نے شانے اچکا کے خود کو اس بے بس کر دینے والے لمحے کے طلسم سے بمشکل آزاد کرایا اور اپنی نظروں پر زبردستی پہرہ بٹھایا۔

"نہ کوئی ان آنکھوں میں جھانکتا ہے نہ ہی کچھ جانتا ہے۔"

"اور یہ بھی تو نہیں ہو سکتا ہے موتیا کہ میں ہاتھوں میں اپنی آنکھیں رکھ لوں' بالکل کسی کشکول کی طرح اور صدائیں لگا کر اسے مخاطب کروں' اس کشکول کی جانب متوجہ کروں۔ محبت بھکاری تو بن سکتی ہے' مگر بھیک' محبت نہیں کہلائی جا سکتی۔ اگر وہ اس کشکول میں توجہ کے چند سکے ڈال بھی دے تو میں اسے محبت سمجھ کے مطمئن نہیں ہو سکتا۔"

"کون کہتا ہے کہ تم بھکاری بنو' تم محبت کی بھیک مت مانگو مگر اپنی محبت تو اسے دان کر سکتے ہو۔ یوں سینت سینت کر اپنے ہی دل میں جمع کیے رکھنے سے کیا حاصل؟"

"حاصل... ہا... حاصل۔" اس نے ایک طویل سانس اپنے اندر کھینچتے ہوئے فضا میں پھیلتی کچنار کی بھینی بھینی خوشبو کو محسوس کیا۔

"یہ حاصل لفظ کا کیا کام محبت کی اس کتاب میں محبت میں کیا حاصل... کیا وصول۔"

"نہ یہ دور اس قسم کی محبت کے لیے سازگار ہے نہ تم اس دور کے پروردہ ہو جب بغیر حاصل کے بھی محبت نبھائی جاتی تھی۔ اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے کہو کہ تمہیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ گل تمہیں چاہتی یا نہیں... تمہاری محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے یا نہیں۔"

"ہاں میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اس سے اپنی محبت کا جواب محبت میں پانا اگرچہ میرے لیے کسی سعادت یا نعمت سے کم نہیں ہوگا مگر صرف اسے چاہتے رہنا بھی میرے لیے کم نہیں مجھے واقعی اس بات سے فرق نہیں پڑتا۔ نہ مجھے اور نہ میری محبت کو... کہ اسے بدلے میں پذیرائی نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھے... عین اپنے دل پہ... یہ بات کہہ رہا تھا۔

"اس ہاتھ کو یہاں سے ہٹائے بغیر اس سوال کا جواب بھی دے دو... کیا تمہیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ تمہیں تو تمہاری محبت کا جواب بے رخی سے دے مگر خود اپنی محبت کسی ایسے شخص پہ نچھاور کر دے جو اس کے لائق نہ ہو... آں... ہاں... دل پہ ہاتھ رکھ کے جواب دو۔"

اس نے دیر تک دل پہ ہاتھ رکھا... پھر سینہ مسلتے ہوئے بے بسی سے ہاتھ ہٹا کے مٹھیاں بھینچ لیں۔ موتیا نے اس کے ہاتھوں سے نظر ہٹا کے چہرے کی جانب دیکھا' اس کی مٹھیوں کی طرح اس کی پلکیں بھی ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ نجانے وہ کیا روکے رہنے کی کوشش کر رہا تھا... کون تھا اس کی ہاتھوں کی لکیروں میں جسے اس نے مٹھی میں قید کر لیا تھا۔

اور نجانے کون تھا ان پلکوں کے پیچھے جسے وہ ہمیشہ کا مہمان بنانا چاہتا تھا۔

بھلا دروازے بند کر لینے سے جانے والے رکتے ہیں...؟ اگر نیند ٹوٹ جائے تو سپنا روٹھ جاتا ہے' بے شک آپ آنکھیں کھولیں یا نہیں... پلکیں موندے رکھنے سے خواب مہمان نہیں ہو جاتے۔

وہ ایک نیند کے عالم میں تھا' موتیا نے اسے جگا دیا تھا۔ خوابوں کی بے رخی کے بارے میں خبردار کر دیا تھا۔ عمیص نے آنکھیں کھولیں... اب تک اس نے ایک بار بھی اپنے دائیں جانب کھڑی موتیا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نگاہیں مسلسل سامنے لگی ہوئی تھیں۔ اب بھی پلکیں کھولنے پر اسے بند گیٹ نظر آیا... جس پہ سارے دن کے تھکے ہارے کبوتر سستانے آبیٹھے تھے۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں شام نے دامن پھیلانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ دور افق پہ ڈوبتے سورج کی سرخی پھیل رہی تھی۔ فضا میں اچانک کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں ابھریں۔ شاید اذان مغرب کے لیے موذن نے اسپیکر آن کیے تھے۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اندر کی طرف پلٹ گیا۔

موتیا نے گردن موڑ کے اس کی جانب دیکھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے دل کی جانب گیا۔ سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"فرق پڑتا ہے عمیص۔۔۔ بہت فرق پڑتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ایکسی لینٹ' بریلینٹ۔۔۔"

شہزاد بے اختیار ہو کے کہہ اٹھا۔ گل مہر کا چہرہ ستائش پا کے دمک اٹھا۔

"میں نے آج تک کسی کی بے جا تعریف نہیں کی' نہ ہی محض اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر یا دل رکھنے کے لیے ستائشی کلمات کہے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو کوئی بھی قابل تعریف کام کرے تو میں اس کا اظہار کرنے میں قطعی کنجوسی نہیں کرتا۔ آپ نے واقعی یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس جاب کے لیے آپ سے بہتر چوائس کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"

"تھینک یو سر۔"

"یہ کام اتنا بہترین اور پرفیکٹ ہوا ہے کہ اس سیریز کے بارے میں میرے دل میں جو چند ایک خدشات تھے وہ بھی دور ہو گئے ہیں۔ الگ کر دکھانے کی دھن ضرور سوار تھی میرے سر پہ۔۔۔ مگر یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں ویورز اس تبدیلی کو ہضم نہ کر سکے تو۔۔۔؟ یا ہم لوگ ہی وہ رزلٹ نہ دے پائے جس کی پلاننگ کی ہے تو سارا سرمایہ ڈوب سکتا ہے۔ فنانس سے بھی زیادہ فکر مجھے اپنی پروفیشنل ساکھ کی تھی' اس لائن میں آپ کوئی بھی مقام حاصل کرنے میں کئی سال لگا دیتے ہیں مگر کھونے کے لیے ایک پل کافی ہے۔ تھینک گاڈ کہ اس سیریز کے بارے میں میری ساری توقعات پوری ہوئیں اور تھینکس فار یو آلسو' کہ آپ کے بہترین کام نے وہ کر دکھایا جو میں چاہتا تھا۔"

شہزاد نے پہلے ایپی سوڈ کی مکمل ایڈیٹنگ کرنے کے بعد جب اس کے رش پرنٹس دیکھے تو گل مہر کی مہارت کی داد دیے بغیر رہ نہ سکا۔

"ویری ریمارک ایبل ورک۔۔۔ بالکل ہالی وڈ کے پائے کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔"

اس نے ایک سین جو اسے خاصا پسند آیا تھا' دوبارہ ریوائنڈ کر کے دیکھا جس میں "شیر دل" کو گھنے جنگل کے درختوں پہ چہل قدمی کرتے دکھایا گیا تھا۔ نہ یہ جنگل حقیقی تھا نہ ہی یہ چہل قدمی۔ جنگل کا مصنوعی سیٹ لگانے پہ خاصا پیسہ لگتا ہے اس کے باوجود وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو گل مہر کے تخلیق کردہ اس قدرتی رنگوں والے جنگل میں تھی جس کے گھنے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے میں ملی ہوئی تھیں۔ یہ جنگل اس نے کمپیوٹر ورک کی مدد سے تراشا تھا اور اس ہنر کا استعمال کرتے ہوئے اس نے "شیر دل" کا مرکزی کردار ادا کرنے والے اداکار کو ٹہلتے ہوئے کچھ اس طرح دکھایا تھا کہ اس کے قدموں سے درختوں کی گھنی شاخیں ذرا سا جھکتی تھیں' پتے سرسراتے تھے اور اس کے ہر قدم پہ اس درخت پہ بسیرا کرنے والے پرندے اس دخل اندازی پہ دہشت زدہ ہو کے اپنی اپنی بولیاں بولتے اڑ جاتے تھے ٹہنیوں سے لٹکے بندر حیران ہو کے اچھلنے لگتے تھے۔

یہ سارا ماحول جو اس ڈیڑھ منٹ کے مختصر سے سین میں دکھایا گیا تھا' اسے اسکرین پہ اس کمال سے پیش کرنے میں گل مہر کی دو روز کی محنت صرف ہوئی تھی' بلاشبہ یہ اس چالیس منٹ کے ایپی سوڈ کا سب سے مشکل سین تھا۔۔۔ مگر نہ مصنف کے لیے۔۔۔ نہ ہدایت کار کے لیے' نہ ہی مذکورہ اداکار کے لیے بلکہ صرف اور صرف گل مہر کے لیے اور اب شہزاد اس کے کام سے بے پناہ متاثر ہو کر دل کھول کر اس کی تعریفیں کر رہا تھا۔

"تھینکس سر۔" ظاہر ہے وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتی تھی' جواب میں اپنی تعریف سننا کسے اچھا نہیں لگتا خصوصاً" اس صورت میں جب وہ تعریف کا مستحق بھی ہو لیکن شہزاد کا ردعمل اس کی توقع سے کچھ بڑھ کے تھا اس لیے خوشی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی جھجک اور شرم نے اس کا چہرہ گلنار کر دیا۔

شہزاد نے بے حد دلچسپی سے اسے لبوں کی لرزش پہ قابو پا کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا' اس کی

پلکوں کے سرمئی گھنیرے سائے رخساروں پہ پھیلی شفق میں مدغم ہو رہے تھے اور وہ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے مسل رہی تھی۔ بے حد خود اعتماد' شاہانہ بے نیازی کی مالک اس رکھ رکھاؤ والی لڑکی کا یوں بلش کر جانا شہزاد کے لیے حیران کن تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"مس گل مہر آپ تھینکس کس لیے کہہ رہی ہیں۔ شکریہ تو کسی مہربانی' کسی عنایت کے جواب میں ادا کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ تعریف و توصیف آپ کا حق ہے۔ آپ نے جتنی محنت کی ہے اور جتنا شاندار کام پیش کیا ہے اس کے لیے اس تعریف کو آپ اپنا حق سمجھ کے وصول کر سکتی ہیں"

"یعنی سر' ہم اپنے منہ میاں مٹھو کہلائیں۔" وہ اس مشورے پہ حیران ہوئی۔

"کیا حرج ہے۔" شہزاد نے شانے اچکائے۔

"خود پسندی کوئی بری چیز نہیں مس گل مہر اگر خود میں واقعی پسند کرنے لائق کوئی چیز ہو تو خود کو پسند کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہم بہت سے لوگوں کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتے ہیں صرف اور صرف ان کی چند ایسی خصوصیات کی وجہ سے جو ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ مثلاً" کسی کی شکل و صورت' بے پناہ حسن و جمال' کسی کی خوش گفتاری و حس مزاح' کسی کا ہنر یا مہارت کسی کی ذہانت و قابلیت' یا دولت شہرت وغیرہ۔۔۔ تو اگر ان میں سے چند یا ایک بھی خصوصیات خود ہماری اپنی ذات میں موجود ہیں تو کیا ہم اپنی ذات سے متاثر نہیں ہو سکتے؟"

"کچھ عجیب سا فلسفہ ہے ——— لیکن ہمیں قائل ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ ہمیں کچھ پسند بھی آ جائے تو ہم اس کا اظہار فوراً" نہیں کر سکتے۔"

"فلسفہ تو آپ کا بھی عجیب ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"بھئی ایک چیز پسند آ گئی ہے تو کھل کر اظہار کریں۔"

"لیکن یہ پرکھنا بھی تو ضروری ہے کہ ہمیں جو پسند آیا ہے وہ واقعی پسندیدگی کے معیار پہ پورا اترتا بھی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں جو چیز اٹریکٹ کر گئی ہے وہ محض اشتباہ نظر ہو۔"

"بحث مجھے کبھی پسند نہیں رہی خصوصاً" اخلاقی بحث کیونکہ میرا تجربہ ہے' دو فریق اپنے اپنے مختلف نظریات کو لے کر کتنے بھی دلائل کیوں نہ دے لیں' دوسرے کو قائل نہیں کر سکتے اگر کر بھی لیں تو اس پسپائی کو منوا نہیں سکتے ۔۔۔ اس لیے میں بحث مباحثہ کو ہمیشہ نظر انداز کرتا ہوں لیکن۔۔۔" اس کے اتنا کہنے پہ گل مہر محتاط ہو کر اپنی فائلز سمیٹنے لگی۔

"لیکن آج اندازہ ہو رہا ہے کہ ذہین لوگوں سے بحث کرنے میں بھی ایک الگ مزہ ہے۔ آپ قائل کر نہیں پاتے' خود ہو نہیں سکتے مگر خوب صورت اور اچھوتے نظریات سے لطف اندوز ضرور ہو سکتے ہیں۔"

"اب اگر ہم آپ کا شکریہ ادا کریں گے تو یہ آپ کے فلسفہ خود پسندی سے متصادم ہو گا۔" آبدار موتیوں سے شفاف دانتوں کی ایک جھلک اس کے تبسم سے ہویدا ہوئی۔

"اس لیے ہم آپ کی جانب سے ملنے والے اس ٹائٹل "ذہین" کو بھی اپنا حق سمجھ کے وصول کر رہے ہیں۔" وہ [illegible] ہوئی۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیوں نہ آج ہم لنچ ایک ساتھ کریں۔"

"سوری سر۔" وہ فوراً" اپنے خول میں سمٹ گئی۔ مسکراہٹ محتاط ہو کے لبوں کے گوشوں کے پیچھے چھپ گئی۔ [illegible] خوشگواریت اور دوستانہ انداز اب ندارد تھا۔

"ہم لنچ گھر سے لاتے ہیں۔ باہر سے کھانا ہمیں پسند ہے نہ کسی کے ساتھ باہر جانا۔"

"اتفاق سے آج میرا لنچ بھی گھر سے آیا ہے۔"

"آپ اس سے پہلے بھی اپنے ورکرز کے ساتھ لنچ کرتے رہے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ہم آپ کا ریکارڈ کس لیے خراب کریں۔" بغیر کسی معذرت یا مجبوری بیان کرنے کے وہ بڑی خوب صورتی سے اور وقار کے ساتھ اسے انکار

کرگئی۔ شہزاد بجائے برا ماننے کے اپنی اس حرکت پہ شرمسار ہو گیا۔ اس کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا اسے اس قسم کی آفر کرنے کا ایک عرصے سے اس لائن میں ہونے کی وجہ سے اسے انسانوں کی پرکھ ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا جواب کیا ہوگا۔ وہ کسی بھی طرح ویسی لڑکی نہیں لگتی تھی جو اپنے باس کی جانب سے لنچ کی آفر کو ایک سعادت سمجھتے ہوئے ہنسی خوشی ساتھ چل پڑے گی۔

"مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کی نظروں میں میرا تاثر کتنا غلط ابھرا ہوگا۔"

شہزاد کو تاسف ہونے لگا۔ اس سے پہلے اگرچہ ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی کسی ورکر یا کولیگ یا اپنے انڈر کام کرنے والی کسی فنکارہ پہ اتنا مہربان ہوا ہو کہ اسے باہر لے جانے کی پیشکش کرے لیکن اس کے پیش نظر اپنا اچھا تاثر قائم کرنا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کو اس قابل ہی نہ سمجھتا تھا۔ جانتا تھا یہ سب ان عورتوں میں سے ہیں جو ایک ہلکی پھلکی بے غرض سی دوستانہ آفر کو بھی اپنے مخصوص کاروباری انداز میں لیتی ہیں اور پھر کمبل ہو جاتی ہیں۔ گل مہر اگرچہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے ساتھ وہ خاصی خوشگواری محسوس کرتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کس قدر محتاط تہذیب یافتہ، سلجھی ہوئی اور باکردار لڑکی ہے کام کے دوران بھی اس کا اسکارف سر سے نہ اترتا تھا۔ اس کا لباس شائستہ، لہجہ پروقار اور چال پر اعتماد ہوتی تھی جو خود بخود دوسروں کو اس کا احترام کرنے پہ مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے ٹیلنٹ کی قدر اور اس کی ذہانت کو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کے نسوانی وقار کا بھی بے حد احترام کرتا تھا کہ وہ جس شعبے سے وابستہ تھا وہاں ایسی خواتین خال خال ہی تھیں جو تعظیم کے لائق ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنا تاثر اس کی نظروں میں ابھارنے کی خواہش کب اس کے اندر عود کر آئی اس کا اندازہ اسے نہ ہو سکا۔

اپنی بے ساختہ مگر نامناسب حرکت اور اس کے ردعمل پہ وہ جھنجلا گیا۔ مارے جھنجلاہٹ کے اس نے دوبارہ گل مہر کو آفس میں بھی نہیں بلوایا ورنہ اگلی قسط کے بارے میں اس سے ڈسکشن بہت ضروری تھی۔ اس میٹنگ کے لیے وہ رائٹر کو بھی طلب کر چکا تھا۔ اسے تو فون کر کے منع کر دیا گیا۔ ایک اور پروفیشنل میٹنگ بھی کینسل کرانے کے بعد وہ آفس سے سیدھا گھر چلا گیا۔

بالو نے خلاف معمول اسے سرشام ہی گھر پایا تو حیران کم پریشان زیادہ ہو گئی۔

"خیر تو ہے شہزادے، آج بڑا چھیتی (جلدی) آ گیا ہے۔ طبیعت تو چنگی ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے، بس ذرا تھکن زیادہ ہو گئی تھی، سوچا آرام کر لوں ایک دو گھنٹے تک، رات کو ایوارڈ فنکشن میں بھی جانا ہے۔" وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے کے بعد جھک کر شوز اتارنے لگا۔

"روٹی کھائی تھی؟ آج تیری پسند کے بھرے کریلے پکائے تھے، نال بینگن کا بھرتہ بھی اس لیے سوچا ڈرائیور کے ہاتھ روٹی بھیج دوں۔ روز تو ہوٹلوں کا کھاتا ہی ہے... کیا ہوا پتر اچھا نہیں لگا میرا ٹفن بھیجنا؟" اس کی خاموشی و بے زاری پہ ٹھٹک کے بالو نے تشویش سے پوچھا۔

"تیرا پیو پہلے ہی کہہ رہا تھا، روٹی نہ بھیج، کہیں شہزادہ گرمی نہ کھا جائے۔ تجھے واقعی برا لگا؟" ماں کے لہجے میں ڈرا ڈرا اندیشہ پا کر شہزاد کا دل پگھل گیا۔

"اس میں برا لگنے والی بات کون سی تھی۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔

"کرموں کہہ رہا تھا کہ کہیں شہزاد کی بے عزتی نہ ہو جائے اپنے افسر دوستوں کے سامنے۔ وہ بڑے بڑے ہوٹلوں سے کھانا منگواتا ہے۔ جن کا مزا بھی الگ اور سجاوٹ بھی وکھری۔ اور تو اس اسٹیل کے پینڈوؤں والے ٹفن میں کریلے اور بھرتہ رکھ کے بھیج رہی ہے... پر میں کیا کرتی، تیری پسند کی چیزیں تھیں، رہ نہ سکی ماں صدقے تو نہ چکھتا تو ماں کے حلق سے برکی (لقمہ) نہیں لنگنی (گزرنی) تھی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ شہزاد کے برابر بیٹھتے ہوئے اس نے بیٹے کے گھنے بالوں میں اپنا گدرایا ہوا سانولا ہاتھ پھیرا۔ صوفے کی پشت سے تھکے تھکے انداز میں سر ٹیکے شہزاد کی بند آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آئی۔ یہ سخت ہاتھ... کھردری انگلیاں... جن کا لمس اکلوتے بیٹے کو چھوتے ہی ریشم ہو جاتا تھا۔ اس کی رگ رگ میں سکون اترنے لگا۔

"کئی راتوں سے اچھی طرح سو نہیں سکا ہوں۔" اس نے اسی طرح آنکھیں موندے ایک چھوٹے بچے کی طرح ماں سے شکایت کی۔

"سیاپے بھی تو ہزار پال رکھے ہیں۔ کام اپنی جگہ، آرام اپنی جگہ۔ کیسا لشکارا رنگ تھا جیسے دودھ میں سیندور ملا ہو۔ سارے کہتے تھے بالو، یہ انگریز تو نے پیدا کیا ہے؟ میں ڈر کے تجھے ہاتھ نہ لگاتی تھی کہ میرے کالے ہاتھوں سے تیرے گورے ریشم سے پنڈے پہ کالک نہ لگ جائے۔ اللہ بخشے تیری دادی نے سمجھایا، ماں کے ہاتھوں سے بچے کے اندر نرا نور ہی نور اترتا ہے جھلیے اور اب دیکھ، سویرے سے آدھی رات تک پھر پھر کے تو نے اپنا کیا حشر کر لیا ہے۔ زیادہ تھکن ہو جائے تب بھی نیند مشکل سے آتی ہے لا میں تیرے سر میں کوڑے تیل (سرسوں) کی مالش کر دوں۔"

"نہیں، اس کی اسمیل... میرا مطلب ہے اس کی بو مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"اچھا خیر، دھنیے اور آملے کا تیل بھی ملا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ مل دیتی ہوں۔ بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دماغ ٹھار دے گا۔" اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر وہ فوراً اٹھی اور پل بھر میں شیشی لے کر دوبارہ وہاں موجود تھی۔ شہزاد اب صوفے سے اتر کر کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔ بالو کے بیٹھنے پر اس نے اپنا سر ماں کی گود میں گرا لیا اور ان کے گھٹنوں سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

"ماں صدقے، میرا شہزادہ پتر۔"

ایک مدت کے بعد اس کے لاڈ اٹھاتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئی۔ اس کے گھنے بالوں میں تیل فوراً جذب ہو گیا، وہ نرمی کے ساتھ اپنی انگلیاں ایک خاص ترتیب میں اس کے سر پہ پھیرنے لگی۔ اسے سرور آنے لگا۔ سارے دن کا تھکا ہارا بدن ہلکا پھلکا ہو گیا۔ کوئی ٹینشن، کوئی فکر... کوئی تردد نہ رہا۔ ڈھیر سارا تیل لگانے اور خوب اچھی سی مالش کرنے کے بعد بالو نے اپنی گود میں دھرا اس کا چہرہ اپنے تیل سے لپے ہاتھوں میں تھاما اور جھک کر اس کی چکنی ہوتی چمکتی ہوئی پیشانی چوم لی۔

"میرا چن ورگا پتر، اللہ نظر بد سے بچائے۔"

"شادا بھئی بڑے لاڈ ہو رہے ہیں۔" کرم الٰہی نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے جو ماں بیٹے کی محبت کا یہ مظاہرہ دیکھا تو کہہ اٹھا۔

"چلو جی، نظر نہ لگا دینا میرے پتر کو۔"

"نظر کیسے لگے گی، نظر بٹو تو خود ہے، جو میرے گبھرو کے ساتھ بیٹھی ہے۔" اس نے بیوی کو چھیڑا اور وہ سچ مچ چڑ گئی۔

"ہاں ہاں اب تو نظر بٹو ہی لگوں گی۔ وہ ویلا نہیں یاد رہا جب اسی کلوٹی کے پیچھے پھرتا پھرتا ہف (تھک) جاتا تھا "بالو، اک واری میرے ول تک لے... سوں رب دی جندڑی وار دیاں گا۔" (ایک بار میری طرف دیکھ لو، خدا کی قسم زندگی وار دوں گا۔)

اس نے نقالی اتارتے ہوئے کہا تو شہزاد کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بند آنکھوں کے ساتھ بھی ماں کا لال بھبھوکا ہوتا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔

"جس دن جو تیرے گھر آئی، پانڈے مانجھ مانجھ کے ہاتھ سواہ (راکھ) ہو گئے، چولہے کے ساتھ چولہا بن گئی۔ ورنہ یہی بالو تھی، جس کے ہاتھ تجھے جامن کے پتر (پتے) جیسے ملوک لگتے تھے، یہی بالو تھی، جس کے آگے پیچھے تو منت کرتا پھرتا تھا "نی بالو، ہاں کر دے نئیں تے میں کسے جوگا نہیں رہواں گا۔" (ہاں کر دو ورنہ میں کسی قابل نہیں رہوں گا۔)

"چل چل حیا کر۔" جوان بیٹے کے سامنے اپنی جوانی کے کارناموں کا تذکرہ سن کر کرم الٰہی جھینپ گیا۔

"ہاں میں حیا کروں، تجھے حیا نہیں آتی، جس رن (بیوی) نے اتنے سال تیری چاکری میں گزار دیے آج وہی تجھے نظر بُو لگتی ہے۔" لگتا تھا، یہ طعنہ جو کرم الٰہی نے مذاق مذاق میں دیا تھا، بلقیس بیگم کے دل کو جا لگا تھا۔

"اب بس بھی کرو۔ شروع ہی ہو جاتی ہے۔ عمر کا ہی لحاظ کر لے۔"

"تاں کیا ہوا ہے میری عمر کو۔ اگر میں بڈھی ہو گئی ہوں تو تو کھوسٹ ہو چکا ہے پھونس بن چکا ہے۔"

"ایسہ ویکھ بھلئے لوکے۔۔۔" بالآخر کرم الٰہی نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"معاف کر دے، اور کسی چیز کا تو پتہ نہیں پر تیری زبان پہ بڑھاپا کبھی نہیں آ سکتا۔ یہ تو روز بروز اور جوان اور بھی تگڑی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا مقابلہ کون کرے۔"

"بس۔۔۔ میں کچھ دیر آرام کرنے اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، ایک کپ اچھی سی چائے بھجوا دینا۔" شہزاد نے ماں کے ہاتھ روک کر کہا جو تیز جذبات میں اور بھی تیزی کے ساتھ اس کے سر پہ چل رہے تھے۔

"چاء کیوں؟ فیر تو ساری نیند اڑ جائے گی۔ اتنی مالش اسی لیے کی ہے کہ تو اچھی سی نیند لے لے۔"

"اس وقت سو گیا تو لمبا ہی سوؤں گا، اسی لیے سستی بھگانے کے لیے اسٹرونگ سی چائے مانگی ہے۔ یونہی ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام کر لیتا ہوں۔ رات کو ایوارڈ فنکشن میں بھی جانا ہے۔ اس کی تیاری بھی کرنی ہے۔ تیل بھی آپ نے اس قدر تھوپ دیا ہے کہ مشکل سے ہی نکلے گا۔"

"کون سے ایوارڈ ہو رہے ہیں پتر؟" کرم الٰہی نے شوق سے پوچھا۔ جواباً شہزاد نے ملک کے ایک مشہور اور کثیر الاشاعت روزنامے کا نام لیا جو ان ایوارڈز کا انعقاد کر رہا تھا۔

"بہت بڑا فنکشن ہو گا۔ تو کہے پتر تو میں بھی ساتھ چلوں؟" وہ جانتا تھا، اس کا بیٹا عرصے سے اس پہ ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پہ قدغن لگا چکا ہے پھر بھی بڑی آس سے اپنی خواہش بیان کر گیا۔

"نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ خود بخود درشت ہو گیا۔ یہی بات وہ آرام سے کہہ دیتا، اپنے باپ کی خرابی صحت کو عذر بنا کر منع کر دیتا تو شاید کرم الٰہی مان بھی جاتا۔ مگر بیٹے کے ماتھے پہ آنا" فاناً نمودار ہوتی ناگوار شکنیں اور دو ٹوک درشت انکار اسے توڑ کے رکھ گیا۔ تلخی اس کے اندر بھی گھل گئی۔

"ضرورت کیوں نہیں؟ مر کھپ گیا ہوں میں؟ نام و نشان مٹ چکا ہے کیا میرا، جو مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ سوائے اس سجی سجائی قبر کے جو گرمی میں ٹھنڈی اور سردی میں گرم رہتی ہے اور جسے تو نے میرے کمرے کا نام دے رکھا ہے۔ اس پہ میرے نام کی تختی بھی لگا دے، مرحوم کرم الٰہی کے نام کی۔"

"ہائے ہائے، خیر دی گل کرو۔" بالو دہل گئی۔

"کیا میرا دل نہیں چاہتا کسی بیلی سے ملنے کو، کسی یار سے گپ لگانے کو، میرے لیے دوائیوں کی شیشیاں، یہ لاٹھی، ٹیکے اور گرم پانی کی بوتل ہی رہ گئی ہے لوگ وہیل چیئر پہ بیٹھے بیٹھے بھی دنیا گھوم لیتے ہیں۔ تو نے تو مجھے جیتے جی دفن کر کے رکھ دیا ہے۔"

وہ کمرے کی جانب بڑھتے شہزاد ہی کو سنا رہا تھا جو قطعی طور پہ یہ ساری باتیں نظر انداز کرتا ہوا دروازہ کھول رہا تھا۔ اس کی لاتعلقی اور بے نیازی کرم الٰہی کو اور مشتعل کر گئی۔ ایک تو عمر کا تقاضا، دوسرے بیماریوں کی چڑچڑاہٹ اور سب سے بڑھ کے تنہائی کا عذاب۔۔۔ سب سے کٹ کر رہنے کا دکھ اسے ایسا ہی تلخ بنا دیتا تھا۔

"جا، جا۔۔۔ کان لپیٹ کر اپنے فوم کے گدے پہ آرام کر۔ بڈھا بھونکتا ہے تو بھونکتا رہے، تیرا کیا جاتا ہے، خون سفید ہو گیا ہے۔" وہ بلقیس کے اشاروں کو خاطر میں نہ لاتا ہوا چلاتا رہا۔

"کون سا خون؟" اچانک شہزاد دروازہ کھولتے کھولتے پلٹ گیا۔

"یہ خون۔۔۔ یہ والا خون۔"

اس نے اپنا دایاں ہاتھ لہرا کے سائیڈ پہ رکھے ٹیبل کی گلاس ٹاپ پہ دے مارا۔ اس پہ رکھا ٹیلی فون سیٹ اور کرسٹل کا ڈیکوریشن پیس اچھل کر دور جا گرا۔ گلاس ٹاپ چکنا چور ہو کر ماربل کے فرش پہ بکھر گئی۔ شہزاد کے ہاتھ

پہ ایک لمبی خراش آئی تھی جس سے خون قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا۔ کرم الٰہی کو چپ لگ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے وحشت زدہ چہرے اور خون آلود ہاتھ اور کلائی کو دیکھنے لگا۔

بالو سراسیمہ انداز میں اس کی جانب لپکی۔

"ایسہ کی کیتا؟" اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ وہ اپنے نئے ہلکے گلابی ململ کے دوپٹے سے اس کا خون صاف کرنے لگی۔ آنسو اس کے سانولے چہرے کی لکیروں میں رستہ بنانے لگے۔

"کرمے، کج ہوش کر، کتنی واری کہا ہے، شہزادہ سارا دن کھپ کے آتا ہے، نہ ستایا کر اسے۔" وہ روتی جا رہی تھی، اس کا ہاتھ بار بار چومتی جا رہی تھی اور اپنے شوہر کو ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے شکوہ بھی کر رہی تھی جو خود شہزاد کے اس انتہائی ردعمل پہ حیران تھا۔

"یہ والا خون ہے۔۔۔ جس کے سفید ہونے کا شک ہے آپ کو بتائیں یہ سفید ہے؟" اس نے کلائی پہ بندھا دوپٹہ کھول کے اپنا زخم دکھایا۔

"کون سی کمی چھوڑی ہے میں نے آپ کی خدمت میں؟ یہ کمرہ جسے آپ قبر کہہ رہے ہیں، اس قبر کو گرمی میں ٹھنڈا اور سردی میں گرم رکھنے کے لیے میں نے موسموں کی شدت کی پرواہ کیے بغیر دن رات کام کیا ہے۔ یہ ڈاکٹر، دوائیاں، ٹیکے جو آپ کو عذاب لگ رہے ہیں، انہی کی وجہ سے آج آپ زندہ ہیں، بغیر وہیل چیئر کے صرف اس لاٹھی کے سہارے چل پھر سکتے ہیں ورنہ سستی شراب اور دیسی بیڑی نے آپ کے اندر کیا چھوڑا تھا؟ کون سا فرض ہے جو میں نے ادا نہیں کیا؟ چھوٹی عمر میں اپنا بوجھ خود اٹھا لیا۔ مگر میں نے کوئی شکوہ نہ کیا، اس طرح چلا چلا کے آپ سے جواب طلبی نہیں کی۔ خود پڑھا، آگے بڑھا، ایک مقام حاصل کیا، یہ دولت، شہرت، اور اپنی ان کامیابیوں کا ہر سکھ آپ کو پہنچانے کی پوری پوری کوشش کی۔ کیا میں آپ سے اتنی توقع بھی نہیں رکھ سکتا کہ آپ لوگ اس مقام کو قائم رکھنے میں میری ذرا سی مدد کر دیں۔ میرے نام، میری شہرت اور میرے مقام کو نقصان نہ پہنچائیں۔"

"اس کا مطبل ہے تیرے لیے تیرے ماں پیو۔۔۔ نری بدنامی ہیں۔" کرم الٰہی کی آواز پست ہو گئی۔ تذلیل کا دکھ اس کے لہجے میں کرلا رہا تھا۔

"ہمارے ہونے سے تیرا نام خراب ہوتا ہے، تیری عزت کو نقصان پہنچتا ہے۔" لاٹھی پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بیٹے کے بازو تھامے، اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی بالو خود بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔ اس کے ہاتھ خود بخود شہزاد کے شانے اور بازو سے الگ ہو کے اس کے اپنے پہلو میں آن گرے۔

"تو پھر ہمیں ایک بوجھ کی طرح اٹھائے کیوں پھرتا ہے پتر؟ اپنے گھر میں نظر بند رکھ کے تو کون سے ثواب کما رہا ہے۔ مرنے دے ہمیں، بلکہ اپنے ہاتھوں مار ڈال۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں، میرا یہ مطلب۔۔۔"

"تاں پتر، سب مطبل سمجھ آ گئے ہیں۔" کرم الٰہی نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے وضاحت سے روک دیا۔

"یہ تیری محبت نہیں مجبوری ہے، محبت ہوتی تو ہمیں سر آنکھوں سے لگا کر رکھتا۔ یہ مجبوری ہے، ضمیر کے آگے سر اٹھانے کی مجبوری، ہم پہ چار پیسے لٹا کے تو سمجھتا ہے سارے فرض ادا ہو گئے، جنت میں تیری جگہ پکی ہو گئی۔"

اتنی بدگمانی کے کھلم کھلا اظہار پہ شہزاد بپھر گیا۔ خود پہ کنٹرول کرنے کے ہنر سے وہ آشنا ہی کب تھا۔

"ہاں مجبوری ہے میری، میری مجبوری یہ ہے کہ میں معاشرے میں سر اٹھا کے جینا چاہتا ہوں، باعزت طریقے سے۔ کیا عزت اور رتبے کی خواہش رکھنا غلط ہے۔ انسان کے پاس جو چیز نہ ہو اسی کے لیے وہ تڑپتا ہے۔ میں بھی بہت تڑپا ہوں، اسی تڑپ نے مجھ سے دن رات محنت کرائی ہے اور آج جب چار لوگ مجھے عزت دیتے ہیں، آپ مجھ سے یہ بھی چھین لینے کے درپے ہیں۔ کیوں اپنے ساتھ لے کر جاؤں میں آپ کو؟ کیا بتاؤں لوگوں کو۔۔۔ یہ شخص ابن فلاں ابن فلاں۔۔۔ جو جدی پشتی میراثی ہے، بھانڈ ہے۔۔۔ میرا باپ ہے اور میں جسے تم جھک کر اتنی تعظیم دے رہے ہو، اس اعلیٰ خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ ہوں۔ معاف کیجیے گا، میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں۔ آپ کا

وجود میرے لیے قابل تعظیم ضرور ہے کیونکہ آپ میرے باپ ہیں مگر آپ کا وجود قابل فخر ہرگز نہیں ہے کہ میں اسے تمغے کی طرح اپنے سینے پہ سجا تا پھروں۔"

وہ آپے سے باہر ہو کے وہ سب بھی کہہ گیا جو ہمیشہ خود کو کہنے سے روک لیتا تھا۔ بالو بھی سخت رنجیدہ ہو گئی۔

"شہزادے' مجھے نہ پتہ تھا تیری نظروں میں ہماری یہ اوقات ہے۔ میرا خیال تھا تجھے صرف ہمارے سیدھے سادے پینڈو ہونے یا ان پڑھ ہونے کی شرمندگی ہے۔ مگر تو تو اک منٹ میں ہمیں مٹی میں رول گیا ہے۔ جس پیو کا نام تیرے لیے گالی ہے' وہ پیو تیرے پیدا ہونے کی خوشیوں میں ننگے پیر گلیوں میں ناچتا پھرتا اعلان کرتا تھا' جس ماں کو دیکھ کر تیری نظریں شرم سے جھک جاتی ہیں' وہ سودائن تو خود کو ملکہ سمجھنے لگی تھی تیرے جیسے شہزادے کو پیدا کر کے۔ آج تو جو کچھ ہے' اللہ کے کرم سے ہے مگر اللہ کے آگے ماتھا تو تیرے ماں پیو ہی ٹیکتے رہے ہیں' تیری لمبی جندگی اور اونچے نصیبوں کی خاطر۔ اسی پیو کی دعائیں لگی ہیں تو تیرے بھاگ جاگے"

"کیسی دعائیں؟ ضرور مانگی ہوں گی مگر میری ترقی کی نہیں بلکہ اس بات کی کہ میں بھی باپ دادا کے پیشے میں نام کماؤں۔ ابا کو میری تعلیم سے دلچسپی ہی کب تھی' وہ تو کب کا مجھے اس گند میں دھکیل چکے ہوتے۔ مگر یہ میں تھا جس نے اپنے بل بوتے پہ یہ راستہ چنا اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔"

"راستہ تو تیرا بھی اسی طرف جاتا ہے' پھر جب منزل ایک ہے تو میرے راستے میں کیا برائی ہے۔"

"ناچنے والے اور نچانے والے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ڈگڈگی بجانے والے مداری کی حیثیت بہرحال بچہ جمورا سے بہتر ہی ہوتی ہے۔ میں کسی اور شعبے میں بھی جا سکتا تھا۔ مگر اس راستے کو صرف اسی لیے چنا کہ میں آپ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ طریقے سے کام کیا جائے تو اس شعبے میں بھی نام اور پیسے کے ساتھ ساتھ عزت کمائی جا سکتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

ان آنکھوں کی مستی کے دیوانے ہزاروں ہیں

ادا کی لوچ دار کمسن آواز پورے ہال میں رقص کر رہی تھی۔ وہ سب لوگ جو اس سے پہلے ایک معروف کامیڈین کے چٹکلوں پہ قہقہے لگا لگا کر تھک چکے تھے اور ایک ماہر رقاصہ کے ہوشربا رقص پہ اچھل اچھل کے بے تاب ہو چکے تھے' اب دم سادھے بیٹھے اس دلفریب حسن کی مالک نوعمر گلوکارہ کی پرسوز آواز میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں شہزاد بھی شامل تھا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی ادا کا نام اناؤنس ہوتے ہی وہ بے چین ہو گیا مگر اٹھ کر جانے والی حرکت نہیں دہرائی۔ پہلے ہی وہ گھر سے سخت ڈپریس نکلا تھا۔ کرم الٰہی اور بلقیس سے ہونے والی تلخی اب تک اس کے اعصاب پہ سوار تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس تو نکال بیٹھا تھا مگر اندھیرے کمرے میں ٹہل ٹہل کر سگریٹ پھونکتے ہوئے دیر تک شرمندہ بھی ہوتا رہا کہ اس کے تیز دھار الفاظ کی زد میں آ کر اس کے بوڑھے ماں باپ کے دل پہ نجانے کیا کیا گزری ہو گی۔ لیکن کیا کیا جا سکتا تھا' یہ واحد مسئلہ تھا جس کے معاملے میں وہ کوئی کمپرومائز کرنے پہ تیار نہ تھا۔ جب طبیعت پہ پژمردگی حد سے بڑھنے لگی تو اس نے گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ ایوارڈ پہ جانے کا پروگرام تو پہلے ہی سے تھا سو اس نے شاور لیا اور فریش ہونے کے بعد سب باتیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا ہوا وہاں آ گیا۔

اور اگر اسے علم ہوتا کہ یہاں آنے کے بعد اس کی الجھن میں کمی ہونے کی بجائے سراسر اضافہ ہونے والا ہے تو وہ یقیناً "اپنے بند اندھیرے کمرے کی تنہائی کو ترجیح دیتا۔

"اب مجھے عادی ہو جانا چاہیے ان دھچکوں کا یہ جان لینا چاہیے کہ اب جب بھی میرے قدم ایسے کسی مقام پہ رکیں گے' سامنے میرے ضبط کا امتحان لینے وہ کھڑی ہو گی۔ مجھے محتاط ہو جانا چاہیے' اس کا سامنا کم سے کم ہو' اس لیے مجھے ایسے فنکشنز میں کم سے کم جانا چاہیے۔"

کمپیر کی زبانی "ادا" کا نام اناؤنس ہوتے ہی کرسی کے ہتھے پہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے ارادہ

کیا تھا۔

کاہی رنگ کے گھیر دار لہنگے پہ مقیش اور دبکے کا بھاری کام تھا۔ اسی رنگ کے ذرا گہرے شیڈ میں ویلوٹ کی مختصر سی کرتی تھی جس کے گولائی میں بنے گلے اور آدھی آستینوں کے کناروں سے جھلمل ستارے لٹک رہے تھے۔ کلائیوں تک بھری چوڑیاں' تمام انگلیوں میں پھنسی انگوٹھیاں' صراحی دار بلوریں گردن میں سبز نگوں والا سونے کا گلوبند' پشت پہ لہراتے ریشمی بالوں کی گھنی آبشار' نفاست سے کیا میک اپ اور ایک جذب کے سے عالم میں نغمہ سرا ادا۔

پہلی نظر میں وہ اسے پہچان ہی نہ پایا تھا۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب اس نے اسی طرح اسے اسٹیج پہ نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ اس دن خود پہ قابو نہ پا سکا تھا اور فوراً" وہاں سے چلا گیا تھا۔ مگر اتنا تو یاد تھا کہ وہ اس روز جیسی بھی لگ رہی تھی اتنی بااعتماد ہرگز نہ لگ رہی تھی۔ سیاہ لباس میں اس کا حسن اس روز بھی قیامت ڈھا رہا تھا لیکن وہ اس قیامت سے بے خبر بھی تھی اور بے نیاز بھی جبکہ آج۔۔۔ وہ خود قیامت برپا کر دینے والے ناز و ادا کو کمال خوبی سے استعمال کر رہی تھی۔ اس کی صرف آواز ہی نہیں' کمان سے ابروؤں کی جنبش پہ بھی دیوانے مچل مچل کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ اسے یوں نوک پلک سے آراستہ۔۔۔ اداؤں کے ہر ہتھیار سے لیس۔۔۔ اور اس ماحول میں پوری طرح ہم آہنگ ہوتے دیکھ کر شہزاد سلگ کر رہ گیا۔

"بہت کم وقت لگایا تم نے دعا نور۔۔۔ دعا اور نور کے حصار سے نکلنے میں' کوئی تمہارے باپ کو مبارکباد دے کہ آج اس کی بیٹی مکمل طور پہ ایک کماؤ بیٹی بن گئی ہے۔ اس کی صرف آواز ہی نہیں' حسن۔۔۔ نخرہ۔۔۔ سنگھار۔۔۔ مسکراہٹ سب کچھ برائے فروخت ہے۔"

وہ تاسف سے اسے لہرا لہرا کر نغمہ سرا ہوتے دیکھتا رہا۔ کئی منچلے اسٹیج پہ چڑھ کے اس پہ ہزار ہزار کے نوٹ نچھاور کر رہے تھے اور وہ جانتا تھا کہ کئی نوٹوں کے ساتھ ان عیاش لوگوں کے وزیٹنگ کارڈز بھی پن اپ ہوں گے۔

اک تم ہی نہیں تنہا۔۔۔ الفت میں میری رسوا

اس نے قیمتی انگوٹھیوں سے سجا اپنا مخروطی انگلیوں والا ہاتھ اک ناز سے لہرا کے کہا تو شہزاد اپنے خیالوں سے چونک اٹھا۔ اس کی لوچ دار آواز کی لے پر۔۔۔ اور ہاتھ کی دلفریب ادا پہ سارا ہال داد و تحسین کے شور سے گونج اٹھا تھا۔ شہزاد نے غور کیا۔۔۔ اس کے ہاتھ کا رخ اسی جانب تھا جہاں وہ بیٹھا تھا۔

اس شہر میں تم جیسے۔۔۔ دیوانے ہزاروں ہیں

اس کے برابر بیٹھا فیصل آباد سے آیا کپڑے کا مشہور اور مالدار تاجر بے قابو ہو کے اٹھا اور اسٹیج کی سیڑھیاں تیزی سے پھلانگتے ہوئے اوپر چڑھ گیا' اس کے ہاتھوں میں دبی بڑے نوٹوں کی گڈی ایک تواتر کے ساتھ ادا پہ برسنے لگی۔ اس گہرے سانولے شخص کے مکروہ چیچک زدہ چہرے کی جانب ادا نے ایک مسکراتی پیار بھری نگاہ ڈالی۔ ہزاروں روپے کا کچھ تو خراج ادا کرنا تھا۔

شہزاد ایک مستقل اذیت سے گزر رہا تھا لیکن چونکہ اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ آئندہ کبھی اس کی موجودگی سے خائف ہو کر فرار نہیں ہو گا اس لیے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہیں بیٹھا رہا۔۔۔ یہ الگ بات کہ اس کے لمحہ لمحہ پہلو بدلنے سے لگتا تھا جیسے وہ سلگتے ہوئے انگاروں یا زہر میں بجھے کانٹوں پہ بیٹھا ہوا ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں کی تلخی کو وہ فضا میں اگلنے کی بجائے اپنے اندر نگلتا جا رہا تھا۔

"قیامت ہے۔۔۔ آگ لگ جاتی ہے اک نظر دیکھتے ہی۔" اس کے دائیں جانب بیٹھے ایک نامور صحافی نے جسے نیا نیا ڈرامہ ڈائریکٹر بننے کا شوق چرایا تھا۔ شہزاد کو ٹہوکا دیتے ہوئے تائید طلب لہجے میں کہا۔ شاید وہ اس کی بے چینی کو اپنی بے چینی کے تناظر میں دیکھ رہا تھا۔ وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔

"لو جی' اپنے ملک صاحب کی تو سٹی گم ہو گئی۔" اس نے پیچھے مڑ کر اپنے ایک حواری کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اپنا ملک زیرو میٹر کنوارہ ہے رضوی صاحب۔" حق نواز صاحب نے شہزاد کی طرف داری میں کہا۔ "جب آپ جیسے انسان کا ایمان ایسی قیامت کو دیکھ کر ڈانواں ڈول ہو سکتا ہے جس نے تین تین اپنے وقت کی مشہور قیامتیں نکاح میں لے رکھی ہیں تو اپنے شہزاد ملک کا دل تو ابھی بھرپور جوان ہے۔

یہ وہی سینئر رائٹر تھا جو "شیر دل" کا مصنف تھا اور اپنی بزرگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اکثر شہزاد سے ایسے مذاق کر جاتا۔ صحافی صفدر رضوی اپنے ماضی کی تین قیامتوں کا ذکر سن کر ذرا سا جھینپ گیا۔

"وہ تینوں قیامتیں اپنے تئیں کتنی مطمئن ہوں گی کہ صفدر رضوی جیسے شخص سے نکاح کر کے وہ معاشرے میں باعزت ہیں۔ صفدر رضوی جو ایک تعلیم یافتہ شخص ہے 'معزز زندہی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے' اعلیٰ شجرہ کا حامل ہے... اس کی منکوحہ کہلانے سے ان کی حیثیت بدل جائے گی... یہی سوچا ہو گا انہوں نے۔ مگر کاش وہ سن لیں کہ آج بھی ان کی حیثیت 'قیامت کی ہے۔ آج بھی ان کا ذکر چٹخارہ لینے والے انداز میں محفل میں رنگ بھرنے کی خاطر کیا جاتا ہے اور اس محفل میں خود ان کا وہ شوہر بھی موجود ہوتا ہے جس کا نام انہوں نے اپنے نام کے آگے اسی لیے لگایا تھا کہ ان کا نام بھی اسی بہانے عزت سے لیا جائے گا۔" شہزاد نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔

"غیرت کے نام پہ مرمٹنے کا دعویٰ کرنے والا صفدر رضوی' ہے کسی کی مجال کہ بھری محفل میں اس کے خاندان کی کسی عورت کا نام لے سکے۔ مگر وہی غیرت مند رضوی یاروں دوستوں کی زبانی ان قیامتوں کو فتح کرنے کا ذکر سن کر فخر محسوس کر رہا ہے... کیوں؟"

✲ ✲ ✲

"آج پتہ چلا ہے کہ میں کسی فنکارہ کا باپ ہوں۔"

اللہ وسایا نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اپنے کرتے کی بھاری 'لٹکتی ہوئی جیب کو تھپتھپا کے کہا۔ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر تھکی تھکی سی بیٹھی ادا نے ایک تلخ نظر آگے بیٹھے اپنے چہکتے ہوئے باپ پہ ڈالی۔ اس کا چہکنا' بات بے بات ہنسنا سمجھ میں آتا تھا' آج ہر چیز اس کی توقع سے بڑھ کے تھی۔ آج اس کی بیٹی بغیر کسی بحث مباحثہ کے بڑے دل کے ساتھ سج سنور کے گانا گانے گئی تھی۔ آج اس نے دوسروں کی حد سے بڑھی خوش اخلاقی کے جواب میں بے رخی سے منہ پھیرنے کی بجائے مسکرا مسکرا کر ان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس کے اسی نئے اور تبدیل شدہ رویے کی بدولت اس کی پذیرائی بھی معمول سے زیادہ ہوئی جس میں اللہ وسایا کو بھی حصہ ملا۔ اسے خاص نشست پیش کی گئی' مہنگے سگریٹ دیے گئے' چند شرفاء سے تعارف حاصل ہوا۔ اسٹیج پہ اتنے نوٹ نچھاور ہوئے کہ جتنے پیسے اسے اس اسٹیج پہ پرفارم کرنے کے ملک مقبول کی جانب سے ملے تھے' مجموعہ دگنے ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ صرف دو اخبار والوں نے انٹرویو کے لیے ملاقات کا وقت طے کر لیا بلکہ ایک پروڈیوسر نے اپنی نئی فلم کے گانے ادا سے گوانے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ وہ تو فوراً "ہاں" کرنا چاہتا تھا۔ مگر ادا نے سوچ کر بتاؤں گی' وقت ہے کہ نہیں کہہ کر ٹالا۔ بعد میں وہ دبے الفاظ میں بیٹی کو یہ پیشکش قبول کر لینے پہ آمادہ کر رہا تھا کہ ملک مقبول نے گھر کا۔

"کیوں اسے بے مول کر رہا ہے۔ ٹھیک جواب دیا ہے ادا نے۔ دیکھنا اگلی ملاقات میں وہ پروڈیوسر منہ مانگی رقم کی پیشکش کرے گا' شاید ادا کو فلم کی ہیروئن بنانے کی آفر بھی کرے۔"

وہ سر ہلا کے رہ گیا' ویسے بھی اس پہ اسٹیج سے اکٹھے کیے نوٹ گننے کی بے تابی تھی' بحث کیا کرتا' اس وقت بھی اس کا بس نہ چل رہا تھا' ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی گنتی کرنا شروع کر دے' صرف ساتھ بیٹھے ڈرائیور کا لحاظ تھا جو اگرچہ ملک مقبول کا خاص ٹیکسی ڈرائیور تھا اور اکثر شو کے بعد فنکاراؤں کو گھر چھوڑ کے آتا تھا پھر بھی تھا تو غیر بندہ' کسی بھروسے کے قابل نہیں تھا۔ اللہ وسایا نے تو ٹیکسی میں بیٹھنے سے پیشتر ادا کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ اپنا سارا زیور اتار کے ایک پوٹلی میں باندھ لے۔ ویسے بھی زیور نگاہ کا تھا' پرائی امانت... اس لیے ادا نے یہ حکم ماننے میں تامل نہ کیا۔ بڑی سی کالی چادر میں اس کا بنا سنورا وجود بھی چھپ گیا اور ادھار کے زیورات کی پوٹلی بھی رومال سے اس نے چہرہ پونچھ کے میک اپ بھی خاصا ہلکا کر لیا تھا۔

اگرچہ ملک مقبول نے ٹیکسی والے کو کرائے کی ادائیگی کر دی تھی مگر جیب میں پڑی اوپر کی آمدنی کا خمار تھا کہ اللہ وسائے نے گھر کے آگے اترتے ہوئے اسے سو کا کڑکتا نوٹ تھمایا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ دن بھر جس تنگ گلی میں شور مچا کے کھیلتے بچوں' خوانچہ فروشوں اور ایک دوسرے کے گھروں میں خیر سگالی کے دورے کرتی عورتوں کی وجہ سے ایک میلے کا سا سماں رہتا تھا' وہاں اب ہو کا عالم تھا' اسٹریٹ لائٹ کا تو وجود تھا نہیں اس گلی میں' یہاں کے رہنے والے بھی بجلی کے بڑھتے بلوں سے خوفزدہ گھر کے باہر بلب جلانے کے عادی نہ تھی۔ ٹیکسی کی روشن ہیڈ لائٹس کی مدد سے ہی اللہ وسایا نے تالے میں چابی گھمائی۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ اسے آج مفت میں کھانے اور سگریٹ کے علاوہ پینے کو بھی دل کھول کر ملا ہے۔

"پورے گیارہ ہزار..." وہ لباس تبدیل کر کے نکلی تو اس نے نوٹ لہرا کے مسرت سے اعلان کیا۔

"عیش ہو گئے بھئی' ملک صاحب نے جو دیا سو دیا' یہ تو بونس کا مال ہے' اس پہ تیرا حق ہے کڑیے" اس نے کمال وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سو' پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں کی یہ گڈی اس کے ہاتھ پہ رکھی۔ وہ پہلے سی ادا ہوتی... یا یوں کہنا چاہیے کہ دعا ہوتی تو بے زاری سے ہاتھ جھٹک کے کہہ دیتی۔

"میں ان کا کیا کروں گی؟ آپ ہی رکھیے۔"

لیکن اب وہ دعا نہیں ادا تھی اور ادا بننے کے لیے اسے جن لوازمات کی ضرورت تھی وہ ان نوٹوں سے ہی پورے ہو سکتے تھے۔ ملک مقبول کی جانب سے ملی رقم میں سے اللہ وسایا نے اب تک اسے ایڈوانس میں ملے چند ہزار ہی دیے تھے جو اس قیمتی لباس اور پارلر میں ہی پورے ہو گئے تھے۔ وہ اس رقم کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے آج اس نے موقع ملتے ہی ملک مقبول سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ اپنے سارے مالی معاملات خود طے کیا کرے گی۔ یہ سبق اسے نگاہ نے پڑھایا تھا۔

"ابا جی' اس شو سے جو پے منٹ ملی ہے اس سے اس مکان کے سارے بقایا جات ادا کریں اور جس جس کا جو قرضہ ادا کرنا ہے وہ کر دیں۔"

"او تو کیوں فکر کرتی ہے' یہ سارے میرے سیاپے ہیں' میں آپے نبڑ (نمٹ) لوں گا۔ تو کل بازار جا' ڈھیر سارے کپڑے لتے' گہنے خرید' ہوٹلوں میں کھانا کھا۔ ہو جائے گا سارا کچھ۔"

"نہیں ابا جی ہو نہیں جائے گا' کل ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے اگلی جو پے منٹ ملے گی اسے میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ جس جس سے جو کچھ لے رکھا ہے' واپس لوٹائیں' کھانے پینے میں یہ رقم مت لٹائیں ورنہ آگے کی ذمہ دار میں نہیں ہوں گی۔ میں نے کل شاپنگ کے دوران اپنا بینک اکاؤنٹ کھلوا لیا ہے' آئندہ سے میری ساری پے منٹ ڈائریکٹ بینک میں جائے گی۔" اس کے دوٹوک انداز پہ پہلے تو اللہ وسایا بغیر پلک جھپکائے منہ کھول کر اسے دیکھتا رہا پھر ذرا مشتعل ہوا۔

"یہ نئی پٹی تجھے کس نے پڑھائی ہے؟ تو کون ہوتی ہے اتنے بڑے فیصلے کرنے والی۔"

"بڑے بڑے کام کر سکتی ہوں تو بڑے بڑے فیصلے کیوں نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"اور پٹی تو زمانے نے پڑھائی ہے ابا جی' اس اسکول میں مجھے داخل ہی کیوں کروایا تھا۔ باہر نکالا ہے تو نئی ہوائیں جو سبق سکھا رہی ہیں' انہیں بھی برداشت کریں۔"

"تو... تو مجھے اپنے بڈھے پیو کو اپنی زندگی سے الگ کر رہی ہے؟ کیا میرا کوئی حق نہیں تجھ پہ... یا تیری کمائی پہ؟" بیٹی کے تیور اسے سہمانے لگے۔

"کیوں نہیں ابا جی۔" ادا نے تسلی دی۔

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ یہ پیسہ ضائع نہ ہو۔ آج دو نئے شوز کے معاہدے کیے ہیں میں نے ضرورت کے مطابق رقم نکال لیں گے۔ باقی ایک شو کی پے منٹ سے کسی اچھے علاقے میں کرائے کا فلیٹ لیں گے۔ اچھے علاقوں میں کرائے کی جگہ لینے کے لیے بھی تیس چالیس ہزار روپے ایڈوانس میں دینے پڑتے ہیں۔ دوسرے شو کی

پے منٹ سے گھر کی سجاوٹ کا سامان آئے گا' کچھ فرنیچر' قالین' پردے وغیرہ۔۔۔ اب مجھے اپنے مقام کے مطابق اپنا رہن سہن رکھنا ہو گا۔ اس گندے محلے کے اس بوسیدہ مکان میں تو میں ان جرنلسٹس کو نہیں بلوا سکتی جو میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔ کیا انہیں اس ٹوٹی کرسی یا ڈھیلی چارپائی پہ بٹھانا پڑے گا۔ میں تو چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے' ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی لے لوں۔"

"ایہہ کو کسی وڈی بات اے۔" وہ بیٹی کے عزائم جان کر پرجوش ہو گیا۔

"تیرے بعد شو کرنے والی لڑکیوں کے ایسے نخرے ہوتے ہیں کہ بندہ دیکھ کر حیران ہو جائے۔ پہلا شو کرتے ہی اپنی گڈی پہ بیٹھ کے آتی ہیں تو فکر نہ کر' بڑی جلدی یہ سب تیرے پاس ہو گا اور اس کے لیے تجھے آنہ آنہ جوڑنے کی کوئی لوڑ (ضرورت) نہیں ملک مقبول تو آج بھی کہہ رہا تھا کہ ادا کو بغیر تار والا فون لے دیتا ہوں۔۔۔ وہی والا۔۔۔ جو آج کل ہر دوسرا بندہ کان سے لگائے شو مار رہا ہوتا ہے اور یہ دیکھ یہ کارڈ۔۔۔" اس نے جیب سے کارڈ نکالا۔

"تین ہزار کے نوٹوں کے ساتھ یہ کارڈ لگا ہوا تھا' اس کے پیچھے قلم سے بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں رہ نہ سکا تو صدیقے سے پڑھوایا۔ کوئی بڑا سیٹھ ہے' دیکھ اس نے کیا لکھا ہے کہ یہ تین ہزار آپ کو پیش کرتے شرم آ رہی ہے' آپ اجازت دیں تو کوئی گاڑی خدمت میں پیش کروں۔ میں تو کہتا ہوں اسے فون کر۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ابا جی۔" وہ بھڑک گئی۔

"یہ تین ہزار اس نے میرے گانے پہ خوش ہو کر نچھاور کیے تھے۔ گاڑی بھی وہ کسی وجہ سے ہی دے گا' مفت میں کوئی کسی کو دھیلا تک دینے کا روادار نہیں۔ میرے پاس ان سیٹھوں کو خوش کرنے کے لیے صرف اور صرف یہ آواز ہے' اس سے زیادہ پہ میں ہرگز راضی نہیں۔ چاہے بدلے میں کوئی گاڑی کی بجائے بنگلہ دینے پہ بھی تیار ہو۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کا آغاز تھا' ابھی جون جولائی کے جھلسا دینے والے دن بہت دور تھے لیکن اپریل کے ان آخری دنوں نے ہی احساس دلا دیا تھا کہ اس سال گرمی کیسے کیسے رنگ دکھلائے گی۔ **صبحیں نسبتاً** خوشگوار تھیں مگر جیسے ہی دن بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا' سورج کی دیدہ دلیر کرنیں جسم میں سوئیاں سی چبھونے لگتیں' در و دیوار تپنے لگتے پنکھے کی رفتار تیز کرلی جاتی۔

صاحبزادی **خلعت النساء** فجر کے وقت سے برآمدے کے باہر والے سنگی چبوترے پہ براجمان تھیں۔ پنج سورۃ کی تلاوت کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ چاشت کی نماز ادا کرنے تک یہیں نیم دراز ہو لیں۔ انہوں نے اپنا ہلکا پھلکا سا ناشتہ بھی وہیں منگا لیا تھا مگر سورج کی تپش آج معمول سے کچھ زیادہ جلدی حاوی ہو گئی تھی۔ انہوں نے پیر سمیٹے' سرہانے رکھی رحل میں پنج سورۃ اور درود و وظائف کی دوسری کتب ترتیب دیں' صاحبزادی حرمت النساء کی پیش کی ہوئیں موتیے کی کلیاں ململ کے نفیس دوپٹے کے پلو میں لپیٹیں۔

"دلگیر۔۔۔" ان کی بارعب آواز تناول کدہ کے فرشی دسترخوان سے ناشتے کے برتن سمیٹتے دلگیر تک باآسانی پہنچ گئی۔

"کتنی بار کہہ چکے ہیں دلگیر کہ آپا بیگم کے ناشتے کے برتن فوراً واپس لے آیا کریں۔ انہیں جھوٹے برتنوں سے الجھن ہو جایا کرتی ہے۔"

ناشتے سے فراغت کے بعد چائے کے گھونٹ بھرتی صاحبزادی حرمت النساء نے تنبیہہ کی۔

"جی بڑی بیگم۔۔۔"

"دلگیر ہم اندر اپنے کمرے میں جانا چاہتے ہیں۔ صاحبزادی الماس خاتون سے **کہیے** باوضو ہو کر ہماری رحل شریف اور سیپارے اندر پہنچا دیں۔"

دلگیر نے ایک ہاتھ میں ناشتے کے خالی برتنوں والی ٹرے تھامی اور دوسرے ہاتھ سے بڑی بیگم کو سہارا دیا۔ اندر

جاتے ہوئے اس نے برتن دھوتی موتیا تک ان کی ہدایت باآواز بلند پہنچائی۔ وہ فوراً" نل بند کر کے وضو کرنے اندر چلی گئی۔ صاحبزادی حرمت النساء نے بھی چائے کا کپ رکھا اور بڑی بہن کے پیچھے ان کے کمرے میں چلی گئیں۔

عمیص برآمدے کی دیوار پہ لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بال سنوار رہا تھا۔ اس نے اسکن کلر کی جینز کے ساتھ ڈارک براؤن ٹی شرٹ پہن رکھی تھی' پیروں میں جاگرز تھے۔ اپنی گھڑی کا اسٹریپ بند کرتی گل مہر نے کمرے سے نکل کر ذرا ٹھٹک کے اس کی تیاری ملاحظہ کی وہ خاموشی سے گزرنے کی کوشش کرنے میں ناکام ہو گئی۔

"خیریت؟ آج صاحبزادہ **عمیص** علی خان سویرے سویرے اتنی معقول حالت میں کہاں کا قصد فرما رہے ہیں؟"

عموماً" وہ اپنے جاگنگ سوٹ یا پھر سفید کرتا شلوار میں رہا کرتا تھا۔ آج دنوں بعد اسے اس حالت میں دیکھ کر وہ فقرہ چست کیے بغیر رہ نہ سکی جواباً" وہ پیچھے مڑے بغیر سامنے لگے آئینے میں ہی اس کے عکس کو دیکھتا ہوا مسکرانے لگا۔ لان کے بے حد کھلے مگر ٹھنڈے رنگوں کے امتزاج والا وہ پرنٹڈ سوٹ آج کے گرم دن میں اس پہ خوب اٹھ رہا تھا۔ اس کی گلابی رنگت نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ سنہری بال کھینچ کے پیچھے کی جانب لپیٹ کر جوڑے کی شکل میں ایک بڑے سے سفید کلپ میں قید تھے۔ میک اپ سے **قطعاً**" بے نیاز چہرہ سادگی میں بھی پرکار لگ رہا تھا۔

"قصد کو ماریے گولی۔۔۔ بلکہ بم کا گولہ' آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے ساتھ چل پڑیں۔"

"وہ کس خوشی میں! ہم میلہ دیکھنے نہیں جا رہے' آفس جا رہے ہیں۔" وہ تخت پوش کے نزدیک رک کے تازہ اخبار کے پہلے صفحے کی ہیڈلائنز پہ نظریں دوڑانے لگی۔

"میں تو سارے میلے ایک ہی چہرے پہ دیکھ لیتا ہوں۔" وہ دو قدم چل کے اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ تخت پوش کے سرے پہ ٹکی اخبار سے نظریں ہٹا کے اب اسے دیکھ رہی تھی۔

"رنگوں کے میلے۔۔۔ خوشبو کے میلے۔۔۔ روشنیوں کے میلے۔۔۔" وہ بے حد مدھم آواز میں کہتا اس کی اپنی جانب اٹھی شہد رنگ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ جو میلے دیکھنے کا شوق ہے ناں' یہی تمہیں لے ڈوبے گا۔" وہ اس کا مطلب جان کر بھی انجان بن گئی۔ یہ تو اس کی پرانی عادت تھی۔ اسے بیگ شانے پہ لٹکاتے دیکھ کر وہ پھر کہہ اٹھا۔

"آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"

"تم ہمیں چھوڑ ہی دو تو اچھا ہے۔" وہ تنک کے بولی۔

"کاش کہ تم نے کچھ اور مانگا ہوتا۔"

"جو بھی مانگتے۔۔۔ تمہارے پاس دینے کے لیے صرف انکار ہی ہے۔"

"خیر ایسی بات نہیں۔" اس نے اس کا راستہ روکا۔

"جان مانگ کے دیکھو' دل مانگ کے دیکھو' پوری زندگی مانگ کے دیکھو۔ ایک پل کی دیر کیے بغیر تمہاری خدمت میں پیش کر دوں گا۔" شاید اس دن موتیا کے افسانے کا ردعمل تھا جو وہ آج کھل کے سب کہہ دینا چاہتا تھا۔

"ہاں جن کی زندگی کا کوئی مصرف ہو نہ ہی جان کا۔۔۔ انہیں ایسی بے کار کی چیزوں کو دوسرے کے سر منڈھنے کا خاصا شوق ہوا کرتا ہے۔ لیکن **عمیص**' یہ دل' یہ جان' یہ زندگی جب تمہارے اپنے کسی کام کی نہیں تو ہم ایسے فضول نذرانوں کا کیا کریں گے۔" اس کی رکھائی جوں کی توں تھی۔

"گل۔۔۔ آخر تم مجھ سے اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہو؟" بالآخر وہ بے بسی سے پوچھ بیٹھا۔

"ہم تو ایسے ہی ہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"تمہیں خاص طور پہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں البتہ اگر کبھی ہم کسی سے اکھڑے اکھڑے نہ رہیں تو اسے خاص طور پہ چونکنا چاہیے۔"

"کیا وہ خاص میں کبھی نہیں ہو سکتا؟"

"کیا تم زندگی کے اور کسی معاملے میں خاص ہو؟ نہیں ناں تو پھر ہماری زندگی میں خاص کیسے بن سکتے ہو۔" گل

مہر نے صاف گوئی کی انتہا کردی۔

"مائینڈ یو صاجزادہ عمیص، جو شخص خاص نہ ہو، بلکہ عام سے بھی کئی درجہ کم۔۔۔ معمولی ہو، وہ گل مہر کی توجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ہماری نظر غیر معمولی سے کم پہ نہیں ٹھہرتی۔"

اتنا کہہ کر وہ عمیص کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے کو تھی کہ سامنے سے آتی موتیا نے اس کی راہ روک لی۔

"اینڈ مائنڈ یو صاجزادی گل مہر خانم، جو شخص خود خاص نہ ہو، بلکہ عام سے بھی کئی درجہ کم۔۔۔ معمولی ہو، اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ وہ غیر معمولی یا خاص کی تمنا کرے۔ تمہارے پاس وہ نگاہ ہی نہیں جو خاص یا عام میں تمیز کر سکے۔"

"ہم تم سے بات نہیں کر رہے۔" اس نے ہاتھ سے اسے پرے کیا اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔ موتیا اس کی پشت پہ فقرہ کسنے سے باز نہ آئی۔

"تم کسی بھی ایسے شخص سے بات نہیں کر سکتیں گل مہر جس کے ہاتھ میں آئینہ ہو۔"

"بس بھی کرو موتیا۔" عمیص نے اسے ٹوکا۔ ناگواری اس کے چہرے سے واضح تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم بلاوجہ اسے اشتعال دلانے کی کوشش کیوں کرتی ہو۔ جب دیکھو طعنے کستی اور باتیں سناتی رہتی ہو۔"

موتیا نے حیرت سے اس کا شکوہ سنا، وہ اس پہ ناراض ہو رہا تھا، اسے ڈپٹ رہا تھا۔

"میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ گل نے جھگڑنے میں تم سے پہل کی ہو۔ کبھی خود سے تمہیں چھیڑ کر لڑنے پہ اکسایا ہو۔ یہ تم ہو جو بات بے بات اسے غصہ دلاتی رہتی ہو۔"

یہ سچ تھا، ذاتی مسائل کی وجہ سے دونوں بہنوں میں کم ہی چخ چخ ہوا کرتی تھی۔ ہمیشہ موتیا اس پہ تند و تیز طعنوں کے ساتھ حملہ کرتی اور ایسا تب ہوتا تھا جب وہ عمیص کے ساتھ زیادتی کر جاتی لیکن عمیص کو یہ نظر نہ آیا کہ وہ گل مہر سے کس وجہ سے الجھی صرف اتنا محسوس ہوا کہ وہ لڑائی میں پہل کرتی ہے۔ اس کھلی طرف داری پہ موتیا کی آنکھیں بھر آئیں۔

"یہ تم کہہ رہے ہو عمیص، میں نے سب سنا، اس نے کس طرح تمہیں بے عزت کیا۔ میں یہ بالکل برداشت نہیں۔۔۔"

"اس نے مجھے کہا تھا موتیا اور میں برداشت کر سکتا ہوں۔" عمیص نے بات کاٹی۔

"یہ ہم دونوں کا آپس کا معاملہ تھا، تمہیں درمیان میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ بھی پیر پٹختا باہر نکل گیا۔ طویل نیم تاریک راہداری میں صرف موتیا کھڑی رہ گئی، اکیلی۔۔۔ حیران پریشان۔

"میں اور درمیان میں؟ نہیں عمیص۔۔۔ میں تم دونوں کے درمیان نہ کبھی تھی نہ ہوں، نہ آؤں گی۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم دونوں کے درمیان اور بھی کچھ نہ تو تھا، نہ ہے اور نہ ہی شاید ہوگا۔"

● ● ●

کل کی تلخی کے بعد سے عمیص اس سے کترایا کترایا پھر رہا تھا۔ رات کو بھی دیر سے لوٹا اور اگرچہ ہمیشہ کی طرح دروازہ موتیا نے ہی کھولا لیکن اس کا کترایا ہوا انداز دیکھ کر اسے بھی تاؤ آگیا اور پہلے کی طرح خود کھانا گرم کر کے دینے کی بجائے اس نے بے سدھ سوئے دلگیر کو جگایا جو بڑبڑاتا ہوا اس کے آگے پٹخ پٹخ کر کھانا رکھنے لگا۔ نہ صرف سالن ٹھیک طرح سے گرم نہ ہوا تھا بلکہ روٹی بھی ادھ پکی تھی، کنارے موٹے اور کچے تھے اور تو اور اس نے رات کے اس وقت عمیص کو چائے بنا کر دینے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ ظاہر ہے سرِ شام سو جانے والے دلگیر کے لیے رات کے بارہ بجے اٹھ کر کچن میں جانا اور پھر چولہے کے آگے کھڑے ہونا ایک سزا ہی تو تھی۔ سو اس نے جیسے تیسے اس سزا کو نمٹایا۔ حیرت موتیا کو اس بات پہ تھی کہ عمیص بھی بے چوں و چرا وہ ٹھنڈا بدمزہ کھانا

نہ صرف کھا گیا بلکہ خود ہی اپنے لیے چائے بھی بنانے لگا۔ جبکہ اسے امید تھی کہ وہ ضرور جھنجلا کے اسے پکار بیٹھے گا۔ پھر اس کے سامنے آنے پہ شاید اپنے صبح والے رویے پہ شرمندگی کا اظہار بھی کرے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا تو وہ بھی رد عمل کے طور پہ اس سے کھنچ سی گئی۔ ورنہ وہ دل میں بغض یا کینہ رکھنے والی لڑکی نہ تھی۔ بڑی سے بڑی بات بھی خوشی خوشی پی جایا کرتی۔ یونہی ایک ضد سی ہو گئی تھی کہ اگر اسے اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس نہیں ہے تو وہ کیوں دلائے۔

اس وقت بھی وہ برآمدے کے تخت پہ بیٹھی امی حضور کا لان کا کرتا سی رہی تھی جبکہ خود وہ بھی نزدیک بیٹھی صاجزادی خلعت النساء کے لٹھے کے سفید غرارے کی ترپائی کر رہی تھیں۔ دن کو عموماً "لائٹ آف رکھی جاتی مگر اوائل مئی کے اس بھرپور گرم دن کی شدت کا آغاز صبح سات بجے ہی ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ تیز دھوپ برآمدے کے پکے فرش اور دیواروں کو تندور بنا ڈالتی۔ موتیا نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی دلگیر کے ساتھ سارا برآمدہ اور بیرونی دالان کا لال اینٹوں والا فرش دھو ڈالا۔ چقیں گرا دیں اور روشن دانوں پہ تو وہ کئی روز پہلے ہی موٹا سبز کپڑا لگا چکی تھی تاکہ ان کے شیشے سے دھوپ منعکس ہو کر اندر نہ آئے۔ سو اس وقت نیم تاریک قدرے خوشگوار ٹھنڈک لیے ہوئے برآمدے کے اس کونے میں ہی ذرا روشنی تھی جہاں صاجزادی حرمت النساء اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ سلائی کا کام کر رہی تھیں کیونکہ تخت کے عین اوپر لگی چھوٹی ٹیوب لائٹ آن تھی۔ نزدیک رکھے لکڑی کے چھوٹے میز پہ پانی کا کولر رکھا تھا۔ ساتھ ہی پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ برآمدے کے دوسرے کونے میں جہاں دیوار گیر آئینہ نصب تھا، حسب معمول عمیص گھر سے نکلنے سے پہلے اپنی تیاری میں مشغول تھا۔ وہ اور موتیا گاہے گاہے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ نظر ملنے پہ دونوں کا انہماک اپنے اپنے کام میں مزید بڑھ جاتا۔ موتیا سر جھکا لیتی اور اس کے ہاتھ مشین کے ہتھے پہ اور بھی تیز ہو جاتے۔ عمیص کچھ اور تیزی سے بالوں میں کنگھا چلانے لگتا۔

ماحول میں ایک عجیب پرسکون سا سکوت طاری تھا۔ دالان سے آتی پرندوں کی مدھم چہچہاہٹ تھی۔۔۔ یا پھر سلائی مشین کی ہلکی سی گھرر گھرر۔۔۔ جو سکوت کو ہیبت ناک سناٹے میں تبدیل نہیں ہونے دے رہی تھی۔ اس ماحول میں کافی دیر بعد تیسری آواز صاجزادی حرمت النساء کی گونجی۔

"صاجزادہ عمیص، فرصت ہو تو آج ہمارا ایک کام کر دیجیے۔"

"جی چچی حضور۔۔۔ فرمائیے۔" وہ مودب ہو کر پلٹا۔

"بہت دن ہوئے صاجزادی یاسمین کی کوئی خبر نہیں۔ آپ کے چچا کی طبیعت بھی پچھلے دنوں ناساز رہی ورنہ وہ [illegible] ہو آئے جا کر ہو آیا کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے اب ذرا سنبھلے ہیں۔ ہم آج صبح ان سے کہنے ہی والے تھے۔ [illegible]راصل آپا حضور نے بھی کل دوبار صاجزادی یاسمین کو یاد کیا تھا۔ لیکن آپ کے چچا حضور کا ارادہ آج اپنے [illegible]ستوں کی صحبت میں کہیں جانے کا تھا۔ اس لیے آپ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر وقت ملے تو ہمشیرہ کے ہاں سے [illegible]تے آئیے۔"

"کیوں نہیں چچی حضور آپا کے لیے تو وقت ہی وقت ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں ابھی تو نہیں البتہ شام کو ضرور وہاں [illegible] جاؤں گا۔ شام کو اس لیے کہ اگر بابر بھائی کی رضامندی ہوئی تو انہیں ساتھ ہی گھر لے آؤں۔ کل اتوار ہے، بچوں کو [illegible]کولوں سے چھٹی ہو گی، ایک دن یہاں گزار لیں گے۔ امی حضور کی اداسی بھی دور ہو جائے گی۔ اس وقت گیا تو ایک [illegible] اپنے گھر میں نہ ہوں گے دوسرے آپا جانے کے لیے تیار بھی ہوئیں تو میں اتنی جلدی گھر نہیں آ سکتا۔ کیا خیال ہے، [illegible] ٹھیک رہے گا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے بھی صاجزادی یاسمین کوئی دو ماہ پہلے آئی تھیں غالباً" تب صاجزادی گل مہر نے بھی [illegible]ت پہ جانا شروع نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد نہ ہم نے بچوں کی صورت دیکھی نہ وہ آ سکے۔۔۔ صاجزادی الماس [illegible]۔۔۔ ایسا کیجیے۔" اچانک کچھ دھیان آنے پہ انہوں نے موتیا کو مخاطب کیا تو عمیص بے ساختہ اس طرز

تخاطب پہ اس کے چہرے سے ناگواری کھوجنے لگا مگر وہ جز بز ہوئے بغیر بڑے سکون سے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”جی امی حضور۔“

”اس کرتے کا ناپ صاحبزادی یا سمین کے لحاظ سے تیار کر دیجیے۔ وہ اتنے دنوں بعد آ رہی ہیں۔ خالی ہاتھ تو نہ لوٹائیں گے یوں بھی گرمی بڑھ گئی ہے۔ ہمارے پاس تو یوں بھی بہتیرے کرتے ہیں اور یہ رنگ تو ہمیں جچا بھی نہیں۔ ہماری عمر کے لحاظ سے ذرا شوخ ہے مگر صاحبزادی گل مہر کا دل برا نہ ہو اس لیے رکھ لیا۔ صاحبزادی یا سمین پہ خوب اٹھے گا۔“ گل مہر اپنی پہلی تنخواہ سے ان کے لیے یہ سادہ ململ کا فیروزی سوٹ اور کڑھائی والی چادر لائی تھی' موتیا کے لیے بھی وولان کے پرنٹڈ سوٹ تھے۔ اس وقت انہی کی سلائی کا کام جاری تھا۔

”امی حضور' دلکش کے لیے میں اپنے سوٹوں میں سے ایک نکال لیتی ہوں۔“

”نہیں۔“ انہوں نے منع کیا اور عمیص کو کمرے میں جاتا دیکھ کر قدرے آہستہ آواز میں کہا۔

”صاحبزادی گل مہر کو شاید اچھا نہ لگے۔ وہ تو صرف اس بات پہ ناراض ہوں گی کہ آپ نے ان کا لایا تحفہ دلکش کے لیے دے دیا لیکن یہ بات آپا حضور یا کسی اور تک پہنچی تو انہیں سبکی کا احساس ہوگا۔ ابھی تو انہیں یہ علم نہیں کہ یہ غرارے کا کپڑا بھی وہ نہیں لائیں بلکہ ہم نے گھر سے نکالا ہے۔ دراصل ہمیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ گھر کے دو افراد کے لیے تو تحائف لائے جائیں اور باقی کو نظر انداز کر دیا جائے۔“

”لیکن مجھے تھری پیس سوٹ پسند بھی نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے تھان لپیٹ رکھا ہو۔ میرے پاس دو سادہ شلواریں ہیں ایک تو کالی ہے وہ بلیک اینڈ وائٹ سوٹ سے میچ ہو جائے گی دوسری میں خود رنگ لوں گی۔ آپ شلواروں کے کپڑے کی قمیصیں دلکش کے لیے کاٹ دیں۔“

”ہاں یہ بہتر رہے گا۔ ہمارے پاس سفید سوتی کپڑا رکھا ہے اس کی شلوار بنا دیں گے' دونوں قمیصیں سفید شلوار کے ساتھ چل جائیں گی ساتھ سفید جالی کے دوپٹے پہ کروشیا آج رات ہی بیٹھ کے بنا دیں گے۔“

عمیص کو کمرے سے نکل کر اس طرف آتے دیکھ کر وہ اٹھیں۔

”ذرا رکیے صاحبزادہ عمیص' ہم آپ کو کترنیں دیتے ہیں۔ آتے ہوئے اس رنگ کے کڑھائی والے دھاگے کی گچھی لیتے آیئے گا۔“

وہ اندر گئیں تو عمیص وہیں تخت پہ موتیا کے نزدیک بیٹھ گیا۔ وہ پھیلا وا سمیٹ کر اٹھنے لگی تو وہ پکار بیٹھا۔

”رکو موتیا۔“

اس کا سر ابھی بھی جھکا ہوا تھا۔ وہ بھی اسی انداز میں سر گرا کے بیٹھ گئی۔ ایک کے انداز میں مان بھری خفگی تھی' منوالینے کے استحقاق سے چھلکتی ناراضی تھی تو دوسرے کے انداز میں اپنے رویے کی جھینپ تھی' شرمندہ شرمندہ سی جھنجلاہٹ تھی۔

”سوری مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔“

”کیسا؟“

”مجھے گل مہر پہ آیا غصہ تم پہ نہیں اتارنا چاہیے تھا۔ میں یہ سب نہیں کہنا چاہتا تھا بس غصے میں منہ سے نکل گیا۔“

”غصہ تو صرف بہانہ ہوتا ہے عمیص' دل میں چھپے ان خیالات کو باہر اگلنے کا... جنہیں انسان کسی نہ کسی مصلحت کے تحت دبا کے رکھتا ہے۔“

”یقین کرو' ایسا نہیں ہے' موتیا۔ ہماری دوستی میں مصلحت نام کی کوئی چیز نہیں... نہ ہی کوئی ایسا جذبہ جسے ایک دوسرے پہ عیاں کرنے سے ہم گھبرائیں۔“

اس نے دعویٰ کیا جس سے موتیا کو اختلاف تھا۔ وہ یہ اختلاف کرنے میں حق بجانب تھی۔ عمیص کے پاس نہ

سہی مگر اس کے پاس ضرور ایک ایسا جذبہ تھا' جسے عیاں کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ یہ اختلاف ظاہر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے صرف سر ہلا کے رہ گئی۔ جسے عمیص نے تائید کا مفہوم اوڑھا دیا۔

”یعنی تم مجھ سے ناراض نہیں؟“

وہ یوں مسکرائی جیسے اپنی ہار کا اعتراف کر رہی ہو۔ یہ ہار ہی تو تھی کہ وہ ساری دنیا سے منہ موڑ سکتی تھی' اس سے ناراض نہیں ہو سکتی تھی۔

”یعنی کہ تمہیں میری کوئی بات بری نہیں لگی؟“

”خیر اب ایسی بات بھی نہیں۔ میری مجبوری ہے کہ میں تم سے تو کیا کسی سے بھی زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بالکل ہی پتھر ہوں' جس کا جی چاہے' مجھے جو مرضی بھلا برا سنا لے اور میں بغیر برا مانے ہنس ہنس کے قبول کرتی جاؤں۔ برا تو مجھے لگا تھا' بہت برا لگا تھا اور لگنا بھی چاہیے' تم نے بات ہی ایسی کی تھی۔ ایک تو میں تمہاری وجہ سے اس سے الجھی' اس کے باوجود تم اسی کی طرف داری کر رہے تھے' مجھ ہی کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے۔ حد ہے نا انصافی اور جانب داری کی پہلے مجھے صرف اسی پہ غصہ تھا لیکن تمہاری اس حرکت کے بعد تم پہ کئی گنا زیادہ غصہ آیا کہ تم کس قدر بے وقوف بنے ہوئے ہو۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ اس نے تمہیں بے وقوف بنایا ہوا ہے کیونکہ وہ جیسی بھی ہے' دوغلی یا مصلحت پسند قسم کی جھوٹی نہیں اس نے کبھی محض تمہارا دل رکھنے کے لیے بھی تمہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کیا۔ بلکہ جانتے ہو اس کے تمہارے ساتھ اتنے خشک رویے کی وجہ کیا ہے۔ پوچھا تھا ایک بار میں نے کہنے لگی کہ مجھے عمیص سے کوئی پرخاش نہیں' نہ ہی مجھے اس سے تلخ رویہ رکھنے کا کوئی شوق ہے۔ میں اس سے نارمل انداز میں ہی رہنا چاہتی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ میرے نارمل انداز کو نارمل نہیں لے گا۔ میری دوستانہ نرمی کو بھی کسی اور تناظر میں دیکھے گا اور چونکہ میرے دل میں اس کے لیے ایک کزن سے بڑھ کے اور کوئی جذبات نہیں اس لیے میں نہیں چاہتی کہ وہ میری جانب سے کسی خوشگواریت کو پا کر غلط فہمی کا شکار ہو۔ آیا سمجھ میں صاحبزادہ عمیص۔“ اس نے کھل کر بتایا۔ وہ لب بھینچ کر فرش پہ نظریں گاڑ کے رہ گیا۔

”اس لیے اس وقت تم جس قسم کے حالات میں ہو اس کی ذمہ داری سراسر تم پہ عائد ہوتی ہے۔ میں ناحق گل مہر سے الجھی۔ سمجھانا تو تمہیں چاہیے۔ ٹھیک ہے جذبات پہ روک ٹوک ممکن نہیں' دل پہ کسی کا زور نہیں چلتا مگر زبان پہ تو چل سکتا ہے' اسے قابو تو کر سکتے ہو۔ کیوں اپنے جذبات کا بے ساختہ اظہار کر کے انہیں بے مول کرتے ہو جبکہ وہ سننے پہ تیار ہی نہیں۔“

”کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو مگر یہ جو میں اسے سامنے پا کے بے قابو ہو جاتا ہوں تو صرف اس لیے کہ مجھے ڈر ہے کوئی اسے مجھ سے چھین نہ لے۔“

”وہ کوئی بے جان چیز نہیں عمیص۔ جیتی جاگتی باشعور لڑکی ہے اگر وہ تمہاری ہے تو کوئی چھین کیسے سکتا ہے لیکن اگر... تم سب کچھ حالات اور تقدیر پہ کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔“

”ہاں جیسے یہ دونوں تو میرے بڑے... ”محسن“ ہیں ناں۔“ وہ منہ پھلا کر بولا۔

”آج تک تو حالات بھی تیرے تابع رہے ہیں اور تقدیر بھی مہربان رہی ہے... ہونہہ۔“ اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔

”یہ کیوں بھولتے ہو کہ اپنی ملازمت کی ضد منوانے کے بدلے میں وہ اپنی آئندہ زندگی کے فیصلے کے تمام اختیارات ابا حضور کو سونپ چکی ہے اور تمہیں راز کی بات بتاؤں' امی حضور سے سنا ہے کہ وہ تو خود اس انتظار میں ہیں کہ تائی حضور ملکا ساز کر کریں اور وہ...“

”کیا... ؟ تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”ہاں تو اور کیا؟ اگر تم اپنی امی حضور کی توجہ اس طرف دلا دو تو یہ کام کل ہی ہو سکتا ہے۔ گل مہر اس معاملے میں ابا حضور سے اختلاف کی جرات نہیں کر سکے گی۔“

"یعنی اختلاف ضرور کرے گی' یہ الگ بات کہ ظاہر کرنے کی جرات نہ کر سکے۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"
"نہیں موتیا میں اسے پانا چاہتا ہوں' فتح نہیں کرنا چاہتا۔ اسے اپنانا چاہتا ہوں اس پہ قبضہ نہیں جمانا چاہتا۔"
"یہ تو صرف ایک امکان ظاہر کیا تھا میں نے' ہو سکتا ہے ایسا ہو ہی ناں۔ دراصل گل کا دھیان ان لطافتوں کی جانب کم ہی جاتا ہے۔ یار وہ رومانس مٹیریل نہیں ہے۔" موتیا نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ عمیص کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کے اس موڑ پہ بھی اس پتھر میں شگاف نہ پڑے۔ آخر ہے تو وہ لڑکی ہی۔ تم ہمت تو کرو۔"
"ہاں ضرور۔ مگر ابھی نہیں۔ بس کچھ دن اور۔۔۔ ابھی کس برتے پہ اس کا سوال بنوں۔ پہلے کچھ بن تو جاؤں روزگار کی کوئی مستقل سبیل ہو جائے پھر یہ ذکر چھیڑنا مناسب رہے گا۔ زیادہ نہیں صرف کچھ دن اور۔۔۔"
"تو پھر وعدہ کرو کہ اتنے دن تم کوئی اور گڑبڑ نہیں کرو گے۔ بالکل نہیں چھیڑو گے گل کو۔"
"میں ایسا کرنا نہیں چاہتا لیکن کیا کروں اسے سامنے پا کر خود پہ قابو نہیں رہتا اور جب وہ مجھ سے اتنا روکھا بولتی ہے تو میں اور بھی۔۔۔ کیا کروں میں۔۔۔"

اس نے بس اتنا کہا میں نے سوچا کچھ نہیں
میں وہیں پتھرا گیا میں نے سوچا کچھ نہیں
کون ہے وہ کیسا ہے وہ مجھ کو اس سے کیا غرض
وہ مجھے اچھا لگا' میں نے سوچا کچھ نہیں

وہ بے بسی سے کہتا سامنے بڑھ گیا جہاں صاحبزادی حرمت النساء ہاتھ میں چند کترنیں تھامے اسے ہی پکار رہی تھیں۔

میں بھی تو اک انسان ہوں اک خامی رہ گئی
میں نے جس کو دل دیا میں نے سوچا کچھ نہیں

موتیا زیر لب کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کے ہاتھ پہ کیا ہوا سر؟" گل مہر اس کے ہاتھ پہ پٹی بندھی دیکھ کر پوچھنے سے رہ نہ سکی۔
"یہ۔۔۔" شہزاد فائل ایک طرف رکھتے ہوئے لمحے بھر کے لیے رکا۔ اس کی نظر اپنے ہاتھ پہ گئی۔ ٹیس ایک بار پھر ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی' اس نے سر جھٹکا۔
"کچھ خاص نہیں۔ یونہی چوٹ لگ گئی تھی۔"
"خاصی گہری چوٹ لگتی ہے۔"
"ہاں بہت گہری۔۔۔ زیادہ گہرائی میں جاؤ تو چوٹ بھی گہری لگتی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔
"یس سر۔" گل مہر واضح سن نہ سکی تو اچنبھے سے دہرایا۔
"کچھ نہیں آپ یہ فائل لے جائیں۔ اس میں اگلی قسط کا مکمل اسکرپٹ بھی ہے اور میرے نوٹس بھی کہ کہاں کہاں مجھے کیا کیا چیز چاہیے۔ آپ اس کا ایک سیمپل تیار کروالائیے پھر ریکارڈنگ کے دوران اس پہ ڈسکس بھی کر لیں گے اور جہاں ضرورت پڑی' چھنجنگ بھی ہو جائے گی اور ہاں کچھ پوچھنا چاہیں تو آپ بلا جھجک آ سکتی ہیں۔"
"اوکے سر۔" وہ اسکارف درست کرتی پلٹی۔ دوسری جانب سے ایک خوش پوش نوجوان اندر آ رہا تھا۔
"آہا۔ ڈی جے یار تم یہاں کیسے؟" شہزاد اسے سامنے پا کر اچانک اٹھا اور گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس

کی بے تکلفی ظاہر کر رہی تھی کہ نوادرد اس کا پرانا جان پہچان والا یا گہرا دوست ہے۔ گل مہر اس کے راستہ چھوڑنے پہ "فورا" باہر نکل گئی۔
"یار شہزاد' تو جو کام کرتا ہے' وکھری ٹائپ کا کرتا ہے۔" ڈی جے نے پسندیدہ نظروں سے جانے والی کا تعاقب کرتے ہوئے ریمارکس دیا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ سیکرٹری بھی رکھی تو بی بی جی ٹائپ۔ دنیا جہان کے لوگ چن کر وہ سیکرٹری رکھتے ہیں کہ بس آفت ہے قیامت ہے۔ جو جتنی عیاں۔۔۔ اتنی ہی مقبول۔۔۔ اور تو پہلے تو کبھی مانتا ہی نہیں تھا لیڈی سیکرٹری رکھنے پر برسوں سے ایک وہی رٹو طوطا رکھا ہوا ہے اور اب اگر اس سے گلو خلاصی کر ہی لی تھی تو یار رکھنی تھی کوئی ٹینا شینا' رنگی چنگی۔۔۔ یہ کلثوم بانو اور زبیدہ خاتون ٹائپ چیز کہاں سے پکڑی۔ ماتھے تک کپڑا لپیٹ رکھا ہے محترمہ نے جیسے ابھی ابھی نماز کی نیت باندھنے لگی ہو۔۔۔ بے شک حسین تو بہت ہے۔۔۔ بس ذرا خود کو ڈھنگ سے۔۔۔"
"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ ڈی جے۔" شہزاد نے اس کی بات کاٹ کر غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔
"میرا سیکرٹری ابھی تک وہی رٹو طوطا ہے بقول تمہارے۔۔۔ اور مستقبل قریب یا بعید میں میرا اس سے گلو خلاصی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تاوقتیکہ وہ خود نہ بھاگ جائے۔ لیکن اب بات طے ہے کہ اس کے بعد بھی میں نہ کوئی ٹینا شینا' چنگی رنگی رکھوں گا نہ ہی کلثوم بانو اور زبیدہ خاتون۔ میرا اتنا ٹمپرامنٹ نہیں کہ میں آفس میں مسلسل آٹھ آٹھ گھنٹے ایک لیڈی سیکرٹری کو برداشت کر سکوں۔"
"یہ پھر وہی بات کی ناں تو نے' وہی۔۔۔ وکھری ٹائپ کی۔" ڈی جے نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔
"اوروں کا بس نہیں چلتا آفس کے آٹھ' نو گھنٹوں کے علاوہ گھر بھی سیکرٹری کو ساتھ لے جائیں۔ وہ جو پہلے کہتے تھے کہ سالی آدھے گھر والی' اب کہا جاتا ہے' سیکرٹری آدھے گھر اور پورے دل والی۔"
"تم تو جانتے ہو ابھی تک نہ کوئی میرے دل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکی ہے نہ ہی گھر تک آ سکی ہے۔ رہا آفس۔۔۔ تو یہ شارع عام ہے۔ میرا کام ایسا ہے' دن میں درجنوں آتی ہیں' درجنوں جاتی ہیں۔ لیکن اسٹاف میں لیڈیز رکھنے کے حق میں میں اس لیے نہیں رہا کہ چنگی اور ٹینا ٹائپ لڑکیاں جس مقاصد کے تحت جاب کرتی ہیں اور وہ بھی ایسے آفسز میں ان کے حصول کے لیے میں پلیٹ فارم نہیں مہیا کرنا چاہتا اور کلثوم و زبیدہ جیسی خواتین ویسے بھی اس ماحول میں ان فٹ ہوتیں۔ یہاں ہر قماش کا شخص آتا ہے اور یار تم بھی تو بے دھڑک منہ اٹھا کے آ جاتے ہو۔" شہزاد نے آنکھ دبا کر کہا۔ وہ برا مانے بغیر ہنس پڑا۔
"تو پھر کیا یہ کوئی اداکارہ تھی جو فل ڈریس ریہرسل کر رہی تھی۔ آئی تھنک اردو یا اسلامیات کی سرکاری اسکول کی ٹیچر۔۔۔ میرا مطلب ہے استانی جی کے گیٹ اپ میں ہو گی۔ ایم آئی رائٹ؟"
"یو آر ٹوٹلی رانگ۔ یہ میری سیکرٹری نہیں مگر میرے اسٹاف میں شامل ہے اور یہ کسی سرکاری اسکول کی اردو میڈیم استانی نہیں۔ گولڈ میڈلسٹ ہے۔ اس کے حلیے اور سادگی پہ مت جاؤ۔ شی از آ کمپیوٹر جینئس تم نے "شیر دل" کا فرسٹ ایپی سوڈ دیکھا؟"
"شیور اینڈ آئی مسٹ سے' اٹ از سمپلی سپرب۔ ان فیکٹ میں آج تمہیں "شیر دل" کی مبارکباد دینے ہی آیا ہوں۔"
"شیر دل" کو سپرب بنانے میں بڑا ہاتھ اسی لڑکی کا ہے ڈی جے۔ رائٹر قلم کے ذریعے نہ اسے اڑا سکتا ہے نہ بجلی کی رفتار سے بھگا سکتا ہے۔ جو کچھ تم "شیر دل" میں دیکھ رہے ہو وہ یقینا "اپنی نوعیت کا واحد کام نہیں۔ ہالی وڈ میں سالوں پہلے ایسے کامیاب تجربے ہو چکے ہیں لیکن ان کے ٹیکنیشنز اور سہولیات کا مقابلہ اگر ہمارے ہاں کا کوئی نو آموز کرے اور وہ بھی اتنی کم سہولیات کے ساتھ' اتنے محدود تجربے کے ساتھ اور بالکل انہی کے پائے کا۔۔۔ تو یہ ضرور حیرت انگیز امر ہے۔"

"امیزنگ میرا خیال تھا تم نے کوئی غیر ملکی ٹیکنیشن یا وڈیو افیکٹ ایکسپرٹ ہائر کیا ہوگا۔"

"ضرورت پڑتی تو میں ایسا بھی کرتا لیکن 'شیر دل' کا بجٹ ویسے ہی قابو سے باہر ہو رہا تھا اس سے پہلے کہ فنانسر گھبرا کے بھاگ جاتے۔ میں نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ زیادہ کٹوتی کرتا تو سیریز کا امیج خراب ہوتا اس لیے میں نے کاسٹ بھی زیادہ تر نئی رکھی تاکہ سپر اسٹارز کے ہیوی اماؤنٹ سے بچت ہو۔ ایسے میں فارن کوالی فائیڈ کو ہائر کیسے کرتا۔ شکر ہے سفیان کی مدد سے گل مہر مل گئی جسے ابھی خود بھی اپنی صلاحیتوں کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں ہے۔"

"صحیح اندازہ تو تمہیں نہیں ہے اس کی صلاحیتوں کے بارے میں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم بس اپنا کام نکلوا رہے ہو' جہاں ہے جیسے ہے کی بنیاد پہ۔۔۔ اتنا نہیں سوچتے کہ ایک چیز سے دو دو جگہ منافع کیسے کمایا جا سکتا ہے۔ یار شہزاد تو کبھی ایک کامیاب بزنس مین نہیں بن سکتا۔"

"اچھا تو اب تم مجھے گر سکھاؤ گے کاروبار کے۔"

"ٹپس بتا رہا ہوں گرہ سے باندھ لو۔ تم نے غور سے اس لڑکی کا چہرہ دیکھا ہے۔ اتنے محتاط انداز میں لپٹی ہونے کے باوجود وہ کسی کے بھی دل میں اتھل پتھل کر سکتی ہے۔ اگر تم اسے کچھ پالش کرو' تھوڑا گرُدم کرو تو۔۔۔۔"

"ربش ڈی جے۔" شہزاد نے ناگواری سے ابرو سکیڑے۔

"میں نے اسے جس کام کے لیے اپائنٹ کیا ہے' اس کام کا رزلٹ وہ اپنے اس اسٹائل میں بھی بہترین دے رہی ہے۔ یہ کافی ہے میرے لیے۔ اس کا وے آف لوکنگ کتنا بھی بیک ورڈ ہو اس سے میرا کیا لیتا دیتا۔"

"لیکن اس کا لائف اسٹائل اگر چینج ہو جائے تو تم بہت کچھ لے بھی سکتے ہو اور دے بھی سکتے ہو۔"

"مجھے عورتوں کے ذریعے کمانا ہوتا تو یہ آسان راستہ بہت پہلے اختیار کر چکا ہوتا۔ آئی جسٹ ہیٹ دیٹ تھنکنگ۔ ناؤ لیو دس ٹاپک پلیز۔" اس کا لہجہ بدلتا پا کر ڈی جے مصلحتاً خاموش ہو گیا۔

"تمہاری تو ہمیشہ سے عادت ہے' نہ کھاؤ گے نہ کھانے دو گے۔" وہ اس کے ماتھے کی تیوریاں نظر انداز کرتا ہوا خوش دلی سے ہنسا۔

"تمہارا ہاتھ کب روکا ہے میں نے' کھاؤ جم جم کھاؤ' پیٹ بھر کے کھاؤ۔ چاہے حرام کھاؤ چاہے حلال۔۔۔ میں کون ہوتا ہوں تمہارے منہ سے نوالہ چھیننے والا۔ مگر اپنی پلیٹ سے کھاؤ۔"

"واٹ ڈو یو مین؟" وہ چونکا۔ "تو کیا اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ تم اپنی اس ورکر پہ اپنا حق جتا رہے ہو۔"

"ناٹ ایٹ آل۔" وہ گویا بلبلا اٹھا جیسے ڈی جے نے اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔

"تم جانتے ہو کہ صنف مخالف میں میری دلچسپی واجبی سی رہی ہے۔"

"کیوں جھوٹ بولتے ہو یار۔ واجبی کا بھی وجود ہوتا ہے۔ تم یوں کہو کہ دلچسپی سرے سے رہی ہی نہیں۔"

"جو بھی سمجھ لو۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"بس ایسی ہی بے سروپا ہوائیاں اڑانی تھیں یا کوئی اور بھی کام کی بات کرنی ہے۔"

"میرے کام۔۔۔ ہاہاہا۔" اس نے ایک اور بلند قہقہہ لگایا۔

"دوستی میں برداشت کر لیتا ہوں تیرے جیسے بندے کو ورنہ مجھے جو کام ہوتے ہیں وہ تم سے ڈسکس کرنے کا کیا فائدہ۔"

"تو پھر چلتے پھرتے نظر آؤ' کیوں اپنی راہ اور میرا وقت کھوٹا کرتے ہو۔" شہزاد نے کہتے ہوئے سامنے دیکھا جہاں دروازے پہ ہلکی سی دستک کے ذریعے اندر آنے کی اجازت طلب کی گئی تھی۔

"یس کم ان مس گل مہر۔" اتنے کم دنوں میں وہ اس کا ہر انداز اور آہٹ تک پہچاننے لگا تھا۔ اس کے اس درست اندازے پہ ڈی جے نے معنی خیز حیرت سے بھنویں اچکائیں تو وہ خجل سا ہو گیا۔

"سوری سر' ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ دراصل یہ کچھ پوائنٹس ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے اگر آپ ایکسپلین کر دیں تو ہم ابھی اپنا کام شروع کر دیں۔"

"ہم۔۔۔ کیا آپ کے ساتھ پوری ٹیم ہے!" ڈی جے نے مداخلت کی۔ شہزاد نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔ گل مہر کی نازک مزاجی پہ بھی اس اجنبی نووارد کی یہ بے تکلفی گراں گزری۔

"آپ بزی ہیں تو ہم کچھ دیر بعد آجاتے ہیں سر۔" اس کے کہنے پہ شہزاد نے سر ہلا دیا۔ وہ خود کب چاہتا تھا کہ ڈی جے کی موجودگی میں گل مہر یہاں موجود رہے۔ اس کی بے باک نظروں کا اس پہ بار بار پھسلنا شہزاد کو سخت ناگوار گزر رہا تھا۔

"جسٹ آمنٹ مس۔" ڈی جے اپنی نشست سے اٹھ کر کچھ اس انداز میں آگے بڑھا کہ گل مہر کو نہ چاہتے ہوئے بھی رک کر اسے سننا پڑا۔

"میرا نام داؤد جمیل ہے' ڈی جے۔۔۔ نام تو سنا ہوگا۔ ڈی جے ایڈورٹائزنگ ایجنسی۔" وہ اپنی مشہور زمانہ لیڈی کلر اسمائل چہرے پہ سجا کے کہہ رہا تھا۔

"آپ نے کبھی ماڈلنگ کے بارے میں سوچا ہے مس!" اس اچانک' غیر متوقع اور نامناسب سوال پہ تلملا کے وہ بہت سخت جواب دینا چاہتی تھی مگر شہزاد کا لحاظ کر کے ضبط کر گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس کے باس کا گہرا دوست ہے۔ البتہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی اس نے قطعی کوئی کوشش نہ کی۔

"ڈی جے ہر چہرے میں اپنی ماڈل مت کھوجنے لگا کرو۔" شہزاد نے سرزنش کی۔

"ہر چہرے میں نہیں شہزاد خاص چہروں میں۔۔۔ خاص الخاص چہروں میں۔" اس نے گل مہر کے سرخ پڑتے چہرے پہ نظر جما کے کہا۔

"اور یہ چہرہ تو خاص سے بھی کچھ بڑھ کے ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر یہ ماڈلنگ کی دنیا میں آئیں تو تہلکہ مچ جائے گا۔ ارے اگر یہ مسکرا کے زہر کے قصیدے بھی پڑھیں تو اگلے روز آدھا پاکستان زہر خریدنے نکل پڑے گا۔"

"معاف کیجیے گا' ہمیں زہر بیچنے کا کوئی شوق نہیں۔" وہ تلخ لہجے میں کہتی شہزاد کی جانب دیکھنے لگی جیسے مزید کچھ کہنے یا کرنے کے لیے اس کی اجازت کی منتظر ہو۔

"یو مے گو مس گل مہر۔" شہزاد نے اس کی مشکل آسان کی۔

"تھینکس سر۔" وہ اسی وقت باہر نکل آئی مگر اندر سے شہزاد کی غصے بھری بلند آواز نے اسے دروازے کے نزدیک ہی ٹھٹک کے رکنے پہ مجبور کر دیا۔ وہ ڈی جے پہ برس رہا تھا۔

"سک۔۔۔ یو آر سک مین۔۔۔ بات کرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لو کہ سامنے کون ہے' کس سے کیا بات کرنی ہے۔ تمہاری طرح میں بھی اسی پروفیشن میں ہوں۔ جن عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے ان میں سے ننانوے فیصد ویسی ہی ہوتی ہیں جنہیں "ایسی ویسی" کہا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس ایک فیصد کی پہچان کھو بیٹھا ہوں۔ ایسی عورتوں سے زیادہ تعلق رکھنے کی وجہ سے تمہاری عادت بن چکی ہے اس قسم کی گفتگو کرنا۔ لیکن اب تمہیں سیکھ لینا چاہیے کہ قابل احترام خواتین سے کس انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔"

"او کم آن یار' میں نے کیا کہہ دیا اسے؟ تم تو یوں بگڑ رہے ہو جیسے میں نے اس کی انسلٹ کر دی ہو۔ میں نے تو اتنی عزت سے آفر دی ہے۔"

"گل مہر جس فیملی سے تعلق رکھتی ہے وہاں ایسی آفر کا ملنا عزت کی نہیں بے عزتی کی بات سمجھی جاتی ہے۔ تم نے اس کی حیثیت' اس کی شخصیت' اس کے وقار کی انسلٹ کی ہے' تمہیں اس پہ شرمندہ ہونا چاہیے بلکہ اس سے معذرت بھی کرنی چاہیے۔"

"ڈیم اٹ' یہ ایسا مسئلہ نہیں جس پہ ڈی جے معافیاں مانگتا پھرے۔ بھئی ایک آفر دی ہے انہیں منظور نہ سہی اسے عزت و وقار کا معاملہ بنانا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہاری جانب سے میں معذرت کرلوں گا۔"

"کیا تم؟ شہزاد ملک معذرت کرے گا اپنی ایک ورکر سے اور وہ بھی کسی اور کی جانب سے؟"

"اس میں حرج کیا ہے؟ وہ میرے آفس میں جاب کرتی ہے۔ اس وقت میرے کام سے یہاں آئی تھی اور میرے ہی دوست کی وجہ سے اس کی دل آزاری ہوئی ہے۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے آفس میں کام کرنے والے ہر شخص خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔ اس کے تمام تر تحفظات کا خیال رکھوں۔"

گل مہر کا دل جو بدگمانی سے کبیدہ ہو رہا تھا' ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا وہ آہستہ سے اپنے کیبن کی جانب بڑھ گئی۔

"اب تم اس خباثت سے مسکرا کیوں رہے ہو؟" شہزاد نے جھنجلا کے ڈی جے سے سوال کیا۔

"کیونکہ تم پہلی بار کھل کے سامنے آرہے ہو۔ میرا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا تمہاری اس قابل احترام محترمہ کو ماڈلنگ کی آفر دینے کا۔ یونہی ذرا تمہیں چھیڑ رہا تھا اور تم حسب توقع چھڑ گئے۔ میں تو اس کے سامنے تمہارے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر ہی ٹھٹک گیا تھا اور اب میرا اندازہ درست نکلا' دال میں کچھ نہیں بہت کچھ لال لال ہے۔"

"تم ہوا میں تیر چلانے کی عادت مت ترک کرنا۔ سب کچھ بدل سکتا ہے مگر داؤد جمیل کی دوسروں کو تاؤ دلانے والی عادت نہیں۔" شہزاد نے ہاتھ میں رکھا ریسیور پٹخ کے کریڈل پہ دھرا۔

"اب میں تمہارے لیے لنچ بھی نہیں آرڈر کر رہا۔ جاؤ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"تم تو روٹھی محبوبہ کی طرح نخرے دکھا رہے ہو۔" ڈی جے اس کی خفگی کے اس **بچکانہ** انداز پہ کھل کے ہنسا۔

"چل کیا یاد کرے گا' لنچ آج میں تجھے کراتا ہوں اور وہ بھی **"ککوز کیفے"** میں۔"

☼ ☼ ☼

"اوہ یہ ہے سارا واقعہ۔۔۔ تھا کون وہ نامعقول شخص جس نے ہماری شہزادی گل مہر کی شان میں یہ گستاخی کرنے کی جرات کی؟؟"

مزنیٰ نے اس سے ساری تفصیل جاننے کے بعد پوچھا۔ اتفاق سے آج اسے شاپنگ کے لیے جانا تھا اور شاپنگ وہ گل مہر کے بغیر کرنے کی عادی نہ تھی' اس لیے اس کو لینے سیدھے آفس آن پہنچی۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ گل مہر بھی آج وقت سے پہلے فارغ ہو گئی تھی۔ شہزاد لنچ ٹائم پہ جو اپنے دوست کے ساتھ آفس سے نکلا تو دوبارہ نہیں لوٹا۔ البتہ اس نے فون پہ مطلع ضرور کر دیا تھا کہ وہ کل اس کے ساتھ ساری ڈسکشن کرے گا۔ اسی لیے اسے بھی جانے میں تامل نہ ہوا۔ ڈی جے کی وجہ سے اس کے مزاج میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی وہ مزنیٰ سے چھپ نہ سکی اور اس کے پوچھنے پہ گل نے الف سے یے تک ساری بات کہہ ڈالی۔

"سر کا کوئی بے تکلف دوست تھا اور کسی بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا چیئرمین' کوئی فضول سا بے تکا نام بھی بتایا تھا' اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے۔"

"چلو تمہارے باس نے اس کی ٹھیک ٹھاک دھلائی کر تو دی۔ اب تمہیں کس بات کا غم ہے؟؟"

"ہمیں اب احساس ہو رہا ہے کہ ابا حضور ہماری ملازمت کے اس قدر مخالف کیوں تھے اور تو اور **عمیص**۔۔۔ جسے ان کی ہر بات سے اختلاف ہوتا ہے اور جو خود کو بڑا جدت پسند اور روایت شکن ثابت کرتے ہوئے ہمیشہ نئے اقدار کے ساتھ چلنے اور دقیانوسی روایات کو ترک کرنے کی باتیں کیا کرتا ہے' اس نے بھی اگرچہ ابا حضور سے ہماری سفارش تو کی مگر در پردہ وہ بھی ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ باہر کی دنیا کے تھپیڑے ہم سہہ نہیں سکیں گے۔ اب احساس ہو رہا ہے کہ کسی حد تک وہ اپنے خدشات میں سچے تھے۔ دنیا نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہوتا سب کے جذبات کا احترام کرنے کا۔۔۔ نہ ہی ان پہ فرض ہوتا ہے کہ وہ سامنے والے کی حیثیت و مقام دیکھ کر اس سے بات کریں۔ اگر ہم صرف صاحبزادی گل مہر ہوتے تو شاید وہ ہمیں یوں بے دھڑک مخاطب تک کرنے کی جرات نہ کر پاتا' لیکن اس وقت ہم اس کی نظر میں اس کے دوست کے آفس میں کام کرنے والی ایک معمولی ورکر

تھے' گھر سے باہر نکل کر۔۔۔ مجبوراً' یا شوقیہ ملازمت کرنے والی ایک لڑکی جسے آگے بڑھنے کا کچھ حاصل کرنے کا شوق ہو اور اس نے حسب عادت انہی دوسری لڑکیوں کی طرح ہمیں بھی آگے بڑھنے یا کچھ حاصل کرنے کا لالچ دے کر اپنی رنگین دنیا میں گھسیٹنا چاہا۔ کتنا بے مول کر دیتے ہیں یہ لوگ ملازمت کرنے والی خواتین کو۔"

"یعنی تمہارا یہ جنون بھی جھاگ کی طرح بالآخر بیٹھ گیا۔ میرا خیال ہے کل سے تم گھر پہ بیٹھی نظر آؤ گی۔"

"ہرگز نہیں' کسی کے بے توقیر کر دینے سے انسان کی عزت کم نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ واقعی باعزت ہو تو اپنی عزت تسلیم کروانے کی لگن اور شدت اختیار کر جاتی ہے۔ اس واقعے سے ہم جو کچھ سوچنے پہ مجبور ہوئے وہ تمہیں کہہ دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بالکل ہی مایوس یا دلبرداشتہ ہو گئے ہیں۔ یہ اتنا بڑا واقعہ نہیں کہ ہم ہتھیار پھینک ڈالیں۔ بس۔۔۔ اتنا افسوس ہوا تھا کہ ہر وہ لڑکی یا خاتون جو کیریئر بنانا چاہتی ہے یہ کیوں مان لیا جاتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کو ہر راستہ قبول ہو گا۔ ہر وہ لڑکی جو گھر سے باہر نکلتی ہے اسے آسان چیز سمجھ لیا جاتا ہے۔ کیا وہ کسی عزت و تکریم کے لائق نہیں؟

ہمارے ساتھ جو واقعہ ہوا یہ تو بہت معمولی بات تھی' شاید ہماری جگہ کوئی اور ہوتی تو اس آفر کو اپنے لیے اعزاز جانتی۔۔۔ لیکن ہم۔۔۔ ہم ہیں مزنیٰ سب کو ایک ہی زاویے سے دیکھنا غلط ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت بڑی بات ہے' بہت بڑی۔"

"سب کو ایک ہی زاویے سے دیکھنا غلط ہے' تمہاری یہ بات درست ہے' اب دیکھو ناں تمہارے باس تو اپنے اس دوست سے مختلف ثابت ہوئے۔ انہوں نے خود یہ بات کہی کہ گل مہر اس ٹائپ کی نہیں۔"

"اسی بات سے تو ہمیں حوصلہ ہوا کہ کم از کم ہم جس ادارے میں کام کر رہے ہیں' وہاں کا ماحول تسلی بخش ہے۔ جس شخص سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے وہ عزت کرنا بھی جانتا ہے اور عزت کروانا بھی۔ اسے عورت کی تکریم کرنی آتی ہے۔ یہاں ایسی عورتیں بھی آتی ہیں جو قطعی طور پہ عزت کے لائق نہیں مگر ہم نے سر کو ان کے ساتھ بھی کبھی بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا۔"

"واہ۔ تم تو خاصی متاثر نظر آرہی ہو اپنے باس سے۔۔۔ حیرت انگیز۔"

"اس میں حیرت والی بات کیا ہے؟؟"

"یار تم اور کسی سے متاثر ہو جاؤ۔۔۔ یہ ناممکن امر ہے اور اگر یہ ناممکن' ممکن میں بدل جائے تو مجھ جیسی بے چاری کو حیران ہونے کا حق تو ہے۔ تمہارے جیسی خود پسند لڑکی کا کسی اور کی تعریف کرنا۔۔۔ ایک بار پھر کہنے پہ مجبور ہوں۔۔۔ حیرت انگیز۔" اس نے Pace کی پارکنگ بیسمنٹ میں کار پارک کرنے کے لیے جگہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم خود پسند ہیں یا نہیں' یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص واقعی تعریف کے قابل ہو تو ہمیں اس کی تعریف کرنے میں ہرگز کوئی مضائقہ محسوس نہیں ہوتا۔ سر شہزاد انہی خاص لوگوں میں سے ہیں۔"

"لو' اب تو میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔ یعنی اب تم نے کسی کو خاص بھی تسلیم کر لیا۔ جبکہ تمہیں ہمیشہ سوائے اپنے سبھی عام بلکہ معمولی ہی لگے ہیں۔" مزنیٰ اسے مسلسل چھیڑ رہی تھی۔

"عام لوگوں کے درمیان ہم خاص ہی لگیں گے۔" وہ اس کی شرارت سمجھتے ہوئے اسے جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"اور کسی دوسرے کو خاص تسلیم کر لینے سے ہمارا خاص ہونا کم نہیں ہو جاتا' آیا سمجھ میں مس مزنیٰ۔"

"سمجھ میں تو بہت کچھ آرہا ہے لیکن فی الحال خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ شاپنگ کی جائے۔" اس نے اتر کر کار لاک کی۔

"ورنہ میری رہی سہی سمجھ کا بھی تم بیڑہ غرق کر ڈالو گی۔"

☼ ☼ ☼

گھر میں تو وہ کہہ آیا تھا کہ وہ شام کو ہی آپا حضور کے ہاں جا سکے گا لیکن پھر اچانک اسے خیال آیا کہ بابر ہمایوں مغل تو صرف دن کے وقت ہی گھر پہ پائے جاتے ہیں۔ اگر وہ شام کے وقت گیا تو آپا چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ میکے رہنے نہیں جا سکیں گی۔ کیونکہ اپنے مزاج دار شوہر کی اجازت کے بغیر انہوں نے آج تک گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اسی وجہ سے اس نے سوچا کہ وہ اپنے بہنوئی کی موجودگی میں وہاں جائے اور خود ان کے لیے اجازت طلب کرے۔

وین نے اسے بریم گلی کے اسٹاپ پہ اتارا تھا' وہاں سے وہ پیدل ہی حویلی کی جانب چل پڑا۔

تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے آگے "رونق چوک" تھا جس میں چند دکانیں' راجا پہلوان کا ڈیرہ اور ایک سرکاری اسکول تھا۔ چوک کے دائیں جانب مڑنے والی سڑک کے پہلے کونے پہ ہی وہ حویلی تھی جو اپنی زبوں حالی اور شکستگی کے باعث اب ایک کھنڈر نظر آتی تھی اور جس کی تمام تر خراب حالات کے باوجود بہت سے خاندان اس کی خستہ چھت کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خاندان بابر ہمایوں مغل کا بھی تھا جس کے والد کے تصرف میں کبھی یہ پوری حویلی اپنی تمام تر سابقہ شان و شوکت اور آن بان کے ساتھ تھی۔

اور اب وہی بابر ہمایوں مغل اپنے کنبے کے ساتھ اس "کنڈری" کے ایک مختصر سے کمرے میں رہائش پذیر تھا۔ **عمیص** نے ذرا رک کر اس بے رنگ و روغن عمارت کو دیکھا اور تاسف سے سرد آہ بھر کے رہ گیا۔ دائیں جانب قطار کے ساتھ بنی گنتی کی چند دکانیں کھل چکی تھیں۔ ایک ماکھے گجر کے بھائی کی دکان جس میں دودھ دہی اور سستی مٹھائیاں سموسے وغیرہ بکتے تھے۔ ایک کریانے کی دکان جس میں چائے کی پتی' سرف اور شیمپو کی چھوٹی چھوٹی پڑیوں کے ہار لٹک رہے تھے' دھوبی کی اور نائی کی دکانیں' چند پھل اور دیگر چیزوں کی ریڑھیاں۔ وہ کریانے کی دکان کی جانب بڑھا۔ آج تک بہن کے گھر خالی ہاتھ نہ گیا تھا۔ اس نے شربت کی ایک بوتل' بسکٹ کے دو ڈبے خریدے۔ کیونکہ ریڑھیوں پہ موجود پھل پہ وہ ایک نظر دوڑا چکا تھا۔ گندا اور گلا سڑا پھل تھا۔ یہ چیزیں لے کر وہ مٹھائی کا جائزہ لینے حلوائی کی دکان کی جانب بڑھا تو دکان کے اندر بینچ پہ بیٹھے ماکھا گجر کے ساتھ حلوہ پوری کا ناشتا کرتے بابر ہمایوں مغل پہ نظر پڑی۔ **عمیص** کے سلام کرنے پہ بابر بری طرح چونکا۔

"ارے **عمیص** میاں آپ.... آج آپ کہاں راستہ بھول پڑے۔"

"امی حضور نے تاکید کی تھی کہ آج آپا کی خیر خیریت ضرور دریافت کر کے آؤں اور اگر وہ تیار ہوں تو انہیں ہمراہ لے جاؤں۔ کل چھٹی ہے' بچے ایک دن ننھیال میں گزار لیں گے۔"

"آؤ میاں' ناشتا کر لو۔" وہ ہنی ان سنی کرتے بولا۔

"جی نہیں شکریہ بھائی جان۔ میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔"

"اچھا تو میاں جائیے پھر اپنی ہمشیرہ سے مل آئیے۔" انہوں نے دوبارہ تمام تر توجہ ناشتے پہ مبذول کر لی۔ اپنے بہنوئی کی بے اعتنائی اور ان کے فضول سے دوست ماکھا گجر کی دبی دبی استہزائیہ مسکراہٹ دیکھ کر **عمیص** خاصا جزبز ہوا۔

"آپ نہیں آئیں گے بھائی جان؟ عرصہ ہوا آپ کے ساتھ کوئی پر لطف نشست نہیں جمی۔"

"اجی چھوڑیے' میاں' ہم کیا اور ہماری گفتگو کیا۔" بابر نے جیسے ہوا میں مکھی اڑائی۔

"ہم آ گئے تو آپ کی ہمشیرہ کھل کے اپنے دکھڑے نہ رو سکیں گی۔" اس طنز پہ **عمیص** اور بھی ناگواری محسوس کرنے لگا۔ یوں سر عام چوراہے پہ بیٹھ کے گھر کی باتیں اس انداز میں کرنا اور وہ بھی غیر لوگوں کے سامنے اسے ذرا پسند نہ آیا۔ وہ خاموشی سے پلٹنے لگا کہ ماکھے گجر نے پکار لیا۔

"آ یار شہزادے' اس مخولیے کی بات پہ کیوں ناراض ہوتا ہے۔ ہم تو سجنوں کے سجن ہیں تو بابر شہزادے کا سالا ہے تو اپنا بھی بچہ ہوا۔ آجا یار' ہم نے کبھی وکھرے وکھرے نوالہ نہیں توڑا۔ یاروں کو اور یاروں کے یاروں کو ساتھ بٹھا کے پیٹ بھرا ہے۔ کیوں بھئی بابر شہزادے' تو ہی کہہ بچے کو.... کہ آجا ہمارے ساتھ بسم اللہ کرے۔

اوئے منہ سی کے کیا بیٹھا ہے۔ اوئے تجھے پتہ نئیں ساری خدائی ایک طرف' جورو کا بھائی ایک طرف۔" اس کے بھونڈے قہقہوں کا ساتھ اس کے حواریوں نے دل کھول کے دیا۔ **عمیص** اور بھی بدمزہ ہوا مگر کچھ کہے بغیر آگے چل پڑا۔

"آداب ماموں جان۔" دلکش نے سب سے پہلے اسے دیکھا اندر جھانک کے ماں کو اطلاع دی۔

"امی حضور' دیکھیے ماموں آئے ہیں۔"

صاحبزادی یاسمین "بسم اللہ" کہتی اپنا سلائی کا پھیلاوا سمیٹنے لگیں۔ **عمیص** دلکش کے برابر رکھی لکڑی کی چوکی پہ بیٹھ گیا۔ وہ کمرے کے آگے بنے مختصر سے برآمدے میں زمین پہ رکھے چولہے پہ کچھ پکا رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہے ہماری بٹیا۔"

"ابا حضور کی فرمائش تھی گڑ والے چاول بنانے کی.... سو اسی کا شیرہ تیار کر رہے ہیں۔"

"واہ' ہماری ننھی سی گڑیا اتنی بڑی ہو گئی۔"

"بچیوں کو سب آنا چاہیے اور کم عمری میں سیکھے ہنر تادیر تک کام آتے ہیں۔" صاحبزادی یاسمین کہتی ہوئی کمرے سے نکلیں تو **عمیص** "تعظیماً" کھڑا ہو گیا' انہوں نے نظر بھر کے جوان خوبرو بھائی کو دیکھنے سے بھی اجتناب کیا مبادا ان کی اپنی نظر نہ لگ جائے۔ زیر لب نظر بد کا ورد کرتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے پہ پھونک ماری۔

"پڑھتی وڑھتی بھی ہو یا انہی کاموں میں لگی رہتی ہو؟"

"آپ کو بتایا تو تھا۔ یہیں نزدیک ہی ایک استانی جی رہتی ہیں' دلکش انہی کے پاس پڑھنے جایا کرتی ہیں مگر روزانہ کا معمول بن نہیں پاتا۔ کبھی کبھی ان کے والد گھر سے نکلنے میں معمول سے زیادہ تاخیر کر دیتے ہیں اور ہم دلکش کو شام ڈھلے تو گھر سے نہیں بھیج سکتے۔"

"یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہوا آپا اس طرح اس کی تعلیم پہ برا اثر پڑے گا۔ عمر کے لحاظ سے تو اس وقت دلکش کو.... میرا خیال تھا یہ اس سال مڈل کا امتحان دے لے تو اسے ایک ہی سال میں تیاری کروا کے میٹرک پاس کروا دیں گے۔ میں نے موتیا سے بھی یہ بات ڈسکس کی تھی۔ آپ کھل کر بابر بھائی سے بات کر کے تو دیکھیں۔ میرا خیال ہے تعلیم کے مسئلے پہ انہیں ذرا روشن خیالی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ایسی سوچ تو ابا حضور اور چچا حضور کی بھی نہیں رہی تھی۔ آپ.... گل مہر اور موتیا اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ان کی مرضی اور خواہش سے ہی تعلیم حاصل کرتی رہی ہیں۔ آپ کی شادی جلد ہو گئی اور میٹرک کے بعد آپ تعلیم جاری نہ رکھ سکیں' موتیا نے بھی گھریلو ذمہ داریوں میں الجھ کے بی اے کے دوران ہی تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا لیکن اب میرے مشورے سے وہ گھر پہ تیاری کر رہی ہے۔ دو ماہ بعد بی اے کے پرائیویٹ امتحان دے گی اور گل مہر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے جنون کا چچا حضور نے بڑی خوشی سے ساتھ دیا ہے۔ پھر بابر بھائی جان آج کے زمانے کے ہو کر ایسی سوچ کیوں رکھتے ہیں۔ یہ کون سا زمانہ ہے بیٹیوں کو گھر بٹھا کے شعور اور تعلیم کی روشنی سے محروم رکھنے کا۔"

"اب آپ کو کیا بتائیں میرے بھائی۔" یاسمین آہ بھرنے کے سوا اور کیا کہہ سکتی تھیں۔ یہ تو بتا نہیں سکتی تھیں کہ ان کا شوہر جس ماحول میں زیادہ تر وقت گزارنے کا عادی ہے وہاں عورت ذات کے اتنے ناقابل اعتبار روپ دیکھتا ہے کہ اس کا اعتماد اپنی گھر کی عورت سے بھی ڈانوا ڈول ہو جاتا ہے۔ صاحبزادہ نفیس علی خان محض روایات کے پابند تھے' خاندانی ناموس و حرمت پہ جان لٹانے والے تھے وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ زمانے کی سرد ہوا ان کی اولاد کی سوچ و فکر پہ اثر انداز نہ ہو اس لیے انہوں نے چند سخت ترین قوانین وضع کیے لیکن اولاد کو پابند سلاسل نہیں کیا جبکہ بابر ہمایوں مغل کی سختی' پردے کی پابندی' وغیرہ محض ڈھکوسلہ تھا' جس دنیا کا وہ باسی تھا اس میں اتنا تعفن تھا کہ اسے گلوں سے بھی بدبو آنا شروع ہو گئی تھی۔ جس شخص کی اپنی نیت ستھری نہ ہو' اسے دوسروں کی نیت میں بھی فتور نظر آیا کرتا ہے۔ دوسری کی بہنوں اور بیٹیوں پہ بری نظر ڈالنے والے مکافات عمل

کے خوف سے اپنے گھر کی دیواریں ہی اونچی نہیں کرتے بلکہ کھڑکیوں اور روزنوں میں بھی میخیں ڈلوا لیتے ہیں۔

"آپ اجازت دیں تو میں بات کروں بابر بھائی جان سے۔"

"کہیے میاں 'کیا بات کرنی ہے آپ کو ہم سے۔"

عقب سے بابر پان کی خوشبودار گلوری کلے میں دبائے نمودار ہوئے۔ عمیص نے سنبھل کے یاسمین کی جانب دیکھا مگر ان کی نظروں میں تنبیہہ پا کے بات کا رخ موڑ دیا۔

"میں آپا سے کہہ رہا تھا کہ بابر بھائی سے پوچھ کر آج ہماری طرف چلیے 'امی حضور بچوں کے لیے خاصی اداس ہو رہی تھیں۔"

"لیکن بچے تو اس وقت اسکول ہوتے ہیں صاحبزادے۔"

"میں اس وقت صرف آپا کی مرضی معلوم کرنے آیا تھا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو وہ تیار ہو جائیں۔ میں شام کو واپسی میں انہیں یہاں سے گھر لے ——— جاؤں گا۔"

"واپسی پہ؟ کیوں میاں؟ کہاں کا قصد ہے؟"

"جی بس ۔۔۔ ویسے ہی ایک کام سے جا رہا تھا۔" اس نے ٹال دیا۔

"لو دیکھ لو بیگم 'آپ کے بھائی کو بھی تو کام ہوتے ہیں یعنی یہ ثابت ہوا کہ کام ہونے کے لیے بندے کا "کام کا ہونا" ضروری نہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"صاحبزادے آپ کی ہمشیرہ ہم سے اکثر ہی سوال کرتی ہیں کہ آخر آپ کو ایسے کیا کام ہیں جو بلا ناغہ گھر سے نکلتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہمارا کوئی کاروبار نہیں 'روزگار کی سبیل نہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم عورتوں کی طرح گھر کے ہو کے رہ جائیں۔ اب آپ کو بھلا کیا کام ہو گا باہر؟ آپ بھی تو ہماری طرح ہی ۔۔۔"

ان کے قہقہوں کا جواب عمیص ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ "مروتاً" بھی نہ دے سکا۔ سرونگاہوں سے اس بے حمیت شخص کو دیکھتا رہا۔

"پھر بتایئے آپا 'میں شام پانچ بجے کے قریب آ جاؤں۔"

وہ ایک بار پھر شوہر کا چہرہ تکنے لگیں بالآخر بابر نے ایک شان بے نیازی سے نیم رضامندی ظاہر کی۔

"جائیے جائیے 'شوق سے جائیے 'یہاں کیا رکھا ہے بیگم 'آپ وہیں جائیے اپنے ابا حضور کے محل دو محلے میں ۔۔۔ کنیزیں پنکھا جھلیں گی ۔۔۔ خدام من و سلویٰ پیش کریں گے ۔۔۔ جائیے ۔ بصد شوق جائیے۔"

"آپ بھی کل سویرے وہیں آ جائیے گا۔ عرصہ ہوا وہاں کسی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔" یاسمین نے ڈرتے ڈرتے گزارش کی۔

"یوں کیوں نہیں کہتیں آپ ۔۔۔ کہ میرے چچا حضور کی قدم بوسی کے لیے آ جائیے گا۔" بابر نے تمسخر اڑایا پھر عمیص کا لحاظ کرتے ہوئے رواداری میں ہامی بھر لی۔

"اچھا دیکھیں گے ۔۔۔ وقت ملا تو آ جائیں گے۔"

اس جیسے بے مروت و بے لحاظ شخص کا اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا۔ یاسمین بھائی کے سامنے مزید سبکی نہ ہونے کے خیال سے ہلکی پھلکی ہو گئیں۔

"ایسے نہیں چلے گا بھائی جان۔ چچی حضور نے خاص تاکید کی تھی۔ آخر آپ ان کے لاڈلے اور فی الحال اکلوتے داماد ہیں۔ آپ کو تو اس پروٹوکول کا جی بھر کے مزہ لینا چاہیے۔" عمیص نے ماحول کو مزید خوشگوار کرنے کی غرض سے شوشہ چھوڑا جس کا نتیجہ حسب منشا رہا۔ خود پسندی کا شکار بابر اس اہمیت پہ مسرور ہو گیا۔

"اور آپ کی سالی صاحبہ نے تو خصوصی طور پہ پوچھ بھیجا ہے کہ آپ کل کے دوپہر کے کھانے میں کیا کھانا پسند کریں گے۔ وہ آپ کی پسند کے مطابق پکانا چاہتی ہے بلکہ اس کی خواہش تھی کہ آپ کل اتوار کا ناشتا ہمارے ساتھ ہی کریں۔" عمیص نے تیر نشانے پہ بیٹھتا دیکھ کر مزید لیپا پوتی کی۔

"نہیں خیر ۔۔۔ ناشتے پہ آنا تو قدرے مشکل ہو گا البتہ ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ناشتا سرے سے کریں گے ہی نہیں ۔۔۔ آج رات احباب کے ساتھ ایک محفل ہے۔ رات گئے لوٹیں گے تو صبح دیر سے ہی آنکھ کھلے گی ورنہ صاحبزادی الماس کی ناشتے کی دعوت ضرور قبول کرتے۔ ان کے ہاتھ کے ذائقے کے تو ہم دل سے معترف ہیں۔ بہرحال ہماری فرمائش ان تک پہنچا دیجیے گا 'مغلئی پلاؤ 'مہابت خانی پسندے اور نورتن تورمہ ۔۔۔ جو وہ سبزیوں کے ساتھ پنیر شامل کر کے بنایا کرتی ہیں۔"

"جی ضرور بھائی جان۔ اچھا آپا ۔۔۔ آپ وقت پہ تیار رہیے گا۔ میں ان شاء اللہ شام پانچ سے چھ کے دوران یہیں ہوں گا۔"

☼ ☼ ☼

دن کے گیارہ بجے تھے۔ خلاف معمول آج موسم خاصا خوشگوار تھا۔ دو دن سے تو گویا آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ شام ہوتے ہی ریتلی آندھیاں چلتیں اور ہر طرف گرد و غبار کر جاتیں۔ آج صبح سے نہ صرف بادل چھائے ہوئے تھے بلکہ بڑی سبک ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ کل ہی میاں رب نواز کے ڈیرے پہ یہ طے ہوا تھا کہ سب احباب مل کے اپنے باغات کا دورہ کریں گے۔ میاں رب نواز کے علاوہ صاحبزادہ نفیس علی خان 'چوہدری نیاز ملک اور حیات محمد ٹوانہ ۔۔۔ ان سب ہی گہرے دوستوں کے آم اور جامن کے باغات ایک ہی جگہ تھے۔ ان سب کی دوستی میں قدر مشترک بھی یہی تھی ورنہ کہاں صاحبزادہ نفیس علی خان جیسا لکھنوی تہذیب کا پروردہ 'مرصع اردو بولنے والا نفیس طبع شخص ۔۔۔ کہاں ضلع اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والا جاٹ سردار چوہدری نیاز ملک ۔۔۔ کہاں ملتان کا ٹھیٹھ سرائیکی لہجے میں بات کرنے والا معمولی پڑھا لکھا زمیندار حیات محمد ٹوانہ اور سیاست کا شغل رکھنے والا کم گو مگر زیرک اور کسی حد تک عیار میاں رب نواز ایک اور قدر مشترک یہ بھی تھی ان چاروں کی جڑیں بہت مضبوط تھیں۔ نسل در نسل اور پشت در پشت چلی آ رہی سرداری نے ان چاروں کے اندر ایک رعونت اور وقار پیدا کر رکھا تھا۔

سب کے سب چوہدری نیاز ملک کے فارم ہاؤس پہ جمع ہوئے جو ٹھوکر نیاز بیگ میں ایک وسیع و عریض رقبے پہ واقع تھا۔

میاں رب نواز اپنی لینڈ کروزر میں صاحبزادہ نفیس علی خان کو ہمراہ لائے تھے پر تکلف ناشتے کا اہتمام فارم ہاؤس کے سرسبز لان میں نصب سنگ مرمر کے چبوترے پہ تھا۔ دلکش رنگوں والے مور پنکھ پھیلائے ادھر سے ادھر آزادانہ پھر رہے تھے۔ حوض میں ہنس تیرتے ہوئے ماحول کو فطرت کے مزید قریب لا رہے تھے۔ مصنوعی پتھروں کی آبشار سے ایک دلفریب ردھم کے ساتھ پانی جھر جھر رواں تھا اور آبشار کے ساتھ بنے آہنی پنجروں میں کالا چیتا 'سفید ریچھ اور آسامی شیر قید تھا۔

فضا میں ناشتے کے لوازمات کی اشتہا انگیز مہک کے ساتھ ساتھ قسم قسم کے پھولوں اور پھل دار درختوں کی مخصوص خوشبو بھی اپنا اپنا احساس دلا رہی تھی۔

"اس سال آندھیاں پچھلے سال کی نسبت کم آئی ہیں۔ امید ہے آموں کا نقصان زیادہ نہیں ہوا ہو گا۔" میاں رب نواز نے توقع ظاہر کی تو چوہدری نیاز ملک نے دانت میں خلال کرتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"او جانے دو میاں صاحب 'ان چھوٹے موٹے نقصانات کی آپ کو بھلا کیا فکر۔ آپ کی شوگر مل سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے 'میری زمینیں بھی سارا سال کم سونا نہیں اگلتیں 'اسی طرح ٹوانہ صاحب کی کپڑے کی فیکٹریاں زندہ باد ۔۔۔ اور آپ کی تو سیاست بھی کم منافع بخش نہیں۔ اسی طرح اپنے نفیس خاں صاحب تو ہیں ہی نواب ابن نواب ۔۔۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ یہ باغات وغیرہ تو بس خود کو مصروف رکھنے کا ایک بہانہ ہیں کبھی کم از کم میں نے یہاں کی آمدنی کو کاروبار کا حصہ نہیں جانا۔ ذرا شغل میلہ ہو جاتا ہے 'کبھی کبھی بچے اکٹھے ہوں تو باغوں پہ پکنک وغیرہ کا پروگرام بن جاتا ہے۔ ویسے بھی یہ زمینیں 'باغات جائیدادیں زمینداری کی شان بڑھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ فکریں بڑھانے کے لیے نہیں کہ آم کا بور آندھیاں تباہ کر گئیں تو کتنا نقصان ہوا ۔۔۔ کتنا نہیں ہوا۔"

صاجزادہ نفیس علی خاں غیرارادی طور پہ اس بات کو سن کر آبشار کے گرتے پانی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ یہ تو صرف وہی جانتے تھے کہ ان کا واحد ذریعہ معاش یہی باغات اور انہی سے ہونے والی آمدنی ہے۔ البتہ ٹوانہ صاحب نے شدومد سے اس کی تردید کی۔

"نہیں مینڈھا یار۔۔۔ تساں نوں کے پتہ ہمٹی دا عشق کی ڈاھڈی شے ھوندی اے۔"

(تمہیں کیا خبر مٹی کا عشق کیا ظالم شے ہے)

"بالکل درست' یہ ایک حقیقت ہے چوہدری کہ تم حس لطیف اور حس ذوق سے قطعی عاری شخص ہو۔"

میاں رب نواز کا یہ تجزیہ چوہدری کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ ٹوانہ صاحب کی ملتانی سرائیکی وہ آسانی سے سمجھ لیتا تھا مگر صاجزادہ نفیس کی لکھنوی نوابی اردو اور میاں رب نواز کی سیاسی تقریروں جیسی دو ٹوک اور بے رحم باتیں اسے کم سمجھ میں آیا کرتیں۔

"آم کے عشق میں جو شخص مبتلا ہو' اس کے دل سے پوچھو کہ ایک آم کے ضائع ہونے کا درد بھی کیا ہوتا ہے۔"

"ہاں اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے۔"

"میاں صاحب گیارہ بج رہے ہیں' کب تک نکلنے کا قصد ہے' کیا کسی اور کا بھی انتظار ہے؟" صاجزادہ نفیس علی خان کے پوچھنے پہ میاں صاحب نے بتایا۔

"جی خاں صاحب انتظار تو ہے۔ میرے وکیل نے چند بے حد ضروری کاغذات پہ دستخط کروانے ہیں اور اس کا فون آیا تھا وہ نکل بھی چکا ہے۔ راستے میں ہو گا' اب تک تو پہنچنے والا ہو گا۔ بس کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں ویسے بھی یہاں سے باغات تک کا راستہ بمشکل چالیس سے پچاس منٹ ہو گا۔"

"موسم کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اگر بارش ہوئی تو واپسی پہ کچے راستے کی وجہ سے دشواری ہو گی۔"

"جانے دیجئے خاں صاحب' یہ بادل تو نہ گرجنے کے ہیں نہ برسنے کے۔ بہت ہوا تو ذرا بوندا باندی ہو جائے گی۔ آپ سنائیے میاں جی' وکیل خیریت سے آ رہا ہے؟ کس قسم کے کاغذات ہیں؟"

"کسی بدذات نے ہماری ککھڑ والی اس زمین پہ قبضہ کر لیا ہے جو عرصے سے بنجر پڑی ہے۔ بیس سال پہلے اس زمین نے اناج دینا بند کیا' میں نے بھی توجہ نہ کی۔ زمینوں کی کون سا کمی ہے' دوسرے بکھیڑے ہی جان نہیں چھوڑتے جو کسی اور جانب دھیان جائے۔ ادھر پچھلے کچھ سالوں سے بچے زور دے رہے تھے کہ اس زمین پہ کوئی فیکٹری بنائی جائے لیکن میں ٹال مٹول کر رہا تھا۔ شوگر مل ہے' باغات' شہر میں پلازہ۔۔۔ دکانوں مکانات کے کرائے وغیرہ۔ نیا جھنجھٹ شروع نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ میں اس زمین سے بالکل ہی لاتعلق تھا۔ زمین تو ہماری آبرو ہوتی ہے' بے کار ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس سے آنکھ پھیر لیتا۔ انتہائی بدقماش گروہ ہے جس نے اس زمین پہ ناجائز قبضہ کرا دیا ہے۔ نزدیک ہی ان کے اینٹوں کے بھٹے ہیں' اپنے مزدوروں کے کچے پکے جھونپڑے وہاں بنوا دیے ہیں۔ یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ ڈھیٹ قسم کے غریبوں کے ڈیرے وہاں لگوا دینا۔۔۔ میاں رب نواز نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں فی الحال عدالتی کارروائی کے ذریعے پہلا قدم اٹھا رہا ہوں تاکہ میری حیثیت مضبوط اور پوزیشن صاف رہے لیکن موقع ملا تو انگلی ٹیڑھی کرنے سے بھی گریز نہ کروں گا۔"

"پکے سیاست دان ہو یار۔" ٹوانہ نے قہقہہ لگایا صاجزادہ نفیس علی خان نے بھی تبسم بکھیرا۔

"جی حضرت' بات جب آن پہ بن آئے تو خاندانی لوگ سبھی کچھ کر گزرتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"ہمارے نزدیک یہ معاملہ محض چند مربع زمین کا نہیں۔ وقار اور غیرت کا ہے۔ اپنا حق چھوڑ دینا بزدلی ہے اور بزدلی عزت داروں کا شیوہ نہیں اور بڑے بے غیرت تو وہ ہیں جو دوسروں کے حق پر بری نظر رکھتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے ہمیں ایسے بدنیت لوگوں پہ۔۔۔ کس دیدہ دلیری سے دوسروں کی چیز پہ قبضہ جما لیا۔"

"نواب صاحب' خدا کے واسطے اب تو اس دنیا کے حالات پہ حیران ہونا چھوڑ دیجئے۔ اب تو کچھ بھی نیا ہو۔ بڑے سے بڑا واقعہ کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ ہر برائی' ہر جرم سبھی کچھ دھڑلے سے ہوتا ہے۔"

"دراصل ہمارے نواب صاحب نے خود ساری عمر بڑی صاف ستھری اور اصول سے گزاری ہے۔ جس کی اپنی فطرت میں ہلکی سی کجی نہ ہو اسے ذرا سا ٹیڑھا پن بھی ناگوار گزرتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ صاجزادہ نفیس علی خان جیسے اصول پرست اور وضع دار لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔"

"ذرہ نوازی ہے حضور۔" صاجزادہ نفیس اپنی تعریف پہ کسر نفسی سے مسکرائے۔

"جی ہم نے تو اپنے بزرگوں سے یہی ایک سبق حاصل کیا ہے کہ زر رہے نہ رہے' زمین رہے نہ رہے۔ سربلندی نہیں کھونا چاہیے' یہی وجہ ہے کہ نامساعد ترین حالات میں بھی ہم نے اپنا خاندانی تشخص ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہر ممکن کوشش کی کہ ہمارے آباء ہماری جو شناخت بنا گئے ہیں' اس پہ آنچ نہ آنے پائے۔ یہی تو بڑی بات ہے' دولت' شہرت آنی جانی چیز ہے۔ کم تر سے کم تر آدمی بھی اپنی محنت' تقدیر کی مہربانی یا پھر کسی اور جائز ناجائز حربے سے یہ چیزیں حاصل کر لیتا ہے مگر شجرہ' خاندانی وقار اور اونچی حیثیت یہ وہ نعمتیں ہیں جو قسمت والے لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ شاطر سے شاطر شخص بھی کسی طریقے سے انہیں حاصل نہیں کر سکتا۔ دولت سے شجرہ نہیں خریدا جا سکتا۔ پھر جس نصیب والے کو یہ بن مانگے مل جائے' اس کے شانے پہ یہ ایک بھاری ذمہ داری کی طرح ہوتا ہے۔ اس پہچان کو تمغے کی طرح سینے پہ سجا لینا ہی کافی نہیں۔ اس کی حفاظت کرنا بھی بہت بڑی بات ہے۔ بڑے کم ہمت دیکھے ہیں ہم نے' جو حالات کی ذرا سی تنگی سے گھبرا کے اپنے اس تشخص کو ٹھیس پہنچا دیتے ہیں۔ محض معمولی تنگ دستی سے تنگ آ کے' دنیاوی عیش و آرام کے لالچ میں اس نعمت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔"

"بجا ارشاد۔۔۔ لیجئے وکیل صاحب بھی آ گئے۔" میاں رب نواز نے فارم ہاؤس کے کھلے گیٹ سے بلو کیب اندر آتے دیکھ کر کہا۔ بلو کیب کی رفتار دھیمی ہوتے ہوتے ان کے قریب آ کے رک گئی۔

میاں صاحب کا وکیل کاغذات کی فائلیں اور بریف کیس سنبھالے نیچے اترا۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کے ان سے یہ سامان ہاتھ میں لیا۔ اب وکیل ڈرائیور کی سیٹ پہ جھکا اسے کرایہ ادا کر رہا تھا۔ یونہی اچٹتی سی نظر صاجزادہ نفیس علی خان نے اس جانب ڈالی اور پھر جیسے پلٹنا بھول گئے۔ وکیل کے عقب سے ہلکی سی جھلک انہیں بری طرح چونکا گئی۔ وہ اضطراب سے پہلو بدلتے وکیل کے ہٹنے کا انتظار کرنے لگے اور جب ہی وہ ادائیگی کر کے پلٹا' ان کا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ عمیص ہی تھا' ڈرائیور کی سیٹ پہ۔

نواب خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ' صاجزادہ عمیص علی خان۔

● ● ●

عمیص ابھی ابھی صاجزادی یاسمین اور بچوں کو لے کر گھر پہنچا تھا۔ گرمی سے سب کا برا حال تھا۔ صاجزادی یاسمین اپنے برقع کے بٹن کھولے پنکھے کے عین نیچے بیٹھی پسینہ خشک کر رہی تھیں۔ ننھا اقدس موسم کی سختی اور تھکن سے بے نیاز دلگیر کے کاندھوں پہ سوار چہک رہا تھا۔ شمشیر اور نایاب بڑے مودب سے بیٹے اپنی دونوں نانیوں سے دعائیں سمیٹ رہے تھے جبکہ دلکش نعمت کدہ میں موتیا کے ساتھ شربت تیار کر رہی تھی۔ اتنے میں کل مہر کی آمد ہوئی کافی دنوں کے بعد یاسمین کو دیکھ کے اسے خوشی تو ہوئی مگر چاروں بچوں کو آنگن اور برآمدے میں بیٹھے دیکھ کر اس نے تھکن اتارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ دن ڈھلے ان کی آمد اس بات کا اشارہ کر رہی تھی کہ یقیناً وہ یہاں قیام کے ارادے سے آئی ہیں اور یہ قیام کتنے دن پہ محیط ہو گا' یہ وہ نہ جانتی تھی' جانتی تھی تو بس اتنا کہ چند الجھن بھرے اکتائے ہوئے دنوں کا آغاز ہونے والا ہے۔ یہ الجھن۔۔۔ یہ اکتاہٹ ابھی سے اس کے رویے پہ غالب آ گئی۔

اس کے انداز میں گرمجوشی اور تپاک کا فقدان سبھی کو بری طرح کھلا۔ لیکن صاحبزادی گل مہر خانم کی یہی تو مجبوری تھی کہ وہ مصلحتاً بھی موت کا لبادہ اوڑھنے کے فن سے انجان تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے ذاتی طور پہ یاسمین سے کوئی پرخاش تھی۔ وہ تو اتنی سادہ فطرت اور بے ضرر تھیں کہ کسی کو ان کی ذات سے شکایت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ عرصہ ہوا اس حویلی کے مکینوں کی تعداد چھ تھی جن میں سے صاحبزادہ نفیس علی خان تو ناشتے کے اوقات کے علاوہ عموماً اپنے حجرے یا بیٹھک تک محدود رہتے۔ صاحبزادی خلعت النساء کی آواز شاید ہی کوئی دن بھر سن پاتا ہو' وہ اپنی عبادت و وظائف یا پھر آرام میں مشغول رہا کرتیں۔ صاحبزادی حرمت النساء بیٹی کی فطرت و عادت سے واقف تھیں اس لیے اس کے زمانہ طالب علمی سے ہی بطور خاص یہ دھیان رکھا کرتیں کہ اس کے آرام' ذہنی یکسوئی میں کوئی خلل نہ پیدا ہو۔ موتیا کے ساتھ کی وہ بچپن سے عادی ہو چکی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ تو اس کا بھی دیگر مصروفیات میں ہی گزرتا فارغ ہوتی تو ضرور دن میں ایک آدھ بار گل سے نوک جھونک ہوتی جو بھی تھا' ان کھٹی میٹھی جھڑپوں کے باوجود دونوں کے تعلقات کبھی بھی ناخوشگوار رخ اختیار نہیں کرنے پائے۔ عمیص سے بھی اب سامنا نہ ہونے کے برابر تھا' ایک تو وہ خود جاب کی وجہ سے گھر سے سارا دن باہر رہتی' دوسرا وہ بھی اب رات دیر گئے تک واپس لوٹتا۔ کچھ اس گریز میں دونوں کی شعوری کاوشیں بھی شامل تھیں۔ دلگیر تھا تو وہ خود گل مہر کے سائے سے بھی بدکتا تھا۔

ایسے میں گھر میں کسی اور کی آمد تنہائی پسند اور لگے بندھے معمول کی عادی گل مہر کو ڈسٹرب کر جاتی۔ پچھلے چار روز سے اس پہ کام کا لوڈ بھی بے حد تھا۔ وہ کمپیوٹر لے چکی تھی' اب اسے اس کام کے لیے مزنی کے گھر نہیں جانا پڑتا تھا۔ آفس سے آکر بھی کئی گھنٹے وہ کمپیوٹر پہ نت نئے تجربات کرنے میں مصروف رہا کرتی۔ آج ہی اس کے حصے کا سارا کام مکمل ہوا تھا۔ "شیر دل" کی اکٹھی دو اقساط ایڈٹ ہو کر مکمل ہو چکی تھیں۔ کچھ روز کے لیے آرام ہی آرام تھا۔ وہ یہ ویک اینڈ بھرپور طریقے سے تھکن اتارتے ہوئے سکون سے گزارنا چاہتی تھی لیکن گھر میں اکٹھے پانچ نفوس کی آمد سے اسے یہ ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ خاص طور پہ اس صورت میں کہ ان میں تین کبھی نچلے نہ بیٹھنے والے بچے بھی شامل تھے۔

"آپ آیا حضور' آپ اچانک؟" یاسمین کے والہانہ انداز میں گلے لگانے کے جواب میں وہ سرسری انداز میں ان کی آمد کا مقصد و دورانیہ جانچنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

"اچانک تو نہیں' شاید آپ کو خبر نہ ہو۔ ہم تو کئی روز سے صاحبزادی یاسمین کو بلاوا بھیج رہے تھے۔ انہیں آج وقت ملا۔۔۔ بلکہ صاحبزادہ عمیص جا کر لائے ورنہ انہیں کیا اس کی پروا کہ ہم لوگ بچوں کی صورت دیکھے بغیر کیسے اتنے دن گزار دیتے ہیں۔"

بس چچی حضور' آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے گھرداری کی مصروفیات کو۔ بچے اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوں تو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ ان کی سہولت کے مطابق گھر سے نکلنا پڑتا ہے کل چھٹی کا دن ہے اور اتفاق سے چھٹی کے اگلے روز اسکول میں ان کا کوئی امتحان وغیرہ بھی نہیں جس کی تیاری کرنا ہو' اس لیے نکلنے کا قصد کر لیا۔"

"بس آپا میں نے کہہ دیا اگلے ماہ سے بچوں کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوں تو آپ نے ساری چھٹیاں یہاں گزارنی ہیں۔" موتیا شربت کی ٹرے اٹھا کر نمودار ہوئی۔

"ساری تعطیلات تو نہیں البتہ ان کے ابا کی اجازت سے ڈیڑھ دو ہفتے ضرور گزاریں گے۔" یاسمین کے ہامی بھرتے ہی گل مہر کے اعصاب تن گئے۔ وہ خاموشی سے ٹھنڈے شربت کے گھونٹ بھرنے لگی۔ عمیص جواب لاتعلقی سے رخ پھیرے بیٹھا تھا' دزدیدہ انداز میں ایک نظر ڈال کے رہ گیا۔

"اور بابر میاں وہ کیوں نہیں آئے؟ ہم نے بطور خاص انہیں مدعو کیا تھا۔" صاحبزادی خلعت النساء نے [illegible] استفسار کیا۔

"آج انہیں ایک ضروری کام تھا۔ اس لیے معذرت کر رہے تھے البتہ کل آنے کا وعدہ ضرور کیا ہے۔ کل انشاء اللہ وہ ظہرانہ یہیں کریں گے۔" اس نئی اطلاع پہ گل مہر مزید برداشت کا مظاہرہ نہ کر سکی اور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اپنا بیگ اور چادر اٹھا کر وہ ایک لفظ کہے بغیر کمرے کی جانب مڑ گئی۔ بابر ہمایوں مغل ہمیشہ اس کے لیے ایک ناپسندیدہ اور ناقابل برداشت ہستی رہا تھا اگرچہ کبھی کھل کے اس نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مگر سبھی اس تلخ حقیقت سے واقف تھے اس لیے اس کا اٹھ کر جانا ایک لمحے کے لیے سب کو خاموش کر گیا۔ صاحبزادی یاسمین بھی خجل سے انداز میں دلگیر کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے اقدس کو پکارنے لگیں۔

"نواب صاحب تشریف لے آئے۔" میاں رب نواز کی گاڑی کے مخصوص ہارن پہ دلگیر نے چونک کر اطلاع دی۔ غیر ارادی طور پہ موتیا' دلکش اور یاسمین اپنے آنچل درست کرنے لگیں۔ عمیص نے ایک نظر اپنے پسینے سے بھرے لباس اور گرد آلود حلیے کو دیکھا اور غسل کی نیت سے اندر کی جانب لپکا' جانتا تھا کہ اس کے چچا حضور کو ایسے حلیے سے کس قدر الجھن ہوتی ہے۔

صاحبزادہ نفیس علی خان حسب عادت کھنکھارتے ہوئے راہداری سے نمودار ہوئے اور برآمدے میں موجود سب اہل خانہ کے درمیان صاحبزادی یاسمین کو بمعہ بچوں کے دیکھ کر قدرے ٹھٹھکنے کے انداز میں رکے۔

"السلام علیکم نانا حضور۔" بچوں کے مشترکہ' مودب مگر گرمجوش سلام کے جواب میں بھی وہ اپنے چہرے پہ بشاشت پیدا نہ کر سکے۔ سب نے اسے ان کی تھکن پہ محمول کیا۔ وہ گرے گرے انداز میں کرسی پہ بیٹھے موتیا لپک کے ان کے لیے بھیگا تولیہ اور سکنجبین لانے اندر گئی جو کہ ان کا مرغوب مشروب تھا۔ صاحبزادی خلعت النساء ان کے غیر معمولی رویے سے قدرے ٹھٹھکیں اور غور سے ان کا چہرہ کھوجنے لگیں۔ انہوں نے نہ تو دنوں بعد میکے آئی بیٹی سے حال احوال پوچھا تھا نہ ہی گھر کے دیگر افراد سے کوئی بات کی تھی۔ صاحبزادی حرمت النساء البتہ انہیں خود ہی بتانے لگیں۔

"آج صبح سویرے ہی ہمارے کہنے پہ عمیص میاں' بابر میاں سے اجازت لے کر صاحبزادی یاسمین کو تیار رہنے کا کہہ آئے تھے اور اب گھر لوٹتے ہوئے انہیں ساتھ لیتے آئے۔"

"کس چیز پہ؟ ہمارا مطلب ہے صاحبزادی یاسمین' آپ کس طرح یہاں تک پہنچیں؟ ویگن پہ۔۔۔ یا؟" ان کے عجیب سے سوال پہ دل ہی دل میں حیران ہوتی یاسمین نے جواب دیا۔

"نہیں چچا حضور' عمیص میاں خود ویگن پہ سوار ہوئے تھے البتہ ہمیں اور بچوں کو رکشہ میں سوار کرا دیا تھا۔"

"اور وہ ان کی موٹر کیا ہوئی؟۔۔۔ وہ شاہانہ پیلی موٹر۔۔۔ وہ ٹیکسی؟" ان کے سرد لہجے میں کیے اس سوال نے سبھی کو چونکا کے رکھ دیا۔ کچن سے نکلتی موتیا اور کمرے سے باہر آتا عمیص بھی سن چکے تھے۔

"کیوں عمیص میاں' آپ تو صاحب موٹر ہیں' ذاتی ٹیکسی ہے پھر ہمشیرہ کو رکشے میں بٹھانا کیوں گوارا کیا' اپنی ٹیکسی میں کیوں نہیں لائے۔" ان کی گرجدار آواز حویلی کے در و دیوار کو لرزا گئی۔ ضبط کے کڑے مرحلوں سے گزرتا انا کا طیش اب خوفناک طریقے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اگر سب ان کے مزاج سے واقف نہ ہوتے تو یقیناً اس انکشاف پہ یقین ہرگز نہ کرتے' اسے محض ایک مذاق سمجھا جاتا مگر صاحبزادہ نفیس علی خان کے لہجے' ان کی غضب ناک آنکھوں کی سرخی اور غصے کی شدت سے کپکپاتے لبوں کو دیکھ کر کوئی محض اپنے دل کی تسلی کے لیے بھی اسے مذاق سمجھنے کی جرات نہ کر سکا۔ صاحبزادی یاسمین اور صاحبزادی حرمت النساء زرد پڑتے چہروں کے ساتھ ہکا بکا تھیں۔ صاحبزادی خلعت النساء کے ہمیشہ کے پرسکون چہرے پہ یک بیک شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے اور کچن کے دروازے میں ایستادہ موتیا کے ہاتھ میں جگ چھلک پڑا۔ تولیے سے بال پونچھتے عمیص کے ہاتھوں کی حرکت بھی تھم چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اُدا' تو شادی کر لے۔" نگاہ نے بڑی دلسوزی اور یقیناً پورے خلوص سے یہ مشورہ دیا ہو گا مگر نجانے کیوں دعا

کو زور کی ہنسی آ گئی جیسے نگاہ نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔ اسے بے تحاشا ہنستے دیکھ کر نگاہ برا مان گئی۔

"میں نے کوئی غلط بات کی؟ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں تمہیں جلد از جلد شادی کر لینی چاہیے۔"

"میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔" بڑی مشکل سے دعا نے اپنے قہقہوں کا گلا گھونٹا۔

"ہنسی اس بات پہ آ رہی ہے کہ میں اپنی اتنی پیاری دوست کا یہ مشورہ یا ہدایت۔۔۔ جو بھی یہ ہے۔ اس پہ فوری عمل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں یعنی تمہاری شادی کر لینے والی رائے پر سوچا جا سکتا ہے لیکن جلد از جلد کرنا قابل عمل نہیں۔ یار دیکھو ناں! ابھی تو ساری شاپنگ رہتی ہے' دو گھنٹے مزید اس میں لگیں گے۔ پھر ٹیلر کے پاس جانا ہے' جھولر سے اپنا سیٹ لینا ہے۔ پارلر جا کر فیشل کروانا ہے تاکہ آج کے سارے دن کی خواری سڑکوں کی دھول مٹی اور گرمی نے جو اثرات چہرے پہ کیے ہیں اسے کم کیا جا سکے۔ یار پھر اباجی کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر گھر بھی جانا ہوگا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ وہ گھر پہ بھوکے پیاسے بیٹھے میرا انتظار کرتے رہیں اور میں شادی رچانے میں مگن ہوں۔ گھر جاتے جاتے تقریباً" دس تو بج جائیں گے۔۔۔ تو اگر نیند جلدی نہ آئی تو میں ضرور شادی کر لوں گی۔"

"مذاق تو تم کر رہی ہو نگاہ۔ شادی کا مشورہ یوں دے رہی ہو جیسے کل فون کر کے کہا تھا' آؤ ادا شاپنگ پہ چلتے ہیں یا جیسے ابھی گھنٹہ بھر سے کہہ رہی ہو کہ یہ رنگ تم پہ اچھا لگے گا' یہ ڈیزائن تم پہ سوٹ کرے گا۔ اسی طرح منہ پھاڑ کے کہہ دیا کہ شادی تمہارے لیے بہتر رہے گی۔ ایسا ہی مشورہ میں تمہیں دوں تو کیا تمہیں ہنسی نہیں آئے گی؟"

"نہیں مجھے ہنسی نہیں آئے گی' بالکل بھی نہیں آئے گی۔ مجھے رونا آئے گا۔" سنجیدگی سے کہتے کہتے نگاہ کی آواز بھرا گئی۔

"مجھے اس بات پہ رونا آئے گا کہ یہ بات کہنے میں کسی نے کتنی دیر لگا دی۔ مجھے اس بات پہ رونا آئے گا کہ میرے سامنے وہ چیز رکھی جا رہی ہے جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے مگر اسے اٹھانے کے لیے اب میرے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔"

"ہاتھ تو میرے بھی کٹے ہوئے ہیں ورنہ میں کیسے۔۔۔" اس نے کہنا چاہا تھا مگر نگاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں ادا' تمہارے ہاتھ ابھی نہیں کٹے' وہ صرف بندھے ہوئے ہیں اور ذرا ہمت سے تم اس گرہ کو کھول سکتی ہو۔"

"میرے ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہیں نگاہ اور دوست! یہ میں نہیں کھول سکتی' کوئی دوسرا کھول سکے تو شاید۔۔۔"

"کیا۔۔۔ کیا کوئی۔۔۔ کوئی دوسرا ہے کیا؟" نگاہ نے جھجک کے پوچھا۔ اتنے کم دنوں میں دونوں کی دوستی خوب پروان چڑھ چکی تھی اس کے باوجود اس سوال کی نوبت نہ آ سکی۔

"ہاں دوسرا۔۔۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"دوسرا ہے۔۔۔ مگر وہ اتنا ہی دوسرا ہے جیسے۔۔۔ کنارہ دوسرا دریا کا جیسے ہاں وہ دوسرا ہی تو ہے' یہی غم ہے کہ وہ اپنا نہیں ہے۔ دوسرا ہے۔"

"کیا مطلب پہلے سے شادی شدہ ہے؟" اس کی خود کلامی سے نگاہ نے یہی مطلب اخذ کیا۔ دعا ہولے سے مسکراتے ہوئے سر جھٹک کے رہ گئی۔

"چھوڑو یار تم بھی کن باتوں میں پڑ گئی ہو۔"

"نہیں' نہیں تم بتاؤ کیا واقعی ایسا ہے؟ میری بات مانو ادا تو یہ مت دیکھو کہ اس کی پہلے سے ایک بیوی ہے یا تین' یہ دیکھو کہ کیا وہ دل سے تمہیں چاہتا ہے؟ نہ صرف چاہتا ہے بلکہ عزت دینے کا حوصلہ اور خواہش بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ یہی سب سے اہم ہے۔ ہم جیسی عورتیں کسی مرد کے دل اور گھر پہ بلا شرکت غیرے راج کرنے کے صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہیں۔ ہمیں تو کسی کے دل اور گھر میں صرف جگہ ہی مل جائے تو غنیمت ہے چاہے وہ کتنی ہی شراکت میں ہی کیوں نہ بٹی ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر میں بھی غلط نہیں کہہ رہی۔ ایسے کسی شخص کا فی الحال کوئی وجود نہیں جو مجھے دوسری' تیسری یا چوتھی بیوی بنانے کا خواہش مند ہو۔"

"ابھی ابھی تم خود ہی۔۔۔ ٹھیک ہے نہ بتانا چاہو تو الگ بات ہے۔" نگاہ نے شانے اچکاتے ہوئے ساری توجہ سامنے رکھے بڑے پہ مرکوز کر لی۔ وہ دونوں اس وقت شاپنگ کے ارادے سے فورٹریس آئی تھیں۔ کل رات بھی دونوں کا ایک مشترکہ شو تھا۔ صبح دیر سے آنکھ کھلنے پہ دعا ناشتے میں صرف جوس کا گلاس لے کر گھر سے نکل آئی تھی کیونکہ کافی دنوں سے نگاہ کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔ نگاہ کی پسند اور ذوق خاصا لاجواب تھا جبکہ وہ ہنوز اس معاملے میں صفر تھی۔ نگاہ نہ صرف شاپنگ کے فن سے واقف تھی بلکہ یہ بھی جانتی تھی کہ بہتر سے بہتر چیز مناسب سے مناسب دام میں کہاں سے مل سکتی ہے۔ پہلے وہ لوگ انار کلی گئیں' وہاں سے بہت سے ایسے فینسی اور جھلمل ان سلے سوٹ خریدے گئے جنہیں اپنے پروفیشن کے لحاظ سے تقاضوں کے مطابق سلوانے کا سوچا گیا تھا۔ اسٹیج پروگرامز اور پرائیویٹ فنکشنز میں ایسے ہی فلمی انداز کے شوخ رنگوں اور چمک دمک والے لہنگے' شرارے اور ساڑھیاں پہنی جاتیں۔ اب وہ دونوں عام استعمال کے سادہ مگر جدید انداز میں تیار ریڈی میڈ سوٹس خریدنے فورٹریس آئی تھیں۔ چار بج رہے تھے بھوک سے بے تاب ہو کے دونوں شاپنگ کا ارادہ فی الحال ملتوی کر کے برگر بار میں گھس گئیں۔ وہیں یہ موضوع زیر بحث آیا۔

"چلو جلدی کرو' ابھی پوتھکس میں چھانٹی کرنی ہے' ذرا ڈھنگ کے مگر مناسب قیمت کے سوٹس منتخب کرنے کے لیے۔"

☼ ☼ ☼

عمیص کو ٹیکسی میں ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ کر سواری سے شکریے کے ساتھ پینسٹھ روپے وصول کرتا دیکھ کر صاحبزادہ نفیس علی خان پہ جو بجلی گری تھی' وہی بجلی وہ اس وقت سارے اہل خانہ پہ گرا کے اپنی بھڑاس نکال رہے تھے۔ سبھی نفوس پہ سکتے کا عالم تھا۔ البتہ اس سکتے کی وجوہات الگ الگ تھیں۔

صاحبزادی خلعت النساء کے ساکت وجود کے پیچھے وہی تلاطم برپا تھا جس نے اس وقت نواب صاحب کو آتش فشاں بنا رکھا تھا۔ انہیں بھی اپنے مرحوم والد اور خسر کا خاندانی جاہ و جلال اور عظمت مٹی میں رلتی نظر آ رہی تھی۔ ایسے کم حیثیت پیشے سے وابستہ بیٹے کی ماں ہونے کے ناتے انہیں اپنا وجود بے حد ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔

صاحبزادی حرمت النساء اس وقت صرف ایک بیوی ہونے کے ناتے متفکر تھیں۔ انہیں اپنے شوہر کے حوالے سے وہم اور خدشات گھیرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی بڑی ہمشیرہ اور شوہر کی طرح شدت پسندی سے خاندانی روایات و قواعد کے بارے میں حساس نہیں تھیں مگر وہی کرنے کی عادی تھیں جو ان دونوں کو پسند ہو۔ عمیص کی اس حرکت سے انہیں اگر دھچکا پہنچا تھا تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتی تھیں نواب صاحب پہ اس کے کتنے برے اثرات مرتب ہوں گے۔ ابھی تو وہ صاحبزادی گل مہر کی ملازمت سے ہی نہیں سنبھل پائے حالانکہ وہ اس کے مقابلے میں ہزار گنا باعزت تھی۔ جذبات کے ہاتھوں یا مصلحت کے تحت مجبور ہو کے وہ صاحبزادی کو گھر سے نکلنے کی اجازت تو دے چکے تھے مگر سمجھوتا نہیں کر پائے تھے۔ وہ رفیق حیات کی اس دلی الجھن سے واقف تھیں' انہیں چپکے چپکے گھلتے دیکھ رہی تھیں کہ ایسے میں یہ نئی افتاد۔۔۔ جو نواب صاحب کی برداشت کا کڑا امتحان تھی اور صاحب زادی حرمت النساء کو ڈر تھا کہ وہ اس امتحان کو کیسے پار کریں گے۔

صاحبزادی یاسمین متضاد کیفیات کا شکار تھیں۔ انہیں اپنی والدہ اور چچا حضور کی طرح خاندانی ناموس پہ حرف آنے کا بھی دکھ تھا' ان کی صحت کی طرف سے بھی بالکل اپنی چچی حضور کی طرح فکر مندی تھی۔۔۔ دوسری طرف اکلوتے بھائی کا خیال آتا تو یہ اقدام ایسا غلط بھی نہ لگتا۔ ٹھیک ہے کہ اس نے راہ غلط چنی' جلد بازی کا شکار ہو کے مناسب وقت اور معقول روزگار کا انتظار کرنے کی بجائے ایسا راستہ چنا جس میں صرف اور صرف بزرگوں کی دل آزاری تھی مگر یقیناً" اس کی نیت صاف تھی۔ سب کی بھلائی کی غرض سے ہی وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے پہ مجبور ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں آنے والے کل سے بھی خدشہ تھا' آنے والا کل۔۔۔ جس میں بابر ہمایوں مغل۔۔۔

ان کے مجازی خدا کی آمد متوقع تھی۔ اگر ان کے آنے سے پہلے پہلے یہ معاملہ پوری طرح نہ دبا تو ان کے ہاتھ یاسمین کے میکے کی ایک کمزوری آجاتی اور ان کا ظرف بھلا اتنا کہاں تھا کہ وجاہت یا یاسمین کو اس کے بھائی کا طعنہ دینے سے نہ چوکتے۔

گل مہرکی خاموشی کے پیچھے ایک مصلحت تھی۔ وہ ابا حضور کی گرجدار آواز پہ چونک کے کمرے سے نکلی تھی۔ کچی نیند سے جاگنے کی وجہ سے اسے معاملہ پوری طرح جاننے میں ذرا وقت لگا مگر جب ساری بات بھانپ گئی تو ایک گہری نظر عمیص کے جھکے سر اور سرخ چہرے پہ ڈال کے چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئی۔ اسے نہ تو اہل خانہ کی اہتزہنی حالت پہ افسوس تھا' نہ اپنے ابا حضور کو پہنچنے والے دلی صدمے سے رنج ہوا تھا۔ اس کے دل میں تو ہلکا ہلکا سا سکون ٹانگیں پسار رہا تھا۔ اپنی ضد منوا لینے کے بعد بھی اگر دل میں کہیں ہلکی سی ندامت تھی تو وہ دھل رہی تھی۔ جانتی تھی کہ عمیص کا جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کی ضد اس کے پیچھے کہیں چھپ سی جائے گی' اب ابا حضور کی توجہ اس کی ملازمت سے ہٹ کر عمیص کی اس مذموم جرات پہ مرکوز ہو جائے گی۔ عمیص سے حد درجہ چڑنے کے باوجود وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھی کہ اگرچہ گھر میں اس موضوع پہ کبھی کھل کے گفتگو نہیں ہوئی مگر دل ہی دل میں سب اسے عمیص کے حوالے سے سوچ رہے ہیں بلکہ ایک طرح سے طے کر بیٹھے ہیں اور گل مہر نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب بھی یہ بات ظاہر ہوئی وہ کھل کے اس کی مخالفت کرے گی' زمین آسمان ایک کر دے گی مگر ایسا نہ ہونے دے گی اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے ایسا کرنے میں اسے خاصی محنت نہ کرنے پڑے گی۔ اس کا محض یہی ایک اعتراض کافی ہوگا۔

اس کے برعکس موتیا ساکت و جامد بیٹھی صرف اور صرف عمیص کے بارے میں سوچ رہی تھی اگرچہ ہمیشہ سے وہ دل سے متفق نہ ہونے کے باوجود ابا حضور کے نافذ کردہ قوانین و ضوابط پہ کسی نہ کسی حد تک عمل پیرا رہی۔ عمیص کی سوچ سے وہ پوری طرح متفق تھی' اس بات کی تائید کرتی تھی کہ حلال رزق کا کوئی بھی ذریعہ شرمناک نہیں ہوتا نہ ہی ہاتھ کی محنت سے خاندان کے نام پہ حرف آسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اس کی یہ بھی خواہش رہی کہ عمیص اور ابا حضور کے درمیان اختلافات حد سے تجاوز نہ کرنے پائیں۔ اس کا ندرا اپنے والد پہ تو نہ چل سکتا تھا' لے دے کر عمیص رہ جاتا تھا جسے وہ باغیانہ روش اختیار نہ کرنے کی اکثر بیشتر تاکید کرتی تھی' مقصد صرف یہ تھا کہ گھر کے ماحول میں تلخی نہ پیدا ہونے پائے اور ابا حضور کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اور اس وقت اس کے یہی بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارے سامنے تھے اور وہ جو ہمیشہ سے عمیص کو روکنے کی سعی کرتی رہی' آج دل سے اس کی حمایت کر رہی تھی۔

اس کا جھکا ہوا سر۔۔۔ اور سرخ چہرہ اس سے برداشت نہ ہو رہا تھا۔ مجانے یہ چہرہ خجالت سے سرخ تھا یا ابا حضور کی لعنت ملامت سے۔۔۔ اور پتہ نہیں یہ سر شرم سے جھکا ہوا تھا یا ایک محترم ہستی کا دل توڑنے اور بھرم کو ٹھیس پہنچانے کی پشیمانی سے جھکا ہوا تھا۔۔۔ جو بھی تھا یہ ساری صورتحال موتیا کی برداشت سے باہر تھی۔ عمیص نے دوستی کے باوجود اپنا اتنا بڑا راز اس سے مخفی رکھا' اس کا گلہ ایک طرف۔۔۔ مگر وہ سب کو چیخ چیخ کر یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کا جرم اتنا بڑا نہیں کہ اسے یوں کٹہرے میں کھڑا کر کے اس پہ سنگ ملامت برسائے جائیں۔

"نا خلف۔۔۔ نے برسوں کی عزت۔۔۔ صدیوں کی پہچان مٹی میں ملا کے رکھ دی۔ کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ جس چیز کو بنانے میں ان کا کوئی حصہ نہیں اسے بگاڑنے کا حق انہیں کس نے دیا؟ یہ پہچان' یہ نام' یہ مرتبہ' ہمیں ہمارے بزرگ سونپ کر گئے تھے۔ ہم نے مقدور بھر اسے سنوارنے کی کوشش کی' برقرار رکھنے کی جدوجہد کی۔ اگر عمیص میاں آپ اس مرتبے کو سنبھالنے کے اہل نہیں تھے تو اسے مٹی میں ملانے کا حق بھی آپ کو کسی نے نہیں دیا تھا۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا چچا حضور' جس سے عزت مٹی میں ملنے کی نوبت آئے۔" بڑی دیر بعد وہ گویا ہوا۔ آواز پست' نظریں زمین میں گڑی ہوئی مگر لہجہ مضبوط اور ہموار تھا۔

"سے کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری یعنی حضرت کو اپنے کیے پہ ندامت ہونا تو در کنار' اس کی خفیف کا بھی احساس نہیں۔ سینہ تان کے اپنی شرمناک حرکت کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ ہماری سات پشتوں میں ایسا بے حمیت انسان نہ پیدا ہوا ہوگا۔"

"چچا حضور' مجھے ندامت ہے' شرمندگی ہے۔۔۔ مگر اس بات کی کہ میں دانستہ' نادانستہ طور پہ آپ کی دل آزاری کا سبب بنا۔ باوجود اس کے کہ میری یہ حرکت آپ کے اصولوں سے ٹکراتی ہے' میں اسے ناجائز یا معیوب نہیں سمجھتا۔ میں نے خلاف شرع' خلاف قانون' خلاف فطرت یا خلاف اخلاق انسانی کوئی کام نہیں کیا۔"

"قانون صرف وہ نہیں ہوتا برخوردار جو کتابوں میں نقش ہو۔ قوانین وہ بھی ہوتے ہیں جو سینہ بہ سینہ محفوظ چلے آرہے ہیں۔ فطرت صرف وہ نہیں جسے جبلت انسانی قرار دیا جاتا ہے' فطرت وضع بھی کی جاتی ہے اور یہ ایک دو دنوں میں نہیں بلکہ نسلوں تک ڈھل کر وضع ہوتی ہے اور اخلاق' اخلاق کا تو آپ نام مت لیں۔ اخلاق و کردار سے اس شخص کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا جو چند روپے کی خاطر ان کی دھجیاں اڑا چکا ہو۔"

"آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں چچا حضور کہ میں نے آپ کے کڑے اصولوں کے خلاف قدم اٹھا کر آپ کی حکم عدولی کی مجھ پہ خاندانی روایات کے توڑنے کا الزام بھی عائد کیا جا سکتا ہے مگر گستاخی معاف آپ مجھ پہ یہ حد نافذ نہیں کر سکتے کہ میں اخلاق و کردار سے عاری۔۔۔"

"اب آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ میں کیا کر سکتا ہوں کیا نہیں۔" نواب صاحب مشتعل ہو کے دھاڑے۔ عمیص جواب تک اس اچانک راز کھل جانے کی خجالت کے زیر اثر تھا اور اپنے چچا حضور کی مسلسل لعن طعن پہ مجبوراً لب کشائی پہ مجبور ہوا تھا' ایک بار پھر خاموشی اختیار کر گیا۔

"کیا آپ اس سے انکار کریں گے کہ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ محض اشتباہ نظر تھا' کیا آپ یہ حقیقت تسلیم نہیں کریں گے کہ اس حرکت سے ہمارے گھرانے کی تقدس اور عظمت کس بری طرح مجروح ہوئی ہے اور کیا اب بھی آپ خود کو حق بجانب ٹھہرائیں گے۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم اپنے آباء سے کیا عہد کر چکے ہیں ہم نے اپنے مرتے ہوئے والد سے عہد کیا تھا ان کی روایات کو زندہ رکھنے کا۔۔۔ اور آپ نے ہماری زندگی میں ہی اس عہد کے پرخچے اڑا دیے۔"

"روایات سے باہر نکل کے دیکھیے چچا حضور روایات ہماری اپنی وضع کی ہوئی ہیں' قوانین ہمارے اپنے مرتب کردہ ہوتے ہیں اور اقدار بھی ہم لوگ خود اپنی مرضی سے وقت کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ اصل چیز تو عزت ہے' اسے دھچکا پہنچانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"دھچکا؟۔۔۔ اور جو ہماری عزت ڈانواڈول ہو گئی ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟"

"میرے محنت کرنے سے آپ کی عزت پہ حرف کیسے آسکتا ہے۔ محنت میں عظمت ہے' اس۔۔۔ قول سے آپ آشنا ہوں گے۔ قدیم روایات کو گلے لگائے رکھنے کا شوق ہے آپ کو تو یہ بات بھی یاد ہوگی کہ بحیثیت ایک مسلم قوم ہمارے آباء وہ کہلاتے ہیں جنہوں نے اسلام کی بنیاد رکھی۔ ہمارا آئیڈیل وہ قوانین ہونے چاہئیں جو سرور کائنات حضورؐ نے وضع کیے اور خدا کے حکم سے نافذ کیے۔ جب ان کی تعلیمات کی روشنی میں محنت میں ذلت نہیں بلکہ عظمت ہے' شرم نہیں بلکہ بڑائی ہے تو پھر ہم یا آپ یہ کہنے والے کون کہ کون سا پیشہ باعزت ہے اور کون سا شرمناک۔"

"آپ ہمیں لاجواب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں شاید۔"

"ہرگز نہیں صرف اپنی صفائی پیش کرنے کی جرات کر رہا ہوں اگر ناگوار نہ گزرے۔ میں آپ کی دل آزاری کرنے پہ معذرت خواہ ہوں مگر یہ نہیں مان سکتا کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ ہاں اگر میں نے کوئی خلاف شرع یا خلاف قانون کام کیا ہوتا' کہیں چوری کی ہوتی' ڈاکہ ڈالا ہوتا' کسی کو دھوکا دیا ہوتا' کسی یتیم کا مال ہڑپ کیا ہوتا تب کوئی آپ پہ انگلی اٹھاتا' آپ کی تربیت کو الزام دیتا یا ہمارے خاندان کی نیک نامی پہ حرف گیر ہوتا تو ضرور میرے

لیے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔"

"شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تو اب بھی ہے صاحبزادہ عمیص علی خان' اگر واقعی آپ میں شرم موجود ہو تو کیا ملا آپ کو یہ سب کر کے محض ہمارے مقابل آنے کا اور ہمارے اصولوں سے ٹکرانے کا شوق تھا آپ کو ــــ من ملی کرنے کا جنون ٹھاٹھیں مار رہا تھا آپ کے جوان خون میں' آپ نے اپنی ضد پوری کر لی' ہمارے برابر قد بڑھانے کے لیے ہمارے اصولوں کو پاش پاش بھی کر دیا مگر ان سب سے آپ کو آخر حاصل کیا ہوا۔"

"چچا حضور جن اصول و قواعد پہ آپ برسوں سے سختی سے عمل پیرا ہیں' ان سے آپ کو کیا حاصل ہوا؟" اس کے نڈر انداز میں سوال کرنے پہ نواب صاحب بپھر گئے اور طیش کے ہاتھوں بے قابو ہو کر اس کے چہرے پہ طمانچہ رسید کر بیٹھے۔ سب دنگ رہ گئے۔ صاحبزادی خلعت النساء نے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں' ان کے باریک لب ایک دوسرے میں اور بھی پیوست ہو گئے۔ موتیا کی پلکوں پہ ٹنگے آنسو چھلک پڑے۔ عمیص نے ایک ہاتھ اپنے جلتے رخسار پہ رکھا اور دھندلی ڈبڈبائی آنکھوں سے سامنے دیکھا جہاں اس کے چچا حضور شاید خود بھی اپنے اس انتہائی رد عمل پہ حیران تھے۔

"میرا سوال اب بھی وہی ہے' ان اصولوں نے آپ کو کیا دیا؟ اس اونچی حیثیت اور بڑے جاہ و جلال والے ناموں کے حوالے سے ہمیں کیا ملا؟ آپ جواب دیں یا نہ دیں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ کا جواب کیا ہو گا۔ کچھ بھی نہیں ـــ یہی سچ ہے انہوں نے ہمیں سوائے مجبوریوں' مصلحتوں اور سب سے الگ تھلگ کٹی ہوئی زندگی کے کچھ نہیں دیا۔ ہم سے خوش قسمت تو وہ لوگ ہیں جن کے سروں پہ ان کے اعلیٰ نسب کا تاج نہیں ہوتا' وہ اس بوجھ سے آزاد ایک ہلکی پھلکی آزاد زندگی گزارتے ہیں۔ ہر سانس کے ساتھ عزت پہ حرف آنے کا ڈر نہیں رہتا انہیں اور ہم ـــ ہم تو اپنی بھوک کا اظہار کرنے سے بھی ہچکچاتے رہے کہ یہ خاندانی لوگوں کا شیوہ نہیں حالانکہ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور ہم بیدار ہوتے ہی اپنی فطرت اور جبلت کو کچلنے اور فنا کرنے کا ہنر ہی تو سیکھتے ہیں۔"

"آپ جانتے ہیں عمیص میاں' آپ کیا کہہ رہے ہیں ـــ" وہ صدمے سے بے حال تھے۔

"لیکن آپ کو کیا خبر' جب آپ کو اپنے کیے کی سنگینی کا احساس نہیں تو کہتے ہوئے کیا پشیمانی۔ مگر ہمارے لیے تو یہ سخت دکھ اور اذیت کی بات ہے کہ آپ ان کم حیثیت لوگوں کو خود سے بہتر قرار دے رہے ہیں جنہیں خدا نے اس نعمت سے محروم رکھا۔ بجائے اللہ کی ذات کا شکرانہ ادا کرنے کے آپ سخت ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ـــ"

"اللہ کی نعمت تو یہ دو ہاتھ بھی ہیں چچا حضور اور اس نعمت سے فائدہ نہ اٹھانا بھی ناشکری ہے۔ خدا نے ہمیں جو صلاحیتیں دی ہیں ان کو بروئے کار نہ لانا بھی ناشکری ہے۔ میری اس حرکت سے آپ کو دلی ٹھیس پہنچی ہو تو ہو مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے میری یا میرے خاندان کی عزت کو نقصان پہنچا ہے۔"

"پھر وہی بات' آپ بار بار خود کو اس گھٹیا حرکت کے لیے درست قرار دے رہے ہیں۔"

"اس لیے کہ یہ گھٹیا کام کم از کم مجھے بے روزگاری کی ذلت سے تو نکال رہا ہے۔ مجھے یہ احساس تو دلا رہا ہے کہ میں ایک زندہ وجود رکھتا ہوں۔ ایک مکمل وجود۔ جو ـــ" ایک بار پھر نواب صاحب نے اس کی بات کاٹی۔

"آپ سمجھنے سمجھانے کی حد سے باہر جا چکے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تھک ہار کے اپنے اس فرض سے آنکھیں پھیر لیں۔ بھابھی بیگم' آپ سے التجا ہے کہ انہیں اپنے الفاظ میں سمجھالیں۔ ہم نے صرف اس دنیا کا ہی سامنا نہیں کرنا بلکہ روز محشر ان کے والد کو بھی جواب دینا ہے۔ ہم نے اپنی ذمہ داریاں اپنے طور پہ بخوبی نبھانے کی کوشش کی تھی' نہیں جانتے تھے کہ ایسی شرمساری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم نے صاحبزادی یاسمین کو بھی عزت سے رخصت کیا' چاہتے تھے کہ عمیص میاں بھی ہمیں سرخرو کرنے میں مددگار ثابت ہوں مگر ـــ انہیں بتائیے کہ اپنی اور ہماری عزت کو تو یہ پامال کر ہی چکے ہیں کم از کم بیاہی ہمشیرہ کا بھرم ہی رکھ لیں۔ کل

بابر میاں تشریف لا رہے ہیں۔ خدارا ان کے سامنے یہ ذکر نہ چھیڑا جائے ورنہ ہم کس قدر سبکی محسوس کریں گے اور صاحبزادی یاسمین کا سر بھی ان کے سامنے نیچے ہو گا۔"

ان کی ڈانٹ ڈپٹ' لعنت ملامت عمیص کو اتنی بری نہ لگی تھی' جتنی تکلیف وہ یہ بات لگی۔ اب تک وہ کوشش کر کے اپنے لہجے کو حد میں رکھنے میں کامیاب تھا مگر بابر کا ذکر اسے بھی مشتعل کر گیا۔ وہ اپنے دل کی کدورت دل میں مزید نہ رکھ پایا۔

"کس لیے سر نیچا ہو گا آپ کا۔ سر تو اس شخص کو اس عظیم اور صابر باوفا عورت کے آگے ہمیشہ جھکا کے رکھنا چاہیے جو شروع سے اپنا بھرم اور اس کی عزت کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ بے معنی یقین برقرار رکھتی آئی ہے جو آپ انہیں بابر جیسے شخص سے بیاہ کر کر بیٹھے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ نسل خاندانی شریف نواب کے نکاح میں ہے۔"

"عمیص میاں۔" صاحبزادی یاسمین تڑپ کے اسے خاموش کرانے آگے بڑھیں مگر نواب صاحب نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"کہنے دیجئے' ہمیں بھی تو علم ہو کہ صاحبزادے کے دل میں کتنا زہر بھرا ہے اور کس کس کے خلاف بھرا ہے۔ ہوں تو گویا در پردہ ہمیں یہ الزام دیا جا رہا ہے کہ ہم نے اپنے فرض سے چشم پوشی کی اور صاحبزادی یاسمین جنہیں ہم اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں' ان کے لیے سراسر غلط انتخاب کیا۔"

"میرے دل میں کوئی زہر نہیں' صرف سچائی ہے اور دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں میں تلخی ہوتی ہے۔ میں آپ پہ فرائض سے چشم پوشی کا الزام نہیں لگا رہا ہاں یہ گلہ ضرور کر رہا ہوں کہ آپ نے صرف اپنے اصول عزیز رکھے اور انہیں کوئی گزند نہ پہنچانے کی غرض سے واقعی ایک غلط انتخاب کیا۔"

"کیا کمی ہے بابر میاں میں۔ وہ آپ کی طرح تھڑدلے ثابت نہیں ہوئے۔ ہاں رزق کی بندش ہے تو ایسی آزمائشیں اللہ اپنے بندوں پہ ڈالتا رہتا ہے۔ اعلیٰ ظرف ان آزمائشوں پہ صبر و قناعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ثابت قدم رہتے ہیں اور کم ظرف گھبرا کے آسان مگر ذلت آمیز راہ اختیار کرنے سے نہیں چوکتے۔"

"ظرف کا پیمانہ اور معیار آپ حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد طے کیجئے گا۔ آپ نے یہ نیا رشتہ جوڑتے ہوئے بابر ہمایوں مغل کے باپ' دادا اور پردادا تک کی جانچ کی مگر جس شخص سے رشتہ جڑ رہا تھا' اسے جانچنے پرکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ آپ نے میری بہن کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے صرف شجرہ دیکھا ـــ جڑ دیکھی ـــ مگر پھل نہ دیکھا اور سدا کی خزاں میری بہن کے مقدر میں لکھ دی۔"

"خاموش ہو جائیے عمیص' خدا کا واسطہ ہے۔" یاسمین اپنے چچا حضور کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ نہ سکیں اور بلک پڑیں مگر عمیص پہ جنون سوار تھا۔ وہ ضبط کی جتنی کوشش کرتا چلا آ رہا تھا' وہ سب اس کے اپنے سامنے مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھیں۔ آج ہر مصلحت سے بے نیاز وہ سارے راز کھول رہا تھا۔

"جسے آپ اعلیٰ ظرف اور صبر و قناعت کا مجسمہ قرار دے رہے ہیں' وہ ایک انتہائی بد قماش انسان ہے۔ آپ کا حلقہ احباب معتبر مگر محدود ہے ورنہ ان صاحب کے کارنامے اڑتے اڑتے آپ تک پہنچ ہی جاتے۔ لیکن آپ کے میل جول والے شرفا میں بابر ہمایوں مغل کی شہرت کیسے پہنچتی؟ مزاج شاہانہ' اکثر نوابی اور شوق رئیسوں والے ـــ طرہ یہ کہ وہ ان شوقین مزاجیوں کو پورا کرنے کے لیے کسی غلط کام سے بھی نہیں چوکتے آپ کی مالی امداد آپا کا چولہا تو جلا دیتی ہے مگر ان کے شوہر کے نوابی شوق پورا کرنے سے قاصر ہے اسی لیے وہ ان مقاصد کے لیے رقم حاصل کرنے کی خاطر جوا کھیلتے ہیں۔ کبھی تو ہاتھ کچھ آ جاتا ہے اور کبھی جو ہوتا ہے وہ بھی نکل جاتا ہے۔ شراب' چرس' عورتوں کے پاس جانا کون سی بری لت ہے جس کا وہ شکار نہیں۔ جب ایک شہر میں رہتے ہوئے اتنے برسوں میں آپ اپنے داماد کی اصلیت ظاہر نہ ہو سکی تو میرے ایک معمولی حیثیت کا کام کر لینے سے آپ کے حلقہ احباب میں آپ کی سبکی کیسے ہو سکتی ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے' کسی کو کسی کی فکر نہیں اور میں نے کم از کم کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے اپنے ضمیر کے آگے یا بزرگوں کی روح کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔" وہ شاید اور بھی کچھ کہتا'

"ہاں' دوسری بار پہلی بار تب' جب صاحبزادی فرحت النساء کی حفاظت میں ہم سے چوک ہو گئی۔" برسوں پرانا یہ تلخ واقعہ' سب کے دلوں میں راکھ میں دبی چنگاری کی طرح روشن تو تھا مگر اسے دہرانے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ برسی وغیرہ پہ ان کا ختم دلایا جاتا تو دونوں بہنیں ایک دوسرے سے چھپ کے چند آنسو بہالیتیں۔ بچوں کو یہی علم تھا کہ ان کی یہ بڑی خالہ کم عمری میں کسی مہلک وبا کا شکار ہو کے وفات پا گئی تھیں۔ آج عرصے بعد صاحبزادہ نفیس علی خان ان کا ذکر کرکے خود ہی پشیمان ہو گئے۔ انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے بیگم کا زرد پڑتا چہرہ دیکھا اور پہلو بدل لیا۔ صاحبزادی حرمت النساء پژمردہ قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل گئیں۔ اب انہیں اپنی بڑی ہمشیرہ کی دلجوئی کرنے کا فریضہ بھی ادا کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں اس وقت اپنے اپنے بستر پہ لیٹی اپنے اپنے خیالوں میں مگن تھیں۔ چھت پہ لگا پنکھا ہلکی سی آواز دے رہا تھا اور اس کی تیز گردش پہ موتیا کی نگاہیں مرکوز تھیں۔ بار بار کسی تکلیف دہ خیال کے زیر اثر اس کی نگاہیں ڈبڈبا جاتیں۔ اس کی بانسبت گل مہر کے تفکر میں ایک اضطراب' ایک ہیجان تھا۔ اس کا دایاں پیر مسلسل گردش کر رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں مگر پپوٹوں پہ لرزش ہویدا تھی۔

"گل۔" بہت دیر بعد موتیا کی مدھم آواز کمرے کے سناٹے میں گونجی۔

"ہوں۔" اس کے پیروں کی حرکت پل بھر کو تھمی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"یہی کہ کل کون سا ڈریس پہنیں ہم۔"

"بکواس مت کرو۔" موتیا کو اس کی بناوٹی بے نیازی پہ تاؤ آگیا۔

"تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہی ہوں۔" اس نے اس بار زور دے کر کہا جیسے گل مہر تسلیم ہی تو کرلے گی۔

"ہمیں کیا پتہ' تم کیا سوچ رہی ہو۔ ہو سکتا ہے ہماری اور تمہاری سوچ میں یہ قدر مشترک ہو کہ تم بھی ہماری طرح کل کے بارے میں ہی کچھ طے کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہم کل پہنے جانے والے ڈریس کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور تم یقیناً" یہ سوچ رہی ہو گی کہ کل کیا پکایا جائے۔"

"گل' اتنا بنا مت کرو۔" وہ چڑ گئی۔

"کیا نہ بنا کریں ہم؟" وہ سب جان کے انجانے پن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی' عمیص نے ایسا کیوں کیا؟" تھک کر موتیا نے ہار مان لی اور خود ہی بتانا شروع کیا۔

"ہم سے پوچھو کیوں کیا؟ اس لیے کہ اس سے زیادہ کرنے کے وہ قابل ہی نہیں تھا۔ اس کی سوچ کی پرواز یہیں تک جا سکتی تھی یعنی ڈرائیوری تک۔"

"ایسا مت کہو گل۔ ابھی کچھ روز پہلے تک وہ مجھ سے ذکر کر رہا تھا کہ اس کا ارادہ کوئی گفٹ شاپ یا شاید گروسری اسٹور کھولنے کا ہے۔ بتا رہا تھا کہ اس کے ایک دوست کے والد نے یہیں قریبی مارکیٹ میں پلازہ بنایا ہے اور وہ عمیص کو بغیر ایڈوانس اور سیکورٹی کے دکان کرائے پہ دینے کو تیار ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے بی سی او کا پرمٹ بھی دلا دیں گے۔ وہ تو بہت پرجوش تھا' بڑی پلاننگ کر رہا تھا' رقم کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں بھی بھاگ دوڑ۔۔۔ اوہ۔" وہ بری طرح چونکی اور اچھل کے بیٹھ گئی۔

"اب سمجھ آیا' وہ فکر مند تھا کہ دکان میں سامان ڈلوانے کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ ابا حضور اسے چالیس پچاس ہزار تک کی رقم با آسانی دے تو سکتے تھے مگر جس مقصد کے لیے وہ مانگتا' اس کے بارے میں جان کر شاید وہ بھرپور مخالفت کرتے اور کام شروع ہونے سے پہلے وہ ان کی مخالفت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ باعزت طریقے سے یہ کاروبار شروع کرنے کے بعد اور گھر کے حالات میں نمایاں تبدیلی آجانے کے بعد وہ خود

ہی موم ہو جائیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے طور پہ کوشش کر رہا ہے' کچھ رقم کا انتظام ہو گیا ہے' کچھ کا اور تھوڑے عرصے میں ہو جائے گا۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ کسی سے قرضہ وغیرہ لینے کی کوشش میں ہے۔ یہ تو خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اس رقم کے لیے بھاگ دوڑ کرنے کے لیے اس حد تک جا سکتا ہے۔ یعنی گل مہر! ابا حضور کی خفگی بجا' لیکن جب انہیں حقیقت کا علم ہو گا کہ عمیص نے وقتی طور پہ' صرف چند دنوں کے لیے یہ کام کیا ہے اور اب وہ اسے ترک کرنے والا ہے تو وہ ضرور اسے معاف کر دیں گے۔"

"اور وہ جو اتنی ڈھیر ساری بکواس فرما کے گیا ہے' اس کی معافی دلانے کے لیے آپ کیا عذر تراشیں گی صاحبزادی الماس خاتون۔" گل مہر نے چبا چبا کے کہا۔

"بعض لوگ کس قدر احسان فراموش ہوتے ہیں۔ بجائے ابا حضور کے شکر گزار ہونے کے۔۔۔ وہ الٹا ان پہ انگلی اٹھا رہا تھا کہ اس کی بہن کے لیے ایسا رشتہ ڈھونڈا۔ کیا کمی چھوڑی ابا حضور نے یاسمین آپا کے لیے؟"

"یہ تم کہہ رہی ہو گل؟ تم ہمیشہ سے بابر بھائی کو ایک ناقابل برداشت شوہر اور ناپسندیدہ ترین شخصیت قرار دینے والی گل مہر آج کہہ رہی ہے کہ ابا حضور نے یاسمین آپا کے لیے کیا کمی چھوڑی؟"

"وہ تو ہم اب بھی کہیں گے لیکن تب جو حالات تھے اور جو یاسمین آپا۔۔۔ ہمارا مطلب ہے ان کے لیے ایسا رشتہ بھی غنیمت تھا۔ کیا تھا ان کے پاس' جس کے بل بوتے پہ ابا حضور قابل اور ہم پلہ داماد تلاشتے' نہ صورت شکل غیر معمولی' نہ تعلیم اور نہ ہی دولت جائیداد اور تم یوں تو بڑی تابعدار اور فرمانبردار بیٹی بنتی ہو پھر اب محض عمیص کی حمایت میں ابا حضور کی مخالفت کیوں کر رہی ہو؟"

"میں ہرگز ابا حضور کی مخالفت نہیں کر رہی گل نہ ہی میں یہ مانتی ہوں کہ انہوں نے آپا کے لیے جان بوجھ کر کوئی کوتاہی کی ہے' یہ تو بس۔۔۔ سارا قسمت کا کھیل تھا۔ کیسے پتہ تھا کہ۔۔۔ اور میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ عمیص نے شدت جذبات میں کچھ زیادہ ہی کہہ ڈالا' اسے حد برقرار رکھنی چاہیے تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کا طیش ابا حضور کے رویے کا رد عمل تھا۔ انہوں نے اس کی ایک ایسی حرکت کا غیر معمولی شدت سے نوٹس لیا ہے' جو بیچارے نے بڑے خلوص نیت کے ساتھ صرف خود کو حالات کی گردش سے نکالنے کے لیے کی ہے۔ اس کے پاس اور کیا چارہ رہ گیا تھا۔"

"اف خدایا!" گل مہر نے سر تھام لیا۔

"عجیب چیز ہو تم موتیا۔ وہ بھی درست' یہ بھی صحیح۔۔۔ وہ بھی غلط نہیں' یہ بھی ٹھیک۔۔۔ تم کسی بھی چیز کے بارے میں ایک واضح نکتہ نظر کیوں نہیں رکھتیں۔"

"اسے غیر جانبداری سے تجزیہ کرنا کہتے ہیں۔" موتیا نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"جی نہیں محترمہ' صاف الفاظ میں اسے سب کو خوش اور راضی رکھنے کی پالیسی کہا جاتا ہے' جس کا تمہیں خبط ہے۔۔۔ اور جس کا ہونا ناممکنات میں سے ہے' اس کے باوجود بھی تم اپنی کوششوں سے باز نہیں آنے والی۔۔۔ ہے ناں؟" اس نے مسکراتے ہوئے تکیہ درست کرکے بحث ختم کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔

"بالکل اور اس میں حرج بھی کیا ہے؟ ٹھیک ہے سب کو راضی اور خوش رکھنا ناممکنات میں سے ہے لیکن کوشش جاری رکھنی چاہیے' سب نہ سہی کچھ تو راضی رہیں گے بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ ایک بھی راضی رہے تو کافی ہے۔ کسی ایک ذات کو ہی انسان خوشی پہنچا دے تو بڑی بات ہے۔"

"اور یہ ایک ذات' اس انسان کی اپنی بھی تو ہو سکتی ہے۔" گل مہر نے جمائیاں روکتے ہوئے جواب دیا۔

"اپنی ذات کو خوش رکھنا بھی بڑی بات ہے ہمشیرہ۔ کبھی کبھی یہ فریضہ بھی ادا کرتے رہنا چاہیے۔" اس نے کروٹ بدل لی۔

"اور یہ فرض تو تم ہمیشہ سے ادا کرتی آرہی ہو۔" موتیا نے بڑبڑا کر اسے جھنجھوڑنے کی ناکام سی کوشش کی مگر وہ اپنی نیند مزید اس بے کار کی بحث میں ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے صبح آفس بے شک نہیں جانا تھا مگر شام کو

شہزاد کی برتھ ڈے پارٹی پہ ضرور جانا تھا۔ گھر پہ اب تک اس نے یہ نہ بتایا تھا کہ اسے اس کے باس نے مدعو کیا ہے۔ ارادہ تھا کسی کولیگ یا پرانی دوست کی برتھ ڈے پارٹی کا کہہ کے نکل جائے گی تاکہ فضول بحث اور بے کار اعتراضات سے بچت ہو سکے لیکن اب گھریلو ماحول میں پیدا ہونے والی بدمزگی نے برتھ ڈے والا بہانا ہی ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سوچ رہی تھی 'مزنی کے گھر ضروری کام سے جانے کا کہہ کے نکل جائے گی۔

پہلے پہل اس نے شہزاد کے انوائیٹ کرنے پہ مناسب الفاظ میں معذرت کرنے کا ہی سوچا تھا۔ لیکن ایک تو شہزاد کے مدعو کرنے کا انداز بے حد دوستانہ مگر مہذبانہ تھا' دوسرا وہ اپنے سارے اسٹاف کو ہی انوائیٹ کر رہا تھا ایسے میں گل مہر کو یہ مناسب نہ لگا کہ وہ انکار کر کے سب میں اپنی انفرادیت یا اہمیت جتانے کی کوشش کرے۔ منفرد تو وہ تھی' سب سے الگ تھلگ بھی اور اہم ترین بھی مگر یہ سب جتانے کے لیے اسے کبھی ان اوچھے ہتھکنڈوں کی ضرورت نہ پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج رات شہزاد ملک قدرے جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔ گیٹ کے آگے ہارن دیتے اس نے رسٹ واچ پہ ٹائم دیکھا۔ گیارہ بج کے پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ شاید گیٹ کیپر کو اس کی آمد کی توقع نہیں تھی اس لیے گیٹ وا کرنے میں ذرا تاخیر ہوئی۔

ایسا نہیں تھا کہ آج رات کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ جس دنیا کا وہ باسی تھا' وہاں راتیں ہی تو جاگتی تھیں۔ کسی فلم کی اوپننگ' کسی کا رش پرنٹ' کسی کی میوزک ریلیز' کسی سیریل کی سلور جوبلی' کوئی نہ کوئی ایوارڈ فنکشن یا پھر گیٹ ٹوگیدر' گزشتہ کئی برسوں سے وہ اس روٹین کا عادی ہو چکا تھا۔ اپنے اندر کی تنہائی سے بھاگتے بھاگتے وہ ان محفلوں کی گہماگہمی میں پناہ حاصل کیا کرتا۔ مگر نجانے کیا بات تھی' کچھ دنوں سے اسے محفلوں میں اندر کا اکیلا پن زیادہ محسوس ہونے لگتا' اسے ہزاروں کے مجمع میں اپنا وجود کسی میلے میں بچھڑے ہوئے بچے کا سا لگتا۔ اسے کسی سے ملنے کے نام سے ہی گھبراہٹ ہونے لگتی۔ اسی لیے آج بھی اس نے فنکشن میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ دوسری طرف نجانے کیسے ـــــ بلا ارادہ ہی وہ اپنی برتھ ڈے اپنے اسٹاف کے ساتھ منانے کا پروگرام بنا بیٹھا۔ یہ سب کچھ آج کی میٹنگ کے بعد اسٹاف سے ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران طے ہوا اور بے حد اچانک ہوا۔ اول تو وہ اپنا برتھ ڈے سیلبریٹ کرنے کا عادی ہی نہ تھا۔ نہ اب عمر رہی تھی نہ شوق۔ دوسرے اسٹاف کے ساتھ اس کا رویہ بلاشبہ بے حد دوستانہ' ہمدردانہ اور مخلصانہ تھا اس کے باوجود اس نے اپنے اور ان کے درمیان حد ہمیشہ برقرار رکھی۔ بعد میں وہ خود سوچ سوچ کے حیران ہوتا رہا راستے بھر کہ اگر اسے برتھ ڈے سیلبریٹ کرنے کا خیال آیا ہی تھا تو کیوں نہ اماں ابا کے ساتھ یا بے تکلف دوستوں کے ساتھ منانے کا سوچتا۔ اس خیال کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے گل مہر کا گلابی چہرہ آگیا تو لحظہ بھر کو اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پہ بہک سے گئے۔

"تو یہ ہے وہ وجہ ـــــ وجہ خوب صورت ہے دلنشیں بھی ہے اور باوقار بھی ـــــ مگر یار شہزاد ملک یہ تجھے سوجھی کیا۔" عرصے بعد وہ اپنے ساتھ ہی مذاق کر کے رہ گیا۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ انکار کر دیتی تو شاید میں یہ پارٹی ہی کینسل کر دیتا۔" اس نے چپکے سے ایک اور اقرار کیا۔

پارٹی اس نے فائیو اسٹار میں شام کو دی تھی۔ لنچ پہ گرم ترین دن کی وجہ سے نہ بلایا اور ڈنر کے لیے اسٹاف کی لیڈیز کو پریشانی ہوتی اس لیے اس نے ٹی پارٹی کا پروگرام بنایا۔

"خیر تو ہے پتر طبیعت تو چنگی ہے؟" بالو اسے خلاف معمول ساڑھے گیارہ بجے گھر دیکھ کر حیران تھی۔

"ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس گرمی بہت رہی آج سارا دن۔" اس نے ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے ابا کے متعلق پوچھا۔

"ابا تو ٹھیک رہے؟ بلڈ پریشر وغیرہ؟"

"ہاں بس آم زیادہ کھا لیے' میرا خیال ہے شوگر بڑھی ہوئی ہے تیرے لیے آم کاٹوں؟"

"نہیں۔" وہ کمرے کی طرف بڑھا۔

"بڑے ودھیا (عمدہ) ہیں' چونسا آم چن کر لیے ہیں۔ نال کچی لسی بنا دیتی ہوں۔ نیند بڑی سوہنی آئے گی۔"

"واقعی اماں؟ نیند اچھی آئے گی؟" ایک لمحے سوچنے کے بعد اس نے سوال کیا تھا اور جواب اثبات میں ملنے کے بعد سر ہلا دیا۔

"لے آؤ پھر مگر زیادہ نہ ہو۔ اتنی گنجائش نہیں۔" لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ کمرے میں دوبارہ آیا تو بالو ٹرے میں آم کی بڑی بڑی قاشیں اور جگ میں نمکین لسی لیے بیٹھی تھی۔

"کل خیر سے میرے شہزادے پتر کی سالگرہ ہے' کیا پکاؤں تیرے لیے؟"

وہ انکار کرتے کرتے رک گیا۔ ذہن میں کل کا سارا پروگرام ترتیب دینے کے بعد بس صبح کا وقت ہی خالی نظر آیا۔

"ناشتے میں اپنے ہاتھ کے تہہ والے پراٹھے اور کھوا والا انڈا' میٹھی لسی بنا دینا۔"

"لے۔ ایہہ کی گل ہوئی ـــ میں تے حلوے بناواں' زردے وی تے نال مکڑ تلاں۔"

"اوہو' اماں' ایسا زبردست ناشتا کرنے کے بعد تو میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھاؤں گا آپ حلوے' زردے اور مکڑ کی بات کرتی ہیں۔ اچھا سوجی کا حلوہ بنا دیجیے گا بس۔"

بڑی مشکل سے انہیں رضامند کر کے رخصت کیا۔ آم کھا کے وہ لسی کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا کہ پیپ نے بیپ کہ موبائل پہ SMS کی بیپ نے اسے چونکا دیا۔ آن کیا تو اسکرین پہ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" لکھا نظر آیا۔ چونک کر کلاک کی جانب دیکھا' پورے بارہ بج رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر سوچا' یہ کون ہو سکتا ہے ـــ اس کے بہت سے بے تکلف اور قریبی دوست تھے مگر اتنا تکلف اور اہتمام کسی نے کبھی نہ کیا تھا' شاید کسی کو یہ تاریخ یاد بھی نہ ہو۔ اس نے نمبر غور سے دیکھا' یہ نمبر اس کے لیے نیا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے یہ نمبر ملایا۔ پہلی بیل پہ ہی فون اٹھا لیا گیا تھا مگر دوسری جانب کسی کی آواز نہ آئی۔ وہ بھی خاموش رہا۔ چند لمحے ایسے ہی گزرے پھر ایک کھنکتی گونج دار آواز ابھری۔

"کیا ہوا اچھا جی؟ کچھ کہنا نہیں تو یاد کیوں کیا؟"

● ● ●

بہت وقت کے بعد وہ خود کو تیار کر پایا تھا امی حضور کا سامنا کرنے پر۔ صاحبزادی یاسمین کو ہمراہ لے کر وہ ان کے کمرے میں گیا۔ چچی حضور پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ عمیص کے دل کو دھچکا سا لگا صاحبزادی خلعت النساء کی حالت دیکھ کر۔ پچھلے کچھ سالوں سے ان کی صحت مسلسل گر رہی تھی۔ لمبے چوڑے وجود میں اب محض لمبائی ہی لمبائی رہ گئی تھی۔ بے گوشت کلائیوں میں پھنسا رہنے والا کنگن' جو اچھے وقتوں اور صاحبزادہ انیس علی خان کی یادگار تھا' اب ڈھیلا ہو کے کلائی کے آخری سرے تک آجایا کرتا۔ چہرے کی چمک برقرار تھی مگر رخساروں کی سرخی مفقود۔ بلڈ پریشر تو اب نارمل رہتا ہی نہیں تھا اس پہ گردے کی تکلیف نے وجود آدھا کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن اتنی لاغر کمزور وہ کبھی بھی نہ محسوس ہوئی تھیں جتنا اس وقت لگ رہی تھیں۔

عمیص کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ انہیں تیس گھنٹوں بعد نہیں بلکہ تیس دنوں یا تیس مہینوں بعد دیکھ رہا ہو۔ راتوں رات ان کی اس بدلتی حالت کا ذمہ دار یقیناً وہی تھا۔ مارے ندامت کے وہ رہی سہی ہمت بھی کھو بیٹھا۔ چپ چاپ ان کے بڑے سے پلنگ کی پائینتی کے سرے پہ بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک سر نیہوڑائے رکھنے کے بعد یاسمین کے ٹہوکے پہ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ اسے امی حضور کو مخاطب کرنے پہ اکسا رہی تھیں۔ وہ بے بسی بھرے انداز میں انہیں دیکھنے لگا جو سنبل بھرے سفید تکیے پہ اپنے سنبل جیسے ہی سفید بکھرے بال پھیلائے سوئی ہوئی لگ رہی تھیں مگر سو ہرگز نہیں رہی تھیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ کمرے میں ان کے علاوہ بھی تین

نفوس محو ہوں۔۔۔ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے ہوں اور ان کے عین سرہانے لگی ٹیوب لائٹ بھی روشن اور وہ سو جائیں۔ لیکن، اگر وہ اس سے گریز اور اجتناب ظاہر کرتے ہوئے اپنی نیند ظاہر کر رہی تھیں تو وہ اتنی ہمت کہاں سے لاتا کہ انہیں آواز دے سکتا۔ چند لمحے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنی نظریں بے مقصد ادھر ادھر گھمانی شروع کر دیں۔

ان کا بڑا سا کمرہ خالی خالی سا لگتا۔۔۔ انہیں زیادہ سامان سے وحشت ہوتی تھی ویسے تو حویلی کا کوئی بھی کمرہ سامان سے بھرا ہوا نہیں تھا بلکہ کئی کمرے تو بالکل خالی مقفل تھے اور مہینوں بعد محض صفائی کی نیت سے کھولے جاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پرانے وقتوں اور طرز کی بنی اس حویلی کی چھتیں اونچی اور کمرے اتنے بڑے بڑے تھے کہ آج کل کے طرز تعمیر سے بنے اچھے بھلے وسیع اور کشادہ کمرے بھی ان کے مقابلے میں آدھے ہوتے۔ اور ان لوگوں کے اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ ان کمروں کی کشادگی کے حساب سے اسباب جمع کر پاتے۔ لیکن صاحبزادی خلعت النساء کا تو یہ حال تھا کہ وہ ضروری اسباب بھی اپنے ارد گرد دیکھنے سے عاجز تھیں۔ ان کے کپڑوں تک کی الماری ان کی بہن کے کمرے میں تھی۔ وہ خود ہی روز استری شدہ جوڑا نکال کر انہیں دے جاتیں۔ کمرے کے عین وسط میں جہاں کی پچھلی دیوار میں وہ کھڑکی تھی جو دالان کی جانب کھلتی تھی' ان کا بڑا سا آبنوسی پلنگ دراز تھا جس پہ سفید بے شکن چادر بچھی رہتی۔ سرہانے کی کھڑکی دن بھر کھلی رہتی البتہ دوپہر میں دھوپ کی شدت روکنے کے لیے پردے گرا دیے جاتے۔ اس کھڑکی کے باہر لگے املتاس کے درخت کی کئی شاخیں کھڑکی کھلنے پر جھومتی ہوئی مست ہو کے اندر آ جاتیں اور اپنے پیلے پیلے جھومر اور آویزے ان کے دودھ سے تکیے پہ بکھرا جاتیں۔ دوسری طرف کی دیوار والی کھڑکی برآمدے میں کھلتی تھی جس میں دن بھر آنا جانا لگا رہتا اسی لیے اس کے لکڑی کے پٹ اکثر و بیشتر مضبوطی سے بند ہوتے تاکہ باہر کی کسی قسم کی سرگرمی یا شور اندر ان کے آرام میں خلل پیدا نہ کرے۔ اسی کھڑکی کے ایک طرف فرش سے چند انچ اونچا تخت بچھا تھا جس پہ ایک موٹا کھیس بچھونے کی صورت بچھا تھا اسی کے سرہانے ان کی جانماز اور تسبیح پڑی تھی۔ مغرب' عشاء اور تہجد کی نماز وہ کمرے میں ہی ادا کیا کرتیں۔ دوسری نمازوں کے لیے ان کے لیے دوسرا تخت مستقل طور پہ دالان میں نصب تھا۔ دیواروں میں لوح قرآنی' عکس خانہ کعبہ اور چاروں قل آویزاں تھے اس کے باوجود دیواریں ایک پر جلال خالی پن سمیٹے ہوئے تھیں۔

پلنگ کے ساتھ رکھی ایک میز پہ۔۔۔ جس میں دو عدد درازوں میں اسوۂ حسنہ اور احادیث و فقہ سے متعلق کتب اور چند ضروری اشیاء تھیں' اسی میز پہ گلاس' جگ' چشمہ اور ٹیبل کلاک رکھا تھا۔ ساتھ رکھی کرسی پہ اس وقت صاحبزادی حرمت النساء بیٹھی تھیں۔ صاحبزادی یاسمین اپنی امی حضور کے سرہانے کھڑی تھیں جبکہ وہ وہیں پائنتی کے سرے پہ ٹکا کمرے کا بلا مقصد جائزہ لے رہا تھا۔ تھک ہار کے صاحبزادی یاسمین خود پہل کر بیٹھیں۔

"امی حضور!" وہ جھک کے سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ وہ جواب میں ہنکارا بھر کے رہ گئیں۔

"امی حضور! عمیص میاں آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"مگر ہم اس وقت کچھ سننا نہیں چاہتے۔ ان کی بارعب آواز گونجی۔

"کیا آپ مجھے صفائی کا ایک موقع بھی نہ دیں گی۔" وہ ان کے پیر تھام کے گڑگڑا اٹھا جو اس گرم ترین دوپہر میں بھی ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔ وہ ہلکا سا کسمسائیں مگر کروٹ پھر بھی نہ بدلی۔ عمیص دھیرے دھیرے ان کے پیر سہلانے لگا۔

"امی حضور' مجھ پہ ناراض ہو لیں' مجھے ڈانٹ لیجیے' برا بھلا کہہ دیجیے' تب بھی دل نہ بھرے تو بے شک مار لیجیے مگر خاموش نہ ہوں۔ یہ مجھ سے سہا نہیں جا رہا۔"

"آپ نے بھی تو ہمارے "سہنے" سے کہیں بڑھ کے کام کیا ہے۔ کیا یہ ہم سے سہا جا رہا ہے؟" ان کی آواز شدت غم و غصہ سے کپکپا اٹھی۔

"میں وہی تو کہنے آیا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا یہ عمل آپ کو اور چچا حضور کو ناگوار ہے۔ بلکہ کہیں زیادہ

محسوس ہوا ہو گا۔ یہ بھی مانا کہ مجھے آپ کے علم میں لائے بغیر ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اتنا تو سوچیے کہ کیا اجازت مانگنے پہ مجھے مل جاتی؟"

"اسی لیے آپ نے من مانی کرنے کا سوچا۔" بالآخر وہ رخ بدل لینے پہ مجبور ہو گئیں۔ یاسمین نے آگے بڑھ کے انہیں بیٹھنے میں سہارا دیا اور ان کے پشت پہ ٹیک کے لیے گاؤ تکیہ رکھا۔

"یہ میرا شوق نہیں تھا امی حضور کہ میں بلاوجہ ضد میں آ کر آپ کو اور چچا حضور کو دکھ دینے کی نیت سے من مانی کرتا۔ آپ ہی سوچیے' ٹیکسی چلانا ایسی کون سی عیاشی یا کارنامہ ہے جسے کرنے کو میں تڑپ رہا تھا۔ یہ سب میں نے مجبوری کی حالت میں وقتی طور پہ کیا تھا۔ آپ بھی جانتی ہیں کہ کتنے عرصے سے میں نوکری کی تلاش میں خوار ہو رہا تھا حالانکہ پہلے دن سے مجھ پہ روشن تھا کہ میری قابلیت اور تعلیم کے لحاظ سے مجھے جو ملازمت ملے گی وہ چچا حضور کو نامنظور ہو گی اور جیسی ملازمت کی اجازت انہوں نے طوعاً" کرہاً" مجھے دی ہے وہ کم از کم مجھے اس زندگی میں تو مل نہیں سکتی تھی۔ آخر میں کوئی معمولی پیمانے پہ شروع کیا کاروبار ہی رہ جاتا تھا اور مجھے یقین تو نہیں امید ضرور تھی کہ چچا حضور کو اس پہ خاص اعتراض نہ ہو گا۔ اگر پہلے پہل انہوں نے ہلکا پھلکا اعتراض کیا بھی تو بعد میں یہ دیکھ کر دور ہو جائے گا کہ اس کام کے کرنے سے ہمارے خاندانی وقار کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچ سکتی۔"

"بہت خوب' یہی تو وہ ڈھٹائی ہے جو ہمیں رہ رہ کے یاد دلا رہی ہے اور آپ کی اس سنگین اور مذموم حرکت سے بڑھ کے تکلیف دے رہی ہے۔" وہ بگڑ گئیں۔

"دیکھا حرمت النساء آپ نے' یہ آپ ہی ہیں جو ہمیں صبح سے یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ صاحبزادے نے جو کچھ کیا اور کہا اس پہ وہ نہ صرف شرمندہ ہیں بلکہ معافی کے طلب گار بھی ہیں۔ اور آپ دیکھیے اب بھی اس بات پہ مصر ہیں کہ اس کام سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا۔"

"امی حضور' آپ سمجھ نہیں سکیں یا شاید میری کوتاہی ہے کہ میں سمجھا نہیں سکا۔ میں اپنے کاروبار کے متعلق ذکر کر رہا تھا۔ چچا حضور کو ہمیشہ اس بات پہ اعتراض رہا ہے کہ پرچون فروشی یا دو چار روپے کی چیزیں بیچنے سے عزت پہ حرف آتا ہے تو میں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ایسا کوئی کاروبار نہیں شروع کروں گا جس سے ان کے اصول و پسند ناپسند کو کوئی گزند پہنچے حالانکہ کم سرمائے سے اور تھوڑے پیمانے پہ ایسا ہی کام شروع کیا جا سکتا تھا پھر بھی بہت سوچ سمجھ کے میں نے فیصلہ کیا کہ قسطوں پہ فوٹو اسٹیٹ مشین لے کر ایک چھوٹی سی دکان کرائے پہ لے لوں۔ مارکیٹ میں سامنے ہی ایک اسکول' ایک لاء کالج اور نزدیک ہی ایک اکیڈمی بھی ہے ایسے میں فوٹو اسٹیٹ کا کام خوب چلتا' ساتھ ہی میں نے پی۔ سی۔ او کا پرمٹ بھی حاصل کر لیا تھا۔ ان کاموں کے لیے میرے کچھ دوستوں نے میری کافی مدد کی۔ مگر میں بھی اسی خاندان کا حصہ ہوں' میری رگوں میں بھی وہی غیور خون دوڑ رہا ہے۔ میری خودداری نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں اخلاقی اور تعلقاتی مدد کے علاوہ ان سے مالی مدد بھی حاصل کروں چاہے وہ قرض یا ادھار کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ کاروبار کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں یہ کام نہ چلتا اور میں مقررہ وقت تک رقم ادا نہ کر پاتا' ایسے میں کیا چچا حضور کے لیے یہ امر زیادہ ناقابل برداشت نہ ہوتا کہ حویلی کے دروازے پہ لوگ قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے آتے۔

صاحبزادی خلعت النساء پوری توجہ اور خاموشی سے اس کا بیان سن رہی تھیں تب تک انہوں نے مداخلت نہ کی تھی اور صاحبزادی حرمت النساء اور یاسمین تو ویسے بھی خاموش تماشائی کی طرح ماں بیٹے کے مذاکرات دیکھ رہی تھیں اس لیے عمیص موقع غنیمت جان کر ساری تفصیل دہرا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کی والدہ ہی دل صاف کر لیں تو سمجھو "آدھے سے زیادہ کام ہو گیا" پھر صاحبزادہ نفیس علی خان کو بھی ماننے میں وقت نہ لگے گا۔

"دوسری طرف یہ کام بھی صرف سرمائے کی کمی کی وجہ سے میں التواء میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ مجھے اپنا آپ ایک بے کار وجود کی طرح لگتا تھا۔ ایک گھر بن کھائے وجود کی طرح۔ مجھے دل گیر تک خود سے زیادہ کار آمد لگتا تھا۔ آپ تصور نہیں کر سکتیں کہ میری ذہنی حالت دن بدن بد سے بد تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے ہر حال میں خود کو ثابت

ہونے سے بچاتا تھا۔ کسی دن میں حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔۔۔ مایوسی کی انتہا پہ پہنچ کے خود کشی کر لیتا یا اپنی ردی ہوتی ذہنی حالت کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھتا تو کیا اس سے نواب خاندان کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔"

وہ دہل کے رہ گئیں۔ ان کے سپاٹ چہرے پہ یکدم تلاطم پیدا ہوا۔ وہ زیرِ لب قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے اس پہ پھونکیں مارنے لگیں۔ عمیص نے ان کے ہاتھ چوم کر سینے سے لگا لیے۔

"مگر ابھی میں اتنا کمزور نہیں پڑا تھا یا یوں کہیے آپ کی دعاؤں کی وجہ سے اللہ کی ذات کریمی نے مجھ پہ خاص کرم کیا اور چند لوگوں کو وسیلہ بنا کر مجھ تک بھیجا جو میرا ہاتھ تھام کے راستہ آسان کرتے چلے گئے۔ میرے ایک دوست کے والد نے مارکیٹ میں ایک چھوٹا سا پلازہ بنایا تھا اس نے اپنے والد کو ضمانت دی اور وہ بغیر سیکورٹی کی رقم اور ایڈوانس کے نہایت آسان اور قابلِ قبول کرائے کی رقم پہ مجھے دکان دینے پہ تیار ہو گئے۔ ایک اور کالج کے دوست نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنی ضمانت پہ پی۔ سی۔ او کا پرمٹ دلوایا۔ ایک واقف کار نے اپنی ٹیکسی دن کے چھ گھنٹوں کے لیے مجھے دینی منظور کر لی تاکہ میں محنت سے کما کر دکان چلانے کے لیے بنیادی چیزوں کی خاطر رقم جمع کر سکوں۔ ڈھائی تین ماہ ہو چکے تھے۔ اور اب تو منزل بے حد قریب تھی۔ مجھے زیادہ نہیں' صرف پچاس ساٹھ ہزار کی ضرورت تھی اور شاید اگلے ایک ڈیڑھ ماہ میں میرا یہ ہدف پورا ہو جاتا کہ میرے اس مجبوری میں اٹھائے قدم کی خبر آپ سب کو ہو گئی۔ لیکن میرا یقین کیجیے میں نے نہ تو کبھی چچا حضور کی دل آزاری کرنے کا سوچا نہ ہی مجھے من مانی کرنے یا ان کے مقابل آنے کا شوق رہا ہے۔ میں صرف اپنے تشخص اور بقا کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اور اس جدوجہد میں بھی اپنے طور پہ میں نے پوری کوشش کی کہ میرا ہاتھ غلط جگہ نہ لگے مگر۔۔۔ میں اپنی ہر دانستہ اور نادانستہ جسارت کی معافی آپ کے پیروں پہ سر رکھ کے مانگ رہا ہوں۔ میں چچا حضور سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ مگر پہلے آپ کے پاس صرف اس لیے آیا کہ فی الحال ان کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ آپ کا ہاتھ سر پہ ہو۔۔۔ تو شاید میں خود کو اس قابل سمجھ سکوں کہ ان کے آگے معافی مانگ سکوں۔"

اس کی جھکی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو ان کے یخ بستہ پیروں پر کیا گرے۔۔۔ کہ گویا ساری برف پگھل گئی' ان کا ہاتھ عمیص کے گھنے بالوں میں آ کر ٹھہر گیا۔ اس نے اپنا سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھیں مگر ان کی پرشفقت مسکراہٹ میں ایک درد تھا۔ ایک بے بسی تھی جو عمیص کو مکمل کر مطمئن نہ ہونے دے رہی تھی۔ یقیناً وہ ممتا کے ہاتھوں مغلوب ہو کے اپنا دل تو اس کے لیے نرم کر بیٹھی تھیں لیکن ان کا دماغ۔ ان کی وہی اٹل سوچ' ان کے اصول اب بھی عمیص کے لیے لچک پیدا کرنے پہ تیار نہ تھے۔

"کس کس بات کی معافی مانگیں گے آپ صاحبزادہ عمیص"

"ہم سے تو آپ نے اپنے اس عمل کی وضاحت کر دی جو اس معاملے کی بنیاد بنا لیکن اپنے چچا حضور سے آپ نے جو بدکلامی کی' ان کا دل دکھانے کے مرتکب ہوئے' ان پہ بے بنیاد الزامات کی بوچھاڑ کی' سب کے سامنے انہیں شرمسار کیا' ان کے عزت و وقار کی ذرا برابر پروا نہ کرتے ہوئے ان کی نیت تک پہ شک کرنے کی جسارت کی۔ عمیص میاں' ان سب کی معافی آپ کیسے مانگیں گے؟ آپ کا یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہم تو آپ کی سفارش تک کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ آپ کو یہ کوہِ عظیم خود سر کرنا ہے۔"

انہوں نے معذرت ظاہر کر دی۔ عمیص کے لیے تو فی الحال اتنا بھی بہت تھا۔ یاسمین جو کچھ منٹ پہلے خاموشی سے کمرے سے نکلی تھیں' اتنی ہی خاموشی سے اقدس کو گود میں اٹھائے اندر داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے موتیا ٹرے اٹھائے آ رہی تھی۔ اس نے تائی حضور کی خیریت دریافت کرنے کے بعد ٹرے ان کے سامنے رکھی۔ اس میں کم پتی والی چائے کا کپ' چند نمکین بسکٹ اور دودھ سویوں کی پیالی تھی۔

"عمیص' تائی حضور نے نہ صبح ناشتا ٹھیک طرح کیا نہ ہی دوپہر کا کھانا کھایا۔ وہ اس وقت کھانا کھانے کی عادی نہیں ورنہ رات بھر معدے کی گرانی کے باعث طبیعت خراب رہے گی۔ اس لیے چائے کے ساتھ پلیز انہیں کچھ کھلا دو۔"

موتیا نے بے حد دھیمے لہجے میں اس سے کہا تھا۔ عمیص نے سر ہلایا اور دودھ والی سویوں کی پیالی اٹھالی۔

❀ ❀ ❀

"تائی حضور کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہیں عمیص۔"

انہیں چائے کے ساتھ ہلکی پھلکی غذا کھلانے کے بعد جب وہ باہر آیا تو موتیا ہاتھ میں دو مگ لیے اس کی منتظر تھی۔ دالان کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کے ڈھلتی شام کے سائے تلے اکٹھے چائے پیتے ہوئے گفتگو کرنا دونوں کا سالوں سے معمول تھا جس میں پچھلے کچھ عرصے سے تسلسل۔۔۔ یا بے ترتیبی سی آ گئی تھی' جس کی وجہ یقیناً عمیص کی بڑھتی ہوئی مصروفیت تھی۔ اس کے باوجود اب بھی جب وہ شام کی چائے کے اوقات میں گھر ہوتا تو اسی معمول کو پورا کیا جاتا۔

"دیکھو ناں' بات ان کی بھی ٹھیک ہے' اگر مسئلہ صرف تمہاری اس حرکت تک ہوتا تو اس معاملے کو دبانے کے لیے تمہارے یہ دلائل اور وضاحت کافی تھی جو تم نے ابھی اندر بیان کی۔ ابا حضور مطمئن نہ ہوتے' قائل نہ ہوتے۔۔۔ کسی حد تک سمجھوتہ ہی کر لیتے۔ لیکن تم بھی حد کرتے ہو۔ بے لحاظ ہونے پہ آئے تو اگلی پچھلی ساری کسریں نکال کر رکھ دیں۔ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تمہاری یہ گل فشانیاں تمہارے اور ان کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل کر گئی ہیں' جسے اب تم چاہو بھی تو نہیں پاٹ سکتے۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ قابو میں رکھنی چاہیے کمان سے نکلا تیر اور زبان سے نکلے الفاظ کبھی واپس نہیں آتے۔"

"کیا کروں' مجھے آج تک کوئی سیانا ٹکرایا ہی نہیں۔"

"سیانی سے تو دن رات کا ٹاکرا رہتا ہے لیکن۔۔۔ گھر کی مرغی دال برابر۔"

"یار کیا تمہارے پاس بھی کوئی حوصلہ یا امید نہیں مجھے دینے کے لیے۔" وہ خوامخواہ چڑ اٹھا۔

"کیا کہوں کہ تم دانت نکال کر اندر جاؤ' ابا حضور تمہیں گلے لگا کر شاباش دیں گے یا کسی ایسے منتر کے بارے میں بتا دیں گے جس کی جاپ کرنے سے ان کی یادداشت سے کل کا سارا واقعہ بمعہ اپنی تمام تر جزئیات کے محو ہو جائے۔"

موتیا نے اس سے بڑھ کے چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ عمیص چند لمحوں تک اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر اس پہ بس نہ چلا تو مگ زور سے پٹخ دیا۔

"کس قدر بکواس چائے بنائی ہے تم نے آج۔"

موتیا نے رخ پھیر کے بے ساختہ در آنے والی مسکراہٹ کو چھپایا' پھر دوبارہ خود ساختہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"اور کس قدر بکواس گفتگو کی تھی تم نے کل۔"

"موتیا کچھ اپنے ابا حضور کے لیے بھی بچا کے رکھو۔" عمیص نے بے حد تحمل سے کام لیتے ہوئے جتایا۔

"ساری لعنت ملامت اور طعنے۔۔۔ تم استعمال کر لو گی تو وہ کیا کریں گے؟"

"وہ زبانی ہتھیار استعمال کرنے کی بجائے اپنا ہاتھ استعمال کر لیں گے۔ جو انہیں کرنا ہی چاہیے۔"

"وہ کر چکے ہیں۔" عمیص نے سر جھکا۔

"اور اگر مجھے غصے یا طیش میں آ کر بدتمیزی کرنا ہوتی تو میں تب کرتا جب انہوں نے سارے خاندان کے سامنے میرے منہ پہ تھپڑ مارا تھا لیکن یقین کرو موتیا مجھے اس وقت بالکل برا نہیں لگا تھا۔ نہ ان کی ڈانٹ ڈپٹ' نہ تھپڑ مارنا' بلکہ اگر وہ خاموش رہتے' کچھ نہ کہتے تو تشویش کی بات تھی۔ مجھے تو ندامت تھی کہ میری وجہ سے انہیں کتنا شدید جذباتی دھچکا پہنچا ہے۔

جب ان کے اندر کا طیش تھپڑ کی صورت میں باہر ابلا تو مجھے کسی قدر اطمینان ہوا تھا کہ چلو اس طرح وہ اپنے اندر کا غبار تو نکال رہے ہیں۔۔۔ ہاں میرے اندر کا غبار تب نکلا جب انہوں نے اچانک بابر بھائی کا ذکر شروع کر دیا۔۔۔

میری تلخی کو زبان تب ملی جب وہ اس شخص کی بے بنیاد تعریف کرنے لگے جس نے پچھلے کئی سالوں سے میری بہن کی زندگی عذاب کی ہوئی ہے۔ میں خود پہ قابو نہ رکھ سکا۔"

"تو رکھنا سیکھو عمیص، خود پہ کنٹرول رکھنے سے زندگی مشکلات سے بچ جاتی ہے۔"

"کوشش تو کرتا ہوں، اور کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ پھر نجانے کیا ہوتا ہے سارا ضبط ایک دم ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ کیا کروں، یہ میرے بس سے باہر ہے۔ نہ میرے اندر غصہ دبا رہ سکتا ہے نہ ہی محبت۔ میں کسی جذبے کو پوشیدہ رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"

اس کے لہجے میں اتنی بے بسی تھی کہ موتیا جواب میں کچھ کہہ نہ سکی۔ چپ چاپ جامن کے درخت پہ بنے گھونسلوں میں پلٹ کے آتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔

"سنو۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔

"ہوں۔"

"اس کا ردعمل کیا تھا؟ بہت غصے میں ہو گی کہ میں نے چچا حضور کے ساتھ۔"

"عمیص! اب اس کا غصہ، پریشانی، فکر، اطمینان سب کچھ اس کی ذات کے حوالے سے مخصوص ہو گیا ہے۔"

موتیا نے سنجیدگی سے اسے باور کرایا۔

"اس گھر میں کیا ہوتا ہے۔ اچھا۔ برا۔ خوشگوار۔ یا ناخوشگوار۔ وہ اس چھت کے نیچے رہنے کی وجہ سے اسے دیکھنے پہ مجبور تو ضرور ہے مگر ایک تماشائی کی طرح۔ کل جو کچھ ہوا وہ گل کے لیے کسی تماشے سے زیادہ نہیں تھا۔ تم صحیح ہو یا غلط۔ ابا حضور اپنے غم و غصے میں حق بجانب ہیں یا نہیں۔ گھر کے ماحول میں پیدا ہونے والی اس تلخی کا اہل خانہ پہ کیا اثر ہوتا ہے، ان سب باتوں سے اس کا اب کوئی سروکار نہیں رہا۔ وہ صبح ناشتا کرنے کے بعد معمول کے مطابق گھر سے نکل گئی تھی۔"

"آفس گئی ہو گی۔"

"نہیں، آج اس کا ڈے آف تھا، شاید منی کی طرف یا شاید کسی اور دوست کے ہاں۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ دل کا بوجھ تھا کہ بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

"ہاٹ اسپاٹ" جیسے پرتعیش اور مہنگے ریسٹورنٹ میں داخل ہونے کا گل مہر کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے رسٹ واچ پہ ایک نظر ڈالی۔ وہ مقررہ وقت سے بیس منٹ لیٹ تھی اور یہ معمولی سی تاخیر بھی اس کی دانستہ کوشش کا نتیجہ تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وقت پہ پہنچ جانے کی صورت میں اسے اکیلے بیٹھ کے باقی سب کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ اس تصور سے ہی وہ گھبرا اٹھی تھی۔ ارادہ تو یہ تھا کہ کم از کم گھنٹہ بھر تاخیر سے پہنچے گی مگر پھر ایک اور وہم نے گھیر لیا کہ کہیں یہ تاخیر ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ ہال میں شہزاد ملک اسٹاف کے چند اور لوگوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ گل کے علاوہ بس دو تین اور کی کمی تھی۔ پراعتماد قدموں کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے گل مہر نے دیکھا کہ اس پہ اچانک پڑنے والی شہزاد ملک کی نظر ایک دم ہی اطمینان اور کچھ پالینے کے احساس سے بھر گئی تھی۔ یہ تاثر اتنا واضح اور بے ساختہ تھا کہ گل مہر کے قدم پل بھر کو لڑکھڑا سے گئے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے بوکے پہ اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔ شہزاد اس کی پذیرائی کو آگے بڑھا۔

"ہیپی برتھ ڈے سر۔" اس نے قریب آنے پہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بوکے آگے کیا۔ شہزاد نے ایک نظر اس کے نکھرے معطر وجود پہ ڈالی، دوسری نظر اس کے نازک ہاتھوں پہ۔ جو سفید اور گلابی ٹیوب روز کا گلدستہ تھامے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔

"کہتے ہیں تحفہ، لینے والے سے زیادہ دینے والے کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔" اس نے پھول تھامتے ہوئے کہا اور گل مہر کی استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں مزید وضاحت کی۔

"تحفہ تو آپ بے حد چن کے لائیں۔ اور اس میں بھی آپ نے میری بجائے اپنے آپ کو نظر میں رکھا یعنی وہ چیز دی جو آپ کے شایان شان تھی۔ آپ کے اندر اور باہر سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہوئی۔"

اس نے گل مہر کے سفید سوتی، سادہ مگر پروقار لباس میں چھپے گلابی نرم و نازک دلربا وجود کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے ہلکے رنگوں کا انتخاب اور لباس کی سادگی اس کا اپنا معیار تھا جس میں وہ اس گیدرنگ کے لیے بھی ترمیم کرنے پہ تیار نہ ہوئی کہ ہمیشہ سادگی سے آفس آنے والی صاحبزادی گل مہر خانم اچانک چونکا دینے والے حلیے میں سب سے الگ نظر نہ آئے۔ اسے مصنوعی سہاروں اور آرائش کے ذریعے خود کو ابھارنے کی نہ تو ضرورت تھی نہ ہی عادت۔ اس وقت بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ کاٹن کے اس بے حد سادہ تراش خراش والے سفید کلف لگے شلوار قمیص میں اس پوش ایریا میں واقع اتنے مشہور ریسٹورنٹ میں یہ برتھ ڈے پارٹی اٹینڈ کرنے چلی آئی۔ لیکن اسے اندازہ نہ تھا کہ اس سادگی میں۔ بھی اس کا حسن اس طرح شہزاد ملک جیسے ریزرو اور محتاط طبیعت والے شخص کو بہکا دے گا۔ وہ سٹپٹائے ہوئے انداز میں اس کا بدلا ہوا روپ دیکھ رہی تھی۔

شہزاد ملک کو شاید خود بھی احساس ہو گیا اپنی بے خودی کا۔ اس نے سنبھل کے اپنی نظریں سفید شیفون کے اسکارف میں لپٹے گل مہر کے حیا بار چہرے سے ہٹا کے اس گلدستے پہ مرکوز کر لیں، جس میں سفید پھولوں کے درمیان سے چند گلابی کلیاں سر نکال کر اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلا رہی تھیں۔

"اینی وے۔ تھینک یو ویری مچ فار دی بیوٹی فل گفٹ۔"

"ہیپی برتھ ڈے سر۔" عقب سے مسز راشدہ بھٹی کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔ ان کے ساتھ مس ویرونیکا بھی تھیں۔

"ویلکم لیڈیز۔ ہماری پارٹی کو شروع ہونے کے لیے آپ تین معزز خواتین کا ہی انتظار تھا۔" نجانے وہ اور کتنی دیر گل مہر کا راستہ روکے کھڑا رہتا کہ ان دونوں کے آنے پہ اسے انہیں لے کر آگے بڑھنا پڑا۔ گل مہر نے گہری سانس بھری۔ اس کے اندر کوئی سگنل جیسے جل اور بجھ رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

کوئی بہت ہی غیر متوقع بات۔

کوئی اچانک پیش آنے والا حادثہ۔

وہ الجھ سی گئی۔

یہ بہت سلجھے ہوئے لوگوں کی گیدرنگ تھی۔ ٹین ایجرز والا شور شرابا تھا نہ ہی ایسی کوئی پرہنگامہ ہلچل۔ سب ہی ایک دوسرے سے مہذب انداز میں خوش گپیاں لگا رہے تھے۔ خواب ناک روشنیوں والے ہال میں خوشگوار خنکی تھی، فضا میں تازہ پھولوں، ایئر فریشنرز اور مختلف لوگوں کے ملبوسات سے پھوٹتی مختلف نوعیت کی خوشبویات تھیں۔ پس منظر میں کسی بہت پرانے مگر بے حد رومانٹک انگلش گیت کا آرکسٹرا دھیمے سروں میں گونج رہا تھا۔ اس کے باوجود گل مہر کو گھٹن سی محسوس ہوئی۔ اسے اپنا آپ بہت اکیلا۔ بہت بکھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"شاید ہمیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہم اس ماحول میں فٹ نہیں ہو رہے۔" اس نے سوچا۔

"آپ نہ آتیں تو گلوں کی کمی رہتی۔" شہزاد ملک نے اس کے بالکل نزدیک آ کے کہا تو وہ بری طرح چونک اٹھی۔

"کیا ہم واقعی یہ بات سوچ رہے تھے یا بے خیالی میں زبان سے کہہ اٹھے۔" وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

"دیکھیے، سوائے آپ کے کسی اور نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار اتنے مہکتے ہوئے انداز میں نہیں کیا۔" اس نے سامنے کی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا جہاں خوبصورت ریپرز میں لپٹے ڈھیر سارے گفٹس کے درمیان وہ بوکے

ایک شان سے رکھا تھا۔

"آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں۔ آیئے سب کے درمیان آئیں۔" اتنے میں ویرونیکا نے بھی آکے اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

وہ اور مسز راشدہ بھٹی اس کے علاوہ لکی ایس پروڈکشن ہاوس کی لیڈیز اسٹاف رکن تھیں۔ مسز راشدہ بھٹی چالیس کے پیٹے میں ایک خوش اخلاق، طرحدار شادی شدہ اور بال بچے دار خاتون تھیں جو کمپنی کی مستقل میک اپ آرٹسٹ تھیں اگرچہ مقبول اداکارائیں اپنا میک اپ اپنے اپنے فیورٹ پارلرز سے کروایا کرتی تھیں مگر بہر حال یونٹ میں ایک باقاعدہ میک اپ آرٹسٹ کی گنجائش رکھنی پڑتی ہے۔ جبکہ ویرونیکا ایک معمولی شکل وصورت کی مگر انتہائی نرم و دلکش لب ولہجے کی مالک ایک چھبیس ستائیس سالہ کرسچن لڑکی تھی جو اس پروڈکشن ہاوس کی ٹیلی فون آپریٹر تھی۔

"سر آپ کیک کب کاٹ رہے ہیں؟"

"نہیں بھئی، یہ سب نہیں ہوگا۔ آپ لوگوں کے اصرار اور فرمائش پہ میں نے یہ پارٹی ارینج ضرور کی کہ آپ اپنے باس کو کہیں کنجوس نہ مشہور کردیں۔ لیکن کیک۔ نو وے۔ تین دہائیاں گزار لینے کے بعد موم بتیوں پہ پھونک مارنا اور کیک کاٹنا۔ کچھ مضحکہ خیز نہیں لگتا کیوں؟"

"کیک کے بغیر برتھ ڈے پارٹی کیسی؟"

"آپ لوگ کیک کھایئے، ضرور کھایئے، جی بھر کے کھایئے۔ ایک نہیں تین مختلف طرح کے کیک رکھوائے گئے ہیں لیکن کاٹنے کا فرض آپ لوگ خود ادا کیجیے۔" اس نے ہال کے اس طرف چلنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا، جہاں پارٹی کے انتظامات مکمل تھے۔

"آپ کچھ نہیں لے رہیں مس گل مہر!" ایک اچھے میزبان کی طرح وہ تقریباً سبھی مہمانوں سے یہ روایتی جملہ کہنے کے بعد اس کی طرف آیا جو واقعی کب سے پلیٹ میں موجود واحد چکن نگٹس کو کانٹے کی مدد سے ذرا ذرا کرید رہی تھی۔ کیک کا پیس بھی جوں کا توں موجود تھا۔ وہ مسکرا کے رہ گئی۔

"آپ کچھ پریشان نظر آرہی ہیں مس گل مہر!" کچھ منٹ بعد وہ پھر سے اس کے سامنے تھا۔ اب وہ بے دلی سے چائے کے سپ لے رہی تھی۔

"نہیں سر! پریشان تو نہیں، بس کچھ فکر مند ہو رہے تھے کہ شام گہری ہو چکی ہے۔ یہاں سے کنوینس پرابلم کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم ٹیکسی پہ آتو گئے تھے اب پتہ نہیں یہاں کوئی ٹیکسی ملتی ہے یا نہیں۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ لیڈیز کو ہی نہیں، اسٹاف کے ان ارکان کو بھی پرابلم ہو سکتی ہے جن کے پاس اپنی کنوینس نہیں کیونکہ ڈیفنس کے اس سرے پہ بنے اس ریسٹورنٹ کے آس پاس لوکل سواری کا ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ میں نے اسٹاف وین کا انتظام کر رکھا ہے۔ آپ اسی طرح جائیں جیسے روز آفس سے واپسی پہ یہ وین آپ کو ڈراپ کرتی ہے۔"

"لیکن سر! آپ نہیں جانتے کہ اس آفس وین کا روٹ کیا ہے۔ ہم جس علاقے میں رہتے ہیں، وہ اس روٹ کے آخری سرے پہ ہونے کی وجہ سے ہم روزانہ ہی سب سے آخر میں ڈراپ کیے جاتے ہیں۔ آفس آف ہونے کے بعد اگرچہ ہمارے گھر سے آفس تک کا راستہ بیس پچیس منٹ کی ڈرائیو ہے مگر ہم ڈیڑھ گھنٹے میں گھر پہنچتے ہیں جبکہ ڈیفنس سے یہ فاصلہ دگنا وقت لے گا۔ بس اسی لیے۔ بہر حال اور کوئی چارہ بھی نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"نہیں خیر حل تو ہے۔ وہ یہ کہ میں آپ کو ڈراپ کردوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"اعتراض تو نہیں مگر یہ مناسب نہیں لگتا۔ ایک تو ہمیں اس کی اجازت نہیں، دوسرا اس وقت سارا اسٹاف یہاں موجود ہے۔ ہم کسی قسم کی قیاس آرائی برداشت نہیں کر سکتے۔"

"آپ کی بات درست لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں آپ سے اکیلے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ سوچا تو یہ تھا کہ یہ بات شاید اس پارٹی کے دوران ہو جائے لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔"

"ہم سے کیا بات کرنی ہے آپ کو۔" اس کی پیشانی پہ شکن نمودار ہوئی۔

"آپ پریشان مت ہوں، خاص کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑا اٹھا۔ رعب حسن کا عالم ہی کچھ ایسا تھا۔

"سر! ہمیں عادت ہے الگ تھلگ رہنے کی۔ آپ پلیز پارٹی انجوائے کیجیے، ہماری فکر نہ کریں۔" اب گل مہر کو سچ مچ گھبراہٹ ہونے لگی۔

"میری اپنی عادت بھی کچھ ایسی ہے، محفل میں جی جلد اوب جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلقات یا موت۔ یا پھر بزنس کی وجہ سے مجھے مجبوراً "پارٹیز" میں جانا پڑ جائے تو اور بات ہے میں خود کم ہی پارٹیز ارینج کرتا ہوں۔"

"تو پھر یہ سب۔"

"اول تو مجھے برتھ ڈے منانے کی عادت نہیں۔ گھر پہ امی ابو صبح دعا دے دیا کرتے ہیں، یہی سب سے بہترین تحفہ ہے، میری پسند کا کھانا امی بنا دیتی ہیں۔ اور بس۔ مجھے قریبی دوستوں تک کے ساتھ اس دن کو منانا پسند نہیں۔ اور رہا آج یہاں سب کو اکٹھا کرنے کا سوال۔ تو اس کی ایک وجہ تھی۔" وہ اتنا کہہ کر رکا۔ گل مہر نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ وہ وجہ کیا تھی، اس کے اندر جلنے بجھنے والا سگنل اب پوری طرح روشن تھا۔ وہ دھڑکتے دل اور بھیگی ہتھیلیوں کے ساتھ خود کو بہلا رہی تھی کہ ایسا ہرگز نہیں۔ جیسا کہ اسے لگ رہا ہے۔ شہزاد ملک جیسا مہذب و مدبر شخص اس عامیانہ طریقے سے اسے گھیرنے کی کوشش ہرگز نہیں کر سکتا۔

"وہ وجہ یہ تھی مس گل مہر کہ میں "باس باس" کھیلتے تنگ سا آگیا تھا۔ اب میں ایک عام شخص کی حیثیت سے دوستانہ انداز میں آپ سب کے سامنے آنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرا یہ اقدام اس سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔" کہنا تو وہ کچھ اور چاہتا تھا مگر اس کے حسین آئینہ سے چہرے پہ نمودار ہوتے تلاطم نے اسے بات بدلنے پہ مجبور کر دیا۔ گل مہر نے بمشکل مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

مسز راشدہ بھٹی اپنے ہسبینڈ کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ ان ہی کے ساتھ واپس گئیں۔ ویرونیکا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے صفدر نعیم کی ہی بلڈنگ میں رہتی تھی، اسے صفدر کے ساتھ جانے میں زیادہ سہولت محسوس ہوئی۔ مجبوراً گل مہر کو شہزاد کی آفر قبول کرنا پڑی۔ گیارہ مردوں کے درمیان اکیلی شخص کے دو تین گھنٹے تک سفر کرنے سے بہتر تھا کہ وہ شہزاد کے ساتھ ہی چلی جاتی جسے وہ اتنے کم عرصے میں مکمل نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ جاننے لگی تھی جبکہ ان گیارہ میں سے چھ سات ایسے تھے جن سے گل مہر کا سامنا تک نہ ہونے کے برابر تھا۔

☆ ☆ ☆

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ یہ بدن۔۔۔ یہ نگاہیں میری امانت ہیں
یہ گیسوؤں کی گھنی چھاؤں ہے میری خاطر
یہ ہونٹ اور یہ باہیں میری امانت ہیں

بابر ہمایوں مغل بے اختیار گنگنا اٹھا۔ ایک تو یوں بھی وہ دل اور خواہش دونوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا شخص تھا اور دوسرا یہ کہ سامنے اس وقت وہ وجود تھا جس نے عرصے بعد بابر کے اندر کے عاشق کو جگا ڈالا تھا اور وہ نوخیز عاشق بھرپور انگڑائیاں لے کر نہ صرف بیدار ہو چکا تھا بلکہ ہاتھ سے نکلا بھی جا رہا تھا۔

اور اس کی گنگناہٹ سن کر وہ اپنے دھیان سے چونک اٹھی۔ اس کا مانوس چہرہ نظر آتے ہی وہ قدرے مطمئن ہوئی۔ اس شخص سے پہلے بھی اس کا دو تین بار سامنا ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے حدود اربعہ سے تو واقف نہیں تھی لیکن اتنا اندازہ تھا کہ وہ جو بھی ہے ملک مقبول کا خاص بندہ ہے۔ اسی لیے ہمیشہ ملک کے شو کے دوران ہی اس سے ٹکراؤ ہوتا تھا۔ ادا سرسری سی ملاقاتوں میں اس کے بارے میں کوئی رائے تو قائم نہیں کر سکتی تھی البتہ بھی

کبھی ناگوار حد تک الجھن پیدا کردینے والا یہ چرب زبان انسان کم از کم ان حریص نظروں اور غلیظ ذہنوں والے لوگوں سے بہرحال بہتر تھا جو ایسی جگہوں پہ اس نے دیکھے تھے۔ جو ہر گانے والی عورت کے بارے میں یہ سوچ کے یہاں آتے ہیں کہ وہ پیسے خرچ کرکے صرف اس کی آواز ہی نہیں سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ ایک وہی نہیں اور بھی تھیں جو گانا گا کر یا اسٹیج پہ ڈانس کرکے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پال رہی تھیں۔ ان میں اکا دکا اس کی طرح حالات کی ماری اچھے گھرانوں کی بھی تھیں، کئی بازار سے بھی تعلق رکھتی تھیں مگر اپنی آواز اور ادا سے زیادہ کچھ بیچنے پہ رضامند نہیں تھیں لیکن یہاں جو گاہک آتے وہ مال بھی اپنی مرضی کا منتخب کرتے اور قیمت بھی اپنی مرضی کی لگاتے۔ ایک بار ایسے ہی کسی اوباش سیٹھ نے ڈانسر چمپا کو گھیرنا چاہا تو وہ جل کے بولی تھی۔

"سیٹھ یہی دھندہ کرنا تھا تو بازار کیا برا تھا؟ میرا کیا دماغ خراب ہے جو راتیں جاگ کر گرمی سردی کی پروا کیے بغیر اپنے پیر تڑوا کے کئی کئی گھنٹے ناچتی ہوں۔ ہڈی ہڈی درد سے چیخ اٹھتی ہے۔"

شبلو نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا۔

"چمپا لوگ تو تجھے ناچنے والی ہی سمجھتے ہیں۔ بازاری عورت ہی کہتے ہیں پھر تو اتنی احتیاط کیوں کرتی ہے؟ دنیا کو کیا پتہ تیرے اصولوں کا؟ کیا خبر زمانے کو تیری حد کی؟ جب تو رات بھر گھر سے باہر رہ کر لوٹتی ہے تو کسی کو کہاں یقین آتا ہوگا کہ تو ناچنے کی مزدوری کرکے لوٹی ہے۔ اور اگر مان بھی لیں تو ناچنا کون سا عزت کی بات ہے۔ اتنے بھڑکیلے کپڑے پہن کر تو ہزار کے مجمع کے سامنے انگ انگ ہلاتی ہے تو پھر یہ دہرا معیار کیوں۔"

"یہ سوال تو کر رہی ہے ادا؟ حیرت ہے؟ ناچنے والی کی عزت نہیں تو گانے والی کو کون سا لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر میں تجھے کہوں کہ آج رات مائیک ہاتھ میں پکڑے کھڑے ہو کر گانا گانے کی بجائے گھنگھرو پہن کے ٹھرک کے دکھا تو کیا تو مانے گی۔ بس یہی بات ہے۔ یوں مردوں کے آگے ناچ کے ان کو بے قرار کرکے میرا دل خوش تو نہیں ہوتا لیکن دلدل میں دھنسنے سے بہتر ہے کہ انسان کیچڑ بھرے راستے سے ہی گزر لے۔ دنیا مجھے جو مرضی سمجھتی رہے۔ کم از کم میرا دل، میرا ضمیر تو مطمئن ہے۔"

اور اتنے کم عرصے میں اب ادا کو بھی لگنے لگا تھا کہ اس ماحول میں اس سے ٹکرانے والا ہر شخص اسے دلدل میں دھنسا ہوا دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ گانے والی کو ناچنے پہ، ناچنے والی کو اور بھی ذلیل کام کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ ایسے میں یہ سر پھرا عاشق تو پھر بھی غنیمت تھا جو محض دلبرانہ نظروں کے طواف اور نثار ہو جانے والے اشعار تک محدود رہتا۔

"اتنے حسین چہرے پہ یہ تردد؟ یہ فکر۔ خیریت ادا جی؟" وہ اور نزدیک آیا۔

"جی بالکل خیریت ہے آپ عالیا۔" وہ ذہن پہ زور ڈال کے اس کا نام یاد کرنے لگی۔ (پتہ نہیں اس نے مجھے اپنا نام کبھی بتایا بھی تھا یا نہیں؟)۔

"بندے کو بابر ہمایوں مغل کہتے ہیں۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے فدویانہ انداز میں گویا ہوا۔

"آپ کو جب بھی دیکھا اکیلے ہی پایا۔ یہ تنہائی آپ کی اپنی پسند ہے یا کسی کی دین؟"

"ایسی بات نہیں۔ لیکن ہر کسی کے ساتھ وقت گزار کے وقت کا زیاں کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اکیلے رہ لیا جائے۔ یوں بھی میں اکیلے میں بھی "اکیلی" نہیں ہوتی۔ اور کوئی نہیں، اپنا آپ تو ساتھ ہوتا ہے جب کہ بعض اوقات بھری ہجوم میں اپنا آپ بھی نظر نہیں آتا۔"

"واللہ" وہ پھڑک اٹھا۔

"کیا خوبصورت بات کی ہے۔ آپ غزل سرائی میں ہی نہیں، غزل گوئی میں بھی کمال رکھتی ہوں گی۔ کبھی کچھ شعر کہہ کے خود کو آزمایا آپ نے؟" وہ ادا کی جانب سے لفٹ ملنے پہ پھیل کے بیٹھ گیا اور وہ جو نگاہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے سخت اکتاہٹ محسوس کر رہی تھی۔ خود کو باتوں سے بہلانے لگی۔ ایک نگاہ ہی تو تھی جو اس کی ایسی بے سروپا باتیں سن لیا کرتی۔ یہاں اور کون تھا جسے ادا کی "باتوں" سے غرض تھی۔ باقی سب کو تو ادا کی "ادائیں"

چاہیے تھیں۔

"آزمایا تو بہت ہے۔ ہاں شاعری کے ذریعے نہیں، اور بہت سے راستے گزرے ہیں آزمائش کے۔" وہ اپنی مخروطی انگلی میں نیلم کی انگوٹھی گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آپ ایک بار آزما کے تو دیکھیے، ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس آزمائش میں سو فیصد پوری اتریں گی۔ آپ میں ایک حساس اور مکمل شاعرہ کو ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔"

"آپ شاعر ہیں؟"

"نہیں، مگر شاعر شناس ضرور ہیں۔"

"یہ ہی بہت ہے۔ کسی چیز سے تو شناسائی کا دعویٰ ہے آپ کو۔ ورنہ عمر گزر جاتی ہے کھوج میں۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیا آپ کو بھی کسی کی تلاش ہے؟" وہ ذرا اور بے تکلف ہوا۔

"اور کیا آپ کو بھی؟" ادا نے جوابی سوال کیا۔

"تلاش تو تمام ہوئی۔" بابر نے اسے گہری نگاہوں کے حصار میں لے کر کہا۔ "ہاں اب مرحلہ کوئی اور ہے۔"

"میرا خیال ہے، اسٹیج پہ میرا نام اناؤنس ہو رہا ہے۔ مجھے اجازت ہے۔" وہ اپنا ریشمی سرسراتا جھلمل لبادہ نفاست سے سمیٹتے ہوئے اٹھی۔ بابر اس کے اٹھتے ہی تعظیماً کھڑا ہوا تو ادا کو یہ انداز بڑا بھلا لگا۔

"آپ سے بات کرکے اچھا لگا۔" اس نے جاتے جاتے کہا اور یہ حقیقت تھی کہ اس نے یہ فقرہ محض رسمی طور پہ یا مروتاً نہیں کہا تھا۔ اپنی پہلی ملاقات میں بابر نے اس پہ ملا جلا سا تاثر قائم کیا تھا اور دوسری ملاقات میں تو وہ اسے ایک عیاش، بہکا ہوا سا شخص سمجھ رہی تھی لیکن اب اس سے تفصیلی گفتگو کرکے احساس ہوا کہ بے شک وہ ایک رنگین طبع اور شوقین مزاج آدمی ہے مگر بہرحال اس ماحول میں پائے جانے والے دوسرے افراد سے مختلف بھی ہے اور بہتر بھی۔ یہاں اور کون تھا جو اتنی دیر کسی لڑکی کے پاس بیٹھ کے اتنی شرافت سے "صرف" گفتگو کرنے کی ہمت اور برداشت رکھتا ہو۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ بابر ہمایوں مغل نے یہ ملمع کس لیے چڑھایا تھا۔ اس سے پہلے میک اپ روم کی راہداری میں اسے اکیلے پا کر وہ اس پہ جال پھینکنے کی کوشش کر چکا تھا اور اسے ادا کے چہرے کے بگڑتے زاویوں اور ناگواری نے ناکامی کا احساس بھی دلا دیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں جو حسن کے قصیدے سن کر پھسل پڑیں یا چند تحائف کے بدلے جھولی میں آن گریں۔ اس نے ادا کی پروقار سوگواری میں ایک ٹھہراؤ دیکھا تھا۔ اس کے اکیلے پن میں ایک تلاش کو محسوس کیا تھا۔

اس ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر مارنے کی بجائے اس نے ہلکی ہلکی لہریں بنانا زیادہ مناسب جانا۔

اس تلاش کو الجھاؤ دینے کی بجائے اس نے راستہ دینا بہتر خیال کیا۔

وہ جان چکا تھا کہ ادا کو کس چیز کی تلاش تھی۔ وہ جس ماحول سے تعلق رکھتی تھی، اس سے ذہنی مطابقت رکھتی تھی اور یہی وجہ تھی اس کے کھوئے کھوئے سے رہنے کی۔ اس کا ذہنی معیار، جذباتی پرکھ۔ جس ماحول سے مطابقت رکھتی تھی، وہ ماحول اس کے پس منظر سے میل نہ کھاتا تھا۔ اسے محفلوں میں گانے والی ایک بازاری عورت سے زیادہ مقام نہ ملتا۔ جبکہ وہ اس سے کہیں زیادہ کی مستحق تھی اور بابر ہمایوں مغل کے ہاتھ اس کی یہ کمزوری آ گئی تھی۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ عزت و مقام کی متلاشی اس لڑکی کو کس چیز کی پیاس ہے۔

بلا مقصد تو وہ کسی چیز پہ وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اب اگر ادا کے پیچھے لگا تھا تو اس کی بھی ایک ٹھوس وجہ تھی۔ اور وہ وجہ ملک مقبول تھا جس نے کل ہی اسے آفس بلوا کے یہ کام سونپا تھا۔

"[illegible] چیز زبردست ہے۔ باہر کا کسٹمر ایسے ہی آئٹم کی ڈیمانڈ کرتا ہے۔ جس کے پاس نرا فن ہی نہ ہو بھیجہ بھی ہو اور وہ [illegible] میں اسٹائل ۔۔۔ وہ بھی ہو۔ مگر یہ لڑکی ہے کہ پچھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔"

"بروکر کون ہے اس کا۔"

"ارے نہیں یار صاحب۔ یہ بروکر کالایا آئٹم نہیں۔ کسی طبلچی کی بیٹی ہے۔ چار دیواری میں پلنے کے بعد اب ایک دم محفل میں گھسیٹ لایا ہے اس لیے اب تک اوپری اوپری سی لگ رہی ہے۔ عادت نہیں اسے۔"

"ہو جائے گی ملک صاحب۔ عادت ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"او یار 'ادھر رات گزر جائے تو دیر ہو جاتی ہے۔ عمر کا کیا ہے' آج ایکس تو کل تیس۔ ابھی بولی اچھے داموں لگے گی۔ بڑا اچھا آرڈر آیا ہوا ہے ابوظہبی سے۔ انہیں ایسا ہی آئٹم چاہیے فنکشن کے لیے۔ یہ لڑکی ذرا پڑھی لکھی ہے۔ بول چال اچھی ہے۔ ادھر ہر چیز چلتی ہے' ہر مال کھپ جاتا ہے لیکن بڑے لوگوں کی محفلیں اور چیز مانگتی ہیں۔ ان کو صرف ناچ گانا نہیں دیکھنا ہوتا۔ نازک مزاج لوگ ہیں 'اس بات پہ بھی بدک جاتے ہیں کہ رقاصہ نے پان کی پیک ان کے سامنے کیوں اگلی۔ اپنے پاس تو لے دے کر نگاہ ہے جسے ذرا رنگ ڈھنگ سے ایسی محفلیں سجانی آتی ہیں۔ لیکن اس کا بھی یہ تیسرا پھیرا ہے ابوظہبی کا۔ یہ نہ ہو وہ پرانا آئٹم دیکھ کے اگلی بار کانٹریکٹ ہی نہ دیں۔ نگاہ کو تو ضرور بھیجنا ہے۔ اس کا تجربہ کافی ہے۔ سب کچھ قابو کر لے گی لیکن ساتھ ایک نئی بلبل تو ہو۔ کسی طرح یہ ادا راضی ہو جائے۔"

"اس کے باپ سے بات کر کے دیکھی آپ نے۔"

"ہاں کی تھی۔ پہلے تو بدک اٹھا کہ شاید طائفے کی آڑ میں کوئی اور کام نہ کروالوں لیکن میں نے تسلی کرائی کہ یہ ثقافتی طائفہ ہے۔ ہاں اسٹیج پروگرام کے علاوہ خفیہ طور پہ چند پرائیوٹ فنکشن کرنے پڑیں گے لیکن ان میں بھی سوائے ناچ گانے کے اور کچھ نہیں۔ تھوڑا لالچ وغیرہ دیا تو ہے لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ بیٹی سے بات ضرور کرے گا مگر وہ شاید ہی مانے۔"

"تو اب آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ جب وہ محترمہ اپنے باپ کے کہنے میں نہیں تو ہماری تو ان سے واجبی سی سلام دعا تک نہیں ملک صاحب۔"

"اب یار، تمہیں دعا سلام پیدا کرنے اور پھر آگے بڑھنے میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے۔ گھاگ سے گھاگ لڑکی کو تم منٹوں میں باتوں میں لگا لیتے ہو۔ یہ تو پھر ایک سہمی ہوئی چڑیا ہے۔ تھوڑا بہلا پھسلا کے' دوستی کے چکر دے کر لائن پہ لے آؤ۔ تم پہ بھروسہ کرنے لگے گی تو تمہارے کہے پہ ساتھ بھی چل پڑے گی۔"

"تھیجئے بھلا وہ ہمارے کہنے پہ کیسے چل پڑیں گی۔"

"بنو مت یار۔ مفت میں تم سے آج تک کچھ کروایا ہے۔ جواب کرواؤں گا؟۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ بلکہ یہ لو ایڈوانس۔" ملک مقبول نے ہزار کا ایک نوٹ آگے بڑھایا۔

"کام آج سے شروع کر دو۔"

"لیکن یہ کام وقت لے گا حضور۔ دوستی ہوتے دن لگتے ہیں اور ہو بھی جائے تو چھوٹتے ہی ہم ان سے ابوظہبی جانے کا مطالبہ تو نہیں کر سکتے۔ وہ فوراً "بدک جائیں گی۔ بھانپ جائیں گی کہ اتنا تو سب جانتے ہیں ہم آپ کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔ ہاں رفتہ رفتہ ہم انہیں اس نہج پہ از خود سوچنے پہ مجبور ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ آپ سے آ کر اس پیشکش کی منظوری کا اعلان کر دیں۔"

اور اس نے بڑی ہوشیاری سے پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔ اب وہ وہیں بیٹھا ادا کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا آئٹم ختم ہوئے پندرہ منٹ ہو رہے تھے مگر وہ نہ لوٹی تو بڑا مایوس ہو کر اٹھ گیا۔

"لگتا ہے اسٹیج سے ہی واپسی ہو گئی۔"

لیکن سامنے سے ادا کو آتے دیکھ کے اس کا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ اس کا لباس اور ہیئر اسٹائل تبدیل ہو چکا تھا۔ شاید یہ تاخیر اسی لیے ہوئی۔ اب وہ دھانی اور عنابی امتزاج کے لان کے سوٹ میں ملبوس' سادہ سندھی چوٹی اور دھلے ہوئے میک اپ سے بے نیاز چہرے کے ساتھ ایک نو عمر گھریلو لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کا چھوا پن تمام تر دلکشی کے باوجود اترا اترا سا الگ رہا تھا۔ بابر نے وجہ دریافت کی۔

"دراصل مجھے نگاہ کا انتظار تھا۔ آج کے شو میں اس کی شرکت نہیں تھی لیکن پھر بھی میں نے اسے آنے کا کہا تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' کہنے لگی اگر افاقہ ہوا تو ضرور آئے گی۔ شاید زیادہ بیمار ہو اس لیے نہ آسکی۔"

"او تو آپ نگاہ جی کے لیے فکر مند ہیں۔ آپ کہیں تو آپ کو ان کے گھر لے چلوں۔ ملک مقبول کی ذاتی گاڑی کی چابیاں لے آتا ہوں۔"

"نہیں وہ تو کوئی خاص مسئلہ نہیں۔ میں کل فارغ ہوں۔ جا سکتی ہوں۔ مسئلہ تو آج کا تھا۔ اور آج کا دن ختم ہونے میں بس چار گھنٹے رہ گئے ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے مجھے نگاہ کے ساتھ آج بہت ضروری کام سے جانا تھا۔ میں اکیلی کبھی بازار گئی ہی نہیں۔"

"خادم حاضر ہے۔ جہاں حکم دیں گی چل پڑیں گے۔"

"نہیں اب کیا ہو سکتا ہے۔ دراصل ایک عزیز دوست کی سالگرہ ہے۔ تحفہ میں لے چکی ہوں۔ جا کر دینے کا وقت نہیں رہا۔ نگاہ کو ساتھ لے جا کر کوریئر سے بھیجنے کا ارادہ تھا۔"

"ایک بڑی مقبول کوریئر سروس کا آفس یہیں نزدیکی مارکیٹ میں ہے۔ آئیے دیر نہ کریں۔ ہم لے چلتے ہیں۔"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر ملک کے آفس چابی لینے لپکا تو ادا لحظہ بھر سوچنے کے بعد جانے کا ارادہ کر بیٹھی۔

● ● ●

وہ اس کے بالکل نزدیک تھی۔

ہاتھ بھر کے فاصلے ـــــ

اس کے پہلو میں بیٹھی تھی مگر پھر بھی درمیان میں ایک خلیج حائل تھی۔ اور یہ خلیج جھجک کی تھی۔ خوف کی تھی۔

شہزاد ملک ـــ ایک کامیاب بزنس مین' ایک سیلف میڈ انسان' اس کامنی سی لڑکی سے خوفزدہ تھا۔ اپنے دلی جذبات اس پہ آشکار کرنے سے ڈر رہا تھا حالانکہ اس وقت یہ سب کہہ دینے کا بڑا مناسب موقع تھا۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گرمیوں کی یہ رات اچھی خاصی خوشگوار تھی۔ بادل گھر کے آ رہے تھے اور لگتا تھا رات کے کسی پہر تو خوب ہی برسیں گے۔ ان دونوں کو اس گاڑی میں اکٹھے سفر کرتے بیس پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ آدھا راستہ تو سمجھو کٹ چکا تھا مگر دونوں جانب ہنوز ایک خاموشی تھی۔ گل مہر کی خاموشی میں گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ تردد اور فکر بھی شامل تھے۔ وہ کبھی اتنی رات تک گھر سے باہر نہیں رہی تھی اور وہ بھی بغیر بتائے۔ جبکہ آج وہ نہ صرف گھر سے کچھ کہے بغیر نکلی تھی بلکہ گھر کے تلخ ماحول کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے گھر بھر سے ناراضگی مول لینے کا سامان ہی پیدا کیا تھا۔ اتنا تو پتہ تھا کہ امی حضور اس کی اس جسارت کو ڈھک لیں گی یعنی ابا حضور اگر گھر میں ہوئے تو دیر سے آنے پہ خفا ہو سکتے ہیں' باز پرس کر سکتے ہیں مگر ان تک یہ خبر یقیناً نہیں پہنچے گی کہ وہ بغیر اجازت اور اطلاع کے نکلی تھی۔ یقیناً امی حضور نے آج کے دن اس کی غیر حاضری کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ بیان کر دی ہو گی۔ خود وہ اکیلے میں ضرور ہلکا پھلکا ڈپٹ لیں گی۔

گل مہر کو زیادہ الجھن موتیا کے متوقع اعتراضات کے بارے میں سوچ سوچ کر ہو رہی تھی۔ اس سے چھٹکارا اتنی جلد ممکن نہ تھا اور نہ ہی وہ آسانی سے مطمئن ہونے والوں میں سے تھی۔ پتہ نہیں وہ اسے سونے بھی دے گی یا نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ڈر تھا کہ دیر سے آنے کی غلطی شاید کسی بہانے پہ معاف کر دی جائے لیکن اگر کسی نے اسے شہزاد کے ساتھ اتنی رات کو اس کی گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تو وہ کیا جواز پیش کرے گی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس وقت ڈیفنس سے اگر کوئی ٹیکسی مل بھی جاتی تو نجانے کس قماش کا ڈرائیور ہوتا' اس کے ساتھ تنہا بیٹھ کے آنے سے کہیں بہتر تھا کہ وہ اپنے پاس کے ساتھ آتی جو اس کے لیے قابل بھروسہ تھے۔ لیکن یہ بات وہ ابا حضور کے سامنے اس اعتماد سے نہ کہہ پاتی کہ اس کا یہ بتانے کا قطعی ارادہ نہ تھا کہ وہ کہاں گئی اور کس مقصد سے گئی۔

اس کی اس ملازمت پہ معترض ہونے کا ایک اور بہانہ مل جاتا۔ دل ہی دل میں وہ گھر واپسی پہ کسی کا سامنا نہ
کی دعا مانگنے لگی۔

گل مہر آپ نے پوچھا نہیں کہ میں آپ سے کیا بات کرنا چاہتا ہوں۔" شہزاد نے اس چپ کو توڑنے کا فیصلہ

ہم نے پوچھا تھا سر' لیکن آپ ہی نے کہا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں۔"
وہ تو میں۔۔۔" اب اسے کیا کہتا کہ وہ اس کے وقار و دبدبہ سے خائف ہو گیا تھا۔ شہزاد نے اک لمحے کے لیے
کن انداز میں سوچا۔ کہ اسے بھی اس وقت یہ بات کرنا چاہیے یا نہیں۔
ہر کام سوچ سمجھ کے کرنے کا عادی تھا۔
محبت بھی اور محبت کا اظہار بھی۔
اور اس نے سوچ لیا۔۔۔ آج نہیں تو کبھی نہیں۔
مس گل مہر' میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں باس باس کھیلتے اوب چکا ہوں۔ میں دوستانہ انداز میں آپ کے
آنا چاہتا ہوں۔ ہمارا آفس میں کئی گھنٹوں کا ساتھ ہے لیکن وہاں یہ ذکر میں اس لیے چھیڑنے سے احتراز کرتا
آپ وہاں کام کرنے آتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا آپ کے ذہن میں کسی قسم کا غلط گمان آئے کہ میں موقع
یا اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ پتہ نہیں آپ کا رد عمل کیا ہوتا ہے میری بات کے جواب میں' مجھے اس
پرواہ نہیں۔ صرف یہ ڈر تھا کہ کسی شدید یا غیر متوقع رد عمل کی صورت میں آپ کے کام پہ فرق نہ پڑے۔
مس گل مہر' میں جو کہنے جا رہا ہوں' یہ میری ذاتی سوچ ہے۔۔۔ میں آپ کے سامنے فقط اس کا اظہار کر رہا
آپ پہ زبردستی کچھ تھوپ نہیں رہا۔ ایک سوال کرنے والا ہوں' جس کا جواب آپ اپنی مرضی سے دینے کی
ہیں۔ مجھے آپ کے انکار پہ ناراض ہونے تک کا حق نہیں صرف یہ چاہوں گا آپ کا جواب بھلے کچھ بھی ہو'
کا فرق ہمارے پروفیشنل ریلیشن شپ پہ نہیں ہونا چاہیے۔"
"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں سر۔" وہ سراسیمہ انداز میں کہہ رہی تھی کچھ کچھ اندازہ تو ہو رہا تھا کہ یہ تمہید کس
لے میں باندھی جا رہی ہے مگر شہزاد کا متذبذب رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا وہ یوں ہی ہچکچا رہا تھا جیسے بہت
اسی بات کہنے والا ہو۔ اور یہی چیز گل مہر کو کنفیوز کر رہی تھی۔
"گل مہر' میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں' کیا آپ کو اس پہ کوئی اعتراض ہے؟" وہ
ہی سانس میں تینوں باتیں کہہ گیا اور وہ جو خود کو ذہنی طور پہ تیار کر رہی تھی عشق و محبت کے طولانی اظہار اور
فتگیوں کے لیے۔ حیران ہو کے رہ گئی۔
"اتنا سیدھا' سچا اور دو ٹوک انداز۔" وہ دل میں دہرانے لگی کہ اس نے کتنے واضح مگر سادہ الفاظ میں اپنا مدعا اس
پہنچا دیا تھا۔
"مجھے جواب کی جلدی نہیں۔ آپ بخوشی جتنا چاہے وقت لے لیں سوچنے کے لیے بلکہ اگر کچھ پوچھنا چاہیں'
جاننا چاہیں تو بلا جھجک سوال کر لیں۔"
وہ سر جھکا کے اپنی ہتھیلی مسلنے لگی۔ ایسا کڑا مرحلہ زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔ اسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا کہ وہ اس
پہ اپنی فیلنگز چھپائے یا ظاہر کرے۔۔۔ اور فیلنگز تو خود اس پہ بھی نہ کھل رہی تھیں۔۔۔ نہ خفگی کی کوئی
۔۔۔ نہ خوشی کی لہر۔۔۔ بس ایک مسلسل حیرانی تھی جو اسے گھیرے میں لے رہی تھی۔
"میں پھر دہرا دوں' آپ کے کسی بھی فیصلے کا اثر آپ کی جاب پہ نہیں پڑنا چاہیے۔ میری کمپنی کو آپ کی
ضرورت ہے۔ آپ پہ نہ کوئی دباؤ ہے نہ زبردستی۔ یہ زبردستی کے سودے تو ہوتے بھی نہیں مس گل مہر۔ اگر آپ
مجھے کسی قابل سمجھا تو یقیناً یہ اعزاز میرے لیے بہت بڑا ہو گا اور بالفرض آپ کا جواب انکار میں ہوا تب بھی
مجھے دوبارہ یہ ذکر کرتے نہ سنیں گی۔"

وہ اور بھی حیران ہوئی۔
"یا تو یہ شخص ضرورت سے زیادہ مہذب ہے یا پھر اسے خود پہ اعتماد نہیں۔ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا ہے جبکہ اس میں ایسا کیا نہیں جو کوئی لڑکی بقائمی ہوش و حواس اس کے ساتھ سے انکار کرے۔ اتنا پر اعتماد شخص۔ اتنا کامیاب انسان۔۔۔ اور ہمارے سامنے اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے اتنی انکساری اور غیر خود اعتمادی کا مظاہرہ۔۔۔ حیرت ہے؟۔"
گاڑی ایک سگنل پہ رکی تھی۔ گل مہر کا گھر اب پانچ سات منٹ کے فاصلے پہ تھا۔ شہزاد نے گل کے تاثرات جانچنے کی خاطر اس کی جانب چہرہ کیا۔ اب تک وہ بالکل سامنے دیکھتا ہوا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ لیکن گل مہر کی بجائے اس کی نظروں کی زد میں سڑک کے اس پار ایک شاپ کی سیڑھیاں اترتی دعا آ گئی۔ وہ اچانک اسے سامنے پا کے ساکت سا ہو گیا۔ گل مہر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں گردن موڑی ایک خوش اندام سادہ سی لڑکی ہاتھ میں کوئی گفٹ اور گلدستہ تھامے مسکراتی آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ سوالیہ نظروں سے شہزاد کو دیکھا۔
"آپ کی کوئی عزیزہ؟"
یہ سوال اسے تازیانے کی طرح لگا۔ وہ ایک مرد کو جھک کے اس کے لیے مرسڈیز کا دروازہ کھولتے دیکھ چکا تھا۔ گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔
"ایک تھرڈ کلاس سی سنگر ہے۔"
اور دھیرے سے آگے بڑھتی گاڑی سے یونہی بے ارادہ دوبارہ اس جانب دیکھتی گل مہر کی آنکھیں مارے حیرت کے پوری طرح کھل گئیں۔ وہ جس مرسڈیز کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تھی اس کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بابر ہمایوں مغل بیٹھ رہا تھا۔
اس کی بڑی بہن صاحبزادی یاسمین خانم کا شوہر۔۔۔
اس کا بہنوئی۔۔۔
اور اس کے ابا حضور کا چہیتا اور پسندیدہ داماد۔۔۔

☆ ☆ ☆

"پتہ نہیں یہ لڑکی ہر موقع پہ میرے اچھے بھلے موڈ کو غارت کرنے کہاں سے آن ٹپکتی ہے۔"
گل مہر کو ڈراپ کرنے کے بعد وہ بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا پھر رہا تھا۔
"جب بھی میں اس کھائی سے ابھرنے کی کوشش کرتا ہوں کوئی نہ کوئی چیز مجھے واپس نیچے کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ کتنا چھوٹا۔۔۔ کتنا ہلکا لگ رہا تھا مجھے اپنا آپ۔۔۔ اس کے سامنے۔۔۔ وہ اتنے اعلیٰ خاندان کی۔۔۔ اتنے قابل فخر پس منظر کی مالک۔۔۔ اور اگر اسے ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ میرا خاندان کیا ہے تو اس کا رد عمل کیا ہوتا؟ یہی خوف تھا جو مجھے اس کے سامنے اتنا کمزور کر رہا تھا۔ اعتماد سے کھڑا تک نہیں ہونے دے رہا تھا۔ ایسے میں بس یہ کسر باقی رہ گئی تھی کہ وہ سامنے آ جاتی۔۔۔"
وہ اندر ہی اندر الجھتا۔۔۔ خود سے لڑتا کتنی دیر بارش میں ڈرائیونگ کرتا رہا۔ جب گھر میں داخل ہوا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آج تو لاؤنج میں اکثر و بیشتر اس کا انتظار کرتی بلقیس بھی موجود نہ تھی۔ سبھی کمروں کی لائٹس آف تھیں۔ صرف کوریڈور' سیڑھیوں کے اوپر لگے نائٹ بلب آن تھے یا لاؤنج میں رکھا قد آدم لیمپ۔
اس نے ٹیوب لائٹس آن کیں۔
اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ خود کبھی بنانے کا تجربہ نہ ہوا تھا اور ماں کو جگانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ ایک تو آدھی رات کو صرف ایک کپ چائے کے لیے دن بھر کی تھکی ہاری ماں کو جگانا ویسے بھی معیوب حرکت تھی۔ دوسرا اس کی ذہنی حالت ہرگز اس قابل نہ تھی کہ وہ کسی کا سامنا کرتا یا سوالوں کا جواب دیتا۔ اس نے دوبارہ

سے لائیٹس آف کیں اور سارے لاک وغیرہ چیک کرنے کے بعد اپنے کمرے کا رخ کیا۔
روشنی بکھرتے ہی اس کی نظر بیڈ پہ پڑے گفٹ پیک اور بوکے پہ پڑی۔ کوٹ اتارتے اتارتے وہ رک گیا اور تیر کی طرح لپکا۔ سرخ ادھ کھلی گلاب کی کلیوں کا بڑا خوبصورت سجا ہوا گلدستہ تھا جس کی بھینی مہک نے سارے کمرے میں خوشگواریت پھیلا رکھی تھی۔
چند لمحوں تک ان کلیوں کو گھورنے کے بعد اس نے گفٹ پیک کے اوپر رکھے کارڈ کو اٹھایا۔
اس کا اندازہ درست تھا۔ یہ کارڈ۔ یہ پھول۔ یہ تحفہ۔ دعا کی طرف سے تھا۔
"مگر وہ یہاں کب آئی۔ پارٹی کے شروع ہونے سے پہلے بھی میں نے گھر فون کیا اور ختم ہونے کے بعد۔ کلب سے کو لے کر نکلتے ہوئے بھی فون کیا، کسی نے ایسا ذکر نہیں کیا، اور کچھ دیر قبل وہ خود مارکیٹ میں اپنے کسی قدر دان کے ساتھ شاپنگ کرتی پھر رہی تھی۔"
اس کی یہ الجھن بھی دور ہو گئی جب بیڈ پہ پڑی ایک رسید اٹھا کے دیکھا۔ وہ خود نہیں آئی تھی۔ اس نے کوریئر کے ذریعے یہ گفٹس بجھوائے تھے۔ شہزاد نے موبائل پہ کل والا نمبر ملایا۔
"جی چھاجی۔" دوسری طرف پہلی بیل کے بعد ہی کال ریسیو کرتے ہوئے دعا نے بے تابی سے کہا۔ وہ لب بھینچے خود پہ ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔
"چھاجی تحفہ پسند آیا؟۔ اور وہ پھول۔؟"
"میری پسند ناپسند کو چھوڑو کیا تمہیں اپنے عاشق کا دیا یہ تحفہ پسند نہیں آیا تمہارے معیار پہ پورا نہیں اترا جو تم نے خود رکھنے کی بجائے میرے منہ پہ مار دیا۔"
"چھاجی؟" وہ بے یقینی سے کراہی۔
"یہی پھول تم اس شخص کے ساتھ بڑے فخر سے لیے پھر رہی تھیں۔ اور اب یہی ایک تعفن زدہ چیز کی طرح میرے کمرے کو ناپاک کر رہے ہیں۔ کاش تم سامنے ہوتیں۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے ان چیزوں کو گھر سے باہر کوڑے کے ڈھیر پہ پھینکتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہوتی۔"

● ● ●

اس قدر حقارت۔
اس درجہ نفرت۔
اتنی کراہیت کا اظہار۔
اس کے ہاتھ میں فون کانپ کے رہ گیا۔ دوسری جانب سے کال ڈس کنیکٹ ہو چکی تھی لیکن دعا کے کان میں اب تک شہزاد کے زہر میں بجھے الفاظ گونج رہے تھے۔
"یہی پھول ایک تعفن زدہ چیز کی طرح میرے کمرے کو ناپاک کر رہے ہیں کاش تم سامنے آتیں تمہاری آنکھوں کے سامنے ان چیزوں کو گھر سے باہر کوڑے کے ڈھیر پہ پھینکتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہوتی۔"
"مگر کیوں؟ کیا وجہ ہے اتنی نفرت کی۔ اتنی بیزاری کی؟ کیا صرف میری محبت اور اس معصوم سی محبت کا نو عمری والا بے دھڑک اظہار کیا یہ جرم اتنا ہی بڑا ہے چھاجی کہ آپ اب تک مجھے معاف نہیں کر پارہے۔ یہ تو سچ ہے کہ محبت کے بدلے محبت ہی ملے، یہ ضروری نہیں، لیکن محبت کے بدلے نفرت ملے، یہ کہاں کا اصول ہے؟
چھاجی! کیا آپ کے پاس مجھے دینے کے لیے بس یہی جذبہ ہے؟ اور کیا آپ کے پاس بھی بس۔۔۔" وہ بلکتی جارہی تھی اور کمرے کی تنہائی سے سوال کرتی جارہی تھی۔
"میں نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں تھا چھاجی میری اتنی اوقات کہاں؟ کوئی بھکاری در پہ آئے تو دینے کے لیے کچھ نہ ہو تب بھی لوگ اسے دھتکارتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، لمحہ بھر کے لیے خوف خدا سے لرز لرز جاتے ہیں اور میں تو بھکاری بھی نہیں میں نے تو آپ سے بھیک میں بھی کچھ نہیں مانگا۔ الٹا میں تو دے رہی ہوں عقیدت محبت

آپ کو ضرورت نہیں، نہ سہی لوٹا دیتے مگر محبت کو تعفن زدہ چیز کہہ کے اس جذبے کی توہین تو نہ کرتے، مجھے پذیرائی نہ سہی، مروت ہی نصیب ہو جاتی۔"
اس کے آنسو بہہ بہہ کے خشک ہو گئے مگر اب بھی کوئی کوئی ہچکی اس کے خشک لبوں سے آزاد ہو کے احساس دلا جاتی کہ اندر اب بھی بارش جاری تھی۔
"اماں، میرا نام کس نے رکھا تھا۔"
اسے یاد تھا، بہت بچپن میں ایک بار اس نے ماں سے یہ سوال کیا تھا۔ اس کی ساری ہم جولیوں، ہمسائیوں کے نام اس کے نام سے الگ تھے، شکیلہ، رانی، شہزادی، کوثر، چھمی، سب سنے سنے سے نام اور اس کا نام دعا نور بالکل الگ سا لگتا۔
"میں نے اور کس کو پڑی تھی، تمہارا نام رکھتا۔" اماں نے برتن مانجھتے مانجھتے تلخی سے سر جھٹک کے جواب دیا تھا۔
"کیوں۔"
"باقی سب کو تو لڑکے کی آس تھی، اس لیے تمہاری دادی، دادا، پھوپھی، اور تمہارے ابا بھی تمہاری جگہ لڑکا ہوتا تو سب بڑھ چڑھ کے نام بتاتے، تم ہوئیں تو جیسے سانپ سونگھ گیا، میں بھی نہ رکھتی تو کیا بے نام ہی رہنے دیتی۔"
"اوہو اماں، میں نے یہ نہیں پوچھا کہ نام آپ نے کیوں رکھا۔ میں تو پوچھ رہی ہوں یہ والا نام کیوں رکھا۔" اس نے اپنے "کیوں" کی وضاحت پیش کی۔
"کیوں؟ تمہیں یہ نام پسند نہیں۔" ایک "کیوں" اماں کی جانب سے بھی آیا۔
"اوں۔۔۔ پتہ نہیں۔" کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ "مگر یہاں کسی کا نام ایسا نہیں دو تو شازیہ ہیں، رانی پوری تین ہیں، دو گلی میں، ایک بڑی پھوپھی کے گھر، شہزادی بھی ایک سامنے والوں کی لڑکی ایک میرے اسکول میں، ایک جیسے ناموں والی۔ مگر دعا نام کسی کا نہیں۔ ایسا نام کیوں رکھا تھا اماں۔"
"پگلی، اس لیے کہ میری بیٹی جیسی بھی تو اور کوئی نہیں۔"
برتن دھل چکے تھے۔ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے انہوں نے ننھی دعا کو گود میں لیا اور اس کے ماتھے سے بال پیچھے کی طرف سہلانے لگیں۔ دعا کو اماں کی بات کا یقین آ گیا۔ یقیناً وہ سب سے الگ تھی، جبھی تو اماں اتنی مصروف رہنے کے باوجود اسے گود میں بٹھاتی ہیں، گھنٹہ لگا کے اس کے بالوں کی مالش کرتی ہیں، ہاتھ سے نوالے بنا بنا کے منہ میں ڈالتی ہیں۔ رات کو دیر تلک تھپک تھپک کے لوریاں اور کہانیاں سناتے ہوئے سلاتی ہیں جبکہ اور کسی کی اماں کو اس نے ایسا کرتے نہ دیکھا تھا، نہ گود میں بٹھا کے پیار کرتے ہوئے، نہ لاڈ اٹھواتے ہوئے اور وہ سب سے الگ تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ سارے محلے میں بس ایک وہی تھی جس کا کوئی بہن بھائی نہ تھا، باقی سب کے تین تین بھائی اور چار چھ بہنیں تو ضرور ہی تھیں۔
"اماں، پھر بھی۔۔۔"
"میں یہ بھی چاہتی تھی کہ میں رہوں یا نہ رہوں، اس نام کے سہارے میری دعائیں اور ان کا نور ہمیشہ تمہیں اپنے حصار میں رکھے۔"
اماں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے، اس کے کان میں تقریباً سرگوشی کرتے ہوئے بے حد مدھم لہجے میں یہ کہا تھا، جو اس وقت وہ سمجھ سکی تھی نہ اب سمجھنے کے قابل تھی۔
"اور پتہ نہیں اماں، وہ دعائیں کیا تھیں؟ پتہ نہیں آپ نے اپنے رب سے میرے لیے کیا مانگا ہو گا۔ میرے اچھے نصیب، اونچے مقدر، بلند بختی، میرا گھر بس جانے کی دعا یا پھر وہ سب جواب مجھے مل رہا ہے۔ شہرت، عروج، مشہوری، بے شمار پرستار، نہیں ہرگز نہیں۔ اماں مجھے یقین ہے آپ نے میرے لیے ایسی زندگی کے خواب تو کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ نہ یہ آپ کی خواہش رہی ہو گی۔ پھر آپ میرے لیے ایسی دعا کیوں کرتیں؟ پھر وہ دعائیں کیا

تھیں جواب تک میرے گرد حصار نہیں کھینچ سکیں۔ وہ کیسا نور تھا جواب تک میری تلاش میں ہے۔ آپ کی دعا مٹی میں مل گئی ہے اماں۔ اس نور کو اندھیرے چاٹ گئے۔"

* * *

اس کے کہنے پہ شہزاد نے اسے مین روڈ پہ ہی ڈراپ کر دیا تھا دوپٹہ سلیقے سے سر پر درست کرتی ہوئی وہ نیچے اتری۔ چہرہ پہلے ہی ہمہ وقت اسکارف کے ہالے میں لپٹا رہتا تھا' البتہ آتے جاتے ہوئے راستے میں وہ بڑے دوپٹے کو بھی چادر کی طرح پھیلا لیا کرتی تھی۔

پچھلے آٹھ منٹ سے دونوں کے مابین کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی۔ گل تو پہلے ہی اس طرح گھر سے بغیر اجازت اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر آنے والی اپنی حرکت سے خائف تھی اور اندر ہی اندر الجھن کا شکار بھی۔ اوپر سے شہزاد کے پرپوز کر دینے۔ ایک فطری جھجک نے اس کے لبوں پہ قفل لگا دیے تھے۔ لیکن حیرت انگیز طور پہ شہزاد کے رویے میں ایک واضح تناؤ کی کیفیت تھی۔ جسے وہ زیادہ اس لیے محسوس نہ کر سکی کہ اس کے اپنے محسوسات اس وقت بے شمار حیرتوں کی زد میں تھے۔

شہزاد ملک کا اظہار پسندیدگی اور پرپوز کرنا اس کے لیے غیر متوقع تھا' حیرت میں آنا ہی تھا۔ اس کی بات کے جواب میں اپنے رد عمل پہ اس کی حیرت بھی بجا تھی۔ وہ چونکی ضرور۔ مگر نہ طیش میں آئی نہ ناگواری کا اظہار کیا' اور نہ ہی دل کو کسی قسم کی خوشی یا تسکین محسوس ہو رہی تھی۔

اس پہ مستزاد یہ کہ اس نے بابر ہمایوں مغل کو ایک مہنگے شاپنگ سینٹر سے نکل کر ایک شاندار سی گاڑی میں ایک حسین و نوعمر سی لڑکی کی سنگت میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ وہ لڑکی جس کے بارے میں شہزاد نے بڑے زہر خند لہجے میں انکشاف کیا تھا۔

"ایک تھرڈ کلاس سی سنگر ہے۔"

اور اس کے خیال میں تو اس کا بہنوئی بے روزگار' قلاش اور مفلس بہنوئی ایک تھرڈ کلاس سنگر کی کمپنی افورڈ کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔ کجا کہ یہ نئی چمکتی گاڑی اور شاپنگ۔ وہ رہ رہ کے صاجزادی یاسمین کا تصور کر رہی تھی۔ حسرتیں جن کے تھکے ماندے چہرے پہ رقم ہو کے رہ گئی تھیں اور وہ بچے محرومیوں اور تشنگیوں نے جن کے بچپن کی ساری شگفتگی نچوڑ کے رکھ دی تھی۔ ان بجھے ہوئے چہروں کے بعد جب بابر ہمایوں کا چھلکتا انداز اور ٹھاٹھ باٹ یاد آتے تو عمیص کے وہ دعوے اسے سچ لگنے لگتے جو اس نے پچھلی رات ابا حضور کے سامنے کیے تھے

اسی ادھیڑ بن میں کب اس کے گھر کے نزدیک کار آن پہنچی اسے پتہ ہی نہ چلا۔

"اب کہاں سے ٹرن لینا ہے۔"

راؤنڈ اباؤٹ کے قریب رفتار ہلکی کر کے شہزاد نے پوچھا تو وہ چونک اٹھی۔

"جی بس۔ یہیں اتار دیجیے۔"

شہزاد نے گھر کے آگے نہ اترنے کی وجہ تک دریافت نہ کی اور کار ایک سائیڈ پر روک لی۔

"شکریہ سر۔" آگے بڑھنے سے قبل اس نے فارمیلٹی نبھانے کی غرض سے شکریہ ادا کیا مگر شہزاد فقط سر ہلا کے رہ گیا اور ایک جھٹکے سے اس کی کار آگے بڑھ گئی۔ اس کے چہرے کا تناؤ' آنکھوں کی الجھن اور معنی خیز خاموشی قابل غور تھی لیکن گل مہر کے پاس اس وقت غور کرنے کے لیے اور بہت کچھ تھا۔

دل ہی دل میں کسی کا سامنا نہ ہونے کی دعا کرتی ہوئی وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی۔ آنگن پار کر کے وہ لمبی سی نیم تاریک راہداری سے دبے پاؤں گزر رہی تھی جب کچن سے چائے کا مگ لے کر نکلتی موتیا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو گل ہڑبڑا کے رہ گئی مگر پھر اطمینان بھرا سانس لیا۔

"او تم ہو ہم سمجھے شاید امی حضور۔" موتیا کو ہینڈل کرنا اس کے لیے قدرے آسان تھا۔

"یہ تم اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟ پتہ بھی ہے میں نے کیا کیا جھوٹ بولے ہیں تمہارے لیے۔" وہ دبی آواز میں گھرکنے لگی۔

"اندر چلو' بتا دیتے ہیں۔" وہ اس کا بازو پکڑ کے اندر کمرے کی جانب گھسنے لگی۔

"امی حضور سو گئی ہیں کیا؟"

"مجھے کیا پتہ۔ ویسے امید تو نہیں۔ بے شک تمہاری خاطر میں نے جھوٹ بول کے اپنے گناہوں کی گٹھڑی کو بھاری ضرور کیا ہے لیکن اس کا خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔ انہیں میں نے کہہ دیا تھا کہ منزی کے گھر کوئی گیٹ ٹو گیدر ہے اور دیر ہو جانے کی صورت میں وہ خود تمہیں چھوڑنے آئے گی لیکن ان کے پھیرے تھے کہ ختم نہ ہو رہے تھے۔ بار بار دروازے تک جاتیں' کبھی برآمدے کی جالی سے لگ کے کھڑی ہو جاتیں۔"

"شکر ہے خدا کا کہ اس وقت کم از کم وہ دروازے پہ نہیں تھیں۔"

گل مہر نے جھرجھری لی۔ اگرچہ وہ مین روڈ پہ اتری تھی مگر اتنی رات کو اسے سنسان گلی میں اکیلے پیدل آتے دیکھ کے بھی ان کا غصے میں آنا یقینی تھا۔

"کیوں' ایسا کیا کر کے آ رہی ہو" وہ مشکوک ہو گئی۔

"اس لیے کہ ہم منزی کے ساتھ نہیں آئے تھے۔"

"تو کس کے ساتھ آئی ہو؟" وہ آسانی سے ٹلنے والی نہ تھی۔

"ٹیکسی پہ۔" اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ لیکن یہ جھوٹ بھی سچ سے کم دھماکا خیز ثابت نہ ہوا۔ صاجزادی حرمت النساء کے لیے' پتہ نہیں کب وہ کمرے سے نکل آئیں۔ غالباً گل کے اب تک گھر نہ آنے کی فکر انہیں چین نہ لینے دے رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی کو دیکھنے نکلی تھیں کہ کچن کے دروازے پہ اسے موتیا کے ساتھ کھڑے باتیں کرتے دیکھ کے ان کی جان میں جان آئی۔ کچن کا بلب جل رہا تھا۔ مگر راہداری کے دوسری جانب تاریکی ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ان کے اتنے قریب آنے کا اندازہ نہ کر سکیں۔

"کیا۔۔۔؟ صاجزادی گل مہر آپ اتنی رات گئے ایک اجنبی مرد کے ساتھ ٹیکسی میں تنہا بیٹھ کے آ رہی ہیں؟ ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی؟"

"مجبوری تھی امی حضور" "اجنبی" ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ ہی آنا پڑا' گھر کا جانا پہچانا ٹیکسی ڈرائیور کہیں نظر ہی نہ آیا۔" وہ ایک لمحے کو سٹپٹائی تو ضرور مگر خود کو سنبھال کے اپنے مخصوص نوکیلے انداز میں گویا ہوئی۔ وہ دونوں آسانی سے سمجھ گئیں کہ اس کا اشارہ کس جانب تھا۔

"آپ ہمارے سوال کا جواب دیجیے۔ آپ کے ابا حضور کو خبر ہو گئی تو جانتی ہیں ان کا رد عمل کیا ہو گا۔ شرفاء کی بچیوں کو کیا یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آدھی آدھی رات تک غیر لوگوں کی محفلوں میں مگن رہیں اور ویران راستوں پہ اکیلی آئیں جائیں۔"

"منزی آپ کے لیے کب سے غیر ہو گئی۔ ہم پہلی بار تو اس کے گھر نہیں گئے تھے۔"

"منزی غیر بچی نہیں لیکن کون جانے اس کے ہاں کس نوعیت کی محفل تھی کسی قماش کے لوگ تھے۔ آپ بے شک اس کے ہاں آتی جاتی رہتی ہیں اور ہماری جانب سے کبھی ایسی کوئی پابندی بھی آپ پہ نہیں لگائی گئی۔ لیکن ہر چیز ایک حد کے اندر اچھی لگتی ہے۔ آپ کو سختی سے کہا جا چکا ہے کہ بچیوں کا مغرب کے بعد گھر سے باہر رہنا ہمارے خاندان میں منع ہے۔ پھر بھی آپ بغیر کسی جھجک اور خوف کے نہ صرف آدھی رات تک گھر سے باہر رہیں بلکہ ایک غیر اور ناقابل بھروسہ شخص کے ساتھ واپس آئیں۔"

عموماً صاجزادی حرمت النساء تحمل مزاجی یا بردباری کا ہی مظاہرہ کرتی آئی تھیں۔ کم ہی اتنے سخت الفاظ استعمال کیا کرتیں لیکن آج وہ گل مہر کی جسارت نظر انداز کرنے کے موڈ میں نہ تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ یہ معاملہ صاجزادہ نفیس علی خان کے علم میں لانے سے پہلے اپنے طور پہ نمٹانا چاہتی ہوں۔ جانتی تھیں کہ گل مہر

کے ساتھ جب تک سختی سے کام نہ لیا جائے گا وہ تو ان کی نصیحت اور روک ٹوک پہ توجہ نہ دے گی۔ جب سے وہ ملازمت کرنے لگی تھی اس کی ہٹ دھرمی میں ایک عجیب سی سرکشی کی آمیزش سے وہ خائف رہنے لگی تھیں۔

"اور کچھ نہیں تو کم از کم اس بات کا ہی لحاظ کر لیجئے کہ آپ کے نہ صرف والد حضور گھر پہ موجود ہیں بلکہ صاحبزادی یاسمین بھی آئی ہوئی ہیں۔ بیاہتا بیٹیوں کے میکے کے حوالے سے لاکھوں بھرم اور ہزاروں مان ہوتے ہیں۔ آج بابر میاں کا یہاں قیام کا ارادہ تھا' وہ تو اچھا ہوا کہ وہ ابھی تک آئے نہیں۔ ورنہ ان کے سامنے آپ یوں اندھیرے میں دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتیں تو وہ کیا گمان کرتے۔"

اب تک تحمل سے امی حضور کی ڈانٹ سنتی گل مہر کا صبر جواب دے گیا۔

"مثلاً ــــ مثلاً" کیا گمان کرتے وہ؟"

"وہ اس گھر کے داماد ہیں اور نہ صرف نازک طبع ہیں بلکہ ہماری طرح نجیب الطرفین بھی۔ آپ کے ابا حضور کی طرح اونچ نیچ اور رکھ رکھاؤ کے بارے میں حد درجہ حساس۔ ان کے سامنے ہمیں کس قدر شرمندگی ہوتی۔ پہلے ہی آپ کی ملازمت کے بارے میں ان کے اعتراضات کے جواب دے دے کے بے چاری صاحبزادی یاسمین ہلکان ہو چکی ہیں۔"

"تو ضرورت کیا ہے صفائیاں پیش کرنے کی۔ وہ کون ہوتے ہیں ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے والے۔" ایک تو بابر ہمایوں مغل سے ویسے ہی گل مہر کے تعلقات خاص اچھے نہ تھے اور اب جو منظر دیکھ کے وہ آ رہی تھی' اس کے بعد تو وہ کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

"اور ہماری ملازمت پہ اعتراض کرنے کا حق انہیں کس نے دیا ہمارے گھر میں کون ہے جو ان کے معمولات پہ نظر رکھے ہوئے ہے یا ان کے کرتوتوں پہ اعتراض کر رہا ہے کوئی نہیں پھر انہیں بھی چاہیے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔"

"یہ آپ کس قسم کی زبان استعمال کر رہی ہیں صاحبزادی گل مہر۔" وہ دھیمی آواز کو دبنگ لہجے سے ہم آہنگ کرتی ہوئی بولیں۔

"ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں امی حضور جسے سننے کا حوصلہ اس گھر کے مکینوں میں کم ہی پایا جاتا ہے۔ کل عمیص نے جو کچھ کہا ابا حضور اس کی تاب نہ لا سکے۔ آج ہم جو کہنے جا رہے ہیں' یقیناً آپ تسلیم کرنے سے انکاری ہوں گی لیکن یہ بالکل سچ ہے۔ جس نجیب الطرفین اور رکھ رکھاؤ والے شریف داماد کے سامنے آپ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی ہیں۔ وہ موصوف اس وقت ایک حسین گلوکارہ کے ساتھ سیر سپاٹوں اور تفریحات میں مگن ہیں۔ وہ جن کے بچوں کے پیوند لگے کپڑوں اور بیوی کے مفلس زدہ چہرے کو دیکھ دیکھ کے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں' انہیں بہترین کلف زدہ لباس میں' قیمتی سگریٹ پیتے ہوئے ایک بڑی سی گاڑی میں ایک حسین و طرحدار دوشیزہ کے ساتھ گھومتے ہوئے ہم نے ان آنکھوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ ہے کسی میں حوصلہ ان سے جواب طلبی کرنے کا؟"

وہ چند لمحے تک سوال کرنے کے بعد ان کے چہرے پہ آنکھیں گاڑ کے کھڑی رہی پھر تنتناتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ صاحبزادی حرمت النساء کی بے یقین اور پر سوچ نگاہیں فرش پہ گڑی تھیں اور موتیا دم سادھے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں صاحبزادی یاسمین دروازے کو تھامے سفید چہرے کے ساتھ ہکا بکا کھڑی تھیں۔

❊ ❊ ❊

"کمال ہے اکیلی چلی گئیں۔ اگر بابر بھائی کو نہیں آنا تھا تو کم از کم وہ رک کے میرا انتظار تو کرتیں۔" عمیص کافی سویرے ہی کسی کام سے گھر سے نکل گیا تھا۔ دوپہر ڈھلے واپس آیا تو یاسمین آپا کی واپس گھر روانگی کی خبر سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

"تمہارے آنے کا بھی تو پکا پتہ نہیں تھا کہ کب آتے ہو۔ انہوں نے تو ناشتا تک نہیں کیا کہہ رہی تھیں دن چڑھ گیا تو گرمی بڑھ جائے گی۔ دلگیر رکشہ لے آیا تھا۔ امی حضور نے تو بہت روکنے کی کوشش کی بلکہ تائی حضور نے تو اس شرط پہ رکشہ پہ جانے کی اجازت دی کہ وہ دلکش کو یہیں چھوڑ جائیں۔ اس کا رکشے پہ جانا انہیں گوارا نہیں تھا۔"

"چلو اچھا ہے' دلکش کچھ روز یہیں رہ جائے۔ تم اسے پیپرز کی تیاری وغیرہ بھی کرا دینا۔ آپا کوشش تو کر رہی ہیں مگر بابر بھائی کے سامنے اپنے فیصلے خود کرنے کی ہمت وہ شاید کبھی بھی پیدا نہ کر سکیں۔ دلکش یہاں کچھ عرصہ رہ جائے تو میں خود ہی اس کا داخلہ بھجوا کے پرچے دلوا دوں گا۔"

"اتنا وقت ہے تمہارے پاس؟" موتیا نے پوچھا۔ "آج کل کسی کے ہاتھ ہی کب آتے ہو؟ پتہ نہیں کن فضاؤں میں اڑے اڑے پھر رہے ہو؟"

"اڑان بھرنے کا وقت ابھی بہت دور ہے عزیزہ' فی الحال تو زمین پہ قدم جمانے کی تگ و دو میں لگا ہوں۔" دونوں ہاتھ باندھ کے سر کے پیچھے تکیے کی طرح رکھتے ہوئے تخت پہ نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"ہاں ــــ تم نے بتایا نہیں کیا بنا؟ کہاں تک پہنچا تمہارا کام؟"

"دکان کی چابیاں آج شام مل جائیں گی۔ چار ہزار روپیہ ماہوار کرایہ طے ہوا ہے۔"

"اتنا زیادہ کرایہ؟ اتنے میں تو دو تین کمروں کا مکان کرائے پہ مل جاتا ہے۔ توبہ! اتنی سی دکان کے چار ہزار۔" وہ چلائی۔

"کمرشل جگہ کی ویلیو ہی کرائے کا تعین کرتی ہے۔ اچھی خاصی معروف شاہراہ پہ اتنی بڑی بلڈنگ بنائی ہے۔ اس پلازہ میں تھرڈ فلور پہ بھی چار ہزار کرایہ پہ دکان ملتی ہے۔ مجھے تو گراؤنڈ فلور پہ بالکل فرنٹ پہ دکان ملی ہے۔ اس سے بزنس پہ بھی اثر پڑتا ہے۔ فرنٹ پہ جگہ کی ویلیو زیادہ ہے۔ دوستی کی وجہ سے کرایہ تقریباً" آدھا طے ہوا ہے۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ اتنا کرایہ ہر ماہ آسانی سے نکل آئے گا کیا؟"

"ہاں اگر کام چل نکلے تو کوئی مشکل نہیں۔"

"اور اگر خدانخواستہ ــــ"

"تم اپنے "خدانخواستہ" پاس سنبھال کے رکھو۔" وہ غصے میں آ گیا۔ "ڈرانے کے علاوہ اور بھی کچھ آتا ہے تمہیں۔"

"انسان کو کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو سامنے رکھنے چاہئیں۔"

"بزنس کوئی بھی ہو' ہزاروں میں شروع کیا جائے یا کروڑوں کے سرمائے سے غیر یقینی ہی ہوا کرتا ہے۔ سو فیصد اعتماد کے ساتھ تو آپ کوئی بھی کام شروع نہیں کر سکتے اور اگر ہر شخص اس کا آغاز کرنے سے پہلے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تناسب کرنے لگے۔ تو گھبرا کے آغاز سے پہلے ہی انجام تک نوبت آ جائے گی۔ مجھے اللہ سے پوری امید ہے اور اپنی ہمت اور صاف نیت کا اعتماد بھی کہ کامیابی میرے قدم چومے گی۔"

"بشرطیکہ تمہارے پیر دھلے ہوئے ہوں۔ کامیابی خاصی نفیس طبع واقع ہوئی ہے' یوں دھول مٹی میں اٹے بساند مارے قدم وہ ہرگز نہ چومے گی۔" موتیا نے ہنسی دباتے ہوئے کہا تو وہ مصنوعی خفگی سے اس پہ آنکھیں نکالنے لگا۔

"لیکن سوچنے والی بات ہے کہ کیا پی۔ سی۔ او کے ذریعے اتنی آمدنی ہو جائے گی؟"

"امید تو سو فیصد ہے۔ ساتھ میں نیٹ کارڈز' کالنگ کارڈز اور مختلف موبائل کمپنیز کے پے کارڈ رکھ لوں گا۔ وہ تو بکتے ہی ہیں ہاتھوں ہاتھ۔ سوچ رہا ہوں اور کیا اضافہ کروں اسٹور میں کہ جو منافع بخش بھی ہو اور اس پہ چچا حضور کو اعتراض بھی نہ ہو۔"

"کسی نیوز ایجنسی سے بات کر کے اخبارات وغیرہ رکھ لو ہفتہ وار اور ماہوار شائع ہونے والے میگزینز اور [illegible] وغیرہ۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے مگر پتہ کرنا پڑے گا کہ اس میں فائدہ بھی ہے یا نری کھپ ہی کھپ۔ اخبار تو ہر گھر میں صبح صبح پہنچ ہی جایا کرتا ہے۔ دکانوں سے آکر کون خرید تا ہے۔ اور رسالے لوگوں میں اب پڑھنے پڑھانے کا رجحان کم ہو گیا ہے' وقت کی کمی بھی ہے۔"

"خیر ایسی بات بھی نہیں۔ جو مطالعے کے شیدائی ہیں' اب بھی ہر حال میں کتابوں سے عشق نبھانے کا وقت نکال ہی لیتے ہیں۔ میڈیا کی ترقی اور بے شمار نیوز چینلز کے ہوتے ہوئے بھی بیک وقت درجن بھر روزنامے شائع ہوتے ہیں بہر حال تم دو چار اور لوگوں سے مشورہ ضرور کر لو۔"

"میرے ایک دوست نے تو گفٹ آئٹمز اور اسٹیشنری وغیرہ رکھنے کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن اس پہ عمل کرنے میں دو مسئلے درپیش ہیں' ایک تو چچا حضور کے متوقع اعتراضات اور دوسرا سرمائے کی کمی۔"

"ابا حضور کو جس حد تک اعتراض کرنا تھا' وہ کر چکے عمیص۔" موتیا سنجیدہ ہو گئی۔

"نہیں اعتراض تمہارے اس اقدام پہ تھا۔ جب تم اس اعتراض کو خاطر میں نہیں لائے تو پھر اب مزید کچھ مت سوچو۔ اگر ابا حضور مفاہمت کر بیٹھے ہیں یا یوں کہو کہ بدلتے وقت کے تقاضوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی سمجھوتہ کر رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے اب ان کے لیے تمہارا کوئی بھی کام غیر متوقع نہیں ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو موتیا لیکن جہاں تک ممکن ہوا' میں نے ہمیشہ ان کی دل آزاری سے اجتناب کیا ہے۔ کیا دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں باغی ہوں ان کے اصولوں سے' ان کے نظریات سے اور محض ضد میں آکر ان کے قواعد و ضوابط سے مخالفت کرتا ہوں؟ نہیں موتیا۔ بالکل بھی نہیں۔ میں ان کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی اپنے ابا حضور کی کر سکتا تھا ان کی زندگی میں۔

میں ان سے اتنی ہی محبت اور عقیدت رکھتا ہوں جتنی کہ تم ان کی حقیقی اولاد ہو کے ان سے رکھتی ہو۔ مجھے ان کے قواعد و نظریات سے چڑ نہیں۔ ہاں کہیں کہیں میں ان کو شدت پسند ضرور محسوس کرتا ہوں۔ وہ اس معاملے میں انتہا پہ چلے جاتے ہیں اور میں صرف عقیدت' احترام اور محبت کی وجہ سے کچھ ایسا غلط ہوتے نہیں دیکھ سکتا جو ہمارے اور ہمارے خاندان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ بس یہی اختلاف ہے میرے اور ان کے درمیان وہ "نام" کی بقا کو اولیت دیتے ہیں جبکہ میں "وجود" کو اہم جانتا ہوں۔ وہ "شناخت" کو قائم رکھنا ضروری جانتے ہیں جبکہ میرے خیال میں پہلا حق "زندگی" کا بنتا ہے۔ وہ خاندان کو عزیز جانتے ہیں جبکہ میں "خاندان والوں" کو۔ ان کے نظریات سے میں ہرگز اختلاف نہ کرتا اگر وہ زندگی اور مستقبل پہ اثر انداز نہ ہو رہے ہوتے۔ مجھے مخالفت برائے مخالفت کا شوق بالکل نہیں۔ نہ ہی نوجوان نسل کا نمائندہ باغی کہلانے کا مراق ہے۔

مانتا ہوں اس کام کے آغاز کے لیے میں نے ان کی ناراضگی کی پرواہ نہیں کی۔ ان کی مخالفت بھی مول لی ہے مگر صرف اس لیے کہ اس معاملے میں خود کو حق پہ سمجھتا ہوں اور یہ ضروری بھی تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اب میں صرف ان کو چڑانے کے لیے ہر ایسا کام کروں جس سے ان کی ناراضگی کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جائے۔ ورنہ کرنے کو تو بے شمار کام ہیں جو پی سی او کی نسبت زیادہ منافع بخش ہیں۔"

"کبھی کبھی ایسا لگتا ہے عمیص کہ میرا تمہیں مکمل طور پہ جاننے کا دعویٰ غلط ہے۔" موتیا نے اس کی تفصیلی بات سن کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"موتیا شام کی چائے بنانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔" گل مہر نے کمرے سے نکل کر انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا۔ ایک تو رات کو دیر سے واپسی ہوئی پھر آتے ہی صاحبزادی حرمت النساء سے مڈبھیڑ اور تلخ گفتگو کی کوفت اس پہ سوا شہزاد ملک کی باتیں وہ ساری رات سو نہ سکی۔ صبح ناشتے کے بعد بھاری ہوتے سر اور جلتی آنکھوں کی تکلیف سے نڈھال ہو کے اس نے سر درد کی ٹیبلٹ کے ساتھ ایک نیند کی گولی بھی لے لی اور کمرہ بند کر لیا۔ اب کئی گھنٹوں کی نیند لینے کے بعد اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

"شام تو ہو لینے دو۔ تمہاری تو اب صبح ہوئی ہے۔"

"آؤ گل بیٹھو تم سے بھی مشورہ لینا تھا۔" عمیص نے اسے دیکھ کر ٹانگیں سمیٹتے ہوئے تخت پہ جگہ بنائی۔ خلاف معمول نخوت سے ناک چڑھانے کی بجائے وہ آگے بڑھ آئی البتہ تخت پہ بیٹھنے کی بجائے نزدیکی موڑھا گھسیٹ لیا۔

"یہ تم کب سے اوروں سے مشورے مانگنے لگے؟" اس نے شاہانہ انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائی اور اپنے گھنگھریالے بالوں کے بکھرے سنہری پیچھے سمیٹ کر کلپ میں قید کرنے لگی۔

"اوروں سے تو میں اب بھی کچھ نہیں مانگتا۔ مشورہ تک نہیں البتہ "اپنوں" کے آگے ہاتھ پھیلا ہی رہتا ہے۔"

اس دوران موتیا نامحسوس انداز میں ان دونوں کے درمیان سے اٹھ گئی۔

"کل تم کہاں تھیں؟"

"ایک پارٹی میں اور ہم کیا بتائیں کیسی زبردست پارٹی تھی۔ کیا گیدرنگ تھی۔ سچ بہت انجوائے کیا ہم نے۔"

"چلو اچھا ہے' تمہیں بھی انجوائے کرنا آگیا اور وہ بھی چار لوگوں کی موجودگی میں۔" اس نے گل مہر کی آدم بیزاری پہ چوٹ کی۔

"ڈیپینڈ کرتا ہے کہ وہ چار لوگ کون ہیں۔" اس نے برابر کا وار کیا۔

کچن میں چولہے پہ چائے کا پانی رکھتے ہوئے موتیا نے سامنے لگی کھڑکی کی جالی سے برآمدے کے اس کونے کا منظر دیکھا۔ آواز اس تک نہیں آرہی تھی مگر وہ بخوبی اندازہ کر سکتی تھی کہ ان دونوں کے مابین کس نوعیت کی گفتگو ہو رہی ہوگی۔

وہی گل مہر کی ازلی خود نمائی اور خود ستائشی کا اظہار وہی عمیص کا ہمیشہ کی طرح فدویانہ انداز اور ڈھٹائی۔

"زندگی کے باقی معاملات میں حد سے زیادہ باشعور' خوددار اور غیور ہونے کا دعویٰ اور عملی مظاہرہ کرنے والے صاحبزادہ عمیص علی خان صاحب کاش کچھ خودداری اور عزت نفس آپ اس معاملے کے لیے بھی بچا کے رکھ لیتے۔"

اس نے کھوئے کھوئے انداز میں دیکھتے ہوئے زیر لب سرگوشی کی۔

چائے تیار ہو چکی تھی۔ اس نے تین کپ ٹرے میں رکھے اور ایک چھوٹی پلیٹ میں نمکین تلی ہوئی دال مونگ ڈال کر باہر لے آئی۔

"کیوں بھئی' پھر کیا مشورہ دیا گل نے؟" اس نے آتے ہی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"کیسا مشورہ؟" اس نے ابرو چڑھائے۔

"عمیص کو پی۔ سی۔ او کے لیے اسٹور مل گیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جگہ خاصی ہے' کیوں نہ پی۔ سی۔ او کے ساتھ ساتھ اسی جگہ پہ کوئی اور بھی کام کیا جائے۔ ہم دونوں تمہارے آنے سے پہلے یہی ڈسکس کر رہے تھے۔ میری رائے تو یہ تھی کہ میگزینز' اسٹیشنری وغیرہ ساتھ رکھ لی جائے۔ تم کیا کہتی ہو؟"

"سوری' ہمیں دکانداری سے کوئی انٹرسٹ نہیں۔" بے حد رکھائی سے کہتے ہوئے اس نے کپ لبوں سے لگا لیا۔ موتیا نے عمیص کے چہرے کی رنگت بدلتے دیکھی۔

"پھر تو دکانداروں میں بھی کوئی انٹرسٹ نہیں ہوگا۔" خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "آف کورس۔" وہ لاپروائی سے ٹانگیں جھلا رہی تھی۔

"تم اس سے مشورہ لو ناں' اپنی سگھڑ گھریلو بی بی الماس خاتون سے اسے دو اور دو جمع کر کے چار بنانے کا خاصا تجربہ ہے۔"

"تمہیں بھی ہو جائے گا" موتیا نے تنک کے کہا۔ "عملی میدان میں تم بھی کود پڑی ہو' چاہے وہ میدان کچن کے بنانے سے الگ ہی سہی مگر دو اور دو چار جمع کرنے کا شوق اب تمہیں بھی لاحق ہو جائے گا جب اپنی کمائی

سنبھالنے کی پڑے گی۔"

"کیوں نہیں۔" اس کے اطمینان میں ذرا برابر فرق نہ پڑا۔

"دو کو چار بنانے کا شوق کسے نہیں۔ ہمیں بھی ہے۔ ہم بھی بنانا چاہیں گے' فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے دو اور چار کے ساتھ بے شمار صفر لگے ہوں گے۔" وہ مسلسل دل جلانے والی مسکراہٹ سے ان دونوں کو نواز رہی تھی۔ عشق کے مارے عمیص کا دل تو ویسی ہی اس کی بے رخی اور کج ادائیوں نے جھلسا کے رکھا ہوا تھا۔ وہ مزید تاب نہ لا سکا اور اٹھ کے اندر چلا گیا۔ موتیا نے بھی اسے اسی بے نیازی کے ساتھ چسکیاں لیتے دیکھا تو سر جھٹک کے اپنا کپ اٹھایا اور کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کرنے چلی گئی۔

گل مہر نے اپنے گلابی نازک پیر گھر کے اندر پہننے والی ہلکی سی ہوائی چپل سے نکالے اور تخت پہ رکھ لیے۔ موڑھے کا رخ وہ پہلے ہی باہر دالان کی طرف موڑ چکی تھی۔ پیچھے ستون سے ٹیک لگا کے وہ خوشبودار چائے' مکمل تنہائی اور چپکے سے اترتی سنہری شام سے لطف اندوز ہونے لگی۔

سفید گلابوں کی باڑھ سے پھسلتی نظر یکدم ساکت ہو گئی۔ شہزاد ملک کی گمبھیر آواز گونجی تھی۔

"کہتے ہیں تحفہ لینے والے سے زیادہ دینے والے کی شخصیت عکاسی کرتا ہے۔"

"گل مہر میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ پہ نہ کوئی دباؤ ہے نہ زبردستی۔ یہ زبردستی کے سودے تو ہوتے بھی نہیں۔"

"اگر آپ نے مجھے کسی قابل سمجھا تو یقیناً یہ اعزاز میرے لیے بہت بڑا ہو گا اور بالفرض آپ کا جواب انکار میں ہوا تب بھی آپ مجھے دوبارہ یہ ذکر کرتے نہ سنیں گی۔"

کل ساری رات بھی ان سرگوشیوں نے اس کی آنکھ نہ لگنے دی تھی اور اب تنہائی پاتے ہی پھر حملہ آور ہو گئیں۔ وہ نئے سرے سے الجھنے لگی۔

"پتہ نہیں ہماری الجھن اور حیرانی کی وجہ کیا ہے؟ کیا شہزاد ملک کا اظہار پسندیدگی۔۔۔ یا ہم سے اظہار پسندیدگی۔۔۔ یا ہمارا الجھاؤ اس جواب کی وجہ سے ہے جو کبھی نہ کبھی تو ہمیں انہیں دینا ہی ہے۔"

"کیا جواب دیں گے ہم انہیں۔ وہ کون سا جواب ہے جسے کہنا ہمارے لیے سہل ترین ہے۔"

"کیا انکار۔۔۔؟ ہاں' ہم بہت آسانی سے انکار کر سکتے ہیں۔ انہوں نے واضح الفاظ میں جتایا ہے کہ ان کی جانب سے ہم پہ کوئی دباؤ نہیں' نہ ہی انکار کی صورت میں ہمارے پروفیشنل ریلیشن شپ میں کوئی اثر پڑے گا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم انکار ہی کیوں کریں گے؟"

وہ ایک بار پھر منتشر ہو گئی۔

"تو کیا اقرار کریں۔۔۔ یعنی ان کا پرپوزل قبول کر لیں' کہہ دیں کہ ہمیں ان سے ایک نیا رشتہ استوار کرنے میں کوئی اعتراض نہیں اور ان کے گھر والوں کو اپنے گھر آنے کی رضامندی دے دیں۔۔۔ لیکن یہ سوال تو پھر بھی وہیں کا وہیں ہے کہ ہم ایسا کیوں کریں؟ ہاں۔۔۔ یا ناں۔۔۔ کچھ بھی کہنے کے لیے کسی ٹھوس وجہ یا جواز کا ہونا ضروری ہے۔ نہ تو انکار کرنے کے لیے ہم کوئی وجہ بیان کر سکتے ہیں' نہ ہی۔۔۔" وہ یہاں رک کے ایک بار پھر سوچنے کے لیے مجبور ہوئی۔

"اگر انکار کرنے یا یہ پرپوزل مسترد کرنے کا کوئی معقول جواز ہمارے پاس نہیں۔۔۔ تو یہ تو خود بخود اقرار کرنے کی دلیل ہے۔" اپنے اس خیال پر وہ چونک اٹھی۔

"ضروری تو نہیں صرف محبت ہی ہر رشتے کے پیچھے کار فرما ہو۔ بعض رشتے کچھ اور پہلوؤں کو مدنظر رکھ کے بھی استوار کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ محبت ہمیشہ اپنے اصل روپ میں ہی متعارف ہو۔ کبھی کبھی وہ پسندیدگی اور ذہنی ہم آہنگی کے سانچے میں ڈھل کے بھی پیدا ہوتی ہے اور جس طرح ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے دل کے آئینے پہ ابھی تک کسی نے بھی محبت نام کا عکس نہیں جگایا۔ چاہے وہ عمیص ہو' شہزاد ملک ہو یا

کوئی اور۔۔۔ اسی طرح یہ بھی مان لینا چاہیے کہ ہم شہزاد ملک کو پسند ضرور کرتے ہیں اور اس کی ایک نہیں' کئی وجوہات ہیں۔ بہت کچھ ہے ان میں جو ہمیں اٹریکٹ کرتا ہے' جو ہمارے مزاج سے میل کھاتا ہے۔۔۔ تو کیا یہ اٹریکشن' ہم آہنگی کسی رشتے میں ڈھل کے محبت کا روپ نہیں لے سکتی اور نہ بھی لے۔۔۔ ایک بات تو طے ہے کہ ہم محبت کے بغیر رہ سکتے ہیں' اپنے معیار سے کم پہ نہیں۔" وہ جیسے ایک نتیجے پہ پہنچ گئی۔

❊ ❊ ❊

"امی جان! ساٹھ کو چار سے تقسیم کریں تو کیا حاصل آئے گا۔"

صاحبزادی یاسمین نایاب کی آواز پہ چونک اٹھیں۔ ان گنت پریشان کن خیالات میں گھرے ان کے ذہن میں بیٹے کی آوازیوں گونج کر رہ گئی جیسے کسی ویران کھنڈر میں کسی تنہا اور اجنبی شخص کی صدا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگیں۔ مختلف سوچوں کا آماجگاہ بنا دماغ الفاظ سننے کی صلاحیت رکھتا تھا مگر ان کے مفہوم جاننے کی اہلیت سے قاصر تھا۔ نایاب نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

"حاصل۔۔۔؟" وہ بڑبڑائیں۔

"کچھ حاصل نہیں ہوا' کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ تقسیم کر دیا مگر حاصل اب بھی کچھ نہیں۔ خالی ہاتھ' خالی دامن ہیں ہم۔"

"امی۔۔۔؟" وہ الجھ کے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔ یاسمین نے اپنا سر پھر سے پلنگ کے سرہانے ٹکا دیا۔ بجھی ہوئی نظریں' سست روی سے گردش کرتے پنکھے کے سالخوردہ آہنی پروں پہ جمی تھیں۔ خشک لب اب بھی نامحسوس سی حرکت کر رہے تھے لیکن آواز معصوم تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد زچ ہو کے نایاب نے کاپی الٹ دی۔

"دلکش آپا بھی نانا حضور کے گھر رہ گئیں بس یونہی۔ اب کون پڑھائے گا؟"

کچھ دیر مزید ماں کی جانب سے کسی رد عمل کا انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو کے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ جہاں پہلے ہی اقدس اور شمشیر زمین پہ چٹائی بچھائے اپنے ان پلاسٹک کے کھلونوں سے کھیل رہے تھے جو کچھ روز قبل ان کے ماموں عمیص انہیں دے کر گئے تھے۔

"کیا حاصل ہوا؟"

صاحبزادی یاسمین کے ذہن میں اب تک اسی سوال کی تکرار جاری تھی۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہی تھیں کہ بابر ہمایوں مغل کے ساتھ اس چودہ سالہ رفاقت کے دوران اپنی وفاؤں کو ضرب دے دے کر صبر' ہمت' برداشت اور مستقل مزاجی کو تقسیم کرنے کے بعد بھی انہیں کیا حاصل ہوا؟

بابر ہمایوں مغل کی کمین فطرت اور رنگین مزاجی ان پہ شادی کے اولین دور میں ہی کھل گئی تھی اور اپنے والد کی وفات کے بعد تو مزید کھل کے سامنے آیا تھا۔ وہ تمام برائیاں جن کے اس شخص میں ہونے کا پہلے صرف یاسمین کو شک تھا' اب یقین بھی ہو گیا۔ قماربازی' شراب نوشی' ہیرا پھیری' بازاری عورتوں سے دوستی۔۔۔ وہ سب شوق جو پہلے اسے باپ کے لحاظ اور خوف سے چھپ کے پورے کرنے پڑتے تھے' اب وہ کھلم کھلا کرتا تھا۔ بیوی کا ڈر نہ اسے پہلے تھا' نہ اب رہا لیکن صاحبزادی یاسمین اس کی طرح لاوارث نہ تھیں۔ اس کے سر پہ تو کوئی پوچھنے یا بازپرس کرنے والا نہ رہا تھا مگر انہیں ہمیشہ اپنی بزرگ بیوہ والدہ کی دلگیری اور باپ جیسی شفقت دینے والے اونچی آن بان کے مالک چچا حضور کا وقار عزیز رہا۔

اس ڈر سے وہ اتنے سال تک بابر کے تمام اوصاف پہ پردہ ڈالنے کی کامیاب سعی کرتی آ رہی تھیں کہ ان کا بھرم سلامت رہے۔ اگر وہ اپنے تئیں بیٹی کو باعزت طور پہ ایک اونچے گھرانے میں بیاہ کر' اس کا مستقبل ایک اعلا خاندان کے ہونہار چشم و چراغ کو سونپ کر مطمئن ہیں تو وہ انہیں مطمئن ہی رہنے دیں گی' انہیں کسی قسم کے

پچھتاوے یا احساس جرم سے وہ چار ہرگز نہ کریں گی کہ اس سب سے انہیں بھلا کیا ملے گا۔ اپنے ہی دکھ بہت ہیں سنبھالنے کو۔ ازدواجی زندگی کی کڑواہٹ کا دکھ۔ اولاد کی محرومیوں اور کم مائیگی کا دکھ۔ شریک حیات کی جانب سے محبت اور توجہ کی عدم موجودگی کا دکھ۔ غربت اور کسمپرسی کا دکھ۔

ایسے میں دل ناتواں میں اتنی شکست کہاں رہ جاتی ہے کہ اب اپنے بزرگ اور قابل احترام ہستیوں کے دکھ بھی جھیلتا رہے۔

کم از کم دل کو اب تک یہ اطمینان تو حاصل تھا کہ ان کی جانب سے چچا حضور اور ای حضور مطمئن و شاد تھے' بے فکر تھے اور اب اچانک ہی یہ اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔ بھرم کی وہ چادر جسے اب تک وہ بڑی مہارت کے ساتھ پیوند لگا لگا کر اپنی زخم خوردہ حیات کی ستر پوشی کرتی چلی آ رہی تھیں' یکدم ایک جھٹکے سے تار تار ہو گئی۔ ان کی ساری تشنگیاں' محرومیاں' تمام دکھ' ایک ایک کر کے ان مہربان ہستیوں پہ عیاں ہو گئے جن کے سامنے انہوں نے ہمیشہ خود کو راضی برضا اور مطمئن ظاہر کیا تھا۔

سب سے پہلے ان کے بھرم کا یہ پردہ ان کے اپنے ماں جائے' لاڈلے بھائی عمیص نے چاک کیا۔ وہ گم صم کھڑی اسے دیکھتی رہیں اور وہ ان کی حالت سے بے خبر جوش جذبات میں چچا حضور کے سامنے ایک ایک کر کے بابر ہمایوں کے تمام اوصاف گنواتا رہا جن سے اب تک وہ انجان تھے۔ یاسمین نے ایک نظر صاحبزادہ نفیس کے جھکے ہوئے شانوں پہ ڈالی جو ہمیشہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہونے کے باوجود قوی رہا کرتے تھے۔ ان کی ملال سے بھری جھکی نظروں کو دیکھا' شکستہ قدموں کو پلٹتے دیکھا' ایک نظر انہوں نے صاحبزادی خلعت النساء کے زرد پڑتے چہرے اور کپکپاتے لبوں پہ ڈالی۔ اس کے بعد ان کی آنکھوں میں مزید کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہ رہی۔ تمام منظر جیسے تاریکی میں ڈوب گئے۔ کسی کی ہمدردی اور ترس بھری نظروں کو سامنا نہ کرنے کی نیت سے وہ کمرے میں بند ہو گئیں۔

ابھی اپنی کم مائیگی کا بھرم ٹوٹ جانے کا غم کم نہ ہوا تھا کہ گل مہر کے انکشاف نے انہیں اور بھی بے حیثیت کر دیا۔ اس نے سب کے سامنے ان کے شوہر کی عیاش طبع اور رنگین مزاجیوں کا پول کھول دیا۔ اب وہ مزید نہ سہار سکیں اور اپنا بچا کھچا بھرم سمیٹ کر واپس اس اذیت کدہ میں چلی آئیں۔ جہاں ملنے والے غم' دکھ' اذیت' درد۔۔۔ سب سہنا ان کا مقدر تھا مگر کم از کم انہیں انگاروں پہ چلتے ہوئے دیکھنے والا کوئی تماشائی نہ تھا۔ ان کی جلن صرف ان کے اپنے حصے کی تھی' اس میں وہ کسی اور کو حصہ دار کیوں بنائیں اور وہ بھی ان لوگوں کو جو ان کے لیے سدا دعائیں ہی مانگتے رہے ہیں۔ ان کی اور ان کی اولاد کے لیے بھلا ہی چاہتے رہے ہیں۔

"آ گیا ٹولہ۔۔۔ کیا ہوا نانا جان! بہت جلدی اکتا گئے۔"

بابر کی تلخ و طنزیہ آواز سنائی دی۔ شاید اس کے لیے ان لوگوں کی آمد غیر متوقع تھی۔ تینوں بچے جن کی دبی دبی ہنسی کی آوازیں اور معصوم باتیں اس غائب دماغی میں بھی یاسمین کو سنائی دے رہی تھیں۔ باپ کی آمد کے ساتھ جیسے سہم کر معدوم ہو گئیں۔ یقیناً وہ تینوں اب اپنے کھلونے سمیٹ رہے ہوں گے۔

یاسمین نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ پتہ نہیں کب آنسوؤں کی چند بے قرار لڑیاں رستہ بناتی چہرے اور گردن کو بھگوتی بالوں میں جذب ہو گئی تھیں۔ دوپٹے سے چہرہ اور آنکھیں خوب اچھی طرح رگڑ کے پژمردگی سے وہ اٹھ کے بیٹھ گئیں۔ بابر ہمایوں مغل حسب معمول جھومتا' لڑکھڑاتا' رستے میں آنے والی چیزوں کو ٹھوکریں مارتا آیا۔ اس کے سلام کا جواب دینے کی زحمت کیے بغیر جیب ٹٹول کر سگریٹ نکالنے لگا۔ یاسمین کے پلنگ سے اٹھتے ہی بابر نے اپنا مدہوش وجود وہاں گرا لیا۔

خلاف معمول آج یاسمین چائے پانی یا کھانے کا پوچھنے کی بجائے چپ چاپ چوکی چولہے کے نزدیک گھسیٹ کر بیٹھ گئیں اور تھیلے میں سے چار آلو نکال کر چھیلنے لگیں۔ بچوں نے اندر آنے کی کوشش کی تو انہیں بھی اشارے سے منع کر دیا اور باہر کھیلنے کا کہا۔

بے نیازی کا یہ مظاہرہ بابر کو بے حد کھلا۔

"تین دن بعد آج گھر کا کھانا نصیب ہو رہا ہے۔ کیا یہ چار آلو ہی رہ گئے ہیں ہمارے لیے۔ خود تو میکے بیٹھ کر خوب پکوان اڑائے ہوں گے۔"

"سبزی میں صرف آلو ہی گھر پہ موجود ہیں یا چند عدد پیاز' اس لیے ہم آلو کی بھجیا بنا رہے ہیں۔ اگر نہیں پسند تو دال چڑھا دیتے ہیں۔" یاسمین نے بھی اکھڑے لہجے میں ہی جواب دیا۔ وہ چونکا۔ یہ لب و لہجہ قطعی نا آشنا سا تھا۔

"کیوں' خان صاحب کیا بالکل ہی قلاش ہو گئے جو بیٹی کو خالی ہاتھ گھر بھیج دیا۔"

"اللہ نہ کرے۔ جن کے ہاتھ پیر میں خدا نے محنت کرنے کی صلاحیت رکھی ہو' وہ قلاش کبھی نہیں ہوتے۔"

"زبان چلاتی ہے سالی۔" بابر بپھر کے اٹھا۔ وہ سہمنے کی بجائے سکون سے آلو چھیلتی رہیں۔ بابر کے طیش سے اٹھے قدم ساکت ہو گئے۔

"پیسے ہیں تو لاؤ' گوشت لے کر آتے ہیں ہم۔ دو دن سے نان پکوڑے' چنے کھا کھا کے واللہ زبان ربڑ کی ہو کے رہ گئی ہے۔" اچانک پینترا بدل کر وہ مطالبہ کر رہا تھا۔

"ہمارے پاس روپے نہیں ہیں اور بازار کے چنے' پکوڑے کھانے کا فیصلہ آپ کا اپنا تھا۔ عمیص میاں آپ کو باقاعدہ کہہ کے گئے تھے کہ آپ بھی وہاں رہیں۔ اتوار کی صبح موتیا نے آپ کی خاطر خاصا اہتمام بھی کر کے رکھا تھا مگر آپ کی مصروفیات۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ وہ کوئی کام آن پڑا تھا۔ ایک صاحب نے کہیں بھیجا تھا۔"

"ان صاحب نے موٹر اور لڑکی دے کر بھیجا تھا تو کیا خالی ہاتھ بھیج دیا تھا۔ ہمارا مطلب ہے' موٹر میں پیٹرول ڈلوانے اور لڑکی کو تحائف لے کر دینے کے لیے رقم تھی تو چنے کھانے کی بجائے کچھ بہتر کھانا لے لیا ہوتا۔" بظاہر بے حد سکون سے یہ فقرہ ادا کیا مگر یہ تو وہ جانتی تھیں کہ اس وقت ان کے سینے میں کیسے بھانبڑ جل رہے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے بابر حق دق رہ گیا۔ اسے شاید یاسمین کی جانب سے ایسے بے دھڑک سوال کی توقع نہ تھی مگر اس کی یہ وقتی خاموشی صرف حیرت کے زیر اثر تھی۔ شرمندگی تو اسے چھو کے نہ گزری تھی۔ نہ ہی اس کے نزدیک بیوی کو صفائی دینا کوئی ضروری امر تھا۔ وہ مزید بپھر گیا۔

"سالی' اب یہ کام بھی شروع کر دیا۔ اپنے اس آوارہ بھائی سے شوہر کی جاسوسی تک کرانا شروع کر دی۔ ہونہہ' بڑے نواب بنے پھرتے ہیں۔ اوقات تو یہ ہے کہ داماد کے پیچھے تو سونگھنے والے کتوں کی طرح لگے رہتے ہیں۔"

"خدا کا واسطہ ہمارے بھائی اور چچا کو بیچ میں مت لائیے۔ ان کا اس سارے قصے سے نہ کوئی تعلق ہے' نہ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی تعلق بنے۔ ان سے آپ کی جاسوسی کرانا تو در کنار' ہم ایک حرف شکایت تک کا کرنا گوارا نہیں کرتے۔ آپ کو اپنی عزت کا نہ سہی مگر ہمیں بہرحال یہ خیال ضرور ہے۔ ہمیں یہی تربیت دی گئی ہے کہ جس گھر میں بیاہ کر جائیں' اس خاندان کی نیک نامی کو اپنے وقار سے بڑھ کے عزیز جانیں۔ ہم تو ہمیشہ آپ کی حرکتوں کی پردہ پوشی کرتے رہے ہیں۔"

"اچھا تو کیا خود آدھی رات کو سڑکوں پہ گشت کیا جا رہا تھا۔ ہم بابر ہمایوں مغل ہیں یاسمین خانم! دن میں سو لوگوں کو ہزار چکر دیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ چار سو بیسیاں کھیلنے کی کوشش مت کرنا۔ آج پہلی بار یہ زبان ہمارے سامنے کھلی ہے' اس لیے معاف کرتے ہیں' ورنہ تم بھی بخوبی جانتی ہو ہمارا ظرف اتنا بڑا نہیں۔ نہ ہی قوت برداشت اتنی زیادہ ہے کہ ایسی زبان درازیاں اور گستاخیاں سہہ سکیں۔ آئندہ ہمارے معمولات میں دخل دینے' اپنے باپ' چچا یا بھائی کی دھونس دینے یا پھر کسی قسم کا سوال جواب کرنے کی جرات کی تو گدی سے زبان نوچ ڈالیں گے۔"

"ہم آپ کو اپنے باپ' چچا اور بھائی کی دھونس نہیں دیتے مگر آپ کو آپ کے اپنے مرحوم والد کی نیک نامی اور شرافت کا واسطہ دے کر یہ یاد تو دلا سکتے ہیں کہ آپ ایک عزت دار اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں پھر کم تر

لوگوں والے اطوار اپنا کے اپنے آباء کی روحوں کو کیوں تڑپاتے ہیں۔"

"جو مر گئے' سو مر گئے اور ہمارے لیے کیا چھوڑ کے مرے اس خالی خولی نام اور کھوکھلی شرافت کے علاوہ جو ہم اپنا دل مار کے ان کی روحوں کو شاد رکھنے کی کوششیں کرتے پھریں۔"

"زندہ لوگوں کا واسطہ تو دیا جا سکتا ہے نا۔ آپ کی جوان ہوتی بچی' یہ بڑھتی عمر کے تین بیٹے۔ کیا یہ بھی آپ کے غلط سمت اٹھتے قدم نہیں روکتے۔"

یاسمین کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بابر کا قدم اٹھ چکا تھا۔ گیس کا چولہا الٹ چکا تھا اور اس پہ دھری مٹی کی ہنڈیا اینٹوں کے پکے فرش پہ تین ٹکڑوں میں بکھری تھی۔ ادھ کچے آلو کے قتلے' گھی اور مسالا دور دور تک پھیلا تھا۔ رزق کی اس بے حرمتی پہ یاسمین کا دل اور آنکھیں دونوں بھر آئیں۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر اللہ سے توبہ کرنے لگیں۔

"منحوس عورت..... کہتی ہے اپنے مرے ہوئے باپ کا ہی احترام کرلو۔ ارے اس شخص کی مغفرت کی دعا کروں جو مرنے سے پہلے اس عورت کی صورت ہمارے لیے ایک مستقل عذاب کا بندوبست کر گیا۔ نہ شکل نہ عقل..... نجانے کیا سوچ کر اس بے رنگ مٹی کی بھدی عورت کو ہمارے سر منڈھ دیا گیا۔ یہ ہماری شرافت نہیں تو اور کیا ہے کہ چودہ سال سے نباہ رہے ہیں لیکن اگر بک بک کرنے کی عادت ایسی ہی رہی تو تمہارے سفید ہوتے بالوں اور ڈھلتی عمر کا بھی لحاظ نہ کریں گے۔ بچوں سمیت چوٹی سے پکڑ کے نکال باہر کریں گے پھر دیکھتے ہیں اعلا حضرت چچا ان پانچ جانوں کو سینے سے لگاتے ہیں یا پھر سے کوئی کاٹھ کا الو ڈھونڈتے ہیں اس بدشکل' بدزبان ادھیڑ عمر بیٹی کے لیے۔"

* * *

فجر کا وقت تھا' گرمیوں کی صبح تھی' اسی لیے صبح کی اس اولین ساعت میں بھی نکھری نکھری سی روشنی تھی۔ صاحبزادہ نفیس علی خان حسب معمول اپنی آبنوسی چھڑی ہاتھ میں لیے درود شریف کا ورد کرتے نماز باجماعت ادا کرنے کی نیت سے گھر سے نکلے۔ چند قدم کے بعد ہی انہیں احساس ہوا کہ کوئی ان سے دو قدم پیچھے چلا آرہا ہے۔ وہ ہلکا سا کھنکھارے۔

"السلام علیکم چچا حضور۔" عقب سے **عمیص** کی آواز پہ وہ قدرے چونکے۔ بلند آواز میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے رفتار ذرا دھیمی کرلی' اس طرح وہ ان کے خاصا قریب آگیا۔ البتہ احترام کی وجہ سے ایک قدم کا فاصلہ دانستہ برقرار رکھا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان نے کن انکھیوں سے نوجوان بھتیجے کو دیکھا جس کے روپ میں وہ اولاد نرینہ سے محرومی کا احساس مٹاتے رہے تھے اور جس سے پچھلے چند روز سے ان کے تعلقات سرد چلے آرہے تھے۔

سفید ململ کے کڑھے ہوئے کرتے کے سارے بٹن بند کیے' آستینوں کو کہنی سے ذرا نیچے تک موڑے' سوتی سفید شلوار' ہوائی چپل اور گھنے بالوں کے اوپر رکھی سفید جالی کی ٹوپی کے ساتھ وہ ان کے دل میں اترتا ساری ناراضی کی دھند ہٹانے لگا۔ دل ہی دل میں وہ نظر بد سے بچانے والے کلمات ادا کرنے لگے۔

"کیسی طبیعت ہے چچا حضور؟" اس نے مودبانہ سوال کیا۔

"الحمدللہ' عنایت ہے رب کریم کی۔" مسجد کے اندر داخل ہونے سے پہلے چپل اتارتے ہوئے انہوں نے کہا۔ اس کے بعد ایک ساتھ بیٹھ کے وضو کرتے ہوئے' نماز ادا کرتے ہوئے' اسی رستے سے اکٹھے واپس جاتے ہوئے دونوں کے درمیان اور کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی صاحبزادہ نفیس نے اپنی بیٹھک کی بجائے حویلی کے اندرونی حصے میں قدم رکھا۔ یہ ان کا برسوں پرانا معمول تھا۔ وہ دن بھر یا تو بیٹھک میں ملاقاتیوں یا احباب کے ساتھ مشغول رہا کرتے یا زمینوں کے کام سے باہر چلے جاتے۔ دن بھر کھانا' پینا' چائے اور قیلولہ تک وہیں ہوتا۔ رات کو کھانے کے لیے اکثر اندر آجایا کرتے مگر یہ روزانہ کا معمول نہیں تھا۔ اگر رات کے کھانے پہ کوئی دوست احباب ہمراہ ہوتے تو کھانا بھی بیٹھک

میں منگوالیا جاتا' ورنہ بیٹھک سے متصل اپنے کمرے میں سونے کی نیت سے جاتے تو صاحبزادی حرمت النساء ان کی ٹرے وہیں پہنچا دیتیں۔ یعنی دن کے کسی بھی اوقات یا رات کو ان کا اہل خانہ کے پاس آنا ان کی فرصت سے مشروط تھا مگر صبح نماز فجر کی ادائیگی کے بعد بلاناغہ سب سے فرداً "فرداً" ملنا' احوال جاننا اور مل کے ناشتا کرنا۔ وہ ان معمولات پہ سختی سے کاربند تھے۔

سب سے پہلے وہ دالان میں رکھے سنگی تخت پہ نماز کے بعد وظائف کا ورد کرتی صاحبزادی **خلعت النساء** کے پاس گئے۔ ان کا احوال دریافت کیا۔ وہ وہیں ان کے تخت کے ایک سرے پہ بیٹھے تھے جب صاحبزادی حرمت النساء ان دونوں کے لیے چائے لے کر آئیں۔ صاحبزادی **خلعت النساء** تو نماز سے پہلے ہی اپنا ہلکا سا ناشتا کرلیا کرتیں' یہ وقت ان کا چائے کا تھا جبکہ نفیس صاحب ناشتے سے پہلے بھی چائے پیتے تھے۔

"صاحبزادی الماس خاتون دریافت کررہی تھیں کہ آج آپ ناشتے میں کیا لینا پسند کریں گے۔" انہوں نے اپنے شوہر سے سوال کیا۔

"طبیعت میں کچھ گرانی سی ہے' نیم گرم دودھ کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا دے دیجئے' باقرخانی وغیرہ۔" وہ جواب سن کر پلٹنے والی تھیں کہ اب تک وہیں کھڑے **عمیص** نے آگے بڑھ کے انہیں روک لیا۔

"ذرا رکیے چچی حضور! مجھے ایک ضروری بات کرنا تھی۔ امی حضور اور چچا حضور کے ساتھ آپ بھی یہاں موجود ہیں' اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ رکا اور تینوں کے چہروں کی جانب باری باری دیکھا۔ امی حضور کے ورد کرتے لب ساکت ہوگئے تھے۔ چچی حضور بھی بیٹھ گئی تھیں۔ چچا حضور کے ہاتھ کی گرفت اپنی چھڑی کے دستے پہ مضبوط ہوگئی مگر تینوں نے ہی کوئی سوال کرنا یا تجسس کا اظہار کرنا گوارا نہ کیا۔

"چچا حضور! آج مجھے دکان کی چابیاں مل رہی ہیں۔ آج بعد نماز ظہر میں پی سی او کے کام کا آغاز کررہا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ اس کام کا آغاز خدا کے بابرکت نام سے آپ خود..... میرا مطلب ہے' اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو کیا میں آج آپ سے کچھ دیر کے لیے اسٹور پہ آنے کی درخواست کرسکتا ہوں۔"

اور وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا مگر وہاں فقط خاموشی تھی۔ ایک جامد اور قطعی سمجھ میں نہ آنے والی خاموشی۔

"آپ میرے بزرگ ہیں' ہمیشہ میری خطاؤں کو درگزر کرتے آئے ہیں۔ میری کوتاہیوں کے باوجود آپ نے اپنی شفقت میں کبھی کمی نہ آنے دی۔ میں نے ہوش میں آتے ہی اپنے والد کی جگہ آپ کا دست شفقت اپنے سر پہ محسوس کیا ہے اور آئندہ بھی..... زندگی کے اہم یا غیر اہم موڑ پہ میری یہ خواہش رہے گی کہ آپ کی دعائیں میری راہ نما ہوں۔"

"ہماری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی برخوردار! لیکن....." وہ کچھ متذبذب نظر آرہے تھے۔

"دعاؤں کا سفر دل سے دل تک بخوبی طے ہو جاتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم وہاں آئیں۔" بہت خوبصورت انداز میں انہوں نے انکار کرنا چاہا۔

"میں آپ سے ضد اور اصرار کرنے کا حق بھی رکھتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"ہم بھی آپ سے بہت کچھ منوانے کا حق رکھتے ہیں لیکن ہم نے یہ حق استعمال نہیں کیا' اس لیے یہ ذکر تو جانے ہی دیجئے میاں۔" اس بات پہ وہ خفیف ہوگیا۔

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ زندگی کے اتنے اہم موڑ پہ..... ایک نئے دور کا آغاز کرتے ہوئے میں اکیلا ہوں'

"ایسامت کہیے **عمیص** میاں!" صاحبزادی حرمت النساء نے تڑپ کے کہا۔

"خدانخواستہ آپ تنہا کیوں ہونے لگے۔ دو دو ماؤں کی دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ہمراہ ہیں اور اس اللہ کا کرم بھی..... جو ستر ماؤں سے بڑھ کے چاہنے والا ہے۔"

صاحبزادی خلعت النساء نے بھی ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے نزدیک بلایا۔ وہ قریب آیا تو اس کے چہرے پر دعاؤں میں لپٹی پھونک مارنے کے بعد نم آنکھوں کے ساتھ اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

عمیص نے آہستگی سے رخ پھیرا۔ اب وہ صاحبزادہ نفیس علی خان کے روبرو تھا اور اس کا سر ہنوز دعا لینے کی طلب میں جھکا ہوا تھا۔ ان کا ابھری ہوئی نیلی رگوں والا شفاف و سفید ہاتھ بلند ہوا اور اس کے گھنے بالوں پہ ٹھہر گیا۔ اتنے دنوں سے دل پہ چھایا اضطراب عمیص کو پل بھر میں چھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

❋ ❋ ❋

"تو تو باز نہیں آئے گی۔" ساری روداد سننے کے بعد نگاہ نے آنکھیں نکالتے ہوئے اسے گھرکا۔

"پہلے بھی سمجھایا تھا اس مغل کے بچے کے جھانسے میں نہ آ۔ سو طوائفیں مری ہوں گی تو اس اکیلے کا خمیر اٹھا ہوگا۔ یہ تو تیری جیسی کئی کھڑے کھڑے بیچ دے اور تو ہے کہ یارانے بڑھانے میں مگن ہے۔"

"توبہ ہے نگاہ تم سے' کہاں کی بات کو کہاں ملا دیتی ہو۔" ادا کی طبع پہ لفظ "یارانہ" گراں گزرا۔

"پہلی بات تو یہ کہ مجھے بابر مغل صاحب ہرگز ایسے نہیں لگے جیسے کہ تم بتا رہی ہو۔ ہاں کچھ چرب زبان ضرور ہیں' قدرے رنگین مزاج یا حسن پرست کہہ لو۔ تو میری جان یہاں کون مرد حسن پرست نہیں ہے۔ کم از کم اس شخص کو حسن برتنے کا سلیقہ تو آتا ہے۔ چاہے وہ حسن نظر ہو یا حسن ذوق ہو۔ کم از کم مجھے ان تین چار ملاقاتوں میں ان میں ایسی کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی جس کو میں اپنے لیے خطرہ سمجھوں۔"

"یہی تو بات ہے۔ تم ابھی اس میدان میں نئی ہو' مرد کو سمجھنے کے لیے ایک عمر چاہیے ادا بیگم! اور وہ بھی بابر جیسے مرد۔۔۔ جو پیاز کی طرح پرت در پرت کھلتے ہیں اور جتنی پرتیں کھلتی ہیں' اتنے ہی آنسو بھی نکلتے ہیں۔ یہی لچھے دار گفتگو کرنے والے' بظاہر نفیس اور آگے بچھ بچھ جانے والے مرد ڈنک مارتے ہیں۔ ان سے تو وہ کتوں کی طرح رال ٹپکاتے چوہدری اور ملک زادے اچھے۔۔۔ کم از کم بھگا کے تو نہیں مارتے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں تو تم سے یونہی ذکر کر بیٹھی کہ اس دن تمہارے نہ آنے کے باوجود میرا کام ہوگیا۔ بابر صاحب کے ساتھ جا کر میں گفٹ اور ریو کے دونوں کو رے کروا آئی تھی اور تم ہو کہ لیکچر دینے بیٹھ گئیں۔ خود ایسے ایسے کمینے اور خرانٹ سیٹھوں کے ساتھ پھرتی ہو' وہ تو پھر بھی خاصا بے ضرر انسان ہے۔ ایک بار بھی نوٹوں کی جھلک دکھا کے مجھے خریدنے کی کوشش نہیں کی۔"

اس بات پہ نگاہ نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

"اری پگلی نوٹ اس کنگلے نواب کے پاس ہوتے تو وہ دکھاتا۔ مفت خورا ہے' مفت خورا۔ بخشش میں ملی چیزوں پہ منہ مارنے کی عادت ہے۔"

"ہوسکتا ہے مگر اتنی پہچان تو مرد کی بھی ہوتی ہے کہ کس عورت کے ساتھ کس طریقے سے پیش آنا ہے اور وہ پڑھا لکھا' مہذب' خاندانی شخص ہے۔ بازاری عورتوں کے ساتھ ہوسکتا ہے اس کا رویہ ویسا ہی ہوتا ہو جیسا تم بتا رہی ہو مگر اس کے برتاؤ میں اب تک ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا۔ کم از کم اس پروفیشن میں آنے کے بعد اتنا بے وث اور دوستانہ رویہ میں نے کسی کا نہیں دیکھا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوچکا ہے ادا! اور میں دعا کروں گی کہ یہ دماغ بغیر کسی تکلیف دہ جھٹکے کے ہی ٹھیک ہوجائے۔"

● ● ●

"چچی حضور! کیا بات ہوئی جو آپا جان اچانک اکیلی واپس چلی گئیں۔ وہ تو چند روز رہنے کی نیت سے آئی تھیں ناں۔"

عمیص نے اگلے روز دماغ میں رہ رہ کے اٹھتے خیال کو سوال کی شکل دی۔ اگرچہ وہ یہ سوال موتیا اور اپنی والدہ سے بھی کرچکا تھا مگر جواب تسلی بخش نہ ملنے پہ اس نے یہی بات اب صاحبزادی حرمت النساء کے آگے دہرا دی۔

ان کے چہرے پہ اچانک نمودار ہونے والی سراسیمگی اس کے اندیشوں کو اور بھی ہوا دے گئی۔

"کیا ہوا تھا' کیا بابر بھائی صاحب کچھ کہہ گئے؟"

"وہ تو آئے ہی نہیں۔ شاید صاحبزادی یاسمین کو یہی فکر لاحق ہو کہ خدانخواستہ ان کی طبیعت ناساز ہو' اسی لیے وہ جلدی چلی گئیں۔" وہ رخ پھیر کے برآمدے کی چھت اوپر کرنے لگیں۔ عمیص نے ذرا توقف کے بعد مزید کریدنے کا ارادہ موقوف کرتے ہوئے کہا۔

"آئیے پھر میرے ساتھ ان کے ہاں ہو آئیے۔ ہوسکتا ہے واقعی بھائی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہ ہو اور بعد میں انہیں گلہ ہو کہ کوئی خیریت تک دریافت نہ کرنے آیا۔"

"ہاں ہمارے خیال میں یہ مناسب رہے گا لیکن پہلے ہم آپ کے چچا حضور سے اجازت لے لیں۔"

"ٹھیک ہے ابھی میں کسی کام سے باہر جارہا ہوں۔ آپ ان سے بات کرلیں۔ شام کو لوٹوں گا تو نکلتے ہیں۔"

"نہیں' شام کو نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں' ہم ساری زندگی شام ڈھلے کبھی گھر سے نہیں نکلے۔ ہمیں تو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ کل سویرے ناشتے کے بعد نکل چلیں گے۔" انہوں نے جانے پہ آمادگی ظاہر کردی۔ وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ ایک بار یاسمین سے مل کر اس کی دلجوئی کرلیں۔ جانتی تھیں کہ اس کی اچانک روانگی کا سبب گل مہر کا وہ انکشاف تھا۔ انہوں نے تو شدومد سے اسے جھٹلاتے ہوئے اور اپنے ہونہار فرمانبردار داماد پہ سراسر ایک بہتان قرار دیتے ہوئے یاسمین کو بہلانا چاہا تھا۔

"آپ گل مہر کی بات پہ مت چھوڑ بیٹھیں۔ نجانے انہوں نے کس نابکار کو دیکھا اور بابر میاں سمجھ بیٹھیں۔ بات کرتے ہوئے ان کو اتنا بھی دھیان نہیں رہتا کہ بلا جواز اور بنا ثبوت کے اتنا بڑا الزام لگانے کا کیا نتیجہ"

"نہیں چچی حضور! گل غلط نہیں کہہ رہیں۔ نہ ہی یہ بات ہمارے لیے غیر متوقع ہے۔ آپ کے داماد کے ساتھ دن رات بسر کرتے ہمیں چودہ برس گزر گئے۔ ایسا کون سا پہلو ہوسکتا ہے ان کی ذات کا جو بیوی سے پوشیدہ رہ پائے یا اس کی خبر کوئی تیسرا فرد آکر دے۔ دکھ تو ہمیں اس بات کا ہے کہ ہمارا بھرم نہ صرف ہمارے بزرگوں کے سامنے بلکہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے سامنے بھی تار تار ہوگیا۔ آپ نے ہی ہمیں بتایا تھا کہ عورت کی شان اس کے مرد کی شان سے ہوتی ہے۔ اگر اس کی عزت ہو تو عورت بھی عزت والی کہلاتی ہے' اس لیے اپنے شوہر کی عزت ہر حال میں بنائے رکھنا بیوی کا فرض ہے۔ یہی سوچ کر ہم ان کی تمام کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے رہے تاکہ سسرال میں انہیں وہی عزت بدستور ملتی رہے جو دامادوں کا حق ہوتی ہے لیکن آج ہمیں اپنا آپ بے حد ہلکا اور کم مایہ محسوس ہورہا ہے۔"

اگرچہ یاسمین کی بات پہ کتنی ہی دیر تک صاحبزادی حرمت النساء کچھ کہہ نہ سکیں۔ گل مہر نے رات سے ہی ان کے ہوش اڑا رکھے تھے لیکن وہ اسے پوری طرح سچ نہ مانتے ہوئے مسلسل جھٹلا کے خود کو تسلی دیتی آرہی تھیں اور اب تو خود کو بہلاوا دینے کا کوئی بہانہ نہ رہا تھا۔ جب خود یاسمین نے بابر کی اصلیت انہیں دکھادی۔ کتنی ہی دیر تک وہ گم صم بیٹھی یاسمین کے زرد اداس چہرے پہ بہتے آنسوؤں کی لکیریں تکتی رہیں۔ ان کا دل بری طرح دکھ گیا۔ اس کو سینے سے لگاتے ہوئے بھرائے لہجے میں کہا۔

"آپ کیوں ایسا سوچتی ہیں۔ آپ اس گھر کی بڑی بیٹی ہیں۔ آپ خدانخواستہ کیوں ہلکی ہونے لگیں۔ آپ کی اب بھی وہی حیثیت ہے جو پہلے تھی۔"

"پتا نہیں چچی حضور! فی الحال ہم کسی کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتے۔ نہ ہم سے کسی کی ہمدردی برداشت ہوگی' نہ ہی کسی کی ترحم بھری نظریں سہی جائیں گی۔ ہمیں جانے دیجیے خدارا۔" اور پھر وہ کسی کی ایک نہ سنتے ہوئے واپس چلی گئیں۔

"کس سوچ میں گم ہیں امی حضور!" موتیا برآمدے میں نکلی تو انہیں گم صم انداز میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

"ہوں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔" وہ چونکیں۔

"وہ عمیص میاں کہہ رہے تھے کہ وہ کل ہمیں صاحبزادی یاسمین کی طرف لے چلیں گے۔ تو ہم یہی سوچ رہے تھے کہ آپ کے ابا حضور تو زمینوں پہ جا چکے۔ اللہ کرے شام کو جلدی لوٹ آئیں تو ہم ان سے اجازت لے لیں۔"

"اللہ۔۔۔ امی حضور!" وہ ہنس پڑی۔

"حد کرتی ہیں آپ' یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نئی نویلی دلہن میکے جانے کی اجازت طلب کرنے میں جھجک رہی ہو۔"

"صاحبزادی الماس خاتون!" انہوں نے تنبیہہ کی۔ اگرچہ وہ ظاہر یہ کر رہی تھیں کہ انہیں بیٹی کا یہ بے تکلفانہ مذاق گراں گزرا ہے لیکن آنکھوں میں دبی دبی مسکراہٹ موتیا کو دلیر کر گئی۔

"بھئی! آپ کی بیٹی کا گھر ہے۔ اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے اور اگر رسمی طور پہ لینی ہی ہے تو ظاہر ہے کہ ابا حضور منع تھوڑی ہی کریں گے جو آپ اس قدر ہچکچا رہی ہیں۔"

"وہ پسند نہیں کرتے کہ بیاہی بیٹیوں کے گھر زیادہ آنا جانا رکھا جائے۔"

"زیادہ۔۔۔؟ ڈیڑھ دو سال میں ایک بار چلے جانے کو آپ "زیادہ" کہہ رہی ہیں۔"

"صاحبزادی الماس خاتون! ہم سے بحث مت کیا کیجئے۔" وہ ناگواری سے اسے ٹوکتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئیں۔ موتیا کو برے برے منہ بناتے دیکھ کر لکھو نے فی البدیہہ پلے بیک سونگ نشر کیا۔

اظہار بھی مشکل ہے' چپ رہ بھی نہیں سکتے
مجبور ہیں اف اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے

اس نے پہلے کالی جھے دانتوں میں اپنی چرخ سیاہ انگلی دباتے ہوئے "اف اللہ" کا تڑکا لگاتے ہوئے تان بلند کی۔

"تم کوئی موقع نہ ہاتھ سے جانے دیا کرو' دوسروں کے زخم پہ نمک پاشی کرنے کا۔" موتیا نے اپنے انداز میں اس کے فن کی داد دی جو لکھو نے دانت نکالتے ہوئے خوش دلی سے وصول کی۔

❊ ❊ ❊

کار پورچ میں ایک وائٹ سوزوکی مہران کھڑی دیکھ کے شہزاد کو اچنبھا ہوا۔ اس کے ملنے جلنے والے گھر تک تو آتے نہیں تھے اور گھر میں موجود اس کے ماں باپ سے ملنے جلنے والوں میں سے کسی کے پاس اب تک تو گاڑی نہ تھی۔ اپنی کار کھڑی کر دینے کے بعد وہ سوچتی نظروں سے اسے گھورتا اندر کی جانب بڑھا۔

لاؤنج سے بالو کے کھل کر ہنسنے کی آواز باہر تک آرہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا' ضرور اس کے عزیز رشتے داروں میں سے کوئی اندر موجود تھا۔ اندر پہلا قدم رکھتے ہی اس کے اندازوں کی تصدیق ہو گئی۔ وہ دعا تھی۔۔۔ یا شاید ادا۔۔۔ جو سفید لباس میں کارپٹ پہ پاؤں پسارے بیٹھی تھی۔ اس کا سر بالو کی گود میں تھا اور چہرے پہ بڑی آسودہ سی مسکراہٹ اور بالو کھلکھلا کے ہنستی ہوئی اسے کوئی مزیدار قصہ سنانے کے ساتھ ساتھ اس کے کھلے بالوں میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ وہ ایک ثانیے کے لیے ٹھٹک سا گیا۔ بڑا بھرپور' بڑا مکمل اور بڑا شاد سا منظر تھا۔ عرصے بعد بالو کے چہرے پہ خوشی کے سائے رقصاں تھے اور وہ لڑکی جسے وہ نجانے کیوں ایک مسئلہ بنا بیٹھا تھا۔ اس وقت ایک بے ضرر۔۔۔ معصوم۔۔۔ وہ لیے بڑے ہی انہماک سے وہ قصہ سن رہی تھی جو بچپن سے لے کر اب تک نجانے کتنی بار سن چکی ہو گی۔

"لے۔۔۔ شہزادہ بھی آ گیا۔" بلقیس نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس اطلاع پہ شہزاد نے واضح طور پہ دعا کے بھیلے لب سمٹتے اور بند پلکیں لرزتی دیکھیں۔ اس نے آہستگی سے اپنا سر اپنی مامی کی گود سے اٹھایا اور اس پہ ایک نگاہ ڈالے بغیر دونوں ہاتھ اونچے کر کے تیل سے بھیگے لمبے بالوں کو لپیٹ کر جوڑے کی شکل دینے لگی۔

"آج تو خیر سے بڑی جلدی واپسی ہو گئی میرے پتر کی۔ چل اچھا ہی ہے' اسی بہانے دوئی سے بھی مل لیا' ورنہ یہ

شوہدی تو جانے لگی تھی۔ میں نے کتنا کہا کہ اب تو تو گڈی والی ہے' کس بات کی فکر آرام سے رات کی روٹی کھا کے جانا۔ ہائے شہزادے تو نے اپنی دوئی کی گڈی دیکھی۔" حسب عادت وہ ایک ساتھ کئی باتیں کر گئیں۔ شہزاد بغیر کوئی جواب دیے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ بالو کو اس کی یہ بے رخی بری طرح کھلی۔ اگرچہ وہ اپنے عزیز رشتے داروں سے شہزاد کے اس بے مروت طرز عمل کی عادی تھی لیکن اس وقت دعا کو بالکل توجہ نہ دینا اسے واقعی غصہ دلا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دعا سے بلقیس کو فطری انسیت تھی۔ دوسرا وہ واحد تھی جس کے ساتھ شروع ہی سے شہزاد کا رویہ مشفقانہ رہا تھا۔ اگرچہ پچھلے کچھ سالوں سے مصروفیت کی وجہ سے یا شاید دعا کے بڑے ہو جانے کے بعد اس نے اپنی توجہ کم کر دی تھی لیکن اب تک وہ بھولی نہیں تھی کہ کس طرح وہ ذاتی طور پہ اس کی تعلیم میں دلچسپی لیتا تھا۔ خصوصاً" اس کے بارے میں دریافت کرتا رہتا تھا' اس کی ہر چھوٹی بڑی کامیابی پہ تحائف بھجواتا رہتا تھا۔ خود دعا بھی اس سے خاص لگاؤ رکھتی تھی۔ اس نے شہزاد کی بے نیازی پہ دعا کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو نئے سرے سے خفا ہو گئی۔ اندر کمرے میں جا کر بیٹے کو چار باتیں سنانے کا ارادہ کیا کہ دعا بھی دوپٹہ اور پرس سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا مامی! میں چلتی ہوں۔"

"اری تو تو بیٹھ نا" ابھی ابھی تو شہزاد آیا ہے' تھک جاتا ہے سارا دن کام کر کے۔ ابھی نہا دھو کے باہر آتا ہے' چائے پی کے ذرا ہوش ٹھکانے آتے ہیں تو تیرے ساتھ گپ شپ لگائے گا۔" اس نے دل بہلانے کی کوشش کی مگر دعا کا دل اب اتنا بھی کم سن نہ رہا تھا کہ یوں بہلائے بہل جاتا۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹک کے رہ گئی۔

"اسی لیے تو جا رہی ہوں مامی کہ چھاجی آ گئے ہیں۔ انہیں آرام اور سکون کی ضرورت ہو گی جو میرے ہوتے ہوئے تو۔۔۔" اس کی تھکی تھکی سی آواز اور ٹوٹا ہوا لہجہ اندر شہزاد تک پہنچا تو وہ گلے سے ٹائی نوچ کے اپنی اکتاہٹ ظاہر کرنے لگا۔

"کیوں تو کیا اس کے سر پہ بیٹھی ہے؟" اس کا یا سیت بھرا فقرہ بالو کو طیش دلا گیا۔ وہ پہلے ہی شہزاد کے سلوک پہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"نہیں نہیں مامی! میرا مطلب تھا کہ چھاجی آئے ہیں تو اب آپ مصروف ہو جائیں گی۔ آپ ان کے لیے چائے وغیرہ بنائیے' میں چلتی ہوں۔"

"تو تیرے پہ مامے کے گھر کی چائے حرام ہے کیا' چل بیٹھ سیدھی تراں سے' نہیں تو بازو پکڑ کے بٹھا دوں گی۔ جب سے آئی ہے' پوچھ پوچھ کے تھک گئی ہوں' نہ کوئی شربت' نہ پھل' نہ فروٹ۔۔۔ اب چائے تو پی لے۔ میں نذیر سے چاٹ اور سموسے منگاتی ہوں۔ پتہ ہے مجھے' تجھے کتنے پسند ہیں' چل بیٹھ آرام سے۔" اس نے استحقاق بھرے انداز میں ڈپٹتے ہوئے اسے بٹھایا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس محبت کے آگے مجبور ہو کے بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے شہزادے طبیعت تو ٹھیک ہے۔" اب وہ اندر آئی۔

"ہاں ٹھیک ہے' طبیعت کو کیا ہونا ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ اچھی بھلی جاتی دعا کو بصد اصرار روک لینے والی حرکت اسے پسند نہ آئی تھی۔

"تو پھر اتنا روکھا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ کوئی اور نہیں' اپنی دوئی ہے۔ کتنا برا لگا ہو گا اسے۔ ایک تو مہینوں بعد ادھر آئی ہے' اس پہ بھی تو اتنا منہ بنا رہا ہے۔"

"تو آئی کیوں ہے۔" وہ دانت کچکچا کے بولا۔

"اس کا اپنا گھر ہے جم جم آئے۔"

"یہ میرا گھر ہے۔" وہ زور دے کے بولا۔ "اور اس میں کسی ایسے ویسے مہمان کی آمد میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"ہولی بول۔" (آہستہ بول) بالو نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ تو دوئی کے بارے میں بول رہا ہے؟ وہ کب سے ایسی ویسی ہو گئی؟ یہ وہی ہے نا جسے گود میں اٹھا کے تو گھر لے آیا کرتا تھا کہ اماں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھ لو۔ یہ معصوم فرشتے جیسی بچی وہاں رل جائے گی۔"

"تو مان لیتا تھا میرا مشورہ۔ رکھ لیتا تھا اسے اپنے پاس۔ اماں! اب وہ نہ معصوم رہی ہے نہ فرشتہ، اسے رلنا تھا' رل گئی۔"

"ہائے ہائے' خیر کا بول منہ سے نکال۔ خدانخواستہ وہ کیوں رلنے لگی۔ اب تو اتنی ترقی کر رہی ہے۔ تو نے دیکھا نہیں' کتنی سیانی نظر آنے لگی ہے۔ بڑی بڑی باتیں کرتی ہے' آپ گڈی چلاتی ہے۔"

"گھر سے نکل کر بندہ یونہی سیانا ہو جایا کرتا ہے اماں! اور جسے تم ترقی سمجھ رہی ہو' وہ نری بربادی ہے اور میں اس بربادی کا حصہ دار نہیں بننا چاہتا۔ اسے جتنی جلدی ہو سکے' یہاں سے چلتا کرو۔"

"دیکھتے ہیں بھابی! آپ اور کتنا بے عزت کر سکتے ہیں' ہم اور کتنا بے عزت ہو سکتے ہیں۔" باہر بیٹھی ساری گفتگو سکون سے سنتی دعا نے کرب سے مسکراتے ہوئے سوچا۔

"دیکھتے ہیں کس کا ظرف اس آزمائش پہ پورا اترتا ہے۔ پہلے آپ تھکتے ہیں یا میری ہمت جواب دے جاتی ہے؟ آپ کی مروت آپ کو زبان بندی پہ مجبور کرتی ہے یا میری خودداری کانوں پہ ہاتھ رکھتی ہوئی فرار اختیار کرتی ہے۔"

"تو نے تو سارے لحاظ ہی ختم کر دیے ہیں شہزادے!" بالو نے تاسف سے سر ہلایا اور اس سے مزید سر نہ کھپانے کا ارادہ کرتے ہوئے باہر نکلنا زیادہ مناسب جانا۔

"نہ دل میں کسی آئے گئے کی عزت رہی ہے نہ ہی خدا کا خوف۔" وہ بڑبڑاتی باہر نکل گئی۔ جتنی بلند آواز میں شہزاد بلا جھجک اپنے زہریلے خیالات کا اظہار کر رہا تھا' اسے پوری امید تھی کہ دعا یہ سب سننے کے بعد فوراً وہاں سے جا چکی ہو گی کہ وہ تو اس کے ماتھے کی تیوریاں ہی دیکھ کے جانے کو تیار تھی لیکن اسے حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب صوفے پہ آرام دہ حالت میں اسے بدستور براجمان دیکھا۔

"تو پھر ماسی! کیا کیا منگوا رہی ہیں چائے کے ساتھ۔"

"ہیں... وہ... تو جو کہے میری دھی! میں وہ منگوا دیتی ہوں۔ نذیرے... او نذیرے..." حیرت کے اس جھٹکے سے ذرا سنبھلتے ہی بالو نے پلو سے بندھا سو کا نوٹ کھولتے ہوئے ملازم کو آواز دی۔

"جا بھاگ کے جا' چھ گرما گرم تازے نکلے سموسے' دو پلیٹ پاپڑی چاٹ اور باقی پیسوں کی جلیبیاں لے آ۔" شہزاد کا خون نئے سرے سے کھول گیا۔

"میں چائے رکھ کے آتی ہوں۔ تیرے ماے کی چاء کا بھی ویلا ہو گیا۔ تو آرام نال بیٹھ' ٹی وی شی وی دیکھ۔" وہ کچن کی جانب مڑی تو دعا اچانک کسی خیال کے آنے پہ سرعت سے اٹھی۔

"ٹھیک ہے ماسی! چائے بننے تک میں ذرا بھابی کی خیریت ہی دریافت کر لوں۔" وہ اتنی تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گئی کہ بالو چاہتے ہوئے بھی اسے روک نہ سکی۔

"لو' ہور مصیبت۔ اب پتا نہیں شہزادہ کیا زہر بول دے۔ ایویں میں نے اتنے سموسے منگائے۔ یہ اب کہاں رکے گی۔" اس نے زور سے چائے کی کیتلی چولہے پہ پٹخی۔

"کیسے مزاج ہیں بھابی!"

بیڈ پہ نیم دراز شہزاد کی سماعت کے لیے یہ آواز قطعی غیر متوقع تھی۔ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ اتنی کڑوی کسیلی سننے کے بعد وہ نہ صرف رک جائے گی بلکہ اس کے کمرے تک چلی آئے گی۔ اس کی ہمت کی داد دیتی نظروں سے شہزاد نے اس کا جائزہ لیا۔

وہ نیم وا دروازے پہ ایک ہاتھ رکھے' دوسرے ہاتھ سے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے کرتی مسکرا رہی تھی۔

دروازے کے عین سامنے اے سی کی خنک ہوا اس کا سفید لباس سرسرائے دے رہی تھی۔ اس کی ڈھیٹ قسم کی مسکراہٹ سے چڑ کے شہزاد نے بازو موڑ کے آنکھوں پہ رکھ لیا اور بدستور لیٹا رہا۔

"خیریت' نہ سوال کا جواب دینا گوارا' نہ ہی ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنا ضروری سمجھا۔ ہم اتنے برے کب سے ہوئے بھابی!"

"تم اپنی ہسٹری سے خود اچھی طرح واقف ہو۔ کب' کہاں سے "برائی" پیدا ہوئی' اس کا جواب دینے کا میں پابند نہیں ہوں۔"

"پابند تو ہم ہیں بھابی اور یہ پابندی اور کسی نے نہیں' خود اس دل نے لگائی ہے۔"

"اپنے یہ بازاری ناز و ادا وہاں چھوڑ کے آنے تھے' جہاں ان کے بدلے تمہیں سکے ملتے ہیں۔" وہ بپھر کے اٹھا۔

"مجھ پہ یہ داؤ چلانے کی قطعاً "ضرورت نہیں۔"

"سکے نہیں بھابی! نوٹ۔" اس نے جیسے رازداری سے سرگوشی کی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ اس کی ڈھٹائی کے آگے ہار بیٹھا۔

"جو حکم۔" اسی دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پلٹی مگر جب دروازہ بند کیا تو یہ مسکراہٹ پوری طرح آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔

❊ ❊ ❊

"آپ یونہی وہم کر رہی ہیں چچی حضور! ناحق عمیص میاں کے دل میں بھی وسوسہ پیدا کیا۔ ہم بالکل ٹھیک ہیں اور یقین کیجیے کسی سے ناراضگی کی وجہ سے واپس نہیں آئے بلکہ..." روانی سے انہیں بہلاوے دیتی صاحبزادی یاسمین اچانک اٹک گئیں کہ اچانک واپسی کا ایسا کون سا جواز پیش کریں جو ان دونوں کو مطمئن کر دے۔

"ہماری تو یہی دعا ہے بیٹا کہ آپ سدا اپنے گھر آباد رہیں' اپنی گھر گرہستی میں مگن رہیں۔ بس دل ذرا بے چین سا تھا کہ شاید اس روز صاحبزادی گل مہر کی وجہ سے..."

"اس ذکر کو جانے دیجیے چچی حضور!" یاسمین نے آہستگی سے کہا۔ وہ عمیص کے سامنے ایک بار پھر یہ موضوع زیر بحث نہیں لانا چاہ رہی تھیں۔ البتہ عمیص کے کان ضرور کھڑے ہو گئے گل مہر کے نام پہ۔

"کیا گل سے آپ کی کوئی بات ہوئی تھی؟"

"نہیں تو' لیجیے بھلا گل سے کیا بات ہو گی۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "ہم چائے کا انتظام کرتے ہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں چچی جان کہ مجھ سے گھر کا ہر معاملہ چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" وہ شاکیانہ گویا ہوا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔ گل مہر کے مزاج سے تو آپ بخوبی واقف ہیں بس ذرا بچپن سے جلدی جھلا جاتی ہیں۔ ہمارا گمان تھا کہ شاید صاحبزادی یاسمین کو یہ بات ناگوار گزری ہو لیکن آپ کے سامنے انہوں نے یہ کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔ آپا جان! میری چائے مت بنائیے گا۔" اس نے شانے اچکائے اور ذرا بلند آواز میں یاسمین کو پیغام دیا۔

"میں ضروری کام سے اردو بازار تک جا رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک لوٹوں گا۔ تب تک میری پیاری چچی جان کا خیال رکھیے گا۔" وہ دعا لینے کے لیے ان کے آگے جھکتا ہوا شرارت سے کہہ رہا تھا۔

"ایک ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ وقت نہ ہونے پائے عمیص میاں! دوپہر کو سخت لو اور دھوپ ہوتی ہے"

❊ ❊ ❊

"مے آئی کم ان سر۔"

گل مہر کی شگفتہ آواز پہ شہزاد نے فائل سے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ آج دو روز کے بعد اس کا سامنا ہو رہا تھا۔ اس دن کے بعد پہلی بار... جس دن اس نے گل مہر پہ اپنے جذبات آشکار کیے تھے۔ یہ دو دن اس نے مسلسل امید و بیم کی کیفیت میں گزارے تھے اور آج اسے روبرو پا کر وہ ساری بے تابیاں' وہ ساری بے چینیاں اور وہ سارا

اضطراب اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں سمٹ آیا۔

وہ اسے یوں سوالیہ انداز میں تکنے لگا جیسے اس نے وہ سوال دو روز قبل نہ کیا ہو بلکہ ابھی ابھی کیا ہو اور ابھی اسی وقت جواب سننا چاہتا ہو۔

گل مہر جو ایک فیصلہ کن نتیجے پہ پہنچ چکی تھی اور اپنا سارا اعتماد مجتمع کر کے خود کو اس کا سامنا کرنے پہ تیار کر پائی تھی ایک بار پھر لڑکھڑا سی گئی۔ شہزاد کی آنکھوں سے چھلکتا اشتیاق اور طلب اسے مجوب کر گئے۔

"ہم آسکتے ہیں سر؟" اس نے جھجکتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"کیا اب بھی آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت ہے گل مہر!" وہ بے ساختہ کہہ اٹھا۔ گل کی مسلسل لرزش کا شکار پلکیں بالآخر ہار کے جھک گئیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ شہزاد نے بے حد دلچسپی سے حیا اور خود اعتمادی کے اس امتزاج کا جائزہ لیا۔

ہلکے جوگیا رنگ کے لباس میں کھوئی کھوئی' گھبرائی گھبرائی سی وہ کوئی جوگن ہی لگ رہی تھی۔ پہلے سے الگ' ہمیشہ سے ہٹ کے۔ حالانکہ غور کرنے پہ دیکھا جائے تو ایسا کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ معمول سے ہٹ کے آفس آئی ہو۔ وہی لباس کا سادہ انتخاب' وہی سلیقے اور سادگی سے سمٹے بالوں پہ بندھا اسکارف' وہی شانوں پہ باوقار انداز میں پھیلا بڑا سا کلف لگا دوپٹہ' وہی بغیر ہیل کے بند سینڈل اور وہی آرائش سے پاک' مصنوعی سہاروں سے بے نیاز دھلا دھلایا نکھرا چہرہ جس پہ سجی دو مسحور کن آنکھیں بغیر کاجل کے ہی دل موہ لیا کرتیں۔

"ابھی سوڈ نمبر تین کا اسکرپٹ فائنل ہو گیا سر؟" گل نے گفتگو کا آغاز کرنے میں پہل کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"آنے والا ہے' میں نے محب اللہ کو فون کیا تھا' وہ نکل گیا ہے۔ آجائے تو مل کے اسکرپٹ ڈسکس کر لیں گے۔ ڈائریکٹر اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو بھی میں نے ایک گھنٹہ بعد میٹنگ کا ٹائم دیا ہے۔"

"اوکے سر پھر ہم اپنی سیٹ پہ چلتے ہیں۔ میٹنگ شروع ہونے پہ آجائیں گے۔" وہ اٹھنے لگی۔

"ایک میٹنگ اور بھی تو ڈیو ہے آپ پہ گل مہر!" اس نے دوبارہ سیٹ پہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"ڈسکس کرنے کے لیے ہمارے پاس ابھی سوڈ نمبر تین کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ کیوں' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

وہ لب بھینچ کے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مسلنے لگی۔ جانتی تھی یہ سوال ضرور ہو گا۔ جواب کیا دینا ہے' یہ بھی وہ طے کر چکی تھی مگر کیسے' یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔

"چلیے میں براہ راست اپنے اس دن والے سوال کی جانب آتا ہوں۔ کیا آپ کو اس کا جواب دینے کے لیے اور کچھ دن سوچنے کی ضرورت ہے۔"

"نہیں سر! ہمیں جواب دینے کے لیے مزید مہلت نہیں چاہیے۔" بالآخر اس نے لب کھولے۔

"اس لیے کہ ہم اس سوال کا جواب دینے کے اہل نہیں یا یوں کہیے آپ کو یہ سوال ہم سے کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

یک بیک شہزاد کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کا ماضی' اس کا شرمناک اور قابل گرفت ماضی برہنہ ہو کے گل مہر کے سامنے آگیا ہو اور اب وہ ناک ناک کے وار کرتی ہوئی اسے اس جسارت پہ —

"آپ نے غلط جگہ یہ سوال کیا سر! آپ کو یہ سوال ہم سے نہیں' ہمارے گھر والوں سے کرنا چاہیے تھا۔" نظریں جھکا کر کہا۔ اس کا یہ غیر مبہم فقرہ شہزاد میں گویا نئی روح پھونک گیا۔ حالانکہ اس نے نہ تو اس کی محبت کا اقرار کیا تھا' نہ کسی حوصلہ افزا رویے کی جھلک دکھائی تھی مگر فی الوقت تو اس کے لیے یہ بھی بہت تھا۔ اس نے گہری طمانیت بھری سانس لی اور اپنے ہر خوف' ہر اندیشے سے آزاد ہوتی نظریں ایک بار پھر اس کے چہرے کا طواف

کرنے پہ مامور کر دیں۔ اس چہرے پہ اب پہلے والی سراسیمگی مفقود تھی' البتہ حیا کے رنگ بدستور ہلکورے لے رہے تھے۔ جھکی پلکوں کے ساتھ وہ مسلسل اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے مسل رہی تھی۔

شہزاد کی مسلسل خاموشی پہ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"دراصل سر! ہمارے ہاں یہ فیصلے بزرگ ہی طے کیا کرتے ہیں۔ ہم لوگ اس کے مجاز نہیں کہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے دے سکیں۔ ہم نہیں جانتے کہ آپ کی اس بات پہ ہمارے خاندان کے بزرگوں کا ردعمل کیا ہو گا پھر ہم کیسے کوئی جواب دے سکتے ہیں۔ نہ ہاں میں اور نہ ہی ناں میں۔"

"یہ تو بے حد اچھی بات ہے گل مہر! اور یقین کیجیے کہ میں ں پہ بھی خاصا اطمینان محسوس کر رہا ہوں کہ کم از کم آپ نے مجھے اس بات کی تو اجازت دی کہ میں یہ سوال باضابطہ طور پہ آپ کے گھر پیش کر سکوں۔ ان فیکٹ میرا ارادہ بھی یہی تھا مگر مناسب سمجھا کہ اس سے قبل آپ کی رائے لے لوں کہ کہیں آپ انگیج تو نہیں یا کسی میں انٹرسٹڈ۔۔۔ یو نو' یہ فیصلے زبردستی کے تو نہیں ہوتے۔ آپ نے میری بات پہ ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ۔۔۔" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی اس ان کہی پہ ہی گل مہر کی بے چینی عروج پہ تھی اور وہ اسے مزید پریشان نہ کرنا چاہتا تھا۔

"ہم جاسکتے ہیں سر!"

"میٹنگ شروع ہونے میں اب کم ہی وقت۔۔۔" اس نے ریسٹ واچ پہ نظر دوڑائی پھر کوئی خیال آنے پہ سر ہلا دیا۔

"اوکے' آپ جائیے۔ باقی سب کے آنے پہ میں آپ کو کال کر لوں گا۔"

وہ بخوبی محسوس کر سکتا تھا کہ اس وقت اسے خود کو کمپوز کرنے کی اشد ضرورت ہے' ورنہ میٹنگ کے دوران بھی وہ یونہی نروس سی رہتی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے یہاں سے چلی جائے۔ سو اس نے فوراً "ہاں" والا چولا پہنا اور اسے نارمل ہونے میں مدد دینے کے لیے جانے کی اجازت دی' ورنہ دل کہاں چاہتا تھا کہ وہ ایک پل کے لیے بھی نظر سے دور ہو۔ یوں تو پہلی نظر میں ہی اس خوش بدن نے اسے چونکا کے رکھ دیا تھا۔ ہر بار وہ پہلے سے کہیں بڑھ کے دل کے اندر تک اترتی محسوس ہوئی تھی لیکن آج اس کا حیا بار روپ شہزاد ملک کو نئے طور سے آزما رہا تھا۔ اسے اپنے انتخاب پہ فخر محسوس ہو رہا تھا۔

❊ ❊ ❊

حسب وعدہ عمیص ڈیڑھ گھنٹے تک واپس آگیا اور حسب عادت اس کے پاس بچوں کے لیے بے شمار چیزیں تھیں۔ چونکہ وہ اردو بازار سے آیا تھا' اپنے اسٹور کے لیے اس نے کچھ اسٹیشنری خریدی تھی۔ اسی رعایتی قیمت پہ وہ بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لے آیا۔ پنسلوں کا پیکٹ' اردو اور انگلش کی درجن بھر کاپیاں اور چند رنگ برنگی کہانیوں کی کتابیں۔

"چلیں چچی جان!" اس نے شربت کا گلاس خالی کرنے کے بعد پوچھا۔ حالانکہ وہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی چادر اوڑھ چکی تھیں۔

"آپا! آپ بھی چلیے ناں۔ کل میرے اسٹور کا افتتاح ہے۔ دل چاہے تو رک جائیے گا' ورنہ شام کو آپ کو گھر واپس چھوڑ جاؤں گا۔"

"پہلے بتا دیتے میرے بھیا! ہم آپ کے بھائی صاحب سے ذکر کر چھوڑتے' اب یوں بلا اجازت بغیر بتائے کیسے چل پڑیں۔"

"صاحبزادی یاسمین درست کہہ رہی ہیں عمیص میاں! شرفا کی بی بیوں کے یہ اطوار نہیں ہوا کرتے کہ جب جی چاہا' گھر پہ قفل لگایا اور چل پڑیں۔ میاں گھر آئے تو بند دروازہ منہ چڑا رہا ہو اور تو اور آپ نے ہم سے بھی ذکر تک نہ کیا۔ صبح جب ہم گھر سے نکلے تب تک تو آپ نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ کل ہی آپ اپنے اسٹور

کا افتتاح کرنے والے ہیں۔"

"اور آپ یہ بھی ضرور کہیں گی کہ شرفا کے صاحبزادوں کے یہ اطوار نہیں ہوتے کہ وہ گھر میں بغیر کسی مشورے یا صلاح کے چپ چپاتے ایسے پروگرام بناتے پھریں۔" وہ ہنستے ہوئے انہیں چھیڑنے لگا۔ وہ جھینپ گئیں جیسے واقعی یہی کہنے جارہی ہوں۔

"دراصل اردو بازار سے میں نے جامع مسجد کے لیے سیپاروں کا ایک سیٹ بھی بطور ہدیہ پیش کرنے کے لیے خریدا تھا۔ وہیں امام صاحب سے بات ہوئی۔ کہنے لگے کہ کل جمعہ کا دن کاروبار کا آغاز کرنے کے لیے بڑا مناسب رہے گا اور کل مسجد میں قرآن خوانی بھی ہے۔ ماہانہ میلاد شریف بھی ہے۔ مسجد میں قرآن مجید حفظ کرنے والے بچے ہر ماہ ایک ایک قرآن مجید ختم کرتے ہیں اور میلاد کے بعد کسی کو بخش دیا جاتا ہے جو بھی درخواست کرے' ورنہ میرا ارادہ تو اتوار کو کرنے کا تھا کہ چھٹی کا دن ہوگا۔ اب سوچا ہے امام صاحب کا مشورہ درست ہے' میں کچھ انتظام کرکے کل کے میلاد شریف اور قرآن خوانی میں طالب علم بچوں کے لیے چائے ناشتے کا بندوبست کردیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے کام کا آغاز ہوگا۔ معصوم حافظ قرآن بچے کاروبار کی ترقی اور رزق میں برکت کے لیے دعا کریں گے۔ انشاءاللہ کل نماز جمعہ کے بعد چند ملنے جلنے والوں کو مدعو کرلوں گا۔ یہ کون سا کوئی فنکشن ہے جس کے لیے باقاعدہ لمبی چوڑی پلاننگ ہوتی یا باضابطہ دعوت نامے بھیجے جاتے۔ بس یہ خواہش ہے کہ زندگی کے اس اہم موڑ پہ پہلا قدم رکھتے ہوئے چند خیر خواہوں اور بزرگوں کی دعائیں ہمراہ ہوں۔"

"انشاءاللہ۔۔۔ انشاءاللہ۔" دونوں نے دہرایا۔

"بس اتنی مدد کوئی میری کردے کہ گھر جاکے جب میں چچا حضور سے کل اسٹور کا افتتاح کرنے کی درخواست کروں تو خدارا کوئی تو ہو جو ان کو رضامند کردے۔" اس نے ملتجی نظروں سے صاحبزادی حرمت النساء کو دیکھا تو وہ شش و پنج میں پڑ گئیں۔

"ہم۔۔۔ ہم کیسے۔۔۔؟ آپ جانتے ہیں کہ انہیں کسی بھی ایسی بات کے لیے رضامند کرنا کس قدر مشکل ہے جس کی مخالفت وہ ایک بار کرچکے ہوں اور ہمارے لیے تو سب سے بڑھ کے مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ آپ۔۔۔ صاحبزادی گل مہر۔۔۔ یہاں تک بھابھی بیگم بھی کبھی کبھی انہیں کسی نہ کسی بات پہ آمادہ کر ہی لیا کرتی ہیں' دلائل دے کر اپنی منوا بھی لیا کرتی ہیں مگر ہمارے لیے تو یہ ناممکنات میں سے ہے۔"

"ارے چچی جان! دراصل آپ نے خود کبھی اپنے آپ کو آزما کے ہی نہیں دیکھا۔" وہ ان کے بے چارگی بھرے لہجے پہ مسکرا کے رہ گیا۔

"آپ ایک بار کہہ کے تو دیکھیے' پھر دیکھیے کہ کیا ممکن ہے اور کیا ناممکن۔"

"آپ خود ہی بات کرلیجیے۔" انہوں نے صاف دامن چھڑا لیا۔

"یا پھر بھابھی بیگم سے سفارش کروائیے' شاید آپ کا کام بن جائے۔ ضرورت پڑی تو ہم آپ کی حمایت ضرور کریں گے۔"

واپس جاتے ہوئے انہیں پچھلی سیٹ کی جانب جاتے دیکھا تو عمیص ایک بار پھر جھنجلا گیا۔

"کمال ہے چچی جان! آپ پھر پچھلی سیٹ پہ بیٹھ رہی ہیں۔ مانا کہ یہ ٹیکسی ہے اور اسے میں ڈرائیو کررہا ہوں مگر فی الحال یہ ایک لحاظ سے میری ذاتی سواری ہے۔ میں اس کا ڈرائیور نہیں ہوں مگر پیچھے بیٹھ کے آپ یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں۔"

"نہیں عمیص میاں! ہم پچھلی نشست پہ ہی آرام سے بیٹھ پائیں گے۔ پہلے بھی آپ نے ضد کرکے اپنے برابر اگلی نشست پر بیٹھنے پہ مجبور کردیا۔ ہمارا تو دل ہولتا رہا۔ ساری عمر موٹر میں یوں کبھی بھی تن کے آگے نہیں بیٹھے۔ سارے رستے ایسے لگتا رہا جیسے بھری سڑک پہ دوڑ رہے ہوں۔ سامنے سے آتی ہر سواری منہ پہ لگتی محسوس ہو رہی ہو۔" وہ ان کی اس عجیب منطق پہ مسکرا کے رہ گیا اور مزید اصرار کا ارادہ ترک کردیا۔

صاحبزادی حرمت النساء پچھلی نشست پہ ایک جانب سمٹی سمٹائی' چادر سے پورے وجود اور آدھے سے زیادہ چہرے کو ڈھانپے بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور زیر لب وہ غالباً" قرآنی آیات کا ورد کررہی تھیں۔ سگنل پہ گاڑی روکتے ہوئے عمیص نے عقبی شیشے سے انہیں دیکھا تو ایک بار پھر چھیڑے بغیر نہ رہ سکا۔

"کمال ہے چچی جان! پیچھے بیٹھ کے بھی آپ اتنی ہی خوفزدہ ہیں جیسے میدان جنگ میں توپیں چل رہی ہوں آپ کے سامنے۔ یہ دیکھیے' یہ خاتون' یہ دھان پان سی محترمہ۔۔۔ کس خوداعتمادی اور بے فکری سے خود ڈرائیونگ کررہی ہیں۔" اس نے ذرا فاصلے پہ برابر میں رکی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی ایک جواں سال دوشیزہ کی جانب اشارہ کیا۔ صاحبزادی حرمت النساء نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور ان کی نظر گویا واپس پلٹنا بھول گئی۔ وہ بے یقینی سے اس چہرے کے ایک ایک نقش کو کھوج رہی تھیں۔ اچانک عمیص نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بھیڑ میں وہ چہرہ ضرور گم ہوگیا مگر خود صاحبزادی حرمت النساء اس چہرے میں اب تک گم تھیں۔

❊ ❊ ❊

عمیص اس بات کو جتنا سہل سمجھ رہا تھا' ایسا ہرگز نہ تھا۔ اس کی خام خیالی تھی کہ جس طرح پہلے مرحلے طے ہوگئے' یہ مرحلہ بھی آسانی سے سر ہوجائے گا مگر صاحبزادہ نفیس علی خان کی دنوں سے چھائی خاموشی ایک زبردست غضب کے ذریعے ٹوٹ گئی۔

"آپ کا جو دل چاہتا ہے کیجیے۔ ہم نے جس دل سے سہی مگر اجازت دے دی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب آپ ہمیں بے عزت کرنے کے لیے روز ایک نیا بہانہ تراش لائیں۔"

"چچا حضور! میں ایسا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" وہ تڑپ کے رہ گیا' اس بے بنیاد الزام پہ۔ وہ تو اس قدر مان اور احترام سے انہیں بتا رہا تھا کہ اس کی خواہش ہے اس کے پی سی او کا افتتاح ان کے ہاتھوں ہو۔ بڑے ہی جوش کے عالم میں اس نے آگاہ کیا تھا کہ وہ اپنے اسٹور کا نام بھی ان کے نام پہ رکھ رہا ہے مگر وہ تھے کہ یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔

"اپنی ضد پوری کرنے کے لیے اور محض ہمیں نیچا دکھانے کے لیے آپ ہر حد سے گزر سکتے ہیں اور یہ آپ ثابت کرچکے ہیں۔ آپ کی شہ پا کے صاحبزادی گل مہر کے حوصلے بلند ہوئے' ان کی حمایت میں آپ یوں تن کے کھڑے ہوئے کہ صرف اور صرف گھر میں دھڑے بازی نہ بننے کی نیت سے ہم نے ان کی ناجائز اور بے جا ضد بھی مان لی پھر آپ نے چوری چھپے ہمارے خاندان کے نام کو بٹا لگانے کی مذموم حرکت کی' ہم وہ بھی سہہ گئے۔ اپنے اس کام کا آغاز کرنے کے لیے آپ نے بے کار ضد اور فضول دلائل کے ذریعے ہمارے مدمقابل آنے کی کوشش کی' ہم اپنا وقار بچائے رکھنے کی خاطر اس پہ بھی خاموش ہوگئے کہ اگر ہمارے چھوٹے ہی ہماری عزت کا خیال نہیں کررہے تو کم از کم ہم خود ہی کرلیں اور آج آپ کی ہمت اتنی بڑھی کہ آپ اس نام کو سربازار اچھالنے کی خاطر اسے اپنی دکان پہ آویزاں کرنا چاہتے ہیں' اسی پہ اکتفا نہیں بلکہ ہمیں بطور خاص بلوا کے ہمارے ہی ہاتھوں یہ تماشا کروانا چاہتے ہیں۔"

"چچا حضور! آپ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ کہیں انہیں یہ کہنا بھی گستاخی کے زمرے میں نہ آتا ہو کہ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" پہلے ہی اس پہ زبان درازی' گستاخی' حکم عدولی' نافرمانی اور بغاوت کے لاتعداد الزامات تھے۔ اس نے چپ رہنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ ویسے بھی پچھلے کچھ روز سے وہ بے حد چپ چاپ تھے۔ عمیص سے ان کی یہ چپ برداشت نہ ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ جب بھی بولتے' ان کے یہ ارشادات اور فرمودات جو انہیں جان سے بڑھ کے عزیز تھے' انہیں سننا عمیص کی برداشت سے باہر تھا مگر یہ اس کی اپنے چچا سے فطری محبت تھی کہ وہ انہیں ہارا اور ٹوٹا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان کی یہ دل گرفتہ سی خاموشی اسے کئی روز سے کچوکے لگا رہی تھی۔ اب ان کے اندر کے غبار کو باہر نکلنے کا بہانہ ملا تو وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ اسی بہانے وہ اپنی بھڑاس تو نکال لیں۔ بھلے اس سے اس کے اپنے دل کو کتنی ہی ٹھیس کیوں نہ پہنچتی ہو۔ اپنے پرخلوص جذبات اور نیک نیتی کو غلط

معنی پہناتے دیکھنا اس کے لیے تکلیف دہ سہی لیکن وہ یہ تکلیف سر جھکائے خوش دلی سے سمیٹتا رہا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان خود ہی گرج برس کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

صاحبزادی حرمت النساء جنہوں نے ضرورت پڑنے پہ اس کی حمایت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہکابکا بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ موتیا ستون سے ٹیک لگائے دُکھی دل کے ساتھ عمیص کا بجھا ہوا چہرہ دیکھتی رہی۔

چند منٹ تک چھائے اس بوجھل سکوت کو گل مہر کی آواز نے توڑا۔ وہ مطلع صاف ہونے کے بعد اپنے کمرے سے نکلی۔

"ہاں جی، ہوگئی میٹنگ برخاست۔ کیا طے ہوا کل کی گرینڈ اوپننگ کے بارے میں۔ کیا ابا حضور نے چیف گیسٹ ہونے کا اعزاز بصد شکریہ قبول کرلیا یا۔" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ موتیا نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ یقیناً اس کے کمرے تک ابا حضور کی گرج دار آواز پہنچی ہوگی اور سارے قصے سے آگاہ ہونے کے باوجود محض عمیص کے زخموں پہ نمک پاشی کرنے کے ارادے سے اس نے کمرے سے باہر آنا گوارا کیا تھا، ورنہ آفس سے آنے کے بعد گویا وہ پہاڑ توڑ کے آئی تھی۔ وہ ہوتی اور اس کا کمرہ۔ اور اس کمرے کا بے چارا پلنگ جسے وہ اگلی صبح تک توڑا کرتی۔

"کہاں جناب! بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ چچا حضور اتنی آسانی سے ہم غریبوں کو بھلا کیسے دستیاب ہوسکتے ہیں۔" وہ حسب سابق اس کا طنز ہنس کے پی گیا۔

"محترمہ صاحبزادی گل مہر خانم! کیا آپ ہمارے کل کے گرینڈ اوپننگ فنکشن کی چیف جسٹس بننا قبول کریں گی۔"

موتیا عمیص کی اس پیشکش پہ بڑبڑا کے رہ گئی۔

"ابھی تسلی نہیں ہوئی جو مزید بے عزت ہونے کا پروگرام بنالیا۔" اور گل مہر نے موتیا کی توقع کے عین مطابق نخوت سے ناک چڑھائی۔

"کیوں، تمہارے خیال میں ہم۔ یعنی کہ ہم۔ تمہیں آسانی سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔" وہ ایک چبھتا ہوا سوال کرکے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی اور عمیص۔ اسے تو اس چبھن کو اب کتنی ہی دیر تک محسوس کرنا تھا۔ وہ سوچتی نظروں سے اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتا رہا جیسے جاننے کی کوشش کررہا ہو گل کے اس فقرے کے کتنے اور کون سے مطلب اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ موتیا نے اسے چھیڑنا مناسب نہ جانا، البتہ دلگیر رہ نہ سکا۔

"ہم دستیاب ہوں گے عمیص میاں، بسرو چشم ہوں گے، سر کے بل ہوں گے، ایک بار نہیں ہزار بار ہوں گے۔ آپ ہمیں بنا لیجیے اپنا شہ بالا۔"

"شہ بالا؟ میں کیا گھوڑی پہ چڑھنے والا ہوں۔"

"اللہ وہ مبارک دن لائے ہمیں خود آپ کی گھوڑی بن جاؤں گا۔" وہ فوراً اشتیاق سے اونگی بونگی مارنے لگا۔

"پھر تو دو لہا سے زیادہ باراتی دولہا کی سواری کا نظارہ کررہے ہوں گے۔" عمیص نے اس کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے سر دھن کر کہا۔

"کیا چیز ہو تم عمیص۔" موتیا اسے مسلسل تکتی اور مسلسل سوچتی رہی۔

"کیوں تمہارا دل اس طرح نہیں دکھتا جیسے میرا دکھتا ہے گل مہر کی باتوں پہ، کیوں تمہیں غصہ نہیں آتا جب ... اور مجھے ہی کیوں غصہ آتا ہے۔ میری بہن مجھے یکدم زہر کیوں لگنے لگتی ہے۔ اور ... اور تم ... تم عمیص ... تم کیسے ان زہر جملوں کو شہد کی طرح پی جاتے ہو۔ کیا تمہاری محبت اتنی ہی فراخ دل اور وسیع القلب ہے۔ اور کیا میری محبت اتنی ہی تنگ دل اور کم ظرف ہے۔"

"اے ... میں کیا ہوا، کیا تم خیالوں ہی خیالوں میں اس سجی سجائی گھوڑی کا دیدار کررہی ہو۔" عمیص نے اس کی محویت کو توڑا۔

"ہوں ... نہیں تو ... میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب تمہارے اسٹور کا افتتاح کون کرے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں جس پہ غور و خوص کیا جائے بلکہ میں تو سرے سے اس اہتمام کا قائل ہی نہیں۔ بس ایک اچھے کام کا آغاز اچھے طریقے سے ہونا چاہیے۔ اس کا اہتمام امام مسجد صاحب کررہے ہیں۔ میں تو صرف چچا حضور کے مبارک قدم ... خیر ... کوئی بات نہیں۔" اس نے لاپروائی ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن موتیا محسوس کرسکتی تھی کہ صاحبزادہ نفیس کے صاف انکار پہ وہ اندر سے کتنا ٹوٹ گیا ہے۔

* * *

"کیا بات ہے صاحبزادی حرمت النساء! جب سے آپ بٹیا کے ہاں سے آئی ہیں، مسلسل کھوئی کھوئی اور فکرمند سی ظاہر ہورہی ہیں۔ وہاں صاحبزادی یاسمین خیریت سے تو ہیں۔"

صاحبزادی خلعت النساء نے بہن کو عجیب کشمکش کے سے انداز میں گرفتار پاکر سوال کیا۔ خود تو وہ گوشہ نشین ہوچکی تھیں۔ کم ہی کہیں آیا جایا کرتیں۔ خصوصاً "یاسمین کے ہاں جانے کا تو انہیں کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان اور حرمت النساء ہی ہو آتے اگر ضرورت پڑتی لیکن ان کے محسوسات اتنے کمزور نہ ہوئے تھے کہ وہ یہ اندازہ نہ لگا پاتیں کہ کل وہاں سے آنے کے بعد سے ہی حرمت النساء کسی تذبذب کا شکار ہیں۔ بارہا انہیں محسوس ہوا کہ کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہیں۔

"ایسی خاص بات تو کوئی نہیں بھابھی بیگم! الحمدللہ، صاحبزادی یاسمین بھی خیریت کے ساتھ ہیں۔ یہ بات تو ہم آپ کو کل بھی بتا چکے ہیں۔"

"بجا مگر وہ بات آپ اب تک نہیں بتا پائیں جس کی وجہ سے آپ کا دل اور دماغ دونوں الجھن کا شکار ہیں۔ کیا آپ ہم سے بھی اپنی الجھن بیان نہیں کریں گی۔"

"آپ کے سوا اب ہمارا کون بڑا رہا ہے بھابھی بیگم! آپ سے تو ہمارے دو دو رشتے ہیں۔ کبھی آپ ہماری ماں جیسی آپا حضور ہیں تو کبھی قابل احترام بھابھی بیگم۔ میکے اور سسرال دونوں کے مان آپ سے وابستہ ہیں۔" وہ ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بے حد محبت سے کہنے لگیں۔

"تو کہہ دیجیے جو بھی پریشانی ہے۔ ابھی ہم اتنے عضو معطل بھی نہیں ہوئے کہ آپ کے کسی مسئلے کا حل نہ پیش کرسکیں۔ یہ بھی نہ سہی تو کم از کم تسلی تو دے سکتے ہیں۔ آپ کے دل کا بوجھ تو ہلکا کرسکتے ہیں۔"

"آپ ناحق اندیشوں میں مبتلا ہورہی ہیں۔ ہم ایک الجھن کا شکار ضرور ہیں مگر اس کا تعلق خدانخواستہ کسی بڑی پریشانی سے نہیں۔ دراصل ..." وہ کہتے کہتے پھر سے ہچکچائیں، ذرا توقف کے بعد بالآخر انہوں نے کل کے اس واقعے کا تذکرہ ان سے کر ہی دیا۔ سننے کے بعد چند لمحے تو صاحبزادی خلعت النساء گم صم سی ہوکے رہ گئیں۔ ان کے لب حیرت سے پھیلے اور آنکھیں بے یقینی سے ان پہ جمی رہ گئیں۔ سر جھٹک کے انہوں نے خود کو حیرت کی اس کیفیت سے آزاد کرایا۔

"حرمت النساء! آپ بھی ... کیسی عجیب سی بات کہہ دی آپ نے۔ ہمیں تو یقین نہیں آرہا کہ آپ باہوش و حواس ایسی بات کہہ سکتی ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ قدرے سخت ہوگیا۔ رد عمل کے طور پہ حرمت النساء کے چہرے کی رنگت خفت سے سرخ پڑ گئی۔

"ہم اسی لیے یہ بات دل میں دبائے ہوئے تھے، جانتے تھے کہ کوئی ہمارا یقین نہیں کرے گا۔"

"آپ خود سوچیے کس قدر بے بنیاد اور بے تکی سی بات ہے یہ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ سر راہ کسی اجنبی کو دیکھا سرسری طور پہ صرف ایک نظر اور اسی ایک نظر میں اس وہم میں مبتلا ہوگئیں آپ۔"

"یہ وہم نہیں ہے بھابھی بیگم! ہماری نظریں اس چہرے کے نقوش بھلا نہیں پارہیں۔"

"ہوتا ہے، ایسا بھی ہوا کرتا ہے۔" انہوں نے بہن کے شانے پہ ہاتھ دھر کے ان کی بے چینی کم کرنے کی

کوشش کی۔

"بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کسی چہرے کے نقوش کسی اور چہرے کی یاد دلاتے ہیں۔ کسی کی شبیہہ ہم کسی اور میں تلاشنے لگتے ہیں لیکن اس ابہام کو اس طرح ذہن پہ سوار کر لینا نری جذباتیت ہے۔ ہم تو آپ کو بے حد سمجھ دار جانتے تھے اور آپ ایسی بچکانہ باتیں کر رہی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے یہ واقعی وہم ہو لیکن اگر ہماری جگہ آپ ہوتیں تو شاید آپ کی بھی یہی کیفیت ہوتی۔ کسی کی زبانی سننا اور بات ہے، آنکھوں دیکھنا اور بات۔ آپ اگر وہ چہرہ دیکھ لیتیں تو ہمارے محسوسات کو جذباتیت نہ گردانتیں۔"

"بہر حال جو بھی ہے، اب اس کے متعلق بے کار سوچنا ترک کیجئے۔ ہم مان لیتے ہیں، واقعی حد درجہ مشابہت ہوگی۔ آپ کا ذہن بھی الجھا ہوگا لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کرتی ہیں نا کہ یہ مشابہت محض اتفاق ہوگا۔ بھلا اتنے سالوں بعد۔ بس آپ ذہن سے نکال باہر پھینکیے ان خیالات کو، خود کو ہلکا پھلکا کیجئے، ورنہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آپ کی الجھن آپ کے ہر عمل سے ہویدا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جو سوال ہم نے کیا ہے، وہ کچھ دیر بعد کوئی اور کر رہا ہو۔" اچانک کوئی خیال آنے پہ انہوں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"کہیں آپ نے اپنے واہمے کا تذکرہ بھائی صاحب سے تو نہیں کر دیا۔"

"نہیں بھابھی بیگم! ابھی تک تو نہیں۔ دراصل ہم فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اس کا ذکر نواب صاحب سے کرنا مناسب رہے گا یا نہیں۔"

"قطعی نامناسب اور غیر ضروری ہے۔ فی الوقت وہ پہلے ہی کئی گھریلو اور کاروباری الجھنوں کا شکار ہیں۔ ایسے میں اس بے معنی واقعے کا تذکرہ کر کے ان کے منتشر ذہن کو مزید پریشان کرنے سے کیا حاصل۔"

"اور وہ تو شاید اس سے بھی زیادہ سخت برا منائیں گے کہ ہمیں ضرورت کیا ہے اجنبی چہروں میں۔۔۔"

"جب آپ اپنے شوہر کے مزاج سے واقف ہیں تو پھر کیوں ایسی نوبت آنے دیتی ہیں۔ یہ کوئی بات ہے، جس کے لیے آپ کل سے ہلکان ہو رہی ہیں۔ ٹھیک ہے، ایک جھلک نے آپ کو قدرے الجھایا، اسے اب فراموش کیجئے اور اپنے ذہن و دل کو یکسو کیجئے۔"

"جی بہتر بھابھی بیگم!" وہ اور کیا کہہ سکتی تھیں۔

❋ ❋ ❋

مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد عمیص نے محلے کے چیدہ چیدہ بزرگوں کو وہیں روک لیا۔ نماز باجماعت سے قبل میلاد شریف اور ختم قرآن ادا ہو چکا تھا۔ دلگیر گھر سے شربت صندل کے کولر بنا کے لے آیا تھا۔ حلوائی نے حسبِ وقت پہ جلیبیاں، سموسے اور گلگلے بھجوا دیے۔ کچھ فروٹ اس کے دوست "تحفتاً" لے آئے۔ وہیں مسجد میں طالب علم بچوں اور حافظ قرآن قاریوں کے ساتھ اجتماعی دعا کے بعد سب کی تواضع کرائی گئی۔ آس پاس کی دکانوں میں بھی چیزیں بھیجی گئیں۔ باقی پھل اور سامان وہیں مسجد کے باہر غرباء اور بچوں میں تقسیم کرنے کے بعد وہ اسٹور پہ چلا آیا۔

"آپ چلیے عمیص میاں! ہم بس ابھی گئے اور ابھی آئے۔" اچانک دلگیر پلٹا۔

"تم بے شک اور بصد شوق ابھی جاؤ مگر "ابھی" دوبارہ آنے کی خاص ضرورت نہیں۔" عمیص نے شٹر اوپر چڑھایا۔ ایک طرف ٹیبل اور چیئر پہ دو ٹیلی فون سیٹ دھرے تھے۔ چند رسیدی کاپیاں، ایک رجسٹر، ایک پین ہولڈر بھی رکھا تھا۔ دیوار کے ساتھ دو مختصر کیبن تھے جو خواتین کے لیے ٹیلی فون بوتھ کی شکل میں ہارڈ بورڈ سے بنائے گئے تھے۔ ایک چھت کا پنکھا اور ایک کیبن کے اوپر دیوار پہ نصب تھا۔ دوسری جانب کی دیوار کے ساتھ رکھے شوکیس میں نیٹ کارڈز، موبائل کمپنیز کے پے کارڈز، کچھ اسٹیشنری اور چند ماہانہ رسائل و جرائد سجے تھے۔ پہلے سے صاف ستھرے اسٹور میں اس نے یونہی شوق شوق میں کچھ اور صفائی اور جھاڑ پونچھ کی۔ کیلنڈر پہ آج کی تاریخ میں سرخ حاشیہ لگایا۔

"دیکھیے، ہم آگئے۔ کہا تھا نا، یہ گئے اور یہ آئے۔" دلگیر کی چہکتی آواز پہ عمیص نے گردن موڑ کے دیکھا۔ اس کے ہمراہ سیاہ چادر میں لپٹی وہ موتیا تھی۔

"تم۔۔۔؟ تم کیسے۔" وہ حیران ہوا۔

"امی حضور سے اجازت لے کے آئی ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر خیریت تو ہے، کوئی کام تھا کیا۔"

اس کی حیرت بجا تھی۔ گل مہر کا ملازمت کرنا ایک الگ معاملہ تھا مگر موتیا نے ہمیشہ صاحبزادہ نفیس علی خان کے اصولوں کی پاسداری کی تھی اور بلا ضرورت کبھی بھی گھر سے نہ نکلتی تھی۔

"خیریت ہی ہے جناب! مارکیٹ میں عموماً "شاپنگ کی نیت سے آیا جاتا ہے اور شاپنگ کی نیت بھی غالباً" خیریت کی حالت میں ہی کی جاتی ہے۔"

"او وہ تو آپ محترمہ شاپنگ کرنے نکلی ہیں۔" وہ اس کا ارادہ جان کے مسکرایا۔

"جی اور ظاہر ہے اقربا پروری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ سوچا کہ ہمارے عزیزوں کو ہی کوئی فائدہ کیوں نہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ مارے مروت اور لحاظ کے وہ کچھ رعایتی قیمت پہ ہی شاپنگ کرا دیں۔ کیوں عمیص، تعلق داری اور دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے قیمت میں کچھ کمی بیشی ہوگی یا نہیں۔" وہ شوکیس میں سجی اشیاء کا جائزہ لیتی پوچھ رہی تھی۔

"صرف تعلق داری اور دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے ہی نہیں بلکہ اپنی دکان کے پہلے گاہک کے اعزاز میں، میں قیمت تقریباً" آدھی کرنے پہ تیار ہوں۔"

"مگر میں لوں کیا، یہ نیٹ کارڈز اور فون کارڈز تو میرے کسی کام کے نہیں، نہ میرے پاس موبائل ہے، نہ ہی کمپیوٹر۔ فون بھی کسی کو نہیں کرنا، ورنہ ایک آدھ کال کے ذریعے ہی "بوہنی" کروا دیتی۔ چلو ایسا کرو، یہ والا بال پوائنٹ دکھاؤ اور ہاں، وہ ڈائری بھی۔"

عمیص نے اس کی مطلوبہ اشیاء نکال کے سامنے رکھیں۔

"یہ میوزیکل ڈائری ہے، کھولنے پہ بے حد خوبصورت ساز بکھر جاتے ہیں۔" اس نے کھول کے دکھایا۔ ایک دلکش سی دھن گونجنے لگی۔

"نہ بابا نا، یہ نہیں چاہیے۔ جب کچھ لکھنے لگوں گی، سارے گھر کو پتہ چل جائے گا۔ یہ تو بڑی بھانڈہ پھوڑ اور چغل خور ڈائری ہے۔"

"اس کی یہ دونوں بدعادات ایک لحاظ سے تمہارے لیے تو فائدہ مند ہی ہیں۔ دیکھو نا، اگر کوئی چوری چھپے تمہاری ڈائری پڑھنے کی کوشش کرے گا تو چاہے گھر کے کسی کونے میں بھی ہوگی، یہ ڈائری چغلی لگا دے گی اور تم چاہو تو مذکورہ مذموم حرکت میں ملوث شخص کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکتی ہو۔" اس نے ایک کامیاب سیلزمین بنتے ہوئے ڈائری اسے بیچنے کی پوری پوری کوشش کی۔

"جی نہیں، مجھے شوق نہیں کسی کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا۔"

"اچھا پھر یہ دیکھو، اس ڈائری میں لاک بھی ہے۔ ایکدم رازدار اور سیف ڈائری۔"

"جسے راز کھولنے ہوں، وہ ہزار تالے توڑ سکتا ہے۔ بس تم اس پین کی قیمت بتاؤ۔"

"اس پہ لکھی ہے۔"

"اسی روپے۔" وہ حیرت سے چلائی۔

"ایسی کیا خاص بات ہے اس میں، کیا اس سے لکھنے کے لیے ہاتھ چلانے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی، خود بخود لکھ لیتا ہے؟"

"جی نہیں، لکھنے کی زحمت تو خود کرنا پڑتی ہے البتہ اتنی مہربانی یہ پین ضرور کرتا ہے کہ جب اس سے ورق پہ لفظ بکھیرے جاتے ہیں تو خوشبو یہ خود بخود بکھیر دیتا ہے، یہ پرفیومڈ پین ہے۔"

"تو پھر میرے کس کام کا، میں نے کون سا لو لیٹر لکھنے ہیں۔" اس نے ناک چڑھا کے اسے بھی پرے کیا۔

"میں نے تو پین سے ہفتہ وار منگائے جانے والے سودا سلف اور سبزی گوشت کا حساب لکھنا ہوتا ہے۔ لہسن، ادرک، گوبھی یا پھر ہلدی، سرف اور تیل میں سے خوشبو کے جھونکے اٹھا کے یہ پین میرے پہ کیا احسان کرے گا۔ فضول میں اسی روپے برباد ہوں گے۔"

"تو پھر محترمہ! اور کیا پیش کیا جائے آپ کی خدمت میں۔" اب کے عمیص سچ مچ زچ ہو گیا۔

"تمہیں کچھ پسند بھی آئے گا یا نہیں۔"

"اے.... تمیز سے.... کسٹمرز سے ایسے روڈلی بات کی جاتی ہے کیا۔" موتیا نے آنکھیں نکالیں۔ "اچھا بھلا محترمہ محترمہ کہتے پٹڑی سے کیوں اتر رہے ہو۔ دکانداری ایسے نہیں ہوتی عمیص صاحب! تم پہلے ہی کسٹمر سے تنگ آ گئے۔ سیلز مین کی قوت برداشت قابل رشک حد تک بلکہ ڈھٹائی کی حد تک مضبوط ہونی چاہیے۔"

"چلیں جی، ٹھیک ہے۔ لیجئے آپ میری قوت برداشت کا امتحان۔"

"نہیں، خیر ایسی بات بھی نہیں۔ یہ والا پین نکالنا۔" اس نے ایک عام سے تین روپے والے بال پوائنٹ کی جانب اشارہ کیا۔

"کتنے؟"

"ایک اور بھلا کتنے۔ تمہارا خیال ہے میں درجن بھر لوں گی۔"

"واہ عمیص علی خان! کیا زبردست "بوہنی" ہوئی ہے۔" اس نے پین نکال کر آگے رکھا۔

"تم نے کہا تھا تم اپنی دکان کے پہلے گاہک کو آدھی قیمت تک رعایت دو گے۔"

"اب تین روپے میں کیا رعایت دوں؟"

"ڈیڑھ روپے کی۔" دلگیر نے حساب میں مدد دی۔

"لیکن اب اٹھنی کہاں رہی۔ چلو کیا یاد کرو گے، میں تمہیں پورے دو روپے دے دیتی ہوں۔" موتیا نے دو روپے کا سکہ شاہانہ انداز میں آگے کیا جسے عمیص نے قابل دید مشکور و ممنون انداز میں اٹھا کے آنکھوں سے لگایا۔

"بڑی مہربانی، آپ یہ بھی نہ دیتیں تو میں آپ کا کیا بگاڑ لیتا۔"

"اسے پیک کر دو۔" موتیا نے سائیڈ پہ رکھے ریک میں سے خوبصورت ریپرز منتخب کرتے ہوئے نیا آرڈر دیا۔

"کیا؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ تین.... بلکہ دو روپے کی چیز کے لیے یہ پانچ روپے کا گفٹ پیپر بھی ضائع کر دوں۔"

"نہ صرف یہ بلکہ اوپر خوبصورت سا ربن بھی لگانا۔ مجھے یہ کسی کو گفٹ کرنا ہے۔"

"اللہ رحم کرے اس پہ جسے یہ گفٹ ملنے والا ہے۔ گفٹ ریپر کے پانچ اور ربن کے آٹھ روپے مزید نکالو۔"

"کیا کرو گے پیسے لے کے۔ گفٹ پیپر بھی تمہارے پاس رہے گا اور ربن بھی۔ دراصل یہ گفٹ میں تمہیں ہی تو دینے والی ہوں۔ بعد میں بے شک یہ دونوں چیزیں واپس سیل کے لیے رکھ دینا۔ ہاں، البتہ بال پوائنٹ خالصتاً گفٹ ہے اسے استعمال نہ کرنا اٹی کیٹس کے خلاف ہو گا۔"

"تم اور گفٹ....؟ وہ بھی مجھے؟" وہ بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

"اور وہ بھی پورے دو روپے کا۔" دلگیر نے اضافہ کیا۔

"دیکھ لو تمہارے لیے اپنے اصولوں میں ترمیم کی ہے۔"

"مان میرا احسان ارے نادان۔" دلگیر کی رگ موسیقی پھڑکی اور کیا بر وقت پھڑکی۔

مان میرا احسان ارے نادان
کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار

عمیص کو چڑانے میں مصروف موتیا ہل کے رہ گئی۔ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ اس نے چونک کے عمیص کو دیکھا۔ وہ کسی خاص تاثر کے بغیر دلگیر کی لوچ دار آواز کا ساتھ شوکیس پہ تال بجا کے دے رہا تھا۔

"بس کرو، ورنہ لوگ اسے بینڈ باجے کی دکان سمجھیں گے۔" اس نے گھبرا کے ٹوکا۔

"یار دلگیر! تم کچھ نہیں خریدو گے؟" اس نے جاتے جاتے پھر دونوں کو روکا۔

"خریدنا تو چاہتے ہیں عمیص میاں! مگر کیا کروں کچھ پسند ہی نہیں آیا۔ برا مت ماننا۔" وہ رک کے ناقدانہ انداز میں ایک بار پھر جائزہ لینے لگا۔

"تمہاری خاطر اب اس میں طبلے، سارنگی کا اضافہ کرنا پڑے گا۔"

"ہاں تاکہ ابا حضور جو اب تک خاصی برداشت سے کام لے رہے ہیں، پیٹرول چھڑک کے تمہارا یہ اسٹور ہی...." "یار! خدا کا واسطہ ہے اچھا بول منہ سے نکالو۔ آج میرا پہلا دن ہے۔"

❊ ❊ ❊

"آپ کی شخصیت کبھی کبھار تضاد کا شکار لگتی ہے مغل صاحب!" ایک دن ادا نے بابر ہمایوں مغل پہ اپنی الجھن آشکار کر ہی دی۔ وہ ساحرانہ انداز میں مسکرایا۔

"یہاں کون ہے ادا جی جس کی شخصیت تضاد کا شکار نہیں۔ یہی تضاد تو حیات کا حسن ہے۔ آپ کے سامنے کسی اور کی مثال کیا پیش کی جائے، آپ خود کو ہی دیکھ لیجئے۔ ہم آپ کے صرف اس روپ سے آگاہ ہیں لیکن خود آپ اپنی شخصیت کے دیگر پہلوؤں سے بھی واقف ہوں گی اور یہ تسلیم کریں گی کہ وہ سب پہلو آپ کے اس روپ سے یکسر مختلف ہوں گے۔"

وہ چند ثانیے کے لیے چپ رہ گئی جیسے اس کی بات سے اتفاق تو ہو مگر تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو۔

"آپ کا کہنا درست مگر میں اس تضاد کی بات نہیں کر رہی۔ یہ واقعی ٹھیک ہے کہ ہر شخص کی زندگی کے بہت سے پہلو ایسے ہوتے ہیں جو دیگر پہلوؤں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں لیکن میرا کہنے کا مطلب اور تھا۔"

"کہیے، کھل کے کہیے۔" اس نے سگریٹ سلگایا۔

"اکثر لوگوں کو آپ کے بارے میں کچھ عجیب سی قیاس آرائیاں کرتے سنا ہے۔ یقین اس لیے نہیں آتا کہ جتنا بھی اتنے کم عرصے میں، میں آپ کو جان پائی ہوں، وہ ان افواہوں سے خاصا الگ تاثر لیے ہوئے ہے لیکن الجھن اس لیے ہوتی ہے کہ اتنے لوگ یہ بات کرتے ہیں تو آخر کس لیے 'کیوں۔" وہ نگاہ کے خبردار کرنے پہ پہلے ہی ٹھٹک گئی تھی پھر بعد میں اسے دو تین بار بابر ہمایوں مغل کے ہمراہ دیکھ کر چند ایک اور خیر خواہوں نے بھی ٹوکا۔ تب وہ یہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے جو اس کے لیے خطرناک یا نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے جبکہ بظاہر وہ خاصا مہذب اور سلجھا ہوا انسان نظر آتا ہے۔ اس پروفیشن میں ٹکرانے والے دیگر افراد سے یکسر مختلف۔

"یقیناً آپ سوچتی ہوں گی کہ ان باتوں کو کتنے لوگ دہرا رہے ہیں تو ان میں کچھ تو حقیقت ہو گی۔ کچھ نہیں، ادا جی، بہت کچھ درست ہے۔ ہم کسی کو غلط قرار نہیں دیں گے۔ یا ان کے اپنے بارے میں لگائے اندازوں کو جھٹلائیں گے۔ ہاں، ہم جانتے ہیں کہ ہم حسن پرست ہیں، حسن ہر حال میں، ہر رنگ میں اپنی جانب کھینچتا ہے ہمیں۔" اس نے راکھ سامنے رکھی ایش ٹرے میں جھٹکتے ہوئے تسلیم کیا۔ ادا کی نگاہوں میں بے یقینی در آئی۔

"ہاں ہر حال میں۔ یعنی حسن کا ہر روپ ہمارے نزدیک داد و تحسین کا مستحق ہے اور ہم اسے خراج تحسین پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام بھی نہیں لیتے۔ یہ تو آپ بھی جانتی ہوں گی یہاں حسن کن رنگوں میں بکھرا ہے۔ کوئی آواز کے ذریعے سحر جگاتا ہے تو کوئی ناز و عشوہ کے ذریعے اپنی خوبصورتی کا احساس دلاتا ہے اور یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ آواز و ناز کے ذریعے حسن جگانے والوں کو خراج میں کیا وصول کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔ ہم نے

کبھی انہیں مایوس نہیں کیا لیکن جس طرح حسن کے الگ الگ انداز' مختلف ڈھنگ ہوتے ہیں' اسی طرح ہر انداز ایک مختلف خراج کا مستحق ہوتا ہے۔ آپ کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ حسن کے سب پہلو مجسم ہو کے سامنے آئیں تو کیا ہوتا ہے۔ ہم نے آپ میں صرف ایک کھنکتی آواز ہی نہیں پائی' ایک دلکش سراپا نہیں دیکھا۔ آپ کا انداز نشست و برخاست' آپ کی سنبھلی ہوئی' سلجھی ہوئی گفتگو' آپ کے خیالات کی گہرائی' آپ کی سوچوں کی نزاکت' آپ کی روح کی پاکیزگی۔۔۔ کیا نہیں ہے جس پہ ہم لٹ جانے کو تیار رہوں اور یہ سب۔۔۔ یعنی آپ کے حسن کی ہمہ جہتی اور ہمہ صفتی اس خراج کی مستحق نہیں ہے' جو ہم اس سے پہلے ادا کرتے رہے ہیں۔ واللہ اگر ہمارے پاس قارون کا خزانہ ہوتا اور ہم اس کا منہ آپ کی جانب کھول دیتے' تب بھی یہ خراج ادا نہ ہو پاتا۔ حسن کے اس بیش بہا مجموعے کو پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف خلوص اور عقیدت ہے' دوستی ہے اور۔۔۔"

اس نے مبہم انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے سگریٹ ایک بار پھر لبوں میں دبا لیا۔ اس کی لچھے دار گفتگو کے پیچ و خم میں کھوئی ادا ایک بار پھر حال میں آ گئی۔

"پتہ نہیں آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں' مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بات صرف آواز اور صورت کی تعریف کی حد تک ہوتی تو اس پروفیشن میں آنے کے بعد یہ سننا میرے لیے غیر معمولی بات نہیں رہی مگر خیالات کی گہرائی' سوچوں کی نزاکت اور روح کی پاکیزگی۔ مغل صاحب۔۔۔ آپ واقعی مختلف ہیں' اوروں سے بالکل مختلف۔"

● ● ●

"شکر کرو اس کنجوس نے دو روپے خرچ کرنے کی بھی ہمت کی۔" گل مہر نے عمیص کی زبانی موتیا کی خریداری کا واقعہ سنتے ہوئے ہنس کر تبصرہ کیا۔

چھٹی کا دن تھا بلکہ شام' عرصے بعد شام کی چائے کا مزہ آ رہا تھا۔ گرمیوں نے تو چائے کا لطف اور مل بیٹھ کر پینے کی روایت کو ہی ختم کر ڈالا تھا۔ چائے کا نشہ جن کو لگا ہو' موسم کی تباہ کن گرمی بھی اس چسکے کو پورا کرنے سے روک نہیں پاتی۔ ایک ڈیوٹی کی طرح صبح و شام چائے پینا "نبھانا" ہی پڑتا ہے لیکن اتنی ہمت نہ تو بنانے والے میں ہوتی ہے کہ وہ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات بھی گرمی میں چولہے کے آگے کھڑے ہو کے بنائے اور نہ ہی پینے والے کا دل چاہتا ہے۔

گرمیاں تقریباً "رخصت ہو چکی تھیں۔ اصولاً" تو اگست کے اختتام کے ساتھ ہی گرمیوں کا بھی انجام ہو جانا چاہیے لیکن گرمیوں کا موسم لاہور کے لیے بڑا "باوفا" ثابت ہوتا ہے۔ جب تک سردیاں سر پہ نہ آ جائیں' یہ رخصت ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ غنیمت تھا کہ دوپہر ڈھلنے کے بعد موسم قدرے خوشگوار ہو جاتا ہے۔

آج بھی شام بڑے سہانے ڈھنگ سے اس آنگن میں اتری تھی۔ دوپہر ہی سے دھوپ کی حدت میں کمی تھی۔ آثار اچھے دیکھ کے موتیا کو بھی ترنگ اٹھی اور وہ ڈائجسٹ چھوڑ کر سہ پہر ہی سے کچن میں جا گھسی۔ یہ اس کا برسوں پرانا معمول تھا۔ دوپہر کی نیند ہمیشہ اس پہ نامہربان رہی تھی۔ دوپہر کو سارے کام نمٹا لینے کے بعد وہ ہوتی' اس کا پلنگ ہوتا اور اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ڈائجسٹ یا شعری مجموعہ۔ جبکہ باقی سارا گھر قیلولہ فرمانے میں مصروف ہوتا۔

اس نے بڑا دل لگا کے بیسن گھولا۔ انار دانہ' خشک دھنیا' میٹھا سوڈا' مسالاجات اور ہری مرچیں ڈال کر ہاتھوں سے خوب دیر تک پھینٹتی رہی۔ میدے میں پسی ہوئی شکر' الائچی پاؤڈر اور گھی ڈال کر میٹھی پوریوں کا آمیزہ بھی تیار کر ڈالا۔ ساڑھے چار بجے ادھر اس نے چائے کا پانی رکھا' ادھر دوسرے چولہے پہ کڑاہی چڑھا کے دلگیر کو پکوڑے تلنے کھڑا کیا۔ پوریاں اس نے خود چائے دم لگ چکنے کے بعد احتیاط سے تلیں۔ آنگن کے سنگی چبوترے پہ سب کچھ رکھنے کے بعد اس نے الگ ٹرے میں امی حضور اور چچی حضور کے لیے ناشتا چائے سجا کے دلگیر کے ہاتھ اندر بھجوایا' اس کو عمیص اور گل مہر کو بلانے کا بھی کہا اور خود انتظار میں بیٹھ گئی۔ یونہی اسے ایک خیال سا آیا۔

"ضروری تو نہیں کہ میرا موڈ اچھا ہے تو باقی سب کا بھی ہو۔ یہ شام مجھے کھل کے ہنسنے گنگنانے پہ اکسا رہی ہے تو باقی سب پہ بھی اسی خوشگوار انداز میں اثر انداز ہو رہی ہو۔ عمیص تو شاید۔۔۔ مگر گل کا پتہ نہیں۔ اسے تو چھٹی والے دن بستر پہ اینڈنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ مل کر بیٹھنے پہ تو پہلے بھی کم کم راضی ہوتی تھی' آج کل تو ویسے بھی زیادہ ہی الگ تھلگ رہنے لگی ہے۔ جب دیکھو' چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں تکتی کچھ نہ کچھ سوچ رہی ہوتی ہے۔ مشکل ہی ہے کہ وہ باہر آئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے اسے نہ پا کر عمیص مایوس ہو جائے اور یہ شام۔۔۔ یہ شام اس کے ساتھ گزارنے کی جو عجیب سی خواہش یکایک میرے اندر بھڑکی ہے' وہ اس کی بے دلی اور مایوسی کی نذر ہو جائے۔"

اچانک اس کا جذبوں سے دمکتا معصوم اور بے ریا دل بجھ کے رہ گیا۔ چند منٹ کے بعد دلگیر کو واپس لوٹتے دیکھا تو غیر ارادی طور پہ اس کی نظریں بے چینی سے اس کے پیچھے کسی کو تلاش کرنے لگیں۔ اچانک اس کا دل جیسے پھر سے جی اٹھا۔ وہ گل مہر تھی جو اپنے لانبے ہلکے ہلکے نم بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل دیتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں اترتی دالان تک آ رہی تھی۔

"اب تو عمیص بھی۔۔۔" وہ اس نئے احساس پہ خود ہی حیران ہو گئی۔

"یہ میں کس منزل پہ آ چکی ہوں۔ یہ تو صرف دوستی تھی' پھر پسندیدگی اور ہاں جب محبت میں بدلی تو تب بھی میں نے اسے تسلیم کرنے میں وقت نہ لگایا مگر یہ کیا ہے' کیا محبت میں انسان اتنا وسیع القلب بھی ہو جایا کرتا ہے کہ محبوب کے ساتھ ساتھ محبوب کا محبوب بھی پیارا ہو جاتا ہے۔ نہیں محبت تو بڑا پوزیسو سا اور کم ہمت سا جذبہ ہے۔ یہ تو عشق کے آثار ہیں کیا میں اب عشق کی اس منزل تک پہنچ چکی ہوں کہ۔۔۔"

گل کے آنے پہ اس کا دل اس لیے مارے خوشی کے انجانی سی تال پہ ناچ اٹھا تھا کہ اب عمیص بھی یہاں موجود ہو گا اور ضرور ہو گا اور یہ درست بھی تھا۔ بکھرے بالوں میں انگلیاں چلا کر سنوارتا ہوا عمیص واضح بے دلی کے تاثرات کے ساتھ برآمدے میں کھڑا نظر آیا تھا۔ شاید گہری نیند سے جاگ کر دالان تک آ کر چائے پینے کی زحمت کرنا اسے خاصا ناگوار گزرا تھا لیکن چبوترے کے نزدیک موڑھا گھسیٹ کر بیٹھتی گل کو دیکھ کے اس کے تاثرات آناً "فاناً" بدل گئے۔ ساری کوفت اور سستی بھک سے اڑ گئی۔ وہ سیدھا اس جانب آنے کی بجائے جامن کے پیڑ کے ساتھ لگے نلکے کی طرف گیا اور تازہ پانی کے چھپاکے چہرے پہ مار کے بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

موتیا نے ایک نظر سامنے بیٹھی گل پہ ڈالی جو املی کی چٹنی کے ساتھ آلو کے پکوڑے چٹخارے لے لے کر کھا رہی تھی۔ وہ شاید کچھ دیر قبل ہی نہا کے نکلی تھی۔ جارجٹ کا پلین لائٹ گرین سوٹ' پرنٹڈ جارجٹ کا دوپٹہ شانوں پہ پھیلا تھا جس میں پیلا اور سبز رنگ نمایاں تھا۔ گیلے بال اس نے اب تک سلجھائے نہ تھا البتہ یہاں آتے ہوئے انہیں سمیٹ ضرور لیا تھا' چند الجھی لٹیں اس کے صبیح چہرے پہ جھول رہی تھیں۔

موتیا نے حیرت اور رشک کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھا۔ وہ حسین تو ہمیشہ سے تھی' اس کا اعتراف موتیا نے کئی بار کیا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے کچھ زیادہ ہی دلکش نظر آنے لگی تھی۔ اس کی رنگت مزید نکھر گئی تھی گلابی پن سرخی چھلکانے لگا تھا' بڑی بڑی خوش رنگ آنکھوں سے عجیب مستی سی چھلکنے لگی تھی۔ موتیا نے غیر محسوس انداز میں اپنا سرسری سا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ دوپہر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غسل کر کے یہ جوڑا پہنا تھا لیکن دوپہر کو کروٹیں بدل بدل کر افسانے پڑھنے کی وجہ سے کاٹن کا یہ کرتے اور میرون سوٹ اس وقت شکنوں سے پر تھا جبکہ قمیص کے ہلکے کرے دامن پہ گھی کے چھینٹے واضح نظر آ رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ گود میں پھیلا کے رکھتے ہوئے ان داغوں کو چھپانے کی کوشش کی۔ انگلیوں کے ناخنوں میں بیسن جما ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے فوراً" مٹھیاں بھینچ لیں۔

"زبردست' مزا آ جائے گا آج تو چائے پیتے ہوئے۔"

عمیص کی بات پہ موتیا نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس نے یہ جملہ گل کی یہاں موجودگی کی وجہ سے

نہیں بلکہ چائے کے اس اہتمام کی وجہ سے کہا ہے۔

"موسم بھی سہانا' سنگت بھی۔۔۔"

اگلے فقرے کے آخری دو لفظ اگرچہ اس نے بہت مدھم سروں میں گل کے برابر بیٹھتے ہوئے کہے تھے لیکن موتیا جس کا رواں رواں اس کی آہٹ تک سننے کے لیے بے تاب رہتا تھا' اس تک یہ آواز بخوبی پہنچ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے برابر خالی نشست کو دیکھا۔

"چلو کوئی بات نہیں' تم برابر نہ سہی۔۔۔ مقابل تو ہو۔ تمہارا "ساتھ" ہونا اتنا اہم نہیں' جتنا "سامنے ہونا ہے"

اس نے دل کو تسلی دی۔ لیکن جس کے ساتھ وہ تھا اس کے لیے تو اس کا نہ ساتھ ہونا کوئی بھی اہمیت رکھتا تھا نہ ہی سامنے ہونا۔ وہ مکمل توجہ کے ساتھ چائے اور پکوڑوں سے انصاف کر رہی تھی۔

"اور سناؤ' تمہارا اسٹور کیسا چل رہا ہے؟"

ٹشو سے ہاتھ پونچھنے کے بعد بالآخر اسے اپنے اردگرد بیٹھے نفوس سے ہم کلام ہونے کا خیال آ ہی گیا۔

"شکر ہے اللہ کا' موتیا جیسے دو چار کرم فرما اور مل جائیں تو سودا گھاٹے کا نہیں۔" اس نے اپنے اسٹور کی بوہنی کا واقعہ نمک مرچ لگا کے سنایا۔

"یعنی اوپننگ کمال کی رہی۔ شکر کرو اس کنجوس نے دو روپے تو خرچ کیے۔ تم خوش قسمت ہو عمیص۔" اس نے چائے کا کپ دوبارہ بھرتے ہوئے ہنس کے کہا تو عمیص نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔

"ثابت کرو تو جانوں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ میں خوش قسمت ہوں۔"

"اوہ پلیز عمیص' فار گاڈ سیک' پھر سے پہیلیوں والی الجھی الجھی باتیں مت کرو۔ آج ہمارا موڈ بہت اچھا ہے اور ہم اسے خراب نہیں کرنا چاہتے۔ پتہ نہیں ایسی باتیں کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم بہت دانش ور قسم کے انسان ہو' فلسفہ جھاڑ سکتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

عمیص حیران رہ گیا کہ اس نے بھلا کون سا فلسفہ جھاڑا ہے۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے عمیص۔ جسے دل کے معاملات سے آگہی ہی نہ ہو' اسے دل کی صاف صاف باتیں بھی الجھی ہوئی لگا کرتی ہیں۔ بلکہ تم۔۔۔ تم جو خود دل کے معاملے میں الجھے ہوئے ہو' تمہیں بھلا کب میرے دل کی پکار سنائی دیتی ہے۔" موتیا نے پھر سے خود کلامی کی۔

"اور تم کیوں اتنی چپ چاپ ہو؟" اب گل نے اس کی جانب نظر کرم کی۔

"چپ رہ کے ہی سنا جا سکتا ہے ناں۔" موتیا نے ساری یاسیت کو جھٹکے سے اتار پھینکا۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے کہ تم پچھلے کچھ دنوں سے بہت چپ چاپ بلکہ گم صم رہنے لگی ہو۔" اس نے گل کا سوال اسی کی جانب لوٹا دیا۔

"بیٹھے بیٹھے خیالوں میں کھو جاتی ہو۔"

گل کا چائے میں چمچہ ہلاتا ہاتھ لمحہ بھر کو ساکت ہوا۔ اس کی خوابناک آنکھیں کسی خوش کن خیال سے جگمگا اٹھیں۔ عمیص نے تعجب اور موتیا نے معنی خیز انداز سے اس کے چہرے پہ اترتے رنگ دیکھے۔ یکبارگی اس نے سر جھکا اور مسکرا دی۔

"ہم پہلے کون سا زبان کے فراٹے بھرا کرتے تھے۔ رہی بات بیٹھے بیٹھے کھو جانے کی۔۔۔ تو شکر کرو ہم بیٹھے بیٹھے کھو جاتے ہیں یعنی کھو جانے کے باوجود وہیں کے وہیں موجود تو رہتے ہیں' سوچو ذرا اگر ہم چلتے پھرتے کھونے لگیں تو پھر؟"

"بات کو ٹالو مت۔"

"بھئی' دل کرتا ہے ناں کبھی کبھی کھو جانے کو۔ کھو جانے سے انسان کو اکثر بہت کچھ مل بھی تو جاتا ہے۔ کبھی تم بھی کھو کے دیکھو اور کچھ نہیں تو اپنا آپ میسر آجاتا ہے۔"

"اب فلسفہ جھاڑنے کا الزام تم پہ عائد کیا جا سکتا ہے۔" عمیص کے کہنے پہ اس نے شانے اچکائے۔

"بائی دی وے' اتنی اچھی چائے اور مزیدار پکوڑوں کا بہت بہت شکریہ موتیا۔" اس نے اٹھنے کی تیاری کی۔ دوپٹہ درست کرتے ہوئے نظر آسمان کی جانب اٹھائی۔ شام گہری ہو چلی تھی۔ خود بخود ہی اس کے ہونٹوں پہ ایک بھلی سی مسکان آن ٹھہری۔

"آج موسم کس قدر خوب صورت ہے۔" وہ تو تبصرہ کرتی چلی گئی۔ عمیص اپنی حیرت کا اظہار کرنا نہ بھولا۔

"گل پہ بھی موسم اثر انداز ہونے لگے؟ مقام حیرت ہے۔"

موتیا کچھ بھانپ جانے کے سے انداز میں کچھ کھوج لینے کے سے تجسس کے ساتھ اسے اندر تک جاتا دیکھتی رہی۔

تمہیں بھی عشق کرنے کے ہنر آنے لگے ہیں
تو کیا اب خواب دن میں بھی نظر آنے لگے ہیں

وہ بے یقینی سے بڑبڑا کے رہ گئی۔ عمیص نے جتانے والے انداز میں اگلا شعر پڑھا۔

تمہیں کہتا نہیں تھا ' خاک میں تاثیر بھی ہے
ادھر دیکھ ' مسافر لوٹ کے گھر آنے لگے ہیں

"اوہ عمیص' تم اور تمہاری خوش فہمیاں۔" وہ سر پیٹ کے کہنا چاہتی تھی مگر عمیص کی نگاہوں میں اس خوش فہمی نے جو زندگی بھر دی تھی' اُسے ختم کرنے کا موتیا کو حوصلہ نہ ہوا۔

☆ ☆ ☆

"بہت خوب' آج تو خاصا اہتمام کر رکھا ہے آپ نے۔"

صاحبزادہ نفیس علی خان مغرب کی نماز پڑھ کے تشریف لائے تو موتیا نے تازہ چائے دم کر کے گرم پکوڑوں اور پوری کے ساتھ اندر بھجوائی۔

"کہاں خان صاحب' ہم اب کیا اہتمام کریں گے۔ ایک تو عمر کا تقاضا' صحت کے مسائل دوسرا صاحبزادی الماس خاتون نے ویسے ہی تمام تر ذمہ داریاں اپنے ہاتھ میں لے کر ہمیں بالکل ہی کاہل بنا کے رکھ دیا ہے۔ ہم یہ تردد کیا کریں گے یہ تو آپ کی دختر الماس خاتون کی ہی کارگزاری ہے۔"

"سبحان اللہ بہت ذائقہ ہے صاحبزادی کے ہاتھ میں۔"

انہوں نے پھولی ہوئی خوشبودار پوری کا لقمہ منہ میں رکھتے ہی تعریف کی۔

"ایسی اولاد بھی عطیہ خداوندی سے کم نہیں بیگم۔ ماشاء اللہ ہماری یہ صاحبزادی جس گھر میں جائیں گی' اپنے اطوار سے نور و برکت پیدا کریں گی۔ اللہ ان کے نصیب مبارک کرے۔" وہ پدرانہ شفقت سے مغلوب ہوکے موتیا کو دعائیں دے رہے تھے۔

"آمین' ہمیں صاحبزادی الماس خاتون کی بہت فکر ہے۔ خاندان تو ہمارا وہیں مٹی میں مٹی بن کے سو چکا' آپ ہی اپنے جاننے والوں میں کوشش کیجیے' کہیں کوئی اچھا بر۔۔۔"

"ہاں ہم بھی سوچ رہے ہیں لیکن آپ کے برعکس ہم صاحبزادی الماس کے لیے فکر مند ہرگز نہیں۔ وہ ان بیٹیوں میں سے ہیں جنہیں لوگ اپنے گھر کی زینت بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم آج کسی سے ذکر کریں تو وہ ایسے دس شرفاء کے نام بتا دے گا کہ ہمیں انتخاب کرنے میں بھی دقت ہوگی۔ لیکن اصل تردد تو ہمیں آپ کی بڑی صاحبزادی کی جانب سے ہے۔ دن رات یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ ان کا کیا ہوگا؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ برسوں سے یہ بات طے ہے کہ صاحبزادی گل مہر اسی گھر میں رہیں گی۔ آپا حضور اس

پہ مہر لگا چکی ہیں۔ پھر آپ کا یہ تردد چہ معنی؟"

"یہ بھی اللہ کا خاص کرم ہے کہ گھر کی بات گھر میں رہے گی۔ ورنہ بالفرض اگر ایسا نہ ہو تو خود سوچئے کیا صاحبزادی گل مہر کے اطوار ایسے ہیں کہ وہ کسی بااصول گھرانے میں عزت سے نباہ کر سکیں۔"

"گستاخی معاف نواب صاحب۔ ہر بچہ اپنی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے ایک ہی عادات کے مالک نہیں ہوتے مگر خون کی تاثیر اور تربیت کا یکساں اثر خصوصاً" ماحول پہ ضرور رنگ لاتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ صاحبزادی الماس خاتون کی فطرت میں لچک ہے' طبعاً" وہ نرم مزاج' احساس ذمہ داری سے بھرپور اور تابع و فرمانبردار شخصیت رکھتی ہیں جبکہ صاحبزادی گل مہر کو ہم روایتی اطوار سے پروان نہیں چڑھا سکے۔ ان کی فطرت بے لچک اور مزاج میں ضد اور من مانی کرنے کا عنصر ہے۔ لیکن فطرت و عادات سے قطع نظر وہ ہمارا ہی خون ہیں' اسی خاندان کی پروردہ۔ اس اندیشے میں نہ رہیے کہ وہ خدانخواستہ آپ کے نام اور ہماری تربیت پہ حرف آنے دیں گی۔"

"آپ کہتی ہیں تو مان لیتے ہیں کہ بیٹی کو ماں سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ آپ یہ دعویٰ کر سکتی ہیں اور ہم جھٹلا بھی نہیں سکتے لیکن ہمارے اندیشے اپنی جگہ سلامت ہیں۔ وہ محض اپنی ضد میں آکر' اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ہمارے مقابل ڈٹ سکتی ہیں تو شوہر کو کیا خاطر میں لائیں گی اور شوہر بھی اگر صاحبزادہ عمیص جیسا ہو تو... پھر اس خاندان کی اگلی نسلوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ عمیص میاں خود بھی باغیانہ سوچ رکھتے ہیں اور گل مہر کے ہر اقدام کی سب سے پہلے حمایت کرتے ہیں۔ یوں بھی صاحبزادی گل مہر کے مزاج اور عمیص میاں سے ان کا برتاؤ دیکھ کے یہ امید کم ہی ہے کہ وہ اپنے اس عم زاد کو بحیثیت شوہر وہ تکریم دے پائیں گی جو ان کے عقد کے بعد حق بنتا ہے۔"

"دونوں ہم عمر ہیں' بچپن سے ایک چھت کے تلے رہتے آئے ہیں سو یہ نوک جھونک تو فطرت کا تقاضا اور بے تکلفی کا نتیجہ ہے۔ نکاح کے دو بول' ہر رشتے کی نوعیت بدل دیتے ہیں اور صاحبزادی گل بہرحال ہیں تو ایک مشرقی دوشیزہ' ہمارے رکھ رکھاؤ والے ماحول کی پروردہ ہمیں ان پہ پورا یقین ہے' نئی زندگی میں داخل ہوتے ہی نئی ذمہ داریوں سے روشناس ہوتے ہی وہ یہ غیر سنجیدہ روش ترک کر دیں گی' اپنی بچکانہ ضدوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں گی۔ کیا آپ کو ہماری تربیت پہ اعتماد نہیں؟"

"واللہ' ایسا ہرگز نہیں۔"

"نہیں' نواب صاحب' آپ بھلے کچھ بھی کہیے' ہم جانتے ہیں کہ نہ تو ہم تب آپ کے لائق تھے جب ابا حضور نے ہمیں آپ کی زندگی میں شامل کیا' نہ ہی ہم اب تک خود کو اس قابل کر پائے ہیں۔" ان کے لہجے میں ملال گھلا تھا۔

"یہ آپ آج ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں بیگم حرمت النساء۔"

"اب تو یہ کہنے کی ہمت ملی ہے ورنہ یہ احساس... کم مائیگی کا یہ احساس نیا نہیں۔ ہم نے خود کو ہمیشہ آپ کے شانہ بشانہ نہیں بلکہ کئی قدم پیچھے ہی محسوس کیا ہے' ذہنی طور پہ بھی... اور شاید قلبی طور پہ بھی۔"

"نہیں' ایسا ہرگز نہیں' یہ آپ کا وہم ہے۔" وہ جزبز ہو گئے۔ اگرچہ اس حقیقت کو کھل کے جھٹلا بھی نہیں سکتے تھے کہ صاحبزادی حرمت النساء کو نصف بہتر کے روپ میں تسلیم کرتے کرتے انہیں مدتوں دل کو منانا پڑا تھا لیکن اس کا اظہار کر کے انہیں مزید دل گرفتہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے جو ایک عمر سے ان کی جانب سے محبت اور اعتماد کی آس لیے وفا نبھا رہی تھیں۔ دراصل لڑکپن سے ہی انہوں نے صاحبزادی فرحت انساء کو ہی اپنی ہونے والی شریک حیات کی نظر سے دیکھا تھا اور ابھی ان کی ناگہانی اور افسوسناک وفات سے ٹھیک طرح سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ چچا حضور نے انہیں ایک اور بندھن میں باندھ دیا۔

صاحبزادی حرمت النساء سے ان کی عمر کا فرق تقریباً" پندرہ سولہ سالوں پہ محیط تھا دوسرا یہ کہ ان کے ذہن میں دور دور تک ان کے لیے ایسا کوئی خیال نہ تھا اس کے باوجود وہ اپنے قابل احترام چچا حضور کے فیصلے کے آگے چوں تک

نہ کر سکے۔ شادی کے بعد بھی دونوں میں ذہنی مطابقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ صاحبزادی حرمت النساء اپنی فطرت کی لچک کے باعث ان کے مزاج کے اتار چڑھاؤ کو بھانپ کر ان کی مرضی کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرنے لگیں مگر شوہر کی نظروں میں وہ ہمیشہ ایک ناتجربہ کار' کم عقل اور سادہ مزاج خاتون رہیں۔ اب کہیں جا کے وہ ان کو سننے بھی لگے تھے اور کبھی کبھی ان کے کسی مشورے کو بے ساختہ سراہ بھی جاتے۔ شاید اسی وجہ سے ان میں اتنی ہمت ہوئی کہ وہ یہ گلہ کر پائیں۔

صاحبزادہ نفیس علی خان اگرچہ دل سے ان کی گل مہر کے بارے میں خوش گمان قیاس آرائیوں سے قائل نہیں تھے پھر بھی صرف ان کی دل آزاری کے خیال سے کہہ دیا۔

"آپ کہتی ہیں تو درست ہی ہو گا۔ گھریلو معاملات خصوصاً" اولاد کے متعلقہ مسائل کے بارے میں ماں سے بہتر کون جان سکتا ہے۔"

"تو بس پھر ساری پریشانیاں دل و دماغ سے جھٹک دیجئے۔ ہمارا برسوں پرانا فیصلہ بروقت بھی تھا اور مناسب بھی۔ صاحبزادی گل مہر کے لیے عمیص میاں سے بہتر انتخاب کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ آپ کی بٹیا کو بہت خوش رکھیں گے اور ان کی بے حد قدر کریں گے۔"

"ان حضرت سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔" وہ طنزیہ ہنکارا بھر کے رہ گئے۔

"ہم سمجھے نہیں۔"

"ہماری خواہش ہے کہ صاحبزادی گل مہر کی شادی جس سے ہو' بے شک وہ عمیص میاں ہی ہوں وہ انہیں بدلنے کی کوشش کریں' انہیں ایک مشرقی بیوی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں نہ کہ یہ خود ان کے مطابق خود کو ڈھال لیں اور زوجہ محترمہ کو من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ دے دیں اور آپ کے لاڈلے بھتیجے سے ہمیں یہی توقع ہے۔ ایسے گرہستیاں نہیں چلا کرتیں جتنے فکر مند ہم اپنی صاحبزادی کے حوالے سے ہیں اتنے ہی فکر مند عمیص میاں کے لیے بھی ہیں۔ وہ بھی ہمارا ہی خون اور ہمارے جگر کا ٹکڑا ہیں۔ ہمارے خاندان کا واحد وارث اور چشم و چراغ۔ ہم دل سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ نواب گھرانے کی اس شان و شوکت کو آگے بڑھائیں اور اس کے آثار نظر نہیں آ رہے۔ اب ان کے اس نئے شوق کو ہی دیکھ لیجئے' لاحول ولا... یہ کیا ذریعہ معاش ہے۔ لوگوں کو فون پہ نمبر ملا ملا کے دینا۔" انہوں نے نخوت سے سر جھٹکا۔

☆ ☆ ☆

یوں تو موتیا کئی روز پہلے ہی سے اس کے بدلے بدلے انداز و اطوار دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی لیکن آج کی شام نئے سرے سے اسے سنجیدگی سے کچھ سوچنے پہ مجبور کر گئی۔ اس نے بستر پہ لیٹے لیٹے گل مہر کی "مصروفیت" کا جائزہ لیا۔ رات کے پونے دس ہو رہے تھے۔ لاہور شہر میں اس وقت زندگی بھلے عروج پہ تھی لیکن اس حویلی کے مکین نو بجے ہی سونے کی تیاری میں مشغول ہونے کے عادی تھے۔ موتیا جو دوپہر کو سونے کی عادی نہ تھی' صبح نماز کے وقت کی جاگی ہوئی' دن بھر کے کام اور مصروفیت کے بعد نماز عشاء ادا کرتے ہی نو ساڑھے نو بجے بستر پہ گرتے ہی سو جایا کرتی لیکن جب سے گل نے جاب شروع کی تھی' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً" دس ساڑھے دس تک جاگنے پہ مجبور تھی کیونکہ رات گئے تک گل کی اگلی صبح کے لیے تیاریاں چلتی رہتیں اور موتیا کو اس کھٹ پٹ میں نیند نہ آتی۔

اس وقت بھی آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت اس نے صبح کے لیے سوٹ استری کرنے میں لگایا اور غالباً" اتنا ہی... یا شاید اس سے زیادہ اس سوٹ کو منتخب کرنے میں صرف ہوا ہو گا۔ کاٹن کے ہلکے زرد سوٹ پہ خوب دبا کے استری پھیرتے ہوئے وہ ہلکے سروں میں کچھ گنگنا بھی رہی تھی جو موتیا باوجود کوشش کے سن نہ سکی' شلوار کرتا کرسی کی پشت پہ پھیلا کے رکھنے کے بعد اب وہ زرد دھاگے کی کڑھائی سے سجا [illegible] کشن والا دوپٹہ استری کرنے لگی۔ موتیا نے سرد آہ بھرتے ہوئے اس دو گز عرض اور ساڑھے چار گز طول والے لمبے چوڑے سوتی دوپٹے کو دیکھا' جو پلا

مبالغہ استری ہونے میں آدھا گھنٹہ مزید لینے والا تھا۔ اس نے بھنا کر ساتھ میں رکھا تکیہ چہرے پہ دھر لیا۔

"ہمارا تکیہ چھوڑو موتیا! ابھی ڈھیروں تیل تم نے سر میں انڈیلا ہے وہ بھی کڑوے سرسوں کا اور ہمارا تکیہ کس مزے سے ان چپ چپے بالوں پہ رکھ لیا ہے۔" اپنے کام میں مگن بھی وہ اپنی ذاتی استعمال کی چیزوں کے بارے میں پوری طرح الرٹ تھی۔ اس کے ٹوکنے پہ موتیا کو غصہ آگیا۔

"تم لائٹ آف کرو۔ تو میں بھی تمہارا تکیہ پرے پھینک دوں گی۔"

"بس تھوڑی دیر اور ابھی لائٹ بند نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر ابھی یہ تکیہ بھی میرے اس تیل سے بھرے سر سے الگ نہیں ہو سکتا۔"

"ابھی ہم اپنے چہرے کی کلینزنگ کرنے والے ہیں۔" اس نے استری کے بعد والی مصروفیات سے آگاہ کیا۔ جواباً موتیا نے بھی اگلے مرحلے سے مطلع کیا۔

"اور ابھی میں بھی یہ تکیہ سر کے اوپر سے سر کے نیچے منتقل کرنے والی ہوں۔"

"پلیز موتیا ہم سو نہیں پائیں گے اس تیل کی بدبو سے۔" وہ چلائی۔

"اور میں بھی سو نہیں پا رہی تمہاری ان چک پھیریوں سے۔" وہ اور بھی شدت سے چلائی۔

"تم آفس جاتی ہو یا کسی فیشن شو میں روزرات کو تمہیں کلینزنگ بھی لازماً کرنا ہوتی ہے' ہر دوسرے تیسرے دن ہاتھوں پیروں کی مرمت بھی کرنا ہوتی ہے۔" اس نے کل ہونے والے مینی کیور پیڈی کیور کی جانب اشارہ کیا۔

"گھنٹہ بھر تو تم لباس کے چناؤ پہ لگاتی ہو۔"

"کم جلا کرو الماس خاتون! تمہاری بھلی رنگت جھلس کے رہ گئی ہے۔" وہ اسی سکون کے ساتھ اب آئینے کے روبرو کھڑی ہاتھوں پہ کلینزنگ ملک انڈیل رہی تھی۔ باقی کی بھڑاس موتیا نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے نکالی۔ جانتی تھی کہ گل پہ اس وقت کچھ اثر نہیں ہونے والا۔ وہ اپنی روٹین سے نمٹ کر ہی لائٹ آف کرے گی۔

لاگی تجھ سے من کی لگن۔۔۔ لگن لاگی تجھ سے من کی لگن

گل کی ہلکے سروں کی گنگناہٹ پہ موتیا کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے ہی عکس کو دیکھ کے مسکراتے ہوئے' اپنے چہرے پہ مساج کر رہی تھی مگر صاف لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں بے شک سامنے آئینے پہ تھیں مگر نظریں کہیں اور تھیں وہاں جہاں اس وقت اس کا دھیان تھا اور دھیان وہاں تھا جہاں کے تصور نے اسے گنگنانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"تیرے بن میرا من۔۔۔

جیسے بکلی پون.....

جیسے بن میں ہرن.....

لاگی تجھ سے من کی لگن۔۔۔ لگن لاگی تجھ سے من کی لگن

"میں تو سمجھ رہی تھی اس کے پاس "من" نام کی کوئی چیز ہی نہیں' مگر نہ صرف یہ من سنبھال کے رکھے ہوئی تھی بلکہ چپکے چپکے لگانا بھی شروع کر دیا۔"

"سنو' وہ ہے کون؟" اچانک اس نے سوال کیا بغیر کسی تمہید کے بغیر کسی بہانے کے۔

لحہ بھر کے لیے مساج کرتے اس کے ہاتھ ساکت ہوئے۔ اس نے آئینے میں ہی اسے نظر بھر کے دیکھا۔ پھر لوشن کی شیشی کا ڈھکن بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ بغیر کسی وضاحت کے بغیر کسی بہانے کے۔

"تمہیں اس سے کیا؟"

اس نے انکار نہیں کیا تھا' نہ ہی سن کر غصے کا اظہار کیا۔ اس سے موتیا کے شک کو تقویت ملی۔

"کیوں مجھے کچھ کیوں نہیں؟ بہن ہوں تمہاری۔"

"وہ تو ہم بھی ہیں۔۔۔ یعنی تمہاری بہن۔" وہ گھوم کے اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مگر ہم نے تو تم سے کبھی نہیں پوچھا' آدھی آدھی رات تک تکیے میں منہ دیے کس کے نام کے آنسو بہاتی ہو۔"

موتیا کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

گل مہر نے اطمینان سے اپنی چادر جھاڑی۔ سکتے کے عالم میں بیٹھی موتیا کی گود سے اپنا تکیہ جھپٹا' پاس لا کر سونگھا اور برا سا منہ بناتے ہوئے اپنا مہکتا ہوا دوپٹہ اس پہ پھیلا کے لیٹ گئی۔

اس کو دوبارہ چھیڑنے کا مطلب تھا اس ذکر کو دوبارہ چھیڑنا اور یہ خطرہ موتیا مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

"پتہ نہیں گل کیا کچھ جانتی ہے؟ کتنا جانتی ہے؟ اور کیا پتہ جانتی بھی ہے یا نہیں' یونہی میرا منہ بند کرنے کے لیے ہوا میں تیر چلا رہی ہے اگر واقعی ایسا ہے تو میں نے خاموش ہو کے اس کے اندازے کی تصدیق کی ہے۔ مجھے صاف مکر جانا چاہیے تھا ویسے ایک بات تو ثابت ہو گئی ہے کہ واقعی کوئی ہے' کوئی تو ہے جس نے اس پتھر میں جونک لگائی ہے' کوئی تو ہے جس کے ہونے سے گل کو احساس ہوا ہے کہ اس کے پاس بھی من ہے اور من لگانے کی چیز ہے' من مانی کرنے کی نہیں۔ چلو صاحبزادی گل مہر اگر سچ مچ من لگا بیٹھی ہو تو اب ہوش ٹھکانے آ ہی جائیں گے' اسی لگن نے سارے کس بل نہ نکال دیے تو میرا نام بدل دینا۔" اس نے جیسے چیلنج کیا۔ مگر ساتھ ہی عمیص کا خیال سارے جوش پہ حاوی ہو گیا۔

"مگر عمیص اس کا کیا ہو گا۔ یہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی کہ گل کے دل تک وہ کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکے گا مگر نارسائی ایک الگ چیز ہے' رد کیے جانے کا دکھ الگ۔ کیا وہ برداشت کر پائے گا"

رات بھر جاگنے کے لیے یہ ایک وجہ کافی تھی۔ صبح وہ معمول کے مطابق جاگی تو آنکھیں متورم تھیں' سردرد نے ہلکی سی تمازت بھی پیدا کر دی تھی جس سے چہرہ سرخ سا ہو رہا تھا۔

گل تیار ہو کے کچن میں آئی تو اس نے حسب معمول اس کے آگے فرائی انڈا' دو ٹوسٹ اور چائے کا کپ رکھا۔

"آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔" پتہ نہیں اس نے موتیا کو چڑانا چاہا تھا یا کوئی اور وجہ تھی' بہر حال وہ چڑ گئی۔

"تعریفی جملے بولنے کی پریکٹس کرنے کے لیے کیا میں ہی ملی تھی۔"

"کیا کل رات بھی تکیہ بھگوتے گزری ہے' ہمارا مطلب ہے یہ خوابناک گلابی گلابی آنکھیں۔۔۔ یہ بھاری آواز۔۔۔"

"اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں میرے سر میں کل شام سے سخت درد ہے اس لیے رات تمہارے ساتھ مغز ماری کرنے کی ہمت نہیں ہوئی ورنہ بتاتی تمہیں۔"

"تم نے کیا بتانا ہے' تم تو پوچھ رہی تھیں' بتانے کے لیے تو ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔" اس نے شرارت سے کپ میں چمچہ بجا کے اسے چونکایا۔

"لیکن ابھی ہمارے پاس وقت نہیں ہے پھر کبھی۔" وہ بیگ شانے پہ اٹکا کے نکلنے لگی اور اندر داخل ہوتے عمیص سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ خلاف توقع چڑ کے کوئی کڑوی کسیلی بات کہنے کی بجائے اس نے عمیص کے ہاتھ میں لسی کے فل سائز گلاس کو گھورا۔

"کم پیا کرو' دن دہاڑے ڈگمگاتے پھرتے ہو۔"

عمیص نے ایک نظر اس کے ناشتے کی ٹرے میں رکھی مکھن کی ٹکیا پہ ڈالی اور جوابی فقرہ چست کیا۔

"تم بھی کم مکھن کھایا کرو' پھسلتی پھرتی ہو۔"

وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی اللہ حافظ کہہ کے نکل گئی تو عمیص مارے حیرت کے گرتے گرتے بچا۔ موتیا رخ موڑ کے اب عمیص کے لیے آملیٹ تیار کرنے لگی۔

"تم نے دیکھا موتیا' جاب کرنے سے گل میں کتنی خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں۔"

"مثلاً؟" وہ انڈے پھینٹ رہی تھی۔

"پہلے جو ہر وقت جلی کٹی باتیں سنایا کرتی تھی' بات بات پہ کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی' اب ایسا نہیں ہے۔ اس کا سارا چڑچڑاپن اس نئی مصروفیت کی نذر ہو گیا ہے۔ اپنی مرضی اور مزاج کے مطابق وقت گزارنے کی وجہ سے اب اس کی وہ ساری بیزاری اور کڑواہٹ ہوا ہو گئی ہے جو اس پہ سوار رہا کرتی تھی۔ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا اس کے لیے جاب کرنا۔"

"جاب تو وہ پچھلے ڈھائی ماہ سے کر رہی ہے **عمیص** مگر تم نے شاید یہ نوٹ نہیں کیا کہ اس کے مزاج میں نئی نئی اٹھی یہ خوشگوار لہر بس پندرہ بیس دن سے مہمان ہوئی ہے یعنی پچھلے دو ڈھائی ہفتوں سے اور اس کی وجہ ضروری نہیں یہی ہو جو تم خیال کر رہے ہو' کوئی اور سبب بھی تو ہو سکتا ہے۔" اس کے غیر معمولی سنجیدہ انداز پہ وہ ٹھٹکا۔

"وہ کیا سبب ہو سکتا ہے؟"

"مجھے کیا پتہ؟" اس نے شانے اچکائے۔ "یونہی کہا ہے۔"

"تم جو بھی کہو' جاب کرنے کا اس کا فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا ہے۔"

"تمہیں تو خیر اس کا ہر قدم درست ہی لگا کرتا ہے چاہے وہ درست ہو یا نہ ہو۔" اس نے سر جھٹکا۔

"وہ کوئی غلط فیصلہ بھی کرے گی' کچھ الٹا سیدھا قدم بھی اٹھائے گی تو تمہیں برا نہیں لگے گا' ہے ناں؟" اس نے ٹٹولنا چاہا۔ **عمیص** نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں' گل کوئی الٹا سیدھا کام کر ہی نہیں سکتی۔"

"اچھا' بڑا اکڑ کے دعویٰ کر رہے ہو۔ بالفرض کل کو وہ کسی آدمی کو لا کے کھڑا کر دے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اس سے شادی کرنا چاہتی ہے تو تب تم کیا کہو گے۔ یونہی تالی بجا کے داد دو گے یا اس کی حمایت میں ہمیشہ کی طرح گھر بھر سے لڑو گے۔" وہ بغیر کسی واضح ثبوت کے اتنی بڑی بات منہ سے نکالنا نہیں چاہتی تھی لیکن **عمیص** کے گل پہ حد سے زیادہ اعتماد نے اسے بے قابو کر دیا۔

"تب بھی تم یہی کہو گے کہ وہ غلط نہیں۔"

"ہاں تو کسی کو پسند کرنا' اس سے محبت کرنا غلط کیسے ہو گیا۔ اگر میں گل کو پسند کرتا ہوں اور صحیح ہوں تو وہ بھی کسی کو پسند کرے گی تو اپنی جگہ صحیح ہو گی۔" اس کے چہرے کی رنگت پل بھر کو متغیر ضرور ہوئی مگر اگلے ہی پل وہ سنبھل کے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو موتیا' غلط یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی کو محبت کے نام پہ دھوکا دے' اس کی محبت سے غلط فائدے اٹھانے کی کوشش کرے یا اس کی محبت کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے یا پھر محبت کے خواب دکھا کے بیچ راہ میں ساتھ چھوڑ دے۔ اگر کوئی سرے سے کسی سے محبت کرتا ہی نہیں تو پھر اسے غلط کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں گل کے دل میں نہ میرا۔۔۔ نہ کسی اور کا گزر ہے' اسی لیے میں کوشش کیے جا رہا ہوں' یہ میرا حق ہے لیکن اس کی بے اعتنائی پہ میں اسے الزام نہیں دے سکتا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں تو وہ اپنے دل کے ہاتھوں پھر بھی مجھے پوری امید ہے کہ میری مستقل مزاجی اور سچی لگن ایک دن ضرور اس کا دل موم کر دے گی۔"

"ہاں لگن۔۔۔ یہ کم بخت لگن ہی تو۔" وہ بڑبڑا کے رہ گئی اور چپ چاپ اس کے سامنے ناشتا رکھ دیا۔ **عمیص** کی باتوں سے وہ سو فیصد قائل تھی۔ خود وہ بھی تو اس راہ کی مسافر تھی جانتی تھی کہ اس کے دل تک اس کا گزر نہیں ہو سکتا پھر بھی اس لگن کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اسے اس انجانے پن پہ موردِ الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ لیکن جس درد سے وہ واقف تھی اس سے اب تک **عمیص** انجان تھا اور وہ درد تھا اس شخص کو اپنے سامنے کسی اور کی محبت کا دم بھرتے دیکھنا' جسے آپ دل و جان سے چاہتے ہوں۔

"کن خیالوں میں پہنچ گئیں"

"سوچ رہی ہوں' جو تم کہہ رہے ہو اسے ثابت بھی کر پاؤ گے یا نہیں۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے **عمیص** کہ ۔۔۔"

"اوں ہوں۔" اس نے آخری لقمہ لیتے ہوئے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"کون ہے وہ کیسا ہے وہ مجھ کو اس سے کیا غرض
وہ مجھے اچھا لگا' میں نے سوچا کچھ نہیں

"کچھ نہیں۔۔۔ میں نے واقعی سوچا کچھ نہیں موتیا۔" وہ ہاتھ دھونے کے لیے مڑ گیا۔

"ہاں سوچنے کی مہلت ہی کب ملتی ہے۔" موتیا کے دل نے تائید کی۔

وہ اس کی پشت کو دیکھ کے آہستہ سے کہہ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیوں بھئی اللہ وسایا' کیا سوچا پھر تم نے؟"

ملک مقبول نے ایک بار پھر اس کے سامنے اپنی آفر دہرانے کے بعد سوال کیا۔

"جتنی آمدنی ادھر مہینے میں چھ شو کرنے کی ہوتی ہے' وہاں ایک ہی پھیرے میں اس سے دگنی ہو گی اور جہاز کی سیر' سات سمندر پار جانے کا مزا الگ۔ اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے۔ اوئے پاگل انسان' میرے پاس تو ساری گانے والیاں گھڑی گھڑی سفارشیں لے کے آتی ہیں کہ کسی طرح ان کا نام طائفے میں شامل ہو جائے' کئی ایک تو رشوت تک دینے پہ تیار ہوتی ہیں کہ کل آمدنی کا اتنے فیصد وہ دے دیں گی' بس ایک بار باہر کا چکر لگ جائے۔ اور میں اپنے منہ سے دوسری بار ادا کے لیے تجھے کہہ رہا ہوں۔ وہ تو خوش قسمت ہے کہ بغیر ہاتھ پیر مارے اتنے بڑے شو میں شامل ہو جائے گی۔ اس میں انڈیا کے بھی کئی فنکار شامل ہیں۔ ان کے ڈائریکٹر وغیرہ بھی آئے ہوں گے۔ آج کل وہ بھی پاگل ہوئے ہوئے ہیں اپنی لشکتی لشکاتی فرسٹ کلاس ہیروئین چھوڑ کے ہماری سائن کر رہے ہیں۔"

"وہ کیوں جی؟"

"اوان کے دماغ ہو چکے ہیں خراب نئی سے نئی لڑکی بھی چالیس پچاس لاکھ سے کم پہ نہیں مانتی۔"

"ہیں جی؟ چالیس پچاس لاکھ؟"

"اوئے تو اور کیا؟ اور جو ذرا نام والی ہیروئنیں ہیں جن کی گڈی اونچی اڑ رہی ہے وہ کروڑوں لیتی ہیں تین گھنٹے کی فلم میں صرف ایک گانے پہ بھی ذرا مٹکنا ہی ہو تب بھی منہ پھاڑ کے کروڑ روپیہ مانگ لیتی ہیں۔ ان کی ٹکے ٹکے کی ایکسٹرا ڈانسریں بھی ہماری سپر اسٹار کے برابر بلکہ زیادہ ہی پیسے کماتی ہیں اس لیے وہ اب ہماری ہیروئنیں گھیر رہے ہیں جو بیچاری چالیس پچاس ہزار سے لے کر لاکھ ڈیڑھ تک پہ بھی تیار ہو جاتی ہیں۔ بھئی انڈیا کی فلم میں کام کرنا ہی بہت بڑا نام ہے' پیسے کا کیا ہے' ہو سکتا ہے ادا کو بھی کوئی وہاں کا ڈائریکٹر پسند کر لے' ہیروئن بنا لے یا پھر گانے گوا لے اپنی فلم کے۔"

"ہاں جی گانے تک تو ٹھیک ہے مگر فلم نہیں۔ یہاں کی فلم میں سو دفعہ کام کرے وہاں کی فلموں میں تو کبھی نہیں۔ آخر ہم خاندانی لوگ ہیں جی۔ شوق اپنی جگہ' عزت اپنی جگہ۔"

"شوق ہی سہی لیکن جب کام میں ہاتھ ڈال ہی لیا ہے تو بیٹی کو سمجھاؤ اب کامیابی کے رستے سے پیچھے نہ ہٹے۔ میرے ساتھ ایگریمنٹ کر لے' سال میں ایک چکر دبئی وغیرہ کا لگ جائے تو دیکھنا کیسے مال بنتا ہے تو۔ شوق بھی وہی اچھا اللہ سایا' جس سے ہاتھ میں کچھ آئے پلے سے لگا کے شوق کیا پورا کرنا۔"

"سولہ آنے سچی بات کی ہے ملک صاحب۔ لیکن دل کو کچھ دھڑکے ہیں دراصل یہ جو باہر ملک طائفے جاتے ہیں ان کے بارے میں بڑا کچھ سن رکھا ہے۔ برا بھی اور بھلا بھی۔ روپے واقعی بڑے ملتے ہیں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کام بھی وہ بہت سارے لیتے ہیں' صرف ناچنا گانا نہیں ہوتا بلکہ۔۔۔ آپ سمجھ دار ہو جی' بیٹی والا ہوں' کہہ چکا ہوں صرف شوق کے ہاتھوں اور کچھ بیٹی کے گن دیکھ کے اسے یہاں لایا ہوں۔ یہ کام ہم لوگوں کا نہیں۔ بازاری تو نہیں ہیں۔ بازار بیٹھ کے طبلہ ضرور بجایا ہے کئی سالوں تک۔ مگر گھر کی عورتوں کے سودے نہیں کیے۔"

"اوئے کم عقلا، مانا ایسے خبیث لوگ بھی ہوتے ہیں ایسے بدذاتوں نے ہی شوبزنس کا نام خراب کیا ہوا ہے ساتھ ساتھ ہمارے ملک اور اس کی ثقافت کی بھی مٹی پلید کر کے رکھی ہے۔ درجنوں لڑکیاں اٹھا کے لے جاتے ہیں فن کے نام پہ اور وہاں ان کو عرب شیخوں کی محفلیں گرمانے بھیج دیتے ہیں لیکن اللہ وسایا، بندے کی پرکھ ہونی چاہیے 'اک عمر تو نے اس نگری میں گزار دی اب تک بندے بندے کو نہیں پہچان سکا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اوئے میں نے ایسی ذلالتوں کی وجہ سے اپنی اتنی ساکھ نہیں بنائی۔ یہ مقام، یہ عزت، یہ پوزیشن ایسے ہی حاصل نہیں ہوئی۔ بڑا بچ بچا کے چلا ہوں۔ غلط ہتھکنڈوں سے دولت ضرور کمائی جاسکتی ہے مگر نام نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ غلط ٹور لے جانے والے دوسرے تیسرے پھیرے کے بعد ہی اندر ہو جاتے ہیں یا روپوش ہو کے ملک چھوڑ جاتے ہیں جبکہ میں پچھلے سولہ سالوں سے ہر سال کم از کم دو ٹور لگا تا ہوں اور ایسی ویسی بھرتیاں نہیں کرتا، سپر اسٹار لے کر جاتا ہوں۔ بڑی چھوٹی بات کی تو نے اللہ وسایا، میں نے تیرا بھلا کرنا چاہا اور تو نے شک کر کے۔ چل چھڈ نہ سہی۔"

"نہیں ملک صاحب، ناراض تو نہ ہوں جی۔" وہ ہاتھ جوڑ کے **کھکھیانے** لگا۔ جانتا تھا غیر ملکی ٹور کے ساتھ جانا نہ جانا الگ مسئلہ تھا لیکن پاکستان کے اندر بھی جتنے شو زوہ کراتا ہے اتنے کوئی اور پرموٹر نہیں کراتا۔ اس سے بگاڑنے کا مطلب تھا، ادا کے نئے نئے کیریئر کو بننے سے پہلے مسمار کر دینا۔

"غلطی ہو گئی جی، میں ان پڑھ، کم عقل بندہ بات کرنے کی تمیز نہیں کہنا کچھ اور تھا، کہہ کچھ اور گیا۔ مٹی پاؤ جی آپ میری باتوں پہ۔ میں ادا سے بات کروں گا، سمجھاؤں گا اسے۔"

"سمجھاؤ، سمجھاؤ، ضرور سمجھاؤ، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ لمبے نوٹ کماؤ گے۔ بڑے بڑے اخباروں کے پہلے صفحے پہ ادا کی تصویر چھپے گی اور پتہ ہے یہ عرب سیٹھ بڑے کھلے دل کے ہوتے ہیں اور وہاں جو سکھ رہتے ہیں وہ بھی بڑے مالدار، شوقین مزاج اور شاہ خرچ ہوتے ہیں۔ پنجابی گانے پہ تھرکتے ہوئے وہ مستی میں نوٹ نہیں سونے کی ٹکیاں تک نچھاور کر ڈالتے ہیں۔ دبئی والوں کو سونے کی کیا کمی۔"

نوٹوں کی کراری کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ اس نے سونے کی پیلی جھلملاہٹ کا بھی سہارا لیا اور اللہ وسایا پوری طرح چندھیا کے رہ گیا۔ سارے رستے وہ یہ سارے سیاق و سباق دل ہی دل میں دہراتا رہا اور دعا کے پاس آ کر کسی رٹے رٹائے طوطے کی طرح وہی پٹی اسے پڑھانے لگا جو ملک مقبول نے اس کی حریص آنکھوں پہ باندھی تھی۔

"اف ابا جی، پھر سے وہی تکرار۔" دعا نے سر ہاتھوں پہ گرا لیا۔ کچھ دن پہلے بھی اس موضوع پہ دونوں باپ بیٹی کے مابین گرما گرم بحث ہو چکی تھی اور اس کا نتیجہ دعا نے یہی نکالا تھا کہ وہ اپنے دلائل کے ذریعے یقیناً باپ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے کہ یہ ثقافتی طائفے نرے ڈھکوسلے ہوتے ہیں اور بے شک ان کے ذریعے پیسہ کمانا بہت آسان ہے لیکن فن کی آڑ میں فنکاراؤں کو اور بہت کچھ کرنے پہ مجبور کیا جاتا ہے جو اسے کسی قیمت پہ منظور نہیں۔ لیکن چند دن کی خاموشی کے بعد آج پھر سے وہی معاملہ زیر بحث تھا۔

"او جھلی، ضد نہ کر۔ ملک صاحب نے خود اپنے منہ سے کہا ہے۔ یہ تو بڑی قسمت کی بات ہے۔"

"ابا جی کاش آپ احساس کر سکتے کہ بیٹیوں کی قسمت کیسے سنواری جاتی ہے۔" وہ کرب سے باپ کے لالچ سے سیاہ پڑتے چہرے کو دیکھ کے رہ گئی۔ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی جانتے ہوئے اللہ وسایا نے مزید لیپا پوتی کی۔

"میرا کیا ہے بڈھی جان، خستہ دیوار آج ساہ ہے کل نہیں۔ تیرا مستقبل محفوظ ہو جائے گا تو ساہ ذرا سکھا نکل جائے گا۔"

"اور کاش آپ یہ بھی سوچ سکتے کہ بیٹیوں کا مستقبل کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے۔" وہ سوچ گئی اور اللہ وسایا کہتا گیا۔

"تیرے نام پیسہ ہو گا، کوٹھی ہو گی، تیرا اونچا نام ہو گا تو کل کو میرے بعد بھی کسی کی ہمت نہیں ہو گی تیری طرف

میلی نظروں سے دیکھنے کی۔"

"آپ کے ہوتے ہوئے جو میلی نظریں دن رات آزادانہ میرے وجود کو ناپاک کرتی ہیں ان کا کیا کروں ابا جی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"لے، رونے لگ گئی۔ اچھا اچھا۔۔۔ میرے بغیر جانے کو من نئیں کر رہا ہو گا۔ تو جانے کی ہامی تو بھر میں ملک صاحب سے بات کر لوں گا، ہو رے وہ راضی ہو جائیں میری بھی ٹکٹ بنا دیں۔ لے بھئی، فیر میں بھی جہاز میں بیٹھوں گا۔" وہ بغلیں بجانے لگا۔ دعا نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔ اللہ وسایا کے دل میں یہ احساس جگانا ناممکنات میں سے تھا۔ اس نے ایک بار پھر دو ٹوک انداز میں انکار کیا۔

"ابا جی، نہ آپ کے ساتھ، نہ آپ کے بغیر مجھے کہیں باہر جا کے شو نہیں کرنے۔ یہ بات آپ صاف صاف اپنے ملک صاحب کو بتا دیں۔ کسی اور کو پھنسائیں وہ جا کر۔"

"تیرا تو دماغ پھر گیا ہے۔ جو بندہ تیرے فیدے کی بات کرے، تیرا بھلا کرنا چاہے وہی تجھے اپنا دشمن لگتا ہے۔" اس کے اپنی ضد پہ ہٹ دھرمی سے ڈٹے رہنے سے اللہ وسایا کو بھی غصہ آ گیا۔

"پتہ ہے کس کے ڈر سے انکار کر رہی ہے۔ اپنے اس مامے کی وجہ سے جو خود تو کوٹھی میں بیٹھا ہے نوٹوں سے کھیل رہا ہے۔ لیکن نئیں چاہتا کہ اس کے غریب رشتے داروں کے دن پھریں اور وہ اس کے مقابلے پہ آئیں۔ اسی نے تیرے دماغ میں یہ عزت بے عزتی والا خناس بھرا ہے۔ خود پتر کا باپ ہے، اس لیے جو مرضی کرتا پھرے، میری اولاد میں پتر نئیں لکھا تھا تو کیا یہ میرا قصور ہے؟ مجھے دولت کمانے کا حق نہیں۔ گولی مار تو اپنے اس مامے کی باتوں کو۔ وہ چاہتا ہی نئیں تو ترقی کرے میں تیرا پیو ہوں، مجھ سے سگا اور کون ہے تیرا؟ تو ہے کہ صرف میری نہیں مانتی، باقی سارے زمانے کی باتیں سچی ہیں، بس ایک بڈھا باپ ہی جھوٹا ہے۔" وہ بلکتا جھلتا باہر نکل گیا۔

دعا نے نگاہ سے مشورہ کیا۔

"ہاں یہ صحیح ہے ان شوز کی آڑ میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اسمگلنگ بھی۔ چاہے وہ منشیات کی ہو غیر قانونی سونے کی یا پھر لڑکیوں کی لیکن ملک مقبول کے طائفے کے ساتھ جانے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ بڑا صاف ستھرا بندہ ہے۔ دراصل اسے اب ان کاموں کی ضرورت نہیں۔ وہ اسٹیج کی دنیا کا بادشاہ بندہ ہے۔ اسی کام سے اب لاکھوں مہینے کے کما لیتا ہے۔ شروع شروع میں اس نے بھی ایسے کھیلے بہت کیے ہیں لیکن اب ڈرتا ہے کہ کہیں کوئی غلط قدم سالوں سے کمائی شہرت اور دولت کا بیڑہ غرق نہ کر ڈالے۔ ورنہ اپنے وقت کا بڑا مشہور رہ چکا ہے۔"

"یعنی اس کے طائفے میں ایسا کام نہیں ہوتا۔"

"اپنی مرضی سے کوئی کرنا چاہے تو وہ روکے گا تھوڑی۔" نگاہ نے شانے اچکائے۔

"اب ساری کی ساری تیری طرح پھونک کے قدم تو نہیں رکھتیں۔ کچھ تو جاتی اس نیت سے ہیں کہ موٹے تگڑے مالدار شکار پھنسائیں۔ ہاں یہ ڈر نہیں کہ وہاں کوئی تجھے اس کے لیے مجبور کرے گا۔ آفریں تو بڑی آئیں گی۔ وہاں بھی ایک سے ایک شوقین مزاج اور رنگین مزاج سیٹھ ہے لیکن یہاں کی طرح شہدے کمینے نہیں کہ پیچھے ہی پڑ جائیں اور انکار کو عزت بے عزتی کا مسئلہ بنا لیں۔ ایسی لوٹ مار نہیں مچی کہ کوئی زبردستی تجھے اٹھا کے لے جائے۔ وہاں حسن کی کمی تو نہیں اور پیسے والے کے لیے تو بالکل نہیں ہے۔ ملک مقبول ایسے معاملوں میں نہیں بولتا، بس اس کے شو کی روٹین پہ فرق نہیں پڑنا چاہیے نہ پوزیشن پہ۔ باقی جو مرضی جس کا دل کرتا ہے وہ آزاد ہوتا ہے۔ ہاں ایک بات ہے، تمہیں اسٹیج پہ پرفارم کرنے کے ساتھ ساتھ ملک مقبول کے چند واقف کاروں کے لیے پرائیویٹ محفلیں بھی سجانا ہوں گی۔ نہیں نہیں، صرف ناچ گانے کی۔ یہ وہ بڑے لوگ ہوتے ہیں جو ٹکٹ خرچ کر کے عام لوگوں کے درمیان بیٹھ کر دل پشوری کرنا اپنے شایان شان نہیں سمجھتے۔ ان سے ملک تبھی رقمیں وصول کرتا ہے۔ تمہارا کمیشن الگ ہو گا اور سیٹھوں سے جو قیمتی تحائف ملیں گے وہ الگ۔"

"بات تو وہی ہو گی ناں۔ وہی بازاری ماحول۔"

"ہاں کچھ کچھ۔ تمہارے دام بھی لگیں گے' نیلامی والا حساب ہو گا لیکن فکر مت کرو' تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔ وہاں کے سیٹھ ملکے کام نہیں کرتے۔"

"ہونہہ' میری مرضی۔" وہ زہر خند لہجے میں کہنے لگی۔

"فکر کیسے نہ کروں نگاہ۔ آج اس ملک کی باتوں میں آ کے ابا جی ہر قیمت پہ مجھے دبئی بھیجنے پہ تلے بیٹھے ہیں کل وہاں کسی ارب پتی کے جھانسے میں آ کے شاید میری بولی لگانے سے بھی دریغ نہ کریں۔"

"کیا واقعی ایسا ہے؟ میرا مطلب ہے اپنے باپ کے بارے میں تم اتنی بڑی بات کہہ رہی ہو تو کچھ دیکھ کے ہی کہہ رہی ہو گی۔ اب میں تمہارے گھر کے اندرونی حالات تو نہیں جانتی۔ اگر واقعی تمہاری مرضی تمہارے بس میں نہیں تو پھر اتنا بڑا رسک نہ لو اور اگر کچھ کرنا چاہتی ہو' آگے بڑھنے کی لگن ہے تو پھر خود میں ہمت اور اعتماد پیدا کرو۔ یہ ٹھان لو کہ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی تمہیں کسی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتا' حتیٰ کہ تمہارا باپ بھی نہیں۔ صرف گانے کی محفلیں سجانے میں بھی کم پیسہ نہیں۔ ملک ٹھیک کہتا ہے سال کے دو پھیرے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیں گے۔"

"پہلے مجھے بھی کسی کی بات کا اعتبار نہیں ہوتا تھا۔ اماں کے بعد ماسی نے بچپن میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اور پھر لڑکپن میں واضح انداز میں ابا جی سے خبردار رہنے کا کہا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں جو مقصد وہ تمہاری ماں سے پورے نہیں کر سکا وہ تمہاری ذات کے حوالے سے وصول کرے گا۔ وہ اپنے فائدے کے لیے کچھ بھی کرے گا لیکن میں ان کے خلوص پہ شبہ نہ کرنے کے باوجود بس اس ایک بات کا یقین نہ کرتی تھی۔ میرا خیال تھا' وہ جیسے بھی ہیں' ہیں تو میرے والد کبھی میرا برا نہیں سوچیں گے۔ پہلا جھٹکا تب لگا جب انہوں نے ماسٹر جی کے سامنے مجھے بٹھا دیا اور تب تو ساری خوش فہمیاں بھک سے اڑ گئیں۔ جب وہ میرے پہلے شو کا کانٹریکٹ کر آئے۔ اب میں ان سے کسی بھی بات کی توقع کر سکتی ہوں۔"

"تو گویا تم صاف انکار کر دو گی۔"

"ارادہ تو یہی تھا تم سے بات کرنے سے پہلے تک۔ لیکن اب تم نے تسلی کرائی ہے اور حوصلہ بھی دیا ہے تو سوچ رہی ہوں ایک آدھ سے اور بھی رائے لے لوں۔ دیکھوں کیا مشورہ ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ واقعی میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔ ایک بات تو طے ہے کہ اب مجھے جو کرنا ہے اسی شعبے کے حوالے سے کرنا ہے۔ مجھ پہ ایک گلوکارہ کی چھاپ لگ چکی ہے میں چاہوں بھی تو اس لیبل سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ پھر کیوں نہ میں اس شعبے میں عزت اور بیچ بچاؤ کے ساتھ کوئی مقام حاصل کر لوں۔ بہرحال پیسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

☆ ☆ ☆

"سر' کوئی اے' ڈبلیو چوہدری آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" انٹر کام پہ ملنے والی اطلاع پہ شہزاد پل بھر کے لیے چونکا۔

"اے ڈبلیو۔ اوہ نو ناٹ اگین۔"

اسے یاد آ گیا کہ اللہ وسایا آج کل خود کو اسی نام سے پکارا جانا پسند کرتا ہے۔ اس کا ماتھا شکن آلود ہو گیا۔ اس نے درزیدہ نگاہوں سے اپنی ٹیبل کے دوسری جانب بیٹھی گل مہر کو دیکھا جو بڑے انہماک کے ساتھ فائل پہ چند اہم پوائنٹس نوٹ کر رہی تھی۔

"او ہاں۔ وہ۔ کہہ دو میٹنگ میں بزی ہیں۔ پھر کسی دن آ جانا۔" اس نے ٹالنے کی کوشش کی جبکہ اچھی طرح جانتا تھا یہ محض کوشش ہی ہو گی۔

"سر' یہ تو فائنل ہو گیا۔ آپ اسے اب رضوی سر کی ٹیبل پہ پہنچا دیں۔"

"مس گل مہر کیا خیال ہے ایک ایک کافی ہو جائے۔ بہت وقت ہو گیا اس اسکرپٹ کے ساتھ دماغ خشک

کرتے ہوئے۔" جانتا تھا کام پورا ہوتے ہی گل مہر اپنے کیبن جانا پسند کرتی ہے جبکہ وہ کچھ دیر اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے حوصلہ افزا جواب نے شہزاد کو ہمت باندھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اس کی شدت سے خواہش تھی گل کے ساتھ بیتے ان چند لمحوں کو خوشگوار بنانے کی۔ اس سے پہلے کہ گل کوئی جواب دیتی انٹر کام کی بیل ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس نے ناگواری سے اسے آن کیا۔

"سر یہ صاحب آپ کا ویٹ کرنے پہ اصرار کر رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ آپ کے قریبی عزیز ہیں۔"

"قریبی عزیز' مائی فٹ۔" وہ دانت کچکچا کر بولا۔ اگر اسے کسی طرح چلتا کر بھی دیتا تو شہزاد کا موڈ اس حد تک خراب تو ہو ہی چکا تھا کہ اب گل مہر کے ساتھ خوشگوار ماحول میں وہ باتیں کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا جن کے بارے میں کل سے سوچ رہا تھا۔ اللہ وسایا کی ڈھٹائی سے ہار مان کے اس نے اس کی طبیعت صاف کرنے کا ارادہ کر لیا۔ "دس منٹ بعد بھیج دینا۔" پھر وہ گل مہر کی جانب متوجہ ہوا جو فائل بند کرتے ہوئے اٹھ رہی تھی۔

"سر ہمارا خیال ہے' اگلے اسکرپٹ تک شاید ہی ہماری ضرورت پڑے۔ اپنے حصے کا کام ہم اچھی طرح فائنل کر چکے ہیں۔ کیا ہمیں دو دن آف مل سکتے ہیں۔"

"دو دن؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"اینی پرسنل ریزن؟"

"نو وے سر' لیکن کوئی کام نہ تھا تو ہمیں کیبن میں فری بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔"

"او کے' آپ کل آف کر لیں پرسوں ضرور آیئے گا' اگر کوئی خاص کام نہ ہوا تو بے شک ہاف ڈے لے کر چلی جایئے گا۔"

"او کے سر' تھینکس۔"

اس کے نکلنے کے بعد شہزاد کچھ دیر اپنے اعصاب پر سکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا جو اللہ وسایا کی آمد کی خبر سنتے ہی منتشر ہو گئے تھے مگر اس کی یہ کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے سیاہ مکروہ چہرے پہ ایک عیار اور خوشامدانہ مسکراہٹ سجا کے اس کی برداشت کا امتحان لینے موجود تھا۔ ایک ایسا کڑا امتحان' جس میں برسوں کی تیاری کے باوجود شہزاد ہمیشہ فیل ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی کوئی نہ کوئی بات ماضی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی طعنہ اسے پھر کر اپنے حواس کھونے پہ مجبور کر دیا کرتا۔

"میں قربان' میں صدقے سوہنی شان میرے مولا کی۔" وہ دونوں ہاتھ نیاز مندانہ انداز میں اٹھائے اس کی جانب بڑھا۔ شہزاد نے کوفت سے اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا کہا۔

"رب نے کیا بھاگ لگائے ہیں میرے شہزادے پتر کو میرے بھرا کے گھر پتر نہیں پیدا ہوا' برکت اتاری ہے۔"

"اچھا اچھا بیٹھو تو سہی۔" وہ اس ڈرامے بازی سے اکتایا ہوا تھا۔

"بس میرے پتر' اس برکت کی نیاز کبھی کبھی ہم غریبوں کی جھولی میں بھی ڈال دیا کر۔ اپنے سر کا صدقہ ہی سمجھ کر۔ اللہ تیرے نصیب اور اونچے کرے۔"

شہزاد نے اس کا مقصد بھانپ کر والٹ کھولا اور ہزار ہزار کے تین کڑکتے نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھائے۔ اللہ وسایا یوں مسکرایا جیسے کسی نادان بچے کی معصوم مگر حماقت آمیز حرکت پہ محفوظ ہو کے مسکرایا جاتا ہے۔

"اللہ زندگی والا کرے۔ مولا کا شکر ہے۔ اور تیری دعائیں ہے اب تیرا پھوپھا خیر سے ان ہزار دو ہزار کا محتاج نہیں رہا۔ میری اپنی دھی ماشاء اللہ اک شو کے پچیس تیس ہزار لے لیتی ہے۔"

فخر کے اس اظہار پہ شہزاد کو جی بھر کے کراہیت محسوس ہوئی۔

"مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب تو تیرے جیسے اونچے بندوں سے نکلتے ہی رہتے ہیں شہزادے۔ کہنا صرف یہ تھا کہ نرے نوٹ دے کر

ہی کسی کی مدد نہیں ہو سکتی اور بڑے طریقے ہیں مدد کرنے کے۔"

"اب کیا جائیدادیں خرید کے تمہارے نام کردوں۔"

"اللہ تجھے مبارک کرے جائیداداں میرے سوہنیا۔ بس تو اتنا کر کہ ہاتھ پکڑ کے رستہ دکھادے 'آگے بڑھنے کا موقع پھر خود بخود نکل آئے گا۔ پہلے بھی تیرے سے درخواست کی تھی کہ تیرے اتنے تعلقات ہیں' بڑی پہنچ ہے' بڑی واقفیت ہے اگر تو ادا کے سر پہ ہاتھ رکھ دے تو اسے فن کی دنیا میں راج کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ تو سمجھ رہا ہے ناں پتر۔"

شہزاد کے اعصاب تن گئے۔ اس نے جبڑے سختی سے بھینچتے ہوئے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

"شاباش۔۔۔ بس یہی عرضی لے کر آیا تھا' تیرا اپنا خون ہے۔ ترقی کرے گی تو اپنے ہی خاندان کا نام روشن ہو گا۔ بس ایک بار اس کی انگلی پکڑ لے۔ اس کا وہ بن جا۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں فلمی دنیا میں۔۔۔ بڑا بھلا سا لفظ ہے انگریجی کا۔۔۔ ہاں گاڈ پھادر (گاڈ فادر) بس تو گاڈ پھادر بن جا دیکھ ناں تو خود اس دنیا میں ہے' اچھی طرح جانتا ہے بغیر کسی تعلق کے یا اونچے نام کے لوگ چھوٹے موٹے فنکاروں کو کھا جاتے ہیں۔ تیرا نام ساتھ لگا ہو گا تو ادا کو تحفظ ہو گا۔"

"بس۔۔۔ یا کچھ اور بھی کہنا ہے۔"

"نہیں' اور کیا کہنا ہے' بس اتنا ہی کہنے حاضر ہوا تھا۔"

"میرا جواب اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ تم اپنی بیٹی سے کیا کراتے ہو' کیا نہیں' میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے میں نے اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لی تھی' تمہیں ہر ممکن طریقے سے روکنا چاہا تھا اس لیے کہ میں دل سے چاہتا تھا دعا اس کیچڑ میں قدم نہ رکھے۔ لیکن تم نے جو کرنے کی ٹھانی تھی وہ کر کے رہے۔ اب نہ میرا تم سے کوئی واسطہ ہے نہ ادا نام کی گلوکارہ سے کوئی تعلق ہے۔ وہ ترقی کرے یا تباہ ہو' میری طرف سے جہنم میں جائے۔ آئندہ اس قسم کی فرمائش لے کر میرے پاس نہ آنا۔"

"منہ بھر کے بددعا دے ڈالی تو نے تو پتر اک میں ہوں' تیرے لیے رب سے خیر مانگتے مانگتے نہیں تھکتا اور تو میری دھی کو تباہ برباد ہونے کی بددعا دے رہا ہے' اشکے بھئی اشکے۔۔۔ خون کیسے سفید ہوتا ہے آج پتہ چلا ہے تجھ سے کوئی روپیہ پیسہ تو نہیں مانگ لیا' تیرا نام تو نہیں چھین لیا۔ اگر کوئی برابر کا بھی ترقی کر لے تو انسان کی اپنی ترقی گھٹ نہیں جاتی۔"

"کرو ترقیاں' سو بار کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔"

"تجھے اپنا جان کر چلا آیا تھا ورنہ ادا کی انگلی پکڑنے والے بہتیرے' وہ ملک مقبول ترلے کرتا ہے۔ جانتا ہے ناں کل کو ادا سپر اسٹار بنے گی تو ساتھ اس کا اپنا نام بھی چمکے گا اس لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہے اسے آگے لانے کی اور تو اور دبئی والے شو کے لیے بھی بک کر رہا ہے۔ پچیس ہزار میں نہیں بلکہ ڈھائی لاکھ میں۔ چھ دن کے دورے کے پورے ڈھائی لاکھ۔ میرا ہی دماغ خراب ہو گیا تھا جو اچھے بھلے خیر خواہوں کو چھوڑ کے ادھر اپنی بے عزتی کرانے آ گیا۔"

یہ لن ترانی سن کے شہزاد ہتھے سے اکھڑ گیا۔ دعا کے معاملے سے لاتعلقی کا اعلان خود بخود بودا ثابت ہو گیا۔

"ملک مقبول۔۔۔ وہ پرموٹر۔۔۔ وہ بدنام زمانہ اسمگلر بہت اچھا راستہ چنا ہے تم نے ترقی کا۔ سیدھے جیل جاؤ گے۔ کل کلاں کو پولیس نے تمہاری بیٹی کو ہیروئن چرس سمیت ایئرپورٹ سے گرفتار کر لیا تو سفارشیں ڈھونڈنے ادھر مت آنا۔"

"میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسی باتیں کر کر کے تو نے اور تیری ماں نے ادا کو ڈرایا ہوا ہے۔ اوئے کچھ نہیں ہوتا۔ سال میں دو تین چکر لگاتا ہے وہ۔ کبھی دبئی کے' کبھی کویت کے' کبھی انگلینڈ کے تو کبھی امریکہ کے ساری بڑی بڑی گانے والیاں اور فلمی ہیروئین ساتھ ہوتی ہیں۔ آج تک تو کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ تو چاہتا ہی نہیں کہ دعا ترقی کرے۔ تیرے غریب رشتے دار تیرے مقابلے پہ آئیں۔

"ہونہہ ترقی۔ تمہارے جیسے بے غیرت ہی بیٹی کے سہارے ترقی کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ تمہارا بس چلے تو بیٹی کو چوراہے پہ کھڑا کر کے بولی لگادو۔" اس نے سارا ضبط کھو دیا۔ اللہ وسایا بھی آپے سے باہر ہو گیا۔

"میرے صبر کو نہ آزما شہزادے۔ باپ ہوں ادا کا۔ اس کا بھلا میرے سے زیادہ کون چاہے گا۔ مجھے بے غیرتی کا طعنہ دینے والا تو ہے کون؟"

"تو کیا بیٹی کا سودا کرنے والے کو غیرت مند کہا جاتا ہے۔ عورت کی کمائی پہ عیش کرنا بڑے فخر کی بات ہے؟"

"مجھے یہ طعنہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تیرا باپ بھی تیری ماں کی کمائی پہ سالوں عیش کرتا رہا ہے' خود لے کر پروڈیوسروں کے آگے پھرتا رہا ہے۔ کیا یہ۔۔۔ نہیں تھی۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ دہاڑا تھا۔

"سچ کہنا آسان ہے شہزادے' سننا۔۔۔ اور صبر کے ساتھ سننا بڑا مشکل اور سن کے پی جانا اور بھی مشکل۔ کم ذات میں ہوں تو تو بھی اس کرسی پر بیٹھ کے شاہ جی نہیں بن گیا۔ خون کبھی بدلا ہے؟ اگر میری رگوں میں گندا خون ہے تو تیرے اندر بھی یہی گندگی کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ میں کہتا ہوں نکل جاؤ۔" وہ خود پہ ضبط کرتے کرتے ہانپ گیا۔ بڑی مشکل سے اسے قتل کرنے کی خواہش کا گلا گھونٹا۔ وہ دفع ہو گیا نکل گیا۔ مگر اس کے کڑوے جملوں کی بازگشت اب تک وہیں تھی۔

اور نجانے کب تک رہنی تھی۔

نجانے کب تک۔۔۔ کتنی دیر تلک شہزاد کو اس بھٹی میں جلنا تھا۔

● ● ●

دعا کی شامت آئی تھی جو وہ بھی اسی دن' اسی معاملے میں بات کرنے کے سلسلے میں شہزاد کے گھر چلی گئی۔

اللہ وسایا کی آمد نے شہزاد کو جس طرح ڈسٹرب کیا تھا۔ اس موڈ کے ساتھ اب مزید آفس میں بیٹھنا اس کے لیے بہت مشکل تھا وہ جانتا تھا کہ اس کے چیخنے چلانے کی بلند آوازیں کسی حد تک باہر اسٹاف تک ضرور گئی ہوں گی۔ وہ معاملے کی نوعیت کو بے شک نہ بھانپ سکے ہوں' لیکن اندر ہی اندر یہ سوال ضرور اٹھ رہے ہوں گے کہ یہ کمین ذات اور بدقماش سا شخص آخر ان کے باس پہ اس قدر حاوی کیوں ہے کہ اس سے ناگواریت کا کھلا اظہار کرنے کے باوجود وہ اس سے ملنے' اسے اندر بلوانے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اور آخر یہ شخص ایسا کون سا منتر جانتا ہے جسے پھونک کر وہ شہزاد کو آتش فشاں بنا دیتا ہے۔ ان سوالوں سے منہ چھپاتا وہ فوراً ہی آفس سے نکل آیا۔

ارادہ تھا کہ پہلے تو گھر جا کر اماں کے سامنے بھڑاس نکالی جائے کہ ان کی ہی اقرباپروری اور شہ دینے والی نرمی سے فائدہ اٹھا کے اللہ وسایا آئے دن اس کی ٹھہری ہوئی پرسکون زندگی میں تلاطم برپا کرنے منہ اٹھا کے آجاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کوئی سکون آور ٹیبلیٹ لے کے دو تین گھنٹوں کی نیند لینا چاہتا تھا تاکہ شام کو پڑوسی ملک سے آنے والے ثقافتی وفد کے اعزاز میں دیے گئے عشائیے میں ہشاش بشاش ہو کے شرکت کر سکے۔ یہ دعوت اس کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ اسے مشترکہ پروڈکشن کی کئی آفرز آئی تھیں اور وہ ان پہ سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ بہرحال ان کا میڈیا کئی گنا زیادہ وسیع اور طاقتور تھا۔ اس کے ذریعے وہ اپنی شہرت کا دائرہ مزید پھیلا سکتا تھا۔

لیکن ہوا یہ کہ طبیعت کو ہلکا پھلکا کرنے کے ارادے سے گھر آئے شہزاد کے دل پہ منوں بوجھ مزید بڑھ گیا' جب سامنے ہی دعا کو صوفے پہ آلتی پالتی مارے اور گود میں امرود کی پلیٹ رکھے' اماں سے گپ شپ کرتے دیکھا۔ اماں کسی بات پہ کھل کے ہنستے ہوئے اس کی پلیٹ میں رکھی امرود کی گول پتلی کٹی قاشوں پہ چاٹ مسالا چھڑک رہی تھی۔

"لو' دیکھو' اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ۔" بانو نے بیٹے کو اندر آتے دیکھ کے کہا۔

"یہ دونی ابھی آئی تھی' کہہ رہی تھی چھاجی سے ملنا ہے میں نے کہا' اب تو تجھے کم از کم رات تک رک کے انتظار کرنا پڑے گا لیکن دیکھ لے' آج تو دوپہر ویلے ہی گھر آگیا۔ چلو تسی دونوں گل بات کرو' میں روٹی ہانڈی

دیکھوں۔" اس نے پھلوں کے چھلکوں والی باسکٹ اٹھائی۔

"شہزادے' کھانا گرم کروں؟"

"نہیں' بس ایک کپ چائے اور وہ بھی میرے کمرے میں۔" اس نے ماں کی "بیٹھ کے گل بات" کرنے والی پیشکش کو یکسر مسترد کرتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ دعا بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک منٹ چھاجی' مجھے واقعی آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ پلیز... میں زیادہ وقت نہیں لوں گی' بس دس بارہ منٹ۔" اس کے لہجے کی لجاجت پہ وہ طوعاً "کرہاً" رک گیا۔ بالو کی نگاہوں میں بھی تنبیہہ صاف نظر آ رہی تھی۔ چہرے پہ انتہا درجے کی کوفت اور ناگواری سجا کے وہ وہیں کھڑے کھڑے کمال بے اعتنائی کے ساتھ بولا۔

"ہاں بولو' کیا بات ہے؟"

"لے' ایہہ کی؟" بالو نے کچن کی طرف جاتے جاتے ایک بار پھر مڑ کے مداخلت کی۔

"بازار میں ملے ہو کیا؟ جو کھڑے کھڑے بات کرنی ہے۔ آرام نال' سکون نال بیٹھ کے بات کرو۔ چل میرا شہزادہ پتر' بیٹھ جا' میں چائے لے کے آئی' دوپنی بڑا مزیدار کیک لائی ہے' وہ بھی لاتی ہوں۔"

ناچار وہ صوفے کے ایک سرے پہ ٹک گیا اور اپنی سوالیہ نظریں دعا کے بے چین چہرے پہ گاڑ دیں۔ اس دن والا اعتماد اور بے خوفی نجانے وہ کہاں رکھ کے آئی تھی۔ اضطراب اس کے ہر عمل سے ہویدا تھا۔ گود میں رکھے ہاتھوں کی انگلیاں بری طرح مسلتے ہوئے بالآخر وہ گویا ہوئی۔

"چھاجی' آپ ملک مقبول کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"تم کیا جاننا چاہتی ہو؟" اس نے سرد لہجے میں سوال لوٹایا۔ ابھی وہ سر جھکا کے الفاظ ترتیب ہی دے رہی تھی کہ وہ زہر خند لہجے میں ایک اور چبھتا ہوا سوال کر بیٹھا۔

"کیا پیشکش کی ہے اس نے تمہیں؟ کس چیز کے عوض تمہیں گروی رکھنے کی آفر دی ہے؟ کوٹھی' کار' بینک بیلنس یا پھر کسی بڑی فلم میں ہیروئن بنانے کا لالچ...؟ اور ان سب کے بدلے وہ تمہیں نکاح کر کے کہیں رکھنا چاہتا ہے... یا پھر یونہی کام چلانے پہ زور دے رہا ہے؟"

"چھاجی؟" چند لمحے تو وہ اس کے پے در پے تابڑ توڑ سوالوں کی نوعیت ہی سمجھتی رہی' حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور جب شہزاد کے سنگین سنجیدہ چہرے سے کسی مذاق کی رمق تک نہ ملی تو اسے یقین آ گیا کہ یہ سب بے بنیاد الزام واقعی اس کے "چھاجی" نے اس پہ عائد کیے تھے۔ وہ دکھ' کرب اور شکوے سے چلا اٹھی۔

"چھاجی... آپ؟"

اس کے سفید پڑتے چہرے' کپکپاتے لبوں اور غم سے پھٹتی آواز نے بھی شہزاد پہ کوئی خاص اثر نہ ڈالا۔ وہ بدستور ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سنگدلی سے اللہ وسایا کی جانب سے دل میں بھرا سارا غبار اس نازک سی لڑکی پہ نکال رہا تھا۔

"کیوں؟ حیران ہو رہی ہو کہ تمہارے بتانے سے پہلے ہی میں یہ سب کیسے جان گیا؟"

"حیران تو ہوں چھاجی... مگر اس بات پہ کہ وقت کتنی جلدی دل اور جذبات دونوں کو بدل دیا کرتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا چھاجی' جب میں حیران ہوا کرتی تھی کہ میں نے تو یہ بات چھاجی کو بتائی تک نہیں' پھر انہیں کیسے خبر ہوئی کہ مجھے اس چیز کی ضرورت تھی' مجھے یہ پریشانی تھی... اور آج میں حیران اس بات پہ ہوں کہ میرے دل کے اندر تک اتر کے میرے سارے مسائل... ساری خواہشات جان لینے والے چھاجی آج کنارے پہ کھڑے ایسے بے بنیاد اندازے لگا رہے ہیں۔"

"میں نہیں بدلا۔ میں پہلے بھی وہی تھا' اب بھی وہی ہوں۔ بدلی تو تم ہو۔ وہ جو آئینے کی طرح شفاف تھی' جس کے دل کی ہر بات میں اس کے چہرے سے بھانپ لیا کرتا تھا وہ دعا تھی... دعا اور یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے۔ وہ ندا ہے... ادا۔"

"نام بدلنے سے کیا فرق پڑتا ہے چھاجی؟"

"کام سے تو پڑتا ہے۔" اس نے سفاکی سے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔

"جس کام سے اب تم وابستہ ہو' اس لحاظ سے اگر تم کسی تگڑی آسامی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتی پھرو گی تو لوگ یہی اندازہ لگائیں گے۔"

"لوگ... مگر میں لوگوں کے پاس تو نہیں گئی' میں تو اپنوں سے مدد مانگنے آئی تھی۔ میں تو آپ سے مشورہ کرنے آئی تھی چھاجی۔"

"بھئی میرا کیا حق ہے مشورہ دینے کا۔ میرے پہلے مشورے کو تو تم نے کسی قابل نہ سمجھا اور اپنی کر کے رہی۔ بن بیٹھیں دعا سے ادا پھر بھی اگر سننا ہی چاہتی ہو تو ٹھیک ہے... اگر نکاح کر رہا ہے تو حرج نہیں ویسے تو اس معاملے میں بھی اس کا ریکارڈ خاص اچھا نہیں' سال دو سال بعد جی بھر جائے تو چھوڑ دیا کرتا ہے لیکن اگر بدلے میں تمہیں کچھ مل رہا ہے یا تم اپنی مرضی کے مطابق لکھوانے میں کامیاب ہو جاتی ہو تو سودا برا نہیں یہ بھی امکان ہے کہ اگر تم شرافت سے چار دیواری میں رہنے والی بیوی بن جانا چاہو تو وہ اپنا ارادہ بدل دے' چند مزید سال تمہیں عزت سے زندگی بسر کرنے کو مل جائیں۔ لیکن زور کس پہ ہوا اس پہ کہ... اگر تم واقعی عزت کی زندگی چاہتی ہو۔"

نہ اس کے دل جلانے والے انداز میں فرق پڑا تھا نہ طنز کے زہر میں ڈوبی مسکراہٹ پھیکی پڑی تھی اور نہ ہی الفاظ کی تپش کم ہوئی تھی۔ فرق پڑا تھا تو صرف دعا پہ... جو ایک بار پھر اس کی تمام تر بے اعتنائی اور گریز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے مدد مانگنے چلی آئی تھی۔ یہ اس کا شہزاد پہ بے پایاں اعتماد تھا جو خود تو پاش پاش ہوا ہی تھا لیکن دعا کا اپنی ذات پہ سے بھی اعتماد ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر دھواں دھواں آنکھوں سے شہزاد کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ جہاں اپنے کہے الفاظ کی سنگینی پہ نہ شرمندگی تھی نہ پچھتاوا۔ دعا نے اس کڑوے دھوئیں کو اپنے اندر اتار لیا۔ اس کا اندر بھی اب اتنا ہی کڑوا کسیلا تھا جتنا کہ شہزاد کا۔ یہ کڑواہٹ دونوں طرف برابر کی تھی۔

"ہاں مجھے عزت کی زندگی چاہیے مگر اپنے بل بوتے پہ' پتہ نہیں آپ کے یا آپ کے جیسے دوسرے مردوں کے نزدیک عزت کی زندگی کا کیا معیار ہے' کیا پیمانے مقرر کر رکھے ہیں آپ نے لیکن میرے نزدیک عزت کی زندگی وہ زندگی ہے چھاجی' جو آپ کی اپنی ہو' ادھار کی نہ ہو اور اس پہ آپ شرمندہ بھی نہ ہوں۔ کس کام کی یہ دولت' یہ شہرت جس پہ آپ کھل کے ناز بھی نہ کر سکیں' کیا فائدہ اتنے نام کا... جس کا بھرم رکھنے کے لیے آپ کو اپنا اصلی نام اور پہچان چھپانا پڑے۔ ایسی عزت کا کیا کریں گے آپ چھاجی' جس کے ہر وقت کھونے کا ڈر آپ کو منہ چھپائے رکھنے پہ مجبور کرتا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ غرایا۔

"بکواس تو کرنے کی چیز ہے۔" وہ اسی انداز میں مسکرائی' جس انداز میں کچھ دیر پہلے تک وہ خود مسکرا رہا تھا۔

"مجھے بھی عزت کی زندگی چاہیے لیکن اس کے لیے نہ تو میں ملک مقبول کے سہارے کی محتاج ہوں نہ ہی خود ملمع چڑھا کے اپنی جھوٹی شناخت چاہتی ہوں۔ جھوٹی شناخت اور جھوٹے حوالے سے ملی عزت پہ کوئی کتنی دیر تک اترا سکتا ہے۔ مانگے کا لباس پہننے میں یہی خطرہ تو رہتا ہے کہ کہیں کوئی بھری محفل میں راز نہ کھول دے' لباس پہن کے بھی انسان خود کو عریاں محسوس کرے' اس سے تو بہتر ہے کہ اپنے چیتھڑوں کو ہی کوشش کر کے رفو کر لیا جائے۔ مجھے بھی ایسی عزت نہیں چاہیے جس کے حصول کے لیے مجھے کسی کی چوتھی یا پانچویں بیوی بن کے... اور شاید اس جائز رشتے کو کسی ناجائز تعلق کی طرح پوشیدہ رکھتے ہوئے چند ہزار ماہانہ کے عوض ٹھاٹھ کی زندگی گزارنا پڑے۔ ایسی جائیداد کے میرے نام ہونے کا مجھے کیا فائدہ جس کے حصول کے لیے مجھے اپنے نام کے آگے اپنے شوہر کا نام تک لگانے کی اجازت نہ ملے اس سے تو میرا نام بغیر کسی حوالے کے ہی بہتر ہے۔"

"تو ملک مقبول کے بارے میں مشورے اور آراء کس خوشی میں اکٹھی کرتی پھر رہی ہو۔" وہ اس کے چھپے ہوئے طنز کو بھانپ کے کسمسا رہا تھا۔

"بزنس کے سلسلے میں چھاجی۔۔۔ بزنس۔" اس نے بھی ٹھیک اسی کے اسٹائل میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھ لی اور سامنے رکھی فروٹ باسکٹ سے ایک تازہ سا سیب چھانٹ کے کترنے لگی۔

"اس نے مجھے آفر ضرور کی ہے لیکن اس قسم کی نہیں' جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں اس پروفیشن میں نام بنانے آئی ہوں' ایک مقام حاصل کرنے آئی ہوں' کسی کی غلامی کرنے یا کسی کی داشتہ بننے نہیں۔ میرے اندر اتنی صلاحیتیں ہیں اور اتنی ہمت اور حوصلہ بھی ہے کہ میں ان کے بل بوتے پہ اپنے مقاصد حاصل کر سکوں۔ مجھے ایسے ہتھکنڈے آزمانے کی ضرورت نہیں۔ ملک مقبول نے مجھے جس معاہدے کی پیشکش کی ہے اس کی رو سے میں آئندہ تین سال تک اس کے ہر بیرون ملک شو میں شرکت کرنے کی پابند ہوں گی اس کے بدلے اس نے مجھے ہر شو کا تین لاکھ روپیہ آفر کیا ہے' اس کے علاوہ ہر پہلے سال تو نہیں' البتہ دوسرے اور تیسرے سال میں ہونے والے شوز کی کل آمدنی میں سے مجھے دس فیصد اضافی ملے گا۔ ٹکٹ فری' رہائش فری۔۔۔"

"یہ سب فری نہیں ہے' نہ اسے فری سمجھنے کی کوشش کرنا۔ ان سب کی بھاری قیمت وصولے گا وہ تم سے اور یہ جو تم اکڑ کے بڑی بڑی ڈینگیں مار رہی ہو کہ اپنی صلاحیتوں اور ہمت کے بل بوتے پہ کامیابی حاصل کرو گی تو مس ادا' بڑی بڑی صلاحیتوں والیوں کو میں نے فلمسازوں اور ڈسٹری بیوٹرز کے تلوے چاٹتے دیکھا ہے۔ یا تو اتنا سرمایہ ہو کہ بغیر کسی فنانسر کے کوئی خود اپنی راہ نکال لے۔۔۔ ورنہ دوسری صورت میں راستہ بنانے کے لیے صلاحیتیں وغیرہ کچھ کام نہیں آتیں۔ صرف ایک چیز کام آتی ہے۔ کوئی خود بخود سودے پہ تیار ہو جاتی ہے' کوئی تمہاری جیسی خوش فہمیوں کی ماری ہوتی ہے جسے اس طرح کے دانے ڈال کے پھنسایا جاتا ہے۔"

"یعنی آپ کے خیال میں مجھے ملک مقبول کی اس "پرکشش آفر" کو پہلی فرصت میں رد کر دینا چاہیے۔" اس نے پرکشش پہ زور دیتے ہوئے کریدا۔

"میرا مشورہ تو یہی ہے۔۔۔ اگر تم واقعی یہاں میرا مشورہ لینے آئی ہو۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے اور کچن کی جانب دیکھا' جہاں سے اب تک چائے کے آثار نمودار نہ ہوئے تھے۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا پہلا اندازہ درست تھا۔ اس نے مجھے واقعی شادی کی پیشکش کی ہے۔۔۔ اس قسم کی شادی جو اس شوبز کی نقلی چمک دمک کی طرح نقلی ہی ہوتی ہے۔ کسی فلیٹ میں یا کسی کوٹھی میں بیش قیمت زیورات' ملبوسات' ملازموں اور ایک عدد ذاتی کار کے ساتھ اس کی پانچویں بیوی بن کے ایک پوشیدہ زندگی گزارنے کی پیشکش تو آپ کا مشورہ کیا ہوتا؟"

"وہ مشورہ بھی میں دے چکا ہوں کہ اگر دولت ہی چاہیے تو کسی ایک کی بن کے اس طرح بھی کما سکتی ہو۔ کیا پتہ' وہ دو تین سال کی بجائے عمر بھر کے لیے تمہیں بیوی بنا کے رکھ لے اور عمر بیچارے کی اب کتنی رہ گئی ہے۔ کسی کی بیوہ بن کے بھی کم فائدے نہیں اٹھائے جا سکتے۔ کم از کم یوں ٹکے ٹکے کے لوگوں کے آگے بن سنور کے تھرکنے سے تو بہتر ہے۔"

"بہت بہت شکریہ چھاجی۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بہت بہت شکریہ اس مخلصانہ مشورے کا۔ اب مجھے اپنا فیصلہ کرنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ ابا کا یہ کہنا بھی درست ثابت ہو گا کہ جن کو میں اپنا خیر خواہ جانتی آئی ہوں' اصل میں وہ میرے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں۔"

"ہونہہ ہم اور تمہارا ابا۔۔۔ اب تو تمہیں اسی میراثی کے قول درست لگیں گے۔"

"زبان سنبھال کے بات کیجیے شہزاد ملک صاحب۔" غالباً "نہیں یقیناً" زندگی میں پہلی بار اس نے اس کا نام لیا تھا اور وہ بھی اس انداز میں وہ پورا سراٹھا کے سامنے کھڑی اس کامنی سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کا نازک وجود غیض و غضب کی شدت سے ہلکے ہلکے جھٹکے کھا رہا تھا۔ جن آنکھوں میں وہ بچپن سے اپنے لیے عقیدت' پرستش اور محبت دیکھتا آرہا تھا' ان سے آگ کی لپٹیں نکلتے دیکھ کے شہزاد کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"آپ کسی ایرے غیرے کے بارے میں نہیں' میرے ابا کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور میں ابھی اتنی بے حمیت نہیں ہوئی کہ اپنے باپ کو اپنے لیے باعث ذلت محسوس کروں۔ وہ جیسے بھی ہیں' جو بھی ہیں' میرے لیے والد کی حیثیت سے قابل احترام ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی نام نہاد عزت' اپنے ہی ماں باپ کے وجود سے خطرے میں پڑ جایا کرتی ہو۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو میں یہاں۔۔۔ آپ کے پاس چلی آئی۔ مجھے جان لینا چاہیے تھا' بہت پہلے جان لینا چاہیے تھا کہ جو شخص اپنی خود کی پہچان' اپنی ذات اور اپنے ماں باپ کے حوالے سے بھی شرم محسوس کرتا ہو' اس کے نزدیک کسی دوسرے کی عزت کیا معنی رکھتی ہے۔"

وہ تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ اسی لمحے بالو چائے کی ٹرالی دھکیلتی کچن سے نکلی۔ اس نے آندھی طوفان کی طرح نکلتی دعا کو دیکھ کے آواز بھی دی مگر اتنے میں وہ مین ڈور پار کر کے اپنی کار تک بھی پہنچ چکی تھی۔ جتنی دیر میں بالو دروازے تک پہنچ کے اسے دوسری آواز دیتی' وہ کار ریورس کرتی گیٹ سے نکال کے لے جا چکی تھی۔

"ہائے' ہائے' فیر تو نے کڑوی کسیلی کہہ کے وچاری کو واپس کر دیا' کتنی واری کہا ہے' زبان میٹھی رکھا کر' ایویں کسی کا دل توٹے۔۔۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی شہزاد نے پاؤں کی ٹھوکر سے سامنے رکھا ٹیبل الٹ دیا اور اس پہ رکھی ایش ٹرے' فروٹ باسکٹ اور گلدان ادھر ادھر کارپٹ پہ بکھر گئے۔

"منع کر دیں اسے آئندہ یہاں نہ آئے ورنہ میرے ہاتھوں زندہ بچ کے نہ جائے گی۔ بلکہ اس کی خیریت اس میں ہے کہ آئندہ اس راستے سے بھی نہ گزرے' جہاں میرا گزر ہوتا ہے۔"

"ہوا کیا ہے؟"

"اور کیا کسر رہ گئی ہے۔ یہ کل کی لڑکی۔۔۔ ٹیوشن پڑھا پڑھا کے جس کی اسکول کی فیسیں ادا کیں' آج وہ میرے منہ کو آرہی ہے۔ اتنی لمبی زبان نکال کے مجھے ٹکے ٹکے کی باتیں سنا گئی ہے اور وہ بھی میرے ہی گھر میں بیٹھ کے۔ جس باپ کے سائے سے محفوظ رکھنے کی میں نے کوشش کی آج اسی بے غیرت باپ کی محبت میں سارے احسان بھول کے مجھے ذلیل کر گئی ہے۔"

"نہیں' ماں ہی نہیں سکتی' دوئی اور تیرے ساتھ بدزبانی کرے۔۔۔ وہ تو اتنی بھلی مانس ہے کسی کے آگے بھی اونچا نہیں بول سکتی' اور تیرے آگے تو خیر کبھی بھی نہیں۔" بالو انکاری ہو گئی حالانکہ کچن سے نکلتے ہوئے اس کے کانوں میں دعا کی اونچی آواز ضرور پڑی تھی لیکن اس کا دل یہ ماننے پہ ہرگز تیار نہ تھا کہ وہ شہزاد سے کسی قسم کی بدتمیزی کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس اسے اندیشہ تھا کہ ضرور شہزاد نے ہی کچھ ایسا ویسا اسے کہہ ڈالا ہو گا کہ وہ ناراض ہو کے چلی گئی۔ مگر وہ اس اندیشے کو زبان پہ لا کے اسے مزید طیش نہ دلانا چاہتی تھی۔

اتنے میں کرم الٰہی گھر میں داخل ہوا' جب سے موسم بدلا تھا' وہ چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا گھر سے ذرا فاصلے پہ واقع پارک میں چلا جاتا' جہاں اس کے جیسے' اس کے ہم عمر کئی ریٹائر قسم کے بزرگ نرم گرم دھوپ کے مزے لیتے اپنی اپنی زندگی کے تجربات دہرایا کرتے۔

"خیر تو ہے؟"

بالو کے سٹ پٹائے انداز' بیٹے کے تناؤ زدہ چہرے اور کمرے میں الٹی ہوئی میز اور بکھری چیزیں دیکھ کے وہ بھانپ گیا کہ ضرور کوئی معرکہ ہوا ہے۔

"کوئی گل نہیں' تسی خیر نال کمرے میں چلو۔" بالو کو اس کی آمد سے یہ ٹھنڈا پڑتا معاملہ ایک بار پھر گرم ہوتا محسوس ہوا۔

"آئی تھی آپ کی لاڈلی' آپ کی بہن کی نشانی۔۔۔ وہ گانے والی۔" وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"شہزادے۔۔۔" کرمے نے اپنے کمزور' داغ زدہ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کے اسے ٹوکا۔ نتیجتاً اس کی سانس اکھڑ گئی۔ بالو فوراً آگے بڑھ کے اسے سہارا دے کے صوفے تک لائی اور اس کی کمر سہلاتے ہوئے' سانس کو

معمول پہ لانے کی کوشش کرتے ہوئے' بیٹے کو ملامتی نظروں سے گھورنے لگی جو بدستور چنگاریاں برسا رہا تھا۔

"دیکھ بلقیس' اس بے شرم' بے ہدایتے کو دیکھ' اپنے خاندان سے شرم کھاتا ہے' اسے بے غیرتوں کا خاندان کہتا ہے اور اس کی اپنی غیرت تو دیکھ' اپنے گھر کی عزت کو' اپنی بہن کو گانے والی کہہ رہا ہے۔"

"تو اور کیا کہوں' جو وہ ہے وہی کہوں گا۔ کیا نہیں گاتی وہ گانے! کیا محفلیں نہیں سجاتی؟ کیا لوگ اس کے سر پہ سے نوٹ نچھاور نہیں کرتے؟ اور وہ اس کا باپ۔۔۔ یہ دونوں جونک کی طرح مجھے چمٹ کے رہ گئے ہیں۔ میرا خون چوستے رہتے ہیں۔ وہ ذلیل انسان دفتر تک چلا آیا۔ وہاں مجھے ذلیل کرنے میں جو کسر رہ گئی تھی' وہ گھر پہ بیٹی کو بھیج کر پوری کر دی۔ دفتر سے بھاگ کے سکون لینے گھر آیا' اور آگے اماں اس فتنی کو بٹھا کے خاطر داریاں کر رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ میں پناہ لینے کہاں جاؤں' کیا کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لوں۔ مجھے اپنے ہی گھر میں پناہ تک نہیں ملتی۔ جس کا جی چاہتا ہے' میری عزت دو کوڑی کرنے کے لیے بلا جھجک منہ اٹھا کے اندر آجاتا ہے۔"

"چل اللہ وسایا کی تو میں مانتا ہوں' اسے گر آتے ہیں اگلے بندے کو کلسانے کے' لیکن دعا تو چاری تیرا کیا لیتی ہے۔ میں سختی سے منع کر دوں گا اللہ وسائے کو۔ آئندہ تیرے دفتر کے آس پاس بھی نہ پھٹکے مگر پتر' دولی کے یہ ماے کا گھر ہے۔ وہ بن ماں کی بچی' رشتوں کی ترسی' محبت کی بھوکی' کبھی مہینوں بعد بھول کے گھڑی دو گھڑی ادھر آجاتی ہے تو تیرا کیا جاتا ہے۔ خون کا رشتہ ہے اس کا تیرے ساتھ۔" کرم الٰہی نے طریقے سے اسے رام کرنا چاہا۔

"وہ اب اتنی ترسی ہوئی یا محبتوں کی بھوکی نہیں رہ گئی ابا۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"اسے اب اگر کسی چیز کی بھوک ہے تو صرف پیسے کی' صرف نام کی اور اس کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ کرے۔۔۔ جو اس کا جی چاہتا ہے کرے۔۔۔ مگر کرتے ہوئے یا کرنے کے بعد مجھ سے' میرے گھر سے اور میرے ماں باپ سے کسی قسم کا تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں وہ اس گھر میں اسی صورت داخل ہو سکتی ہے اگر پہلے کی طرح ادا کی بجائے دعا بن کے آئے لیکن میں اسے گانے بجانے والی کے روپ میں کسی رشتے کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"یہی بات تو اسے پیار سے بھی سمجھا سکتا تھا' پتہ نہیں اسے کیا کیا سنا ڈالا کہ نمانی فورا" یہاں سے چلی گئی۔" بالو کو اب تک رہ رہ کے افسوس ہو رہا تھا کہ پچھلی بار بھی دعا روتے ہوئے ہی اس گھر سے نکلی تھی اور اب بھی' دونوں بار اس کی وجہ شہزاد کا رویہ تھا۔

"باتیں میں نے نہیں' آپ کی اس لاڈلی نے سنائی تھیں مگر آپ تو یہ ماننے پہ تیار ہی نہیں کہ اس کے منہ میں بھی زبان ہو سکتی ہے۔"

"منہ میں زبان ہو یا نہ ہو۔۔۔ پتر' سینے میں دل تو ہے ناں۔ کتنی دیر تک تیری کلیجہ ساڑ دینے والی باتوں پہ صبر کرتی۔ انسان ہے' بندہ بشر' جواب دے گئی ہو گی برداشت۔" کرمے نے ہنکارا بھرا۔

"تو یہ بتا کہ اب نئی بات کیا ہوئی ہے؟"

"نئی بات نہیں بلکہ نیا ڈرامہ۔ یہ ڈرامے بازی ہی تو ہے' پہلے خود مشورہ مانگا کہ ملک مقبول کے ساتھ باہر ملک شو کرنے جاؤں یا نہ جاؤں۔ اگر میں بیٹھ کے تھپک کے شاباش دیتا کہ جاؤ' ضرور جاؤ' ہر جائز ناجائز طریقے سے دولت کماؤ' اپنے حسن اور جوانی کو جس حد تک کیش کروا سکو' ضرور کراؤ تب تو میں ٹھیک ہوتا' اس کی اور اس کے باپ کی نظر میں ان کا سب سے بڑا خیر خواہ ٹھہرایا جاتا لیکن اگر میں نے اسے ملک مقبول کی نیت اور ارادوں سے خبردار کر دیا ہے' اس کے شوز کی اصلیت کھول کے بیان کی ہے تو میں دوغلا' حاسد اور کم ظرف کہلایا جا رہا ہوں۔ بقول اللہ وسایا' میں کسی کو کامیاب ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتا اور یہ بالشت بھر کی احسان فراموش لڑکی' منہ بھر کے سنا گئی ہے کہ جس کی اپنی کوئی عزت نہ ہو' اسے باقی سب بھی بے عزت نظر آتے ہیں۔"

وہ چیختا چلاتا اپنے کمرے میں چلا گیا تو بلقیس اور کرم الٰہی خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے۔

♥ ♡ ♥

"کچھ بتائے گی بھی یا یونہی کلپتی رہے گی اور ساتھ ساتھ مجھے بھی کلساتی رہے گی۔"

بالآخر نگاہ نے جھنجلاہٹ اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے جھنجھوڑ کے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ دعا جب سے اس کے پاس آئی تھی بغیر کوئی وجہ بتائے بس روئے چلی جا رہی تھی۔ نگاہ پہلے تو اس کے آنسو دیکھ کے پریشان ہو گئی' پیار سے ہمدردی سے منت کر کے ہر طرح سے پوچھ کے دیکھ لیا' نہ تو اس کے آنسو رکے نہ لب کھلے۔ اب نگاہ صرف پریشان ہی نہیں بلکہ فکر مند بھی ہو گئی کہ کہیں دعا کی حالت مسلسل رونے سے خراب نہ ہو جائے۔ مجبورا" اسے سخت لہجہ اپنانا پڑا۔

"قسم اللہ پاک کی' تجھے اس طرح تڑپ تڑپ کے روتا دیکھ کے میرے اپنے دل کو کچھ ہونے لگا ہے' ذرا سوچ تیرے دل کا کیا حال ہو گا۔۔۔ مر جائے گی اب بس کر۔"

دعا نے دونوں ہتھیلیاں رخساروں پہ رگڑتے ہوئے آنسو صاف کرنے کی کوشش کی مگر متورم آنکھوں سے برستے جھرنے پھر سے سارا چہرہ بھگو گئے۔ اس کے اپنے ہی آنسوؤں پہ اس کا بس نہ تھا۔ بالکل اس کے اپنے ہی دل کی طرح جو اسے ہر بار بری طرح بے بس کر کے۔۔۔ بے دست و پا کر کے۔۔۔ ہمیشہ کی طرح ذلیل ہونے کے لیے اس کے پاس گھسیٹ لے جاتا ہے۔۔۔ اسی طرح یہ آنسو وہ جتنا روکنے کی کوشش کرتی' اتنا ہی ابل ابل کے۔۔۔ امنڈ امنڈ کے بہے جاتے۔

"سچ کہہ رہی ہوں' اب اگر تو نے رونا بند نہ کیا تو ایمان سے میں اپنا سر سامنے کی دیوار سے مار بیٹھوں گی۔" نگاہ کا واقعی اس وقت وہ حال تھا کہ وہ اس دھمکی پہ سچ مچ عمل کر بیٹھتی۔

دعا نے بیچارگی سے اسے دیکھا جیسے اپنے آنسوؤں کی بے اختیاری کا شکوہ کر رہی ہو۔ لب دانتوں تلے دبا کے اس نے سسکیاں روکنے کی کوشش کی۔ آہوں کا گلا بے شک گھونٹ دیا لیکن اندر ہی اندر وہ اب بھی طوفان بلائے ہوئے تھیں جس کی وجہ سے اس کا نازک وجود جھٹکے کھا رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک ہی خود پہ قابو پانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کی سانس اکھڑ گئی تھی۔ اسے بری طرح ہچکولے کھاتے دیکھ کے نگاہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے اس کے لبوں سے پانی کا گلاس لگا کے پانی پلانے کی کوشش کرنے لگی مگر ہچکی بندھ جانے کی وجہ سے پانی اس کے اندر اترنے کی بجائے واپس نکل آتا۔

"یا اللہ' یہ کیا ہو گیا اسے؟" نگاہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اس کی کبھی کمر سہلاتی' کبھی ہاتھ پیر مسلنے لگتی۔ اگلے ہی لمحے دعا بے دم سی ہو کے اس کے بازوؤں میں تھی۔ نگاہ نے آرام سے اس کے بے ہوش وجود کو وہیں اسی صوفے پہ کشن سیدھا کر کے لٹا دیا جہاں بیٹھی وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے رو رہی تھی۔ اس کی بے ہوشی پہ بجائے تشویش میں مبتلا ہونے کے نگاہ قدرے پر سکون ہو گئی۔

اس نے اپنے دوپٹے سے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ خشک کرنا چاہا تو چونک اٹھی۔ اس کا سارا جسم نہ صرف ٹھنڈا پڑ چکا تھا بلکہ پسینے میں شرابور تھا حتیٰ کہ بال تک بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے بے ہوش بدن میں بھی ابھی تک ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔

"ہائے اللہ' کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔۔۔ منع بھی کیا تھا' نہ اپنی جان پہ ظلم توڑ' بھلا یوں رو کے بھی انسان ہونی کو بدل سکتا ہے۔"

وہ جلدی سے چادر گھسیٹ کے لپیٹتی ہوئی' پرس اٹھا کے باہر کی جانب لپکی۔ تیز تیز سیڑھیاں نیچے اترتے ہوئے وہ ذہن میں آس پاس کے کسی اچھے کلینک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس بوسیدہ بلڈنگ سے جہاں نگاہ کا چھوٹا سا فلیٹ تھا' باہر نکلتے نکلتے اسے آٹھ منٹ لگ گئے۔ اس کا سارا دھیان اوپر کمرے میں اکیلی بے ہوش پڑی دعا کی جانب تھا۔ بلڈنگ کے احاطے سے نکل کے اس نے سڑک کنارے کھڑے ہو کے دائیں بائیں نظر دوڑائی جیسے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ اسے کس جانب جانا چاہیے۔ اگرچہ اس فلیٹ میں منتقل ہوئے اسے چھ سات ماہ ہو رہے تھے لیکن اتفاق کی بات تھی کہ گردو نواح کا

جائزہ لینے کا نہ موقع مل سکا تھا نہ ہی ضرورت آن پڑی تھی اور وہ قطعی لاعلم تھی کہ اس علاقے میں کوئی اچھا ڈاکٹر کہاں سے مل سکے گا۔ اسی تذبذب کے عالم میں اس کی نظر اچانک ہی سڑک کے دوسری جانب پان والے کے کھوکھے کے نزدیک کھڑے بابر ہمایوں مغل پہ پڑی۔ وہ حسب معمول نفیس ململ کے بے داغ اور بے شکن کڑکڑاتے کرتے شلوار میں تک سک سے تیار اپنے مخصوص شاہانہ انداز اور کروفر کے ساتھ کھڑا غالباً" اپنے اسپیشل آرڈر پہ تیار ہوتے پان کا انتظار کر رہا تھا۔

نگاہ کو شروع سے ہی اس شخص سے عجیب بے نام سی چڑ تھی۔ یوں تو اس کے ایسے بہت سے قدر دان اور چاہنے والے تھے جن کی شکل تک دیکھنے کی وہ روادار نہ تھی لیکن وہ نوازنے والے تھے' اس کی دال روٹی چلانے والے اس لیے ان سے وہ بناوٹی ہی سہی لیکن لگاوٹ کا مظاہرہ کرنے پہ مجبور تھی جبکہ اس خالی جیب والے نواب کی بے سروپا باتیں اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کی عادت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ملک مقبول کو نجانے اس میں کیا نظر آتا تھا یا اللہ جانے اس کا اس نکھٹو سے کیا مفاد وابستہ تھا کہ وہ ہر جگہ بن بلائے اور بغیر پیسہ خرچ کیے موجود ہوتا۔ اس قدر آمنا سامنا ہونے کے باوجود نگاہ نے اس کی ذرہ برابر حوصلہ افزائی نہ کی تھی اور دعا سے اس کے بڑھتے تعلقات پہ وہ کئی بار اسے سختی سے تنبیہہ بھی کر چکی تھی۔ لیکن اس وقت اسی ناپسندیدہ شخص کو سامنے موجود پا کر اس کی جان میں جان آئی۔

"مغل صاحب۔"

وہ وہیں کھڑے کھڑے چلائی۔ مبادا وہ پان بنوا کے بھیڑ میں کہیں غائب نہ ہو جائے پر ہجوم ٹریفک کے شور میں اس کی آواز زیادہ ابھر نہ پائی۔ بسوں اور ویگنوں کا رش بھی اس قدر تھا کہ وہ فی الحال سڑک پار کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پوری طاقت کے ساتھ ایک بار پھر حلق پھاڑ کے پکارا۔

"بابر صاحب۔۔۔ مغل صاحب۔۔۔ ادھر دیکھیے۔"

اتفاق سے بابر نے بھی عین اسی وقت رخ موڑ کے سڑک کے پار سرسری سی نظر دوڑائی۔ ایک جانا پہچانا سا چہرہ نظر آنے پہ وہ ٹھٹک گیا۔ دوسری نظر میں ہی پہچان گیا کہ سادہ سے گھریلو حلیے میں یہ نگاہ ہی تھی۔ ذرا غور کرنے پہ اندازہ ہوا کہ وہ تو اسے ہی پکار رہی تھی۔ دل ہی دل میں سخت متعجب ہوتے وہ اس کی جانب بڑھا۔

"زہے نصیب۔۔۔ فرمائیے آپ اس ناچیز کو صدائیں دے رہی تھیں' واللہ ہم تو خوش فہمیوں۔۔۔"

"ایک منٹ بابر صاحب۔" نگاہ نے اس کی لن ترانی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کرا دی۔

"میں اس وقت سخت مشکل میں ہوں۔ وہ سامنے والی بلڈنگ میں رہتی ہوں۔ دراصل ادا مجھ سے ملنے آئی تھی۔ غالباً" اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ یہاں آنے کے بعد زیادہ بگڑ گئی۔ اس وقت وہ میرے فلیٹ میں تقریباً" بے ہوش پڑی ہے۔ سمجھ نہیں آرہا' کیا کروں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"یہ آپ نے کیا کہہ ڈالا۔ ادا۔۔۔ بے ہوش چلیے' ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔"

"اس وقت اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کے نکل تو آئی لیکن دل وہیں اٹکا ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں یہ بھی نہیں جانتی' یہاں کوئی معقول کلینک کس طرف ہے۔ اگر آپ ادا کی مدد کرنا ہی چاہتے ہیں تو برائے مہربانی یہاں نزدیک ہی کسی ڈاکٹر کو بلا لائیے۔ میں ادا کے پاس واپس جاتی ہوں پتہ نہیں اس کا کیا حال ہو گا۔"

"ضرور' ہم یہاں ایک بہت اچھے ڈاکٹر سے واقف ہیں۔ پانچ منٹ میں لے کے آتے ہیں مگر آپ کا فلیٹ۔"

"تیسرے فلور پہ ملاپ شادی دفتر کے بالکل سامنے" وہ تیزی سے واپس پلٹتے ہوئے بتانے لگی۔

دعا بدستور بے ہوش تھی۔ نگاہ اس کے چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ پانچ تو نہیں البتہ دس بارہ منٹ کے بعد بابر ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ اس نے تفصیلی چیک اپ کے بعد چند طاقت بخش ٹانک اور بلڈ پریشر کی ایک عام دوا لکھ دی۔

"کوئی خاص تشویش ناک بات نہیں۔ کمزوری بے حد ہے۔ غالباً" یہ کھانے پینے کی جانب زیادہ توجہ نہیں

دیتیں۔ بی پی بھی لو ہے' یہ بے ہوشی یا غنودگی اصل میں لو بلڈ پریشر کی وجہ سے ہی ہے۔ اب یہ ہوش میں آرہی ہیں' انہیں کسی نرم' زود ہضم مگر طاقت بخش غذا کھلانے کے بعد بلڈ پریشر کے دوا دے دیں اور دس روز تک باقاعدگی سے استعمال کرائیں۔ یہ ٹانک اور وٹامنز کی گولیاں البتہ یہ جب تک چاہیں لے سکتی ہیں۔ ایسی خواتین جو کھانے پینے میں حد سے زیادہ احتیاط کرتی ہیں' انہیں خوراک کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ ٹانک وغیرہ باقاعدہ استعمال کرنا چاہئیں۔"

"ڈاکٹر صاحب' اس عمر میں بلڈ پریشر کی شکایت۔۔۔ کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟" نگاہ نے تسلی چاہی۔

"یہ تو اب عام سا مسئلہ ہے بی بی۔ اس میں عمر کا کیا تعلق؟ ہاں البتہ خوراک اور ذہنی پریشانی' دونوں اس کو بڑھانے یا گھٹانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خوراک کی زیادتی یا بد پرہیزی ہائی بلڈ پریشر کا باعث بنتی ہے جبکہ کمی کمزوری کی صورت لو بلڈ پریشر میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ انہیں ذہنی تفکرات اور ڈپریشن سے دور رکھا جائے۔"

بابر ڈاکٹر کو باہر تک چھوڑ کے واپس آیا تو دعا صوفے پہ سمٹی بیٹھی چپ چاپ نگاہ کا تھمایا نیم گرم دودھ کا مگ چسکیاں لے کے پی رہی تھی۔ اس کی بے تاثر آنکھیں نیچے فرش پہ گڑی تھیں اور سامنے رکھے لکڑی کے اسٹول نما بے ڈھب میز پہ بسکٹ اور کریم رول جوں کے توں رکھے تھے۔

"کچھ تو کھا لے ساتھ' سنا نہیں ڈاکٹر نے کیا کہا؟ کچھ کھا لو تو میں دوا دوں۔" نگاہ اسے آمادہ کر رہی تھی۔ بابر نے آگے بڑھ کے پلیٹ اس کے چہرے کے سامنے کی۔ دعا نے آہستگی سے پلکیں اٹھائیں۔ بابر نے اسے ایک بار پھر پلیٹ کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کچھ لینے کا اشارہ کیا۔ اس نے خاموشی سے ایک کریم رول اٹھایا اور اسی بے تاثر انداز میں کھانے لگی۔ نگاہ نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بہت بہت شکریہ مغل صاحب'

"اس میں شکریہ کی کیا بات۔ وقت پہ اپنے ہی کام آتے ہیں۔" وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوا۔ نگاہ کو اس اپنے ہونے پہ کچھ اعتراض ہوا مگر اس نے ظاہر نہ کیا دعا کے ہاتھ میں دوا دینے کے بعد کہنے لگی۔

"مجھے شو کے لیے آدھ پون گھنٹے تک نکلنا ہو گا۔ تم چاہو تو یہیں میرے گھر میں رک کے آرام کرو۔ اس حالت میں میں تمہیں ڈرائیونگ تو ہرگز نہ کرنے دوں گی۔"

"نہیں نگاہ' مجھے جانا ہو گا۔ ابا جی فکر مند ہوں گے ویسے بھی اب میں خاصا بہتر محسوس کر رہی ہوں۔"

"بالکل نہیں۔ جانا اگر ضروری ہے تو چلو میں ٹیکسی میں چھوڑ دیتی ہوں۔"

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو ادا جی تو ہماری خدمات حاضر ہیں۔" بابر نے انکساری سے جھکتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کو آپ ہی کی گاڑی میں بحفاظت آپ کے گھر تک پہنچا آتے ہیں۔"

"ہاں میرے خیال میں یہ مناسب رہے گا۔" دعا بغیر کسی پس و پیش کے مان گئی لیکن نگاہ کو تامل تھا۔ اشد ضرورت کے تحت بابر سے مدد لینا الگ بات تھی لیکن اس حالت میں اسے اس شخص کے ساتھ اکیلے جانے دینا ایک سراسر الگ معاملہ جب کہ ڈاکٹر بتا چکا تھا کہ بلڈ پریشر کی یہ دوا سکون آور بھی ہے اور اس کو لینے کے بعد دعا گہری نیند میں جا سکتی ہے۔ اسے متذبذب دیکھ کے بابر جیسا کائیاں فوراً" بھانپ گیا۔

"غالباً" آپ کی مخلص اور ہمدرد دوست نگاہ جی ہمیں اس قابل نہیں سمجھتیں۔"

"ایسی بات نہیں بابر جی۔" سمجھ تو دعا بھی گئی تھی لیکن بابر کو برا نہ محسوس ہو' اس لیے فوراً" ازالے کی خاطر چلنے کو تیار بھی ہو گئی۔

"چلیے نگاہ جی' راستے میں آپ کو بھی اتار دیں گے۔" بابر نے اسے آفر کی تو وہ کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا کے اندر سے اپنا شو میں پہننے والا لباس اور دیگر سامان لینے چلی گئی۔

♥ ♡ ♥

”موسم کتنا بدل گیا ہے... ہے ناں موتیا؟“ گل نے سیدھے لیٹے لیٹے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

”کون سا موسم۔ دل کا؟“

”ہاں... وہ بھی۔“ گول مول سا جواب دے کے وہ خود ہی مسکرا دی۔ موتیا کو اس کی مسکراہٹ میں ایک نئی بات نظر آئی جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ انوکھی سی سرشاری' البیلی سی امنگ سے بھری یہ نوخیز مسکراہٹ اس کے حسین چہرے کو حسین ترین بنا گئی تھی۔ وہ حیران ہوکے کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے ناں؟“

انداز پوچھنے والا نہیں۔ بلکہ اپنے اندازے کی درستگی پہ داد لینے کا سا تھا۔ گل کی مسکراہٹ کچھ اور بھرپور طریقے سے واضح ہوئی اب اس کے چہرے کا اک اک نقش مسکرا رہا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ جانتی تھی' وہ عمیص کا نام نہیں لے گی... چاہتی بھی یہی تھی کہ وہ کبھی عمیص کا نام نہ لے لیکن جب اس نے واقعی عمیص کا نام نہ لیا۔ تو موتیا جیسے بجھ کے رہ گئی۔ اسے تصور میں عمیص کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ نظر آیا اور اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔

”شہزاد ملک' ہماری کمپنی کے باس۔“ گل مہر نے انکشاف کیا تھا۔

”کیا ہوا؟ تم چپ کیوں کر گئیں۔“ اسے توقع تھی کہ اس کے انکشاف کے بعد موتیا لاتعداد سوالات کی بوچھاڑ کر دے گی لیکن اس کے برعکس اس کی خاموشی اسے خاصی حد تک معنی خیز لگی۔

”کچھ نہیں' میں سوچ رہی تھی کہ ہم جیسی لڑکیاں اگر گھر میں رہیں تو عشق فرمانے کے لیے یا تو آس پاس منڈلاتے چچا زاد' ماموں زاد دستیاب ہوتے ہیں یا آس پڑوس کا کوئی معقول ہمسایہ میسر آجاتا ہے اور اگر گھر سے باہر نکلیں تو یہ باس کم بخت ہی کیوں نصیب میں ہوتے ہیں' کتنی عجیب سی بات ہے۔ بلکہ عجیب اتفاق ہے' آخر باس ہی کیوں؟“ اس کے بے تکے تجربے پہ گل مہر کا اچھا بھلا خوشگوار موڈ غارت ہو کے رہ گیا۔

”یہ تم کیا ادھر ادھر کی ہانک رہی ہو' ہم تم سے کیا کہہ رہے ہیں اور تم ہو کہ...“

”غلط تو نہیں کہہ رہی۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟ آخر ایسا ہی کیوں ہوتا ہے یار؟“

”ظاہر ہے انسان محبت اس سے کرتا ہے جس کی کوئی نہ کوئی بات' عادت یا خاصیت اسے اپیل کرے اور اس کشش کے پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسے جانتے ہوں' پہچانتے ہوں... اور جانا پہچانا اسے جاتا ہے جو آپ کا شناسا ہو' آپ کے نزدیک ہو۔ اب کسی دوسرے سیارے کی مخلوق کے عشق میں تو ہم مبتلا ہونے سے رہے۔“

”اصل بات یہ ہے کہ یہ مجھے کچھ ہضم نہیں ہو رہا کہ آنسہ گل مہر خانم' خاص الخاص ہونے کا دعویٰ کرنے والی میری ہمشیرہ... کتنے عام پائے جانے والے عشق میں مبتلا ہوئیں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ گھر سے صرف اور صرف اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے اور اپنی شناخت حاصل کرنے کے عزم کا اظہار کر کے جاب کے لیے نکلنے والی اسی فیصد لڑکیوں کی طرح تم بھی ”باس“ نما عاشق کے سہارے آسان ترین...“

”جسٹ اسٹاپ اٹ موتیا۔“ گل نے اس کا تلخ سچ مکمل تک نہ ہونے دیا۔

”اس نے ہمیں پرپوز کیا ہے' باقاعدہ اور عزت دار طریقے سے نہ تو ہم اتنے گرے پڑے ہیں کہ ہر ایرا غیرا ہمیں تر نوالہ سمجھ کے نگلنے کی کوشش کرے نہ ہی اتنے ترسے ہوئے ہیں کہ ذرا کسی معقول اور متمول شخص نے لفٹ کرائی تو پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں جا گریں۔“ اس کا غضب ناک ردعمل دیکھ کے موتیا ذرا سنبھل گئی۔

”کمال ہے' تم تو سیریس ہو گئیں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔“

”تم جانتی ہو کہ ہمیں ایسے مذاق پسند نہیں۔“ وہ روٹھ کے کروٹ بدل گئی۔

”اف کس قدر بے موقع ناراض کر دیا اسے۔ ابھی تو بہت کچھ اگلوانا تھا۔ بہت کچھ معلوم کرانا تھا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے اسے منانے کا کڑا مرحلہ سر کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کیا میں تمہارے بارے میں... یعنی اپنی سگی بہن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی مجھے خود سے زیادہ تم پہ اعتماد ہے میں جانتی ہوں کہ تم ایسی ویسی نہیں... یہ تو بس زبان کم بخت... کیا کروں پھسل جاتی ہے۔“

”سب اس دلگیر اور عمیص کی صحبت کا اثر ہے۔“ گل نے جل کے کہا۔

”اچھا سوری ناں' اب سنو تو...“ وہ اسے کبھی جھنجھوڑنے' کبھی گدگدانے کے بعد بالآخر کروٹ بدلنے پہ مجبور کر ہی گئی۔

”کیا ہے؟“ اب نخرے کرنے کی باری گل کی تھی۔

”کچھ بتاؤ تو سہی' موصوف کیسے ہیں' تمہیں آخر ان میں پسند کیا آیا؟“

”ایمان داری سے بتائیں تو ان کے پرپوز کرنے سے ایک لمحہ قبل تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم انہیں پسند کرتے ہیں... یعنی کم از کم اس لحاظ سے تو ایسا ہم نے اس وقت تک ہرگز نہیں سوچا تھا۔ ان کا اظہار پسندیدگی اور پرپوز کرنا ہمارے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ اس حیرت سے نکلنے کے بعد جو پہلا احساس ہمیں ہوا وہ یہ کہ یہ حیرت خوشگوار بھی تھی اور قابل قبول بھی... کیا اسے پسندیدگی کی جانب پہلا قدم نہیں کہا جا سکتا۔“ وہ بتاتے بتاتے سوال کر بیٹھی۔ موتیا نے سر ہلایا۔

”ہاں' کسی حد تک' نیم رضامندی یا آمادگی بھی پسندیدگی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے ورنہ تم سے کیا بعید... کہ ان حضرت کے پروپوزل کے جواب میں تم سر پھاڑ کے آجاتیں۔“

”ہم پاگل نہیں ہیں کہ جو ہر کسی کا سر پھاڑتے پھریں۔“

”یعنی یہ سعادت چند خاص لوگوں کے لیے وقف ہے۔“

”اب کوئی حرکت ہی سر پھاڑنے والی کرے گا تو یہی ہو گا۔ شہزاد بہت مہذب اور بااخلاق انسان ہیں۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی مرد اس حد تک محتاط انداز اپناتے ہوئے کسی سے اپنے دل کی بات کر سکتا ہے۔ کہ دوسرا فریق ناپسندیدگی... کے باوجود نہ تو برہم ہو نہ ہی ناگواری محسوس کرے۔ یقین کرو موتیا' وہ اتنے نفیس انسان ہیں۔ انہیں خواتین سے بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔“

”خوا... تین سے؟“ وہ زور دے کے بولی۔

”ہمارا مطلب ہے کہ وہ اوچھے لوگوں کی طرح خواتین کو دیکھ کے پھسل نہیں جاتے نہ ہی اور رہو کے حد سے زیادہ خوش اخلاق یا عاشق مزاج بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ جس پروفیشن میں وہ ہیں' بلاناغہ ایک سے ایک آفت سے پالا پڑتا ہے۔ ہم نے کبھی انہیں ایسی خواتین سے بھی فری ہوتے نہیں دیکھا جو بن ٹھن کے اصل میں اسی مقصد کے لیے گھر سے نکلتی ہیں' ان کے لیے یہ بے وقعتی اور وقت گزاری ایک معمول کی چیز ہوتی ہے لیکن شہزاد سران کو بھی وہی عزت و تکریم دیتے ہیں جو اپنے آفس کی ورکرز اور دیگر لیڈیز کو دیتے ہیں۔ ہمیں ان کا یہی انداز پسند ہے۔ اس کے علاوہ وہ بے حد پریکٹیکل مائنڈ ہیں اور سیلف میڈ بھی۔ آج وہ جس مقام پہ ہیں صرف اور صرف اپنی مسلسل اور ان تھک محنت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پہ۔“

موتیا نے منہ کھول کے جمائی لی۔

”تم نے تو پورا شہزاد نامہ شروع کر دیا۔ یعنی قصہ مختصر' تمہیں دیگر لڑکیوں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عام لڑکیوں کی بہ نسبت اس کی ظاہری شخصیت نے اٹریکٹ نہیں کیا۔ ویسے آپس کی بات ہے' ظاہری شخصیت میں اٹریکٹ کرنے لائق کچھ ہے بھی... یا بس گزارا۔“

”ہوں... ویسے ہم نے کبھی غور نہیں کیا لیکن ہمارا خیال ہے وہ خاصے ڈیشنگ بھی ہیں۔“

"اوہو۔۔۔ تمہارا خیال۔۔۔؟" موتیا نے صاف مذاق اڑایا۔

"زیادہ دانامت کرو گل۔۔۔ انفرادیت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے بس۔۔۔"

"تمہاری مرضی، یقین کرو یا نہ کرو۔" اس نے لاپروائی جھاڑی اور ایک بار پھر کروٹ بدل لی۔ نائٹ بلب کی مدھم نیلگوں روشنی میں دونوں ہی رخ بدلے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ دونوں ہی اس شخص کے بارے میں سوچ رہی تھیں جن سے وہ محبت کرتی تھیں۔۔۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان میں سے ایک اس شخص کو اپنے حوالے سے سوچ رہی تھی جبکہ دوسری کسی اور کے لیے۔

"سنو گل۔" چند منٹ کی بھاری خاموشی کے بعد موتیا نے اس سکوت کو توڑا۔

"تم نے **عمیص** کے بارے میں کیا سوچا؟" وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کا یہ سوال بے موقع بھی ہے اور بے جواز بھی لیکن وہ خود کو اس سوال سے روک نہ پائی اوپر اوپر سے اس کی پسند کے بارے میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے درحقیقت وہ اندر سے تب ہی سے **عمیص** کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"ہم اس کے بارے میں کیوں سوچنے لگے؟ اور یہاں **عمیص** کا کیا ذکر؟" وہ اچھل کے بیٹھ ہی تو گئی۔

"دیکھو موتیا، تمہارے کچھ اور کہنے سے پہلے ہی ہم واضح کر دیں کہ ہمارے اس فیصلے سے **عمیص** پہ کیا اثر پڑتا ہے، ہم اس کے قطعی ذمہ دار نہیں۔ جس شخص کے بارے میں ہماری اموشنل انوالومنٹ نہ ہونے کے برابر بھی نہیں، صرف اس کو ہرٹ نہ کرنے کے لیے ہم اپنی پسند اور خواہش کا گلا تو نہیں گھونٹ سکتے۔"

"مجھے تمہارے بارے میں ایسی کوئی غلط فہمی ہے بھی نہیں۔ جن لوگوں سے تمہاری اچھی خاصی اموشنل انوالومنٹ ہے، تم تو کبھی ان کی خاطر بھی اپنی خواہش سے دستبردار نہیں ہو سکیں، **عمیص** تو بہت دور کی بات ہے۔ بس یونہی ایک خیال سا آیا تھا کہ جب اسے پتہ چلے گا تو۔۔۔ بہرحال وہ ایک عرصے سے تمہیں چاہتا آ رہا ہے۔"

"یکطرفہ چاہتوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے عزیز ہمشیرہ اور ہم نے تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی اس بات کی تم بھی گواہ ہو۔"

"اس کے حوصلوں کو کسی قسم کی "افزائی" کی ضرورت کبھی نہیں رہی اور کسی معاملے میں نہ سہی لیکن تمہارے لیے وہ ہمیشہ پر عزم اور پر امید ہی رہا ہے۔ یقین کرو۔۔۔ وہ وہ واقعی بری طرح ٹوٹ جائے گا۔" موتیا کا لہجہ بھیگ سا گیا۔

"ایسے لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے جو حقیقت کو سامنے پا کے بھی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ہم نے ہر طرح سے ہمیشہ اسے یہ باور کرایا کہ وہ ہمارے لیے ایک چچا زاد سے بڑھ کے اور کچھ نہیں، حتیٰ کہ دوست بھی نہیں کہ دوستی کرنے کے لیے بھی دونوں فریقین میں ذہنی ہم آہنگی کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے جو ہم دونوں میں کبھی نہیں رہی۔ مگر وہ اس حقیقت سے نظریں چراتا رہا۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تم خود سوچو، ہماری بہن۔۔۔ یا **عمیص** کی دوست بن کے نہیں، صرف ایک لڑکی بن کے سوچو کہ ایک شخص جس سے محبت کرنے کے لیے آپ دل کو بالکل بے بس پاتے ہیں۔۔۔ چاہ کے بھی اسے چاہ نہیں سکتے، محض ہمدردی یا خدا ترسی کے نام پہ تو نہیں اپنا سکتے۔ منافقت اور وہ بھی زندگی کے اس نازک موڑ پہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" وہ اتنا کہہ کے رہ گئی لیکن سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

"ہاں گل کی بات بھی ٹھیک ہے۔ آپ دل کو کسی سے محبت کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے بالکل اسی طرح جیسے دل کو کسی سے محبت نہ کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ بھلا محبت سے بڑھ کے بھی منہ زور اور بے لگام جذبہ کوئی اور ہے؟"

♥ ♡ ♥

اللہ وسایا اس مختصر سی سنگل پورشن کوٹھی کے چند گز چوڑے برائے نام لان میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا جو حال ہی میں دعا نے کرائے پہ لی تھی۔ لوہے کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور دھوپ سینکنے کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کینو کھانے اور باہر سڑک کی چہل پہل دیکھنے میں بھی مصروف تھا۔ جبھی اس نے دعا کو بابر کے ساتھ آتے دیکھا اور

کینو کی پھانک منہ میں رکھ کے وہ اسے چوسنا تک بھول گیا۔ بابر اس کی بیٹی کے ہمراہ اس کی گاڑی میں۔۔۔ اور وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پہ۔۔۔ یہ اس کے لیے خاصا حیرت انگیز امر تھا۔ بابر سے اس کی واقفیت بھی بس یونہی سی تھی وہ اسے ملک مقبول کے خاص بندے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ پہلے پہل وہ اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ اور ٹیپ ٹاپ سے مرعوب ہو کے اسے واقعی کوئی رئیس ابن رئیس سمجھ بیٹھا تھا مگر اڑتی اڑتی سنی تھی کہ نواب ابن نواب تو وہ بے شک ہے مگر اب خالی خولی زبانی کلامی نوابی باقی رہ گئی ہے۔ ایسے میں اسے دعا کے اتنے قریب دیکھنا کوئی خاص خوش کن امر نہیں تھا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ دعا کے گاڑی سے اترتے ہی وہ اس سے بابر کے سامنے ہی، بلا لحاظ و مروت باز پرس کرنا چاہتا تھا کہ اس کی اتری اتری سی صورت اور پھیکی پڑتی رنگت دیکھ کے پریشان ہو اٹھا۔

"کیا ہوا ادا پتر؟ تو بھلی چنگی گھر سے نکلی تھی، کیا ہوا جو رنگ پیلا پھٹک ہو رہا ہے؟" وہ سوال اس سے کر رہا تھا مگر مشکوک نظروں سے بابر کو دیکھے جا رہا تھا۔

"چوہدری صاحب، فکر مت کیجیے، ادا صاحبہ اب بالکل خیریت سے ہیں۔"

بابر کی زبانی "چوہدری" اور "صاحب" کے خطاب سن کر اس کے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑے۔ نظروں سے جھلکتی ناگواری اور رویے سے ظاہر ہوتا اجتناب خود بخود غائب ہو گیا۔

"لیکن اسے ہوا کیا تھا، گھر سے تو یہ سہیلی سے ملنے نکلی تھی۔"

"جی ہاں یہ اپنی اسی دوست نگاہ کے ہاں سے ہی آ رہی ہیں۔ وہاں ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ نگاہ جی ڈاکٹر کو لینے نکلیں تو اتفاقاً ہم سے ملاقات ہو گئی۔ ڈاکٹر بھی ہمارا جاننے والا تھا، فکر والی کوئی بات نہیں۔ کمزوری اور تھکن غالب آ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے دوا دے دی ہے۔ دوا میں چونکہ نیند لازماً آنا تھی، اسی لیے ہم نے مناسب نہ سمجھا کہ اس حالت میں ادا جی خود ڈرائیونگ کر کے گھر تک آئیں۔ سو ہم چھوڑنے چلے آئے۔" اس نے تفصیلاً بتا کر اللہ وسایا کی تسلی کرائی۔

"ہمیں اب اجازت دیجیے ادا جی۔ امید ہے اب آپ ڈاکٹر کی ہدایات پہ پورا عمل کرتے ہوئے اپنا خاص خیال رکھیں گی۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے، آپ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں اور یونہی چلے جائیں گے۔ پلیز اندر آئیے ناں۔۔۔ چائے کا وقت بھی ہو رہا ہے اور طلب بھی۔"

"ہمیں بہت خوشی ہوتی آپ کے ساتھ چائے پینے میں لیکن اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ہم مخل نہیں ہونا چاہتے۔ پھر کسی روز انشاءاللہ آئیں گے تو آپ ہی کے ہاتھ کی چائے پئیں گے۔"

اللہ وسایا اس دوران خاموشی سے کھڑا بیٹی کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔ اس پروفیشن سے وابستہ ہونے کے بعد اس نے دعا میں واضح تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ بہت زیادہ گھلنے ملنے والی طبیعت تو اس کی کبھی بھی نہ رہی تھی لیکن اب جیسے بالکل ہی آدم بیزار ہو گئی تھی۔ ضرورتاً بھی کسی سے از خود مخاطب ہونے سے گریز کرتی خصوصاً اس فیلڈ سے وابستہ لوگ۔۔۔ جن سے اس کا دن رات کا واسطہ تھا ان سے تو بالکل بھی روابط رکھنے پہ تیار نہ تھی۔ ایک نگاہ تھی جس سے پہلے دن سے اس کی دوستی ہو گئی تھی اور اللہ وسایا کو اس دوستی پہ اعتراض نہ تھا۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ نگاہ کا مشکور تھا جس نے اس کی سیدھی سادی بیٹی کو فن اور چمک دمک کی دنیا میں رہنے کا سلیقہ سکھایا تھا۔ اس سے دوستی کی بدولت وہ اب چار لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ اور اعتماد سیکھ گئی تھی اوڑھنے پہننے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔

اور اب یہ دوسرا فرد تھا۔ بابر ہمایوں مغل۔۔۔ جس سے گفتگو کرتے ہوئے وہ دعا کے چہرے پہ ناگواری نہ پا رہا تھا حالانکہ وہ بھی ملک مقبول کا خاص آدمی تھا، ایک تماش بین بھی تھا اور جانا مانا حسن پرست و بھنورا صفت۔ اس کے باوجود اگر وہ اس سے اتنے دوستانہ انداز میں بات کر رہی ہے تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ کھٹک اللہ وسایا کو لگ گئی۔

♥ ♡ ♥

"بیٹھ پتر' آج تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"
کرم الٰہی نے شہزاد کو اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ بلقیس بھی وہیں موجود تھی اور اس کے چہرے پہ بھی وہی گمبھیر خاموشی تھی۔

"خیریت؟"

"ہاں' ہاں ست خیراں نیں۔ بس تو بیٹھ تو سہی۔"

"بیٹھ جاتا ہوں لیکن ابا' اگر بات وہی کل والی دہرانی ہے تو کوئی فائدہ نہیں۔ میں اللہ وسایا اور اس کی بیٹی کے بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

"چل ٹھیک ہے' اس نامراد اللہ وسایا کا نام بھی میں نہیں لیتا' نہ ہی اس کی بیٹی کی بات کرتا ہوں میں تو بات کرتا ہوں اپنی بہشتن بہن کی آخری نشانی کی۔ اپنے خون کی' اپنی بھانجی دعا کی۔"

"بات تو ایک ہی ہے ابا۔" وہ زچ ہونے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کے کہنے لگا۔

"دیکھ پتر' میں سمجھتا ہوں تیرے جذبات' ٹھیک ہے پہلے پہل تیری باتیں کڑوی لگتی تھیں۔ تو جب اس خاندانی کسب کو منہ بھر کے گالیاں دیتا تھا تو میرے کلیجے میں آگ لگ جاتی تھی لیکن اب ٹھنڈے دماغ سے سوچنے بیٹھوں تو خیال آتا ہے' تیرا قصور نہیں جو دنیا نے تیرے دماغ میں ڈالا' تو نے ویسا ہی سوچنا تھا۔ حلال کسب تو کوئی بھی برا نہیں' بس زمانے نے ہر کام کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ کوئی کام عزت والا تو کوئی بے عزتی والا۔ حالانکہ عزت دینے والی بھی اللہ سوہنے کی ذات ہے اور لینے والا بھی وہی ہے۔ لوگ کون ہوتے ہیں یہ فیصلہ کرنے والے کہ کون کمی ہے اور کون شاہ۔ لیکن خیر۔ رہنا تو انہی لوگوں کے ساتھ ہے' گزر تو اسی زمانے کے ساتھ کرنی ہے۔ اگر تو بھی زمانے کی نظروں سے ہی مجھے میرے خاندان کو دیکھتا ہے تو اپنی جگہ تو بھی ٹھیک ہے۔ مجھے کیا حق ہے تیری محنت سے کمائی شہرت اور نیک نامی کو داغ دار کرنے کا۔

دعا سے تیری جو چڑ ہے وہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ تجھے اس کے گانے پہ اعتراض ہے۔ محفل سجانے پہ غصہ ہے لیکن وہ مسکین کیا کرے۔ باپ کے چنگل میں پھنسی ہے۔ ہم بھلے اس کے سچے خیر خواہ ہوں پر باپ سے بڑھ کے سگے تو نہیں۔ پیار جتا سکتے ہیں' حق نہیں وہ مجبور تھی باپ کی بات ماننے پہ اس غلطی کی سزا اسے اس طرح تو نہیں دے سکتے کہ بالکل ہی تعلق توڑ کے باپ کے رحم و کرم پہ ڈال دیں۔"

"ٹھیک ہے ابا۔ آپ چاہیں تو اس سے مل سکتے ہیں۔ وہ آسکتی ہے یہاں لیکن میری غیر موجودگی میں' میں نہیں چاہتا کہ اس کا میرا سامنا ہو' پھر سے کوئی بدمزگی ہو اور آپ کا دل برا ہو اور ہاں دعا سے آپ کا لگاؤ اور محبت فطری ہے۔ لیکن اللہ وسایا سے اب مزید کوئی تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس شخص کو برداشت نہیں کرسکتا۔ صرف اس حد تک سمجھوتے پہ تیار ہوں کہ دعا سے آپ لوگ۔۔۔"

"بات صرف ملنے ملانے کی نہیں شہزادے۔" اب تک خاموش بیٹھی بالو نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"میں نے اور تیرے ابا نے کل رات مل کے ٹھنڈے دماغ سے غور کیا تو تیری بات سچی لگی۔ آج کل کے زمانے میں تو کیا' کسی بھی زمانے میں بھی گانے والی عورت کو اچھا نہیں سمجھا گیا۔ ہمیشہ اسے بازاری ہی کہا گیا چاہے وہ شوقیہ گاتی ہو یا پھر اپنے ٹبر کو پالنے کے لیے گانے کی مزدوری کرتی ہو۔ وسائے کی آنکھوں پہ دولت کی پٹی بندھی ہے اور دوئی بڑی معصوم بچی ہے ہم نے سوچا ہے کہ اسے وسائے سے الگ کردیں تو وہ اسے گانے پہ مجبور نہیں کرسکے گا۔ جب اس کا بھی یہ حق ہی نہیں رہے گا تو مجبور کیا کرے گا۔"

"لیکن باپ کا حق آپ لوگ کیسے ختم کرسکتے ہیں؟"

"بیٹی جب تک پیو کے گھر ہو' تب تک ہی پیو کا حق ہوتا ہے۔ ویاہی جائے تو خاوند کا حق بن جاتا ہے۔ اگر اس کی شادی۔۔۔"

"یہ نیک مشورہ تو میں بہت پہلے دے چکا ہوں۔ اس گند میں قدم رکھنے سے پہلے ایک سے ایک شریف عزت

دار گھرانے میں اسے رخصت کرسکتا تھا۔ وہ لوگ نہ اس کے باپ کا پیشہ دیکھتے نہ ٹوٹا کوارٹر' صرف میرے نام پہ اسے بیاہ لے جاتے۔ لیکن اب۔۔۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ کوشش اب بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وسایا سونے کے انڈے دینے والی مرغی ذبح کرنے پہ تیار ہوگا؟ پہلے شاید مان جاتا لیکن اب بیٹی کی کمائی کی لت پڑ گئی ہے۔ اب مشکل ہی ہے جو وہ اس کا گھر بسانے کے بارے میں سوچے۔"

"میں بات ہی ایسی کروں گا کہ وہ انکار نہ کرسکے گا۔" کرم الٰہی کے پر ثوق انداز پہ شہزاد ٹھٹکا۔

"دراصل۔۔۔" بلقیس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شوہر کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود تمہید باندھی۔

"دراصل شہزادے' میرا اور تیرے پیو کا خیال ہے کہ دعا ہماری اپنی ہے' ہم سے زیادہ کون اس کا اچھا سوچ سکتا ہے۔ وہ اپنوں کے بیچ ہی رہے تو اچھا ہوگا۔ اگر ہم کسی اور کی بجائے وسائے سے تیری بات کریں تو وہ انکار کرنے کی ہمت نہ کرسکے گا۔"

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" اس نے بھنویں سکیڑ کے پوچھا۔ جو مطلب وہ بھانپ رہا تھا' دل اسے ماننے سے انکاری تھا۔ اسے یقین نہ تھا کہ اس کی واضح ناپسندیدگی کے باوجود اس کے ماں باپ ایسا مطالبہ پیش کرسکتے ہیں۔

"مطلب یہ کہ ہم دعا کا ہاتھ تیرے لیے مانگنا چاہتے ہیں۔ تجھ سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔" پتہ نہیں بالو کی تمہید کتنا طول کھینچتی۔ اس لیے کرم الٰہی نے بے تابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف صاف بات کی۔ بالو نے سہم کے شہزاد کا ردعمل جانچنا چاہا۔ اس کا چہرہ ایک دم سپاٹ تھا۔ لب سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ چند لمحے تک اس کی جانب سے کسی جواب یا اعتراض کا انتظار کرنے کے بعد اس کی ہمت بندھی اور اس نے آگے بات بڑھائی۔

"تیرا اعتراض بھی دور ہو جائے گا' دوئی کو تحفظ بھی مل جائے گا۔ گھر کی عزت گھر میں رہے گی۔ وہ بڑی بھلی مانس بچی ہے' اسے کہاں شوق ہے ان سب باتوں کا۔ کوئی شوق کے ہاتھوں تو نہیں گاتی پھرتی' مجبور ہے۔ جب یہ مجبوری نہ رہے گی تو دیکھنا' کیسے برکت سے تیرا گھر بسائے گی۔"

"گھر۔۔۔ گھر بسائے گی؟۔۔۔ وہ گھر بسائے گی۔" اس سے زیادہ تحمل کا مظاہرہ کرنا شہزاد کے بس سے باہر تھا۔ اس کے باوجود اس نے بھرپور کوشش کی کہ اس کے اندر کا ابال لہجے کی تپش سے زیادہ ظاہر نہ ہو۔ اس کی آواز دھیمی تھی الفاظ بھی خاص قابل اعتراض نہ تھے مگر لہجہ پھنکاریں مارتا ہوا تھا۔

"جسے محفلیں سجانے کی لت پڑ جائے' وہ گھر نہیں بسایا کرتیں اور اگر آپ دونوں کو ایسی خوش فہمیاں ہیں بھی تو کیا تجربات کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایک میں ہی ملا تھا؟ آپ کا اکلوتا بیٹا۔۔۔ کیا میرے ہی مقدر پھوڑنا تھے؟"

"ہائے ہائے' مقدر سنوارنے کی بات کر رہی ہوں میں تو۔۔۔ پتہ نہیں تو ہر وقت بغیر سوچے سمجھے ایسی بدشگونی کی باتیں کیوں کرتا رہتا ہے؟"

"آخر دعا میں برائی کیا ہے؟"

"میں نے کہا ناں کہ میرا منہ مت کھلوائیں۔ اگر میں کچھ کہہ بیٹھا تو آپ لوگوں سے برداشت نہیں ہوگا۔" وہ سختی سے کہتا اٹھ کھڑا جانے لگا کہ کرم الٰہی نے روک دیا۔

"ایک منٹ شہزادے' آج ہی بات صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ دعا کو اس گھر کی بہو بنانے کا فیصلہ میرا اور تیری ماں کا ہے اور جب ہم تجھے پیدا کرسکتے ہیں' پال پوس کے اتنا بڑا کرسکتے ہیں تو کیا تیری زندگی کے بارے میں فیصلہ نہیں کرسکتے؟ ٹھیک ہے تجھے دعا کے فنکارہ بننے پہ اعتراض تھا۔ میں سمجھتا رہا' یہ بھی تیری اس سے اپنائیت تھی۔ تو اسے اپنا جانتا تھا۔ اس لیے اس کے بارے میں فکر مند تھا' اس کے بھلے کے لیے سوچتا تھا۔ تیری اس سے خفگی بھی اس لیے تھی کہ تو اسے۔۔۔ دیکھ شہزادے' اگر تو واقعی اس کا بھلا کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کو سہارا دے دے' اپنا نام دے دے۔"

"بھلا تو میں بہت سے لوگوں کا کرنا چاہتا ہوں ابا' لیکن اس کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں' زکوٰۃ' خیرات' صدقہ وغیرہ وغیرہ۔ کسی کا بھلا کرتے کرتے خود اپنا بیڑہ غرق کرلینا کہاں کی سخاوت ہے۔ میں اس کی شادی کرنے پہ تو

تیار ہوں' اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا' جہیز اور دیگر انتظامات کا بھی ذمہ لیتا ہوں لیکن اس سے شادی کرنے پہ ہرگز' ہرگز تیار نہیں۔ اب خدا کا واسطہ ہے' اماں کی طرح آپ بھی یہ سوال نہ کرنے بیٹھ جانا کہ دعا میں برائی کیا ہے۔ کیونکہ اب دوبارہ اس سوال کا جواب دینے سے میں خود کو روک نہ پاؤں گا اور یہ بات تو یقینی ہے کہ میرا جواب آپ کو پسند نہیں آئے گا۔"

"تو کچھ نہ بھی بول تو میں جانتا ہوں تیرا جواب کیا ہو گا۔" کرم الٰہی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن بیٹا! اپنے ہی اپنوں کے عیب ڈھکتے ہیں' ان کی چادر بنتے ہیں۔"

"ضرور کرتے ہوں گے۔ وہ بہت اعلیٰ ظرف انسان ہوں گے لیکن مجھے آپ کم ظرف سمجھ لیجئے۔ میرا اتنا حوصلہ نہیں کہ ساری عمر جس چیز سے پیچھا چھڑاتے گزر گئی' اب اسے ہی گلے کا طوق بنا لوں۔ آپ کو یہ بات کرنے سے پہلے خود سوچنا چاہیے کہ اسے ماننا تو ایک طرف' سننا بھی میری برداشت کا کتنا بڑا امتحان ہو گا۔ کتنی کڑی مشقت جھیلی ہے میں نے خود سے یہ لیبل اتارنے کی غرض سے... کتنی سخت اور طویل جدوجہد کے بعد اپنا نام بنا پایا ہوں۔ چار لوگوں میں عزت حاصل کرنے کے قابل بنایا ہے میں نے خود کو بھی اور آپ دونوں کو بھی۔ میں نے صدق دل سے آپ کو عزت والی زندگی دینے کی کوشش کی اور آپ' آپ بدلے میں مجھے ذلت' بخشنا چاہتے ہیں۔ پھر سے مجھے گندگی کی دلدل میں گھسیٹنا چاہتے ہیں' جس سے میں نے مر مر کے نجات حاصل کی ہے۔"

"ذلت؟... گندگی...؟ تو کیوں بار بار میرا کلیجہ جلاتا ہے شہزادے۔" کرم الٰہی کراہ اٹھا۔

"تھک گیا ہوں میں تیرے یہ طعنے سن سن کے اوئے بے بدا یتا' یہ ہے وہ عزت والی زندگی' جس کا احسان تو جتا رہا ہے؟ یہ ہے میری عزت' کہ میرا اپنا بیٹا مجھے میری ہی چھت کے نیچے ذلیل کر رہا ہے۔ اوئے اس سے تو میں بے عزت ہی اچھا تھا۔ اوئے اس سے تو تو بے نام ہی اچھا تھا۔ کیا فائدہ اس جھوٹے نام اور شہرت کا' جب اندر سے تو اپنے آپ سے ہی مطمئن نہ ہو' پہلے خود اپنی عزت کرنا اور اپنے ماں باپ کا احترام کرنا سیکھ'

"میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔" اس نے زور دے کے کہا۔

"ہاں لیکن یہ سچ ہے کہ میں اپنے آپ سے مطمئن نہیں اور اس کے ذمہ دار کسی حد تک آپ ہیں' میں مانتا ہوں' اس میں قصور نہ آپ کا ہے نہ میرا۔ یہ تو تقدیر کی بات ہے۔ مجھے اس خاندان میں پیدا ہونا تھا ہو گیا۔ لیکن اگر میں تقدیر سے لڑ کے صرف اور صرف اپنی ہمت اور عزم کے بل بوتے پہ اپنی ایک الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہو گیا تو آپ جان بوجھ کے میری محنت اکارت کرنے کے در پے کیوں ہیں۔"

"کر لے بیٹا' کر لے جتنی شکایتیں کرنی ہیں۔" کرم الٰہی جیسے ٹوٹ کے رہ گیا۔

"نہیں مجھے اور کچھ نہیں کہنا صاف اور دو ٹوک بات کہہ رہا ہوں۔ نہ دعا اور نہ اس خاندان کی کوئی اور لڑکی... بلکہ کوئی بھی ایسی لڑکی نہیں جو نہ صرف خود اس شعبے سے ہو بلکہ اس کے خاندان کا دور دور تک کوئی بھی فرد اس پیشے سے وابستہ ہو تو میری زندگی میں اس کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ میں شادی ضرور کروں گا مگر کسی ایسی لڑکی سے' جو میری زندگی میں شامل ہو کے میری عزت بڑھانے کا باعث بنے نہ کہ کم کرنے کا۔ کسی ایسے خاندان سے رشتہ جوڑوں گا جو میرے نام کو اور اونچا کرے' میرے سر کو فخر سے بلند کرے۔"

"دوسروں کے سہارے اپنا قد اونچا کرنے میں اگر تو اپنی عزت جانتا ہے تو ٹھیک ہے یہی سہی۔"

"ارے کیا ٹھیک ہے؟" بالو تڑپ اٹھی۔

"رشتے اپنوں میں ہی جچتے ہیں۔ عیب بھی چھپ جاتے ہیں اور کوئی کسی کا کانا بھی نہیں رہتا۔ یہ جو اتنے اونچے اونچے خواب دیکھ رہا ہے' اس سے پوچھ تو سہی کہ تو دعا کا سگا ہو کے اسے اپنانے پہ تیار نہیں تو کوئی اونچے خاندان والا اپنی بیٹی اس گھر میں کیوں دے گا' اس خاندان میں کیوں بھیجے گا' جس خاندان کو اس کا اپنا بیٹا گالی دیتا ہے۔"

"ایسا ضرور ہو گا اماں' ہو کے رہے گا بلکہ... میں نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔" اس نے ایک دم بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"او ہو... تے ایہہ گل اے۔" بالو نے ہاتھ نچا کے کہا۔

"کون ہے وہ شریف زادی' نواب زادی؟"

"بالکل صحیح پہچانا' وہ واقعی نواب زادی ہے۔ آپ کے بیٹے کے ہاتھ گوہر نایاب لگا ہے' ایک شہزادی اس گھر کی بہو بننے والی ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ یہ تصور ہی اس کی طبیعت پہ چھایا تکدر اور بیزاری دور کر گیا تھا۔

● ● ●

"آپ نے بتایا نہیں صاحبزادی الماس خاتون' کب بات کریں گی آپ اپنی ہمشیرہ سے۔"

اسے گم صم دیکھ کے صاحبزادی حرمت النساء نے اپنا سوال دہرایا وہ جیسے چونک سی گئی۔

"جی امی حضور میں... میں بات کروں؟"

"جی' یہ آپ کے ابا حضور کی تجویز ہے۔ ویسے تو ہم اس کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے لیکن غالباً "نواب صاحب" اپنی صاحبزادی کے مزاج سے خائف ہو کے احتیاطاً" انہیں پہلے سے آگاہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ وہ ذہنی طور پہ تیار رہیں یوں بھی انہوں نے ملازمت کرتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ وقتی طور پہ یہ شغل جاری رکھیں گی اور بعد میں..."

"معاف کیجئے گا امی حضور' میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں لیکن کیا گل مہر کو صرف مطلع کرنا مقصود ہے یا پھر اس کی رائے یا مرضی جاننا بھی ضروری ہے؟"

"ان کی رائے یا مرضی کا اس معاملے سے کیا تعلق۔" اپنی والدہ کی سادگی یا خوش فہمی پہ موتیا سر ہلا کے رہ گئی۔

"آپ بھول رہی ہیں کہ اس عادت کو پروان چڑھے عمر بیت چکی ہے۔ اب اس کے ہر معاملے میں صرف اور صرف اس کی رائے یا مرضی کا ہی تعلق ہے۔" اس نے باور کرانا چاہا جسے وہ قطعی خاطر میں نہ لائیں۔

"وہ اور معاملات ہوں گے' صاحبزادی گل مہر کی تعلیم وغیرہ سے متعلقہ جن کے اثرات صرف ان کی ذات تک محدود رہتے ہوں گے لیکن یہ معاملہ یعنی شادی کا معاملہ ہمارے پورے خاندان کا معاملہ ہے' ہمارے اس مختصر مگر متحدہ خاندان کا متفقہ فیصلہ' اسے ہم گل مہر کی ذاتی پسند ناپسند کی بنا پر غیر مستحکم نہیں قرار دے سکتے یوں بھی صاحبزادی گل کو بھلا کیا اعتراض ہو گا' **عمیص** میاں ان کے جانے پہچانے ہیں' ایک چھت تلے رہتے آئے ہیں اور **عمیص** میاں تو گل کے مزاج شناسا بھی ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے' ان بی بی کو بھی **عمیص** کے مزاج سے شناسائی کا دعویٰ ہے اور یہ شناسائی ایسی خاص خوشگوار بھی نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔ صاحبزادی حرمت النساء اسے تو حکم صادر فرما کے اندر چلی گئیں' وہ کڑھائی والا فریم پرے پھینک کے خود سرہانوں پہ گرا کے بیٹھ گئی۔

"خالہ حضور' یہ سمری تو کروا دیجئے۔" دلکش نے انگلش کی کتاب کھول کے اس کے سامنے کی نہ چاہتے ہوئے بھی موتیا نے کتاب تھام تو لی مگر تفکرات میں گھرے ذہن نے الفاظ اور حروف کو آنکھوں کے آگے نچا ڈالا۔

"دل' بچے ابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں' شام کو کروا دوں گی۔" وہ بے چارگی سے فریم کے برابر ہی کتاب بھی پٹخ بیٹھی۔

"یوں کہو' دوپہر کو بیٹھ کے پرانی کتابوں سے انگلش کی ڈکشنری اور خلاصے ڈھونڈ کے پہلے دماغ کو تراوٹ پہنچاؤں گی اس کے بعد تمہیں پڑھا سکوں گی ہاں بھئی کتابوں سے... ہیلو کیے بھی تو عرصہ بیت گیا۔"

عمیص کی دخل اندازی پہ موتیا کی کوفت اور بڑھ گئی۔ اس وقت وہ عموماً" اپنے اسٹور پہ ہوتا تھا اور وہ اس کی آمد کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ امی حضور نے اسے جو کام سونپا تھا' اس سے نمٹنے کے لیے کوئی کارآمد بہانہ ڈھونڈنے کے لیے اسے مکمل یکسوئی درکار تھی۔ کام بھی تو کوئی آسان نہ تھا یعنی کہ صاحبزادی گل مہر کو یہ اطلاع دینا کہ ابا حضور نے اس کی اور **عمیص** کی شادی چھ ماہ کے اندر اندر کرانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے اور یہ

اطلاع اس گل مہر کو دینی تھی۔ جو ابھی رات کو ہی اپنے عشق نوخیز کی حکایت اس سے بیان کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے عمیص کے بارے میں اپنے دلی جذبات کا بھی کھل کے اظہار کر ڈالا تھا۔ یہ مشکل تو جو تھی سو تھی عمیص کو ہینڈل کرنا بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ موتیا تو کب سے چاہتی تھی کہ وہ اپنے خوابوں اور تصورات کی دنیا سے باہر نکل کے اس حقیقت کو جان لے کہ گل مہر کی زندگی اور دل دونوں میں اس کے لیے رتی برابر گنجائش نہ تو ہے نہ کبھی پیدا ہو سکے گی اور اب اصل میں وہ وقت آگیا تھا جب اسے یہ حقیقت زبردستی تسلیم کرانا پڑے گی۔

"خیریت؟ اتنی بجھی بجھی سی کیوں ہو؟" وہ اس کے نزدیک بیٹھ کے فریم اٹھا کے ادھورے پھول کا جائزہ لینے لگا۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی تھی عمیص۔" بہت سوچنے کے بعد بھی یہی کچھ کرنا تھا اس لیے بہتر تھا' بغیر سوچے سمجھے ہی کہہ ڈالا جائے' سو اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"گل کے بارے میں؟" اس نے گہری نظروں سے دیکھا' موتیا ششدر رہ گئی۔

"تمہیں کیسے۔۔۔؟"

وہ اس کے ادھورے سوال پہ ادھوری سی مسکراہٹ پھیلا کے رہ گیا۔

"تم پچھلے کچھ دنوں سے میرا دھیان جس جانب دلانا چاہ رہی ہو' نہ چاہتے ہوئے بھی میں بالآخر دھیان دینے پہ مجبور ہو ہی گیا۔ غالباً" آج بھی تم گل میں آئی تبدیلیوں کا ذکر کرنا چاہتی ہو۔"

"نہیں' میں ان تبدیلیوں کی وجہ بتانا چاہتی ہوں۔"

"مثلاً"۔۔۔ **مثلاً** "کیا وجہ۔۔۔؟ یہی کہ گل کسی اور کو چاہنے لگی ہے۔" اس کے درست اندازے پہ موتیا سر جھکا کے رہ گئی۔

"چلو' غنیمت ہے تمہیں بھی سامنے کے منظر صاف نظر آنے لگے۔ اب یہی وقت ہے عمیص واپس پلٹنے کا۔" "واپس۔۔۔؟" اس نے تخت پہ نیم دراز ہوتے ہوئے برآمدے کی اونچی چھت کے روشن دان میں بنے گھونسلے پہ نظر جمائی۔

میں جب بھی نکلا میرے پاؤں چھید ڈالے گا
جو خار زار میرے چار سو ابھی تک ہے
کوئی گماں مجھے تم سے دور کیسے کرے گا
کہ اعتبار میرے چار سو ابھی تک ہے

"کیا مطلب؟۔۔۔ گمان۔۔۔ یعنی تمہارا مطلب ہے یہ محض میرا گمان ہے' وہم ہے؟"

"بالکل۔" اس کے اطمینان میں ذرا فرق نہ آتے دیکھ کے موتیا کو غصہ آگیا۔ وہ واقعی سمجھ بیٹھی تھی کہ اس کے کہنے سے قبل ہی عمیص بھی گل کے دلی جذبات سے آگاہی حاصل کر چکا ہے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ عشق نے خوش گمانیوں کی جو رنگین پٹی اس کی آنکھوں سے باندھ رکھی تھی' اسے اتارنا اتنا آسان نہ تھا۔

"بس بھی کرو عمیص۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے اب بس کرو۔ نہ تو یہ میرا گمان ہے نہ ہی وہم۔ نہ ہی میں ہوا میں اندازے کے تیر چلا رہی ہوں۔ گل نے کل رات صاف الفاظ میں مجھ سے کہا ہے۔"

"کیا؟" عمیص کی رنگت پل بھر میں بدلی موتیا کو لمحہ بھر کے لیے اسے یہ سفاک اطلاع دیتے ہوئے افسوس تو ہوا لیکن دل پہ پتھر رکھ کے کہہ ڈالا۔

"وہ۔۔۔ وہ واقعی کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے اور بہت سیریسلی انوالو ہے۔" یہاں تک کہہ چکنے کے بعد اس نے غور سے عمیص کے تاثرات جانچنا چاہے۔ وہ اسی انداز میں لیٹا تھا' ایک جامد سناٹا اس کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔ موتیا کو اس سناٹے کی ہولناکی سے خوف آنے لگا۔ وہ مزید کہنے لگی۔

"بات بہت آگے بڑھ چکی ہے' وہ گل کو باقاعدہ پرپوز کرنے کے لیے اپنی فیملی یہاں بھیجنا چاہتا ہے اور گل۔۔۔ گل نے اسے مثبت جواب دیا ہے۔"

اس کے باوجود اس کے ساکت وجود میں حرکت نہ ہوئی تو موتیا بے ساختہ اسے جھنجھوڑ بیٹھی۔

"عمیص۔۔۔"

وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ایک مرحلہ تو سر ہو ہی چکا تھا' مگر سب سے اہم اور کڑے مرحلے ابھی اس کے سامنے کھڑے تھے۔ گل کو گھر میں طے پائے جانے والے فیصلے سے آگاہ کرنا۔۔۔ جواب میں اس کی اشتعال انگیز اور باغیانہ گفتگو کو برداشت کرنا۔

امی حضور تک نہ چاہتے ہوئے بھی گل مہر کا صاف انکار پہنچانا۔۔۔ یہ بھی ممکن تھا گل اپنے سر کے متوقع پروپوزل کی اطلاع بڑوں تک پہنچانے کا فریضہ بھی اسے سونپ دیتی۔

مراحل جتنے بھی ناخوشگوار تھے' ان سے نمٹنا تو بہرحال تھا۔

"چائے پیو گی؟" بڑے ہی دوستانہ انداز میں اس نے تمہید باندھنا چاہی کہ چائے کے بہانے اس سے گفتگو کا آغاز کیا جائے لیکن اس سے پہلے گل مہر خود بول اٹھی۔

"چائے کو رہنے دو' بس تم یہاں ہمارے پاس بیٹھو ہم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"تم نے بھی؟"

"کیا مطلب؟ کیا کسی اور نے بھی کرنی ہے۔ اخیر' بات کیا ہوگی' یوں کہو ہم سے ایک کام آن پڑا ہے ہمیں۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے ایک گہری سانس بھری اور دھم سے اس کے برابر بستر پر گر گئی۔ "کہو" انداز ایسا تھا جیسے سو فیصدی جانتی ہو' گل اس سے کیا کہنے والی ہے۔

"آج سر نے ہم سے پھر وہی بات کہی۔ وہ اس معاملے کو مزید التوا میں نہیں ڈالنا چاہتے کہہ رہے تھے' انہوں نے اپنے پیرنٹس سے ہمارا ذکر کیا ہے اور وہ لوگ جلد از جلد ابا حضور سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان سے چند روز کی مزید مہلت لی ہے۔ دیکھو ناں موتیا' ایسے کیسے ہم انہیں اچانک یہاں آنے دیں۔ ہمارے گھرانے کے ماحول کا تو تمہیں اندازہ ہے اور پھر ابا حضور کا مزاج۔۔۔ یوں تو سر کی فیملی کا یہاں آنا یقیناً" ان کے لیے باعث افتخار ہی ہوگا' ظاہر ہے یہ کسی ایرے غیرے' للو پنجو کا رشتہ تو نہیں ہوگا لیکن اجنبی اور ناشناسا لوگوں کا اچانک اور بغیر کسی حوالے کے یوں رشتہ طلب کر لینا شاید انہیں ناگوار گزرے۔ اس لیے ہم چاہتے تھے پہلے سب کو ذہنی طور پہ تیار کر لیں۔"

"کمال ہے' پتہ نہیں' ذہن نام کی چیز کو سب نے کیا سمجھ رکھا ہے' ہر کوئی اسے اپنی مرضی کے مطابق تیار کرنا چاہتا ہے۔"

"کون۔۔۔ کون' کس کے ذہن کو تیار کرنا چاہتا ہے۔" اس کی بڑبڑاہٹ پہ گل چونکی ہوئی۔

"تم ابا حضور کے ذہن کو۔۔۔ جبکہ وہ تمہیں ذہنی طور پہ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان باتوں کے لیے جو ان کی جانب سے تمہارے لیے اور تمہاری جانب سے ان کے لیے شدید دھچکے کا باعث بن سکتی ہیں۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ جو کام تم میرے ذمے لگانا چاہتی ہو' وہ پہلے ہی سے امی حضور کے ذریعے مجھ تک پہنچا چکے ہیں یعنی تمہیں اس بات سے مطلع کرنے کا۔۔۔ واضح رہے صرف اور صرف۔ "مطلع" کرنے کا کہ اگلے چھ ماہ کے اندر وہ تمہاری شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"مائی گاڈ تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا۔ ہم سمجھے پتہ نہیں کیا بم پھوڑا جانے والا ہے ہمارے سر پہ۔"

"ابھی بم پھوڑا ہی کہاں ہے گل بی بی' پوری بات تو سن لو۔ وہ تمہاری شادی عمیص سے کرنا چاہتے ہیں بلکہ کرنا کیا چاہتے ہیں' کرنے والے ہیں۔"

"واٹ؟ ہم اور عمیص ابا حضور نے یہ سوچا بھی کیسے؟" وہ اچھل ہی تو پڑی۔

"یہ تو تم خود ان سے پوچھ لینا۔" موتیا نے شانے اچکائے۔

"یہ یکایک عمیص کے لیے ان کے دل میں محبت جاگی ہے یا ہمارے لیے نفرت جو وہ ہمیں نئے طریقے سے سزا دینا چاہتے ہیں۔"

"یہ ساری وضاحتیں دینے کی میں نہ تو پابند ہوں نہ ہی اہل۔ میرا جو کام تھا' وہ یہیں تک تھا۔"

"نہیں' تمہارا کام بس اتنا سا نہیں تھا۔ جس طرح تم نے ان کے کہنے پہ ہمیں مطلع کیا ہے' برائے مہربانی ہماری جانب سے بھی یہ اطلاع ان تک پہنچا دینا کہ ہمارے پاس سر شہزاد ملک کے والدین ان سے ہمارا رشتہ طلب کرنے جلد آنے والے ہیں۔" وہ چبا چبا کے بول رہی تھی۔

"تم جانتی ہو گل! اس بات سے کتنا بڑا طوفان اٹھے گا۔" اس نے اسے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کی۔

"کیوں؟ کیا ہمارے لیے اس گھر سے باہر کوئی رشتہ نہیں آسکتا؟ ایسی کون سی انہونی ہونے جا رہی ہے۔"

"یہ انہونی نہیں ہے' مانتی ہوں لیکن اتفاقاً" موقع محل کچھ ایسا نامناسب سا ہو گیا ہے۔ اب اس موقع پہ کہ جب ابا حضور اپنی جانب سے تمہارا اور عمیص کا معاملہ تقریباً" فائنل کیے بیٹھے ہیں' انہیں یہ بتانا کہ ایک اور امیدوار تیار بیٹھا ہے جسے ان کی صاحبزادی کی حوصلہ افزائی بھی حاصل ہے۔ میری مانو تو پہلے عمیص والے معاملے کو سنبھال لو' اس کے بعد دوسرا قدم اٹھانا۔"

"ہمارے خالی خولی انکار کو تو وہ ہرگز اہمیت نہیں دیں گے۔ ظاہر ہے کہ عمیص کو مسترد کرنے کا کوئی ٹھوس جواز بھی تو ہونا چاہیے ہمارے پاس اور اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے بلکہ ہمارا تو خیال ہے عمیص کا خیال ان کے دل سے نکالنے کا اس سے اچھا طریقہ اور ہو ہی نہیں سکتا' جب اس سے ہزار لاکھ' کروڑ گنا اچھا رشتہ ہمارے لیے موجود ہے تو وہ ہمارے عمیص کے لیے انکار پہ زیادہ معترض نہیں ہوں گے۔ آخر ہیں تو وہ ہمارے ہی ابا حضور' ہمارا بھلا ہی سوچیں گے۔"

"اوہو' بڑی خوش فہمیاں ہیں اپنے سر کے بارے میں۔" موتیا کو اس ان دیکھے شخص سے بلاوجہ اور بے حساب چڑ محسوس ہوئی' جسے وہ عمیص کے مقابلے میں ہزار لاکھ اور کروڑ گنا بہتر قرار دے رہی تھی۔

اتنا تو موتیا بھی جانتی تھی کہ گل کا انکار اور سب سے بڑھ کے شہزاد کے پروپوزل کے بارے میں ذکر گھر میں بھونچال لے آئے گا لیکن ردعمل اس کی توقع سے کہیں بڑھ کے ثابت ہوا حالانکہ ابھی بات امی حضور اور تائی حضور تک ہی محدود تھی۔ وہ ابھی سے یہ سوچ کے خوفزدہ تھی کہ بات جب ابا حضور تک پہنچے گی اور ظاہر ہے کہ لازماً" پہنچے گی تب کیا ہو گا۔ گل ان سب باتوں سے یکسر بے نیاز ہو کے حسب معمول آفس گئی تھی۔

"صاحبزادی گل مہر نے ایسا سوچنے کی بھی جسارت کیوں کرلی۔" امی حضور کا جلال دیدنی تھا۔ موتیا نے اس سے قبل انہیں اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"کیا وہ نہیں جانتیں نواب گھرانے کی روایات کو' ہمارے ہاں بیٹیوں کو یہ اختیار نہیں سونپے جاتے کہ وہ اپنے لیے بر ڈھونڈیں۔"

"گل نے کبھی یہ اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں لیا امی حضور حتمی فیصلے کا اختیار بجا طور پہ آپ کے اور ابا حضور کے ہاتھ میں ہے' اسی لیے تو وہ صاحب اور ان کی فیملی باضابطہ طور پہ اور شریفانہ طریقے سے یہاں آرہے ہیں۔ بالا ہی بالا سب معاملات طے ہو چکے ہوتے تو ان سب کی بھلا کیا ضرورت تھی۔"

"ایک غیر شخص کی اتنی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ وہ ہماری دہلیز تک اس مقصد سے آئے۔" صاحبزادی خلعت النساء نے بھی اپنے غیض و غضب کا مظاہرہ کیا۔

"صاحبزادی یاسمین کو خاندان سے باہر بیاہنا ہماری مجبوری تھی کہ قدرت کی ستم ظریفی کے باعث ہمارا خاندان ان دو بھائیوں کے کنبے تک ہی محدود رہ گیا تھا اور صاحبزادی کے لیے بر باہر تلاشنا پڑا' مگر یہاں بھی بھائی صاحب نے خاندانی حسب نسب کو ملحوظ خاطر رکھا اور نواب گھرانے کی ٹکر کا سمدھیانہ ڈھونڈا۔ لیکن صاحبزادی گل مہر کے

لیے حویلی سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب عمیص میاں کی صورت میں مناسب اور موزوں جوڑ موجود ہے تو روایات کو کیوں پامال کیا جائے۔"

"لیکن تائی حضور! آخر مل لینے اور جانچ پرکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔" اس کی مسلسل حجت پہ صاحبزادی حرمت نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

"اپنی ہمشیرہ کی بے جا حمایت یا وکالت کرنے کی ضرورت نہیں ہے صاحبزادی الماس خاتون۔ دھیان ملحوظ رکھیے کہ آپ کس سے مخاطب ہیں۔"

"معاف کیجیے گا تائی حضور۔" امی کے ٹوکنے پہ اس نے فوراً" تائی حضور سے معافی مانگ لی۔

"میں کسی کی بھی وکالت نہیں کر رہی۔ مکمل غیر جانبداری کے ساتھ اس تک آپ کی بات پہنچائی اور اسی طرح آپ تک اس کا پیغام پہنچا رہی ہوں۔ لیکن آپ اس کی بے جا حمایت کا شبہ ظاہر کر رہی ہیں اسی طرح اس نے بھی مجھ پہ جانبداری کا الزام لگایا ہے جبکہ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں آپ دونوں کو شدت پسندانہ رویہ ترک کر کے مصالحت پسندی کی طرف لانا چاہ رہی ہوں۔ اس کو بھی یہی سمجھایا تھا کہ بزرگوں کے فیصلے میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے' ایک بار عمیص کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر لے اور آپ سے بھی صرف اتنی سی درخواست کر رہی ہوں کہ بدلتے وقت کے تقاضوں کو سمجھیں' حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ ضروری نہیں ہر اجنبی ناپسندیدہ ہی ثابت ہو۔ آپ ایک بار ان لوگوں کو آنے تو دیجیے۔"

موتیا کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا' گل کی حمایت کر کے آنے والے مہمانوں کے لیے راہ ہموار کرنے کا' وہ خود حیران تھی کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے۔

"اور نواب صاحب....." صاحبزادی حرمت النساء نے اس کی توجہ اس جانب دلائی۔

"آپ کے ابا حضور کو کیسے یہ بات سمجھائی جائے۔ وہ ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ ابھی تک وہ دل سے گل مہر کی بغاوت کو تسلیم نہیں کر پائے بس ایک سمجھوتہ سا کیے ہوئے ہیں کہ ان کے آفس جانے پہ بھی لب سیے بیٹھے ہیں لیکن ان کی مصلحت آمیز خاموشی کا مطلب ان کی پسپائی نہیں ہے۔ ہر بار وہ صاحبزادی گل مہر کے باغیانہ قدم کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ تو اپنے تئیں ان کی اور عمیص میاں کی نسبت تقریباً" طے کیے بیٹھے ہیں۔"

"ایسا کرتے ہوئے انہیں ایک بار گل کے مزاج کے بارے میں سوچنا ضرور چاہیے تھا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"آخر وہ والد ہیں' ان سے بڑھ کے مزاج آشنا اور کون ہو گا اولاد کا۔"

"اسی دعوی کے ساتھ انہوں نے عمیص کو صاحبزادی کے لیے منتخب کیا تھا کہ صاحبزادی گل مہر کی اکھڑ مزاجی کے لیے عمیص میاں کا لچکدار مزاج موزوں رہے گا۔"

"لوہے کو لوہا کاٹتا ہے امی حضور۔" وہ مسکرائی۔ "شہزاد ملک کا کیا بنتا ہے' میں نہیں جانتی' ابا حضور اسے اس دہلیز تک آنے کا شرف بھی بخشتے ہیں یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن ایک بات تو طے ہے' گل عمیص کے لیے کبھی ہاں نہیں کہے گی۔ اگر شہزاد ملک نامی شخص درمیان میں نہ آتا' تب بھی نہیں۔"

"کیا برائی ہے ہمارے صاحبزادے میں؟" صاحبزادی خلعت النساء کی بارعب آواز میں ارتعاش تھا۔ موتیا کو احساس ہوا اسے یہ بات اس انداز میں ایک ماں کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"نہیں تائی حضور' کمی عمیص میں نہیں' بات دونوں کے مختلف مزاج کی ہے۔ یوں تو دو مختلف فطرت و عادات والے لوگوں میں بھی نبھ ہی جایا کرتی ہے لیکن گل کے بارے میں آپ جانتی ہیں وہ نبھانے پہ یقین نہیں رکھتی۔ پھر ایسے کام کے لیے کوشش کی ہی کیوں جائے جس کے نبھ جانے کی ذرا برابر امید نہ ہو۔"

"وہ ناسمجھ ہیں' جذباتی ہیں' ان کی یہ بے جا ضد نظرانداز کر دینا ہی مناسب ہو گا۔ پہلے ہی ہم سب نے ان کی ہر بات مان کے انہیں بہت سر چڑھا لیا ہے۔" وہ ایک سننے پہ تیار نہ تھیں۔

"آپا حضور درست کہہ رہی ہیں۔ نواب صاحب سے صاحبزادی گل کے اس اعتراض کا ذکر تک کرنے کی

ضرورت نہیں اور صاحبزادی گل مہر سے کہہ دیجیے' الماس خاتون کہ اپنے اطوار سدھار لیں' اب مزید ان کی من مانی نہیں چلے گی۔ عمیص ہی ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہیں اور ان کے لیے موزوں ترین انتخاب بھی کسی اور کا خیال ذہن اور دل دونوں سے جھٹک دیں۔ یہی ان کے حق میں بہتر ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

بابر ہمایوں مغل کو دو ہی دن بعد ایک بار پھر اپنے دروازے پہ دیکھ کے اللہ وسایا چونک گیا۔

"خیر تو ہے مغل صاحب؟"

"جی حضرت' ہم یہاں سے گزر رہے تھے کہ خیال آیا' ادا جی کی اس روز کی چائے ہم پہ ادھار تھی۔ ہم ادھار رکھنے کے قائل نہیں' سو چلے آئے کہ یہ قرض بھی اتار دیں۔" اس کی بے تاب نظریں اندرونی دروازے پہ بھٹک رہی تھیں۔

"ادا پتر تو آرام کر رہی ہے۔ میں نے کل سے اسے باہر نہیں نکلنے دیا۔ گھر سے تو دور کی بات کمرے تک سے نہیں۔" وہ گیٹ پہ ڈھٹائی سے جما تھا' ایک بار بھی تکلفاً "اسے اندر آنے کو نہ کہا۔ اس کا رویہ بابر کی نازک مزاجی پہ گراں تو گزرا۔ لیکن ادا کی خاطر وہ بھی مقابلے پہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا وہیں ڈٹا رہا۔

"بہت اچھا کیا چوہدری صاحب۔ انہیں آرام کی واقعی سخت ضرورت ہے۔"

"کون ہے ابا جی؟" اچانک دعا نمودار ہوئی بابر کو دیکھ کے اس کے چہرے پہ یک بیک خوشی اور حیرت کے بے ساختہ رنگ چھلک آئے۔

"ارے مغل صاحب' آپ؟"

"کہیے کیسے مزاج ہیں ادا جی؟" وہ بھی کھل سا گیا۔

"بس کرم نوازی ہے اللہ کی اور آپ جیسے خیر خواہوں کی دعائیں ہیں' آپ پلیز اندر تشریف لائیے ناں۔"

اللہ وسایا جز بز ہوتا بابر کو اندر جاتا دیکھتا رہا۔ مزید غصہ تب آیا جب دعا نے اسے بازار سے چائے کے ساتھ پیش کرنے والا سامان لانے کے لیے پیسے پکڑا ئے۔

"یہ تو کیا غضب کر رہی ہے ادا' کس لسوڑے کو پکا کر رہی ہے۔ یہ تو ان میں سے ہے' جنہیں انگلی پکڑاؤ تو پہنچا پکڑ لیتے ہیں اس کے آگے ٹرالی سجا کے رکھنے کی لوڑ نئیں' روز آیا کرے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ابا جی۔ بابر صاحب کوئی گرے پڑے انسان نہیں۔ خاندانی آدمی ہیں اور اگر روز بھی آجائیں تو کیا حرج ہے۔ کوئی معقول آدمی بغیر کسی مطلب کے ہم سے ملنا گوارا ہی کہاں کرتا ہے۔"

لیکن پندرہ منٹ بعد جب وہ بیکری سے شاپنگ بیگ بھر کے لوٹا تو ڈرائنگ روم کے دروازے سے سن گن لینے کے بعد بابر کی آمد پہ اسے اپنی ناگواری میں خود بخود کمی کرنا پڑی۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"دیکھئے ادا جی' آپ میں فن ہے' صلاحیت ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے شعبے سے دیانت داری کا جذبہ پایا جاتا ہے ورنہ اس شعبے میں قدم رکھنے کے بعد تقریباً "سبھی فنکارائیں فن کو پس پشت ڈال کے صرف اور صرف پیسے کے حصول کے لیے اور سب کچھ کر گزرتی ہیں' بس اس فن بیچارے کو ہی استعمال نہیں کرتیں۔ آپ خوش نصیب ہیں جو آپ کو اپنی صلاحیتیں آزمانے اور پھر انہیں دنیا پہ ثابت کرنے کا اتنا اچھا اور صاف ستھرا موقع مل رہا ہے میرا پر خلوص مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اس سنہری موقعے کو ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔"

"لیکن بابر صاحب' چند ایسے خیر خواہ بھی ہیں جو ملک مقبول کے بارے میں کچھ ایسے اندیشوں کا اظہار کر رہے ہیں جن کی وجہ سے میرا دل نہیں مان رہا۔ کچھ کھٹک سی پیدا ہو گئی ہے۔"

"وسوسے ہمیشہ کھٹک ہی پیدا کیا کرتے ہیں ادا جی۔ اور جو لوگ دل میں وسوسے پیدا کریں' انہیں خیر خواہ تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔"

بابر کی بات پہ دروازے کے نزدیک کھڑے اللہ وسایا نے زور زور سے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"ہم ملک صاحب کو عرصہ دراز سے جانتے ہیں ان کی پاک دامنی کا دعویٰ ہرگز نہیں کریں گے البتہ یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کاروباری اعتبار سے ملک مقبول اصولوں کے پکے شخص ہیں۔ جو ایگریمنٹ ہوتا ہے اس سے انچ برابر پیچھے نہیں ہٹتے۔ یوں بھی اتنے سالوں سے یہ کام کر رہے ہیں' ہر شخص کی فطرت اور اصلیت کے مطابق اس سے کام لیتے ہیں چاہے اچھا۔۔۔ چاہے برا۔ آپ اطمینان رکھیے' انہوں نے کبھی کسی کو غلط کام کے لیے مجبور کرنا تو درکنار' پیشکش تک نہیں کی آپ کے وقار اور رکھ رکھاؤ کا تو اکثر بڑی عقیدت سے ذکر کرتے ہیں کہ ایسی خواتین کی اس شعبے میں موجودگی اب خال خال ہی رہ گئی ہے۔"

"یعنی اگر میں یہ ایگریمنٹ سائن کر لوں تو کوئی خطرے والی بات نہیں۔"

"ہرگز نہیں' سو فیصدی کامیابی آپ کا مقدر ہو گی ادا جی۔ آپ ہماری یہ بات لکھ کے رکھ لیجیے اور یہ بات بھی گرہ سے باندھ لیجئے کہ ہمدردی میں لپیٹ کر دیے گئے ایسے مشورے' جو آپ کو آگے بڑھنے سے روکیں اور پیچھے کی جانب ملنے پہ اکسائیں حسد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ایسی باتوں پہ کان دھرنا چھوڑیے اور اپنی ترقی پہ توجہ دیجئے۔"

"چلیں آپ کہتے ہیں تو میں جلد ہی ملک مقبول کو حتمی طور پہ ہاں کہہ دوں گی۔ نگاہ نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا اور ابا جی تو شروع سے ہی یہ چاہتے ہیں بس میں ہی دیر کیے جا رہی تھی لیکن آپ کی بات درست ہے' واقعی جن کو میں خیر خواہ سمجھ بیٹھی تھی وہ در حقیقت۔۔۔ خیر۔۔۔ آپ سے بات کر کے سارے کھٹکے دور ہو گئے' دل و دماغ ہلکے پھلکے سے ہو گئے ہیں۔"

وہ طمانیت سے مسکرائی تو بابر کے اندر بھی اطمینان کھل کے اپنا آپ پسارنے لگا۔ وہ پہلے ہی جانتا تھا یہ کام ایسا مشکل نہیں' صرف ملک سے زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنے کی خاطر وہ اسے بڑھا چڑھا کے دشوار بیان کر رہا تھا۔ اب دعا کو اتنی آسانی سے رضامند ہوتے دیکھ کے وہ خود ہی اپنے آپ کو شاباش دینے لگا۔

دوسری جانب اللہ وسایا ان کی گفتگو سننے کے بعد اب خوشی خوشی ٹرالی سجانے لگا۔ اسے بھی بابر یکا یک اچھا اور اپنا اپنا سا لگنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بنا؟"

آفس سے لوٹتے ہی گل مہر نے موتیا کو جا لیا حالانکہ گھر کے ماحول میں پھیلے تناؤ اور امی حضور کے بدلے تیور اسے بہت کچھ باور کرا رہے تھے لیکن وہ تفصیل جاننا چاہتی تھی۔

"وہی' جو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا یعنی کچھ نہیں۔" موتیا نے مختصراً کہہ کے جان چھڑانا چاہی لیکن گل نے اسے بازو سے کھینچ کے دوبارہ بٹھا لیا۔

"کیا مطلب کچھ نہیں؟ ہم نے کہا تو تھا کہ ان سے سب صاف صاف کہہ دو۔" وہ جھنجلائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"جتنی صفائی سے بات کر سکتی تھی' کر چکی۔ اگر کوئی کسر باقی ہے تو وہ تم پوری کر لو۔ میں مفت میں بہت ذلیل ہو چکی ایک تم ہو جو بلا وجہ کی دھونس جما کے اپنا مطلب نکال رہی ہو' دوسری طرف تمہارا موقف بڑوں کے سامنے دہرانے سے ساری ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن بھی میرے حصے میں ہی آئی' جو کہ سراسر تمہارا حق بنتا تھا۔"

"ہاں' چکا دیں گے تمہارا سارا احسان' زیادہ جتانے کی ضرورت نہیں۔ ایسا نہیں کہ ہم خود یہ بات کر ہی نہیں سکتے' نہ ہم میں ہمت کی کمی ہے نہ دلائل کی' جائز اور درست عمل میں جھجک کیسی؟ تمہارے توسط سے یہ بات پہنچانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ بڑوں کو ایک اور اعتراض کا موقع نہ ملے کہ ہم خود اپنی شادی کی بات ان سے کر رہے ہیں حالانکہ ہم اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے ضرورت پڑی تو خود ان کے سامنے جائیں گے۔"

"اور اگر ضرورت نہ پڑے تو۔۔۔" دروازے پہ ہلکی سی دستک کی آواز اور عمیص کا فقرہ ایک ساتھ سنائی دیا۔

"مخل ہونے اور بغیر اجازت تمہارے اس بے حد ذاتی معاملے میں دخل اندازی کی معذرت لیکن جب بات کھل جائے تو وہ اتنی ذاتی نہیں رہتی۔"

وہ اس کی خاموشی کے باوجود سامنے بیٹھ گیا اور ایک ٹک اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ گھبراہٹ اور الجھن سی محسوس کرنے لگی۔

"ایسے کیا گھور رہے ہو ہمیں؟"

"کچھ نہیں' سوچ رہا ہوں۔۔۔

جو بھی کرتا ہے محبت' وہ برا کرتا ہے
اک بندے پہ وہ کتنوں کو خفا کرتا ہے

وہ بدستور اس کے چہرے پہ نظر جمائے شعر پڑھ رہا تھا' اس وقت چونک اٹھا جب جواب میں پہلی بار موتیا کی بجائے گل نے شعر پڑھا۔

مسئلہ میرا ہے دنیا کو پریشانی کیوں
جو ہوا ہے' وہ محبت میں ہوا کرتا ہے

گل کے شانے اچکا کے کہنے پہ دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ یہ حیرت اس کے کھل کے اپنی محبت تسلیم کر لینے پہ زیادہ تھی اور اس شاعری سے الرجک لڑکی کے فی البدیہہ شعر سنانے پہ کم۔

یوں برانگیختہ ہونے کی ضرورت نہیں
جس کو تکلیف پہنچتی ہے وہ گلہ کرتا ہے

موتیا نے اس کا اعتراض اسی کے انداز میں اسے لوٹا دیا۔

"ہمیں کوئی شوق نہیں کسی کو تکلیف دینے کا۔۔۔ ہاں اگر کسی کو خود ہی تکلیفیں مول لینے کا شوق ہو تو ہم پہ الزام کیوں۔" وہ تنتناتی ہوئی کمرے سے ہی نکل گئی۔

نہ شکایت نہ تکلف نہ ہی رونا دھونا
اتنا بے جذبہ کسے کون جدا کرتا ہے

عمیص نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"جدا وہ ہوتے ہیں عمیص' جو کبھی ساتھ رہے ہوں۔" موتیا نے کچھ یاد دلانا چاہا۔

"اور کچھ لوگ ساتھ نہ بھی رہنا چاہیں' تب بھی ساتھ ہوتے ہیں۔" وہ گل کے پیچھے آنگن تک چلا آیا' وہ موتیے کی باڑ کے پاس بیٹھی بے زاری سے پتیاں نوچ رہی تھی۔

"تم بدگمان بہت جلد ہو جاتی ہو گل' محبت کرنے والوں کے لیے یہ اچھی علامت نہیں۔" وہ بھی وہیں نرم ہلکی گیلی گھاس پہ بیٹھ گیا۔

"اگر واقعی تم محبت کرنے والوں کے قبیلے میں شامل ہو چکی ہو تو۔۔۔" اس نے اضافہ کیا تو گل کے ہاتھ ذرا دیر کو اس شغل سے تھمے۔ کچھ پل سوچنے کے بعد اس نے پھر جھٹکے سے ایک پتی نوچ لی۔

"پتہ نہیں۔۔۔ بس ہم چاہتے ہیں۔"

"چاہنا۔۔۔ ہاں چاہنا۔۔۔" عمیص نے اس کے ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں تھامتے ہوئے اسے اس بے دردانہ عمل سے روکا۔

"ہاں چاہنا' یعنی چاہت بھی تو محبت کی ہی پہلی سیڑھی ہے۔ ٹھیک ہے' چڑھتی جاؤ۔۔۔ قدم بڑھاؤ ساتھیو' ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

"ہمارا مطلب ہے ہم یہ محبت وغیرہ کے جذبے پہ ابھی بھی اتنا یقین نہیں رکھتے لیکن اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اگر کوئی نیا موڑ لیتی ہے تو وہ موڑ ہماری مرضی کے مطابق ہونا چاہیے اور اس نئے موڑ پہ ہمارا ہم سفر اگر کوئی شخص بنتا ہے تو اس کا انتخاب بھی ہماری پسند سے ہونا چاہیے۔ ہمیں بھی شادی کی کوئی جلدی ہے نہ ہی کوئی بیٹھے بٹھائے شوق پیدا ہوا ہے۔ سر نے ہمیں پرپوز کیا تو ہمیں لگا' اگر شادی کرنا ہی ہے تو اس سے بہتر چوائس اور کوئی

نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر لحاظ سے ہمارے آئیڈیل کے قریب ترین ہیں۔ ویل مینرڈ' ویل بی ہیوڈ' ویل نون اور۔۔۔"

"ویل۔۔۔ ویل۔۔۔ ویل۔" عمیص نے ہاتھ کھڑے کیے۔

"تم اسے جو بھی نام دو' تمہارا اس خواہش پہ ڈٹ جانا' اڑ جانا اور کسی بھی مخالفت کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھنا۔۔۔ یہ سب کچھ اور ظاہر کرتا ہے گل۔"

"چلو تم اس طرح خوش ہوتے ہو تو یونہی سہی۔" اس نے چہرہ دوسری جانب پھیرتے ہوئے بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن عمیص کی نظروں سے اس کا گلنار ہوتا روپ چھپ نہ سکا۔ وہ کرب سے مسکرا دیا۔ اس کی شہزادے سے محبت کا یہ ڈھکا چھپا مگر فطری اظہار اس کی اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی کے سارے قلعے ڈھا گیا۔ اسے اس انجانے شخص سے بے پناہ حسد محسوس ہوا جس کے نام کے سارے دلکش رنگ پل بھر میں گل کے چہرے پہ بہار پھیلا گئے تھے۔

"تم بتاؤ ہم کس طرح خوش ہو سکتی ہو؟"

دل کے اس کرب کو دل میں ہی چھپاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا اور جواب میں ایک سرگوشیاں کرتی خاموشی سے خود ہی اس کے دل کی بات بھانپ گیا۔

"چلو ٹھیک ہے' تم اس طرح خوش ہوتی ہو تو یونہی سہی۔" وہی فقرہ تھا جو گل نے کہا تھا۔

وہی چہرہ پھیر کے اپنے تاثرات چھپانے کا انداز تھا' جو گل کا تھا۔ چہرے پہ وہی سرخی چھائی تھی۔۔۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گل کے چہرے کا گلال حجاب اور اولین محبت کے اقرار کا تھا جبکہ عمیص کے چہرے سے چھلکتی سرخی ضبط کی تھی۔

ایک فرق یہ بھی تھا کہ عمیص نے اس رنگ سے گل کے دل کی بات بھانپ لی تھی جبکہ گل دیکھ کے بھی انجان بن رہی تھی۔

"کیا کر سکتے ہو تم ہمارے لیے؟" وہ ایک نیا امتحان لینے کو تیار تھی۔

"وہ سب۔۔۔ جو تمہارے لیے ہو سکتا ہے۔"

کاش گل جان پاتی' ان الفاظ میں کیا کچھ پوشیدہ تھا۔

"کیا۔۔۔" وہ پوچھتے ہوئے کچھ جھجک سی گئی۔

"کیا۔۔۔ شہزاد ملک ہمارے لیے ہو سکتے ہیں؟"

"میں پوری کوشش کروں گا گل کہ چچا حضور کو رضامند کر لوں۔" اس نے صرف ان آنکھوں میں جلتی امید کی جوت کو قائم رکھنے کے لیے وعدہ کر لیا ورنہ یہ بیڑا اٹھانا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے اس کے اور صاحبزادہ نفیس علی خان کے درمیان نامعلوم سی کشیدگی حائل تھی' جسے وہ چاہ کے بھی کم نہ کر پا رہا تھا۔ ایسے میں گل کا یہ مقدمہ لڑنا اس کشیدگی کو اور ہوا دے دیتا۔ لیکن سب جانتے بوجھتے بھی یہ وہ منہ زور جذبہ تھا جو اس سے ایسے وعدے کروا رہا تھا۔

موتیا نے دالان کے ستون کے سہارے کھڑے کھڑے یہ سارا منظر دیکھا اور عمیص کے حوصلے کی داد دی۔ جس بات سے وہ اتنا ڈر رہی تھی' وہ بغیر کوئی طوفان لائے ہو گئی۔ اسے اندیشہ تھا نجانے عمیص کا ردعمل کتنا شدید ہو' اس کے دل پہ کتنی تباہ کاریاں ہوں نجانے کتنا عرصہ لگے اسے سنبھلنے میں۔ لیکن ہوا کیا۔۔۔؟ خود تو وہ سنبھلا ہی ساتھ میں گل کو سنبھالنے کا ذمہ بھی اٹھا لیا۔

"کیا کر سکتے ہو تم میرے لیے؟" اس کے دل نے بڑا نڈر ہو کے عمیص کے تصور سے سوال کیا۔

"وہ سب کچھ جو تمہارے لیے ہو سکتا ہے۔" تصور نے وہی جواب دیا جو وہ سننا چاہتی تھی۔

"کیا تم میرے۔۔۔ ہو سکتے ہو؟"

"جاگ جاؤ موتیا۔" اپنے بالکل نزدیک اس کی آواز سن کے وہ اپنے تصور سے چونک گئی۔ وہ اس کی کھوئی کھوئی

آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا رہا تھا۔

"کیا سوچ رہی تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پلکیں جھپک کے بن بلائی نمی کو پرے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود **عمیص** کا چہرہ دھندلا سا دکھائی دیا تو اسے احساس ہوا کہ یہ دھند اس کی آنکھوں کے آگے نہیں بلکہ **عمیص** کے چہرے پہ چھائی ہوئی تھی۔

"یعنی طوفان تو آیا مگر۔۔۔ کچھ بہائے بغیر اندر ہی اندر تباہ کاریاں مچاتا نکل گیا۔"

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"تم یہ بتاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیوں ایسا کر رہے ہو؟ انسان بنے رہنا اچھا نہیں لگ رہا کیا؟ جو انسانیت کے مرتبے سے اٹھ کے فرشتہ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"محبت انسان ہی کرتے ہیں موتیا اور میں محبت نبھا رہا ہوں۔ محبت صرف یہ تو نہیں کہ جسے چاہا جائے بس اس کی طلب کی جائے، اس کے حصول کے لیے تگ و دو کی جائے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے ہمارے بجائے کسی اور کی طلب ہے۔ محبت تو یہ ہے موتیا، اپنی طلب بھلا کے اس کی طلب پوری کی جائے، خود نامراد رہ کے بھی اس کی مراد پوری کی جائے۔

مولا میری عمر کے چاہے سارے دیپ بجھا دے
لیکن اس کی آنکھوں کے سب خواب سلامت رکھنا

اسے تھکے قدموں کے ساتھ اندر پلٹتے دیکھ کے موتیا کے اندر بھی ڈھیروں ڈھیر تھکن اتر آئی۔

"خواب تو ان آنکھوں میں بھی بہت سے ہیں **عمیص**، لیکن تم نے ان میں رنگ بھرنے کا سوچنا تو ایک طرف، کبھی دیکھنے کی زحمت کرنا بھی گوارا نہ کیا۔"

☼ ☼ ☼

"یہ ناممکن ہے امی حضور۔"

عمیص کی زبان سے صاف انکار سن کے صاحبزادی **خلعت النساء** دنگ رہ گئیں۔ اتنی حیرت انہیں **گل** کے انکار سے نہ ہوئی تھی۔

"مگر ہم پوچھتے ہیں۔۔۔ کیوں؟"

"وجہ آپ جانتی ہیں۔"

"ہم آپ کی زبان سے سننا چاہتے ہیں۔"

"موتیا نے آپ تک گل کا موقف پہنچا دیا ہو گا۔ اس کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔"

"وہ کم عمر اور جذباتی ہیں۔ اگر ہم ان کی **بچکانہ** باتوں کو اہمیت دینے لگیں گے تو اس گھرانے کی روایات و اقدار کا کیا ہو گا؟"

"گھرانے میں بسنے والے جیتے جی زندہ انسانوں کے بارے میں بھی سوچ لینا چاہیے امی حضور، رہی بات گل کے جذباتی ہونے کی تو میں اس سے اختلاف رکھتا ہوں۔ وہ ضدی ضرور ہے مگر کم عقل اور جذباتی نہیں، اگر وہ کسی فیصلے پہ ڈٹ جاتی ہے تو وہ فیصلہ اس نے خوب سوچ سمجھ کے کیا ہوتا ہے۔"

"ہمیں بالکل یہ امید نہ تھی صاحبزادے **عمیص** کہ آپ اس بار بھی گل کے عاقبت نااندیش فیصلے کی حمایت کریں گے جبکہ اس میں سراسر آپ کی ہتک کا پہلو نکلتا ہے۔"

"اس نے اگر صرف مجھے رد کیا ہوتا تو شاید میں بھی اس میں ہتک کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتا لیکن امی حضور، اس نے صرف اپنی پسند کو فوقیت دی ہے۔ وہ میری بجائے کسی اور سے۔۔۔ میرا مطلب ہے۔"

"ہمیں کوئی مطلب سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی ہمارے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں ہوئی کہ ہم اپنی بہو بیٹیوں کے بارے میں ایسے انکشافات بے حیائی سے سن سکیں۔"

"کسی کو پسند کرنے میں کوئی بے حیائی نہیں۔ اگر وہ میرے بارے میں یا میں اس کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کرتے تب آپ کو قطعاً اعتراض نہ ہوتا لیکن اگر اس نے آپ سب کی توقعات کے برعکس کسی اور کے بارے میں اپنی پسندیدگی ظاہر کی ہے تو آپ کو ناگوار گزر رہا ہے۔ چلیں اچانک دھچکے کی وجہ سے یہ بات آپ کو بری بھی لگی ہے تو اب ذرا ٹھنڈے دماغ سے غور کیجیے۔ یہ بات اخلاقاً، شرعاً کسی بھی طرح سے نامناسب نہیں گل ایک سمجھدار اور باشعور لڑکی ہے، وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی اور شہزاد نامی شخص نے بھی اگر غلط طریقے سے نقب لگانا چاہی ہوتی تو وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتی۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس نے گل مہر سے نہایت جائز اور شریفانہ طریقے سے شادی کی خواہش ظاہر کی اور گل نے اسے گھر کا رستہ دکھا دیا اور ایسا بھی صرف اس لیے کیا کہ وہ خود شہزاد ملک کے کردار کے بارے میں مطمئن اور پر اعتماد ہو گی ورنہ وہیں سے صاف جواب دے دیتی۔"

"اگر معاملہ اتنا ہی بے ضرر ہے تو صاحبزادی گل مہر ہمارے انکار کو مسئلہ کیوں بنا رہی ہیں۔ اگر وہ اس شخص کے بارے میں صرف اتنے ہی جذبات رکھتی ہیں تو کس برتے پہ اپنے بزرگوں کے منہ کو آ رہی ہیں۔ نہیں **عمیص** میاں، ہمیں بہلانے کی کوشش مت کیجیے۔ بات اتنی سیدھی سادی نہیں جتنا کہ آپ بتلا رہے ہیں اور اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے، اس شخص نے اپنی خواہش بیان کی، صاحبزادی گل مہر نے اسے ہمارے پاس آنے کی صلاح دی یعنی معاملہ ہماری صوابدید پہ چھوڑا تو پھر اب ہماری رائے کا احترام کریں۔"

"اس نے یہ معاملہ آپ کے سپرد ضرور کیا لیکن اس اعتماد کے ساتھ کہ آپ مکمل غیر جانب داری برتتے ہوئے وہ فیصلہ کریں گی جو اس کے لیے بہتر ہو گا لیکن آپ نے اس شخص سے ملے بغیر، اس کو جانچے پرکھے بنا ہی مسترد کر دیا، جس سے ثابت ہوتا ہے اس عمل سے صرف اسے یہ باور کرانا مطلب ہے کہ اس کی پسند ناپسند یا مرضی کی قطعی کوئی اہمیت نہیں۔ اس بات سے اسے غصہ نہیں آئے گا تو اور کیا ہو گا کم از کم یہ تو دیکھ لیں کہ وہ آدمی کیسا ہے۔ اگر کوئی معقول جواز ہوا انکار کا تو مجھے امید ہے گل سمجھ جائے گی۔"

"**عمیص** میاں، آپ بلاوجہ بات کو الجھائیں مت۔ اگر نواب صاحب تک یہ معاملہ پہنچا تو بہت برا ہو گا، ان کے لیے بھی، ہم سب کے لیے بھی اور اس گھر کے لیے بھی۔ اتنے طوفان کے بعد بھی اگر انکار ہی ہونا ہے تو کیوں نہ بات کو اس حد تک جانے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے۔"

خاموشی سے، ماں بیٹے کی بحث کو طول پکڑتا دیکھتی صاحبزادی حرمت النساء کہہ اٹھیں۔

"آپ سب یہ طے کیے بیٹھے ہیں کہ چچا حضور انکار ہی کریں گے۔ میں بھی جانتا ہوں ان کا فوری ردعمل کچھ ایسا ہی ہو گا لیکن ضروری نہیں وہ اس انکار پہ قائم بھی رہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ رشتہ ان کے معیار کے عین مطابق ہو۔ وہ اسے مجھ پہ فوقیت دے ڈالیں ویسے بھی میرا انتخاب ان کی مجبوری ہے ورنہ ان کی میرے بارے میں رائے سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔"

"گویا آپ اس معاملے کو سنگین نوعیت تک پہنچانے کا عزم کیے بیٹھے ہیں۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ورنہ میں تو پوری نیک نیتی سے آپ ہی کی بیٹی کی بھلائی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ عمر بھر کے رشتے اگر مکمل رضامندی اور دلی خوشی کے ساتھ باندھے جائیں تو ان میں برکت پیدا ہوتی ہے ورنہ زبردستی کے بندھن۔۔۔ نبھ تو جاتے ہیں کسی نہ کسی طرح مگر۔۔۔"

اس کی ادھوری بات نے صاحبزادی حرمت النساء کی آنکھوں کے سامنے پل بھر میں ان کی ادھوری ازدواجی زندگی کے ڈھیر سارے ادھورے منظر لا کے رکھ دیے۔

انہوں نے صاحبزادہ نفیس علی خان کے ساتھ پچھلے پچیس سالوں میں بے شک کوئی ایسا ازدواجی دکھ نہیں اٹھایا۔ لیکن سچ بات تو یہ تھی کہ ایسا سکھ بھی نہ دیکھا جس سے انہیں یہ احساس ہوتا کہ وہ ان کی من چاہی شریک حیات ہیں۔ اتنے سالوں کی رفاقت کے بعد اب کبھی کبھار نواب صاحب انہیں اس قابل سمجھ لیتے کہ اپنے دل کی بات کہہ سن لیتے۔ لیکن یہ بھی محبت نہیں بلکہ رفاقت کا اعجاز تھا کہ اتنے سالوں کے بعد تو بے جان چیزوں سے

بھی لگاؤ ہو جانا فطری امر تھا۔ ابتدائی سالوں میں تو اکثر وہ ضروری معاملات میں بھی انہیں مخاطب تک کرنا مناسب نہیں جانتے تھے۔ وہ ہمیشہ سے جانتی تھیں کہ وہ ان کی زندگی میں زبردستی شامل کی گئی ہیں ورنہ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی انہیں کچھ روز قبل دیکھا وہ آشنا سا چہرہ یاد آ گیا' جو یقیناً" کسی ناآشنا کا تھا۔ ایک الجھن سے نکل کر وہ دوسری الجھن میں گرفتار ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

تمہاری جلد بازی نے بگاڑا کام کو ورنہ
ذرا جو تم ٹھہر جاتے محبت میں ۔۔۔ مگر کیسے؟
اسے احساس تو ہوتا اگر تم شرطِ الفت میں
کوئی ایک عذر بھی لاتے محبت میں ... مگر کیسے
مزہ تم کو سکھاتے تمہاری بے وفائی کا
تمہیں ہم ایسے چکراتے محبت میں ۔۔۔ مگر کیسے

"مگر کیسے؟۔۔۔ یہی تو ساری عمر کا رونا رہا ہے کہ۔۔۔ مگر کیسے؟" اس کی خود کلامی جاری تھی کہ موتیا نے عقب سے آ کے اس کی چوری پکڑتے ہوئے لقمہ دیا۔ اس کے سامنے گل ہی خود کو بے حد نارمل ثابت کرتا اور کچھ دیر قبل گل کا مقدمہ پورے خلوص سے لڑتا عمیص اس وقت ٹوٹا ٹوٹا سا' اسی کے تصور سے گلہ کر رہا تھا۔۔۔ ذرا جو تم ٹھہر جاتے محبت میں مگر کیسے؟

"جتنی ہمت ہو عمیص' بار بھی اتنا ہی اٹھانا چاہیے۔ جب تم میں اتنا حوصلہ نہیں تو اس کام کا ذمہ کیوں لیا' جسے کرتے ہوئے تم خود ڈھے رہے ہو۔ کیا میں نہیں جانتی کہ یہ کرنا تمہارے لیے کتنا دشوار ہو رہا ہو گا۔"

"دشواریاں اور کٹھنائیاں تو محبت کرنے والوں کا مقدر ہیں موتیا۔"

"سب کا تو نہیں ورنہ گل بھی اپنے حصے کی کٹھنائیاں خود سہہ رہی ہوتی' تمہارے شانوں پہ نہ ڈالتی۔ اپنی محبت کے دکھ کیا کم تھے تمہارے پاس' جو اس کے حصے کے بھی اپنے دامن میں بھر لیے ہیں۔"

یہ الزام اس کی ذات پہ دھرتے ہوئے وہ یہ بھول گئی کہ خود اتنے عرصے سے کیا کر رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں موتیا' تمہیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں گل کے موقف کی حمایت کر رہا ہوں۔"

"بات یہ نہیں عمیص۔ اتنا میں بھی مانتی ہوں کہ اسے اس اہم فیصلے کے بارے میں اپنی پسند بتانے کا اختیار حاصل ہے۔ اور یہ بھی کہ ہمارے بڑوں کو انکار کرنے سے پہلے ایک بار سنجیدگی سے اس کی پسند پہ غور ضرور کرنا چاہیے۔ تمہاری یہ بات بھی درست کہ اگر اس کے دل میں تمہارے لیے گنجائش نہیں تو زبردستی کے رشتے میں بندھنا حماقت ہے۔ بلکہ یہ حقیقت تو میں عرصے سے تمہیں سمجھانا چاہتی تھی' تم ہی نجانے کس امید پہ۔۔۔ خیر دیر آید درست آید اعتراض مجھے صرف یہ ہے کہ تمہیں اتنی سنجیدگی سے اس معاملے میں انوالو نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے ہی ابا حضور اور تمہارے ستارے نہیں ملتے اس پہ تم ایک نیا تنازعہ کھڑا کرنا چاہتے ہو۔ اسے اپنا مقدمہ خود لڑنے دو۔ ضرورت پڑنے پہ اس کی حمایت ضرور کی جا سکتی ہے لیکن اسے ایک طرف بٹھا کے تم خود یہ مقدمہ ابا حضور کے سامنے پیش کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔۔۔ اپنی اعلیٰ ظرفی۔۔۔ بلند ہمتی یا پھر۔"

"یا پھر؟" اس نے دریافت کیا۔

"یا پھر تم گل پہ یہ ثابت کرنے کی ایک آخری کوشش کرنا چاہتے ہو کہ تم سے بڑھ کے اس دنیا میں اس کا کوئی اور چاہنے والا نہیں' جو محض اس کی خوشی کی خاطر نہ صرف اپنی خواہش کا گلا گھونٹ سکتا ہے بلکہ خود پر جبر کی انتہا کرتے ہوئے اسے کسی اور کو سونپنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔"

اس کے تلخ دعوے پہ عمیص تلخ مسکراہٹ کے سوا اور کیا جواب دے سکتا تھا۔ لیکن موتیا اس مسکراہٹ کو اس کا جواب سمجھی۔

ہم کو ان سے ہے وفا کی امید
جو نہیں جانتے' وفا کیا ہے

اس نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اس کی حالت پہ تبصرہ کیا۔

جو وہ جفا ہیں تو ہم وفا ہیں
ہر ابتدا کی ہم انتہا ہیں

عمیص نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے سر کی پشت پہ رکھ لیں اور نیم دراز ہو کے آنکھیں موند لیں۔

یہ بت نہیں ہے کہ ٹوٹ جائے
ہمیں نہ چھیڑو کہ ہم انا ہیں

☼ ☼ ☼

"یار کوئی اسپیڈ پکڑ۔۔۔ کوئی رزلٹ دکھا' ہر دوسرے دن ہزار ڈیڑھ لے جاتا ہے۔ ادھر اسپانسر کرنے والے ڈیٹ مانگ رہے ہیں۔ کب تک انتظار کروں۔" ملک مقبول تیسری بار بابر کو دو ہزار دیتے ہوئے سخت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

"رزلٹ تو ملک صاحب جلد ہی آپ کے سامنے ہو گا اور آپ کے حسب منشاء بھی ہم نے اداجی کے وہ سارے شکوک و شبہات دور کر دیے ہیں جس کی وجہ سے وہ آپ کا ایگریمنٹ سائن کرتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ یوں سمجھیے کہ وہ بس تیار ہی ہیں۔۔۔ تقریباً"۔"

اسے تسلی دیتے دیتے بابر ہمایوں مغل کے دل میں نجانے کیا آیا کہ اس نے ذرا توقف کے ساتھ تقریباً" کا اضافہ کیا۔

"یہ تقریباً" کا کیا مطلب ہے؟" وہ چیں بہ جبیں ہوا۔

"بیرون ملک کا معاملہ ہے وہ ذرا اناڑی ہیں اور نا تجربہ کار بھی۔ دوسری بات یہ کہ ذرا مختلف پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ نجانے کیا کیا خدشے لاحق ہیں۔ آپ کے متعلق تو ہم نے انہیں بے فکر کر دیا ہے لیکن وہاں کے ماحول اور تماش بینوں سے خوفزدہ ہیں کہہ رہی تھیں کہ کوئی آشنا اور قابل بھروسہ شخص ساتھ ہو تو وہ چلنے کو تیار ہیں۔"

"ہو سکتا ہے ایسی ہی بات ہو۔ آپ جہاندیدہ شخص ہیں آپ کے اندازے بھلا غلط کب ثابت ہو سکتے ہیں۔" پہلے چاپلوسی کے ذریعے دماغ ٹھنڈا کیا گیا۔

"لیکن جتنا ہم جان پائے ہیں اداجی کو۔۔۔ ہمیں تو ایسے کسی معاملے کے آثار نظر نہیں آتے۔ ہمارا خیال ہے وہ اپنے ساتھ اپنی کسی عزیزہ خاتون یا دوست کو لے جانا چاہیں گی شاید نگاہ جی کو۔۔۔"

اس کے بعد اس کے خدشے کو دور کرتے ہوئے ایک اور خدشے سے چوکنا کیا گیا۔

"بیڑہ غرق۔۔۔ یہ نگاہ تو اسے میرے ہتھے نہیں چڑھنے دے گی۔ میں تو ایڈوانس بھی پکڑ چکا ہوں۔" تیر نشانے پہ لگا۔

"اگر آپ کہیں تو ہم کوشش کریں۔" اس سے اگلے ہی مرحلے میں وہ براہ راست اپنا مدعا بیان کر گیا یہ الگ بات کہ ملک کو سمجھنے میں ذرا وقت لگا۔

"کس بارے میں؟ نگاہ کو بیچ میں سے نکالنے کے لیے؟"

"جی ہرگز نہیں ہم ایسی کوئی کوشش نہیں کریں گے جن سے انہیں کسی قسم کا شک ہو۔ وہ نگاہ جی پہ بلا کا اعتماد کرتی ہیں' ان سے متنفر کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ وہ ہمارے ہی بارے میں کھٹک جائیں۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم اس اعتماد کا سہارا لیں جو وہ کچھ ہی دنوں میں ہم پہ کرنے لگی ہیں۔ ہم ان سے بات کرتے ہیں کہ ہم

ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔"

"تو وہ پوچھے گی نہیں کہ کس رشتے سے؟ تو اس کا ماما لگتا ہے؟" ملک کا تلخ لہجہ اور ناگوار الفاظ بابر نے کسی کڑوے گھونٹ کی طرح پئے اور مسکرایا۔

"ہم یہ ظاہر نہیں کریں گے کہ ہم صرف ان کے لیے جا رہے ہیں۔ کہہ دیں گے کہ ہم بھی اس طائفے میں شامل ہیں۔"

"او ہو مگر کس حیثیت سے؟ اس کے باپ کو تو میں سازندوں کی ٹیم میں شامل کر لوں گا' شکل سے ہی پکا میراثی ہے' طبلچی کی اولاد۔۔۔ مگر تو تو کہیں سے طبلہ بجانے والا یا سارنگی چھیڑنے والا نہیں لگتا نہ ہی گلے میں سر اور لے ہے کہ ایکسٹرا میں ہی شامل کر لوں۔ ایسے بھرتی نہیں ہوتی' ویزا دینے والے سو سو سوال کرتے ہیں۔"

"مگر ہم شکل سے منیجر یا سیکرٹری تو لگ سکتے ہیں ناں ملک صاحب اب کسی نہ کسی طرح ہمیں اس ٹیم میں ایڈجسٹ کرنا آپ کا کام ہے اور ایک ہفتے کے اندر اندر ایگریمنٹ پہ ادا جی کے دستخط کرانا ہمارا کام۔" اس نے کھل کے اپنی شرط بیان کر دی۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد ملک مقبول نے رضامندی ظاہر کر دی۔

"ٹھیک ہے مگر وہاں جا کے ہڑ حرامی نہیں چلے گی۔ ادا کی وجہ سے ساتھ چل رہے ہو تو وہاں پہ اسے ہینڈل کرنے کی ذمہ داری بھی تمہاری' یہ نہ ہو کہ وہاں پہ چھمک چھلو کے پر پرزے نکل آئیں اور مین میخ نکالنے لگے میرے سارے بنے بنائے پروگراموں میں' اور دوسری بات' اب یہ ہزار ہزار کی عیدیاں ہر دوسرے دن نہیں دوں گا۔ تمہیں ساتھ لے جانے پہ کم خرچہ نہیں ہو گا یعنی تمہارے کام سے زیادہ ہی تمہارا معاوضہ بن رہا ہے۔"

"منظور ہے جناب بسرو چشم منظور ہے۔" اس نے بخوشی یہ شرط بھی مان لی۔ جب سامنے بڑے بڑے فائدے نظر آ رہے ہوں تو چھوٹے چھوٹے نقصانات کی کیا پرواہ۔

یونہی بیٹھے بٹھائے ذہن میں آئے اس خیال کو اس نے شاطرانہ طریقے سے منٹوں میں ایک پلان کی شکل دے ڈالی تھی۔ اب اس کے سامنے ایک واضح رستہ تھا جو دو سمتوں کی جانب مڑتا تھا۔ جس سمت وہ جانا چاہتا تھا' وہاں تو اس کے وارے نیارے تھے ہی' بالفرض تیر نشانے پہ نہ بیٹھتا تب بھی دوسری سمت تو تھی ہی یعنی بیرون ملک سیٹل ہونے کا چانس تو پھر بھی ہاتھ میں تھا۔ گر پہلی چال ناکام ہو جاتی تب بھی اس کا ارادہ واپس پاکستان لوٹنے کا نہ تھا۔ لیکن یہ بعد کی باتیں تھیں' فی الحال اس نے دل جمعی کے ساتھ اپنے پہلے پلان کی نوک پلک سنوارنے کا ارادہ کیا۔

☆ ☆ ☆

"آج آپ بہت جلدی گھر لوٹ آئے؟"

اسے خلاف معمول اور خلاف توقع سر شام ہی گھر پہ موجود دیکھ کے صاحبزادی یاسمین خود کو سوال کرنے سے روک نہ پائیں۔

"اگر حضور کو اعتراض ہے تو حکم دیجئے' واپس چلے جاتے ہیں۔" ایک اور خلاف توقع بات وہ مزید حیران ہوئیں کہ ان کے سوال کے جواب میں سیخ پا ہو کے کوئی تلخ بات کہنے کی بجائے آج بابر صاحب اتنے ہلکے پھلکے انداز میں کیسے بات کر رہے ہیں۔ حیرت اتنی شدید تھی کہ وہ چپ ہی کر گئیں۔ دل میں ڈر سا تھا کہ شاید یہ شگفتہ مزاجی بھی کہیں طنز کی کوئی شکل نہ ہو۔

"بچے کہاں ہیں؟" ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا گیا۔

"اقدس اور نایاب تو اس وقت برابر کی ثریا آپا کی بڑی بیٹی سے حساب پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ باقی کے مضامین ہم گھر پہ ہی پڑھا دیا کرتے ہیں۔ جبکہ شمشیر میاں کو ہم نے موڑ تک بھیجا تھا سبزی لانے کے لیے۔"

"ہوں اور دلکش غالباً" ابھی تک اپنے ننھیال میں ہے۔" سرسری سے اور بے تاثر لہجے میں کیے گئے اس تبصرے سے یاسمین کو اندازہ نہ ہوا کہ یہ اعتراض تھا یا کچھ اور۔ پھر بھی انہوں نے وضاحت ضروری سمجھی۔

"آ جائیں گی ایک دو روز میں وہ۔ دراصل ہم وہاں رہے تو انہیں صاحبزادی الماس خاتون کی دیکھا دیکھی کڑھائی

کا شوق جاگا۔ ہم نے سوچا اسی بہانے کچھ سلیقہ سیکھ لیں گی۔ آپ کہیں تو ہم کل ہی پیغام بھجوا کر بلوا لیں۔"

عمیص کے کہنے کے عین مطابق وہ ابھی بابر پہ یہ ظاہر نہ کرنا چاہتی تھیں کہ وہ امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں وہاں رہ رہی ہے اور وہیں رہ کے پرچے دینے کے بعد آئے گی۔

"نہیں کوئی بات نہیں' رہنے دیجئے' بچیاں ننھیال میں رہا ہی کرتی ہیں اس میں کیا حرج ہے۔"

آج تو حیرت کے جھٹکے اتنے شدید اور پے در پے تھے کہ یاسمین سے سنبھلنا محال ہو گیا۔

"بلکہ ہو سکتا ہے۔" اس نے کھنکھار کے تمہید باندھی۔ جو وہ کرنے جا رہا تھا اس کے لیے بیوی کو آہستہ آہستہ ذہنی طور پہ تیار کرنا ضروری تھا۔

"آپ کو کچھ عرصے کے لیے وہاں ہی رہنا پڑے۔"

"خدانخواستہ۔۔۔ ایسا کیوں؟" وہ پل بھر میں ہزاروں اندیشوں میں گھر گئیں اور سہم کے شوہر کے پرسکون چہرے کو دیکھنے لگیں کہ نجانے اب کیا ستم ٹوٹنے والا ہے۔

"ہمارے روزگار کا ایک بہت اہم اور سنہری موقع ہاتھ لگا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہمیں بیرون ملک جانا پڑے گا۔ بہت باعزت ملازمت ہے۔ آمدنی بھی معقول ہو گی۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے لیکن بیرون ملک؟"

"ہم بھی اسی تذبذب کا شکار تھے' آپ ہیں' تینوں چھوٹے لڑکے اور سب سے بڑھ کے دلکش۔۔۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ ہمارے بعد کم از کم بچوں کے ماموں اور نانا توان کے سر پر ہوں گے۔ اگر آپ وہاں جانے پہ رضامند ہوں گی تو ہم ملازمت پہ جا سکیں گے بصورت دیگر انکار کرنا پڑے گا۔ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا جس کے لیے برسوں انتظار کیا ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ ہم لاکھ برے سہی۔۔۔ اتنے خود غرض نہیں کہ بیوی بچوں کو حالات کے تھپیڑے کھانے کے لیے بے آسرا چھوڑ کے خود پردیس چلے جائیں۔"

یاسمین آخر کیا تھی' ایک سیدھی سادی عورت ایک مشرقی بیوی پل بھر میں ساری خطائیں معاف کر دینے والی۔ ایک نرم بول کے بدلے پچھلے سارے زہر بھول جانے والی جس طرح وہ آج آپ' آپ کر کے میٹھی باتیں کر رہا تھا' وہ اس کی کڑوی زبان کی ساری گالم گلوچ فراموش کر گئی۔

"نہیں' نہیں۔۔۔ خدا خدا کر کے یہ سبیل نکلی ہے۔ آپ ہماری وجہ سے مستقبل کی یہ سنہری امید ختم نہ کیجئے۔ ہمیں بھلا میکے میں رہنے سے کیا اعتراض ہو گا۔ کون سا خدانخواستہ وہاں مستقل رہنے جانا ہو گا۔ آپ کے اندیشے بجا ہیں۔ جوان بیٹی کو بنا سرپرست کے چھوڑنا عاقبت نااندیشی ہے۔ آپ بے فکر ہو کے سارے انتظامات نمٹائیے ہماری فکر مت کیجئے۔"

"سارے انتظامات؟۔۔۔ ہاں ان کے بارے میں بھی سوچنا پڑے گا۔ بس بال بچوں کی فکر سے اطمینان ہو تو دوسری جانب بھی دھیان دیں' حالانکہ یہ مسئلہ کہیں زیادہ اہم ہے۔" اس نے چہرے پہ زمانے بھر کی پریشانیاں اور فکریں طاری کر لیں تو یاسمین بھلا فکرمند کیوں نہ ہوتیں۔

"کیسے مسائل؟"

"ظاہر ہے ملازمت دینے والے ملازمت دے رہے ہیں' کام کے بعد معاوضہ بھی دیں گے لیکن وہاں جانے کا انتظام کرنا تو ہمارا درد سر ہے۔ بس چند ہی روز کی مہلت ہے اگر ہم کچھ کر پائے تو سمجھو سارے دلدر دور ہو گئے ورنہ یہ موقع کسی اور کے ہاتھ جا لگے گا اور ہم' ہم پھر بیروزگاری کی اسی دلدل میں پھر سے وہی ذلت اور بے غیرتی کی زندگی' جس سے چھٹکارا پانے کے لیے ہمیں مجبوراً" نشے کا سہارا لینا پڑتا ہے ورنہ۔۔۔"

"ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں آپ؟" اس کا دل خود بخود پسیجا جا رہا تھا۔ "ہم نے منت مان رکھی تھی' اسی کا اعجاز ہے اور ہمیں اللہ سے پوری امید ہے اس بار آپ ناامید نہیں رہیں گے۔"

"کرائے سرا ابھی تو ہاتھ لگے کسی جانب سے اگر امداد ہو تو۔۔۔"

"تقریباً" کتنی رقم چاہیے ہوگی اندازاً"۔"

"ویزا تو وہ لگوا دیں گے بس ٹکٹ کے پیسے چاہئیں۔" اس نے اتنا ہی منہ کھولا جتنا ملنے کی توقع ہو۔ جانتا تھا سسرال میں بھی بس وضع داری اور بھرم ہی بھرم ہے لاکھوں کی توقع رکھنا فضول تھا۔ یوں تو باہر جانے کے لیے اسے ایک روپے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ ملک مقبول اپنے خرچے پہ لے جا رہا تھا۔ یہ رقم تو اسے کسی اور مقصد کے لیے چاہیے تھی۔

"ہمارے پاس تو بہت معمولی سا زیور رہ گیا ہے وہ بھی دلکش بیٹی کے لیے سنبھال رکھا ہے' پھر بھی اگر ضرورت پڑی تو ہم دے سکتے ہیں۔ پتہ نہیں دو تین تولے سونے سے آپ کا مقصد حل ہوتا ہے یا نہیں لیکن ہمیں امید ہے آپ محنت کر کے چند ہی سالوں میں اس سے دگنا اپنی صاحبزادی کے لیے بنوا سکتے ہیں اور جو کسر رہ گئی وہ ہم چچا حضور سے کہہ کے پوری کروا دیں گے۔"

"آپ بہت اچھی ہیں یاسمین۔ آپ نے تو ہماری ساری فکریں ختم کر کے ہمیں ایک دم ہلکا پھلکا کر دیا ہے۔" وہ طمانیت سے مسکرایا۔ ہاتھ میں رقم آنے کی امید بندھنے کے بعد اب وہ اپنے پلان کو زیادہ جلدی پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کے کہنے پہ ہم نے آپا حضور سے ذکر تو کر دیا لیکن اس روز آپ ہی کی کہی باتیں اب تک ہمیں الجھا رہی ہیں۔"

صاحبزادی حرمت النساء بہت سی ہمتیں مجتمع کرنے کے بعد نواب صاحب کے پاس آئیں۔

"کونسی باتیں؟"

"یہی کہ صاحبزادی گل مہر اور صاحبزادہ عمیص کے جوڑ پہ آپ دل سے مطمئن نہیں۔ آپ نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا' وہ اس وقت ہم نے ضرور جھٹلا دیے لیکن اب سچ لگ رہے ہیں یعنی کہ صاحبزادہ عمیص ہماری صاحب زادی کے لیے مناسب ضرور ہیں لیکن گل مہر کے مزاج کے لحاظ سے ذرا نرم خو ثابت ہوں گے جبکہ ان کے غیر لچک دار مزاج اور ضدی پن کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا شخص ان کا ساتھی بنے جو ان کی فطرت کے ہٹیلے پن کو اپنی سخت اور اصول پرستی کی وجہ سے قابو کر سکے۔ عمیص میاں میں لاکھوں خوبیاں سہی لیکن بس ایک یہی نہیں ہے۔"

"ہاں آپ کا کہنا درست' لیکن جس طرح آپ کو آج ہماری بات دل کو لگ رہی ہے' اسی طرح ہمیں بھی آپ کی باتیں پسند آئی تھیں کہ عمیص میاں کی نرمی بھی گل کے حق میں بہتر ثابت ہوگی۔"

"جی۔۔۔ لیکن۔۔۔" یہ بہانہ خالی جاتے دیکھ کر وہ گڑبڑا گئیں۔ اس کے علاوہ اس رشتے سے ان کا دھیان ہٹانے کا کوئی اور بہانہ فی الحال انہیں نہ مل رہا تھا۔

"لیکن کیا؟"

"ہم بہتر سے بہترین کی تلاش بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"صرف اتنا کہ اگر عمیص میاں سے نسبتاً "بہتر" ایسا رشتہ ہو جو ہماری صاحبزادی کے حق میں اچھا ثابت ہو تو اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

"دیکھیے حرمت النساء بیگم' پہلی بات تو یہ کہ ہم صاحبزادی یاسمین کے بارے میں ہی ایک غلط فیصلہ کر کے اب تک سنبھل نہیں پائے۔ اپنی جانب سے تو بخدا ہم نے پوری چھان پھٹک کی تھی پھر نجانے کہاں چوک ہوئی اس لیے اب جب گھر کی بات گھر میں نبھ رہی ہے تو پھر ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جو ہمیشہ اپنی مردم شناسی اور جہاں دیدگی پہ نازاں رہے ہیں اب خود اپنے آپ پہ سے اعتماد کھو چکے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے

کہ اب بات زبان سے نکل چکی ہے۔ ہم آپا حضور کو امید دلا چکے ہیں ایسے میں۔۔۔ ایک بات تو بتائیے' آپ کو تو عمیص میاں آپا حضور سے کہیں بڑھ کے عزیز رہے ہیں پھر ایسا خیال آپ کے دل میں آیا کیوں کر؟"

"وہ ہمیں اب بھی کم عزیز نہیں ہیں۔ دوہرے رشتے ہیں ان سے لیکن ایسے معاملات میں دلی وابستگی سے زیادہ اولاد کی حقیقی خوشیاں اور ان کا مفاد زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب ہے صاحبزادی گل سے عمیص میاں کی یا پھر عمیص میاں سے ہماری صاحبزادی کی حقیقی خوشیاں وابستہ نہیں ہیں۔" تیوری پیشانی پہ سجا کے انہوں نے چبھتا ہوا سوال کیا جس کا جواب دینا ان کے لیے مشکل سہی مگر ضروری تھا۔ دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

"صاحبزادی گل مہر کو اعتراض ہے کہ۔۔۔"

"اعتراض۔۔۔ ایک اور اعتراض۔۔۔ یا پھر ایک اور بغاوت؟" ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ اسے بغاوت کہیے یا سرکشی۔" بالآخر صاحبزادی حرمت النساء نے صاف صاف بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ دل سے تو وہ بھی گل کے اس فیصلے پہ نالاں تھیں۔ ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کے ہمیشہ اس کی سرکشی اور من مانی پہ پردے ڈالتی اور وضاحتیں کرتی آئی تھیں لیکن اب کہہ ڈالا۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ ہمیشہ سے ہر معاملے میں فقط اپنی رائے اور اپنے نظریے کو اہمیت دیتی ہیں۔ اپنی ذات سے متعلقہ فیصلے خود کرنا پسند کرتی ہیں اور۔۔۔"

"آپ ہمیں ان کی خصوصیات سے آگاہ مت کیجئے جن سے ہم پہلے سے واقف ہیں۔" ایک بار پھر انہوں نے بات کاٹی۔ لہجے سے ہیجان واضح تھا جیسے وہ پہلے سے بھانپ گئے ہوں کہ کیا انکشاف ہونے جا رہا ہے۔

"فقط اتنا بتلایئے کہ اس بار انہوں نے کیا حربہ آزمایا ہے ہمیں زچ کرنے کا۔"

"ایسی بات نہیں یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ بات آپ کے لیے دھچکے کا باعث بنے گی لیکن انہوں نے محض آپ کو آزار پہنچانے کی خاطر ایسا نہیں کیا ان کا کہنا ہے کہ عمیص میاں سے ان کا جوڑ مناسب نہیں۔"

"بہت خوب گویا وہ فہم و فراست میں اب اپنے بزرگوں سے بھی آگے نکل گئیں۔" انہوں نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"اور اس کے علاوہ۔۔۔" وہ ہچکچائیں۔

"ایک بات اور بھی ہے۔" ان کے لہجے میں نجانے کیا ایسی غیر معمولی بات تھی کہ صاحبزادہ نفیس علی خان چوکنے ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"تو آپ نے کیا فیصلہ کیا اداجی۔" ایک بار پھر بابر ہمایوں مغل دعا کے روبرو تھا۔

"فیصلہ تو ہو چکا مغل صاحب میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔"

"اب آپ نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آپ کی تسلی کے لیے ہم مزید عرض کر دیں کہ ہم بھی اس ٹور پہ آپ کے ہمراہ ہوں گے۔"

"یہ خوش خبری آپ اتنی دیر سے سنا رہے ہیں۔ اگر پہلے بتا دیتے تو شاید میں کب کا یہ فیصلہ کر چکی ہوتی۔" اس کے بے ساختہ خوشی اور اپنائیت کے اظہار پہ بابر کو منزل اور بھی قریب محسوس ہونے لگی۔

"پتہ نہیں آپ اعتبار کریں یا نہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو متذبذب دیکھ کے ہی ہم نے ملک مقبول کی اس پیش کش پہ ہامی بھری ورنہ اس سے پہلے بھی وہ ہمیں کئی بار ساتھ چلنے کی آفر کر چکے ہیں لیکن ہم ٹھہرے آزاد منش پنچھی۔۔۔ کسی کا پابند ہو کے چار دن رہنا گوارا نہیں۔۔۔ کجا کہ پندرہ بیس روز۔"

"یہ تو آپ کی مہربانی ہے لیکن آپ کس حیثیت سے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ وہاں کریں گے کیا؟"

"آپ کا دل بہلائے رکھیں گے۔" وہ ہنسا۔
"خیر یہ تو مذاق کی بات ہے۔ ملک مقبول اپنے منیجر کی حیثیت سے ہمیں لے جا رہے ہیں اور ہمیں بے شک کسی کا ماتحت بن کے رہنا گوارا نہیں لیکن صرف اور صرف آپ کے لیے ادا جی' ہم یہ بھی کر گزرے تاکہ اگر آپ کو کوئی دھڑکا ہے بھی۔ یا خدانخواستہ واقعی وہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ جاتا ہے تو ہم آپ کے آس پاس موجود رہیں۔ آپ کی تسلی کے لیے آپ کی ڈھارس بندھائے رکھنے کی خاطر اور آپ کے تحفظ کی خاطر۔"
دعا کتنی ہی دیر ڈبڈبائی ہوئی مشکور نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔
"کیا ہوا؟ کیا آپ کو یقین نہیں آ رہا ہماری بات کا؟"
"یقین آپ کی باتوں پہ تو ہے مغل صاحب' لیکن اپنی قسمت پہ نہیں آ رہا۔ بھلا میرے لیے۔۔۔ مجھ جیسی لڑکی کے لیے بھی کوئی ایسا کر سکتا ہے؟ صرف اور صرف میری ڈھارس بندھانے کی خاطر کوئی اتنی دور تک جا سکتا ہے' صرف اور صرف مجھے تحفظ دینے کی خاطر۔"
"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں خود کو عام مت جانیے ادا جی آپ نہیں جانتیں آپ کس قدر خاص ہیں بلکہ ہمارے لیے تو خاص الخاص ہیں۔" اس واضح اظہار پہ دعا ٹھٹکی بابر نے مزید پیش قدمی کی۔
"آپ کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کا جذبہ رکھتے ہیں ہم۔ کیا ہمیں اس کی اجازت ہے؟"
اس عجیب و غریب سوال پہ دعا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ فی الحال تو وہ بابر کے بدلے تیوروں سے ہی سنبھل نہ پا رہی تھی۔
"اور کیا ہمیں اس کی بھی اجازت ہے کہ ہم آپ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر سکیں جو آپ کو دیکھتے ہی ہمارے اندر ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہے اور ہم چاہتے ہوئے بھی اس پہ بند نہیں باندھ پائے۔"
"کیسی خواہش؟" اس کے لرزیدہ لبوں سے بے حد مدھم الفاظ ادا ہوئے۔
"آپ کو اپنانے کی خواہش' آپ کا ہو جانے کی خواہش۔"

● ● ●

صاحبزادی حرمت النساء کو اندازہ تھا کہ وہ جو کہنے جا رہی ہیں' ایک طوفان کی آمد کا باعث ہو سکتا ہے۔ بے شک انہوں نے بساط بھر محتاط ترین الفاظ میں یہ بات بتانے کی کوشش کی تھی' اس کے باوجود خود کو ذہنی طور پر تیار رکھا تھا' نواب صاحب کے کسی بھی انتہائی حد تک جاتے شدید رد عمل کے لیے۔ لیکن وہ حیران رہ گئیں اور پھر یک بیک بے انتہا خوفزدہ بھی جب ان کے تمام تر اندازوں اور اندیشوں کے قطعی برعکس نواب صاحب نے ایک گہری چپ سادھ لی۔
"آپ۔۔۔ آپ کچھ کہتے کیوں نہیں؟"
بہت دیر بعد انہوں نے ڈرتے ڈرتے فقط اتنا کہنے کی ہمت کی۔ جواباً انہوں نے ایک ایسی نگاہ اپنی بیگم کے فق چہرے پہ ڈالی کہ وہ اندر تک دہل کے رہ گئیں۔
کیا نہ تھا اس ایک نظر میں۔
بے بسی۔۔۔ لاچاری اور پسپائی کی ہزار داستان۔
شکوے۔۔۔ گلے۔۔۔ شکایتوں کی کہانیاں۔
اپنی ہار کا اعلان کرتی وہ نگاہ زیادہ دیر اٹھی نہ رہ سکی اور اسی بے بسی اور لاچاری کے ساتھ دوبارہ جھک گئی' اور جھکتے جھکتے نواب صاحب کے شانوں پہ نجانے کون سا ان دیکھا بوجھ ڈال گئی کہ ان کے مضبوط و توانا ہاتھ اپنے آبنوسی عصا پہ کانپ سے گئے' دوسرے ہاتھ سے پلنگ کے بڑے سے منقش پائے کا سہارا لیتے ہوئے وہ بیٹھ گئے۔
صاحبزادی حرمت النساء مزید وہاں کھڑی نہ رہ پائیں اور اپنے آنسوؤں سے چھپاتی وہاں سے نکل آئیں۔ راہداری کے دوسرے سرے پہ منتظر اور مضطرب کھڑی موتیا نے ماں کی آنکھوں میں مچلتے آنسو دیکھے اور سب کچھ بغیر جانے جان گئی۔

وہ جان گئی' یہ آنسو اس احساس کے تحت بہے تھے کہ جس شخص کو زندگی بھر خوش اور مطمئن رکھنے کی ہر ممکن سعی کی ہو' اسے ہی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دکھ دینا پڑ رہا ہو جس دکھ میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہ تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ نواب صاحب تک پہنچنے والی ہر تکلیف اور پریشانی اپنے اوپر سہہ لیتیں لیکن ستم تو یہ تھا کہ ایسی خبر ان تک پہنچانے کا فریضہ انہیں خود انجام دینا پڑ رہا تھا۔
جانے کسی چیز کے گرنے اور ٹوٹنے کی زوردار آواز سے وہ بری طرح چونک اٹھی۔ صاحبزادی حرمت النساء کے نکلتے ہی اس نے دلگیر کو ٹرے اٹھائے نواب صاحب کے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ امی حضور کے چہرے کے تاثرات اور آنسوؤں میں اس طرح الجھی کہ دلگیر کو اندر جانے سے روک بھی نہ پائی' ورنہ وہ جانتی تھی اس وقت ابا حضور کو تنہا چھوڑ دینا ہی مناسب ہو گا۔ اب نجانے دلگیر نے اندر جا کے کیا لن ترانیاں چھیڑی ہوں گی کہ ان کے اندر ٹھاٹھیں مارتے بپھرے ہوئے طوفان کو باہر نکلنے کا رستہ مل گیا۔
ادھر کھلے دروازے سے ایک چمچہ اور اسٹیل کا چمکتا ہوا گلاس لڑھک کے باہر تک آیا۔ ایک منٹ کے بعد منہ سوتا دلگیر ٹوٹے ہوئے کپ کی کرچیاں ٹرے میں سمیٹے باہر نکلا۔ وہ اسے کچن کی جانب آنے کا اشارہ کرتی خود بھی وہیں چلی آئی۔
"جو ستم ٹوٹتا ہے اس جان ناتواں پہ ٹوٹتا ہے۔"
اس نے اندر آتے ہی دہائی دی اور اپنی سوکھی چمرخ سانولی سی کلائی آگے کر کے لہرائی' جس پہ باریک لمبی سی خراش کی لکیر صاف نظر آ رہی تھی۔
"بڑے نواب صاحب سے ہمیں ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ بھی اپنی اس کنیز پہ یوں ظلم و ستم کریں گے۔ دیکھیں ناں موتیا بی بی' گھما کے ساری کی ٹرے ہم پہ دے ماری۔ اب بھلا بتاؤ' کوئی بات بھی تو ہو۔ چائے بھی گرما گرم گلاس میں پانی بھی ٹھنڈا تھا۔ برتن بھی صاف ستھرے دھلے ہوئے اور تو اور ہم نے اندر جاتے ہی بلند آواز میں ایک عدد کھنکھتا ہوا' فرشی سلام بھی جھاڑا تھا۔"
"فرشی سلام اور بلند آواز میں؟ وہ تو خاموشی سے بھی جھاڑا جا سکتا تھا۔" موتیا نے اس کا یا شاید اپنا دھیان بانٹنا چاہا۔
"لیجیے' جب خدا نے اتنی مسحور کن آواز سے نوازا ہے تو کیوں نا اس کا استعمال کیا جائے مگر ہائے' ہائے۔۔۔ نہ تھی ہماری قسمت۔۔۔"
"کیوں بھئی' یہ قسمتوں کے رونے کیوں روئے جا رہے ہیں؟" عمیص روز اس وقت اسٹور بند کر کے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے گھر آیا کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی کھا لیتا اور نہا دھو کے فریش بھی ہو جاتا۔
موتیا نے اس کے آتے ہی دلگیر کو پالک اور میتھی دے کر باہر روانہ کیا۔ "باریک کاٹنا' ورنہ ابلنے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔"
اس کے نکلتے ہی اس نے چولہے پہ رکھی دیگچی کے نیچے آگ روشن کی۔ جتنی دیر میں سالن گرم ہوا' وہ وہیں کچن میں رکھی مختصر سی میز پہ پلیٹ' چٹنی' سلاد' پانی کا جگ اور گلاس رکھ چکی تھی۔ سالن پلیٹ میں نکال کر اس نے روٹیوں والے ہاٹ پاٹ کے ساتھ اس کے سامنے رکھا۔ اس دوران عمیص خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا جو بہت کچھ چھپا لینے کی کوشش کرتا ہوا بہت کچھ ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے لاکھ اصرار کے باوجود تب تک کچھ بھی بتانے پہ تیار نہ ہو گی جب تک وہ کھانا نہ کھا لے۔
اس لیے دل میں اس خاموشی اور گھر کے ماحول پہ چھائی دہشت کا راز جان لینے کی بے تابی کو دباتے ہوئے چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ موتیا رخ موڑ کے اب کیتلی میں چائے کا پانی رکھ رہی تھی۔ بے دلی سے چند نوالے حلق سے اتارنے کے بعد مزید صبر سے کام نہ لے سکا اور وجہ پوچھ بیٹھا۔
"وہی ہوا' جو ہونا ہی تھا اور جس کے ہونے کے سب سے زیادہ شائق بھی تم ہی تھے۔" اپنا اور اس کی چائے کا کپ

لے کر سامنے بیٹھتے ہوئے موتیا نے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا گلہ اور واضح ناراضگی تھی۔

"یعنی چچا حضور۔۔۔ تو ان تک معاملہ پہنچ ہی گیا۔" وہ پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگا۔ معاملے کی تہ تک پہنچنے میں اسے ایک منٹ سے بھی کم وقت لگا تھا۔

"ہاں' اور امی حضور کی حالت تو ابا حضور سے بھی زیادہ خراب ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ یہ خبر ان تک پہنچانا امی حضور کے لیے کتنا ناگوار اور تکلیف دہ رہا ہوگا؟"

"ہاں' مجھے اندازہ ہے اسی لیے میں نے انہیں منع کیا تھا کہ میں یہ بات اپنے طریقے سے ان تک پہنچادوں گا لیکن انہوں نے میرا انتظار کرنا گوارا نہ کیا اور خود ہی۔۔۔"

"ہاں تو ایک لحاظ سے ٹھیک ہی کیا۔ ہونہہ تمہارا اپنا طریقہ اچھی طرح جانتی ہوں وہ کیا طریقہ ہوتا۔ ابھی تو صرف برتن ٹوٹے ہیں تم بات کرتے تو شاید سر ٹوٹتا اور وہ بھی تمہارا۔"

"سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے۔"

اس نے مصنوعی بشاشت لہجے میں بھرتے ہوئے نعرہ بلند کیا۔

"ویسے رزلٹ کیسا رہا؟"

"ایک ٹوٹا ہوا کپ' اور دلگیر کے ہاتھ پہ ڈیڑھ انچ لمبا زخم۔" وہ سنجیدگی سے بتا کے خالی برتن سمیٹنے لگی۔

"چچا حضور نے اور کچھ نہیں کہا؟" وہ مسلسل کرید رہا تھا۔

"اور کچھ۔۔۔؟ مسٹر عمیص انہوں نے "کچھ" بھی نہیں کہا۔ ایک لفظ تک نہیں۔ اسی سے اندازہ کرلو کہ ان کا رد عمل کتنا شدید ہوگا۔"

"یہ معاملہ ایسا نہیں موتیا کہ ہم محض اندازوں کے بل بوتے پہ ان کا مدعا بھانپنے کی کوشش کریں۔ ہمیں یہ جاننا ہی ہوگا کہ ان کی رائے کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ جاننے کے لیے ان کا زبان کھولنا ضروری نہیں۔ ان کے کچھ کہے بغیر بھی ہم سب جانتے ہیں ان کی رائے کیا ہے۔"

"یہ رائے بدلی بھی تو جاسکتی ہے۔"

"اور یہ کارنامہ تم انجام دوگے۔" اس کا لہجہ یک بارگی تیز ہوا۔

"عمیص' آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اور تم نے میرے ابا حضور کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ ان کے ہر فیصلے' ہر اصول' ہر رائے کے پیچھے پڑے رہتے ہو' انہیں بھی تم سے ہزاروں اختلافات رہے ہیں لیکن آج تک وہ زور زبردستی کے ذریعے تمہارے فیصلوں کو تبدیل نہیں کرپائے' تم نے ہمیشہ اپنی من مانی کی۔ تم نے بھی اور گل نے بھی اپنے فیصلے کرنے کے لیے تم بے شک آزاد ہو' لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ وہ ان کے اصولوں سے ٹکرانے کے بعد ہی عمل میں لائے جائیں۔"

"اور کیا یہ ضروری ہے موتیا کہ یہ اصول و ضوابط ہماری' ہم جیتے جاگتے انسانوں کی خواہش سے ٹکرا کے ہی وضع میں لائے جائیں۔"

"خواہشوں کے ہاتھوں کم زور لوگ لاچار ہوتے ہیں۔ اس سے بڑی کمزوری اور کیا ہوگی کہ صرف اپنے دل کی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک اور دل کو ٹھیس پہنچائی جائے اور وہ بھی ایسے دل کو جس میں تم لوگوں کے لیے محبت ہی محبت بھری ہو۔" وہ تقریباً" روہانسی ہو رہی تھی۔

"اسی محبت سے شہ پا کے تو میں اتنا دلیر ہو رہا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"میں بھی جانتا ہوں' ان کے سارے کڑے اصول ایک طرف اور اولاد سے ان کی بے پایاں محبت ایک طرف' اگر مجھے اس محبت کے ان کے دل میں ہونے کا اس قدر یقین نہ ہوتا تو میں ایسی حرکت کرتا ہی کیوں؟ جس چیز کا وجود نہ ہو' اسے پیدا کرنے یا ابھارنے کی سعی عبث ہے' لیکن یہ محبت ہے" موتیا۔ چچا حضور کے اصول پرست دل

میں یہ نرم و نازک جذبہ اب بھی موجود ہے' جسے میں جگائے رکھتا ہوں۔"

اس کے اتنا کہنے پہ موتیا اور کچھ نہ کہہ سکی۔ جانتی تھی وہ عمیص کو ابا حضور سے یہ بات کرنے سے کبھی نہ روک سکے گی۔

"میں پہلے چچی حضور سے مل لیتا ہوں۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

صاحبزادی حرمت النساء نے بھی اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں فی الحال یہ تنازعہ چھیڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"ہم ان کی خاموشی سے خوفزدہ ہیں۔ اتنی بڑی بات پہ ان کا رد عمل غیر فطری اور خلاف توقع ہے۔ ہم ان کی جانب سے سخت فکرمند ہیں۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں چچی حضور کہ وہ کسی بھی طرح اپنا رد عمل تو ظاہر کریں۔ یہ خاموشی ان کے اعصاب کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اسی لیے میں ان سے کھل کے بات کرنا چاہتا ہوں' ہر چیز واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے اگر میری ذات بھی زیر عتاب آتی ہے تو پرواہ نہیں۔ چلیں' مجھ پہ گرج برس کے ہی اگر ان کے دل کی بھڑاس نکلتی ہے تو یونہی سہی۔"

"پتا نہیں تم کیا سچ کہہ رہے ہو اور کیا جھوٹ۔" موتیا اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں بولی۔

"پتا نہیں واقعی تم اپنے چچا حضور کے دل کی بھڑاس نکالنے' انہیں پرسکون کرنے کے لیے زیر عتاب آنا ہنسی خوشی منظور کررہے ہو' یا پھر یہ گل کے عشق کا اعجاز ہے کہ جو تمہیں ہر حد سے گزرنے کا حوصلہ دے جاتا ہے۔۔۔ پتا نہیں۔"

☼ ☼ ☼

"یہ تھے وہ خدشات عمیص میاں' جنہیں آپ نے بڑی ہی بے فکری کے ساتھ بے معنی قرار دے کر جھٹلایا تھا۔ یہ تھے وہ خطرناک نتائج جن کی نشاندہی ہم نے اس وقت کی تھی اور آپ نے پورے وثوق کے ساتھ ان کی تردید کی تھی۔ اب آپ اپنی کوتاہی تسلیم کر بھی لیں تو کیا ہوگا' ہمارے خاندان کو لگا یہ داغ دھل تو نہیں سکتا۔"

یہ تھے وہ پہلے الفاظ جو صاحبزادہ نفیس علی خان نے اٹھارہ گھنٹوں کی طویل خاموشی کے بعد عمیص کو دیکھ کر کہے۔

"اطمینان رکھیے' چچا حضور۔۔۔ ہمارے خاندان کو ابھی بھی کوئی داغ نہیں لگا اور نہ ہی انشاء اللہ تعالیٰ کبھی لگ پائے گا۔"

"ہم طفل تسلیوں سے بہلنے والے نہیں ہیں صاحبزادہ عمیص' ابھی ابھی آپ کی چچی حضور نے ہم پہ جو انکشاف کیا ہے' وہ ہمارے اعتماد کی بنیادیں ہلانے کے لیے کافی ہے۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ یہ بات آپ کے لیے تکلیف اور دھچکے کا باعث بنی ہوگی لیکن اس اچانک دھچکے سے ذرا باہر نکل کے حقیقت پسندی اور انصاف سے کام لیتے ہوئے سوچیے چچا حضور کہ گل نے کوئی غیر معمولی بات نہیں کی نہ ہی کوئی نامناسب قدم اٹھایا ہے۔ اپنے شرعی حق کا بالکل جائز استعمال کیا ہے۔ پلیز چچا حضور' اس کے اس حق کو تسلیم کیجیے۔"

"والدین کے اعتماد کے پرخچے اڑا دینے کا حق کب سے ملنے لگا ہے عمیص میاں؟"

"گل کو اپنی روایات کی پاسداری کا اتنا ہی خیال ہے جتنا آپ کو۔ اس نے آپ کے اعتماد کو بالکل بھی دھوکا نہیں دیا بلکہ آپ کی شفقت پہ مکمل اعتماد کرتے ہوئے اپنی خواہش بیان کی ہے۔ سب اختیار آپ کو سونپے ہیں کہ آپ اپنی جہاں دیدگی سے کام لیتے ہوئے اس کے لیے بہتر فیصلہ کریں گے۔"

"ہم نے تو اپنی جانب سے اس کے لیے بہتر فیصلہ ہی کیا تھا۔" انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر سر جھکائے سامنے کھڑے عمیص پہ ڈالی۔

"مگر انہیں تبھی بھی ہمارے کسی فیصلے پہ بہتر ہونے کا گمان نہیں گزرا' یہ بھی آپ کی خام خیالی ہے کہ وہ ہمیں

تمام اختیارات سونپ رہی ہیں۔ ایسا ہی ہے تو ہم ابھی۔۔۔ اسی وقت واضح انکار کرتے ہیں۔ تو کیا تب وہ راضی خوشی اپنی خواہش سے دست بردار ہو جائیں گی۔ ہمارے اختیار کو تسلیم کر لیں گی۔"

انہوں نے وہی سوال اٹھایا جو صاحبزادی خلعت النساء نے اٹھایا تھا۔

"گستاخی معاف چچا حضور' یہاں آپ اپنے اختیار کا نہیں' طاقت کا استعمال کریں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ کم از کم ایک بار ان لوگوں سے مل تو لیں' ان صاحب کو جانچ پرکھ تو لیں' ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے معیار پہ پورا اتریں۔"

"لیکن۔۔۔۔ غیر اور اجنبی لوگ جن کے بارے میں ہم یہ تک نہیں جانتے کہ ان کا نسب کیا ہے' شجرہ کیا ہے۔ کیسے انہیں اپنی دہلیز تک آنے دیں۔" وہ واضح طور پہ متذبذب تھے۔

"جاننے کی کوشش کیے بغیر کسی کو کیسے جانا جا سکتا ہے۔ یہ کوشش آپ پہلے بھی تو کر چکے ہیں۔ یاسمین آپا کے لیے آپ نے اپنی ٹکر کا شجرہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ ہو سکتا ہے ان نئے آنے والے مہمانوں کا حسب نسب بھی آپ کو مطمئن کر دے۔ ہو سکتا ہے ناں۔"

"اور اگر۔۔۔"

"تو پھر اختیار استعمال کرنے کا حق تو آپ کے پاس ہے ہی۔"

"پتا نہیں کیا بات ہے **عمیص** میاں۔" ہارے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے نواب صاحب نے تھکن سے آنکھیں موندیں۔

"کہ ہم ہمیشہ آپ کی ضد کے آگے ہار جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی دلیل پہ ہمارا دل راضی نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ہم مان جاتے ہیں۔ آپ تو اسے ہماری پسپائی ہی سمجھتے ہوں گے۔"

"نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں یہ آپ کی محبت ہے چچا حضور۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان کے شانوں پہ اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا۔ وہ ان کی کرسی کی پشت پہ کھڑا تھا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان کے تنے تنے اعصاب پر سکون سے ہونے لگے۔

☼ ☼ ☼

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ بابر صاحب۔۔۔۔" وہ ششدر رہ گئی۔ بابر ہمایوں مغل جو کہہ رہا تھا۔ اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ اس کے بارے میں تو دعا نے کبھی مذاق میں بھی نہ سوچا تھا۔

"آپ جانتے بھی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اگر ہماری یہ جسارت آپ کو گراں گزری ہو ادا جی' تو ہم دل سے معذرت خواہ ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم خود کو آپ کی خواہش کرنے سے روک نہیں پا رہے۔ آپ کی طلب سے یہ دل دست بردار ہونے کو تیار ہی نہیں۔"

"بابر صاحب' میں آپ کو ایک ہمدرد انسان اور مخلص دوست سمجھی تھی اور آپ ہیں کہ۔۔۔" وہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ بابر ہمایوں سے کھل کے ناگواری اور خفگی کا اظہار کرے یا نہیں۔ اس کی اپنی کیفیت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ بابر کا اظہار محبت اچانک بھی تھا۔ غیر متوقع بھی اور ناقابل قبول بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ سخت رویہ اپنا سکی نہ ہی سخت لہجہ۔

"کیا ایک ہمدرد انسان محبت نہیں کر سکتا ادا جی۔ یا پھر مخلص دوست کسی کے عشق میں مبتلا نہیں ہو سکتا' یہ کہاں لکھا ہے؟"

"لیکن۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ ایک شادی شدہ انسان ہیں؟" اس نے یاد دلانا چاہا۔

"ہاں تو کیا شادی شدہ انسان بھی محبت سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے؟" وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ دعا زچ ہو کے کہہ اٹھی۔

"یہ بالکل بھی مناسب بات نہیں ہے بابر صاحب۔ میں آپ سے اس کی بالکل بھی توقع نہیں کر رہی تھی۔"

"توقع تو ہمیں بھی نہیں تھی ادا جی کہ یوں بے توقیر ہو کے اپنے دل کا حال کھولنا پڑے گا۔ لیکن کیا کریں ہم خود کو کہنے سے روک نہیں پائے' بالکل ویسے ہی جیسے آپ سے محبت کرنے سے نہیں روک پائے۔"

"لیکن بابر صاحب' مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے ان جذبات کی پذیرائی نہیں کر سکتی۔"

"آپ انہیں سچ تو مان سکتی ہیں ناں۔ کم از کم اتنا ہی کر لیں۔"

"لیکن۔۔۔" وہ متذبذب تھی۔

"آپ۔۔۔ اگر آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہو گا لیکن۔۔۔" بابر کے سامنے **موت** برتنے پہ وہ مجبور تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی تسلیم کر گئی۔

"بس۔۔۔ بس ادا جی۔۔۔ ہمارے دل کی تسلی کو اتنا ہی بہت ہے کہ آپ نے ہماری محبت کو سچ تو مان لیا۔ اب یہ بھی مان لیجئے کہ محبت کو تسلیم کرنے کے بعد اگلا قدم۔۔۔۔"

"پلیز بابر صاحب میں کوئی اگلا قدم نہیں اٹھانا چاہتی۔" دعا نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

"لیکن ہمارا کیا ہو گا۔ ہم تو بہت دور تک آ چکے ہیں۔"

"پتا نہیں آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی دو تین دن تک تو آپ بالکل ٹھیک تھے۔" وہ الجھ گئی۔ اب اسے کیا پتا تھا کہ ان دو تین دنوں میں ملک مقبول سے ہونے والی ملاقات اس کے دل و دماغ میں کیا کیا بساطیں بچھا گئی تھیں۔

"محبت تو ہمیں آپ سے پہلی ہی نظر میں ہو گئی تھی ادا جی اور ہم نے اسی محبت کو بڑی وضعداری سے دل میں چھپا کے آپ سے صرف اور صرف خلوص اور دوستی کا رشتہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا' اس فیصلے پہ ہم کتنا ہی عرصہ قائم بھی رہے۔ خود ساختہ پابندی ہم نے اپنے آپ سے ہٹائی ہے تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے نہیں بلکہ صرف اور صرف آپ کے لیے۔ آپ کو تحفظ کا احساس دلانے کے لیے۔ آپ کا اکیلا پن دور کرنے کے لیے۔ جب سے آپ کو قریب سے جاننے لگے ہیں اور خصوصاً" آپ کے گھر آنا جانا ہوا ہے تب سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ آپ کتنے خطرات میں گھری ہوئی ہیں۔"

"خطرات۔۔۔۔ کیسے خطرات؟" وہ چونکی۔

"انجان مت بنیے ادا جی۔ ہم جانتے ہیں آپ شوق کے ہاتھوں نہیں بلکہ مجبوری سے اس لائن میں موجود ہیں۔ ہم یہ مشورہ تو نہیں دیں گے کہ آپ یہ لائن چھوڑ دیں کم از کم تب تک تو نہیں جب تک آپ تنہا ہیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ اور کئی راستے ہیں جن پہ آپ کو چلنے کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے اور ان راستوں سے یہ راستہ ہزار درجہ بہتر ہے۔ لیکن ایک صورت ہے کہ آپ اپنی مرضی سے اور اپنی پسند کی زندگی باعزت طریقے سے گزار سکتی ہیں اور وہ صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا شخص آپ کی زندگی میں شامل ہو' جسے نہ آپ کی شہرت سے سروکار ہو نہ آپ کے فن سے کوئی واسطہ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دل سے آپ کا اتنا طلب گار ہو' اپنے عشق میں اتنا سچا ہو کہ آپ کو زمانے بھر سے بچا کے۔۔۔ چھپا کے رکھ سکتا ہو۔ اور یہ حوصلہ ہم میں ہے ادا جی۔"

اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ کتنی ہی دیر دعا کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کی خاموشی سے شہ پا کے بابر مزید گویا ہوا۔

"ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ آپ سوچ لیجئے۔ اچھی طرح غور کر لیجئے۔ ابھی تو ٹور پہ جانے میں بھی کئی دن رہتے ہیں۔ یوں تو ہم آپ کے ساتھ آپ ہی کی خاطر جا رہے ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ایک مضبوط حیثیت اور حوالے سے آپ کے ہمراہ ہوں۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ کوئی آپ کی جانب ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھ سکے۔ آپ جتنے دن چاہیں' لے سکتی ہیں سوچنے کے لیے۔ ہمیں جلدی بے شک کوئی نہیں لیکن دھیان رکھیے گا' اتنی دیر بھی نہ کہ۔۔۔ دیر ہی ہو جائے۔"

وہ دعا کو سوچ میں چھوڑ کے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"سنیے! اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا ہم کل چچا حضور کے ہاں ہو آئیں۔" پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ یاسمین کو شوہر سے میکے جانے کی اجازت لینے کے لیے زیادہ جھجکاہٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ پچھلے دو چار روز سے حیرت انگیز طور پہ بابر ہمایوں مغل کا مزاج ٹھکانے پہ تھا۔ بچوں کے ساتھ ساتھ بیوی سے بھی خاصے خوشگوار انداز میں بات چیت کی جا رہی تھی۔ پچھلی تین راتیں بھی خلاف معمول گھر پر ہی گزاری گئی تھیں۔ اسی لیے یاسمین کی ہمت بندھی اور اس نے بغیر ڈرے یا جھجکتے اپنا مدعا بیان کیا۔

"کل۔۔۔؟ کہیں آپ کا وہاں کچھ روز قیام کا ارادہ تو نہیں؟"

"کچھ روز تو نہیں البتہ ایک رات کے بارے میں ضرور سوچا تھا۔ پرسوں اتوار ہے۔ بچوں کو اسکول سے چھٹی ہو گی اس لیے سوچا تھا کہ۔۔۔ لیکن اگر آپ کو پسند نہیں تو ہم کل شام کو ہی واپس آجائیں گے۔"

"پسند کی بات نہیں ہمیں کیا اعتراض ہو گا۔ بچے اور کہیں آتے جاتے ہی کب ہیں۔ ایک ہی تو گھر ہے' ددھیال تو تقریباً "نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب اگر ہم آپ کے میکے آنے جانے پہ بھی بندش لگانے لگیں تو آپ کتنی اکیلی ہو جائیں گی۔"

یاسمین کے حافظے میں ابھی تک اس کی ساری بندشیں' اعتراضات اور پابندیاں موجود تھیں لیکن اس نے مصلحتاً ان کا حوالہ دینے سے گریز کیا اور خاموشی سے اسے سننے لگی جواب اسے مزید حیران بلکہ پریشان کر رہا تھا۔

"اصل میں جیسے جیسے ہمارے جانے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی تمنا جاگ رہی ہے۔ پتا نہیں' کتنا عرصہ آپ سے اور بچوں سے دور رہنا پڑے۔ کم از کم جتنا عرصہ ہم یہاں ہیں' ہمیں اکیلا نہ چھوڑیں۔"

"مگر آپ کو اس قدر گھبراہٹ ہو رہی ہے تو پھر رہنے دیجئے یہ باہر جانے کا خیال ہمیں کوشش کر لیجیے۔"

"نہیں' ایسے مواقع روز روز نہیں ملا کرتے اور پھر آپ کے سامنے کی بات ہے' یہاں کوشش کرتے کرتے کتنے سال ہو گئے۔ معمولی سے معمولی کاروبار کا آغاز کرنے کے لیے بھی تین چار لاکھ چاہئیں۔ اس سے کم میں تو ٹھیلا ہی لگایا جا سکتا ہے جو ظاہر ہے بابر ہمایوں مغل کے بس کی بات نہیں۔ ہم بھوکے مر جائیں گے' یہ ہمیں گوارا ہے مگر اپنے باپ دادا کے نام کو یوں رسوا نہیں کر سکتے۔ یہ وقتی جدائی برداشت کرنے کا حوصلہ تو ہمیں بھی کرنا پڑے گا اور آپ کو بھی۔"

بے حد عاشقانہ انداز میں کہے اس آخری فقرے نے صاحبزادی یاسمین کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ ایسی باتیں تو اس نے شادی کے اولین دنوں میں بھی نہ کی تھیں۔

"ہم آپ کے لیے قہوہ لے کر آتے ہیں۔"

بچوں کی موجودگی میں اسے حجاب نے آن گھیرا اور وہ بابر کے بے دھڑک اظہار اور بے تابی پہ گھبرا کے اٹھنے کا بہانہ تلاشنے لگی لیکن اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ بابر کی گرفت میں تھا۔

"کمال ہے' ایک ہم ہیں جو اک پل کے لیے آپ کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے' ایک آپ ہیں جو فضول کے کاموں میں الجھی رہتی ہیں۔"

یاسمین نے سٹ پٹا کے ادھر ادھر دیکھا۔ اقدس اپنی پلاسٹک کی گن میں پانی بھرنے میں مصروف تھا جبکہ شمشیر پورے انہماک کے ساتھ ہوم ورک کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے کسمسا کے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا' بابر کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔

یہ لمس نیا تھا نہ ہی بابر ہمایوں مغل اس کے لیے کوئی غیر تھا لیکن اس کے باوجود صاحبزادی یاسمین کو اس عمر میں بھی لگنے لگا جیسے نوعمری کے اولین دور میں کسی نئے نویلے لمس نے کنوارے جذبات دل میں دہکا دیے ہوں۔ اس کا گندمی چہرہ حیا کی حدت سے تمتما اٹھا۔

"حد کرتے ہیں آپ بچوں کا نہ سہی تو کچھ ہماری اور اپنی عمر کا ہی لحاظ کر لیجیے۔"

"کیوں کیا ہوا ہماری عمر کو؟" وہ سخت بدمزہ ہوا۔ اس کا لہجہ بدلا تو یاسمین بھی چونکی تو اس نے کمال اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر وہی خول چڑھا لیا۔

او میری زہرہ جبیں۔۔۔
تو ابھی تک ہے حسیں۔۔۔
اور میں جواں۔۔۔
تجھ پہ قربان میری جان میری جان۔

وہ گنگنایا تو یاسمین دھری ہو کے رہ گئی۔ شمشیر نے بھی سر اٹھا کے دیکھا تو یاسمین نے قصداً گفتگو کا رخ موڑ دیا کیونکہ بابر تو فی الحال اس موڈ سے نکلنے کو تیار نہ تھا۔

"جانے سے پہلے یہ ضروری کام کر لیں کہ ہمارا وہ زیور جو ہم نے آپ کو فروخت کرنے کے لیے دیا تھا' اس کا حساب کر لیجیے کہ کتنے میں بکے گا۔ تاکہ جتنی رقم کم ہے وہ ہم چچا حضور سے مانگ لیں۔"

"ہاں مگر قرض کے طور پہ۔۔۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"ہم وہاں جانے کے بعد جیسے ہی سیٹ ہوں گے پہلے ان کا قرضہ چکائیں گے۔ حالانکہ ان کے کچھ احسان تو ایسے ہیں جو ہم مر کے بھی نہیں چکا سکتے جیسے کہ آپ کو ہماری زندگی میں شامل کرنے کا احسان۔"

"آپ بھی ناں بس۔۔۔"

"واللہ' ہم سچ کہتے ہیں۔ آپ جیسی رفیق حیات نصیب والوں کو ملا کرتی ہے۔ ہم زندگی کے اور معاملات میں بھلے ناکام رہے ہوں لیکن آپ کی صورت میں جو نعمت ہم نے پائی ہے اس کی وجہ سے دل کچھ خوش فہم سا ہو چلا ہے کہ تقدیر کے معاملے میں ہم اتنے کھوٹے بھی نہیں' جب آپ جیسا گوہر بیش بہا ہمارے مقدر میں ہو سکتا ہے تو قسمت نے اور بھی کوئی نہ کوئی کامیابی لکھی ہو گی۔ بس اسی امید پہ سات سمندر پار جا رہے ہیں۔"

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ وہاں کام کیا کریں گے۔ چچا حضور دریافت کریں گے تو انہیں بتانا ہو گا۔"

"کام ایسا ہے جو ہمارے لائق ہے۔ یقیناً" نواب صاحب کی طبع نفیس پہ بھی گراں نہیں گزرے گا۔ آخر اب ہمارے شانوں پہ اپنے خاندان کی ناموس کے ساتھ ساتھ نواب گھرانے کی آبرو برقرار رکھنے کی بھی ذمہ داری ہے۔ ہمارے ایک قدر دان ہیں ملک صاحب' اچھی صاحب سلامت ہے ان سے۔ ان کا وسیع کاروبار پاکستان کے علاوہ عرب امارات تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنے وہاں کے کاروبار کی نگرانی کسی قابل بھروسہ شخص کو سونپنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اس کام کے لیے ہمیں چنا۔ خاصا معقول معاوضہ بھی ملے گا اور رہائش کا بھی انتظام ہے البتہ ٹکٹ کا مسئلہ ہے اور ظاہر ہے ہم خالی جیب لے بھی تو نہیں جا سکتے ہیں' پردیس کا معاملہ ہے نہ ہی ملک صاحب کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھئی بابر ہمایوں مغل کے ظاہر پہ نہ جائیے' اس کے پلے پھوٹی کوڑی نہیں' اس لیے کام سے پہلے "دام" دے دیجیے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں آپ سے زیور بیچنے کا کہنا پڑا۔"

"زیور ہوتا کس لیے ہے' آڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ یہ بتائیے کیا اس سے کچھ کام بنا؟ آپ لے تو گئے تھے سنار کی طرف۔"

"سونے کا بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہا ہے یاسمین بیگم مگر فروخت کرنے نکلو تو آدھی قیمت بھی نہیں ملتی۔ پھر اتنے پرانے زیور کی چمک دمک بھی ماند پڑ گئی ہے' پالش کرنے میں بھی کئی ماشے جھڑ گیا۔ آپ کے زیور کی کل قیمت سنار نے پچیس ہزار لگائی ہے۔ ابھی ہم واپس لے آئے ہیں' ظاہر ہے اتنے پیسے سے ہمارا کام نہیں بننے والا' بہر فضول میں آپ کی چیز کیوں ضائع کریں۔ اگر مزید اتنی ہی رقم کا اور انتظام ہو جائے تو سوچا جا سکتا ہے ورنہ۔۔۔" اس نے زمانے بھر کی مایوسی اور تھکن چہرے پہ طاری کر لی تو یاسمین کا دل ہول کے رہ گیا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسی مایوسی والی باتیں مت کیجیے ہم چچا حضور سے التجا کریں گے' وہ ہمارا مان ضرور رکھیں گے۔ آپ کے وہاں جانے کا انتظام انشاءاللہ تعالیٰ ہو جائے گا۔" وہ اسے بھرپور تسلی دیتے ہوئے کل صبح میکے

جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اور ریاب ہمایوں مغل اطمینان سے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کے نیم دراز مسکراتا ہوا اپنے پلان کی اگلی کڑیاں جوڑنے لگا۔

پرانے وقتوں کا وہ زیور اتنا کم قیمت بھی فروخت نہیں ہوا تھا جتنا کہ وہ ظاہر کر رہا تھا بلکہ خالص اور ٹھوس سونے کا وہ سیٹ جو یاسمین نے دلکش کے لیے سنبھال رکھا تھا اور جسے ایک غلط مقصد کے لیے فروخت کرتے ہوئے اس مکار باپ کا دل اک لمحے کے لیے بھی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں فکر مند نہیں ہوا تھا وہ سیٹ بھی تقریباً ''تیس ہزار میں بک رہا تھا۔ یاسمین کی آخری دو چوڑیوں کی بارہ ہزار قیمت لگی تھی۔ اور جھمکے اور تین چار انگوٹھیاں ملا کے کل ساٹھ ہزار تک تو رقم مل ہی جاتی لیکن وہ جاتے جاتے زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنا چاہتا تھا۔ یہ آخری دھچکہ صاحبزادی یاسمین کو بہت مہنگا پڑنے والا تھا مگر وہ اپنے شوہر کی ساری پرانی باتیں اور رویے یکسر فراموش کیے اس وقت اس کی جھوٹی محبت کے خمار میں سب کرنے کو تیار تھی حتیٰ کہ اپنے چچا حضور کے آگے مدد مانگنے کو بھی حالانکہ ان کے حالات سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

☼ ☼ ☼

عمیص سے گفتگو کے اگلے ہی روز ناشتے کے بعد نواب صاحب نے صاحبزادی حرمت النساء کو مخاطب کیا۔

''ہمیں ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آپ آپا حضور کے کمرے میں تشریف لے آیئے ہم وہیں جا رہے ہیں۔''

ناشتے کے برتن اٹھاتی موتیا نے چونک کے ان کی جانب دیکھا اور ان کے سنجیدہ چہرے سے ان کے تاثرات جانچ کر اندازہ لگانا چاہا کہ وہ تائی حضور سے کس قسم کی ضروری بات کرنے والے ہیں مگر وہ یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہی۔

''کیا خبر کل عمیص کے دلائل ایک بار پھر کام دکھا گئے ہوں۔ حالانکہ اس کی امید تو کم ہی ہے۔ تو کیا وہ اپنے فیصلے کو باضابطہ اور حتمی شکل دینے وہاں جا رہے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو آج میری خیر نہیں۔۔۔ گل نے تو میرا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی سارا عتاب مجھ پہ ہی نکالنا ہے۔''

صاحبزادی حرمت النساء بھی ایسی ہی کشمکش و پیچ میں گرفتار ان کے پیچھے پیچھے صاحبزادی خلعت النساء کے کمرے کی جانب چل دیں۔

''آپا حضور، ہم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہم پہ ایسا کڑا وقت بھی آئے گا جب اپنی ہی اولاد کے ہاتھوں مجبور ہو کے ہم اپنے فیصلے خود ہی تبدیل کرنے لگیں گے۔ لیکن ہم شرمندہ ہیں آپا حضور، ہمیں نہ صرف ایسا کرنا پڑ رہا ہے بلکہ آپ کو دیئے وعدہ سے انحراف بھی کرنا پڑ رہا ہے۔''

''ہم یہ مجبوری سمجھتے ہیں کیونکہ اس تکلیف سے ہم بھی گزر رہے ہیں۔'' ان کی بلوریں آنکھیں ڈبڈبا اٹھیں۔

''بیگم آپ صاحبزادی گل مہر خانم سے کہہ دیجیے کہ ایک بار پھر وہ اپنے والد کو جھکانے میں کامیاب ہو گئی ہیں لیکن یاد رہے کہ صاحبزادہ نفیس علی خان اپنی اولاد کے آگے جھکنے پہ مجبور ہوئے ہیں صرف اور صرف اولاد کی محبت کی وجہ سے۔ اپنے والد کا سر وہ اس حد تک نہ جھکائیں کہ خود وہ بھی عمر بھر شرمسار رہیں۔ ہم صرف ان لوگوں کو اس حویلی تک آنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ وہ کون ہیں۔ کیسے ہیں کہاں سے تعلق رکھتے ہیں اور آیا ہمارے خاندان سے رشتہ جوڑنے کے لائق ہیں یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ہم خوب جانچنے اور پرکھنے کے بعد ہی کریں گے اور انہیں ہمارا وہ فیصلہ قبول کرنا ہی ہو گا۔ اور ایک بات مزید انہیں اچھی طرح سمجھا دیں کہ یہی ہماری اہم ترین شرط ہے 'خاندان، حسب نسب و شجرہ۔ ان سب میں وہ خاندان ہمارے ہم پلہ ہو گا تو ہی ہم بات آگے بڑھانے کے بارے میں سوچیں گے۔''

''نواب صاحب 'تو کیا آپ نے واقعی صاحبزادی کے لیے۔۔۔ ہمارا مطلب ہے کہ کیا آپ اپنا فیصلہ بدل رہے ہیں 'عمیص کی بجائے۔۔۔''

غیرت کی شدت سے صاحبزادی حرمت النساء اپنی بات تک مکمل نہ کر سکیں۔ عمیص نے انہونی کو ہونی میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہی بات موتیا نے گل کو یہ خوش خبری دیتے ہوئے بتائی۔

''میری عقل سے بالاتر ہے یہ بات کہ عمیص کی ہر بات 'ہر نظریے سے اختلاف رکھنے کے باوجود آخر کار ابا حضور اس کی بات مان کیسے لیتے ہیں۔ آخر ایسی کون سی گیدڑ سنگھی ہے اس کے پاس جو وہ اس کی ہر ایسی بات مان لیتے ہیں جس کا ماننا ناممکن سا لگتا ہے۔''

''انہوں نے اس کی نہیں 'ہماری بات مانی ہے۔'' گل نے یاد دہانی کرائی۔

''ہاں مگر منوائی تو عمیص نے ہی ہے۔''

''تم ہمیشہ کی طرح ہر کام کا کریڈٹ اسے دینے سے باز نہ آنا۔'' گل کو موتیا کا بار بار عمیص کا ذکر کرنا اچھا نہ لگا اور موتیا کو اس کا عمیص کے ذکر سے کترانا برا لگا۔

''اور تم بھی ہمیشہ کی طرح احسان فراموش کرنے سے باز نہ آنا۔''

''کیسا احسان؟ اگر تم یا تمہارا چہیتا عمیص یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا موقف ابا حضور تک پہنچا کے تم دونوں نے ہماری ذات پہ کوئی احسان عظیم کیا ہے تو بھول جاؤ۔ اگر تم لوگ یہ بات نہ کرتے تو ہم خود ہی کر لیتے جہاں تک ابا حضور کے ماننے کی بات ہے تو ایسا اس لیے ہوا کہ یہ معاملہ ان کی لاڈلی بیٹی گل مہر خانم کا تھا 'اس لیے نہیں کہ اس معاملے کو عمیص نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ ایسی بات ہوتی تو عمیص نے خود اب تک اپنے لیے کیا کیا ہے؟ اپنا کون سا مقدمہ وہ کامیابی سے لڑ سکا ہے ابا حضور کے سامنے۔''

''جو بھی ہے 'تمہارا مقدمہ تو اس نے خوب لڑا۔ اور کچھ نہیں تو مروتاً ہی تمہیں اس کا شکریہ تو ضرور ادا کرنا چاہیے۔'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ گل مہر کا مروت سے دور کا بھی واسطہ نہیں 'موتیا اسے یہ مشورہ دے بیٹھی جسے حسب توقع اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔

''ہاں تاکہ وہ اور بھی ہمارے سر پہ سوار ہو۔ ہمیں جو ملا ہے وہ ہماری قسمت ہے۔ مان لو ہمشیرہ 'ہمارے ستارے اس وقت خاصے روشن ہیں۔''

''اللہ کرے ہمیشہ روشن رہیں لیکن گل 'کچھ روشنیاں بانٹ دینے سے کم نہیں ہوا کرتیں۔'' اسے حقیقتاً ''اپنی بہن کی طوطا چشمی'' پہ سخت افسوس ہوا تھا لیکن اس کے تاثرات سے قطعی بے نیاز گل اس وقت اپنے آپ میں مگن کل کے بارے میں سوچ رہی تھی جب اسے شہزاد ملک کو یہ خوشخبری سنانی تھی۔

☼ ☼ ☼

''سر، ہم نے گھر میں آپ کے والدین کی آمد کے بارے میں سب کو مطلع کر دیا ہے۔'' جھجکتے ہوئے گل نے بتایا۔

''دف۔ کوئی پرابلم۔۔۔ آئی مین کسی نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا؟''

''اعتراض کیسا؟ ہمارا مطلب ہے کہ اس اسٹیج پہ وہ کوئی اعتراض کیسے کر سکتے ہیں۔ ابھی تو وہ آپ سے ملے بھی نہیں۔ دونوں خاندانوں کا تعارف بھی نہیں ہوا۔''

''تعارف۔۔۔!'' وہ بے دھیانی میں بڑبڑایا۔ یہ مرحلہ جتنا ناگریز تھا اتنا ہی وہ اس سے نظریں چرا رہا تھا حالانکہ اس مرحلے کو سر کیے بغیر باقی مراحل کا طے ہونا محال تھا۔

''کیا ہوا سر؟'' گل مہر کی سمجھ سے اس کا تردد بالاتر تھا۔

''اوں۔۔۔ نہیں کچھ نہیں۔'' شہزاد نے سر جھٹکا۔

''پھر بھی۔۔۔ انہوں نے کوئی تو رد عمل ظاہر کیا ہو گا؟'' نجانے وہ کیا کریدنا چاہ رہا تھا۔

''سر ہم نے بتایا تھا کہ ہماری فیملی خاصی کنزرویٹو ہے 'روایات کو بیشتر حد تک اہمیت دینے والی۔ اعلیٰ تعلیم اور

روشن خیالی اور معاملات پہ تو اثر انداز ہوئی ہے مگر رسوم و قواعد کے معاملے میں ہم لوگ ابھی ابھی پچھلی صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ صرف ہمارے بزرگوں کو ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی اپنے اعلیٰ نسب اور سب سے بڑھ کے اس نسب کی عظمت برقرار رکھنے پر فخر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے روایتی ماحول میں ہمارا یہ ذکر کرنا سب کو گراں تو گزرا لیکن ہم نے سب کو مطمئن کر دیا ہے۔ ویسے بھی ہمارے ابا حضور کو ہم پہ پورا اعتماد ہے کہ ان کی صاحبزادی گل مہر کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی۔ بس انہیں یہ فکر تھی کہ خاندان سے باہر رشتے ناتے کرنے میں کہیں آپ ہمارا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں۔"

"بخوبی۔"

"اسی لیے انہوں نے سب سے پہلی اور کڑی شرط یہ عائد کی ہے کہ ہمارے لیے آنے والا یہ رشتہ حسب نسب میں ان کے خاندان کے ہم پلہ ہونا چاہیے۔ شرافت و نجابت ان کی پہلی ہی نہیں بلکہ واحد ترجیح ہے۔"

مسکراتے ہوئے یہ شرط بیان کر کے گل مہر نے شہزاد ملک کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ نہ دیکھا۔

"یہی وجہ ہے کہ ہمیں انہیں مطمئن کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کتنی اچھی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

شہزاد نے بمشکل مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ گل مہر کے آفس سے نکلنے کے بعد اس نے اس پھیکی اور بے جان مسکراہٹ کو نوچ اتارا اور اپنے خوف زدہ فق چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کے سر چیئر کی بیک سے ٹیک دیا۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کتنی اچھی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔" اس کا وہ پروثوق لہجہ۔

"شرافت و نجابت ان کی پہلی ہی نہیں بلکہ واحد ترجیح ہے۔" اور اس کی وہ کڑی شرط۔

"ہمیں بھی اپنے اعلیٰ نسب اور اسے برقرار رکھنے پہ فخر ہے۔" اس کا وہ غرور۔ جس سے شہزاد ملک کی ذات محروم تھی۔

"کتنا بچنا چاہا میں نے ہر بار بچنا چاہا۔ لیکن یہ آئینہ خود بخود نہ چاہتے ہوئے بھی ہر بار میرے روبرو آجاتا ہے۔ اور کتنی دیر تک۔۔۔ اور کتنا عرصہ میں اس سے بچتا رہوں گا' اس آئینے سے بھاگتا رہوں گا۔ اپنے ہی عکس سے منہ چھپاتا رہوں گا۔"

وہ سچ مچ پریشان تھا کہ آنے والے وقت سے کیسے دامن بچائے۔ وہ گل مہر کو حاصل بھی کرنا چاہتا تھا لیکن حصول کے اس رستے میں کئی خار تھے جن سے ان کے وہ پردے چاک چاک ہونے کا خدشہ تھا۔ جن سے اس نے اپنا آپ چھپا رکھا تھا۔ مشکل تو یہ تھی کہ اپنا راز چھپائے رکھنے کی خاطر وہ گل کی خواہش سے دست بردار ہونے کو بھی تیار نہ تھا۔

"جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ کب تک یہ خوف مجھے اپنے حصار میں لیے رکھے گا۔ میں نے خود کو کمزور بنا لیا ہے ورنہ یہ ایسی بھی بڑی بات نہیں۔ کون ہے میرے حلقہ احباب میں جو اب تک یہ حقیقت جان پایا ہے۔ گل مہر کے گھر والے بھی کیسے جان سکتے ہیں' جب تک کہ میں خود نہ بتاؤں۔ اور ظاہر ہے کہ میں خود تو ہرگز نہیں بتاؤں گا۔"

اس نے خود کو تسلی دی۔

"لیکن تمہارے حلقہ احباب سے تمہاری حقیقت اس لیے چھپی رہی کہ تم نے ان سے اپنے ماں باپ اور رشتے داروں کو چھپائے رکھا اور گل مہر کے معاملے میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہاری ماں اور تمہارا باپ وہ اپنا تعارف آپ ہیں۔ نہ تو تم انہیں زندگی کے اتنے اہم مسئلے سے دور رکھ سکتے ہو۔ نہ ہی گل مہر کے روایتی خاندان والے تمہیں بغیر والدین کے حوالے کے قبول کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ خود پہ وہ خول چڑھانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو تم اتنے برسوں سے اپنی ذات پہ چڑھائے ہوئے ہو۔"

اس کے اندر سے کوئی تمسخر اڑا رہا تھا۔

"لیکن انہیں ایسا کرنا ہوگا۔ ہر حال میں کرنا ہوگا۔ میں نے کیا نہیں کیا ان کے لیے۔ کیا وہ میرے لیے ذرا سا

جھوٹ بھی نہیں بول سکتے۔ اب تک کیا ہی کیا انہوں نے میرے لیے' ساری زندگی مجھے شرمندہ کرنے کے سوا۔ اب انہیں میری خاطر یہ کرنا ہوگا۔"

اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح وہ کرم الٰہی اور بالو کو رضامند کر لے گا کہ وہ گل مہر کے گھر والوں کے سامنے اپنی اصلیت پوشیدہ رکھیں لیکن کرم الٰہی اس کی بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا شہزادے۔ کل تک تو تو یاروں دوستوں سے ہی اپنا اصل چھپاتا پھرتا تھا۔ چل وہ بات دوسری ہے' ان سے تعلق واسطہ ہی کتنا ہے' بندہ اپنا آپ چھپا بھی لے تو تھوڑا بہت گزارا ہو جاتا ہے لیکن یہ بات دوسری ہے۔ اب تو عمر بھر کا رشتہ بھی جھوٹ بول کے بنانا چاہتا ہے۔ بھلا حیاتیوں کے فیصلے اس طرح جھوٹ بول کے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اتنے اونچے خاندان کے ہیں' ان سے تیرا جھوٹ کتنے دن تک چل سکے گا۔ بے وقوفا' دلوں کے سودے مکاری سے طے نہیں ہوتے۔"

"مجھے آپ کی نصیحتیں نہیں' آپ کا تعاون چاہیے۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"تیرا پیو ٹھیک کہہ رہا ہے پتر۔" بالو نے بھی سمجھانا چاہا۔

"ایسے رشتوں میں جھوٹ زیادہ دیر نہیں نبھ پاتے۔ کل کلاں کو یہ بات کھل گئی تو زیادہ برا ہوگا۔ اس سے اچھا ہے کہ پہلے ہی ہر بات صاف کر لی جائے۔"

"ہاں صاف صاف کہہ دوں انہیں' ہر بات سچ بتا دوں؟" وہ چیخ اٹھا۔

"اور اس کے بعد کس منہ سے درخواست کروں کہ نواب صاحب' اپنی لاڈلی بیٹی مجھے یعنی میراثیوں کے چشم و چراغ کو سونپ دیجیے۔ اور آپ کا خیال ہے کہ میرے سچ بولنے پہ خوش ہو کے وہ میرا شانہ تھپ تھپا کے مجھے داد دیں گے اور پھر شاباشی کے طور پر مجھے اپنا داماد بنا لیں گے۔"

"نہیں بناتے تو نہ بنائیں۔" بالو نے ہاتھ ہلایا' اسے شہزاد کی چیخ پکار اور واویلا ذرا پسند نہ آیا۔

"میرے چن پتر کو کوئی لڑکیوں کی کمی ہے' ایک ڈھونڈنے نکلوں گی تو دس ہزار ملیں گی' اور وہ بھی ایک سے ایک سوہنی تو بول تو سہی میں کل سے ہی۔"

"بس اماں۔۔۔" اس نے بات کاٹ دی۔

"جانتا ہوں اچھی طرح' کیا "چیز" پسند کر کے لائیں گی آپ میرے لیے۔ مجھے پتا ہے' مجھے کیا چیز چاہیے اور وہ چیز صرف گل مہر میں ہے۔ گل مہر کو میں ہر حال میں اپنانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں آپ کی مدد کا محتاج ہوں۔ آپ دونوں سے گڑگڑا کے التجا کر رہا ہوں کہ میری خاطر۔ صرف اور صرف اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی بھر کی واحد خوشی کی خاطر۔ آپ لوگ کچھ دیر کے لیے بھول جائیں کہ آپ کون ہیں۔ صرف وہ کریں جو میں کہوں۔"

"یہ ڈرامہ بازی اب اس عمر میں ہم سے نہیں ہونے والی۔" کرم الٰہی نے صاف جواب دے دیا۔

"اور پھر یہ تو بتا' کب تک جھوٹ بولتے رہیں ہم۔ چل تیری بات مان کے میں جھوٹ موٹ کا سیٹھ اور حاجی بن کے مل بھی لیتا ہوں اس اونچی ناک والے نواب سے اور تیری شادی بھی تیری من پسند لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ تو کل کو جب وہ ووہٹی بن کے ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آئے گی کیا تب اسے پتا نہ چلے گا؟ یا پھر ہم بڈھا بڈھی ساری حیاتی جھوٹ جھوٹ کھیلتے رہیں گے' اپنے گھر کی چار دیواری میں بھی اپنا آپ کھول نہیں سکیں گے۔"

"آپ ایک بار میرا یہ کام تو کر دیں۔ پھر وہی ہوگا جو آپ چاہیں گے۔ آپ کو اپنوں میں اپنے اصل کے ساتھ جینے کی خواہش ہے تو میں اس کا بھی انتظام کر دوں گا۔ آپ کو گاؤں بھجوا دوں گا' زمینیں' حویلی لے دوں گا۔ باقی کی عمر چوہدریوں کی طرح اپنے رشتے داروں میں سر اونچا کر کے اپنی مرضی کے مطابق گزاریں۔"

"یعنی تو مطلب پورا ہونے کے بعد ہمیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکے گا۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں نے تو آپ ہی کی خوشی کے لیے یہ کہا تھا ورنہ آپ عمر بھر میرے ساتھ رہنا چاہیں تو یہ میرے نصیب کی بات ہوگی۔ آپ کو خود ہی ان سجے سجائے گھروں میں وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے۔۔۔

پلیز اباجی میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں۔"

"او ہو' میں سمجھ رہا ہوں' اب تو بھی سمجھ لے کہ یہ جھوٹ کھلا تو جو عزت تو نے اب تک بنائی ہے وہ بھی مٹی میں مل جائے گی' پھر ہمیں کوئی الزام نہ دینا۔"

"اگر آپ ٹھیک ویسا ہی کریں گے جیسا میں کہوں گا تو پھر کوئی بچ کو نہ جان سکے گا ویسے بھی — پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے' بڑے سے بڑا عیب چھپانے کے لیے یہی کافی ہے اور جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی وہ آپ دونوں ذرا سی کوشش کے بعد پوری کر سکتے ہیں اگر آپ واقعی کوشش کرنا چاہیں تو۔"

"ہمیں کرنا کیا ہوگا؟" کرم الٰہی نے نیم رضامندی ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا۔

"زیادہ کچھ نہیں۔ میں ان لوگوں پہ ظاہر کروں گا کہ میرے والدین دیہاتی پس منظر رکھتے ہیں۔ جدی پشتی جاگیر دار اور زمین دار ہیں۔ ظاہر ہے اب کچھ دنوں میں آپ کا لب ولہجہ اور چال ڈھال تو بدل نہیں سکتا اس لیے زمین دار اور دیہاتی ہونا آپ کی سادگی پہ پردہ ڈال دے گا۔ انہیں بتایا جائے گا کہ آپ لوگ شہر میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ میں انہیں مختلف دیہاتوں اور علاقوں میں اپنی زمینوں کی جو تفصیل بتاؤں گا' آپ اس سے انکار ہرگز نہیں کریں گے۔"

"اور جو وہ لوگ تفتیش کرنے نکل پڑے تو۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا ویسے بھی کچھ زمینیں خرید رکھی ہیں میں نے اپنے نام پہ۔"

"اچھا۔۔۔ اور کچھ؟"

"آپ انہیں ذرا سا بھی شک نہیں ہونے دیں گے کہ آپ کا یا اماں کا یا ہمارے خاندان کے کسی بھی فرد کا فلموں یا گانے بجانے سے کوئی تعلق رہ چکا ہے۔ ہمارے کسی رشتے دار کے بارے میں وہ پوچھیں تو کہہ دیجیے گا کہ ہماری ساری ذات برادری تقسیم ہند کے موقع پر بچھڑ گئی۔ کچھ وہیں رہ گئے' کچھ مر کھپ گئے۔ ایک بار ذکر چلا تو گل مہر نے بتایا تھا کہ اس کے والد کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہوا تھا اس لیے وہ اس بارے میں بے حد جذباتی ہیں۔ شاید ان کا یہی کمزور جذباتی پہلو میرے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا کر دے۔ کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"نہیں گائیڈ لائن دیتے دیتے رک کے شہزاد نے سوچ میں ڈوبے کرم الٰہی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ ڈرامے بناتے بناتے میرا پتر زندگی کو بھی ایک ڈرامہ ہی سمجھنے لگا ہے' لیکن پتر۔۔۔ اگر یہ زندگی اک ڈرامہ ہے بھی تو اس کی کہانی تو اوپر والا لکھتا ہے' کچھ پتا نہیں اگلے سین میں کیا ہو جائے۔ ساری تیاری دھری کی دھری رہ جائے۔"

"اوفوہ۔ پھر وہی باتیں۔۔۔" وہ جھنجلا اٹھا۔

"سیدھی طرح کہیں کہ آپ لوگ میری مدد کرنا ہی نہیں چاہتے۔ میں نے پہلی بار آپ سے کچھ مانگا ہے اور آج بھی آپ کے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔"

"ہاں شہزادے' واقعی ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ ہم تجھے کچھ بھی تو نہیں دے سکے۔" بالو بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"تو فکر نہ کر۔۔۔ ہم وہی کریں گے جو تو کہے گا۔" بالو کے کہنے پہ کرمے نے تڑپ کے اسے دیکھا لیکن بالو نے اس کا ہاتھ دبا کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"پہلی بار تو ہمارے شہزادے نے ہم سے کچھ مانگا ہے۔ پہلی بار تو ہم اس کی زندگی کے کسی فیصلے میں شامل ہونے جا رہے ہیں چاہے چہرے پہ نقاب لگا کے ہی سہی۔"

☼ ☼ ☼

"ایسا ہے گل کہ میرے والد صاحب کی طبیعت کچھ ناساز ہے اس لیے وہ فی الحال شہر نہیں آ سکتے۔" اگلے روز وہ بہانہ بنا رہا تھا۔ بے شک کرم الٰہی اور بلقیس رضامند ہو گئے تھے لیکن انہیں اس کے لیے تیار کرنے میں اسے

کچھ وقت چاہیے تھا اور یہی مہلت حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک اور جھوٹ گھڑ لیا۔

"کیا وہ یہاں نہیں رہتے؟"

"نہیں' انہیں شہر کا ماحول کچھ خاص پسند نہیں زمیندار لوگ ہیں آپ کے والد صاحب کی طرح میرے والد صاحب کو بھی اپنی روایات اور "اصل" سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہے۔ وہ کبھی کبھار یہاں آ بھی جائیں تو ان کا دل نہیں لگتا۔ انہیں گاؤں میں اپنی حویلی' زمینوں' مربعوں' فصلوں اور مزارعوں کے ساتھ رہنا زیادہ پسند ہے۔ ان کی چودہراہٹ یہاں آ کے کچھ ادھوری سی ہو جاتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں' وہ بیمار ہیں' یہاں شہر میں علاج کی جدید سہولتیں ہونے کے باوجود وہ میرے اصرار پہ بھی آنے پہ تیار نہیں ہوتے کہ بقول ان کے شہر میں بیماری دور نہیں ہوتی بلکہ جان کو چمٹ جاتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔

"ویسے فکر نہ کیجیے' زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن تک میں خود انہیں لے آؤں گا۔ آپ کو اس لیے بتایا کہ آپ کے گھر والے منتظر ہوں گے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ آنے کی اجازت طلب کرنے کے بعد آنے میں اس قدر تاخیر کرنے والے لوگ کس قدر بدتہذیب ہیں۔"

"نہیں سر' ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بھی کچھ مطمئن ہوئی۔ بے شک ابا حضور کی جانب سے عندیہ ظاہر ہو چکا تھا لیکن یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے ہی اس فیصلے پہ دل سے راضی نہیں تو باقی افراد خانہ کیسے خوش ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گھر کے ماحول میں ایک تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ گل مہر کو اطمینان ہوا کہ شہزاد کے گھر والوں کی جانب سے ہونے والی اس وقت تاخیر کے نتیجے میں اس کے گھر میں بھی سب لوگوں کو ذہنی طور پر نارمل ہونے کا موقع مل جائے گا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تو آپ نے عجیب دل دکھا دینے والی خبر سنائی امی حضور۔" صاحبزادی یاسمین کو میکے آئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انہیں بھی عمیص اور گل مہر کے اس رشتے کے ٹوٹنے کی خبر مل گئی جو ابھی پوری طرح بنا بھی نہ تھا۔

"ہمیں تو چچا حضور پہ حیرت ہے کہ وہ کیسے اتنی آسانی سے گل مہر کی ضد کے آگے ہار مان گئے۔"

"آسانی سے تو نہیں یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انہیں یہ بات ماننے میں کتنی تکلیف اور رنج سے گزرنا پڑا ہوگا۔" صاحبزادی خلعت النساء نے تاسف سے بتایا۔

"اگر ایسی ہی بات تھی تو پھر وہ اپنا فیصلہ نہ بدلتے۔ آخر ہمارے بھائی میں کیا کمی ہے؟"

"عقل کی۔" انہوں نے اصل بات بھی بتا دی کہ کیسے وہ خود اس سارے عمل میں پیش پیش تھا۔

"بھائی صاحب تو شاید نہ مانتے اگر ہمارے ہی برخوردار خود بڑھ چڑھ کے دلائل نہ دیتے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ انہیں اپنے چچا حضور کے مقابل آنے کا کتنا شوق ہے پھر چاہے معاملہ ان کے مفاد میں ہو یا نہیں۔ اس بار تو انہوں نے مخالفت برائے مخالفت میں اپنا بھی لحاظ نہ کیا۔"

"نہیں امی حضور۔ یہ محض اتفاق ہے کہ عمیص میاں اور چچا حضور کے نظریات آپس میں ٹکرا جاتے ہیں ورنہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دل سے ان کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ ہاں اس معاملے میں انہوں نے گل مہر کی حمایت کیوں کی' یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔"

"صرف حیرت کی نہیں' یہ افسوس کا مقام ہے صاحبزادی یاسمین۔"

"ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں ان حضرت میں جو گل مہر نے ہمارے بھائی کو رد کر دیا۔" وہ اس بات کو ہضم نہ کر پا رہی تھیں۔

"یہ تو ملاقات کے بعد ہی پتا چل سکے گا۔" انہوں نے ایک بار پھر تسبیح اٹھا لی۔

"ہمارا تو دل ہی بجھ کے رہ گیا ہے' کس جوش و خروش کے ساتھ ہم آئے تھے کہ آپ کو یہ خوش خبری سنائیں گے اور آتے ہی ایسی خبر سن لی۔"

"اللہ مبارک کرے' کیسی خوشخبری؟"

"آپ کی دعاؤں سے دلکش کے ابا کی ملازمت کا بڑا معقول انتظام ہو گیا۔ بالکل ویسی ہی' جیسی وہ چاہتے تھے اور جیسی چچا حضور کی خواہش تھی یعنی باعزت اور باوقار۔ آمدنی بھی مناسب ہو گی' بس یہ ہے کہ انہیں کچھ عرصہ پردیس میں گزارنا ہو گا۔"

"پردیس میں؟"

"جی ہاں' بیرون ملک ملازمت ملی ہے۔ ان کے کسی جاننے والے نے اپنے وسیع کاروبار کی دبئی میں شاخ کی نگرانی کے لیے ان کا انتخاب کیا ہے۔ تقریباً" تمام انتظامات مکمل ہیں بس ٹکٹ کا کچھ مسئلہ ہے۔ رقم پوری نہیں ہو پا رہی۔ اسی سلسلے میں ہم یہاں چچا حضور سے بات کرنے آئے تھے۔"

"کیسی بات؟" انہوں نے سمجھنے کے باوجود وضاحت چاہی۔

"یہی کہ اگر کچھ رقم کا انتظام ہو جاتا تو یہ موقع ہاتھ سے نہ نکلے گا۔ زیادہ نہیں' بس یہی کوئی پندرہ بیس ہزار۔"

"گھر کے حالات آپ کے سامنے ہیں' پندرہ بیس ہزار اتنی بھی کم رقم نہیں۔ اور آپ کے چچا حضور کو ویسے بھی آج کل کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ گھریلو حالات میں بھی اور مالی امور میں بھی۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایسے میں آپ کا مطالبہ انہیں اور بھی پریشان کر دے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ان کے پاس رقم نہ بھی ہوئی تب بھی وہ آپ کو انکار نہ کر پائیں گے' آخر داماد کے سامنے عزت برقرار رکھنے کا معاملہ ہے۔ نجانے کہاں سے انتظام کرتے پھریں گے۔ ہو سکتا ہے گل مہر کا رشتہ وہیں طے پا جائے' جہاں وہ چاہتی ہیں اس صورت میں منگنی بیاہ وغیرہ پہ انہیں رقم کی ضرورت پڑے گی۔ ان کی زندگی پہ ان کی اولاد کا بھی حق ہے۔"

"ہم اس سے انکار نہیں کرتے۔ جانتے ہیں ہم اپنے حق سے کہیں زیادہ لے چکے ہیں لیکن یہ وقت ہی ایسا آن پڑا ہے اور یہ رقم ہم قرض کے طور پر لے رہے ہیں۔"

"ایسی بات بھول کے بھی اپنے چچا حضور کے سامنے مت کہیے گا۔ ان کی غیرت کو یہ گوارا نہ ہو گا کہ وہ بیٹی کو قرضے کی نیت سے رقم دیں۔"

"تو پھر ہم کیا کریں' کس سے مدد مانگیں۔ بھائی تو ابھی خود پیر جمانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں ورنہ ان سے مانگ لیتے۔ یہ شوہر کے سامنے ہماری عزت کا ہی نہیں بلکہ ہمارے بچوں کے مستقبل کا سوال ہے۔" وہ رو پڑیں تو صاحبزادی خلعت النساء بے چین ہو گئیں۔

"ہم آپ کی مجبوری سمجھ سکتے ہیں لیکن آپ بھی سمجھنے کی کوشش کیجیے' ہم بھائی صاحب کی ذہنی الجھنوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہمارا خیال ہے آپ بھی ہرگز ایسا نہ چاہیں گی۔" وہ بے بسی سے کہنے لگیں۔

"ہمارا کیا پوچھتی ہیں امی حضور ہم نے کبھی بھی کسی کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہا' یہ تو حالات ایسے ہو گئے ہیں"

"اچھا ہم کچھ کرتے ہیں۔" انہوں نے گھٹنوں پہ زور دے کے اٹھتے ہوئے کہا۔ چند منٹ تک الماری میں کھٹ پٹ کرنے کے بعد وہ پلٹیں تو ہاتھ میں ایک مخمل کی پوٹلی تھی۔

"زمانے کے ہاتھوں بس یہی بچا پائے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آپ کے بیاہ پہ لگ گیا۔ اب یہ جن جن کو دینے کی نیت سے بچا کے رکھا ہے' دیکھیے ان کے نام لکھ کے چپکا رکھے ہیں تاکہ یہ دینے سے پہلے اگر ہماری آنکھیں بند ہو گئیں تو سب کو ان کا حق پہنچ جائے۔" انہوں نے پوٹلی کھول کے پلنگ پوش پہ الٹ دی۔ پرانی طرز کے کچھ زیورات بکھر گئے۔ وہ اٹھا اٹھا کے دکھانے لگیں۔

"یہ گلوبند ہم نے **عمیص** میاں کی دلہن کے لیے رکھا ہے۔" ٹھوس سونے کے بھاری گلوبند کی چمک دمک اگرچہ ماند پڑ چکی تھی مگر ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پالش ہونے کے بعد کیا غضب ڈھاتا۔

"اور یہ چار چوڑیاں۔۔۔ صاحبزادی گل مہر اور صاحبزادی الماس خاتون کے لیے ویسے تو چاروں ہم نے صاحبزادی الماس کو دینے کی نیت سے رکھی تھیں' دیکھیے نام بھی ان کا لکھا ہے۔ صاحبزادی گل مہر کے لیے سوچا تھا کہ وہ

ہماری بہو کی حیثیت سے اس گلوبند کی وارث بنیں گی لیکن جو اللہ کو منظور۔ سوچا ہے' دو دو چوڑیاں دونوں کو دے دیں گے۔" طلائی چوڑیوں پہ اصل زمرد کے ٹکڑے منقش تھے۔

"اور یہ کنگن دلکش بٹیا کے لیے۔" انہوں نے بھاری بھرکم کنگن نکال کے دکھائے جن کے اوپر سونے کے ہی چھوٹے چھوٹے گھنگھرو لٹک رہے تھے۔

"آپ یہ لے جائیے۔ ہم سمجھیں گے کہ حق دار تک اس کا حق پہنچ گیا۔ ہمارا فرض پورا ہو گیا۔"

صاحبزادی یاسمین نے پرتشکر انداز میں وہ کنگن لے لیے۔ ایسے میں ان کی نظر ایک بار پھر اس گلوبند اور چاروں چوڑیوں پہ گئی۔ وہ پرسوچ انداز میں انہیں دیکھے گئیں۔

"خیریت صاحبزادی؟" وہ الجھیں۔ "کیا یہ گلوبند پسند ہے؟ ایسا ہے تو کنگن رکھ دیجیے یہ لے لیجیے۔"

"نہیں' نہیں امی حضور پسند کی کیا بات ہے ہمیں تو فروخت ہی کرنا ہے' کون سا اپنے پاس رکھنا ہے اور آپ نے اپنی بہو کو دینے کی نیت سے رکھا ہے تو اللہ انہیں ہی مبارک کرے' انہیں پہننا نصیب ہو۔ ہم تو بس یہ سوچ رہے تھے۔"

"کیا سوچ رہی تھیں آپ؟" ان کا معنی خیز توقف ان پہ گراں گزرا تو وہ بے تابی سے پوچھ بیٹھیں۔

"بس یونہی آپ کی باتیں سن کر ایک خیال آیا ہے۔" وہ کچھ اس انداز میں مسکرائیں کہ صاحبزادی **خلعت النساء** اس کا "خیال" اور "سوچ" جاننے کے لیے مزید مشتاق ہو گئیں۔

"یہ یہ چار کی چار چوڑیاں آپ گل مہر کو ہی دے دیجیے۔"

"کیا۔۔۔؟ یہ کیا بات کہی آپ نے؟" وہ اس عجیب و غریب مشورے پہ حیران سی ہوئیں۔

"صاحبزادی الماس بھی ہماری ہی بچی ہیں۔ ان کا بھی پورا حق ہے۔ اچھا نہیں لگتا کہ ایک ہی کو چاروں چوڑیاں دے دی جائیں۔"

"تو پہلے بھی تو آپ چار کی چار چوڑیاں ایک ہی کو دے رہی تھیں۔" اس کی مسکراہٹ اب بھی جوں کی توں تھی۔

"کیسی ناسمجھی کی باتیں کر رہی ہیں۔" اب کے وہ ذرا بگڑ گئیں۔

"تب ہم گل مہر کو اپنی بہو کی حیثیت سے یہ گلوبند جو دے رہے تھے۔"

"اب بھی ایسا کیا جا سکتا ہے امی حضور۔" یاسمین کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

"پہیلیاں مت بجھوائیے صاحبزادی یاسمین۔" ان کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔

"صاف الفاظ میں بات کیجیے۔"

"صاف کہوں تو ابھی ابھی ہمارے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ اگر گل مہر اپنی کم عقلی کی وجہ سے **عمیص** میاں جیسے گوہر کو گنوا رہی ہیں تو کیوں نہ ہم موتیا کو۔۔۔ ہمارا مطلب ہے وہ بھی اسی گھر کی بچی ہے۔ آپ سے اس کا بھی وہی رشتہ اور اپنائیت ہے جو گل مہر سے رہی ہے۔ بلکہ **عمیص** اور اس کی وابستگی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اگرچہ یہ وابستگی سراسر بے ضرر اور قطعی دوسرے معنوں میں ہے لیکن اس کی وجہ سے دونوں کو اس نئے رشتے کو قبول کرنے میں دقت نہ ہو گی۔"

"بات تو دل کو لگتی ہے لیکن اتنی جلدی گل مہر کی بجائے اب الماس خاتون کا نام لینا کیا مناسب رہے گا؟"

"جو کچھ گل مہر نے کیا ہے' کیا وہ مناسب ہے؟ اور مناسب' نامناسب میں مت الجھیے' وہ کیجیے جس میں اس گھر کی خوشی اور ہمارے بھائی کی بہتری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ شروع سے ہی گل مہر کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتے ہیں۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے ان جذبات کو گل مہر کی خواہش کے آڑے نہیں آنے دیا' اس سے ان کے دل کو بھلے ٹھیس پہنچی ہو مگر ان کا وقار تو سلامت رہا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ خود کو کتنا ہی مضبوط ظاہر کریں' ان کو سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ ہمیں انہیں ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچانا ہے اور یہ کام ہم موتیا کی

مدد سے باآسانی کر سکیں گے۔ وہ عمیص کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں۔ دونوں میں گہری ذہنی ہم آہنگی ہے۔"

"لیکن کیا صاحبزادہ عمیص اس بات کے لیے رضامند ہو جائیں گے؟"

"یقیناً" بلکہ ہمارا خیال ہے اگر وہ گل مہر کے بعد کسی کو زندگی میں شامل کرنے کا حوصلہ کریں گے تو وہ کوئی اور نہیں' صاحبزادی الماس خاتون ہوں گی۔ اس کے علاوہ شاید ہی وہ کسی کے لیے ہامی بھریں' اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو شاید ہی کوئی اور ایسی ہو جوان کے ساتھ نباہ کر پائے کیونکہ گل مہر کو دل و دماغ سے نکالنے میں عمیص میاں کو ایک عرصہ لگے گا۔ موتیا اس حقیقت سے پہلے سے ہی واقف ہے' اس کی وسعت قلبی اس نازک مسئلے کو گمبھیر نہ بننے دے گی۔"

"اس حقیقت کو جانتے ہوئے کیا الماس خاتون ہامی بھرلیں گی؟" صاحبزادی خلعت النساء کو عمیص کے بعد اب موتیا کی رضامندی کی فکر لاحق ہو گئی ویسے بھی گل مہر کے صاف انکار کے بعد وہ ڈر سی گئی تھیں۔

"وہ موتیا ہے امی حضور' گل مہر نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ بزرگوں کی رائے کا احترام کرنا وہ بخوبی جانتی ہیں اور دوسری بات یہ کہ عمیص سے دوستی اور ہمدردی اس چیز کو مسئلہ نہ بننے دے گی' یوں بھی گل مہر ان کی بہن ہیں' سگی بہن۔ ان سے حسد اور بدگمانی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ ہی موتیا کی فطرت میں یہ عناصر شامل ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر یہ ذکر چھیڑ دیں۔"

"آپ کا مشورہ دل کو بھایا ہے لیکن ہم اتنی جلدی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے۔ ابھی تو گھر کے ماحول میں گل مہر کی وجہ سے تلخی سی ہے۔"

"یہ تلخی اسی صورت کم ہو سکتی ہے کوئی تو خوشگوار واقعہ رونما ہو۔"

"کم از کم صاحبزادی گل مہر کا معاملہ تو کسی کروٹ بیٹھ جائے۔ ابھی تو وہ لوگ پیام لے کے آئے بھی نہیں۔ نجانے بھائی صاحب کا کیا فیصلہ ہو۔"

"بس امی حضور' ان کا فیصلہ جو بھی ہو' ایک بات تو طے ہے کہ اگر اب گل مہر کی بات وہاں طے نہیں بھی ہوتی تب بھی ہم انہیں اپنے بھائی کے لیے ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ وہ خود ایک بار' ایک غیر شخص کے لیے انہیں مسترد کر چکی ہیں' ہمیں یہ گوارا نہیں کہ وہاں بات طے نہ ہونے کی صورت میں وہ مجبوراً" دوبارہ ہمارے ہی گلے بندھیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ یہ تو آپ کا مزاج نہیں نہ ہی ہماری تربیت۔"

"معذرت خواہ ہیں امی حضور لیکن بخدا ہمارا بہت دل دکھا ہے۔ ہمارا شہزادوں کی سی آن بان والا ہیرا سا بھائی اور..... آپ جلد از جلد موتیا کا ہاتھ چچا حضور سے مانگ لیں گل مہر کو بھی تو پتا چلے کہ عمیص میاں کے لیے کوئی کمی نہیں۔ یہ کام گل مہر کی نسبت طے ہونے سے پہلے ہو تو زیادہ اچھا ہے۔" وہ اکسا رہی تھیں۔

"اچھا دیکھتے ہیں۔" انہوں نے ٹالا۔ اگرچہ یاسمین کی پیش کردہ تجویز انہیں دل و جان سے پسند آئی تھی لیکن وہ جلد بازی سے کام لینے کے حق میں نہیں تھیں۔

"ہمیں پہلے صاحبزادہ عمیص سے مشورہ کرنا ہو گا اور اس کے بعد اپنی ہمشیرہ حرمت النساء سے بھی۔ اس کے بعد ہی ہم بات آگے بڑھائیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی لیکن خیال رکھیے زیادہ تاخیر نہ ہونے پائے۔" انہیں تاکید کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل کے برآمدے کی جانب آئیں۔ اسی وقت گل مہر کی آفس سے واپسی ہوئی۔

"السلام علیکم آپا! آپ کب آئیں؟" خلاف توقع انہیں دیکھ کر منہ بنانے کی بجائے اس نے خاصے خوشگوار انداز میں سلام کیا' شاید اس کی وجہ اس کے مزاج میں آئی تبدیلی تھی جو صاحبزادہ نفیس علی خاں کی جانب سے ملنے والی اجازت کی مرہون منت تھی۔ لیکن اس کے برعکس یاسمین کے انداز میں اس بار گرمجوشی مفقود تھی۔ انہوں نے خاصے ڈھیلے انداز میں جواب دیا۔

"آپ کی واپسی روز اسی وقت ہوتی ہے یا آج کسی خاص وجہ سے تاخیر ہوئی ہے؟" بظاہر سرسری سے انداز میں انہوں نے سوال کیا۔

"ہمارا تو واپسی کا یہی وقت ہے' کیوں آپا حضور کوئی خاص وجہ؟" اس نے ابرو چڑھا کے اس تفتیش کی وجہ دریافت کی۔

"کمال ہے' چچا حضور کے اصول بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے لگے۔ ہماری شادی کو اتنے سال ہونے کو آئے۔ اب تو بچے بھی ماشاءاللہ شانوں سے اونچے ہو گئے ہیں اس کے باوجود نہ میکے میں اور نہ ہی شوہر کے گھر میں شام کے وقت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ جبکہ آپ اکیلی تن تنہا۔ ذرا وقت تو دیکھئے' مغرب ہونے کو ہے۔ پہلے تو آپ سہ پہر ہونے سے پہلے ہی لوٹ آیا کرتی تھیں' پھر اب شام کیسے ہونے لگی؟"

"اس لیے کہ اب شام جلدی ہو جاتی ہے۔" گل مہر نے اپنی عادت کے برخلاف ان کا تفصیلی اعتراض تحمل سے سنا اور اسی متحمل مزاجی سے جواب دینے کی کوشش کی۔

"ہمارے آفس کا ٹائم تین بجے آف ہوتا ہے' پہلے بھی ہم سوا تین بجے تک وہاں سے نکلتے تھے اور اب بھی وہی معمول ہے۔ ایک پون گھنٹہ راستے میں لگنا معمول کی بات ہے کبھی کبھار ٹریفک کی وجہ سے زیادہ وقت بھی لگ جایا کرتا ہے یوں ہم چار سے ساڑھے چار کے درمیان گھر پہنچ جایا کرتے ہیں۔ اگر آپ کو فرق محسوس ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے چار بجے تقریباً" دوپہر ہوا کرتی تھی گرمیاں جو تھیں اب سردیوں میں دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے آج ہم چار بج کے بیس منٹ پر واپس لوٹے ہیں تو آپ کو لگ رہا ہے کہ ہم شام تک گھر سے باہر رہے ہیں کیونکہ مغرب ہونے میں کچھ ہی وقت باقی ہے۔ اب بتایئے قدرت کے اس نظام میں ہمارا قصور کیا ہے؟"

اس کے مدلل جواب پہ کچن سے نکلتی موتیا نے بمشکل اپنی مسکراہٹ یاسمین کی نظروں سے چھپائی جو نجانے کیوں گل مہر سے خفا خفا سی لگ رہی تھیں اور اس تفصیلی وضاحت پہ تو ان کا مزاج اور بھی اکھڑا ہوا سا لگنے لگا۔

"آپ کا تو خیر کبھی بھی کوئی قصور نہیں رہا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئیں صاحبزادی حرمت النساء کے کمرے کی جانب مڑ گئیں۔

"انہیں کیا ہوا؟" گل نے مڑ کے موتیا سے دریافت کیا جواباً" وہ اپنے شانے اچکا کے رہ گئی۔

"بال بال بچ گئے ہم۔" گل نے سہلاتے ہوئے کلمہ شکر ادا کیا۔

"کس سے؟"

"تمہاری ان آپا حضور سے۔ جی بڑی کمال کی نند ثابت ہوتیں یہ اگر جو بدقسمتی سے ہمارا مقدر ان کے بھائی کے ساتھ پھوٹ جاتا۔"

"یہ تو وقت بتاتا کہ مقدر کس کا پھوٹنا تھا اور کس کا نہیں۔" موتیا کو سخت برا لگا۔

"اور اتنا خوش ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیا پتا وہ جو تمہارے شہزاد ملک صاحب ہیں' کس قدر "ہوشربا" قسم کی بہنیں رکھتے ہوں اور عین ممکن ہے ایک دو نہیں' پانچ سات رکھتے ہوں' باکمال قسم کی نندیں۔ پھر کیا ہو گا تمہارا؟"

"تمہاری تسلی کے لیے یہ بتا دیں کہ شہزاد ملک اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں اور پتا ہے والدین بھی ان کے ساتھ نہیں رہتے بلکہ گاؤں میں رہائش پذیر ہیں یعنی راوی آئندہ چین ہی چین لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"کیوں بھلا۔ ؟ یہ ان کے والدین ساتھ رہنے پہ تیار کیوں نہیں؟"

"بھئی وہی ٹیپکل روایتی سوچ۔ کچھ کچھ ہمارے ابا حضور والا مزاج یہ اپنا نوابی مزاج بدلنے پہ تیار نہیں تو وہ اپنی چودھراہٹ چھوڑنے پہ راضی نہیں۔ سر بتاتے ہیں کہ وہ وہاں خوش رہتے ہیں اپنے ملازموں' مزارعوں کے درمیان ان پہ حکمرانی کرتے ہوئے۔"

"کہیں یہ حکمرانہ مزاج شہزاد ملک نے بھی تو ورثے میں نہیں لے لیا؟"

"کیا پتا؟"

"تو تمہارا گزارا کیسے ہوگا؟ تم تو خود حکم چلانے کی عادی ہو۔ دب کر رہنا گوارا ہوگا؟"

"کوئی کوئی ایسا بھی تو ہوتا ہے موتیا جس کے آگے دب کے رہنا بھی اچھا لگتا ہے۔"

اس کے منہ سے ایسی باتیں سننا ہمیشہ موتیا کو عجیب سا لگا کرتا تھا۔ وہ بس دیکھ کے رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

جب بھی وہ وہاں سے نکلی ہمیشہ یہ سوچ کے نکلی کہ دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔ لیکن کبھی بھی وہ اپنے اس عہد پہ برقرار نہ رہ سکی۔ قسمت اسے جلد ہی اس دروازے پہ دوبارہ لے آتی تھی۔ کبھی دل کے ہاتھوں تو کبھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ پھر یہاں آجاتی تھی۔

اس بار بھی یہی ہوا۔ چند دن ہی وہ اس خود ساختہ پابندی کے زیر اثر رہی اور آج پھر سے اس کے قدم اسے وہیں لے جا رہے تھے۔ کھلے گیٹ سے کار اندر لے جاتے ہوئے اسے یہ دیکھ کے تسلی سی ہوئی کہ شہزاد ملک کی گاڑی وہاں نہیں کھڑی تھی۔

"ارے دعا پتر... میں صدقے... ست بسم اللہ' آجا بیٹا۔" بلقیس کے لیے اس کی آمد قطعی غیر متوقع تھی اس لیے اپنی حیرت پہ جلد قابو پا کے اس نے گرمجوشی سے دعا کا خیر مقدم کیا۔ پچھلی بار جن حالات میں وہ وہاں سے گئی تھی انہیں اسے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ واپس پلٹ کے اپنے ماموں کے گھر کا رخ کرے گی اور وہ بھی اتنی جلدی۔

"جیتی رہو۔" کرم الٰہی نے بھی اس کے جھکے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعاؤں سے نوازا۔ دعا کی نظروں سے اپنے ماموں کے چہرے پہ پھیلا تردد چھپا نہ رہ سکا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس سے آنے سے ذرا پہلے ہی وہ دونوں کسی گمبھیر مسئلے پہ گفتگو کر رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ماما جی' خیر تو ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا۔

"طبیعت کو کیا ہونا ہے پتر' نصیب ہی خراب ہیں۔"

"نہ ایسی باتاں کیا کر کملی... اللہ کو ناشکری پسند نہیں۔ یہ دیکھ اس نے کتنا نوازا ہے' کیا کچھ دیا ہے۔ جس کے ہم نمانے قابل بھی نہ تھے۔ ہماری اوقات سے بڑھ کے ہم پہ کرم کیا ہے' پھر کیا ہوا جو ساتھ دو چار آزمائشیں بھی دے دیں۔"

"اولاد سے بڑی آزمائش کوئی نہیں بالو۔ بندہ ہر سختی سہہ جاتا ہے پر اپنی ہی اولاد کی طرف سے اک دھچکا بھی نہیں سہا جاتا۔"

"کیا چھاجی سے پھر کوئی گرما گرمی' تلخی ہوگئی؟" دعا باپ بیٹے کے درمیان جاری رہنے والی سرد جنگ سے واقف تھی۔

"چھڈ پتر' ان کا تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے تو بتا کیسے آنا ہوا؟" بالو نے موضوع بدلنا چاہا۔

"ویسے ہی مامی' آپ دونوں سے ملنے کو جی چاہا تو چلی آئی۔" آئی تو وہ کسی اور مقصد سے تھی' لیکن اب سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ کیسے انہیں ٹٹولے کہ آیا وہ اسے اس گھر کی عزت بنانے کی خواہش رکھتے ہیں یا نہیں۔ شہزاد کے دل کے حال سے تو وہ واقف تھی' وہاں سے مایوس ہونے کے بعد ہی اس نے ماموں اور مامی کا سہارا لینے کا سوچا۔ اگر وہ ہمدردی یا خدا ترسی کے نام پہ بھی اسے اپنی بہو بنانے کا سوچ لیتے ہیں تو اس کے لیے یہی بہت تھا۔ اس وقت محبت سے زیادہ عزت کا مسئلہ اہم تھا۔ اسے اپنے چھاجی کا قرب اور الفت بھلے نصیب نہ ہوتی' نام ہی مل جاتا۔ زندگی وقار سے بسر کرنے کا آسرا ہو جاتا۔ لیکن یہ بات وہ خود اپنے منہ سے ماما سے نہیں کہہ سکتی تھی چاہے وہ اسے کتنا ہی پیار کیوں نہ کرتے ہوں۔

"یہ تو تیری محبت ہے بچے ورنہ آج کل کون کسی سے یونہی ملنے کے لیے وقت نکال پاتا ہے' خون سفید ہو کے رہ

گیا ہے۔ سگی اولاد کے دل میں نہ ماں باپ کے لیے محبت باقی رہی ہے نہ ہی خوف خدا۔"

"کیسی باتیں لے کے بیٹھ گئے ہو کرمے۔ بچی اتنے دنوں کے بعد گھر آئی ہے۔ بندہ کوئی چار بول میٹھے ہی کہہ لیتا ہے۔ ہر وقت سڑی بسی' کلیجہ سیاہ کر دینے والی باتیں... توبہ..." بلقیس نے اکتا کے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

"انسان اپنوں سے ہی دکھ سکھ ہلکا کرتا ہے بالو۔ تجھے پتا ہے دعا ہم لوگ اپنے پنڈ واپس جانے والے ہیں۔ شاید میں غلط بول گیا۔ جانے نہیں والے بلکہ بھیجے جانے والے ہیں۔"

"کیا مطلب... کون آپ کو بھیج رہا ہے اور کس لیے؟"

"ہمارا اپنا شہزادہ اور کون اور ہمیں خالی ہاتھ دھکے کھانے نہیں نکال رہا بلکہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ رخصت کر رہا ہے۔ پنڈ کا چودھری بنا کے اونچے چوباروں والی حویلی آباد کرنے ہم دونوں وہاں ہی رہیں گے عیش کریں گے دونوں بڈھی بڈھا' سات سات نوکر چاکر ہاتھ باندھ کے کھڑے رہیں گے' پیر دابا کریں گے اور یہاں شہزادہ بھی بے فکر ہوگا۔ کوئی نہیں ہوگا جس کی وجہ سے اسے دس لوگوں کے آگے شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ یہاں خوش' ہم وہاں خوش۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ ایک کھوکھلا قہقہہ۔ دعا کو اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے محسوس ہوئے۔

"مگر کیوں ماما جی؟"

"اس کے خیال میں ہم پہلے ہی سے اس کے لیے مشکلیں کھڑی کرتے آئے ہیں۔ ماں باپ خاندان ذات برادری پیشہ فن پہچان یہ سب اس کے لیے ذلت اور شرمندگی ثابت ہوئی اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ وہ اپنی نئی زندگی شروع کرنے والا ہے اور اس کے لیے اسے ہماری مدد کی ضرورت تو ہے اور وہ بھی صرف ایک جھوٹ بولنے کے لیے' کسی کو دھوکا دینے کے لیے لیکن ہمارے ساتھ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس ساتھ کی وجہ سے اس کی نئی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اس لیے اس کا خیال ہے صحیح وقت پہ ہمارا اس کی زندگی سے نکل جانا ہی صحیح ہوگا۔"

"لیکن چھاجی ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

"اپنا بیاہ رچانا چاہتا ہے کسی نواب زادی کے ساتھ۔" بالو نے جل کے انکشاف کیا۔

"کیا..." اس پہ گویا ساتوں آسمان گر پڑے۔ اس جانب تو کبھی اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ چھاجی بھی کسی اور کو۔

"آہو... اور ہے بھی کوئی سچ مچ کی نواب زادی۔ بڑی اونچی جگہ دل لگایا ہے شہزادے نے سچ کہتا تھا زندگی میں جو بھی کام کروں گا اونچا کروں گا۔ لو دیکھ لو ثابت کر دیا۔ کاروبار نام روپیہ پیسہ سب اپنی مرضی کا حاصل کیا اور اب ووہٹی بھی اپنی مرضی سے اونچے نام والے گھرانے کی لا رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ وہی کیا جو اس کا دل چاہا... پھر چاہے رستے میں جو رکاوٹ ہو' اس نے پرواہ نہیں کی۔ اس بار رستے کی رکاوٹ ہم ہیں وہ ہماری پرواہ کیا کرے گا۔ ہائے ہائے یہ دن بھی دیکھنا لکھا تھا نصیب میں..." وہ آنسو بہانے لگی۔

"شہزادے نے تو ہمارا پتا ہی صاف کر دیا۔ ہمیں اپنی زندگی سے ہی نکالنے کی سوچ رہا ہے

"اور میں اس شخص سے ہمدردی کی آس لگائے بیٹھی تھی۔" دعا کو اپنی امیدوں پہ ہنسی آگئی۔ وہ بغیر کچھ کہے چپ چاپ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے پتا تھا کہ اب اسے کہاں جانا تھا۔

وہ سب... جو اسے چاہیے تھا۔

اور لینے والے کی طلب جب بڑھ جائے تو اسے اس بات سے مطلب نہیں رہتا کہ دینے والا کون ہے۔ اسے تو صرف لینے سے غرض باقی رہتی ہے۔

● ● ●

بابر ہمایوں مغل سگریٹ کی ڈبیا پہ انگلیاں تھپتھپاتے ہوئے زیرِلب کچھ گنگنا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی عیار چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں تیزی سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

یہ ملک مقبول کا آفس تھا اور وہ پچھلے دس بارہ منٹ سے یہاں اکیلا بیٹھا ملک مقبول کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ بارہ منٹ اسے بارہ صدیوں پہ محیط لگ رہے تھے۔ اس کے اندر کی بے چینی اسے ایک پل سکون سے نہ بیٹھنے دے رہی تھی اور یہ بے چینی اس راز کو اگلنے کی تھی جو بابر کے نزدیک اس کی زندگی کی اب تک کی سب سے اہم اچیومنٹ تھی۔

وہ اس اضطراب کو کم کرنے کے لیے خواہ مخواہ ہی ٹیبل پر رکھی چیزوں کا از سرِ نو جائزہ لینے لگا۔ دو تین منٹ اور اس بے معنی شغل میں گزرے تو وہ ان کی ترتیب میں ردوبدل کرکے وقت گزارنے لگا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریڈ کلر کاسیٹ' دائیں جانب کردیا اور بائیں جانب انٹرکام سیٹ کے ساتھ سی' ایل آئی والا وائٹ ٹیلی فون سیٹ رکھ دیا۔ کمپیوٹر جو ملک مقبول نے نجانے کس شو میں آکے وہاں سجا رکھا تھا اور جس کی ابجد سے بھی وہ ناواقف تھا' اس کو ادھر ادھر گھمانے لگا۔

"کمپیوٹر تو ملک صاحب نے یوں سجا رکھا ہے جیسے بڑے عالم فاضل ہوں۔" وہ تمسخرانہ انداز میں بڑبڑایا۔

"حالانکہ کمپیوٹر سے ان حضرت کا تعلق ایسا ہی ہو سکتا ہے جیسے کسی تانگہ چلانے والے کوچوان کے ہاتھ میں مرسڈیز کا اسٹیئرنگ تھما دیا جائے اور وہ چابک مار مار کے اسے چلانے کی کوشش کرے۔"

"لگتا ہے چرس دماغ کو چڑھ گئی ہے یا سستا والا "ٹھرا" چڑھا رکھا ہے' اسی لیے اکیلے بیٹھے بڑبڑ کر رہے ہو۔" ملک مقبول نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"جانے دیجیے حضور' وہ دن گئے جب ہم گھونٹ گھونٹ پیا کرتے تھے اور وہ بھی سستی چرس' دیسی ٹھرا' اب تو ولایتی پینے اور پلانے کے دن آ رہے ہیں۔ آپ کو بھی لیٹر دو لیٹر چڑھا دیا کریں گے۔" وہ ترنگ میں تھا۔

"بھئی تمہیں مبارک ہو یہ لیٹر دو لیٹر ولایتی شراب' اپنا تو وہ حال ہے کہ صرف سونگھ لینے پہ ہی آؤٹ ہو جاتا ہوں' ویسے ہی' جیسے اس وقت تم ہوئے پھر رہے ہو۔" وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ضرور بابر ہمایوں مغل اس وقت فل نشے میں ہے' جبھی واہی تباہی بک رہا ہے۔

"یار' تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے' جب زیادہ آؤٹ ہو جاتے ہو تو یہاں مت آیا کرو۔ کم از کم میرے آفس میں تو نہیں۔ میرا اتنا دماغ نہیں جو ایسی بے سر پیر کی لن ترانیاں سنوں۔ مجھے اور بھی بہتیرے کام ہوتے ہیں۔ چلو شاباش۔" اس نے پچکارنے کے سے انداز میں اسے اٹھنے کو کہا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" وہ برا مانے بغیر وضاحت کرنے لگا۔

"آج کا نشہ تو بن پیے چڑھا ہے۔ یہ کامیابی کا نشہ ہے۔ کچھ پا لینے کا سرور ہے۔ منزل پہ پہنچ جانے کا کیف ہے ملک صاحب۔" وہ باقاعدہ جھوم رہا تھا۔

"لاٹری نکل آئی ہے کیا؟" ملک مقبول اب بھی اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لینے پہ تیار نہ نظر آ رہا تھا' اس نے سی ایل آئی پہ کچھ چیک کرتے ہوئے سرسری سے انداز میں پوچھا' پر خود ہی اپنے بے تکے اندازے کی تردید پیش کردی۔

"خیر' تمہاری تو لاٹری بھی نہیں نکل سکتی کیونکہ لاٹری کی ٹکٹ کون سا مفت میں ملتی ہے' خریدنی پڑتی ہے اور خریدنے والی چیزوں سے تمہارا کیا تعلق واسطہ' تمہیں تو ہر چیز دھیلہ خرچ کیے بغیر چاہیے۔"

بابر ہمایوں یوں تو بڑی اونچی ناک والا بنتا تھا' ذرا کسی نے کوئی بات کی اور اس کا غصہ سوا نیزے پہ جا پہنچا۔

"یہی تو بابر ہمایوں مغل کا کمال ہے جس کو آپ تسلیم نہیں کرتے اور کون ہے یہاں ایسا جس کی پلے سے ایک دمڑی تک نہ خرچ ہوتی ہو مگر کاروبار کبھی مندا نہیں ہوتا۔ آپ نے درست اندازہ لگایا حضور۔۔۔ ہماری واقعی لاٹری نکل آئی ہے۔ یہ قیاس بھی صحیح ہے کہ ٹکٹ ہم نے پلے سے نہیں خریدی۔ مگر ملک صاحب آپ اب تک

یہ نہیں جان پائے کہ آپ ہی کی عطا کردہ ٹکٹ سے ہم نے لاٹری کھیلی اور آج کامیاب ہیں۔"

"میری دی ہوئی ٹکٹ؟" وہ اپنا بے ڈول اور گنجا سر کھجا کے رہ گیا۔

"ابے او چرسی' تو اس وقت فل ٹن (مدہوش) لگ رہا ہے۔ میں تو کبھی کسی کو سرکس کی ٹکٹ مفت میں نہ دوں' لاٹری کی بھلا کس لیے دیتا۔" ملک مقبول کی اپنی ایک سرکس کمپنی بھی تھی۔

"آپ کی دی ہوئی ٹکٹ ملک صاحب' مس ادا۔۔۔ کچھ سمجھے یا ہم مزید تفصیل میں جائیں۔ چلیں ہم وضاحت کیے دیتے ہیں۔ جس ادا کو بیرون ملک ثقافتی ٹور پہ لے جانے پہ رضامند کرنے کا فریضہ آپ نے ہمیں سونپ رکھا تھا' اس میں ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔"

"وہ تو تمہیں ہونا ہی تھا۔ مفت کی نہیں دے رہا تھا میں تمہیں۔ یہ کام اگر تم پورا نہ کرتے تو آئندہ تمہیں اس دفتر میں قدم دھرنے کی اجازت نہ ملتی۔ یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ میرا حوصلہ ہے جو تم جیسے ناکارہ اور باتوں کے دھنی سے بھی کوئی نہ کوئی کام نکلوا لیتا ہوں' ورنہ تم ہو کس کام کے؟" آج شاید وہ بابر سے زیادہ ہی خار کھائے بیٹھا تھا' یا پھر اس کا مزید اسے رقم دینے کا کوئی ارادہ نہ تھا' جبھی چڑ کے بول رہا تھا۔ بابر کی متحمل مزاجی بھی ہوا ہو گئی۔

"ہم کس کام کے ہیں' یہ اندازہ آپ کو ہوتا ملک صاحب تو آپ ہمارا ٹیلنٹ بے کار کے چھوٹے موٹے کاموں میں ضائع نہ کرتے۔" اس کا لہجہ تیز ہوا۔

"اوہو۔۔۔ ٹیلنٹ' یعنی یوں کہو' اب تمہیں بھی چانس چاہیے۔ ہاں بھئی' ایسے ایسے بے سرے پھٹے ڈھول اپنے البم نکال رہے ہیں کہ ٹچروں کو بھی دیکھ کے حرص آتی ہے کہ کاش ہم بھی سنگر بن جائیں۔" وہ بھونڈے انداز میں منہ پھاڑ کے ہنسا۔

"مگر اس میں کامیاب صرف پیسے والے ٹچر ہوتے ہیں۔"

"ملک صاحب' آپ ہم پہ زیادہ پینے کا فردِ جرم عائد کر رہے ہیں' جبکہ درحقیقت آپ مدہوش محسوس ہو رہے ہیں ہمیں۔ جو ذرا ٹھہر کے تسلی سے ہماری مکمل بات سننے پہ تیار ہی نہیں۔" اس کا موڈ خراب ہونے لگا۔

"ادا جی' نہ صرف جانے پہ تیار ہو گئی ہیں بلکہ وہ صرف اور صرف ہمارے ساتھ جانے پر رضامند ہوئی ہیں۔ البتہ۔۔۔" اس نے ذرا توقف کرتے ہوئے پیپر ویٹ انگلیوں پہ نچایا اور بظاہر بڑے سرسری سے انداز میں بتایا۔

"وہ ہمیں بطور آپ کے مینجر کے وہاں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتیں۔"

"تو کیا اپنا سیٹھ بنا کے لے جانا چاہتی ہیں۔" وہ بات کی تہ میں اترے بغیر چلایا۔ اس سے مزید بابر کی بے تکی گفتگو برداشت نہ ہو رہی تھی' سراسر وقت کا زیاں۔۔۔ مغز ماری۔

"اب کیا اپنی کمپنی تیرے نام کردوں' سب کا باس بنا کے بھیجوں تو تب نواب زادی کے مزاج ٹھکانے آئیں گے' نہیں آتی تو نہ آئے نخرلی' ایسی شرطیں میں نہیں ماننے والا۔"

"وہ ہمیں اپنے شوہر کی حیثیت سے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔" ملک مقبول کے آگ بگولا ہو کے چیخنے چلانے کو وہ خاطر میں نہ لایا۔

"ہم شادی کر رہے ہیں۔۔۔ ادا جی سے اور وہ بھی جلد از جلد۔" اس نے ایسا دھماکا کیا کہ ملک مقبول سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھواں باہر اگلنا تک بھول گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم نے کیسے کیا؟" بہت دیر بعد اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"اب یہ تو ہماری کشش اور شخصیت کا کرشمہ ہے۔" اس نے خواہ مخواہ کالر جھاڑتے ہوئے اکڑ دکھائی۔

"ادا جی کو جو چاہیے تھا وہ صرف ہم ہی انہیں دے سکتے ہیں۔ وہ ذرا اور طرح کی لڑکی ہیں' مختلف مزاج کی۔۔۔ آپ کی دی گئی پرکشش آفرز اور مراعات انہیں متاثر نہ کر سکیں البتہ ہم سے ملنے والی محبت اور تحفظ کی خاطر وہ

سب کر گزرنے کو تیار ہو گئیں۔ اگلے ہفتے ایک سادہ سی تقریب میں ہم ان سے نکاح کر رہے ہیں۔"

"بے کھن چکر' فراڈیئے۔" اوسان بحال ہوتے ہی وہ بابر پہ برس پڑا۔

"تمہیں میں نے کام بنانے بھیجا تھا' سالے تو اپنا کام نکال آیا۔ میرا بگاڑ دیا۔"

"آپ کا ہی کام کیا ہے' بس ذرا طریقہ کار الگ ہے۔"

"خاک کام کیا ہے' تجھ سے شادی کر کے وہ کہاں محفل سجانے کے لائق رہے گی؟ پہلے ہی مشکل سے ہاتھ آئی ہے' گھر والی بن کے۔ اور وہ بھی تیرے جیسے خر دماغ شخص کی۔ وہ بھلا کب چار پیسے کمانے کے لائق رہے گی؟ بند کر دے گا تو اسے بھی اپنی گلی سڑی "کسٹڈی" کے کسی ٹوٹی چھت والے کمرے میں سلائی مشین کے آگے مشین بنا کے رکھ دے گا۔"

"غلط فہمی ہے آپ کی' محض گمان ہے یہ۔" بابر نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

"وہ ہماری "بیگم" نہیں صرف مسز ہو گی۔"

"بیگم اور مسز میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"بیگم صرف ایک ہوتی ہے۔ ہاں مسز چاہے جس کو مرضی بنا لو اور جتنی دل چاہے بنا لو یہ بات آپ سے بڑھ کے بھلا اور کون جانتا ہو گا جناب۔"

"یعنی کاروباری شادی؟"

"جی۔ ویسی ہی کاروباری شادی' جیسی کہ آپ خود تین چار نمٹا چکے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان نام کی شادیوں میں آپ کا صرف خرچہ ہی خرچہ ہوا ہے' کیا صرف انہوں نے جو آپ کی "مسز" کہلائیں وقتاً فوقتاً" جبکہ ہمارے کیس میں الگ ہو گا۔ ادا جی' وہ فریضہ نبھائیں گی جو آپ نبھاتے رہے ہیں۔ جبکہ اس شادی کے نتیجے میں ہم وہ فائدے اٹھائیں گے جو آپ کی بیویاں آپ سے اٹھاتی رہی ہیں۔ یعنی کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے ایک معقول آمدنی کا گھر بیٹھے بندوبست ہو جائے گا۔"

"واہ۔ واہ استاد۔" وہ پھڑک اٹھا۔

"میں خواہ مخواہ ہی تم پہ غیرت کا الزام لگا رہا تھا' تف ہے میری ذہنیت پہ بلا کہاں غیرت اور خودداری جیسے اوصاف اور کہاں ہمارا شہزادہ بابر ہمایوں مغل۔"

"یہ آپ ہم پہ طنز فرما رہے ہیں۔" اس کے چتون بگڑے۔

"نہ یار نہ۔ تعریف کر رہا ہوں۔ بندے کو غیرت اتنی ہی رکھنی چاہئے' جتنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ ٹھیک ہے۔ ایک بیوی گھر میں بیٹھی تو ہے ناں۔ غیرت دکھانے کے لیے وہی کافی ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"اور یہ درست بھی ہے ملک صاحب' خاندانی بیوی ہی بالآخر آپ کی حقیقی بیوی کہلاتی ہے چاہے وہ کتنی ہی ناپسندیدہ اور نااہل کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس سے آپ کی نسل آگے بڑھتی ہے' بس نسب پہ دھبا نہیں لگنا چاہیے۔"

"ہاں کردار چاہے بساند کیوں نہ دینے لگ جائے" ملک مقبول۔ زیر لب بڑبڑایا۔

"کچھ ہم سے ارشاد فرمایا حضور نے؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو تھڑدلے بن کے پہلے ہی دن ذبح نہ کر بیٹھنا۔ ہو تو تم جلد باز اور لالچی۔ میری نصیحت کو خاطر میں تو نہیں لانے لگے۔ پھر بھی سمجھانا میرا فرض بنتا ہے۔"

"مانا کہ ہم جلد باز ہیں۔ مانا کہ لالچی بھی ہیں۔ لیکن یہ تو ایک زمانہ مانتا ہے اور آپ بھی مانتے ہیں کہ بابر ہمایوں مغل بے وقوف نہیں ہے اور پھر دوسری بات "ادا جی سے شادی بے شک ہمیں بہت سے فائدے پہنچائے گی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان سے شادی کرنے کی ایک بڑی وجہ ہمارے دل میں ان کے لیے خاص جذبات ہیں۔ ہم ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتے جن سے ادا جی کو نقصان پہنچ سکے۔"

"بلے بھئی بلے۔ تو پھر شادی بھی نہ کر۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"تیرے جیسے شوہر سے زیادہ نقصان دہ چیز اس کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"جانے دیجئے ملک صاحب۔" وہ اپنی اس تعریف پہ شرما سا گیا۔

"بس یہ یاد رکھنا کہ تم پہ پہلا حق ہمارا بنتا ہے بلکہ پہلا کیا اب بھی ہمارا ہی ہے "ادا گائے گی' تو صرف ملک کے شوز میں' ناچے گی تو صرف ملک کے شوز میں۔" اس نے یاد دہانی کرائی جس پر بابر نے مصلحتاً "فوراً" تسلیم کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ میں نے کیا کر ڈالا۔"

دعا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے ساری رات سوچ گئی اس سوال کو ایک بار پھر دہرا رہی تھی۔

"کہیں جلد بازی میں کیا گیا یہ فیصلہ۔ میری زندگی کا پہلا اور اب تک واحد فیصلہ جو میں نے خود اپنی مرضی سے کیا ہے۔ میری زندگی کا آخری فیصلہ نہ ثابت ہو جائے۔ کیا میں چھاجی کے علاوہ کسی اور کی بن کے خوش رہ۔ نہیں خوش رہنا بہت بعد کی بات ہے' سوال یہ ہے کہ کیا میں زندہ رہ پاؤں گی؟"

اس نے اپنے دل سے پوچھا مگر پہلی بار وہ بھی اسے روٹھا روٹھا' مرجھایا ہوا سا لگا۔

"بس بھی کر دعا" اور کتنا ذلیل کرواؤ گی مجھے۔ اپنی اس اندھی محبت کے ہاتھوں۔" دل کراہا تھا۔

"ہاں محبتیں یک طرفہ بھی ہوا کرتی ہیں۔ مگر جس سے محبت کی جائے وہ اس محبت کے لائق ہو تو گویا محبت کرنے والا دل محبت کا حق ادا کر دیتا ہے لیکن ناقدروں کے آگے اس محبت کو رولنا۔ یہ تو محبت کی بے ادبی ہے' میرا قتل ہے۔" دل دہائیاں دیتا رہا' دعا نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اس تکلیف کو دبانے کی کوشش کی۔

"کیا تم محبت کے بغیر جی لو گے میرے دل؟"

"ہاں۔"

"مگر کیسے؟" وہ سسکی۔

"جیسے اب تک جیتا آیا ہوں۔" وہ ہنسا۔

دعا نے تکیے پہ سر رکھ کے رات بھر کی جاگی ہوئی۔ جلتی بلتی آنکھیں موند لیں۔ کل کا سارا واقعہ کسی فلم کی طرح ریوائنڈ ہو کے اس کے ذہن کے پردے پہ جاگنے لگا۔

"اس کا خیال ہے صحیح وقت پہ ہمارا اس کی زندگی سے نکل جانا ہی صحیح ہے۔" ماما جی کا دکھ بھرا لہجہ۔

"ہم اس کے رستے کی رکاوٹ ہیں' وہ ہمیں اس گھر سے بھیجنے والا ہے "اپنی نئی زندگی کی شروعات کے لیے۔" وہ ان کا تاسف۔

"بیاہ رچانا چاہتا ہے کسی نواب زادی کے ساتھ۔" مامی جی کا انکشاف۔

"کہتا تھا جو کام کروں گا' اونچا کروں گا' لو دیکھو' دل بھی اونچی جگہ لگایا۔ سنا ہے بڑے اونچی ذات کے' خاندانی نواب لوگ ہیں۔ لڑکی بھی بڑی پڑھی لکھی خوبصورت ہے "لائق فائق۔"

"اور میں۔ میں اس شخص سے ہمدردی کی آس لگائے بیٹھی تھی جو اپنے سگے ماں باپ تک کو یہ سوغات بخشنے پہ تیار نہیں۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے ان کو راستے سے ہٹانے سے بھی دریغ نہیں کر رہا۔ جسے اس لڑکی کی محبت کے آگے ماں باپ کی شفقت تک دکھائی نہیں دیتی "اسے میرا کم حیثیت سا عشق بھلا کہاں دکھائی دے گا۔ مجھ کمی کی کیا اوقات۔" وہ ڈولتے قدموں سے وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اس گھر سے مایوس ہی نکلی تھی۔

خالی دل لیے۔

خالی ہاتھ گرائے۔

اور خالی جھولی سمیٹے۔

فرق اتنا تھا کہ اس بار وہ دوبارہ کسی آس کے ساتھ یہاں نہ آنے کے ارادے سے نکلی تھی اور ایسا نہ تھا کہ اسے عمر بھر یہ دل پہ ہاتھ اور یہ جھولی خالی رکھنا تھی۔ وہ اب کہیں اور جا رہی تھی۔

ایک در بند ہوا تھا تو ہزار در نظر آنے لگے اور وہ ایک در جو اس نے کبھی کھٹکھٹایا بھی نہ تھا مگر اس کے لیے خود بخود بڑی چاہ سے کھل گیا تھا' اس کے قدم اسے اسی جانب کھینچے لیے جا رہے تھے۔

اور لینے والے کی طلب جب بڑھ جائے تو اسے اس بات سے مطلب نہیں رہتا کہ دینے والا کون ہے' اسے تو صرف لینے سے غرض رہتی ہے۔

''مغل صاحب' میں آپ سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔'' اس کے اقرار نے بابر ہمایوں مغل پہ نجانے کون سے خزانے نچھاور کر ڈالے تھے جو وہ اپنی خوشی چھپانے میں رتی بھر کامیاب نہ ہو پا رہا تھا۔ اسے خوشی سے بے قابو ہوتے دیکھ کے دعا کے دل کو تسکین ہونے لگی۔ اس کے ٹھکرائے ہوئے دل کی عزت نفس بحال ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

''خیر تو ہے آپا حضور' اللہ نظر بد سے بچائے' عرصے بعد آپ کے چہرے پہ وہ مسکراہٹ دیکھ رہے ہیں کہ خود بخود کرنوں کی طرح پھوٹتی جا رہی ہے۔''

صاحبزادی حرمت النساء نے کرتے کی تُرپائی کرنے کے دوران تیسری بار اپنی بڑی بہن کو بیٹھے بیٹھے بلاوجہ مسکراتے پایا تو سوال کرنے سے خود کو روک نہ پائیں۔

''صاحبزادی حرمت النساء آپ کی سادگی کے کیا کہنے' مسکراہٹ تو خیر ہی کی نشانی ہے' پھر ہمیں مسکراتے پا کے آپ ہماری خیریت کیوں دریافت کر رہی ہیں' خدانخواستہ خیریت نہ ہوتی تو کیا ہم مسکراتے؟''

''اللہ آپ کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے' ہم تو صرف اتنا چاہ رہے تھے کہ ہمیں بھی آپ اپنی خوشیوں میں شریک کر لیں۔''

''ہماری خوشیاں تو آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ آپ سے' بھائی صاحب سے' اور ہمارے بچوں سے۔ ہماری کوئی بھی خوشی' کوئی بھی مسکراہٹ آپ سب کے بنا ادھوری ہے۔ اس وقت بھی ہم اس خوش کن خیال کے تحت مسکرا اٹھے تھے' جو صاحبزادی یاسمین نے ہمیں سونپا ہے' ہر بہن کی طرح انہوں نے بھی اپنے اکلوتے بھائی کے سر پہ سہرا سجانے کے ارمان باندھ رکھے ہیں۔ صاحبزادی گل مہر کے فیصلے اور عمیص میاں کا ان کا ساتھ دینے پر وہ دل برداشتہ تو ہوئیں لیکن ہماری اور آپ کی طرح دل مسوس کے نہیں رہ گئیں بلکہ فوراً ہی اس کے ازالے کے لیے ایک ایسا حل پیش کر دیا جو یقیناً ہمارے ساتھ ساتھ آپ سب کے لیے بھی قابل قبول اور باعث مسرت ہو گا۔''

''ایسا کیا کہا صاحبزادی یاسمین نے؟'' انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ان کے خیال میں عمیص میاں چونکہ اب صاحب روزگار ہو چکے ہیں اس لیے ان کی شادی میں مزید تاخیر کرنا مناسب نہیں۔''

''ہمارا بھی یہی خیال ہے۔'' کہنے کا انداز ایسا تھا کہ یاسمین نے ایسا کون سا اچھوتا خیال پیش کر دیا۔ صاحبزادی خلعت النساء بردباری سے مسکرائیں۔

''اور اپنے بھائی کی شادی کے لیے انہوں نے ایک نام بھی تجویز کیا ہے۔''

''وہ بھلا کیا آپا حضور۔'' ایک بار پھر ان کا اشتیاق جاگا۔ ''صاحبزادی الماس خاتون۔'' صاحبزادی خلعت النساء کی ہاتھ میں گردش کرتی تسبیح کا آخری دانہ اور یہ نام ان کے لبوں سے ایک ساتھ آزاد ہوا۔

اپنی تائی حضور کے کمرے میں پلنگ پوش تبدیل کرنے کی نیت سے آتی موتیا ایک دم ٹھٹھک کے رک گئی تھی جب اس نے اندر سے آتی ان کی خوشی سے بھرپور اور جذبوں سے معمور آواز سنی تھی۔

''اور اپنے بھائی کی شادی کے لیے انہوں نے ایک نام بھی تجویز کیا ہے۔''

اس پہ وہ رک کے اگلا جملہ سننے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ وہ اگلا جملہ جو اسے بری طرح جھنجھوڑ کے رکھ گیا۔

''صاحبزادی الماس خاتون۔''

اس نے دو سوتی کی وہ سفید کلف زدہ چادر اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر سینے سے لگا لی۔ جہاں کوئی بے یقینی سے مرا جا رہا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا حضور۔'' ان کی آواز کانپ گئی۔

''ہم آپ کو وہی مژدہ سنا رہے ہیں حرمت النساء' جو صاحبزادی یاسمین نے ہمارے مردہ تن میں روح کی طرح پھونک دیا ہے۔ ہمیں اس خاندان کا شیرازہ بکھرتا نہیں دکھائی دے رہا۔ صاحبزادی الماس خاتون کا نام امید کی ایک جگمگاتی کرن کی طرح نمودار ہوا ہے۔ ہمارے دل کو تسلی ہو گئی ہے کہ اب ہمارے اکلوتے فرزند اپنے حصے کی وہ ساری خوشیاں سمیٹ لیں گے جو کسی اچھے ہم سفر کی عنایت کردہ ہوتی ہیں۔ صاحبزادی الماس میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جن کی ہم نے اپنی ہونے والی بہو کے حوالے سے خواہش کی تھی۔ وہ سعادت مند ہیں' خوش شکل ہیں' خوش گفتار ہیں' گھر بنانے والا مزاج اور دل جوڑنے والا وصف رکھتی ہیں اور بھلا کسی کو کیا چاہیے۔''

کہتے کہتے انہیں احساس ہوا کہ ان کی بہن بہت دیر سے خاموش صرف سن ہی رہی ہیں۔

''ارے' ہم بھی خوشی سے کیسے بے حال ہوئے کہ بس اپنی ہی سناتے گئے۔ آپ سے تو پوچھا تک نہیں کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا آپ ہماری جھولی میں یہ گوہر۔ اپنا بیش بہا الماس ڈالیں گی؟ کیا اس بار ہم بامراد ہوں گے یا۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا حضور۔'' حرمت النساء نے تڑپ کے ان کے دونوں ہاتھوں پہ پھیلا دامن سمیٹ دیا۔

''اللہ وہ وقت نہ لائے کہ آپ کو ہمارے آگے دامن پھیلا کر ہمیں شرمندہ کرنا پڑے۔ ہم تو شرم کے مارے آپ سے آنکھ ملانے کے قابل نہ رہے تھے کہ ہماری ہی اولاد' ہماری اپنی دی ہوئی ڈھیل کی وجہ سے آپ کے دکھ کا باعث بنی' ہمیں آپ کا سوال لوٹانا پڑا۔ نواب صاحب کی دگرگوں حالت کی بھی ایک بڑی وجہ یہی شرمندگی ہے کہ آپ کو دیا عہد ٹوٹ گیا۔ وہ سوچتے ہیں کہ نجانے اللہ نے عمر کے اتنے سکے باقی رکھے بھی ہیں یا نہیں کہ وہ اپنی آپا حضور۔ اپنی بھابھی حضور کو انجانے میں دیے گئے اس دکھ کا کبھی ازالہ کر سکیں۔ اور رب کی مہربانی۔ ہمیں خود ہی آج یہ موقع مل گیا۔ ہم ابھی نواب صاحب کو یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ اللہ نے ہماری لاج رکھ لی۔ ہمیں ہماری آپا حضور اور آپ کو آپ کے مرحوم بھائی کے آگے سرخرو کر دیا۔ ہمارا عہد ایک بار ٹوٹا۔ مگر اب پھر کبھی نہ ٹوٹنے کے لیے قائم ہو رہا ہے۔''

وہ خوشی سے کپکپاتے لہجے کے ساتھ کہتی اٹھیں اور موتیا دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ جلدی سے وہاں سے ہٹی۔

وہ حیران پریشان' اللہ سے مخاطب تھی۔

''مگر اللہ میاں۔ کیا بن مانگی دعائیں بھی تو قبول کر لیتا ہے۔ وہ دعائیں جو دل سے لب تک بھی نہیں آپاتیں' وہ تیری بارگاہ تک کیسے پہنچ جاتی ہیں؟ وہ ہاتھ جو ابھی اٹھے تک نہیں' ان ہاتھوں کو تو نے بھر کیسے دیا؟''

اگر یہ واقعہ آج سے مہینہ بھر پہلے ہوا ہوتا تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے کی بجائے وحشت سے چکرا جاتا۔ وہ عمیص کو چاہتی ضرور تھی اور آج سے نہیں بہت عرصے سے۔ شاید تب سے جب سے وہ عمیص کو جانتی تھی' لیکن وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھی کہ عمیص سے اس کی محبت جتنی پرانی ہے' گل کے لیے عمیص کا عشق بھی اتنا ہی قدیم ہے۔ اس کے باوجود کہ گل نے کبھی اس کے جذبوں کو پذیرائی نہیں بخشی' وہ ہمیشہ عمیص پہ پہلا حق گل کا سمجھتی رہی۔ اس نے اپنی اور عمیص کی دوستی کو کبھی غلط انداز سے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے گل کی بے رخی سے فائدہ اٹھا کے عمیص کو اس کی جانب سے متنفر کرنے اور اپنی جانب راغب کرنے کی

بھی او چھی کوشش نہیں کی۔ ایسے میں اگر گھر میں اس کا نام عمیص کے لیے لیا جاتا تو اسے خوشی کی بجائے تکلیف ہوتی۔ اسے لگتا جیسے وہ عمیص کے راستے میں رکاوٹ بن گئی ہے وہ راستہ جو اسے گل کی جانب لے جا سکتا ہے اسے لگتا اس نے گل سے وہ سب خوشیاں چھین لی ہیں' وہ خوشیاں جو عمیص اسے دے سکتا ہے لیکن اب ایسا کچھ نہ تھا۔ گل نے اپنے ہاتھوں سے خوشیوں کا وہ دروازہ خود پہ بند کیا تھا' عمیص نے خود اپنی مرضی سے گل کی جانب جانے والا وہ رستہ ترک کر دیا تھا جس پہ وہ بڑی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے پچھلے کئی سالوں سے گامزن تھا۔

اب اگر اللہ اس کی قسمت میں 'من چاہا ہم سفر لکھ رہا تھا' تو کوئی وہم 'کوئی پشیمانی۔۔۔ اس کی خوشیوں کا مزا کرکرا کرنے موجود نہیں ہوگی۔ موتیا نے ہلکی پھلکی ہو کے بڑے ہی صاف اور معطر دل کے ساتھ آنے والے وقت کے لیے اپنی گرمجوش بانہیں وا کر دیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ لے کرما گرم میٹھے کا حلوہ 'نال کشمیری چاء (چائے)۔" بالو نے بڑا بھاپ اڑاتا کشمیری پیالہ اس کے سامنے رکھا ساتھ پلیٹ میں خوش رنگ حلوہ پستے کی ہوائیوں سے سجا رکھا تھا۔

"ہائے۔۔۔ کشمیری چاء کے ساتھ ہوتا اگر وہ کھنڈ کلچے۔۔۔ واہ جی 'سواد آجاتا۔" بالو نے سرہلا کے گویا چٹخارہ بھر کے کہا۔

"یاد ہے کرمے 'جب ہم ڈام گلی رہا کرتے تھے۔۔۔ وہ اندرون شہر' وڈی حویلی میں کمرہ لے کے۔۔۔ یاد آیا؟ وہاں پہ جو تو موچی دروازے کے پاس سے کشمیری ہوٹل سے ناشتا لاتا تھا' کشمیری گلابی چاء' کھنڈ کلچے اور باقر خانیوں کا۔۔۔ ہائے ایسا سواد پھر کبھی نہ چکھا' وہ دیسی گھی کی تلی خستہ باقرخانیاں' وہ مکھن جیسے کلچے اور وہ خوشبو والی چاء۔۔۔ سردیوں کا سواد آجاتا تھا۔"

"چھڈ بھلیے لوکے 'اب کیسے سواد' زندگی سے سواد اور خوشی مک مکا گئی ہے۔ کھیل ختم 'پیسہ ہضم۔" کرم الٰہی نے دونوں ہاتھ جھاڑے۔

"کم گئے وہ زمانے' وہ خوشیوں بھرے ویلے۔۔۔ جب منہ میں نوالہ جاتا تھا تو سواد انگ میں اترتا تھا۔ جب بندہ ہر چیز میں خوشی ڈھونڈ لیتا تھا' حتیٰ کہ نری چاء اور باقرخانی کا ناشتا بھی ایسے آسمان پہ اڑا کے لے جاتا تھا اور اب تو بڑی سے بڑی بات دل کو ہلکا نہیں کرتی۔ ہور کون سے بھاری پتھروں کے نیچے آکے دب گیا ہے دل۔"

"یہ بھار تو تجھے خود ہولا (ہلکا) کرنا ہے کرمے۔"

"یہی جاچ (ہنر) تو نہیں آتی۔"

"چل چھڈ' چاء ٹھنڈی ہو گئی ہے اور حلوہ بھی۔"

"نہ۔۔۔ رہن دے حلوہ۔۔۔ پہلے ہی جی متلا رہا ہے' طبیعت بھاری بھاری سی ہو رہی ہے' یہ اتنے گھی اور میووں والا حلوہ کھا کے بلڈ پریشر زیادہ ہی اونچا نہ ہو جائے۔"

"لے کرمے 'تو کب سے پرہیز کرنے لگا۔"

"جب سے مجھے احساس ہوا ہے کہ میرا ناکارہ وجود بھی کسی کام کا ہے۔ میں خوامخواہ اتنے سالوں سے اپنے آپ سے شرمندہ شرمندہ سا۔ منہ چھپائے رہتا تھا کہ میں کیسا باپ ہوں' اپنے اکلوتے پتر کو سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں دے سکتا۔ لیکن اس دن شہزادے نے بتایا کہ میں بھی اس کے کسی کام آسکتا ہوں' چاہے ڈرامہ کر کے ہی سہی۔ زندگی سے بڑا ڈرامہ اور کون سا ہے اور میرے پتر نے مجھے اس ڈرامے میں ایکٹنگ کا چانس دیا ہے بالو۔" وہ ہنس پڑا۔ بلقیس اس کی ہنسی سے خوفزدہ ہو گئی جس میں عجیب سی سسکیاں تھیں۔

"بس اب مجھے خود کو اچھا اداکار ثابت کرنا ہے ورنہ شہزاد کیا سوچے گا کہ پیو کو ساری حیاتی اک کام کہا' اس بدبخت سے یہ بھی نہ ہوسکا۔" اس کا رنگ زرد اور لہجہ کمزور پڑ رہا تھا۔

"اٹھا یہ حلوہ میرے آگے سے۔ مجھے مرنا نہیں ہے یہ سب کھا کے۔ کم از کم شہزادے پہ اپنے آپ کو ایک اچھا باپ۔۔۔ اوہ میرا مطلب ہے اچھا اداکار ثابت کیے بغیر تو ہرگز نہیں مرنا۔"

اس کی آواز مزید مدہم ہوئی۔ اب وہ اپنا سینہ مسل رہا تھا۔ بالو آگے کو جھکی۔

"کرمے۔۔۔ کرمے۔۔۔ کیا ہوا؟ کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

"میں شہزادے کی شادی۔۔۔" اچانک اس کی آواز ایک دم ڈوب گئی۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا اس کا وجود ڈھیلا ہو کے ایک جانب گر گیا۔

☼ ☼ ☼

"بات کیا ہے ادا' مجھے بھی نہیں بتائے گی؟" اللہ وسایا نے چوتھی بار کمرے میں جھانکنے پہ بھی اسے روتے پایا تو بے چین ہو اٹھا' جیسا بھی تھا' بہرحال باپ تھا۔

"کل سے عجیب اجڑی اجڑی سی لگ رہی ہے۔ بات بے بات آنکھیں بھر آتی ہیں تیری۔۔۔ نہ کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے' اور صبح سے اپنی ماں کی تصویر آگے رکھ کے رو رہی ہے۔ بتا میری دھی! ماں یاد آرہی ہے؟"

"ماں کب نہیں یاد آتی ابا جی۔" اس نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے سسکی روکی۔

"اور اس موقع پہ تو ماں ہی یاد آتی ہے۔۔۔ اگر وہ نہ ہو۔۔۔"

"ہاں' یہ تے ہے۔" اس نے سرہلایا پھر جیسے بری طرح چونک اٹھا۔

"کس موقع پہ؟"

"یہی۔۔۔ شا۔۔۔ شادی بیاہ کے موقع پہ۔" جھجکتے ہوئے ہی سہی' بہرحال اس کے لیے اتنی بڑی بات باپ کے سامنے منہ سے نکالنا ہی بہت ہمت اور حوصلے کا کام تھا' جو اس نے کر دکھایا۔ اگر وہ پہلے والی دعا ہوتی تو اتنا سوچنے ہی سے اس کے حوصلے جواب دے جاتے لیکن وہ ادا تھی۔ باہر کی دنیا نے اسے خود اعتماد بھی کر دیا تھا اور قدرے بے جھجک بھی۔ جب تن تنہا اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا تو اس کا اعلان بھی اب اسی بے خوفی سے کرنا تھا اسے۔

"کس کی شادی؟" اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔

"او ہو ابا جی' میری اور کس کی؟ اور کون بیٹھا ہے اس گھر میں بیاہ کے لائق۔" وہ تنگ آکے بولی۔

"لیکن آپ کو شاید کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ آپ کی بیٹی اب۔۔۔ یا پھر آپ کو کسی نے بتایا ہی نہیں ہوگا کہ بیٹیاں صرف پیدا کر کے پالتے پوستے ہی نہیں' انہیں رخصت بھی کرتے ہیں۔" وہ چبا چبا کے بولی تو اللہ وسایا ہوش میں آیا۔ اسے بیٹی کے تیور کچھ بدلے بدلے سے محسوس ہوئے۔

"پتا ہے۔۔۔ پتا ہے۔۔۔ سب پتا ہے مجھے۔ کاکا نہیں ہوں میں۔ تیرا کیا خیال ہے میں اتنا غافل بیٹھا ہوں۔ بڑی فکر ہے مجھے تیری لیکن تجھے دھکا دے کر تو گھر سے نہیں نکال سکتا۔ نہ ہی کسی ایرے غیرے کے ہاتھ میں تیرا ہاتھ دے سکتا تھا۔ مجھے تیرے لیے اچھے سے اچھے رشتے کی تلاش ہے اور ظاہر ہے اس میں وقت تو لگے گا۔ نہ تو مجھے اتنی بھاری ہے نہ تیری دو روٹیاں مجھ پہ بھاری ہیں۔"

"میری دو روٹیاں آپ پہ بھاری ہو بھی کیسے سکتی ہیں ابا جی۔ عرصہ ہوا آپ نے ان دو روٹیوں کی فکر کرنا چھوڑ دی تھی۔"

"زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔" وہ بیٹی کے طنز کو سہہ نہ سکا۔ "دیکھ رہا ہوں' زبان زیادہ ہی چلنے لگی ہے' آنکھوں میں دید لحاظ بھی نہیں رہا۔"

"رہے گا بھی کیسے ابا جی۔ میں کوئی گھر کی چار دیواری میں عزت سے بیٹھی' ہانڈی روٹی کرنے والی "بی بی بچی" تو نہیں رہی۔"

"تو کہنا کیا چاہتی ہے؟ بیاہ کرنا چاہتی ہے؟ ہاں ہاں کرا دوں گا۔ تیری کون سی عمر گزری جارہی ہے۔ چار پیسے تو جوڑ لے پہلے' تیرے ہی جہیز کے کام آئیں گے۔" اس نے تسلی دی۔

"اسے کوئی جہیز وغیرہ نہیں چاہیے۔"

"کیسے؟" اللہ وسایا کے کان کھڑے ہوئے۔

"اسے جس سے میں شادی کر رہی ہوں۔" اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔ سوچا نہ تھا کہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ اتنی جلد۔۔۔ اور ایسے حالات میں کرنا پڑے گا۔

"میں مر گیا ہوں کیا؟" وہ دھاڑ اٹھا۔

"آہستہ ابا جی۔" دعا نے ٹوکا۔

"وہ سب لڑکیاں جو شادی کرتی ہیں' ان کے باپ مرے نہیں ہوتے۔" بے رحمی اور بدتمیزی سے اس نے جواب دیا تھا۔ اللہ وسایا اس اجنبی لہجے پہ چپ سا ہو گیا۔

"پھر بھی دھیئے' میں باپ ہوں تیرا۔ تیرے بیاہ کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا میں نے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔" اس نے گیلی پلکیں زور سے پٹ پٹاتے ہوئے حیرت ظاہر کی۔

"کبھی بتایا نہیں ابا جی آپ نے۔"

"کیا بتاتا؟ سوچا' صحیح وقت آئے گا تو سارے ارمان پورے کروں گا۔ لیکن تجھے پتا نہیں کیا جلدی مچ گئی ہے۔ ایسی عمر بھی نہیں نکلی جا رہی ہے۔ تیرا قصور نہیں لگ رہا' لگتا ہے تجھے کسی نے بہکایا ہے۔ ورغلا دیا ہے۔ نام بتا مجھے اس شوہدے کا۔"

"عزت سے ابا جی۔ یوں تو آپ چوہدری کہلانا پسند کرتے ہیں اب۔ لیکن شاید جانتے نہیں کہ عزت داروں میں داماد کا کتنا احترام کیا جاتا ہے۔"

"اوئے کون سا داماد یہ کون ہے جو آسمان سے جوائی بن کر ٹپک پڑا ہے؟"

"بابر ہمایوں مغل۔ آپ انہیں جانتے ہیں۔ وہی مغل صاحب۔۔۔ ملک مقبول کے دوست۔"

"وہ۔۔۔" اللہ وسایا مارے صدمے کے فوت ہونے لگا۔

"کیا دوست' چمچہ ہے وہ ملک کا۔ نہ کام کا نہ کاج کا۔ تجھے بھرے جہان میں وہی نشئی چرسی ملا تھا۔ اوئے کم عقلے' میں تو یہ سمجھ رہا تھا' باہر کی ہوا لگ کے تو بھی سیانی ہو گئی ہے۔ تجھے بھی اچھے برے کی پہچان ہو گئی ہے لیکن میں غلط تھا۔ تو سیانی نہیں' اندھی ہو گئی ہے۔ جو مغل جیسے دو ٹکے کے آدمی سے۔"

"خدا کا واسطہ ہے ابا جی' یہ ٹکے ٹکے کا حساب چھوڑ دیں اب۔" دعا نے ہاتھ جوڑے۔ "مغل صاحب جیسے بھی ہیں میرا انتخاب ہیں۔ میں ان سے شادی کر رہی ہوں صرف اس لیے کہ وہ مجھے اور کچھ بھلے نہ دے سکتے ہوں' عزت اور تحفظ تو دیں گے۔"

"جس کے اپنے پاس عزت نہ ہو' وہ تجھے کیا دے گا؟"

"میں جانتی ہوں' آپ کے نزدیک عزت کے معیار کچھ اور ہیں۔ لمبی سی گاڑی' چلتا کاروبار' ذاتی کوٹھی۔ بس وہی عزت دار ہے۔ ہے ناں۔ لیکن یہ تو ذات کا چمار بھی راتوں رات ڈاکا مار کے حاصل کر سکتا ہے۔ جو بابر کے پاس ہے وہ ہمارے اور آپ کے جیسے ساری عمر لگا کے بھی نہیں کما سکتے اور وہ ہے اونچا نام' خاندان۔ وہ مجھ سے شادی کر کے میرے نام کے آگے اپنا نام لگائیں گے۔ مجھے اپنے عزت دار خاندان کا ایک حصہ بنائیں گے۔"

"ہاں پہلے تو تجھے کتے کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں ناں جیسے۔" اس نے جھلاہٹ میں سر ہلایا۔

"ہونہہ۔۔۔ تحفظ چاہیے۔"

"ہاں' میرے پیچھے کتے ہیں۔" وہ پھٹ پڑی۔

"جنگلی۔۔۔ وحشی۔۔۔ آدم خور کتے۔۔۔ بڑی بڑی خونیں آنکھوں' لمبی لمبی زبانوں اور نوکیلے پنجوں والے کتے۔۔۔ وہ سب مجھے کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں۔ ابا' آپ کو وہ نظر نہیں آتے۔ لیکن وہ مجھے نوچ ڈالیں گے۔"

"پتا نہیں تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے یا بابر سے ادھار لے کر کوئی نشہ کر بیٹھی ہے۔ جو الٹی سیدھی بکواس کر رہی

ہے۔ ہو رہے' کون سا تحفظ چاہیے تجھے' کیسی مدد چاہیے۔ جھلئے شادی کے لیے اور بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ نرا خاندان ہی نہیں دیکھنا ہوتا۔"

"مگر خاندانی اور شریف لوگوں میں بس یہی دیکھا جاتا ہے۔"

"او نہیں ہوں میں شریف۔ نہیں ہیں ہم خاندانی لوگ۔" وہ ابل ابل پڑا۔ "میں اگر اپنی بیٹی بیاہوں گا تو خاندان اور عزت کے علاوہ اور بہت کچھ دیکھوں گا۔"

"آ گئے اپنی اصلیت۔۔۔"

کال بیل کی تیز آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ اللہ وسایا بکتا جھکتا باہر کی جانب بڑھا لیکن آنے والے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

"کون ہے اوئے؟" اس نے انٹر کام پہ پوچھا۔

"بابر ہمایوں مغل۔" شاہانہ سے لہجے میں بتایا گیا یہ نام اس کے تن من میں آگ لگا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جلا کٹا جواب دے کے اسے دروازے سے رخصت کرتا' دعا وہاں آ نکلی۔

"اندر آ جائیے مغل صاحب' میں لاک کھول رہی ہوں۔" اس نے انٹر کام پہ لگا ایک اور بٹن پش کیا۔ باہر کے دروازے کا لاک کلک کی ہلکی سی آواز سے کھل گیا۔ ناچار اللہ وسایا کو آگے بڑھ کے لاؤنج کے داخلی دروازے کو کھولنا پڑا۔ وہاں بابر قدرے معقول حلیے میں سامنے تھا۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا بوکے اور دوسرے میں ایک بڑا سا شاپر تھا جس میں گفٹ ریپرز میں لپٹے تحائف جھانک رہے تھے۔

"یہ کیا مغل صاحب؟" دعا نے اسے اندر کا راستہ دیتے ہوئے پوچھا۔ اس کا اشارہ ان تحائف کی جانب تھا۔

"یہ سب آپ کی اور چوہدری صاحب کی نذر کرنے کو لائے ہیں بہت حقیر سے نذرانے ہیں۔"

"ان کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے کچھ جتاتی نظروں سے باپ کو دیکھتے ہوئے تکلفاً کہا مگر اللہ وسایا نے "اونہہ" کہتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

"ہوں گے کوئی سو دو سو والے میلے سے لیے تحفے اور کیا ہے اس ٹٹ پونجیے کے پاس۔" یہ اس کی رائے تھی جس کا اظہار اس نے فی الحال دل ہی دل میں کرنا مناسب جانا۔ لیکن تب اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب بابر نے ایک کے بعد ایک وہ سب تحائف کھولے۔

اللہ وسایا کے لیے قیمتی سوٹ' امپورٹڈ پرفیوم' اور گھڑی۔۔۔ دعا کے لیے طلائی کنگن' جو اپنی قیمت کا اعلان منہ سے کر رہے تھے۔ زمرد لگی انگوٹھی' اطلس کا سنہری تاروں سے سجا عروسی لباس۔ دو بیش قیمت ساڑھیاں' دو جدید انداز میں سلے ریڈی میڈ سوٹ۔

"یہ سب آپ کیوں لے آئے؟" دعا حیران تھی۔

"یہ ہمارے ہاں کی روایت ہے ادا جی' ہم کچھ مانگنے جائیں تب بھی خالی ہاتھ نہیں جاتے۔"

"مانگنے؟"

"جی۔۔۔ ہم یہاں آپ کے والد بزرگوار سے آپ کا ہاتھ طلب کرنے آئے ہیں' بہت عاجزی کے ساتھ۔۔۔ مگر اپنے رسم و رواج کے مطابق۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ کوئی کسر نہ رہ جائے آپ کی شان کے مطابق ہی سب انتظام کیا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی گستاخی ہوئی ہو' کوئی کمی ہماری کم فہمی کے باعث رہ گئی ہو تو نظر انداز کر دیجیے گا۔۔۔ انشاء اللہ ہم آئندہ تلافی کی کوشش کریں گے۔"

اللہ وسایا اپنے لیے لائے تحائف دیکھنے کے بعد اب کب سے دعا کے لیے لائے کنگن کا معائنہ کر رہا تھا۔

"یہ ہمارے خاندانی کنگن ہیں۔ ہماری والدہ مرحومہ کی آخری نشانی۔"

"لگتے تو واقعی نایاب ہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ اب اس کا دل بابر کی ڈینگوں پہ ایمان لانے لگا تھا۔

"لیکن' ایک بیٹی کا باپ ہونے کے ناتے میں اتنا تو پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے روزگار کا سلسلہ کیا ہے؟"

"اللہ کا فضل ہے' رزق کے حصول کے لیے کبھی تردد نہیں کرنا پڑا۔ ہمارے پچھلے اتنا تو چھوڑ گئے کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے بھی زندگی کی گاڑی عزت سے چل جاتی ہے۔ آپ کی صاحبزادی کو ہم بہت آسودہ رکھیں گے۔"

"مگر رکھو گے کہاں میاں؟ میری نازوں پلی بیٹی' سوتن کے ساتھ تو ہرگز نہ رہے گی۔"

"ہمارا ارادہ بھی انہیں وہاں رکھنے کا نہیں ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ فی الحال کچھ عرصہ ادا جی یہیں رہ لیں۔ بعد میں ہمارا ارادہ ان کے ساتھ بیرون ملک سیٹل ہونے کا ہے۔"

"باہر؟" وہ چونکا۔ "لیکن یہاں پاکستان میں میری بیٹی کی چار لوگوں میں عزت ہے' ایک نام بنایا ہے اس نے بڑی مشکل سے اس کے فن کی پہچان بنی ہے۔ باہر جا کے تو اس کا بنا بنایا کیریئر خراب ہو جائے گا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ باہر جا کے ہم......" وہ اللہ دسایا کی بھرپور تسلی تشفی کرانے لگا تھا کہ دعا نے دخل دیا۔

"کیسا کیریئر اور کون سا کیریئر۔ مجھے کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں۔ مجھے اب صرف اپنے گھر سے دلچسپی ہے۔" اس کے حتمی انداز پہ وہ دونوں چپ کر گئے۔

اللہ دسایا کی چپ کے پیچھے ہار تھی۔ وہ بیٹی کے عزائم کے آگے ہار مان بیٹھا تھا۔ جان گیا تھا کہ سونے کی چڑیا نے اپنے پر تول لیے ہیں' اب اس کے پھر ہونے کے دن قریب ہیں۔ وہ چاہے بھی تو اسے روک نہیں پائے گا۔ اس کے پیچ و تاب کھانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ بیٹی کا فیصلہ تو اسے ناگوار گزر ا ہی تھا' انتخاب اس سے بڑھ کے برا لگا۔ بابر ایسا شخص نہیں تھا جو اس کی بیٹی کو کچھ دے پاتا۔ اور جب بیٹی خالی ہاتھ رہتی تو ظاہر ہے اسے کیا خاک کچھ ملنا تھا۔ اس لیے اس کی اس بحث کا مقصد بھی یہی تھا کہ اگر دعا شادی کا خیال دل سے نہیں نکالنا چاہتی تو کم از کم بابر سے شادی کی دھن ہی سر سے اتار پھینکے۔ لیکن یہ تلخ بحث بھی لاحاصل رہی۔ صاف لگ رہا تھا کہ دعا اپنے ارادے پہ پکی ہے اور بابر سے شادی کرنے پہ تلی بیٹھی ہے۔ دوسری طرف فی الحال بابر نے چند پیسے خرچ کے اللہ دسایا کی کچھ تسلی کرا دی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کچھ نہ کچھ نوابی باقی ہے۔ یونہی دنیا کو دکھانے کے لیے قلاش بنا پھرتا ہے۔ تاکہ قرض مانگنے والے خود ہی اس کی حالت دیکھ کے اپنے مطالبے پر شرمندہ ہو جائیں' یہ تو صرف ایک کنگن ہے۔ جو کسی بھی طرح ایک لاکھ سے کم مالیت کا نہیں لگ رہا اور نجانے ایسا کتنا زیور ہوگا۔ یہ کپڑے لتے اور میرے تحفے۔ ان پہ بھی اس نواب زادے نے کوئی چالیس پچاس ہزار تو لگا دیا ہوگا۔ چل بھئی..... ٹھیک ہے۔ جو بندہ کھڑے کھڑے لاکھ ڈیڑھ خرچ کر دے وہ بالکل خالی ہاتھ تو نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے واقعی سچ کہتا ہو کہ اس کے پچھلے اتنی جائیداد چھوڑ گئے ہیں کہ جوئے میں ہار ہار کے بھی ختم نہیں ہو پا رہی۔"

جب اس نے بابر کے لیے دل کو فوراً" ہی منا لیا تھا تو دعا کے اپنے کیریئر چھوڑ دینے پہ وہ زیادہ ہاتھ پیر مار کے کیا کر لیتا۔ یہ فیصلہ بھی اسے پسند تو نہ آیا مگر..... چپ کر گیا۔

بابر ہمایوں مغل کی خاموشی کی وجہ سراسر دوسری تھی۔ نہ وہ کبھی ہارا تھا' نہ اس نے کبھی ہار مانی تھی۔ جب دعا نے دوٹوک لفظوں میں کہا۔

"کیسا کیریئر اور کون سا کیریئر۔ مجھے صرف اپنے گھر سے دلچسپی ہے۔"

تو اس نے چہرے پہ فوراً" ایک ایسی مہربان مسکراہٹ سجا لی تھی جیسے دعا کی اس خواہش پہ وہ اپنا آپ نثار کرنے کو تیار ہو۔ لیکن اس کا دل دعا کی اس خواہش پہ ہزار بار لعنت بھیجتے ہوئے چپکے سے اس کی ایسی کی تیسی کرنے کے منصوبے سوچ رہا تھا۔ جوا تو وہ برسوں سے کھیلتا آ رہا تھا' کبھی جیت تو کبھی ہار..... لیکن کاروبار پہلی بار کر رہا تھا۔ پہلی بار اس نے کچھ انویسٹ کیا تھا اور وہ گھاٹا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ہر حال میں دو کے بدلے چھ چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس وقت شہر کے مہنگے ترین پرائیویٹ ہاسپٹل کے شیشے سے چمکتے کاریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

کاریڈور کے اس سرے پہ بنے اس کونے میں' جو نماز کے لیے مخصوص تھا' اس کی ماں' بلقیس المعروف بالو۔ دبیز قالین پہ بچھی نرم جائے نماز پہ قبلہ رخ بیٹھی نفل پڑھ رہی تھی۔ اندر آئی' سی یو میں اس کا باپ کرم الٰہی ـــ المعروف کرما۔ ماضی کا مقبول کامیڈین اور اسٹیج آرٹسٹ' بلبلہ مصنوعی تنفس کے سہارے موت سے لڑ رہا تھا۔

"سسٹر' اب میرے فادر کی طبیعت کیسی ہے؟" اندر سے آتی نرس کو روک کے اس نے بے تابی سے پوچھا۔

چار گھنٹے پہلے ـــ ماں کا فون آیا تھا۔ وہ فوراً" گھر پہنچا اور نیم بے ہوش کرم الٰہی کو یہاں لے کر پہنچا۔ دو گھنٹے تک ڈاکٹر کے رحم و کرم پہ رہنے کے بعد اسے آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا۔ تب ڈاکٹرز کی ہدایت پہ صرف ایک فرد کو چند منٹ کے لیے اندر جانے کی اجازت ملی تھی۔ شہزاد نے ایک نظر ماں کے سہمے ہوئے زرد چہرے پہ ڈالی تھی اور اسے اندر بھیج دیا تھا۔ تین منٹ بعد جب وہ نرس کے کہنے پہ باہر نکلی تو اس نے چادر کا پلو منہ میں دبا رکھا تھا' اپنی سسکیاں روکنے کے لیے اور آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں۔

"تیرا ابا ابھی تک بے ہوش ہے۔"

شہزاد کے پوچھنے پہ اس نے اتنا بتایا تھا۔ تب سے وہ آئی سی یو کے باہر بے چین سا ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے باپ کا چہرہ اور کانوں میں اس کی آواز بار بار آ رہی تھی۔

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔" نرس نے مختصر سا جواب دے کر اس کے اضطراب کو دگنا کر دیا۔ وہ اس کے پیچھے ہی ڈاکٹر کے کمرے میں چلا آیا۔

"دیکھیے مسٹر شہزاد' آپ کے والد کو بہت سیریس ہارٹ اٹیک ہوا ہے' ساتھ میں فالج کا بھی لائٹ سا اٹیک ہوا ہے۔ فالج کا حملہ اگرچہ بہت شدید نہیں ہے مگر اس کے اثرات ان کے دماغ پہ پڑے ہیں جس کی وجہ سے ان کی بے ہوشی طویل ہو رہی ہے۔ اب کسی دوسرے اٹیک کا خطرہ تو فی الحال نہیں ہے۔ نہ ہارٹ اٹیک کا' نہ ہی فالج کے حملے کا۔ لیکن اگر بے ہوشی کچھ گھنٹے مزید رہی تو یہ خدانخواستہ کومے میں جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے تفصیل سے اسے کرم الٰہی کی حالت سے آگاہ کیا۔

"کومے میں ـــ؟"

"جی ہاں اور یہ کوما کتنا طویل ہو سکتا ہے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"تو پھر آپ انہیں جلد از جلد ہوش میں لانے کی کوشش کیجیے۔ اس پہ جتنا بھی پیسہ لگ سکتا ہے۔ پرواہ مت کیجیے۔ کسی بھی اسپیشلسٹ کو ملک کے کسی بھی کونے سے بلوانا چاہیں بلوا لیجیے۔"

"ہم جو کر سکتے تھے' کر چکے ہیں مسٹر شہزاد' ان کا دل اب دوسرے دورے سے بالکل محفوظ ہے۔ فالج سے ان کے دائیں حصے کو مفلوج ہونے سے بھی ہم بچا چکے ہیں۔ ہلکے سے اثرات ہیں جو چند روز کی فزیو تھراپی سے دور ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی بے ہوشی دور کرنے کے لیے ہم زیادہ کوشش نہیں کر سکتے۔ اس کا فائدہ ہونے کی بجائے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ آپ بس دعا کیجیے۔"

"دعا...!" وہ چونکا۔

"دعا میرے کلیجے کی پھانس ہے شہزادے۔" کرم الٰہی کے ایک بار بے حد کرب سے ادا کیے اس فقرے نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔

"میں اپنی مرتی ہوئی بہن سے اس کی بیٹی کی حفاظت کرنے' اسے خوش رکھنے کا وعدہ کر بیٹھا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" اس نے بیٹے کو بڑی آس سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ تب وہ نظریں چرا گیا تھا۔ اب جھکا کے رہ گیا۔

"انہیں دعا کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر کا فقرہ ایک بار پھر اس کے ذہن میں گونجا۔

"ہاں انہیں دعا کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں' انہیں دونوں طرح کی دعا کی ضرورت ہے۔ لیکن ابا کی طرح میرے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں۔ میں بھی ان کی خواہش پوری کرنے کے قابل نہیں۔ ان کی خواہش پوری کرنے کا

مطلب ہے اپنی خواہش سے دست بردار ہونا۔ ان کے کلیجے کی پھانس نکالنے کا مطلب ہے' اپنے دل میں تیر گھونپ لینا۔ انہیں اس وعدے کے بوجھ سے ہلکا پھلکا کرنے میں ساری عمر بھاری سل کے نیچے دب کے نہیں گزار سکتا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ میں ان کے لیے صرف دعا کر سکتا ہوں' دعا دے نہیں سکتا۔"

پل بھر کے لیے دل میں آئے اس خیال کو اس کی خود غرضی اور کم ظرفی نے جھٹک کے رکھ دیا۔

"آپ اب اپنے فادر سے مل سکتے ہیں' آئی مین ہم نہیں دیکھ سکتے ہیں کیونکہ ابھی تک وہ بے ہوش ہی ہیں۔"

نرس کی اجازت ملنے پہ وہ تیر کی طرح اندر لپکا۔ سفید بے داغ اور بے شکن چادر والے بستر پہ پڑا کرم الٰہی کا وجود اس لٹھے سے بڑھ کر سفید پڑ چکا تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی لگ رہی تھیں' چار پانچ گھنٹوں میں گویا اس کا سارا خون نچڑ گیا تھا' وہ ادھ موا ہو کے رہ گیا تھا۔ شہزاد کے دل پہ گھونسا پڑا۔ ضمیر ایک بار پھر انگڑائی لے کے بیدار ہونے لگا۔

"شاید ان کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہوں۔" اس نے کرمے کا استخوانی یخ بستہ ہاتھ اپنے لرزتے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اپنی عمر سے دس سال زیادہ ضعیف نظر آ رہا تھا۔

"ابا جی۔" اس نے ہلکی سی سرگوشی کی۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ اتنی نرمی اور اپنائیت سے اپنے باپ کو مخاطب کرنا کب کا چھوڑ چکا تھا۔ بغیر پانی کے تو پودا بھی مرجھا جاتا ہے۔ یہ تو پھر انسان تھا' اکلوتی اولاد کی بے اعتنائی نے اسے اس حال تک پہنچانا ہی تھا۔

"ابا جی' آنکھیں کھولیں۔" ایک بار پھر اس نے التجا کی۔ اب وہ اس کے ہاتھ اپنی نم پلکوں سے لگا رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے بند پپوٹوں سے لگے اس کے ٹھنڈے ہاتھوں میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا۔ اس نے فوراً پلکیں کھول کے کرم الٰہی کی جانب دیکھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔

"ابا جی' خدا کا واسطہ ہے آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر مجھے دیکھیں مجھے یقین دلائیں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ میں آپ کو یوں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے میری گستاخیوں' میری کوتاہیوں کی اتنی بڑی سزا مت دیں۔ کہ رہتی دنیا تک میں خود اپنی نظروں میں گرا رہوں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔ ابا جی۔"

وہ گڑگڑا رہا تھا اور اسی وقت کرم الٰہی کی آنکھیں دھیرے دھیرے کھلنا شروع ہوئیں۔

☼ ☼ ☼

"سر' آپ کے والد کی طبیعت اب کیسی ہے؟؟"

گل نے اس سے دریافت کیا۔

"پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ میں تو ابھی انہیں ہاسپٹل میں ڈاکٹرز کے انڈر آبزرویشن رکھنا چاہتا تھا مگر وہ گھبرا اٹھے تھے اور گھر آنے پہ مصر تھے۔ مجبوراً" کل ہی انہیں ڈسچارج کرانا پڑا۔"

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟؟"

"خاصے پر امید ہیں۔ جتنا ان کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے اس کی وجہ سے ہارٹ پرابلمز کا ہونا تو لازمی ہے۔ لیکن اگر پرہیز اور دوا کا استعمال جاری رہا تو انشاء اللہ دوسرے ہارٹ اٹیک کا خطرہ ٹل جائے گا۔ بس ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ انہیں ہر طرح کے ذہنی دباؤ اور ٹینشن سے دور رکھنا ہے۔"

"جو کہ سب سے مشکل کام ہے۔" وہ مسکرائی۔

"کیا مطلب؟؟" وہ جز بز ہوا۔

"اس عمر میں پہلا شوق یہی تو ہوتا ہے۔ یعنی فکریں پالنا۔ آپ بزرگوں کو ذہنی دباؤ سے دور رکھنے کی کتنی بھی کوشش کر لیں مگر انہوں نے کوئی نہ کوئی ٹینشن۔ لینی ہی ہوتی ہے۔ خصوصاً" اولاد کے حوالے سے۔ ہماری والدہ کو ہی لے لیجیے' ہم اب بچے نہیں رہے مگر موسم کوئی سا بھی ہو' انہیں یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ اس کے اثرات ہم پہ نہ ہوں۔ کام کا دباؤ ہمیں بیمار نہ کر ڈالے۔ کبھی ہماری نظر کمزور ہونے کا ڈر۔۔۔ کبھی رنگت پیلی ہونے کا وہم۔۔۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اس طرح ہمارے والد صاحب۔۔۔ ان کے تفکرات کچھ الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ اس نے محسوس کیا تھا' شہزاد گہری دلچسپی لیے اس پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ وہ اچانک جھینپ سی گئی۔

"کچھ نہیں گل۔ آپ کہتی رہیے' اچھا لگ رہا ہے۔" اس سادہ سی تعریف پہ وہ گل گوں ہو کے سر جھکا کے رہ گئی۔

"آج پہلی بار آپ نے اتنی اپنائیت سے اپنی ذات کے متعلق اپنے گھر اور فیملی کے بارے میں کوئی بات اس قدر تفصیل سے بتائی ہے۔ مجھے واقعی بہت اچھا لگا بہت اپنا اپنا سا۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو کیا ہم آپ کے والد صاحب کی عیادت کے لیے آجائیں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" شہزاد کا موڈ اور لہجہ' دونوں ایک دم تبدیل ہوئے۔

"لیکن ہمارا خیال تھا کہ ان کی مزاج پرسی۔۔۔"

"آپ نے مجھ سے پوچھ لیا' میں آپ کے جذبات ان تک پہنچا دوں گا۔ انہیں بھی دلی خوشی ہوگی یہ جان کر کہ آپ ان کے لیے فکر مند ہیں لیکن آپ کو خود جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" گل مہر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اسے شہزاد کا منع کرنا برا نہیں لگا' اس کا روکھا انداز برا لگا۔

"پلیز گل' مائنڈ مت کیجیے گا۔" وہ اس کے تیور بھانپ کے سنبھل گیا۔

"میں نہیں چاہتا کہ جس گھر میں میں آپ کو پوری شان و شوکت اور دھوم دھام سے لے جانے کا خواہش مند ہو۔ وہاں آپ پہلی بار قدم رکھیں تو اس افسردہ ماحول میں۔ میری والدہ بھی خاصی پریشان ہیں ان دنوں۔ وہ آپ کے شایان شان نہ تو استقبال کر سکیں گی نہ ہی بہو کے پہلی بار گھر آنے پہ ڈھنگ سے خوشی منا سکیں گی۔ اس کا قلق انہیں بعد میں رہے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرا دی۔

"ہم کون سا مرے جا رہے ہیں عیادت کو۔" یہ جملہ اس نے دل میں ادا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرے خدایا' سردی ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔" موتیا نے اپنی جرسی کو کمر سے نیچے تک کھینچنے کے بعد دونوں ہتھیلیوں کو مسل کر۔۔۔ ان کی ٹھنڈک کم کرنے کی کوشش کی۔

"تمہیں کس نے کہا تھا اس قدر سردی میں کپڑے دھونے کو۔" **عمیص** آج مکمل چھٹی کے موڈ میں تھا' جبھی دن کے بارہ بجے تک کسلمندی سے پڑا تھا۔ ناشتے کے لیے وہ کمرے سے باہر نکلا تو دوبارہ اندر نہیں گیا لیکن برآمدے کے تخت پہ ہی لحاف میں دبک کے دھوپ نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔

"آج تو دھوپ بھی نہیں نکلی۔ پتا نہیں تمہارے کپڑے سوکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ کیا ضرورت تھی اتنی کارکردگی دکھانے کی؟؟"

"اور تمہیں کیا ضرورت ہوتی ہے دن میں دو بار کپڑے تبدیل کرنے کی۔ میلے کپڑوں کا ڈھیر لگاتے ہوئے کسی کو دھیان نہیں ہوتا کہ سردی ہے یا گرمی۔۔۔ دھوپ نکلے گی یا نہیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن تمہارے اور گل کے کمرے سے ایک ڈھیر برآمد ہوتا ہے میلے کپڑوں کا۔" وہ ہیٹر کے بالکل نزدیک بیٹھ گئی اور **عمیص** کے آگے سے چلغوزوں کی پلیٹ بھی اٹھالی۔

"دو چیزیں ہیں جن پہ موسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایک تو موتیا بی بی کی صفائی ستھرائی اور دھلائی..... دوسرا نواب صاحب کے ملاقاتوں کی آمد۔" دلگیر ہاتھ نچاتا راہداری سے برآمد ہوا۔

"آندھی کے جھکڑ چل رہے ہوں لیکن موتیا بی بی جھاڑو پھیر رہی ہوں گی۔ موسلا دھار بارش برس رہی ہے اور یہ ہماری چھوٹی بی بی وائپر چلا رہی ہیں۔ کڑاکے کی سردی اور دھند میں واشنگ مشین چل رہی ہے اسی طرح طوفان ہو چاہے زلزلہ..... نواب صاحب کے دوست احباب کا ریلا بہا ہی چلا جاتا ہے۔ اف توبہ کوئی کرے تو کیا کرے۔"

اس نے نازے ماتھا پیٹا۔

"دلگیر، کبھی کبھی تم سخت اوور ایکٹنگ کا شکار ہو جاتے ہو یار۔ اپنی اداکاری میں نکھار پیدا کرو، پرفارمنس میں کچھ نکھار لاؤ جگر۔" عمیص نے مفت کا مشورہ دیا۔

"اور یہ تم کہاں چل دیں؟" موتیا کو چلغوزوں کا شغل ترک کرکے اٹھتے دیکھا تو پوچھنے لگا۔

"کچن میں اور کہاں۔ ابا حضور کی بیٹھک میں چائے ناشتا وغیرہ بھجواؤں۔ صبح سے نجانے دلگیر نے ڈھنگ سے کچھ پیش بھی کیا ہوگا یا نہیں، میں تو پچھلے آنگن میں کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ تمہیں تو پتا ہے ابا حضور اس معاملے میں ذرا بھی کوتاہی برداشت نہیں کرتے۔"

"لیکن میں تو جب سے یہاں بیٹھا ہوں، میں نے چچا حضور کو ان کے کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔"

"یہی تو میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں بی بی کو۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں مہمانوں کا آنا جو میں تنگ آجاتا۔ نئی بات تو یہ ہے کہ آج نواب صاحب نے کسی بھی ملاقاتی سے نہ ملنے کا اعلان فرمایا ہے اور میری ننھی سی جان آنے والوں کو معذرت سے واپس بھیجتے ہوئے نڈھال سی ہوگئی ہے۔"

"ابا حضور کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ فکر مند ہوئی۔

"وہ ناشتے پہ بھی باہر نہیں آئے۔ میں سمجھی کہ شاید سردی کی وجہ سے۔"

"طبیعت تو بہتر ہے البتہ مزاج شریف میں کچھ گڑبڑ کے آثار ہیں۔" وہ آنکھیں مٹکاتا چلا گیا۔

"کیا پھر کوئی نیا واقعہ؟" عمیص نے جاننا چاہا۔

"نہیں تو۔ کل شام کی چائے دینے میں ان کے کمرے میں گئی تھی۔ تب تک تو ان کا موڈ..... ہاں بس ٹھیک ہی تھا۔ خوشگوار تو ہم کہہ نہیں سکتی کہ اب یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں۔" وہ افسردگی سے بتانے لگی۔

"ایسا کیوں سوچتی ہو۔ چچا حضور نے عمر بھر کسی کا برا نہیں چاہا، ان کے ساتھ برا کیوں ہونے لگا۔ انشاءاللہ حالات بہت جلد بہتر ہو جائیں گے گھر کے بھی اور باہر کے بھی۔ ان دنوں وہ دوہری پریشانیوں کا شکار ہیں، ایک طرف مالی مشکلات ہیں تو دوسری جانب گھریلو ماحول میں تلخی۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ آزمائش کے دن ختم ہو جائیں گے۔ گل مہر کی شادی ہو جائے گی، وہ اپنے گھر میں خوش باش ہوگی تو چچا حضور کے سارے گلے اور ملال جاتے رہیں گے۔ بہرحال وہ باپ ہیں، اولاد کی خوشیاں ہی ان کی تسکین کا باعث ہیں۔"

"اولاد کو بھی تو سوچنا چاہیے۔ اللہ کرے تمہارا کہنا جلد سچ ثابت ہو لیکن تب تک کے لیے وہ جس ذہنی اذیت سے گزر رہے ہیں، اس کا کیا حل ہے؟"

"ہاں میں مانتا ہوں میں اور گل مہر ہمیشہ دانستہ، نادانستہ انہیں تکلیف دینے کا باعث بنے ہیں لیکن اب ایسا نہ ہوگا موتیا۔ گل تو اپنے گھر چلی جائے گی اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا کچھ نہ کروں گا جس سے ان کی دل آزاری ہو۔ اگر ان کی کوئی بات میرے لیے ناپسندیدہ یا ناقابل قبول بھی ہوئی تب بھی میں ان کا کہا لوٹاؤں گا نہیں۔" وہ پورے دل سے کہہ رہا تھا اور موتیا کے دل میں ہلچل سی مچ رہی تھی۔

"سوچ لو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں کچھ ایسا کہہ دیں، جس کے بارے میں تم نے سوچا تک نہ ہو۔"

"ظاہر ہے وہ مجھے زہر پھانکنے یا کنویں میں کود جانے کا حکم تو نہ دیں گے۔"

"یہ تم لوگ صبح صبح کس بحث میں الجھے ہو۔ ساری نیند کا مزا کرکرا کرکے رکھ دیا۔

"سبحان اللہ، دن کے بارہ بجے ہیں انہیں صبح صبح کا گمان ہو رہا ہے۔ ظہر کا وقت ہو رہا ہے صاحبزادی گل مہر۔"

"اتنی سردی میں دوپہر ہوتی ہی کب ہے۔ دھند کی وجہ سے دوپہر کے ایک دو بجے تک منہ اندھیرے کا ہی گمان ہوتا ہے اور نیند پوری کرنے کے لیے ایک چھٹی کا ہی دن تو ہوتا ہے۔ خیر تمہیں کیا، تمہارے لیے تو ہر دن چھٹی کا دن ہے ہم سے پوچھو۔"

"ہاں بڑے عیش کر رہی ہوں میں۔" موتیا چمک کے بولی۔

"مجھے تو یہ تک نہیں پتا، چھٹی ہے کس بلا کا نام۔ ہفتے کے سات مہینے کے تیس اور سال کے تین سو پینسٹھ دن میرے لیے ایک جیسے ہی ہیں۔ وہی دن کا آغاز کچن میں وہی اختتام کچن میں۔"

"شادی کر لو، چینج آجائے گا۔" عمیص نے چلغوزے پھانکتے ہوئے ہمدردانہ مشورہ دیا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی موتیا ایک دم چپ کر گئی۔ کل کی گفتگو اسے نئے سرے سے یاد آگئی۔ چند فٹ کے فاصلے پہ بیٹھا اپنا بچپن کا دوست اور ساتھی عمیص اچانک اسے بہت نیا اور اجنبی سا لگنے لگا۔ اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

"کیسا چینج؟" گل نے مذاق اڑایا۔

"جب تک ان محترمہ کی عادتوں میں چینج نہیں آئے گا، زندگی میں کیسے آئے گا۔ یہ وہاں جاکے بھی یہی کچھ کرنے والی ہے۔ تم پتا نہیں کس تبدیلی کی نوید سنا رہے ہو، شاید تب دن کا آغاز اسٹور روم میں اور اختتام کوریڈور میں ہونے لگے۔"

"تم اپنے بھونڈے مذاق اپنے پاس رکھو۔ شادی تمہاری ہو رہی ہے اس لیے آئندہ کی منظر کشی اپنی زندگی کے بارے میں کرو کہ تمہارا دن کہاں سے نکلے گا اور رات کہاں ہوگی۔"

"یار گل، شادی سے یاد آیا، وہ تمہارے شہزاد صاحب کہاں رہ گئے؟ کہیں تم نے انہیں چچا حضور سے زیادہ ہی تو نہیں ڈرا دیا؟"

"وہ ڈرنے یا پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ایکچوئلی ان کے فادر کی طبیعت خراب ہے۔ انہیں بہت سیریس ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ کئی دن ہاسپٹلائز رہنے کے بعد پرسوں ہی گھر آئے ہیں۔ ظاہر ہے فی الحال انہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ وہ اتنے دن ہاسپٹل رہے، ہم میں سے کسی کو جانا چاہیے تھا۔ کم از کم میں ہی چلا جاتا۔"

"نہیں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ابھی تک باضابطہ طور پہ دونوں خاندانوں میں بات چیت کا آغاز نہیں ہوا، کوئی جان پہچان بھی نہیں، ایسے میں تمہارا جانا۔"

"میں تمہارے کزن کی حیثیت سے تمہارے باس کے والد کی طبیعت دریافت کرنے تو جا سکتا ہوں۔ عیادت سنت ہے اس پہ کوئی کیوں اعتراض اٹھانے لگا۔ کیا شہزاد کی فیملی بہت روایت پسند اور کنزرویٹو ہے؟"

"پتا نہیں۔" گل مہر نے شانے اچکائے۔

"ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اتنا جانتے ہی نہیں ان کی فیملی کے بارے میں۔"

"اب تو جانتی ہو۔ ظاہر ہے اس نے اپنی فیملی کے بارے میں کچھ تو بتایا ہوگا۔"

"زیادہ کچھ نہیں۔ وہ ذاتیات کے بارے میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے۔"

"ذاتیات؟" وہ کھٹکا۔

"تمہارا اس سے جو رشتہ قائم ہونے جا رہا ہے اس کے بعد بھی کیا اس کی فیملی تمہارے نزدیک اس کی 'ذاتیات' ہے۔ مجھے لگتا ہے تمہیں اس کے بارے میں اور بھی کچھ جاننا چاہیے۔"

"مان لو گل، شرافت سے اس کا مشورہ مان لو۔" موتیا نے لقمہ دیا۔ "یہ آج مفت کے مشورے بانٹ رہا ہے۔ مجھے اور دلگیر کو تو عنایت ہو چکے ہیں، اب تم پہ نظر کرم ہوئی ہے۔"

"ہمیں فی الحال صرف ناشتے کی طلب ہے۔ کیا ملے گا؟" میں تو اس وقت ہیٹر کے آگے سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ ہاٹ پاٹ میں تمہارا پراٹھا رکھا ہے' آلو کی بھجیا کڑاہی میں ہے' صبح بنائی تھی اب تک تو جم چکی ہوگی گرم کرنے کی زحمت کرلینا' انڈہ بنانا چاہو تو مجھے آواز دینے کی غلطی مت کرنا' فرائی کرنا تو تمہیں بھی آتا ہے اور ہاں چائے بناؤ تو لیک ایک کپ ہم دونوں کو بھی عنایت کردینا۔" وہ ہاتھ سینک رہی تھی۔

"گل کتنی بدل گئی ہے۔" عمیص نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ موتیا نے آنکھیں سکوڑ کے کچن کی طرف جاتی گل مہر کو گھورا۔

"کیوں کیا لنگڑا کے چل رہی ہے؟ مجھے تو کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔"

"یہ تبدیلی کیا چھوٹی ہے کہ وہ تم سے بحث کرنے کی بجائے۔ چپ چاپ خود ناشتا بنانے چلی گئی ہے۔"

"بنانے نہیں صرف گرم کرنے۔ انڈہ کھانے کو جی بھی چاہا تو کبھی نہیں بنائے گی۔ ہاں چائے شاید بنالے مگر صرف ایک کپ۔ بھول جاؤ کہ وہ ہمارے لیے چائے لائے گی۔ تمہیں تو پتا نہیں کیوں ہمیشہ اس سے خوش فہمیاں ہی رہتی ہیں۔"

"محبت خوش گمانی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔"

"محبت۔۔۔" اسے دھچکا سا لگا۔ اس نے رخ موڑ کے عمیص کی جانب دیکھا۔ دنوں بعد اس کے چہرے پہ وہی محبت کی سنہری دھوپ پھیلی دیکھ کے اس کا دل دھڑک اٹھا۔

"محبت۔۔۔ عمیص کیا محبت اب بھی۔۔۔؟" اس نے ادھورا سا سوال کیا' جو اپنے اندر مکمل استفسار لیے ہوئے تھا۔

● ● ●

"محبت خوش گمانی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔" عمیص کی بات سن کر موتیا کو دھچکا لگا تھا۔

"محبت۔۔۔؟"

ایسا نہیں تھا کہ وہ بس ابھی ابھی عمیص کی محبت کی شدت سے واقف ہوئی تھی اور نہ ہی ایسا تھا کہ عمیص کی گل کے لیے دیوانگی اتنی پرانی بات ہو چکی تھی کہ وہ اسے فراموش کرچکی ہوتی۔ فرق تو اس کے محسوسات پہ پڑا تھا جب سے اس نے ماں اور خالہ کی گفتگو سنی تھی۔ اب اسے عمیص کے منہ سے محبت کا لفظ گل کے حوالے سے سننا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کہے بغیر رہ نہ سکی۔

"محبت۔۔۔ عمیص کیا محبت۔۔۔ اب بھی؟" اس کا ادھورا سا سوال اپنے اندر مکمل استفسار لیے ہوئے تھا۔

"محبت۔۔۔ کب نہیں۔۔۔" اس کا ادھورا جواب اس سوال سے بھی بڑھ کے بھرپور تھا۔

"ہاں مگر اس کے عکس دھندلانے لگے ہیں۔ وہ یقین سا جو میری ہمت کم نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ امید جو مجھے حوصلہ نہ ہارنے دیتی تھی' اب اک واہمہ سا بن کے رہ گیا ہے سب کچھ۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔

یہ دروں رات کا خوف سا ہے عجیب سا کوئی واہمہ
جب بروں حد جہاں نما' مجھے ڈال دیتا ہے وسوسے

اس نے ٹوٹے سے لہجے میں شعر کہا۔ جس کے جواب میں موتیا' جو اس کی پشت پہ کھڑی تھی' اچانک کہہ اٹھی۔

وہ کبھی رخ بدل کے بھی دیکھ لے کھڑے ہیں ہم تجھے دیکھنے
تیری قربتوں میں جو آگئے تو لپیٹ دیں گے یہ فاصلے

اس کے اشارے دیتے لہجے پہ عمیص نے چونک کے رخ پھیرا۔ آج اس کے شعر پڑھنے کے انداز بھی نئے تھے' چہرے پہ پھیلے رنگ بھی نئے اور نا آشنا تھے۔ اس نے الجھ کے اسے پکارا۔

"موتیا۔۔۔"

موتیا کی نظریں اٹھنے کی کوشش میں اور بھی جھک گئیں۔ وہ آہستگی سے پلٹ کے واپس چلی گئی۔ اگر ایک بار نظر

اٹھا کے دیکھ لیتی تو شاید عمیص کی الجھن ختم ہو جاتی۔ اسے اپنے سارے سوالوں کا جواب مل جاتا کیونکہ موتیا کی آنکھیں پڑھنا اس کے لیے مشکل کام نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کہہ تو بیٹھی مگر اب دھڑ دھڑ کرتا دل اس کے بس سے باہر ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں پناہ لیتے ہوئے اس نے دروازہ زور سے بند کیا اور وہیں دروازے سے پشت ٹکا کے کھڑی ہوگئی۔ سلگتی آنکھیں روشنی سے نیم تاریک کمرے میں آکے مانوس نہ ہو پا رہی تھیں اس خنک اندھیرے سے۔ اس نے آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ اب رخساروں کی تپش اپنا احساس دلانے لگی۔ اس نے یخ ہوتے ہاتھوں کی سختی سے بند مٹھیاں کھولیں اور ٹھنڈی ہتھیلیاں گالوں پہ رکھ کے ان کی حدت کم کرنے لگی۔ اچانک اسے اپنے حلق کی خشکی کا احساس ہوا۔ وہاں جیسے کانٹے سے اگ آئے تھے۔ آنکھیں کھول کے اس نے پانی کا جگ دیکھنا چاہا۔ اس بار نظریں اندھیرے سے دوستی کر بیٹھیں۔ دونوں پلنگوں کے درمیان پڑی ٹیبل پہ جگ اور گلاس رکھا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور گلاس لبالب بھر کے ایک سانس میں پی گئی مگر پیاس تھی کہ بجھنے کا نام نہ لے رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ جھنجلا کے بڑبڑانے لگی۔

"بالآخر ایسی بھی کیا بات کہہ دی میں نے جو حواس میرا ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں' نظریں وہ نہیں دیکھ رہیں جو سامنے ہے۔ بس ایک ہی چہرہ جیسے آنکھوں پہ چسپاں ہو کے رہ گیا ہے۔ دل ہے تو وہ قابو سے باہر ہے۔ قدم ہیں تو اختیار میں نہیں' رکھتی کہیں ہوں' پڑتے کہیں ہیں۔ جب تک جذبات قابو میں اور زبان اختیار میں تھی' سب کچھ ہاتھ میں تھا لیکن ایک ذرا سا زبان کو چھوٹ دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ لوگ پتا نہیں کیا کچھ کر گزرتے ہیں' دل کی ساری باتیں فٹ سے سامنے والے کے منہ پہ کہہ مارتے ہیں جیسے اب نہ کہا تو دوبارہ زندگی شاید موقع دے یا نہ دے اور ایک میں ہوں' کہا ہی کیا میں نے؟ صرف ایک شعر اور شعر تو کہنے کے لیے ہی ہوتا ہے ضروری تو نہیں کہ سننے والا اس کا اصل مضمون کہنے والے کے حوالے سے منسوب کردے۔"

اس نے آہستہ آہستہ خود کو تسلی اور بہلاوے دے کر نارمل کرنا چاہا۔

"ضروری تو نہیں کہ وہ سمجھ بھی گیا ہو' جو میں اس سے کہنا چاہتی تھی' اتنا سیانا ہوتا تو اتنے سالوں تک بھلا انجان رہتا۔" اس کی خود کلامی میں ہلکا سا شکوہ در آیا۔

"میرا بھی دماغ خراب تھا جو سالوں کا قائم رکھا بھرم ایک پل میں کھونے چلی تھی' احمق۔" اب وہ خود کو سرزنش کرنے لگی۔

"اگر اس کی توجہ گل سے ہٹا کے اپنی جانب کرنے کی اوچھی حرکت کرنا ہی ہوتی تو اتنا عرصہ دل مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔"

"لیکن میں نے اسے گل کی راہ سے کب ہٹانا چاہا؟ کبھی نہیں۔ اب وہ جس راہ پر چل رہا ہے اس کے دوسرے سرے پہ گل موجود ہی نہیں۔ ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی مایوسی اور تھکن ہی اس کے حصے میں آنے والی ہے تو اگر آدھے رستے سے میں اسے واپس بلانا چاہتی ہوں تو یہ ایک لحاظ سے اس کی مدد ہوگی۔ کیا میں اسے تباہ ہونے دوں؟" اس کے دل نے اس کی جانب سے صفائی پیش کی۔ اب شرمساری کا بوجھ کم ہونے لگا۔ ایک اور گلاس پانی کا پی کے اس نے اعصاب ڈھیلے کرتے ہوئے خود کو بستر پہ گرا لیا۔

"کچھ نہیں ہوا' کچھ بھی نہیں۔" ایک اور بہلاوا۔

"میں نے کچھ نہیں کہا۔ ایک سرسری سی گفتگو تھی اور بس۔۔۔ عمیص نے کچھ بھی محسوس نہ کیا ہوگا۔ خوامخواہ میرے اندر کا چور مجھے گھبراہٹ اور خوف میں مبتلا کیے دے رہا ہے۔ بالفرض اس نے کچھ پوچھا بھی تو میں مکر جاؤں گی۔ الٹا اس کا مذاق اڑاؤں گی۔ جب اللہ تعالیٰ بن مانگے میری مراد پوری کر رہے ہیں۔ سیدھے رستے میں بزرگوں کے بابرکت فیصلے کے ذریعے مجھے اس کی زندگی میں شامل کر رہے ہیں تو مجھے ایسی حرکتیں کرکے خود کو

بے توقیر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس کے اندر کی "اچھی لڑکی" نے غلبہ پالیا اور وہ خود کو سمجھا بجھا کے آئندہ اختیار نہ کھونے کی پابند کرنے لگی لیکن اندر دبی محبت کہیں نہ کہیں اظہار کے لیے مچل رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

دعا اس وقت نگاہ کے فلیٹ میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا جو اپنی ساری بھاپ میں اڑا چکا تھا۔ اس کے سامنے پڑی ٹیبل پہ رکھے پکوڑے بھی اپنی گرمی اور خوشبو کھو چکے تھے۔ نگاہ بڑی سنجیدگی سے اسے گھورنے میں مصروف تھی۔ وہ اپنی بات کہہ چکنے کے بعد کچھ دیر تک تو صبر کے ساتھ اس کی چبھتی ہوئی نظریں خود پہ برداشت کرتی رہی مگر جب چبھن حد سے بڑھ گئی تو چلا اٹھی۔

"خدا کا واسطہ ہے نگاہ اگر تمہارے پاس مجھے کہنے کے لیے ایک لفظ تک نہیں رہا تو بتا دو میں چلی جاتی ہوں۔"

"میں ابھی لفظوں کے معاملے میں اتنی کنگال نہیں ہوئی۔ بہت کچھ ہے کہنے کو مگر سوچ رہی ہوں کہ پتا نہیں تم سن پاؤ گی یا نہیں۔" اس کے لب کھلے مگر سرد لہجے میں یہ بات کہتے ہوئے بھی اس کی نظریں بدستور اس پہ جمی رہیں۔

"ہاں کہہ دو جو کہنا ہے۔ جتنی بھی سخت بات ہے کہہ ڈالو' تمہاری ان فضول نظروں سے بڑھ کے سخت تو نہیں ہوں گے۔ یہ تو مجھے اندر تک چھیدے جا رہی ہیں۔ پرے ہٹاؤ انہیں۔" وہ جھنجلا رہی تھی' کسمسا رہی تھی۔

"دفع کرو۔" نگاہ نے سر جھٹکا۔

"تم پہ کون سا اثر ہونے والا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ یہ فیصلہ جو تم نے جلد بازی اور عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے بغیر کسی کے مخلصانہ مشورے کے تن تنہا کیا ہے' اگر اسے بدل نہیں سکتیں' اس پہ نظرثانی نہیں کر سکتیں تو کم از کم اسے موخر تو کر دو۔ تم اپنی کر گزرنے کی ٹھان بیٹھی ہو تو میں کون ہوتی ہوں تمہیں روکنے والی لیکن اتنی ہڑبڑاہٹ مت پیدا کرو۔ یہ شادی جو تم ٹور پہ جانے سے پہلے پہلے کرنا چاہتی ہو' اسے واپس لوٹنے کے بعد کھیل لینا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کھیل لینے سے۔" وہ بگڑی۔

"مجھے تو یہی لگ رہا ہے' جیسے تم گڈی گڈے کا بیاہ رچا رہی ہو' بالکل کسی دل بہلانے والے کھیل کی طرح۔ چاہے تمہیں برا ہی کیوں نہ لگے۔" اس نے صاف گوئی سے شانے اچکائے۔

"بلکہ شاید اس کھیل میں بھی کچھ نہ کچھ سنجیدگی شامل ہوتی ہوگی' تم نے تو زندگی کے اتنے بڑے اور اہم موڑ کو ایک مذاق سمجھ لیا ہے۔" کچھ نہ کہنے کا ارادہ کرتی نگاہ ضبط نہ کر سکی اور بہت کچھ کہہ گئی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ بے چارگی سے بولی۔

"وہی جو میں کہہ رہی ہوں۔ اتنی جلد بازی سے کام مت لو۔ کچھ وقت دو' اسے بھی' خود کو بھی اور حالات کو' کیا پتا اس عرصے میں کچھ بدل جائے۔ شاید تم' یا شاید حالات۔" وہ معنی خیز انداز میں کہہ رہی تھی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"تم نے مجھے یہ تو بتایا نہیں کہ اس فیصلے کے پیچھے وجہ کیا تھی' لیکن اتنا مجھے پتا ہے کہ وہ وجہ محبت یا عشق نہیں ہو سکتی۔" اس نے کریدتی ہوئی نظریں ایک بار پھر اس پر گاڑ دیں۔

"میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟" اس نے اپنے قیاس کی تصدیق چاہی۔ دعا چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر پائی۔

"تو بس... محبت کا معاملہ ہوتا تو شاید میں سمجھ لیتی کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا' دل کا کیا ہے گدھے پہ بھی عاشق ہو سکتا ہے اور اگر تم بھی اس ٹائپ کے کسی جیسے مغل پہ فدا ہو گئی ہو تو میں ڈنڈے مار مار کے بھی تمہارے سر سے عشق کا بھوت نہیں اتار سکتی۔ لیکن اب جب یہ بھی واضح ہے کہ بات اس کے علاوہ کوئی اور ہے تو میں ایک بار پھر زور دوں گی کچھ وقت ٹھہر جاؤ' ہو سکتا ہے جن حالات کے تحت مجبور ہو کے تم یہ قدم اٹھا رہی ہو' وہ حالات بدل جائیں'

یہ ناممکنات میں سے تو نہیں۔ وقت بھلا کب ایک جیسا رہا ہے۔"

"مانتی ہوں' حالات بدل بھی جایا کرتے ہیں۔ لیکن دل' نگاہ بعض دل بدلا نہیں کرتے۔ ان کا بدلنا معجزات میں سے ہی ہوگا اور آج کل کے زمانے میں معجزے نہیں ہوا کرتے کم از کم میرے تمہارے جیسے انسانوں کے ساتھ تو نہیں۔"

"تو پھر میرے تمہارے جیسے انسانوں کو غیبی امداد یا معجزے کے رونما ہونے کا انتظار کرنے کی بجائے خود کچھ کرنا چاہیے۔"

"وہی تو کیا تھا۔ اپنی بساط سے بڑھ کے ہی کچھ کرنے کا سوچا تھا۔"

"اگر اپنے لیے واقعی بھلا سوچنا چاہتی ہو تو میرا مشورہ مان لو۔ اس بہانے تمہیں بابر کو زیادہ سے زیادہ جانچنے پرکھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "جانچ پرکھ کے بھلا میں کیا کر لوں گی۔ مجھے کون سا اس سے دل لگانا ہے۔"

"تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا دعا۔" نگاہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ "پھر بھی اپنی سی کوشش کر رہی ہوں۔ شاید کچھ بات بن ہی جائے۔"

"بہرحال میرا مخلصانہ مشورہ اور عاجزانہ درخواست یہی ہے کہ شادی کا جو ابال تمہارے اندر اچانک اٹھا ہے' آنچ دھیمی کر کے اسے ذرا نیچے کرو۔ پہلے اس ٹور سے ہو آؤ' پھر دیکھا جائے گا۔ سمجھیں؟"

دعا نے فیصلہ تو کر لیا تھا اور واقعی وہ شہزاد پہ یہ ثابت کرنے کے لیے اس حد تک جانے کے لیے مکمل طور پہ تیار تھی کہ وہ کسی بھی خاندانی شخص کا معیار اور انتخاب بن سکتی ہے لیکن اندر سے شاید اس کا دل ابھی تک مہلت مانگ رہا تھا اس لیے نگاہ کے اصرار پہ اس نے اپنی کمزوری تسلیم کر لی۔

☆ ☆ ☆

شہزاد نے سہارا دے کر کرم الہٰی کو گاڑی سے نکالا۔ آج وہ ڈسچارج ہو کے گھر لوٹا تھا۔ بالو جو پہلے سے گھر میں موجود تھی' جلدی سے آگے بڑھی۔

"دے ہدایت دینا' بکرا آگے لا' پہلے کرنا صدقے کے بکرے کو ہاتھ لگا لے' پھر اسے ادھر لاتا ہے۔" اس کے حکم پر ہدایت دین کالے رنگ کا پلا پلایا بکرا رسی سے تھام کے آگے لایا۔ کرم الہٰی نے صدقے کے بکرے کو ہاتھ لگایا' شہزاد نے ملازم کو لے جانے کا اشارہ کیا۔

"ذبح کرا کے گوشت یتیم خانے اور قریبی کچی آبادی میں بھیج دینا۔"

کرم الہٰی پہ نقاہت غالب تھی۔ چہرہ زرد اور کمزور پڑ رہا تھا۔ بغیر سہارے کے اس سے ایک قدم اٹھانا دشوار تھا لیکن اس کے باوجود ایک خاص قسم کی بشاشت تھی جو اس کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ طمانیت کا ایک واضح اظہار تھا جو اس کی نظروں سے چھلک رہا تھا شاید یہ پچھلے دو روز سے شہزاد کی جانب سے ملنے والی توجہ اور محبت کا اعجاز تھا۔ اس نے گویا اپنی گزشتہ تمام کوتاہیوں کا ازالہ کر دیا تھا۔ ایک بوند کو ترسے ہوئے کو ایک بھرا پیالہ پانی کا مل جائے تو وہ اسے غٹاغٹ پینے کی بجائے ایک ایک چسکی لیتے ہوئے لطف اندوز ہوتا ہے جیسے اسے خدشہ ہو کہ یہ پیالہ ختم ہو جانے کے بعد نجانے دوسرا کب نصیب ہو اور دوبارہ کتنی دیر تک اسے پیاسا رہنا پڑے۔ یہی حال کرم الہٰی کا تھا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت کا ایک ایک لمحہ طویل' طویل تر کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں' میں کمرے میں نہیں جاؤں گا۔ یہیں بیٹھوں گا۔" اس نے لاؤنج میں بیٹھنے پر اصرار کیا۔

"آپ کو زیادہ بیٹھنے سے منع کیا ہے ڈاکٹر نے اندر جا کے لیٹیے۔" بالو تو وہیں صوفے پہ کشنز صحیح کر کے اسے بٹھانے لگی تھی مگر شہزاد نے روک دیا۔

"دو تین دن ہسپتال کے اتنے خاموش اور اکیلے۔۔۔ خالی خالی کمرے میں رہ کے ایسا لگتا ہے جیسے میں اندر سے خالی ہوتا جارہا ہوں۔ مجھے یہاں رہنے دے۔ گھر کے بالکل درمیان والے حصے میں۔ ادھر میں جلدی ٹھیک ہوں گا۔ سارے آس پاس چلتے پھرتے نظر آتے رہیں گے۔ تو کب آرہا ہے' کب جارہا ہے۔ بالو باورچی خانے میں کیا کررہی ہے سب دکھائی دیتا رہے گا۔ اندر اکیلے میرے جی کو ہول اٹھتے رہیں گے۔"

"ایک تو ابا جی' آپ کی ضدیں' کوئی آپ کو اکیلا نہیں رہنے دے گا۔ جب تک امی کچن میں مصروف ہیں' میں بیٹھتا ہوں آپ کے پاس۔"

اس پیشکش پہ وہ اور بھی کھل اٹھا۔

"بس' میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں پھر گج وج (دھوم دھام) کے اپنے بیٹے کے لیے اس بھاگوں والی کا ہاتھ مانگنے جاؤں گا۔"

بیٹے کی محبت سے دل اتنا بہل چکا تھا کہ اب وہ کام خوشی خوشی کرنے کو بے تاب تھا جس کے لیے پہلے نہ چاہتے ہوئے راضی ہوا تھا۔

"نہیں ابا جی' جس کام کو کرنے سے پہلے ہی۔۔۔ صرف اسے کرنے کے خیال سے آپ کا یہ حال ہو گیا' میں نہیں چاہتا کہ آپ وہ کام کریں' میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا کہ آپ میرے لیے جھوٹ بولیں۔"

"یعنی تو میری پسند سے شادی کرے گا۔" اسے بہت بڑی خوش فہمی نے آن گھیرا۔

"نہیں ابا جی۔" ہمیشہ اپنا اختلاف کھل کر اور ڈھٹائی سے بیان کرنے والا شہزاد آج انکار کرتے ہوئے شرمندہ سا لگ رہا تھا۔

"میں یہ وعدہ نہیں کرسکتا۔ آپ کی خوشی کے لیے میں اپنی خوشی سے دست بردار ہو سکتا ہوں لیکن ساری زندگی کے لیے ایک ناپسندیدہ ہستی کو بوجھ کی طرح لادے نہیں پھر سکتا۔ اپنی مرضی سے شادی نہ ہونا اتنا بڑا سانحہ نہیں' دکھ تو ہو گا مگر جلد سنبھل جاؤں گا۔ بھولنے کی کوشش کروں گا لیکن آپ کی مرضی سے دعا یا خاندان کی کسی بھی اور لڑکی کو اپنانے کا مطلب ہے عمر بھر کا پچھتاوا مول لینا۔ میں جانتا ہوں یہ تو آپ بھی نہیں چاہیں گے کہ میں ساری زندگی اداس اور پریشان ہوں۔"

"چاہتا تو میں یہ بھی نہیں کہ تو ساری عمر اکیلا رہے۔ پتر' جب تو نے کسی اور کی پسند کی ہوئی لڑکی کو اپنانا ہی نہیں تو پھر ٹھیک ہے تیری پسند ہی سہی میں تو پہلے ہی راضی ہو چکا تھا۔ یہ تو بس ویسے ہی تیرے پوچھنے پہ اس کے ساتھ کہہ بیٹھا۔ تیرا گھر بس جائے' اس سے بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہم بڈھوں کے لیے اور کیا ہو گی۔ باقی رہی یہ بیماری تو یہ تو عمر کے ساتھ ہی ساتھ ہے پتر۔ تو فکر نہ کر کچھ دنوں تک بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔"

"مجھے معاف کر دیجیے گا ابا جی۔" شہزاد نے کرم الٰہی کے بوڑھے کمزور ہاتھ اپنی نم آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اوئے' جوان بن شہزادے۔۔۔ پاغلا کوئی گل ہی نئیں۔" وہ ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔ جس کے نتیجے میں اور بھی ہانپ گیا۔

"میں بھی کس قدر لاپروا ہوں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ڈاکٹر کی بتائی ہدایتوں پہ سختی سے عمل کرواؤں۔۔۔ الٹا خود آپ کے ساتھ اتنی لمبی گفتگو کرنے لگا۔"

"ڈاکٹر نے زیادہ بات کرنے سے منع کیا ہے ابا جی۔ آئندہ خیال رکھیے گا اور کوئی میرے جیسا آپ کو بولنے پہ اکسائے بھی تو بس چپ چاپ سنتے رہیے گا۔ خود ہی تھک کے چپ ہو جائے گا۔ لیٹے لیٹے جی گھبرا جائے تو ٹیک لگا کے بیٹھ جائیں مگر کچھ دیر کے لیے۔۔۔ اور پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے' جو بھی کھانے کو دیا جائے' چپ چاپ کھا لیجیے گا۔"

"چپ چاپ سنتا رہوں' چپ چاپ کھاتا رہوں' یہ اچھی زبردستی ہے۔"

"کچھ دنوں کی بات ہے' پرہیز اور آرام دونوں زیادہ ضروری ہے۔ لیکن یہ سب میں آپ کو کیوں کہہ رہا ہوں۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔

"آپ تو پھر بھی دھیان رکھ لیں گے مگر امی۔۔۔ مجھے یہ یاددہانی انہیں کرانی چاہیے تھی۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی صحت بنانے کے چکر میں وہ کچن میں گھسی پنجیری اور سردائی تیار کررہی ہوں۔" وہ ماں کو دیکھنے کے لیے پلٹا مگر بالو وہیں دروازے پہ کھڑی تھی۔

"میں نے کہاں جانا ہے۔ مجھے ہوش ہی کہاں ہے کچھ اور کرنے کا میں تو کب سے ادھر کھڑی پیو پتر کے لاڈ دیکھ رہی ہوں۔ شالا کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ شالا مجھ شدائن کی نظر ہی نہ لگ جائے۔" وہ بلائیں لینے لگی تو شہزاد جھنجلا کر اٹھنے کے ساتھ کچھ کچھ جھینپ سا بھی گیا۔

"اوئے' دیکھ تو کرمے۔۔۔ میرا اڈہڈا غصے والا شہزادہ اج لاڑے (دولہا) کی طرح شرما رہا ہے۔"

اس نے شہزاد کا ماتھا چوم لیا۔

☼ ☼ ☼

"ہم آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ وقت ہمیں عنایت کریں گے آپ؟"

صاحبزادی حرمت النساء نے نواب صاحب کو بیٹھک سے اپنے کمرے میں تشریف لاتے دیکھ کے کہا۔ وہ بڑی بیگم کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے جلد از جلد یہ معاملہ نمٹانا چاہتی تھیں۔

"وقت ہی وقت ہے بیگم حرمت النساء۔" انہوں نے تھکان کا اظہار کرتے ہوئے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی البتہ ان کا ابنوسی عصا اب تک ان کی مٹھی کی گرفت میں تھا جس کا مطلب تھا وہ کچھ دیر ستانے اندر آئے تھے اور ابھی کسی بھی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع پاتے ہی اٹھ کے چل دیں گے۔

"اور بات تو ہمیں بھی کرنی ہے آپ سے۔"

"تو پھر آپ پہلے کرلیجیے۔"

"نہیں آپ کہیے۔ ہمیں ذرا سنجیدہ نوعیت کی بات کرنی ہے۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم غیر سنجیدہ اور بے مقصد باتیں کرتے ہیں۔" وہ برا مان گئیں۔

"واللہ نہیں۔" وہ ہنس دیئے۔ "ہمارا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ خیر' آپ کہیے۔"

"جی نہیں۔ اب تو ہم آپ کی پوری بات سننے کے بعد ہی کچھ کہیں گے اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ہماری بات' جو ہم ابھی کرنے والے ہیں' کہیں زیادہ اہم نوعیت کی ہے۔"

"آپ نے تو ہمارا اشتیاق بڑھا دیا ہے اب ہماری تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دیجیے کہ وہ بات خدانخواستہ پریشان کن تو نہیں؟ کسی نئے مسئلے کا آغاز تو نہیں؟"

پچھلے کچھ عرصے سے پے در پے ملنے والے دھچکے ان کو وہمی بنا گئے تھے۔

"اطمینان رکھیے' ایسی کوئی بات نہیں۔ بلکہ یہ انشاء اللہ آپ کے تمام تفکرات کا حل ثابت ہو گا۔"

"انشاء اللہ۔ چلیے؟ کہیں سے تو کسی خوش کن بات کی امید بندھی ورنہ اب تو خواب بھی عجیب پریشان اور منتشر سے آنے لگے ہیں۔ نیند دنیاداری کے جھمیلوں سے کچھ دیر آزاد کر دیا کرتی ہے مگر ہم تو آنکھ بھی موندتے ہیں تو ایک نئی پریشانی خواب کی صورت ہمارے خیالوں اور سوچوں میں انتشار برپا کر جاتی ہے۔"

"آپ ہم سے کچھ بات کرنے والے تھے۔"

"یہی بات کرنا تھی ہم نے۔ آپ سے اپنے ایک خواب کا ذکر کرنا تھا۔ آپ جانتی ہیں کل رات ہم نے خواب میں کسے دیکھا؟"

"کسے؟"

"ہم نے۔۔۔ آپ کی بڑی ہمشیرہ کو دیکھا۔"

"آپا حضور کو؟"

"نہیں۔۔۔ بھابھی بیگم کو نہیں آپ کی بڑی ہمشیرہ وہ صاحبزادی فرحت النساء خانم۔" یہ نام وہ لبوں تک لا کے اس ٹیس میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے جو رات سے دل میں مہمان تھی لیکن جو نام وہ اتنے برسوں میں بھلا نہ پائے تھے وہ اس حویلی کے دیگر مکین رفتہ رفتہ فراموش کر چکے تھے۔ صاحبزادی حرمت النساء جو اپنی بہن کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کے وقت بہت کم سن تھیں' وہ تو یہ بات تقریباً" بھول چکی ہوتیں کہ آپا حضور کے علاوہ بھی ان کی کوئی بڑی بہن تھیں' لیکن بھول نہ سکیں۔ کیونکہ آج وہ جس مقام پہ تھیں' وہ انہی کا چھوڑا ہوا تھا' زندگی میں ایسے کئی مقام آئے تھے جب وہ ان سب کے درمیان موجود نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلا گئی تھیں۔ اب بھی یہی ہوا۔

"بڑی آپا حضور کو۔۔۔!" اس کے ساتھ ہی انہیں چند ہفتے قبل کا وہ واقعہ یاد آیا جب عمیص کے ساتھ یاسمین کے گھر سے واپسی کے راستے پہ وہ چہرا انہیں بری طرح جھنجھوڑ گیا۔

"اور تب سے ہم بے حد پریشان ہیں۔ نجانے کیا وجہ تھی جو آج برسوں بعد۔۔۔"

"اس میں پریشان ہونے والی بات کون سی ہے نواب حضور' خواب ہی تو ہے اور خواب میں وہ چہرے ہی نظر آیا کرتے ہیں جو سوچوں میں بسے ہوں۔"

صاحبزادہ نفیس نے چونک کے بیگم کو دیکھا لیکن ان کے لہجے کی طرح ان کے چہرے کے تاثرات بھی سادہ ہی تھی۔ ان میں کسی طنز یا طعنے کی آمیزش نہ تھی۔

"پریشانی کی بات ان کا خواب میں نظر آنا نہیں ہے بلکہ تشویش تو اس بات پہ ہے کہ اس خواب کے ذریعے آخر وہ ہمیں کیا کہنا چاہتی ہیں۔ ہم نے انہیں روتے تڑپتے اور مدد طلب کرتے دیکھا ہے۔ وہ خاموش تھیں مگر ان کے بہتے آنسو اور بندھے ہاتھ بہت کچھ کہہ رہے تھے۔"

"یہ سب آپ کی اندرونی کیفیات اور خیالات ہیں۔ آپ اب تک اپنے آپ کو پشیمانی کے احساس سے آزاد نہیں کرا پائے کہ آپ کی لاپروائی کی وجہ سے انہیں یہ حادثہ درپیش آیا۔ اگر آپ وقت پہ پہنچ جاتے تو۔۔۔ لیکن نواب حضور' جو بات قسمت میں لکھی تھی آپ وقت پہ پہنچ کے بھی اسے کیسے تبدیل کر سکتے تھے بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ یہ سب ہونا طے تھا تو آپ کا تاخیر سے پہنچنا بھی لکھا جا چکا تھا۔ آپ اب خود کو مورد الزام ٹھہرانا چھوڑ دیں۔ آپ کو اب تک یہی احساس اور پچھتاوا کچوکے لگاتا ہے کہ آپ ان کی مدد نہ کر سکے اس لیے خواب میں بھی انہیں مدد طلب کرتے دیکھا۔"

"شاید آپ درست کہتی ہیں۔ لیکن دل جو کل رات سے ملال کے زیر اثر ہے۔ آہستہ آہستہ ہی اس احساس سے آزاد ہو گا۔"

"ہم آپا حضور کے ساتھ مل کے قرآن خوانی کا اہتمام کرتے ہیں اور بڑی آپا حضور کے ایصال ثواب کے لیے مسکینوں کو کھانا بھی کھلا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو سکون نصیب فرمائے۔ آپ چنداں فکر نہ کیجیے وہ ایک نیک معصوم روح تھیں اللہ کے جوار رحمت میں ہوں گی۔"

"انشاءاللہ۔۔۔ آپ سے بات کر کے دل ٹھہر سا گیا ورنہ۔۔۔ آپ کہیے کیا بات کرنا چاہتی تھیں؟"

"ہم آپ سے عمیص میاں کے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اب کیا کر ڈالا میاں صاحبزادے نے؟"

"انہوں نے کچھ نہیں کیا' کرنا تو ہم چاہتے ہیں۔ ہم انہیں اپنا داماد بنانے کا خیال ترک نہیں کر پائے۔"

"یہ کوشش تو آپ کو کرنا پڑے گی بیگم ہم بھی دل سے یہی چاہتے تھے مگر بہرحال اب کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنے کے مشورے دینے والوں میں آپ بھی پیش پیش تھیں۔"

"ہونے کو تو اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے نواب حضور۔ اگر آپ چاہیں تو عمیص میاں اب بھی ہمارے داماد۔۔۔" "نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔" انہوں نے قطعیت سے کہا۔

"مگر کیوں؟ اس میں ایسا کیا قباحت ہے؟"

"ایک بار مصلحتاً" یا مجبوراً" کمزور پڑ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بالکل ہی اپنی آن کھو چکے ہیں۔ ایک بار بھی بھابھی بیگم کو انکار کہلوا کے بے عزت ہو چکے ہیں ان کی نظر میں' اب اگر صاحبزادی گل کی بات یہاں طے نہ بھی ہوئی تب بھی ہم عمیص میاں کے لیے ہرگز ہرگز بھابھی بیگم کے ظرف کو دوبارہ نہیں آزمائیں گے۔"

"ان کے ظرف کو آزمانے کی ضرورت ہی کب ہے۔ ان کی اعلیٰ ظرفی تو اول روز سے روشن اور عیاں ہے۔ آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی نواب صاحب آپا حضور نے خود صاحبزادہ عمیص کے لیے الماس خاتون کا نام لیا ہے۔"

"صاحبزادہ الماس خاتون کا؟" انہوں نے خوشی اور استعجاب کے ملے جلے اثر کے تحت کہا۔

"جی صاحب اور ہم بھی اسی حوالے سے عمیص میاں کے لیے پھر سے وہ خواہش دل میں پال بیٹھے ہیں کیا ہماری خواہش آپ کی خواہش نہیں ہے؟"

"آپ کی بات خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر غیر متوقع ہے کہ ہم فوری طور پہ اپنا رد عمل ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔" بہت دقت کے بعد وہ اتنا کہنے کے قابل ہوئے۔

"آپ کو اپنا رد عمل ہم پہ ظاہر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے نواب حضور۔" وہ نظر نیچی کر کے مسکرائیں۔

"اتنے برسوں کی رفاقت کے بعد بھی اگر ہم آپ کے دل میں اتر کے آپ کے اندرونی جذبات جاننے کا دعویٰ نہ کر سکیں' تو تف ہے ہماری اس رفاقت پہ۔"

"آپ کی رفاقت اور خلوص پہ ہمیں ناز ہے صاحبزادی حرمت النساء سچ تو یہ ہے کہ ہم نے بہت دیر سے آپ کی قدر جانی۔ آپ کو اپنے آپ سے بے حد کم عمر جانتے ہوئے آپ کو عقل و فہم سے بھی عاری جانا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تب آپ بے حد سادہ کم فہم اور الھڑ سی ہوا کرتی تھیں۔ ہم سوچتے تھے اتنی مشکل زندگی آپ اتنی بے فکری کے ساتھ کیسے گزار پائیں گی۔ اب سمجھ میں آیا ہے کہ مشکلوں سے نمٹنے کے لیے ہوشیاری کی نہیں صبر و برداشت اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ وصف آپ میں پائے جاتے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کے اسی وصف پہ مہربان ہو کے ہر بار ہمارے گھر کو مشکل سے نکال لیتا ہے۔"

انہوں نے زندگی میں پہلی بار اپنی شریک حیات کی صلاحیتوں کا کھل کے اعتراف کیا۔ صاحبزادی حرمت النساء نم ناک آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھ کے رہ گئیں۔ وہ اس وقت کچھ کہنے کے قابل نہ تھیں۔

"اس وقت بھی آپ ہمارے لیے ایسی خبر لائی ہیں کہ گزشتہ سارے تلخ دنوں کا ازالہ ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔"

"یہ تو اللہ کا کرم ہے' اس کی رحمت ہے۔ اور وسیلہ بنی ہیں آپا حضور جنہوں نے صاحبزادی گل کے انکار کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور اتنے ہی خلوص اور محبت کے ساتھ صاحبزادی الماس خاتون کے لیے دست طلب بڑھا دیا۔"

"اولاد سے محبت یکساں ہوتی ہے ہمارے لیے بھی اپنی دونوں صاحبزادیاں ایک جیسی ہیں۔ ایک جیسی محبت رکھتے ہیں ہم دونوں کے لیے لیکن صاحبزادی الماس خاتون کے لیے ہمارا اعتماد اپنی بڑی صاحبزادی سے کہیں بڑھ کے ہے۔ ہم جانتے ہیں وہ ہمارے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھابھی بیگم کی بات پہ ایک لمحے کے لیے بھی سوچنا نہیں پڑا۔"

"لیکن ہمیں صاحبزادی الماس خاتون سے بات تو کرنا ہو گی۔"

"بے شک' یہ ان کا حق ہے۔"

صاحبزادی حرمت النساء کے جانے کے بعد نواب صاحب نے طمانیت سے گاؤ تکیے پہ دوبارہ سر ٹکا دیا۔ عرصے بعد انہیں دل و دماغ ہلکے پھلکے محسوس ہو رہے تھے جیسے کوئی بھاری سل سرک گئی ہو۔ شاید اسی احساس کے تحت آج وہ بے ساختہ اپنی بیگم کے لیے اپنائیت اور احسان مندی کا اظہار کر بیٹھے ورنہ ایک فاصلے کا احساس رہا۔ ایک جھجک سی مانع رہی تھی۔ وہ اس بات سے جھنجھلائے رہتے تھے کہ ان کی شریک حیات اپنی مرحومہ بہن سے ان

کی دلی وابستگی اور لگاؤ کے بارے میں جانتی ہے۔

ہمیشہ ان کی کوشش رہی کہ دونوں کے درمیان صاحبزادی فرحت النساء کا ذکر کم سے کم ہو۔ لیکن آج ان کے سامنے اپنے خواب کا ذکر کرتے ہوئے کسی احساس جرم یا شرمندگی نے انہیں نہیں گھیرا یہ اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ عمر کے اس حصے میں انہوں نے صاحبزادی حرمت النساء کی اپنی زندگی میں اہمیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور رہا صاحبزادی فرحت النساء کا مقام تو خواب میں اپنی ایک جھلک دکھا کے وہ یہ باور کرا گئی تھیں کہ اب بھی وہ اس جگہ موجود ہیں جہاں برسوں پہلے صاحبزادہ نفیس علی خان نے انہیں مقیم کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عمیص حسب معمول ناشتے کے لیے کچن میں آیا۔ کھلے موسم میں وہ سب برآمدے میں دسترخوان بچھا کے چقیں اٹھا کے تین وقت اکٹھے ہی کھانا کھایا کرتے تھے مگر سردیوں میں ناشتے کے لیے یہ معمول بدل جاتا تھا۔ نواب صاحب تو ویسے بھی ناشتا بیٹھک میں کیا کرتے۔ شاید ہی کوئی دن ہوتا کہ ناشتے پہ کوئی ملاقاتی موجود نہ ہوتا تھا۔ صاحبزادی خلعت النساء بھی اپنے جوڑوں کی تکلیف کی وجہ سے سردیوں میں کم ہی اپنے کمرے سے نکلا کرتیں۔ ماسوائے اس روز کے جب اچھی دھوپ نکلی ہو، تب وہ دالان میں بچھے اپنے تخت پہ آجاتیں لیکن ناشتا ان کے کمرے میں ہی جاتا جہاں ان کی چھوٹی بہن ان کا ساتھ دیتیں۔

باقی وہ تینوں اور دلگیر گرم گرم کچن میں ہی ناشتا کر لیا کرتے جہاں ہر وقت جلتے چولہوں کی وجہ سے ہیٹر کی ضرورت کبھی نہ پڑتی تھی۔ نواب صاحب کی مہمان نوازی کی وجہ سے اس کچن کے چولہے کبھی بند نہ ہوئے تھے۔ چائے کی کیتلی تو چوبیس گھنٹے رکھی رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ نواب صاحب کی باغات سے آئی ساری آمدنی تقریباً" تقریباً" طعام کے خرچوں میں ہی اٹھ جاتی اور مہینے کے بل وغیرہ جمع کرانے میں انہیں مشکل پیش آتی اور دوسری ضروریات کے لیے تو کبھی کچھ بچا ہی نہ تھا۔

جب سے **عمیص** کا اسٹور چلنا شروع ہوا تھا۔ اس نے گھر کے کئی اخراجات نامحسوس طریقے سے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ اتنے بڑے گھر کے کئی کمروں میں اندھیرا رہتا۔ اس نے دالان میں، باغ میں پچھلی راہداریوں میں ہر جانب لائٹیں لگوائیں۔ سرد موسم کے لحاظ سے سب کے لیے کپڑے خریدے، اپنی امی حضور کا علاج قابل اور مہنگے ڈاکٹر سے کرلیا۔ ذہن میں بہت سا کام مرمت طلب تھا،

کبھی رخ بدل کے بھی دیکھ لے
کہ کھڑے ہیں ہم تجھے دیکھنے

کچن میں داخل ہوتے ہی جیسے ہی اس کی نظر دروازے کی جانب پشت کیے آٹا گوندھتی موتیا پہ پڑی تو اس کے ناآشنا سے لہجے میں ادا کیے الفاظ پھر سے اسے یاد آگئے۔ اس نے ہر بار کی طرح ایک بار پھر سر جھٹک کے خود کو مزید کچھ سوچنے سے باز رکھا۔

"ناشتا ملے گا؟ ابھی تو آٹا گوندھا جا رہا ہے۔"

اس کی آواز پہ موتیا ایک دم چونک کے مڑی۔ اسے دیکھ کے اس کے چہرے پہ اچانک گھبراہٹ سی نمودار ہوئی جسے اس نے دوبارہ رخ موڑ کے چھپانے کی کوشش کی البتہ آواز سے مترشح ہوتے اجنبی پن کو وہ **عمیص** سے چھپا نہ سکی۔

"آٹا تو... یہ تو میں ویسے ہی گوندھ رہی تھی۔ ناشتے کے لیے تو رات کو ہی گوندھ کے رکھ دیا کرتی ہوں۔ وہ ختم ہونے کے قریب تھا تو سوچا مزید گوندھ لوں۔ آج موسم خاصا خوشگوار ہے۔ ہو سکتا ہے ابا حضور کے کوئی دوست احباب آجائیں۔ تم کیا لو گے ناشتے میں؟"

"میں... ؟" اس کے لہجے اور انداز کے غیر معمولی پن پہ غور کرتا **عمیص** ٹھٹھک گیا۔

"جو تم دیتی ہو، لے لیا کرتا ہوں۔ پہلے تو کبھی نہیں پوچھا؟"

"وہ آج۔ ویسے ہی میں نے سوچا، شاید تم انڈے پراٹھے کی بجائے کچھ اور لینا چاہو۔" اس نے چولہے پہ توا رکھا۔

"کیوں آج کیا خاص بات ہے؟ کوئی الگ دن چڑھا ہے کیا؟" وہ یونہی اخبار کے ورق پلٹتے پوچھنے لگا۔ آٹے کا پیڑہ بناتے موتیا کے ہاتھ سست پڑ گئے۔

"ہاں خاص بات... خاص بات یہ ہے **عمیص** کہ آج میں تمہارا سامنا کرنے میں جھجک رہی ہوں۔ آج کا دن الگ کچھ اس طرح ہے کہ آج میرے دل کے اندر برسوں سے سر منہ لپیٹ کے بیٹھے تمہارے عکس نے مزید چھپنے سے انکار کر دیا ہے میں تمہاری جانب دیکھنے سے بھی ڈر رہی ہوں کہ تم میری آنکھوں سے یہ راز نہ جان جاؤ۔ کل بھی بہت بڑی غلطی کی کہ تمہارے ساتھ باتیں کرنے لگی یہ سوچے بغیر کہ امی حضور اور تائی حضور نے میرے جذبات کو ایک نیا رخ دے دیا ہے اور یہ کسی بھی وقت بند توڑ کے ساری احتیاطیں بہا لے جا سکتے ہیں۔ وہ تو شکر ہے میری کل کی بکواس پہ تم نے غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔"

عمیص کے لاپرواہ انداز اور وہی پرانے دوستانہ بے تکلف رویے نے اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ اس نے موتیا کی کل کی بات کو سرسری سا لیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے اس رشتے کی نئی صورت کا احساس موتیا کو جھجک میں مبتلا کر رہا تھا تو **عمیص** کو خفت میں وہ گریز اور لاتعلقی کے ذریعے خود پہ پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی تو **عمیص** انجان بنے رہنے میں عافیت جان رہا تھا۔

"الٰہی خیر، یہ میری گناہ گار آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟" دلگیر نے اندر آتے ہی اپنی کھنکتی آواز سے سکوت توڑا۔

"موتیا بی بی اور **عمیص** میاں دونوں ایک ساتھ، اور اس کے باوجود قیامت کا سناٹا۔ کل بی بی اور **عمیص** میاں ایک ساتھ ہوں اور کھٹ پٹ نہ ہو، یہ تو شاید ممکن ہے مگر آپ دونوں یوں چپ چاپ... ضرور کوئی بات ہے، اوہو... ہو ہو... ضرور کوئی بات ہے۔" وہ گنگنایا۔

"ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلی ملاقات ہے. جی پہلی ملاقات ہے۔"

"بکواس بند کرو دلگیر۔" پہلی بار موتیا اتنے خراب انداز میں اسے ڈپٹ بیٹھی اس لیے وہ فوراً" خاموش ہو گیا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" **عمیص** نے پہلی بار اس کا تتا ہوا چہرہ اور بھاری پپوٹے دیکھے ورنہ اس وقت سے وہ دوسری جانب منہ پھیرے کھڑی تھی۔

"موسم ہی ایسا ہے۔" موتیا نے بات بنائی۔

"اور تم پہ کام کا بوجھ بھی تو بہت زیادہ ہے۔ اتنے بڑے گھر کی صفائی، ستھرائی اور اتنے سرد موسم میں... دلگیر یار ایک کام تو کرو۔"

"بسر و چشم میاں۔" وہ آداب بجا لایا۔

"آس پڑوس کے گھروں میں پتا کرو، کسی قابل بھروسہ ملازمہ کے بارے میں۔"

"نہیں **عمیص**۔ اس کی کیا ضرورت ہے، خواہ مخواہ میں اتنا خرچہ۔ ہم گھر کے لوگ ہی کتنے ہیں۔"

"لوگ بے شک گنتی کے چار پانچ ہیں مگر مہمان... اور گھر بھی کم چھوٹا نہیں۔ چلو اور کچھ نہیں تو کم از کم صفائی کے لیے ملازمہ رکھنے پہ تو تیار ہو جاؤ۔ آدھا دن تو تمہارا اسی کام کی نذر ہو جاتا ہے اور باقی کا آدھا دن کچن میں۔ اپنے ساتھ دلگیر کو بھی لگا لیا کرو۔ جب دیکھو حلق پھاڑ کے ملہار گائے جا رہے ہیں۔ بہت ہوا تو چار برتن کھنگال ڈالے۔"

"ہائے ہائے تو کیا کریں ہم، آٹا ہم سے پتلا گوندھ جاتا ہے۔ روٹی پکانے لگیں تو کسی سے نوالہ نہیں توڑا جاتا، حلق سے کیا خاک اترے گی۔ چائے تک تو ہماری کسی کے معیار پہ پوری نہیں اترتی۔"

"یہ اچھا بہانہ گھڑ رکھا ہے۔ نہیں آتا تو سیکھو اپنے ہاتھ کے پکائے کھانوں کی عادت ڈالو سب کو۔ موتیا ساری عمر یہاں تو نہیں بیٹھی رہے گی ڈوئیاں چلانے کو۔ آخر گل کے بعد اسی کی تو باری ہے۔"

"کہیں نہیں جا رہی میں۔" موتیا نے اس کے آگے ناشتا رکھا اور عام سے انداز میں کہتی باہر نکل گئی لیکن **عمیص** کو اس سادہ' مختصر اور معمولی سے فقرے میں چھپے اشارے سے محسوس ہو رہے تھے۔ جو اسے سمجھ نہ آ رہے تھے مگر بڑی بری طرح چبھ رہے تھے۔

وہ موتیا کے کہے شعر کا دوسرا مصرعہ دہرا کے رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"چچا حضور آپ؟"

صاحبزادہ نفیس علی خان کو اپنے اسٹور پہ دیکھ کے وہ کتنی دیر تک تو یقین ہی نہ کر پایا کہ وہ یہاں تک آ سکتے ہیں۔

"آپ یہاں کیسے؟ خیریت تو ہے ناں گھر پہ؟" اپنی حیرت پہ قابو پانے کے بعد سب سے پہلے خیال اسے یہی آیا کہ خدانخواستہ کہیں گھر میں کوئی غیر متوقع بات نہ ہو گئی ہو۔

"الحمدللہ سب خیریت ہے۔ ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو خیال آیا کہ آپ سے ملتے جائیں اور آپ کا یہ اسٹور بھی دیکھ لیں۔" وہ ادھر ادھر نظریں گھماتے جائزہ لیتے کہنے لگے۔

"کئی بار آپ نے اصرار کیا مگر ہم مصروفیت کی وجہ سے وقت نہ نکال سکے۔"

ان کی اس بات پہ وہ کہتے کہتے رہ گیا۔ "مصروفیت کی وجہ سے نہیں' اپنی ضد کی وجہ سے۔" مگر بروقت اس نے اپنی زبان کو قابو میں کیا۔

"آپ یہاں تشریف رکھیے چچا حضور۔" اس نے دکان میں موجود واحد اسٹول خالی کر کے ان کے سامنے بیٹھنے کے لیے پیش کیا' جس پہ کچھ دیر پہلے وہ خود بیٹھا تھا۔

"بس یہی ہے یہاں۔۔۔" وہ کچھ شرمندہ سا نظر آیا۔ "آپ کے شایان شان تو نہیں مگر اس طرح آپ کو کھڑے دیکھنا بھی اچھا نہیں لگ رہا"۔

وہ پہلے سے صاف اسٹول کو اور بھی جھاڑنے لگا۔ اگرچہ صاحبزادہ نفیس علی خان اس غیر آرام دہ نشست کو ذرا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور عام حالات پہ اس اونچے اسٹول پہ بیٹھنے سے وہ کھڑے رہنا زیادہ پسند کرتے لیکن اس کی سرشاری دیکھ کے بیٹھ گئے کہ انہیں کھڑے دیکھ کے وہ مزید برا محسوس نہ کرے۔

"کیا پیش کروں آپ کی خدمت میں چچا حضور۔ چلائے تو یہاں کسی کام کی نہیں ملتی اور آپ ٹھہرے موتیا کے ہاتھ کی بنی زبردست چائے کے عادی۔"

اس کی اس بات پہ صاحبزادہ نفیس علی خان نے اسے گہری نظروں سے دیکھا' ان کے لبوں پہ ایک دھیمی اور معنی خیز مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"کچھ ٹھنڈا منگا تا ہوں۔"

"نہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔ "ٹھنڈے کا کون سا موسم ہے۔" وہ ایک بار پھر اسٹور کا جائزہ لینے لگے۔ **عمیص** نے مزید اصرار اس لیے نہ کیا کہ وہ جانتا تھا' اس کے چچا حضور باہر سے کچھ کھانا پینا پسند نہیں کرتے۔ دوسری طرف ایک عجیب طرح کی سرشاری اور ہیجان نے اس پہ غلبہ پایا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ ان کی یہاں موجودگی پہ اپنی خوشی کس طرح ظاہر کرے۔

"چچا حضور۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ آپ کے لیے۔" کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے نئے سال کی ڈائری ان کے سامنے کی۔ انہیں تحفہ دینے کے لیے اسے اپنا آپ بہت کم حیثیت محسوس ہوا۔

"یہ تکلیف کس لیے میاں صاحبزادے' اصولاً "ہمیں آپ سے کچھ خریدنا چاہیے' آخر پہلی بار آپ کے ہاں آئے ہیں۔"

"پلیز چچا حضور' میری خوشی کے لیے۔" اس نے آگے بڑھ کے ایک گھٹنا زمین پہ ٹیکتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے آہستگی سے ڈائری اس سے لے لی اور اس کے ورق پلٹنے لگے۔ ہر صفحے پہ قرآنی آیات کا ترجمہ اور احادیث درج تھیں۔ انہیں پسند آیا۔

"شکریہ بیٹا۔" وہ اٹھنے کی تیاری کرنے لگے۔

"شرمندہ مت کیجیے' چچا حضور۔" پتا نہیں کیوں اس کی آواز بھاری ہو گئی' شاید وہ اپنے جذبات پہ قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔

"آپ نہیں جانتے' آپ کا یہاں آنا میرے لیے۔۔۔"

رندھے ہوئے گلے کے ساتھ وہ اتنا ہی کہہ پایا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان نے آگے بڑھ کے اس کا شانہ شفقت سے تھپتھپایا۔۔ اس کی محبت دیکھ کے انہیں اس کے ساتھ روا رکھے اپنے گزشتہ رویے پہ شرمندگی محسوس ہوئی۔

"خدا آپ کے کاروبار کو برکت اور ترقی دے اور آپ یونہی اپنے بزرگوں کے دل کی ٹھنڈک کا باعث بنے رہیں۔"

وہ چلے گئے مگر **عمیص** تقریباً سارا دن ہی اس خوش کن احساس کے زیر اثر رہا۔ اس کے نزدیک چچا حضور کا یہاں آنا اس سال کا سب سے بڑا واقعہ تھا۔ اسے گھر جا کے سب سے اپنی خوشی بانٹنے کی جلدی سوار ہو گئی۔ آج اس نے معمول سے ذرا جلدی اسٹور بند کیا اور مسرت کے اظہار کے طور پر راستے میں سے علاقے کی مشہور مٹھائی کی دکان سے ایک کلو قلاقند خریدی' جو گھر میں سب کی پسندیدہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے وہ اپنی امی حضور کے کمرے کی جانب لپکا۔

"آپا حضور' آپ کے کہنے کے مطابق ہم نے نواب صاحب سے **عمیص** میاں اور صاحبزادی الماس خاتون والی بات کر لی ہے۔"

چچی حضور کی پر اشتیاق آواز پہ وہ **ٹھٹھک** کے دروازے کے پار ہی رک گیا۔

"میری اور موتیا کی بات؟ مگر کون سی بات؟"

دماغ جس جانب اشارہ کر رہا تھا' دل اسے تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا کہ جو وہم ابھی ابھی اسے گزرا ہے' وہ محض وہم ہی ہے

"یہ آپ نے درست کیا۔ ہم بھی اس معاملے میں تاخیر کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ صاحبزادی گل مہر کا اگر معاملہ طے ہو جاتا ہے تو دونوں بہنوں کی رسمیں ایک ساتھ ہی ادا کر دی جائیں۔"

"اچھا خیال ہے لیکن ابھی اس جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ الماس خاتون بتا رہی تھیں کہ غالباً اگلے اتوار ان لوگوں کا ارادہ ہے ہمارے ہاں آنے کا۔ وہ ایک دو روز قبل اطلاع بھجوا دیں گے لیکن آپا حضور' نواب صاحب کہہ چکے ہیں کہ وہ حتمی فیصلہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانچنے پرکھنے کے بعد کریں گے اور وہ فیصلہ آخری ہو گا' صاحبزادی گل مہر بھی اس فیصلے کو قبول کرنے کا وعدہ کر چکی ہیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ خدانخواستہ اگر ہمارا مطلب ہے کہ وہاں بات نہ بنی تو پھر ایسے ماحول میں الماس خاتون اور **عمیص** میاں کی رسم ادا کرنا کیا مناسب رہے گا؟"

"بالکل نہیں' واقعی اس سے صاحبزادی گل مہر کی دل آزاری ہو سکتی ہے لیکن ہم تو سرے سے اس رسم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ ایک ہی گھر' ایک ہی خاندان کی بات ہے۔ وہ تو ہم نے سوچا کہ اگر صاحبزادی گل مہر کی باقاعدہ نسبت ٹھہرنے کی تقریب ہوئی تو ہم بھی لگے ہاتھوں۔۔۔ بہرحال ہمارے لیے بھائی صاحب کی رضا مندی ہی بہت معنی رکھتی ہے۔"

"نواب حضور تو بہت خوش ہیں۔"

"ہم ان کی خوشی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔"

"اور میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ وہ آج میرے پاس کیوں آئے تھے۔" وہ ست قدموں کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔ برآمدے میں آ کے اس نے مٹھائی کا ڈبہ میز پہ رکھا اور موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"تم آج بہت جلدی آ گئے۔" موتیا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ سر اٹھا کے وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس خالی پن کو امی حضور اور چچی حضور کی گفتگو کی بازگشت نے بھر دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا، طبیعت تو ٹھیک ہے؟" موتیا نے اس کے چہرے کی متغیر ہوتی رنگت اور ماتھے پہ چمکتے پسینے کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں، بس... تھکن سی ہو رہی ہے۔" وہ قصداً اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہی جھجک اس پہ غالب آ رہی تھی جس نے کل سے موتیا کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

"اور یہ مٹھائی...؟" اس کی نظریں میز پہ رکھے مٹھائی کے ڈبے پہ گئیں۔

"یونہی لے آیا۔ امی حضور اور چچی حضور کو پسند ہے ناں اس لیے اور ہاں چچا حضور کو بھی۔"

"تم بھول رہے ہو گل کو بھی قلاقند بہت پسند ہے۔" موتیا نے ڈبے میں جھانک کے آہستہ سے کہا۔

چائے کے ساتھ ایک پلیٹ میں قلاقند سجا کے وہ اندر لے گئی تو صاحبزادی حرمت النساء نے پوچھا۔

"یہ مٹھائی کہاں سے آئی؟ کیا آپ کے ابا حضور لائے؟" انہیں گمان گزرا کہ شاید وہ صبح والی بات پہ اپنی خوشی کے اظہار کے طور پہ لائے ہوں۔

"نہیں، یہ تو عمیص لایا تھا۔" وہ کپ میں چینی گھولنے لگی۔

"اوہ... تو صاحبزادہ عمیص تک بھی یہ خوش خبری پہنچ گئی، وہ منہ میٹھا کرانے کے لیے قلاقند لے آئے۔" صاحبزادی خلعت النساء نے سر ہلا کے بہن کو دیکھا۔ انہیں چائے پکڑاتے ہوئے موتیا کا ہاتھ ہلکا سا کانپ گیا۔ اس سے مزید وہاں رکا نہ گیا۔

☼ ☼ ☼

کوثر بی بی ممٹری کی بڑی دبدبے والی عورت تھی۔ ویسے تو کم حیثیت سی تھی۔ شوہر کا چار سال پہلے کسی حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ تب ساتوں بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اسی کٹڑی میں رہتی تھی۔ کون سا کام تھا، جو اس نے نہیں کیا مگر چار سالوں میں بچے اس قابل کر دیے کہ اپنے ہاتھ پیروں سے کمانے کھانے لگے۔ کٹڑی کے ہر گھر میں اس کا آنا جانا تھا اور اسے سبھی لوگ عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

بابر کی ناپسندیدگی کی وجہ سے عورتیں شاذ و نادر ہی یاسمین سے ملنے آتیں۔ بابر کی تو عادت تھی، کھڑے کھڑے سب کو بے عزت کر ڈالتا۔ مگر کوثر بی بی کا بڑا جگرا تھا جو تیسرے چوتھے روز اس کی خبر لینے آ جاتی۔ اس کے لیے اکثر سلائی کا کام بھی وہی لاتی۔ اس بار بھی پریم گلی سے وہ سلائی کا ہی کچھ کام لے کے اس کے پاس آئی تھی جب یاسمین نے اپنی اس ہمدرد اور خیر خواہ عورت سے اپنی خوشی بانٹنی چاہی اور بابر کے باہر جانے کے بارے میں بتایا۔ ساتھ ہی ساتھ باتوں باتوں میں وہ اسے زیور بیچنے کے بارے میں بھی بتا بیٹھی۔

"ہائے ہائے، یہ تو نے کیا کیا بے وقوف۔" کوثر بی بی ماتھا پیٹ کے رہ گئی۔

"اپنا سارا زیور تو تم پہلے ہی بیچ کے اس کے سر سے وار چکی ہو۔ اب جھیلوں سے لا کے بھی اسے دے دیا۔ صدقے جاؤں تمہاری عقلوں کے۔ بیٹی کی ماں ہو کے شوہر کے لیے ایسی عاشقی اچھی نہیں ہوتی بی بی۔ اولاد کے بارے میں سوچ، اب خاوند کی فکر کرنا، اس کے عیش و آرام کے لیے سوچنا چھوڑ دے۔ اولاد کا حق تو نہ مار۔ خاص طور پر بیٹی کا۔ اس زیور پہ دلکش کا حق ہے۔"

"ہم جانتے ہیں کوثر بہن اور ہم نے اولاد کے مستقبل کا ہی خیال کرتے ہوئے یہ رسک لیا ہے۔ کب تک ہم

یہاں وہاں سے لا کے یا کپڑے سی سی کے بچے پالتے رہیں گے۔ دلکش کے ابا جان کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا پڑا۔ اللہ اللہ کر کے تو وہ اسی بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پہ تیار ہوئے۔ اب اگر ان کے لیے پیسوں کا بندوبست نہ ہوتا تو یہ سنہری موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہتا۔"

"بڑی بھولی ہو تم۔ ہزار دھوکے کھا کے پھر مرد ذات کا اعتبار کر لیا اتنے سالوں میں کوئی ایک بھلائی کی ہو اس نے تمہارے ساتھ تو بتاؤ۔ ویسے بھی میں تو سچی بات کہوں گی، بھلے تمہیں برا لگے۔ مگر کھری تو یہی ہے کہ نشئی اور جواری کے کسی وعدے کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

"ایسی بات نہیں۔" یاسمین کو واقعی برا لگا۔ وہ جو تربیت لے کے پروان چڑھی تھی، اس میں اپنے مجازی خدا کے بارے میں کسی سے شکایتاً کچھ کہنا تو دور کنار، کسی سے برا سننا بھی اسے ناگوار ہی گزرتا۔

"اللہ کرے... ویسے بھی اب دعا مانگنے کے سوا اور ہو بھی کیا جا سکتا ہے۔ خالی ہاتھ تو تم ہو چکی ہو اسے زیور دے کر۔ لیکن میری مانو، اتنی بے فکر مت بیٹھو۔ پوچھ پچھ کرتی رہا کرو نظر رکھو، کہاں کی اڑان ہے۔ یہاں پاس رہتے ہوئے تو تم شوہر پہ مہار باندھ نہیں سکتیں، سات سمندر پار جا کے وہ کیا تمہارے ہاتھ آئے گا۔ یہ وقت بھولی بی بی بننے کا نہیں ہے۔ کچھ ہوشیاری سیکھو۔"

"ہاں ہم پوچھیں گے۔" اس نے ٹالا، ورنہ ایسا کوئی ارادہ ہرگز نہ تھا۔

"ذرا سختی سے پوچھنا۔ میں بھی ذرا شیدو کو لگاتی ہوں کام سے۔ وہ بڑا تیز ہے اندر کی بات نکالنے میں۔ کسی کو پتہ بھی نہیں لگنے دیتا اور راز چرا لاتا ہے۔ ایک دو دن میں پتا لگا لے گا، بابر صاحب کے ارادے کیا ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں کوثر بہن۔" وہ گھبرا گئی، شوہر کی جاسوسی کرانے کے خیال سے۔

"اے ہٹو، تمہیں تو کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں۔" کوثر نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔ وہ یاسمین کی گھبراہٹ کو کسی خاطر میں نہ لائی۔

"نہ شوہر کی، نہ اس کی کمائی کی۔ نہ اولاد کی بھلائی سے کوئی مطلب ہے مگر مجھ سے تو تم جیسی عورت کا اپنی آنکھوں کے سامنے بیڑہ غرق ہوتے نہیں دیکھا جاتا میں تو اصل بات کا پتا لگا کے رہوں گی۔"

☼ ☼ ☼

"یہ دیکھ شہزادے، شگنوں کا سوہا جوڑا۔ کتنا لش پش کرتا کام ہے اس پہ، سچے تلے کی تاریں ہیں سوٹ کا کپڑا تو دو ہزار کا آیا ہی تھا، کام پورے آٹھ ہزار کا ہے، حالانکہ بھرا ہوا نہیں ہے۔ پھر بھی اتنا مہنگا۔ میں نے صرف تین دن دیے تھے جوڑا تیار کرنے کے لیے، اتنے تھوڑے وقت میں اتنا باریک کام کرنے کے اس نے ہزار روپے اوپر سے لیے ہیں۔

مگر میں کیا کرتی، تیری ووہٹی کے لیے وہاں پہلے سے تیار جوڑوں میں سے کوئی میری نظر کو جچا ہی نہیں۔ کسی کا رنگ اچھا تو کام بے کار۔ یہ تلے کی تاروں والا کام سوہنا تھا مگر جوڑا پھیکے رنگ کا۔ یہ پتا نہیں کیا فیشن نکلا ہے آج کل کی چھوکریوں نے، اڑے ہوئے رنگ کے کپڑے پہنتی ہیں نیا جوڑا بھی ایسا لگتا ہے جیسے پچیس دھلائیاں ہو چکی ہوں۔ میں نے تو سوہے رنگ کا جوڑا خاص آل ڈل (آرڈر) پہ بنوایا ہے۔ کتنا جچے گا۔ کڑی کا رنگ تو چٹا ہے ناں؟" بالونان اسٹاپ بولتی اچانک کسی خیال کے آنے پہ اشتیاق سے شہزادے سے پوچھ بیٹھی مگر وہ اس سوال کا جواب دینے کی بجائے الجھن بھری نظروں سے نارنجی مائل سرخ جھلملاتے سوٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ گل مہر کو بہت دھیمے اور ٹھنڈے رنگ استعمال کرتے دیکھا تھا۔

"ان سب کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت؟ تو کیا خالی ہاتھ جاؤں۔ شگن لے کر جانا پڑتا ہے۔"

"کیسے شگن؟ آپ وہاں فی الحال میرا رشتہ لے کر جا رہی ہیں۔" اس نے "فی الحال" پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو انہیں پتا تو چلے کہ کس کا رشتہ آیا ہے۔ ذرا رعب پڑے گا۔ میں انگوٹھی بھی ساتھ لے جاؤں گی تو مجھے رات سوھے بازار (جیولر مارکیٹ) لے جانا' میرا پرانا واقف کار سنیارا ہے' کھری چیز بنا کے دیتا ہے۔ خالی انگوٹھی لینی ہے یا پورا سیٹ؟"

"میں آپ کو ان کپڑوں جوڑوں سے روک رہا ہوں' آپ زیورات کی بات کر رہی ہیں۔" وہ جھنجلا اٹھا۔

"یہ سب قبل از وقت ہیں۔ جب موقع ہو گا تب بے شک درجن بھر سوٹ اور بیس پچیس تولے سونا لے جانا۔"

"شہزادہ ٹھیک کہہ رہا ہے بالو۔ زیادہ اتاولی نہ ہوا کرو سب باتیں وقت پہ اچھی لگتی ہیں۔ خیر کا ویلا آنے دے' سارے چاء پورے کر لینا۔" کرم الٰہی نے بیٹے کی تائید کی۔

"ناں جی' ایسے خالی ہاتھ جاتے ہوئے تو مجھے اپنا آپ بڑا ہولا (ہلکا) لگے گا۔ ویسے ہی شہزادے نے ڈرا کے رکھا ہے کہ وہ بڑے اونچے لوگ ہیں۔ اونچے لوگوں کے مزاج بھی تو اونچے ہی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح ہاتھ لٹکا کے آنا ہی انہیں برا لگ جائے۔ کوئی پھل فروٹ تو ساتھ ہو۔"

"ہاں فروٹ لے جایئے گا۔ میں دو تین کریٹ مختلف پھلوں کے ساتھ رکھ دوں گا۔"

"اور مٹھائی کا ٹوکرا بھی۔ مٹھائی موچی دروازے کی ہونی چاہیے گلال کھوہ والوں کی۔"

"مٹھائی۔۔۔؟ اچھا ٹھیک ہے مگر اسے گاڑی میں ہی رہنے دیجئے گا۔ پہلے سے لے جانے کی ضرورت نہیں۔" کچھ سوچ کے اس نے کہا۔

"لے' یہ کیا بات ہوئی۔" بالو پھر برا مان گئی۔

"یہ کیسا اعتراض ہوا۔ مٹھائی کا ٹوکرا تو میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ ادھر انہوں نے ہاں کی' ادھر میں نے منہ میٹھا کرایا۔"

"اور اگر انہوں نے ناں کر دی تو۔۔۔؟ تب یہ مٹھائی کا ٹوکرا واپسی ڈگی میں رکھواتے ہوئے آپ کو کیسا لگے گا؟"

"خیری صلا انکار کس لیے ہو گا' میرے شہزادے کے لیے انکار ان کی مت ماری گئی ہے کیا؟ میں تو ان کی سات نسلیں نہ چھوڑوں اگر۔۔۔"

"خدا کا واسطہ ہے۔" شہزاد نے ہاتھ جوڑے۔ "یہ سب وہاں مت کیجئے گا۔ اسی لیے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو گی۔ میں زیادہ پر امید نہیں ہوں۔"

"بیٹا تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے' وہ لوگ زیادہ ہی بڑے لوگ ہیں۔ لکھ پتی۔ یا کروڑ پتی؟" کرم الٰہی نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

"نہیں ابا جی' لاکھوں' کروڑوں والی بات نہیں۔ متوسط آمدنی والے سفید پوش مگر وضع دار لوگ ہیں۔ ہاں شریف ضرور ہیں۔ اس لیے ڈر تھا کہ۔۔۔"

"تو کیا ہم بدمعاش ہیں؟" بالو آپے سے باہر ہو گئی۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" اس نے زچ ہو کر ان دونوں کے چہروں کی جانب دیکھا۔ کرم الٰہی کے ماتھے کی تیوریاں اس کی ناگواری ظاہر کر رہی تھیں۔ شہزاد نے ذرا سنبھل کے محتاط الفاظ میں بات بنائی۔

"وہ لوگ ذات برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔ ہاں اگر میری قسمت اچھی ہوئی اور گل مہر کے والد صاحب کو میری یا آپ لوگوں کی کوئی بات پسند آ گئی تو شاید وہ راضی ہو جائیں ورنہ ان کی پہلی ترجیح اپنا خاندان اور اپنی ذات ہے۔"

"سب بہانے ہیں' نخرے اپنی اہمیت جتانے کے ڈھکوسلے۔" بالو نے ناک چڑھائی۔

"جب لڑکی راضی ہے تو باپ کیا کرے گا۔ نوکری کرنے والی خود مختار لڑکی ہے۔ جب ڈٹ کے باپ کے آگے کھڑی ہو گی تو ساری نوابی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ بھلا عشق کے آگے ذات نے کبھی ہار مانی ہے۔ وہ کیا کہتے

ہیں۔ عشق نہ پچھے ذات۔" اس کے تجربہ کارانہ تجزیے کی تائید کرمے نے سر ہلا کے کی۔ شہزاد بے بسی سے اپنے بال مٹھی میں جکڑ کے رہ گیا۔

"اف۔۔۔ کیسے سمجھاؤں۔ یہ وہ والی عاشقی معشوقی کا چکر نہیں ہے گل مہر بہت سلجھی ہوئی اور باوقار شریف لڑکی ہے۔ مجھے پسند آئی ہے میں کسی ایسی ہی لڑکی کو شریک حیات بنانا چاہتا تھا میں نے اس سے رشتہ بھیجنے کی اجازت طلب کی۔ وہ اس نے دے دی۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ صاف الفاظ میں کہہ چکی ہے کہ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتی نہ ہی کرنا چاہتی ہے۔ ان کا فیصلہ آخری اور حتمی ہو گا۔"

"بھلی مانس لگتی ہے پھر تو۔" بالو کے دل کو سکون ہوا۔ "میں تو سمجھی نوکری کرتی ہے' اتھری (خود سر) ہو گی۔"

"ضروری نہیں گھر سے باہر نکلنے والی ہر عورت اپنا وقار داؤ پہ لگا کے اپنی پہچان بناتی ہو' عزت سے بھی اپنی الگ شناخت اور حیثیت منوائی جا سکتی ہے۔"

"اچھا پھر یہ جوڑا۔۔۔" وہ بے دلی سے دوبارہ تہ لگانے لگی۔ "اتنے چاؤ سے خریدا تھا۔ اچھا جیسے مٹھائی گاڑی میں رکھی رہے گی' ویسے ہی جوڑا اور انگوٹھی بھی رکھ دیتے ہیں۔ ہاں ہوتے ہی پہنا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے' جیسے آپ کی مرضی۔" وہ اس پہ رضامند ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

دوسری جانب صاحبزادہ نفیس علی خان کے گھر پہ بھی تیاریاں عروج پہ تھیں' جب سے گل نے موتیا کے ذریعے اطلاع بھجوائی تھی کہ اس اتوار کی شام شہزاد کے گھر والے باضابطہ طور پر رشتہ لے کے آ رہے ہیں تب سے صاحبزادی حرمت النساء کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔ صرف تین دن باقی تھے۔ ایسا پہلا موقع تھا کہ باہر سے کوئی انجان لوگ اس مقصد سے ان کے ہاں آ رہے تھے اس لیے وہ گھبراہٹ میں مبتلا تھیں۔ کبھی دلگیر کو ہدایات جاری ہو رہی ہیں تو کبھی موتیا کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

عمیص نے جس روز ملازمہ کے لیے کہا تھا' اسی شام کو دلگیر کسی بوتل کے جن کی طرح یہ حکم بجا آور لاتے ہوئے اسی گلی کے ایک گھر کی پرانی ملازمہ کو لے آیا۔ وہ اس موقع پہ خوب کام آ رہی تھی۔ برابر والوں کے مالی کو ایک دن کے لیے مستعار لیا گیا' اس نے بھی معاوضے پہ عمیص کی ہدایت کے عین مطابق باہر کی بیلوں' جھاڑ جھنکار اور باغ کی آرائش کا سارا کام چند گھنٹوں میں کر لیا۔ صرف وہ حصہ جہاں موتیا نے اپنے پسند کے پودے لگا رکھے تھے وہی اس کی توجہ پانے میں کامیاب تھا۔ باقی کا سارا حصہ عجیب جنگل سا سماں پیش کر رہا تھا۔ اب ایک ماہر کی چند گھنٹے کی محنت نے گویا اس باغ کی شکل نکال دی تھی۔ آج دوسرا دن تھا۔ موتیا نے ملازمہ کے ساتھ مل کے گھر کے خالی پڑے کمروں کی بھی مکمل صفائی کر لی تھی۔ صاحبزدی حرمت النساء نے صندوق میں سے کڑھائی والے نئے میز پوش' چار سوتی کی چادریں' مکرامے کے پردے وغیرہ نکالے۔ گل نے ناک بھوں چڑھائی۔

"اب یہ اصغری' اکبری کے ہاتھ کے بنے نمونے کون گھر میں لٹکاتا ہے۔ کڑھائی والی چادروں کی بجائے اب کاٹن کی پرنٹڈ بیڈ شیٹ یا بلاک پرنٹ والی شیٹ کا فیشن ہے اور کشن کے کورز تو ایسے ایسے کمال کے ہوتے ہیں۔"

"ہاتھ کی بنی چیزیں فیشن کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان کے رواج کبھی پرانے نہیں ہوتے۔" موتیا نے ماں کی طرف سے جواب دیا۔

"ہم نے تو بھائی صاحب سے کہا تھا کہ انہیں ظہرانے یا عشائیے پہ مدعو کر لیں مگر اب پتا چلا ہے کہ وہ لوگ صرف چائے پہ آئیں گے۔" صاحبزادی خلعت النساء نے کہا۔

"ہمارا مشورہ بھی یہی تھا مگر ان کا کہنا ہے کہ زیادہ اصرار مناسب نہیں خصوصاً" اس صورت میں کہ وہ پہلی بار آ رہے ہیں۔ اس لیے جب انہوں نے عمیص میاں سے فون پہ بات کرتے ہوئے بڑے سلیقے سے عشائیے پہ آنے سے معذرت کر لی تو انہوں نے نواب صاحب کے ہی کہنے پہ عصرانے پہ مدعو کر لیا۔" صاحبزادی حرمت النساء نے وضاحت کی۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ اب عصرانے پہ ان کے شایان شان اہتمام ہونا چاہیے۔ آپ الماس خاتون سے مشورہ کرکے عمیص میاں کو فہرست دے دیں۔ آج ہی سب سامان آجانا چاہیے تاکہ کل اور پرسوں وہ سب تیار کرلیں۔"

"تائی حضور' اس تردد کی کیا ضرورت ہے۔" گل مہر کی شامت آئی تھی جو وہ آرام سے کینو کی پھانکیں کھاتے کھاتے بیچ میں بول پڑی۔

"بیکری سے تیار سامان وقت پہ آجائے گا۔ پتا نہیں وہ لوگ پوری' چاٹ' پکوڑوں اور حلوہ کے شوقین ہیں بھی یا نہیں۔ بیکری سے کیک' بسکٹ' نمکو' پیسٹری اور پیٹس وغیرہ منگوا لیجیے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ طرح کے کباب گھر میں تیار ہوجائیں گے۔"

"آپ اپنے قیمتی مشورے اپنے پاس رکھیں صاحبزادی گل مہر۔" انہوں نے اسے جھڑک کے رکھ دیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ آپ ایسا کوئی تجربہ نہیں رکھتیں' نہ مہمان نوازی کا نہ ہی خانہ داری کا اس لیے اپنے مشورے ضائع مت کیجیے۔ دوسری بات یہ کہ آپ کے مشورے اور آراء اگر قابل توجہ بھی ہوں تب بھی آپ کو ان کا اظہار کرنے کی اجازت نہیں۔ اس معاملے میں بیٹیاں نہیں بولا کرتیں۔"

"اور یہ آپ کی الماس خاتون۔ یہ جو بڑھ چڑھ کے بول رہی ہے۔" اس نے تلملا کر تائی کو جواب دیا۔ کچکچاتے لہجے میں۔ "الماس خاتون" موتیا کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ اس کا "معاملہ" نہیں' وہ بول سکتی ہے۔ بڑھ چڑھ کے۔" **عمیص** مسکرایا۔

"تم اس کے معاملے میں بول لینا۔ بڑھ چڑھ کے۔"

"ہونہہ۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ موتیا خلاف عادت چپ رہی۔

"آپ بتائیے بیٹا' چائے کے ساتھ کیا لوازمات ہونا چاہئیں؟" اب انہوں نے **عمیص** سے دریافت کیا۔

"یہ تو آپ خواتین طے کریں۔ ویسے میری رائے ہے کہ گھر کے ساتھ ساتھ ایک آدھ آئٹم باہر سے بھی لے آنا چاہیے۔ ورائٹی ہو تو اچھا ہے' جس کو جو پسند ہو وہ لے لے۔ ویسے میرا خیال ہے شہزاد صاحب کے والدین دیہات سے تعلق رکھتے ہیں' گھی سے پرہیز اور مرچ مسالوں سے الرجی جیسے نخروں۔ سے کوسوں دور رہوں گے۔ میں بیکری سے فریش کریم پیسٹریاں اور ڈرائی فروٹ والا کیک لے آؤں گا' ساتھ میں دو تین طرح کے بسکٹ' باقی جو موتیا بتائیے۔"

"شامی کباب تو چائے کے ساتھ لازم ہیں۔ گاجر کا حلوہ اور ٹرائفل میٹھے میں بنالوں گی' قیمے کے سموسے' آلو کے پکوڑے' اور چنے کی چاٹ یا دہی بڑے میں سے کوئی ایک چیز' یہ ٹھیک رہے گا؟"

"جو آپ مناسب جانیں' اور **عمیص** میاں کل آپ جا کر صاحبزادی یاسمین کو بلا لائیں۔ اس موقع پہ ان کا ہونا بہت ضروری ہے وہ اس گھر کی بڑی صاحبزادی ہیں۔"

"جی بہتر' اچھی حضور۔"

"اور اگر بابر میاں کو فراغت ہو تو ان کو بھی مدعو کرلیجیے گا۔ وہ صاحبزادی گل مہر کے بڑے بھائی کی جگہ ہیں۔"

اس بات پہ گل مہر کا منہ بن گیا' وہ منع کرنا چاہتی تھی مگر تائی کے لحاظ میں چپ رہی کہ ان کے داماد کی شان میں گستاخی کہیں انہیں ناگوار نہ گزرے۔

☆ ☆ ☆

آج کل بابر ہمایوں مغل کے ستارے خوب روشن تھے۔ اسی لیے تو وہ جو پلان بناتا وہ کامیاب ہوتا جس کام میں ہاتھ ڈالتا وہ پورا ہوتا۔ پہلے ادا آسانی کے ساتھ اس کے بچھائے جال میں پھنسی' حالانکہ اسے خود بھی امید نہ تھی کہ یہ کام اتنا جلد ہوجائے گا۔ پھر ملک مقبول جھانسے میں آیا۔ یاسمین کو الو بنانا خیر کون سی بڑی بات تھی' یہ کارنامہ تو وہ کئی سالوں سے کرتا آرہا تھا۔ زیور بھی ہاتھ لگا' دوسری طرف پچھلے تین دنوں سے جوئے کی بازی بھی وہ جیت رہا

تھا۔ پرسوں رات چار داؤ کھیلے' تین ہار کے آخری بازی وہ جیت گیا اور آج چار میں سے دو ہارے' دو جیتے۔ بھری جیب کے ساتھ وہ ادا کے ہمراہ "ڈھابا" میں ڈنر کرکے آرہا تھا۔ کرائے پہ لی گاڑی۔ مہنگے ریسٹورنٹ میں پرتکلف کھانا' واپسی پہ اسے لبرٹی سے کرائی شاپنگ' ایک بھرپور شام منا کے جب وہ واپسی گھر لوٹا تو کٹڑی کے بیشتر دروازے بند تھے۔

محنت کش طبقہ رات گئے جاگنے کا عادی نہ تھا۔ دن بھر کی مزدوری سے ٹوٹے ہارے بدن بستر پہ گرتے ہی ہوش سے بیگانہ ہوجاتے تھے۔ کسی کسی کمرے کی کھڑکی کے کواڑوں کی درزوں سے پیلے بلب کی مدقوق روشنی جھلک رہی تھی۔ ایسا ہی ایک دروازہ اس کا تھا۔ حسب عادت اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا تو زمین پہ دسترخوان بچھائے یاسمین تینوں لڑکوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔

"کھانا نکالوں آپ کے لیے۔" سلام کا پھیکا سا جواب لینے کے بعد یاسمین نے پوچھا حالانکہ بابر کی شکل سے لگ رہا تھا کہ وہ خوب سیر ہو کے آیا تھا۔ منہ میں الائچی والا پان دبا تھا جو وہ عموماً کھانے کے بعد لیا کرتا تھا۔

"نہیں۔" انکار کرنے کے بعد اس نے سرسری سی نظر دسترخوان پہ ڈالی۔ تانبے کی ایک بڑی پلیٹ کے بالکل درمیان میں مونگ کی بھنی دال تھی جو غالباً دوپہر کی پکی ہوئی تھی کیونکہ جب وہ دن کو بارہ بجے کے قریب گھر سے نکلا تھا تب یاسمین یہی دال چن کر بھگو رہی تھی۔ ایک چھوٹی پلیٹ میں مولی دھنیے اور ہری مرچ کے ساتھ کوٹ کر رکھی تھی۔ یاسمین ہاتھ میں نوالہ بنا کے اقدس کے آگے بار بار کر رہی تھی اور وہ منہ پیچھے کرلیتا تھا۔

"کیا بات ہے' اقدس کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟"

"گلا خراب ہے' روٹی نگلی نہیں جارہی۔"

"تو مت کھلاؤ زبردستی کیوں منہ میں ٹھونس رہی ہو۔"

"دوا دینی ہے' خالی پیٹ کیسے دے دیں دوپہر بھی کچھ نہیں لیا۔ صبح چائے کے ساتھ دو بسکٹ اور شام کو چائے کا ایک خالی کپ لیا تھا۔ ایسے میں دوا کیا اثر کرے گی۔"

"کوئی نرم چیز بنا دیتا تھی۔ دودھ میں سویاں ڈال کر پکا لیتیں۔ یا یخنی وغیرہ۔"

"مگر کیسے؟ دودھ تو صبح کی چائے میں ہی لگ گیا۔ اور یخنی۔" وہ سرد آہ بھر کے رہ گئی۔ "گھر میں پیسے نہ تھے بالکل بھی نہیں تھے۔ دس روپے بھی ہوتے تو آدھا کلو دودھ منگا لیتے۔"

"چلیں سویاں نہ سہی' دودھ میں روٹی بھگو کے ہی کھا لیتے اقدس۔"

"تم بھی ہمیشہ بے وقت کا رونا روتی ہو۔" اس نے مرغن غذاؤں سے بوجھل ایک بڑا سا ڈکار لیا سیر ہو کے کھانے کی وجہ سے غنودگی چھا رہی تھی۔

"صبح منگا لیتیں' پیسے تو تھے ہمارے پاس۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے سو سو کے دو نوٹ نکالے۔

"صبح دودھ زیادہ لے لینا' کچھ پھل وغیرہ لے لینا' اور ہم جانے سے پہلے گوشت خرید کے دے جائیں گے۔ بچے کو یخنی نکال دینا۔ گلا جلد ٹھیک ہوجائے گا۔"

یاسمین کچھ دیر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں دبے نوٹوں کو دیکھتی رہی۔

"ہم جانتے تھے کہ آپ کے پاس روپے ہیں مگر مانگے اس لیے نہیں کہ جس مقصد کے لیے اس رقم کا انتظام کیا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ یہ اسی لیے استعمال ہو۔ اگر یونہی گھر کے خرچوں میں اسے ضائع کردیا تو ٹکٹ کے لیے مزید رقم کہاں سے آئے گی۔"

"آجائے گی ٹکٹ بھی۔ وہ تمہارا دردسر نہیں۔ ویسے بھی وہ رقم جوں کی توں موجود ہے۔ یہ اور پیسے ہیں۔" اور یہ "اور" پیسے کہاں سے آئے ہیں' کیا ذریعہ معاش ہے اس کا۔ یاسمین اس سے واقف تھی اور اس حقیقت سے بھی کہ اس کام میں اگر وہ مہینے کے دو تین چند سو کما لیتا ہے تو باقی دن اس سے کئی گنا رقم برباد بھی کرتا ہے۔ اسے خدشہ سا ہوا کہ کہیں وہ ساری رقم جوئے میں تو نہیں اڑا بیٹھا۔ لیکن پوچھتے ہوئے ڈر گئی۔ دسترخوان

سمیٹ کر اس نے بچوں کو بستر میں لٹایا اور بابر کی پنڈلیاں دباتے ہوئے اس سے بات کرنے کے لیے الفاظ اور ہمت جمع کرنے لگی۔

آج شام کو ہی تو کوثر بی بی دوبارہ اس کے پاس آئی تھی۔

"لے بھئی یاسمین! میں نہ کہتی تھی تیرا خاوند اور ہی ہواؤں میں ہے۔ میں تو مرد کی چال پہچان لیتی ہوں۔ دوسری عورت کے چکر میں پڑ کے ایسے ہی قدم ہو جاتے ہیں ان مردوں کے..... رکھتے کہیں ہیں' پڑتے کہیں ہیں۔ وہ تو پہلے ہی تجھے نہ پوچھتا تھا' اب دوسری کے چکر میں۔"

"اللہ خیر کرے۔" یاسمین نے دل کے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "کوثر بی بی' بات کرنے سے پہلے سوچ تو لیجیے۔"

"سوچنا کیا؟ میں تو ثبوت کے بغیر بات کرتی تک نہیں۔ مجھے صرف شک تھا' جسے پکا کیا تو نے یہ بتا کر کہ کیسے وہ تجھ سے زیور ہتھیا کے لے گیا۔ بے غیرت انسان' لڑکی جوان ہو رہی ہے' اس کی شادی کے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنی عیاشیوں کی پڑی ہے' اس کے جہیز کی فکر کرنے کی بجائے اس کمینی پہ لٹا رہا ہے۔"

"کوثر بہن۔" یاسمین نے سخت لہجے میں ٹوکا۔ "میں ان کے بارے میں ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتی۔"

"ہائے ہائے تو میں کب پسند کرتی ہوں اس کی بات کرنا۔ یہ تو تمہارے اور تمہارے بچوں کے ساتھ ہمدردی ہے بتا رہی ہوں کہ اگر اب بھی کچھ کر سکتی ہو تو کر لو۔ ورنہ وہ تو نکل گیا ہے ہاتھ سے۔ میں نے شیدو سے پتا کروایا ہے گانے والی ہے۔ بازاری زنانی' رج کے سوہنی اور نکی عمر کی اور تو اور ٹی وی پہ بھی آتی ہے' پتا نہیں تیرے بندے سے عشائی ہے اور اب اگر پھنس گئی ہے تو قابو میں رکھنے کے لیے دانہ تو ڈالنا پڑے گا۔ چاہے کیسے بھی ڈالے یہ بابر کا ویزا۔ ٹکٹ کام سب جھوٹ ہے' ڈرامہ ہے۔ وہ زیور یا تو اس بازاری چھمک چھلو کو تحفے میں دے دیا ہو گا یا پھر بیچ کے اس کی قیمت ادا کر دی ہو گی' مفت میں تو ایسی عورتیں ہنس کے بات تک نہ کریں۔ اک اک نظر کی قیمت لیتی ہیں۔"

"یہ آپ... آ... آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" اس کا رنگ فق ہو گیا۔ کوثر بی بی زبان کی کڑوی تھی' مگر سب جانتے تھے' وہ شوقیہ لگائی بجھائی کرنے والی عورت نہ تھی نہ ہی گھر اجاڑنے والی شخصیت تھی اگر اس نے بابر کے بارے میں ایسی بات کی ہے تو یقیناً اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ہو گی۔

"اب یہ تمہارا کام ہے تم کس طرح بندے کو قابو کرتی ہو۔ ایک بات کہہ دوں' پیار محبت اور قربانی سے اسے سدھارنے کا موقع تم گنوا چکی ہو۔ اب تو بات ذرا رعب سے کرو گی' کچھ سختی سے کام لو گی تو بات بنے گی۔ اپنے میکے کی دھمکی دو۔"

وہ کئی مشورے دے کر چلتی بنی اور اب کتنی دیر سے نشے میں دھت پڑے شوہر کی ٹانگیں دباتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کوثر کے بتائے کس مشورے پہ پہلے عمل کرے اور کیسے کرے۔

جیسے ہی بابر کے ہلکے ہلکے خراٹے شروع ہوئے' یاسمین نے طے کر لیا' نتیجہ کچھ بھی ہو' اسے یہ بات ابھی صاف کرنا ہو گی۔ تاکہ پتا چلے شیدو کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا... واقعی۔

"آپ کے جانے کا کیا بنا؟"

"تمہیں بڑی بے تابی ہے میرے جانے کی۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔ یاسمین نے دبک کے خاموش ہونے کی بجائے جواب دیا۔

"بے تابی نہیں' فکر ہے۔ ہم نے اپنی بچی کا مستقبل داؤ پہ لگا کے آپ کے جانے کا انتظام کیا ہے۔ وہ زیور اس کا حق تھے اور ہم نہیں چاہتی' ان کا غلط استعمال ہو۔" اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں جتانا چاہا۔

"پتا ہے' پتا ہے ہمیں۔ تمہاری اکیلی کی اولاد نہیں۔ ہمیں بھی فکر ہے۔" وہ جمائیاں روک رہا تھا۔

"اور وہ ہمارے ساتھ ساتھ تمہارے میکے کی بھی ذمہ داری ہے۔ پھر ہمیں اکیلے فکر کرنی کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" اس کا دھیما پن ایک دم رخصت ہوا۔

"آپ اپنی بیٹی کی ذمہ داری ان پہ کیوں لاد رہے ہیں۔"

"تو پھر کس دعوے سے لے کر گئے ہیں وہ دلکش کو۔ اپنے گھر کے کام کرانے کے لیے۔"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں وہ وہاں..." وہ بتاتے بتاتے رک گئی کہ وہ امتحان دینے کی نیت سے وہاں رکی ہوئی ہے۔

"آپ بات کو غلط رخ دے رہے ہیں۔ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر فی الحال جانے کا کوئی ارادہ نہیں تو زیور ہمیں واپس کر دیجیے' جب جا رہے ہوں واپس لے لیں۔"

"زیور تو بک گیا۔" اس کے اطمینان بھرے جواب پہ وہ جل کے رہ گئی۔

"تو رقم دے دیجیے۔" پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیا۔

"کس لیے؟" اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"ہمیں ڈر ہے آپ رقم ضائع کر دیں گے۔" یاسمین نے ہمت سے کام لے کر صاف بات کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے تیور جتلا رہے تھے کہ وہ پہلے والی ڈگر پہ لوٹ رہا ہے اور گزشتہ دنوں کا بدلا بدلا سا رویہ محض ڈرامے بازی تھی۔

"رقم ضائع کر دیں گے؟ بچہ سمجھ رکھا ہے کیا ہمیں؟"

"نہیں... بچہ نہیں... بچے ہوتے تو..." اس نے سر جھکا۔

"دیکھیے بابر صاحب' ہم میں بہت صبر ہے اور ہم نے اس صبر کو اتنے سالوں میں خوب ظاہر بھی کر لیا۔ مگر اپنی اولاد کے لیے ہم کچھ بھی کر گزریں گے۔ آپ کو اس راہ سے روکنے کے لیے جو کرنا پڑا کریں گے۔"

"کس راہ سے؟" وہ چونکا۔

"آپ بخوبی جانتے ہیں ہم کیا کہہ رہے ہیں ہم اس بازاری عورت کے بارے میں بات کر رہے ہیں جس کے چکر میں آپ..."

"بکواس بند کرو۔" وہ بپھر گیا تھا۔

● ● ●

"ہماری زبان بند کروا کے آپ من مانی کرنا چاہتے ہیں۔"

پہلی بار یاسمین اس کے گرجنے برسنے کو خاطر میں نہ لائی اور بجائے دبک کے بیٹھنے کے ترخ کے جواب دیا۔ لمحے بھر کے لیے بابر چپ کر گیا۔ اس نے نظر بھر کے یاسمین کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہاں آج ایک نیا ہی رنگ تھا۔ آج وہ چہرہ ایک بے بس' مجبور اور ہر حال میں سمجھوتہ کر لینے والی عورت کا چہرہ نہ تھا' آج اس چہرے پہ کچھ منوا لینے' اپنا حق وصولنے کا غرور تھا۔

"کون چابی بھر گیا ہے؟" بابر نے تمسخر سے پوچھا۔

"ہمارا سوال زیادہ اہم ہے' پہلے آپ بتائیے کون ہے وہ عورت؟"

"کیوں پتہ لگنے پہ تم اسے ہمارے لیے بیاہ کر لانے والی ہو؟"

"اگر آپ نے ہمارے اور ہماری اولاد کے سب حقوق ادا کیے ہوتے' ہمیں ہمارے حصے کی محبت دی ہوتی تو بخدا ہم ایسا بھی کر گزرتے۔ اپنے ہاتھوں کسی نیک بخت کو بیاہ کر لاتے..... اگر ہم اپنے آپ کو آپ کے قابل نہ سمجھتے ہوتے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی... کوئی بھی ذمہ داری نہ بیوی کی نہ اولاد کی آپ نے ہمیں وہ محبت اور اعتماد نہیں دیا جو ہمارا حق تھا۔ آپ نے اپنے بچوں کی پرورش میں وہ کردار ادا نہیں کیا جو آپ کا فرض تھا۔ پھر ہم قربانی کی ایسی مثالیں کس لیے اور کیوں پیش کریں؟ اور آپ کی پسند... وہ بدکردار' بازاری... ناچنے و گانے والی عورت' اسے ہم... صاحبزادی یاسمین خانم' اپنے مقابل کیسے لا سکتی ہیں۔ آپ کیا جانتے ہیں کہ ہمیشہ ہماری آنکھوں میں کامیابی سے دھول جھونکتے رہیں گے؟ ہمیں کبھی کچھ پتہ نہیں چلے گا؟"

"کس نے بتایا تمہیں یہ سب؟" وہ ٹھٹھک کر پوچھنے لگا۔ یاسمین کا باوثوق انداز اور دوٹوک لہجہ باور کرا رہا تھا کہ اسے کہیں سے سن گن نہیں ملی بلکہ کسی نے مکمل ثبوت کے ساتھ ساری معلومات اس تک پہنچائی ہیں۔ اس کا دھیان مسلسل اپنے سالے عمیص کی جانب ہی جا رہا تھا کہ ہو نہ ہو' اس نے کہیں نہ کہیں اسے ادا کے ساتھ دیکھ لیا اور پھر ٹوہ لے کے سب جان گیا۔

"کیوں؟ جان سے مار دیں گے جا کر اسے کہ آپ کو بے نقاب کیوں کیا؟" اس سے پہلے کہ صاحبزادی یاسمین اپنی اس نئی دریافت یافتہ ہمت و جرأت کا مزید مظاہرہ کرتی' بابر نے الٹے ہاتھ کا طمانچہ اسے دے مارا۔ وہ تیورا کر گری۔ بچے جو ابھی گہری نیند میں نہیں گئے تھے' ان کی ہلکی غنودگی تو ماں باپ کی تلخ کلامی سے ہی ٹوٹ گئی تھی' اب ماں کو پڑنے والے زوردار تھپڑ نے انہیں تڑپ کر بستر سے نکلنے پہ مجبور کر دیا۔ بابر تلملائے ہوئے انداز میں زمین پہ گری یاسمین کو اپنے دونوں بیٹوں کے حلقے میں دیکھ رہا تھا۔

نایاب قد نکال رہا تھا۔ نانا اور دادا کی طرح اس کا ڈیل ڈول صحتمند اور کاٹھی مضبوط تھی۔ کم خوراکی اور گھٹے ہوئے ماحول کے باوجود فطری طور پر اچھی اٹھان رکھنے کی وجہ سے اپنی عمر سے چند سال بڑا ہی لگتا۔ اگرچہ اس نے ماں سے ہونے والی زیادتی پہ باپ کو ایک لفظ تک کہنے کی جسارت نہ کی تھی کہ یاسمین نے اپنی اولاد کی تربیت انہی خطوط پہ کی تھی لیکن ماں کے پاس لپک کے آتے ہوئے اس نے بس ایک گلہ آمیز نگاہ باپ پہ ڈالی تھی اور بابر اس ایک نگاہ سے ہی خائف ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا' یہ لڑکے جو آج ماں کی ہمدردی میں اسے اجنبی نظروں سے گھور رہے ہیں کل کو اس کے مقابلے پہ بھی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہ تلملا کے اور بپھر گیا۔

"سازشی عورت' شوہر کی جاسوسی کراتی ہو' اولاد کو ہمارے خلاف بھڑکاتی ہو۔ یہ ہے تمہارے اعلیٰ نسب گھرانے کی روایات؟ دریہ ہے تمہارا مہذب خون؟ یہی سکھایا ہے تمہارے والدین نے تمہیں۔"

"تربیت پہ الزام مت دیجیے۔ آپ کے جنت مکانی والدین نے بھی یقیناً یہ سب آپ کو نہیں سکھایا ہوگا نہ ہی کبھی یہ خواہش بھی کی ہوگی۔" وہ دکھتے ہوئے رخسار پہ ہاتھ رکھ کے اٹھنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"انہوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ آپ ان کی اتنے ارمانوں اور چاؤ سے لائی بہو کے مقابل ایک بدنام زمانہ بازاری عورت کو لا کھڑا کریں گے۔"

"کیا بازاری عورت' بازاری عورت کی رٹ لگا رکھی ہے' وہ ایک فنکارہ ہے۔ مگر اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔" سچ اچانک ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔ یہ اعتراف کرنے میں اسے اپنی بیوی سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قبل وہ اس کی ہوا کسی کو لگانا نہ چاہتا تھا۔

"اچھا گھرانہ..... کسی اچھے گھرانے تک آپ کی رسائی ہونا اب ناممکن ہے مغل صاحب۔ وہ بھلے وقتوں کی بات تھی جب ہمارے چچا حضور نے دھوکا کھایا۔ تب آپ کے سر پہ آپ کے والد کا دست شفقت تھا۔ ان کی نیک نامی اور خاندانی نجابت کے آگے کوئی آپ کا کردار جانچنے کی زحمت کرنا گوارا ہی نہ کرتا تھا۔ لیکن اب آپ وہ سب گنوا چکے ہیں۔ خود تو آپ نے اپنا نام بنایا ہی نہیں۔ اپنے آباؤ اجداد کی نسلوں سے کمائی عزت بھی ملیامیٹ کر چکے ہیں۔ ہم بیاہ کے جس حویلی میں آئے تھے۔ وہ یہ کھنڈر تو نہ تھی یہاں جن لوگوں کو ہماری ہمسائیگی کا شرف حاصل ہے' تب اس زمانے میں اس حویلی کے ملازمین تک ان سے زیادہ باحیثیت تھے۔ جو لوگ آپ کے والد صاحب کی جوتیاں سیدھی کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے' ان لوگوں سے دس دس روپے تک مانگ کے آپ اپنی عزت اور وقار کھو چکے ہیں۔ اب کس عزت دار گھرانے کی شریف لڑکی کی عقل پہ پردے پڑ سکتے ہیں؟ بلکہ ہم تو حیران ہیں ناچنے گانے والی بھی کیا دیکھ کے آپ کو....."

"اپنی زبان کو لگام دو یاسمین۔ کہیں ایسا نہ ہو پہلی بار کا کھلنا ہی اس زبان کو بھاری پڑے اور دوبارہ وہ بولنے کے قابل تک نہ رہے۔"

"ہمیں بھی زبان درازی اور تلخ کلامی کا شوق نہیں' نہ یہ ہمارا وتیرہ ہے نہ ہمارا معیار۔ حتیٰ کہ ہمیں تو آپ کے

کردار میں دن بدن گہری ہوتی دراڑوں سے بھی اب کوئی غرض نہیں رہی۔ ہمیں تکلیف ہے تو اس بات کی کہ آپ نے اپنے مکروہ شوق پورے کرنے کے لیے اب ہمیں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کی فطرت میں جھول ہے' تو ٹھیک ہے' کیجیے عیاشی..... مگر اپنے بل بوتے پہ۔ گندگی میں گرنے کا شوق ہے تو شوق سے گریے مگر دھیان سے' کوئی ناپاک چھینٹا ہم تک یا ہمارے بچوں تک نہیں آنا چاہیے۔ آپ کو جو کرنا ہے کیجیے' ہمیں ہمارے زیورات اور رقم واپس لا دیجیے' ویسے تو شادی سے لے کے اب تک آپ ہمارا کتنا ہی زیور برباد کر چکے ہیں' میکے کا بھی اور سسرال سے ملا ہوا بھی..... لیکن فی الحال ہم اس زیور کی بات کر رہے ہیں جو ہماری ضعیف' بیوہ والدہ حضور نے بڑے ارمانوں سے اپنی اکلوتی نواسی کے لیے بچا رکھا تھا اور جو ہم آپ کی چکنی چپڑی باتوں کے جھانسے میں آ کے ان سے لے آئے۔ وہ ہماری بیٹی کا حق ہے مغل صاحب' ہم اسے کسی دو ٹکے کی عورت کے ناز نخروں پہ نچھاور نہیں کرنے دیں گے آپ کو۔ آپ کو باپ ہو کے فکر نہیں' امی حضور نے نانی کی حیثیت سے جو بچا کے رکھا ہے وہ تو رہنے دیں۔"

بات کرتے کرتے یاسمین کا لہجہ آخر میں التجا آمیز ہو گیا۔

"ہم کہہ چکے ہیں' زیور بیچ دیا ہے۔" وہ لاپروائی سے تکیہ درست کر کے لیٹنے کی تیاری کرنے لگا۔

"تو پھر اس زیور کی رقم ہمارے ہاتھ میں رکھ دیں۔" یاسمین نے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلایا جو لیٹتے لیٹتے پھر سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"اماں عجیب خبطی عورت ہو' ایک بار کی بات سمجھ میں نہیں آتی کیا؟ کہاں سے لائیں رقم؟" وہ جھنجلا اٹھا۔

"صاف صاف کہیے' اڑا بیٹھے ہیں۔"

"یہی سمجھ لو۔" اس نے دوبارہ لیٹتے ہوئے ٹکا سا جواب دیا اور چادر منہ تک تان لی۔ یاسمین آنکھوں میں آنسو بھرے دیر تک اس بے حس اور ڈھیٹ شخص کو تکتی رہی' جس کے خراٹے چند سیکنڈ بعد ہی گونجنے لگے تھے' وہ ایسا ہی تھا۔ یا شاید نشے کی زیادتی نے اسے ایسا کر دیا تھا' منٹوں میں ہوش سے بیگانہ ہو کے نیند کے مزے لینے لگتا' چاہے کتنے ہی سنگین' تلخ سے تلخ واقعہ گزر چکا ہو۔ یاسمین نے پلٹ کے بچوں کی جانب دیکھا ان کی کچی نیند سے جاگی آنکھوں میں خمار کی بجائے ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کے ان کے برابر جا لیٹی بتی بند ہونے کے بعد بچے تو ماحول میں خاموشی چھاتے ہی سو گئے تھے مگر وہ دیر تک جاگتی رہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ رات کا بقیہ پہر اس نے آنکھوں میں کاٹ کے گزارا۔ رہ رہ کے اسے جہاں اپنی ہمت پہ جی بھر کے حیرت ہوتی وہاں بابر کی ڈھٹائی اور سینہ زوری پہ تاؤ بھی آتا۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ دوبارہ لیٹی تو آنکھیں نیند سے تو نہیں البتہ رات بھر کی بیداری سے بوجھل ہونے کے بعد بند ہوتی جا رہی تھیں' سر میں ہتھوڑے سے بج رہے تھے۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنے لیے ایک کپ چائے ہی بنا لیتی' ایسے میں اسے دلکش کی کمی بری طرح محسوس ہوئی۔

"کاش دلکش کے والد بھی یہ سمجھ پائیں کہ بیٹی رحمت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بھاری ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔"

اس کی یاد شدت سے آنے کے باوجود اسے یہاں نہ لانے کے اپنے ارادے میں اسے مزید مضبوطی پیدا کرنا پڑی۔

"اچھا ہی ہوا جو وہ یہاں موجود نہیں ورنہ اپنے والد کے کردار کا یہ نیا رخ انہیں کس قدر ملول کر دیتا' وہ اب ماشاء اللہ عمر کے اس دور میں ہیں کہ سب اچھا برا سمجھنے لگی ہیں۔ ہماری رات کی تکرار سے نایاب اور شمشیر بھی بھانپ گئے ہوں گے کہ مسئلہ کیا ہے' آخر آج کے دور کے بچے ہیں لیکن بیٹوں کی نسبت بیٹی کے دل و دماغ پہ والد کے بارے میں ایسا تاثر پیدا ہونا زیادہ شرمناک ہے۔ ہم نے تو اتنے سالوں تک ہر ممکن کوشش کی کہ ان کے والد کی ہر کوتاہی کی چشم پوشی کر کے ان کے دلوں میں ان کا احترام باقی رہنے دیں مگر..... آخر ہم بھی حوصلہ ہار ہی گئے۔ کیا کرتے اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا' تو کیا ان کے مستقبل کی فکر سے نڈھال ہو کے کیا۔ یا اللہ' اگر ہم تیرے بنائے

اصولوں سے روگردانی کے مرتکب ہوئے ہیں تو ہمیں معاف فرما‘ ہمارے اور ہمارے بچوں کے حال پہ رحم فرما‘ ان کے والد کے دل میں اپنی اولاد کے لیے گنجائش پیدا فرما۔ اور انہیں گمراہی کے اندھیروں سے نکال دے۔"

آنکھیں بند کیے وہ دیر تک اپنے رب سے دل کے دکھ بیان کرتی رہی۔ پتہ ہی نہیں چلا کب صبح کی سفیدی پھیل گئی۔ چھٹی کا دن تھا۔ بچوں کو اسکول جانے کی جلدی نہیں تھی‘ اس لیے انہیں جگانے کی بجائے کسلمندی سے کروٹ بدلے لیٹی رہی۔ اچانک کھٹکے کی آواز اسے اس کے خیالوں سے واپس کھینچ لائی۔ شاید دروازے کی چٹخنی گرائی گئی تھی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ بابر چپل میں پاؤں پھنساتا‘ ڈولتے قدموں کے ساتھ باہر نکلنے کی تیاری میں تھا۔

"کہاں چل دیے آپ..... اتنے سویرے سویرے۔" وہ کبھی بھی اتنی صبح خیزی کا عادی نہ تھا۔ وہ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کروا رہی ہوتی‘ ناشتہ بنا رہی ہوتی تو ایک ہی کمرے کی وجہ سے ہزار کوشش کے باوجود پیدا ہونے والی آوازوں سے وہ جاگ بھی جاتا تو کبھی بڑبڑا کے تو کبھی بکنے جھکنے کے بعد دوبارہ کروٹ بدل کر سو جاتا۔ آج آنکھ کھلتے ہی اس کے باہر نکلنے کا مقصد شاید یاسمین سے فرار حاصل کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ دیر رات تک جاگنے کی وجہ سے ابھی تک سو رہی ہے۔

وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر باہر نکلنے کے لیے ایک قدم آگے بڑھا چکا تھا کہ یاسمین تڑپ کے اٹھی اور تیر کی طرح لپک کے اس کا دامن تھام لیا۔

"آپ اس طرح نہیں جاسکتے۔"

"پاگل ہو گئی ہو خبطی عورت۔" وہ سٹپٹا کے رہ گیا۔ سارا نشہ تو ہرن ہو ہی چکا تھا‘ اب یاسمین کی نئی نئی جسارت پہ رہ رہ کے حیرت ہو رہی تھی۔ رات کے مکالمے یاد آتے تو وہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتا کہ وہ سب واقعی اس ڈری سہمی خود اعتمادی سے عاری دبو سی عورت نے کہا تھا‘ یا اس کا وہم ہے اس نے کوئی خواب دیکھا تھا یا پھر نشے کی زیادتی نے خود ہی کوئی خیال تراش لیا ہے۔

"ہمارے سوالوں کا جواب دیے بغیر‘ ہمارے بچوں کا حق ہمیں لوٹائے بغیر آپ یہاں سے نہیں جاسکتے۔"

وہ آنکھوں میں سختی‘ چہرے پہ عزم اور لہجے میں چیلنج لیے اس کے سامنے کھڑی یہ باور کرا رہی تھی کہ نہ تو وہ کوئی خواب تھا نہ ہی وہم۔

"ہٹو سامنے سے۔" اس نے یاسمین کو پرے دھکیلنا چاہا۔ مگر وہ ڈٹ کے کھڑی رہی۔

"ہمیں وہ زیور واپس چاہیے..... یا اس کو بیچنے کے بعد جو رقم آپ کے ہاتھ لگی‘ وہ لوٹا دیجیے۔"

"پھر وہی بات‘ وہی ضد‘ کتنی بار بتائیں کہ ہم نے وہ زیور باہر جانے کے لیے فروخت کیا ہے اور اب تم اتنا کیوں ابل ابل کے بول رہی ہو۔ کیا ہم نے پہلے تمہیں ہر بات بتا نہیں دی تھی۔"

"نہیں آپ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ آپ نے ایک جھوٹی کہانی گھڑی تھی۔ ہمیں ایک بار پھر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ہاں‘ ہم تسلیم کرتے ہیں‘ ہم آج بھی اتنے ہی بے وقوف ہیں کہ آسانی سے آپ کے ہر جھوٹ پہ یقین کریں۔ مگر مغل صاحب‘ ایک بیوی دھوکا کھا سکتی ہے‘ اسے غل دینا آسان بات ہے لیکن ایک ماں اپنے بچوں کو لٹنے نہیں دے گی۔ وہ زیور ہمارا آخری اثاثہ ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے سنہرے مستقبل کے لالچ میں انہیں ایک امانت کے طور پہ اپنے شوہر کو ضرور دے سکتے ہیں۔ اور ضرورت پڑنے پہ ان کے سر سے وار کے بھی پھینک سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ اسے ان کی عیاشیوں میں استعمال ہونے۔ یا کسی پرائی عورت کے ناز و ادا پہ نچھاور کرنے کے لیے دے دیں۔ اتنا بڑا ظرف نہیں ہے ہمارا۔"

"تم کیا اور تمہارا ظرف کیا۔ اپنی اوقات میں رہو یاسمین بیگم۔" اس نے ایک بار پھر اسے پیچھے کر کے آگے نکلنا چاہا مگر وہ پتھر کی طرح دہلیز میں ایستادہ ہو گئی۔ بچے جاگ گئے تھے اور اپنے اپنے بستر میں دبکے یہ سب خوفزدہ حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے جو اس کٹڑی کے ہر گھر کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ ان سب سے واقف تھے مگر عادی

نہ تھے کیونکہ ان کے اس مختصر سے گھر میں ایسا منظر کبھی نہ دیکھا گیا تھا۔ بابر کو اونچا بولنے‘ گالیاں بکنے اور برتن پٹخنے کی عادت تھی مگر یاسمین کی خاموشی اور تحمل بات کو آگے نہ بڑھنا دیتا۔ وہ خود ہی دو تین منٹ تک بکنے جھکنے کے بعد گھر سے نکل جاتا۔

"آپ یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ آپ کے کسی عورت سے تعلقات ہیں اور اسی کی خاطر آپ نے ہم سے—"

"ہم نے واقعی باہر جانے کے لیے یہ زیور بیچے ہیں۔ یقین کرنا ہے تو کرو‘ نہیں کرنا تو بے شک مت کرو۔ ہم تمہیں وضاحتیں دینے کے پابند نہیں۔ جب ہفتہ دس دن کے اندر یہاں سے چلے جائیں گے تب تمہیں شاید یقین آجائے۔"

"تو آپ باہر جانے کا نام لے کے اس گھر سے اور اس گھر کی ان ذمہ داریوں سے فرار چاہتے ہیں جو آپ نے کبھی پوری نہیں کیں۔ آپ اب کسی بازاری عورت کے پالتو بن کے....."

بابر کے زوردار تھپڑ نے یاسمین کو بات مکمل نہ کرنے دی۔ وہ وحشیوں کی طرح اس پہ ٹوٹ پڑا۔ طمانچوں‘ لاتوں اور گھونسوں کا بے دریغ استعمال کرنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے یاسمین نے لب دانتوں کے اندر اس سختی سے بھینچ لیے کہ ان سے خون رسنے لگا۔ البتہ بچوں کی بے ساختہ چیخوں نے در و دیوار ہلا کے رکھ دیے۔ ننھا اقدس گلا پھاڑ کے رونے لگا۔ آس پاس کی کٹڑیوں کے کواڑ مارے تجسس کے دھڑا دھڑ کھلنے لگے۔

"ہاں‘ جانا چاہتے ہیں ہم یہاں سے..... کیا کر لو گی تم؟ کیسے روکو گی؟ کیا رکھا ہے تمہارے جیسی تھکی ہوئی عورت کے پاس جس کے بل بوتے پہ تم ہمیں روک کے رکھ سکو۔ شادی کر رہے ہیں ہم اداجی سے سن لیا..... بہت ارمان تھے سچ جاننے کے‘ جان لیا سچ؟"

اس کی زبان اور ہاتھ بے روک ٹوک چل رہے تھے۔

"ہائے میں مرجاواں..... کی ظلم کما رہیا ایں" (کیا ظلم کما رہے ہو۔)

صورتحال کو بھانپ لینے کے بعد پڑوسیوں میں سے سب سے پہلے کوثر بی بی نے اندر آنے کی ہمت کی اور زمین پہ ادھ مری پڑی یاسمین پہ بابر کو لاتیں برساتے دیکھ کے دھک سے رہ گئی۔

اس کے اندر آنے پہ بابر اچانک رک گیا ادھ کھلے دروازے سے صاف نظر آرہا تھا۔ باہر اور بھی بہت سے متجسس لوگ اندر جھانک جھانک کر اپنے طور سے اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہاں تماشا نہیں ہو رہا‘ کیوں اکٹھے ہو رہے ہیں سب ہمارے دروازے کے سامنے‘ یہ کیسی ایرے غیرے کا نہیں بابر ہمایوں مغل کا گھر ہے‘ شمشیر نایاب مغل کے بیٹے کا گھر۔"

وہ بلند آواز میں دہاڑا۔ یاسمین پہ آنے والا غصہ اب ان تماشائیوں کی جانب منتقل ہو گیا۔

"تماشا تو میاں تم خود بنا رہے ہو۔ یہاں رہنے والوں کا تو خیر ہمیشہ سے یہی کام رہا ہے‘ تماشا لگوانا اور تماشا دیکھنا۔ ہاں مگر اس گھر سے کبھی کسی تماشے کے ہونے کی خبر نہیں ملی تھی اور واقعی ہم بھی مانتے تھے کہ یہ گھر اور یہ گھر والے ہم میں سے نہیں‘ یہ شمشیر نایاب مغل کے وارثوں کا گھر ہے مگر آج تم نے خود اپنے آپ کو اس کٹڑی میں رہنے والے دوسرے مزدور پیشہ اور کم ذات لوگوں کے برابر کھڑا کر دیا ہے۔" کوثر بی بی نے کھری کھری سنائیں جن کی وہ تاب نہ لا کے تیزی سے آگے بڑھا اور دروازے کو ایک ٹھوکر رسید کرتا باہر نکل گیا۔

"چلو‘ چلو‘ کام کرو اپنا۔" کوثر بی بی نے دروازے سے سر نکال کے سب کو گھر کا۔

"چھٹی والے دن اور کوئی کام نہیں تو ادھر ادھر کن سوئیاں لیتے پھرتے ہیں..... دفع ہو۔"

کواڑ اچھی طرح بند کرنے وہ یاسمین کی جانب پلٹی جو اسی حالت میں فرش پہ گری پڑی تھی۔

"نامراد‘ کس بے دردی سے پیٹ گیا ہے‘ کلیجہ نہیں کانپا کمینے کا۔ اب کوئی تیری عمر رہی ہے یوں جوان ہوتے بچوں کے سامنے پٹنے کی‘ برداشت زدر سمجھتے ہیں یہ خبیث خود کو بیوی پہ ہاتھ اٹھا کے۔ ہاتھ ٹوٹیں ان سب مردودوں

کے۔"

یاسمین پہ ہمدردی کے پھاہے رکھتے۔ ویسے وہ اس قبیل کے سبھی مردوں کو بے نقط سنا رہی تھی اور یاسمین جو کسی ہمدرد کی زبان سے بھی اپنے شوہر کے بارے میں نازیبا کلمات سن کر ناگواری سے ٹوک دیا کرتی تھی، آج چپ چاپ سن رہی تھی۔

"تاؤ آیا ہوگا ناں کہ اس سیدھی سادی گھر میں بیٹھی، بے چاری سی زنانی کو کیسے خبر ہوگئی میرے کرتوتوں کی۔ ہونہہ، خود تو عیش کرتا پھرتا ہے، ہیروئنوں کے ساتھ، ادھر بیوی بچے روکھی سوکھی کو ترستے رہتے ہیں۔ بڑا آیا کہیں کا نواب زادہ..... اچھا کیا جو تو نے اسے یہ جتادیا کہ تو بے خبر نہیں روز روز تو ہاتھ اٹھانے سے رہا اور اٹھائے گا کس حق سے؟ فرض کونسا پورا کر رہا ہے جو حق جتائے گا۔ میں تو کہتی ہوں روز اس کے نکلنے سے پہلے ایسے ہی پواڑا (فساد) کھڑا کر دیا کر۔ چار دن میں سیدھا.....'

"اس کی نوبت نہیں آئے گی کوثر بہن....." وہ نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی کہ یاسمین نے چادر کا پلو پھٹے ہوئے ہونٹ پہ رکھ کر خون خشک کرتے ہوئے اس کی روانی کو بریک لگا دیا۔

"وہ شادی کر رہے ہیں؟"

"ہیں....." وہ بھاڑ سا منہ کھول کے رہ گئی۔

"شادی.....؟ دوسری شادی اور یہ کنگلا جواری، یہ تو اس قابل بھی نہ تھا کہ کوئی اسے جوانی میں بھی اپنی بیٹی دیتا تمہاری ہی قسمت خراب تھی یا تب اس کا نصیب چمک رہا تھا جو تمہارے ہوتے سوتے اندھے ہوگئے اور اس کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دے دیا۔ یہ اس ڈھلتی عمر میں، شراب سے کھوکھلے ہوئے اس بے کار آدمی میں کسی لڑکی کو کیا نظر آیا ہوگا بھلا؟ اور لڑکی بھی اتنی سوہنی، فلموں، ڈراموں میں کام کرنے والی..... ناں ناں..... ایویں چھوڑ رہا ہو گا او نگی بو نگی، تجھے رعب دکھا رہا ہوگا۔ دھوکے سے لیے پیسے دکھا کے چار دن اس کو ساتھ لے کر پھر کیا لیا، سوچ رہا ہے وہ پری اس سے شادی بھی کرلے گی بھلا یہ فلموں ڈراموں والیاں بھی کسی کی بنی ہیں یہ تو پیسے کی یار ہیں۔"

"وجہ کوئی بھی ہو، مگر وہ جو بھی ہے ان سے شادی کرنے پہ تیار ہے، ہم جانتے ہیں وہ کب سچ بولتے ہیں اور کب جھوٹ۔" وہ یاسیت سے کہہ رہی تھی جب دروازے پہ دستک ہوئی۔

"بڑے ذلیل ہیں، جب تک ساری اسٹوری نہ پتہ چل جائے گی، جان نہیں چھوڑیں گے۔ ذرا میں ان کی تو طبیعت صاف کروں، پھر ذرا تجھے چائے ناشتا کراتی ہوں، دوا دارو دیتی ہوں۔"

وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھی اس کا خیال تھا آس پاس کے کسی گھر کی کوئی عورت ساری تفصیل جاننے اور آنکھوں دیکھا حال سے واقف ہونے آئی ہوگی مگر یاسمین کے لیے یہ دستک خاصی جانی پہچانی تھی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے لکڑی کے بند دروازے کی ان درزوں کو دیکھنے لگی جن سے روشنی کی باریک سی لکیریں اندر تک آ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"سالی، اتنی ہمت بڑھ گئی ہے، اب ہماری جاسوسی کرائے گی۔ اس کو تو ایسا سبق سکھاتے ہم اگر جو ہمارے چار بچوں کی اماں نہ ہوتی تو....."

سارے رستے وہ بڑبڑاتا ہوا دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔

"سوچا تھا، سالی نے پندرہ سال تک جیسے تیسے ساتھ دیا ہے اور کچھ نہیں چلو اولاد تو ہماری اپنی ہے، ماں کے کم صورت ہونے میں ان کا کیا قصور۔ باہر جا کے جیسے ہی دن پھریں گے، ان کو بھی نہ بھولیں گے۔ بھجوا دیا کریں گے چند ہزار ہر مہینے۔ مگر یہ بدزبان عورت اس قابل نہیں کہ اس کا بھلا سوچا جائے۔ بچوں کا خیال نہ ہو تو باہر جا کے ایسے گم ہوں کہ کبھی پیچھے کی خبر نہ لیں۔ سالی کو سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوہ کی طرح اکیلے بچے پالنا پڑیں تو ساری طرم خانی ہوا ہو جائے گی۔ مگر کیا کریں، دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ شریف انسان ہیں، دل میں خدا کا خوف ہے ورنہ"

وہ اپنی خود ساختہ اور نام نہاد شرافت، نرم دلی اور خوف خدا کے راگ الاپتا ملک مقبول کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا تاریخ مقرر ہوئی ہے؟"

"تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میں تمہارے بیاہ کے دن رکھنے گیا تھا۔" وہ حلق پھاڑ کے ہنسا۔

"ہم اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں۔ باہر جانے کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔ کس تاریخ کی ٹکٹیں کروائی ہیں؟"

"تم اتنے اتاولے کیوں ہو رہے ہو؟ کیا میری تاریخ سے میچ کر کے اپنی شادی کی تاریخ رکھنی ہے یا دوران پرواز، ہوائی جہاز میں نکاح پڑھوا کے کوئی عالمی ریکارڈ قائم کرنا ہے۔" وہ ابھی تک سنجیدہ نہ ہو رہا تھا۔

"کیا کریں، ہر طرف سے دباؤ کا شکار ہیں ہم۔ ایک طرف ادا جی ہیں جو شادی پہ سو فیصد رضامندی ظاہر کر دینے کے بعد اب نجانے کس لیے مہلت چاہتی ہیں تو دوسری جانب ہمارے گھر تک اس کارنامے کی اطلاع پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔"

"یہ ادا کی ٹال مٹول کی وجہ کیا ہے؟" وہ کھٹکا۔

"کچھ خاص نہیں، شادی سے انکار نہیں کیا، البتہ باہر جانے سے پہلے نکاح کرنے کی بجائے واپس آ کے نکاح کرنا چاہتی ہے اور یہی ہماری پریشانی کی اصل وجہ ہے۔ واپس کون کم بخت آنا چاہتا ہے۔" وہ اپنا اصل منصوبہ بے دھیانی میں اگل گیا۔

"اوہو..... تو یہ بات ہے۔" ملک مقبول نے اپنا چکنے گھڑے جیسا سر ہلایا۔

"یہ ارادے ہیں..... بچو ہم سے استادیاں....."

"کیسی استادیاں، ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ادا جی کے ساتھ وہیں سیٹل ہو جائیں۔ وہاں بھی کام کم تو نہیں بلکہ یہاں سے زیادہ ہی ہوگا۔ وہاں رہنے والے خوشحال پاکستانی بھی آئے دن گھروں میں تقریبات منعقد کرتے رہتے ہوں گے، یہاں رہ کے تو کھلی چوائس ہے، جس مرضی گلوکارہ یا رقاصہ کو پرفارم کرنے بلا لو، ایک، اینٹ اکھاڑو تو درجن بھر نکلتی ہیں لیکن وہاں اکا دکا ہیں۔ جم کے بزنس ہوگا اور آپ جیسے خیر خواہ بھی ہوں تو کیا بات ہے۔ ظاہر ہے آپ کے سال میں جتنے شوز بھی وہاں ہوں گے، ادا جی تو ان میں لازمی ہوں گی۔" اس نے بات سنبھالی مگر ملک مقبول بھی ایک گھاگ شخص تھا۔ اسے گہری نظروں سے دیکھتا سر ہلاتا رہا۔

"دیکھو یار، میں بندہ ہوں ذرا صاف طبیعت کا کھلے ڈلے مزاج کا۔ گھما پھرا کے بات کرنا مجھے نہیں آتی، میرا تو اصول ہے کہ یا تو بندہ سیدھے رستے چلے یا پھر اگر بے غیرت ہونا ہے تو کھل کے بے غیرت ہو۔ بے غیرتی بھی ایک بہت بڑا فن ہے، فنکار قسم کا بے غیرت ہی اس ہنر سے فیض اٹھا سکتا ہے، بس طریقہ آنا چاہیے اپنے اندر کی کمینگی، بے غیرتی، خود غرضی اور لالچ کو برتنے کا۔"

"ہم سمجھے نہیں۔" اور وہ سچ کہہ رہا تھا۔ یہ فلسفہ واقعی اس کے سر سے گزر رہا تھا۔

"بچے، یہاں تک تو تم نے صاف بتا دیا کہ اس سے شادی کرنے کے بعد بھی تم اسے بیوی کا باعزت رتبہ دے کر چار دیواری میں تو بٹھانے والے نہیں۔ اپنے وطن میں بیوی کی کمائی کھاتے ہوئے شرم آتی ہے، زمانے کے طعنوں یا اپنے خاندان کی عزت ملیا میٹ ہونے کا ڈر ہے اس لیے یہاں سے دور جا کے اس کی کمائی پہ عیش کرنا چاہتے ہو..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔" یہاں تک کہہ کے وہ رکا اور تصدیق چاہی۔ باوجود چاہتے ہوئے بھی اس کے اندازوں کو جھٹلا نہ سکا۔ پچھلے تین چار سالوں کی رفاقت نے اس کا کوئی پردہ ملک سے رہنے نہ دیا تھا، اس کی طبیعت کھل کے اس کے سامنے آچکی تھی، اب چھپا کے کیا کرتا۔

"تو بچہ، اپنے ذہن کو تھوڑا اور کھولو، جب بندہ چور بن ہی جائے تو پھر ڈر کیسا۔ نوٹوں کی گڈی میں سے ایک روپیہ چرا کے بھی گناہ گار ہی بننا ہے تو کیوں نہ پوری گڈی اڑا لی جائے۔ جب نقب لگا کے کسی کے خزانے میں پہنچ ہی چکے ہو تو گھوم پھر کے نظارہ کرنے یا ایک آدھ چیز غائب کرنے کی بجائے خزانے کیوں نہ بٹور لیے جائیں۔"

"ملک صاحب' ابھی آپ گھما پھرا کے بات نہ کرنے کا دعوا کر رہے تھے اور اب آپ اپنے اسی دعوے کو ہوا میں اڑا رہے ہیں۔" وہ مبہم سا مسکرایا۔

"میں تو فٹ سے اصل بات کہہ ڈالوں' یہ تو سننے والے پہ ہے کہ اس میں کھلی بات سننے کا جگرا ہے بھی یا نہیں۔ یار۔۔۔ لوگ اندر سے چاہے پورے ہوں اوپر اوپر سے چنگا بننے کا شوق بڑا ہوتا ہے انہیں۔ اگر تمہیں ایسا کوئی شوق نہیں تو سنو' اگر ادا کو باہر لے گئے' شادی وادی بھی کرلی تو خالی خولی اس کی آواز پہ تم کتنا کمالو گے؟ تم نے کبھی غور سے اسے دیکھا ہے۔۔۔ نہ نہ۔۔۔ عاشق کی نظر سے نہیں' کسی بیوپاری کی نظر سے؟ میں نے دیکھا ہے۔ کیونکہ میں بیوپاری ہوں۔ صرف فن کا ہی نہیں' حسن کا بھی اور اگر تم حسن کے اس خزانے کا بیوپار مجھ سے کرواؤ تو میں تمہیں تمہاری سوچ سے بھی کئی گنا زیادہ منافع دلوا سکتا ہوں' سالوں میں نہیں' مہینوں میں۔ باہر کی مارکیٹ میں ایسے ستھرے پیس کی بہت ڈیمانڈ ہے۔"

بابر کتنی ہی دیر ہونق انداز میں اسے دیکھتا رہا۔

"یعنی آپ کے بارے میں جو اکثر اڑتی اڑتی سنا کرتے تھے' وہ سچ ہے۔"

"پچاس فیصد۔" ملک مقبول نے بڑے آرام سے تسلیم کرلیا۔

"پچاس فی صد اس لیے کہ ایک تو میں یہ کام بڑے منظم اور اصولی طریقے سے کرتا ہوں' کوئی زور زبردستی' دھوکا دہی نہیں ہے۔ بردہ فروشوں سے اغوا کرا کے نہیں اٹھوا تا لڑکیاں۔ جو اپنی رضا سے اس بزنس میں آنا چاہیں' باقاعدہ کانٹریکٹ کے تحت رکھتا ہوں اور دوسری بات یہ کہ میرے اس بزنس کی کوئی برانچ پاکستان کے کسی شہر میں نہیں۔ یہاں صرف فن کا بیوپار ہوتا ہے۔ شو ہی شو۔۔۔ شو بزنس' اصل بزنس عرب امارات' کینیڈا' ناروے' انگلینڈ اور امریکہ وغیرہ میں رہنے والے دولت مند پاکستانی' ہندو اور سکھ تاجروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہو' منظور ہے۔"

ہار کہنا بابر ہمایوں مغل کے لیے اتنا آسان بھی نہ تھا۔ ادا کے حوالے سے اس نے واقعی مفت کی کھانے کے خواب دیکھے تھے' اور اسی خواب کو پورا کرنے کے لیے اس نے ادا کے دل میں اپنے لیے پیدا ہونے والی گنجائش سے فائدہ اٹھانے کا سوچا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک سچ تھا کہ ادا کی معصومیت اور سچائی نے اسے دل سے متاثر کیا تھا۔

ملک مقبول کے کہنے پہ چند سو روپے کمیشن کی خاطر وہ ناچنے گانے والی لڑکیوں کے گروپ اپنی نگرانی میں ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتا رہا تھا۔ ڈانس گروپس میں بھرتی کرنے کے لیے کوٹھوں کی خاک چھان کے طوائفیں بھی چنتا رہا تھا۔ ہر طرح کا نشہ کر کے دیکھ لیا تھا' جوا کی لت تو جیسے گھٹی میں پڑی تھی۔ ان بد خصلتوں نے اس کے اندر سے حمیت اور غیرت کے سارے اوصاف ملیا میٹ کر کے رکھ دیے تھے۔ خاندانی نجابت کا ہلکا سا اثر بھی خون میں شامل نہ رہا تھا۔ شراب نے رگوں میں دوڑتے اس سیال کو کثیف اور غلیظ کر دیا تھا۔ ادا اپنی چند مجبوریوں اور حالات کے ہاتھوں اٹریپ ہو کے خود بخود اس کی طرف بڑھی' اس کی ذرا سی کوشش کے بعد ہی اس کی جانب ملتفت ہوئی تو بابر کے دل میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا خیال آیا۔ ادا محفلوں میں گانے تو پہلے سے ہی گاتی تھی بابر نے سوچا اگر وہ اسے اپنے نام کا تحفظ دے کر بدلے میں فیض اٹھالے تو کیا مضائقہ ہے۔ لیکن ملک مقبول کی پیشکش نے تو اس کی سٹی ہی گم کر کے رکھ دی۔ جن لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا وہاں ہر قماش کا بندہ تھا' اس دنیا میں لیا گیا ہوتا ہے' کوئی کس حد تک کمینہ ہو سکتا ہے' وہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن ادا کے حوالے سے ملک کا اس طرح ترغیب دلانا اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

"یہ مشکل۔۔۔ بلکہ ناممکن سی بات ہے۔" مشکل سے خود پہ قابو پاتے ہوئے اس نے واضح کرنا چاہا۔

"ادا جی کبھی رضامند نہیں ہوں گی۔ اور پھر وہ جس عزت کی طلب میں ہم سے شادی کرنے پہ تیار ہو رہی ہیں۔۔۔"

"دفع کرو گولی مار اس کی طلب پہ۔" ملک نے بات کاٹ دی۔

"اپنی طلب کو سامنے رکھ۔"

اور اس کا مشورہ بابر کے دل کو جا لگا۔

"اپنی طلب۔۔۔ اپنی غرض۔۔۔ ہاں بھلا اس سے بڑھ کے اور کیا ہے۔"

☼ ☼ ☼

صاحبزادی یاسمین کا اندازہ درست تھا۔ اس نے اس مانوس دستک دینے والے ہاتھوں کی خوشبو کو دور سے ہی پہچان لیا تھا۔ یہ اس کے ماں جائے' اس کے لاڈلے' پیارے بھائی کی آواز تھی۔ جب تک وہ سنبھل کے کوڑیالی کو رکنے یا دروازہ ایک دم سے کھولنے کو منع کرتی تب تک وہ چٹخنی گرا چکی تھی اور عمیص سلام کرتا اندر داخل ہو چکا تھا۔ اور جب تک وہ خود کو اس سکتے کی حالت سے نکال کر اپنا حلیہ درست کرتی جو پکار پکار کے اپنے ساتھ ہونے والی کارروائی کی روداد بیان کر رہا تھا تب تک پہلی نظر ڈالتے ہی عمیص چونک کے وہاں کا وہاں ہی جما رہ گیا تھا۔

یاسمین نے اسے حیرت زدہ سا خود سے چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑا دیکھا تو ایک بے بس سی ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔ اب چھپانے سے کچھ فائدہ نہ تھا مشکل تو یہ تھی کہ بتانا بھی کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ وہ اپنی ہمت مجتمع کرنے لگی اس کے سوالوں کا سامنا کرنے کے لیے۔

وہ اب تک ننگے فرش پہ بیٹھی تھی اور اس کے بیٹھنے کے انداز میں عجیب پسپائی تھی۔ اس کی چھوٹے چھوٹے عنابی پھولوں والی سفید چادر اس کے وجود سے سرک چکی تھی' اس کا ایک کونا چارپائی کے پائے کے کسی کیل سے اٹکا پڑا تھا اور دوسرا کونا اس کی گود میں گرا تھا' باقی ساری چادر زمین پہ پھیلی ہوئی تھی۔ لباس بے ترتیب شلوار کے پائنچے نیچے گرنے کی وجہ سے بے دھیانی میں اوپر اٹھ گئے تھے' بال بکھرے ہوئے' ہونٹ پھٹا ہوا' آنکھیں شب بیداری اور گریہ زاری سے خونیں اور رخسار سوجے ہوئے تھے۔ یاسمین نے لباس سے شروعات کی' اپنی شلوار کے پائنچے درست کر کے اس نے چادر کا پلو ایک جھٹکے سے کھینچ کے کیل سے چھڑایا اور اپنے سراپے کو لپیٹا' بے پردہ تو وہ کبھی چھوٹے بھائی کے سامنے بھی نہ آئی تھی۔ ایک کونا سر پہ لپیٹ کے آگے کو گراتے ہوئے اس نے اجڑے بالوں اور متورم چہرے کو چھپانے کی کوشش کی حالانکہ اب سب بے سود تھا۔ اس کے اٹھنے سے قبل ہی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ چکا تھا۔

"آپا۔۔۔ آپا حضور؟" اس کی کپکپاتی آواز میں بے شمار سوال تھے' بے تحاشا درد تھا۔ یاسمین سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ بھائی کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"یہ سب۔۔۔ کیا بھائی صاحب نے۔۔۔؟" جواب بالکل واضح تھا' مگر پھر بھی وہ پوچھ رہا تھا شاید اپنے دل کی تسلی کو' ورنہ کنٹری کے بڑے سے پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے بابر کو باہر نکلتے دیکھا تھا' دور سے ہی اس کا مزاج برہم نظر آ رہا تھا لیکن اسے ایک معمول کی بات جان کے عمیص گرم جوشی سے آگے بڑھا تھا۔ اس کا رشتہ بابر سے اپنی بہن کے ناتے تھا اور جب سے بہن نے خوشی خوشی اس میں آنے والی خوشگوار تبدیلیوں کی اطلاع دی تھی وہ بھی اپنے دل میں بہنوئی کے لیے قدر پانے لگا تھا۔ مگر تب اسے دھچکا لگا جب اس کی گرمجوشی کا بابر نے رکھائی سے جواب دیا اور اس کے سلام کو نظر انداز کرتا اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا آگے بڑھ گیا۔ اس حیرت کے ساتھ وہ یہاں تک آیا تو اس نئے منظر نے بابر کے رویے کو اور بھی آسان مفہوم کے ساتھ واضح کر دیا پھر بھی وہ سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ بابر کے اس وحشیانہ سلوک کی وجہ بھی یاسمین کو چپ کرانے میں ناکام ہو کے اس نے بچوں کی جانب دیکھا۔ اقدس حد سے زیادہ سہما لگ رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اور اس کی کم عمری کی وجہ سے عمیص نے اس سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ شمشیر کو دیکھا' ہراس اس کے چہرے سے بھی مترشح تھا' اس کا دھان پان سا وجود ہلکا سا کپکپا رہا تھا۔ عمیص کا دل تاسف سے بھر گیا۔ اس نے اب بڑے والے بھانجے نایاب کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ دبا دبا سا احتجاج اور غصہ بھی تھا۔ وہ لب کچل کے شاید خود پہ قابو پانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"نایاب' بیٹا بتاؤ' کیا بات ہوئی تھی؟"

نایاب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ماں کی شکل دیکھ کے رہ گیا جس کی ہچکیاں اب تھم چکی تھیں مگر فرش پر گڑی آنکھوں سے اب بھی ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ماں کا عندیہ لیے بغیر وہ یہ فیصلہ نہ کرپا رہا تھا کہ اپنے ماموں کو ساری تفصیل سے آگاہ کرے یا نہیں۔ اس مشکل کو کب سے دروازے میں کھڑی کوثر بی بی نے حل کیا۔

"اے بھائی' ان سے کیا پوچھتے ہو' ماں نے اپنا صبر ان لڑکوں کو بھی گھول کے پلا دیا ہے۔ ماں سے پردہ پوشی اور بھرم دکھانا انہوں نے ورثے میں لیا ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ قصہ کیا ہے......"

اور اس نے الف سے ے تک ساری کہانی کہہ ڈالی۔

☼ ☼ ☼

"آپ یہاں براجمان ہیں' ہم آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے ہلکان ہو گئے۔"

اپنے کمرے میں آئے ابھی دس منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ **دلگیر** حسب عادت بغیر دستک دیے اندر داخل ہوا اور اپنی کراری آواز سمیت اس کے سر پہ سوار تھا۔ یہ دستک نہ دینے کا انداز صرف اسی کے کمرے میں گھستے ہوئے اختیار کیا جاتا ورنہ سارے ادب آداب اسے ازبر تھے۔

عمیص جو فی الحال تنہا رہنا چاہتا تھا' اسی لیے آپا حضور کو گھر لاتے ہی اپنے کمرے میں گھس گیا' اس کی دخل اندازی پہ اپنی ناگواری دباتے ہوئے طوہاً کرہاً بولا۔

"کیا بات ہے **دلگیر**' جلدی کہو۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں' آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارے رے رے۔۔۔ کیا آپ بڑی آپا حضور کو پیدل یہاں تک لا رہے ہیں۔ وہ بھی تھکن سے نڈھال آرام فرمانے کمرے میں چلی گئیں ادھر آپ کے رخ روشن پہ بھی عین بارہ کا سماں ہے۔"

"بات کیا ہے **دلگیر**؟" وہ بہت مشکل سے ضبط کر رہا تھا۔ کسی اور کا غصہ اس معصوم پہ الٹ کے وہ اگلے کئی دنوں تک پشیمان نہیں رہنا چاہتا تھا۔

"آپ کو بڑی بیگم یاد فرما رہی ہیں۔"

"امی حضور۔" وہ ذرا سا چونکا۔ کہیں انہیں بچوں سے بھنک تو نہیں پڑ گئی۔ مگر انہیں تو سارے رستے سمجھاتے بجھاتے آئے ہیں۔ خیر بچے ہی تو ہیں' شاید۔۔۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپا حضور کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کے وہ خود ہی سمجھ گئی ہوں' ماں کا دل ہے' بھانپ گیا ہو گا۔ لیکن اگر انہوں نے مجھے یہی بات کرنے یا کچھ پوچھنے بلوایا ہے تو میں کیا کروں گا۔ آپا نے تو کچھ نہ بتانے کی قسم دے رکھی ہے۔"

وہ اندر ہی اندر الجھتا جانے یا نہ جانے کی کشمکش میں گرفتار تھا کہ **دلگیر** اکتا کے دوبارہ کہنے لگا۔

"بتایئے ناں جہاں پناہ کنیز جواب کی منتظر ہے۔"

"ان سے کہو' میں غسل کے بعد آتا ہوں۔" اس نے اس بہانے دس پندرہ منٹ کی مہلت حاصل کرنا چاہی۔

"اور ہاں یہ لائٹ دوبارہ بجھا دینا جاتے جاتے۔۔۔ اور ایک کپ چائے بھجوا دو۔"

"ہائیں۔۔۔ کیا غسل فرمانے کے دوران چسکیاں بھریں گے یا کسی نے حسن و وجاہت میں اضافے کے لیے غسل سے قبل چائے سے مساج کرنے کا نسخہ بے بہا تجویز فرمایا ہے۔"

"**دلگیر**۔۔۔ مجھ سے نہیں' خود سے ہمدردی ہے تو اس وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ۔۔۔"

اس ورنہ کے بعد **دلگیر** نے مزید رکنے کی ہمت نہ کی۔

"کیسے جاؤں۔۔۔؟ وہ یقیناً" مجھ سے آپا حضور کے بارے میں کوئی نہ کوئی سوال کریں گی حالانکہ انہوں نے آتے ہی بتا دیا تھا کہ انہیں دو روز سے بخار ہے اور صبح نقاہت کی وجہ سے چکرا کے گر جانے سے انہیں چوٹ بھی لگی مگر ضروری تو نہیں امی حضور یا چچی حضور نے اس پہ اعتبار بھی کر لیا ہو۔ مجھے بھی آپا نے اتنی بڑی قسم دے کر زبان

بندی پہ مجبور کر دیا ہے ورنہ میں تو چاہتا تھا کہ آتے ہی ان پہ ٹوٹنے والے ستم کے بارے میں سب کو بتاؤں۔ یہ بھی کوئی چھپانے والی بات ہے۔ یہ بابر صاحب کیا اور شہنہ پائیں گے کسی قسم کی جواب طلبی نہ ہونے پہ' یہی سمجھیں گے کہ جو مرضی چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں مگر ایک تو یہ۔۔۔ آپا حضور۔۔۔"

یاسمین نے اس کی منت کر کے کسی بھی قسم کا قدم اٹھانے سے روکا تھا۔

"آپ ہمیں وہاں کس لیے لے جا رہے ہیں' یہ یاد ہے یا بھول گئے؟ صاحبزادی گل مہر کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ وہ ہماری اپنی ہیں' ہمارے عزیز اور محترم چچا حضور کی بیٹی وہ چچا حضور جنہوں نے ہم یتیم بچوں کو باپ سے بڑھ کر شفقت دی۔ کیا ہمیں زیب دیتا ہے ہم ان کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنیں؟ کیا یہ مناسب لگے گا کہ ہم اپنے میکے میں اس خوشی کے موقع پہ بدمزگی پھیلائیں' جب سب آنے والے خوش آئند وقت کے بارے میں سوچ رہے ہوں تب ہم انہیں اپنی بپتا سنا کر افسردہ اور سوگوار کر ڈالیں۔"

"آپ کا کہنا درست مگر غم بانٹنے کے لیے ہی ہوتا ہے آپا حضور اور اس کے لیے اپنے ہی کام آتے ہیں۔"

"ہم بھی اپنا دکھ اپنی ماں سے کہنے کے لیے بے چین ہیں۔ اپنے آنسو ان کے ممتا سے دھلے آنچل سے صاف کر کے اپنا دل ہلکا کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے یہ موقع مناسب نہیں۔ صاحبزادی گل کا معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے' آپ کے معاملے کا بھی حتمی اور باقاعدہ فیصلہ ہو جائے پھر ہم خود بات کریں گے۔"

بہن کے دکھ میں الجھے ہوئے **عمیص** نے سنا مگر یہ غور تک نہ کیا کہ اس کا ایسا کونسا فیصلہ یا معاملہ گھر میں زیر غور ہے جس کا ذکر ہوا ہے۔ اسے بس یہ فکر تھی کہ وہ یاسمین سے کیے اپنے وعدے پہ کسی طرح قائم رہے۔ اسی لیے اس نے آتے ہی تھکن کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں پناہ لینا چاہی مگر یہاں بھی بلاوا آ گیا۔

اچانک ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھلا۔ چچی حضور کے سہارے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں امی حضور کو اندر آتے دیکھ کے وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے اور یہ بات یاسمین آپا کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"آپ۔۔۔ ؟امی حضور آپ۔۔۔ خیریت۔۔۔ میں آ ہی رہا تھا پھر آپ نے کیوں زحمت کی؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے باری باری دونوں کے تاثرات جانچنا چاہے۔ ان چہروں پہ واقعی کوئی غیر معمولی تاثر رقم تھا لیکن حیرت انگیز طور پہ وہ تاثر خاصی خوشگواریت لیے ہوئے تھا۔ وہ بجائے ہلکا پھلکا ہونے کے مزید الجھ گیا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے کہ ہم سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ **دلگیر** نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ تھکے ہوئے ہیں' اس لیے سوچا خود ہی جا کر بات کر لیں۔"

"حکم کیجئے امی حضور۔" اندر ہی اندر وہ اندازے لگانے میں مصروف تھا۔

"آپ بات کیجئے آپا حضور' ہم ابھی آتے ہیں۔ ذرا الماس خاتون کو دیکھ لیں وہ صبح سے پکوانوں کی تیاری میں مشغول ہیں شاید انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہو۔"

اس سے پہلے کہ صاحبزادی **خلعت النساء** انہیں روکنے کی اپنی خواہش پہ عمل کرتیں وہ معذرت کا اظہار کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ صاحبزادی **خلعت النساء** مسکرا کے سرہلانے لگیں۔

"آخر بیٹی کی والدہ ہیں' جھجک مانع آ گئی تو خود کیسے اس موقع پہ موجود رہیں۔۔۔ حالانکہ ان کے آپ سے دوہرے تہرے رشتے ہیں۔"

"جی۔" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سرہلانے لگا۔

"آپ جانتے ہیں کہ آج صاحبزادی گل مہر کی بات طے ہونے والی ہے۔" انہوں نے تمہید باندھی۔

"جی امی حضور ہمیں بس پوچھنے کے لیے آنے ہی والا تھا کہ اور کوئی کام ہے تو بتا دیں۔"

"نہیں الحمدللہ سب انتظامات مکمل ہیں۔ بھائی میاں نے بھی خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا ہے اور اس میں آپ کی کاوشوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ آپ کے والد زندہ ہوتے تو آپ کو ان کے اتنا قریب جان کے خوش ہوتے۔

ہمیں بھی اب اطمینان ہو چلا ہے کہ آپ ان کا سہارا بنتے جا رہے ہیں۔ آپ ان کی تکالیف کو محسوس کرنے لگے ہیں بالکل جیسے وہ آپ کے جذبات کا احساس کرنے لگے ہیں۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے۔۔۔ بلکہ ہم سب کی متفقہ رائے ہے کہ آپ حقیقی معنوں میں ان کا سہارا بن جائیں۔"

"میں سمجھا نہیں امی حضور! کیا ابھی بھی آپ کو میرے خلوص پہ شبہہ ہے یا اس محبت اور احترام میں کمی پائی ہے، جو میں چچا حضور کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہوں۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ واقعی چند روز قبل ہونے والی ان کی وہ گفتگو یکسر فراموش کر گیا تھا جس سے اسے شک سا ہوا تھا کہ گھر میں اس کے اور موتیا کے حوالے سے کھچڑی پک رہی ہے۔ اگرچہ یہ بھولنے والی بات نہیں تھی۔ مگر فی الوقت اس کے حواسوں پہ صرف بابر ہمایوں مغل اور یاسمین کا تنازعہ سوار تھا۔

"ہم آپ کو ان کی فرزندی میں دینا چاہتے ہیں۔" ان کی دو ٹوک اور واضح بات پہ عمیص کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ گل اور موتیا کے چہرے آپس میں گڈمڈ سے ہونے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے انگلیوں سے دبالیں۔

"ہم سمجھ سکتے ہیں آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ سے صاحبزادی گل مہر کی خواہش کی ہے اور شاید اس میں بھی قصور ہمارا ہے۔ یہ ہم بڑوں کی خواہش تھی جس کا جابجا اظہار آپ کے دل میں بھی یہ خواہش جگا گیا لیکن اس معاملے کا ہر رخ آپ کے سامنے ہے۔ حقیقت کو نہ صرف آپ خود کھلے دل سے تسلیم کر چکے ہیں بلکہ ہمیں بھی سمجھا چکے ہیں۔ صاحبزادی الماس خاتون' ہماری نظر میں ہمارے پہلے انتخاب سے بدرجہا' بہتر ہیں۔ وہ ہمارا دوسرا انتخاب اسی لیے نہیں کہ ان پہ ہماری نظر پہلے نہیں پڑی۔ دراصل وہ گل مہر سے چھوٹی ہیں اس لیے اصولاً" پہلے ان کا نام نہیں آیا۔ ورنہ وہ ہمیں ہمیشہ سے اپنے دل سے بہت قریب محسوس ہوئی ہیں۔ ہم انہیں اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔"

اتنا کہہ کے وہ پر اشتیاق نگاہوں سے اپنے فیصلے کا رد عمل اس کے چہرے سے کھوجنے لگیں۔ وہ سر گرائے بیٹھا تھا اسی انداز میں کہنے لگا۔

"امی حضور! میں اسے کیا سمجھوں۔۔۔ کیا مجھے ایک حتمی فیصلے کی اطلاع دی جا رہی ہے یا مجھ سے اس خواہش پہ عمل درآمد کرنے کے سلسلے میں میری رائے طلب کی جا رہی ہے؟"

"ہم تو آپ کو اپنے خوابوں میں شریک کرنے آئے تھے' لیکن آپ نے احساس دلایا کہ شاید ہم سے غلطی ہوئی۔۔۔ واقعی ہمیں آپ سے پوچھنا چاہیے تھا' آپ کی مرضی جاننا ضروری ہے۔"

عمیص نے ان کے لہجے سے اچانک بشاشت غائب ہوتے محسوس کی تو اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

"اور امی حضور' میرے پاس سوچنے کے لیے کتنی مہلت ہے؟ کتنا وقت دے رہی ہیں آپ مجھے فیصلہ کرنے کے لیے۔"

اس سوال پہ ان کا امیدوں اور خواہشوں سے جگمگاتا چہرہ تاریک سایوں سے بھر گیا۔

"آج شام تک۔" یہ کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گئیں۔

"آج شام تک۔۔۔ یعنی آج شام تک مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ کیا چند گھنٹوں میں دل کا مہمان بدلا جا سکتا ہے' روح پہ لکھے نام کو مٹا کر ایک اور نیا نام لکھا جا سکتا ہے؟ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں گل کی خاطر جوگ لینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لیے نہیں کہ میرے عشق میں جوگ لینے کے لیے دیوانگی کی کمی ہے' بلکہ اس لیے کہ میں اپنے عشق کی دیوانگی خود سے منسلک دوسرے لوگوں پہ مسلط نہیں کرنا چاہتا اور اس لیے بھی کہ اپنی محبت کی ناکامی میں میں دوسروں کو حصہ دار کیوں بناؤں۔ اپنی امی حضور کو۔۔۔ چچا حضور کو۔۔۔ نہیں' اسی لیے میں نے بڑے حوصلے اور ظرف سے محبت کی اس ناکامی کو جھیلا ہے لیکن اتنا حوصلہ کہاں سے لاؤں جو مجھے اتنی جلدی ایک دوسرے بندھن میں بندھنے پہ آمادہ کر سکے اور وہ بھی موتیا کے ساتھ۔ جو میری محبتوں کی ہر شدت سے گواہ ہے۔ کوئی ایسا ہوتا جو مجھ سے انجان' میری چاہتوں سے بے گانہ ہوتا' تب کتنا آسان ہوتا یہ دھوکا دینا۔ اور خود دھوکا کھانا۔۔۔ لیکن موتیا کے

سامنے میری ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔ وہ جانتی ہے میرے دل سے گل کا نشان مٹتے مٹتے ہی مٹے گا۔ وہ بھانپ جائے گی کہ میں نے یہ فیصلہ کسی مجبوری کے تحت کیا ہے۔ اس میں کیا کمی ہے جو وہ کسی کی مجبوری کی بھینٹ چڑھے۔ یہ اس کی دوستی' اس کے خلوص کی توہین ہے میں ایسا ہرگز نہیں۔۔۔"

"وہ چچا حضور' جنہوں نے ہم یتیم بچوں کو باپ سے بڑھ کے شفقت دی۔ کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ ہم ان کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنیں؟"

کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اسے صاحبزادی یاسمین کی بات یاد آئی اور وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ یاسمین نے اپنا دکھ اپنے پیاروں سے بانٹ کر اپنا دل ہلکا کرنے کی بجائے اس لیے اپنے اندر ہی اتار لیا تھا کہ وہ اپنے چچا حضور کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہیں کسی قسم کے آزار میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی اور ایسے وقت میں جب عرصے کے بعد سب آنے والے وقت کے حوالے سے ان گنت امیدیں اور خوش گمانیاں وابستہ کیے ہوئے ہیں' کوئی بدمزگی نہیں پھیلانا چاہتی تھی۔۔۔ تو کیا وہ ایسا کرنا چاہتا ہے۔

اس نے بھرپور طریقے سے غور کیا اور جواب ملا۔

"نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔"

ابھی تو وہ اس خوشی کو ہی نہیں ڈھنگ سے سنبھال پایا تھا کہ چچا حضور نے اس سے اپنی سرد جنگ اور خاموش ناراضی کو ختم کر دیا ہے۔ جس دن سے وہ اس کے پاس اسٹور آئے تھے' اسے سینے سے لگا کر نیک تمناؤں اور مہربان دعاؤں سے نوازا تھا' اس کے تو مانو' قدم ہی زمین پہ نہ ٹک رہے تھے۔ ایک بار پھر خود کو ان دعاؤں کے حصار سے دور لے جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ حالانکہ دل سے وہ بھی جانتا تھا اپنے چچا حضور کی وضع داری کو کہ اس کے انکار پہ انہیں بھلے کتنا ہی دکھ کیوں نہ ہو' وہ ظاہر نہیں کریں گے۔ اندر سے چاہے ٹوٹ جائیں مگر اپنی شکستگی دکھا کے اپنا وقار کم نہیں کریں گے۔ اسے اسی طرح عزیز رکھیں گے جیسے بچپن سے رکھتے آ رہے ہیں' جہاں اس کی اتنی سرکشیاں' نافرمانیاں اور گستاخیاں برداشت کرتے آئے ہیں' وہاں ایک اور سہی۔۔۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ صاحبزادہ نفیس علی خان کا ظرف بے شک کم نہیں پڑا تھا دکھ سہنے کے لیے۔ صاحبزادہ عمیص علی خان کا ضمیر ضرور خوفزدہ ہو گیا تھا اس بظاہر آہنی مگر شیشے سا دل رکھنے والے اپنے چچا کو مزید آزمائش میں مبتلا کرنے سے۔

"ٹھیک ہے' آپ شام سے پہلے پہلے ہمیں اپنے جواب سے آگاہ کر دیجیے گا۔" صاحبزادی خلعت النساء کی تھکی تھکی' پژمردہ سی آواز پہ وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں' کسی کے سہارے کے بغیر اٹھنا انہیں دوبھر لگتا تھا لیکن شاید یہاں بیٹھ کے عمیص کے چہرے پہ چھائی کشمکش دیکھنے سے وہ چلے جانا زیادہ بہتر سمجھ رہی تھیں۔ اس نے انہیں شانوں سے تھام کے دوبارہ اپنے ساتھ بٹھایا اور خود اٹھ کے فرش پہ ایک گھٹنا ٹیک کے ان کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ ان کے سفید روئی سے ہاتھ تھام کے دیکھنے لگا۔ یہ چہرہ جو اس کی ماں کا تھا اور جس پہ ایک جوان بیٹے کی ماں کا فخر و غرور ہونا چاہیے تھا اس کے مستقبل کے حوالے سے ان گنت خوابوں کے رنگ ہونے چاہیے تھے وہاں اس وقت صرف بدترین اندیشوں کے سائے تھے ایک خوف سا تھا۔۔۔ نہ سننے کا خوف جو اس کے سوچ بچار کرنے اور مہلت مانگنے سے مزید بڑھ گیا تھا۔

"آپ نے شاید ہمیں ضرورت سے زیادہ ہی مہلت دے دی ہے۔۔۔ شام سے پہلے پہلے۔۔۔"

اس کی بات کو صاحبزادی خلعت النساء نے طنز پہ محمول کیا۔

"ہم آج ہی یہ بات طے کرنا چاہتے تھے اور۔۔۔ اور ہمیں نجانے کیوں امید سی تھی کہ آپ رضامند ہو جائیں گے' یہی وجہ تھی کہ آپ سے پہلے بات نہ کر سکے۔ واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ جب صاحبزادی یاسمین نے ہم سے یہ خیال ظاہر کیا' ہمیں اسی وقت سب سے پہلے آپ سے رائے جاننا چاہیے تھی' پھر بات آگے بڑھاتے۔ مگر تب جذبات میں اس مسرت و ہیجان کی زیادتی نے ہمیں اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ ہمارا پر امید ہونا۔۔۔"

"قطع کلامی کی معذرت امی حضور۔۔۔ لیکن اگر آپ نے مجھ پہ اتنا اعتماد کر کے میری ذات کو معتبر کر ہی دیا تھا تو

پھر اس وقت مجھ سے میری رائے جاننے کی خواہش ظاہر کر کے اس اعتماد کو ہلکا کیوں کیا بس مجھے یہی شکایت ہے۔"
"یعنی تو کیا ہم سمجھیں کہ آپ ـــــ" وہ خوشی سے کچھ کہنے کے قابل نہ رہیں۔ آس و نراس میں ڈوبا چہرہ ایک بار پھر جگمگا اٹھا۔ وہ سحر زدہ سا اس چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔
"جی' امی حضور میں آپ کے فیصلے سے دل سے متفق ہوں۔
"میری ایک ہاں نے میری ماں کو خوشی کے ساتویں آسمان پہ پہنچا دیا ہے۔ تیرا شکر ہے میرے اللہ کہ تو نے مجھے اس قابل بنایا کہ میرے کسی عمل سے ان کے دل کو راحت پہنچی۔ بس یہی خوشی' یہی اطمینان میں ایک بار اپنے چچا حضور کے چہرے پہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"موتیا!"
اس نے کچن کے دروازے پہ کھڑے آواز دی۔
بڑا سا' اونچی چھت والا باورچی خانہ اس وقت خاصی افراتفری کا شکار تھا۔ چھٹی کا دن اور دس بجے کا وقت۔ بہت سے گھروں میں ابھی دن کا آغاز بھی نہ ہوا تھا لیکن اس حویلی میں دن چاہے چھٹی کا ہو' صبح فجر کی پہلی اذان کے ساتھ ہی ہو جایا کرتی تھی اور آج شام کو تو مہمانوں کی آمد بھی متوقع تھی اور مہمان بھی خاص الخاص۔ اس لیے موتیا کی مصروفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عمیص نے اپنی آمدنی سے کچن میں اس کی سہولت کے مطابق حال ہی میں کچھ اضافے اور ترامیم کی تھیں۔ ایک طرف سلیب لگا کے چولہے اوپر نصب کر دیے تھے ورنہ پرانی طرز کے اس بڑے سے باورچی خانے میں ایسا کوئی نظام نہ تھا۔ اس نے سنک بھی اونچا بنوا دیا تھا۔ لکڑی کی سالخوردہ الماریوں کے دروازے نکلوا کے وہاں شیشے کی سلائڈز لگوا دی تھیں۔ ان میں سجے اکثر نایاب اور کب کے سنبھالے برتن باہر برآمدے کی ٹیبل پہ تھے اور اس وقت صاحبزادی حرمت النساء خود احتیاط سے انہیں صاف کر رہی تھیں' دلگیر راہداری میں سبزیوں کا ڈھیر پھیلائے بیٹھا تھا' یقیناً" اس کچن بدری کی وجہ وہ ریڈیو تھا جسے وہ اتوار کے دن مسلسل چالو رکھتا اور موتیا کو ریڈیو کی آواز سے اچھی خاصی چڑ تھی۔
"موتیا!...... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" اس کے بکھیڑے' ادھر سے ادھر تک پھیلاوے اور مسلسل چلتے ہاتھ عمیص کو گھبراہٹ میں مبتلا کیے دے رہے تھے مگر وہ اس سے بات ضرور کرنا چاہتا تھا۔
"ہاں کہو......" شامی کبابوں کے آمیزے میں ہرا مسالا دونوں ہاتھوں سے مکس کرتے ہوئے اس نے بغیر سر اٹھائے کہا۔
"تم جانتی ہو آج شام کیا ہونے والا ہے؟"
"نہیں' مجھے نہیں پتہ۔" اچانک اس کے ہاتھ تھمے اور اس نے بڑی ناراض سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جتا جتا کے کہا۔
"مجھے کچھ نہیں پتہ۔ کیونکہ ایک تو میں اس گھر میں رہتی نہیں ـــــ دوسرا مجھے ویسے ہی شوق سا ہوا ہے کہ کیوں نہ آج شام کی چائے کے ساتھ درجن بھر لوازمات ہوں اور اس شوق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں سے جتی ہوئی ہوں۔" اس نے چہرے پہ آئے بال سنے ہوئے ہاتھوں سے پیچھے کیے اس کی پیشانی اور کانوں کے اوپر سے جاتی لٹ پہ قیمہ لگا دیکھ کے عمیص کو اس سنجیدہ صورت حال میں بھی ہنسی آ گئی۔
"یہ تو تم نے ٹھیک کہا' تم واقعی گھر پہ نہیں رہتیں' تم تو صرف کچن میں رہتی ہو' اور انہی معاملات سے باخبر رہتی ہو جن کا تعلق کچن سے ہے' اس کے علاوہ گھر میں کیا ہو رہا ہے' کبھی اس کی بھی خبر لے لیا کرو۔ شاید کوئی خبر تم سے تعلق ہی ہو۔"
"لاعلمی اچھی چیز ہے عمیص' من کو الجھاتی نہیں۔" وہ آہستہ سے کہہ کر سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ اسے چند روز قبل اتفاقہ سنی وہ گفتگو یاد آ گئی جس کے بعد سے اب تک اس کے دل و دماغ الجھن کا شکار تھے۔

"کچھ باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔" وہ کچن میں رکھی' مختصر سی گول میز کی ایک کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گیا اور دوسری پہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ موتیا فروٹ باسکٹ سامنے رکھ کے بیٹھ گئی اور چاٹ کے لیے امرود کاٹنے لگی۔
"موتیا' تم میری سب سے اچھی دوست ہو' میرے ہر جذبے' میری ہر کیفیت' میری ہر خواہش حتیٰ کہ میری شکست سے بھی واقف ہو۔ میں نے اپنے خواب تم سے بانٹے ہیں' اپنے آنسو تمہارے سامنے رویا ہوں۔ میرا کچھ بھی تم سے چھپا ہوا نہیں ہے' نہ میرا کردار نہ ہی میری کہانی۔"

میرے علم میں تھی ساری یہ کہانی دل لگی کی
اسے حتم بھی تو ہونا تھا کسی کی اک نہیں پر

موتیا نے اصل وجہ بتائی۔ وہ واقعی پہلے سے جانتی تھی کہ گل کے لیے اس کی دیوانگی کا اختتام بالآخر یہی ہونا ہے اور وقتاً" فوقتاً" وہ اسے متنبہ بھی کرتی رہتی تھی مگر عمیص نے سنجیدگی سے نہ لیا۔ شاید محبت یونہی انسان کی آنکھوں پہ خوش رنگ پٹیاں باندھ دیتی ہے۔
"ہاں تم جانتی تھیں ـــــ تم ہمیشہ سے جانتی تھیں۔ مگر میں نے ہی اعتبار نہ کیا۔" عمیص نے تسلیم کیا۔
"لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے مان لیا ہے کہ میں اپنے لیے درست انتخاب اور صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے میں نے یہ حق اب حق داروں کو لوٹا دیا ہے یعنی اپنے بزرگوں کو اور انہوں نے میرے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔"
"تو تم تک بھی یہ بات پہنچ گئی۔" موتیا کا سر کچھ اور جھک گیا۔ وہ پہلے سے بڑھ کے انہماک کے ساتھ فروٹ کاٹنے لگی۔
"اور میں نے یہ بھی مان لیا ہے کہ صرف تم ہی ہو جو مجھے سہہ سکتی ہو' مجھے برداشت کر سکتی ہو اور شاید مجھے سنبھال بھی سکتی ہو اس لیے میں نے ان کے انتخاب کو بسر و چشم قبول کر لیا ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ تمہارے پاس میرا ساتھ قبول کرنے کی کوئی وجہ ہے بھی یا نہیں؟ کیا تمہیں بڑوں کا یہ فیصلہ منظور ہے؟"
"کیوں پوچھ رہے ہو؟" اپنی کیفیت اور جھجک پہ قابو پا کے موتیا نے الٹا اس سے سوال کیا۔
"کیا میرا انکار سننے کے بعد گل کی طرح میرا مقدمہ بھی ابا حضور کے سامنے لے جاؤ گے' انہیں یہ بتانے کہ آپ کی اس دوسری صاحبزادی کو بھی آپ کی فہم و فراست پہ کوئی خاص اعتماد نہیں۔ آپ کے انتخاب پہ صبر شکر کے ساتھ راضی ہونے کی بجائے وہ خود کوئی نئی مہم سر کرنا چاہتی ہے۔"
"نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔"
"کیوں؟ گل کے لیے کر سکتے ہو تو میرے لیے کیوں نہیں؟ اسے مرضی استعمال کرنے کا حق ہے تو مجھے کیوں نہیں؟"
"گل کی حمایت میں نے اس لیے کی تھی کہ تمہاری ہمیشہ کی کہی بات پہ میں نے تب اعتبار کر لیا تھا اور وہ یہ کہ گل کو کمی مجھ میں نظر نہیں آئی تھی' اعتراض اسے مجھ پہ نہیں تھا بس بات اتنی تھی کہ اس کے دل کی طلب کوئی بن گیا تھا جبکہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہے تمہارے انکار کی وجہ صرف اور صرف ایک ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تمہیں میری جانب سے خلوص کی کمی اور محبت کے بٹے ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور تمہارا یہ اعتراض میں خود دور کر سکتا ہوں' اتنی سی بات کو چچا حضور کے سامنے کیا لے کر جانا۔"
"تو کرو۔" وہ اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی' ہاتھ میں سیب تھا جسے وہ آہستہ آہستہ دانتوں سے کتر رہی تھی۔ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نازک مسئلے پہ اس سے بحث کرتے اس کی پوری کوشش تھی کہ اس کا اندر عمیص کے سامنے عیاں نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں ان دونوں کی پرانی دوستی اور بے تکلفی کام آ رہی تھی لیکن پھر بھی کچھ تھا' جو وہ مسلسل اپنی نظریں جھکائے ہوئے تھی اور اس کی جانب دیکھنے سے دانستہ

گریز کر رہی تھی اور دوسری جانب عمیص کی نگاہیں تھیں کہ اس کے چہرے سے ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھیں اور وہ ایسا دانستہ نہیں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں‘ آج اسے موتیا کے ہزار بار دیکھے عام سے نقوش والے سادہ چہرے میں کوئی نئی‘ بالکل انوکھی بات محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ کوئی بہت ہی غیر معمولی بات۔

”لمبے چوڑے دعوے نہیں کروں گا‘ تفصیل میں جانے کی بجائے صرف اتنا کہوں گا کہ محبت کی اس بازی میں اپنی شکست کو میں نے کھلے دل سے تسلیم کیا ہے‘ اپنے اناڑی پن کو بھی اور اس بات کو بھی کہ میں نے داؤ غلط جگہ کھیلا تھا اور موتیا جو اپنی شکست ہنستے ہنستے مان لے‘ وہ ہار کو بہت جلدی بھلا بھی دیتا ہے ______ میں بھی یہ سب بھول جاؤں گا‘ بہت جلدی‘ بلکہ یوں سمجھو بھولنے کا عمل جاری ہے اور اس عمل میں تمہارا ساتھ اور بھی تیزی لا سکتا ہے۔ میں پورے دل کے ساتھ تمہیں اپنانے پہ تیار ہوا ہوں۔ تم بھی اپنے دل کو ہر طرح کے اندیشوں سے پاک کر لو۔“ اس نے تسلی دی۔

وہ اب بھی میز پوش کی سفید دھاگے سے ہوئی کڑھائی کے بیل بوٹوں پہ نظر جما کے بیٹھی تھی۔

”کچھ تو کہو موتیا۔“

”کیا کہوں؟ سب تو تم نے کہہ دیا۔۔۔ نہ کہا تو صرف یہ کہ۔۔۔“ وہ ایک بار پھر جھجک اور ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئی۔ حیا سے لرزاں اس کی پلکیں عمیص پہ ایک انکشاف کر گئیں۔ اسے لگا کہ اس دن موتیا کی مبہم سی باتیں اسے جو اشارے کر رہی تھیں وہ بے وجہ نہیں تھے۔ اس کا دل ٹھیک پہچانا تھا‘ صرف اسی نے دل کے اس اندازے کو وہم قرار دے کے جھٹلایا تھا اور اب اس وہم کو ایک حقیقت کا روپ دھارتے دیکھ کے وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ کچھ دیر قبل امی حضور سے اس نئے رشتے کے بارے میں سنتے ہی اس کے دل پہ جو ان چاہا سا بار آن گرا تھا‘ اب اس کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ صرف اور صرف چچا حضور کی دل آزاری سے بچنے کے لیے جو فیصلہ کیا تھا اس پہ چلنا خاصا مشکل کام لگ رہا تھا اور اب وہی فیصلہ موتیا کی چمکیلی آنکھوں سے ظاہر ہوتے دیکھ کے وہ سوچ رہا تھا۔

”اب زندگی کتنی سہل ہو جائے گی۔۔۔ کتنی سبک اور کتنی خوشگوار۔“

”ہم محبت تو تم سے کرتے ہیں۔“ بالآخر وہ دھیمے سروں میں گنگنا اٹھا۔

’ہم محبت تو تم سے کرتے ہیں
اس کی شدت سے مگر ڈرتے ہیں

موتیا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا کے شعر مکمل کرنے لگا۔

رستہ قسمت کا پتا دیتا ہے
آؤ ہم پہلا قدم دھرتے ہیں

موتیا کا یہ جواب مکمل اور بھرپور تھا۔ وہ اس کے ہمراہ نئی زندگی کے اس سفر پہ قدم بڑھانے کو دل سے راضی تھی۔

✡ ✡ ✡

”یہ ہو گئے سات قسم کے پھل۔“

بلقیس نے پھلوں کے سجے سجائے بڑے سے ٹوکرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جو ابھی ابھی خاص آرڈر پر تیار ہو کے آیا تھا۔ بڑا سا ٹوکرا‘ جس میں کینو‘ سیب‘ امرود‘ کیلے‘ انار‘ ناریل اور انگور ٹرانسپیرنٹ کور میں سے جھانک رہے تھے‘ کور کے اوپر رنگین ربن بھی باندھے گئے تھے جبکہ ٹوکرے کے نچلی جانب رنگین اور چمکدار ریپر لپٹا تھا۔

”اور یہ سات طرح کی مٹھائیاں۔“ اس نے الگ الگ تیار کی گئیں چھوٹی چھوٹی خوش رنگ ٹوکریوں کی جانب اشارہ کیا‘ سات ٹوکریوں میں سات طرح کی کلو کلو مٹھائی نظر آ رہی تھی۔

”کیوں‘ مانتا ہے ناں اپنی ماں کو۔ کس شان سے تیاری کرائی ہے۔ ایسی ٹور سے جاؤں گی اپنے شہزادے کا رشتہ لے کر کہ وہ تو دیکھتے ہی رعب میں آ جائیں گے۔ خاندانی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں‘ اوپر کا دکھاوا اتنا ہوتا ہے کہ سامنے

والا ویسے ہی دبدبے میں آ جائے۔ تو دیکھنا‘ میں منگنی میں کیسا کھڑاک کروں گی۔ سارا شہر ہلا کے رکھ دوں گی۔“

اس کے بلند عزائم سے الگ وہ دوسرے صوفے پہ متفکر سا بیٹھا تھا۔

”ابا جی‘ سب ٹھیک ہو جائے گا؟“

”او پتر کیوں دل ہولا کرتا ہے۔ اتنی نکی سی عمر میں تو نے اتنے بڑے بڑے کام کر لیے‘ یہ کون سا مشکل کام ہے جو ڈر رہا ہے۔“ کرم الٰہی خوشدلی سے ہنسا۔

”بس اتنا خیال رکھنا کہ اماں زیادہ نہ بولیں۔“ اس نے آہستہ آواز میں تاکید کی مگر بالو نے سن لی۔

”کیوں۔۔۔ کیوں نہ بولوں میں نہ بولوں گی تو کیا گوانڈی پڑوسی بولیں گے۔ میرے پتر کا معاملہ ہے میں ہی ساری باتیں طے کروں گی۔ تجھے اپنی ماں کے سیانے پن پہ ابھی بھی کوئی شبہ ہے؟“ وہ خفا لگ رہی تھی۔

”نہیں‘ یہ بات نہیں۔ دراصل ان کے ہاں خواتین کا بولنا زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔“ اس نے بات بتائی۔

”آپ بھی زیادہ سے زیادہ خاموش ہی رہیے گا‘ مردوں کے ساتھ مرد ہی بات کریں تو اچھا رہے گا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ یہ بات اس کی عقل میں سما گئی۔ اتنے میں کال بیل کی آواز پہ ملازم باہر نکلا اور اس کے دوبارہ واپس آنے سے پہلے پہلے اللہ وسایا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔

”بلے۔۔۔ خیر تو ہے کرمے بھرا۔۔۔ کدر کی تیاریاں ہیں‘ چپ چھپتے عمرہ تو نہیں کر آئے؟“ وہ صوفوں پہ اور کارپٹ پہ رکھے مٹھائی کے ٹوکروں کو حیرت سے دیکھ کے پوچھنے لگا۔

”وہ فریضہ بھی انشاء اللہ ادا کر آئیں گے بلکہ شہزادے نے توجہ کرانے کا وعدہ کرایا ہے۔ اللہ اسے زندگی اور توفیق دے۔ پہلے تو ہم دنیاداری کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ شہزادے کا رشتہ لے کر جا رہے ہیں۔“

”رشتہ۔۔۔ صرف رشتہ لے کر۔۔۔؟“ وہ اور بھی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ غیر ضروری اہتمام دیکھنے لگا جس سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ منگنی کرنے یا شادی کے دن مقرر کرنے جا رہے ہوں۔ ایک نظر اس نے اپنے ہاتھوں میں دبے ڈبے پہ ڈالی‘ جس میں کلو بھر مٹھائی وہ دعا کے بار بار کہنے پہ یہاں دینے آیا تھا۔ حالانکہ وہ آنے سے گھبرا رہا تھا‘ بار بار یہ بہانہ کیا۔

”اوئے دھیے‘ رہن دے‘ وہ سو سو باتیں کریں گے۔ تیرے مامے کا منہ بن جائے گا کہ رشتہ طے کرتے ہوئے اس سے صلاح کیوں نہ لی۔“

لیکن پتہ نہیں کیوں وہ بضد رہی اور آج اسے مٹھائی سمیت مامے کے گھر بھیج کے ہی دم لیا۔

”ہاں‘ بڑی اچھی کڑی ہے۔ پڑھی لکھی‘ رج کے سوہنی گرہستن اس کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کے مطابق۔۔۔ بالکل شہزادی پسند خاندان بھی بڑا اونچا ہے۔“

”مبارک ہو بھرا کرمے! ویسے خاندان تو بابر کا بھی بڑا اچھا اور نامی گرامی ہے۔ وہ بھی بڑا اچھا منڈا ہے۔ لگتا ہے ہم دونوں کی اولادوں کا نصیب اوپر والے نے اکو جیسا بنایا ہے‘ جیسی ان کی پسند ہے ویسے ہی رشتے جڑ رہے ہیں۔“ اس نے جوابی کارروائی کی۔

”کیا مطلب۔۔۔ یہ بابر کون ہے؟“ بالو نے فوراً پوچھا۔

”بھرجائی‘ بابر میرے جوائی کا نام ہے۔ مغلوں کا لڑکا ہے۔ ایسا سوہنا کہ نظر بھر کے دیکھا نہیں جاتا۔ بولتا ہے تو دل کرے سنی جاؤ۔ نوابوں والے ٹھاٹ باٹ۔ لاہور شہر میں اس کے باپ کا بڑا نام ہے‘ بڑی حویلیاں ہیں۔“

”تو نے دولی کا رشتہ طے کر دیا۔“ کرمے نے حیرت سے پوچھا اور حیرت تو شہزاد کو بھی تھی لیکن اس نے اظہار کرنا مناسب نہ جانا۔

”ہمیں بتایا تک نہیں۔“ بالو نے بھی گلہ کیا۔ اللہ وسایا اسی گلے سے بچنے کے لیے یہاں آنے سے کترا رہا تھا لیکن یہاں کی صورت حال دیکھ کے اب اس کے پاس بڑا اچھا جواب تھا۔

"بھرجائی! میں ماڑا (غریب) بندہ۔ میں تو چپ کر کے ہی اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھ سکتا تھا۔ اگر آپ لوگوں کو بلاتا تو ظاہر ہے کہ چار لوگ وہاں کے بھی ساتھ آتے' اتنا انتظام اتنا خرچہ میں کیسے کرتا۔ باقی آپ کو خوشی میں شریک کرنے کے لیے ہی یہ مٹھائی لایا تھا۔ آپ بڑے لوگ ہیں' آپ نے بھی تو یہی کرنا تھا' گج وج کے پوری رونق لگا کے۔ بعد میں ہم غریبوں کے گھر چار چار لڈو ہی بھیجنے تھے۔"

"ایسی بات نہیں وسائے ہم ابھی وہاں صرف رشتہ لے کر جا رہے ہیں ابھی کونسا بات پکی۔۔۔۔"

"چھوڑیں ابا جی' آپ کہاں وضاحتیں پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" شہزاد نے اکتا کر کہا۔ اسے اس موقع پر اللہ وسائے کی آمد بری طرح کھل رہی تھی اور وہ اسے کوئی اچھا شگون نہ سمجھ رہا تھا۔

"اچھا جی خیر رب را کھا۔ خیر نال جاؤ تے خیر نال آؤ۔"

اللہ وسائے نے بھی اٹھنے کی تیاری کی تو کرمے نے آداب میزبانی نبھانے چاہے۔

"بیٹھ وسائے اک پیالی چاء تے پی جا۔"

"مہربانی بھرا۔ تیرے شہزادے کو دیر ہو رہی ہے۔"

"دوئی کو میری طرف سے بہت پیار کرنا وسایا۔

اسے بڑی بڑی مبارک باد دینا' کہنا تیرا صبر ضرور تجھے رنگ لگائے گا۔ لوگ تو اچھے جڑے ہیں ناں؟" بالو نے مبارک دیتے ہوئے ایک بار اور تسلی چاہی۔

"ہاں بھرجائی۔ بڑے دل والے لوگ ہیں۔ کبھی آ کے وہ جوڑے دیکھنا جو انہوں نے میری دھی کو دیے ہیں' ساتھ باہر کے جوتے اور میک اپ کا سامان۔ وہ موٹے سونے کے کنگن' جو ان کے خاندانی ہیں' اک اک کڑا چھ تولے کا تو ہو گا اور انگوٹھی میں قیمتی نگینے جڑے ہوئے ہیں۔"

"ماشاءاللہ۔۔۔ ماشاءاللہ۔" کرمے نے بے ساختہ کہا۔

"اللہ مبارک کرے' پہننا نصیب کرے۔" بالو کے دل سے بھی دعا نکلی اور شہزاد کو بھی اپنے سینے سے ایک بوجھ سرکتا ہوا محسوس ہوا۔

☆ ☆ ☆

"کیا **عمیص** اور موتیا۔۔۔ یعنی کہ موتیا اور **عمیص**؟"

گل مہر کو بھی یہ اطلاع مل گئی اور اس کا ردعمل حسب توقع تھا۔ صاحبزادی حرمت النساء نے اسے یہ خبر تب دی جب مہمانوں کے آنے میں کچھ ہی وقت تھا اور وہ تیار ہو رہی تھی۔

"اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے۔"

"کیا **عمیص** مان گیا؟"

"کیوں نہ مانتے۔ ابھی آپا حضور نے ان کا عندیہ جان کر ہمیں خوشخبری دی ہے۔"

"اور موتیا۔۔۔" گل کو امید تھی کہ لاکھ دونوں کے بیچ دوستی سہی مگر اس کے بارے میں **عمیص** کے جو جذبات رہ چکے ہیں' ان کو جاننے کے بعد شاید ہی وہ اس رشتے پہ رضامند ہو۔

"ان کی سعادت مندی پہ تو ہمیں ہمیشہ ناز رہا ہے۔"

"ناز ضرور کیجئے مگر یہ تو جان لیجئے کہ اس سعادت مندی کے پیچھے کوئی مجبوری تو نہیں۔ کہیں وہ محض اپنی اس "جی ہاں" والی عادت کی وجہ سے تو قربان نہیں ہو رہی۔"

"خدانخواستہ۔" وہ برا مان گئیں۔

"ہم ماں ہیں۔ اولاد کے دل کا حال بخوبی بھانپ سکتے ہیں۔ **عمیص** میاں کو انہوں نے بخوشی قبول کیا ہے اور **عمیص** میاں کو بھی اپنی والدہ کے انتخاب پہ کوئی اعتراض نہیں۔"

"ہونہہ۔۔۔ وہ کیا اعتراض کرے گا۔" گل نے ہنکارا بھرا اور اپنے ہلکے نم سنہرے بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

"ایک ہاتھ نہ آئی' دوسری کو کیسے نکلنے دے۔ اس گھر کے علاوہ اور کون ہو گا جو اسے بیٹی دے۔ ہاں ایک ہمارے ہی ہاں بیٹی زیادہ بوجھ ہے۔ ہمیں تو ترس آ رہا ہے موتیا پہ۔"

"یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہی ہیں۔" انہوں نے لہجہ سخت کر لیا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم۔ کیا وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو گی کہ ایک بہن کا رشتہ اتنے اچھے گھرانے میں اور ایک کامیاب بزنس مین کے ساتھ ہو رہا ہے اور اسے گھر کے ہی ایک ایسے لڑکے کے پلے باندھا جا رہا ہے جو معمولی سا دکاندار ہے اور جس کی تعلیم بھی واجبی ہے۔ آپ کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے تھا۔ وہ سعادت مند ہے' بس اسی میں آپ خوش ہیں' اس کے مستقبل کی' اس کی خوشیوں کی پرواہ کم از کم آپ کو تو ہونی چاہیے۔"

"ہمیں پرواہ ہے اور ہم نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے' کسے علم ہے' کون جانتا ہے کہ **عمیص** میاں کے نصیب میں کتنی کامیابیاں لکھی ہیں۔ ان کا کاروبار کتنا ترقی کرنے والا ہے۔"

"ترقی کرنے والوں کے اوصاف کچھ اور ہوا کرتے ہیں امی حضور ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھنے والوں کے قدم کامیابی نہیں چوما کرتی۔ یہ آپ کے **عمیص** میاں انہی لوگوں میں سے ہیں۔"

"ادب ملحوظ رکھ کے گفتگو کیجئے صاحبزادی گل مہر۔" انہوں نے ٹوکا۔ "اب آپ کے ان سے رشتے کی نوعیت تبدیل ہو چکی ہے۔ آج شام کو انشاءاللہ تعالیٰ آپ کا معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہوتے ہی ہم صاحبزادی الماس خاتون اور صاحبزادہ **عمیص** کی باقاعدہ نسبت کر دیں گے' معزز مہمانوں کی موجودگی میں۔۔۔۔ اگر ان سے کوئی رشتہ استوار ہوا تو۔"

"خدا کا واسطہ ہے امی حضور۔ یہ مت کیجئے گا۔ کیا سوچیں گے وہ لوگ اور شہزاد سر کو کتنا محسوس ہو گا۔ وہ جس گھر کے داماد بننے جا رہے ہیں' اسی گھر کا دوسرا داماد ایک ایسا شخص۔۔۔۔"

"گل۔" موتیا کی آواز پہ وہ پلٹی تو خجالت کے مارے اس کا رنگ سرخ تھا۔ یقیناً وہ سب سن چکی تھی' اس کے چہرے کے تاثرات سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ صاحبزادی حرمت النساء کو بھی تاسف نے آن گھیرا۔

"مہمان آ گئے ہیں۔"

● ● ●

"مہمان آ گئے ہیں۔"

موتیا نے سپاٹ انداز میں یہ پیغام دیا اور کچھ دیر رک کے انتظار کرنے لگی کہ شاید امی حضور اسے کوئی کام بتائیں۔ مگر انہیں معزز مہمانوں کا استقبال کرنے کی جلدی تھی۔ انہوں نے چادر کا پلو کچھ اور آگے کی طرف سرکایا اور چہرے کو تقریباً ڈھانپتے ہوئے کمرے سے نکلیں۔ موتیا ان کے پیچھے پیچھے پلٹی۔ اپنے کہے الفاظ پہ شرمندہ سی گل نے اسے آواز دی۔

"سنو موتیا!"

"کہو۔" وہ رکی مگر پیچھے مڑ کے نہ دیکھا اب گل کا شک یقین میں بدل گیا کہ ضرور وہ سب سن چکی ہے۔ اس کی شرمندگی سوا ہو گئی۔ یہ شرمندگی اسے اپنے خیالات پہ نہ تھی۔ ان کے بے دھڑک اظہار پہ بھی نہ تھی' صرف موتیا کے سن لینے پہ تھی۔

"ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" اس نے گول مول انداز میں صفائی پیش کرنا چاہی اف' معذرت پیش کرنا اور وہ بھی صاحبزادی گل مہر کے لیے کس قدر مشکل کام تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے اسی بے تاثر لہجے میں کہا۔

"جانتی ہوں' تمہاری کسی بھی بات کا کوئی بھی مطلب نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کے وہ رکی نہیں۔ اس نے اپنی بات گل کی جانب چہرہ کیے بغیر کی تھی اس کے باوجود گل کو نجانے کیوں ایسا لگا جیسے یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پہ بڑی طنزیہ اور تمسخرانہ سی مسکراہٹ پھیلی ہو۔ موتیا کے یہ انداز اسے سر سے پیر تک جلا گئے۔ چند منٹ پہلے تک کی ساری شرمندگی زائل ہو چکی تھی۔ اب وہ نئے سرے سے تنتناتی پھر رہی تھی۔

"ہونہہ' فضول کے نخرے...... آخر ایسا کیا کہہ دیا ہم نے جو اتنی اکڑ دکھائی جا رہی ہے۔ ہماری جانب دیکھنا تک گوارا نہیں...... نہ سہی ہماری کسی بات کا کوئی مطلب اسے نظر نہیں آتا اور جس کے پلے بندھنے جا رہی ہے اسے تو بے مطلب کی باتیں ہانکنے کا خبط ہے۔ غلط نہیں کہا تھا ہم نے امی حضور سے۔ اپنی طرف سے تو ہم نے بہن ہونے کے ناتے موتیا کا بھلا ہی سوچنا چاہا تھا۔

کل کو ہمیں اور ہماری زندگی کو دیکھ دیکھ کے خوامخواہ کڑھے گی اپنے اور ہمارے شوہر کا موازنہ کر کے اپنے فیصلے پہ پچھتائے گی۔ دھری کی دھری رہ جائے گی ساری فرماں برداری اور تابعداری' جس کے سرٹیفکیٹ ابا کے محترمہ پھولے نہیں سما رہیں۔ ہمارا خیال کیا کرے گی جس نے اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی زحمت نہیں کی اپنا تو کباڑا کیا ہی' اس فیصلے سے اتنا نہ سوچا کہ بہن کے رشتے پہ بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ شہزاد کہیں اس بات کو محسوس نہ کریں۔ یہ کیا کم ہے کہ وہ صرف ابا حضور کی نیک نامی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں تک آ گئے ورنہ اس پرانی حویلی میں دھرا ہی کیا ہے اور ان سے تو شہر کے نامی گرامی لوگ رشتہ قائم کرنے کی خواہش رکھتے ہوں گے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ بجائے ان کے شایان شان استقبال اور مہمان نوازی کی فکر کرنے کے ایک پٹیچر دکاندار کو اسی دن' اسی جگہ ان کے ہم منصب قرار دیا جا رہا ہے۔"

وہ پتہ نہیں کہاں کہاں کی کوڑیاں لا رہی تھی اور کیسے کیسے اندیشہ پال کے ہلکان ہوتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مٹھائی دے آئے ابا جی؟"

"آہو...... دے آیا۔" اللہ وسایا نے بڑی جتاتی نظروں سے دعا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تھوڑی دیر تک ان کی مٹھائی بھی بس پہنچتی ہی ہو گی۔"

"ان کی مٹھائی؟"

"آہووو......" اس نے جیسے مزا لینے کے انداز میں بیٹی کی حیرت اور تجسس کو بڑھایا۔ دعا کی اپنے ماما اور مامی سے انسیت اور ان کی جا بے جا طرفداری اسے ہمیشہ چڑاتی رہی تھی اور اب وہ دعا کو یہ احساس دلانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا تھا کہ جس مامے اور مامی کے نام کی وہ مالا جپتی رہتی ہے اور ان کی محبت اور احسانات بڑھا چڑھا کے بیان کرتی رہتی ہے' ان کے لیے وہ اتنی بیگانی ہے کہ اپنے بیٹے کا رشتہ تقریباً "تقریباً" طے کر دینے کے باوجود انہوں نے دعا کو اس معاملے کی ہوا تک نہ لگنے دی۔

"بڑی لاڈو رانی بنتی تھی تو اپنے مامے کی سگی سمجھتا تجھے تو ساتھ نہ لے جاتا' چلو صلاح ہی کر لیتا' بھو کے منہ ذکر ہی کر دیتا۔ یہی کہہ دیتا کہ چل روٹی تو بھی بھرجائی پسند کر لے۔"

"بھرجائی...... کیسی بھرجائی؟"

"شہزادے کی رن...... ہور کون؟ تیری بھرجائی ہی لگی ناں۔"

اللہ وسایا نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ نہیں بلکہ پیر رکھ دیا وہ بلبلا اٹھی۔

"ابا جی......" اس کی یہ احتجاجی چیخ پتہ نہیں اس خبر پہ تھی یا شہزاد کی بیوی کو اس کی بھابھی قرار دینے پہ......

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بھاجی کی شادی اتنی جلدی۔ ابھی کچھ دن پہلے تو میں گئی تھی تب ایسا کچھ نہ تھا۔ نہیں آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اس طرح چپ چاپ تو ماما جی ان کی شادی نہیں کر سکتے۔"

"خیر شادی تو نہیں ہوئی ابھی' رشتہ ہی ہوا ہے۔"

"توبہ۔ اور آپ یوں بات کر رہے ہیں جیسے......" وہ سر جھٹک کے قدرے پرسکون ہوتے ہوئے بولی ورنہ ابا جی نے تو اپنی چونکا دینے والی عادت سے اسے ہلا کے ہی رکھ دیا تھا۔

"شادی بھی ایسے ہی چپ چپاتے ہو جائے گی۔ بڑے لوگ ہیں بھئی' غریب ماٹھے رشتے داروں کو کس لیے

منہ لگائیں گے۔ ان کی محفل میں سہیں بھلا وہ کیا کہتے ہیں ہاں تقریب اس کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈل جائے گا ہمارے جیسے ٹٹ پونجیوں کے آنے سے ذرا تو صبر کر لیتی تو میں بتاتا اس کرمے کو' وڈا آکڑ آکڑ (اکڑ اکڑ) کے پھرتا ہے۔ مگر تو...... تجھے عقل ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔"

"اب میں نے کیا کیا ہے' ہر بات گھوم پھر کے مجھ پہ کیوں لے آتے ہیں آپ؟" وہ زچ ہو گئی۔

"ذرا صبر نہیں تیری ذات میں۔ اک سال ہوا ہے' دیکھ کیسے کوٹھڑی سے کوٹھی میں پہنچے ہیں۔ چاہے کرائے کی ہی سہی' دو سال اور لگتے اپنی کوٹھی بھی آ جاتی۔ رکشے سے گاڑی تک جانے میں صرف چھ مہینے لگے تھے تجھے۔ اتنی محنت بس سال دو سال اور کر لیتی تو ان نئے نئے پھنے خان بنے شریکوں (رشتے داروں) کے منہ پہ میں ایسی چھیڑ مارتا کہ لگ پتہ جاتا۔ لیکن تجھے تو آخر چڑھی تھی وہاں کی۔ ناں تیری کونسی عمر نکلی جا رہی تھی' آرام سے پانچ چھ سال لگا کے پھر سوچتی' بلکہ اتنے عرصے میں ایک سے ایک اچھا رشتہ آ جاتا تھا۔ تو اس کنگلے نواب پہ ہی ریجھ گئی مجھے تو کبھی کبھی بڑا سخت ڈرامے باز لگتا ہے یہ بندہ۔ باتیں اتنی میٹھی کرتا ہے کہ بندہ شیشے میں اتار لے۔ اس وقت تو مجھے بھی ساری دنیا سے اچھا لگنے لگتا ہے بعد میں سوچتا ہوں' ایسے ٹھاٹ ہیں اس کے تو صاف نظر کیوں نہیں آتے۔ تیرے پاس آتا ہے تو ہزاروں کے تحفے دے جاتا ہے مگر کم بخت آتا لوکل ویگن پہ ہے۔ عجیب دوہرا کردار ہے' میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ جس نے ساری دنیا برت لی ہے اور تو تو خود ابھی انجانی ہے تیری سمجھ میں ایسا گھمن گھیر بندہ کہاں آنے لگا ہے۔ اب تو اللہ سے دعا ہے کہ وہی بھلی کرے۔ جیسا یہ بابر کہتا رہا ہے ویسا ہی ہو پھر بھی میں تو حق مہر میں کم از کم پانچ لاکھ روپے لکھواؤں گا۔"

"کیسی عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ؟" وہ ناگواری سے ٹوکنے لگی۔

"عجیب کیسی؟ جوان لڑکی کا پیو ہوں' میں نئیں فکر کروں گا تو اور کون کرے گا۔ تو تو اپنی کرنے پہ آتی ہے' باز نئیں آئے گی تو کیا میں بھی تیرا بھلا نہ سوچوں۔ یہ تیرا حق ہے اور جھلئے' ہم ماڑے (کمزور) لوگوں کا کیا ہے' جس کا جی چاہے روند کے چلا جائے۔ اپنی اینٹ مضبوط رکھنے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ حق مہر تگڑا ہو گا تو کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچے گا یہ بابر مغل ان نواب زادوں کا ویسے ہی کوئی اعتبار نہیں' کب کس سے دل بھر جائے' عیاش تو ہوتے ہی ہیں۔ چلو حق مہر کی وجہ سے ہی بندھ کے رہ جائے۔"

"ابا جی......؟" وہ حیران رہ گئی اتنے سفاک تبصرے پہ۔

"ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی اور آپ...... آپ ایسی منحوس باتیں کر رہے ہیں۔ پہلے ہی آپ کی یہ سوچ ہے تو بعد میں...... مغل صاحب آپ کے ہونے والے داماد ہیں اور ان کے بارے میں آپ کی یہ رائے ہے؟"

"اچھا...... میں نحوست پھیلا رہا ہوں؟ ہاں ہے یہ میری سوچ اور ہے میری یہی رائے اپنے اس ہونے والے داماد کے بارے میں۔ میں کلا (اکیلا) نئیں' ساری بیٹیوں کے ماں باپ کے دل شادی سے پہلے ایسے ہی ڈانواڈول ہو رہے ہوتے ہیں۔ ہر ہر بات سوچ لیتے ہیں وہ ساری احتیاطیں کر کے دیکھتے ہیں' اپنی طرف سے پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی بیٹی رخصت کرتے ہیں' اس کے باوجود قسمت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اوئے لوگ تو اگلا پچھلا سارا خاندان کھنگال ڈالتے ہیں' آنڈی گوانڈی (آس پڑوس) سے پچھ پریت (پوچھ پچھ) کرتے ہیں۔ میں جانتا ہی کیا ہوں بابر مغل کے بارے میں سوائے اس کے کہ وہ ذات کا مغل ہے اور کسی بڑے نواب کی اولاد ہے' پہلے سے شادی شدہ ہے اور ملک مقبول کے خاص بندوں میں سے ہے۔ کتنا کماتا ہے' بال بچے کتنے ہیں' تجھے کہاں رکھے گا بیوی کو دوسرے ویاہ کا بتایا ہے یا نہیں یہ سب تو پتہ نہیں کروایا۔ رب جانے تیری ضد کیا رنگ لانے والی ہے۔ سچ میں تو بڑا فکر مند ہوں۔ اسی لیے ایسی بات کی تھی اور تو مجھے باتیں سنا رہی ہے۔"

اس وقت اللہ وسایا کے چہرے پہ واقعی اتنا تردد اور تفکر تھا کہ دعا متاثر ہو گئی۔

"ہے تو میرا باپ ہی۔ لیکن میں کیسے سمجھاؤں کہ بابر صاحب ہی میرے نجات دہندہ ہیں' وہ مجھے ایک ایسی دنیا

ایسی زندگی دینے والے ہیں جس کی میں نے ہمیشہ سے تمنا کی تھی بھلے کسی اور کے حوالے سے ہی سہی کسی اور کے ساتھ ہی سہی۔ وہ ساتھ نصیب میں نہیں تو کیا وہ زندگی پانے کی جدوجہد بھی چھوڑ دوں۔" وہ چپ چاپ سوچے گئی۔

"اور پھر حق مہر تگڑا ہونے کا ایک فائدہ ہے' اگر نہ ہوا اس کے پاس تو دب کے رہے گا' تیرے سر پہ تلوار تو نہ لٹکتی رہے گی کہ کب فارغ کر دے۔" وہ اپنے بے باک تبصرے اور سفاک تجزیے پھر سے نشر کرنے لگا۔

"اور اگر واقعی اس کے پاس اتنا پیسہ ہے جتنا وہ بتا رہا ہے تب بھی تیرا فیدہ ہے۔ کل کلاں کو واپس آئی تو خالی ہاتھ تو نہ آئے گی۔ چند لاکھ ہوں گے پاس تو دوبارہ اپنی زندگی شروع کرنے میں مشکل تو نہ ہوگی۔ شروع شروع کے چند شو یا ڈرامے تھوڑا پیسہ خرچ کر کے حاصل کرتا ہوں گے' ایک دفعہ پھر سے نام کی مشہوری کرانے کے لیے کچھ تو مال ہونا چاہیے۔"

ایک بیٹی کے باپ سے ایک فنکارہ کے سرپرست ہونے میں اسے بس چند ہی منٹ لگے۔

دعا تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا وہ اس بات کے جواب میں کیا کہے۔ بس اتنا جان لیا کہ مزید بحث کرنا بے کار ہوگا۔ اسی لیے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھر کے وہاں سے اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ میرے والد کرم الٰہی ہیں۔" شہزاد نے صاحبزادہ نفیس علی خان سے مصافحہ کرتے ہوئے تعارف کی رسم نبھائی۔

وہ ان کی شخصیت کے سحر' رعب اور دبدبے سے مرعوب نظر آ رہا تھا۔ یہ مرعوبیت اس کے منکسر لہجے سے بھی واضح تھی جبکہ اس کے اسی انکسار اور جھکی ہوئی نظروں پست آہنگ لہجے کو نواب صاحب نے اس کی شرافت اور نجابت پہ محمول تھا۔ ان کی نگاہوں میں پسندیدگی در آئی' شہزاد اگر ہمت کر کے نگاہیں اٹھا کر اس وقت ان کے چہرے کی جانب دیکھ لیتا تو اس کے پست ہوتے حوصلے نئے سرے سے جوان ہو جاتے۔ اس کے دل کے اندر دبک کے بیٹھا احساس کمتری اس پسندیدگی کی رمق دیکھ کے ہوا ہو جاتا۔ مگر وہ مسلسل مودب سا بنا سر اور نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔

عمیص نے بھی گہری نظروں سے اپنے رقیب کا جائزہ لیا۔

یہ وہ شخص تھا جس کی خاطر گل مہر نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ وہ تھا جس کے مقابلے میں عمیص کو لا تا وہ اپنے اس انتخاب کی توہین سمجھتی تھی۔

"تم نہ ہوتے تو کوئی اور ہوتا۔ میں تو بہرحال' کبھی بھی نہ ہوتا۔" اس نے حقیقت پسندی سے تسلیم کیا۔

"تمہارا انتخاب واقعی لاجواب ہے گل' تم کوئی ایسی ویسی چیز تو پسند بھی نہیں کر سکتی تھیں۔" اس نے ایک بار پھر بڑے محتاط اور دبے دبے انداز میں چچا حضور سے گفتگو کرتے شہزاد ملک کو دیکھا۔

"سر کی جو بات' ہمیں سب سے زیادہ اٹریکٹ کرتی ہے وہ ان کا بے پناہ اعتماد اور ذات میں جھلک دکھاتی چٹان کی سی مضبوطی ہے۔ وہ چھا جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے سامنے کوئی زیادہ دیر ٹھہر نہیں پاتا اور ہم نے تو ہمیشہ ہی سے ایسے شریک حیات کی خواہش کی تھی جس کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے ہمیں اپنے ارد گرد کے سب لوگ سر جھکائے' مودب سے کھڑے نظر آئیں۔"

اسے گل کی وہ بات یاد آئی جس کی روشنی میں عمیص نے شہزاد کا جو تصوراتی خاکہ تراش رکھا تھا' وہ ایک بڑے ہی بارعب' پروقار' سنجیدہ' خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کسی اکڑی ہوئی گردن اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے کروفر سے بیٹھنے والے' اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہ لانے والے کسی باس نما آدمی کا خاکہ تھا جبکہ شہزاد اس وقت اس تصوراتی خاکے سے قدرے مختلف نظر آ رہا تھا۔ سنجیدگی تو اس کی شخصیت سے واضح تھی' ذہانت اور اس رشتے

کے بارے میں خلوص بھی اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا مگر وہ چٹان کی سی مضبوطی اور اپنی شخصیت کے سحر میں سمیٹ لے جانے والا بہاؤ ندارد تھا۔ وہ خاصا نروس نظر آ رہا تھا۔

"شاید اس موقع پہ سب کا یہی حال ہوتا ہو۔ ساری طرم خانی دھری کی دھری رہ جاتی ہو۔ اب مجھے کیا پتہ' میں کب گزرا ہوں بردکھوے کے اس تجربے سے۔" وہ خوامخواہ مسکرا دیا۔

اسی لمحے شہزاد کی نظر گل کے اس کزن پہ پڑی۔ نجانے اس کی سادہ سی' بے معنی سی مسکراہٹ میں اسے کیا نظر آیا کہ اس کی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی۔

عمیص کے برعکس صاحبزادہ نفیس علی خان کی زیادہ توجہ اپنے متوقع داماد کی بجائے اس کے والد کی جانب زیادہ تھی۔ پتہ نہیں کیوں' اس کا چہرہ انہیں دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ وہ پورے وثوق سے کہہ سکتے تھے کہ اپنی پوری زندگی میں ان کا واسطہ کبھی بھی ملک کرم الٰہی نام کے کسی زمیندار سے نہیں رہا۔ اپنی یادداشت پہ انہیں اس حد تک تو اعتماد تھا لیکن پتہ نہیں کیوں' جب جب بھی ان کی نگاہ اس کمزور اور زرد رو ادھیڑ عمر شخص پہ پڑتی جو حد سے زیادہ کم گو تھا' ذرا الجھ کے رہ جاتے۔ گمان کیا کہ شاید اپنے کسی جاگیردار یا زمیندار دوست کے ہاں ایک آدھ بار سرسری سی ملاقات ہوئی ہو جو ذہن سے یہ چہرہ چپک کے رہ گیا ہے۔

"قبلہ' کیا آپ میاں نعمت علی سے واقف ہیں؟ وہ ہمارے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے ہیں۔"

سر نیہوڑائے بیٹھے کرم الٰہی کو انہوں نے اچانک مخاطب کیا' تو وہ گڑبڑا کے رہ گیا۔ اتنی مرصع و مسجع زبان سے ادا کیے گئے فقرے کو اس نے ذہن میں دہرا کے اس کا مطلب جانچنے کی کوشش کی۔

"نہ۔۔۔ نہیں جی۔۔۔ جی میرا مطلب ہے' میں تو اس نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں۔"

بات کا آغاز کرتے ہی اسے شہزاد کی تنبیہہ یاد آئی کہ ہر ممکن حد تک لہجہ چوہدریوں' وڈیروں کی طرح بارعب اور انداز سربلند رکھنا ہے' اس لیے اس نے بڑی بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کیا۔

"ذرا ذہن پہ زور ڈالو جی۔" بانو نے ایک بار پھر بیٹے کی تنبیہہ کو فراموش کر دیا۔ عادت سے مجبور وہ بار بار ہر بات میں دخل دے رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے' وہ میاں جی۔۔۔ جو نواب صاحب کے جاننے والے ہیں' کبھی نہ کبھی آپ کے بھی ملنے والوں میں سے رہے ہوں۔ آپ کو پرانی باتیں یاد بھی تو مشکل سے آتی ہیں۔ ذرا سوچو۔۔۔ غور کرو۔"

لگتا تھا وہ زور زبردستی سے اسے کوئی نہ کوئی میاں یاد دلا کے ہی رہے گی۔ صاحبزادی حرمت النساء نے اچنبھے سے اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے طلب گار بن کے آئی اس صحت مند خاتون کو دیکھا جو پچھلے بیس پچیس منٹ سے مسلسل انہیں حیران کرتی آ رہی تھیں۔ اگرچہ کرم الٰہی بست' لیے دیے سے انداز میں ساری محفل سے کٹ کے بیٹھا تھا اس کے باوجود پردے دار صاحبزادی حرمت النساء اور خلعت النساء خود کو آرام دہ محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ چادروں سے پورا وجود' سر اور آدھا چہرہ چھپائے ہوئے بھی وہ اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں تکلف سے بیٹھی تھیں۔ ابھی تک سوائے رسمی سلام دعا کے انہوں نے کوئی بات نہ کی تھی۔ ایسے میں بلقیس کے رنگ ڈھنگ اور طور اطوار انہیں اجنبی سے لگ رہے تھے۔

سخت گرمی کی اس حبس بھری شام میں وہ شیفون جارجٹ کا تیز نارنجی رنگ کا کڑھائی والا سوٹ پہنے ہوئی تھی' اور کڑھائی بھی کھلتے ہوئے سبز رنگ کی' تنگ فٹنگ والا یہ ریشمی سوٹ اس کے صحت مند سانولے وجود پہ جیسے غلاف کی مانند چڑھا ہوا تھا۔ چربی سے بھرپور کلائیاں سونے کی چوڑیوں اور کڑوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اچھی خاصی عمر ہونے کے باوجود سارا سر کالا سیاہ تھا' یا تو بال اب تک سفید ہوئے نہ تھے یا پھر باقاعدگی سے رنگنے کی عادی تھی' میک اپ کے لوازمات بھی سارے کے سارے موجود تھے' لپ اسٹک بھی' مسکارا بھی بلش آن بھی۔ سونے کا بھاری سیٹ بھی اس نے یوں پہن رکھا تھا جیسے کسی تقریب میں جانے کا قصد ہو۔ اتنا بجنے سنورنے اور سر سے پیر تک کوئی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی مالیت کا ساز و سامان لادنے کے باوجود وہ ان دونوں سادہ مزاج گھریلو خاندانی خواتین کے

لیے موت کا باعث بن رہی تھی۔

"اباجی کو عرصہ ہوا' تقریباً" گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔" شہزاد نے دخل دیا' کن انکھیوں سے ماں کو بھی کچھ باور کرانے کی کوشش کی۔

"اور جب سے طبیعت خراب رہنے لگی ہے' تب سے میری بھی یہی کوشش ہے اور ڈاکٹرز کا بھی یہی مشورہ ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔ یہ کم ہی کہیں آتے جاتے ہیں' زیادہ تر گھر پہ ہی رہتے ہیں۔ ماسوائے کسی خاص وجہ کے جیسے آج میرے بے حد اصرار پہ شہر آئے ہیں۔"

وہ ہر طرح سے ان پہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ اس کا باپ اپنے گاؤں سے کبھی نکلا ہی نہیں۔ دراصل جب سے صاحبزادہ انیس علی خان نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ پہلے بھی کرم الٰہی سے ضرور کہیں نہ کہیں مل چکے ہیں تب سے اسے یہ دھڑکا سا لگا تھا کہ ہو نہ ہو' وہ ملک کرم الٰہی کے پردے میں چھپے اپنے وقت کے فلمی کامیڈین اور اسٹیج آرٹسٹ بلبلہ کو پہچان چکے ہیں حالانکہ اس کے امکانات دس فیصد بھی نہ تھے۔ کیونکہ تب کے لمبے تڑنگے صحت مند بلبلہ اور آج کے نحیف و نزار مختلف بیماریوں کا شکار کرمے میں زمین آسمان کا فرق تھا اور پچھلے دنوں ہونے والے ہارٹ اٹیک نے تو اس کی شکل ہی بدل ڈالی تھی اور دوسرا وہ کونسا مشہور اداکار تھا جو آج تیس سال بعد بھی لوگ اسے یاد رکھ پاتے۔ پرانے فلم بینوں کو بھی بہت یاد دلانے پہ بلبلہ نام کا وہ مسخرہ شاید ہی یاد آپاتا جو ساٹھ اور ستر کی دہائی میں بننے والی ہر دوسری فلم میں ہوتا تھا۔

"ہوسکتا ہے' ہمیں بھی کچھ مغالطہ ہوا ہو۔" انہوں نے بھی اپنے وہم کو رفع دفع کرنا چاہا۔

☼ ☼ ☼

سارا دن وہ کسی مشین کی طرح کام کرتی رہی تھی۔ مگر نہیں...... مشین کا کام تو بس چلتے رہنا ہوتا ہے' اپنی ڈیوٹی کسی معمول کی طرح انجام دینا۔

جبکہ وہ تو یہ سارے کام بڑی لگن اور دل سے کر رہی تھی۔ ایک ہی خواہش تھی کہ گل کی دلی مراد پوری ہو جائے تو سمجھو ساری محنت وصول ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی غرض بھی شامل تھی کیونکہ آج ہی کی شام اس کی اور عمیص کی نسبت کا اعلان بھی ہونے والا تھا۔ احساسات پر خوشگواریت چھائی ہو تو تھکن یا بے زاری کا احساس بھلا کیسے ہوتا۔

ایسے میں عمیص کا آنا' اپنی پرخلوص اور سچی باتوں سے اس کے دل میں موجود رہے سہے خدشات کو دھو جانا اسے اور بھی ہلکا پھلکا کر گیا تھا۔

لیکن اب...... سارے دن کی مصروفیت کے بعد وہ کچن کے ایک کونے میں بے کار کھڑی ٹرالی میں سجے برتنوں اور چائے کے لوازمات کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہمیں تو ترس آرہا ہے موتیا پہ۔" گل کا ترحم آمیز لہجہ گونجا۔

"اور مجھے رشک آیا کرتا تھا تم پہ۔ گل جب یہی عمیص تم پہ جی جان سے فدا تھا' جس سے میرے منسوب ہونے کی وجہ سے تمہیں میرا وجود قابل رحم لگ رہا ہے۔"

وہ پہلے سے پھینٹ کے رکھے بیسن کے آمیزے میں بے دھیانی میں چمچہ چلاتی جا رہی تھی۔ سامنے چولہے پہ دھری کڑاہی گرم ہو گئی تھی۔

"خدا کا واسطہ ہے' یہ مت کیجئے گا' کیا سوچیں گے وہ لوگ اور شہزاد سر کو کتنا محسوس ہوگا۔"

وہ امی حضور کو اس اقدام سے باز رہنے کا مشورہ دے رہی تھی اور خود اپنی وکالت کے لیے اس نے کب سے موتیا کو آگے کر رکھا تھا۔ وہ بیچاری دنوں تک اس کا مقدمہ اپنے بڑوں کے سامنے پیش کرتی رہی کتنی خلوص نیت کے ساتھ۔

موتیا نے گھی کے کنستر میں سے چمچہ بھر کے گرم ہوتی پیتل کی بڑی سی کڑاہی میں گھی ڈالا۔ ہلکا جما گھی شوں کی آواز کے ساتھ کڑاہی کے پیندے کو چھوتے ہی پگھلنے لگا۔ وہ ہاتھ روک کے اس کی ہیئت بدلتے دیکھنے لگی۔

"وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گی یہ سوچ کر کہ اس کی بہن کا رشتہ اتنے اچھے گھرانے میں ایک کامیاب بزنس مین کے ساتھ ہو رہا ہے اور اسے گھر کے ہی ایک ایسے لڑکے کے پلے باندھا جا رہا ہے جو معمولی سا دکاندار ہے' تعلیم بھی واجبی سی۔"

"تم کیا جانو' گل میری خوشی کس میں ہے۔ چلو مانا کہ تم میرے جذبات سے بے خبر ہو مگر ایک بہن ہونے کے ناتے تم یہ سب واقعی میری ہمدردی میں کہتیں تو میں درگزر کر دیتی کہ تم تو اپنی طرف سے میرا بھلا ہی کرنا چاہتی ہو' تمہیں کیا خبر کہ یہ عام سا شخص عمیص کی میری زندگی کا سب سے اہم شخص ہے۔ مگر بات یہ ہے صاحبزادی گل مہر کہ تم نے تو زندگی بھر سوائے اپنے اور کسی کے بارے میں نہ کچھ جانا نہ سمجھا اور نہ ہی اس کی کوشش کی مگر میں نے ساری عمر یہی ایک کام تو کیا ہے' کوئی زبان سے کیا کہہ رہا ہے اور اس کے دل میں کیا ہے' یہ راز نجانے کیسے مجھ پہ کھل جاتا ہے اور پھر اگر سامنے کوئی اپنا ہو تو یہ جاننے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔ تو میری بہن' میں بھی جان گئی تھی کہ اصل میں تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ تم نے ہمیشہ اپنی ذات کو اولیت دی ہے۔ تم کیسے یہ گوارا کر سکتی ہو کہ جس شخص کو تم نے اپنے لیے پسند کیا ہے اور جسے اپنانے کے لیے تم سارے زمانے کی ٹکر لینے پہ تیار ہو' اس کا ہم منصب ایک ایسا شخص ہو جسے تم انتہائی حقارت سے ٹھکرا چکی ہو۔ اف...... کتنی خود غرض ہو تم کس قدر مطلبی۔"

اس نے دھواں دیتے گھی کے نیچے آنچ بالکل مدھم کر دی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" عمیص نے اس کی محویت کو توڑا۔

"دلگیر کا انتظار۔"

"ہائے...... یہ نہ تھی ہماری قسمت۔" اس نے اداکاری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

"تمہیں انتظار کے لیے اور کوئی معقول چیز دستیاب نہیں ہوئی بی بی ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔" وہ آگے بڑھ کے تلی ہوئی مونگ پھلی میں سے چن چن کر موٹے دانے نکالنے لگا۔

"تم نے میرا کونسا کام سنوارنا ہے۔ جو میں تمہارا انتظار کرتی۔ دلگیر کا انتظار اس لیے تھا کہ وہ کراکری وغیرہ اندر لے جائے تو میں پکوڑے تلنے کا کام شروع کروں۔"

"تم اندر کیوں نہیں آرہیں' آؤ یار...... بڑا زبردست کریکٹر ہے یہ گل کی ہونے والی ساس۔"

"ہاں بس چائے لے کے آتی ہوں۔"

"کیوں...... تم کیوں؟ جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے' آج کے اہم دن یہ فریضہ گل کو ادا کرنا چاہیے' یہی دستور ہے۔"

"کیا تمہاری ناقص معلومات میں یہ درج نہیں کہ آنسہ گل مہر کو ہر دستور سے چڑ ہے۔ اس نے چائے لے جانے سے انکار کر دیا ہے' ہاں بعد میں آجائے گی۔"

"ہاں اسے کہنا چاہئے پہ تو ضرور آئے اور اپنی ہونے والی ساس کے کھانے کی رفتار کا جائزہ لے' فی الحال تو میں اس کے بولنے کی رفتار کا جائزہ لے کے آرہا ہوں۔ رفتار کا بھی اور معیار کا بھی۔" آخری فقرہ اس نے بڑے دبے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"کیا مطلب...... کیا بہت باتونی خاتون ہیں؟"

"خود دیکھ لو کیا چیز ہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ شہزاد ملک کرائے کے ماں باپ اٹھا لایا ہے۔ وہ فلموں ڈراموں میں دکھاتے ہیں ناں کہ لڑکے کا آگے پیچھے کوئی نہیں یا پھر ماں باپ نے رشتہ اس کی پسند سے کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ سستے سے نوٹنکی کے اداکار پیسے دے کر بہروپ بھر کے لے آتا ہے۔ بس اسی قسم کے کچے اداکار لگ رہے ہیں۔"

"شش...... چپ کرو' گل نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔" وہ گھبرا گئی کیونکہ ہلکے کاسنی سوٹ میں' بالوں میں

برش پھیرتی گل اسی جانب آ رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے' کیا کھچڑی پک رہی ہے؟" وہ دروازے پہ ہی ٹھٹھک کے پوچھنے لگی۔ عمیص کے چہرے کے تاثرات ہی ایسے تھے۔ صاف پتہ لگ رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کسی ایسی بات کا مزا لے رہا ہے جو اس کے آنے پہ ادھوری رہ گئی ہو۔

"کھچڑی..... اللہ کا نام لو گل' اب کیا موتیا تمہارے ہونے والے سسرالیوں کو کھچڑی پہ ٹرخائے گی۔ وہ بے چاری صبح سے یہ پندرہ بیس آئٹمز تیار کرنے کے چکر میں ہلکان ہو رہی ہے اور تم اس پہ بدذائقہ کھچڑی بنانے کا بے بنیاد الزام لگا رہی ہو۔"

"کہیں تم دونوں ہمارے متعلق تو بات نہیں کر رہے تھے۔" عمیص کی آنکھوں سے پھوٹتی شرارت اور موتیا کا مسلسل رخ پھیر کے کھڑے ہونا اسے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔

"ہمارے پاس بات کرنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے۔" اس بار موتیا نے پلٹ کے جواب دیا تھا۔

"اوہو..... یوں کہو کہ ہم نے کباب میں ہڈی کا رول پلے کیا ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں دونوں کو باری باری مسکرا کے دیکھنے لگی۔ اس کی مسکراہٹ میں وہ شرارت یا چھیڑ نہیں تھی جو اس موقع پہ بہنوں یا سہیلیوں کی مسکراہٹ میں ہوتی ہے بلکہ ایک دل جلانے والا انداز تھا' ایک چوکے لگاتا احساس تھا۔

موتیا سر سے پیر تک سلگ گئی۔ عمیص بھی یہ محسوس کر کے چپ سا ہو گیا کہ ان دونوں کے درمیان قائم ہونے والے اس رشتے سے اب گل مہر بھی واقف ہے۔ حالانکہ اس میں خائف ہونے والی کوئی بات نہ تھی وہ کونسا گل کا پابند تھا یا اس کے جذبات کو ٹھیس لگا رہا تھا۔ مانا کہ ایک عرصے تک وہ علی الاعلان اس کی محبت کا دم بھرتا رہا مگر یہ وہی تھی جو ہر بار اور ہر طریقے سے اس کی دل شکنی کرتی رہی اور پھر شہزاد ملک کا انتخاب کر کے اس کی محبت کو حتمی طور پہ مسترد کر دیا۔ لیکن یہ عمیص کا بے دھڑک اظہار محبت ہی تھا جو اب اسے گل کے سامنے شرمندہ کر رہا تھا۔

"کیا سوچتی ہو گی گل مہر کہ کیسے میرے عشق کی قسمیں کھاتا رہا اور اب کتنی آسانی سے میری ہی بہن سے وابستہ ہونے جا رہا ہے۔ اب اسے کیا پتہ کہ یہ میں کس لیے اور کس کی خاطر کر رہا ہوں۔ موتیا اچھی ہے' بہت اچھی' لیکن اتنی جلدی اسے اس نئے رشتے کے ساتھ قبول کرنا میرے دل کے لیے آسان کام نہیں پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا بجھا کے پہلے سا رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ میرے کسی غیر معمولی طرز عمل یا گریز سے اس اچھی اور حساس لڑکی کو ٹھیس نہ پہنچے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں گل۔ عمیص تو مجھے صرف یہ بتا رہا ہے کہ اندر کون کون آیا ہے' کیا کیا باتیں ہوئیں وغیرہ۔"

خود پہ مشکل سے ضبط کر کے موتیا نے متانت و بردباری سے وضاحت کی۔

"اور پلیز تمہیں کتنی بار کہا ہے' کھلے بال لے کے یوں کچن میں مت آیا کرو' خاص طور پہ کنگھا یا برش کرتے ہوئے۔" عادت سے مجبور وہ ٹوکنے سے بھی باز نہ رہ سکی جبکہ وہ حسب عادت اس کی ہدایت کو کسی مکھی کی طرح اڑاتے ہوئے عمیص سے پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں کیسے لگے سر کے والدین۔ کیسا رویہ ہے ابا حضور کا ان کے ساتھ اور ہاں سر کے بارے میں ان کے کیا تاثرات ہیں' بہت خوش ہوں گے وہ ان سے مل کے۔" اس کے لہجے میں تجسس سے کہیں زیادہ اشتیاق تھا۔

"کون..... تمہارے سر یا چچا حضور؟ چچا حضور کا تو پتہ نہیں کیونکہ وہ اتنی جلدی کسی پہ نہیں کھلتے البتہ تمہارے سر ضرور اس وقت ساتویں آسمان کی سیر کرتے معلوم ہو رہے ہیں اور رہے ان کے والدین تو والد صاحب تو یوں لگتا ہے مارے بندھے بیٹھے ہیں' بے دلی یا مجبوری کی بجائے ایک عجیب طرح کا ہراس یا یوں کہہ لو' بے بسی سی چھائی ہے ان پہ۔

ماشاءاللہ ان کی نصف بہتر..... تو نصف تو کہیں سے نہیں البتہ ڈیڑھ ضرور لگتی ہیں' خوب مزے میں ہیں اور یہ ٹرالی

اندر جانے کے بعد اور بھی مزے کرنے والی ہیں۔"

"پلیز عمیص' بی سیریس' ٹھیک طرح سے بتاؤ کیا صورت حال ہے اندر کی؟"

"کیوں اتنی اتاؤلی ہو رہی ہو۔ جو ہو گا انشاءاللہ بہتر ہی ہو گا۔ میں تو صبح سے دعا کر رہی ہوں کہ بات بن جائے۔ ابا حضور راضی خوشی مان جائیں۔"

"وہ تو ہو گا ہی۔" گل مہر نے اچانک دنیا جہاں کا اطمینان خود پہ طاری کرتے ہوئے کہا۔

"سب سے بڑا مرحلہ تو صرف شہزاد سر کے گھر والوں کو یہاں تک لانے کی منظوری حاصل کرنا تھا۔ یہی مرحلہ سب سے کٹھن بھی تھا اور یہی پہلا اور آخری بھی۔ اب اور کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ ابا حضور کو اعتراض کرنے کا موقع ہی کہاں ملے گا۔ ویسے بھی انہوں نے اپنے ہونے والے داماد کے متعلق کوئی خاص توقعات نہیں رکھی ہوئی تھیں ماسوائے چند شرائط کے۔" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے عمیص کو دیکھ کے کہا۔

"اور ان کے قائم کردہ معیار سے تو چند درجے اونچا ہی ہے ہمارا انتخاب۔"

"زیادہ بڑھ چڑھ کے بولنے کی ضرورت نہیں گل۔" بالآخر موتیا کو غصہ آ ہی گیا۔ بھلا کوئی کب تک برداشت کرے..... وہ خود پہ طنز برداشت کر سکتی تھی۔ عمیص پہ تنقید چپ چاپ سہہ سکتی تھی لیکن ابا حضور کے بارے میں گل کا یہ انداز گفتگو اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"نجانے تم خود کو کیا سمجھ بیٹھی ہو جیسے تم نے اپنے لیے ایک شہزادہ چن لیا ہے جو نہ صرف تمہاری بلکہ ہم سب کی زندگی میں ایک انقلاب لانے والا ہے۔ جیسے ہم خدانخواستہ کوئی رینگنے والے کیڑے ہیں جن کو وہ عالی حضرت کمال مہربانی سے آسمان پہ جگہ دینے والے ہیں۔ اس طرح شو کر رہی ہو جیسے ابا حضور نے ساری عمر تمہیں ایک ایک چیز کے لیے ترسایا ہو اور ہمیشہ تمہارے بارے میں غلط فیصلے کیے ہوں۔ ٹھیک ہے' ہو سکتا ہے یہ آدمی جو اندر بیٹھا ہے اور جس سے تم محبت کا دعویٰ کرتی ہو' واقعی بہت اچھا ہو' اس سے بھی کئی گنا زیادہ اچھا جتنا کہ تم بتاتی ہو پھر بھی..... پھر بھی گل..... اسے اچھا ظاہر کرنے کے لیے تم باقی سب کو برا کیوں بتا رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟ ایسا کیا کہہ دیا ہم نے جو تم بلبلا اٹھی ہو۔" وہ بکھرے بال سمیٹ کر لپیٹنے لگی۔

"تمہارا ہر انداز یہ ظاہر کر رہا ہے گل کہ جیسے ابا حضور خدانخواستہ تمہیں کنویں میں دھکیلنے والے تھے اور وہ تو تمہاری قسمت اچھی تھی یا تم میں کوئی سرخاب کے پر لگے تھے جو ایک سارے جہاں سے نرالا' تمہارا نجات دہندہ بن کے آ گیا۔"

موتیا نے زہرخند لہجے میں اپنا اعتراض واضح کیا۔ عمیص نے نظروں ہی نظروں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اس میں غلط کیا ہے۔" اس نے شانے اچکائے۔

"فکر مت کرو' اگر تمہاری قسمت اچھی ہوئی تو تم بھی اس کنویں کا شکار ہونے سے بچ جاؤ گی۔" وہ ایک اچٹتی ہوئی نظر دونوں پہ ڈال کے واپس جانے لگی۔

"ایک منٹ رکو گل۔" عمیص نے آواز دی اور اس کے تھم کے پلٹنے پہ چند قدم آگے بڑھا۔

"محبت میں دیوانگی ایک فطری بات ہے گل مگر دیوانگی کا بھی ایک قرینہ ہوا کرتا ہے۔ خدا تمہیں تمہاری محبت اور محبوب دونوں مبارک کرے یہ میری ہی نہیں اس گھر کے ہر مکین کی دلی دعا ہے مگر تم..... تم بھی اپنی محبت کا صدقہ نکال دیا کرو' صدقہ بری نظر سے بچاتا ہے' آئی بلا کو ٹالتا ہے۔"

اس کی بات پہ وہ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اسے دیکھنے لگی تو عمیص نے وضاحت کی۔

"محبت کا صدقہ محبت ہی ہے۔ کچھ محبت ادھر ادھر بھی بانٹ دیا کرو اچھا رہتا ہے۔"

اس کی سادہ سی مسکراہٹ نے گل کو مزید زہر اگلنے سے روک دیا اور خلاف عادت و فطرت وہ خاموشی سے یہ نصیحت سن کر واپس چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"آپ یہاں، مگر آج کے دن کے لیے تو آپ نے آنے سے معذرت کرلی تھی۔"

دعا بابر کو اپنے دروازے پہ پا کے حیران رہ گئی۔ ابھی دو ہی دن پہلے تو اس نے اتوار کی شام اسے گھر بلوایا تھا کہ وہ شام کی چائے اس کے ساتھ پیے اور بعد میں دونوں شادی کی شاپنگ کے لیے اکٹھے نکلیں مگر تب بابر یاسمین سے اس کے میکے حاضری دینے کا وعدہ کرچکا تھا اور چونکہ ان دنوں یاسمین سے بنا کے رکھنا اس کے لیے ضروری تھا اس لیے وعدہ خلافی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اب بنا کر رکھنے کی ساری کوشش بے کار ثابت ہو چکی تھی بنتی بات اچھی خاصی حد تک بگڑ چکی تھی۔ فی الحال عافیت اسی میں تھی کہ وہ نہ صرف یاسمین بلکہ اس کے میکے کے ہر فرد سے دور دور ہی رہے یاسمین جس طرح کے رنگ ڈھنگ دکھا رہی تھی، اب اس سے پردہ پوشی کی توقع رکھنا عبث تھا۔ یقیناً" اب تک وہ میکے جاتے ہی ایک ایک کو ساری روداد سنا چکی ہو گی۔ اس لیے اس نے یہ شام دعا کے ہمراہ گزارنا زیادہ مناسب خیال کیا۔

"غالباً" آپ کے عزیزوں کے ہاں کوئی تقریب تھی؟" دعا نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"کیا ملتوی ہو گئی؟"

"تقریب ایسی خاص نہ تھی۔ یوں سمجھیے تقریب کی تمہید تھی دراصل ہماری خواہر نسبتی۔۔۔ یعنی ہماری سالی صاحبہ کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ ہمارے خسر صاحب کی خواہش و درخواست تھی کہ اس موقع پہ ہم وہاں موجود رہیں۔ لیکن اس دل کا کیا کریں ادا جی، یہ آپ کے بنا کہیں لگتا ہی نہیں۔ سوچا وہاں ہو کے بھی نہ ہونے سے بہتر ہے، یہاں آجائیں۔ آپ مصروف تو نہیں۔"

"بالکل بھی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو کیا۔۔۔" خوشدلی سے لگاوٹ کا اظہار کرتی کرتی وہ اچانک رک گئی۔

ایسا ہی ہوتا تھا اس کے ساتھ۔

دل و دماغ کو پوری طرح آمادہ کر کے وہ بابر ہمایوں مغل سے رشتہ استوار کرنے پہ تیار ہوئی تھی ارادہ باندھ چکی تھی کہ اپنے ہر عمل سے اور دل کی تمام تر گہرائی و سچائی کے ساتھ یہ رشتہ نبھائے گی اور اس سلسلے میں عملی قدم اٹھاتے ہوئے وہ خود کو ہر طرح سے اس کی جانب ملتفت کرنے کی کوشش کر چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بابر کے لیے پسندیدگی کے جذبات تو ہیں ہی اس کے دل میں اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے وہ اس کی ممنون بھی ہے۔ اسی طرح یہ پسندیدگی اور ممنونیت محبت میں بدلتے دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔

بابر کے سامنے محبت میں گندھے جذبات کی اداکاری پیش کرتے ہوئے اسے خود ہی اپنی پرفارمنس اس قدر بھونڈی اور کچی محسوس ہوتی کہ وہ اپنی اس نااہلی پہ شرمندہ ہو کے اکثر چپ ہو جاتی۔ ابھی بھی وہ کہنا تو یہی چاہ رہی تھی کہ۔۔۔

"آپ سے زیادہ ضروری کام بھلا! مجھے کیا ہو سکتا ہے۔"

یا پھر۔

"آپ کی خاطر میں سب کچھ پس پشت ڈال سکتی ہوں۔"

مگر اپنے لہجے کی بے دلی اور الفاظ کا کھوکھلا پن محسوس کر کے اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

"کیا لیجیے گا؟" لونگ روم میں اسے بٹھانے کے بعد دعا نے آداب میزبانی نبھانی چاہی۔

"آپ کی خاطر ایک بہت ہی پرتکلف دعوت چھوڑ کر آرہے ہیں۔ ہائی ٹی سے کم پہ تو ازالہ نہ ہو گا۔" بابر نے بے تکلفی جتاتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہے پھر؟ شاپنگ کے لیے نکلنا تو ہے ہی، پہلے پی سی چلے چلتے ہیں۔"

لٹاتے لٹاتے اب اتنا ہی رہ گیا تھا کہ وہ ڈنر یا لنچ کی بجائے صرف چائے کی آفر کرسکتا مگر آج دعا بھی اور ہی موڈ میں تھی۔

"لیکن چائے پہ تو میں نے آپ کو انوائیٹ کیا ہے۔ اگر آپ گھر پہ نہیں پینا چاہتے تو نہ سہی، باہر چلے چلتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ آج کی چائے میری طرف سے ہو گی۔"

"مگر۔۔۔" اس نے مزاحمت کرنا چاہی۔

"کوئی اگر مگر نہیں۔۔۔ جانتی ہوں آپ کی مردانہ انا کو ٹھیس پہنچے گی مجھے بل ادا کرتے دیکھ کے۔ مگر آپ ادھر دیکھیے گا ہی نہیں یہ فرض کیجیے گا کہ آپ مہمان ہیں اور میں میزبان۔ پھر کیا ہوا جو میں آپ کی مہمان نوازی گھر پہ نہیں کہیں اور کر رہی ہوں۔"

بابر نے بظاہر مروتاً" تکلفاً" مگر دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے یہ آفر قبول کرلی۔

راستے میں دعا نے پوچھا تھا۔

"ویسے آپ نے اچھا نہیں کیا، اس موقع پہ اپنے سسرال سے غیر حاضر رہ کے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میں اپنی وجہ سے کسی کی حق تلفی نہ ہونے دوں گی۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ میری وجہ سے آپ نے انہیں ناراض کیا۔ برا تو لگا ہو گا انہیں؟"

"لگتا ہے تو لگے ہماری بلا سے۔" اس نے یہ فقرہ دل ہی دل میں ادا کیا اور چہرے پہ مکمل بے اعتنائی کے تاثرات سجا کے کہنے لگا۔

"نہیں اچھا ہی کیا لگتا ہے۔ یہ سچ ہے ادا جی کہ دل کا کوئی اعتبار نہیں نہ ہی عشق سارے اگلے پچھلے حساب دیکھ کے نفع نقصان جانچ کے کیا جاتا ہے۔ ہمارے دل کا آپ کے دل سے ربط شاید نصیب میں لکھا جاچکا تھا، آپ ہم سے آج سے بیس سال پہلے ملتیں یا اگلے بیس سال بعد یہ دل آپ کا اسیر ہوتا ہی تھا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر مرد کو گھریلو آسودگی میسر ہو تو دوسرا گھر بسانے سے پہلے وہ ایک بار ضرور سوچتا ہے، محبت کرنے سے پہلے بھلے نہ سوچتا ہو۔ ہمارا گھر بھی کبھی بسا ہی نہیں۔ ہمارے دل کی طرح وہ بھی اب تک اجاڑ، ویران اور بیابان ہے۔ جب اس عورت نے کبھی ہمارے جذبات کا احساس نہیں کیا تو ہم کب تک کریں۔ پتہ ہے ہمیں، برا لگے گا اسے ہمارا نہ آنا آخر ان کی ہمشیرہ صاحبہ کا معاملہ ہے اور معاملہ بھی اونچا۔۔۔ خاصی اچھی جگہ رشتہ جڑ رہا ہے ان کا پتہ نہیں ہمارے خسر صاحب کہاں سے ایسے کاٹھ کے الو ڈھونڈ لیتے ہیں جن میں ہم بھی شامل ہیں۔"

دعا کو ہنسی آگئی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

وہ دونوں اس وقت پی سی میں ہائی ٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ صبح صبح اللہ وسایا نے دعا کو جو خبر سنائی تھی، اس کے بعد جیسے اس کا جی ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ بے دلی سے وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کے اٹھ گئی تھی اور دوپہر کا کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ ایسے میں سہ پہر کو بابر ہمایوں مغل کی آمد اسے اس کیفیت سے نجات کا ذریعہ لگی۔

باہر کی مصروفیت، شوبز کی سرگرمیوں اور آغا جیسی جہاں دیدہ دوستوں نے اسے کافی حد تک بدل دیا تھا۔ پہلے اسے اداسی کو اوڑھے رہنا اچھا لگتا تھا۔ شہزاد کی ذات سے ملنے والا ہر دکھ وہ محبت کی نیاز سمجھ کر قبول کر لیتی تھی لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ وہ قنوطیت کو خود پہ طاری ہونے سے بچاتی تھی۔ بابر کی آمد پہ اس نے شکر ادا کیا اور خود کو اس اداسی سے نکالنے، اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے ساتھ نکل آئی۔ اس کے ساتھ باتوں میں واقعی وہ خاصی ہلکی پھلکی ہو گئی بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ اور اب وہ خاصی بے تکلفی سے ہر چیز سے انصاف کر رہی تھی۔

"مذاق نہیں کر رہے ہم۔" بابر نے ایک اور چکن رول اس کی پلیٹ میں منتقل کیا۔

"ہمارے والد صاحب، جنت مکانی، بے حد جہاں دیدہ اور مردم شناس آدمی تھے مگر نجانے کہاں چوک ہوئی ان سے جو ہمارا رشتہ وہاں طے کر دیا شاید خالی خولی نام کے بدبے یا شرافت سے مار کھا گئے اور بیٹے کے لیے ایک ڈھلتی عمر کی، تعلیم اور تربیت دونوں سے عاری ایک معمولی شکل وصورت کی بیوی پسند کر لائے۔ اب وہ جو صاحبزادی گل

مہر خانم ہیں' یقیناً" شکل و صورت میں یاسمین سے ہزار ہا درجہ بہتر ہیں۔ تعلیم بھی اچھی خاصی ہے مگر مزاج میں اپنی بہن سے کئی گنا زیادہ تیز ہیں۔ اس بھلے آدمی کی تو سمجھیں زندگی کا کباڑا ہونے والا ہے۔ اسی لیے ہم جانا بھی نہیں چاہ رہے تھے' بھئی ہم سے تو کسی معصوم اور شریف انسان کی زندگی برباد ہوتی دیکھی نہیں جاتی۔ ہمیں تو یہ سمجھ نہیں آ رہا یہ رشتہ انہیں ملا کہاں سے اور کیسے "کی ایس پروڈکشن" کا نام تو سن رکھا ہو گا آپ نے؟"

اس کے براہ راست سوال پہ فرائی فش کا پیس منہ تک لے جاتے لے جاتے دعا کا ہاتھ رک گیا۔

"کی ایس پروڈکشن کے کرتا دھرتا شہزاد ملک کا رشتہ آیا ہے ہماری سالی صاحبہ کے لیے۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور دعا نے فرائی فش کا پیس منہ میں رکھ لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس کے لیے کچھ بھی نگلنا مشکل ہو گا۔ حلق میں دور تک کانٹے اگ آئے تھے۔ خود کو بہلانے کی ساری کوششیں غارت ہوتی نظر آئیں صرف اور صرف ایک نام سن کر۔

"نصیب والے ہیں ہمارے خسر صاحب' اپنی ساری شرطیں منوا لیتے ہیں' دوسروں سے چھپا لیتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہماری طرح نواب گھرانے سے ہیں۔ کم ذاتوں میں تو رشتہ جوڑ نہیں سکتے' اس سے تو لڑکی کو عمر بھر گھر بٹھانا گوارا کرتے ہیں۔ شاید ہماری زوجہ بھی اس لیے شادی تک پہنچتے پہنچتے تیس سے اوپر ہو گئی تھیں۔ پھر بھی ہمارے جیسے نجیب الطرفین داماد مل گئے انہیں۔ اسی طرح اب صاحبزادی گل مہر کے لیے بھی شہزاد ملک جیسے نامی گرامی اور اونچے خاندان کے چشم و چراغ کو چن لیا ہے۔ مگر ان کی اپنی حیثیت ان کے شجرہ نسب اور اونچے نام کے پیچھے چھپ ہی جاتی ہے۔ سوائے اس بوسیدہ حویلی' چند باغات کے سوا کچھ بھی نہیں دھرا نواب صاحب میں۔ شہزاد ملک کو نجانے یہ بات پتہ ہے یا نہیں۔"

"شہزاد ملک کو نواب صاحب کی حویلی اور باغات سے کوئی مطلب نہیں۔" وہ عجیب طریقے سے کہنے لگی۔

"ہاں' ہو سکتا ہے۔ انہوں نے صرف اپنے ہم پلہ خاندان دیکھ کے۔۔۔"

"ایک بات بتاؤں آپ کو۔" دعا نے تیزی سے بابر کی بات کاٹی جیسے اب نہ کہہ پائی تو کبھی نہ کہہ پائے گی۔

وہ ہاتھ روک کے سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"شہزاد ملک۔۔۔ میرے فرسٹ کزن ہیں۔" اس کی سرگوشی پہ بابر جیسے اچھل ہی گیا۔

"کیا۔۔۔؟"

"ہاں' میرے سگے ماموں کے اکلوتے بیٹے۔" وہ بابر کی حیرانی کا مزہ لے رہی تھی۔

"آپ کے ماموں؟" اس کی نظروں میں دعا کے طبلہ نواز باپ کا سراپا گھوم گیا جو چلا چلا کے اپنے "اصل" کا اعلان کر رہا تھا۔

چائے کے دونوں کپ آدھے ادھورے پڑے رہ گئے۔

پیسٹریز' پیٹیز اور بروسٹ سے بھری پلیٹیں وہیں رکھی رہیں۔

ان دونوں کو واپس جانے کی جلدی تھی۔

ایک نے جو دھماکا کیا تھا' اسے اس کے اثرات جاننے کی جلدی تھی۔

دوسرا ایک دھماکا کرنے کے لیے اتاؤلا ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا سمجھتے تھے آپ چھاجی۔۔۔ خود کو بہت اونچا ثابت کر پائیں گے اتنی آسانی سے۔

میرے دل نے آپ کو جو مقام دیا تھا' اس سے زیادہ معتبر اور بلند جگہ آپ کو کہیں اور مل بھی نہیں سکتی تھی۔

میرے بارے میں کتنے آرام سے آپ نے یہ پیش گوئی کر دی تھی۔

"تم ادا ہو۔۔۔ اور ادا ہی تمہارا سرمایہ ہے۔ اسی کو بیچتی بیچتی مر جانا تم۔۔۔ کسی عزت دار گھرانے کی بہو تو نہیں

البتہ زیادہ سے زیادہ کسی مالدار بوڑھے کی رکھیل بن جاؤ تو اسی کو اپنے لیے کافی سمجھنا' اس سے زیادہ تم زندگی میں کچھ حاصل نہیں کر سکتیں۔"

مگر چھاجی! آپ کے نصیب میں تو یہ بھی نہیں۔ اگر آج آپ کی اصلیت کھل جائے تو کونسا عزت دار گھرانہ ہو گا جو آپ کو داماد بنانے پہ دل سے راضی ہو۔ یوں تو فی زمانہ پیسے کا رعب ہی بہت ہے۔ جس کی آپ کے پاس کمی نہیں۔ معاشرے میں ایک نام و مقام آپ اپنے بل بوتے پہ تو پیدا کر ہی چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آپ کا پچھلا کھنگالے بغیر آپ کی موجودہ حیثیت پہ ہی راضی برضا ہو جائیں لیکن آپ نے اپنے لیے غلط دروازے کو کھٹکھٹایا ہے چھاجی۔ مغل صاحب نے جو کچھ نواب صاحب کے متعلق بتایا ہے اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی اصلیت ان پہ ظاہر ہونے کی دیر ہے اور بس۔ اور۔"

ایک قہقہہ اس کے کمرے کے سناٹے میں گونج اٹھا تھا۔

"واہ' لطف آ گیا۔۔۔"

بابر ہمایوں مغل کا اندرونی ہیجان اس کے تیز تیز اٹھتے قدموں اور بار بار بے ساختہ پھیل جانے والی مسکراہٹ سے واضح تھا۔

"یعنی کہ صاحبزادہ نفیس علی خان کی دختر نیک اختر' صاحبزادی گل مہر خانم کا رشتہ' ایک ذات کا میراثی پیشہ ور بھانڈ کی سے ہونے جا رہا ہے اور نواب صاحب بے خبر ہیں۔"

دعا کی زبانی وہ شہزاد کا سارا کچا چٹھا جان چکا تھا۔ اس کا پس منظر بھی ماضی بھی اور اس کے والدین کا حوالہ بھی۔

"جس کے باپ دادا میلوں ٹھیلوں اور تہواروں میں ایک دوسرے۔ جگتیں اور پھبتیاں کس کے ایک دوسرے کے ہاتھوں پہ چمڑے کے جوتے کی داد رسید کر کے دو وقت کی روٹی کمایا کرتے تھے اور جس کی ماں تانبے کی گھڑولی بجا بجا کے سر عام سڑکوں پہ ماہیے اور ٹپے گا کر آنہ دو آنہ اکٹھا کیا کرتی تھی وہ صاحبزادہ نفیس علی خان کا داماد بننے جا رہا ہے' ان نواب صاحب کا جو نہ تو خود ناک پہ مکھی بیٹھنے دیتے ہیں نہ ہی ان کی یہ حسین صاحبزادی۔"

گل مہر ہی نہیں بلکہ خود بابر بھی گل مہر سے خار کھاتا تھا۔ اس کی شادی کے وقت اگرچہ وہ خاصی کم عمر تھی مگر مزاج کا طنطنہ تب بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی بابر کے لیے ناپسندیدگی اس کے ہر عمل سے ہویدا تھی اور بابر نے بھی اسے بچی سمجھ کے کبھی درگزر نہیں کیا بلکہ جب بھی موقع ملا اس بات کا گلہ نواب صاحب سے بھی کیا اور یاسمین کو بھی طعنے کی صورت میں جتلا دیا اور اب اسی گل مہر کو مکھی نگلتے دیکھنا اس کے لیے ایک نیا تماشا تھا۔

"ممکن ہے' وہ لوگ اب بھی موجود ہوں۔ ہمیں جلد از جلد پہنچنا چاہیے۔ کتنا مزا آئے گا جب سب کے سامنے ہم اس شہزاد ملک کا بھانڈا پھوڑیں گے۔ اماں یار۔۔۔ کیا زبردست منظر ہو گا۔"

اس نے قریب سے گزرتے رکشے کو ہاتھ دیا۔

"صورت دیکھنے لائق ہو گی نواب صاحب کی اور گل مہر۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ بزعم خود کو حور پری سمجھتی ہے اور سب سے زیادہ تو یاسمین کی حالت دیکھنے کا مزا آئے گا۔ اسے اپنے چچا حضور کی فہم و فراست پہ بڑا ناز ہے ارے اس گھامڑ کو ہمارے جیسا سیدھا سادا چکمہ دے سکتا ہے پھر شہزاد ملک جیسے گھاگ کے لیے مشکل تھا اسے شیشے میں اتارنا جو ساری دنیا کے سامنے کس کامیابی سے بہروپ بھرے ہوئے ہے۔"

جیسے جیسے رکشہ آگے کی جانب فراٹے بھر رہا تھا' ایسے ہی اس کا ذہن تصور و تخیل کے بل بوتے پہ نئے نئے منظر گھڑتا تھا۔ کہیں وہ شہزاد ملک کو اپنے پیروں پہ گر کے گڑگڑاتے دیکھتا۔

کہیں نواب صاحب کو معزز مہمانوں کی بے عزتی کر کے اپنے گھر سے نکالتے ہوئے دیکھتا۔

کبھی صدمے سے نڈھال' ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی گل مہر کو دیکھتا۔

اور کبھی یاسمین کی حیران پریشان صورت۔

اور بعد میں نواب صاحب کا اس کے آگے اظہار ممنونیت۔

"بابر میاں' آپ نے ہمیں کنویں میں گرنے سے بچالیا۔ ہماری بٹیا کی زندگی برباد ہونے سے بچالی۔ ہم عمر بھر آپ کے مشکور رہیں گے۔"

"ہونہہ مشکور۔۔۔ صرف مشکور؟"

یہاں آکے وہ قدرے **ٹھٹھکا۔**

"انہیں ہم اپنا مشکور و ممنون بنا کے بھلا کیا حاصل کر سکیں گے؟ کچھ بھی نہیں' ان کے پاس ہے ہی کیا جو حاصل کرنے کی نوبت آسکے اور ایسا کونسا پیار امنڈ رہا ہے ہمارے دل میں صاحبزادی گل مہر کے لیے جو ہم انہیں برباد ہونے سے بچائیں۔ ہماری بلا سے بھاڑ میں جائے سارا گھرانہ۔ ابھی بتانے میں کیا مزا ابھی بتا دیا تو سارا کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔ بات تو جب ہے کہ صاحبزادہ نفیس علی خان اس کم ذات کو داماد بنا لیں' اس کے بعد ان کی اکڑ توڑنے' ان کو آئینہ دکھانے میں زیادہ تسکین ہو گی۔ ذرا صاحبزادی یاسمین کو بھی پتہ چلے' بابر ہمایوں مغل سے بگاڑ پیدا کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ سالی' جو زہرا گل کے میکے گئی ہے اس کی کڑواہٹ بھی تو نکالنی ہے ہمیں خالی خولی دھما کا کرنے سے کیا حاصل۔"

اس لفظ حاصل کی بار بار تکرار نے اس کے اندر ایک نیا اور اچھوتا خیال پیدا کر دیا۔ وہ خود ہی اپنے اس آئیڈیے پہ پھڑک پھڑک گیا۔

"بس ایک خدشہ ہے کہ کہیں اداجی کا عزیز ہونے کی وجہ سے وہ الٹا ہمیں نہ پھنسا ڈالے۔ یہ نہ ہو کہ اس کا بھانڈا پھوڑتے پھوڑتے ہمارا اپنا بھانڈا پھوٹ جائے۔"

وہ ہاتھ پیر ہلانے کا بے شک قائل نہ تھا مگر ایک جگہ پر بیٹھے بیٹھے جب کوئی شاطرانہ پلان بناتا تو کسی بھی پہلو کو نظر سے اوجھل نہ رہنے دیتا۔

"ویسے اس کا امکان کم ہی ہے۔ اداجی نے بتایا ہے کہ شہزاد ملک نے اپنا نام بنا لینے کے بعد سوسائٹی سے اپنی اصلیت چھپانے کی غرض سے پرانے ملنے جلنے والوں سے اور عزیز رشتے داروں سے مکمل قطع تعلق کر لیا ہے۔ ایسے میں اسے کیسے خبر ہو سکتی ہے کہ ہمارا ان سے کوئی رشتہ بننے جا رہا ہے۔ یا ہم اس کی ایک ایسی عزیزہ سے شادی کرنے والے ہیں جسے وہ منہ لگانے کا روادار نہیں اور بالفرض کبھی علم ہو بھی گیا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا کیا بتائے گا وہ اداجی کو کہ جس سے تم شادی کرنے والی ہو وہ شخص' وہ بابر ہمایوں مغل مجھے۔۔۔؟" وہ پراسرار طریقے سے مسکرا دیا۔

"نہیں' وہ کبھی بھی کسی کو نہیں بتا پائے گا اس میں اتنی جرات ہی نہ ہو گی اور ویسے بھی ہم کونسا یہاں زیادہ دیر تک رکنے والے ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اداجی کے ساتھ نکاح پڑھوا کے اڑن چھو ہو جائیں گے۔ تب تک کے لیے زاد راہ کا بندوبست خود بخود ہو رہا ہے' اس سے کنی کترانا کفران نعمت ہو گا۔"

وہ ایک نتیجے پہ پہنچ گیا اور جیب سے اپنا موبائل نکالا جو چند ہفتے قبل ہی ملک مقبول نے اسے بخشا تھا۔ وہ اپنے کسی واقف کار کا نمبر ملا رہا تھا جس سے شہزاد ملک کا پرسنل نمبر حاصل کرنا بہت آسان تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب تو شکر ہے اباجی کی صحت خاصی سنبھل گئی ہے۔ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا تھا اس لیے بصد شوق شہر آگئے ورنہ یہاں کی آب و ہوا انہیں ذرا بھی موافق نہیں۔ گاؤں کی کھلی آب و ہوا اور صاف ستھرے ماحول کی بات ہی اور ہے۔"

رفتہ رفتہ شہزاد کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

"بجا ارشاد۔" نواب صاحب نے متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا۔ مہمانوں کے آنے سے قبل وہ قدرے بجھے دل کے ساتھ ان کے منتظر تھے۔ صرف گل مہر کی ضد نے انہیں اس مقام تک لا کھڑا کیا تھا ورنہ وہ کبھی بھی مائل نہ ہوتے لیکن اب شہزاد سے ملنے کے بعد خصوصاً" اس کے مودب و مہذب طور اطوار انہیں بہت بھا گئے تھے۔ ان

کے تاثرات اب تبدیل ہو رہے تھے۔

"یہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ ہم خود اس تجربے سے گزر چکے ہیں۔ ہماری چچی حضور اور ہماری خوشدامن۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے' سانس کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ معالج نے انہیں شہر کی کثیف فضا سے دور لے جانے کا مشورہ دیا تھا اور واقعی اس عمل سے ان کے مرض پہ خاطر خواہ اثرات مرتب ہوئے تھے۔"

"لیکن ہر کسی کو تو یہ سہولت میسر نہیں۔" کرم الٰہی نے بہت مدبرانہ رائے پیش کرنا چاہی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی خاموشی بلا جواز اور غیر ضروری حد تک طویل ہے۔ اس غیر معمولی چپ سے نواب صاحب کوئی اور بھی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں اس لیے گا ہے بگا ہے نپے تلے انداز میں اسے گفتگو میں شامل رہنا چاہیے۔

"لاہور اور اس جیسے دوسرے بڑے اور زیادہ آبادی والے شہر تو بیماریوں کا گڑھ بن کے رہ گئے ہیں۔ ہر دوسرا بندہ کسی نہ کسی مرض کا شکار۔ ڈاکٹر تو ساروں کو ہی یہ مشورہ دیتے ہیں کہ کسی پر فضا اور خالص آب و ہوا والی جگہ پہ چلے جاؤ لیکن ہر کوئی جا بھی تو نہیں سکتا۔ سب سے پہلے تو رزق روٹی کی کشش ملنے نہیں دیتی۔ جس جگہ سے بندے کا رزق جڑا ہو' وہ جگہ چھوڑی نہیں جاتی اور دوسرا منہ اٹھا کے بیمار بندہ جائے بھی تو کہاں جائے۔ یا تو جیب میں اتنا پیسہ ہو کہ مری' سوات ہوٹل میں جا کر چند مہینے گزار سکے یا پھر ہماری طرح گاؤں وغیرہ میں رہائش ہو۔"

جتنی طویل بات اس نے کی تھی' اس دورانیے میں شہزاد دم سادھے رہا۔ کبھی بہت سنجیدگی سے اپنا نظریہ بیان کرتے کرم الٰہی کو دیکھتا اور کبھی متانت سے سر ہلا کے سنتے نواب صاحب کو۔ بات ختم ہونے پہ اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی' کرمے نے کہیں کوئی جھول نہ پیدا ہونے دیا تھا۔

"درست فرمایا حضرت' ہمارے باغات بھی شاہدرہ سے آگے ہی واقع ہیں۔ زیادہ دور کا راستہ نہیں۔ وہیں پہ چند ماہ قیام کیا تھا ہماری چچی حضور نے۔"

"ہیں۔۔۔ شاہدرہ کے آگے۔" کرم گرم پکوڑوں سے شغل کرتی بالو یا آواز بلند چونکی۔

"راوی کا پلا لنگ (گزر) کے تو ہمارا پنڈ آتا ہے' ٹوبہ مونگہ۔" اس وقت شہزاد کے سارے پڑھائے سبق وہ پکوڑوں' کبابوں اور چاٹ کے ساتھ ہی ہضم کر گئی تھی۔

"عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہمارے کینو' آم اور جامن کے باغات اسی گاؤں سے متصل ہیں۔ یوں کہیے اس گاؤں ہی کی حدود میں آتے ہیں۔ اب تو نہیں۔۔۔ مگر اس زمانے میں ہمارا خاصا آنا جانا رہتا تھا ٹوبہ مونگہ میں۔ کیونکہ چچی حضور کی وجہ سے ایک مستقل سکونت اختیار کرنے والی بات تھی۔ اس گاؤں کے سبھی سرکردہ لوگوں سے اچھی صاحب سلامت تھی۔ اب تو خیر۔۔۔ کبھی جانا ہی نہیں ہوا۔"

نواب صاحب کی آواز غیر معمولی حد تک دھیمی ہو گئی۔ شاید انہیں کچھ ایسی یادوں نے آن گھیرا تھا جو ان کے لیے قطعی خوشگوار نہیں تھیں۔

ان کی ایسی کیفیت دیکھ کے صاحبزادی حرمت النساء نے اپنی بڑی بہن کی جانب دیکھا۔ وہ سمجھ گئیں کہ اس وقت نواب صاحب کو کس خیال نے ملول کیا ہے۔ صاحبزادی خلعت النساء بھی چھوٹی بہن کی آنکھوں میں یہ دبا دبا سا گلہ دیکھ کے افسردہ ہو گئیں۔

"کیا قسمت ہے آپ کی بھی صاحبزادی حرمت النساء آج شادی کے چھبیس ستائیس سال بعد بھی آپ خود کو اس احساس سے نکال نہیں پائیں کہ آپ نے نواب صاحب کا گھر تو بسا لیا ہے مگر دل میں نہیں بس سکیں اس کی مکین اب بھی۔۔۔"

وہ ہمیشہ اس خیال کو بہن کا وہم قرار دے کر ٹال دیتی تھیں مگر حقیقت کیا تھی' یہ ان سے چھپا ہوا نہیں تھا۔

"اگر آپ لوگ وہاں کے پرانے رہنے والے ہیں تو یہ تو ممکن ہی نہیں کہ بھائی صاحب آپ سے یا آپ کے بزرگوں سے ناواقف ہوں۔"

اپنے تئیں تو صاحبزادی خلعت النساء نے ماحول میں ایک دم پیدا ہو جانے والی بوجھل خاموشی سے گھبرا کے اور

پچھ نواب صاحب کو گزری یادوں کے ملال سے واپس کھینچ لانے کے خیال سے گفتگو کی تھی مگر ان کی اس بات نے گویا سامنے بیٹھے تینوں نفوس کے سر پہ بم پھوڑ ڈالا تھا۔

کرم الٰہی گھبرا کے اپنے بیٹے کی شکل دیکھنے لگا۔

اور بالو۔۔۔ اس میں تو اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی جانب نظر بھی اٹھا پاتی۔ یہ وہی تھی جس نے شہزاد کی ساری کڑی ہدایتیں منٹ میں بھلا کے اپنے گاؤں کا نام بتلایا تھا۔

اور شہزاد۔۔۔ اس کے تو جیسے حواس مختل ہوئے جا رہے تھے۔

بپ بپ۔۔۔ بپ بپ

یہ وہ خطرے کا الارم نہیں تھا جو اس کے اندر بج رہا تھا بلکہ یہ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے سیل فون کی آواز تھی۔

"معاف کیجیے گا۔"

اس وقت اس فون کا آنا غنیمت محسوس ہوا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولتے نواب صاحب سے معذرت طلب کی اور سیل فون آن کیا۔

"ہیلو۔۔۔ شہزاد ملک اسپیکنگ۔"

دوسری جانب سے نجانے کس انداز میں تعارف کرایا گیا کہ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"کیا بکواس ہے؟ کون ہو تم؟"

وہ سرگوشی کے سے انداز میں غرایا ساتھ ہی کن انکھیوں سے سب کو دیکھا۔ کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا لیکن اس کی کال آنے کی وجہ سے وقتی طور پہ گفتگو کا رخ ضرور تبدیل ہو گیا تھا۔ اب صاحبزادی حرمت النساء کے اشارے پہ دلگیر ایک بار پھر مہمانوں کے کپ گرم چائے سے بھر رہا تھا۔ موتیا کے ہاتھ کی بنی خوشبودار چائے کے ایک کپ سے کسی کی سیری ہونا مشکل بات تھی۔

"شٹ اپ۔" اس نے فون دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ دوسری طرف جو بھی تھا اس نے کوئی ایسی بات کہی تھی کہ شہزاد کے ماتھے کی شکنیں مستقل ہو گئی تھیں۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

"کون تھا یہ شخص اور مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کیوں کر رہا تھا؟" اس کا دماغ الجھا ہوا تھا۔

"عرصہ ہو گیا مگر ہمیں آج بھی یاد ہے۔ ٹوبہ مونگہ کے مکین کس قدر کشادہ دل اور پر خلوص تھے۔ ہم وہاں کے رہائشی نہ تھے۔ ہجرت کر کے لکھنؤ سے آئے تھے۔ بالکل مختلف تہذیب، بالکل جداگانہ تمدن۔ ہمارا رہن سہن، بول چال سب ایک دوسرے سے مختلف تھا لیکن خلوص کی شاید اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ ایک الگ رشتہ ہوتا ہے وہاں کے باسیوں نے ہمیں کھلے دل سے اپنایا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم وہاں مستقل رہنے نہیں آئے بلکہ عارضی طور پہ صرف علاج کی نیت سے ٹھہرے ہیں اس کے باوجود انہوں نے ہماری اور ہمیں اپنی خوشی غمی میں شریک رکھا۔"

سیل فون ایک بار پھر بج اٹھا۔

صاحبزادہ نفیس علی خان خاموش ہو گئے اور شہزاد کا چہرہ دیکھنے لگے۔ ناچار اسے کال ریسیو کرنی پڑی۔

"کیوں حضرت، بات تو پوری سن لی ہوتی۔" وہی جان جلاتی آواز۔

شہزاد لب بھینچ کر دزدیدہ نظروں سے سب کے چہرے دیکھنے لگا چونکہ نواب صاحب نے اس کے فون کی وجہ سے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی اس لیے سب غیر ارادی طور پہ اس کی جانب متوجہ تھے۔ کمرے میں صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ بات وہ جانتا تھا اس لیے خاموش رہ کے سننا زیادہ بہتر جانا۔

"کہو۔"

"یعنی۔۔۔ نشر کریں۔" دوسری جانب بھونڈا سا قہقہہ لگایا گیا۔

"جتایا تو ہے آپ کو حضور کہ ہماری کچھ عجیب سی عادت ہے، کسی کو ریکارڈ توڑنے کا شوق ہوتا ہے تو کسی کو قسمیں وعدے توڑنے کی عادت۔ ہمیں دوسروں کا بھرم توڑنے میں بہت لطف ملتا ہے۔ ہمیں اڑتی اڑتی خبر ملی تھی کہ جناب شہزاد ملک صاحب جو حقیقت میں ماضی کے مسخرے بلبلہ کے بیٹے اور جدی پشتی نامی گرامی بھانڈ بادشاہ کے پوتے ہیں، وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ خود کو زمیندار کرم الٰہی ملک کے چشم و چراغ بتلاتے ہوئے صاحبزادہ نفیس علی خان کی صاحبزادی کا رشتہ طلب کرنے چلے ہیں۔ بخدا ہم سے رہا نہیں گیا۔ ہم کب سے مچل رہے ہیں کہ جلد از جلد آپ کا یہ بھرم سب کے سامنے توڑ سکیں۔ آدھے سے زیادہ راستہ تو سمجھیں کٹ ہی گیا، آپ کو رکشہ کی آواز سنائی دے رہی ہے؟۔۔۔ پھٹ پھٹ پھٹا پھٹ پھٹ۔۔۔ یہی آواز چند منٹ تک آپ کو نواب صاحب کی حویلی کے سفید دروازے کے باہر سنائی دے گی۔ نہ، نہ۔۔۔ نہ صاحب، ہمیں اس لطف سے محروم مت کیجیے گا ایک ہی تو شغل ہے ہمارا۔ ہم بیچاروں کو اس واحد عیاشی سے تو محروم نہ کیجیے۔ آپ منت کریں گے، اللہ رسولؐ کے واسطے دیں گے پیار سے منانا چاہیں گے سب بے کار ہو گا ہم بندے ہیں ذرا مستقل مزاج آپ اپنی ناشائستہ زبان میں ڈھیٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب آپ دوسرے ہتھکنڈے آزمانے کی سوچ رہے ہوں گے۔ ہمیں ڈرا دھمکا کے۔۔۔ خطرناک نتائج سے آگاہ کر کے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے مگر افسوس، یہ بھی بے سود رہے گا۔۔۔ اوہو۔۔۔ اب کیجیے تو کیا کیجیے سوچتے ہیں ہم بھی سوچتے ہیں کیا حل نکالا جائے آپ پہ عنقریب ٹوٹنے والی اس افتاد سے بچاؤ کا۔"

وہ مسلسل ہانک رہا تھا اور شہزاد کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بکواس سن رہا تھا۔ منتظر تھا کہ کب وہ اپنا مقصد واضح کرے گا۔ اس کی لچھے دار گفتگو اور دیدہ دلیری سے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، محض کسی ذاتی دشمنی یا حسد و رقابت کی وجہ سے اس کی جان نہیں کھا رہا تھا بلکہ وہ کوئی پیشہ ور بلیک میلر ہے۔

"ہاں ایک حل ہے۔۔۔ آپ کی بھی جان بچ جائے گی اور ہمیں بھی آسرا ہو جائے گا۔ اگر آپ منہ بند رکھنے کے عوض ہمیں چند لاکھ عنایت کر دیں تو۔۔۔ دیکھیے جناب، آخر ہمیں کوئی دوسرا شغل۔۔۔ کوئی دوسری تفریح تلاش کرنے کا بہانہ تو چاہیے۔"

"کتنا؟" مصلحتاً اس نے مختصر ترین الفاظ میں معاملہ نمٹانا چاہا۔

"پانچ لاکھ۔"

"کب؟"

"جناب ابھی، اسی وقت ورنہ ہمارے رکشے کا کرایہ ضائع جائے گا۔ لیجیے ہم حویلی پہنچ گئے۔۔۔ خدایا اس قدر مہنگائی؟ کیا بنے گا ہم سفید پوشوں کا پورے اسی روپے اینٹھ لیے اس رکشے والے نے۔ خیر اس کا ہم الگ حساب نہیں کریں گے۔ ایسے تھوڑدل بھی نہیں۔ یہ ہم چہل قدمی کرتے دائیں جانب نکل رہے ہیں۔ بغلی گلی بل کھا کے اس چھوٹے سے پارک کی جانب آنکلتی ہے۔ گرمی تو بہت ہے مگر کیا کیا جائے۔ یہیں بیٹھ کے آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔ ذرا جلدی آئیے، دس منٹ سے ایک بھی منٹ اوپر ہوا تو ہم خود آ جائیں گے۔"

"فی الحال ممکن نہیں۔"

"یہ غضب مت کیجیے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ غضب تو آپ پہ ہو جائے گا۔" اس نے اچانک پینترا اور لہجہ بدل لیا۔ اب وہ مکمل اور واضح طور پہ دھمکی دے رہا تھا۔

شہزاد کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس وقت گل سے دور ہونے کے ڈر سے زیادہ اسے لوگوں میں تماشا بن جانے کے خیال سے زیادہ خوف محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے اسے شرفا کی محفل میں برہنہ کیے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو۔

"کل تک انتظام ہو جائے گا تب تک۔۔۔"

"نہیں تب تک نہ انتظار۔۔۔ نہ صبر ہاں تب تک کے لیے ایڈوانس ضرور لے سکتے ہیں ہم۔ بھئی کاروباری

شخص ہیں آپ' خالی جیب تو گھر سے نہ نکلے ہوں گے۔ آپ آیئے تو سہی' ہمارے نصیب کا جو ہے وہ ہمیں مل ہی جائے گا۔"

شہزاد کے پاس اس وقت تیرہ چودہ ہزار کیش موجود تھا۔ اس نے آئی بلا ٹالنے کی غرض سے فی الحال اتنا ہی اس بلیک میلر کے منہ پہ مارنے کا فیصلہ کیا۔

"اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے' تو کیا میں صرف دس منٹ کے لیے اجازت طلب کر سکتا ہوں۔"

اس نے بے حد مودب انداز میں صاحبزادہ نفیس علی کو مخاطب کر کے کہا۔ اگرچہ اس نے اپنی پریشانی چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن پھر بھی نواب صاحب کی جہاں دیدہ نظروں سے چھپ نہ سکا۔ وہ اس موقع پہ اس وقت اس کے جانے کی اجازت طلب کرنے پہ حیران تو ہوئے مگر اس کی صورت دیکھ کے کوئی سوال نہ کیا۔

"تو ہم کہہ رہے تھے کہ ٹوبہ موتگہ میں بہت سے رفقاء کی صحبت میسر رہی اور ہم ان میں سے نہیں جو عزیزوں کو فراموش کر دیں۔ غم روزگار نے دوبارہ وہاں کا رخ نہیں کرنے دیا یہ ایک افسوسناک امر ہے مگر وہاں کا ایک ایک فرد آج بھی اپنے تمام تر خلوص کے ساتھ ہمیں یاد ہے۔"

نکلتے نکلتے شہزاد نے صاحبزادہ نفیس علی خان کی بات سنی۔ باہر کی جانب بڑھتے اس کے قدم لمحہ بھر کو تھم سے گئے۔ اس کا دل کسی جانے پہچانے سے خوف نے جکڑ لیا مگر دوسری جانب آوازیں دیتا ڈر زیادہ بھیانک تھا۔

"آج آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے تو خود بخود وہ سادہ و بے ریا چہرے ذہن میں جگمگانے سے لگے ہیں۔ آپ تو اب بھی وہیں سکونت پذیر ہیں' واقف ہوں گے کہ ان میں سے کون اب کہاں ہے' کس حال میں ہے۔ ماسٹر ہدایت اللہ تھے جن کی زوجہ سے ہماری چچی حضور کا بہناپا قائم ہو گیا تھا۔ وہ تو لاولد تھے' پتہ نہیں اب ان کا گھر آباد بھی ہے یا۔۔۔ اور امام مسجد نور دین' علم کا خزانہ تھے واللہ جمعتہ المبارک کا خطبہ تو ایسا بصیرت افروز دیتے تھے کہ ہم بطور خاص جمعتہ المبارک کی نماز ادا کرنے لاہور سے آیا کرتے تھے۔ چودھری فضل بخش یاروں کے یار تھے' بہت خاندانی اوصاف کے حامل۔۔۔ تندور کی ماچھن مائی بختے نے ہماری چچی حضور کی بہت خدمت کی تھی' خدا انہیں اس کا اجر دے گا اور وہ میراثی اللہ دتا۔۔۔ دن میں کئی بار خبر گیری کے لیے۔۔۔"

اچانک جیسے ان کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ وہ جھنجھنا سے اٹھے۔ ذہن میں آئے اس خیال کو انہوں نے بے یقینی سے جھٹلانا چاہا مگر ایسا نہ کر سکے۔

وہی لغزش وہی آواز وہ ہو بہو اس وقت کے اللہ دتا کی تصویر تھا۔

نواب صاحب نے آنکھیں سکوڑ کے سامنے دیکھا۔ میراثی اللہ دتا کے نام پہ کسمسا کے پہلو بدل لینے والا اکرم الہی اب ان کی اچانک خاموشی اور کھوج لینے والے انداز پہ بے انتہا گھبراہٹ کا شکار تھا۔

"اللہ دتا۔۔۔ اگر ہم غلطی پہ نہیں تو۔۔۔"

انہوں نے اپنی شہادت کی انگلی اس کی جانب کی تھی اور وہ لرزتے قدموں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

● ● ●

"تم ہو کون؟"

شہزاد نے بھنویں سکیڑ کر پھنکارتے لہجے میں پوچھا۔

"ہم کون ہیں' یہ جاننا آپ کے لیے زیادہ اہم نہیں۔ بس یہ دھیان رکھیے کہ "آپ" کون ہیں' یہ ہمارے علاوہ اور کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔" وہ اپنی ازلی ڈھیٹ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے صبر کا امتحان لے رہا تھا۔ اس کا بے پناہ اعتماد شہزاد کو باور کرا رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے' صرف زبانی ڈراوے نہیں دے رہا بلکہ سچ مچ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

درمیانی قامت اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک یہ صاف رنگت اور کھڑے مغلائی نقوش والا شخص تیسرے عشرے کی انتہا کو چھو رہا تھا یا عمر کے چوتھے عشرے کے آغاز میں تھا' اس کا اندازہ مشکل لگتا تھا۔ ہلکے بھورے بال

شاید آج ہی ترشوائے گئے تھے اور شیو بھی تازہ کیا ہوا تھا' نفاست سے استری کی ہوئی کاٹن کی گہری سلیٹی رنگ کی کریز رنگت میں بیٹھ کے آنے کے بعد بھی خراب نہیں ہوئی تھی۔ سفید اور سلیٹی دھاری دار کاٹن کی شرٹ کے کالر' کف اور رنگ کا مدھم پڑنا یہ بتا رہا تھا کہ یہ شرٹ کثرت استعمال کی وجہ سے ساری خوبصورتی کھو بیٹھی ہے مگر صاف ستھری اور بے داغ ہونے کے ساتھ ساتھ کلف اور جما کے کی گئی استری بھی بتا رہی تھی کہ اسے پہننے والا اپنے لباس اور ٹپ ٹاپ کے بارے میں کتنا محتاط اور نفاست پسند ہے۔ اس کی انگلیوں میں سلگا ہوا سگریٹ دبا تھا' خوبصورت بناوٹ والے لب کثرت سگریٹ نوشی کے باعث سیاہ پڑ رہے تھے مگر ان کی مسکراہٹ کی دلکشی ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ لب و لہجہ انتہائی رواں' شستہ انداز بیاں محتاط اور مہذب' اپنے طور اطوار اور ظاہر سے وہ کسی بھی طرح کوئی چھٹا ہوا بدمعاش یا جرائم پیشہ نہیں لگ رہا تھا کہ شہزاد اس سے خوف زدہ ہوتا۔ مگر وہ ہو گیا۔۔۔

کیونکہ بابر ہمایوں مغل کے چہرے پہ سجی دو آنکھیں وہ واحد چیز تھیں جن سے اس کا اندر چھلک جاتا تھا۔ ان مکار و عیار اور کسی حد تک سفاک آنکھوں میں اپنا شکار دیکھ کے جو چمک پیدا ہوتی تھی وہ شہزاد ملک جیسے تجربہ کار سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ بے شک وہ پیشہ ور مجرم یا اجرتی قاتل نہیں' مگر وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اگر اس کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو اس پہ عمل کرنے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہ لگائے گا' اس کا ہاتھ اپنے والٹ کی جانب گیا' ہزار اور پانچ سو کے نوٹ اس نے بغیر گنے خاموشی سے اس کے آگے کر دیے۔

سگریٹ کا کش لگاتے بابر کی پیشانی پہ ناگوار سے بل نمودار ہوئے۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھانے کی بجائے پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیا اور ابرو اچکا کے اس رقم کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ کیا ہے حضت؟" (حضرت)

"فی الحال اتنا ہی ہے۔"

"اتنے ہلکے تو آپ نہیں جتنا خود کو ثابت کر رہے ہیں۔ جتنی تگڑی اسامی ہے اس لحاظ سے تو جیب جھاڑنے پہ لاکھ دو لاکھ نیچے گر جانے چاہئیں۔"

"آج کل کون لاکھ دو لاکھ جیب میں ڈال کے پھرتا ہے۔" شہزاد نے سلگ کے کہا۔

"چیک بک تو ڈالی جا سکتی ہے ناں جیب میں۔ یا طبع نازک پہ اس کا بار بھی گراں گزرتا ہے؟"

"یہ بارہ تیرہ ہزار ہیں تم سے خوفزدہ ہو کے نہیں' بلکہ تم پر ترس کھا کے دے رہا ہوں۔ اسی کو غنیمت سمجھو۔ یہاں آیا تو تھا ایک بلیک میلر کی دھلائی کر کے اس کے سر سے بھوت اتارنے۔ مگر تمہیں دیکھ کے لگا کوئی سفید پوش' ضرورت مند مجبوری کے ہاتھوں اس حد تک آ پہنچا ہے۔ شکل و صورت سے تو خاندانی ہی لگتے ہو' اس لیے ترس آ گیا۔"

"شکل و صورت کا کیا ہے حضور' اس پہ مت جایئے۔ شکل و صورت سے تو آپ بھی خاندانی ہی۔۔۔" وہ جلانے والے انداز میں مسکرایا اور واقعی شہزاد ملک کے تن بدن میں آگ ہی تو بھر گئی۔

"رہا ترس کھانے کا سوال تو شوق سے کھایئے۔ مگر ہم سے امید مت رکھیے گا اس قسم کی جوابی کارروائی کی۔ ہمیں ترس نہیں آتا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' تم مجھ سے' شہزاد ملک سے پانچ لاکھ روپیہ نکلوا سکتے ہو؟"

"بے شک۔" بابر نے چیلنج قبول کیا۔

"یہ اتنا آسان نہیں۔ یہ جو چند ہزار میں تمہارے منہ پر مار رہا تھا' اچھا ہوتا تم اسے ہی چوم چاٹ کے قبول کر لیتے۔" شہزاد نے رقم واپس رکھی۔

"اب تمہیں مجھ سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکتی۔" اس نے پلٹنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ بابر اچھل کے سامنے آ گیا۔

"ہاتھ آیا شکار ہم نے کبھی چھوڑا نہیں جناب۔۔۔ اور آپ کو بھی یہی مشورہ دیں گے۔"

"کیسا مشورہ؟"

"یہی کہ اتنا اچھا موقع یوں ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ بڑے میاں کی عقل اس وقت خبط ہوئی لگتی ہے اور صاحبزادی کے حواس تو آپ کے عشق نے گم کیے ہوئے ہیں۔ داؤ چل گیا تو نسل سنور جائے گی آپ کی ورنہ وہی ڈوم' مراثی' بھانڈ۔"اس نے قہقہہ لگایا۔ شہزاد کی دم گویا اس کے پیر تلے آ گئی۔ وہ بلبلا اٹھا۔

"بکواس مت کرو۔"

"عرض۔۔۔ جناب عالی' عرض کیا تھا ہم نے۔"اس نے انگلی دکھاتے ہوئے تنبیہ کی۔

"ذرا الفاظ دیکھ بھال کے استعمال کیجیے' ہم برا جلدی مان جاتے ہیں' ہاں تو پھر کہیے۔۔۔ کاٹتے ہیں ابھی کے ابھی ایک عدد چیک یا ہم حاضری دیں نواب صاحب کے ہاں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے تم جا کے نواب صاحب سے کوئی بھی انٹ شنٹ بات کرو گے اور وہ یقین کر لیں گے؟ میری ایک ساکھ ہے سوسائٹی میں اور تم۔۔۔ تم کیا ہو؟ ایک راہ چلتے۔۔۔ اٹھائی گیرے۔۔۔ نو سر باز۔۔۔ وہ بھلا کیوں تمہاری بات کا اعتبار کرنے لگے۔"

"اس لیے کہ فی الحال ہم آپ کے مقابلے میں تو مضبوط حیثیت ہی رکھتے ہیں' وہ حیثیت جسے پانے کے لیے آپ ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔"

شہزاد کی بے حد اکسا دینے اور مشتعل کر دینے والی بات کا رد عمل تھا کہ اس جیسا ٹھنڈا رہ کے چالیں چلنے والا شخص بھی بلبلا کے وہ بات اگلنے لگا' جو فی الحال ظاہر کرنا اس کے مفاد میں نہ تھا۔

"کیا مطلب؟"شہزاد کو کھٹک پیدا ہوئی۔ ویسے بھی اس اجنبی دشمن کا مرصع لب و لہجہ اسے پہلے ہی وہم میں مبتلا کر رہا تھا کہ ہو نہ ہو' اس شخص کا تعلق نواب صاحب کے خاندان یا ملنے والوں میں سے ہو گا۔ مگر جو انکشاف بابر کرنے جا رہا تھا' اس کا تو اسے گمان بھی نہ گزرا تھا۔

"مطلب یہ کہ ہم' یعنی کہ ہم' بابر ہمایوں مغل ولد نایاب شمشیر مغل' صاحبزادہ نفیس علی خان کے داماد ہیں' بڑے اور فی الحال اکلوتے داماد۔"

"کیا؟"شہزاد ملک کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہاں' اور اس میں اس قدر حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ آپ کو دیکھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب صاحب کی تقدیر دامادوں کے معاملے میں ذرا خراب ہی ہے۔"وہ دل ہی دل میں اس راز کے قبل از وقت افشا ہو جانے پہ کچھ پریشان ضرور ہوا تھا مگر ظاہر نہ کیا۔

شہزاد ملک کتنی ہی دیر تک کچھ بول نہ سکا دراصل اب اسے یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ اسے اس شخص کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھنا چاہیے۔ اس کا جس گھرانے سے رشتہ تھا' اسی گھرانے سے وہ خود بھی رشتہ قائم کرنے جا رہا تھا۔ دوسری طرف ان کا آمنا سامنا ایسے حالات میں ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا' لیکن اب اسے خاصا سنبھل کے بہت محتاط ہو کر بات کرنے کی ضرورت تھی۔

"میرا یقین کرو' واقعی اس وقت میرے پاس چیک بک نہیں ہے۔"

"آدمی خاندانی ہوتے تو ہم خالی خولی زبان کا بھی اعتبار کر لیتے۔"بابر نے سفاکی سے ایک اور چرکہ لگایا جسے صبر کے ساتھ پی جانا شہزاد کی مجبوری ٹھہرا۔

"خیر ایسے معاملات میں رسک تو لینا ہی پڑتا ہے مگر یہ یاد رہے' آج اگر کوئی حوصلہ کن فیصلہ ہو بھی جائے تو زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا مطالبہ پورا کرنے میں ذرا بھی آنا کانی دکھائی تو ہم عین نکاح کے وقت بھی تمہارے سر پہ آسمان گرا سکتے ہیں' یاد رہے۔"

☆ ☆ ☆

جو کچھ ہوا' وہ اس کے وہم و گمان سے بہت آگے کی چیز تھی۔

اور اب جو اس نے دیکھا' وہ اس کی قوت برداشت سے باہر کی بات تھی۔

اول تو عین اس موقع پہ ایک اجنبی کا فون کر کے اسے بلیک میل کرنا ہی ایک ناگوار اور غیر متوقع امر تھا' مزید یہ کہ وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ اس کے ہونے والے سسرال کا ہی ایک اہم فرد تھا۔ ابھی وہ اس جھٹکے سے سنبھل ہی نہیں پایا تھا کہ واپسی پر نواب صاحب کی حویلی پہنچنے پہ ایک اور منظر اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لینے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

لکڑی کا بڑا سا پھاٹک نما گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ڈھلتی شام کی نارنجی شعاعیں اس پہ گڑی لوہے کی میخوں پہ عجیب بارعب طریقے سے منعکس ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی گاڑی اس کھلے گیٹ سے اندر لے جانے کو تھا جب دالان کی لال اینٹوں والی چوڑی سیڑھیوں پہ اس نے اپنے باپ کو ایک دم گرتے ہوئے دیکھا۔ وہ اندازہ نہیں کر پایا کہ کرم الٰہی کو ٹھوکر لگی تھی چکر آیا تھا۔۔۔ یا۔۔۔ کوئی اور وجہ تھی اس کے اس طرح لہرا کے گرنے کی۔

وہ گاڑی کو یونہی اسٹارٹ ہی چھوڑ کے باہر نکلا اور تیر کی طرح اس نے دونوں جانب بنے سرسبز قطعات کے درمیان سرخ اینٹوں کی بنی سات فٹ چوڑی اور اٹھائیس فٹ لمبی سڑک عبور کی۔

"باجی۔۔۔"اس نے بالو کی مدد سے سیڑھیوں پہ اوندھے منہ گرے کرم الٰہی کو بازوؤں میں اٹھانے کی کوشش کی۔

"اماں۔۔۔ کیا ہوا ابا جی کو۔۔۔؟"وہ فکرمندی سے باپ کو ٹٹول رہا تھا کہ کہیں گرنے سے کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔

"بتاتیں کیوں نہیں اماں اور آپ لوگ باہر کیوں آئے؟ ہمیں آنے دیتیں۔۔۔"اس کے ساتھ ہی اسے نہ صرف بالو کی خاموشی کا احساس ہوا بلکہ اس بات کا بھی کہ وہ تینوں اس وقت یہاں اکیلے تھے۔ اور جس گھر کے وہ مہمان تھے' اس گھر کا کوئی مکین اس وقت آداب میزبانی نبھانے کو ان کے قریب نہ تھا۔ کسی بد ترین انہونی کا اندیشہ کالے ناگ کی طرح اسے سرسراتا ہوا چھو کے گزر گیا۔ وہ جھرجھری لے کے سیدھا ہوا۔

"اماں؟"اس نے ضبط کرتی بالو سے ایک لفظ میں استفسار کیا۔

"پتا نہیں کیسے پتر۔۔۔ مگر ان لوگوں کو پتا چل گیا۔"بہت دھیمی آواز میں اس نے بتایا۔

اور شہزاد ملک نے زندگی میں پہلی بار ماں کی اتنی آہستہ آواز سنی تھی۔

"بس شہزادے' دھکے دینے کی کسر رہ گئی تھی۔ بڑا ذلیل کیا اس نواب نے تیرے پیو کو۔ یہ اونچے شملے والے یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ جن کی عزت زیادہ ہو' بے عزتی کرنے کا حق بھی زیادہ ان کا ہی ہوتا ہے۔ اور جو ہمارے زیادہ عزت نہیں کما پاتے۔ ان کی بے عزتی کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو پڑتا ہے۔ شہزادے ہمیں بھی فرق پڑتا ہے بے عزتی سے۔ ذرا حالت دیکھ اپنے پیو کی۔ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا ہے۔ لے چل اسے اس عزت والی حویلی سے دور۔"

وہ دوہائیاں دے رہی تھی۔

"شہزادے تو سنتا کیوں نہیں۔ کیا باپ کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔"

اسے پتھر کی طرح سیڑھیوں پر دو زانو حالت میں دیکھ کے بالو نے اسے گریبان سے پکڑ کے جھٹکے دیے۔ وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ نظریں بازوؤں میں بے دم پڑے باپ پہ پڑیں تو پتلیوں میں جان پیدا ہوئی۔

اس نے اپنے بازوؤں میں باپ کے وجود کو اٹھایا اور وہاں سے چل پڑا۔

☆ ☆ ☆

"اوقات سے باہر ہونا اور نمک حرامی کرنا اس ذات کی خاصیت ہے۔ اپنی بے عزتی خود کروانے کے اسباب پیدا کرنا اس کے خون میں شامل ہے۔ اس بیچ خون اس رذیل نسل سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔"

صاحبزادہ نفیس علی خان اپنے دل کی بھڑاس نکالتے نہ تھک رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے

سامنے لرزتے کانپتے وجود' پیلے چہرے اور بندھے ہاتھوں والے اس شخص کے پرخچے اڑا کے رکھ دیں' جس کی اصلیت ابھی ابھی ان کے سامنے کھلی تھی۔

"صاب۔۔۔ صاحب۔۔۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔" کرم الٰہی نے ہاتھ جوڑ کے ایک بار پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ بڑھاپے اور بیماری نے اس کی یادداشت تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ وہ واقعی اپنے سامنے کروفر سے بیٹھے اس نواب کو پہچان نہ سکا تھا جس سے وہ کئی بار اپنے سگے چاچے کے گاؤں میں ملا تھا۔ توبہ مونگہ کا مراثی اللہ دتا اس کا چچا تھا اور اتفاق کی بات تھی کہ کرم الٰہی اپنے چچا سے حددرجہ مشابہ بھی تھا۔ شاید نواب صاحب کی یادداشت میں وہ بھولا بسرا چہرہ تازہ نہ ہوتا اگر جو اس کے نین نقش ہوبہو کرم الٰہی جیسے نہ ہوتے۔ اس عمر میں آ کے تو وہ اللہ دتہ کا دوسرا روپ لگنے لگا تھا۔ ویسا ہی تنکا سا وجود' ویسا ہی سیاہیاں گھلا پیلا چہرہ' وہ چرخ ہاتھ پیر۔۔۔ اس مماثلت کے ذہن میں آتے ہی اچانک نواب صاحب کے قابلِ رشک حافظے میں یہ بات بھی تر و تازہ ہو گئی کہ اس میراثی کا ایک بھتیجا کرم الٰہی نام کا بھی تھا جس سے وہ خود بھی تین چار بار سرسری طور پر مل چکے تھے۔ میراثی اللہ دتا کو بڑا افسوس تھا کہ اس کے بھتیجے نے خاندان' ذات برادری چھوڑ کے ایک دوسری ذات یعنی چنگڑ ذات کی گڑوی بجانے والی سے شادی کر لی ہے۔ تب صاحبزادہ نفیس علی خان نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا۔

"کیا تمہارے ہاں بھی خاندان' حسب نسب کو اولیت دی جاتی ہے اللہ دتا؟" تب لفظ حسب نسب پہ انہیں خود ہی ہنسی آ گئی تھی۔ بھلا اس کے اپنے خاندان کی کیا حیثیت ہے اس معاشرے میں جو وہ کسی دوسرے کی ذات پہ چار حرف رکھ رہا ہے۔

"کیوں نہیں نواب صاحب۔" اللہ دتا نے ان کے سرخ و سفید دھلے دھلائے صاف ستھرے پیر اپنی گود میں رکھ کے دباتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم جدی پشتی میراثی' وہ گلی گلی ناچ گا کے کمانے والی قوم۔ ہماری جڑ ہے جبکہ وہ کہیں بھی جھگی گاڑھ کے چند دن گزارنے والے خانہ بدوش۔ نہ کوئی نام و نشان' نہ حسب نسب اور تو اور کلمہ دین بھی کوئی نہیں ان کا۔ ہم کم ذات سہی' اللہ رسولؐ کو ماننے والے تو ہیں۔ ہماری بھی کوئی عزت ہے۔"

اور اس کے اتنے زعم سے کہنے پہ تب کے نوجوان صاحبزادہ نفیس علی خان اپنی مسکراہٹ اس سے چھپا گئے تھے یہی بہت تھا۔ تب صرف اس کا دل رکھنے کی خاطر ہی "بے شک" جیسا مختصر سا الفاظ ادا کرنا بھی ان کے لیے دوبھر ہوا تھا۔ انہیں تو اللہ دتا کی خوش گمانیوں پہ ہی ہنسی آ رہی تھی' اس کی دل آزاری نہ ہو اس لیے چپ رہے ورنہ پوچھنا چاہتے تھے۔

"میاں' جب بھرے مجمع میں اپنے ہی باپ دادا کے ہاتھ پہ چمڑے کی جوتی مار کے اس کے خاندان کے اگلوں پچھلوں کی مٹی پلید کرنے والی جگتیں کستے ہو' نازیبا کلمات ادا کر کے پھکڑپن کے دلدادہ لوگوں کو واہیات تفریح مہیا کرتے ہو تب تمہاری عزت کہاں دفن ہوتی ہے۔"

لیکن کہا نہیں۔ صرف یہ سوچ کر کہ اگر وہ اس گمان میں ہے' اس پستی میں بھی خود کو توپ سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے' ہمارا کیا لیتا ہے۔

تب وہ میراثی اللہ دتا کی اس خوش فہمی پہ ہنس کے چپ ہو سکتے تھے مگر اس کے خاندان کے ایک اور فرد کی جسارت ان کے نزدیک ناقابلِ معافی تھی۔ اللہ دتہ تو صرف اپنی حیثیت میں مگن راضی بارضا تھا جبکہ یہ۔۔۔ یہ اپنے مقام اور اوقات سے بہت آگے کی چیز پہ ہاتھ رکھنے کا گناہ گار ہو چکا تھا' وہ کیسے آسانی سے اسے بخش دیتے۔

"تمہارے باپ دادا ہماری جوتیاں سیدھی کرتے مر گئے' اور تم۔۔۔ تمہاری اتنی جرات کہ ہمارے خاندان کی بیٹیوں پہ نظر رکھو۔ مخمل کے قالین میں ٹاٹ کا پیوند تو پھر بھی لگ ہی جاتا ہو گا' بھلے ذوق پہ گراں ہی کیوں نہ گزرے مگر غلاظت سے لتھیڑنا کوئی پسند نہیں کرتا اور تم سر سے پیر تک غلاظت ہو۔۔۔ اس معاشرے کے تھوکے ہوئے' روندے ہوئے سب سے رذیل شخص' تمہاری جرات کیسے ہوئی اپنے گندے خون والے بیٹے کے لیے ہماری

صاحبزادی کی خواہش کرنے کی۔" وہ گرج رہے تھے۔

ایسا تو نہ تھا کہ کرم الٰہی نے زندگی میں کبھی کسی کی بری بھلی سنی ہی نہ تھی۔ عزت کروانے والے دن تو زندگی کے وہی تنتی کے چند سال تھے جب شہرت کا عروج دیکھا تھا ورنہ آنکھ کھولنے سے ہوش سنبھالنے تک اور پھر دوبارہ عروج سے زوال تک جاتے جاتے زمانے کی ہر ٹھوکر کھائی تھی۔ واقعی نواب صاحب درست کہہ رہے تھے' اس کے خون میں ہی حمیت کم تھی اسی لیے تو ابتداء ہی سے وہ گالیوں' پھبتیوں' طنز و طعنوں کا عادی ہو گیا تھا۔ بے عزتی سہہ جانا اس کی گھٹی میں تھا۔ یہی تو ان کا خاندانی وصف تھا جس پہ وہ ناز کرتے تھے۔ غیرت و خودداری سے بھلا بھانڈ کا کیا تعلق واسطہ۔۔۔ غیرت کرے گا تو کمائے گا کہاں سے۔ خود کو دوسروں کے سامنے حقیر ثابت کر کے ہی تو دو وقت کی روٹی کماتے رہے ہیں اس کے دادا پردادا۔۔۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس وقت نواب صاحب کی باتیں اس کے دل میں نیزے کی انی کی طرح چبھتی جا رہی تھیں' شاید اس لیے کہ اسے یہ اپنی نہیں شہزاد کی بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے اس بیٹے کی' جس نے اپنے خون کا اثر ذرا بھی تو نہ لیا تھا۔ اپنی ذات پہ ذرا سا بھی چھینٹا آتا دیکھ کے وہ بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ اور اس وقت وہ خود کو نہیں اپنے بیٹے شہزاد کو نواب صاحب کے سامنے رکھ کے محسوس کر رہا تھا۔ ان کی باتیں اپنے دل سے نہیں اس کے دل سے برداشت کر رہا تھا۔ لہٰذا دل کا تو یہی حال ہونا تھا۔

کوئی دم جاتا تھا کہ وہ کھڑے پیروں گر جاتا۔ سب سے پہلے حواس باختہ بلقیس کی نظر اس پہ پڑی۔

"کرمے۔۔۔ کرمے۔۔۔"

اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے تو وہ اسے ہسپتال سے گھر لائی تھی۔ اس نے واویلا کر دیا۔ نواب صاحب نے ناگواری سے اس عورت کی آہ و زاری سنی۔ صاحبزادی خلعت النساء اور صاحبزادی حرمت النساء پہلے ہی صورتحال بھانپ کر مہمان خانے سے نکل گئی تھیں اور مرکزی برآمدے کے تخت پہ ٹکی اندر کے طوفان کے اندازے لگا رہی تھیں۔ نواب صاحب کا گرجنا برسنا پوری حویلی میں سنائی دے رہا تھا۔ موتیا کچن میں گلاس دھو رہی تھی جب یہ طوفان اٹھا تب سے وہ صابن لگا گلاس ہاتھ میں تھامے ساکت کھڑی تھی۔ گل مہر اپنے کمرے کی دہلیز پہ ہی ساکت کھڑی تھی۔ دلگیر مہمان خانے کے دروازے سے یوں لگ کھڑا تھا کہ سارا وجود تو باہر تھا صرف سر اندر نکال کے جائزہ لے رہا تھا' صرف عمیص تھا جو بار بار اپنے چچا حضور کو چپ کرانے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ بالو کی چیخ و پکار پہ اس نے کرمے کی جانب دیکھا۔

"چچا حضور' خدا کا واسطہ ہے بس کیجیے' یہ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں۔"

"اب تو کچھ بھی اچھا نہیں صاحبزادہ عمیص میاں۔" وہ دھاڑے۔

"ہماری دہلیز ناپاک ہو گئی ہے۔ کل تک جو ہمارے دوار (دروازے) نذرانے وصولنے آتے تھے' آج رشتہ جوڑنے چلے آئے۔ ہمیں ہماری ہی نظروں میں کم حیثیت کر کے رکھ دیا ہے اس پنچ انسان نے۔ کاش اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک خون معاف کیا ہوتا تو ہم اپنے ہاتھ ناپاک کر لیتے مگر اسے اس جسارت کا مزا چکھا دیتے۔"

"کرمے۔۔۔" بالو نے بروقت اس کے ٹوٹے شہتیر کی مانند گرتے وجود کو اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ کرم الٰہی کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ چہرے پہ شدید تکلیف و اذیت کے تاثرات تھے اور جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

"بس کیجیے چچا حضور۔۔۔ ان کی طبیعت اچھی نہیں معلوم ہوتی' خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو۔۔۔"

"نہیں ہوتا۔ اگر یہ ہمارے ہاتھ سے زندہ بچ رہا ہے تو پھر اسے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ نہیں جانتے صاحبزادے' یہ بہت ڈھیٹ اور بے شرم قوم ہے۔"

"مگر۔۔۔" وہ ایک بار پھر ان کی توجہ کرم الٰہی کی غیر ہوتی حالت کی جانب مبذول کرانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی وہ دوبارہ شروع ہو گئے۔

"اب تم جاتے ہو یا ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں جس کے تم عادی ہو' اور جس کے تم مستحق ہو۔ اٹھاؤ

اس جھوٹ کے پلندے گندگی کے ڈھیر کو یہاں سے۔ خاندانی ڈرامے باز۔۔۔" انہوں نے اس کی نیم بے ہوشی کو ڈراما قرار دیا اب کی بار وہ بالو سے مخاطب تھے۔

"رب نہ بن صاحب 'رب سے ڈر۔"

بالو کی بھرائی آواز نے عمیص کو بے چین کر دیا۔

"آپ اندر چلیے چچا حضور۔" وہ ان کا بازو تھام کے مہمان خانے سے باہر لے جانے لگا۔ نکلتے نکلتے اس نے پردے کی اوٹ میں چھپتے ہوئے دلگیر کو آنکھ سے ایک اشارہ دیا۔

وہ تو یوں بھی عمیص کے اشاروں سے آشنا تھا فوراً "بھانپ گیا۔ اس کے نواب صاحب کو لے کر باہر جاتے ہی وہ ایک لمحے میں اندر آیا اور کرمے کو اٹھانے میں بالو کی مدد کرنے لگا۔

"تیرا ککھ نہ رہے نواب کے بچے۔ بابو کرمے کے نیم مردہ وجود کو سنبھالنے میں ہلکان ہوتے ہوئے کوسنے اور بد دعائیں دینے پہ اتر آئی۔

"شش۔۔۔" دلگیر نے اپنے پان سے رنگے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے اسے خاموش کرا دیا۔

"چپ رہو نواب صاحب کے غضب کو آواز مت دو بے وقوف عورت۔"

"بے وقوف ہو گی تیری ماں 'تیری ہوتی سوتی۔" بالو نے دو ہتھڑ اس کی استخوانی کمر پہ دے مارا۔ وہ بلبلا کے پرے ہٹا۔

"اوئی اللہ۔۔۔"

"تیرا نواب تو خود آواز دے رہا ہے اللہ کے غضب کو۔ جا اسے جا کر سمجھا۔ میرے سر کے سائیں کو کچھ ہو گیا تو میں بد دعائیں دے دے کر عرش ہلا دوں گی۔ تیرے نواب کا نام و نشان نہ رہے گا 'جس نام و نشان پہ اکڑتا پھر رہا ہے۔ مر جاتا۔"

"گستاخ۔۔۔ بے ادب۔۔۔ جا خود ہی گھسیٹ۔"

دلگیر پہ اپنے نواب صاحب کی شان میں گستاخی سخت گراں گزری اور اس نے تلملا کے داخلی دروازے سے پہلے ہی کرمے کو چھوڑ دیا اور خود پیر پٹختا واپس چلا گیا۔

اندر گول کمرے میں دیوان پہ بیٹھے صاحبزادہ نفیس علی خان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ عمیص موتیا کو آواز دے کر پانی طلب کر رہا تھا لیکن اس وقت ان کے قریب آنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ دلگیر لپک جھپک کے نواب صاحب کے سب سے پسندیدہ چاندی کے گلاس میں ان کا مرغوب مشروب تھا دل ڈال کے لے آیا۔

عمیص نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر چچا حضور کو پیش کرتے "برا چکا کے دلگیر سے کچھ پوچھا۔ جواباً" وہ ناگواری سے شانے جھٹک کے اور سر ہلا کے رہ گیا۔

"غصہ تھوک دیجیے چچا حضور 'جو ہوا برا ہوا مگر اب اسے بھول جانا ہی بہتر ہو گا۔ اس تکلیف دہ ذکر کو بار بار دہرانا اور بھی برا ہو گا۔"

اس نے بصد اصرار گلاس ان کے لبوں سے لگایا اور نامحسوس طریقے سے ان کے قریب سے ہٹ گیا۔ وہ گلاس آدھا خالی کر کے دلگیر کو تھما چکے تھے اور دیوان پہ نیم دراز 'آنکھیں موند کے چہرے پہ دایاں بازو موڑ کے رکھ چکے تھے۔ وہ دبے پاؤں مہمان خانے کی جانب آیا اور وہاں سے باہر نکلنے والے دروازے کی جانب بڑھا۔

وہ اپنے چچا حضور کے رد عمل کو فطری سمجھ رہا تھا۔ یقیناً ان جیسے شخص کے لیے یہ صورت حال ناقابل یقین حد تک اشتعال انگیز تھی اور انہیں جس قدر بھی طیش آتا وہ کم تھا۔ مگر دوسری جانب اسے اس بزرگ انسان سے بھی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کسی اعلیٰ نسب گھرانے کا فرد نہیں تھا۔ اس بزرگی میں اس نے جو ہتک سہی تھی 'وہ عمیص جیسے حساس انسان کا دل درد سے بھرنے کے لیے کافی تھا۔ اگر چچا حضور کے مزید برانگیختہ ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو شاید وہ اسی وقت آگے بڑھ کے اس کے بے ہوش ہوتے وجود کو سہارا

دے دیتا کہ انسانیت کا تقاضا تو یہی تھا مگر اس نے دانستہ خود کو اس ہمدردی سے باز رکھا "اس کا نتیجہ اور بھی برا نکل سکتا تھا۔ جو بھی تھا "انسانی ہمدردی اپنی جگہ 'مگر فطری محبت اور خون کی کشش اپنی جگہ صاحبزادہ نفیس علی خان سے اس کا رشتہ اس بات کا متقاضی تھا کہ فی الحال وہ ان کی خوشنودی کا خیال کرے۔

موقع ملتے ہی وہ اس شخص کی مدد کرنے کی نیت سے نکلا مگر لکڑی کے گیٹ سے شہزاد ملک کی گاڑی اندر آتے دیکھ کے رک گیا۔

اسے باپ کی جانب متوحش انداز میں بڑھتے دیکھ کے وہ چپ چاپ واپس پلٹ گیا اور جانے سے پہلے دروازہ بند کرنا نہیں بھولا۔

☼ ☼ ☼

پان کھائے سیاں ہمارو

ململ کے کرتے پہ چھینٹ لال لال

وہ گنگناتا 'سیٹیاں بجاتا اندر داخل ہوا 'یوں تو اس کا بالکل بھی ارادہ نہ تھا 'یاسمین کے کہنے پہ یہاں حاضری لگوانے کا "اور وہ بھی گل مہر کے سلسلے میں 'جس سے وہ ویسے ہی خار کھاتا تھا 'دوسرا اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ یاسمین نے اس کی تازہ ترین سرگرمیوں سے جو اپنے بھائی کو آگاہ کر دیا ہے 'کہیں وہ لگے ہاتھوں اس سے باز پرس ہی نہ کرنے لگے۔ عمیص کی تو چلو خیر تھی اس کے لئے وہ کس کھیت کی مولی تھا ڈر تھا تو یہ کہ نواب صاحب کو بھنک نہ پڑ جائے۔ وہ ان سے دبتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں یہاں آ رہا تھا تو مقصد صرف صورت حال کا جائزہ لینا تھا۔ وہ اپنے وضع دار اور رعب داب والے سسر کے چہرے پہ اطمینان اور خوشی کے وہ تاثرات دیکھنا چاہتا تھا جو اب کچھ ہی دن کے مہمان تھے۔

"ململ کے کرتے پہ چھینٹ لال۔۔۔ لال۔۔۔"

اس نے اپنی بھاری جیب سہلائی۔ اور جھومتا جھومتا کار چوبی کا دروازہ دھکیل کر گول کمرے میں داخل ہوا۔ پہلا قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھک کے رک گیا تھا۔ اندر کا ماحول غیر معمولی حد تک سنگین محسوس ہوا۔

صاحبزادی حرمت النساء کا مغموم و ملول چہرہ۔۔۔

صاحبزادی خلعت النساء کی سبز آنکھوں کے بھیگے گوشے اور سختی سے بھینچے لب۔

موتیا کا اترا چہرہ۔۔۔

عمیص کا متردد اور متفکر انداز فرش پہ سر نیہوڑائے خلاف معمول خاموش بیٹھا دلگیر۔۔۔

اور۔۔۔

سب سے بڑھ کے صاحبزادہ نفیس علی خان کے تیور۔۔۔

وہ لمحے بھر کو دہل کے رہ گیا۔

"کہیں ہم سے چوک تو نہیں ہو گئی۔ ایک تو وہ سالا 'ڈوم کا بچہ 'تاؤ دلا گیا اور ہم چاہتے ہوئے بھی یہ بات اگل بیٹھے کہ ہمارا اس گھر سے کیا رشتہ ہے۔ کہیں وہ رذیل یہاں سارا کچا چٹھا کھول تو نہیں گیا؟ اگرچہ اس کا امکان ہوتا تو نہیں چاہیے تھا۔ کوئی اپنے پیر پہ بھی خود کلہاڑی مارتا ہے کیا؟ مگر سٹھیائے ہوئے شخص سے جو توقع بھی کی جائے وہ کم ہے۔ ہو سکتا ہے خود غرض ہو کر اس نے سوچا ہو 'اب یہاں دال گلنے والی نہیں اور اگر میرا کام نہیں بنتا تو اس کا بھی بنا بنایا بگاڑ دو۔۔۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔"

قریب تھا کہ وہ چپکے سے کھسک لیتا کہ دلگیر نے اسے دیکھ کر گویا نعرہ بلند کیا۔

"بابر میاں تشریف لائے ہیں۔"

اپنے اپنے دھیان میں گم۔۔۔ سب افراد نے چونک کے سامنے دیکھا اور بابر نے نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھا ہوا قدم دوبارہ زمین پہ رکھ لیا اور اندر داخل ہو گیا۔ دل تھا کہ دھڑکنے کی بجائے سکڑتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مسکرانے

کی کوشش میں وہ اس وقت اول درجے کا ہونق لگ رہا ہوگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر سب کے چہروں کے تاثرات کا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا۔

موتیا نے پہلے سے ڈھکے ہوئے سر پہ آنچل درست کیا اور

عمیص نے تعظیماً "اٹھ کے سلام پیش کیا تھا۔

صاحبزادی **خلعت النساء** اس کے سلام کے جواب میں ہاتھ آگے بڑھا کے دعا دی۔

جبکہ صاحبزادی **خلعت النساء** نے **دلگیر** کو حکم دیا کہ وہ یاسمین کو بابر میاں کی آمد سے مطلع کردے۔

اور تو اور صاحبزادہ نفیس علی خان بھی اپنے تناؤ سے بھرپور چہرے پہ ایک تھکی تھکی سی خیر مقدمی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوگئے۔

"آیئے بابر میاں۔"

اس کا حوصلہ بڑھا۔ فضول کے اندیشوں اور بے کار کے وسوسوں کو اس نے جھٹکا اور ہلکا پھلکا ہو کے آگے بڑھا۔

"آداب چچا حضور' مزاج بخیر؟ لگتا ہے ہم وقت سے پہلے ہی آگئے ہیں۔ ہم ناحق شرمندہ ہو رہے تھے کہ آپ کے بتائے وقت پہ نہ پہنچ سکے اور ہماری اس تاخیر سے مہمانوں کے سامنے آپ کو عذر پیش کرنا پڑ رہا ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے مہمان ابھی خود ہی نہیں پہنچے۔"

اس نے یہ کہتے ہوئے بغور دیکھا کہ صاحبزادی **خلعت النساء** کی پلکیں اس بات پہ کچھ اور نم ہوگئی تھیں اور نواب صاحب کے چہرے کی رنگت کچھ اور پھیکی ہوگئی تھی جبکہ موتیا چپکے سے وہاں سے نکل گئی۔

"یا پھر ہم کچھ زیادہ ہی تاخیر سے آئے ہیں۔" وہ ہر طرح سے ٹٹول کر اصل صورتحال سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔

"ایسی بات نہیں صاحبزادے۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئے۔ یوں جیسے مزید کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ یا تامل ہو رہا ہو کہ اسے اصل واقعہ بتائیں یا نہ بتائیں۔۔۔ بتائیں تو کس طرح بتائیں اور چھپائیں تو کیسے چھپائیں۔

"ہم کسی غلط موقع پہ تو نہیں آگئے؟"

بابر ہمایوں مغل بھی ایک ڈھیٹ انسان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو یہ جان کر مصلحتاً" خاموش ہو جاتا کہ ضرور اہل خانہ اس سے کوئی بات چھپانا چاہ رہے ہیں لیکن وہ مسلسل کرید رہا تھا۔

"ہمارا مطلب ہے کہ اگر کوئی بہت ہی نجی قسم کا مسئلہ ہے تو یقیناً اس وقت ہماری موجودگی آپ پہ گراں گزر رہی ہوگی۔ ہمیں اجازت دیجیے چچا حضور ہم پھر حاضر ہو جائیں گے۔"

بڑے ناز نخرے کے ساتھ اس نے اس بات پہ اپنی ناراضگی جتائی کہ اس سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔

دلگیر کے ہمراہ چائے اور اس کے لوازمات اندر لاتی صاحبزادی حرمت النساء نے مزاج دار داماد کی یہ بات سنی تو ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"بیٹھیے ناں بابر بیٹا' خدانخواستہ ہم پہ آپ کی آمد کیوں گراں گزرنے لگی۔ آپ کو دیکھ کے تو آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے آخر آپ ہماری صاحبزادی کے سرتاج ہیں۔ آپ کا آنا ہمارے لیے عزت کا باعث ہے یہ تو آپ کے چچا حضور کی طبیعت اچانک کچھ ناساز ہوگئی' اس لیے سب پریشان ہوگئے۔ آپ بیٹھیے' چائے نوش کیجیے۔"

وہ بڑے تکلف کے ساتھ بیٹھ تو گیا' چائے کی پیالی بھی تھام لی مگر اب بھی منتظر تھا کہ کب اصل بات پتہ چلے۔ وہ تہیہ کر چکا تھا کہ اب اپنی جانب سے مزید سوال نہ کرے گا' کم از کم ان مہمانوں کے بارے میں نہیں۔ وہ تو چور کی داڑھی میں تنکا والی بات ہوتی گویا۔

"خیریت تو ہے چچا حضور' نصیب دشمناں' کیا ہوا آپ کی طبیعت کو؟ موسم کی سختی کے باعث ناساز ہوگئی یا بلند فشار خون کا عارضہ پھر شدت پکڑ گیا ہے؟"

"کہیے بابر کیا حال ہے۔" وہ بامشکل بولے۔ اس وقت کوئی بھی بات' کسی سے بھی کرنے کو طبیعت آمادہ نہ

ہو رہی تھی مگر مقابل بابر ہمایوں مغل تھا۔ ان کا داماد۔

"اب عمر ایسی ہوگئی ہے کہ نہ موسم کی سختی نرمی جھیل پاتی ہے نہ ہی کوئی خلاف معمول واقعہ برداشت ہو پاتا ہے۔" وہ داہنے ہاتھ سے اپنا سینہ مسل رہے تھے۔ جہاں ضبط کے باعث اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔

"خدانخواستہ۔۔۔ ؟ ہمارا مطلب ہے ایسی کیا خلاف معمول بات ہوئی جو آپ کو ناگوار گزری؟"

وہ رہ نہ سکا۔ اس کے مسلسل کن سوئیاں لینے کے انداز پہ **عمیص** نے بدمزہ سی نظروں سے اسے دیکھا۔ یاسمین بھی آچکی تھی اور اپنے شوہر نامدار کی جرح کے جواب میں اپنے چچا حضور کو جز بز ہوتے دیکھ چکی تھی۔ **عمیص** کو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیا کہ وہ معاملہ سنبھال لے۔

"آپ تو چچا حضور کا مزاج جانتے ہیں اور ان کے اصولوں سے بھی واقف ہیں۔ کسی واقف کار کی وساطت سے گل مہر کے لیے رشتہ آیا تھا اگرچہ ہم نے واضح کر دیا تھا' پھر بھی۔۔۔ پھر بھی یہ لوگ نجانے کیا سوچ کے جھوٹ کے پلندے اٹھائے چلے آئے۔ اسی وجہ سے چچا حضور کچھ اپ سیٹ ہیں۔"

عمیص نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تھا کون یہ ناہنجار۔۔۔ ہمیں تو یاسمین نے بتایا تھا کہ کوئی بہت اونچا اور مالدار گھرانہ ہے۔ مشہور شخصیت' کامیاب انسان وغیرہ۔۔۔ وغیرہ۔۔۔"

"دولت آجانے سے خاندان اونچا نہیں ہو جایا کرتا' بابر میاں۔" نواب صاحب گویا ہوئے۔

"بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔ بجا فرمایا۔" اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

یاسمین کو وہ یوں ڈرامے کرتا ہوا زہر لگ رہا تھا۔ اس وقت اسے اس کے وہ سارے بیان یاد آرہے تھے جو وہ اس کی موجودگی میں چچا حضور کی شان میں دیا کرتا تھا۔

"کوئی نو دولتیے تھے' سمجھ رہے تھے سکوں کی چمک اور جھنکار دکھا کے ہمیں لبھا سکیں گے۔ ہماری نظر سیر ہے۔ ان آنکھوں نے اتنا سونا چاندی دیکھ رکھا ہے کہ اب ہماری اگلی سات نسلوں کی آنکھوں میں یہ پتھر نہیں جچ سکتے' دکھ تو اس بات کا ہے کہ۔۔۔"

اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ داماد کے سامنے شاید کچھ ضرورت سے زیادہ "کھل" رہے ہیں۔ ایک دم خاموش ہونے کے بعد وہ اور کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگے۔ دو ٹوک گفتگو کرنے والے نواب صاحب بات پلٹنے کے فن سے ناآشنا تھے۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے چچا حضور۔" اس نے اکسایا۔

"قصہ مختصر یہ کہ ان لوگوں کو واپس لوٹا دیا گیا' بات ختم۔" **عمیص** نے اس کا تجسس ختم کرنے کی نیت سے کہا۔

"آپ یہ رول چکھ کے دیکھیے' اور داد دیجیے موتیا کی ہنرمندی کی۔۔۔ ایمان سے بالکل کسی اعلیٰ درجے کی بیکری کے لگ رہے ہیں۔" اس نے پلیٹ آگے بڑھائی۔

"یہ بیکری ہی کے ہیں۔" موتیا نے برجستہ جواب دیا۔ صاحبزادہ نفیس علی خان کے تنے ہوئے چہرے پہ بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ پیالیوں میں چائے انڈیلتی موتیا کو بغور دیکھنے لگے۔

"چلو قصہ ہی ختم' اچھی بھلی ایک امید بندھی تھی چند لاکھ کمانے کی' وہ بھی ہاتھ سے گئی۔ اب وہ شہزادہ ملک بھلا کیوں ہمیں کچھ دینے دلانے لگا۔ جس چیز کے حصول کے لیے وہ ہمارے اشاروں پہ ناچ سکتا تھا' ہمارے آگے ناک سے لکیریں نکال سکتا تھا' وہ تو اب اس کی دسترس سے دور ہوگئی ہے۔ جانتا ہوگا کہ اب پانچ لاکھ چھوڑ' پانچ کروڑ بھی ہمیں دیدے تو ہم تو کیا' ہمارے فرشتے بھی نواب صاحب کی ناں کو ہاں میں نہیں بدل سکتے۔ اف یہ تھی ہماری قسمت۔۔۔ چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی' چند دن کا سامان تو ہو گیا۔"

وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

دوسری جانب صاحبزادہ نفیس علی خان کچھ اور سوچ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کُڑیے۔۔۔ نی اوراں آنی۔"

اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ ابا کی چیخ و پکار نے خلل ڈال دیا۔

"پتا نہیں کون آیا ہوگا۔" اس کے خوابیدہ ذہن نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ کال بیل کی لگاتار آواز بھی اس کی نیند میں گونجتی رہی تھی۔

"دروانہ کھول پتر۔" ساتھ ہی دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹے جانے کی آواز پہ دعا نے بمشکل خود کو بستر سے اٹھنے پہ آمادہ کیا۔

"آرہی ہوں ابا جی۔"

بکھرے بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے اس نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ نیند سے ڈولتے جسم کے ساتھ کہیں کا پیر کہیں پڑ رہا تھا۔

"کیا ہوا ابا جی، خیریت تو ہے کون آگیا آدھی رات کو؟"

"خیریت کتھے؟ فون آیا ہے تیری مامی کا۔"

"فون۔۔۔؟ تو وہ فون کی بیل تھی۔ اتنی رات گئے مامی کا فون؟" نیند کا غلبہ کچھ کچھ ٹوٹ رہا تھا۔

"اتنی رات کب ہوئی۔ گیارہ بجے ہیں مشکل سے۔ اس مغل سے مل کے آنے کے بعد تو بھی آج جلدی بستر پہ پڑ گئی تھی۔ چل شاوا، چھیتی ہو جا، منہ پہ پانی کا چھینٹا مار، کپڑے بدلنے ہیں تو دو منٹ لگا اور نیچے اتر آ، ہسپتال جانا ہے۔"

"ہسپتال؟" اس کی نیند، ہوش سب کچھ بھک سے اڑ گئے۔ سراسیمگی چہرے سے ٹپکنے لگی۔

"ہاں، تیرے مامے کو دوسری بار دورہ پڑا ہے اور بھرجائی بتا رہی تھی کہ اس بار دل کے دورے کے ساتھ ساتھ فالج کا بھی حملہ ہوا ہے۔ ڈاہڈی خراب حالت ہے۔ چل، باتوں میں وقت نہ گزار، زندگی کا کیا پتا، وقت پہ پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔ اک ویلا گزارا ہے میں نے کرمے کے ساتھ، سالا تو وہ میرا بعد میں بنا تھا پہلے تو یار بیلی تھا۔ اچھا نہیں لگے گا جے میں ویلے پہ پہنچ نہ سکا اس کے آخری وقت پہ اس کے قریب نہ ہوں۔"

اسے مخاطب کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر اپنی ہی ہانکنے کی عادت تھی۔ اس وقت بھی اسے ذرا احساس نہ ہوا کہ اس کے بے رحم الفاظ نے دعا پہ کیا اثر کیا تھا۔ وہ وہیں زمین پہ دو تہ مار کے رونے بیٹھ گئی۔

"او جھلیے، ہمت کر، دعا کر اپنے مامے کے لیے۔ چل شاوا میرا بچہ۔" وہ اس کا سر سہلا کے اسے بہلانے لگا۔

آج پہلی بار اسے بیٹی کا اپنے ماموں کے لیے پیار برا نہیں لگ رہا تھا۔

"اسی لیے کہتا ہوں ڈرائیور رکھ لے۔ مگر تو مانے تب ناں۔ تیرا تو خیال ہے، بڈھا بس بکواس کرتا رہتا ہے بس چپ کرکے سنتے جاؤ۔"

غم سے نڈھال دعا سے واقعی ڈرائیونگ نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس لیے اللہ وسایا نے چڑ کے کہا مگر پھر اس کی بیچارگی دیکھ کے ذرا دل موم ہوا۔

"آرام سے، آرام سے۔۔۔ ایسی کوئی جلدی نہیں۔" گاڑی کیمپس کی نہر سے گزر رہی تھی۔ شکر ہے کہ شہر کا یہ حصہ رات کے اس پہر ٹریفک کے اژدحام سے آزاد ہو جاتا ہے ورنہ جیسی ڈرائیونگ دعا کر رہی تھی ایکسیڈنٹ ہونا تو یقینی تھا۔

"پتا نہیں کیا ہوا ہوگا کرم الٰہی کے ساتھ۔" اللہ وسایا نے ایک بار پھر اپنی تجزیاتی گفتگو کا آغاز کیا۔

"آج تو اس نے شہزادے کے شگن کرنے جانا تھا۔ دوپہر تک تو بڑا خوش تھا اچھا بھلا۔"

اس کی بات پہ دعا کے اندر کچھ کلک ہوا۔

"آپ جانتے ہیں بابر صاحب شہزاد ملک میرے کزن ہیں، فرسٹ کزن۔"

پتا نہیں کس رو میں بہہ کے وہ بغیر سوچے سمجھے یہ راز اگل گئی تھی۔

جو بات پوشیدہ رکھی جائے وہ راز ہی تو کہلاتی ہے۔

اسے نہ سہی، شہزاد کو تو اس تعلق پہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی، وہ تو اسے ظاہر نہ کرنے کے حق میں تھا۔ پھر اس لحاظ سے تو یہ رشتہ، یہ تعلق ایک راز ہی تھا جسے اس نے کھول دیا۔ پتا نہیں اس کے اس عمل کے پیچھے اس کی نیت کیا رہی ہوگی۔

کیا وہ ارادتاً یا غیر ارادتاً شہزاد ملک کی راہ میں کانٹے بچھانا چاہتی تھی۔

اگر ایسا تھا بھی تو اسے یہ خبر تو نہ تھی کہ شہزاد کو اس کی چاہت سے دور کرنے کی کوشش میں اور وہ اپنے عزیز از جان ماموں کو موت کے قریب کر دے گی۔

"ہو نہ ہو، ماما جی کی اس حالت کی وجہ یہی بات رہی ہوگی۔ اصلیت کھل جانے اور مقصد پورا نہ ہو سکنے کی ساری جھنجلاہٹ چچا جی نے بیچارے ماما جی پہ نکالی ہوگی۔ مجھ سے زیادہ چچا جی کی زبان کی کڑواہٹ کا کسے پتا۔ جب زہر اگلنے پہ آتے ہیں تو سامنے والے کا اندر باہر نیلا کرکے رکھ دیتے ہیں۔ میں ہی ڈھیٹ تھی جو اتنے کچوکے سہہ گئی۔ ماما جی میں اتنی سکت کہاں رہی ہے اب۔ نہیں چچا جی۔۔۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

اس نے "ڈاکٹرز ہاسپٹل" کی پارکنگ میں بمشکل جگہ ڈھونڈ کے کار پارک کی۔

"اچھا تو شاید میں نے بھی نہیں کیا۔ ماما جی کی جو حالت ہے۔ اس کی وجہ کہیں میں تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری وجہ سے۔۔۔ میرے اتاولے پن کی وجہ سے جو راز کچھ عرصہ اور راز رہتا تھا، قبل از وقت فاش ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میں کیا منہ دکھاؤں گی چچا جی کو۔ پہلے ہی ان کے دل میں میری جانب سے میل ہی میل بھرا ہے اب تو میں ان کی دو جگہ مجرم ہوں۔ ایک ان کی چاہت کو ان کی دسترس سے دور کرنے کے لیے اور دوسری ماما جی کے لیے۔"

"کیسی طبیعت ہے کرمے کی؟ ہوش آیا کہ نہیں۔"

اللہ وسایا کی آواز پہ وہ خیالوں سے چونکی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کب وہ آئی سی یو کے باہر پہنچی اور اب مامی جی کے سامنے تھی۔

"مامی جی۔۔۔ میرے ماما۔۔۔ میری ماں کی آخری نشانی۔" وہ ان کے گلے لگ کے بلک بلک کے رو دی۔ بالو نے بڑی ہمت سے خود کو مجتمع کرکے رکھا ہوا تھا۔ دعا کا رونا بلکنا دیکھ کے وہ پھر سے بکھر گئی۔

"میرے ماما جی کو کچھ نہیں ہو سکتا مامی جی۔ اللہ مجھے اتنا تہی داماں نہیں کر سکتا، وہ کسی کو بھی خالی ہاتھ نہیں رکھتا، دیکھنا ماما جی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میری ماں نے دنیا میں میرے لیے ایک ہی تو سوغات چھوڑی تھی۔"

"ہاں میری رانی، اللہ تیری زبان مبارک کرے، تیرے مامے کو لمبی حیاتی دے۔" بالو نے اس کے آنسو پونچھے۔

"پر بھرجائی یہ قیامت ٹوٹی کیسے؟ تم لوگ تو پتر کا شگن لے کے جا رہے تھے، کہیں وہاں پہ تو کوئی اونچ نیچ نہیں ہوئی؟" اللہ وسائے کو دل کی بات زیادہ دیر تک دل میں رکھنے کا تجربہ نہ تھا۔ اس کے سوال پہ بلقیس کا رنگ واضح طور پہ پھیکا پڑ گیا۔

"نن۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ نہیں دیر۔۔۔ اونچ نیچ کیسی اصل میں تو ہم لوگ ابھی وہاں پہنچے ہی نہ تھے، راستے میں ہی کرمے کی حالت بگڑ گئی تو ہم ہاسپٹل آ گئے، تب سے ڈاکٹروں کے ہتھے چڑھا ہوا ہے، نجانے کیا کر رہے ہیں۔ ملنے بھی نہیں دیتے۔"

وہ سسکیاں لینے لگی۔ عقب سے شہزاد نے آ کے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھا۔

"بس کیجیے اماں۔ دعا کیجیے، ابا خطرے سے باہر نکل آئیں۔"

اس آواز پہ روتی ہوئی دعا نے بازوؤں کے حلقے سے سر اٹھا کے سامنے دیکھا۔ وہی دشمن جان اپنی تمام تر

وجاہت اور تمام تر کھورپن کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔

قیمتی سوٹ شکنوں سے پر تھا۔ ٹائی کی ہر وقت نفاست سے بندھی ناٹ ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ آنکھیں لال۔۔۔ اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کے سامنے صوفے پہ بیٹھی دعا کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ اللہ وسایا کے کسی سوال کے جواب میں بھی محض گردن ہلانے پہ اکتفا کیا تھا۔

"شہزادے' وہ دیکھو وڈا ڈاکٹر' ذرا پوچھ اس سے۔" آئی سی یو سے ڈاکٹر کو نکلتے دیکھ کے بالو نے بے تابی سے کہا۔

شہزاد ان سے بھی زیادہ بے تابی سے آگے بڑھا۔ چند منٹ کچھ گفتگو کرنے کے بعد جب وہ پلٹا تو چہرے پہ اطمینان و خوشی کے رنگ نمایاں تھے۔

"ابا جی کو ہوش آگیا ہے۔ وہ اب خطرے سے باہر ہیں لیکن فالج کی وجہ سے دایاں حصہ متاثر ہو گیا ہے۔"

"ربا تیرا لکھ کروڑ واری شکر اے۔ تو نے میرے سر کے سائیں کی زندگی لوٹا دی۔"

بالو جھولی اٹھا کے شکرانہ ادا کرنے لگی۔

دعا شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے لیے فوراً" وضو کرنے چلی گئی۔ اللہ وسایا شہزاد کے قریب آگیا۔

"اللہ سوہنے کا شکر ہے۔ اس نے میرے یار کی' میرے ویر کی جان ہمیں بخش دی اور میرے شہزاد کو اکیلا ہونے سے بچالیا۔ اکلوتے پتر کو باپ کا سہارا بہت ہوتا ہے۔"

اس نے دل سوزی سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بے اعتنائی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتا لیکن آج اللہ وسایا کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ آج اس کے سیاہ رو چہرے پہ خباثت اور مکاری کی بجائے اپنے باپ کے لیے فکر اور تردد نظر آیا۔ وہ متاثر سا ہو گیا۔

"بس دعا کرنا پھوپھا۔"

"پھوپھا۔۔۔" اللہ وسایا بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ بلاشبہ آج شہزاد نے برسوں بعد اسے اس کے رشتے سے پکارا تھا۔ جس سے وہ اپنی پھوپھی کی زندگی میں اسے پکارا کرتا تھا۔

شہزاد چند قدم اٹھا کے آئی۔ سی یو کے شیشے کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک وقت میں ایک ہی شخص کو اندر جانے کی اجازت تھی۔ اس وقت بالو اندر تھی اور وہ باہر سے اس کے چہرے پہ دم بدم اترتا سکون دیکھ رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا ورنہ پچھلے کچھ گھنٹوں میں تو وہ غم سے نچڑ کے رہ گئی تھی'

"صاحبزادہ نفیس علی خان' جتنے چرکے آپ نے میرے باپ کو لگائے ہیں' ان سب کا حساب میں ایک ہی وار میں لے سکتا ہوں اور لوں گا بھی۔ بخشوں گا نہیں۔ کیا آپ نے بخشا میری ایک خطا کو۔ یہی غلطی تھی ناں میری کہ اپنے باپ دادا کی اصلیت آپ سے چھپالی۔ ہاں اگر ایسا کیا میں نے تو کیا غلط کیا؟ میں آپ کی بیٹی کے لیے سوالی بن کے آیا تھا۔ میں خود شہزاد ملک۔ اور میں خود کو ہر لحاظ سے گل مہر کے قابل سمجھتا ہوں۔ کوئی کمی نہیں مجھ میں' نہ کردار میں' نہ تعلیم کے لحاظ سے اور مالی حیثیت بھی آپ سے کہیں بڑھ کے ہے۔ اگر مجھ میں کوئی کمی ہوتی یا میں خود کو گل کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتا تو ایسی جسارت ہی نہ کرتا۔ لیکن میں خود پہ اعتماد کرتے ہوئے آپ کے پاس آیا تھا اور آپ نے' آپ نے میرے باپ کو اپنے بے رحم الفاظ سے چھلنی کر کے رکھ دیا' اس شخص کی عزت نفس کے پرخچے اڑا کے رکھ دیئے۔ میرے باپ نے اپنی اتنی بے عزتی میری وجہ سے کروائی ہے' اب میں ان ہی کے آگے آپ کا سر جھکا کے رہوں گا۔

بہت غرور ہے ناں آپ کو اپنے خاندانی ہونے پر۔ آپ کے خیال میں گل مہر کا ساتھ طلب کرنا میری بہت بڑی جسارت ہے مگر میں آپ کو بتاؤں گا کہ میرے والد کو ذلیل کرنا آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ آپ نے انہیں بے عزت ہی نہیں کیا بلکہ اپنی عزت نیلام کرنے کے اسباب بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ اب میں گل مہر کو اپنے بل بوتے پہ حاصل کر کے دکھاؤں گا۔ پہلے وہ صرف میری ضرورت تھی۔۔۔ میری پسند تھی۔۔۔ لیکن اب۔۔۔ اب وہ میری ضد ہے صاحبزادہ نفیس علی خان میرے شجر میں آپ کے لیے کوئی کشش نہیں ہو گی مگر میری محبت میں وہ

کشش ہے جو گل کو اپنی جانب کھینچ سکے۔ اب میں اس کے ذریعے آپ سے اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔"

دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے اسے یہ خیال بھی نہ گزرا کہ اس نے اپنی "محبت" کے ذریعے گل مہر کو اپنی جانب جھکانے کا دعویٰ کیا ہے جبکہ ابھی ابھی وہ یہ اعتراف کر چکا ہے کہ گل مہر پہلے اس کی پسند اور ضرورت تھی جبکہ اب ضد۔۔۔ مگر محبت تو کبھی بھی نہ تھی۔

اور جس چیز کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو' اس پر بطور ہتھیار انحصار کرنا بے وقوفی تھی اور شہزاد ملک یہ بے وقوفی کر گزرا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہمیں اجازت دیجیے چچا حضور۔"

بابر ہمایوں مغل نے بے دلی سے چائے کی پیالی خالی کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسی اسٹاک ایکسچینج میں سب کچھ ڈبو دینے والے کاروباری لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس نے بھی تو داؤ کھیلا تھا مگر قسمت۔۔۔ اس بار مقدر میں اس بار خسارہ لکھا تھا۔ اگرچہ کھل کے بات سامنے تو نہ آسکی مگر اتنا اندازہ تو اس نے کر ہی لیا تھا کہ نواب صاحب پہ ان لوگوں کی کم حیثیتی کھل کے سامنے آچکی تھی۔

"یاسمین تو شاید ابھی کچھ دن رہنا پسند کریں۔" اس نے در زدیدہ نظروں سے مسلسل خفا خفا سی بیٹھی اپنی بیوی کو دیکھا۔ جس حالت میں وہ اسے آخری بار گھر چھوڑ کے گیا تھا اس کے بعد اتنی بے رخی دکھانا تو یاسمین کا حق بنتا تھا۔ عمیص بھی بہت بجھے دل کے ساتھ گھر آئے بہنوئی کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے پہ مجبور تھا کیونکہ باقی لوگ اس کے اور یاسمین کے جھگڑے سے ناواقف تھے۔

"آپ بھی آج رات یہیں قیام کیجئے۔" نواب صاحب نے کہا۔

"نہیں حضور۔۔۔ ہمیں ایک ضروری کام سے نکلنا ہے۔ رات کو لوٹنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ آپ کو ناحق تکلیف ہو گی۔" اس نے معذرت کی اتنے میں دلکش باپ سے ملنے آگئی۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی ماں پہ ہونے والے تشدد سے لاعلم تھی اس لیے اپنے بھائیوں کی نسبت اس کا رویہ باپ سے نارمل تھا۔

"دلکش۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟" وہ اتنے دنوں بعد بیٹی کو سامنے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس کی تو جون ہی بدلی ہوئی تھی۔

دبلی پتلی زرد رو' مدقوق چہرے والی' سہمی آنکھوں اور بند لبوں والی وہ لڑکی نجانے کہاں کھو چکی تھی۔

اب جو چودہ پندرہ سالہ لڑکی خوش باش چہرا لیے سامنے کھڑی تھی' وہ کوئی اور ہی تھی۔ اس کے چہرے سے صحت مندی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی بھی جھلک رہی تھی۔ بابر کو ایک دم وہ بہت بڑی بڑی سی لگی۔ وہ نظریں چرا کے رہ گیا۔

"ہم ٹھیک ہیں ابو حضور۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"شکر ہے اللہ کا۔ ہاں آپ کی امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ بہتر ہو گا کہ آپ ان کے ساتھ ہی گھر آجائیں۔"

"جی۔۔۔ جی بہتر۔" وہ کشمکش کا شکار نظر آئی۔ آج کل اس کے بورڈ کے پرچے ہو رہے تھے۔

بابر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو نواب صاحب نے ایک بار پھر کہا۔

"ابھی کچھ دیر اور رکیے بابر میاں۔"

اس بات پہ تقریباً" سبھی نے حیرت سے انہیں دیکھا کیونکہ اتنا زیادہ اصرار کرنا ان کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ سب کی حیرت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انہوں نے اب صاحبزادی حرمت النساء کی جانب دیکھا۔

"بیگم حرمت النساء' آپ صاحبزادی الماس خاتون کو لے آئیے۔ تاکہ بھابی بیگم رسم ادا کرلیں۔"

ان کے کہنے پہ جانے کو تیار بابر کسی معمول کی طرح بیٹھ گیا جبکہ صاحبزادی خلعت النساء حیرت سے اپنے دیور
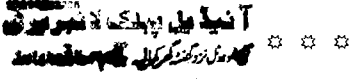
کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"رسم۔۔۔؟اور وہ بھی اس موقع پہ؟کیا یہ مناسب رہے گا؟"

یہی سوال صاحبزادی حرمت النساء کی ہچکچاہٹ اور عمیص کے تذبذب کی وجہ تھا۔

"یہی طے ہوا تھا بھابی بیگم۔اس میں نامناسب کیا ہے؟جائیے آپ صاحبزادی کو بھیجیے۔"

ان کے حتمی انداز میں حکم دینے پہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چلی گئیں۔نواب صاحب نے حق دق بیٹھے بابر کی حیرت رفع کرنا چاہی۔

"ہم نے بھابی بیگم کی خواہش پہ صاحبزادی الماس خاتون کی نسبت عمیص میاں سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اس لیے چاہتے تھے کہ خاندان کا ایک اہم فرد ہونے کی حیثیت سے آپ بھی اس گھریلو سا دا سی تقریب میں شامل رہیں۔بلکہ تقریب بھی کیا ہے۔یوں کہیے کہ حق دار کو امانت لوٹانے کا موقع ہے۔"

عمیص اس موقع پہ بھرپور احتجاج کرنا چاہتا تھا۔اپنے چچا حضور کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس وقت جب گل مہر اچانک ملنے والے دھچکے کے باعث جذباتی کشمکش کا شکار ہے تمہیا کرنا اسے اور بھی آزردہ کرنے کا باعث بنے گا۔وہ فطرتاً" زود رنج ہے'یقیناً یہی سوچے گی کہ کوئی اس کے دکھ میں شریک نہیں بلکہ اس کے غلط انتخاب کا احساس دلانے اور اسے چڑانے کے لیے یہ سب کیا جارہا ہے۔

وہ یہ سب ہونے سے روکنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کرسکا۔ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے قبل جو کچھ ہوا تھا'اس کے بعد مزید کچھ ہوتا اور وہ بھی اس کی جانب سے'نواب صاحب کو اپ سیٹ کرسکتا تھا۔وہ ٹوٹے تو ہوئے تھے مگر سلیقے سے خود کو سنبھالے ہوئے تھے اور اس کی کوئی بھی حرکت انہیں بکھرنے پہ مجبور کرسکتی تھی۔اس لیے وہ چپ رہا۔

دوسری طرف صاحبزادی حرمت النساء بھی بے چینی سے برآمدے کے چکر کاٹ رہی تھیں۔وہ گل مہر کی ماں تھیں۔جتنا عمیص اس کی طبیعت سے واقف تھا اس سے کہیں زیادہ وہ بیٹی کی فطرت و عادات سے آگاہ تھیں۔انہیں بھی یہی خدشات گھیر رہے تھے۔شہزاد کے ماں باپ کے رسوا ہوکر نکلنے کے بعد اور اپنے والد سے ساری حقیقت جان لینے کے بعد سے اب تک وہ کمرے میں بند تھی اور ان کے ہر بار دروازہ کھٹکھٹانے پر انہیں جواب میں دبی دبی سسکیاں ہی سنائی دیتی تھیں۔وہ اپنے اندیشے نواب صاحب سے بانٹ کر انہیں فی الحال اس کام سے باز رکھنا چاہتی تھیں مگر داماد کے سامنے یہ بات کرنے سے ہچکچا رہی تھیں۔معاً" انہوں نے نزدیک سے گزرتے دلگیر کو روکا۔

"جاؤ'بابر میاں کو مہمان خانے میں لے جاؤ۔وہ جب سے آئے ہیں۔ایک ہی جگہ بیٹھے ہیں۔ان سے پوچھ کے ان کے غسل کا اہتمام کروائیے۔"

دلگیر کے پیچھے پیچھے بابر گول کمرے سے نکلا تو وہ لپک کے اندر آئیں۔

"آگئیں صاحبزادی الماس خاتون'جائیے گل مہر بٹیا کو بھی بلا لائیے۔"

"نواب صاحب'گستاخی معاف'مگر ہمارا خیال ہے کہ آپ کو ایک بار مزید اس بارے میں سوچ لینا چاہیے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"ان کی آواز بلند ہوئی۔

"اب کیا سوچنا'اور کس لیے سوچنا'کیا یہ فیصلہ باہمی رضامندی سے نہیں ہوا تھا۔پھر اب یہ اعتراض کس لیے؟"

"بلاشبہ اس فیصلے میں سب کی خوشی شامل ہے۔اور اب بھی کسی کو اعتراض نہیں۔بات صرف اتنی ہے کہ فی الحال یہ رسم ادا کرنے کا موقع نہیں۔یہ فرض کچھ دن بعد بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔"

"آپ اسے فرض بھی کہہ رہی ہیں اور اس کی بجا آوری میں کوتاہی اور غفلت بھی برت رہی ہیں۔الماس خاتون کو باضابطہ طور پہ بھابی بیگم کی امانت بنانے کا فریضہ ہم آج اور ابھی ادا کریں گے۔مانا کہ ابھی جو کچھ ہوا'وہ ہمارے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ہمارے وقار کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔ہمارے آباء کے تقدس کا مذاق اڑایا گیا ہے

لیکن ان سب کے پیچھے صاحبزادی الماس خاتون کا تو کوئی ہاتھ نہیں۔جن کی ضد کا یہ نتیجہ ہے ان کے جذبات کی پاسداری کرنا ہم پہ اب لازم نہیں۔انہوں نے کب خاندانی روایات کی پاسداری کی۔قصور ہمارا بھی ہے جو کمزور پڑ کے ان کی بات مان لی اور یہ نوبت آنے دی۔لیکن اپنی کوتاہیوں کا سایہ ہم آنے والی خوشیوں پہ نہیں پڑنے دیں گے۔"

انہوں نے اتنے دوٹوک انداز میں کہا کہ وہ اور کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔

"آپ یہ کام رہنے دیجیے۔ہم دیکھ لیتے ہیں۔"انہوں نے کچن میں مصروف موتیا سے کہا۔

"بس امی حضور'پلاؤ دم پہ ہے'کباب بنا دیے ہیں'صرف تلنے باقی ہیں'تڑا تعلق تو گل نے بنانا تھا مگر اب وہ۔۔۔"

اس نے شانے اچکائے۔"اور قورمہ آپا حضور بنا ہی چکی ہیں۔"

"کباب دلگیر تل لے گا اور یہ رائتہ ہم تیار کرلیتے ہیں۔سلاد بھی دلکش بنالے گی۔آپ نہا دھو کے لباس تبدیل کرلیجیے۔"انہوں نے اس کے ہاتھ سے چھری پکڑلی۔

"سب کام ختم ہوجائے تو آرام سے بدل لوں گی۔ویسے بھی ان کپڑوں میں کیا برائی ہے۔بابر بھائی نہ آتے تو شاید میں اب یہ اہتمام ہی نہ کرتی۔کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔بار بار گل کا خیال آرہا ہے۔بس ان ہی کے لیے یہ سب کیا ہے۔ابا حضور نے انہیں کھانے پہ جو روک لیا ہے۔"

"نہیں روکنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔بڑے داماد ہونے کی حیثیت سے ان کا تمہاری نسبت پہ موجود رہنا ضروری ہے۔"

"جی۔۔۔"سنک کے کھلے نلکے کے نیچے ہاتھ دھوتے دھوتے رک گئی۔

"اور اسی لیے ہم کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کام چھوڑ دیجیے۔اور ہمارے کمرے میں آپ کا جو نیا جوڑا سل کے آیا رکھا ہے وہ پہن لیجیے۔ہم صاحبزادی یاسمین کے ہاتھ کچھ زیور بھیجتے ہیں ساتھ میں وہ پہن لیجیے گا۔"

موتیا عجیب احساسات میں گھری رہ گئی۔

وہ ہونے جارہا تھا'جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔مگر قدرت نے اس کا سامان پیدا کردیا تو وہ اپنی خوش قسمتی پہ جی بھر کے نازاں ہوئی۔

وہ جو اس نے مانگا بھی نہ تھا'بن مانگے ہی اللہ نے اس کے دامن میں ڈال دیا تو کیا وہ خوش نہ ہوتی۔

لیکن آج یہ خوشی مناتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔گل مہر اس کی بہن تھی۔ابھی ابھی وہ جس جذباتی دھچکے سے گزری تھی اس کے بعد اسے اپنا خوش ہونا بھی عجیب لگ رہا تھا لیکن یہ اس کے ابا حضور کا فیصلہ تھا۔وہ چپکے سے تیار ہونے چلی گئی۔صاحبزادی یاسمین اسے تیار کرنے ساتھ چلی گئیں۔

اب صاحبزادی حرمت النساء ایک بار پھر گل مہر کے کمرے کا بند دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔

"دروازہ کھولیے'آپ کو آپ کے ابا حضور یاد فرما رہے ہیں۔آپ کو گول کمرے میں بلایا ہے۔"

بار بار دستک دینے کے بعد بھی اس نے جواب نہ دیا تو انہیں یہ کہنا پڑا۔جواب میں گل مہر کی بھرائی آواز سنائی دی۔

"انہوں نے ہمیں برا بھلا کہنا ہوگا'ان سب کی ذمہ داری ہمارے کھاتے میں ڈال کے ہمیں ہی موردالزام ٹھہرانا ہوگا'ہماری خود سری اور ضد کے بھیانک نتائج سے آگاہ کرنا ہوگا۔جانتے ہیں ہم مگر کیا یہ سب آج ہی کرنا ضروری ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔جو ہوا'اس پہ سب کو افسوس ہے اور آپ کے ابا حضور کی حالت تو واقعی بہت دگرگوں تھی مگر انہوں نے بمشکل خود کو سنبھالا ہے کیونکہ ان کے شانوں پہ آپ کے علاوہ اور بھی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔اس وقت آپ کو بلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کچھ دیر میں۔۔۔کچھ دیر میں آپ کی ہمشیرہ کی نسبت کی رسم ادا ہونے والی ہے اور سب آپ کے منتظر ہیں۔"

"کیا؟"

حسب توقع دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔

متورم آنکھوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"موتیا کی منگنی عمیص کے ساتھ؟" اس نے تصدیق چاہی۔ اور ماں کے اثبات میں گردن ہلانے پہ وہ پھٹ پڑی۔

"کیا مقصد ہے یہ سب کرنے کا۔ صرف ہمیں یہ احساس دلانا کہ ہم کتنے غلط تھے۔ اور آپ سب کتنے صحیح۔ کم از کم آج کا دن تو ہمیں بخش دیتے۔ یہاں ہم اپنی ناکام محبت کا ماتم نہیں منا رہے بلکہ اس بات پہ پچھتا رہے ہیں کہ آخر ہماری عقل کیوں ماری گئی تھی جو ہم نے بغیر سوچے سمجھے اور چھان بین کرائے ان لوگوں کو اپنے گھر کا راستہ دکھایا۔ ہماری غلطی کا احساس آپ ہمیں اس اذیت ناک طریقے سے کرانا چاہ رہے ہیں۔ وہ احساس ہمیں پہلے ہی سے ہے۔ آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"تحمل سے صاحبزادی گل مہر۔ آپ کی اپنی بہن کا معاملہ ہے۔ اس کی خوشی کے موقع پہ آپ۔۔۔"

"اس کی خوشی؟" وہ بات کاٹ کے چلائی۔

"ہمارے دکھ کی پرواہ ہے کسی کو۔ جو ہم دوسروں کی خوشیوں کی پرواہ کریں۔ ہمیں چڑ کہ لگانے سے کون باز آیا ہے۔ نہیں آتے ہم۔ اگر یہ سب اہتمام ہمیں چڑانے کے لیے کیا جا رہا ہے تو نہیں آتے ہم۔ بالکل بھی نہیں۔"

● ● ●

صاحبزادی حرمت النساء اس کا دوٹوک انکار سن کر دنگ رہ گئیں۔ وہ گل مہر کی ضد سے تو واقف تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ حسن و کشش اور ذہانت کے معاملے میں انتہائی حد تک خوش قسمت ان کی یہ بیٹی دل کے معاملے میں ہاتھ ذرا تنگ ہی رکھتی ہے اسی لیے وہ یہاں آنے اور اسے یہ خبر سنانے سے گریزاں تھیں اور شاید ان کے دل و دماغ میں بھی کہیں یہ خدشہ ضرور تھا اسی لیے انہوں نے صاحبزادہ نفیس علی خان کو اس فوری اقدام سے روکنے کی اپنی سی کوشش بھی کی تھی۔

یہ سب درست مگر۔۔۔

اپنے بشری تقاضوں کے تحت وہ تھوڑی بہت خوش گمانی پالنے کا حق تو رکھتی تھیں۔ اس لیے بڑے مان سے انہوں نے یہ تصور کرلیا تھا کہ ان کی صاحبزادی گل مہر بھلے جذباتی اور کم عقل ہوں۔۔۔ تھوڑدل ہوں مگر ماں کے کہے کی اتنی تو لاج رکھ ہی لیں گی' اور اس نازک موقع پر جب گھر کے تمام افراد اکٹھے ہیں وقتی طور پر اپنے جذبات کو پس پشت ڈال دیں گی۔

اور کچھ نہیں تو اپنی بہن کی خوشی کا ہی خیال کرلیں گی۔

مگر اب انہیں احساس ہوا کہ گل مہر سے یک بیک اتنی توقعات رکھ لینا ان کی غلطی تھی' وہ ان کے سامنے کھڑی واضح الفاظ میں کہہ رہی تھی۔

"ہمارے دکھ کی پروا ہے کسی کو' جو ہم دوسروں کی خوشیوں کی پروا کریں۔ نہیں آتے ہم' اگر یہ سب کچھ ہمیں چڑانے کے لیے کیا جا رہا ہے تو نہیں آئیں گے ہم۔ بالکل بھی نہیں۔"

صاحبزادی حرمت النساء نے شدید حیرت اور صدمے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے بغور دیکھا۔

اس کا دلکش و حسین چہرہ اس وقت حزن و ملال کے سائے میں تھا۔ گلابی رنگت غصے سے دہک کے آتشی ہو رہی تھی۔ خوش رنگ آنکھوں میں بدگمانی تھی اور لہجہ بغاوت کی بو دے رہا تھا۔

کیا نہیں تھا' اس وقت اس کے چہرے پہ۔۔۔

اپنی امیدیں اور آرزوئیں مسمار ہونے کا غم

سب کے سامنے اپنے انتخاب کے اس قدر بودا نکلنے کا دکھ۔۔۔

اپنی ضد کا بھیانک نتیجہ سامنے آنے کی کھسیاہٹ۔۔۔

یہ سب تھا اگر نہیں تھا تو پشیمانی اور ندامت کا ہلکا پھلکا سا احساس' اسے اب بھی اپنی فکر تھی۔ اپنے جذبات کی' اپنے غم کی' اور اپنے ہی احساسات کی۔

دوسروں پہ اس وقت کیا گزر رہی ہے' اس کی پروا اسے اب بھی نہ تھی۔

اتنے بڑے حادثے سے گزر کر بھی۔

صاحبزادی حرمت النساء نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ گویا اس کی حالت پہ اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"آپ کو اور کچھ نہیں تو اپنے والد کا ہی خیال کرلینا چاہیے۔ جو اس وقت صرف آپ کی ضد کے نتیجے میں ایک شدید جذباتی دھچکے سے گزر رہے ہیں۔"

"اسی لیے تو۔۔۔" اس نے فوراً" بات پکڑ کے جتایا۔

"اسی لیے تو ہم نہیں آرہے۔ اب پورا خاندان ہمیں ہماری غلطی کا احساس دلانے کے لیے اکٹھا ہوگا۔ ابا حضور کو اب ایک بھرپور موقع ملا ہے اپنے آپ کو درست اور ہمیں غلط ثابت کرنے کا' اور وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے تو نہیں دیں گے۔"

"صاحبزادی گل مہر۔" ان کی آواز اگرچہ بہت بلند نہ تھی مگر لہجے میں واضح تنبیہہ اور ناگواری تھی۔

"اپنے اطوار درست کیجئے۔ آپ حد سے بڑھ رہی ہیں' شاید آپ کو خود بھی احساس نہیں کہ آپ کس کے متعلق بات کررہی ہیں اور کس درجہ گستاخی سے کررہی ہیں۔ اس وقت ہم آپ کی ذہنی حالت کا احساس کرکے درگزر کردینے پہ مجبور ہیں مگر ہر بار نہیں۔ آئندہ ہرگز نہیں۔"

وہ کچھ دیر کھڑی نظریں اپنے پیروں پہ گاڑے رہی۔ پھر خاموشی سے پلٹی اور اپنے پلنگ پہ ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ صاحبزادی حرمت النساء اندر آئیں اور اس کی الماری کھول کے جائزہ لینے لگیں۔

"یہ لباس مناسب رہے گا۔" انہوں نے ہلکے سبز رنگ کا چکن کا سوٹ نکالا جس کے ساتھ پرنٹڈ چکن کا بڑا سا سبز اور پیلا دوپٹہ تھا۔ گل مہر نے منہ پھیر لیا۔

"ہم آپ سے کہہ رہے ہیں صاحبزادی گل مہر۔" انہوں نے نزدیک آکے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

"اٹھیے اور لباس تبدیل کرلیجئے۔۔۔ منہ ہاتھ دھولیجئے' اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دل سے سارے وسوسے اور گلے بھی۔"

ان کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک شاکی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ ڈبڈبائی نظروں سے اس نے گود میں رکھے اس سوٹ کو دیکھا جو ابھی ابھی امی حضور نکال کے دے گئی تھیں۔

ایک تماشا ابھی ابھی اس گھر میں ہوا تھا اور وہ اوروں کے سامنے چاہے مانے یا نہ مانے' مگر دل میں تسلیم کرتی تھی کہ اسی کی وجہ سے ہوا۔ اب مزید کوئی تماشا نہ تو کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ نہ ہی اپنا تماشا بنوانا چاہتی تھی' اس لیے ان کے کہنے کے مطابق چپ چاپ کپڑے اٹھا کے واش روم میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

صاحبزادی یاسمین نے اس کی کلائیوں میں میرون چوڑیاں پہنائیں تو ان کی چھنک نے موتیا کو کسی گہرے خیال سے چونکا دیا۔ اس نے جیسے گہری نیند سے باہر آتے ہوئے یاسمین کے ہاتھوں میں اپنی گندمی کلائی کو دیکھا جو سنہری میناکاری والی میرون چوڑیوں سے دمک رہی تھی۔

"لیجئے جناب' اب ذرا خود کو ایک نظر آئینے میں تو دیکھیں۔" یاسمین نے بڑا سا میرون کلر کا شیفون کا دوپٹہ اس کے سر پہ پھیلایا جس کے کناروں پہ گولڈن ٹکے کا کام تھا اور اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کے آئینے کے روبرو کیا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو۔۔۔ یہ تو بہت زیادہ ہو گیا آپا حضور۔" وہ اپنا روپ دیکھ کے گڑبڑا گئی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس سے پہلے کبھی وہ اتنے اہتمام سے تیار ہوئی ہو۔ اپنا سجا سجایا سجیلا سا روپ اسے اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔

"کیا زیادہ ہو گیا؟ ہمیں تو کچھ خاص آتا بھی نہیں' میک اپ کرنے کے فن سے قطعی نابلد ہیں ہم۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔ بس ذرا سے کاجل' لپ اسٹک اور اس ہلکے پھلکے سونے کے سیٹ کو آپ زیادہ کہہ رہی ہیں؟" یاسمین نے اس کا آنچل درست کیا۔

"اب ہم ذرا چچی حضور سے پوچھ کے آتے ہیں کہ آپ کو ہمراہ لے جائیں یا ابھی کچھ وقت ہے۔" وہ باہر نکلیں تو موتیا نے جھجکتے ہوئے دوبارہ اپنے عکس کو دیکھا۔

گندمی رنگت سے پتا نہیں کیسے اور کہاں سے یہ سنہری شعاعیں پھوٹی پڑ رہی تھیں جو اس کے پورے وجود کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے تھیں۔ میرون کلیوں والا کھلے گھیر کا بادامی کرتا جو تلے اور دبکے کے کام سے سجا ہوا تھا' میرون چوڑی دار پاجامہ' ہر وقت سادہ رہنے والے عام سی بناوٹ کے ہاتھ گہرے رنگ کی نیل پالش سے سجے تھے' چوڑیوں نے ان کی خوبصورتی بڑھا دی تھی۔ گھبرایا گھبرایا سا چہرہ ہلکے میک اپ میں بھی اچھوتا رنگ دے رہا تھا۔ وہ نظریں چرا کے رہ گئی۔

"آیئے الماس خاتون' آپ کو یاد کیا گیا ہے۔" یاسمین نے آکے اسے شانوں سے تھام کے اٹھایا اور بہت سنبھال کے سج سج لے جانے لگیں۔

"ہمیں چلی جاؤں گی آپا حضور۔" اسے اس خصوصی اہتمام سے گھبراہٹ ہوئی۔

"ہمیں چل سکتی ہوں اور گول کمرے کا راستہ بھی مجھے آتا ہے۔"

"ہم جانتے ہیں اور یہ بھی کہ اس وقت آپ کو وہ سارے ہی راستے آتے ہیں جو ہمارے بھائی عمیص تک پہنچتے ہوں۔" انہوں نے اس کے کان میں شریر سی سرگوشی کی۔

اندر نواب صاحب اپنی دلی کیفیت کامیابی سے چھپائے بابر ہمایوں مغل کی لچھے دار باتوں میں دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور عمیص سر جھکائے بیٹھا اپنے ہاتھ کی انگلیاں موڑ رہا تھا۔ اس کی یہ حرکت اس کے ذہنی خلفشار کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"یہ جو ہونے جا رہا ہے اس میں میری مکمل رضا شامل ہے۔ میں نے دل و دماغ کی تمام تر آمادگی کے ساتھ موتیا کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پرانی ہر وابستگی سے دل کو پاک کر کے اسے صرف اور صرف موتیا کے لیے کھلا رکھ چھوڑا ہے۔ پھر یہ بے چینی کیسی؟ یہ اضطراب کیسا؟ کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ابھی' اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کے یہاں سے دور بھاگ جاؤں۔ کیوں یہ خواہش جاگ رہی ہے کہ یہ وقت ٹل جائے' کچھ دن اور ٹل جائے۔ ابھی نہیں' پھر کبھی پھر کسی اور وقت' کسی اچھے سے وقت۔"

اس نے نظریں اٹھا کے سب کو دیکھنا چاہا۔

اس کی امی حضور بدستور تسبیح کے دانے گرانے میں مگن تھیں البتہ اب ان کے چہرے سے وہ سراسیمگی مفقود تھی جس نے دو گھنٹے قبل ان کی ساری توانائی نچوڑ کے رکھ دی تھی۔ اپنی اس حالت کے قطعی برعکس اب وہاں سکون ہی سکون اور اطمینان ہی اطمینان تھا۔ یہ اطمینان اسی احساس نے انہیں بخشا تھا' جس احساس میں گھر کے وہ بے اطمینانی محسوس کر رہا تھا۔

اور چچا حضور ان پہ جو قیامت گزری تھی اس کے بعد ان کا سنبھلنا اور وہ بھی اتنی جلد قابل حیرت تھا۔ عمیص نے ان کے چہرے پہ حالیہ گزرے حادثے کے اثرات ڈھونڈنا چاہے۔ ان کی آنکھوں کی چمک ماند تھی۔ مگر وہ آنکھیں اب تک اٹھی ہوئی تھیں یہ تو غنیمت تھا۔ ان کا لہجہ پست تھا مگر ہارا ہوا نہ تھا۔ یہ بھی بہت تھا ورنہ ایک پل کو اس ایک پل کو جب کرم الٰہی کی حقیقت باقی سب کی طرح اس پہ بھی کھلی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے

خدانخواستہ وہ اپنے چچا حضور کو کھو دے گا۔ یہ حقیقت جسے تسلیم کرنا خود اس کے لیے بھی دشوار تھا' اس سے گزرنا صاحبزادہ عمیص علی خان کے لیے بڑا دل گردے کا کام تھا۔ جس وقت وہ طیش کے مارے آپے سے باہر ہو کے کرم الٰہی کو بے نقط سنا رہے تھے' اس وقت خاموش کھڑا عمیص یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کتنے جتن کر کے اپنے چچا حضور کو سنبھالنا پڑے گا۔ انہیں زندگی کی طرف دوبارہ لانے کے لیے کیا کیا کچھ نہ کرنا پڑے گا۔ مگر اسے کچھ نہ کرنا پڑا۔ وہ سنبھل گئے۔ یا شاید خود کو سنبھال لیا اس فرض کی ادائیگی کے لیے۔

جو کام اسے بہت مشکل لگ رہا تھا' وہ اس ایک ذرا سی بات نے کر ڈالا۔

وہ ذرا سی بات جو اس وقت عمیص کو کسی پہاڑ کی مانند لگ رہی تھی جسے اسے لازماً "سر" کرنا تھا۔

صرف اور صرف گل مہر کی وجہ سے۔

وہ یہاں بیٹھا بھی باآسانی جان سکتا تھا کہ چچی حضور اس وقت گل کو یہاں آنے کے لیے رضامند کرنے میں ہلکان ہو رہی ہوں گی۔ اور یہ بھی کہ وہ یہ خبر سن کر کیا کچھ سوچ رہی ہو گی۔

"تم بدگمان بہت جلدی ہو جاتی ہو گل میں جانتا ہوں تمہارے دل میں اس وقت ہم سب کے لیے گلے ہی گلے ہوں گے کہ ہم تمہارے دکھ میں شریک ہونے کی بجائے' تمہیں دلاسا دینے یا تمہاری ہمت بندھانے کی بجائے اپنی خوشیاں منانے میں مگن ہیں مگر گل' کاش تم دل میں اتر کے محبت کو محسوس کرنا سیکھ لو تو پھر شاید تمہیں اندازہ ہو کہ ہم سب تمہارے دکھ پہ دکھی ہیں مگر اس کا احساس دلا کے تمہیں ندامت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔ یہ نہیں چاہتے کہ تمہیں اس بات پہ شرمندگی ہو کہ صرف تمہاری وجہ سے آج سارے گھر پہ ماتمی فضا چھائی ہوئی ہے۔ پتا نہیں یہ سب درست کر رہے ہیں یا نہیں۔ میں نہیں جانتا' میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ آج بھی میرا دل تمہارے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا ہے۔ تم اداس ہو تو میں بھی اداس ہوں' تمہارے آنسو گر رہے ہیں تو میرے دل کی مٹی بھی گیلی گیلی ہے' محبت کا یہ درد جو تم آج محسوس کر رہی ہو' میں بھی کبھی اس درد سے گزر چکا ہوں' اور کوئی ہو نہ ہو مگر گل مہر' عمیص آج تمہارے ماتم میں دل سے شریک ہے۔ یہ تمہاری محبت کے اجڑ جانے پہ اتنا ہی افسردہ اور ملول ہے جتنا اپنی محبت سے دست برداری پہ ہوا تھا۔ ہماری خوشیاں کبھی ایک نہ ہو سکیں مگر دیکھ لو' آج ہمارا درد ایک ہو گیا۔"

وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا جب ماحول میں اچانک ہی ایک نامحسوس سی گہما گہمی کے آثار اسے چونک کر سنبھلنے پہ مجبور کر گئے۔

صاحبزادی یاسمین کے ہمراہ "وہ" اندر آ رہی تھی۔

"وہ" جو کل تک اس کے لیے صرف ایک دوست تھی' ایک بہت اچھی دوست' ہمراز' دمساز اور ہم مزاج ساتھی۔

جسے اس کی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اس نے اس فیصلے کو بسر و چشم قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اب تک وہ اس کی اپنے دل میں حیثیت کو تبدیل نہ کر پایا تھا۔

یا پھر شاید اس نے ایسا کرنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ وہ اس کے لیے اب تک وہی موتیا تھی۔ جو اندر باہر سے سادگی ہی سادگی تھی۔ سادہ دل' سادہ مزاج' سادہ فہم۔

لیکن اب اسے دیکھ کے لگا' وہ تو نہیں یہ تو کوئی اور ہی تھی۔ عمیص نے ارد گرد بزرگوں کی موجودگی کا لحاظ کر کے اچانک نظریں پھیر لیں۔ اس کا موتیا کو یوں دیکھتے رہ جانا' صرف اور صرف اس حیرت کی بنا پہ تھا کہ وہ اتنا حسن اب تک کہاں چھپائے بیٹھی تھی مگر موقع محل کچھ ایسا تھا کہ اس کا یوں دیکھنا اور معنوں میں لیا جا سکتا تھا اس لیے برسوں سے بلا روک ٹوک' بغیر کسی جھجک کے اپنی اس سب سے اچھی اور بے تکلف دوست کے ساتھ وقت گزارنے والا عمیص اس ایک بے اختیار سی حرکت پر خجل ہو کے نظریں پھیر رہا تھا۔

مگر اندر آتے ہوئے ذرا کی ذرا بوجھل پلکیں اٹھا کے سامنے دیکھنے والی موتیا سے اس کی نظروں کی یہ چوری چھپی

نہ رہ سکی۔ اس کا دل انوکھی تال پہ ناچ اٹھا۔

اسے صاحبزادی خلعت النساء کے برابر بٹھا دیا گیا۔ جبکہ وہ پہلے سے ہی اپنے چچا حضور کے دائیں جانب جڑ کے بیٹھا تھا۔

اتنے میں صاحبزادی حرمت النساء اندر داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے گل مہر بھی تھی۔ اس نے ماں کا نکالا سبز سوٹ بھی پہن لیا تھا' شدت گریہ سے بے حال ہوتا چہرہ بھی ان کی ہدایت پہ دھولیا تھا اور بکھرے بال بھی سمیٹ رکھے تھے مگر وہ اپنے ماتھے کے بل' آنکھوں کے شرر اور وجود کا اضمحلال رکھ کے نہیں آئی تھی۔ یہ سب صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

وہ اندر آئی مگر کسی کی جانب نگاہ کیے بغیر کسی کو مخاطب کیے اسی اجنبیت اور لاتعلقی کے ساتھ نسبتاً" کونے میں رکھی کرسی پہ بڑے تکلف کے ساتھ بیٹھ گئی' اور تو اور اس نے بابر ہمایوں مغل کو بھی سلام کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ یوں تو وہ ہمیشہ سے ہی اسے طوہاً" کرہاً" ہی برداشت کرتی تھی مگر بہنوئی ہونے کے ناتے یا مہمان ہونے کے لحاظ میں مارے باندھے مقدور بھر تعظیم دے ہی دیتی تھی جسے آج اس نے ضروری نہ جانا۔ وہ دانستہ سب سے گریز برت رہی تھی۔

"بسم اللہ کیجیے امی حضور۔" یاسمین نے انگوٹھی کی مخملیں ڈبیا صاحبزادی خلعت النساء کی جانب بڑھائی۔

"اجازت ہے بھائی میاں؟" انہوں نے نواب صاحب سے رسماً" دریافت کیا۔

"آپ کی امانت ہیں بھابی بیگم۔"

اور انہوں کا موتیا کا لرزتا ہاتھ لے کے سونے کی نازک سی انگوٹھی پہنادی۔

مبارک سلامت کی آوازوں کے ساتھ ایک اور آواز عمیص کو بخوبی سنائی دے رہی تھی اور وہ تھی اپنے دل کے دھڑکنے کی۔ وہ دل جو سالوں سے گل مہر کے نام پہ دھڑکنے کا عادی تھا۔ آج پہلی بار کسی اور کو دیکھ کے دھڑک اٹھا تھا۔ عمیص دل کی اس بے ایمانی پہ حیران رہ گیا۔ وہ لڑکی جو کل تک اس کی زندگی میں شامل کیے جانے والی تھی اور وہ اس فیصلے کو تقدیر کی رضا جان کے راضی تھا۔ آج وہ تمام تر حقوق کے ساتھ بالآخر باضابطہ طور پر اس کی زندگی سے وابستہ ہوگئی تھی اور وہ اسے تقدیر کی رضا نہیں بلکہ تقدیر کی مہربانی جان رہا تھا۔

"ہاں موتیا' یہ تمہارے ساتھ ناانصافی ہوگی کہ کسی کو بن مانگے تمہارے جیسا گوہر ملے اور وہ جی بھر کے خوش بھی نہ ہو۔ میں خوش ہونا چاہتا ہوں مگر گل کی ناخوشی مجھے ایسا کرنے نہیں دیتی' میں مسکرانا چاہتا ہوں مگر اس کی بھیگی پلکیں مجھے ایسا کرنے نہیں دیتیں۔ نئی محبتوں میں اور نئے رشتوں میں بندھ جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان پرانی وابستگیاں پل میں فراموش کر ڈالے۔"

☼ ☼ ☼

"ماما جی کو ہوش تو آگیا ہے۔ اللہ کی مہربانی یونہی رہی تو چند دن تک وہ بھلے چنگے ہو کے انشاء اللہ گھر بھی لوٹ جائیں گے۔ آپ پلیز اتنے پریشان نہ ہوں چھاجی۔"

پچھلے تین دنوں سے وہ لگاتار دن میں کئی کئی بار ہاسپٹل آرہی تھی بلکہ پہلا سارا دن تو اس نے ہاسپٹل میں کرم الٰہی کے پاس گزارا تھا اور بلقیس کو آرام کے لیے واپس گھر بھیج دیا تھا لیکن ان گزرے تین دنوں میں بلاشبہ آج اس نے پہلی بار شہزاد کو مخاطب کیا تھا اور وہ بھی بہت ہمت کر کے' بہت ڈر ڈر کے۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" بہت آہستہ آواز میں اس نے دیکھے بغیر جواب دیا تھا مگر دعا اس پہ بھی بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اسے اس مختصر جواب کی بھی توقع ہرگز نہ تھی کجا کہ وہ اتنی نرمی سے ملتا۔ اس کا حوصلہ بڑھا۔

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں' کب تک ڈسچارج کردیں گے وہ ماما جی کو؟"

"دیکھو۔" وہاں اختصار کا وہی عالم تھا اور ہنوز وہی بے اعتنائی وہ مسلسل سامنے کوریڈور کی جانب آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے لیے چائے نکالوں؟" اس سوال پہ شاید شہزاد نے اپنا تحمل کھودیا۔ بہت ناراض سی نظروں سے اسے اس طرح دیکھا کہ وہ خجل ہو کے رہ گئی۔

"نہ تو میں یہاں مہمان ہوں نہ ہی تم میزبانی کرنے پہ مامور ہو' پھر یہ چونچلے کس لیے۔"

"آپ کے سر میں درد ہے ناں اس لیے میں نے پوچھ لیا۔" اس نے سر جھکا کے وضاحت کی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ میرے......" وہ چونکا۔ جواباً" وہ صرف مسکرادی۔ بڑی بھرپور اور پراعتماد مسکراہٹ تھی اس کی۔ شہزاد کو اپنا آپ ڈولتا محسوس ہوا۔

"اب بھی......؟ کیا اب بھی یہ بے وقوف لڑکی......؟ اوہ نو؟" وہ کوفت سے سر جھٹک کے رہ گیا۔

"تم اب گھر جاؤ۔ کب تک بیٹھی رہو گی؟"

"ابا جی آئیں گے تو چلی جاؤں گی۔"

"وہ تو غالباً" رات نو دس بجے آئیں گے روز کی طرح کیا تب تک یہیں بیٹھی رہو گی؟ اور کوئی کام نہیں کیا؟ یا پھر آج سے پہلے کبھی کہیں اکیلی نہیں گئیں۔" اس کے پے در پے تو کیلے جملوں پہ وہ خائف ہو گئی۔

"میں...... میں چلتی ہوں۔ شاید آپ کو میری موجودگی ناگوار لگ رہی ہے۔" اس نے اپنا شولڈر بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ شہزاد نے مروتاً" بھی روکنے کی کوشش نہ کی اور وہ آنسو پیتی چل پڑی۔

"بہت مشکل ہے' بہت مشکل ہے' پتھر کا موم ہونا اور اس سے بھی مشکل ہے' بلکہ ناممکن ہے میرا چھاجی کے معاملے میں پتھر ہونا۔ کتنا بھی دل کو سمجھالوں مگر کم بخت مانتا ہی نہیں۔ بہلاوے کے لیے اسے کون کون سے کھلونے نہ تھمائے۔ بابر ہمایوں مغل بھی تو ایک بہلاوا ہی ہے' مگر یہ دل اگر ایسے بہلاووں سے بہلنے لگے تو اس دل کو "دل" کون کہے۔"

وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ پارکنگ کی جانب بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"ایک تو یہ لڑکی' یہ نہیں سدھر سکتی میں لاکھ اس سے نارمل رہنے کی کوشش کروں مگر میری ہر کوشش یہ ناکام بنادیتی ہے۔ سوچا تھا منگنی ہوگئی ہے اور وہ بھی پسند کی۔ چلو بلا سر سے ٹلی' ابا جی کی فکر بھی ختم ہوئی۔ لیکن یہ بلا بہت بری طرح میرے پیچھے پڑ چکی ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے آئی سی یو کے بالکل باہر بیٹھا تھا جب ایک نرس کو تیزی سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے اپنے دھیان میں خاص توجہ نہ دی لیکن جب اسی نرس کے ہمراہ چند سنٹ بعد اس ڈاکٹر کو آتے دیکھا جو کرم الٰہی کا ڈزٹ کرتا تھا تو وہ پریشان ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اینی پرابلم ڈاکٹر؟ سم تھنگ سیریس؟"

اس نے پوچھنا چاہا مگر ڈاکٹر کوئی جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اگلا آدھا گھنٹہ اس کے لیے بڑا کٹھن تھا جو اس نے جلے پیر کی بلی کی طرح گزارا۔ کوئی کچھ بتانے پہ تیار ہی نہ تھا۔ دوسری جانب بالو کے فون پہ فون آرہے تھے۔ صبح شہزاد نے ہی اسے آرام کرنے گھر بھیجا تھا اور شام کو ڈرائیور بھیج کر واپس ہاسپٹل بلوانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اب وہ بار بار یاد دہانی کرا رہی تھی اور وہ ٹالتا جا رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ پہلے ڈاکٹرز سے بات ہو جائے۔

"مسٹر ملک!" بالآخر ڈاکٹر سفیان نے اسے مخاطب کیا۔

"آپ کے فادر پہ ایک اور اٹیک ہوا ہے۔ اگرچہ یہ اٹیک اتنا شدید نہیں تھا جتنا تین دن پہلے والا۔ لیکن چونکہ اس اٹیک کی وجہ سے پہلے ہی ان کی کنڈیشن ٹھیک نہیں تھی اور ان کی رائٹ سائیڈ پیرالائیز بھی ہو چکی تھی اس لیے یہ دوسرا اٹیک وہ سہار نہیں سکے۔"

"کیا...... یعنی؟" وہ لڑکھڑا کے دیوار کا سہارا لینے پہ مجبور ہو گیا۔

"نہیں نہیں...... ابھی بھی ایک امید باقی ہے۔ وہ کوما میں چلے گئے ہیں۔ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں انہیں ہوش آجاتا ہے تو انہیں زندگی کی جانب لوٹنے میں بہت کم وقت لگے گا۔ بس یہ دعا کیجیے کہ ان کا کوما طویل نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں صرف آپ کی دعائیں ہی کام کر سکتی ہیں۔ کوما کے پیشنٹ کو ہوش میں لانے کی کوئی میڈیکل

تدبیر نہیں۔"

"آہ۔۔ ابا جی۔۔۔ میری اک بے معنی سی خواہش نے آپ کو موت کے کس قدر قریب کھڑا کردیا ہے۔ میری زندگی میں رنگ بھرنے کی خاطر آپ اپنی زندگی کھو رہے ہیں۔ کیوں بھول گیا تھا میں یہ حقیقت اس سارے معاملے کے اس پہلو کو میں نے کیسے نظرانداز کردیا کیوں نہ پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ حقیقت کھلنے پہ نواب صاحب کا رد عمل شدید ترین ہوسکتا ہے جس کا خمیازہ مجھ اکیلے کو نہیں بلکہ میرے بوڑھے ماں باپ کو بھی بھگتنا پڑے گا اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھو یہ قیامت جب ٹوٹنی تھی تو مجھے ہی منظر سے غائب ہونا پڑا۔ مجھے جو اس ساری صورت حال کا ذمہ دار ہے اور بھگتنا پڑا میرے ابا جی کو۔ جو پہلے ہی اس کے مخالف تھے۔ پتہ نہیں کیا کیا چرکے نہ لگائے ہوں گے اس نواب نے جو وہ اس حال کو پہنچ گئے۔ اماں نے کھل کے کچھ خاص بتایا بھی تو نہیں۔ صرف یہی کہتی رہیں کہ ساری عمر کی ذلالت ایک طرف اور وہ ذلالت ایک طرف جو آج کمائی ہے۔ کاش میں اس وقت وہاں ہوتا تب دیکھتا کیسے کوئی میرے بے قصور ابا جی کی بے عزتی کرتا۔

بے قصور ہی تو ہیں وہ۔ کیا یہ ان کا قصور ہے کہ وہ اس خاندان میں پیدا ہوئے اور کیا یہ بھی ان کا قصور ہے کہ انہوں نے تعلیم سے بے بہرہ ہونے اور شعور سے آگہی نہ رکھنے کی وجہ سے اپنے آبائی پیشے کو جی جان سے اپنایا۔ بے قصور تو میں بھی ہوں' کیا یہ میرا قصور ہے کہ چند اعلیٰ نسب لوگوں کی نظر میں کم حیثیت ٹھہرائے جانے کے باوجود میں نے بھی عزت کمانا چاہی۔ اپنا من پسند ساتھی تلاشنا چاہا۔ ایک ایسا ساتھی جو میرے اندر کی محرومیوں کی تسکین کرسکے۔ عزت و حیثیت کی اس تشنگی کو اپنی اعلیٰ حیثیت سے سیراب کرسکے۔ نہیں صاحبزادہ نفیس علی خان' ہمارے قصور اتنے بڑے نہ تھے۔ نہیں کرنا تھی تمہیں اپنی بیٹی کی شادی تو نہ کرتے' تمہیں اس کا حق تھا۔ میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا۔ قاعدے سے انکار ہوتا تو میں بھی قاعدے سے پیچھے ہٹا ہوتا لیکن ضابطے تم نے توڑے ہیں اب کم تو میں بھی ثابت نہ ہوں گا۔ تمہاری خوش قسمتی ہوتی اگر میرے ابا یہ توہین چپ چاپ برداشت کرلیتے۔ بے عزتی کے اس جان لیوا وار سے بچ نکلتے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ آج وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ تمہیں میں چین کی نیند کیسے سونے دوں' تمہارے لیے عزت ہی سب کچھ ہے ناں' تو ٹھیک ہے اب سنبھالو اپنی عزت۔"

☼ ☼ ☼

"اجی میں نے کہا مبارک ہو۔"

وہ اپنے دھیان میں چولہے کے آگے چائے کے لیے کھولتے پانی پہ نظریں جمائے کھڑی تھی' جب عمیص کی سرگوشی کان کے بے حد قریب بکھری اور وہ تقریباً" اچھل ہی پڑی۔

"کہاں گم تھیں؟" وہ محظوظ ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔ اس وقت موتیا کی حالت ہی کچھ ایسی تھی۔ اسے اتنا نزدیک پا کے وہ بے حد گھبرائی گھبرائی۔ کچھ کچھ شرمائی شرمائی سی لگ رہی تھی۔

"یہیں ہوں۔" بہت آہستہ آواز میں کہہ کے اس نے پتی کا ڈبہ اٹھایا اور پانی میں پتی ڈالنے لگی۔

"چائے پیو گے؟" وہ دانستہ اسے دیکھنے سے گریز کررہی تھی۔

"پلاؤ گی تو پی لیں گے۔" آج اس کی ٹون ہی بدلی ہوئی تھی۔ موتیا کو اس مسلسل چڑانے والے انداز پہ جھنجلاہٹ محسوس ہوئی اور کوئی وقت ہوتا تو عمیص کے بدلے تیور اس کے دل کے تاروں کو چھو جاتے لیکن اس وقت اس کا دل انجانے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ اس کی کوئی بات خوشگوار نہ محسوس ہورہی تھی۔ عمیص بھی اس کی کیفیت بھانپ گیا۔

"کیا بات ہے' کچھ بجھی بجھی' کچھ اڑی اڑی سی لگ رہی ہو؟"

"چینی کتنی؟" وہ اس کا سوال یکسر نظرانداز کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ جس پہ وہ چڑ گیا۔

"منگنی ہوجانے کے بعد میرا شوگر لیول ہائی نہیں ہوگیا' میں آج بھی ڈیڑھ چمچہ چینی ہی لیتا ہوں۔"

اس کے تیز لہجے پہ موتیا نے خائف ہو کے دیکھا تو وہ دھیما پڑا اور قدرے شوخ بھی۔

"ہاں اگر تم اپنے "اسٹائل" سے میری زندگی میں کچھ رس' کچھ شیرینی گھولنا چاہو تو وہ الگ بات ہے۔"

"پلیز عمیص۔" وہ اس کا موڈ بحال کرنا چاہ رہا تھا جبکہ وہ اور بھی عاجز نظر آئی۔

"بات کیا ہے موتیا؟ پلیز بتاؤ' یا ہمارے رشتے کی نوعیت بدلنے کے بعد ہمارا پرانا رشتہ' ہماری دوستی کمزور پڑ گئی ہے؟ سچ سچ بتاؤ' گل نے کچھ کہا ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے اس سے کیا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"یہی تو بات ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔

"یہی تو ساری بات ہے عمیص کہ اس نے کچھ کہا نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ کوئی بات ہی نہیں ہوئی حالانکہ۔" اس کی آواز بھرا گئی تو عمیص اس کی آزردگی کا سبب جان گیا۔

"تم بھی ناں بس۔۔۔ وہ کچھ کہے تو مسئلہ' نہ کہے تو بھی مسئلہ۔" اس کے دکھ کی وجہ جان کے بھی وہ قصداً" اس معاملے کو ہلکا پھلکا لے رہا تھا۔

"یار تم سب گل کو ایک "کیس" کی طرح کیوں لیتے ہو۔ اس کے ہر عمل کو اعتراض کی عینک لگا کے کیوں دیکھتے ہو۔ وہ ایک نارمل انسان ہے' اور اس مرحلے پہ ویسا ہی ری ایکٹ کررہی ہے جیسا کہ کسی بھی نارمل انسان کو کرنا چاہیے۔ اسے دھچکا لگا ہے' شدید دھچکا' اسے سنبھلنے کا کچھ وقت تو دو۔ سب یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ وہ اتنے بڑے جذباتی حادثے سے ہنستے کھیلتے گزر جائے' اور ہم میں سے کون ہے جس نے اسے سنبھلنے میں مدد دی ہو بلکہ الٹا ہم سب کو اپنی اپنی۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ مگر موتیا نے اس کی اس ادھوری بات سے مکمل مطلب اخذ کرلیا۔

"نہیں عمیص۔ اپنی اپنی نہیں۔ ہم سب کی' اس گھر کی خوشیاں عزیز ہیں سب کو۔ بتاؤ کیا ہوا ہے یہاں' کوئی آتش بازی ہورہی ہے؟ چراغاں کیا جارہا ہے؟ آس پڑوس میں بتاشے بانٹے جارہے ہیں؟ صرف ابا حضور کے دل کی تسکین کی خاطر ان کی ایک خواہش پہ ہی تو عمل کیا گیا ہے۔ کیا اس کا ان سے کوئی رشتہ نہیں؟ ہم سب اس کے کچھ نہیں لگتے؟ میں اس کی بہن نہیں؟" اچانک اس کے روکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

"کیا وہ مجھے زندگی کے اس اہم موڑ پہ ایک دعا تک نہیں دے سکتی تھی۔ ایک لفظ تک نہیں ادا کرسکتی تھی جھوٹی مبارک باد کا۔ میں رات کتنی دیر تک منتظر رہی' مگر وہ اسی کمرے میں منہ موڑے چپ چاپ لیٹی رہی۔ مجھے بلانا تو درکنار میری جانب دیکھا تک نہیں' اور اس کے بعد کل بھی سارا دن اور آج بھی' ابھی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"یعنی اس کی طرح تم نے بھی اسے نہیں بلایا۔" اور جواباً" اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ کہا۔

"ہوسکتا ہے وہ بھی یہی کچھ سوچ رہی ہو جو تم سوچ رہی ہو۔ اسے بھی تم سے یہی گلہ ہو۔ تمہیں شکایت ہے کہ اس نے تمہاری خوشی میں شریک ہونا گوارا نہیں کیا تو یہ شکوہ اسے بھی ہوسکتا ہے کہ تم اس کے دکھ میں شریک نہیں ہوئیں۔"

بات موتیا کی سمجھ میں آگئی۔

"ہاں ٹھیک ہی تو کہتا ہے عمیص۔ وہ کتنی زود رنج ہے۔ اس سے اپنی مرضی کے خلاف اور اپنے معیار سے کم کچھ مشکل سے ہی برداشت ہوتا ہے۔ جو ہوا برا ہوا اور واقعی گل کی ضد کے نتیجے میں ہوا۔ ہم نے اتنا ظرف تو دکھا لیا کہ اسے اس کی غلطی کا احساس دلانے سے گریز کیا' اس کے غلط فیصلے کے بھیانک نتائج اور اس کی کھوکھلی پسند کو جتلانا مناسب نہیں سمجھا تاکہ اس کی دل آزاری نہ ہو اور اس کی ندامت کھسیاہٹ میں نہ بدل جائے مگر کیا یہ کافی تھا؟ اس کے بعد۔۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا کیا ہم نے؟ کچھ بھی تو نہیں اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔" کچھ دیر قبل تک اس سے شاکی' اب اپنا محاسبہ کررہی تھی۔

چائے کے دو کپ شامی کباب کے ساتھ ٹرے میں رکھ کے وہ اپنے کمرے میں آئی۔ جانتی تھی گل نے دوپہر کو

برائے نام سا کھانا کھایا تھا۔ ساری دوپہر اس نے واک مین چڑھا کے اوندھے منہ بستر پہ لیٹے گزاری تھی۔ ابھی آدھا گھنٹہ قبل موتیا نے اسے اسی انداز میں کمرے میں چھوڑا تھا مگر اب جب چائے کے ساتھ آئی تو اس کا رنگ ڈھنگ ہی جدا تھا۔ وہ نک سک سے درست کہیں جانے کو تیار اپنے نازک پیروں میں سلور اسٹریپ والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ شاید ابھی ابھی نہا کے آئی تھی۔ کلپ میں قید بال ہلکی ہلکی نمی لیے ہوئے تھے اور پشت سے لائٹ پنک قمیص بھی نم نم سی لگ رہی تھی۔ شاید ہلکے گیلے بالوں کی وجہ سے۔

"تم کہیں جا رہی ہو؟" موتیا نے پوچھا مگر وہ جواب دینے کی زحمت کیے بغیر اپنے بیگ کو کھول کے پتا نہیں کیا ڈھونڈنے لگی۔

"تم۔۔۔ کہیں تم آفس تو نہیں جا رہیں؟" اچانک اسے سوجھا۔

"اس وقت ہم وہاں جا کے کیا کریں گے۔ ہاں جانا تو ہے ہی۔ جانا تو ہے ایک دن۔"

"کیا؟ تم اتنا سب ہونے کے بعد بھی وہاں جاؤ گی۔" وہ اس کا دکھ بانٹنے آئی تھی مگر اب عمیص کی ساری باتیں فراموش کیے اس سے الجھ رہی تھی۔

"کیوں نہ جائیں؟" گل نے شانے اچکائے۔ وہ اب بیگ کاندھے پر لٹکائے سن گلاسز چڑھائے جانے کو تیار تھی۔

"وہ شخص ایک فراڈ ثابت ہو چکا ہے گل۔ ابا حضور نے صرف اس پہ شبہ ہی نہیں کیا بلکہ اس بات کو ثابت بھی کیا ہے اور وہ دونوں وہ اس کے جھوٹے ڈرامے باز ماں باپ بھی مکرے نہیں۔ انہوں نے قبول کیا کہ ان سے یہ غلطی ہوئی اب کیا جواز رہ جاتا ہے ایسے شخص سے تعلق قائم رکھنے کے لیے جس نے تم سے جھوٹ بولا۔ اس رشتے کی بنیاد ہی جھوٹ پر قائم کرنا چاہی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں گل' مانا کہ تمہارے لیے یہ سب بہت مشکل ہوگا مگر تمہیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔"

"مثلاً۔۔۔ مثلاً "کیا کرنا ہوگا ہمیں۔" وہ اس کے نزدیک آئی اور سینے پہ بازو باندھ کے بظاہر بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"تمہیں اپنے دل و دماغ سے اس شخص کا خیال' اس کی محبت اور اس کی طلب نکالنی ہوگی۔ یہی تمہارے لیے اور ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔"

"ہم سب کا تو ہم نے ٹھیکا نہیں لے رکھا البتہ ہم اپنے لیے صرف اور صرف بہتری کرنا چاہتے ہیں اور رہا تمہارا مشورہ تو ہم اس پہ بھی عمل ضرور کرتے اگر ہمارے دل میں اس وقت نکالنے لائق کچھ باقی ہوتا۔ ہمشیرہ' یہاں نہ طلب ہے نہ ہی چاہت۔ جو ہے اسے فی الحال نکالنا مصلحت کے خلاف ہے اور معاف کرنا ہم تمہاری دوسری خواہش پہ بھی عمل نہیں کر سکتے۔ آج تو نہیں مگر ایک آدھ روز تک ہم آفس جائیں گے ضرور۔"

"کیا مطلب؟" موتیا کے پلے اس کی ایک بھی بات نہ پڑی۔

"کیوں؟ کیا ہم اپنے ڈیوز چھوڑ دیں؟ بھئی محنت کی ہے' اپنا حق تو نہ چھوڑیں گے۔ وہ وصول کرنے اور باقاعدہ استعفیٰ دینے تو جانا ہی ہوگا۔" وہ بہت نارمل انداز میں کہہ رہی تھی۔

"چھوٹی بی بی' رکشہ آگیا ہے۔" دروازے پہ ہلکی سی دستک کے ساتھ دلگیر کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ شاید گل نے اس سے رازداری برتنے کو کہا تھا' ورنہ اس کے سراتنے دھیمے نہ ہوتے تھے۔ عمیص نے اسے یونہی تو "پھٹی ہوئی ڈھولکی" نہیں قرار دے رکھا تھا۔

چائے یونہی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ موتیا گل کے بدلے ہوئے انداز پہ الجھ سی گئی۔ کہاں تو آج تیسرا دن تھا وہ کسی سے بات کرنے کی روادار نہیں تھی۔ نہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی نہ بال سنوار رہی تھی۔ نہ ہی ڈھنگ سے کھا پی رہی تھی اور کہاں آج یہ عالم تھا کہ نک سک سے تیار اتنی گرم سہ پہر میں رکشہ منگوا کر نجانے کہاں چل دی۔ اس وقت تو گزرے دو دنوں کے کسی ملال کا اس پہ سایہ تک نہ لگ رہا تھا۔

"سنو دلگیر!" اسی کھوئے کھوئے انداز میں وہ ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھائے کمرے سے نکلی تو برآمدے میں ریڈیو کان سے لگائے بیٹھے دلگیر کو پکارا۔

"سنایئے بی بی ہم ہمہ تن گوش ہیں۔"

"کچھ پتا ہے یہ گل کس طرف گئی ہے۔"

"ہمیں قریب ہی' پاس والی مارکیٹ کا کہہ کر رکشہ منگوایا ہے۔ پتا ہے پورے پچیس روپے مانگ رہا تھا' یہ تو ہم ہیں جس نے رعب ڈال کے بیس پہ بات ختم کرائی۔"

"اور کچھ۔ میرا مطلب ہے کچھ واپس آنے کے بارے میں کہا؟ یا یہ کہ وہ کیا لینے جا رہی ہے؟"

"لیجیے اتنی بات وہ بھلا ہم سے کب کرتی ہیں۔ ہاں اتنا پوچھا تھا کہ عمیص گھر پہ ہیں یا اسٹور چلے گئے۔ ہم نے بتا دیا کہ ابھی ابھی اسٹور کی طرف نکلے ہیں' دوپہر کے قیلولے سے فارغ ہو کے۔"

"عمیص کے بارے میں پوچھا۔ مگر کیوں؟" اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔

"اور گئی بھی اسی مارکیٹ میں ہے۔ کہیں عمیص کے اسٹور پہ۔۔۔" اس کے دل کو گویا پنکھے لگ گئے۔

"تو کیا ہوا؟ کیا نہیں جا سکتی؟ نہیں بات کر سکتی وہ عمیص سے؟" ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کے اس نے خود کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔ مگر ناکام رہی۔

"ہاں کر سکتی ہے۔ ضرور بات کر سکتی ہے وہ عمیص سے مل بھی سکتی ہے مگر وہ یہاں گھر پہ بھی تو مل سکتی تھی اس سے۔ کوئی بات کرنا تھی تو یہیں کر لیتی۔ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے جسے کرنے کے لیے اسے عمیص سے اس کے اسٹور پہ اکیلے ملنے جانا پڑا۔"

☼ ☼ ☼

گرمی اتنی تھی کہ اسے دوپہر کو دو گھنٹے کے لیے اسٹور لازماً "بند کرنا پڑتا تھا۔ ایک تو دوپہر کے وقت کسٹمرز بھی خاص نہ آتے تھے۔ عام ضروریات زندگی کی چیزیں ہوں تو چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی گاہک آ ہی جاتا ہے مگر اس کا بی پی او شام کے اوقات میں زیادہ چلتا تھا یا ٹھیک دوپہر کے وقت جب آس پاس کے اسکولز اور کالجز میں چھٹی ہوتی تھی۔ زیادہ تر اسٹوڈنٹس نیٹ کارڈز یا کالنگ کارڈز خریدنے آتے یا پھر کچھ نہ کچھ فوٹو اسٹیٹ کروانے۔ اس نے ایک ۔۔۔ فریج بھی رکھ لیا تھا' گرمی سے بے حال کسٹمرز کو چند منٹ رکنا پڑتا تو کولڈ ڈرنکس بھی لے لیتے مگر اس کے بعد کئی گھنٹے تک یہ مارکیٹ سنسان رہتی۔ شام ہوتی تو چہل پہل شروع ہوتی۔ کچھ دن وہ بھی اسٹور کے تنور میں جلتا بھنتا رہا پھر دوپہر کے وقت وقفہ کرنے کا سوچا۔ فی الحال وہ اے سی یا اسپلٹ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ کام ٹھیک جا رہا تھا مگر وہ قرضہ اٹھا کے زیر بار نہ ہونا چاہتا تھا۔ حال ہی میں ایک موٹر بائیک بھی قسطوں پہ حاصل کی تھی۔

آج بھی اس نے حسب معمول دوپہر سوا دو بجے کے قریب اسٹور بند کیا' گھر جا کے دلگیر سے ایک بڑا گلاس خوب جھاگ دار نمکین لسی کا بنوایا جس کے زیر اثر آتی غنودگی کو زائل کرنے کے لیے پورے پندرہ منٹ تک شاور کا مزا لیا۔ خاص بھوک تو نہ تھی مگر موتیا نے اس کے آتے ہی روٹیاں پکا کے پلیٹ دی تھیں اس وجہ سے تھوڑا بہت کھانا بھی کھایا' کچھ وقت چچا حضور کے ساتھ گزار کے وہ موتیا کے پاس کچن میں چلا آیا۔ سونے کا وقت تو رہا نہیں تھا اس لیے ارادہ تھا کہ اس کے ساتھ چائے کے ایک کپ کے ہمراہ کچھ گپ شپ ہو جائے گی۔ اس نئے بندھن میں بندھنے کے بعد سے اب تک دونوں کے درمیان ڈھنگ سے خاص بات بھی نہ ہوئی تھی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں گل موضوع بحث بن گئی۔ گھر سے نکلتے ہوئے بھی عمیص تاسف سے یہی سوچتا رہا۔

"مجھے جانب داری سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔ مجھے نہیں بھولنا چاہیے کہ موتیا اب صرف میری دوست اور عم زاد نہیں بلکہ میری منگیتر ہے۔ اس کے مجھ پہ چند حقوق ہیں اور ظاہر ہے کچھ توقعات بھی۔ مجھے پہلے کی طرح ہر بات میں گل کو درست اور اسے غلط نہیں قرار دینا چاہیے۔ گل کی جا بے جا حمایت کرتے کرتے مجھے اس بات

کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ یہ عادت اب ترک کرنا پڑے گی۔"

وہ یہ فیصلہ کر ہی رہا تھا جب انتہائی غیر متوقع طور پر گل اندر آئی۔

"تم۔۔۔؟" اس کی حیرانی بجا تھی اور اس کا اظہار بے ساختہ تھا۔ پہ اس نے دو تین بار اس کی بابت دریافت کیا تھا اور پتا چلا تھا کہ وہ سوئی ہوئی ہے۔ موتیا نے یہ بھی بتایا تھا کہ پچھلے دو روز سے اس نے کسی کو مخاطب نہیں کیا۔ چچی حضور نے بھی دبے الفاظ میں اس کے اٹوانی کھٹوائی لے کے پڑنے کا ذکر کیا تھا اور اس وقت آسمانی اور پنک خوبصورت پرنٹ کے لان کے سوٹ میں ملبوس 'انہی دو رنگوں کا ڈائی والا دوپٹہ سر پہ لیے وہ بڑی فریش فریش اور تر و تازہ نکھری سی لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پہ کھلی مسکراہٹ میں کوئی تصنع نہ تھا۔

"اتنی گرمی میں تم کیوں نکلیں؟ کوئی خاص کام تھا کیا؟"

اس نے آگے بڑھ کے عین پنکھے کے نیچے اپنا واحد اسٹول رکھا اور پنکھے کی اسپیڈ بھی تیز کر دی۔ ساڑھے چار بج رہے تھے مگر دھوپ کی شدت اور حدت دونوں برقرار تھیں۔ اس کا اندازہ گل کے تمتماتے چہرے اور اس پہ نمودار پسینے کے قطروں سے بخوبی ہو رہا تھا۔

"ابا حضور قیلولے کے لیے بیٹھک میں گئے تھے اور تمہیں تو پتا ہے کہ وہ عصر کی نماز ادا کرنے وہیں سے نکل جاتے ہیں اور مغرب کے بعد ہی آتے ہیں۔ موقع اچھا تھا ہم تو ان کے آنے سے کہیں پہلے فارغ ہو کے واپس بھی چلے جائیں گے۔ اگر شام تک کا انتظار کرتے تو۔۔۔۔" اس نے بیگ سے ایک انڈکس نکالی۔

"فون کرنا ہے؟" عمیص نے اندازہ لگایا جو درست نکلا۔ وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

"شہزاد ملک کو؟"

اس سوال کا جواب بھی ایک خاموش اثبات میں ملا۔

"کمال ہے تمہیں نمبر تک یاد نہیں۔" اسے حیرت ضرور ہوئی تھی گل کے یہاں آ کر فون کرنے کے فیصلے پہ مگر اپنی حیرت چھپا کے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں تو پتا ہی ہے ہم فون نمبرز اور ایڈریسز وغیرہ یاد کرنے میں ذرا پھسڈی ہیں۔" اس نے ٹیلی فون سیٹ آگے کر کے نمبر پش کیے۔ عمیص قصداً "دوسری جانب مصروف ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ریسیور رکھنے کی آواز پہ پلٹا۔

"کیا ہوا؟"

"آفس میں نہیں ہے۔ کیا ہم موبائل نمبر ٹرائی کر لیں۔"

"ضرور' تمہارا اپنا فون ہے۔"

"کیا مصیبت ہے۔ یا تو سیل نمبر آف ہے یا پھر سگنل نہیں مل رہے۔" ایک دو بار نمبر ملانے کے بعد اس نے پھر مایوس ہو کر ریسیور پٹخ دیا۔

"ریلیکس۔۔۔ کچھ پیو گی؟ کوک۔۔۔ جوس؟"

"ہاں ایپل جوس دے دو۔"

"گل' اچھا ہوا تم خود آ گئیں۔ میں ویسے بھی تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

"تو پھر کیوں نہیں؟ کیا "کسی" نے منع کر دیا تھا؟" گل نے بڑے چبھتے انداز میں کہا جسے وہ نظر انداز کر گیا۔

"دیکھو گل' اس دن جو ہوا' اس پہ سب کو افسوس ہے اور مجھے خاص طور پہ اس لیے کہ میں اس درد سے گزر چکا ہوں۔ اگرچہ یہ ہمارے درمیان' بہت پہلے طے ہو چکا ہے کہ اب میں کبھی تم سے اپنی پرانی وابستگی کا ذکر نہیں کروں گا یہاں میں صرف ایک مثال کے طور پہ اسے بیان کر رہا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔ تو اب آپ جناب کی مثالیں بھی پیش کی جائیں گی۔" وہ ہنسی اور اس کی یہ ہنسی عمیص کو سراسر بناوٹ محسوس ہوئی۔

"دکھ بانٹنے سے کم ہو جاتا ہے گل۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ تمہارے ٹھکرائے جانے کی اذیت چپ چاپ دل میں اتار لوں گا مگر ایسا کرنا میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوا۔ اگر موتیا میرا درد نہ بانٹتی تو میں آج تمہیں اتنا مربوط نہ نظر آ رہا ہوتا۔ تمہارے اپنوں کی بھی کمی نہیں یہاں میں ہوں' موتیا ہے' تمہاری امی حضور ہیں' تم ہمیں اپنے آپ سے الگ کبھی مت سمجھنا۔ چچا حضور وقتی طور پہ تم سے برگشتہ ضرور ہیں مگر کبھی تم خود کو ان کی جگہ رکھ کے دیکھو تو تمہیں احساس ہو گا کہ اتنا غصہ کرنا تو ان کا حق بنتا ہے۔"

"ہمیں اب تک سمجھ نہیں آیا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ ایک بار پھر فون ٹرائی کر رہی تھی۔

"صرف یہ کہ اس درد کو روگ مت بناؤ۔ مجھے موتیا نے بتایا کہ کس طرح تم پچھلے دو روز سے سب سے کٹی ہوئی ہو۔"

"ہاں تو کیا کریں' گلے لگ لگ کے مبارکباد دیں دیتے یا وصول کرتے پھریں۔ اور کسی سے بات کر کے ہمیں ملے گا بھی کیا' طعنے' الزام۔۔۔۔؟"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ کوئی تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہرا رہا۔ شہزاد کے رشتہ لانے کی بات چونکہ غیر متوقع تھی اور ہماری روایات کے منافی بھی اس لیے شروع میں سب ہچکچا رہے تھے مگر روایتیں تو ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتی ہیں' ایک بار ایک روایت کو توڑتے ہوئے پہلا قدم میں نے اٹھایا تھا' اس بار ایک اور غلط روایت کو توڑنے کے لیے تم نے ہمت کی۔ ہاں یہ الگ بات کہ معاملہ کچھ اور نکل آیا اب تو سب نے اپنے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ اس بار دل کو سمجھانے کے لیے انہیں زیادہ وقت اور مزید دلائل کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس کے ماتھے پہ شکن نمودار ہوئی۔

"تم کچھ صبر سے کام لو۔ ابھی چچا حضور کا صدمہ تازہ ہے فی الحال انہیں چھیڑنا بعید از مصلحت ہے۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں گل کہ انہیں راضی کر لوں گا۔ سمجھا لوں گا کہ شہزاد ملک کے والدین کا ماضی کچھ بھی رہا ہو مگر خود وہ ایک قابل انسان ہے اور معاشرے میں اپنے بل بوتے پہ نام اور عزت بھی کما چکا ہے۔ بس کچھ دن کی بات ہے۔ میرا یقین کرو گل' کبھی نہ کبھی وہ مان ہی جائیں گے۔ تسلیم کر لیں گے کہ شہزاد ملک ہر لحاظ سے تمہارے لائق ہے۔"

"اور۔۔۔ اور یہ تم ان سے تسلیم کرواؤ گے؟" وہ عجیب اجنبی سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں' میں۔۔۔ کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تمہارا حق۔۔۔"

"مگر تم ایسا کرو گے کیوں؟"

اس کے سوال پہ حیرت سے عمیص نے آنکھیں سکوڑیں۔

"کیوں۔۔۔؟ ظاہر ہے تمہاری محبت۔۔۔"

"ہیلو۔۔۔" دوسری طرف شاید لائن مل گئی تھی۔ اس لیے گل اس کا جواب ادھورا چھوڑ کے بات کر رہی تھی۔

"ہم صاحبزادی گل مہر خانم بول رہے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"گل مہر۔۔۔"

شہزاد نے بے یقینی سے دہرایا۔ وہ بلقیس کو لینے کے لیے ہاسپٹل سے نکل ہی رہا تھا ابھی کار اسٹارٹ کی تھی کہ موبائل کی بیپ بج اٹھی۔ ہاسپٹل میں اس نے سیل فون آف کر کے رکھا تھا' پارکنگ کی جانب آتے آتے ہی آن کیا تھا اور اگلے ہی منٹ یہ کال آ گئی۔ اس نے اسکرین پہ اس انجان نمبر کو دیکھا اور پھر گل کا تعارف۔۔۔۔

"ہم صاحبزادی گل مہر خانم بول رہے ہیں۔"

"گل مہر۔۔۔" اسے لگا جیسے منزل خود چل کے اس کے پاس آ گئی ہو' ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے رابطے کی کیا صورت نکالی جائے کہ خود اس کا فون آ گیا۔ کئی گھنٹوں کے بعد شہزاد نے ایک اطمینان بھری سانس بھری۔

"اب بتاؤ صاحبزادہ نفیس علی خان۔ کتنے بند باندھو گے' مجھے نقب لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہارا

عاجزی سے اپنا ہاتھ تمہارے آگے پھیلایا تھا اور جسے تم عزت کے ساتھ میرا کرنے کے روادار نہیں۔ اب وہی بیٹی از خود اپنا آپ مجھے سونپے گی۔ بعض لوگوں کو عزت راس نہیں آتی اور تم شاید انہی میں سے ایک ہو۔ تم نے میرے باپ کی عزت کا خیال نہیں کیا۔ کیا میں تمہاری ناموس کا کروں گا؟ یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے دوں گا؟ نہیں ہرگز نہیں مجھے اس جذباتی لڑکی کی محبت میں اور شدت پیدا کرنی ہے۔ اتنی کہ یہ میری خاطر اپنے باپ کے نام کو ٹھوکر مارنے پہ راضی ہو جائے۔"

اسے خدشہ تھا کہ اس کی غلط بیانی پہ گل بھی اس سے کچھ کچھ ناراض ہوگی مگر وہ منالے گا اور اب غیر متوقع طور پہ اس کا فون باور کرا رہا تھا کہ اسے یہ مرحلہ بھی سر نہیں کرنا پڑے گا۔

"کیا ہوا؟ ہمارے نام نے ایسا کیا سحر پھونکا ہے، جو آپ پہ سکتہ طاری ہو گیا؟" دوسری جانب سے ایک بار پھر اس کی آواز ابھری۔ شہزاد نے خود کو سنبھالا۔

"دراصل میں توقع نہیں کر پا رہا تھا کہ۔۔۔"

"کہ ہم آپ کو فون کریں گے۔" گل نے بات اچک لی۔

"وہ کیا ہے ناں کہ توقعات تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ کبھی آپ کسی کی توقعات پہ پانی پھیرتے ہیں تو کبھی کوئی دوسرا آپ کی توقعات کے محل کو زمین بوس کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کیا خیال ہے؟" بڑا کٹیلا انداز تھا جس پہ شہزاد ٹھٹکا۔ حیرانی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ گل نے کبھی اس سے اتنی لمبی بات کی بھی نہیں تھی۔ وہ مختصر فقرے کہنے کی عادی تھی اور زیادہ تر دو تین لفظوں یا ہاں ہوں سے کام چلا لیتی تھی۔

"تم شاید ناراض ہو۔ شاید اس لیے کہ میں تم سے رابطہ نہیں کر سکا۔ دراصل میرے اباجی۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ کیا ہوا انہیں؟" گل نے ایک بار پھر بات کاٹی۔

"ہارمونیم میں ہاتھ آگیا یا کسی فضول جگت کے رد عمل کے طور پہ ان کے تماش بینوں میں سے کسی نے کوئی گلا سڑا ٹماٹر یا انڈا دے مارا؟"

"گل مہر؟" اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔

"او ہاں ہم تو بھول ہی گئے کہ اب وہ "تماشے" نہیں کرتے، میلوں یا ڈراموں میں۔۔۔ اسٹیج فیکٹر۔۔۔ ویسے۔۔۔ اکلوتے بیٹے اور وارث ہونے کے ناتے آپ ان کی گدی کیوں نہیں سنبھال لیتے؟ آخر "خاندان" کا نام بھی تو روشن کرنا ہے۔"

"دس از ٹو مچ گل مہر۔" اس کے چبا چبا کے کہے اس طنزیہ فقرے نے چند لمحوں کے لیے تو شہزاد کو گنگ سا کر دیا۔ حیرت اور بے یقینی سے نکلتے ہوئے اس سے بس اس قدر ہی کہا گیا۔

"تو شہزاد ملک۔۔۔ آپ اس سے کہیں زیادہ ڈیزرو کرتے ہیں۔ آخر آپ اس شخص کے بیٹے ہیں، جس نے ایک عرصے تک اپنے فن سے لوگوں کو محفوظ کیا ہے، دکھی انسانیت کی خدمت کی ہے اور آپ کی والدہ۔۔۔ واہ کس قدر گریٹ خاتون ہیں۔ گلی گلی پیدل پھرتے ہوئے گڑوی بجا بجا کے انہوں نے اپنی آواز کے سر بکھیرے ہیں۔ ہر خاص و عام کو ایک ہی ریٹ پہ انٹرٹین کیا ہے۔ فقط ایک روپیہ۔۔۔ واہ۔۔۔ قابل تحسین۔"

شہزاد ملک کے اعصاب بری طرح تن گئے۔ اس کے ماتھے اور کنپٹی کی رگ خطرناک حد تک ابھر کے پھڑک رہی تھی۔ آنکھیں شعلہ بار ہو چکی تھیں۔ اگر کہیں گل اس وقت اس کے سامنے ہوتی تو۔۔۔ تو۔۔۔ شاید۔۔۔ وہ اس کے پرخچے تک اڑا ڈالتا۔

اب وہ دبی دبی ہنسی ہنس رہی تھی۔ وہ ایسے ہی ہنستی تھی۔ شہزاد نے اسے کبھی کھل کے ہنستے نہ دیکھا تھا۔ ملکے سروں کی ہنسی۔ جیسے شبنم کے قطرے ہولے ہولے کسی پنکھڑی پر اتر رہے ہوں لیکن اس مدھم ہنسی میں شبنم کی ٹھنڈک نہیں، سلگتے انگاروں کی سی حدت تھی۔ وہ حدت۔۔۔ جس نے شہزاد ملک کے اندر سالوں سے جلتے

بھانبھڑ کو ہوا دے ڈالی تھی۔

"گل مہر۔ اپنی حد میں رہ کے بات کرو۔"

"اپنی حدود کو پھلانگنے کی جسارت آپ نے کی ہے مسٹر۔" یک لخت اس کا بناوٹی نرم لہجہ کرخت ہو گیا۔

"اپنی اوقات سے کہیں بڑی جسارت۔۔۔ صاحبزادی گل مہر خانم کی خواہش کرنے کی گستاخی اور اتنے معمولی بلکہ گھٹیا اور ذلیل شخص کی اتنی بڑی گستاخی ہم آسانی سے معاف نہیں کر سکتے۔ دل تو چاہتا ہے کہ آپ کو چوراہے پہ کھڑا کر کے سرعام کوڑے لگوائیں تاکہ اوروں کو عبرت حاصل ہو۔ انہیں پتا چلے کہ اپنے جامے میں رہنا کس قدر منافع بخش ہے۔ نالی کے کیڑوں کو خوشبو راس نہیں آتی۔ اتنی بڑی خواہش آخر آپ نے کی کیسے؟ کاش ہم اس جرم کی پاداش میں آپ کو کڑی سے کڑی سزا دلوانے پہ قادر ہوتے۔"

اور اس سے پہلے کہ یہ تپش بڑھ کے شہزاد ملک کا اندر یا ہر راکھ کر دیتی، اس نے اپنا موبائل آف کر کے زمین پہ پٹخ دیا۔

وہ دحشت زدہ نظروں سے زمین پہ گری اس چیز کو دیکھ رہا تھا جس نے ابھی ابھی اس کی سماعتوں میں انگارے برسائے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اے سی آن کر دیا تھا مگر اب اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی تنور میں بیٹھا ہے یا شاید دوزخ میں، اس کی سانس بند ہونے لگی۔ اس نے دونوں اطراف کے شیشے اتار دیے اور منہ کھول کے تازہ ہوا لینے کی کوشش کی، مگر ایسا کرنے کی سعی میں اس کے حلق میں دور تک کانٹے ہی کانٹے اگ آئے۔

"گل مہر۔۔۔ تم۔۔۔" اس نے بے بسی کے عالم میں اسٹیئرنگ پہ مکا مارا۔ جس کی محبت کے زعم میں وہ صاحبزادہ نفیس علی خان سے ٹکرانے چلا تھا، وہ محبت ہی مکر گئی۔

جسے مہوبنا کے باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا، وہ مہو خود اپنی چال چل گیا اور کیا ظالم چال چلا کہ شہزاد ملک اس وقت چاروں شانے چت پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔ ہم صاحبزادی گل مہر خانم بول رہے ہیں۔"

ابھی اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا کہ عمیص نے قصداً اپنا رخ پھیر لیا۔ وہ قدرے الگ تھلگ اور دور کھڑا ہو کر بظاہر ریک میں رکھے اس ماہ کے رسائل کی ترتیب درست کرنے لگا۔ مقصد صرف گل کو مقدور بھر پرائیوسی فراہم کرنا تھا تاکہ سکون سے وہ شہزاد ملک سے بات کر لے۔

پتا نہیں وہ چچا حضور کے شدید بلکہ ایک حد تک نامناسب سلوک کی تلافی کس طرح کرے گی۔ معذرت پیش کرے گی یا کوئی توجیہہ بیان کرے گی؟ معذرت؟ اور گل معذرت پیش کرتی ہوئی بھلا کیسی لگے گی؟؟

انتہائی سنجیدہ صورتحال میں بھی اس خیال نے اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیلا دی۔

"ہارمونیم میں ہاتھ آگیا یا۔۔۔"

چھوٹا سا اسٹور تھا اور اس وقت خالی بھی۔۔۔ اردگرد بھی رش نہیں تھا۔ خاموشی کے باعث نہ چاہتے ہوئے بھی گل کی آواز بغیر کسی کوشش کے با آسانی اس تک پہنچ رہی تھی۔ سخت طنزیہ بلکہ تضحیک بھرے انداز میں کہا گیا یہ فقرہ اس کے کان سے ٹکرایا اور وہ بری طرح چونک گیا۔

"اکلوتے بیٹے اور وارث ہونے کی وجہ سے آپ ان کی گدی کیوں نہیں سنبھال لیتے؟"

بظاہر بہت سنجیدگی اور اپنائیت سے کہے اس فقرے میں طنز کی کتنی مار تھی اس کا اندازہ سننے والے کو بخوبی ہوتا تھا۔

"اور آپ کی والدہ۔۔۔ گلی گلی گڑوی بجا کے انہوں نے اپنی آواز کے سر بکھیرتے ہوئے ہر خاص و عام کو ایک ہی ریٹ پہ انٹرٹین کیا ہے۔ فقط ایک روپیہ۔"

اب تو حد ہو گئی۔ عمیص گردن گھما کے اسے دیکھنے پہ مجبور ہو گیا کہ اتنا عامیانہ وار کرتے ہوئے وہ کیسی لگ

رہی ہوگی۔

"اپنی اوقات سے کہیں بڑی جسارت' دل تو چاہتا ہے سر عام آپ کو کوڑے لگوائیں۔"

اس کے چہرے کے نقوش خطرناک حد تک بگڑے ہوئے تھے۔ ہر نقش پہ فقط نفرت ہی نفرت رقم تھی۔ عمیص کو اس کے اندر وحشی ہو کے مچلتی اس نفرت سے خوف محسوس ہوا۔

"نالی کے کیڑوں کو خوشبو راس نہیں آتی۔"

اور عمیص کا جی چاہا آگے بڑھ کے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دے یا ریسیور چھین لے مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔

"بزدل' سچ سننے کا حوصلہ نہیں۔ لائن کاٹ دی۔" وہ ریسیور کریڈل پہ پٹخ رہی تھی۔

"کاش یہ کام وہ پہلے کر لیتا اور تم کہتی ہو اس میں حوصلہ نہیں۔ اگر اس وقت وہ شخص زندہ ہے یا کم سے کم اپنے حواسوں میں ہے تب بھی میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ وہ بے حد حوصلہ مند ہے۔ بے عزتی برداشت کرنا آسان کام نہیں۔ مگر تب یہ کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے جب یہ توہین اس جانب سے ہو' جہاں سے آپ نے سدا چاہت کی توقع رکھی ہو۔"

"اب تمہیں کیا ہوا؟" گل نے اس کے بے حد حیران پریشان چہرے کو دیکھ کے پوچھا تو وہ خیالوں سے باہر آیا۔

"یہ سوال مجھے کرنا چاہیے گل۔۔۔ یہ تمہیں کیا ہوا؟ اتنا سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت؟ ہم کہتے ہیں ہمیں اس سے کئی گنا زیادہ کچھ کرنا چاہیے تھا' کچھ ایسا کہ دوبارہ زندگی میں وہ کوئی خواہش کرنا ہی بھول جاتا۔"

"خواہش کرنا اور طلب رکھنا ہر انسان کا فطری حق ہے۔ تم کون ہوتی ہو کسی کو اس حق سے محروم کرنے والی۔"

"اور اسے یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ ہمیں ہماری ہی نظروں میں گرا جاتا۔ اس قدر شرمندگی اور افسوس ہو رہا ہے کہ ہم آخر اس شخص کی باتوں میں آئے کیسے؟ منہ نوچ لینے کو جی چاہ رہا ہے۔ کاش ہمارے سامنے ہوتا تو ہم ایسا کر بھی ڈالتے ۔ مگر نہیں ہم اپنے ہاتھ کیوں ناپاک کرتے اس کا منہ نوچ کے۔ ہاں اس کے منہ پر تھوکتے ضرور۔"

عمیص کو اچانک ہی کراہیت کا احساس ہوا۔

"اور میں سمجھتا تھا تم اس سے محبت کرتی ہو۔ چلو محبت نہ سہی وہ تمہاری پسند تو تھا۔"

"نہیں وہ نہیں۔ اس کا مقام' اس کا اسٹیٹس' اس کی پرسنالٹی ہمیں پسند تھی اور اب جب ثابت ہو چکا ہے کہ وہ سب جھوٹ تھا تو کیسی پسند' کیسی محبت۔

☼ ☼ ☼

"آج دوپہر کو گل کہیں گئی تھی۔"

موتیا نے ٹٹولتے ہوئے انداز میں کہا۔ وہ ابھی ابھی گھر لوٹا تھا۔ برآمدے میں لگے واش بیسن میں منہ پہ پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے وہ خود کو فریش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کس قدر گرم پانی ہے لگتا ہے جیسے گیزر چل رہا ہو۔ منہ جھلس کے رہ گیا ہے۔"

"میں نے تمہارے باتھ روم میں پانی کی بالٹی دو گھنٹے پہلے بھر کے رکھ چھوڑی تھی۔ اب تک ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ اوور ٹینکی سے تو ظاہر ہے سارا دن کی دھوپ کھا کے گرم گرم ہی اترے گا۔" اسے اپنی بات کا کوئی ردعمل نہ پا کے جھنجلاہٹ تو ہوئی مگر اسے دباتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر پہلے میں نہا لیتا ہوں۔ آ کے شربت پیتا ہوں۔" وہ تولیہ اٹھا کے اندر گھس گیا۔ موتیا اس کے انتظار میں وہیں جگ اور گلاس لیے بیٹھی رہی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کچن میں مصروف تھی اور آنچ دھیمی کر کے اس کے لیے شربت بنا رہی تھی۔ موتیا کو شک سا ہوا کہ شاید وہ نہانے اسی غرض سے گیا ہو کہ چھ سات منٹ یا اس سے بھی دیر کے بعد وہ واپس آئے تو موتیا دوبارہ کچن میں مصروف ہو چکی ہو اور شاید وہ ایسا کر بھی لیتی مگر اس خیال کے آنے کے بعد اس سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ اپنے سوال کا نظرانداز کیا جانا اسے کھل رہا تھا۔

چند منٹ بعد وہ کمرے سے نکلا تو واقعی تر و تازہ لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی جینز اور ٹی شرٹ اتار دی تھی۔ اس

وقت وہ ململ کے سفید کرتے اور کاٹن کی شلوار میں ملبوس تھا۔ گیلے کالے بال بکھرے تھے اور جن کو وہ تولیے سے رگڑ کر خشک کرتا ہوا کرسی گھسیٹ کے بیٹھ رہا تھا۔

"ارے تم ابھی تک بیٹھی ہو۔"

اس کے اس جملے نے موتیا کے خیال کو اور بھی تقویت دی۔ وہ برا مان گئی۔

"کیوں تم کیا دعائیں مانگتے آئے تھے کہ میں تمہیں بیٹھی نہ ملوں۔"

"اور اگر میں کہوں میں نے بالکل برعکس دعا مانگی تھی اور چونکہ میری دعائیں کچھ خاص جلدی قبول نہیں ہوتیں اس لیے حیرت اور خوشی کے مارے۔" وہ گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اور اس کے چہرے کو نگاہوں کی زد میں لیتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اس کے بدن سے اٹھتی جبسمن ٹالکم پاؤڈر' باتھ سوپ اور ڈیٹول کی ملی جلی مہک موتیا کے حواس پہ چھانے لگی۔ اسے اپنی پلکوں پہ بے پناہ نیند کا بوجھ محسوس ہوا۔

"وہ۔۔۔ میں کہہ رہی تھی کہ آج دوپہر کو گل کہیں نکلی تھی۔"

"اچھا۔" اس کی مسکراہٹ غیر محسوس طریقے سے غائب ہوئی تھی۔ اگر جو موتیا بطور خاص پہلے سے یہ نوٹ نہ کر رہی ہوتی تو شاید اتنا محسوس نہ کرتی۔

"پتا نہیں کیا بات ہے صبح تک تو وہ سوگ کی سی کیفیت طاری کیے ہوئے تھی اور پھر اچانک تیار شیار ہو کے بغیر کسی کو کچھ بتائے نکل گئی۔"

"ہوں۔۔۔ چلو۔۔۔ اچھی بات ہے۔" موتیا کو اس کا ردعمل ناکامی محسوس ہوا۔ وہ بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔ اسی بے چینی کے زیر اثر وہ خود کو مزید کھوج لگانے سے روک نہ سکی۔

"کہیں وہ۔۔۔ وہ ادھر تو نہیں گئی' وہاں اس ملک کے پاس اپنے باس کے آفس؟"

عمیص اس کے اندازے پہ عجیب انداز میں مسکرایا۔ موتیا کو اس کی خاموشی کے ساتھ ساتھ اس کی مسکراہٹ بھی بہت معنی خیز لگی۔

"نہیں' وہاں نہیں جا سکتی۔"

"یہ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کیونکہ بس اندازہ ہے میرا۔" وہ بتاتے بتاتے رک گیا اور بات پلٹ دی۔ دراصل وہ جانتا تھا پہلے ہی موتیا گل کی بہت سی عادتوں کو ناپسند کرتی ہے اور معترض بھی رہتی ہے۔ ایسے میں وہ گل کے تازہ ترین خیالات اسے بتا کر ایک اور موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ موتیا کی تنقید کی زد میں آئے۔

"تو پھر۔۔۔ تو پھر آخر وہ گئی کہاں؟" وہ مسلسل اس کے چہرے کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ سوال کر رہی تھی۔

"آج کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا اسی سوال کی گردان جاری رہے گی۔ تمہارا موڈ نہیں ہو رہا پکانے کا تو میں بازار سے لے آتا ہوں۔"

"جا رہی ہوں۔" وہ تنک کے اٹھی۔

"اب کیسے بتا دوں کہ وہ کہاں گئی تھی۔ وہ میرے اسٹور پہ آئی تھی' یہ بتانے میں بظاہر کوئی حرج نہیں مگر۔۔۔"

وہ اسے کچن میں جاتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

"مگر پھر تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ وہ وہاں کس لیے آئی تھی۔ ظاہر ہے یہ جانے بغیر تم رہو گی تو نہیں' اور میں نہیں چاہتا گل کی شخصیت کا یہ پہلو اور کسی کے سامنے بھی آئے' جس پہلو نے مجھے اس قدر حیران کر دیا ہے۔"

عمیص سے مایوس ہوتے ہوئے موتیا نے گل سے صاف صاف بات کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس سے پہلے اس نے خود ہی بتا دیا۔

وہ کمرے میں گئی تو گل کو بیڈ پہ ڈھیر سارے میگزینز اور ڈائجسٹ پھیلائے دیکھا جو گھر میں پڑے ہوئے پرانے

ہرگز نہ لگ رہے تھے۔ بالکل نئے تھے۔

"اتنے رسالے۔۔۔؟"

"ہاں اب کیا کریں' فارغ بیٹھنے کی عادت جو نہیں رہی۔ جاب پہ تو جا نہیں رہے نہ ہی کوئی اور کام ہے۔ سوچا کچھ دن مطالعے سے دل بہلائیں اسی لیے اتنے سارے میگزینز اٹھا لائے۔"

وہ ورق گردانی کرتے ہوئے بتانے لگی۔ آج اس کا ہر انداز پرسکون اور نارمل لگ رہا تھا۔

"اوف۔۔۔" موتیا کے سینے سے کوئی بھاری بوجھ سرک گیا۔

"تو تم بک اسٹال گئی تھیں۔" وہ جیسے معاملے کی تہ تک پہنچ کر اب ہلکی پھلکی ہو کے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں بھئی۔ ویسے بھی ان بے کار چیزوں پہ کون اتنی رقم ضائع کرے۔ ایک آدھ خریدنا اور بات ہے۔ یہ تو دراصل ہم عمیص کے اسٹور سے اٹھا لائے تاکہ پڑھ کے واپس کر دیں۔"

"عمیص کے اسٹور۔۔۔" اس کا سکون بس پل بھر کا مہمان تھا جو گل کی اس بات نے غارت کر کے رکھ دیا۔

"تم وہاں گئی تھیں؟" خشک ہوتے حلق کو تھوک نگل کے تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ نہ تو گل کا وہاں جانا قابل اعتراض تھا نہ ہی یہ کتابیں لانا۔ غیر معمولی بات تو یہ تھی کہ آخر عمیص اس کی آمد کو موتیا سے پوشیدہ کیوں رکھنا چاہ رہا تھا۔ یہ خیال بار بار اسے ڈنک مار رہا تھا۔

"ہاں' وہیں تو گئے تھے ہم۔"

● ● ●

"عمیص۔۔۔ وہ وہاں تھا؟"

کسی موہوم سی امید کے سہارے موتیا نے پھر پوچھا۔ (شاید عمیص کو اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہو' وہ مجھ سے غلط بیانی تو نہیں کر سکتا)

"کیسے عجیب سوال کر رہی ہو؟ وہ وہاں تھا تو ہم یہ سب لائے ہیں ناں۔ تمہارا کیا خیال ہے' ہم اس کے اسٹور کے تالے توڑ کے چیزیں اٹھا لائے ہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔

"نہیں' نہیں' دراصل تم جس وقت نکلی تھیں' اس سے کچھ دیر پہلے ہی میں نے اسے گھر پہ دیکھا تھا۔ مجھے نہیں پتہ چلا کب وہ واپس اسٹور پہ گیا۔۔۔ میں تو سمجھ رہی تھی کمرے میں جا کے سو گیا ہو گا۔"

موتیا نے جلدی سے بات بنائی۔ وہ اپنی کمزوری اس پہ عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ گل کو احساس ہو کہ اسے گل کے عمیص سے ملنے پہ پریشانی ہو رہی ہے اور یہ سچ بھی تھا' اسے پریشانی دونوں کی ملاقات پہ نہیں بلکہ عمیص کی جانب سے اس ملاقات کو اس سے مخفی رکھنے کی کوشش پہ ہو رہی تھی۔

"ایک تو تمہاری سمجھ۔۔۔" گل مہر نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ اب وہ اپنے ناخنوں پہ نیل پالش لگا رہی تھی۔

"خیال رکھا کرو بھئی۔۔۔ کہ وہ کہاں جاتا ہے' کس سے ملتا ہے' کب جاگتا ہے' کب سوتا ہے' تمہارا حق ہے۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔" موتیا نے لاپروائی ظاہر کی۔

"خیر یوں تو نہ کہو۔۔۔ ضرورت تو اشد ہے۔" اس نے تازہ تازہ لگی نیل پالش پہ پھونک مارتے ہوئے کہا اور اس کا یہ یونہی کہا فقرہ موتیا کے دل میں کھب کے رہ گیا۔

کبھی کبھی کہنے والا کوئی بات بس ایسے ہی۔۔۔ بنا کسی مطلب کے۔۔۔ بات برائے بات کے تحت کہہ ڈالتا ہے۔۔۔ مگر ضروری نہیں سننے والا بھی اسے سرسری ہی لے۔۔۔ اس کے لیے بھی وہ بات "بس بات" ہی ہو۔ ہاں یہ ضروری تو نہیں۔

☼ ☼ ☼

"یاسمین آپا! اتنا کچھ ہونے کے باوجود آپ پھر اس گھر میں جا رہی ہیں۔۔۔ اس شخص کے پاس۔"

صاحبزادی یاسمین کے جانے کی خبر سن کر عمیص کو حقیقتاً" افسوس ہو رہا تھا۔

"میں امی حضور سے بات کرنے ہی والا تھا۔ آپ رکیں تو سہی۔"

"کیا بات کرنے والے تھے آپ؟ یوں کہیے ان کے غموں میں ایک اور غم کا اضافہ کرنے والے تھے۔۔۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں عمیص میاں' جانے دیجیے بس۔" وہ سرد آہ بھرتی بیگ میں کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھیں۔

"اور آپ جو خود کو بخوشی غموں کی بھٹی میں جھونکنے جا رہی ہیں۔۔۔ کیا یہ فیصلہ درست ہے؟ اپنا نہیں تو ان معصوم بچوں کا ہی خیال کر لیجیے۔ کتنے سہمے رہتے تھے یہ وہاں اور اب کتنے خوش اور بے فکر لگ رہے ہیں۔ ان کی ذہنی حالت گھر کے ماحول کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے' ان پر رحم کیجیے خدارا۔"

"ان کی یہ خوشی ان کی لاعلمی اور بچپنے کی وجہ سے ہے۔ آج یہ وقتی طور پہ باپ سے دور خود کو آزاد اور خوش محسوس کر رہے ہیں لیکن کل شعور ملتے ہی انہیں دربدری اور محرومی کا احساس ستائے گا۔ یہ کمی ان کے نصیب میں لکھی ہے اسے ہم تو بدلنے پہ قادر نہیں۔ احساس محرومی سے انہیں دوچار رہنا ہی ہے تو کیوں نہ اس گھر کی چھت کے نیچے رہیں جہاں کم از کم انہیں دربدری کا احساس تو نہ ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھیے عمیص میاں' ہم جانتے ہیں ان بچوں کے والد انہیں وہ شفقت' وہ محبت اور وہ توجہ دینے کے قابل نہیں' جو ان معصوموں کا حق بنتا ہے لیکن اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کا نام تو ان کے ناموں کے آگے ایک مضبوط حوالہ بن کے موجود ہے۔ ان کا سایہ۔۔۔ چاہے برائے نام ہی سہی مگر موجود تو ہے اور ہم باپ کے جیتے جی ان بچوں کو بن باپ کے بچوں والی زندگی گزارنے نہیں دیں گے۔ اسی لیے ہم نے وہاں واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے نہ صرف ہم نے۔۔۔ بلکہ دلکش بھی ہمارے ساتھ واپس جائیں گی۔"

"یہ ظلم ہے آپا۔۔۔ زیادتی ہے ان معصوم روحوں کے ساتھ؟"

"نہیں بھائی' یہ وقت کا تقاضا ہے۔ ہمیں آپ کی محبت اور چچا حضور کی وسیع القلبی سے انکار نہیں ہے۔ آپ ہمیں اور ہمارے بچوں کو اپنی چھاؤں میں بخوشی لے لیں گے لیکن اس بات سے تو آپ کو انکار نہیں ہو گا کہ یہ فرض والد کا ہوتا ہے۔ وہ پہلے ہی اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی جانب سے لاپروائی برتنے کے عادی ہیں ہم نے ہمت ہار کے میدان صاف کر دیا تو وہ بالکل ہی غافل ہو جائیں گے۔ نہیں عمیص میاں' ہمیں مت روکیے' یہ فیصلہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کے کیا ہے۔ اسی میں ہمارے بچوں کی بہتری ہے۔"

"کیسی بہتری؟ مجھے تو نظر نہیں آ رہی۔۔۔ آپ نجانے کس خوش فہمی میں ہیں۔"

"فی الحال نظر تو ہمیں بھی نہیں آ رہی۔" وہ اداسی سے مسکرائیں۔

"لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے پروردگار نے ہمارے اور ہمارے بچوں کے نصیب میں کوئی خوشی رکھی ہی نہ ہو بہتری ہو گی' انشاءاللہ کبھی نہ کبھی تو ہو گی' کہیں نہ کہیں ہمارے اللہ نے ہمارے لیے بہتری کی گنجائش رکھی ہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے ہماری واپسی میں ہی یہ بہتری چھپی ہو۔ ہمیں ایک اور کوشش کر لینے دیجیے۔ ہم اپنے بچوں کے دشمن نہیں ہیں۔ جب خدانخواستہ ہمیں لگے گا کہ حالات اب ہمارے ہاتھ سے باہر ہو گئے ہیں اور برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے تو یہ ہمارا وعدہ ہے اپنے بھائی سے۔۔۔ کہ اپنے بچوں کے مستقبل کو آزمائش میں نہیں ڈالیں گے اور واپس آ جائیں گے۔۔۔ مگر دعا کیجیے ہمارے حق میں کہ ایسی نوبت نہ آئے اور آپ کی بہن کا گھر بسا رہے۔"

"دعا کے علاوہ اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔" وہ بے چارگی سے کہنے لگا۔

"آپ نے بات کی ہے برداشت کی حد ختم ہونے کی۔۔۔ تو وہ میں جانتا ہوں کہ کبھی ختم نہ ہو گی۔ یعنی آپ نے صبر کر کر کے شہید ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیوں دکھی ہوتے ہیں بھیا جی۔" یاسمین نے اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

"بہت گھسا پٹا قول ہے آپا حضور اور میں تو یہ مانتا ہوں کہ پرانے زمانے کے سیانے جو کچھ کہہ گئے ہیں اپنے

وقت اور زمانے کے لحاظ سے بالکل درست کہہ گئے ہوں گے مگر وہ بھی آج کے حالات دیکھ لیں ـــــ

"اسی لیے تو اب ان کتابی باتوں اور سنہرے قولوں پہ یقین نہیں رہا۔ آپ کو بھی یہی سمجھانا چاہ رہا تھا کہ ثابت قدمی، مستقل مزاجی، صبر، برداشت، ایثار، وفا ـــــ یہ سب ہتھیار اب کند ہو چکے ہیں۔ ان کے سہارے جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔"

"مگر دل ـــــ دل تو جیتے جا سکتے ہیں۔"

"اور اگر کسی کا دل ان سب کا طالب ہی نہ ہو تو ـــــ محبت کی زبان سے ہی نابلد ہو ـــــ تو پھر؟"

اس کے ذہن میں پھر سے گل مہر کے وہ فقرے گونجنے لگے جو محبت کی سراسر توہین تھے۔ ان کا نفرت سے مسخ ہوتا چہرہ نگاہوں میں چبھنے لگا۔

"تو اور ایسے بہت سے دل ہیں صاحبزادہ **عمیص**، جو کہ سوائے محبت کے اور کوئی زبان جانتے ہی نہیں۔ محبت کرنے والے دل کو تو محبت کرنے والا دل ہی زیب دیتا ہے۔"

وہ کچھ کچھ اس کی الجھن بھانپ گئیں۔ جانتی تھیں کہ اب تک وہ گل مہر کو بھلانے اور موتیا کو دل سے اپنانے میں ہچکچا رہا ہے۔ وہ کون سا دل تھا جو اس کی محبت کے ہتھیار سے زیر نہ ہوا تھا، اس سے بھی وہ واقف تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ ایسا کون سا محبت بھرا دل ہے جو اس کی تشنگی کو سیراب کر سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے مبہم سے انداز میں ایک چونکانے والی بات کی۔

"محبت کرنے والے دل کو محبت کرنے والا دل ہی زیب دیتا ہے۔"

یہ بات **عمیص** کے اندر کھب سی گئی۔

اس بات نے روپہار کے ساگر لٹاتی گہری آنکھیں یاد دلا دی تھیں۔

وہ آنکھیں جو کسی کا بھی درد دیکھ کے نم ہو جاتی تھیں۔ جو آنکھیں اسے دیکھ کے جگمگا اٹھتی تھیں۔

اسے وہ چہرہ صاف نظر آنے لگا جس پہ محبت کی نرم گرم دھوپ ہمہ وقت پھیلی رہتی تھی جس کے کسی نقش کو نفرت نے نہ بگاڑا تھا۔

وہ چہرہ جو بہت زیادہ حسین نہ تھا۔

وہ چہرہ جو بہت دلکش ـــــ بہت رنگین نہ تھا۔

مگر وہ چہرہ جو بہت اپنا اپنا سا ـــــ بہت پیارا تھا۔ جس چہرے پہ ایک مہربان مسکراہٹ کا راج رہتا تھا۔

"موتیا!" اس کے دل سے پکار نکلی۔

"ہاں موتیا ـــــ تم، تم ہو تو مجھے محبت سے اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم ہو تو اس کا مطلب ہے محبت بھی اب تک ہے۔"

کل سے گل مہر کی وجہ سے مکدر ہوا جی ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"خیریت اب کیا ہوا ـــــ؟ آپ ہی آپ مسکرائے جا رہے ہیں۔" یاسمین اس کے بدلتے مزاجوں پہ حیران ہوئیں۔

"کچھ نہیں آپا حضور ویسے اب بھی میرا خیال ہے کہ آپ کو کم از کم دلکش کو یہیں چھوڑ جانا چاہیے۔" بڑی خوب صورتی سے ان کے سوال سے کنی کترا کے وہ اس موضوع پہ واپس لوٹا۔

"نہیں، اب تو ان کے والد خود تاکید کر چکے ہیں۔ ہم کچھ روز کے لیے لے جاتے ہیں۔ بعد میں آ کے لے جایئے گا۔ یہ تو ہماری بھی خواہش ہے کہ ان کی تعلیم یکسوئی سے جاری رہ سکے۔" انہوں نے چادر اوڑھی۔

"اور آپ تکلیف مت کیجئے، موسم خراب ہے، آپ کو کچھ دیر میں اپنی دکان کھولنی ہے، ایسا نہ ہو کہ ہمیں چھوڑنے جائیں اور بارش کی وجہ سے پھنس کے رہ جائیں۔ بس **دلگیر** سے کہیے ہمیں رکشہ لا دے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے آپا۔ آپ اکیلی کیسے جائیں گی۔ میں خود ـــــ

"ہم نے کہا ناں ہم چلے جائیں گے۔ آپ نہا دھو کے ناشتہ کیجئے اور اپنے کام پہ روانہ ہوں ـــــ ماشاء اللہ اب ہمارا بیٹا جوان ہو گیا ہے ہمیں کس کا ڈر ہے۔"

عمیص دلگیر کو آواز دے کر ٹیکسی لانے کی ہدایت کرنے لگا۔ یاسمین اندر صاحبزادی حرمت النساء اور خلعت النساء سے ملنے گئیں تو اس نے چپکے سے ایک سو کا نوٹ **دلگیر** کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

"کرایہ پہلے دے دینا۔"

"اور ہمارا کرایہ؟" اس نے دوسری مہندی رنگی ہتھیلی آگے کی۔

"تمہارا کون سا کرایہ ـــــ سڑک کے کونے سے واپس آنے کے لیے تمہیں کون سی سواری چاہیے۔"

"اوہو ـــــ غلط لفظ بول گئے شاید ـــــ" **دلگیر** نے ناز و ادا سے پیر پٹخے ـــــ جھانجھر چھنک اٹھی۔

"کہنا تو یہ تھا کہ ہمارا بھی نان نفقہ دے دیں۔"

اس نئی طرز کے مطالبے پہ **عمیص** کے جو آگ لگی تو اس نے **دلگیر** کی چند انچ کی گردن مٹھی میں دبوچ لی۔

"ابے نامعقول، کیا انٹ شنٹ ہانک رہا ہے۔ تو کیا میری بیوی ہے؟ منکوحہ ہے؟ جو منہ پھاڑ کے نان نفقہ مانگ رہا ہے۔"

"اوئی ہماری نازک گردن۔" وہ بل کھا کے اس کی گرفت سے نکلا اور گردن سہلاتے ہوئے اسے شکایتی نظروں سے تکنے لگا۔

"ہمیں اس بات کی تکلیف نہیں کہ آپ نے ہم سے یہ دست درازی کی ـــــ دکھ اس بات کا ہے کہ تو تکار بھی کی، ابے کہہ کر پکارا۔"

"بند کرو اپنی زبان ـــــ لاحول ولا ـــــ دست درازی۔" اس نے جھرجھری لے کر اس کا ادا کیا مشکوک و معیوب لفظ دہرایا۔

"تمہیں آج دورہ پڑا ہے غلط الفاظ، غلط مواقع پہ ادا کرنے کا۔ کیوں مجھ پہ دست درازی کا الزام لگا کے مجھے بدنام کرتے ہو دوست۔ یہ لو پچاس روپے اور سیدھے سادے طریقے سے پاکٹ منی کہہ کے مانگ لیا کرو۔ خبردار جو آج کے بعد یہ نان نفقہ قسم کا ازدواجی لفظ استعمال کیا تو اور دھیان سے آپا کو اور بچوں کو خود بٹھانے آنا بلکہ ہو سکے تو ساتھ چلے جاؤ۔"

"ناں بابا ـــــ بادل گھر کے آ رہے ہیں، چھما چھم برس پڑے تو پھر؟"

"تو کیا ـــــ حسب عادت اور حسب توفیق کوئی پھڑکتا ہوا برساتی قسم کا گیت گنگنا لینا۔"

"لایئے پھر ہمارا واپسی کا کرایہ؟"

"لو پکڑو۔" اس نے ایک دس کا نوٹ اور پکڑایا۔

"ایں یہ کیا ـــــ روانگی ٹیکسی میں، واپسی بس میں ـــــ جایئے ہم نہیں جاتے۔ بسوں میں لفنگے چھیڑتے ہیں ہمیں چٹکیاں بھرتے ہیں، آوازے کستے ہیں۔"

"اچھا جاؤ یار، تم بس ٹیکسی میں ہی سوار کرا آؤ، بڑی مہربانی۔" اس کا مسئلہ سن کر **عمیص** نے جان چھڑائی۔

آپا کو رخصت کر کے وہ ناشتہ کرنے باورچی خانہ میں آیا۔ موتیا کڑاہی رکھ کے کچھ تل رہی تھی۔

"واہ ـــــ گڑ کی پوری گویا بارش کا استقبال۔" اس نے گہری سانس لے کر دیسی گڑ اور بادام و الائچی کی ملی جلی مہک اپنے اندر اتار دی۔

"تو آج میٹھا ناشتہ ملے گا۔" اس نے بغور موتیا کو دیکھتے ہوئے کہا جو خلاف معمول خاموش تھی اور سنجیدگی سے اپنے کام میں منہمک تھی۔

"مٹھاس کچھ کم لگ رہی ہے۔" اس نے گرما گرم پوری کا لقمہ لیتے ہوئے کہا، نظریں اس پہ جمی تھیں۔ موتیا بھانپ گئی کہ اس نے یہ تبصرہ اس پہ کیا ہے۔

"جتنی شکر گھولی جائے مٹھاس اتنی ہی ہوگی۔ اگر شکر ڈالنے والا ہی اپنا ہاتھ ہلکا رکھے گا تو اس میں کسی کا کیا قصور۔"

"بجا ارشاد۔" اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا البتہ سر ضرور دھننے لگا۔ اتنے میں موتیا نے اسی بے گانگی کے ساتھ اس کے سامنے چائے کا کپ دھر دیا۔ وہ پلٹنے کو تھی کہ اگلے ہی لمحے دھک سے رہ گئی۔ دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے درزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا چاہا۔

اس کی گندمی کلائی **عمیص** کی گرفت میں تھی۔

یہ ہاتھ اس نے گزرے سالوں میں کئی بار تھاما تھا۔ مگر آج اس لمس کے کنائیے ہی کچھ اور تھے۔

ایک سنسنا دینے والی کیفیت۔

ایک گدگداتا سا احساس۔

ایک استحقاق بھرا دباؤ۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔" نظریں چراتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ مسلسل زور لگا کے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش بھی کر رہی تھی جبکہ دوسری جانب **عمیص** نے اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر رکھی تھی۔

"ایسے فضول مطالبوں پہ مابدولت کان نہیں دھرتے۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے چہرے کے قریب لے جانے لگا۔ آنکھوں میں شرارت بھری تھی۔ موتیا کی سٹی گم ہو گئی اس کا ارادہ بھانپ کر۔

"کیا کر رہے ہو **عمیص**؟" وہ احتجاجاً "**کسمسائی**۔ آواز میں دبی دبی سی جھنجھلاہٹ کے ساتھ ساتھ بے پناہ حیا کی لرزش بھی تھی۔

"تمہارا گلہ دور کر رہا ہوں۔ شکر گھول رہا ہوں۔"

"ڈم ڈم ڈیگا ڈیگا۔" **دلگیر** کی پھٹے ڈھول کی سی آواز بالکل نزدیک ہی ابھری۔ **عمیص** چونکا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی موتیا نے سرعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

ڈم ڈم ڈیگا ڈیگا۔

موسم بھیگا بھیگا۔

وہ گنگناتا ہوا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حلق پھاڑتا ہوا اندر چلا آیا۔ موتیا رخ پھیر کے کڑاہی میں پوریاں ڈالنے لگی مگر **عمیص** اس کے چہرے پہ ست رنگی بہاریں اترتے دیکھ چکا تھا۔ اس چہرے پہ جو ابھی چند سیکنڈ پہلے تک فق ہو چلا تھا۔ اس نے اپنی نیم وا مٹھی کھولی، جس میں کچھ لمحے قبل تک ایک ریشمی لمس سنسنا رہا تھا۔ اسے اپنی ہتھیلی سے خوشبو پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

"موسم بھیگا بھیگا۔" **دلگیر** کی آواز اسے زہر لگ رہی تھی جو ایک تواتر سے کانوں میں گونجتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جیسے ایک نشے کے عالم سے باہر آیا اور خونخوار نظروں سے اسے تکنے لگا جو بارش میں بھیگتا واپس آیا تھا اور اب اپنا ململ کا کرتا نچوڑتا ہوا لہک لہک کے گا رہا تھا۔

بن پیئے میں تو گرا۔ میں تو گرا۔

ہائے اللہ۔

"صورت آپ کی 'استغفراللہ'۔" **عمیص** نے اضافہ کیا۔ موتیا کی خود ساختہ سنجیدگی ہوا ہو گئی۔ ہنسی اس کے لبوں سے آزاد ہو کے چھن چھن کرتی **عمیص** کے آس پاس بکھر گئی۔

☼ ☼ ☼

"آج ریکارڈنگ پہ نہیں جانا پتر؟"

اللہ وسایا نے اسے دن کے بارہ بجے تک کچن میں پایا تو استفسار کرتا پیچھے چلا آیا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے کچن میں ہی مصروف تھی اور یہ بات اس کے لیے حیرت کا باعث تھی۔ اب وہ کم ہی کچن کے کسی کام کو ہاتھ لگاتی تھی، زیادہ سے زیادہ چائے بنائی یا کبھی کسی دن کوئی اور کام نہ ہوا تو باپ کی خصوصی فرمائش پہ اس کی پسند کا کچھ بنا دیا۔ وہ

تمیں وقت اس کے ہاتھ کا لذیذ کھانا اور تازہ نرم پھولے ہوئے پھلکے اب خواب ہو چکے تھے۔ بازار کے سخت نان کھا کھا کے اللہ وسایا کا معدہ جواب دے گیا تھا۔

"نہیں میں نے باجوہ صاحب کو صبح ہی فون کر کے آج کی ریکارڈنگ کینسل کروادی ہے۔ ویسے بھی آج میرا خاص کام نہ تھا۔ گنتی کے دو سین تھے۔" آج کل وہ پرائیویٹ سیکٹر کے ایک ڈیلی سوپ میں کام کر رہی تھی جس کا ٹائٹل سونگ بھی اسی کی آواز میں تھا۔

"کیوں آج کیا تھا؟۔۔۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟۔۔۔ لیکن نہیں، طبیعت خراب ہوتی تو کمرے میں سر باندھ کے آرام کر رہی ہوتی اور تو تو پچھلے دو گھنٹوں سے چولہے کے آگے تپ رہی ہے۔" اس نے **دیگچیوں** کے ڈھکن اٹھا اٹھا کے جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک میں قیمہ ہرے مسالے کے ساتھ دم پہ تھا، دوسرے میں کدو گوشت کا سالن۔

"وہ مغل آرہا ہوگا۔ تبھی اتنا کھپا رہی ہے خود کو۔" اس نے اندازہ لگایا۔

"نہیں۔" اب وہ ہاٹ پاٹ میں سالن الٹنے لگی۔ اس کے بعد اس نے مضبوطی سے ڈھکن بند کرنے کے بعد باسکٹ میں ہاٹ پاٹ رکھے۔

"تو ہسپتال جا رہی ہے!" اب کی بار اس کا اندازہ درست تھا۔ دعا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں نہا کے بس دو منٹ میں آتی ہوں۔ آپ چلیں گے ابا جی؟"

"کیا لوڑ ہے روز روز جانے کی۔ کرے وچارے کو تو ہوش نہیں بھرجائی اور شہزادے کی مجبوری ہے۔ انہیں تو دن رات ادھر موجود رہنا ہی ہے۔ تو نے سارا کام دھندہ بند کر کے سویرے ہی وہاں جا کے بیٹھ جاتی ہے۔ مجھے چنگی طرح پتہ ہے، پرسوں والے میوزک شو کے لیے بھی تو نے اسی وجہ سے انکار کیا ہے۔ مصیبتوں کے ساتھ آج تیرا نام بنا ہے۔ اس طرح تو تو خود گھر آئے رزق کو ٹھکرا کے اپنا نام خراب کر رہی ہے۔"

"مجھے اب اپنا نام بنا کے کرنا بھی کیا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ تو تو اب اس مغل کی گھر والی بننے جا رہی ہے، تجھے کسی نام یا مقام کی کیا ضرورت، مگر یاد رکھ، اس بابر مغل کی نظروں میں بھی تو تب آئی جب روشنیاں تجھ پہ پڑیں۔ گھر کی چار دیواری میں بکل مارے بیٹھی رہتی تو اب تک کسی ریڑھی لگانے والا کا رشتہ بھی نہ آیا ہوتا۔ خیر چھوڑ ساری باتیں، مجھے تیرے چھٹی کرنے پہ اعتراض نہیں، کی ہے تو گھر بیٹھ کے آرام کر۔۔۔ روز روز کی خجل خواری ٹھیک نہیں۔ انہیں ہماری خاص ضرورت ہے بھی نہیں۔ پیسے والے لوگ ہیں، دو دو گاڑیاں، ڈرائیور۔۔۔ نہ تیری اس روٹی کے لیے بھوکے بیٹھے ہیں۔ ہوٹل سے منگا لیتے ہوں گے۔"

"کسی کا کام کسی کے بغیر نہیں رکتا ابا۔۔۔ جانتی ہوں میں بھلا ان کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔ ماما جی جس مشکل گھڑی میں ہے، اس وقت تو چچا جی کا وہ روپیہ پیسہ اور تعلقات بھی ان کی مدد نہیں کر سکتے جن کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔ میں تو اپنا فرض سمجھ کے جاتی ہوں اور مامی جی کا دھیان بٹانے۔ اپنے کا آسرا بہت ہوتا ہے۔"

"تیری تو ہی جانے، پہلے کبھی مانی ہے جواب مانے گی۔" وہ بڑبڑاتا ہوا نکل گیا اور دعا بیزاری سے سر جھٹکتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

"رب خیر کرے آج سویرے سے پتہ نہیں کیوں میرے دل کو جیسے پنکھ لگے ہوئے ہیں۔ بار بار اچھی اڈاری مار کے پھڑپھڑاتا ہے۔" بلقیس سینے پہ ہاتھ رکھے فکر مند انداز میں کہہ رہی تھی۔

"بلڈ پریشر ہائی ہوگا۔ آپ بھی تو ٹینشن لینے سے باز نہیں آتیں۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ فکر مت کریں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

شہزاد نے ماں کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔

"کیسے فکر نہ کروں' آج تیسرا دن ہے' تیرے ابے کو کوئی ہوش نہیں۔ ڈاکٹر بھی کچھ نہیں کہتا' بس یہی کہتا ہے کہ دعا کرو۔۔۔ دعا کرو۔۔۔ نہ دعا سے ہی علاج کرانا تھا ہم نے تو تیرے اتنے مہنگے ہسپتال میں کس لیے داخل کرایا ہے اور کیوں تو اتنی فیس لے رہا ہے۔ پتہ نہیں کب ہوش آئے گا کرے کو' کب وہ آنکھ کھولے گا۔"

تین دن سے شہزاد ماں کو جھوٹے دلاسے دے دے کر تھک چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی جو وہ ماں تک پہنچاتا۔ اس کے کوما سے باہر آنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے باوجود وہ بڑی آس سے تین دن تک باپ کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔ ایک احساس جرم بھی تھا جو اسے وہاں سے ملنے نہ دیتا تھا۔ بار بار یہ احساس اسے بے خبر پڑے باپ کے سامنے زمین میں گاڑ کے رکھ دیتا تھا کہ وہ اس حال تک صرف اور صرف اس کی بے معنی سی خواہش پوری کرنے کی کوشش میں پہنچا ہے۔

"تمہیں عشق ہوتا شہزاد ملک تو کوئی بات بھی تھی۔ یہ تو تمہاری طلب تھی' تمہاری کمی تھی جس نے اپنی تکمیل کے لیے ایک مضبوط سہارا تلاش کرنا چاہا تھا۔ تمہاری شخصیت کی کجی نے ایک معتبر حوالہ چاہا تھا اور جس کے حصول کے لیے تم نے نہ صرف خود کو آپ بلکہ اپنے بوڑھے باپ کو بھی داؤ پہ لگا دیا۔ کیا ملا طلب کے اس بے مقصد کھیل میں۔۔۔ رہا سہا بھرم بھی کھو دیا۔ اپنی عزت نفس بھی اس کی ٹھوکروں کی زد میں رکھ دی۔"

وہ پژمردگی سے سامنے رکھے کپ پہ اپنی شہادت کی انگلی پھیرتا ہوا سوچ رہا تھا۔

"چاء پی لے پتر' ٹھنڈی ہو گئی ہے۔۔۔ ماں صدقے' جس دن کا پیو ہسپتال ہے تو نے نہ رج کے نیند پوری کی ہے نہ سواد کی روٹی کھائی ہے۔"

"اللہ ابا کو صحت دے' باقی سب تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔ ماں باپ کا اتنا حق تو ہوتا ہے ناں اپنی اولاد پہ کہ وہ ان کی خاطر چند دن بے آرام ہو لیں۔۔۔ آخر ماں باپ نے بھی اپنی کئی راتوں کی نیندیں اپنے بچوں کو پالنے میں جاگ کے گزاری ہوتی ہیں۔ اولاد یہ احسان مر کے بھی نہیں اتار سکتی ہاں اپنا فرض ضرور ادا کر سکتی ہے۔"

اس کی بات پہ بالو نمناک آنکھوں سے اسے نثار ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"آج کرما ہوش میں ہوتا تو میں اسے دکھاتی۔۔۔ یہ ہے تیرا بیٹا' تیری ساری حیاتی کا حاصل' تیرا غرور۔ اسے ہمیشہ خود سے شرمندگی اور تیرے سے گلہ رہا۔ شرمندگی اس بات کی کہ وہ تجھے وہ عزت اور زندگی نہ دے سکا جس کی تجھے خواہش تھی اور گلہ اس بات کا کہ تو اس کی یہ غلطی دل سے معاف نہ کر سکا اور اپنے باپ کی بے حیثیتی کو قبول نہ کر سکا۔ مگر اب میں اسے بتاؤں گی کہ تیرا گلہ نہیں کرے' تو غلط تھا۔ ہمارا شہزادہ تو ہمارے جگر کا ٹوٹا ہے۔ اس کے دل میں آج بھی تیری بہت عزت ہے۔ کتنی فکر ہے تیری۔۔۔ پیسہ پانی کی طرح بہا رہا ہے' گھنٹوں ہسپتال کے برآمدے میں کھڑا رہتا ہے۔ کام دھندہ بھی بند پڑا ہے۔"

"اماں' میں سوچ رہا تھا کہ آج آفس کا ایک چکر لگا لوں۔ بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں۔ ایک ضروری میٹنگ بھی ہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض۔۔۔"

"اعتراض کیسا پتر۔۔۔ میں تو خود یہ بات کہنے لگی تھی کہ تو اپنے کام سے بے پروائی نہ برت۔ ادھر اب کوئی خاص کام تو ہوتا نہیں۔ بک۔۔۔ ہاں بس جا کے اس کے سرہانے اک آس لے کے بیٹھنا ہوتا ہے کہ کب وہ آنکھ کھولے۔۔۔ کب نام لے کے پکارے بس تو مجھے ہسپتال اتارتے ہوئے جانا' میں رہ لوں گی۔"

اس نے بھرپور تسلی دی۔

ہسپتال ماں کو اتارنے کے بعد اس کا جی نہ مانا کہ وہ باہر سے ہی ہو کے چل دے۔ اگرچہ باپ کو اتنا ہوش نہ تھا کہ وہ جان پاتا کہ بیٹا باہر سے چل دیا یا اندر آ کے اسے دیکھ کے گیا۔ اس کے باوجود اسے یہ کرنا گوارا نہ ہوا۔

"ٹھہرو اماں' میں اوپر تک ساتھ جاتا ہوں۔"

"کوئی گل نہیں پتر' مجھے مشین کا بٹن دبانا نہیں آتا پر میں سیڑھیاں چڑھ کے چلی جاؤں گی۔" اس نے لفٹ کا ذکر کیا۔ مگر وہ ان سنی کرتا کار لاک کر کے بالو کے ہمراہ چل پڑا۔ ان کے روم میں داخل ہونے پہ اونگھتا ہوا رمضان اپنی مندی آنکھوں کو بمشکل کھولتا کھڑا ہو گیا۔ رمضان اس کے آفس کا ملازم تھا اور رات سے شہزاد کے ساتھ یہیں تھا۔ رات بھر شہزاد تو روم میں رکھے صوفے پہ نیم دراز کبھی سوتا کبھی جاگتا رہا تھا اور وہ بے چارہ کرسی پہ اکڑا رہا۔ صبح پانچ بجے شہزاد فریش ہونے کے لیے گھر روانہ ہوا تب سے یہ اکیلا یہاں تھا۔ پہلے شہزاد نے سوچا تھا اسے بالو کے ساتھ یہیں رکنے کو کہے گا لیکن اب اس کی حالت دیکھ کے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ کل آفس میں بھی کام کرتا رہا اور پھر آفس سے سیدھا یہاں آ گیا تھا۔ اس وقت اس کی حالت قابل رحم لگ رہی تھی۔ اسے جانے کی اجازت دے کر وہ باپ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"آج سانس بہت بہتر آ رہی ہے کل سے۔۔۔ شکر ہے اللہ کا۔" بالو نے بتایا۔ وہ سر ہلا کے رہ گیا اور سرہانے پڑی فائل الٹ پلٹ کے دیکھنے لگا۔ رات سے لے کے اب تک جتنی بار بلڈ پریشر چیک کر کے درج کیا گیا تھا وہ بھی کافی حد تک نارمل تھا۔ اسے تسلی ہوئی۔ اس کے باوجود وہ بالو کو یہاں اکیلے چھوڑنے میں متذبذب تھا۔ وہ ایک سادہ لوح اور ان پڑھ عورت تھی۔ پتہ نہیں ڈاکٹرز کو کب کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ اسے تو سیل فون بھی استعمال کرنا نہیں آتا تھا ورنہ وہ اپنا موبائل اسے دے جاتا تاکہ وہ کسی اہم ضرورت کے وقت وہ اسے کال کر سکتی۔

"کیا سوچ رہے ہو شہزادے؟" بالو نے اسے وہیں ایستادہ دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں' میں سوچ رہا تھا کہ جاؤں یا۔"

"السلام علیکم ماسی جی۔" جس طرح وہ بغیر آہٹ کیے کسی جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی تھی' ویسی ہی دھیمی آواز میں اس نے بالو کو مخاطب کیا۔

"دوئی تو آ گئی۔" بالو کا چہرہ اسے دیکھ کے کھل اٹھا۔

"ماما جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ باسکٹ نیچے رکھنے کے بعد اب روم میں رکھے چھوٹے سائز کے فریج میں جوس کے پیکٹس رکھ رہی تھی۔

"بس دیکھ لے' تیرے سامنے ہے۔"

"اللہ خیر کرے گا ماسی جی! دیکھنا ماما جی کو جلد ہی ہوش آ جائے گا اور وہ بھلے چنگے ہو جائیں گے انشاء اللہ۔"

"اچھا اماں میں چلتا ہوں۔" شہزاد کا تردد دعا کو وہاں پا کے منٹوں میں دور ہو گیا۔ وہ حقیقتاً اس وقت اس کی آمد کا شکر ادا کر رہا تھا۔

"دعا۔۔۔ تم ابھی یہیں ہو ناں؟" چلتے چلتے اس نے رک کر پوچھا تھا اور وہ چونک گئی تھی۔ کتنے عرصے بعد اس نے از خود دعا کو مخاطب کیا تھا اور اتنے نارمل انداز میں جیسے درمیان میں وہ تلخ ترین دور آیا ہی نہ ہو۔ وہ خاموشی سے سر ہلانے لگی۔

"ٹھیک ہے' میں تین چار بجے تک لوٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس دوران اگر کوئی مسئلہ ہو یا ضرورت پیش آئے تو مجھے کال کر لینا۔"

"آپ بے فکر رہیے' میں ماما جی اور ماسی جی کا پورا دھیان رکھوں گی بھائی جی۔"

وہ یہ بات زبان سے ادا نہ کرتی تب بھی شہزاد تو محض اس کی یہاں موجودگی سے ہی مطمئن ہو گیا تھا۔

آج پورے تین دن بعد وہ آفس آیا تھا۔ اگرچہ اسٹاف سے فون پہ اس کا رابطہ رہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے ایسے ورکرز اور ٹیم ملی تھی جو اپنا کام دیانت داری اور لگن سے کرنے کے عادی تھے۔ شہزاد کی چند روز کی غیر حاضری نے بھی ان کی فرض شناسی پہ فرق نہ آنے دیا تھا مگر بہرحال باس' باس ہوتا ہے کئی ایسے پراجیکٹ تھے جو اس کی پرو منٹ کے لیے رکے پڑے تھے۔ کئی ضروری فائلز پہ اس کے دستخط چاہیے تھے۔ آج کی میٹنگ میں بھی اس کا ہونا بہت ضروری تھا۔ وہ چند ضروری کالز کرنے کے بعد سیکرٹری کو انٹر کام پہ پچھلے تین دن میں کیے جانے والے کام کو لانے کی ہدایت کرنے لگا۔

"سر شیر دل ریٹنگ میں نمبر تھری پہ آ چکا ہے۔ اس وقت ڈیلی سوپ اور فیملی ڈراماز کا رجحان ہے اور ان میں بھی انڈین چینلز کو فوقیت دی جاتی ہے۔ ایسے میں ہماری اس ٹرینڈ سے ہٹ کے پیش کئے گئے ویکلی سیریز کا چارٹ میں اتنا اوپر آنا خاصا حوصلہ افزا ہے۔ یہ اس کی پبلسٹی رپورٹ۔۔۔ یہ اس کے نئے پروموز کی ڈیٹیل۔"

سیکریٹری نے اس کے آگے فائل کھولی جس کا سرسری سا جائزہ لے کر شہزاد نے مطمئن ہو کے سر ہلایا۔

"یہ فائل سر۔۔۔ اس میں مکمل رپورٹنگ درج ہے' کس پروگرام کے کتنے شوٹ ہوئے۔۔۔ کس کی ڈبنگ اور کس کی ایڈیٹنگ ان تین دنوں میں کی گئی اور۔۔۔"

"یہ۔۔۔ یہ استعفیٰ؟" شہزاد کے ہاتھ میں ایک پیپر تھا اور اب وہ اپنے سیکریٹری کی بات کاٹ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"سر یہ مس گل مہر کا استعفیٰ ہے کل آیا ہے۔"

"اوکے۔۔۔" اس نے منظوری کی اسٹیمپ لگائی اور مزید ہدایات دیں۔

"سارے ڈیوز آج ہی کلیئر کرا کے بھجوا دو۔"

اس کے نکلنے کے بعد شہزاد نے اپنا سر ریوالونگ چیئر کی بیک سے ٹکا دیا۔

"تو یہ باب بھی ختم ہوا۔"

آج وہ پچھلے دو دنوں کی نسبت بہت پرسکون نظر آ رہا تھا۔ وہ بے چینی کم محسوس ہو رہی تھی جس نے گل مہر کے گھر سے آتے ہی اس کو اپنے اثر میں کر رکھا تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد تو جیسے اس کے اندر آگ دہک گئی تھی اور ان شعلوں کو ہوا دی تھی گل مہر کے کل کے فون نے۔

عجیب سی بات تھی کہ جتنا وہ بھڑک سکتا تھا اس کی بے حد مشتعل کرنے والی باتوں پہ۔۔۔ بھڑکا تھا' ضرور بھڑکا تھا مگر اتنی ہی جلدی ٹھنڈا بھی ہو گیا تھا۔

نواب صاحب نے جو سلوک اس کے باپ کے ساتھ کیا تھا' وہ کم نہ تھا جو وہ بھی چرکے لگانے میں پیچھے نہ رہی مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ نواب کی کی گئی بے عزتی پہ غصے اور طیش کے مارے آپے سے باہر ہو کے انتقامی کارروائیوں کے منصوبے بنانے والا شہزاد اس وقت ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ گل مہر نے اس کی صرف بے عزتی نہیں کی تھی بلکہ اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔

اس کی اوقات۔۔۔ جو اس معاشرے کے کسی بھی کم حیثیت فرد سے گئی گزری تھی۔

زمین پہ رینگنے والے کیڑے کی سی اوقات۔

اس اوقات کے ساتھ بھلا اس میں اتنا دم خم کہاں تھا کہ وہ کسی سے بدلہ لینے کا سوچتا۔

کسی کے مقابل آتا۔

وہ تو تب سے اپنے آپ سے بھی منہ چھپائے پھر رہا تھا۔ اچانک سیل فون کی ہلکی سی بزر نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اسکرین پہ روشن نمبر دعا کا تھا۔ انجانے خدشات میں گھر کے اس نے آن کیا۔

"چھا جی۔۔۔" دعا کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔

"چھا جی' ماما جی کو ہوش آ گیا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہی دیواریں تھیں۔۔۔

وہی چھت۔۔۔ اور وہی دروازہ۔۔۔

اور دروازے پہ وہی سیاہ آہنی تالا۔۔۔

صاحبزادی یاسمین نے زنگ آلود کنجی گھمائی۔ بابر ہمایوں مغل اتنا صبح خیز نہ تھا کہ ساڑھے نو بجے تک تیار ہو کے گھر سے نکل چکا ہوتا۔ اگر تالا لگا ہے تو اس کی گھر میں غیر موجودگی کی یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ رات بھر گھر لوٹا ہی نہ ہو گا۔

انہوں نے لکڑی کے کواڑ دھکیلے تو نیم تاریک ماحول کی حبس زدہ فضا سے آتی پسینے' سگریٹ اور شراب کی ملی جلی ناگوار بدبو نے انہیں اپنی ناک پہ چادر کا پلو رکھنے پہ مجبور کر دیا۔

"تو کیا اب انہوں نے گھر پہ بھی پینا شروع کر دیا؟" اس خیال نے تکلیف دی۔

"گھر تو گھر والوں سے ہوتا ہے۔ ہم نے اس گھر کو خالی کر کے اس کی روح خود کھینچی تھی' اسے مکان۔۔۔ بلکہ کھنڈر کیا تھا۔ اب انہیں بھلا کس کا کھٹکا ہوتا جو وہ احتیاط کرتے۔۔۔ نہ معصوم بچے تھے جن کے لحاظ میں وہ اپنے اس شوق کو اس گھر کی چوکھٹ سے پرے ہی پورا کرنے پہ مجبور ہوتے۔" انہوں نے سوچا اور یہ غلطی بھی اپنے کھاتے میں ڈال لی۔

"کیسی بدبو ہے یہاں؟" دلکش نے ناک چڑھائی۔

"برسات کا موسم ہے اور کمرہ بند ہونے سے سیلن ہو گئی ہو گی۔" انہوں نے جلدی سے کھڑکیوں کے پٹ کھول کے پنکھا فل اسپیڈ میں چلا دیا۔

"اور کس قدر گندگی بھی۔" شمشیر نے زمین پہ بکھرے سگریٹ کے ٹکڑوں۔۔۔ ادھر ادھر لڑھکتے سلور اسٹیل کے گلاسوں اور چارپائی پہ ڈھیر میلے کپڑوں کو دیکھ کے ٹھنک کے کہا۔ چارپائی کے پائے کے ساتھ ایک خالی بوتل بھی نظر آ رہی تھی جس پہ اب تک کسی بچے کی نظر نہ پڑی تھی۔ یاسمین نے سرعت سے آگے بڑھ کے میلے کپڑے سمیٹنے کے بہانے اس بوتل کو بھی اس ڈھیر میں چھپا لیا۔ دلکش تپائی پہ رکھی ٹرے اٹھانے لگی جس میں رکھے جھوٹے برتنوں میں موجود بچی ہوئی ہڈیوں' روٹی کے ٹکڑوں اور کناروں پہ بچے کھچے باسی سالن پہ کیڑے مکوڑے دعوت اڑا رہے تھے۔ چائے کی پیالیوں کا ایک ڈھیر لگا تھا جن میں بچی ہوئی چائے خشک ہو کر جم چکی تھی۔

"امی حضور' کیا ہم کچھ دن اور نانا حضور کے ہاں نہیں رہ سکتے تھے؟" نایاب پہلے ہی یہاں آنے پہ راضی نہ تھا اب گھر کی ابتر حالت سے اور بھی ناراض نظر آ رہا تھا۔

"ابھی بہت چھٹیاں باقی ہیں نایاب بھیا۔ پھر چلے جائیں گے۔ اپنے گھر تو لوٹنا ہی ہوتا ہے ورنہ ابا حضور کو کس قدر پریشانی ہوتی۔ دیکھیے ناں انہیں بازار سے کھانا اور چائے منگوانی پڑی ہے۔" دلکش نے اپنی عمر سے کہیں زیادہ بردبار انداز میں سمجھانے کی کوشش کی جسے وہ خاطر میں نہ لایا۔

"وہ تو یوں بھی باہر کا کھانا ہی پسند کرتے ہیں۔"

"بحث مت کیجئے نایاب۔ جائیے' یہ کچھ سودا لے آیئے۔ ہم ذرا دوپہر کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اگر آپ کے ابا حضور رات بھر نہیں آئے تو بس لوٹنے ہی والے ہوں گے۔ دلکش بیٹا' آپ یہ میلے کپڑے دھو کر سکھانے کے لیے ڈال دیجئے' آج دھوپ تو نہیں نکلی مگر غنیمت ہے کہ بارش جلد بند ہو گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دوبارہ شروع ہو جائے اور شمشیر آپ اقدس کے ساتھ مل کے کمرے کی حالت درست کیجئے' ہم برتن دھو کے صفائی شروع کرتے ہیں۔" انہوں نے سارا پروگرام ترتیب دے کر کمر کس لی۔ اپنے اس چھوٹے سے گھر کی ابتری پہ انہیں رہ رہ کے افسوس ہو رہا تھا۔ بچے نانا کی بڑی سی حویلی چھوڑ کے یہاں اس کابک نما کوٹھڑی میں چلے آنے پہ خوش تو نہ تھے مگر چپ چاپ اپنے ذمے لگائے کام ادا کرنے لگے۔

بارہ بجے کے قریب بابر ہمایوں مغل اپنی مخصوص لاپرواہ چال چلتا کٹڑی تک پہنچا۔ یہاں آ کے اب اس کا دم الجھتا تھا۔ یوں تو بچپن سے آسائشوں کا عادی جسم پہلے ہی بہت مشکل سے اس عسرت زدہ زندگی کا عادی ہوا تھا مگر مجبوری سمجھ کے اس نے لب سیئے ہوئے تھے۔ واویلا کرتا تو کس کے سامنے۔۔۔ سب جانتے تھے یہ کیا دھرا اسی کا ہے۔ باپ کا نام ڈبونے کے ساتھ ساتھ اس کے ترکے میں ملی جائیداد اونے پونے بیچی اور تو اور ماں اور بیوی کے خاندانی قیمتی زیورات' حتیٰ کہ ماں کے جہیز کے سونے چاندی کے نایاب برتن تک بیچ ڈالے۔ ان سب حالات کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اس کے لیے یہ جگہ اب بھی کبھی کبھی ستانے کے لیے ایک عارضی مقام سے زیادہ نہ تھی۔ اسے گھر کی حیثیت اس نے کبھی نہیں دی تھی۔ اس کے کرتوتوں کی وجہ سے آج اس کے بیوی بچے اس ماحول میں

رہ کے روکھی سوکھی کھا کے گزارا کر رہے تھے اور وہ خود... خود تو وہ اب بھی جوا کھیل کے اور کبھی مقبول کے لیے دلالی کر کے چند روپے ہتھیا لیا کرتا اور اپنے شاہانہ شوق پورے کر لیا کرتا۔ خود اچھا کھاتا، اچھا پہنتا... بچے چاہے چٹنی کے ساتھ روٹی ہی کیوں نہ کھا رہے ہوں۔ اسے خاص فکر اس لیے بھی نہ تھی کہ یہ یقین تھا بچوں کا نانا اور ماموں انہیں بھوکا نہ مرنے دیں گے۔ اس کی تسلی کے لیے یہ کافی تھا کہ نواب صاحب ہر ماہ باقاعدگی سے راشن ڈال دیتے ہیں۔ خود اس نے کبھی بھی یاسمین سے گھریلو اخراجات کی بابت استفسار نہ کیا تھا۔

مگر پچھلے کچھ دن اسے اتفاق سے مسلسل گھر پہ گزارنے پڑے۔ دعا کو جو چکر دے رکھا تھا اس کا تقاضا تھا کہ فی الحال الٹے سیدھے کاموں سے خود کو دور رکھا جائے۔ وہ گھر بیٹھنے والی لڑکی نہ تھی۔ کہیں نہ کہیں سے اس کی سرگرمیوں کی سن گن مل جاتی تو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ اگرچہ اس کی شہرت ان حلقوں میں ابھی اتنی دور تک نہیں پھیلی تھی، وہ یہ کام بڑے پیمانے پہ تو نہیں کرتا تھا پھر بھی احتیاط لازم تھا، کم از کم تب تک جب تک وہ اس کے حوالے سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہ کر لے۔ اس نے خود کو خاصا محدود کر رکھا تھا البتہ اس کے ساتھ بلاناغہ ملاقاتیں تسلسل سے جاری تھیں... دل بہلا رہتا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے یہ ملاقاتیں بھی نہ ہو پائیں، ادا کا کوئی قریبی عزیز خاصا بیمار تھا جس کی تیمارداری کی وجہ سے وہ بابر کو وقت دینے سے قاصر تھی۔ بابر کو اس ان دیکھے رقیب سے حسد محسوس ہونے لگا۔ اس نے مارے رقابت کے ادا سے اس عزیز کی تفصیلات جاننا بھی ضروری نہ سمجھیں جس کی بے وقت کی بیماری نے اس کی واحد عیاشی بھی اس سے چھین لی تھی اور اسے یہ تین چار دن مسلسل گھر پہ گزارنے پڑے تھے... اس گھر میں جس کے در و دیوار کی خستگی سے اسے چڑ تھی۔

سونے پہ سہاگہ یہ گھر اتنے دن خالی بھی تھا۔ یاسمین اور بچے نواب صاحب کے ہاں تھے۔ وہ بچے جن کی ہنسی کی مدھم آوازیں بھی اس کی سماعتوں پہ گراں گزرتی تھیں... اور وہ یاسمین جس کی مرجھائی ہوئی صورت دیکھ کے وہ خوامخواہ ہی خار کھا جاتا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں اسے بہت پرسکون ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہ ہوا۔

رات تو طبیعت اس قدر بے چین ہوئی کہ وہ تالا لگا کے نکل کھڑا ہوا۔ گھنٹوں اپنے ہم ذوق دوستوں کے ساتھ پتوں کی بازی میں اور مے نوشی میں مدہوش رہنے سے وقت کچھ آسانی سے کٹا۔ گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی تو لڑکھڑاتا گرتا پڑتا گھر کی جانب روانہ ہوا۔

سیڑھیاں چڑھ کے وہ جیسے ہی اوپر کے مشترکہ بڑے سے لال اینٹوں والے صحن میں پہنچا تو اپنی کوٹھڑی کے باہر لگی تار پہ اپنے دھلے ہوئے کپڑوں کی قطار دیکھی۔ پتہ نہیں کیوں اس کا بھاری ہوتا دل خود بخود ہلکا ہو گیا۔ وہ خود اپنی اس کیفیت پہ حیران رہ گیا۔ کیونکہ ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا کہ اس کے بیوی بچے چند دن ننھیال رہنے گئے ہوں۔ اس بار چونکہ زندگی میں پہلی دفعہ یاسمین اس سے ناراض ہو کر اور جھگڑا کر کے گئی تھی، یہ کہتے ہوئے کہ وہ اب دوبارہ کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی اس لیے فطری طور پہ اس کے دل میں یہ خوف اپنی جگہ بنا گیا تھا۔ بے شک وہ خود بھی ادا کے ساتھ شادی کر کے اڑنے کے لیے پر تول رہا تھا لیکن یہ احساس اس کی جھوٹی انا پہ کاری ضرب کے مترادف تھا کہ اس سے پہلے یاسمین خود اسے ٹھکرا کے چلی گئی تھی۔

''سالی، جاتی ہے تو جائے۔ اس طرح دباؤ ڈال کے ہمیں ادا جی سے شادی کرنے سے روکنا چاہتی ہے۔ اس عورت میں ایسا کیا ہے جو کوئی مرد ساری عمر اس سے ماتھا پھوڑتا رہے۔ ہم کون سا اس پہ ظلم کے پہاڑ توڑنے والے ہیں۔ چار پیسے ہاتھ آ جائیں گے تو اسی کا فائدہ ہوگا۔ ہم بچوں کو بھجواتے رہیں گے، بہرحال وہ ہماری اولاد ہیں۔''

یاسمین کے جانے پہ یہ اس کا پہلا ردعمل تھا اور اب اس کی موجودگی کے آثار پا کے اس کا اگلا ردعمل یہ تھا۔

''آ گئی... ہونہہ بڑے نخرے دکھائے تھے۔ چلو، اچھا ہوا، ہم تو منت کر کے لانے سے بچ گئے۔ ادا جی سے بار بار معاملہ سیٹ ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے، ابھی نجانے کتنا وقت اور لگے تب تک یہ رنڈوؤں کی سی زندگی ہم سے تو نہیں گزاری جاتی اچھا ہی ہوا جو یہ آ گئی۔''

وہ کپڑوں پہ ہاتھ پھیرتا آگے بڑھا جن سے سرف کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی اور وہ ابھی تک نم تھے جس سے

ظاہر ہوتا تھا انہیں دھلے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوا ہوگا۔

ایک اور خوشگوار مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی ساتھ ہی شوں کی آواز شاید یاسمین بگھار لگا رہی تھی اور اب اس نے بھنتے ہوئے لہسن میں ہلدی جھونکی تھی۔ اس کے خالی معدے میں زبردست بھوک کی پکار اٹھی۔ جالی کا پردہ اٹھا کے وہ اندر داخل ہوا۔ کمرے کے باہر بنا مختصر سا برآمدہ جس کے آگے اس نے خود بے پردگی کے خیال سے اینٹیں چنوائی تھیں، اس میں زمین پہ رکھے چولہے کے آگے چوکی پہ بیٹھی یاسمین... سلور اسٹیل کی ڈھکی ہوئی ہنڈیا سے اٹھتی بھاپ... پرات میں آٹا گوندھتی دلکش... نل کے نیچے تختی دھوتا شمشیر... سب کچھ کتنا مانوس تھا۔

کمرے کی حالت بھی وہ نہ تھی، جیسی وہ صبح چھوڑ کے گیا تھا۔ جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما دی تھی۔ بستر پہ صاف ستھری بے شکن چادر بچھی تھی۔ تکیوں پہ دھلا ہوا غلاف چڑھا تھا۔ دری جھاڑ کے بچھائی گئی تھی۔ فرش پہ تازہ تازہ فنائل والا پوچا پھیرا گیا تھا خوشبو اب تک اٹھ رہی تھی اور فرش بھی اب تک ٹھنڈا تھا۔ نہ کوئی جھوٹا برتن پڑا تھا نہ پرانا اخبار... ایک جانب نایاب اور اقدس دری پہ بیٹھے اپنا گرمیوں کی چھٹیوں کا کام کر رہے تھے۔

چند منٹ بعد یاسمین نے دلکش کے ہاتھ اس کے لیے کھانا بھجوا دیا۔ ٹرے میں دسترخوان میں لپٹی روٹیاں تھیں... اسے خود بخود ہی پچھلے کچھ دنوں سے اخبار میں لپٹی تندور کی اکڑی اور جلی ہوئی روٹیاں یاد آئیں۔ ایک کٹورے میں تازہ بگھار لگی کڑھی تھی اور پلیٹ میں توری کی بھجیا دوسری پلیٹ میں کھیرے اور پیاز کے قتلوں پہ کترا ہوا پودینہ اور لیموں کا رس چھڑکا گیا تھا۔ اسے رات کے کھائے بازاری مرغن کھانوں کا مزا بھولنے لگا۔ اس نے سیر ہو کے کھانا کھایا۔

بابر اس کے لیے الائچی والی دودھ پتی بناتی یاسمین اس بعید بھری خاموشی پہ حیران تھیں۔ وہ تو منتظر تھیں کہ کب وہ ان کی اس واپسی پہ طعنے دے دے کر اپنی بھڑاس نکالتا ہے لیکن وہ نارمل انداز میں بچوں کے سلام کا جواب دے کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ آج نہ اس نے کھانے میں نقص نکالا نہ ہی آس پاس کی کسی چیز کو ٹھوکر ماری اور تو اور اب تک کسی بچے کو بھی نہ جھڑکا تھا۔

''کوثر آپا ٹھیک ہی کہتی تھیں جس کو جتنا دبایا جائے، وہ اتنا ہی دبتا ہے اور دبنے والی کی خاموشی دبانے والے کے ظلم کو اور بھی مہمیز کرتی ہے۔ لگتا ہے ہمارا آواز اٹھانا ہمارے کام آیا۔ انہیں احساس ہو گیا ہے کہ ہم ان کی تمام زیادتیاں اب چپ چاپ سہنے والے نہیں۔''

اس سوچ نے ان کا حوصلہ اور بلند کیا۔ وہ چائے دینے آئیں تو بابر نے پہلی بار نظر اٹھا کے دیکھا۔ یاسمین کے چہرے پہ پھیلا اعتماد اور ان کا اٹھا ہوا سر اسے چونکا گیا۔ ہمیشہ اپنے سامنے سر جھکا کے سہمی رہنے والی بیوی کے یہ تیور اس کے اندر ناگواری کی لہر دوڑا گئے۔

''ہو گئی واپسی؟'' اس نے ہنکارا بھرا۔

''جی! گھر تو ایک دن لوٹنا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے آپ بھی اس بات کو سمجھ جائیں گے اور لوٹ آئیں''

''کیا مطلب؟'' وہ چیں بہ جبیں ہوا۔

''اس راستے سے لوٹ آئیں گے جس پہ چلنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ کی ایک بسی بسائی زندگی ہے۔ بیوی ہے، بچے ہیں۔ اس سالوں سے بسی گھر ہستی کو اجاڑ کے ایک نئے گھر کی بنیاد رکھنا...'' وہ دبے لفظوں میں کہنا چاہ رہی تھیں مگر یہ جسارت بابر کی وقتی خوشدلی کو غارت کر گئی۔

''یہ خوش فہمی کس نے دلا دی کہ یہ گھر ہستی بسی ہوئی ہے؟ گھر بسانے کی کوئی ایک خاصیت بھی ہے تمہارے اندر؟ کسی مرد کو عمر بھر باندھے رکھنے کے قابل ایک بھی خوبی ہے تمہارے پاس؟'' اس قدر عامیانہ سوال کا باشعور ہوتے بیٹوں کے سامنے کیا جانا صاحبزادی یاسمین کو پانی پانی کر گیا۔ انہوں نے شرمندہ نظروں سے کونے میں بیٹھے بیٹوں کو دیکھا جواب کتابیں سمیٹے باہر نکل رہے تھے۔ اپنے گھر میں واپسی کا پہلا دن ہی انہیں بھاری پڑا تھا۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری والدہ نے ہمیں ان تمام امور سے آراستہ کیا تھا جن کے بل بوتے پہ کسی مکان کو گھر میں بدلا جا سکے اور جن کے سہارے اپنے مجازی خدا کے ساتھ عمر بھر وفا۔۔۔"

"سنبھال کے رکھو تم اپنی یہ عمر رسیدہ وفا۔" بابر نے بدتمیزی سے ٹانگیں سیدھی کر کے لیٹتے ہوئے پیر کے ساتھ کھانے کی ٹرے پرے کی۔

"اور ایک بات یاد رکھو۔ ہمیں ادا جی سے شادی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔۔۔ نہ تمہاری یہ گھر ہستی۔۔۔ نہ تمہاری یہ بے کار قسم کی وفا۔۔۔ اور نہ تم خود اور ہمیں سمجھ نہیں آتا تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ ہم نہ تمہیں چھوڑ رہے ہیں نہ بچوں کو۔ اپنی ذمہ داریاں بعد میں بھی نبھاتے رہیں گے۔"

"بعد میں۔۔۔" یاسمین نے بیزاری سے سر جھٹکا اور وہاں سے اٹھ کے ایک بار پھر چولہے کے نزدیک آن بیٹھیں۔

"بعد میں' بعد کس نے دیکھا ہے۔۔۔ جب آپ پچھلے پندرہ سالوں میں اپنی ایک بھی ذمہ داری نہ نبھا پائے تو اب دوسری شادی کے بعد کیا یاد رکھ پائیں گے۔ ہم ہی پاگل ہیں جو آپ سے توقع لگا کے ایک بار پھر اسی دہلیز پہ آ بیٹھے۔"

"اب کیا پکانا ہے امی حضور؟" دلکش نے برتن دھونے کے بعد ماں سے پوچھا۔ انہیں دوبارہ چولہے کے پاس چوکی پہ بیٹھا دیکھ کر اسے یہ خیال آیا تھا کہ شاید وہ بھائیوں کے لیے روٹی ڈالنا چاہتی ہوں۔

"باقی روٹیاں ہم ڈال لیتے ہیں۔" اس بات پہ بھی یاسمین نے کوئی رد عمل ظاہر کیا نہ ہی جواب دیا تو وہ کچھ اور نزدیک کھسک آئی۔ گھٹنوں پہ تھوڑی رکھ کے بیٹھی صاحبزادی یاسمین کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ دلکش نے ان کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ دو آنسو پھسل کے ان کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ابا حضور آج کل بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔"

موتیا نے اپنے تئیں گل مہر کو اطلاع دینا چاہی۔

"کیوں؟ اب ہم نے کیا کیا ہے؟" وہ شانے اور ابرو اچکا کے رہ گئی۔

"میں نے کب کہا کہ تمہاری وجہ سے پریشان ہیں۔" موتیا کو اس کا انداز اور بات دونوں برے لگے۔

"فرض تو یہی کر لیا گیا ہے ناں کہ اس گھر میں اگر کوئی پریشان ہے تو وجہ ہو گی صاحبزادی گل مہر خانم۔۔۔ اگر کسی کی راتوں کی نیند اڑی ہے تو وجہ ہو گی صاحبزادی گل مہر خانم۔۔۔ یہاں جو بھی برا ہوتا ہے ہماری وجہ سے ہی تو ہوتا ہے۔"

"یہ محض تمہاری بدگمانی ہے۔"

موتیا نے کہا ضرور مگر دل میں وہ بھی اس بات کی تائید کر رہی تھی' اس کی کل رات کی نیند بھی گل مہر پہ ہی قربان ہوئی تھی۔

"میں نے تو صرف تمہیں یہ بتانا چاہا تھا کہ پہلے تو تم جاب کی وجہ سے مصروف تھیں اس لیے گھر پہ تمہاری توجہ کم تھی۔ اب سارا دن گھر پہ گزارنے کے باوجود بھی تمہارا نہ گھر سے کوئی واسطہ ہے نہ ہی گھر والوں سے تعلق۔ اپنے کمرے تک محدود رہتی ہو۔"

"ہاں تو کیا چاہتی ہو کہ اب ہم جاب نہیں کرتے اس لیے تمہارے ساتھ برتن گھستے اور مسالے بھونتے رہیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا گل۔" موتیا نے بہت مشکل سے اپنے اندر یکدم اٹھتی غصے کی تیز لہر کو دبایا۔

"گھر میں کیا ہو رہا ہے کم از کم اس کی خبر تو رکھنی چاہیے۔ تائی حضور کی طبیعت کل سے ناساز ہے' تم نے مزاج پرسی کرنا ضروری نہیں سمجھا حالانکہ وہ اس گھر کی بزرگ ہیں۔ کل آپا حضور اپنے گھر واپس گئیں' تم نے کمرے

سے نکل کر ان سے ملنا اور اللہ حافظ کہنا گوارا نہیں کیا۔ چلو اور سب کی چھوڑو' کم از کم تمہیں ابا حضور سے اتنی لاتعلقی نہیں برتنی چاہیے۔ وہ ایک نازک جذباتی موڑ سے گزر رہے ہیں۔ انہیں دل جوئی کی ضرورت ہے جبکہ تمہارے پاس صرف رکھائی ہے جس سے وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ تم ان سے خفا ہو شہزاد ملک کا رشتہ لوٹائے جانے پہ غصے میں ہو۔۔۔ یہ سوچ انہیں آزردہ کر رہی ہے۔ دیکھو گل' ان کے ہاتھ بندھے ہیں' تم جو چاہتی ہو وہ کبھی بھی نہیں کر پائیں گے۔ بے شک آج سے پہلے تم اپنی ضد پہ اڑ کے' خفگی سے کبھی دھونس سے اور کبھی روپیٹ کے اپنی منوالیتی آئی ہو مگر اس بار ایسا نہیں ہو گا۔ کچھ اصول ایسے بھی ہوتے ہیں جو ٹوٹنے کے لیے نہیں بنتے اور اگر زیادہ زور لگایا جائے تو اصول تو نہیں' انسان ضرور ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس بار تمہاری ضد کا نتیجہ خطرناک بھی نکل سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں ابا حضور کبھی یہ نہیں مانیں گے۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ وہ۔۔۔"

"اوہو۔۔۔ بات کو کتنا کھینچ دیتی ہو تم۔ ہم نے کب کہا کہ ہم ان سے ناراض ہیں یا ضد پہ اڑے ہیں۔ ہاں بس نہیں جی چاہتا کسی سے بات کرنے کو۔۔۔ کسی کا سامنا کرنے کو۔۔۔ کیا رکھا ہے اب ان باتوں میں ہر جانب سے جتاتی ہوئی نظریں ہی برداشت کرنا ہوں گی۔ جتنی تذلیل ہو چکی وہ کافی ہے۔ ہم ابا حضور کے سامنے جانے سے صرف اس لیے کتراتے ہیں کہ ابھی وہ واقعہ تازہ ہے۔ ان کا غبار اچھی طرح نہیں نکلا۔۔۔ کہیں باقی ماندہ بھڑاس ہم پہ ہی نہ نکل جائے۔"

"ایسا نہیں ہے گل اور تم نہیں جانتیں' تم ان کے سینے کا بوجھ کتنا کم کر دو گی یہ کہہ کر کہ تمہیں اس رشتے کے طے نہ ہونے کا ملال نہیں ہے اور تم اس غم سے باہر آ چکی ہو۔"

"ہم اس غم میں گئے ہی کب تھے جو نکلتے۔" وہ بڑبڑائی۔

"دیکھو ڈیئر سسٹر' آج ہم ایک بات واضح کر دیں کہ سر' ہمارا مطلب ہے کہ اس شہزاد ملک نامی ڈھونگی سے ہماری کوئی ایسی خاص انوالومنٹ نہیں تھی جو ہم اس کی خاطر جوگ لے بیٹھیں۔ اگر عارضی طور پہ ہم سب سے ذرا الگ تھلگ ہیں تو پلیز اس کی وجہ یہ نہ سمجھی جائے۔ یہ تو ہماری توہین کے مترادف ہو گا گویا۔"

اس کے زہریلے انداز میں کہے گئے اس بیان نے موتیا کو حیران کر دیا۔

"تو کیا تمہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ تم نے جس کو چاہا۔۔۔ اچھا چلو' تمہارے کہنے کے مطابق' چاہا نہیں بلکہ صرف پسند کیا یا اس کی خواہش کی۔ وہ تمہیں نہیں ملا۔۔۔ کیا واقعی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا؟ تمہیں گل مہر کو؟ جو نا سننے کی عادی نہیں اور جو اپنی پسند ہر حالت میں حاصل کرنا جانتی ہے۔۔۔ کیا واقعی۔"

"ہاں فرق تو پڑا ہے مگر اس بات سے نہیں کہ ہم اسے حاصل نہیں کر پائے بلکہ اس بات سے کہ آخر ہم نے ایسی نامعقول خواہش کی ہی کیوں؟ ہم اب تک حیران ہیں اور شرمندہ بھی کہ آخر اتنی آسانی سے وہ شخص ہمیں کیسے بے وقوف بنا گیا۔ کبھی ہاتھ آ جائے تو۔۔۔ تو پتہ نہیں کیا حشر کر ڈالیں ہم اس کا۔"

"چلو' یہ بھی اچھا ہوا۔" حیرانی کی شدت کو کم کرتے ہوئے موتیا نے پرسکون ہونا چاہا۔

"اب اس ملال کو بھی جتنی جلد دل سے دھو ڈالو' اتنا ہی اچھا ہے۔ زندگی میں اچھے برے تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اسے بھی ایک تلخ تجربہ جان کے بھلا ڈالو۔"

"مشورے کا شکریہ۔ تم نہ بھی کہتیں تو ہم یہی کرنے والے تھے۔" وہ اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں بولی۔

"ہم اس ایک شخص پہ افسوس کرنے میں اپنی عمر کے قیمتی پل کس لیے ضائع کریں۔ کیا دنیا میں ہمارے لیے کوئی اور نہیں باقی بچا؟"

موتیا کے آس پاس خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ اس نے جھٹلانا چاہا مگر ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

☼ ☼ ☼

"آپ عمیص میاں سے کہہ دیتے تو وہ آپ کو دواخانے لے جاتے۔ ایک تو آپ کی اپنی طبیعت ناساز ہے' دوسرا آپ کے ڈاکٹر نے اللہ جانے کیا بکھیڑے اکٹھے کرنے کو کہہ ڈالا ہے۔"

"بس یہ بھی آج کل کے ڈاکٹروں نے نیا سلسلہ شروع کر ڈالا ہے۔ کئی قسم کے ٹیسٹ لکھ ڈالے ہیں۔ ہفتوں سے ہم ٹالتے آ رہے ہیں لیکن اب سوچ رہے ہیں ایک بار کروا ہی ڈالیں یہ ٹیسٹ شاید ان کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر زیادہ بہتر علاج تجویز کر سکیں۔ فی الحال تو کوئی دوا موافق نہیں آ رہی۔"

"بجا فرمایا لیکن اکیلے جانا مناسب نہیں لگ رہا ہمیں۔ نقاہت غالب ہے ابھی آپ پر۔۔۔ آج عمیص میاں سے کہہ دیجئے گا' کل سویرے ہی وہ لے جائیں گے اور اگر آج ہی جانا ضروری ہے تو دلگیر سے کہلوا دیجئے وہ سنتے ہی گھر آ جائیں گے۔" صاحبزادی حرمت النساء نے اصرار کیا۔

"یہی تو ہم نہیں چاہتے کہ وہ اپنے کام کا حرج کریں۔" نواب صاحب نے انکار کر دیا۔

"آج موسم بھی خوشگوار ہے اسی بہانے ہوا خوری ہو جائے گی۔ نزدیک کے ہسپتال ہی جانا ہے۔"

سفید کھڑکھڑاتے لٹھے کے کھڑے پاجامے اور سفید ہی مہین ململ کے کرتے میں ملبوس وہ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان کا چاندی کے مرصع دستے والا عصا' جو ان کے دادا حضور کی نشانی تھا' ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ اس کے بغیر وہ خود بھی اپنے آپ کو ادھورا سمجھتے تھے۔ سر پہ ٹوپی اور عطر کی بھینی مہک میں بسے وہ گھر سے نکلے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ابھرتی ہوئی فنکارہ ادا اور "لکی ایس پروڈکشنز" کے کرتا دھرتا' ٹیلی پروڈکشن بزنس کے ٹائیکون' شہزاد ملک کے مابین تعلق کا انکشاف۔"

آج کے اخبار ترتیب سے ریک میں رکھتے ہوئے عمیص کی نظر روزنامہ کے فلمی ایڈیشن کی شہ سرخی پر پڑی تھی اور شہزاد ملک کے نام نے اسے چونکا دیا تھا۔ اگرچہ اب نام پہ اسے چونکنے کی خاص ضرورت نہ تھی لیکن فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ یہ صفحہ نکال کر تفصیل پڑھنے لگا۔

"باوثوق ذرائع نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شوبز کی دنیا میں دھیرے دھیرے اپنی جگہ بناتی اداکارہ اور گلوکارہ ادا پروڈیوسر شہزاد ملک کی قریبی عزیزہ ہیں' یہ وہی شہزاد ملک ہیں جو "لکی ایس پروڈکشنز" کے مالک ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک ادا نے لکی ایس پروڈکشن کی کسی سیریل میں کام نہیں کیا حالانکہ یہ ایک لحاظ سے ان کی ہوم پروڈکشن کمپنی کہلائی جا سکتی ہے۔ کیا اس کی وجہ فریقین کے مابین اختلافات ہیں یا دونوں کسی خاص وجہ سے اپنی اس قرابت داری کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"کیا تھا جو یہ خبر چند روز پہلے شائع ہو جاتی۔ کم از کم گل کو یہ اندازہ ہو جاتا کہ شہزاد اس سے اپنے خاندان اور خاندان والوں کے متعلق بہت سے حقائق چھپا رہا ہے۔ یہ تماشا تو ہونے سے رہ جاتا۔۔۔۔" اس نے سوچا تھا۔

گل اس حادثے کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔۔

صاحبزادہ نفیس علی خان یہ ظاہر کرنے کی کوشش۔۔۔ کہ وہ بھول چکے ہیں۔

لیکن عمیص اتنی جلدی اس حادثے کو بھلا نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ وہ اس حادثے کا مرکزی کردار نہیں تھا اور اس کے اثرات براہ راست اس پر نہیں پڑے تھے اس کے باوجود وہ متاثر ہوا تھا۔

نہ صرف گل کے حوالے سے دکھی ہوا تھا بلکہ بعد میں اپنی محبت سے اس کا منکر ہو جانا بھی اسے ملول کر گیا تھا۔ اس جیسے محبت سے گندھے دل کے مالک سے یہ برداشت نہ ہو پا رہا تھا کہ جس لڑکی کو وہ ایک عرصے تک اپنی زندگی میں ایک خاص مقام اور حیثیت دیتا آیا تھا' وہ لڑکی در حقیقت اس مقام کے لائق نہ تھی۔

وہ نہ صرف اپنے چچا حضور کے جذبات کو ٹھیس لگنے پہ دکھی ہوا تھا بلکہ اس شخص کے لیے بھی اب تک اس دل سے ٹیس اٹھتی تھی جو کوئی قصور نہ ہونے پہ بھی سب سے کڑی سزا کا مستحق بنا تھا۔ اسے رہ رہ کے وہ منظر یاد آ جاتا۔

اس کا سفید پڑتا چہرہ۔۔۔ جیسے کوئی دم بدم زندگی سے دور اور موت سے قریب ہوتا جا رہا ہو۔

اس کا لڑکھڑا کے گر پڑنا۔

اس کی بیوی کا اس کے نیم مردہ وجود کے سرہانے بیٹھ کے واویلا کرنا۔

کیا قصور تھا اس بے چارے کا' سوائے اس کے کہ وہ اپنے بیٹے کی خواہش پوری کرنے کے لیے' صرف اس کے کہنے پہ بغیر سوچے سمجھے یہاں آ گیا۔

"اب یہ خبر چھپ بھی گئی تو کیا۔۔۔۔ گل پڑھ بھی لے گی تو کیا۔۔۔ پہلے ہوتا یہ سب تو کتنا اچھا ہوتا۔ کتنی زندگیوں میں زہر نہ گھلتا۔"

وہ انہی سوچوں میں گم تھا جب گل کی آواز پہ چونکا۔ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ تو اسے سامنے پا کے ہی ایک بار پھر حیران تھا۔

"تم۔۔۔ خیریت؟"

"یہی سوال تم نے تب بھی کیا تھا جب ہم پہلے آئے تھے۔ کیا تمہارے اس اسٹور پہ حاضری دینے کی پہلی شرط خیریت کا نہ ہونا ہے؟"

"نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ کوئی کام تھا تو مجھے صبح کہہ دیتیں یا پھر فون کرنے آئی ہو؟"

"نہیں' یہ کچھ ڈاکومنٹس ہیں ہمارے' فوٹو اسٹیٹ کروانے تھے۔"

"دلگیر کے ہاتھ بھجوا دیتیں۔" وہ اس کے پیپرز لے کے اب سرسری سی نظر ڈال رہا تھا' سرٹیفکیٹس وغیرہ تھے۔

"کیوں بھئی۔۔۔ ہمارے گھر سے نکلنے پہ پابندی ہے کیا؟" وہ تنک کے پوچھنے لگی۔ "ہاں صبح تمہیں دے سکتے تھے لیکن تمہارے نکلنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔"

"پھر جاب کا ارادہ ہے؟" وہ فوٹو کاپی نکالنے لگا۔

"ہوں۔۔۔" مختصر جواب دے کر وہ اخبارات کی ورق گردانی کرنے لگی۔

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم فی الحال ایک اور تجربے سے باز رہو۔ چچا حضور کی صحت ان مسلسل دھچکوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ابھی وہ ٹھیک نہیں ہیں۔۔۔ ذرا طبیعت سنبھل جائے تو بات کر لینا۔ اس بار جو بھی قدم اٹھانا ان کی رائے اور اجازت سے۔" اس کے ناصحانہ انداز کو گل نے خلاف عادت تحمل اور سنجیدگی سے سنا۔ وہ دوسرا آدمی تھا جس کی زبانی وہ اپنے ابا حضور کی صحت کے متعلق تشویش سن رہی تھی۔

"سنو۔۔۔ کیا ابا حضور بہت بیمار ہیں؟" اس نے اتنی معصومیت سے یہ سوال کیا تھا کہ عمیص اس کی لاعلمی پہ غصہ آنے کے باوجود ظاہر نہ کر سکا۔ البتہ خاموشی کے ذریعے اپنی ناپسندیدگی ضرور جتائی۔ وہ شانے اچکا کے پھر سے اخبار دیکھنے لگی۔ عمیص نے اس کے ہاتھ میں اخبار کا وہی صفحہ دیکھا جو چند منٹ پہلے اس کے ہاتھ میں تھا تو کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم نے یہ خبر پڑھی؟" اس نے اس کے ہاتھوں سے صفحہ لے کر پلٹا اور دوسری جانب چھپے فلمی ایڈیشن کو اس کے سامنے کیا۔ وہ چونک کے رہ گئی۔ ماتھے پہ بل لیے اس نے یہ خبر پڑھی اور اخبار رول کر کے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔ عمیص نے اس کے بارے میں اس سے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔

☼ ☼ ☼

صاحبزادہ نفیس علی خان اسپتالوں کے ہجوم اور سب سے بڑھ کے ڈاکٹروں کے انتظار میں لائن میں لگنے سے گھبراتے تھے اسی لیے اپنے علاقے کے ڈاکٹر کے بار بار کہنے کے باوجود ہارٹ اسپیشلسٹ سے باقاعدہ معائنہ کروانے والی بات کو ٹالتے آ رہے تھے۔ یہ تو بھلا ہو میاں صاحب کا۔۔۔ جو ان کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے ہیں۔ یونہی باتوں باتوں میں ذکر چلا اور نواب صاحب نے اپنے دل کے متوقع عارضہ کا ذکر کیا تو میاں صاحب مصر ہو گئے کہ وہ پہلی ہی فرصت میں اس پرائیویٹ ہاسپٹل چیک اپ کے لیے جائیں' جہاں ان کے داماد بطور ہارٹ سرجن اپائنٹ ہیں۔ انہوں نے نواب صاحب کے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے داماد کو فون کر کے ان کے لیے ٹائم بھی لے لیا۔ وہ

توکل اپنی کار بمعہ شوفر بھی بھیجنے پہ مصر تھے، مگر نواب صاحب کی وضع داری نے اس حد تک کسی کا احسان لینا گوارا نہ کیا اور تہذیب سے معذرت کرلی۔ البتہ دل ہی دل میں وہ ان کے بے حد شکر گزار ہوئے جب ویٹنگ لاؤنج میں درجنوں مریضوں کو اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی کہ ان کے آتے ہی ڈاکٹر کا اسسٹنٹ انہیں بصد احترام اندر لے گیا۔ میاں صاحب کا داماد اپنے خسر کے دوست کے سامنے نہایت انکساری سے پیش آیا جبکہ وہ جان ہی چکے تھے کہ وہ کتنا نامور، قابل اور مہنگا ڈاکٹر ہے۔ ان کے سارے ٹیسٹ اور چیک اپ تفصیل اور دھیان سے ہوئے۔ فیس کی بابت نواب صاحب کے استفسار پہ تو گویا ڈاکٹر کا رنگ ہی فق ہو گیا۔

"کیوں شرمسار کرتے ہیں چچا جان اور ابا جان کے سامنے تو میری حیثیت ہی دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی جب انہیں علم ہوگا کہ میں نے آپ سے فیس لی۔ آپ یہاں آئے' یہی میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔"

وہ ان کا ہاتھ تھامے حقیقی عقیدت سے کہہ رہا تھا۔ نواب صاحب اس محبت کے آگے سرشار ہو کے یہ احسان سر پہ لینا گوارا کر گئے اور شفقت سے دعا دیتے ہوئے وہاں سے نکلے۔

"خون بول اٹھتا ہے..... بخدا خون بول اٹھتا ہے۔ سلگا خون ہلکا پن ہی دکھاتا ہے اور یہ نوجوان یقیناً" ہمارے جیسے اور میاں صاحب جیسے کسی نجیب الطرفین گھرانے کا چشم و چراغ لگتا ہے۔ اس کی فراخ پیشانی اس کے بلند اقبال کو ظاہر کرتی ہے۔ واللہ خوش نصیب ہیں میاں صاحب۔"

وہ دل ہی دل میں اپنے دوست کے مقدر پہ رشک کرتے سیڑھیاں اتر رہے تھے جب سیڑھیوں کا موڑ مڑتے ہی کوئی بری طرح ان سے آن ٹکرایا۔ ان کا عصا لڑکھڑایا' بایاں ہاتھ دیوار پہ رکھ کے انہوں نے سہارا لینے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس ہاتھ میں پکڑی فائل نیچے گر پڑی اور ایکسرے' الٹرا ساؤنڈ وغیرہ کی رپورٹس بکھر گئیں۔ ذرا سنبھلتے ہی انہوں نے اس ٹکرانے والے کو تاؤ دکھانا چاہا۔

مگر سامنے ایک لڑکی تھی۔

میرون بارڈر والی کالی سوتی چادر میں لپٹی وہ کوئی نوعمر لڑکی تھی جو ان کا عصا دوبارہ ان کے تھمانے کے بعد اب نیچے جھکی ان کی فائل سمیٹ رہی تھی۔ ان کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"رہنے دیجیے بیٹی ہم کرلیں گے۔" انہوں نے روکنا چاہا۔ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ان کی بیٹی کی عمر کے برابر لڑکی بیچ راستے میں زمین پہ ان کے قدموں میں بیٹھی ہے۔ ویسے بھی وہ ہسپتال آئی تھی تو ظاہر ہے یا تو خود بیمار ہوگی یا کسی عزیز کے ساتھ ہوگی۔ ایسے میں اس کا یہاں اس کام کے لیے ایک منٹ رکنا بھی نواب صاحب کو مناسب نہیں محسوس ہو رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں انکل، غلطی میری تھی۔"

اک بے حد میٹھی آواز اور نہایت باادب لہجہ سن کے نواب صاحب کی طبیعت مسرور ہوگئی ورنہ لفظ انکل انہیں ہمیشہ کی طرح گراں گزرا تھا۔

"غلطی شاید ہماری بھی...."

جیسے ہی وہ لڑکی سیدھی ہو کے انہیں فائل پکڑانے لگی' نواب صاحب کے بقایا الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ ششدر ساکت کھڑے اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ وہ شکریہ ادا تک کرنا بھول گئے اور وہ ان کے ہاتھ میں فائل تھما کے اوپر کی جانب بڑھ گئی۔ نواب صاحب پلٹ کے دیکھنا چاہتے تھے..... ایک بار پھر دیکھنا چاہتے تھے..... اسے پکارنا چاہتے تھے مگر ایسا نہ کر سکے۔

☼ ☼ ☼

دعا روز کی طرح دوپہر کا کھانا اور چائے کا تھرماس لے کر ہاسپٹل پہنچی۔ جیسے ہی وہ وی آئی پی پرائیویٹ رومز والے کوریڈور میں مڑی۔ "مسٹر ملک" کے نام والے روم کے آگے غیر معمولی سا ماحول محسوس کر کے اس کے دل میں بے چینی بھر گئی۔ اس کے قدم اور بھی تیز ہو گئے۔

جیسے ہی وہ دروازے کے نزدیک پہنچی' اس کے کانوں سے بالو کے دل دہلا دینے والے بین ٹکرائے۔ اس کے تیز رفتار قدم خود بخود سست پڑ گئے کھلے ہوئے دروازے سے اندر ایک نظر ڈالتے ہی اس کے ڈھیلے پڑتے قدم پتھر کے ہو گئے۔ اس نے لڑکھڑا کے دیوار کا سہارا لیا اور ڈبڈباتی آنکھوں سے سامنے بستر پر پڑے اپنے ماما' کرم الٰہی کے بے جان وجود کو دیکھا جسے وارڈ بوائے سفید چادر سے ڈھک رہا تھا۔

بالو بیڈ کی پٹی سے سر پٹخ پٹخ کے رو رہی تھی اور شہزاد سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ باپ کا مردہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے نجانے کس کس بات کی معافی مانگ رہا تھا۔

● ● ●

ابھرتی ہوئی فنکارہ ادا اور "لکی ایس پروڈکشنز" کے کرتا دھرتا' ٹیلی پروڈکشن بزنس کے ٹائیکون' شہزاد ملک کے مابین تعلق کا انکشاف۔"

یہ وہ شہ سرخی تھی جس پہ ہر بار ایک نظر دوڑانے کے بعد گل مہر نئے سرے سے بھڑک جاتی۔

"گھٹیا شخص یہ تو اوقات تھی تمہاری' ناچنے گانے والیوں کے خاندان میں تم صاحبزادی گل مہر خانم کو لے جانا چاہتے تھے۔ یہ تو ہماری قسمت اچھی تھی..... یا ہمارے بزرگوں کے اچھے اعمال ہمارے کام آگئے اور اس انسان کی اصلیت وقت پہ کھل کے سامنے آگئی ورنہ نجانے کیا ہوتا۔ کیا عجب کہ وہ ہم سے یہی کام کروانا چاہتا ہو۔ اپنے خاندانی پیشے سے لگانا چاہتا ہو۔ اوہ نو ہم' ہم اور یہ کام؟ اس سے پہلے ہم مرجانا پسند کرتے۔ مگر شہزاد ملک جیسا شخص یہ معاملات کیا جانے؟ عزت' بے عزتی' غیرت..... ان سب سے اس کا کیا واسطہ؟ جس کی ماں خود اس پیشے سے منسلک رہ چکی ہو۔ جس کا پنج خاندان ایسی ہی کتنی محفل گرمانے والی رقاصاؤں سے بھرا پڑا ہو' وہ یہ بات کہاں سمجھ سکتا ہے۔ تمہیں یہی دنیا سوٹ کرتی ہے شہزاد ملک..... تم اسی کے قابل ہو۔" اس نے دعا کی رنگین تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا جو کسی فنکشن کے دوران کھینچی گئی تھی۔ مائیک ہاتھ میں تھامے وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جگمگا رہی تھی۔

"ہماری دنیا میں آنے کی جرات بھی تم نے نہ جانے کیسے کرلی۔ نہیں یہ دنیا تمہارے لیے نہیں' تمہیں مبارک ہو یہ ادا' میں شاید ان کے سہارے تم اپنا کاروبار مزید چمکالو۔"

"بڑے غور سے اخبار پڑھا جارہا ہے؟" موتیا نے تبصرہ کیا۔ وہ دوپہر کو ضرور کچھ دیر سوتی تھی۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ گل مہر نے لائٹ آن کردی۔ کچھ دیر تک تکیہ منہ پہ رکھ کے اور کبھی کروٹیں بدل بدل کے دوبارہ سونے کی ناکام کوششیں کرنے کے بعد اس نے کہنی کے سہارے ذرا سا اٹھ کے گل کی مصروفیت جاننا چاہی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے اخبار میں گم تھی۔ چہرے پہ کسی گہری مگر تلخ سوچ کے سائے تھے۔

"ہاں..... دیکھ رہے ہیں کہ کیسے انسان تمام تر عقل و شعور رکھتے ہوئے بھی اس کا استعمال کرنا بھول جاتا ہے۔ کیسے اس کی ساری سمجھ بوجھ دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور بالکل سامنے کی بات اسے نظر نہیں آتی۔ ہمیں بھی رہ رہ کے یہی حیرت ہو رہی ہے کہ اس قدر لائم لائٹ میں رہنے والے اتنے "مچ ڈسکسڈ پرسن" کی پرسنل لائف میڈیا کی نظروں سے اوجھل کیسے رہ گئی۔ یا پھر یہ اس کی پاور اور اختیارات ہیں جو وہ میڈیا کو اپنے حق میں کرنے میں کامیاب ہوا۔ کاش' کاش یہ خبر پہلے چھپ جاتی۔ ہم ہوشیار ہو جاتے۔ ایک بار سوچتے تو سہی کہ جس انسان کی قریبی عزیزہ ناچنے گانے جیسے کام کو بطور روزگار اپنائے ہوئے ہے اور یقیناً "بازار حسن" کی پیداوار ہے' وہ کس قسم کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوگا۔"

"شہزاد ملک کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں یہ دیکھو' یہ انکشاف..... اور یہ اس کی فرسٹ کزن..... محفلوں میں مجرے کرنے والی ایک بازاری عورت' کیا تھا جو یہ انکشاف وقت سے پہلے ہو جاتا۔ آج یہ شرمندگی ہمارے حصے میں نہ آتی۔" اس نے اخبار توڑ موڑ کے موتیا کی جانب اچھالا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگاتی ہوئی خبر پڑھنے لگی اس کے بعد اس نے ذرا تفصیل سے دعا کی تصویر کا

جائزہ لیا۔ کھلے ہوئے سیاہ بالوں کے درمیان چمکتے نگینوں کا ٹیکا صبیح ماتھے پہ دمک رہا تھا۔ ہرنی سی آنکھوں میں عجیب وحشت اور حزن کا امتزاج انہیں سحر انگیز بنا رہا تھا۔ وہ بلاشبہ حسین کہی جا سکتی تھی مگر پتہ نہیں کیوں موتیا کو اس کے چہرے پہ وہ اسپارک اور وہ دل گرما دینے والا چنچل پن نظر نہیں آیا جو اس پیشے سے وابستہ حسیناؤں کا خاصہ بھی ہوتا ہے اور ان کے ہنر کا پیمانہ بھی۔

"لڑکی خوب صورت ہے۔"

اس کے بے ساختہ تبصرہ کرنے پہ گل مہر نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہم نے اس کی شکل و صورت پہ تمہاری رائے نہیں طلب کی اور ہاں کہہ ہی چکی ہو تو بتا دیں کہ اگر یہ خوب صورت نہ ہوں تو ان کا کام کیسے چلے۔"

اس کے ناگواری ظاہر کرنے کے باوجود موتیا اب تک وہی تصویر دیکھ رہی تھی۔ شکل خاصی جانی پہچانی تھی۔ دراصل ان کے گھر کیبل جیسی خرافات تو تھی نہیں اور دعا نے اب تک زیادہ تر کام پرائیویٹ سیکٹر کے لیے کیا تھا۔ پی ٹی وی پہ اس کے اکا دکا گیت ہی کبھی کبھار چلے ہوں گے اس لیے موتیا زیادہ تو نہ جانتی تھی اسے صرف شکل دیکھی بھالی لگ رہی تھی۔

ہلکی سی دستک کے ساتھ صاحبزادی حرمت النساء ان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ یہ ان کی عادت تھی کہ اپنی ہی بچیوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بھی وہ دستک ضرور دیا کرتیں۔

"خیریت امی حضور؟" موتیا نے ان کے چہرے پہ فکر و تردد کے سائے دیکھ کے پوچھا۔

"آپ کے والد ہسپتال سے معائنے کے بعد ابھی ابھی گھر لوٹے ہیں"

"کیوں.... کیا ہوا؟" وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اس کی گود میں رکھا اخبار کا صفحہ بھی نیچے جا گرا جس کا اسے احساس نہ ہوا۔

"یہی تو ہمیں علم نہیں نہ ہی وہ بتانے پہ تیار ہیں اور آپ تو جانتی ہیں کسی بھی بات کی تکرار انہیں برافروختہ کر دیتی ہے۔ اس لیے ہم نے ایک بار دریافت کرنے کے بعد دوبارہ ان کی پریشانی کی وجہ جاننے کی ہمت کی بھی نہیں۔ البتہ ہمیں اندیشہ ضرور ہے کہ خدانخواستہ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے تو.... اللہ کرے ہمارے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوں۔ صاحبزادی الماس خاتون' آپ اپنے والد کے لیے بادام کا شربت تیار کیجیے اور صاحبزادی گل مہر' آپ ماشاء اللہ پڑھی لکھی ہیں سمجھدار ہیں ذرا باتوں باتوں میں 'یونہی ان کی خیریت دریافت کرتے ہوئے وہ معائنے والے کاغذات تو دیکھنے کی کوشش کریں کہ ان میں کیا درج ہے۔"

صاحبزادی حرمت النساء کا اشارہ غالباً" ایکسرے' بلڈ رپورٹس' الٹرا ساؤنڈ اور ای سی جی وغیرہ کی رپورٹس کے متعلق تھا۔

"امی حضور' ہماری تعلیم تو ایک طرف.... مگر یہ میڈیکل رپورٹس پڑھنے سے تو ہم بھی قاصر ہیں۔" وہ تفصیلاً سمجھانا چاہتی تھی مگر جانتی تھی کہ یہ کام ذرا مشکل ہو گا اس لیے صرف ان کی تسلی کے لیے کہہ اٹھی۔

"اچھا' ہم دیکھتے ہیں۔ بات کرتے ہیں ابا حضور سے۔" وہ چپل پہنتی' دوپٹہ سر پہ رکھتی نکل گئی۔ حالانکہ کئی دنوں سے وہ دانستہ ان سے کترا رہی تھی۔ سوائے سلام آداب کے کم ہی کوئی بات کرنے کی نوبت آتی لیکن اب ان کے لیے تشویش اس کے گریز پہ کچھ ایسی غالب آئی کہ وہ جائے بنا رہ نہ سکی۔ موتیا اس سے پہلے ہی شربت بنانے نکل چکی تھی۔

صاحبزادی حرمت النساء از حد پریشان اور متفکر تھیں اس کے باوجود اپنی عادت سے باز نہ رہ سکیں اور بیٹیوں کے کمرے سے نکلنے سے پہلے چیزوں کی ترتیب درست کرنا نہ بھولیں۔ انہوں نے تکیے برابر کر کے رکھے۔ چادر کی شکنیں دور کیں۔ پائنتی پر پڑی کتاب اٹھا کے میز پر رکھی۔ چائے کے جھوٹے مگ اٹھا کے پلٹنے لگیں کہ اخبار ان کے پیروں میں آتے آتے رہ گیا۔

"کتنی بار کہا ہے انہیں' احتیاط کیا کیجیے۔ اخبار پڑھ کے قرینے سے واپس رکھا کیجیے۔ حرف کی بے حرمتی نہ ہونے پائے اور یہاں یہ عالم ہے کہ پڑھ کر قدموں میں روندنے کے لیے نیچے گرا رکھا ہے۔" وہ ناگواری سے بڑبڑاتی ہوئی اخبار کے بے ترتیب صفحے تہ کر رہی تھیں۔

"یہ تو آج کا اخبار ہے۔" ان کی نظر تاریخ پہ گئی۔ "نواب صاحب نے آج کا اخبار نہیں پڑھا۔ انہیں دے کے آتے ہیں۔ اس بہانے یہ بھی دیکھ لیں کہ گل مہر بٹیا سے ان کی گفتگو کا رنگ کیا ہے۔"

اخبار ہاتھ میں لیے اب ان کا رخ ایک بار پھر نواب صاحب کے کمرے کی جانب تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چہرہ....

وہ آواز....

وہ سراپا....

کچھ بھی ایسا نہ تھا جو ان کے لیے نا آشنا تھا اجنبی تھا مگر اچنبھے کی بات یہ تھی کہ یہ چہرہ.... یہ آواز یہ سراپا جس کا تھا وہ وجود ان کے لیے سو فیصدی انجان تھا۔

اس انجان اور اجنبی شخصیت نے یہ چہرہ اور آواز کہاں سے چرایا تھا؟

یہ وہ سوال تھا جو انہیں مسلسل بے چینی میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ وہ بار بار سوچتے۔

"کیا اتفاق ایسے بھی ہوتے ہیں اور کیا واقعی اس حد درجہ مماثلت کو محض اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے؟"

یہ سوال ان کے اضطراب کو مزید بڑھا دیتا۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ ہاسپٹل سے سیدھے گھر آ گئے اور جیسا کہ ان کا ارادہ تھا کہ راستے میں سے وہ میاں صاحب کے ہاں سے ہوتے ہوئے آئیں گے تاکہ ان کے داماد سے ملی امتیازی توجہ کا خصوصی طور پہ شکریہ ادا کر سکیں کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کا شکریہ تک ادھار رکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ اس ارادے پہ عمل در آمد کیا کرتے' وہ تو اس نسخے کے مطابق اپنی دوائیں لینے کے لیے ہاسپٹل میں ہی بنی فارمیسی تک میں نہ رک سکے۔ اس وقت ان کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اپنی حیثیت اور عمر کا لحاظ مانع تھا ورنہ دل تو یہی کہتا تھا کہ واپس پلٹیں اور ہاسپٹل کا چپہ چپہ چھان ماریں اس بے حد آشنا نقوش والے چہرے کو تلاشیں اور اس سے پوچھیں۔

"یہ نقش تم نے کہاں سے چرائے.... آواز کی یہ شیرینی اور مدھرتا تم نے کہاں سے لی.... یہ سراپا تمہیں کس نے دان کیا ہے؟"

اور وہ اجنبی لڑکی بھلا کیا نام لیتی یہ بھی ان کا دل جانتا تھا۔ یہ نقش دان کرنے والی ہستی اور کون ہو سکتی تھی؟ صرف وہی' وہی جس کے یہ نقش تھے اور وہ نقش جو آج تک نواب صاحب کے دل پہ ثبت تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی طبیعت کی سنجیدگی اور خشکی بھی دل کی اس ملائمت کو گھٹا نہ سکی تھی اوروں کے لیے ہوں گے وہ نواب صاحب صاحبزادہ نفیس علی خان صاحب جن کو دیکھ کے لگتا زمانے کی کوئی رنگینی' کوئی لطافت انہیں متاثر نہیں کر سکتی اور جن سے ایک بار ہی مل کے کوئی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے مزاج کو کوئی لطیف حس.... کوئی البیلا جذبہ کبھی چھو کے بھی نہ گزرا ہو گا۔ وہی نواب صاحب اپنے دل کا حال تو بس وہی جانتے تھے۔

آج بھی وہ چہرہ یاد آتے ہی ان کا باسٹھ سالہ دل' کئی زمانے پیچھے چلا جاتا ہے۔ سینے میں وہی میٹھی میٹھی سی کسک محسوس کرنے لگتے ہیں جو اٹھارہ انیس سال کی عمر میں ان کو لاحق ہوئی تھی اور پھر گزری یادیں اپنے جلو میں اس تلخ واقعے کی یاد بھی لے آتیں جو انہیں بے انتہا کرب میں مبتلا کر دیتا ان کے اندر آگ سی دہک اٹھتی۔

"کیوں؟.... آخر کیوں؟ ان کے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ ایسی معصوم اور پاکیزہ روح کے ساتھ ایسا کیوں؟ بھلا انہوں نے کب کسی کا کچھ بگاڑا تھا' ہمیشہ سنوارا ہی تھا۔ اور اگر رب العزت انہیں مزید حیات دے دیتا تو وہ آج اور بھی بہت کچھ سنوار چکی ہوتیں۔ ہاں ہماری زندگی جس سے الحمد اللہ ہم مطمئن ہیں اور قابل عزت روزگار' معاشرے

میں نمایاں احترام' وفاشعار شریک حیات اور ہونہار اولاد کے لیے اپنے اللہ کے شکر گزار بھی ہیں یہ زندگی شاید تب اور بھی حسین ہوتی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ نہ بچا سکے ہم صاحبزادی فرحت النساء کو اس بے بسی اور بے کسی کی موت سے۔ جو ان کے شایان شان نہ تھی۔ نواب گھرانے کی باحیا' باپردہ بی بی کو نجانے کفن بھی نصیب ہوا یا نہیں۔ یا دریا کی لہروں نے ان کا پردہ رکھ لیا؟

ہر بار وہ یہی سوچ کے رہ جاتے۔ صاحبزادی فرحت النساء کی یاد ان کے دل میں سسک اور درد کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑ کر جاتی تھی لیکن آج کی بات اور تھی۔ آج اس یاد کے ساتھ بے شمار سوال تھے بلکہ یہ یاد ایک چبھتے ہوئے سوال پہ ہی سوار ہو کے تو آئی تھی۔

''کون ہے وہ؟..... ہو بہو صاحبزادی فرحت النساء.....''

گھر واپس آ کے بھی وہ اپنا دھیان اس گھڑی بھر نظر آنے والے چہرے سے ہٹا نہ سکے۔ شاید ان کے چہرے پہ اس کشمکش کے آثار اتنے واضح تھے کہ ان کی شریک حیات اور ان کی مزاج آشنا صاحبزادی حرمت النساء ان پہ پہلی نگاہ ڈالتے ہی چونک گئیں لیکن چھوٹتے ہی سوال جواب کرنا ان کی محتاط فطرت کے منافی تھا۔ اس لیے پہلے ان کی طبیعت اور پھر ڈاکٹری معائنے کی بابت دریافت کرنے لگیں اور اپنی ہی الجھن میں گرفتار نواب صاحب کسی بھی سوال کا جواب تسلی بخش طریقے سے نہ دے سکے۔ جب صاحبزادی حرمت النساء خود پہ مزید ضبط نہ کر سکیں تو بالآخر پوچھ بیٹھیں۔

''آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت تو طبیعت کی گرانی کے باوجود آپ کا مزاج بہت شگفتہ تھا پھر اب اس اضمحلال کی وجہ دریافت کر سکتے ہیں ہم؟''

''نہیں۔'' یہ ایک لفظی دو ٹوک جواب نواب صاحب نے ان کے سوال کے بعد چند لمحے ان کے متردد چہرے کی جانب غور سے دیکھتے رہنے کے بعد دیا تھا۔ یہ توقف انہوں نے یہ فیصلہ کرنے میں کیا تھا کہ آیا اس الجھن کا ذکر ان سے کرنا مناسب ہو گا یا نہیں۔ دل و دماغ دونوں اس نکتے پہ متفق تھے کہ ابھی یہ ذکر قبل از وقت ہو گا۔ جس مسئلے کو وہ خود اب تک سمجھنے سے قاصر ہیں' اس مسئلے میں دوسروں کا الجھانے سے کیا حاصل؟ ویسے بھی وہ اب تک آنکھوں دیکھے پہ یقین نہ کر رہے تھے تو کوئی ان کی زبانی سن کے کیا یقین کرتا۔ اسے محض اتفاق قرار دیتا یا ان کی غلط فہمی اس لیے انہوں نے دو ٹوک انداز میں اپنی بیگم کو یہ باور کرا دیا کہ وہ ان سے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال جواب نہ کریں۔

صاحبزادی حرمت النساء خاموش ہو گئیں۔ اب ان کا اگلا سوال معمول کے مطابق تھا۔

''ظہرانہ لیں گے آپ؟ ہم صاحبزادی الماس خاتون سے کہہ کے دستر خوان لگوا دیتے ہیں۔ وقت تو ہوا چاہتا ہے۔''

''نہیں' ابھی طبیعت مائل نہیں ہو رہی۔ ہم کچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی بہتر.....'' وہ ان کا اشارہ بھانپ کر دروازے کی جانب بڑھیں پھر کچھ خیال آنے پہ پلٹیں۔

''بادام کا شربت تو پیجیے گا؟ فرحت دے گا۔''

ان کے عام سے انداز میں کہے فقرے نے نواب صاحب کے دل پہ عجیب اثر کیا۔ وہ عصا دیوار سے ٹکا کر اور اپنی ٹوپی اتار کے دیوان پہ نیم دراز ہونے کو تھے کہ ان الفاظ کے سحر میں جیسے وہیں کے وہیں ساکت ہو گئے۔

''فرحت.....'' ان کا دل اس ایک لفظ میں اٹک گیا اور جس خیال سے وہ اپنا دھیان ہٹانے کی بار بار کوشش کر رہے تھے' وہ خیال ایک بار پھر کسی آسیب کی طرح چمٹ گیا۔ ان کی خاموشی کو رضامندی جان کے وہ خاموشی سے وہاں سے نکلیں اور بیٹیوں کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ دراصل نواب صاحب کے چہرے پہ انہوں نے کچھ ایسا خوف کچھ ایسی پریشانی دیکھی تھی جو عام حالات میں کبھی نظر نہ آتی۔ وہ اس کی وجہ تو نہ جان پائیں مگر اتنا ضرور علم تھا کہ وجہ بڑی ہو گی۔ بہت بڑی..... ورنہ صاحبزادہ نفیس علی خان جیسا آہنی اعصاب کا مالک شخص اپنی کمزوری

اتنی جلدی اپنے چہرے مہرے سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ چونکہ وہ اپنا ڈاکٹری معائنہ کرا کے آ رہے تھے اور وہ بھی ماہر امراض قلب سے اس لیے لامحالہ ان کے دل میں نواب صاحب کی صحت کے متعلق اندیشے اور خدشے پیدا ہو گئے۔ انہوں نے بچیوں کو بھی کہا کہ وہ باتوں کے دوران ان سے ڈاکٹر سے ہونے والی ملاقات کی تفصیل جاننے کی کوشش کریں۔ اپنے خدشے بیٹیوں تک منتقل کرنے کے بعد وہ تسلی قلب کے لیے قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی نیت سے وضو کرنے لگیں اور موتیا اور گل اپنے والد صاحب کے کمرے میں چلی گئیں جہاں وہ دلگیھو کے ہاتھ سے اخبار لے کر اپنا چشمہ درست کر رہے تھے۔ اپنی دونوں صاحبزادیوں کو ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کے وہ چونکے..... خوصا'' گل مہر کو۔ جو کچھ دنوں سے ان سے کھنچی کھنچی سی تھی۔ اس بات کا ملال رکھنے کے باوجود وہ اس کھنچاؤ اور گریز کو غنیمت جان رہے تھے کم از کم اس کی وجہ سے وہ اس تلخ واقعے کو تو بھلا سکتے تھے جو گل کو ہر بار دیکھنے کے بعد نئے سرے سے تازہ ہو جاتا۔

''کیسی طبیعت ہے ابا حضور؟'' موتیا نے آگے بڑھ کر انہیں شربت کا گلاس پیش کیا۔

''اللہ کا کرم ہے..... جیتی رہیے۔'' انہوں نے ایک پرشفقت نگاہ اس پہ ڈالی۔ گل کو کسی خالی پن کا احساس ہوا۔ وہ اپنی ہتھیلیاں مسلنے لگی۔ کتنے دن سے اس کے ابا حضور بیمار تھے' وہ سب سے سن رہی تھی مگر سننے کے باوجود' چاہتے ہوئے بھی ان کی خیریت پوچھنے نہ آ سکی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔ چند قدم کا۔

مگر ایک انا سے دوسری انا تک کا فاصلہ صدیوں پہ محیط تھا۔ اپنی بے لچک فطرت اس نے نواب صاحب سے ہی ورثے میں پائی تھی۔ ایک بار جو بات دماغ میں بیٹھ گئی تو سمجھو بیٹھ گئی۔ اسے بھی یہ خدشہ لاحق ہو چکا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہوتے ہی اس گزرے تلخ واقعے کی تفصیل ایک بار پھر سے دہرائی جائے گی۔ اس کی کوتاہیاں اس کی لغزشیں گنوائی جائیں گی اور وہ ان لوگوں میں سے تھی جو دل سے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے باوجود کسی اور کے منہ سے ان کا ذکر سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ خطاوار ہوتے ہوئے بھی مورد الزام ٹھہرائے جانا اسے گوارا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی اس گریز کی..... جس پہ اب اسے رہ رہ کے افسوس ہو رہا تھا۔

صاحبزادہ نفیس علی خان کی طبیعت ناساز تو پہلے ہی تھی اس کے اثرات ان کی صحت پہ جو تھے سو تھے مگر آدھ گھنٹہ پہلے جو دھچکا ان کی بصارت نے ان کے دل و دماغ کو پہنچایا تھا وہ انہیں اور بھی پژمردہ کرنے کے لیے کاری ثابت ہوا۔ وہ اتنے تھکے تھکے سے اور نڈھال لگ رہے تھے کہ گل مہر کی ہمت نہ ہوئی ایک کے بعد دوسری نگاہ ان پہ ڈالنے کی۔ اسے اپنے رویے پہ شرمساری محسوس ہو رہی تھی۔

''کیسی ہیں آپ صاحبزادی گل مہر؟'' وہ ہمت ہی باندھتی رہ گئی اور اس بار بھی نواب صاحب سبقت لے گئے۔ انا بے شک دونوں جانب ٹکر کی تھی لیکن نواب صاحب اولاد کے معاملے میں قدرے موم ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے لہجے کی حلاوت نے گل مہر کو گلو گیر کر دیا۔ اس سے لفظ ادا کرنا دوبھر ہو گیا۔ وہ اپنے بے ساختہ امڈ آنے والے آنسو چھپانے کی کوشش میں نظریں جھکاتے ہوئے فقط سر ہلا کے رہ گئی۔

''کیا آپ کے دل میں ہمارے لیے اتنے گلے ہیں کہ آپ ہمارے سوال کا جواب بھی زبان سے ادا کرنا مناسب نہیں سمجھتیں۔'' انہوں نے نجانے اس کی خاموشی سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا یا پھر شاید اس کے نظریں چرانے سے۔ موتیا بھی اس کی ڈھٹائی پہ کھول رہی تھی جو آ تو گئی تھی مگر اپنے رویے سے ابا حضور کو اور بھی ہرٹ کر رہی تھی مگر اچانک وہ بھی ششدر رہ گئی' بالکل نواب صاحب کی طرح جب گل ان کے پیر پکڑ کے ان پہ اپنا سر رکھ کے ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

''صاحبزادی گل مہر.....'' حیرت کے اس جھٹکے سے ذرا سنبھلتے ہوئے نواب صاحب نے آہستگی سے اپنے پیر پرے ہٹائے اور اسے آواز دی۔ شاید کبھی دو تین سال کی گل مہر کو انہوں نے روتے دیکھا ہو گا مگر اس کے بعد ان آنسوؤں کا کوئی ذکر ان کے حافظے میں نہ تھا۔ وہ تذبذب میں تھے کہ کیا کہہ کر اپنی اس بیٹی کو چپ کرائیں جو ہمیشہ

انہیں دل سے خصوصی طور پہ قریب محسوس ہوئی تھی۔
شاید اپنی من موہنی شکل و صورت کی وجہ سے۔
یا اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے۔
یا اس وجہ سے کہ وہ بچپن سے ہی یہ بھانپ گئے تھے کہ وہ عادات و خصائل میں بڑی حد تک ان ہی کا پرتو ہے۔
یا پھر اس وجہ سے کہ اس کے اندر انہیں وہ خاندانی تمکنت اور جاہ و حشمت محسوس ہوتی تھی جو ان کے خاندان کا خاصہ تھی مگر اپنی اور اپنے بھائی صاحب کی اولاد میں سے وہ صرف گل مہر کے اندر ہی اس کے اثرات پاتے تھے۔

جو بھی تھا' وہ انہیں ہمیشہ عزیز رہی۔ اس کی خاطر شروع ہی سے وہ ایسے بہت سے فیصلے کرتے آئے جن کی ان سے امید نہ کی جاسکتی تھی۔ اس کا کوایجوکیشن میں پڑھنا...... گھر سے نکل کر جاب کرنا اور پھر اس کی پسند سے ایک باہر کے رشتے کا گھر تک چلے آنا اور یہ شاید حد تھی۔ آخری حد۔
اس کے بعد انہوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر پتھر کر لیا تھا کہ اب جو بھی ہے وہ اولاد کی محبت کے ہاتھوں اپنے خاندان کی ناموس کو داؤ پر نہیں لگائیں گے لیکن اس وقت ان کے پیروں پہ سلگتے گل مہر کے آنسو انہیں ایک بار پھر موم کر رہے تھے۔ ان کا دل فیاضانہ صدائیں لگا رہا تھا۔
"مانگو...... جو مانگنا ہے مانگو...... ان آنسوؤں کے صدقے ہم نے سب معاف کیا۔ جو ہمارے ہاتھ میں ہے' سب تمہارے ہاتھ میں دیا...... مانگو۔"
مگر وہ کچھ اور ہی مانگ رہی تھی۔
معافی...... وہ اپنے بدصورت رویے کی معافی مانگ رہی تھی رو رو کے عاجزی سے۔
موتیا نے یہ منظر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھا۔
"کیسی باتیں کر رہی ہیں صاحبزادی گل مہر...... بیٹیاں معافی مانگتی اچھی نہیں لگتیں اور نہ ہی پیر چھوتے ہمارے سرکار دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تو یہ ہے کہ اپنے تن کی چادر بچھا کے بیٹیوں کو بٹھایا جائے...... ان کی آمد پہ کھڑے ہو کر انہیں احترام دیا جائے۔ آپ ہمارے پاؤں چھو کے ہمیں گناہ گار کر رہی ہیں۔ بخدا ہمارے دل میں آپ کے خلاف ذرا سا بھی میل نہیں ہے۔ ہاں ہم آپ سے گریزاں ضرور رہے لیکن جیسے کہ آپ نے اپنے گریز کی وجہ شرمندگی بتائی ہے' ہمارے گریز کی بھی ایک وجہ تھی۔ ہم آپ کے سامنے آ کے اپنی معذوری ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ہم ــ اپنے اصولوں کی وجہ سے اور اپنے آباء سے کیے عہد کی وجہ سے آپ کی خواہش پوری کرنے سے قاصر ہیں۔"
"ہماری کوئی خواہش نہیں ابا حضور اور وہ خواہش' اس سے ہم دست بردار ہی نہیں ہو چکے بلکہ اسے فراموش بھی کر چکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں بھی آپ کی طرح اپنے معیار سے کم کوئی چیز نہیں بھاتی۔ یہ تو ایک دھوکا تھا جو ہم نے اپنی ناتجربہ کاری کے ہاتھوں کھایا اور ہم اس پہ دل سے شرمسار بھی ہیں۔"
"بھول جایئے ان باتوں کو۔"
"ابا حضور' ڈاکٹر نے کیا کہا؟" وہ اصل بات کی جانب آئی۔
"ہوں...... خاصی تسلی بخش رپورٹ ہے۔" انہوں نے فائل آگے کی۔ "اس عمر میں...... اور بلند فشار خون کے عارضے کے ساتھ دل بے ایمانی تو کر ہی جاتا ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہے جو زیادہ تشویش ناک ہو۔ طبیعت کی گرانی موسم کی شدت کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام معائنہ جات تسلی بخش نکلے۔ صرف آرام اور پرہیز پہ عمل کرنے کا کہا گیا ہے۔"
"شکر ہے اللہ کا۔" موتیا نے بے ساختہ شکرانہ ادا کیا۔ گل مہر بھی ای سی جی وغیرہ کی رپورٹس کا جائزہ لینے کے بعد قدرے مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"کھانا لگوائیں ابا حضور؟" موتیا نے پوچھا۔
"نہیں ایک کپ چائے بنا دیجئے اور دلگیر کو بھیجیے' ہمارے پیروں پہ زیتون کے تیل کی مالش کر دے۔"
"میں خود لگا دیتی ہوں ابا حضور۔" وہ مستعدی سے نزدیک رکھی تیل کی شیشی اٹھا کے ان کے نزدیک فرش پہ بیٹھ گئی۔
"اور چائے ہم بنا لاتے ہیں۔" گل مہر نے ایک اور حیرت انگیز عمل کیا یعنی چائے بنانے چلی گئی۔
"آج ہمارے سر سے ایک بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔" انہوں نے غالباً "نہیں بلکہ یقیناً" موتیا کو ہی مخاطب کیا تھا کہ اس وقت ان دونوں کے سوا کمرے میں تیسرا کوئی نہیں تھا اس کے باوجود موتیا بے یقینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دراصل نواب صاحب دل کی باتیں کم ہی کسی سے کرنے کے قائل تھے اور اولاد سے تو ہمیشہ ہی انہوں نے ایک مناسب فاصلہ رکھا تھا' کجا کہ وہ اتنا "ذاتی" ہوتے مگر آج ہو رہے تھے۔ موتیا کو ان کی باتیں سنتے ہوئے ایک عجیب سا فخر اور سرشاری کا احساس ہو رہا تھا کہ آج اس کے ابا حضور نے اسے اس قابل جانا کہ اس سے اپنے محسوسات شیئر کر رہے ہیں۔
"صاحبزادی گل مہر نے ہمارے دل سے تمام تر اندیشے دھو ڈالے ہیں۔" وہ کہہ رہے تھے۔
"اور میرے اندیشے؟" وہ سوچنے لگی۔
"جانتی ہیں آپ...... ان کے آنسو ہمیں مدہم کر رہے تھے۔ ہمیں اندر تک چھیڑ رہے تھے۔ ہمارے دل میں ایک راستہ سا بناتے جا رہے تھے۔" وہ موتیا کی سوچ سے بے فکر دھیمے لہجے میں اپنی ہی کہتے جا رہے تھے۔
"اس وقت صاحبزادی گل مہر نے ہم سے مانگا بھی تو معافی مانگی حالانکہ بخدا وہ اس وقت کچھ بھی مانگتیں ہم انہیں دے دیتے۔ تب واقعی ہماری یہ سوچ تھی اور اب ہم ڈر رہے ہیں یہ سوچ کر کہ اگر واقعی وہ کچھ اور مانگ بیٹھتیں تو تو ہم کیا کرتے؟ اگر وہ اس بہروپیے کے لیے رعایت طلب کر لیتیں تو ہم کیا واقعی ہم مان جاتے ہاں شاید مان ہی تو جاتے وہ لمحہ بڑا کمزور تھا صاحبزادی الماس خاتون۔ ان کے آنسوؤں نے ہمیں اس موڑ پہ لا کھڑا کیا کہ وہ کچھ بھی مانگتیں ہم دے دیتے۔"
"میں...... میں دیکھتی ہوں گل نے چائے بنائی یا نہیں' کبھی کبھار تو باورچی خانے کا رخ کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی چیز کی ضرورت ہو اسے۔" اچانک وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔
کمرے کے خالی پن نے نواب صاحب کو احساس دلایا کہ کافی دیر سے وہ کہہ رہے تھے اور موتیا سن رہی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرا اٹھے۔
"بیٹیاں بھی کیا خوب دمساز ہوتی ہیں۔ آج احساس ہوا صاحبزادہ نفیس علی خان' جو کسی پہ بھی نہ کھلتے تھے۔ ایک بیٹی کے آگے کمزور پڑے اور دوسری بیٹی کے سامنے اپنی کمزوری بیان کر بیٹھے۔"
وہ اپنی کیفیت سے خود ہی حظ اٹھاتے ہوئے اخبار کھولنے لگے۔ ورق پلٹتے ہی ان کے مسکراتے لب ایک دم سکڑ گئے۔
سامنے وہی چہرہ تھا جس نے انہیں ایک خلفشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ بڑے جتنوں سے وہ وقتی طور پہ اس خیال سے چھٹکارا حاصل کر پائے تھے۔ اپنا دھیان اس طرف سے ہٹا کر اپنی بیٹیوں کی جانب لگانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہے تھے مگر اب اخبار کا بے جان ٹکڑا اور اس پہ بنی وہ شبیہ ان کی تمام تر کاوشوں پہ پانی پھیر گئی تھی۔
وہ چہرہ...... وہی چہرہ جو پل بھر کے لیے نظروں کے سامنے آیا تھا اور انہیں جھنجھوڑ کر رکھ گیا تھا۔ وہی چہرہ ایک بار پھر سامنے تھا اور اب وہ تفصیل سے اس چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ حیرت ان کی رگوں میں اترتی جا رہی تھی۔
وہی حزن و وحشت کا امتزاج لیے کھلی کھلی سی آنکھیں۔
وہ صبیح پیشانی حتیٰ کہ پیشانی کے اوپر' دائیں طرف وہی سیاہ تل۔
وہی خم دار بھرے بھرے ہونٹ۔

وہ سوال دوبارہ انہیں ڈنک مارنے لگا۔

"یہ نقش تمہیں کس نے دان کیے؟"

☼ ☼ ☼

کل سے وہ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کی ایک عام سی بات اسے بری طرح محسوس ہوئی تھی۔

"وہ لمحہ بڑا کمزور تھا۔ ان کے آنسوؤں نے ہمیں اس موڑ پہ لا کھڑا کیا کہ وہ ہم سے کچھ بھی مانگتیں، ہم دے دیتے۔"

اور تب ایک اندیشہ کسی چور دروازے سے موتیا کے دل و دماغ میں آن گھسا۔

"اور اگر اس نے وہ مانگ لیا جو ابا حضور میرے لیے منتخب کر بیٹھے ہیں تو۔۔۔ تو کیا ہوگا؟ کیا وہ تب بھی اس کے آنسوؤں کے بہاؤ کے آگے بے بس ہو جائیں گے؟۔۔۔ کیا وہ ایک اور کمزور لمحہ ہوگا؟ کیا اس بار بھی گل جو چاہے گی وہی ہوگا؟۔۔۔ ہاں ایسا ہو بھی سکتا ہے خاص طور پہ اس صورت میں جب دینے والے ابا حضور ہوں جو ہمیشہ اس کی ضد اور آنسوؤں کے آگے ہار مانتے آئے ہیں اور اس صورت میں بھی کہ جسے وہ مانگ رہی ہے' وہ خود اپنا آپ اسے سپرد کرنے پہ دل و جان سے آمادہ ہو۔"

اس تجزیے نے اسے بھربھری مٹی کی صورت بکھرا کے رکھ دیا تھا۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ اس اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اس نے خوش فہمیوں کی کوئی کرن تلاشنی چاہی۔

"تم میری زندگی میں میری رضا اور میری خوشی سے شامل ہوئی ہو۔" اس کی بات یاد آئی۔

گویا اس کا ایک جگنو مٹھی میں آہی گیا۔

"رضا۔۔۔ خوشی ہاں مگر محبت سے تو نہیں تم نے مجھے بہ رضا اور بخوشی قبول تو کیا ہے **عمیص** مگر میں تمہاری طلب تو نہیں تھی نہ ہوں۔"

اس کی گرفت کمزور پڑی اور وہ جگنو پھر سے اڑ گیا۔ وہ مایوسی سے اپنی سونی ہتھیلی دیکھتی رہ گئی۔ اچانک اسے اس ہتھیلی سے خوشبو میں پھوٹتی محسوس ہوئیں ہر مسام پہ **عمیص** کا لمس لو دینے لگا۔

"لاؤ' مٹھاس گھول دیتا ہوں۔"

اب جگنو ایک نہیں تھا۔۔۔ لاتعداد تھے اور وہ ہزاروں' لاکھوں جگنو **عمیص** کی شریر سیاہ آنکھوں کی مسکراہٹ میں جگمگا رہے تھے۔ دل سے مایوسی کے اندھیرے خود بخود چھٹنا شروع ہو گئے البتہ ذہن ابھی تک بوجھل تھا۔

"لاؤ' میں پڑھ دوں؟"

عمیص کی آواز کہیں نزدیک سے ہی ابھری تھی' وہ چونک کے پلٹی۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ پیچھے ہی کھڑا تھا۔

"تمہیں کہاں آتا ہے ہاتھ کی لکیریں پڑھنا۔۔۔ لاؤ' میں پڑھ کے بتاتا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے پیشکش کی۔ موتیا جھینپ گئی۔ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ دالان کی سنگی سیڑھیوں پہ بیٹھی۔۔۔ نرم گیلی گھاس پہ ننگے پیر رکھے کب سے ان بے معنی سوچوں میں گم تھی۔ **عمیص** بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"بائی داوے کون سی لکیر کا معائنہ ہو رہا تھا۔ زندگی کی قسمت کی یا شادی کی لکیر کا؟"

"اس لکیر کا جو فاصلہ رکھنے کے لیے دو فریقین کے مابین کھینچ دی جاتی ہے۔"

"پھر ملی؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ کچھ کچھ آثار تو ہیں مگر ایسی لکیریں بانٹنا بھی میں بخوبی جانتی ہوں اور بوقت ضرورت انہیں مٹانا بھی۔"

پتہ نہیں کیسے مگر **عمیص** کو سامنے پا کے اس کی مایوسیاں اپنی موت آپ مر گئی تھیں۔ وہ اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے ایک لمحے میں یہ سوچ لیا تھا کہ وہ کسی کو بھی یہ حق نہیں دے گی کہ وہ اس سے **عمیص** کو چھین سکے۔ کیونکہ **عمیص** اس کے لیے ایک ایسے آسمانی تحفے کے برابر تھا جو اس کی چاہ اور خواہش تو تھا

مگر طلب نہیں۔ اس نے ابھی تک اسے اللہ سے مانگنے کی جرات بھی مجتمع نہ کی تھی کہ اللہ نے اپنے کرم کی انتہا کرتے ہوئے اسے اس سے نواز دیا۔ تو جب اللہ کی مرضی یہی ہے تو کوئی دوسرا کیسے اس کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

اس نے ان لاکھوں' کروڑوں جگنوؤں کو مٹھی بھر بھر کے اپنے پلو سے باندھ لیا اور اپنا آنچل جگمگا لیا۔

"تو اب بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگی ہو۔ یہ پراسرار و مشکوک قسم کی حرکتیں کس لیے؟ پتہ ہے کوئی دیکھے گا تو کیا سمجھے گا کہ موتیا بی بی۔"

"یہی ناں کہ موتیا بی بی پاگل ہو گئی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ وہ سمجھے گا کہ موتیا بی بی کو محبت وحبت ہو گئی ہے۔۔۔ چہ چہ کتنی بدنامی والی بات ہے۔ لوگ سو سو باتیں سنائیں گے مجھے کہ تمہاری منگیتر محبت کرنے لگی ہے۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔" وہ اداکاری کر رہا تھا' یہ بات موتیا جانتی تھی اس کے باوجود ان بے سروپا باتوں پہ اسے خواہ مخواہ تاؤ آ گیا۔

"اس میں بدنامی والی کون سی بات ہے اور تم منہ کیوں چھپاتے رہو گے۔"

"شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہی تو ہوگا کہ میری منگیتر' اور محبت کسی اور سے؟"

"تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں کسی اور سے محبت۔۔۔" وہ زبان دانتوں تلے دبا کے رہ گئی اور **عمیص** کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

"ارے۔۔۔ کیا واقعی؟ تو کیا مجھ سے؟ زہے نصیب۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ اور بھی شرمندہ ہوئی۔

"میں تو کروں گا۔" وہاں سے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا گیا جس پہ موتیا نے آنکھیں نکال کے دھمکایا۔

"فضول باتیں کرنے والوں کا میں برا برا حال کرتی ہوں۔"

"حال تو آپ کے دیوانے کا پہلے بھی خاص اچھا نہیں۔" اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے ٹھنڈی آہ بھری۔ ایسا کرتے ہوئے وہ موتیا کو زہر لگا۔

"کہاں سے سیکھ کے آتے ہو یہ تھرڈ کلاس ناز و ادا۔ دلگیر سے ایکسٹرا کلاسز تو نہیں لے رہے؟"

"نہیں' مجنوں اور رانجھے سے ٹیوشن لے رہا ہوں۔ فرہاد اور مہینوال کے بھی دو چار لیکچرز اٹینڈ کیے ہیں۔"

"ایک آدھ لیکچر اپنے چچا حضور کا بھی سن لیتا تھا۔" وہ چڑ گئی اس کی بناوٹی باتوں سے۔

"وہ دن گئے۔ جب خلیل میاں لیکچر سنا کرتے تھے۔"

"میں تمہاری بات کر رہی ہوں۔ یہ خلیل میاں کون ہیں اور یہ میرے ابا حضور کے لیکچر کے دوران کیوں ٹپک پڑے۔"

"اے ادب سے بے بہرہ خاتون۔۔۔ یہ خلیل میاں وہی ہیں جو بھلے وقتوں میں فاختائیں اڑانے کا شغل کیا کرتے تھے۔ جیسے ان کی تمام فاختائیں ایک ایک کر کے اڑ گئیں اور اب وہ اداس نظروں سے فضاؤں کو تکتے رہتے ہیں اسی طرح ہمارے چچا حضور کے وہ زمانے بھی لد گئے جب وہ ہمیں سامنے بٹھا کے گھنٹوں لیکچر دیا کرتے تھے۔ اب مابدولت داماد ہیں اب مجھے ان کی جانب سے لیکچر نہیں' پروٹوکول ملا کرے گا۔"

"اوہو۔۔۔ غلط فہمیوں کی اڑان کتنی بلند ہے۔" موتیا نے ناک چڑھائی۔

"اور تمہاری غلط فہمیوں کی اڑان؟ وہ کتنی بلند ہے؟" پہلی بار موتیا کو اس کے لہجے میں سنجیدگی کی رمق محسوس ہوئی۔ وہ یوں گھبرا اٹھی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔

"کیا مطلب؟"

"بندہ بشر غلط فہمیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور خوش فہمیوں کے سہارے جی اٹھتا ہے تم بھی کوئی ماورائی مخلوق تو ہو نہیں' عام انسان ہو۔ تمہاری بھی کچھ غلط فہمیاں اور کچھ خوش فہمیاں ہوں گی' ان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

”جی نہیں، مجھے ایسا کوئی مرض لاحق نہیں۔“ وہ صاف مکر گئی البتہ دل ہی دل میں اس کی قیافہ شناسی کو خوب داد دی۔

”توبہ برا ہو اس برسوں پرانی دوستی کا کہ جس کے ہاتھوں اب ہم اپنی کوئی بات راز تو رکھ ہی نہیں سکتے' نہ وہ مجھ سے نہ میں اس سے کچھ چھپا پاتی ہوں۔ خصوصاً ”عمیص کی حس تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی کام کرتی ہے۔ کیسے اندر تک اتر جاتا ہے۔“

وہ سوچ رہی تھی اور **عمیص** مسکرا رہا تھا۔ کافی دیر سے وہ اس کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اکیلی بیٹھی وہ پتہ نہیں کن سوچوں میں گرفتار تھی۔ **عمیص** نے خود پہلے اس کے چہرے پہ تناؤ..... پھر تردد..... پھر تفکر اور اس کے بعد امید حوصلہ اور یقین کے رنگ اترتے دیکھے تھے۔

”اب گھورنا بند کرو۔ پکے لفنگے بنتے جا رہے ہو۔ سیدھا کر کے رکھ دوں گی۔“ اس کی ”سب جانتا ہوں“ قسم کی مسکراہٹ سے وہ مسلسل چڑ رہی تھی۔

”جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں ہاں مگر میری شدید تمنا ہے کہ تم برس جاؤ.....“

چہرے پہ میرے زلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو' برس جاؤ کسی دن
رازوں کی طرح اترو میرے دل میں کسی شب
دستک پہ میرے ہاتھ کی کھل جاؤ کسی دن
پیڑوں کی طرح حسن کی بارش میں نہالوں
بادل کی طرح جھوم کے گھر آؤ کسی دن
خوشبو کی طرح گزرو میرے دل کی گلی سے
پھولوں کی طرح مجھ پہ' بکھر جاؤ کسی دن

وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا اور موتیا کسی سحر میں جکڑی جا رہی تھی۔ اس کی پلکیں خود بخود بھاری ہونے لگیں۔ **عمیص** رکا تو اس نے بمشکل بوجھل ہوتی پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔

وہی شریر سی مسکراہٹ جو آج کل اس کے لبوں کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے؟ آج تمہاری بیاض کیوں خالی ہے؟ اگلے اشعار نہیں مکمل کرو گی؟“

”اگلے اشعار؟“ موتیا نے ذہن میں امجد اسلام امجد کی اس خوب صورت غزل کے اختتامی اشعار دوہرائے اور حیا سے کٹ کے رہ گئی۔

”فضول ہو گئے ہو تم۔“ وہ تیزی سے اٹھ کے اندر چلی گئی۔ ویسے بھی ناشتا بنانے کا وقت ہو رہا تھا۔ تائی حضور کا ناشتہ وہ سب سے پہلے تیار کرتی تھی اور ان کے کمرے میں خود ہی پہنچانے جاتی تھی۔ اس طرح صبح کا سلام بھی ہو جاتا۔ یہ اس کا برسوں پرانا معمول تھا۔ آج بھی وہ ٹرے لے کر پہنچی تو **عمیص** وہاں پہلے سے موجود تھا اور کسی سنجیدہ مسئلے پہ بحث ہو رہی تھی۔

”وعلیکم اسلام' جیتی رہیے۔“ بات روک کے صاحبزادی **خلعت النساء** نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر سے سلسلہ کلام جوڑا۔

”آپ آج کسی بھی وقت جا کے صاحبزادی یاسمین خانم کو مطلع کر آیئے۔“ وہ **عمیص** سے مخاطب تھیں۔

”لیکن امی حضور' آپا ابھی دو دن پہلے تو واپس گئی ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اتنی جلد وہ واپس آپائیں گی۔ ویسے بھی مہینے میں ایک آدھ بار آنا ہی ان کا معمول ہے اور جو اطلاع آپ بھجوانا چاہ رہی ہیں وہ سنتے ہی رہ بھی نہ پائیں گی۔ لازما ”آنا چاہیں گی۔ ایسا نہ ہو کہ بابر بھائی صاحب کو ان کے تیسرے ہی دن واپس میکے آنے پہ اعتراض پیدا ہو جائے۔“

”ہم انہیں بلوا نہیں رہے۔ انہیں اپنے چچا حضور کی ناسازی طبیعت ..... لیے آپ کو بھیج رہے ہیں کہ قرینے سے انہیں بتا بھی دیجیے گا اور یہ تسلی و تشفی بھی کرا دیجیے گا کہ اب اللہ کے فضل سے وہ رو بہ صحت ہیں۔ آپ نہیں جان سکتے **عمیص** میاں' بیٹیاں میکے کے بارے میں کتنی حساس ہوتی ہیں۔ اگر انہیں ان کے اپنوں کی معمولی سی بات سے بھی لاعلم رکھا جائے تو انہیں میکے سے پرایا پن محسوس ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی وہ اور بچے اپنے نانا حضور کے لیے دعا کریں گے تو انشاءاللہ بھائی صاحب کی طبیعت اور بھی بہتر ہو جائے گی۔“

”بہتر امی حضور' آج اسٹور کھول کر ایک آدھ گھنٹہ کے لیے **دلگیر** کو بٹھا جاؤں گا اور خود آپا کے ہاں سے ہو آؤں گا۔ بعد میں تو بہت گرمی ہو جاتی ہے۔ بچوں کے لیے پھل لے جاؤں یا مٹھائی؟“

☼ ☼ ☼

دریاں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ چند منٹ پہلے گھر کے لان' پورٹیکو اور لاؤنج میں بچھی یہ دریاں اور ان پہ بچھی سفید چادریں..... ان کا ایک انچ کا ٹکڑا بھی دیکھنے والوں کو نظر نہ آتا تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے لوگ آئے تھے۔ بڑی تعداد میں تو شہزاد ملک کے جاننے والے تھے۔ برادری کے بھی بہت سے لوگ تھے..... ایسے لوگ جن سے اب بالو اور کرمے کا میل ملاپ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا لیکن کرم الٰہی کی موت کی خبر پھیلتے ہی آس پاس کے گاؤں' دیہاتوں' قصبوں میں رہنے والی ان کی ذات برادری امڈی چلی آئی۔

اک شور سا ہر جانب بپا تھا۔ لاؤنج کے بیچوں بیچ سیڑھیوں کے نزدیک چارپائی پہ پھولوں اور سبز چادر سے ڈھکا کرم الٰہی کا بے جان وجود پڑا تھا۔ اگربتیوں اور کافور کی مہک سوگوار ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ بالو چارپائی کے پائنتی کرمے کے پیر تھامے سسک رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی کوئی رشتہ دار عورت جذباتی قسم کا مکالماتی بین ڈالتے ہوئے اسے اکساتی اور وہ آسانی سے ضبط کا دامن چھوڑ دیتی۔ سسکیاں' چیخوں میں بدل جاتیں۔ دعا اپنی ماں کو سنبھال سنبھال کر ہلکان ہو گئی تو انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا اور خود ماما جی کے سرہانے بیٹھ کے تلاوت کرنے لگی۔ ایسا نہ تھا کہ اسے ماما جی کی وفات کا کم دکھ تھا۔ کل دوپہر سے لے کر پچھلی ساری رات تک اس کے آنسو نہ تھمے تھے۔ ان کی باتیں یاد آتیں تو آہیں اس کے اندر بھی مچلنے لگتیں لیکن اسے ان عورتوں کا انداز بہت ناگوار گزر رہا تھا جو کرمے یا بالو کی شاید دور پرے کی رشتے دار تھیں اور جن کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا مگر وہ انہیں مسلسل چادر کے پلو سے رگڑ کے سرخ کرتی جا رہی تھیں اور بیچ بیچ میں یہی آنکھیں گھما گھما کے گھر کا جائزہ بھی لیا جاتا۔ جہاں وہ بلقیس کو خاموش ہوتے دیکھتیں' ایک تیر سینے پہ مار کے واویلا کیا جاتا۔

”ہائے کرمے تو کیوں گیا؟ ہائے تجھے اپنی بالو کا خیال نہ آیا۔“ دوسری بلقیس کو اپنے ساتھ لپٹا لیتی۔ ”ہائے نی' میری بالو! جڑ گئی' سر کا سائیں ختم ہو گیا۔ نی بالو' تیری وی کوئی زندگی اے۔“

”وے کرمے اٹھ' اٹھ اپنے پتر کے سر پہ سہرا سجا۔ اٹھ میرے ویر تو نے تو ابھی اپنے پوترے گودی کھلانے ہیں۔ یہ کوئی تیری عمر ہے جانے کی۔ اٹھ اپنے پتر کی جنج کا انتظام کر۔“ تیسری دوسروں کے دل رقیق کرنے کے لیے یہ طریقہ نکالتی۔

”ویساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا۔“ ایک عمر رسیدہ مائی اپنی کپکپاتی آواز میں نوحہ پڑھنے کے سے انداز میں گانا شروع کرتی اور ہر جانب سے چیخیں اور بین شروع ہو جاتے۔ یہ صرف آج کی بات نہ تھی۔ دعا جب بھی کسی موت والے گھر گئی' یہی کچھ دیکھا۔ متعلقین تو شدت غم سے نڈھال ہوتے ہی تھے۔ ان کے دماغ ماؤف ہو چکے ہوتے' وہ بھلا اس عالم میں ایسے شاہکار المیہ مکالمے کہاں تخلیق کر سکتے تھے مگر دوسرے اس فرض کی ادائیگی میں بڑھ بڑھ کے کارکردگی پیش کرتے جیسے کہ اس وقت ہو رہا تھا۔

"بالو، جی بھر کے دیکھ لے، یہ چہرہ اب تجھے کبھی نظر نہیں آنا۔" اس کی رشتے کی بہن نے باور کرایا۔

مرد، جنازہ لے جانے کی نیت سے آئے تو عورتیں حلق پھاڑ کے چیخنے لگیں۔

"نہ شہزاد پا! اپنے پیو کو مٹی کے حوالے نہ کرنا۔"

"نہ بالو، نہ جانے دے اپنے کرمے کو۔ یہ پھر واپس نہیں آنے والا۔"

"روک لے بالو۔ نہ لے جانے دے۔"

بلقیس تو لگتا تھا ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔ پرشکن مسلے ہوئے سفید شلوار قمیص میں ملبوس شہزاد کا چہرہ بھی متورم اور ستا ہوا تھا۔ رت جگے اور باپ کی دائمی جدائی کے غم نے ایک ہی دن میں چہرے سے سارا لہو نچوڑ لیا تھا۔ دعا نے آگے بڑھ کے اپنے ماما جی کے پیروں سے لپٹی بالو کو آہستگی سے اٹھانے کی کوشش کی۔

"نہ کریں ایسے۔ مامی جی نہ کریں ماما جی کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ انہیں آرام سے ان کے آخری سفر پہ روانہ ہونے دیں۔ ان کے لیے دعا کیجیے۔ انہیں اس وقت آپ کے آنسوؤں کی نہیں دعاؤں کی حاجت ہے۔"

"ہائے وئی، یہ تیرے مامے کو لے جائیں گے۔" وہ ان عورتوں کے ماتمی بیانات کے زیر اثر تھی۔

"وہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں۔ آپ راہ میں آ کے کیوں گناہ گار ہوتی ہیں۔ ماما جی اللہ میاں کے پاس جا رہے ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں اللہ اور بندے کے میل کے بیچ آنے والے۔"

اس نے بہت مشکل سے بالو کو وہاں سے اٹھنے پہ آمادہ کیا۔ اسے ان عورتوں کے ناک بھوں چڑھانے کی بھی پروا نہ تھی جو دبی دبی سرگوشیوں میں کہہ رہی تھیں۔

"کتنی جلدی ہے اسے مامے کو بھیجنے کی۔"

"کلمہ شہادت۔"

یہ آواز سنتے ہی ایک بار تو دعا کو بھی اپنا دل پھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے بے ساختہ ابھرنے والی چیخ اندر ہی گھونٹ کے لب سختی سے دانتوں تلے دبا لیے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کے سارے چہرے پہ تپش پھیلا گئے۔ اس نے بالو کا مچلتا وجود اپنی بانہوں میں زور سے پکڑ رکھا تھا۔

گیٹ سے جنازہ نکلتے ہی دعا نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور بالو مچلتی ہوئی باہر کی طرف نکلی۔ دعا تھکے تھکے قدم اٹھاتی دوسری عورتوں کے ساتھ پیچھے ہی آگئی۔

"باہر اچھا موسم ہے۔" کسی عورت نے تبصرہ کیا جو اپنی دنیا اندھیر ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔

"ہاں، اندر تو حبس ہو گیا تھا۔ کھڑا ہی نہ ہوا جا رہا تھا۔" یہ وہ محترمہ تھیں جو بالو کو میت روک لینے جیسے عمل پہ اکسا رہی تھیں۔

اب عورتیں ہلکے پھلکے موڈ میں لان میں بچھی دریوں پہ گروپ کی صورت یہاں وہاں بیٹھ گئیں اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ صرف بالو تھی جو نڈھال بیٹھی بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ کل سے مسلسل بین کر کر کے اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

"آج کی روٹی کس نے دینی ہے؟" کرمے کی رشتے کی بھانجی کو متجسس انداز میں کسی سے پوچھتے سن کر نزدیک سے گزرتی دعا کا جی مکدر ہو گیا۔ وہ مامی کے نزدیک وہیں گھاس پہ بیٹھ گئی۔

"مامی جی، درود شریف اور فاتحہ زیادہ سے زیادہ پڑھیں تاکہ ماما جی کی قبر میں روشنی اترے، ان کے لیے آسانیاں پیدا ہوں۔ ہم اب ان کے لیے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں اور یہی ہے جو ان کے کام بھی آئے گا۔ یہ آنسو انہیں کچھ نہیں دے سکتے۔"

شاید اب بلقیس کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ورد کرنے لگے۔ کلام پاک اس کے دل کو صبر سے بھر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بالو کی خواہش تھی کہ کرم الٰہی کے آخری سفر پہ روانگی کے وقت ان کی ساری برادری جمع ہو کیونکہ کرمے نے کبھی جیتے جی خود کو ان سے الگ نہیں سمجھا تھا۔ ہاں بیٹے کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کے باعث وہ کافی عرصے سے ان سے قدرے الگ تھلگ ضرور تھا مگر بنیادی طور پہ وہ ایسا انسان تھا جو اپنا "اصل" نہ تو کبھی فراموش کرتے ہیں نہ اس پہ شرمندہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے شہزاد ملک نے بھی ماں کی اس خواہش پہ ناک بھوں نہ چڑھائی۔ اس قسم کا ردعمل ظاہر کرنے کے لیے یہ موقع مناسب بھی نہ تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ باپ کی موت کا ذمہ دار اب تک خود کو ہی سمجھ رہا تھا حالانکہ کرم الٰہی کافی عرصے سے بیمار تھا۔ کوئی ایک روگ تو نہیں تھا اسے۔ لیکن شہزاد کو رہ رہ کے یہ خیال آتا۔

"جب ڈاکٹرز مجھے سختی سے وارن کر چکے تھے کہ ابا کی صحت اب کسی جذباتی دھچکے کو سہارنے کی متحمل نہیں رہی تو مجھے ایسا قدم اٹھانا ہی نہیں چاہیے تھا جب کہ میں خود بھی جانتا تھا کہ میری اصلیت کھلنے کے پچاس فیصد امکانات موجود ہیں۔ میں نے ایک رسک لیا تھا۔ اور کتنا بڑا رسک لیا کہ اپنے باپ کی زندگی ہی داؤ پہ لگا دی۔ کیا یہ سوچ کر کہ اس بوڑھے بیمار شخص کی عمر کے اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، کیوں نہ اس باقی ماندہ زندگی کو کام میں لایا جائے۔ تف ہے تم پہ شہزاد ملک ایک ایسا باپ، جو تمہاری نظر میں تاریکی اور بدنامی کی زندگی جیتا آیا تھا، اسے تم نے عزت کی موت بھی نہ مرنے دیا۔ بڑا 'عزت' 'عزت' کا راگ الاپتے تھے۔ سدا یہی رونا روتے رہے کہ باپ کی وجہ سے تمہیں ایک باعزت زندگی کا حصول کتنا دشوار محسوس ہوا۔ اچھا؟ اور تم نے کیا دیا باپ کو؟ تم تو بڑے عزت دار انسان ہو ناں؟ دن بھر میں درجنوں لوگ تمہیں جھک کے سلام کرتے ہیں، تعظیم دیتے ہیں۔ تم دے دیتے اپنے حصے کی عزت انہیں۔ مگر نہیں تم نے تو انہیں بیٹے کے حوالے سے عزت بھی وصولنے نہ دی۔ ایک پر تعیش پنجرے میں قید کر کے رکھ دیا اور وہ ذلت جو درحقیقت تمہارا نصیب تھی، تمہارے حصے میں آنا تھی، وہ تم نے کتنی آسانی سے اپنے باپ کے حصے ڈال دی۔ اس باپ کے جو چاہتا تو بڑی آسانی سے بچپن سے ہی تمہارے ذہن کو اس جانب راغب کر کے تمہیں اپنی زندگی کی جانب کھینچ سکتا تھا۔ اس گمراہی، ذلت اور تاریکی کی زندگی میں، تم بھی کسی میلے میں لگنے والے تھرڈ کلاس سرکس میں اجڈ قسم کے ہجوم کے سامنے چمڑے کی جوتی اپنے ہاتھ پہ بار بار مار کے پھکڑپن اور فحاشی کو چھوتے مکالمے ادا کر رہے ہوتے۔ مگر اس باپ نے جو خود اس قسم کے کام کرتا رہا، تمہیں وہ ہی دیا جو تم چاہتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع۔ اپنی پسند کا پیشہ منتخب کرنے کے اختیارات اور تم نے ہی قدر نہ کی احسان نہ مانا الٹا نہیں الزام دے دے کر احساس جرم میں مبتلا کیے رکھا اور پھر اپنے ایک مقصد کے حصول کے لیے جو جوا کھیلا اس میں اپنے باپ کو ہی داؤ پہ لگا دیا۔ تم یہ جوا ہار گئے اور تمہارا باپ اپنی زندگی۔"

یہ احساس گناہ اب عمر بھر اس کے ساتھ رہنا تھا اگرچہ کرم الٰہی کی وفات کے وقت وہ اس کے پاس ہی تھا اور موت کو اس کے قریب ترمحسوس کرتے ہی وہ اس کے پیروں سے لپٹ لپٹ کے رویا تھا۔ اپنی خطاؤں کی معافی مانگی تھی اور کرم الٰہی نے اپنا کانپتا ہوا نحیف ہاتھ اٹھا کے اسے پاس بلایا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے قریب المرگ بجھتے چہرے کے قریب ہوا تو کرم الٰہی نے اس کی روشن پیشانی اپنے زرد خشک لبوں سے لگا لی۔

"نہ پتر۔ رو نہ کوئی گل نئیں نہ کوئی گلہ۔" ٹوٹے ہوئے الفاظ اس کے لبوں سے آزاد ہو رہے تھے اور اس نے اسی طرح اٹکتے ہوئے اسے ایک نصیحت بھی کی تھی جو شاید اس کی آخری خواہش تھی یا پھر وصیت۔

شہزاد ملک نے مرتے ہوئے باپ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر سارے عہد نبھانے کا وعدہ کیا تھا تب اسے سکون سے موت آئی۔

جیسا کہ بالو کی مرضی تھی اس کے مطابق شہزاد نے اسی دن تدفین کی بجائے اگلی صبح کے لیے انتظامات کیے تاکہ دور پرے کے دیہاتوں میں رہنے والے عزیز رشتے دار آسکیں۔ اگرچہ تدفین صبح ساڑھے نو بجے تک ہو چکی تھی۔ مگر کھانا وغیرہ کھا کے لوگوں کو رخصت ہوتے ہوتے دوپہر کا ایک ڈیڑھ بج گیا۔ اللہ وسایا بڑی ذمہ داری سے دریاں اٹھوا کے ٹرک میں رکھوا رہا تھا۔ دیگوں والوں کو فارغ کر رہا تھا۔ گھر کے ملازمین صفائی میں مصروف تھے۔ اس کے

باوجود پورے گھر پہ ایک سناٹے کا سا عالم تھا۔ سب لوگ مشینی انداز میں لب سیے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

وہ اپنے کمرے میں پردے گرائے' لائیٹس آف کیے سگریٹ پہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ جب دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی اور کچھ توقف کے بعد دروازہ بے آواز کھولتی ہوئی دعا اندر داخل ہوئی۔ اس دخل اندازی پہ شہزاد نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ہلکے انگوری لباس میں وہ بہت مختلف سی لگ رہی تھی۔ مختلف اس لیے کہ کافی عرصے سے وہ اسے ایسا دیکھتا آرہا تھا جیسا کہ شوبزنس سے تعلق رکھنے والی خواتین دکھا کرتی تھیں نک سک سے درست بنی سنوری۔ اور کل دوپہر سے وہ اسی ہلکے رنگ کے لان کے سوٹ میں ملبوس تھی جس میں کل ہاسپٹل آئی تھی اور جواب شکنوں سے بھرا پڑا تھا۔ گھر آئی دیہاتی خواتین کو کھانا کھلواتے وقت شاید اس کے قمیص کے دامن پہ اور دوپٹے پہ جا بجا چکنائی کے نشانات بھی لگے تھے۔ الجھے ہوئے بال لپیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھے تھے مگر پھر بھی کئی روکھی لٹیں نکل کر اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔

"بھاجی' کچھ کھا لیجیے' آپ نے کل صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے۔ تیس گھنٹے ہو رہے ہیں۔"

"مجھے طلب نہیں۔ جب بھوک لگے گی کھا لوں گا۔" اس نے نظریں پھیر کے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

"چائے ہی پی لیجیے۔" اس نے ایک اور کوشش کی' اس امید پہ کہ وہ اثبات میں سر ہلائے تو وہ چائے کے ساتھ ہی کچھ ہلکے پھلکے اسنیکس لے آئے مگر اس نے نفی میں سر ہلایا اور تواتر سے دھواں چھوڑتا رہا۔ مایوس ہو کے دعا نے قدم واپس پلٹے پھر جاتے جاتے کسی خیال کے تحت ادھ کھلے دروازے پہ ہاتھ رکھ کے جتلایا۔

"ماں جی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ اگر آپ کوشش کریں تو شاید وہ مان جائیں...... لیکن آپ تو خود ہی سنبھلنے پہ آمادہ نہیں کسی کو کیا سنبھال سکیں گے۔"

یہ حربہ کارگر رہا۔ شہزاد ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سلیپر میں پاؤں پھنسائے اور اس کے قریب سے یہ کہہ کر باہر نکلتا گیا۔

"میرے لیے ایک کپ چائے اور اماں کے لیے ٹرے میں کھانا ان کے کمرے میں لے آؤ۔"

ٹرالی میں تازہ پکے پھلکے کے ساتھ گھر کی پکی سبزی جو ملازمہ نے دعا کے کہنے پہ خاص طور پہ تیار کی تھی' کیونکہ شہزاد بازار کے تیز مسالے والے مرغن کھانوں سے پرہیز کرتا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے شہزاد کی پسند کی اسٹرونگ چائے کا کپ رکھا' ایک پلیٹ میں بسکٹ اور کیک پیس رکھے۔ کمرے میں آئی تو بلقیس ایک بار پھر سسکیاں لے رہی تھی اور شہزاد اس کے نزدیک بیٹھا اس کے ہاتھ سہلا رہا تھا۔ دعا کے آنے پہ اس نے ٹرالی نزدیک گھسیٹی اور خود پلیٹ میں سالن نکال کر ماں کے آگے کیا۔

"میں تو کرمے کے بغیر روٹی کھانے کی عادی نہیں۔ میرے حلق سے بر کی نہیں گزرے گی شہزادے۔" اس نے دہائی دی۔ دعا کی پلکیں بھیگ گئیں۔ شہزاد ضبط نہ کر سکا تو اٹھ گیا۔

"دعا...... پلیز تم ہی سنبھالو ماں کو میں' میں تو۔"

وہ ایک دم باہر نکل گیا۔ لان میں تپتی دوپہر میں آگ برساتے سورج کے نیچے کھڑے ہو کے اس نے اندر کی آگ کو کچھ اور بھڑکایا...... آگ کو آگ کاٹتی ہے' یہ سوچ کر اس نے اوپر تلے دو تین سگریٹ اور سلگائے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ اپنی ہمت مجتمع کرتا ہالو کے کمرے تک دوبارہ آیا۔ ادھ کھلے دروازے سے جھانک کے اندر دیکھا تو صورت حال قدرے سنبھلی نظر آئی۔

بالو اب رو نہیں رہی تھی مگر آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان اب بھی اس کے سانولے چہرے پہ واضح تھے۔ دعا ایک ہاتھ میں پلیٹ پکڑے' دوسرے ہاتھ سے نوالہ بنا کر خود اس کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ بالو' بے دلی سے سہی' مگر اس کی محبت کے آگے مجبور ہو کے کھانا کھا رہی تھی۔ وہ مطمئن ہو کے وہاں سے ہٹ گیا۔

"یہ ہے دعا...... ابا کی لاڈلی دوئی جس کے بارے میں وہ مرتے وقت بھی اتنے متفکر تھے۔ اس کا خیال رکھنے کی

ذمہ داری مجھے سونپ رہے تھے جبکہ کل سے ساری ذمہ داریاں تو وہ خود اٹھائے ہوئے ہے۔ ابا جی' آپ جسے بوجھ اٹھانے کے قابل سمجھتے تھے وہ تو بہت کم ہمت ہے اور جسے کمزور جانتے تھے وہ آج ہم سب سے زیادہ حوصلہ مند نکلی۔"

اپنے کمرے میں آکے اس نے سوچا تھا اور اس کے ساتھ ہی اسے کرم الٰہی کے آخری الفاظ یاد آئے۔

"دوئی' میری بڑی لاڈو بہن کی نشانی ہے۔ ایک ایسی بہن کی' جس کے لیے میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا مگر کر نہ سکا۔ میرے غلط فیصلوں کی وجہ سے وہ رل گئی۔ اب میں نہیں چاہتا کہ اس کی آخری نشانی' اس کی پیاری بیٹی' اس طرح سے رلے' میری بہن نے اس کے لیے پتہ نہیں کیسے کیسے خواب دیکھے تھے اور خواب تو میں نے بھی دیکھا تھا' اسے ایسی زندگی دینے کا جو میں اپنی بہن کو نہ دے سکا۔ لیکن رب کی مرضی...... میں تجھے مجبور تو نہیں کر سکتا۔ میں تو چاہتا ہوں' دوئی کو کوئی سر آنکھوں پہ بٹھائے' اس کی قدر کرے۔ تجھے مجبور کر کے اس بندھن میں باندھنے کا فیدہ؟ مرتے ہوئے باپ کی مرضی جان کے تو اسے سہارا دے گا بھی تو اسے بوجھ ہی سمجھے گا اور میں یہ نہیں چاہتا لیکن یہ میری درخواست ضرور ہے کہ تجھے اس سے جو بھی شکایتیں ہوں لیکن تو اسے اپنے باپ کی لاڈلی سمجھ کے معاف کر دینا۔ اس کا خیال رکھنا۔ اس کا پیو' میرا یار اللہ وسایا' الٹے دماغ کا بندہ ہے۔ اپنی غرض کے آگے کبھی کبھی بالکل اندھا بن جاتا ہے۔ وہ دوئی کی نہ تو قدر کر سکتا ہے نہ خیال رکھ سکتا ہے۔ یہ فرض میں تجھے سونپتا ہوں۔ اسے میرے گھر سے رخصت کرنا۔ کسی اچھے گھر میں بیاہنا...... بڑی شان اور عزت سے۔ اس کی خبر گیری کرتے رہنا۔ وعدہ کر بیٹا تاکہ میں سکون سے مر سکوں اور اوپر جا کے بہن کو منہ دکھانے کے قابل بن سکوں۔" اور شہزاد نے وعدہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آؤ سرکار' کبھی ہمارے "منجے" کو بھی رونق بخش دیا کرو۔" ماکھے گجر نے اپنی دکان کے باہر بچھی بڑی سی اور اونچے رنگین پایوں والی چارپائی سے آواز لگائی۔ وہ بروکیڈ کے سنہری اور سرخ غلاف والے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے لیٹا تھا۔ نورا مالشی اس کے سر اور شانوں پہ تیل کی مالش کر رہا تھا۔ پسینے اور تیل کی چکناہٹ سے بھیگی اس کی بنیان مشکی بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ گہرے میرون' سبز اور سیاہ دھاریوں والا تہبند آبنوسی موٹی پنڈلیوں سے اٹھا ہوا تھا جو تیل سے چمک رہی تھیں۔ آگے حسب معمول جھوٹے برتنوں والی سلور کی ٹیڑھی میڑھی ٹرے پڑی تھی جس پہ مکھیاں بھنک رہی تھیں۔

بابر ہمایوں مغل کو ٹوکنا ناگوار گزرا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی رکنا پڑا اور ایک زبردستی کی مسکراہٹ بھی چہرے پہ سجانا پڑی۔

"آؤ باؤ' کوئی ناشتہ' کوئی لسی...... کوئی ملائی والے دہی کا کٹورا......" اس نے پیشکش کی جسے بابر نے رد کر دیا۔

"آپ شوق کیجیے۔ گھر پہ ہماری راہ دیکھی جا رہی ہوگی۔" وہ کترا کے گزرنے والا تھا۔

"وہ کب نہیں دیکھی جاتی۔" ماکھے نے بھونڈا سا قہقہہ لگایا۔ "دیکھنے دو باؤ مغل دیکھنے دو راہ' تم اپنی راہ لگے رہو۔"

"کیا مطلب اس فضول گوئی کا؟" بابر چیں بہ جبیں ہوا۔

"لو جی' اب ہم فضول ہو گئے۔" ماکھے نے بھی تیوری چڑھائی۔ اس کی تیوریوں نے بابر کو احساس دلایا کہ اس شخص سے بگاڑنی الحال اس کے حق میں نہیں۔

"ہمارے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔" اس نے جلدی سے بات سنبھالنے کی کوشش کی مگر سنبھال نہ سکا۔ ماکھے گجر کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

"او مغل صاحب' اتنا لمبا چوڑا کھاتہ ماکھے گجر نے کبھی نہیں کھولا۔ پورے ساڑھے آٹھ ہزار ہو گئے ہیں۔ اس جمعرات تک سارا حساب صاف ہونا چاہیے ورنہ اپنا بوریا بستر گول کرو میں نے کٹڑی کو دارالامان نہیں بنانا...... چل اوئے نورے ہاتھ پکا ڈال' کیا مرے ہاتھوں سے چپی کر رہا ہے ہڈ حرام۔"

وہاں سے جلتا بھنتا وہ کمرے پہنچا تو یاسمین کو سر پہ دوپٹہ کس کے باندھے دیکھا۔

"اب اس عورت کو کیا تکلیف ہے؟" اس نے دلکش کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے ناگواری سے یاسمین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ دلکش کو ماں کے بارے میں یہ طرز تخاطب دکھی کر گیا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے پلٹ گئی تو پہلے سے کڑھتے بابر کو اور طیش آیا لیکن وہ خاموشی سے لب بھینچے سخت نظروں سے اس کی پشت کو گھورتا رہا جو کمرے کے اس کونے میں بیٹھی زمین پہ چادر بچھائے کپڑے استری کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی کہ ہر کسی کو پھاڑ کھانے والے لہجے میں جھاڑنے والا بابر ہمایوں مغل چاہتے ہوئے بھی دلکش سے زیادہ سخت انداز میں پیش نہیں آسکتا تھا۔ کوئی لحاظ تھا جو اسے ہر بار دلکش سے اونچی آواز میں گالم گلوچ کرنے سے روک دیتا تھا۔

"سنیے، بچوں کے اسکول کھلنے والے ہیں' ان کے یونیفارم پھٹ چکے ہیں' نئے بنوانے کے لیے اگر کچھ رقم آپ دے سکیں تو۔" یاسمین نے ڈرتے ڈرتے بات کا آغاز کیا۔ ورنہ اس کے سر میں کل رات سے اتنا شدید درد تھا کہ وہ کسی بدمزگی کو شروع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تو کیا کریں ہم؟ کیا ہم نے کہا تھا انہیں اسکول داخل کرانے کو؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ نجانے کس دور میں جی رہے ہیں۔ آج کل تعلیم کے بغیر بچوں کو کیسے پالا جا سکتا ہے۔"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ صبح صبح ہمارا دماغ مت کھاؤ منحوس عورت۔ اپنا سر تو باندھ ہی رکھا ہے' کیا اب ہمارے سر میں بھی درد جگانا ہے۔ غلطی کی جو گھر لوٹ آیا۔ جہاں رات گزری وہیں دن بھی گزر جاتا۔" وہ دوبارہ چپل پہننے لگا۔

"ناشتہ تو کر لیجیے۔۔۔ دلکش۔" وہ آواز دینے لگی مگر اتنے میں بابر جھکتا باہر نکل گیا۔ ذہن پہ اصل میں ماکھے گجر کا خوف غالب تھا اور جیب میں ساڑھے آٹھ ہزار تو چھوڑ آٹھ سو روپے بھی نہ تھے کہ اس عذاب سے جان چھڑائی جاتی۔ دو تین ہزار بھی ہوتے تو وقتی طور پہ ماکھے گجر کا منہ بند کیا جا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

صاحبزادی یاسمین کے سر کا درد کچھ اور بڑھ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے وہیں لیٹ گئیں۔ دلکش نے استری کا کام سمیٹ دیا۔

"کیا ہوا امی حضور؟"

"ہمارا سر چکرا رہا ہے اس درد نے تو دماغ کی چولیں ہلا کے رکھ دی ہیں۔ پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔"

"دوا لی آپ نے؟۔۔۔ اوہ' آپ نے تو صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ پہلے کچھ کھا لیجیے۔ پھر ہم درد کی گولی لا دیتے ہیں۔"

"نہیں' کھانے کو جی نہیں ہاں' ایک کپ تیز چائے کا مل جائے تو شاید ذرا آنکھیں ہی کھل پانے کے قابل ہوں۔ درد کی تیز لہریں ہماری آنکھوں تک میں کھب رہی ہیں۔"

"چائے کے ساتھ باقر خانی ہی لے لیجیے۔ خالی پیٹ دوا کیا اثر کرے گی۔" وہ یہ کہتی ہوئی چولہے پہ رکھی دیگچی اتارنے لگی جس میں ابھی ابھی ثابت مسور کی دال چڑھائی تھی اور چائے کا پانی رکھ دیا۔

"السلام علیکم خالہ۔" کوثر کو سامنے دیکھ کے اس نے سلام کیا اور کچھ پریشان بھی ہوئی کہ ماں کے سر میں پہلے ہی اتنا درد ہے اور ایسے میں کوثر جیسی باتونی ہمسائی کی آمد۔

"والے کم والے کم' ماں کدھر ہے تمہاری؟" وہ سیدھی اندر کی جانب بڑھی۔ دلکش نے ایک کپ چائے کا پانی بڑھا دیا۔

"ہو' لگتا ہے تمہیں تو پہلے خبر ہو گئی' جب ہی تو سر باندھے ہوئے ہو۔ وہ تمہارا میاں بھی بڑا پیر پٹختا باہر نکلا ہے'

تن فن کرتا ہوا' کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں بہن' بات کیا ہونی ہے۔ گھروں میں معمولی کھٹ پٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے اور وہ بھی ہمارے جیسے گھروں میں۔۔۔ جہاں ضرورتیں ہی وجہ تنازعہ ہوتی ہیں۔" یاسمین نے بات پلٹنا چاہی۔

"اچھا۔۔۔" وہ مایوس نظر آئی۔ "میں تو سمجھی کہ تم نے اخبار دیکھ لیا ہوگا۔ اپنی سوتن کی تصویر دیکھ کر بھڑک اٹھی ہو گی۔"

یاسمین تڑپ کے اٹھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟"

"ہاں بھئی' یہی ہے وہ چھمک چھلو۔۔۔" اس نے اخبار کھول کے آگے کیا۔ کرم الٰہی کی وفات کی خبر تھی' بہرحال وہ ایک نامور شخصیت کا باپ تھا۔ ساتھ میں ایک تصویر شہزاد ملک اور دعا کی بھی تھی۔

"چیز سوہنی اے۔" کوثر نے بے ساختہ تعریف کی جبکہ یاسمین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی جو ایک حسین مگر بے حد عام سی لڑکی کی لگ رہی تھی۔ عام سی اس لیے کہ وہ کسی بھی طرح رنگ و روشنی کے اس دیس کی باسی نہ لگ رہی تھی جہاں عورتوں کا روزگار ہی مردوں کو لبھانا ہوتا ہے۔ اصل میں وہ تصویر کرم الٰہی کی تدفین کے روز کی تھی' جس میں وہ عام سے لباس میں سوگوار چہرہ لیے ایک سادہ سی لڑکی نظر آرہی تھی یہ الگ بات کہ اس سادگی میں بھی اس کا حسن نمایاں ہو رہا تھا۔

"یا اللہ۔۔۔ کیا ہو گیا ہے انہیں' یہ لڑکی دلکش سے چند سال ہی بڑی ہو گی۔ اپنی بیٹی کی عمر کے برابر لڑکی۔۔۔ کیا یہ واقعی سچ ہے۔" وہ سوچ کے رہ گئی۔

"امی حضور' ماموں آگئے۔" اقدس نے مسرت سے بھرپور لہجے میں اعلان کیا۔ یاسمین کے لیے **عمیص** کی آمد اچانک بھی تھی اور باعث حیرت بھی۔۔۔ وہ خیریت دریافت کرنے آتا رہتا تھا۔ یہ نئی بات نہیں تھی کیونکہ یاسمین کے پاس فون جیسی سہولت تو تھی نہیں جو رابطے کا ذریعہ بنا رہتا۔ لیکن اب جب وہ دو دن پہلے ہی میکے سے لوٹی تھی تو **عمیص** کا آنا بلاوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی حیرت کے عالم میں وہ ہاتھ میں پکڑا اخبار بھی نہ رکھ سکی۔ وقتی طور پہ وہ کوثر کی موجودگی بھی فراموش کر گئی۔

"ارے واہ' آج تو اخبار کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے ہماری آپا بھی دنیا کی خبر رکھنے لگیں۔" اس نے خوشدلی سے کہا۔ ہلکے آسمانی کلف لگے کاٹن کے شلوار قمیص میں وہ بہت نکھرا نکھرا اور ترو تازہ لگ رہا تھا۔

"بس **عمیص** میاں' ہم نے کیا خبر رکھنی۔۔۔ یہ تو۔" وہ اخبار تہ کر کے پیچھے رکھنے لگی۔ یکایک اسے کوثر کی موجودگی سے خوف محسوس ہوا' وہ ایک بے جھجک اور کسی بھی قسم کی مصلحت سے انجان عورت تھی۔ کیا بعید ابھی کیا کہہ ڈالتی اور یہی ہوا۔ صاحبزادی یاسمین کے اندیشے کے عین مطابق وہ **عمیص** کو مخاطب کر رہی تھی۔

"دنیا کی خبر اس بے چاری نے کیا رکھنی ہے۔ اپنے گھر کی رکھ لے تو بڑی بات ہے اس کے اپنے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ تو اسے میں نے بتایا ہے ورنہ یہ تو اپنے حال میں مست ملنگ۔ تم ہی سمجھاؤ بھائی کہ شوہر سے اتنی لاپروائی ٹھیک نہیں کچھ زیادہ ہی ڈھیل دے رکھی ہے۔"

"کوثر بہن۔۔۔" یاسمین نے ناگواری جتاتے لہجے میں تنبیہہ کی **عمیص** الجھ سا گیا۔

"تمہارے ساتھ تو کوئی بھلا کرے تب بھی برا۔ میں تو یہ دکھانے لائی تھی کہ جو تصویر میں ہی ایسی قیامت لگ رہی ہے' اصل میں کیا ہو گی۔ سنبھال سکتی ہو تو سنبھال لو مرد کو ورنہ۔۔۔"

"کون کس کی تصویر کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟" اب کے **عمیص** سے خاموش نہ رہا گیا۔

"تمہارے بہنوئی مغل کی معشوقہ۔۔۔ اور کون۔۔۔ یہ ہے ناں' اس کی تصویر دکھانے کے لیے تو یہ اخبار لائی تھی۔ اس کے ساتھ لور لور کرتا پھرتا ہے آج کل تمہارا بہنوئی۔"

کوثر نے یاسمین کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ کے **عمیص** کے آگے کیا۔

"تمہارے بہنوئی مغل کی معشوقہ۔۔۔ اور کون؟"

یاسمین کی ہمسائی کوثر کی تیز آواز میں کہا گیا یہ فقرہ **عمیص** کو اس بری طرح چونکا گیا کہ کتنی ہی دیر تک وہ ہاتھ میں تھامے اخبار پہ نگاہ تک ڈالنا بھول گیا۔

"اسی کے ساتھ لور لور کرتا پھرتا ہے آج کل۔"

اس نے تصدیق طلب نظروں سے اپنی آپا کی جانب دیکھا۔

وہ نظریں چرا گئیں۔ ان کا یہ انداز اسے باور کرانے کو کافی تھا کہ کوثر غلط نہیں کہہ رہی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔۔۔ یہ سوچ کر کہ نجانے کب سے اس کی حوصلہ مند بہن اکیلی اس درد کو سہہ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ اتر آیا جس پہ یاسمین نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے شاید وہ اس بات کو جھٹلانا چاہتی تھیں مگر اس سے پہلے کوثر پھر بول اٹھی۔

"اب تم ہی اپنی بہن کو کوئی مت (عقل) دو میری باتوں کو تو یہ بک بک سمجھ کے اڑا دیتی ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ اپنا کھونٹا مضبوط کرے۔ کل کی آئی چھوکری کے سامنے ہار مان لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ارے یہ چودہ پندرہ سال کی بیاہتا ہے' چار بچوں کی ماں ہے۔۔۔ کیسے اس کا مرد اس سے دامن چھڑا سکتا ہے۔ اگر یہ چاہے تو مغل صاحب کی کیا مجال کہ وہ ایسا خواب بھی دیکھ سکیں لیکن یہ بی بی ہیں کہ اپنے حال میں مگن۔۔۔ ہر چیز پہ راضی۔۔۔ اپنے لیے نہیں تو بچوں کے حق کے لیے ہی آواز اٹھاؤ' تھوڑی ہمت پیدا کرو ورنہ یہ فلمی تتلیاں آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتیں۔۔۔ چلتر کہیں کی۔ اور بھائی میرے ذرا صورت تو دیکھنا اس کی کیسی پریوں جیسی ہے اور دل آیا تو گدھے پہ۔۔۔ ہاں بھئی میں تو کرتی ہوں سچی بات' چاہے پھر کسی کو برا کیوں نہ لگے' ہوگا تمہارا بہنوئی اور یاسمین کا شوہر کرتے رہو تم دونوں عزت وزت میرا تو خون کھول رہا ہے یہ جان کر کہ اس حرافہ سے وہ شادی کرنے جا رہا ہے۔ توبہ توبہ۔۔۔ مجھے تمہارے بہنوئی پہ اتنا غصہ نہیں آ رہا ہے جتنا طیش اس چھوکری پہ آ رہا ہے۔ بھلا ایسی شکل و صورت اور بالی سی عمر کے ساتھ اسے یہی ملا تھا بیاہ رچانے کو۔"

اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان **عمیص** کے چھکے چھڑاتی جا رہی تھی۔ وہ منہ کھولے اس کا طویل بیان سنتا رہا۔ بار بار اس انجان لڑکی کی شکل و صورت اور خوب صورتی کے بارے میں کوثر کا ذکر کرنا اسے بالآخر ہاتھ میں موجود اخبار کی جانب دیکھنے پہ مجبور کر ہی گیا۔ ایک اور سنسنی اس کے رگ و پے میں دوڑنے کو منتظر کھڑی تھی۔ اس تصویر کی صورت۔

ایسی ہی ایک تصویر اس نے کل کے اخبار میں بھی دیکھی تھی۔۔۔ ہاں وہ یہی لڑکی تھی۔۔۔ **عمیص** نے ذرا غور سے دیکھنے پہ تصدیق کی۔ کل کے اخبار میں اسی لڑکی سے شہزاد ملک کی رشتہ داری کا انکشاف کیا گیا تھا اور آج کی خبر اور اس کے ساتھ یہ تصویر اس انکشاف کو سچ ثابت کر رہے تھے۔ خبر تھی شہزاد ملک کے باپ کرم الٰہی کی وفات کی اور تصویر تھی میت کے نزدیک سوگوار کھڑی اس کی بھانجی اور فنکارہ ادا کی۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ بابر ہمایوں مغل کا بھی کوئی نہ کوئی واسطہ نکل رہا تھا اس حسینہ سے۔

"کیوں؟ سٹی گم ہوگئی ناں۔۔۔ سنتے تو یہی آئے ہیں کہ یہ ناچنے گانے والیاں پیسے کے پیچھے مرتی آتی ہیں۔۔۔ اب پیسہ دھیلا تو ہے نہیں مغل کے پاس۔ باقی رہ جاتا ہے عشق۔۔۔ عشق کے سیاپے میں پڑ کے ضرور یہ لڑکی اندھی ہو سکتی ہے۔ مگر ہائے' ہائے ایسا اندھا بھی کیا ہونا۔۔۔ مال نہ سہی مرد کی عمر یا شکل ہی ہو تو عشق کرنے کا سواد بھی آئے۔۔۔" وہ اب تک اپنی بے سروپا گفتگو سے فیضیاب کر رہی تھی۔ تنگ آ کر یاسمین کو سخت الفاظ میں اسے ٹوکنا پڑا۔

"کوثر بہن' برائے مہربانی آپ اس معاملے کو بلاوجہ اچھالنے سے باز رہیں۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے اور ہم اسے خود ہی نمٹا لیں گے۔ بات ویسی نہیں جیسی آپ سمجھ رہی ہیں۔ جب آپ تفصیل سے آگاہ ہی نہیں ہیں تو فتوے دینے کی بھی ضرورت نہیں۔"

"اے لو۔۔۔" وہ برا مان گئی۔

"بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا بی بی۔۔۔ یہ میں ہی تھی جس نے تمہاری آنکھیں کھولی تھیں ورنہ تم تو لگی رہتیں اپنے سرتاج کے لیے دودھ پتی بنانے میں۔۔۔ میں تو مدد کرنا چاہتی تھی تمہاری ہونہہ۔۔۔ نمٹ چکے تم سے معاملے۔" وہ اٹھ کے دروازے تک گئی پھر پلٹ کے **عمیص** سے مخاطب ہوئی۔

"میں زبان کی کڑوی سہی پر دل کی صاف بندی ہوں اور تمہاری اس بہن سے تو ویسے ہی بڑی اپنائیت محسوس ہوتی ہے اس لیے اس کی بات کا برا نہیں مانا لیکن تمہیں ایک بات کہے دیتی ہوں کہ یہ اطلاع سولہ آنے درست ہے۔ اخبار میں تو آج اس کی فوٹو چھپی ہے میں تو یاسمین کو ہفتوں پہلے خبردار کر چکی ہوں لیکن یہ ہے کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل کے اخبار میں اس لڑکی کی شادی کی تصویر چھپی ہو تمہارے بہنوئی کے ساتھ یہ چاہے کتنا بھی کہے کہ ایسی کوئی بات نہیں' اپنے مرد کے بارے میں قسمیں تک کیوں نہیں اٹھائے تم یقین نہ کرنا۔ اگر اپنی بہن کے گھر کی فکر ہے تو کچھ کرو۔"

یہ مشورہ دے کے وہ چلی گئی۔

عمیص نے اخبار تہ کر کے بغل میں دبا اور ایک گہری سانس بھر کے یاسمین کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "اب کہیے' کیا معاملہ ہے یہ؟" یاسمین۔۔۔ وہ وہی کرنا چاہتی تھیں جس کا اندیشہ ابھی ابھی کوثر ظاہر کر کے گئی تھی یعنی کہ اس سارے معاملے کی پرزور تردید۔ لیکن وہ ایسا کر نہ سکیں۔ **عمیص** کے انداز انہیں باور کرا رہے تھے کہ وہ اب ان طفل تسلیوں میں آنے والا نہیں۔ ہار کے وہ رو پڑیں۔

"اب رونے سے کیا حاصل آپا حضور؟ پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔۔۔ اب جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے تو مجھے کسی تیسرے فرد کی زبانی خبر مل رہی ہے۔ اگر میں یہاں نہ آتا۔۔۔ کوثر بی بی سے مل نہ پاتا۔ تو میں بے خبر ہی رہتا۔ آپ پہ اور بچوں پہ گزرنے والے سانحے سے بے خبر۔۔۔ آپا' کیا میں اتنا پرایا ہو گیا۔۔۔؟ یا نااہل کہ آپ نے مجھ سے ذکر تک کرنا گوارا نہ کیا۔"

"ہمیں تو خود کوثر بہن سے پتہ چلا۔۔۔ مگر ہم نے تب بھی یقین نہ کیا' اس لیے نہیں کہ ہمیں اپنے شوہر کی پارسائی کا دعویٰ تھا یا ان کی وفا پہ یقین تھا۔ ان کی بے حسی اور بے راہ روی کا ہم سے بڑھ کر کون شاہد ہوگا لیکن اس بات پہ یقین نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایسے کاموں کے لیے بے حسی' بے غیرتی اور دیدہ دلیری کے ساتھ ساتھ حیثیت کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور ان کی حیثیت۔۔۔ وہ تو وہ کب کی اپنے ہاتھوں کھو چکے۔ ایک کنبے کی کفالت کرنا ان کے بس کی بات نہیں' کجا کہ وہ دوہری ذمہ داری اپنے گلے ڈالیں۔ اس لیے اس خبر پہ یقین کرنے میں متامل تھے پھر کوثر بہن کے ذریعے یہ پتہ چلا کہ وہ لڑکی کس قماش کی ہے اور کس پیشے سے منسلک ہے تب جا کر یقین ہوا کیونکہ تب ہم جان گئے تھے کہ وہ کسی کا بوجھ اٹھانے نہیں بلکہ خود اپنا بوجھ کسی پہ ڈالنے جا رہے ہیں اور اس شرمناک بات کو وہ ہمارے سامنے تسلیم بھی کر چکے ہیں۔"

"کیا؟۔۔۔ یعنی بابر بھائی نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے۔۔۔ کہ' کہ یہ سچ ہے؟" **عمیص** کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔

"ہاں۔" یاسمین نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ "اور بغیر کسی ندامت کے۔۔۔ بنا کسی تاسف کے۔"

"حد ہوتی ہے برداشت کی بھی۔" **عمیص** مارے غم و غصہ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "انہوں نے کیا آپ کو بالکل لاوارث سمجھ لیا تھا یا ہم لوگوں کو بے غیرت کہ جو ان کے جی میں آئے وہ کرتے پھریں گے اور آپ کی طرف سے کوئی انہیں پوچھنے نہیں آئے گا۔ مجھے ان سے بات کرنا ہوگی کب تشریف لا رہے ہیں موصوف؟" وہ پھر سے بیٹھ گیا اور اس طرح جیسے اب بابر ہمایوں مغل سے دو دو ہاتھ کر کے ہی اٹھے گا۔ یاسمین اس کے تیور دیکھ کے ہول گئیں۔

"وہ تو۔۔۔ ابھی ابھی گئے ہیں نجانے کب واپسی ہو۔ لیکن بھیا آپ ان سے بات مت کیجیے۔ ان کی آنکھ کا رہا سہا لحاظ بھی ختم ہو جائے گا اور ویسے بھی آپ ان سے عمر' مرتبے اور رشتے ہر لحاظ سے چھوٹے ہیں۔ یوں جواب

طلبی کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"کمال ہے آپا! ابھی بھی آپ کو یہی فکر ستائے جا رہی ہے کہ کوئی بات آپ کے سرتاج کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے۔۔۔ بہت خوب ٹھیک ہے پھران سے بات کریں گے چچا حضور اور میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سامنے وہ کیسے دم ماریں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ بھلا چچا حضور کی عمر اور ہمت اس بات کی متحمل ہو سکتی ہے؟"

اس کے ساتھ ہی عمیص کو دھیان آیا کہ وہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟ ظاہر ہے کہ صاحبزادہ نفیس علی خان کی خرابی صحت کی اطلاع دینے۔۔۔ اور خود ہی اس بات کو فراموش کر بیٹھا۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ واقعی یاسمین آپا درست کہہ رہی ہیں۔ ڈاکٹرز نے انہیں دل کا عارضہ بتلایا ہے۔ اگرچہ بہت شدید نوعیت کا نہیں مگر بہرحال ہے تو سہی۔ علاج اور پرہیز کے ساتھ ساتھ احتیاط بھی لازم ہے۔ کوئی بھی غیر معمولی خبر یا اشتعال ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھنڈا ہو کے بیٹھ گیا۔

"مگر میں چپ چاپ تماشا تو نہیں دیکھ سکتا۔"

"ہماری خاطر کچھ دیر اور یہ خاموشی برداشت کر لیں۔ ہم ایک بار پھر ان سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ رسولﷺ کا واسطہ دے لیں گے۔۔۔ اپنی وفا اور ایثار کا صلہ طلب کر لیں گے۔۔۔ اپنے بچوں کی دہائی دے لیں گے۔ کیا عجب میرا مولا کملی والے کے صدقے اس پتھر کو موم کر دے اور اگر بالفرض ایسا نہ ہوا' خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تب ہم آخری حربے کے طور پہ انہیں دھمکی دیں گے کہ ہم اپنے چچا حضور کو اس سارے قصے سے آگاہ کر رہے ہیں۔ شاید وہ سنبھل جائیں۔"

"آپا آپ بھی۔۔۔" وہ انہیں اس خوش فہمی سے نکالنا چاہتا تھا۔ بتانا چاہتا تھا کہ بابر ہمایوں مغل جیسے لوگوں کو نہ تو خوف الٰہی بے چین کرتا ہے نہ بیوی کی وفا اور بچوں کی محبت دل موم کرتی ہے۔ نہ ہی کسی بزرگ کے باز پرس کرنے کا خوف پیچھے ہٹنے پہ مجبور کرتا ہے لیکن یاسمین نے منت بھرے انداز میں اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"ہمیں ایک کوشش تو کرنے دیں بھیا ہمارے ننھے بھیا بس ایک کوشش۔"

☼ ☼ ☼

ایک تو ماکھے گجر کا خوف سر پہ تلوار کی طرح لٹک رہا تھا' دوسرا دعا بھی کئی دنوں سے گھر میں نہیں تھی۔ وہ دو تین بار گیا تو بند گیٹ پہ تالا لگا دیکھا پھر اخبار میں شہزاد ملک کے باپ کی وفات کی خبر پڑھی تو اندازہ ہوا کہ دونوں باپ بیٹی کہاں ہو سکتے ہیں۔ اس نے چاہتے ہوئے بھی دعا کے سیل نمبر پہ فون نہ کیا' حالانکہ اسے ایک تعزیتی فون کرنا چاہیے تھا بلکہ ایک باضابطہ منگیتر ہونے کی حیثیت سے اس کے ماموں کی آخری رسومات میں شریک ہونا بھی اس کا فرض بنتا تھا لیکن یہ اس کے دل کا چور تھا جو اسے دبک کے بیٹھنے پہ مجبور کر رہا تھا۔ اس کی شہزاد ملک کے ساتھ پہلی اور اب تک کی آخری ملاقات خاص خوشگوار نہ رہی تھی۔ اس ملاقات میں وہ ایک بلیک میلر کے طور پہ سامنے آیا تھا۔ مگر جاتے جاتے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا نواب صاحب کا داماد ہونا شہزاد پہ ظاہر ہو گیا تھا اور اب وہ اسی کے باپ کے مرنے پہ اس کی فرسٹ کزنز کے ہونے والے شوہر کے طور پہ سامنے آ کے خود اپنے پیر پہ کلہاڑی نہیں مارنا چاہتا تھا۔

ادھر گھر کے حالات بھی دن بدن بگڑتے جا رہے تھے۔ گھر کبھی اس کے لیے کوئی راحت بخش مقام نہیں رہا تھا نہ ہی اس نے کبھی ایسا سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ جب بھی اسے آنے کی ضرورت پیش آتی وہ اس چار دیواری میں لوٹ آتا جسے گھر کہا جاتا ہے۔ دو چار برتن پٹختا۔۔۔ تین چار طنزیہ جملے اچھالتا دھاڑیں مارتا۔۔۔ بچوں کو سہماتا' بیوی کو دھمکاتا۔۔۔ اور اس طرح اپنی اسی تذلیل کا ازالہ کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا جو باہر سے سمیٹ کر لاتا تھا۔ اس کی بچی کھچی مردانہ انا کی تسکین اس بیوی کو کچل کر ہوتی لیکن کچھ دنوں سے یاسمین کے رویے کی تبدیلی بھی واضح طور پہ سامنے آئی تھی۔ اس کی تربیت ایسے ماحول میں نہیں ہوئی تھی کہ وہ شوہر کے روبرو آ کے جھگڑا کرتی لیکن نجانے

یہ حوصلہ وہ کہاں سے لے آئی تھی کہ اب سوال کرنے لگی تھی اور بابر کے لیے یہ "شروعات" ہی خطرے کا سگنل تھی۔ وہ جلد از جلد اس ماحول سے فرار چاہتا تھا۔۔۔ دعا کے ساتھ گزارنے والی حسین زندگی کے خواب اسے اپنی جانب پکار رہے تھے۔ جبکہ قدرت کی جانب سے تاخیر پہ تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ اب جب اسے لگ رہا تھا کہ ویزہ اور پاسپورٹ تیار ہونے کے بعد بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں رہی' وہ کسی بھی شام چھ سات لوگوں کی موجودگی میں نکاح پڑھوا کے اسی رات دبئی کی فلائیٹ پکڑ لے گا کہ یہ حادثہ پیش آ گیا یعنی کرم الٰہی کی موت۔

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے وہ ملک مقبول کے پاس آن پہنچا اور اس وقت چائے کے ایک کپ کے ساتھ ساری بھڑاس نکال رہا تھا۔

"ذرا پتہ کرنا تھا واقعی ماموں کا سوگ منا رہی ہے یا بہانہ بنا کے بیٹھی ہے۔" ملک مقبول نے ایک اور وسوسہ اس کے دل میں جگانے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب؟ کیسا بہانہ۔۔۔؟" وہ بدک اٹھا۔

"کیا خبر' مکر کر رہی ہو۔۔۔ شادی سے بچنا چاہ رہی ہو۔ میں تو پہلے ہی حیران تھا' یہ بلبل پھنس کیسے گئی۔ بڑے بڑے بیوپاری بولی لگا کے تھک گئے' بڑے بڑے سیٹھ نوٹوں کی بوریاں سمیٹ کے واپس لے گئے اور وہ پھسلی تو تیری خالی جیب پہ۔۔۔ ہو سکتا ہے اس وقت اس کی مت ماری گئی ہو' اور اب ہوش آیا تو آنا کانی کر رہی ہے کہیں کوئی اور تو درمیان نہیں آ گیا؟"

"ابھی جانے دیجئے۔۔۔ مذاق مت کریں۔" بابر نے یہ اندیشہ ہوا میں اڑانا چاہا مگر ملک اپنے موقف پہ اب تک ڈٹا' اسے بھی قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم خود سوچو یار مغل' جس ماموں سے تعلق کو اب تک وہ چھپاتی آئی ہے اس ماموں سے یکایک اتنی محبت؟ جو لوگ کل تک یہ بتاتے شرماتے تھے کہ یہ لڑکی ان کی کچھ لگتی ہے' اب اچانک ان لوگوں کو وہ اتنی عزیز ہو گئی ہے کہ پچھلے تین چار دنوں سے وہاں ہے؟۔۔۔ ارے۔۔۔ مروا دیا۔" اچانک کوئی خیال کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور وہ کرسی پہ بیٹھا بیٹھا اچھل پڑا۔

"وہ شہزاد ملک۔۔۔ ارے وہ ہیرو۔۔۔ کہیں وہ تو تمہاری کہانی کا ولن نہیں بن گیا؟"

"نہیں ملک صاحب' ایسا نہیں ہے اور نہ ہونے کا امکان ہے۔" اس نے پورے وثوق سے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ ابے مغل یار' ایک لڑکی نے نجانے کس ترنگ میں آ کے تمہیں ہاں کہہ دی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم خود کو طرم خان سمجھنے لگو۔ شہزاد ملک کے پاس کیا نہیں ہے؟ تم سے چند سال عمر میں بھی کم ہے' دیکھنے میں بھی ہیرو ٹائپ ہے' بنگلہ' کاروبار' گاڑی۔۔۔ بینک بیلنس سب کچھ ہے اور نام الگ مشہور ہے۔ اس کے آگے تم کس کھیت کی مولی ہو اور پھر ددھیال کا رشتے دار بھی ہے۔ پہلے کچھ وجہ ہو گی اختلافات کی لیکن اب دونوں خاندانوں کے قریب آنے سے ان دونوں کے دل بھی قریب آ سکتے ہیں' یہ بات ذہن میں رکھنا۔ آخر شہزاد ملک کے سامنے تم ہو کیا؟۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔" ملک مقبول آج اسے سچ کی مار مارنے پہ تلا بیٹھا تھا لیکن اتنا سب کچھ سننے کے بعد بھی بابر بجائے تلملانے کے مسکرا رہا تھا۔ اس کے تصور میں صاحبزادی گل مہر کا چہرہ آ رہا تھا۔۔۔ صاحبزادی گل مہر جو شہزاد ملک کے ہاتھ آتے آتے رہ گئی۔

"جانتے ہیں کہ ہم شہزاد ملک کے سامنے کچھ بھی نہیں۔" اس نے فراخدلی سے اپنی نااہلی تسلیم کی۔ "لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ جو ہستی شہزاد ملک کے دل و نظر کو بھا چکی ہے اس کے سامنے ادا جی بھی کچھ نہیں۔ ادا جی میں بھی ایک خاص بات ہے ضرور۔۔۔ لیکن شہزاد ملک کا مطلوب کچھ اور ہی ہے۔ وہ اس وقت عشق کی چوٹ کھایا ہوا ہے۔ ابھی تو آسمان سے حور بھی اتر کے اس کے سامنے آ گئی تو اس کی نظروں میں نہ جچے گی۔ اس لیے آپ ہمیں یہ ڈراوے تو نہ دیں۔"

"واہ' بڑے پہنچے ہوئے ہو۔ کیا اندر کی خبریں کھینچ کے لائے ہو استاد۔" ملک مقبول اس کی "معلومات" سے

متاثر نظر آیا۔

"میرا تو خیال تھا تمہاری پہنچ بس حسیناؤں کے کوٹھے اور کوٹھیوں تک ہے لیکن تم تو بڑے بڑوں کے دل تک رسائی پانے لگے۔ کہاں سے خبر ملی شہزاد ملک کے عشق کی؟"

"اسے چھوڑیے' کچھ ہمارے مسئلے کی جانب دھیان دیجئے۔ حالت پتلی ہو رہی ہے۔ ہمیں اس وقت رقم کی اشد ضرورت ہے۔"

"قرض کے طور پہ مل سکتی ہے اور وہ بھی مجھ سے نہیں۔" اس نے مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ ہری جھنڈی بھی دکھا دی۔

"کسی سے بھی مانگ لو۔ بیس تیس ہزار تو دے ہی دے گا کوئی نہ کوئی۔"

"اور وہ کوئی نہ کوئی آپ کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"کیوں کہ کوئی نہ کوئی جو بھی ہو گا' وہ تمہاری رگ رگ سے واقف تو نہیں ہو گا جیسا کہ میں ہوں۔" اس نے دل جلانے والی مسکراہٹ اپنے سگریٹ سے سیاہ پڑتے لبوں پہ سجائی۔

"ایسا تو مت کہیے۔" وہ جز بز ہوا۔ "ہم چکا ہی دیں گے کبھی نہ کبھی۔"

"ہاں۔۔۔ کبھی نہ کبھی اور یہ کبھی نہ کبھی پتہ نہیں کب آئے گا۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو۔ پہلے تو نئی جگہ جا کے قدم جمانے میں ہی کچھ وقت لگے گا۔ یہ ٹھیک ہے دبئی میں آرٹسٹ لوگوں خصوصاً" ان نئی خوب صورت چھوکریوں کا کام بہت چلتا ہے' دنوں میں لوگ مال بنا لیتے ہیں لیکن مقابلے کی فضا سخت ہے۔ پہلے تو اپنی جگہ بنانی ہو گی۔ نئے تعلقات۔۔۔ سفارش بس ایک بڑا پروگرام مل گیا تو ہو گئے تمہارے وارے کے نیارے۔ ایک میوزیکل نائٹ کے ہی اتنے مل جائیں گے جتنے یہاں چار پانچ شو کر کے ملتے ہیں۔ لیکن پیارے۔۔۔ اس میں وقت لگے گا۔"

"پھر ہم کیا کریں؟" وہ کچھ پریشان ہوا۔ "ہم تو خالی ہاتھ بس آپ کے آسرے پہ جا رہے ہیں۔"

"میرے یا اپنی ہونے والی دلہن کے؟" اس نے پھر ذلالت بھری مسکراہٹ سے نوازا "اور پیارے! اگر اسی کے آسرے پہ جینا ہے تو کھل کے جیو۔ اس مارکیٹ میں مقابلہ سخت ہے' باری دیر سے آئے گی تو نہ سہی۔۔۔ دوسری مارکیٹ اوپن ہے۔ وہاں ایسے فریش پیس ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔"

"دوسری مارکیٹ؟ آپ کا مطلب۔۔۔" اسے دھچکا سا لگا۔

"ہاں بھئی' اس کے لیے ہاں بھرو تو میں ابھی یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار پارٹیاں پکڑا دیتا ہوں۔ کئی عرب شیخ مٹھی میں ہیں۔ تمہاری ادا کے وزن کے برابر سونا تول کے دیں گے۔"

"نہیں ملک صاحب۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ایسا ہم نہیں کریں گے۔ ادا جی کا محفلوں میں گانا اور بات ہے۔ وہ فنکارہ ہیں لیکن یہ کام نہ وہ رضامند ہوں گی نہ ہم ایسا چاہیں گے۔" اسے ادا کے حوالے سے اس گھٹیا کام کا سوچتے ہوئے بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ اس قسم کے گھٹیا مشورے دینے والا ملک مقبول زہر سے بھی برا لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لے۔۔۔ مگر وہی ازلی مصلحت پسندی۔ یا مطلب پرستی۔

"کیوں بھئی' تمہیں کیا تکلیف ہے جو تم نہیں چاہو گے؟" ملک نے لتاڑا۔ "جب کوئلوں کی کوٹھڑی میں قدم رکھ ہی لیا ہے تو کیا ڈرنا کہ دامن پہ داغ نہ لگ جائے یا آستین پہ سیاہ دھبا نہ لگ جائے اور یہ کام کون سا نیا ہے تمہارے لیے جو ہچکچا رہے ہو۔ دلالی تو یہاں بھی کرتے رہے ہو اور وہ بھی بڑے دھڑلے سے۔"

"ہاں مگر بازاری عورتوں کی۔" بابر نے بلاتوقف یاد دہانی کرائی۔

"اور ہاں بھئی' تمہارے نکاح میں آنے کے بعد تو ویسے بھی وہ بڑی توپ شے بن جائے گی۔ نواب صاحب کی بیگم۔۔۔" اس کا بے ہنگم قہقہہ اس تناؤ بھرے ماحول کو اور کثیف کرنے لگا۔

"بہر حال میرے مشورے پہ سوچنا ضرور اس میں تمہارا بھلا ہے۔ دن دگنی' رات چوگنی ترقی کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں تمہارے پاس۔ چلو زیادہ نہیں' چار پانچ سال بھی لگا لو تو بہت ہیں۔ کافی رقمیں کما لو گے اس کے بعد بیٹھے عزت کی کھاتے رہنا اور اپنی زوجہ محترمہ کو بھی کھلاتے رہنا۔"

"ہم چلتے ہیں ملک صاحب۔" اس سے زیادہ سننا اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ "آپ سے مدد کی امید لے کر حاضر ہوئے تھے لیکن آپ۔۔۔"

"اپنی مدد آپ کرنے کا سنہری طریقہ تو بتا دیا ہے۔ اب عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ دبئی چلے بھی گئے تو وہاں سرخ قالین نہیں بچھے ہوں گے تمہارے لیے۔۔۔ تمہاری ٹکٹ اور ویزے پہ جو رقم لگی ہے وہ تو مجھے وصولنا ہی ہے اس کے علاوہ میری ضمانت پہ یہاں کتنے ہی لوگوں سے قرض وصول کر چکے ہو۔ وہ اس انتظار میں نہیں بیٹھے ہوں گے کہ کب تمہارے دن پھریں' کب تم لوٹانے کا سوچو اور بیوی بچے الگ بھوکے مر رہے ہوں گے۔ ان کا پرسان حال کون ہو گا۔"

"مگر ملک صاحب۔۔۔" وہ متوحش ہو گیا۔ "آپ ہی نے تو کہا تھا کہ بس ایک بار ہم ادا جی کو دبئی جا کے شو کرنے پہ راضی کر دیں تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ہمارے وہاں سیٹل ہوتے ہی حالات بھی سدھر جائیں گے۔ اب آپ ہی ہمیں خوفزدہ کر رہے ہیں حالات کا ایسا نقشہ کھینچ کے۔"

"غلط نہیں کہا تھا میں نے اس وقت جو تمہیں کھانے تک کے لالے پڑے ہوئے ہیں سگریٹ تک مانگ کے لیتے ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو واقعی تمہارے حالات بدل جائیں گے۔ نئی نویلی بیوی کے فن کی کمائی پہ عیش کرو گے۔۔۔ مگر یا تو عیش کر سکو گے یا پھر قرضے چکا سکو گے۔ میرا مطلب ہے ایسا کوئی ہن تو نہیں برسنے والا۔ بس اتنا ہی کما پائے گی وہ کہ تم اچھا کھا لو گے' عمدہ اور مہنگی والی پی لو گے۔۔۔ اس کے اوڑھنے پہننے کا بھی خرچہ ہو گا گھر داری کا الگ۔۔۔ یعنی کہ نہ تو کچھ جوڑ سکو گے نہ جائیداد بنانے کی نوبت آئے گی۔ قرضے بھی سر پہ موجود رہیں گے اور بیوی بچے بھی یہاں اسی کٹڑی میں برے حالوں رہیں گے۔۔۔ یہ کوئی انسانیت تو نہیں پیارے۔۔۔ خود تو تم دبئی میں مزے کرو' تمہاری پندرہ سالہ پرانی بیوی اور بڑے ہوتے بچے ادھر فاقے کریں۔ تمہارے قرض خواہ میرا گریبان تھامتے پھریں۔ میں نے جو طریقہ بتلایا ہے اس پہ عمل کر کے تم دنوں میں قرضے اتار سکتے ہو۔ اگلے مرحلے پہ دبئی میں کاروبار جما سکتے ہو' اس کے بعد یہاں پاکستان میں اپنی پہلی اولاد کے مستقبل کے لیے بھی بہت سی سرمایہ کاری کر سکتے ہو۔ چند سال بعد تم خود بھول جاؤ گے کہ یہ دولت تم نے کیسے اور کہاں سے کمائی۔ یہ دولت چیز ہی ایسی ہے جگر۔۔۔" وہ ہر طرح سے اسے ترغیب دے رہا تھا اور بار بار ہمایوں مغل کا حرص و طمع کا مارا دل ہمک ہمک جاتا۔۔۔ ہر ترغیب پہ لبیک کہتا جاتا۔۔۔ لیکن دعا کا معصوم چہرہ نظروں کے سامنے آتے ہی لالچ اور حرص کے سیاہ بادل بیٹھ جاتے۔ وہ خود کو دعا کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے قابل نہیں پاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے؟" تکیوں پہ غلاف چڑھاتی موتیا نے ہاتھ روک کے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ عمیص اس کے آگے رول کیا ہوا اخبار بڑھا رہا تھا۔

"کل شام کا اخبار۔"

"وہ تو میں دیکھ رہی ہوں لیکن اخبار تو ہر روز صبح آتا ہی ہے پھر اس شام کے اخبار کی کیا ضرورت ہے اور وہ بھی یہ گھٹیا والا۔ جس میں تھرڈ کلاس ایکٹرز کی من گھڑت خبریں اور واہیات تصویریں لگتی ہیں۔ پرسوں کل ایک اٹھا لائی تھی۔۔۔ شاید تمہارے ہی اسٹور سے اور اب تم اسے سوغات کی طرح لا کر مجھے پیش کر رہے ہو۔" وہ دوبارہ غلاف چڑھانے لگی۔

"اس میں کرم الٰہی کی وفات کی خبر اور تدفین کے موقع پہ اس کے اہل خانہ کی چند تصویریں شائع ہوئی ہیں۔" اس کے اظہار ناپسندیدگی کے باوجود وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اخبار اس کے آگے کھول رہا تھا۔

"کون کرم۔۔۔" اپنی رو میں پوچھتے پوچھتے اچانک موتیا کو یاد آیا کہ یہ شہزاد ملک کے باپ کا نام تھا جس کی شدید علالت کی خبر پرسوں کے اس اخبار میں چھپی تھی جو گل دکھانے کے لیے لائی تھی۔ اس کے تیزی سے چلتے ہاتھ تھم گئے۔

"اوہ۔۔۔ بہت افسوس ہوا۔" یہ فقرہ اس نے رسمی طور پہ نہیں کہا تھا۔ تصور میں ایک بیمار بوڑھے شخص کا چہرہ چلا آیا تھا جس کا زرد رنگ تذلیل کی وجہ سے سیاہ پڑ رہا تھا اور جو اس کے گھر کے ایک حصے میں بے پناہ ذلت سمیٹتے سمیٹتے جب سہار نہ سکا تو کھڑے قدموں سے گر گیا تھا۔

"موت تو برحق ہے لیکن یہ سوچ کر افسوس ہو رہا ہے کہ شاید اس آدمی کی موت کی وجہ وہ واقعہ رہا ہو۔"

"شاید نہیں یقیناً۔" عمیص نے تصحیح کی۔ "وہ شخص دل کا مریض تھا اور چچا حضور نے بھی تو کم نہیں کیا اس کے ساتھ۔" اس کے دل میں اب تک نواب صاحب کے شدید ردعمل کے خلاف ملال تھا جس کا اظہار اس نے بالآخر کر دیا۔

"نہیں میرا خیال ہے اس سارے افسوسناک واقعے میں اکیلے ابا حضور ذمہ دار نہیں ہیں۔ اصل قصور تو اس شہزاد ملک کا ہے۔ نہ وہ جھوٹ کی بساط بچھا کے اپنے باپ کو کسی مہرے کی طرح آگے بڑھاتا نہ یہ سب ہوتا۔ ابا حضور کو مورد الزام ٹھہرانا کسی بھی طرح درست نہیں۔ جو حالات تھے تمہارے سامنے تھے اور ابا حضور کے خیالات بھی تمہارے لیے نئے نہیں۔۔۔ تم ہی بتاؤ وہ کیا کرتے؟"

"خیالات۔۔۔ خیالات، خیالات۔" وہ طنزیہ الاپنے لگا۔

"خیالات، بس خیالات ہی تو ہوتے ہیں، ان کا کیا بھروسہ اور کیا بساط، پھر صرف ان کی خاطر جیتے جی انسانوں کی پرواہ نہ کرنا کیا جائز ہے؟ اور خیالات بدل بھی تو جایا کرتے ہیں خیالات نہ سہی، حالات ہی سہی۔ وہ تو انسان چاہے یا نہ چاہے بدل ہی جاتے ہیں۔" وہ الجھا الجھا سا وہیں برآمدے کے تخت پہ بیٹھ گیا حالانکہ اس کی چادر موتیا نے ابھی جھاڑنے کی غرض سے اتاری تھی اور اسی کے گاؤ تکیوں پہ غلاف چڑھانے میں مصروف تھی۔

"کیسی عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔" وہ اب کچھ تشویش سے اسے دیکھنے لگی۔ "کہیں دلگیر کی نسوار کی ڈبیا میں سے چٹکی بھر سونگھ تو نہیں لی۔۔۔ بھئی صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔"

"اب تم نیا مسئلہ نکال لو۔ ابھی تک تو چچا حضور سے یہی سنتے آئے تھے کہ خون کا اثر ہوتا ہے۔"

"یہ بات کو گھما پھرا کے ابا حضور تک کیوں لے جاتے ہو۔ خفا ہو ان سے؟" اس نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ان سے نہیں، ان کے فرمودات سے خفا ہوں۔ یہ شخص۔" اس نے اخبار کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔۔۔ "یہ شخص ان کی نفرت اور عتاب کا مستحق ٹھہرا کیوں کہ اس نے اپنی اوقات سے کہیں بڑھ کے جسارت کی تھی۔ ایک اعلیٰ نسب گھرانے کی لڑکی کا رشتہ طلب کیا تھا اور اسی اعلیٰ نسب گھرانے کا کوئی فرد اگر اس رسوائے زمانہ پیشے سے منسلک لڑکی سے رشتہ جوڑنا چاہے تو؟۔۔۔ تو پھر؟"

"کون رشتہ جوڑ رہا ہے۔۔۔ تم؟" اس کا دماغ پھر گیا۔

"لاحول ولا۔۔۔ تم سے تو بات کرنا محال ہے۔ نجانے کیا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ چڑ گیا اس بے سروپا انداز پہ۔

"میں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جسے چچا حضور نے بڑے زعم کے ساتھ ہمارے نواب گھرانے میں شامل کیا تھا۔ اس دعوے کے ساتھ کہ انہیں انسان کی پرکھ ہے، شجرو بھانپ لیتے ہیں وہ۔۔۔ وہی شخص یعنی ہمارے بہنوئی صاحب بابر ہمایوں مغل۔۔۔" وہ اتنا بھرا بیٹھا تھا کہ یاسمین سے رازداری کا وعدہ کرنے کے باوجود اس پہ قائم نہ ہو سکا۔ ویسے بھی وہ دل سے اس رازداری کا قائل بھی نہیں تھا۔ وہ اس معاملے کو سب کے سامنے لانا چاہتا تھا تاکہ اس کا فوری سدباب ہو سکے۔

"وہ شہزاد ملک کی اس کزن میں انوالو ہیں۔" اپنے تئیں اس نے خاصا بڑا انکشاف کیا تھا لیکن موتیا سنتے ہی

کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ تو ٹی وی آرٹسٹ ہے، سنگر بھی ہے۔ ہاں بابر بھائی صاحب خاصے شوقین مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اس کے فین ہوں گے۔ تم بھی ناں۔۔۔ بس بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہو۔"

"عمیص سچ کہہ رہا ہے موتیا۔" نجانے کب سے کمرے میں بیٹھی ان کی باتیں سنتی گل نے ادھ کھلے دروازے سے جھانک کر کہا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکی برآمدے کے اسی کونے میں کھلتے تھے۔

"اس بات کی تصدیق ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ اس بات کے عینی شاہد ہیں۔ ہم نے خود ان دونوں کو اکٹھے دیکھا تھا۔"

"کب؟" دونوں اکٹھے کہہ اٹھے۔

"یہی کوئی ایک ڈیڑھ ماہ قبل۔"

"تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟" عمیص نے ماتھے پہ بل ڈال کر پوچھا۔

"کون ہماری بات کا یقین کرتا اور تب ہم جانتے بھی تو نہ تھے کہ وہ لڑکی کون ہے۔ صرف اتنا اندازہ ہوا تھا کہ کسی معزز گھرانے سے تعلق نہیں ہے اس کا، حتیٰ کہ پرسوں اخبار میں بھی اس کی تصویر دیکھ کے یاد نہ آیا کہ اسے کب اور کس کے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔ یہ تو اب تمہاری بات سنی تو اچانک یاد آیا۔"

"واہ۔۔۔ اچانک یاد آیا۔" عمیص نے ناراضگی سے کہا۔

"گل، آپا حضور تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا ایک اہم مسئلہ تھا جسے دیکھ کر بھی تم نے ان دیکھا کر دیا۔ کیا اب تمہارا یہ فرض نہیں بنتا تھا کہ تم گھر میں کسی کو اس بارے میں بتاتیں۔ شاید اس وقت کوئی فوری اقدام کر لیا جاتا تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی جتنی آج ہے۔ تمہیں پتہ ہے وہ اس لڑکی سے شادی کرنے والے ہیں۔"

"ایسے کیسے کر سکتے ہیں وہ شادی؟ اتنا آسان ہے کیا؟ ابا حضور کے علم میں آنے دو یہ معاملہ، پھر دیکھنا کیسے ہوا نکلتی ہے ان کے بڑھاپے کے عشق کی۔" گل نے کہا۔

"یہی تو ہو نہیں سکتا۔ چچا حضور کی صحت کا حال تم دیکھ ہی رہی ہو۔ اتنا بڑا دھچکا ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اب جو کرنا ہے ہم لوگوں کو ہی کرنا ہے۔"

"تمہارا تو پتہ نہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" گل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہم شہزاد ملک سے بات کریں گے۔ اسے ایک بار پھر اس کی اوقات یاد دلائیں گے۔ اسے اپنی اس کزن کو لگام ڈالنا ہی ہوگی۔"

☼ ☼ ☼

آج بہت دنوں بعد شہزاد آفس گیا تھا۔ کرم الٰہی کی وفات کو بارہ روز گزر چکے تھے۔ دسویں کے ختم کے بعد جو اکا دکا رشتہ دار اب تک پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے وہ بھی اپنے اپنے گاؤں سدھارے دعا البتہ اب تک یہیں تھی۔ بلقیس اسے واپس بھیجنے پہ تیار نہیں تھی۔ شہزاد نے سمجھانے کی کوشش بھی کی۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح دعا کے بہت سے کام رکے پڑے ہوں گے، نجانے اس نے کہاں کہاں ڈیٹس دی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ فوتگی والے گھر سے وہ تیار ہو کے یا بن سنور کے ریکارڈنگز کے لیے تو نہیں جا سکتی تھی لیکن پھر ماں کی حالت دیکھ کے چپ ہو رہا۔ یہ حقیقت تھی کہ دعا کی موجودگی کی وجہ سے وہ خاصی سنبھلی ہوئی تھی۔ اللہ دسایا نے بھی پہلے دبے دبے الفاظ میں، کبھی ڈھکے چھپے انداز میں کہنے کی کوشش کی اور دسویں سے فارغ ہو کے تو اس نے صاف الفاظ میں دعا کو واپس چلنے کی تیاری کا حکم دے دیا۔

"چل کڑیے، بس بہت ہو گیا۔ جانے والا چلا گیا اب ہم کب تک پھوڑی (صف ماتم) ڈال کے بیٹھیں گے۔ اپنے اپنے کام دھندے سے لگنا ہوتا ہے۔ ساروں کو کتنے دنوں سے میں فون پہ بہانے بنا بنا کے تھک گیا ہوں۔ وہ اسلم گجر کی فلم تو ہاتھ سے نکل بھی گئی۔ اس نے جمعرات کو۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ ہاں 'افتتاحی پارٹی' رکھی تھی اپنی فلم کی اور اسی میں فلم کے گانے ریکارڈ کرنے تھے۔ کیا سوہنا چانس ملا تھا۔ بے شک چار گانے دوسری بڑی سنگروں

کے تھے لیکن اتنی مہنگی فلم کا ایک گانا بھی تجھے مل گیا' یہی بہت تھا۔ اب تو وہ چانس بھی نکل گیا۔ الٹا روالے شو کے بھی پیسے مارے گئے۔ الٹا جو بیس ہزار ایڈوانس پکڑے تھے وہ اب واپس۔"

"بس بھی کریں ابا جی۔" دعا نے ناگواری سے ٹوکا۔

"او' وہی تو میں کلپ رہا ہوں کہ بس کر۔۔۔ اب بس کر' الو کو تو صبر آتے آتے ہی آئے گا' تو کیا تب تک ادھر بیٹھی رہے گی؟ شاباش گھر چل۔۔۔ آجایا کرنا دوسرے تیسرے دن میں کوئی منع تھوڑی کر رہا ہوں۔ تیرا ماما نہیں رہا تو کیا ہوا' تیرا رشتہ تو نہیں ختم ہو گیا۔ آخر یہ تیرا "نانکا" (ننھیال) ہے۔ آتی جاتی رہنا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب ڈیرے ہی یہاں ڈال لینے ہیں۔"

"چلتے ہیں۔۔۔" اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "کل پرسوں چلیں گے۔"

"کل پرسوں کیوں؟ آج کیوں نہیں؟" وہ بگڑا۔

"میں نے کہا ناں' کل یا پرسوں بتاؤں گی۔"

"لو جی۔۔۔ اب بتاؤں گی۔" وہ منہ بگاڑ کے اور اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

"پہلے کہا تھا کل پرسوں چلوں گی' اب کہہ رہی ہے بتاؤں گی ناں' تیرا ارادہ کیا ہے؟"

"ارادہ۔۔۔" وہ گہری سانس بھرتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارادے بنانے کی ہماری اوقات ہی کہاں ہے ابا۔" وہ زہریلی سی مسکراہٹ سجا کے وہاں سے ہٹ گئی۔ ابا کے اصرار سے بچنے کا اور کیا رستہ تھا سوائے منظر سے غائب ہونے کا۔

اور اگلے دن جب شہزاد بھی آفس چلا گیا تو اللہ وسایا کو نئے سرے سے بحث چھیڑنے کا موقع مل گیا۔

"لو' جس کا باپ مرا ہے اب تو وہ بھی دفتر کھول کے بیٹھ گیا ہے دو اور دو چار کرنے۔ تو کیوں اپنی روزی روٹی کی دشمن بنی ہوئی ہے۔"

"اچھا ابا' کل سویرے نکل پڑیں گے۔" وہ دوپہر کا کھانا بنانے میں مگن تھی۔ اتنے دنوں سے گھر پہ ماتمی فضا چھائی ہوئی تھی۔ آج شہزاد کے معمول کے مطابق آفس جانے کی وجہ سے سب کچھ معمول کے مطابق ہی محسوس ہو رہا تھا۔ شہزاد نے نارمل انداز میں تیار ہو کے ناشتہ کیا تھا' ماں سے ملنے آیا تھا۔ اسے دوا وقت پہ کھانے کی تاکید کی تھی۔ بالو بھی دعا کے ایک بار ہی کہنے پہ نہا دھو کے لباس تبدیل کرنے پہ رضامند ہو گئی تھی۔۔۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو رہا تھا مگر بڑے ہی میکانکی انداز میں شہزاد کی مسکراہٹ میں بھی ایک مصنوعی پن تھا اور بشاشت بھی بناوٹی نظر آ رہی تھی جبکہ بالو بھی خود کو نارمل ظاہر کرنے کی اداکاری کر رہی تھی۔ شاید وہ سب اپنی اپنی زندگی کو پرانی ڈگر پہ لانے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ بلقیس شہزاد کی پسند کا کھانا تیار کرنے کا کہتے ہوئے بہت ضبط کے باوجود اپنی پلکیں گیلی ہونے سے نہ بچا سکی تھی شاید کوئی گزرا پل تصور میں آ گیا ہوگا اور اس وقت دعا بڑی لگن کے ساتھ شہزاد کے آفس میں لنچ بھیجنے کے لیے بھنے ہوئے قیمے میں ابلے انڈوں کے قتلے فرائی کر کے ڈال رہی تھی جب اللہ وسایا ایک بار پھر وہی پرانی رٹ لے کے سر پہ آن کھڑا ہوا۔

"اب کل میں کوئی بہانہ نہ سنوں۔۔۔ اچھا سن۔۔۔" اچانک اسے خیال آیا۔

"یہ مغل صاحب کا کوئی فون وون آیا کہ نہیں۔"

"میرا فون بند پڑا ہے میں نے یہاں آتے ہی آف کر دیا تھا۔" اب وہ سلاد کاٹ رہی تھی۔

"لیکن میرا تو بند نہیں۔" اسے بھی دعا نے ایک موبائل لے کر دے رکھا تھا' آخر ابا کم سیکرٹری تھا۔

"میرے فون پہ کر سکتا تھا۔ آخر تو اس کی ہونے والی بیوی ہے اور تیرے ماے کی فوتگی ہوئی ہے۔"

"انہیں ہم نے خبر کب دی ہے؟"

"اس میں خبر دینے والے کون سی بات ہے۔ ہر اخبار میں چھپا ہے کہ شہزاد ملک کے والد کرم الٰہی کی وفات۔۔۔"

"تب بابر صاحب کو کیا پتہ کہ ہماری ان سے کوئی رشتہ داری ہے۔" حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ یہ راز کب کا بابر کے سامنے کھول چکی ہے لیکن اللہ وسایا چونکہ اس بات سے بے خبر تھا اس لیے فی الحال اسے ٹالنے کو کہہ دیا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ متفق ہوا مگر بس چند ہی سیکنڈ کے لیے۔

"اور وہ جو تیری تصویر بھی چھپتی رہی ہے اس خبر کے ساتھ۔۔۔ وہ پڑھ کے بھی نہ پتہ چلا ہوگا۔"

"نہیں پڑھی ہوگی خبر۔" وہ زچ ہو گئی۔ اس بحث میں اسے یاد نہیں رہا تھا کہ رائتے میں نمک ابھی ڈالنا باقی ہے یا ڈال دیا ہے۔ رائتے کے پیالے میں چمچہ پھیرتے ہوئے اس کے ماتھے پہ لاتعداد شکنیں تھیں۔۔۔ پتہ نہیں یہ نمک بھولنے کی وجہ سے تھیں یا اس ذکر سے جس کو چھوڑنے پہ اللہ وسایا تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ایسی بھی کون سی اہم خبر تھی۔ بعض لوگ ہر خبر پڑھنے کے عادی نہیں بھی ہوتے۔" اس نے چکھ کے کہا۔ نمک واقعی پہلے سے ڈال چکی تھی۔ اچھا ہوا دوبارہ نہیں ڈالا۔

"اچھا چلو مانا۔ لیکن وہ دوسرے دن پھیرے لگانے کا عادی تھا۔ اب بھی آتا ہو گا تو مکان کے باہر تالا دیکھ کر بھی اسے خیال نہ آیا کہ یہ بتائے بغیر کہاں چلے گئے۔ اتنے دن ہو گئے فون کر کے پوچھ ہی لے کہ مسئلہ کیا ہے تیرا فون بند ہے تو میرے نمبر پہ کر لیتا۔"

"ہو سکتا ہے وہ سمجھ رہے ہوں کہ ہم لوگ ان کے تحفے تحائف سمیٹ کے رفو چکر ہو گئے ہیں۔۔۔ فراڈ سمجھ رہا ہو وہ ہمیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"لو کر لو گل۔۔۔ بڑا لاکھوں دے دیا ہے ناں اس نے جو ہم فراڈ کرتے۔" وہ برا مان گیا۔

"یعنی بات لاکھوں کی ہو تو فراڈ کا سوچا جا سکتا ہے؟" اس نے کریدا۔ اللہ وسایا ذرا گڑبڑایا پھر دعا کی آنکھوں میں غیر سنجیدگی دیکھ کے ناراض ہو گیا۔

"شرم نہیں آتی' بڈھے پیو کے ساتھ مخول کرتی ہے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"شرم تو آتی ہے ابا۔۔۔ بہت آتی ہے لیکن کیا کیا کروں' بڈھے باپ کو ہی شرم نہیں آتی تو۔۔۔" اس نے سر جھٹک کے اس تکلیف دہ خیال کو پرے کیا اور ٹفن باکس پیک کرنے لگی۔

"روٹی پتر' روٹی باندھ دی؟" بلقیس کچن میں آئی۔

"جی ماسی جی۔۔۔ ڈرائیور کے ہاتھ بھجوانے ہی والی تھی۔"

"روٹی۔۔۔ وہ تیرا منگیتر۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ لمبا سا؟"

"جی بابر۔۔۔ بابر ہمایوں مغل۔" اس نے سر جھکا کے آہستہ آواز میں کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ضرور ماسی جی نے اس کی اور اللہ وسایا کی گفتگو کا کچھ حصہ سن لیا ہے اور اس کے ذہن میں بھی وہی سوال پیدا ہو رہے تھے جن کا اظہار اس کا باپ کر رہا تھا۔ یہ سوال تو اس کے ذہن کے کسی کونے کھدرے میں بھی موجود تھا مگر وہ لاشعوری طور پہ اس سے پہلو تہی برت رہی تھی۔ اسے سامنے نہیں لانا چاہ رہی تھی۔ شاید وہ بابر کے ذکر سے کترا رہی تھی یا پھر خود بابر سے۔۔۔

"ہاں بابر' نام تو اچھا ہے' رعب داب والا۔ خود بھی ایسا ہی ہو گا ناں؟۔۔۔ بانکا' سوہنا' گھبرو تیرے ساتھ جچتا تو ہے؟"

اس نے تردید یا تائید کی بجائے صرف سر جھکا کے مسکرانے پہ اکتفا کیا۔ وہ اس تمہید کا مقصد بھانپ رہی تھی۔

"بڑا جی کرتا ہے اسے دیکھنے کو۔ آخر ہونے والا جوائی ہے۔ تیری بات پکی ہوئی تو ادھر کرے کی طبیعت خراب ہوئی۔ ملنا ہی نہ ہو سکا ورنہ میں نے دعوت کرنی تھی اس کے سارے خاندان کی وہ بھی دیکھتا اس کے سوہرے کتنے ٹھیکے والے ہیں۔ اب ایسا موقع تو نہیں ہے۔ ذرا کچھ دن ٹھہر کے ہی دعوت کروں گی۔۔۔ لیکن وہ یا اس کے ماں پیو آ تو سکتے تھے کرے کی موت پہ۔ آخر رشتے داری کا معاملہ ہے۔"

"اصل میں ماسی جی' مجھے وہاں اطلاع دینے کا خیال ہی نہیں آیا۔"

"تو اب دے لو۔ کیا پتہ وہ لوگ برا مان جائیں کہ اتنی بڑی بات اور ہمیں بتایا تک نہیں۔ پتر ان چھوٹی چھوٹی

باتوں کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"وہ اکیلے ہیں۔ میرا مطلب ہے والدین کی وفات ہو چکی ہے۔ ایسے روایتی اعتراضات اٹھانے والا وہاں اب کوئی نہیں۔"

"خیر وی۔۔۔ چل تیری مرضی۔" اس نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

☼ ☼ ☼

ابھی ابھی پیون اس کے سامنے وہ لنچ باکس رکھ کے گیا تھا جو ڈرائیور اس کے گھر سے لایا تھا۔ شہزاد نے بے دلی سے دیکھا۔ آفس آنے کے بعد اب تک وہ تین کپ چائے اور درجن بھر سگریٹ پی چکا تھا۔ کچھ بھی کھانے کی رتی بھر طلب نہیں تھی مگر وہ اپنی ماں کی عادت سے واقف تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر میں گھر سے اس کا فون آجاتا اور وہ بہانے بہانے سے یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ اس نے کیا کھایا اور کتنا کھایا کیا پسند آیا۔ ایسے میں اسے کم از کم یہ تو علم ہونا چاہیے کہ آخر گھر سے کیا پک کے آیا ہے۔ اس نے باکس کھولا۔

سب سے اوپر والے کم گہرے ڈبے میں نفاست سے کٹی سلاد تھی جس کے درمیان ٹماٹر کا مہارت سے بنایا پھول یہ ثابت کر رہا تھا کہ یہ دعا کے فنکار ہاتھوں کا کمال ہے۔ بالو اول تو سلاد بنانے کا تکلف ہی نہ کرتی' کبھی بناتی بھی تو بس پیاز اور کھیرے کے موٹے موٹے قتلے کاٹ لینے کو ہی کافی جانتی۔

نیچے والے دونوں ڈبوں میں اس کا پسندیدہ ابلے انڈوں کے قتلوں والا بھنا قیمہ اور پنیر کے کیوبز کے ساتھ پکائی مکس سبزی کا سالن تھا۔ سب سے آخر میں گھر کی پکی روٹیاں تھیں۔ بلقیس کے ہاتھ میں بھی غضب کا ذائقہ تھا لیکن اس وقت کھانے کی خوشبو سے اسے صاف لگ رہا تھا کہ یہ دعا نے تیار کیا ہے۔ اشتہا نہ ہونے کے باوجود وہ خود کو لقمہ توڑنے سے باز نہ رکھ سکا۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نوالہ وہ بے اختیار لیتا گیا۔

کتنے دنوں سے وہ بے دلی سے چند لقمے زہر مار کر کے کھانے کی ٹیبل سے اٹھ رہا تھا۔ آج عرصے بعد کام میں مگن ہو کے ذہن سے اس غم کو قدرے دور کیا تو کھانے کا لطف بھی آیا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کا شکر گزار ہوا۔ اس کے خلاف دل میں جتنی بھی کدورت تھی' جتنا بھی غبار تھا وہ ان دس بارہ دنوں میں کم ہوتے ہوتے تقریباً" ختم ہو کے رہ گیا تھا۔ اس میں یقیناً" کچھ عمل دخل کرم الٰہی کی اس آخری نصیحت کا بھی تھا۔ جس میں اس نے دعا کے لیے شہزاد کو اپنا دل صاف کر لینے کی درخواست کی تھی۔

"تجھے اس سے جو بھی شکایتیں ہوں اپنے باپ کی لاڈلی سمجھ کے معاف کر دینا۔ اس کا خیال رکھنا۔ اسے میرے گھر سے رخصت کرنا۔ بڑی عزت اور شان سے بیاہنا۔۔۔ اس کی خبر گیری کرتے رہنا۔"

"ضرور ابا۔۔۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ چالیسویں کے بعد پھوپھا جی کو کہہ کے اس کے سسرال والوں کو باضابطہ دعوت دوں گا اور شادی کی قریب ترین تاریخ مقرر کر لوں گا۔ اسے پوری عزت اور شان و شوکت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت کروں گا' جیسا کہ آپ کی خواہش تھی۔"

اس نے اس عزم کو دل میں دہرایا۔ اتنے میں فون کی بیل نے اس کی توجہ بانٹ لی۔

"یس شہزاد ملک اسپیکنگ!"

"ہم صاحبزادی گل مہر خانم بول رہے ہیں۔"

دوسری جانب سے ایک سرد آواز نے اس کا نوالہ توڑتا ہاتھ منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں اب بھی کہتا ہوں کہ تم مجھے نمبر دو میں خود بات کر لیتا ہوں۔" عمیص نے ایک اور کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پہ قائم تھی۔

"نہیں اس سے ہم خود بات کریں گے اور اپنے طریقے سے کریں گے۔"

"اور یہی طریقہ تو مجھے پسند نہیں۔"

"تو تمہارا خیال ہے ہم اس شخص سے منت کرتے ہوئے درخواستیں کریں کہ برائے مہربانی ہماری بہن کی شادی شدہ زندگی بچاؤ' اس پہ اور اس کے چار بچوں پہ ترس کھاؤ اور اپنی کزن کو ہمارے بہنوئی سے دور کر دو۔۔۔ ایسی التجائیں تم پہ سوٹ کرتی ہیں' ہم پہ نہیں۔ ہم تو اس کی ایسی کی تیسی کر کے۔۔۔"

"یہ کوئی مہذب انداز نہیں ہے کسی خاتون کی گفتگو کا۔" عمیص کی ناپسندیدگی اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے واضح تھی۔

"اور ویسے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ تم یاسمین آپا کی ہمدردی میں اسے فون نہیں کر رہیں بلکہ تمہیں اس کی ایسی کی تیسی کرنے کا ایک اور موقع چاہیے اور بس۔۔۔ آپا کے ساتھ کیا ہوتا ہے یہ تمہاری بلا جانے۔ اتنی خیر خواہ ہوتیں تم تو اسی دن مجھے بتاتیں جب بابر بھائی صاحب کو اس لڑکی کے ہمراہ دیکھا تھا لیکن تب تک تمہیں پتہ جو نہ تھا کہ وہ لڑکی شہزاد ملک کی کچھ لگتی ہے اور یہ کہ شہزاد کی اصلیت کیا ہے۔ تب اس سارے معاملے کا تم پہ کوئی اثر نہیں پڑتا تھا اس لیے تم نے پرواہ نہیں کی اور اب چلی ہو خدائی فوجدار بن کے ایک ایسے شخص پہ چڑھائی کرنے جس کا اس سارے قصے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تعلق کیوں نہیں۔ وہ کزن ہے اس کی۔" عمیص کی ساری باتوں سے بے نیاز وہ نمبر ملا رہی تھی۔

"ہر شخص اپنے قول و فعل کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ شہزاد نے اسے مشورہ نہیں دیا ہوگا ایک کنگلے اور بے روزگار شادی شدہ ڈھلتی عمر کے شخص کے عشق میں مبتلا ہونے کا۔ گل! وہ آدمی پہلے ہی اپنے کیے کی خاصی سزا بھگت چکا ہے اب بخش دو اسے۔ اس کے باپ کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

"ہم صاحبزادی گل مہر خانم بول رہے ہیں۔" عمیص کی ہر ممکن کوشش کے باوجود وہ شہزاد کو کال کر کے رہی اور اب اس کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کیے اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ عمیص اس کی ڈھٹائی پہ تاسف سے سر ہلاتا دور ہٹ کے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں اس وقت عمیص کے ہی اسٹور میں تھے۔

دوسری جانب چند ثانیے کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید وہاں گل کا تعارف غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔

"جی فرمایئے' کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ذرا سنبھل کے شہزاد ملک نے خشک لہجے اور سرسری سے انداز میں مکمل بے گانگی جتاتے ہوئے پوچھا۔ گل مہر کو یہ اجنبیت بری طرح کھلی۔ وہ اب بھی توقع کر رہی تھی کہ اتنا سب ہونے کے بعد آج بھی وہ اس کی آواز سنتے ہی اچھل پڑے گا اور اس کی اس کیفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اسے جی بھر کے شرمندہ کر سکے گی لیکن اس کی امید کے برخلاف وہاں سرد مہری کا راج تھا۔

"خدمت؟ خدمت خلق کا ٹھیکا تو آپ کے خاندان نے لے رکھا ہے مسٹر ملک؟" اس نے چبا چبا کے کہا۔

"کام کی بات کیجیے محترمہ آپ کچھ عرصہ یہاں رہ کے یہ تو دیکھ ہی چکی ہوں گی کہ یہاں صرف کام ہوتا ہے۔ بے مقصد گفتگو کرنے کا نہ کسی کے پاس وقت ہے نہ حوصلہ۔" اس نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ کہا۔ گل مہر کی آواز سنتے ہی اسے خوش فہمی سی پیدا ہوئی تھی کہ شاید وہ اس کے والد کی تعزیت کے لیے فون کر رہی ہے۔۔۔ جو بھی تلخی رہ گئی ہو' بہرحال دنیاداری بھی کوئی چیز ہے لیکن اس کا جلا کٹا انداز اس کی سمجھ سے بھی باہر تھا

"اور دوسروں کی زندگیوں میں ہلچل مچانے کا تو وقت بھی آپ کے پاس وافر مقدار میں ہے اور آنکھوں میں دھول جھونکنے کا حوصلہ بھی خاصا ہے اور یہ کام آپ کے اہل خانہ خاصے منظم انداز میں کر رہے ہیں۔ لیکن ایک بات تو بتایئے اپنے اپنے جوہر آزمانے کے لیے آپ سب کو ہمارا گھرانہ ہی ملا تھا؟"

"کیا مطلب؟ کہنا کیا چاہتی ہیں آپ محترمہ؟ کھل کے بات کریں۔" وہ چونکا۔

"کھل کے تو آپ سامنے آرہے ہیں۔ جب اپنا مقصد پورا نہیں ہوا تو اپنی ناکامی کی جھنجلاہٹ نکالنے کے لیے اپنی اس بازاری کزن کو ہمارے بھائی صاحب کے پیچھے لگا دیا تاکہ ہماری بہن کا بسا بسایا گھر اجڑ جائے۔"

"آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" شہزاد ملک کے اعصاب تن گئے تھے۔ بہت ضبط کر کے اس نے

اپنے اندر اٹھتے طیش کے بادل کو روکا۔

"بالکل۔۔۔ اور ہم یہ بھی صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ اس دو ٹکے کی لڑکی کو اس کی اصلیت بتائیں اسے یاد دلائیں کہ وہ کیا ہے اور کس کے مقابل آنا چاہ رہی ہے۔ ہمیں تو یہ سمجھ نہیں آرہا ہے کہ جب اس محفلوں میں گانے والی کو ایک سے ایک ٹکڑا پرستار بھی میسر ہے اور خریدار بھی تو وہ کیا سوچ کر ہمارے بہنوئی بابر ہمایوں مغل سے شادی کررہی ہے۔ یقیناً" آپ نے ہی انتقام کی نیت سے اسے ایسا کرنے پہ مجبور کیا ہے اور اب آپ ہی اس کے قدم آگے بڑھنے سے روکیں گے ورنہ۔۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید زہر اگلتی، عمیص کی برداشت کی حد ختم ہو گئی اور اس نے آگے بڑھ کے گل کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

"ہیلو!۔۔۔ ہیلو شہزاد صاحب۔" عمیص نے مخاطب کیا۔ دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آئی۔ شہزاد اب تک اس انکشاف کی وجہ سے عالم حیرت میں تھا۔ وہ بابر ہمایوں مغل، جو اس کے سامنے اپنے مکروہ کردار کے ساتھ آچکا ہے کیا وہ دعا کا ہونے والا شوہر ہے؟ یہ حقیقت اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی، گل کی باتوں کی گہرائی میں جانا تو بہت دور کی بات تھی۔

"میں عمیص علی خان بول رہا ہوں، شہزاد صاحب۔" عمیص نے اپنا تعارف کرایا۔ "گل مہر کا چچا زاد اور صاحبزادہ نفیس علی خان کا بھتیجا۔"

"کہیے۔" ایک گہری سانس بھر کے وہ اپنے خیالوں سے باہر نکلا اور بے بسی سے ریسیور کو تکنے لگا، جس میں آتی آوازیں ابھی اور نجانے کتنا زہر گھولنا چاہتی تھیں اس کی سماعتوں میں۔

"کہیے عمیص صاحب! کہہ ڈالیے آپ بھی، جو کہنا چاہیں جو کسر آپ کی کزن کی جانب سے باقی رہتی ہے وہ آپ پوری کر لیجیے۔"

"آپ کے والد صاحب کی اچانک وفات پہ بہت افسوس ہوا۔"

خلاف توقع دوسری جانب سے تعزیت کا اظہار ہوا تو شہزاد چپ سا ہو گیا۔ گل مہر کی اکسا دینے اور اشتعال انگیز گفتگو کے رد عمل کے طور پہ اس کے اندر جو ابال اٹھنا شروع ہوئے تھے، ان کے باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ جبکہ گل عمیص کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اور اس سے بھی زیادہ افسوس مجھے اس بات پر ہو رہا ہے کہ مجھے اس موقع پہ آپ کے پاس تعزیت کے لیے آنے کی بجائے اس تکلیف دہ موضوع پہ بات کرنا پڑ رہی ہے لیکن یقین جانیے شہزاد صاحب! معاملہ اتنا گمبھیر نہ ہوتا تو میں ابھی آپ کو زحمت نہ دیتا کیونکہ میں سمجھ سکتا ہوں فی الحال آپ کس دور سے گزر رہے ہیں۔ آپ بھی سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ اتنی سنجیدہ نوعیت کی بات کو میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ میری بہن کی زندگی اور اس کے چار بچوں کے مستقبل کا سوال ہے۔"

"کیا مس گل مہر نے جو کچھ کہا ہے، وہ سچ ہے؟" عمیص کی سبھاؤ سے کی گئی بات نے شہزاد کے اندر دہکتے الاؤ کو یکسر ٹھنڈا کر دیا ورنہ گل مہر نے تو اسے بھڑکانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اب وہ بھی فکرمندی سے اس مسئلے پہ غور کر رہا تھا۔ اسے یقین نہ آرہا تھا کہ دعا جیسی حساس اور دردمند لڑکی جانتے بوجھتے کسی دوسری عورت کے بسے بسائے گھر میں آگ لگا سکتی ہے۔ کیا وہ اس حد تک بدل گئی ہے؟۔۔۔ کیا وہ اس کا یکسر دوسرا روپ ہے، جو وہ آج کل دیکھ رہا ہے؟

"جی ہاں اور یہ محض شک نہیں ہے۔ میں خود اس کی تصدیق کر چکا ہوں اور بابر بھائی صاحب بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ وہ ادا نامی گلوکارہ سے چند روز تک شادی کرنے والے ہیں۔ غالباً" آپ کی کزن شادی کے بعد انہیں لے کر بیرون ملک سیٹل ہونا چاہتی ہیں۔"

"میری کزن یا آپ کے بہنوئی؟" اس نے الٹا سوال کیا۔ "دیکھیے میں مانتا ہوں کہ دعا میرا مطلب ہے جسے آپ

ادا کے نام سے جانتے ہیں، وہ میری قریبی عزیزہ ہے لیکن ہمارے آپس کے تعلقات اس نوعیت کے نہیں۔۔۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ مجھے چند ہفتہ قبل اس کی منگنی کی اطلاع ضرور ملی تھی مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی منگنی آخر ہوئی کس سے؟ اس کے باوجود، جتنا بھی میں دعا کو جانتا ہوں، اس کی بنیاد پہ ایک بات تو حلفیہ کہتا ہوں کہ یقیناً" وہ آپ کے بہنوئی کے ورغلانے پہ اس شادی پہ تیار ہوئی ہو گی۔ اس کا تعلق شوبزنس سے ضرور ہے لیکن وہ ایک معزز اور باشعور لڑکی ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس سے مل کے با آسانی ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ بابر ہمایوں مغل پہ ایک ہی ملاقات کے بعد مجھے ہو گیا تھا۔ اس مختصر سے ٹکراؤ نے اس کی ساری اصلیت مجھ پہ کھول کے رکھ دی تھی۔"

"آپ ان سے مل چکے ہیں؟" عمیص کو حیرت ہوئی۔ "لیکن ابھی آپ نے خود کہا کہ آپ نہیں جانتے" آپ کی کزن کی منگنی کس شخص سے ہوئی ہے۔"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ اگر میں واقعی جانتا ہوتا تو آج آپ کو فون کرنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔ میں کب کا یہ معاملہ رفع دفع کر چکا ہوتا کیونکہ بہرحال وہ میری پھوپھی زاد ہے اور میرے مرحوم والد کی بے حد عزیز بھانجی۔۔۔ اس کے ساتھ کچھ بھی برا ہوتے دیکھنا مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔"

"آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ الجھ سا گیا۔ دوسری طرف گل بھی بار بار اسے ریسیور واپس کرنے کے اشارے کر رہی تھی۔

"دیکھیے یہ تو طے ہے کہ دعا یا تو یہ جانتی نہیں ہو گی کہ وہ شخص شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ ہے یا پھر اس فراڈ انسان نے یقیناً" کچھ جھوٹ بول کے اسے پھنسایا ہو گا۔ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے فن کا تو وہ ماہر ہے اور کمال ہے کہ اتنے سالوں میں بھی آپ اس کے اس ہنر کو بھانپ نہیں سکے۔"

اس کا لہجہ خود بخود کٹیلا اور نوکیلا ہوتا جا رہا تھا۔

"آپ سے اس امید پہ بات کرنا چاہی تھی کہ شاید آپ معاملہ سنبھال لیں لیکن آپ تو الٹا بابر بھائی صاحب پہ سارا بار ڈال رہے ہیں۔" عمیص کے لہجے میں بھی کھردرا پن اتر آیا۔

"کبھی آپ ان سے اجنبیت کا دعویٰ کرتے ہیں تو کبھی ان کے اصل سے واقف ہونے کا اعلان۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔۔۔ اس نے اپنا تعارف خود کروایا تھا۔" شہزاد ملک نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"پہلے ایک بلیک میلر کے طور پہ۔۔۔ بعد میں نواب صاحب کے بڑے داماد کے طور پہ۔"

"بلیک میلر؟"

"جی ہاں آپ کو یاد ہو گا جس روز میں اپنے والدین کے ہمراہ آپ کے ہاں آیا تھا، اس وقت اچانک ایک فون کال آجانے کی وجہ سے مجھے درمیان میں سے اٹھ کے جانا پڑا تھا۔"

"جی، جی۔" اسے فوراً" یاد آگیا۔

"وہ انجانی کال آپ کے اسی بہنوئی نے کی تھی۔ اس وقت اس نے اپنا تعارف کرائے بغیر مجھے نزدیکی پارک میں صرف یہ کہہ کر بلوایا تھا کہ اسے مجھ سے ضروری بات کرنی ہے اور یہ کہ میرے رشتہ کے طے ہونے یا نہ ہونے کا سارا دارومدار اس ضروری بات پر ہے۔ اس وجہ سے میں بھری محفل سے اٹھنے پہ مجبور ہوا تھا اور ملنے پہ اس نے مجھے بتایا کہ وہ میری اصلیت سے واقف ہے اور اگر میں اس کے مطالبات پورے نہیں کروں گا تو وہ میرا راز نواب صاحب کے سامنے کھول دے گا۔ میں نے اس کی دھمکی کو گیدڑ بھبکی جان کے نظرانداز کرنا چاہا تو مجبوراً" اسے یہ ظاہر کرنا پڑا کہ وہ بابر ہمایوں مغل ہے۔۔۔ صاحبزادہ نفیس علی خان کا بڑا داماد۔"

"کیا؟۔۔۔" عمیص کے لیے یہ انکشاف تکلیف دہ تھا۔ گل مہر حیرت سے اس کے چہرے کے ہر پل بدلتے تاثرات سے معاملہ کو بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جی ہاں اور سچ تو یہ ہے کہ اسی وجہ سے میں بھی ڈر گیا تھا کیونکہ نواب صاحب کسی ایرے غیرے کی بات کا چاہے یقین نہ کرتے مگر اپنے داماد کا بہرحال کر لیتے۔ اسی لیے میں نے اس کا مطالبہ مان لیا۔ یہ الگ بات کہ وہ معاملہ ہی آگے نہ چل سکا۔ نواب صاحب نے خود ہی.....“ وہ اچانک چپ ہو گیا۔ شاید بہت سی تکلیف دہ باتیں یاد آ گئی تھیں۔

”خیر..... تب تک آپ کے قابل عزت بہنوئی مجھ سے چند ہزار تو ضرور ہی بٹور چکے تھے اور مجھے یقین ہے کہ جو شخص اپنے خاندان کی عزت کی پرواہ نہ کرتا ہو‘ اس میں سے بھی مالی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے..... وہ کتنا گرا ہوا ہو سکتا ہے۔ کیا وہ کسی اور لڑکی کو دھوکا نہیں دے سکتا؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خود دعا کو بہلا پھسلا کر یا ہر لے جا رہا ہو اپنے کچھ ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے؟..... اب میں یہ سمجھا کہ میرے بارے میں اتنی باتیں اسے کہاں سے پتہ چلیں..... یقیناً“ دعا نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہو گا۔ دعا انجانے میں بھلے میرے ساتھ زیادتی کر گئی ہو لیکن میں اسے کنویں میں گرنے نہیں دوں گا۔ آپ میری جانب سے اپنے چچا حضور‘ نواب صاحب کو ایک پیغام دے دیجیے گا کہ انہوں نے بے شک اپنی اعلیٰ نسب صاحبزادی کا ہاتھ ایک مکروہ اور گھناؤنے کردار کے مالک شخص کے ہاتھ میں دیا ہو گا لیکن میں اپنی کزن کو ایسے دھوکے باز سے بچا کے رہوں گا..... ہر حال میں۔“

”کیا ہوا؟..... کون سے کھاتے کھول کے بیٹھ گئے ہو۔“ کافی دیر تک جب عمیص ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا تو گل نے اسے جھنجھوڑ کے پوچھا۔

عمیص نے چونک کر ریسیور کو دیکھا۔ شہزاد کب کا فون رکھ چکا تھا۔ اس نے بھی کال ڈس کنیکٹ کر دی۔

”کیا ہوا؟ کون سا سحر پھونک رہا تھا وہ تمہارے کانوں میں جو تم بت بنے کھڑے تھے۔“ گل نے چڑے ہوئے انداز میں پوچھا۔ اسے ویسے بھی اس بات کا غصہ تھا کہ عمیص نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اس سے ریسیور چھین لیا تھا اور کب سے اس کے ساتھ ایسے انکسار اور عاجزی سے بات کر رہا تھا جیسے رشتہ طلب کر رہا ہو۔

”جواب کیوں نہیں دے رہے؟“

گل کی آواز عمیص کو بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے سنسناتے ہوئے کانوں پہ ہاتھ پھیرا۔ ان کی لوئیں دہک رہی تھیں۔ ماتھے پہ پسینہ آ چکا تھا۔

”جواب دینے کے قابل ہی کہاں رہا۔“ اس نے خالی خالی نظروں سے گل کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جواب تو اس نے دیا ہے۔“

”کیسا جواب؟“

”چچا حضور کے زعم اور تمہارے گھمنڈ کا جواب۔“ عمیص نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ نجانے اس کے لہجے میں اور اس کی نظروں میں کیا تھا جو گل مہر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی تک میں ایک سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔

”اور میری قسمت..... کہ یہ جواب مجھے سننا پڑا۔ شرم سے پانی پانی بھی مجھے ہونا پڑا۔“

● ● ●

یہ کیسی فضا ہے
کہ جس میں سانس لو تو
دھواں سا اندر اتر جائے
یہ کیسا ماحول ہے
کہ جہاں نظر اٹھاؤ
وہ منظر نظر سے اتر جائے

یہ کیسی چھت ہے
جس کے نیچے
دھوپ رگوں میں اتر جائے
یہ کیسی زمین ہے
جس پہ پاؤں دھرو تو
پیر پاتال میں اتر جائے

دعا نے اندر داخل ہوتے ہی بے پناہ گھبراہٹ اور گھٹن محسوس کی۔

اتنی زیادہ جتنی اسے کبھی ایک کمرے والے‘ ٹپکتی ہوئی نیچی چھت‘ پلستر اکھڑی دیواروں والے کا یک نما پرانے گھر میں بھی نہیں محسوس ہوئی تھی جہاں اس نے آنکھ کھولی..... جہاں اس نے ہوش سنبھالا..... اور جہاں اس نے شعور و آگہی کی منازل طے کیں۔

کڑی صبر آزما اور تپتی جلتی منازل.....

اور اس گھر میں آنے کے بعد اس نے سوچا تھا‘ شاید گھٹن اب کم ہو جائے۔ آس پاس کا ماحول بھی تو اثر انداز ہوتا ہے ناں مزاج پر..... کہاں وہ سیلن زدہ‘ متعفن گندے محلے کا ڈیڑھ مرلے کا گھر‘ جہاں باہر گندی نالیوں کی بدبو تھی تو گھر کے اندر ابا کی سستی دیسی شراب کی مہک۔ حالات بہتر ہوتے ہی اس نے اچھے خاصے کرائے پہ اس صاف ستھرے متوسط علاقے میں یہ معقول بنگلہ حاصل کیا جو اس کے اور ابا کی ضرورت کے لحاظ سے بہت تھا۔ اپنے ذوق اور اختیار کے مطابق اس نے اس کی مقدور بھر آرائش بھی کی تھی اور اس گھر کی چھت کے نیچے گزاری جانے والی پہلی رات کی اولین ساعت کو اس نے سوچا تھا۔

”میرا اپنا گھر..... میری اپنی چھت..... میری اپنی زمین۔“

اس نے مغرور ہونا چاہا تھا۔

اپنی مختصر عرصے میں حاصل کی گئی کامیابی پہ مسرور ہونا چاہا تھا۔

اپنی اس متاع پہ نازاں ہونا چاہا تھا جو اس نے اپنی ہمت اور محنت کے بل بوتے پہ کمائی تھی۔

مگر وہ ایسا کر نہ سکی..... نجانے کیوں؟

مغرور ہونا‘ فخر و انبساط محسوس کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ وہ تو اطمینان بھرا ایک سانس تک نہ لے سکی۔ وہ ساری رات اس نے کھلی پلکوں کے ساتھ چھت کو تکتے گزاری تھی۔

اس چھت کو جو بقول اس کے‘ اس کی اپنی تھی۔

مگر یہی چھت جو اسے ساری رات اپنے اوپر گرتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دیواریں جن سے اس نے تحفظ حاصل کرنا چاہا تھا‘ وہی دیواریں چاروں جانب سے تنگ ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

گھبرا کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ٹہلتے ٹہلتے اس نے صبح کر دی تھی۔ اس پہلی رات کے بعد اس نے ٹرینکولائزر استعمال کرنا شروع کر دیے تھے۔ اپنی ہی چھت اور اپنی ہی دیواروں سے آتے خوف کو خود پہ مسلط ہونے سے بچانے کے لیے۔

اور آج عرصے بعد وہ اسی گھٹن اور بے چینی کا شکار ہو رہی تھی۔

کتنے ہی دن بعد اس نے اس گھر کا دروازہ کھولا تھا۔ بند دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے جو ایک مخصوص سیلی سیلی سی مہک پیدا ہو جاتی ہے وہ تو تھی ہی..... یہ ایک الگ ہی احساس تھا جو اس سے سوا تھا۔

اس نے وحشت بھرے عالم میں سوئچ بورڈ پہ الٹا سیدھا ہاتھ مار کے سارے بٹن نیچے کیے۔ لونگ روم کی ساری

ٹیوب لائٹس' چھت پہ لگا فانوس اور دونوں پنکھے آن ہو گئے۔ نئے نکور گرے صوفے پہ سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔ جو فل اسپیڈ سے چلتے پنکھے کی ہوا سے ہلکے ہلکے پھڑپھڑا رہی تھی۔
شیشے کی ٹاپ والی میز اور ڈائننگ ٹیبل پہ پڑی گرد کی موٹی تہ بھی اس ہوا سے اڑ کے چاروں اور پھیل گئی۔
دعا کی وحشت اور بھی بڑھ گئی۔
وہ خوفزدہ نگاہوں سے صوفے پہ پڑی ہلتی ہوئی سفید چادر کو دیکھ رہی تھی۔
"اوئے اسے کی کروتا اے کڑیئے۔"
اللہ وسایا اندر آیا اور فل اسپیڈ سے چلتے پنکھوں کی ہوا سے گھبرا کے سوئچ بورڈ کی طرف بھاگا۔
"ہوئے ہوئے۔۔۔ بڑی ٹھنڈ ہے اے بھئی۔ بھرجائی کا گھر بڑا ننگاہ (گرم) ہے۔ ادھر تو قلفی جم جاتی ہے دسمبر آتے آتے۔ سجے کھبے (دائیں بائیں) کوئی دوجا گھر بھی تو نہیں۔ سیدھی ٹھنڈی ہوا اندر آتی ہے اور تو پنکھے چھوڑ کے کھڑی ہے۔"
"یہ۔۔۔" اس نے انگلی سے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔
"یہ سفید چادر؟"
"اتنے پھیکے رنگ کا صوفہ لیا ہے تو نے۔ میں نے کتنے اچھے گوڑے گوڑے رنگ پسند کیے تھے پر تجھے یہی رنگ پسند آیا۔ بھئی بندہ مہنگی چیز لے تو رنگ میل خورا ہونا چاہیے۔ یہ اتنا ہلکا رنگ اور ہم لوگ اتنے دنوں کے لیے گھر سے باہر تھے جھاڑ پونچھ کرتا تو کون کرتا۔ اس لیے میں نے بچی چدریں اوپر ڈال دیں۔"
اللہ وسائے نے تفصیل کے ساتھ اپنی اس کارکردگی کو بیان کیا۔
لیکن اگلے ہی لمحے وہ حیران رہ گیا جب اس نے دعا کو ہیجانی انداز سے جھپٹ کر صوفے سے چادر نوچتے ہوئے دیکھا۔
"زہر لگتا ہے مجھے یہ سفید رنگ۔"
اب وہ چادر پرے پھینک کر اسے نفرت اور بیزاری سے دیکھ رہی تھی۔
"بلکہ سارے ہلکے رنگ۔۔۔ زہر لگتے ہیں مجھے۔"
"پر تجھے تو ہمیشہ سے ہلکے۔۔۔" وہ بڑبڑا کے رہ گیا اور شانے جھٹک کے کمروں کے لاک کھولنے لگا۔
"کاش میں نے ابا کی پسند سے اس گھر کی چیزیں لی ہوتیں۔" اس نے رک کے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے سوچا۔
ہر جانب اس کے ذوق کی آئینہ دار نفیس اشیاء آراستہ تھیں۔
اس دو بیڈ روم اور ایک کشادہ لونگ روم والے بنگلے کو اس نے زیادہ نہیں بھرا تھا۔ بیڈ رومز تو خیر بے حد سادہ تھے البتہ لونگ روم کو اس نے کسی قدر آراستہ و پیراستہ ضرور کیا تھا مگر اپنے دھیمے مزاج کے ہم آہنگ رہتے ہوئے۔
سفید پینٹ والی دیواریں' سفید ہی دروازے۔
اس کے بیڈ روم کی چھت پہ سفید رنگ میں آسمانی رنگ کی ہلکی سی نیلاہٹ گھلی تھی۔۔۔ اور دیواروں کی سفیدی میں بہت مدھم گلابی رنگ کی آمیزش تھی۔ جبکہ لونگ روم مکمل سفید تھا۔
جس کونے پہ ڈائننگ ٹیبل رکھی تھی وہاں ماربل کا فرش چم چم کر رہا تھا۔ اس نے وال ٹو وال کارپٹ نہیں بچھائے تھے۔ بیرونی دروازے سے اندر آنے والی راہداری بھی سادہ تھی۔ صرف لونگ روم کے اس حصے میں جہاں لائٹ گرے صوفہ رکھا ہوا تھا وہاں ڈارک گرے اور سلور کلر کا دبیز قالین بچھا تھا۔ پردے سفید تھے جن پہ گرے پھول بنے تھے۔ چند ایک کرسٹل کے شوپیس۔
چھت پہ لگا خوب صورت مگر سادہ بناوٹ کا فانوس۔
دائیں جانب قد آدم سلور میٹل کا لیمپ۔

بائیں دیوار کے اوپر آویزاں تجریدی آرٹ کا ایک فن پارہ۔۔۔ جس پہ بنی سیاہ دائروں سے نمودار ہوتی ایک دھندلی سی شبیہہ ماحول کو اور بوجھل کر رہی تھی۔
بس یہ تھی اس کی کل آرائش۔
اور اسے دیکھ دیکھ کے اب دعا کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے ذوق کو مد نظر رکھنے کی بجائے ابا کی پسند کو ترجیح کیوں نہ دی۔
شاید چیختے چنگھاڑتے شوخ رنگ ہی یہاں کا ماتمی ماحول بدل پاتے۔ آنکھیں خیرہ کر دینے والی جگمگاہٹیں' دماغ میں کھب جانے والی جھلملاہٹیں۔۔۔ کچھ تو ہوتا۔۔۔ بس نہ ہوتا تو یہ افسردہ ماحول۔۔۔ یہ سفیدی کی کہر میں لپٹا کٹا پٹا ماحول۔
اس نے ایک گہرا سانس بھر کے اپنے اندر کسی اپنائیت کے احساس کو جگانا چاہا مگر ناکام رہی۔
یہ فضا بوجھل ہی نہیں' ناگوار بھی تھی۔ کثیف ہی نہیں' اجنبی بھی تھی۔
وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور ایک بار پھر اسے شدت کے ساتھ وہ رات یاد آ گئی۔
وہ پہلی رات۔۔۔ جو اس نے اس گھر میں' اس کمرے کی چھت کے نیچے گزاری تھی۔
اس کے ہاتھ بے ساختہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل تک بڑھے جہاں سر درد کی گولیاں اور ٹرینکولائزر وغیرہ موجود رہتے تھے مگر اس کا ہاتھ خالی دراز کو ٹٹولتا ہوا واپس آ گیا۔
"اوہ۔۔۔ یہ تو بہت دن ہوئے ختم ہو چکے ہیں۔ یاد آیا' ماما جی کے ہاں جانے سے بھی دو تین دن پہلے۔۔۔"
اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ اتنے دن ایک پرائی چھت کے نیچے اسے ان مسکن دواؤں کی بھی ضرورت نہ محسوس ہوئی تھی۔
وہ حیران رہ گئی۔
"وہ چھت پرائی کب تھی۔" اس کے دل نے سرگوشی کی۔
"وہ چھاجی کا گھر تھا۔۔۔ چھاجی کا۔۔۔ جن کی ذات سے میں ہمیشہ تحفظ تلاشتی رہی۔ وہ چھاجی جو میرے لیے بذات خود ایک چھت کے مانند رہے ہیں۔ ان کے گھر میں رہنا۔۔۔ ان کے ساتھ ایک چھت کے نیچے اپنی بے خوابیاں بانٹنا۔۔۔ کتنی بڑی عیاشی ہے یہ بھی۔ جو میں نے اتنے دن تک کی۔"
وہ خود ہی اپنے اس خیال پہ مسکرا اٹھی۔
یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو گزشتہ پندرہ بیس دنوں میں اس کے ہونٹوں کو چھو پائی تھی۔
"واہ چھاجی' آپ کا تو اب صرف نام ہی کافی ہے۔" اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔
"آپ کا نام ہی کرشماتی اثر دکھانے لگا۔ آس پاس پھیلا کڑوا کسیلا دھواں گھٹ گیا ہے۔ شانوں پہ دھرا نادیدہ بوجھ خود بخود ہی اتر گیا ہے۔"
اس نے تصور میں جھپاک سے آتے ان کے سراپے کو پلکیں بند کر کے اپنی پتلیوں میں محفوظ کر لیا اور تکیے پہ سر رکھ کے لیٹ گئی۔
"کیسے ہو آپ چھاجی۔۔۔ کتنے عجیب کبھی تو نیندیں چرا لیتے ہو کبھی نیندیں دان کرتے ہو۔"
اسے اپنے بند پپوٹوں پہ نیند کا میٹھا دباؤ محسوس ہونے لگا۔
"اب بھی آپ کو سوچنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ اتنا ہی اچھا' جتنا آج سے سات آٹھ سال پہلے لگا کرتا تھا جب میں آپ کو سوچے بھی جاتی تھی اور ڈرتی بھی جاتی تھی کہ میری سوچ کوئی میرے چہرے سے پڑھ تو نہیں رہا۔"
اس نے اپنا سبک ہوتا وجود یادوں کے نیند آور دھارے پہ چھوڑ دیا اور اپنے تکیے پہ بکھرے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھیرنے لگی۔

"کیسے دن تھے وہ بھی اور کیسی راتیں کچی عمر کی کچی راتیں۔۔۔۔ کچی نیندوں کے کچے خواب۔۔۔ جن کے رنگ البتہ کچے نہیں نکلے۔ یہ رنگ تو بہت پکا نکلا چھاجی۔۔۔ جس میں آپ نے مجھے رنگ دیا۔ آنسوؤں سے دھودھو کے تھک گئی میں تو مگر میرے دل کی چنری سے آپ کا رنگ اترتا ہی نہیں۔"

اچانک اس کا بالوں میں پھرتا ہاتھ تھم گیا۔

اس کے بند پپوٹوں پہ خفیف سی لرزش پیدا ہوئی اور ساتھ ہی پیشانی پہ ایک ہلکی سی ناگوار شکن۔

شاید بالوں میں کچھ الجھ گیا تھا۔

اس نے دوسرے ہاتھ کی مدد سے بالوں کو کھینچ کے نکالا اور پہلا ہاتھ چہرے کے آگے لاتے ہوئے ذرا سی آنکھیں کھول کے دیکھنا چاہا۔

اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

سامنے اس کا دایاں ہاتھ تھا۔

اور اس ہاتھ کی تیسری انگلی میں وہ انگوٹھی تھی، جس میں اس کے بال پھنس گئے تھے۔ اب بھی اس انگوٹھی میں دو تین بال الجھے ہوئے تھے، جو چھڑوانے کی کوشش میں ٹوٹ گئے تھے۔

یہ انگوٹھی جو بابر ہمایوں مغل نے بڑے استحقاق کے ساتھ اسے پہنائی تھی۔

یہ انگوٹھی بہت کچھ یاد دلانے کے ساتھ ساتھ اسے خبر بھی کر رہی تھی۔

"تمہاری نیندیں، تمہاری بے خوابیاں۔۔۔ سب کچھ اب مجھ سے منسوب ہے۔"

اس کے حواس پہ چھاتا نیند کا ہلکا ہلکا سرور اور کچی عمر کی محبت کا خمار بھک سے اڑ گیا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھی تھی اس نے جھنجلا کے انگوٹھی اتارنا چاہی مگر ایسا کر نہ سکی۔

"اسے پہننے کے لیے مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ جواب میں اس طرح احتجاج کر رہی ہوں۔ بند گلی میں بھٹکنے سے بہتر ہے کہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لیا جائے۔ یہ میرا ہی فیصلہ تھا ناں۔۔۔ اب اسے کیوں بدلوں؟ جب دوسری کوئی آس بھی نہیں۔۔۔ کوئی سہارا بھی نہیں۔

ہاں چھاجی میری محبت ہیں۔ لیکن محبت کی طلب ہوتی ہے اور روح کی طلب، عزت۔ چھاجی کی محبت نے میرے دل کو بھلے کتنے ہی رنگ لگائے ہوں لیکن میری ذات کو ہمیشہ کچوکے ہی لگائے ہیں۔ مجھے اپنی خود پسندی کی ایڑیوں تلے روند روند کے مٹی کر دیا انہوں نے۔۔۔ بابر صاحب میری محبت نہ سہی۔۔۔ مگر میرے لیے ایک سہارا تو ہیں۔

☼ ☼ ☼

شہزاد بہت بھرا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔

کتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ آج آفس گیا تھا اور سب کام جاری رہنے کے باوجود اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی غیر موجودگی میں کاموں کا ایک انبار جمع ہو چکا ہو۔ حالانکہ یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اس کا اسٹاف بہت اچھا اور محنتی تھا مگر بات یہ تھی کہ خود شہزاد ملک ٹک کے بیٹھنے والوں میں سے نہ تھا۔ اسے ہر کام اپنی نگرانی میں بھرپور دلچسپی لیتے ہوئے کروانے کی عادت تھی۔

یا یوں کہئے کام کرنے کی لت تھی اسے۔

رائٹرز کے ساتھ اسکرپٹس صرف ڈسکس ہی نہیں کرتا تھا، بعض اوقات پورا پورا اسکرین پلے خود ترتیب دیا کرتا۔

ایڈیٹنگ ٹیبل پہ ایڈیٹر کے ساتھ بیٹھ کے ہر ہر اینگل پہ بحث کرنا بھی اس کے معمول کا حصہ تھا۔

شوٹنگز کے دوران سیٹ پہ ہنگامی وزٹ کرنا بھی اس کی عادت تھی۔

اتنے دن گھر رہا تو باپ کی دائمی جدائی کے گہرے احساس تلے اسے یہ بات زیادہ نہ کھلی لیکن آج آفس جانے کے بعد محسوس ہوا کہ اتنے دن تک وہ کیا چیز مس کرتا رہا۔

وہ چیز تھی۔۔۔ ان تھک محنت اور اپنے کام میں ڈوب جانا۔

ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ وہ گزرے دنوں کی اداسی بھلا کے اپنے کام میں جت گیا۔ اسٹاف کی کارگزاری کا جائزہ لیا۔۔۔ اپنی کمی سے پیدا ہونے والی چند رکاوٹوں کو دور کیا۔ آنے والے ہفتے کے لیے لائحہ عمل تشکیل دیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے آج وہ معمول سے زیادہ وقت آفس میں گزارے گا۔ لیکن ہوا کیا؟۔۔۔ آج وہ مقررہ وقت سے دو گھنٹے قبل ہی گھر پہ موجود تھا۔

اور یہ سارا کیا دھرا تھا گل مہر کے فون کا۔۔۔ اور اس فون کال میں کیے اس کے انکشاف کا۔

اس کے کڑوے کسیلے طنزیہ لہجے میں تاک تاک کے کیے وار اس کی توانائی نچوڑ گئے تھے اب وہ اپنے اندر کسی بھی کام کے ڈھنگ سے کرنے کی ہمت پا رہا تھا نہ اہلیت۔

اگرچہ اس نے گل مہر کے چچا زاد عمیص کو جواباً "چار پانچ" کھری سنائی تھیں۔ لیکن بھڑاس نہ نکل سکی۔ بہرحال دوسری پارٹی کا پلڑہ بھاری تھا۔

ان کا محض یہ الزام ہی اس کی نظریں جھکانے کو کافی تھا۔

"تمہاری بازاری کزن ہمارے شادی شدہ بہنوئی کو پھانس کر ہماری بہن کا گھر تباہ کر رہی ہے۔"

اگرچہ وہ اس "شادی شدہ" بہنوئی کی اصلیت بڑی حد تک اس کے سالے پہ کھول چکا تھا لیکن دعا کے حوالے سے دل میں کھٹک پیدا ہو گئی تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ دعا، اس شخص کے شادی شدہ ہونے سے انجان ہو جبکہ پھوپھا نے بتایا تھا کہ بابر مغل سراسر اس کی بیٹی کی ذاتی پسند ہے۔۔۔ ایسی بدذوق تو نہ تھیں تم دوائی۔۔۔ یہ کیا پسند کر بیٹھیں۔۔۔ سراسر گھاٹے کا سودا۔"

اس نے محسوس تک نہ کیا کہ بے ساختگی میں اسے سوچتے ہوئے وہ بڑے عرصے بعد دعا کو دوائی کہہ گیا تھا۔ وہ تو بس اپنے دل کی کھولن اس پہ کھولنے کو بے تاب تھا۔

"اتنی جلدی آ گیا پتر؟"

بالو اپنے دھیان میں کمرے سے ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے نکل رہی تھی کہ اسے سامنے داخل ہوتا دیکھ کے گڑبڑا کے کہہ اٹھی۔ پھر شاید اسے اچانک کسی بدشگونی کا احساس ہوا تو دل ہی دل میں خود کو سرزنش کرتی چہرے پہ مسکراہٹ لا کے کہنے لگی۔

"بسم اللہ۔۔۔ بسم اللہ خیر سے جلدی آ گیا میرا شہزادہ۔"

"دعا کہاں ہے؟"

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا جیسے وہ کہیں چھپی بیٹھی ہو اور ڈھونڈ نکالنے پہ وہ اسے پکڑ ہی لینے والا ہو۔

"چائے پینی ہے؟ میں آپ بناتی ہوں۔ کتنے دنوں سے چولہے کے قریب نہیں پھٹکی، میں تو بس۔۔۔"

"وہ ہے کہاں؟"

شہزاد نے کھردرے لہجے میں اس کی بات کاٹ کر اپنا سوال دوہرایا۔

اس کے اکھڑ لہجے میں بالو کھٹک گئی۔

کرم الٰہی کی وفات کے بعد اس نے اپنے بیٹے میں جو تبدیلیاں محسوس کی تھیں ان میں سے ایک اس کے لہجے کا نرم ہو جانا بھی تھا۔ دوسری بڑی اور اہم تبدیلی یہ تھی کہ اب وہ بات بات پہ بھڑک نہیں جاتا تھا۔ لیکن آج وہ وہی پرانا شہزاد لگ رہا تھا۔ اپنے سامنے کسی کی نہ سننے والا۔

بالو محتاط ہو گئی۔

"وہ تو چلی گئی۔"

"کہاں؟"

"اپنے گھر اور کدھر؟"

"صبح تو ایسا کوئی ذکر نہیں ہوا۔"

اس کے ماتھے پہ لاتعداد شکنیں پھیل گئیں۔

"بس اچانک ہی چلی گئی۔ وہ اللہ وسائے نے بیچاری کو تنگ کر مارا تھا۔ پرسوں سے پیچھے پڑا تھا کہ گھر واپس چل۔ ہونہہ..... شوہدے کا نشہ ٹوٹ رہا ہو گا اب گھر ٹن ہوا پڑا ہو گا۔ دوئی کا تو دل ادھر ہی اٹکا تھا۔ وہ کب جانے والی تھی۔ پھر میں نے ہی کہا 'جا چلی جا..... دو تین دن بعد پھر آ جانا اور پھر پتر..... ہک ہا....."

اس نے اپنے مرحوم شوہر کرم الٰہی کے مخصوص انداز میں ہوکا بھرا۔

"ہمارا کسی پہ کیا زور یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ہونے سے میرے دل کو بڑا حوصلہ تھا لیکن پرائی دھی پہ کیسا زور؟ ..... اور دھیاں تو اپنی ہوں تب بھی ان پہ کوئی زور نہیں ہوتا یہ تو چیز ہی پرائی ہوتی ہے۔"

وہ فلسفیانہ انداز میں سرہلاتی کچن تک مڑ گئی۔ شاید شہزاد ملک کے لیے چائے بنانے..... یہ سوچتے ہوئے کہ وہ دعا کے بارے میں پوچھ رہا ہے تو ضرور چائے کی ہی طلب ہو رہی ہو گی۔

جس کی ذہنی پرواز بس یہیں تک محدود ہو اس سے اتنا اہم اور پیچیدہ معاملہ کیا زیر بحث لایا جاتا۔ سو یہی سوچ کے شہزاد نے ماں سے یہ ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ اسے دعا کے اچانک چلے جانے پہ رہ رہ کے افسوس اور غصہ محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ہر حال میں اس سے کھل کے بات کر کے یہ معاملہ کلیئر کرنا چاہتا تھا۔

اگر دعا ہر بات سے بے خبر اور انجان ہے تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔

اور اگر وہ بات سے باخبر ہے اور سب کچھ جانتے بوجھتے یہ کر رہی ہے تو یہ بات خود شہزاد ملک کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ اس کے نام کو دعا کی وجہ سے بٹا لگ جائے..... کوئی اس پہ انگلی اٹھائے یہ اسے نامنظور تھا۔

دونوں صورتوں میں اصل مسئلہ واضح ہونا ضروری تھا۔ اور شہزاد ملک کو یہ سوچ سوچ کے کوفت ہو رہی تھی کہ اب اسے یہ بات کرنے کے لیے اس کے گھر تک جانا پڑے گا۔

"یہ لے پتر چائے۔"

بلقیس نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھا اور خود ہانپتے ہوئے سامنے بیٹھ گئی۔

"ملازم کہاں مر گئے تھے؟ کیا ضرورت تھی خود چائے بنانے کی۔"

اس نے ہنوز اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا لیکن ممتا کی ماری بالو نے اس میں بھی اپنے لیے خوش کن مفہوم تراش لیے۔

"ہائے ہائے تو اپنے پتر کے لیے اک پیالی چاء بناتے کیا میں گھس جاتی؟ نہ میرے شہزادے تو ماں کی اتنی فکر نہ کیا کر اور فیر میرا اب تیرے سوا اور رہا ہی کون ہے۔ اک تھاں (جگہ) بیٹھے بیٹھے تو میں جڑ جاؤں گی کچھ تو ہلنے جلنے دے پتہ چلے کہ میں بھی زندہ ہوں۔ زندگی تو نام ہی ہلنے جلنے کا ہے۔"

وہ آج خاصے معقول قول نشر کرنے کے موڈ میں تھی جبکہ شہزاد کا ذہن مسلسل ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔

"دعا سے بات کرنے سے پہلے مجھے اپنے طور پہ ایک بار پھر اس فراڈ شخص کے بارے میں تفصیلات اکٹھا کرنی چاہئیں۔ اف..... یہ چائے ہے یا۔"

اپنے دھیان میں سوچتے سوچتے اس نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور اس کی حد سے زیادہ مٹھاس محسوس کر کے ناگوار انداز میں کپ واپس رکھ دیا۔

وہ شاید ان ہاتھوں کے موزوں ذائقے کا عادی ہو چلا تھا۔

"کیا بکواس ہے؟"

اس نے اپنے اس خیال پہ با آواز بلند لعنت بھیجی یہ خیال ہی اس کی خود سرانا پہ کاری ضرب کی مانند تھا کہ وہ اس عام سے وجود کا عادی ہو چلا ہے جسے کئی سال پیشتر اس نے بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔

"میں؟ میں نے کیا بکواس کی؟"

بالو باقاعدہ برا مان گئی۔

"میں کوئی اور بات سوچ رہا تھا۔"

وہ خفیف سا ہو گیا۔

"یہی سوچ رہے ہو گے کہ دوئی کیسے چلی گئی۔ میں نے بتایا ہے ناں پتر اس کا پیو جان کھا رہا تھا کہ....."

"میں نے کب کہا کہ میں دعا کے جانے نہ جانے کی وجوہات پہ سر کھپا رہا ہوں۔"

وہ بھپر کے اٹھا۔

"میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔ اتنا فضول وقت نہیں ہے میرے پاس جو فضول لوگوں کے بارے میں سوچوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اور بالو حیرت اور تاسف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیر تک اسی جانب تکتی رہی۔

☼ ☼ ☼

بہت ہی جھنجھلائے ہوئے انداز میں اس نے اندر آتے ہی چادر اتاری تھی اور اب دونوں پیروں کو آپس میں رگڑ کر سینڈلیں اتارتے ہوئے وہ کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔

موتیا نے گل مہر کے ان تیوروں کو جانچتی نظروں سے دیکھا اور بالآخر خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکی۔

"یہ تمہیں کیا ہوا؟"

"اپنے منگیتر سے پوچھو۔"

اس نے تڑخ کے جواب دیا اور ایک ہاتھ میں اپنی سینڈل اٹھاتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے چادر اور شولڈر بیگ سمیٹتے ہوئے تنتناتے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

"اپنے منگیتر سے پوچھو۔"

اس کے خطرناک تیوروں اور جلے بھنے لہجے سے قطعاً "الگ اس کے چار الفاظ پہ مشتمل اس فقرے نے موتیا پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔

"تو گل مہر بی بی آخر تم نے عمیص کو میرے حوالے سے اس نئے تعلق کے ساتھ قبول کر ہی لیا۔"

وہ آپ ہی آپ مسکرا دی اور یہ بھی بھول گئی کہ اسے تو گل سے اس کے خراب موڈ کی وجہ دریافت کرنا تھی۔

جبکہ اس کے سامنے وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ شہزاد ملک کی "خبر لینے" نکلی تھی۔

اتنے میں عمیص بھی گھر میں داخل ہوا۔

اس کے چہرے پہ گل مہر سے کہیں بڑھ کے داستانیں رقم تھیں۔

وہاں تو صرف جھنجھلاہٹ دبا دبا طیش تھا۔

جبکہ عمیص سرتاپا مضمحل اور ملول لگ رہا تھا۔

"اب اگر میں تم سے یہ پوچھوں کہ تمہیں کیا ہوا تو کیا تم بھی کہو گے کہ میں اپنی بہن سے سوال کروں؟"

اس نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر دونوں مٹھیوں میں اپنے بال بھرتے ہوئے سر جھکا کے نڈھال سا بیٹھ گیا۔

اس کی یہ حرکت خاص طور پہ اس کی خاموشی اس کے اندرونی اضطراب کی مظہر تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ کوئی بڑی بات ہے جس نے عمیص علی خان جیسے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کو چپ سادھنے پہ مجبور کر دیا ہے اور

وہ وجہ صاحبزادی گل مہر تو ہرگز نہیں ہو سکتی کہ عرصہ دراز سے وہ اس کی بڑی سے بڑی بات ہنس کے پی جانے کا عادی تھا۔ اب اگرچہ اس کے دل میں گل مہر کے لیے موجود جذبات کی نوعیت بدل چکی تھی مگر وہ اس کی ہر زیادتی سہہ جانے کا عادی ہو چکا تھا۔

اس لیے موتیا نے اس امکان کو تو فوراً رد کر دیا کہ وہ گل کی وجہ سے اتنا متفکر ہے۔

"کیا ہوا عمیص؟ اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں بھی تفکر امنڈ آیا۔

عمیص نے نظریں اٹھا کے اس کے محبت سے معمور اور ریا سے پاک چہرے کو دیکھا اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

موتیا کو زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھوں سے خوف محسوس ہوا۔

"عمیص!"

سراسراتے لہجے میں اس کے لب فقط اتنا کہہ کر پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

"ایک گلاس پانی لانا موتیا؟ ــــ بہت یخ۔ جس حد تک ممکن ہو سکے" عمیص نے اپنا لہجہ معتدل رکھنے کی کوشش کی۔

وہ بھاگ کے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لائی۔ بدلتے موسم کی وجہ سے چونکہ فریج کا سسٹم سلو کر دیا گیا تھا اس لیے پانی اتنا ٹھنڈا نہیں تھا جتنا عمیص نے طلب کیا تھا۔ وہ گلاس میں برف کے ٹکڑے بھی ڈال کے لے آئی۔

"کیا گل مہر سے پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"

وہ پانی پی چکا تو موتیا نے لہجے کو سرسری سا بناتے ہوئے پوچھا۔ اگرچہ سب کچھ جان لینے کی بے تابی اس کے ہر انداز سے ہویدا تھی۔

"جھگڑا؟ ــــ جھگڑا کرنے کی ہماری اوقات کہاں؟" وہ تلخ سی ہنسی ہنس دیا۔

ایسی ہنسی جس کا ساتھ اس کی سرخ ہوتی آنکھیں رتی برابر بھی نہ دے سکیں۔

"کیا مطلب؟"

"پتہ ہے موتیا، آج مجھے میری اوقات پتہ چل گئی اور یہ اوقات یاد دلائی ایک ایسے شخص نے جسے ہم سب نے اس کی اوقات میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"آج مجھے چچا حضور کے جذبات سمجھ آئے۔"

وہ اس کی الجھن سے بے نیاز گلاس میں پگھلتے برف کے ٹکڑوں پہ نظر جمائے کہتا رہا۔

"آج پتہ چلا کہ عزت مجروح ہونے کے محض خیال سے ہی وہ کیپکیا کیوں اٹھتے ہیں۔ آج احساس ہوا کہ وہ اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کے بارے میں اتنے حساس کیوں ہیں کہ کسی کی معمولی سی لغزش بھی ان کے خاندان کے نام پہ بٹا نہ لگا دے۔ آج صحیح معنوں میں میں ان کے جذبات سمجھ پایا ہوں۔ کیونکہ آج میں بھی اسی کیفیت سے گزرا ہوں۔ اگرچہ عزت اور خودداری کو ناپنے کے میرے اور چچا حضور کے پیمانے جدا جدا ہیں لیکن بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں ــــ"

"گھما پھرا کے داستانیں کیوں سنا رہے ہو؟" گل مہر اپنے کمرے سے نکل آئی۔

وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔ اب گھر میں عام پہننے والے پرنٹڈ لینن کے سوٹ، میرون سویٹر اور ہم رنگ گرم شال میں ملبوس تھی۔ تازہ تازہ دھلے، بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ خاص تر و تازہ بھی لگ رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے والی اس کی بیزاری اور جھنجلاہٹ کے اثرات قدرے کم تھے۔

"سیدھی طرح سے بتاؤ ناں کہ اپنے بہنوئی کے کارنامے سن کے آ رہے ہو۔"

وہ چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔

"اب کون سے نئے کارنامے؟"

موتیا حیران بھی ہوئی اور کچھ کچھ خوفزدہ بھی ابھی تک تو اسے کل والا انکشاف ہی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"بولو ناں، بتاتے کیوں نہیں اسے؟"

"کیا بتاؤں؟"

وہ سرد نگاہوں سے گل کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیا یہ کہ تمہاری وجہ سے آج مجھے کسی کی ٹکے ٹکے کی باتیں سننا پڑیں۔"

"ہماری وجہ سے؟"

گل نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اب یہ الزام بھی ہمارے سر؟"

اس نے جتاتی نظروں سے موتیا کی جانب دیکھا جو لاعلمی سے شانے اچکا کے رہ گئی۔

"یہ تمہاری ہی ضد تھی کہ تم شہزاد ملک کو کھری کھری سنانا چاہتی تھیں جب کہ میں نے منع بھی کیا تھا کہ جب تک یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ بھی براہ راست اس معاملے میں ملوث ہے، اسے مت چھیڑو۔ لیکن تمہارے سر پہ تو بھوت سوار تھا اس سے الجھنے کا۔ اصل میں تمہارے اندر کی کھسیاہٹ تمہیں چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ نوچنے کے لیے تمہیں ایک کھمبا درکار تھا اور آپا حضور والے معاملے نے تمہیں شہزاد ملک پر برسنے کا جواز فراہم کر دیا۔"

موتیا نے بے یقینی سے عمیص کو دیکھا ــــ کیا یہ وہی ہے جو گل کو آئینہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"لیکن تمہارے بہنوئی صاحب کے کارناموں میں تو ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ اگر تمہیں کچھ سننا پڑا ہے تو ان کی وجہ سے، جاؤ جا کے انہیں الزام دو۔ اپنی بے عزتی کا حساب طلب کرو۔ ہم پہ کیوں بگڑ رہے ہو۔ ہم نے تو تمہاری مدد کرنا چاہی تھی۔"

"مدد ــــ؟" وہ پھنکارا۔

"کیسی مدد گل؟ تم نے زندگی میں کبھی کسی کی مدد کی ہے! سوائے اپنی اس نام نہاد انا کی۔ اسی کی تسکین کی خاطر تم شہزاد ملک سے بات کرنے کو بے تاب تھیں۔ تمہیں یاسمین آپا کا درد نہیں تھا نہ ہی ان سے ہمدردی ــــ تم صرف کسی بہانے اپنے دل کا غبار اس پہ نکالنا چاہتی تھیں۔ جواباً اس نے اپنا غبار مجھ پہ نکالا۔ جبکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر کیوں مجھے بری بھلی سننا پڑی۔"

"تو کس نے کہا تھا ہمارے ہاتھ سے ریسیور چھیننے کو؟"

وہ تنک کر بولی۔

"ہم بات کر رہے تھے ناں۔ کیا ضرورت تھی تمہیں بیچ میں پڑنے کی۔ اگر قصور ہمارا ہے تو پھر ہم ہی سن لیتے اس کی بکواس تمہارے بہنوئی کے کارنامے تھے اگر تم نے سن بھی لیے تو کیا قیامت آن پڑی۔ ان سے جا کر نہیں پوچھتے کہ ایسے کرتوت دکھاتے ہوئے انہیں شرم کیوں نہ آئی۔ الٹا ہمارے گلے پڑ رہے ہو۔"

"ہوا کیا ہے؟ کوئی مجھے کچھ بتائے گا بھی یا نہیں؟"

ان کی بے مقصد اور بے سروپا تکرار سے اکتا کر موتیا نے دخل دیا۔ وہ اس نوک جھونک سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر پا رہی تھی۔

"ہونا کیا ہے۔ یہ موصوف من من کرتے ہوئے اس بے غیرت شخص کو اس کی کزن کے اعلیٰ اوصاف و خصائل سے روشناس کرا رہے تھے کہ اس نے نہ صرف اس معاملے سے لاتعلقی کا اظہار کیا بلکہ الٹا بابر بھائی کے ایسے ایسے کرتوت ہمیں بتائے کہ حیرت ہوتی ہے کوئی انسان اس حد تک دیدہ دلیر اور مجرمانہ ذہنیت کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں موتیا ۔۔۔ میرے لیے تو یہ ذہنی دھچکا ہی کم نہیں تھا کہ وہ اپنی باوفا بیوی کی پندرہ سالہ رفاقت اور جوان ہوتے بچوں کو فراموش کر کے ایک نئے چکر میں پڑ چکے ہیں۔ دوسری شادی کر کے ملک چھوڑنا چاہتے ہیں اور یہ دوسری بات جو شہزاد ملک نے بتائی ۔۔۔ کہ وہ اس کی اصلیت سے پہلے سے ہی واقف تھے اور اس بلیک میل بھی ہوتے رہے۔"

صاحبزادی حرمت النساء کو ابھی ابھی اونگھ آئی تھی کہ **عمیص** اور گل مہر کی تکرار کی ہلکی ہلکی آوازیں ان تک پہنچیں۔

وہ ناگواری سے اٹھ بیٹھیں۔

"نجانے صاحبزادی گل مہر کو کب عقل آئے گی۔ دوبدو جھگڑنے بیٹھ جاتی ہیں **عمیص** میاں سے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے پیروں میں چپل اڑسنے لگیں۔

"کتنا سمجھاتے ہیں ہم کہ اپنی زبان درازی پہ قابو پائیں اور پھر **عمیص** میاں اب محض ان کے چچازاد ہی نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے اور قابل احترام رشتے میں بندھ چکے ہیں۔ اب احتیاط لازم ہے۔ وہ تو شکر کیجئے کہ **عمیص** میاں ہی بھلے مانس اور سادہ طبیعت کے ہیں' دل پہ نہیں لیتے ورنہ ہماری صاحبزادی تو اپنی زبان سے مدمقابل کے چھکے چھڑوانے میں کوئی کسر نہیں باقی رکھتیں۔"

انہوں نے خاصے جارحانہ انداز میں برآمدے کا رخ کیا جہاں سے اس تو تو میں میں کی بھنک سنائی دے رہی تھی۔ ان کا ارادہ تھا آج سختی سے گل کو **عمیص** سے الجھنے سے منع کریں گی لیکن طویل راہداری کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے **عمیص** کے کچھ ایسے الفاظ ان کی سماعتوں تک آ پہنچے کہ ان کے تیزی سے اٹھتے قدم پتھر کے ہو گئے۔

"ایک نئے چکر میں پڑ چکے ہیں۔"

"دوسری شادی کر کے ملک چھوڑنا ۔۔۔"

"اسے بلیک میل ۔۔۔"

ایک ایک فقرہ ان کے حواسوں پہ بجلی کی مانند گرا وہ وہیں رکی رہیں اور تینوں کے چہروں سے اندازہ کرنا چاہا کہ کہیں وہ یہ سب مذاق میں تو نہیں کہہ رہے۔

لیکن تینوں کے چہروں کے تاثرات گمبھیر سنجیدگی کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔

گل مہر کے چہرے پہ غصے کی تپش تھی۔

عمیص کے چہرے پہ غصے کے ساتھ ساتھ ملال اور دکھ کے گہرے سائے تھے۔

جبکہ موتیا کے چہرے پہ بے یقینی اور حیرت کے کچھ کچھ وہی تاثرات تھے جن میں وہ گھری ہوئی تھیں۔

راہداری میں اندھیرا تھا اس لیے ان تینوں کو صاحبزادی حرمت النساء کی آمد کا اندازہ نہ ہو سکا۔

"بلیک میل کرتے رہے؟"

موتیا نے بے یقینی سے دہرایا۔

"ہاں اور ایسا کرتے ہوئے انہوں نے گل مہر سے اپنے رشتے کا بھی لحاظ نہ کیا۔ وہ نہ صرف مزے لے لے کر تماشا دیکھ رہے تھے چچا حضور کے رسوا ہونے کا' بلکہ اس سے فائدہ بھی کما رہے تھے۔ یہ تو عین وقت پہ چچا حضور کی یادداشت کام کر گئی ورنہ اگر سب کچھ ہو جانے کے بعد اصلیت کھلتی تو انہیں سو گنا زیادہ صدمہ ہوتا۔ لیکن بابر بھائی صاحب نے اس نہج پہ سوچنا گوارا نہ کیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ان کے اپنے خاندان کے ساتھ برا ہونے جا رہا ہے ۔۔۔ لیکن شاید انہوں نے کبھی ہم لوگوں کو اپنا سمجھا ہی نہیں۔"

عمیص افسوس سے سر ہلا رہا تھا۔

"جس شخص کو اپنی سگی اولاد کا درد نہیں' کسی غیر کا کیا ہو گا۔"

گل مہر نے تلملا کے کہا۔

"اپنی بیوی کا خیال نہیں تو بیوی کے رشتے داروں کا کیا لحاظ ہو گا۔ ہونہہ ۔۔۔ ناک نیچی کروا دی انہوں نے ہماری' اس شہزاد ملک کے سامنے ۔۔۔ ہم تو اسے الزام دینے گئے تھے کہ اپنی کزن کو قابو میں رکھے جو ہمارے بہنوئی کو پھانس رہی ہے الٹا وہ ہمیں سنانے لگا کہ میری کزن کو تمہارے بلیک میلر اور بے ضمیر بہنوئی نے پھنسایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ موتیا ۔۔۔ اس سارے قصے میں ہمارا کیا قصور نکلتا ہے۔ جو **عمیص** متواتر ہمیں۔"

وہ موتیا کی حمایت حاصل کرنے مڑی اور اسے راہداری میں کسی کا شائبہ گزرا۔ وہ چپ کر گئی اور ذرا غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔

اس کے انداز پہ **عمیص** اور موتیا بھی چونک کر اسی جانب دیکھنے لگے۔

صاحبزادی حرمت النساء چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھ آئیں۔

"امی حضور ۔۔۔!"

موتیا گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

عمیص بھی گل کے چہرے کو دیکھ کے رہ گیا کہ نجانے انہوں نے گفتگو کا کون سا حصہ سنا ہے اور کتنا سنا ہے۔

"امی حضور آپ! ۔۔۔ آپ کہئے کوئی کام تھا؟" گل نے سنبھلنے میں پہل کی اور ان کے موڈ کا اندازہ لگانے کی خاطر انہیں مخاطب کیا۔

"کہئے ۔۔۔ کیا کہہ رہی تھیں آپ؟"

انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ گل کو ان کے سفید پڑتے چہرے سے ہی پتہ چل گیا کہ اب بات چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کچھ تو جان ہی چکی ہیں اور اب بہت کچھ بلکہ سب کچھ جاننا چاہتی ہیں۔

"وہ امی حضور ۔۔۔ بات یہ ہے کہ ۔۔۔"

اس نے محتاط الفاظ میں بتانا شروع کیا۔

☼ ☼ ☼

"معین! آؤ بیٹھو۔"

شہزاد ملک نے لیپ ٹاپ سے سر اٹھا کے نووارد کو ایک نظر دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے سامنے بیٹھنے کو کہا۔

"یس سر!"

وہ ہوشیار شکل کا نوجوان مودب بنا بیٹھ گیا۔

"ایک کام کہا تھا تم سے معین۔"

اس کی انگلیاں اب بھی لیپ ٹاپ سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں اور آنکھیں اسکرین پہ متحرک۔

"جی سر! کام ہو گیا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ کوئی کام کہیں اور بندہ کیے بغیر حاضری لگوانے کی گستاخی کرے۔"

"گڈ۔"

اس نے اپنا کام روک دیا اور پوری توجہ کے ساتھ اس کی جانب تکنے لگا۔

یہ گویا اسے اپنا بیان نشر کرنے کا حکم نامہ تھا۔

وہ نوجوان تو شکل و صورت اور نشست و برخاست سے ہی "فرمانبردار تابعدار" ٹائپ کا بندہ لگ رہا تھا' غالباً شہزاد ملک کی جنبش ابرو تک سے آشنا تھا۔ اس لیے فوراً "شروع" ہو گیا۔

"یہ شخص بابر ہمایوں مغل' ملک مقبول کا خاص بندہ ہے۔ اسی ملک مقبول کا جو بدنام زمانہ پر موٹر ہے۔"

اس نے آغاز میں ہی شہزاد کو اچھا خاصا چونکا دیا۔

"خیر بدنامی میں تو یہ موصوف خود بھی کچھ کم نہیں۔ اگرچہ اچھے خاندان سے تعلق ہے۔ نواب ابن نواب ہیں۔

ان کے والد اپنے وقتوں میں لاہور کے چند معززین میں شمار ہوتے تھے لیکن عرصہ پہلے ان کی وفات کے بعد اس شخص نے کمال سرعت کے ساتھ اپنے خاندان کا نام اور مال ڈبویا ہے۔ قمار بازی اور شراب نوشی کی لت کی وجہ سے ساری کی ساری جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھا حتیٰ کہ اپنی آبائی حویلی سے بھی یہ حویلی اب دلی دروازے کے قریب واقع ایک مشہور "کنٹری" کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جس کے کسی ایک کمرے میں یہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اب بھی رہتا ہے۔" وہ سانس لینے رکا۔

"اس کی بیوی کا تعلق بھی ایک شریف اور معزز گھرانے سے ہے۔ بیوی بچے بے شک کسمپرسی کی حالت میں رہتے ہیں لیکن ملک مقبول کی وجہ سے اس کے خاصے عیش ہیں۔ بندہ چرب زبان اور کسی حد تک خوشامدی ہے اس لیے پارٹیاں گھیر گھار لاتا ہے۔ اس کے بارے میں تازہ ترین چونکا دینے والی خبر یہ ہے کہ یہ دوسری شادی کر رہا ہے۔"

وہ بیان کے اس حصے تک پہنچا تو شہزاد سنبھل کے بیٹھ گیا۔ اس کی ساری دلچسپی تو یہاں تھی۔

"اور وہ بھی ایک اسٹیج آرٹسٹ ادا سے۔"

ایسا کہتے ہوئے معین نامی اس نوجوان نے ٹٹولتی نظروں سے شہزاد کو دیکھا۔ ادا۔۔۔ یعنی دعا سے اس کا تعلق اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہا تھا۔ کرم الٰہی کی وفات پہ پریس کوریج کی وجہ سے یہ بات میڈیا تک پہنچ چکی تھی۔

شہزاد نے اس کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور ہاتھ سے اسے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس شادی کی سرپرستی ملک مقبول جیسا بندہ کر رہا ہے۔"

یہاں وہ پھر رکا۔۔۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر بار وہ ایک بات کہہ دینے کے بعد شہزاد کے تاثرات جانچ رہا ہو۔

"سوچنے والی بات ہے کہ ملک مقبول کا اس شادی سے کیا مفاد وابستہ ہو سکتا ہے۔ بابر اس کا خاص بندہ ضرور ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ صرف اس کی خوشی کی خاطر وہ ان دونوں کی شادی کروا کے انہیں دبئی سیٹل کروا رہا ہو۔"

"تمہارا کام سوچنا نہیں ہے معین۔"

شہزاد نے سرد لہجے میں اسے اس کی حدود یاد دلائیں۔

"سوری سر۔۔۔"

وہ سنبھل گیا۔

"اور کوئی خاص بات؟"

"سر وہ خاص بات بابر کے بارے میں نہیں بلکہ ادا کے بارے میں ہے۔ جس سے عنقریب وہ شادی کرنے والا ہے۔"

"کہو!" اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی۔

"سنا ہے ملک مقبول نے جب انہیں بیرون ملک شو کرنے کی آفر کی تھی تو وہ تیار نہیں ہوئی تھیں۔ صاف انکار کر دیا تھا۔"

شہزاد کو یاد آیا کہ اللہ وسایا ایک بار اس سے یہ ذکر کر رہا تھا اور ملک مقبول کی خراب شہرت کے پیش نظر اس نے صاف صاف منع کر دیا تھا کہ وہ ہرگز دعا کو اس قسم کا کوئی کانٹریکٹ سائن نہ کرنے دے۔

اسی واقعے کے بعد اچانک بابر ہمایوں مغل منظر عام پہ آیا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے ادا سے جان پہچان اس حد تک بڑھالی کہ وہ اس کے تقریباً" تقریباً" قلاش ہونے اور پہلے سے شادی شدہ ہونے کے باوجود شادی کرنے کو تیار ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ بابر کو نہ صرف ملک مقبول کی معاونت حاصل ہے بلکہ اس کی طرف سے شادی کے فوراً" بعد دونوں کا دبئی منتقل ہونے کا بھی پروگرام سیٹ ہے اور دبئی وہی مقام ہے جہاں ملک مقبول کی مشکوک

سرگرمیاں عروج پہ ہوتی ہیں۔"

"ہوں۔۔۔" اس نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

معین جس جانب اشارہ کر رہا تھا شہزاد کا ذہن بھی وہاں تک رسائی پا گیا۔ واقعی یہ نکتہ غور طلب تھا۔

"ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد شہزاد نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور دھوئیں کے مرغولوں پہ نظر جمائے ہوئے دعا کے بارے میں سوچنے لگا۔

"یہ تو صاف واضح ہے کہ ملک مقبول ہر حال میں تمہیں پھانسنا چاہتا ہے۔ اپنے مذموم کاروبار میں شامل کرنے کے لیے سیدھے طریقے سے تم قابو نہیں آئیں تو اس نے بابر جیسا بندہ بطور چارے کے استعمال کیا۔۔۔ دکھ اور حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ تم اتنی گدھی نکلیں کہ یہ چارہ کھانے پہ تیار ہو گئیں۔۔۔ خیر یہ تو طے ہے کہ میں تمہیں برباد نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے اپنے باپ سے وعدہ کیا تھا دعا تمہیں تو بچانا ہی ہے اور ساتھ میں اس نوسرباز سے بھی پرانا حساب کتاب پورا ہو جائے گا۔"

☼ ☼ ☼

صاحبزادہ نفیس علی خان آج ایک بار پھر اس ہسپتال کی بلند اور وسیع بلڈنگ کے سامنے کھڑے تھے ان کے عصا پہ ان کی گرفت غیر معمولی حد تک سخت تھی۔

وہ بے تاثر نگاہوں کے ساتھ دیر تک ہسپتال کی عمارت کو تکتے رہے۔

یہ وہی ہسپتال تھا جہاں چند روز قبل ان کا سامنا اس لڑکی سے ہوا تھا جو صاحبزادی فرحت النساء سے حد درجہ مشابہ تھی۔ وہ قدرت کے اس عجیب و غریب اور حیران کن اتفاق پہ ابھی غور ہی کر رہے تھے کہ وہ اخبار ان کے سامنے آ گیا۔

اس اخبار پہ بھی اسی لڑکی کی تصویر تھی۔

مگر اکیلے نہیں بلکہ اس شہزاد ملک کے ہمراہ۔۔۔ جس کی وجہ سے ان کے گھر قیامت آتے آتے رہ گئی۔

یہ دوسرا اتفاق زیادہ تکلیف دہ تھا۔

وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس پاکیزہ صورت اور بھلے اطوار والی بچی کا کوئی تعلق ایسے گھرانے سے بھی نکل سکتا ہے۔ ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ اخبار میں چھپی اس تصویر میں سے اس کے ساتھ کھڑے شہزاد ملک کو نکال باہر کریں۔

آج وہ نجانے کس آس پہ دوبارہ یہاں موجود تھے۔ جبکہ اب جان چکے تھے کہ اس روز اس کی ہسپتال آمد کا مقصد اس کا ماموں کرم الٰہی تھا جو اب دنیا میں نہیں رہا۔ پھر وہ اس تلاشتے۔۔۔ اسے ایک بار پھر دیکھنے کی آس لیے یہاں کیوں چلے آئے۔۔۔ یہ بات سمجھنے سے وہ خود بھی قاصر تھے۔

"تو کیا کریں ہم؟۔۔۔ کہاں جائیں ان سے ملنے۔۔۔؟ لیکن ہم ملنا ہی کیوں چاہتے ہیں؟ کیا رشتہ ہے ہمارا ان سے؟۔۔۔ ہاں ہو جاتی ہے کبھی کبھار ایسی مشابہت۔"

انہوں نے طفل تسلی کے ذریعے خود کو بہلانا چاہا مگر آنکھیں جو منظر دیکھ چکی تھیں، ذہن اسے ان بودی دلیلوں کے سہارے جھٹلا نہیں پا رہا تھا۔

وہ صرف مشابہت نہیں تھی وہ تو ہو بہو عکس تھا۔

نہ صرف شکل و صورت کا۔

نہ صرف آواز کا۔۔۔

بلکہ تاثر کا بھی۔۔۔ سرتاپا شخصیت کا عکس۔

☼ ☼ ☼

جانے کہاں گئے وہ دن
کہتے تھے تیری راہوں میں
پلکوں کو ہم بچھائیں گے

بابر ہمایوں مغل نے بڑے سوز کے ساتھ صدا بلند کی

"چاہے کہیں بھی تم رہو......"

اس کے ساتھ ہی اسے کھانسی کا زبردست دورہ پڑا۔ پچھلے دو روز سے وہ بیمار تھا۔ نئے نئے بدلتے موسم کا شکار ہوا تھا۔ نزلہ...... زکام گلا خراب۔ اس پہ مصیبت یہ کہ اپنے گھر پہ رہنا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے ایک جگری دوست کے ڈیرے پہ پڑاؤ تھا۔

گھر جانے سے جھجکنے کی وجہ تھا' ماکھا گجر اس کا خوف اسے فرار پہ مجبور کر رہا تھا۔ اس دن ماکھے گجر نے بڑے خراب تیوروں کے ساتھ دھمکی دی تھی کہ کل تک اس کے پیسے واپس نہیں کیے تو کمرہ خالی کرنا پڑے گا۔ اسی لیے اس نے جہاں جہاں مدد ملنے کی امید ہو سکتی تھی' وہاں ہاتھ پھیلایا مگر کوئی کام نہ آیا۔ اب یہی ایک راستہ بچا تھا کہ جب تک رقم کا انتظام نہ ہو جائے' وہ گھر ہی نہ جائے۔ ماکھا گجر سے اتنی توقع تو تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اکیلی عورت اور بچوں کو نکالنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

یہاں سردی نے آن لیا۔ اب پچھلے دو روز سے بیمار پڑا اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ کبھی بیوی کی تیمارداری یاد آتی' کبھی دلکش کے ہاتھ کی چائے یاد آتی اور کبھی ذہن دعا کی جانب چلا جاتا۔

"ارے اور کچھ نہیں تو ان حسین ہاتھوں کی مسیحائی ہی نصیب ہو جاتی۔"

اس نے آہ بھری تھی۔

اس کے ساتھ ہی اسے ملک مقبول کی وہ گفتگو بھی یاد آگئی جس نے اس کا دل اتنا مکدر کیا کہ وہ دوبارہ وہاں کا رخ ہی نہ کر پایا حالانکہ دو تین بار ڈھیٹ بن کے مانگنے جاتا تو شاید رقم مل ہی جاتی۔ لیکن ہر بار جانے کا سوچتے ہوئے اسے وہ ساری باتیں نئے سرے سے یاد آجاتیں اور وہ گھبرا اٹھتا۔

"دماں دفع کرو...... مردود نجانے کن چکروں میں ڈال رہا ہے' ہمیں۔"

ایسا نہیں تھا کہ وہ بہت سیدھا سادا تھا' اس لیے ملک مقبول کے منصوبے اس کے لیے ناقابل عمل تھے اور نہ ہی وہ ایسا شریف النفس تھا جو یہ پیشکش سن کر بدک اٹھا تھا۔

ایسے کتنے ہی سودے وہ ان ہاتھوں سے کرا کے موٹا کمیشن وصول کر چکا تھا۔ جوئے کے معاملے میں تو بے چارے کی قسمت ہی اندھی کانی تھی' زندگی میں گنتی کے دو چار داؤ ہی جیت پایا ہو گا ورنہ زیادہ تر ہار ہی ہار نصیب میں لکھی تھی۔ اسی وجہ سے سب کچھ لٹا کے خالی ہاتھ ہو چکا تھا۔ اب تو گزر اوقات انہی ہیرا پھیری کے چھوٹے موٹے کاموں اور ملک مقبول کے گاہکوں کے لیے چھانٹی کا مال سپلائی کرنے پہ تھا۔

پھر بھی دعا کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں پیروں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

"پتہ ہے مغل صاحب' جب آپ بار بار اس بات پہ شکریہ ادا کرتے ہیں کہ میں نے آپ کا ساتھ قبول کیا تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ ایسا کر کے میں نے آپ کو نہیں' خود اپنے آپ کو عزت دینے کی کوشش کی ہے آپ کہتے ہیں کہ آپ مجھے وہ سب آسائشات نہیں دے پائیں گے جن کی میں حقدار ہوں اور میں کہتی ہوں مجھے صرف آپ کے نام اور اس نام کے حوالے سے تھوڑی سی عزت چاہیے...... میں اس کی حقدار تو ہوں ناں؟"

اپنی جگ مگ کرتی آنکھوں میں بڑی آس لے کر اس نے ایک بار یہ سوال بابر سے کیا تھا اور آج یہ سوال ایک بازگشت بن کے اس کے چاروں اور پھیلا ہوا تھا۔

"وہ ہم سے عزت کی خواہشمند اور ہم انہیں ذلت دے دیں انہیں نہیں' ہمارا دل لاکھ مردہ اور سیاہ کار ہو...... ادا جی کے ساتھ ایسا کرنے کا حوصلہ ہم نہیں پا رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی اچھی نیت سے ان کی جانب نہیں بڑھے

تھے ہم...... اپنا مفاد ہم نے ہمیشہ سرفہرست رکھا ہے۔ اب بھی یہی بات ہے۔ ان سے راہ و رسم بڑھانے کا باقاعدہ معاوضہ وصولا ہے ملک مقبول سے...... ان سے شادی کا ارادہ بھی اپنا مفاد مد نظر رکھتے ہوئے کیا ہے لیکن یہ سب نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"

اس نے یہ عزم ہو' جاہا...... مگر یہ عزم اتنا طاقتور نہیں تھا۔

ملک مقبول کی ترغیب...... بار بار سامنے آ کے اس کے ایمان کو لڑکھڑانے پہ مجبور کر دیتیں جو پہلے ہی ثابت قدم نہیں تھا۔

اس نے دعا کے گھر کا نمبر ملایا۔

موبائل پہ وہ جان بوجھ کے کانٹیکٹ نہیں کر رہا تھا کہ اگر وہ شہزاد کے گھر ہوتی تو مبادا جانا ہی نہ پڑ جائے۔

تیسری بیل پہ ہی فون اٹھا لیا گیا تو اس کی جان میں جان آئی۔

"جی ادا بول رہی ہوں۔"

وہ شاید اس کی آواز نہیں پہچان پائی تھی۔ اس لیے قدرے استعجاب کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"آپ کی تعریف؟"

دراصل اس نے گھر کا نمبر بہت کم لوگوں کو دے رکھا تھا خصوصاً" اس شعبے سے وابستہ مردوں کو۔ اس کی چند ایک قریبی دوستوں کے پاس ہی یہ نمبر تھا۔

"کمال ہے ادا جی' ہم اتنی جلد بھلانے والی چیز تو نہیں کہ چند دنوں تک ملاقات نہ ہو پائی تو آپ ہماری آواز تک نہیں پہچان پائیں...... ناچیز آپ کا دیوانہ' آپ کا پرستار اور آپ کا طلبگار' بابر ہمایوں مغل ہے۔"

ایک سو دو ڈگری کے بخار میں بھی اس کی طبیعت کا چونچال پن جوں کا توں تھا۔

"ارے مغل صاحب آپ؟ سوری میں واقعی نہیں پہچان پائی لیکن اس کی وجہ وہ نہیں جو آپ بتا رہے ہیں۔ دراصل آپ کی آواز واقعی بہت بدلی ہوئی ہے۔"

"ہاں بس کیا سنائیں...... یونہی معمولی سا نزلہ زکام ہے اور ہلکا سا بخار' ایک سو دو ڈگری۔"

"اور آپ اسے ہلکا بخار کہہ رہے ہیں؟ کہاں سے بول رہے ہیں گھر سے تو فون کیا نہیں کرتے آپ۔"

"ادا جی ہمارا گھر تو وہ ہو گا جو آپ بسائیں گی ادا جی ابھی تو جس چار دیواری میں وہ عورت ہمارے بچے لے کر حکومت کر رہی ہے' ہمارے لیے وہ زنداں سے کم نہیں۔ دو دن سے ایک مہربان دوست کے ڈیرے پہ ہیں ہم اس عورت کا سامنا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اس کے طعنوں کو سنتے سنتے بیماری کی حالت میں ہم اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتے تھے اس لیے وہاں جانا گوارا نہیں کیا۔"

اس نے ہمدردی حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور اس میں خاصی حد تک کامیاب رہا۔

"اور آپ کہاں غائب تھیں ہم اتنے دن پریشان رہے۔"

"آپ ملیں تو تفصیل سے بتاتی ہوں۔ اس وقت تو مجھے آپ کی فکر ہو رہی ہے۔ آپ ایسا کیجیے میرے گھر آجائیے آپ کے دوست سے زیادہ تو میں آپ کا خیال رکھ لوں گی۔"

"ارے نہیں' رہنے دیجیے' اب آپ کو ابھی سے تکلیف میں کیا ڈالنا۔"

اس نے "ابھی سے" کو بڑے لطیف معنوں میں استعمال کیا مگر دوسری جانب اس بات کا خاص اثر نہ ہوا۔ وہ واقعی متفکر تھی۔

وہ تھی ہی ایسی۔

ذرا ذرا سی محبت سے بہل جانے والی۔

تھوڑی سی توجہ پا کر سب کچھ نچھاور کر ڈالنے والی۔

وہ اگرچہ بابر ہمایوں مغل سے ویسی محبت نہیں کرتی تھی جیسے کہ کسی نوجوان لڑکی کو اپنے خوابوں کے شہزادے

سے ہو سکتی ہے۔ اس کے دل کے اس خانے پہ شہزاد ملک نوعمری سے ہی قبضہ جما کے بیٹھ گیا تھا۔ اب شاید ہی کسی دوسرے کو یہ مقام وہ دے پاتی۔ لیکن بابر اس کی زندگی میں تب شامل ہوا جب ہر جانب سے محبت اور اپنائیت کا فقدان تھا۔

وہ اسے اپنا ہمدرد اور خیر خواہ نظر آتا تھا بلکہ نجات دہندہ بھی۔ وہ اس کی عزت کرتی تھی اور اب منگنی کے بعد اپنائیت بھی محسوس کرنے لگی تھی اس لیے اس جیسی حساس اور بے لوث لڑکی کا پریشان ہو جانا فطری امر تھا۔

"بس میں کچھ نہیں سن رہی۔ آپ ابھی اسی وقت یہاں آجائیے۔" دعا نے اصرار کیا۔

● ● ●

"پگ گھنگھرو باندھ میرا ناچی تھی۔"

عمیص دیوار پہ نصب آئینے میں خود کو دیکھتا بڑے انہماک کے ساتھ شیو بنا رہا تھا۔ جب دلگیر نے اچانک نجانے کس جانب سے نمودار ہو کے اپنے رخ مبارک کی انٹری اس آئینے میں دی بمع اس اطلاع کے۔

"اچھاجی۔"

عمیص جو اپنے جھاگوں جھاگ چہرے کی بجائے اچانک سامنے اس کے پانی سے رنگے ہونٹوں اور کاجل کی دھاروں سے سجے تیکھے نینوں والے چہرے کو دیکھ کے سٹپٹا اٹھا تھا۔ بڑے مشکور و سنجیدہ انداز میں "اچھاجی" کر کے رہ گیا جیسے دلگیر نے یہ راگ نہ الاپا ہو بلکہ کوئی تازہ ترین خبر اسے سنائی ہو۔

دلگیر ابھی تک آئینے کے سامنے نین مٹکا کر تال دے رہا تھا۔

"گاپانی۔۔۔ تپانی۔۔۔ جاپانی۔۔۔ نی نی۔۔۔ نی نی۔۔۔"

عمیص نے صرف ایک منٹ تک صبر کا مظاہرہ کرنے کے بعد اسے دھکیل کے پرے کیا اور دوبارہ سے آئینے میں غرق ہو گیا۔ طویل برآمدے کے اس کونے میں لگے واش بیسن کے اوپر نصب اُس آئینے میں بیک وقت دو عکس سما بھی نہیں سکتے تھے۔

"پگ گھنگھرو باندھ میرا ناچی تھی۔۔۔"

عمیص کے ہلکے سے دھکے کے بعد وہ جان بوجھ کے نیچے جا گرا تھا اور اب وہیں ٹانگیں فرش پہ رگڑ رگڑ کر "امراؤ جان ادا" بنا رقص و گلوکاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"ناچی تھی۔۔۔ ناچی تھی۔۔۔ ناچی تھی۔۔۔ ناچی تھی۔۔۔"

"بابا، مان لیا۔۔۔۔"

عمیص نے بالآخر سیفٹی ریزر سامنے رکھ کے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"مان لیا کہ وہ ناچی تھی۔۔۔ بار بار زور دے کر کیوں کہہ رہے ہو۔ تمہارے ایک بار کہنے پہ ہی میں ایمان لے آیا تھا کہ بی بی پیروں میں گھنگھرو باندھ کے ہی ناچی ہوگی' چمچے چھریاں نہیں اور اسے ناچنے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے۔ ضرور ناچی ہوگی۔ اب تم اس واقعہ کا ڈھنڈورا پیٹنا بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"اور ہم ناچے بن گھنگھرو کے۔"

دلگیر پہ نا عمیص کے بندھے ہاتھوں کا اثر ہوا نا اس کے جڑے ہوئے بیان کا۔ اب وہ اپنے سوکھے سڑے پیروں اور کالے میل سے بھرے ٹخنوں کا دیدار' اپنے ریشمی آتشی گلابی پاجامے کا پائنچہ اوپر سرکا کے کرا رہا تھا۔

ڈھٹائی کے اس عظیم الشان مظاہرے پہ عمیص نے بے بسی کا اظہار کرتے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

وہ جانتا تھا کہ جب بھی دلگیر کو اپنی کوئی بات منوانا ہوتی یا مطالبہ پیش کرنا ہوتا' وہ ایسا ہی ڈھیٹ بن جایا کرتا اور بہانے بہانے سے اسے زچ کیا کرتا تھا۔

• "کیا تکلیف ہے' اب پھوٹو بھی۔"

وہ اپنا کام چھوڑ کے اب مکمل طور پہ اس کی جانب متوجہ تھا۔

"اور ہم ناچیں بن گھنگھرو کے۔"

دلگیر کے ترنم میں اس بار دبی دبی جھنجلاہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ اپنے کمان سے ابرو نچا نچا کے اپنے ٹخنوں کی جانب اس کی توجہ دلا رہا تھا۔

"ہاں کیا چاہیے۔"

عمیص نے بغور ان سوکھے ہوئے میلے پیروں کو دیکھا۔

"رنگ کاٹ لیکوڈ چاہیے' انہیں صاف کرنے کے لیے یا گھوڑے نہلانے والا برش' ان کی میل اتارنے کے لیے؟"

"اف۔۔۔ ایک تو آپ ہماری بات سمجھتے تک نہیں اور دعویٰ ہے دلبری کا۔"

وہ تنک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"قسم لے لو جو میں نے کبھی ایسا دعویٰ کیا ہو۔" وہ گڑبڑا کے کانوں پہ ہاتھ لگانے لگا۔

"اور رہا بات سمجھنے کا سوال تو بات تم نے کی کب ہے۔ ایک ہی راگ الاپے جا رہے ہو۔ بیچاری میرا کے ناچنے کا غم منا رہے ہو۔"

"اس کے ناچنے کا نہیں بلکہ پگ گھنگھرو باندھ کے ناچنے کا۔"

"کیوں بھئی' تمہارے گھنگھرو چرا کے باندھ لیے تھے اس نے۔"

"ہائے' ہمارے پاس گھنگھرو ہوتے تو رونا کس بات کا تھا۔ یہ تو ہم آپ کو سنا رہے ہیں کہ۔۔۔ ہم ناچیں بن گھنگھرو کے۔۔۔ اور آپ ایسے بے درد کہ سن کر بھی ان سنی کر رہے ہیں۔ ذرا دیکھیے۔۔۔ ہماری سونی ٹخنائیاں۔۔۔"

"سونی کلائیوں کا تو سنا تھا' یہ سونی ٹخنائیاں تم نے خوب کہی۔" وہ سر دھنے لگا۔

"لیکن یار دلگیر! پگ گھنگھرو باندھ کے تم نے کہاں دھمال ڈالنے ہیں۔ چچا حضور تمہاری یہ نازک ٹخنائیاں کاٹ ڈالیں گے' اگر گھنگھروؤں کی چھن چھن ان تک پہنچی تو' اس لیے دوست تمہاری یہ فرمائش تو میں پوری کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ بغیر گھنگھرو کے۔ یہ سونی ٹخنائیاں تو پھر بھی میں سہہ لوں گا مگر ٹخنائیوں کے بنا سونی سونی "ٹانگیاں" مجھ سے دیکھی نا جائیں گی۔"

"اللہ عمیص میاں' ہمارے گھنگھرو بھی ہماری طرح شریف اور بے زبان ہوتے ہیں۔ کبھی سنی ہے آپ نے ان کی چھن چھن۔۔۔ دراصل ہم تو ہلکی پھلکی جھانجھروں اور پازیبوں کو ہی گھنگھرو کہہ کے دل خوش کر لیتے ہیں۔ دلوا دیجیے نا ایک جھانجر۔ آخر آپ کی کمائی پہ میرا بھی حق ہے۔"

"یار کتنی بار کہا ہے یہ بیویوں والی گفتگو مت کیا کرو۔" وہ گھبرا گیا۔

"لو' اس سے کام چلے گا؟" اس نے سامنے لٹکی اپنی قمیص کی جیب سے والٹ نکالا اور ایک سو کا نوٹ نکال کے اسے پکڑایا۔

"چلے گا نہیں' دوڑے گا۔ چھن چھن دوڑے گا۔" اس نے لہرا کے نوٹ اچک لیا۔

"او مجھے جھانجھر یا پہنا دے رے
او سیاں دیوانے
تجھے میں۔۔۔ تجھے میں۔۔۔
سینے سے لگا لوں گی
او سیاں دیوانے۔۔۔"

"اب تم دھمکیوں پہ تو مت اترو۔ ایک تو سو روپے دو' اوپر سے ڈراوے بھی سنو۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹکنے لگا۔

دلگیر اس تبصرے سے بے نیاز ناچتا مٹکتا وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ مٹھی میں دبا سو کا نوٹ آج اسے تقریباً

سارا دن گھر سے باہر رکھنے والا تھا۔

اس کی سرشاری دیکھ کے **عمیص** مسکرا دیا۔

"یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کتنی بڑی نعمت ہوتی ہیں' یہ بے فکر زندگی بھی۔ کتنا کم وقت لگتا ہے دلگیر تمہیں اپنے ہونٹوں تک مسکراہٹ لانے میں۔ جیو میرے دوست۔۔۔ جیو۔۔۔"

"خیریت' اکیلے اکیلے مسکرایا جا رہا ہے؟"

موتیا پودوں کو پانی دے کر اندر آ رہی تھی۔ اسے اکیلے میں مسکرا کے اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھ کے ٹھٹھکی۔

"آؤ' مل کے مسکراتے ہیں۔"

اس نے شانوں پہ رکھے تولیے کو اپنی پشت پر پھیلاتے ہوئے دعوت دی۔

موتیا جھینپ گئی۔

اپنی دھن میں اندر آتے ہوئے اس نے **عمیص** کے حلیے پہ غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ جینز پہنے ہوئے تھا لیکن اس کی شرٹ آئینے کے ساتھ لگے ٹاول اسٹینڈ پہ لٹک رہی تھی۔ کسرتی بدن پہ صرف بنیان تھی جسے بڑے سے تولیے سے وہ ڈھانپے کھڑا تھا کہ نواب صاحب کو گھر میں مردوں کا بھی یوں بے حجابانہ پھرنا آداب کے منافی لگا کرتا تھا۔

موتیا نے نظریں چرا لیں اور چپ چاپ آگے بڑھنے لگی۔

"کیوں' کیا ہوا؟"

عمیص نے اسے چپ چاپ دوسری جانب مڑتے دیکھ کے پکارا۔

"کیا میری مسکراہٹ سے تمہاری مسکراہٹ کا قافیہ نہیں ملتا؟"

"پہلے تم اپنا یہ "حمام" سمیٹو۔"

اس نے بغیر مڑے رک کے کہا۔ اب وہ برآمدے میں رکھے گملوں میں پانی ڈال رہی تھی۔

"یار! میرے کمرے کے باتھ روم کا بلب فیوز ہو گیا ہے۔ اب اندھیرے میں یہ کام تو نہیں ہو سکتا۔ اگر طبع نازک پہ گراں گزر رہا ہے تو معذرت۔"

اس نے شیو سے نمٹ کر سر نیچے جھکایا اور پانی کے زور زور کے چھپاکے منہ پہ مار کر شرٹ کے بٹن بند کرتا اس کی طرف آیا۔

"سنو' چچی حضور نے دوبارہ وہ بات چھیڑی؟"

"ہاں تو کیا فائدہ اس تکلیف دہ ذکر کو چھیڑنے کا۔ جب ہم کچھ کر نہیں سکتے تو بار بار ان کے دل کو دکھانے سے کیا حاصل۔"

"تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ کچھ کیا نہیں جا سکتا۔"

"اچھا تو بتاؤ' کیا کر سکتے ہو تم۔ یا ہم میں سے کوئی اور یاسمین آپا کے لیے۔ کیا ہم بابر بھائی صاحب کو اس موڑ سے واپس لا سکتے ہیں۔"

"کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ آخر یاسمین آپا اور بچوں کو ان کے حال پہ بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ وہ کوئی غیر نہیں۔" **عمیص** کا لہجہ سخت اور دو ٹوک تھا جسے موتیا کی حساس طبیعت نے "فوراً" محسوس کر لیا۔

وہ سمجھ گئی کہ **عمیص** نے اس کی بات کا شاید غلط مطلب لیا ہے۔

"وہ میری بھی اپنی ہیں **عمیص**! ہم سب کو عزیز ہیں لیکن بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں ہم اپنے چاہنے والے بے حد عزیز لوگوں کے لیے چاہ کر بھی کچھ کر نہیں پاتے۔ تم کوشش کرنا چاہتے ہو۔ کیا یاسمین آپا نے

نا کی ہو گی۔ ان کی کوششیں تو تمہاری کوششوں سے کہیں زیادہ زور آور ہوں کہ بہرحال بچے بھی ان کے ہیں اور زندگی بھی ان کی اپنی۔ اس کی بہتری کے لیے وہ تم سے زیادہ خواہش مند ہوں گی لیکن ہوا کیا؟ بابر بھائی صاحب جیسے لوگ دنیا میں کسی کی ماننے نہیں بلکہ اپنی منوانے آتے ہیں۔"

"ایسا پہلی بار ہوا ہے موتیا! کہ تم میری ہمت بندھانے کی بجائے ہمت توڑ رہی ہو۔"

عمیص دل ہی دل میں جہاں اس کی مدلل بات سے متفق ہوا تھا' وہیں ملول سا بھی ہو گیا تھا۔

اس کی نگاہوں میں موتیا کے لیے گلہ تھا۔

"ہاں ایک راستہ ہو سکتا ہے۔"

موتیا اس گلے کا بار سہہ نا سکی اور اس نے **عمیص** کی آس بندھانے کو اپنا خیال ظاہر کرنا چاہا۔

"وہ کیا؟"

"دیکھو' بابر بھائی صاحب میری اور تمہاری بات میں تو آنے والے نہیں۔ ہمیں وہ کیا خاک خاطر میں لائیں گے' الٹا بھڑک بھی سکتے ہیں۔ ہاں اگر ابا حضور اس سلسلے میں ان سے بات کریں تو کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ ان سے وہ دبتے ہیں اور ڈرتے بھی ہیں۔"

آخری الفاظ اس نے مسکراہٹ دبا کے کہے۔

"لیکن فی الحال تو وہ اس سارے قصے سے لاعلم ہیں۔" **عمیص** نے بلاوجہ ایک بار پھر تولیے سے اپنا چہرہ رگڑنا شروع کر دیا جس سے اس کی غائب الدماغی کا اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا سارا دھیان ابھی تک اپنی آپا کے مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔

"اور میرا خیال ہے نا تم میں اتنی ہمت ہے اور نا مجھ میں کہ ان کی پرسکون لاعلمی کو تباہ کر سکوں۔"

"چچی حضور۔۔۔" اچانک **عمیص** کو نیا خیال سوجھا۔

"تمہارا کیا اندازہ ہے' چچی حضور نے جو کچھ سنا ہے' کیا وہ اس راز میں چچا حضور کو شریک کریں گی؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

موتیا نے شانے اچکائے۔

"پہلے کی بات اور تھی' امی حضور چھوٹی سی چھوٹی بات کا تذکرہ بھی ابا حضور سے کرنا لازمی جانتی تھیں۔ کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر ہوتا تھا نا ہی کوئی مسئلہ ان سے مخفی رکھا جاتا تھا لیکن اب اکثر ایسا ہونے لگا ہے۔ شاید اس کی وجہ ابا حضور کی طبیعت کی خرابی ہے۔ ان کی روز بروز گرتی صحت اور سب سے بڑھ کر ایکدم شوٹ کر جانے والا بی پی۔۔۔ اب تو امی حضور کی کوشش ہوتی ہے کہ جس حد تک بن پڑے وہ ان کو ٹینشن اور فکر سے بچائیں' اس لیے مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی آسانی سے ابا حضور کو اس معاملے سے آگاہ کر سکیں گی۔"

"آسانی سے؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ۔۔۔ ضروری نہیں کہ اب تک اگر انہوں نے یہ بات نہیں کی تو وہ آئندہ بھی نا کریں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس پہ ان کا ردعمل شدید ہو سکتا ہے لیکن کبھی نہ کبھی تو یہ بات کھلے گی۔ حقیقت جب خود بخود ان کے سامنے آئے گی تب تک صورت حال خطرناک حد تک بگڑ چکی ہو گی۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اس مرحلے پہ سارا معاملہ ان کے آگے رکھ دیا جائے تاکہ ان کی مداخلت سے اگر بات سنبھل سکتی ہے تو سنبھل جائے۔ میرا خیال ہے کہ امی حضور ان سے بات کریں گی ضرور۔ جتنا خیال انہیں ابا حضور کی صحت کا ہے' اتنا ہی یاسمین آپا کا بھی ہو گا۔ وہ ان کی جانب سے بے فکری سے آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھ سکتیں۔"

"مجھے بھی یوں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایسا نا ہو کہ بابر بھائی صاحب زیادہ ہی جلدی دکھا دیں۔"

"میری مانو تو بس کچھ دن اور۔۔۔ کچھ دن اور انتظار کر لو۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

ہمیشہ کی طرح آج بھی موتیا سے بات کر کے عمیص کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔

گل مہر ناشتے کی نیت سے کچن کی جانب جا رہی تھی جب اس کے قدم موتیا کی مدھم سی ہنسی کی آواز سن کر تھم گئے۔

اس نے مڑ کے دیکھا' برآمدے کے اس کونے میں آمنے سامنے موڑھے رکھے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے کے بے حد قریب اور ایک دوسرے میں مگن۔

گل مہران سے زیادہ فاصلے پہ نا تھی لیکن اس کے باوجود اسے اپنے اور ان دونوں کے درمیان یہ فاصلہ بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

نا اس تک ان دونوں کی مدھم سرگوشیاں پہنچ رہی تھیں اور نا وہ دونوں اس کی ہیل کی ٹک ٹک سن پائے تھے۔

گل مہر کو اچانک اپنا اکیلا پن حد سے زیادہ محسوس ہوا۔ اپنی دھڑکنیں تک اسے پرائی پرائی سی لگنے لگیں۔ مرے مرے قدموں کے ساتھ وہ کچن کی طرف بڑھی۔ غیر ارادی طور پہ کچن کا دروازہ معمول سے زیادہ آواز کے ساتھ بند ہوا۔ عمیص اور موتیا نے چونک کے دیکھا۔

"کون تھا؟"

"پتا نہیں۔" موتیا نے شانے اچکائے۔

"دلگیر تو باہر ہے اور چچی حضور اس طرح دروازہ بجانے کی عادی نہیں۔"

"شاید گل مہر ہو۔"

"گل مہر۔ ناممکن۔" عمیص نے اختلاف کیا۔

"گل مہر کوئی ہوا کا جھونکا نہیں جو چپکے سے گزر جائے۔"

"چپکے سے کب گزرا ہے۔ یہ دھماکا سنا نہیں کیا تم نے۔" موتیا نے مسکرا کے کہا۔

"وہ دھماکا تو کچن کے اندر جانے کے بعد ہوا ہے۔ گل مہر کم از کم ہمارے قریب سے اتنی خاموشی سے نہیں گزر سکتی' نا کوئی چیخ۔۔۔ نا کوئی اعتراض۔۔۔ نا کوئی نکتہ چینی۔۔۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

وہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہا تھا اور اندر کھڑی گل مہر نے اس کی بات پہ نجانے کیوں جھنجلا کے ہاتھ میں پکڑی چائے کی کیتلی زور سے پٹخ کے رکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

بابر ہمایوں مغل سے بات ہونے کے بعد دعا نے سب سے پہلا کام جو کیا' وہ یہ تھا کہ فون کر کے اپنی ریکارڈنگ منسوخ کرائی۔

"تیرا ہو گیا ہے دماغ خراب۔ چندریئے' یہ نخرے بعد میں اچھے لگتے ہیں' بعد میں۔۔۔ یعنی تب جب نام مشہور ہو چکا ہو۔ جب لوگ لائنیں باندھے گھر کے باہر کھڑے ہوں تجھ سے کام کروانے کے لیے اور منہ مانگی رقمیں دینے پہ تیار ہوں۔ تب ایسے نخرے کرنا حق بھی ہوتا ہے اور تو ہے کہ اب یہ نخرے دکھا رہی ہے۔ جب مر مر کے کوئی تجھے ڈیڑھ' ڈھائی گانا دینے پہ تیار نہیں' فلموں پہ دو ایک ناموں کا راج ہے' وہ نئی آوازوں کو چانس ہی نہیں دیتے۔ آجا کے یہ اسٹیج پروگرام ہیں یا پھر اکو ادھا (کبھی کبھار) ٹی وی پروگرام۔۔۔ وہ تیرے انتظار میں تو نہیں بیٹھے۔ تو نے تو فون کر کے ریکارڈنگ پہ نا آنے کا بتا دیا ہے۔ اگلے تیری خاطر تاریخ نہیں بدلنے والے۔ لکھ کے رکھ لے' انہوں نے تیرے فون کے اگلے منٹ بعد کسی اور سنگر کو فون کر کے بلا لیا ہو گا۔"

اللہ وسایا کی لمبی تقریر کے جواب میں تیزی سے مٹر چھیلتی دعا نے بیزاری سے بس ایک فقرہ کہا۔

"تو بلا لیں۔۔۔ میری بلا سے۔"

فقرہ جلتی پہ تیل کا کام کر گیا۔ اللہ وسایا مزید بگڑ گیا۔

"تجھے کیوں بلا لیں؟ کوئی اپنی جگہ اتنی آسانی سے کسی کو دیتا ہے جیسے تو دے رہی ہے۔ ناقدری' شکر نہیں ادا کرتی کہ کسی مصیبت کے بغیر داتا رزق دے رہا ہے۔ رزق کو لات مار رہی ہے۔ کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ پہلے ماں کے سوگ میں اتنے دن کام کیا نا کاج۔۔۔ اب یہ مٹر تو چھوڑ۔۔۔ زہر لگتی ہے تو مجھے اس طرح ہانڈی روٹی میں سر کھپاتی۔"

اس پہ اور کوئی بس نا چلا تو وہ اس کے ہاتھوں سے سبزی چھیننے لگا۔

"ظاہر ہے' آپ کے نزدیک تو بیٹیوں کا سارا سگھڑاپا' سلیقہ ان کے سرگم میں سر کھپائے' تان پورے سے الجھنے اور پرستاروں کے نوٹ وارنے تک محدود ہے۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

"اب یہ منہ ہی منہ میں بڑبڑ کیا کر رہی ہے' ماں سے نیا چج (ہنر) سیکھ کے آئی ہے۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں' جواب کیوں نہیں دیتی۔"

"مجھے گھر پہ کام ہے۔"

اس نے مختصر جواب دے کر ٹالنا چاہا اور نکالے ہوئے مٹر کے دانے لے کر کچن میں گھس گئی۔

"گھر پہ ایسا کیا کام ہے؟"

اللہ وسایا بھی آسانی سے جان چھوڑنے والا نا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا۔

"سو کام ہوتے ہیں گھروں پہ۔"

دعا نے بھی جیسے صاف صاف جواب دینے کی بجائے گول مول باتوں کے ذریعے اس کی جان جلانے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔

"تو گھر کے کاموں میں ضائع ہونے کے لیے نہیں پیدا ہوئی۔"

"تو پھر کس طرح ضائع ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہوں؟"

اس کے ٹھنڈے لہجے میں کیے اس سوال نے اللہ وسایا کو سٹپٹانے پہ مجبور کر دیا۔

فوری طور پہ اس سے کوئی جواب نا بن سکا تو بغلیں جھانکنے لگا۔ کچھ سیکنڈ تک اسے چبھتی نظروں سے دیکھنے کے بعد دعا نے فریزر کھولا اور قیمے کا پیکٹ نکال کر پگھلنے کے لیے رکھا۔

"ابا! ایک دیسی مرغی منوا لائیں۔ یخنی بنانی ہے۔"

"کیوں' طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں' میری تو ٹھیک ہے۔ وہ۔۔۔ مغل صاحب۔۔۔ وہ کچھ بیمار ہیں۔ یہیں آ رہے ہیں' میں نے سوچا کچھ پرہیزی کھانا تیار کر لوں۔"

"تب ہی۔۔۔" وہ سر ہلانے لگا۔

"یہ بندہ تجھے نکما کر کے چھوڑے گا۔"

اس نے فتویٰ صادر کیا۔

"زنانی اس کی مر گئی ہے جو تجھ سے یخنیاں بنوا کے پیے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو ابا!"

دعا کو حقیقتاً" ناگوار گزرا۔

وہ ویسے ہی اس اجنبی خاتون کے بارے میں سوچ کے کبھی کبھار پشیمانی میں مبتلا ہو جایا کرتی تھی کہ چاہے وہ عورت بقول بابر کے کیسی بھی بے حس' جھگڑالو اور عمر رسیدہ کیوں نا ہو' بہر حال وہ اس کی لاعلمی میں اس کے شوہر سے شادی کرنے جا رہی تھی۔ اس کے حق میں شریک ہونے

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ایسا تو دیکھا ہے کہ مرد دوجے تیسرے ویاہ کرنے کے بعد نئی ووہٹیوں کو ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھتے ہیں اور پرانیوں کو یا تو پوچھتے نہیں یا پھر خدمت کے لیے رکھتے ہیں۔ یہ پہلی بار دیکھا ہے کہ پرانی بڈھی

تو عیش کرے اور نئی نویلی۔ جو ابھی نکاحی بھی نہیں گئی' وہ نوکرانی بنے۔"

"اف ابا۔۔۔" دعا نے زچ ہو کے اپنا سر تھام لیا۔

"کون نوکرانی بن رہا ہے؟ کون خدمتیں کر رہا ہے؟ اگر انسانیت یا اخلاق کے ہاتھوں میں ایک بیمار شخص کی ذرا سی مدد کر دیتی ہوں تو کیا برا ہے۔"

"تو ایسا کر۔ تو یہ گانا وانا چھوڑ دے۔"

اللہ وسایا کے مشورے پہ دعا نے حیرت سے مڑ کے اس کی جانب دیکھا لیکن وہاں سنجیدگی کی ہلکی سی رمق بھی نا تھی بلکہ ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

"تو نرس بن جا۔"

اس نئے مشورے پہ بیزار کھڑی دعا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"لے۔ دانت نکال رہی ہے' مخول نہیں کر رہا میں۔ پہلے ماما منجی پہ پڑا' تو خدمت کرنے کو تیار۔۔ دن رات ہسپتال میں اس کے سرہانے کھڑی رہی۔ پھر مامی ماڑی (بیمار) ہوئی' دس دن تو نے ادھر لگا دیے اس کا دھیان رکھنے میں۔ اب یہ مغل ہی بیمار ہو کے بستر لگانے ادھر آ رہا ہے۔ بیماروں کی سیوا کرنے میں تیرا بڑا جی لگتا ہے۔"

"چلو اچھا ہے۔۔۔ کسی کی تو دعا لگ جائے۔"

"آج کل کوئی کسی کے لیے دعا نہیں کرتا۔ سب مطلب نکالتے ہیں۔ پر تو ٹھہری جھلی' یہ گل سمجھتی ہی نہیں۔ بڈھا پیو بک بک کرتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس پہ دھیان دیا کر۔"

"اچھا ابا! آئندہ دھیان دوں گی۔"

اس نے اپنی گلو خلاصی کرانے کی غرض سے تسلی دی۔

"فی الحال تو یہ پانچ سو روپے پکڑیں' بکرے کا قیمہ تو موجود ہے' ایک دیسی مرغی بنا لائیں۔ دو دن کے لیے یخنی نکل آئے گی۔"

"دو دن۔۔۔؟ ڈیرے ڈالنے آ رہا ہے؟"

"باقی پیسوں کا تھوڑا تھوڑا فروٹ لے آئیں۔" دعا نے اس کا سوال نظرانداز کیا۔

"شرم نہیں آتی اس اونچے شملے والے کے پتر کو' ہونے والے سوہرے کے گھر ڈیرے جمائے گا۔"

"اور ہاں فروٹ میں صرف کیلے' سیب اور موسمی لانا۔ موسمی اچھی والی ہو جس کا جوس نکالا جا سکے۔"

"او میں کیا بکواس کر رہا ہوں' میری سنتی نہیں اور اپنی بولتی جا رہی ہے۔"

اس بار وہ غصے سے بولا مگر دعا پہ خاص اثر نا ہوا۔

"کسٹرڈ کا پیکٹ بھی لے آنا۔ ہلکی غذا مغل صاحب کے لیے اچھی ہو گی۔"

"کناہوں میں جو بھونکتا رہوں؟"

اللہ وسایا نے اس کی دانستہ برتی جانے والی بے توجہی پہ بھنا کے اس کا پکڑایا پانچ سو کا نوٹ دیوار پہ دے مارا۔ اس کا بس چلتا تو اپنا یا دعا کا سر بھی وہیں دے مارتا۔

دعا نے کھچڑی کے لیے چاول بھگوتے بھگوتے رک کر اپنے گیلے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے پونچھے اور زمین پر گرا نوٹ اٹھا لیا۔

"حلال کے ہیں یا نہیں۔ یہ تو مجھے نہیں پتہ لیکن محنت کے ضرور ہیں۔ ابا' میری محنت کی کمائی کی یوں بے عزتی تو مت کریں۔"

"اور جو تو میری بے عزتی کر رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں آج کل تیری نظروں میں پیو کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اسٹو آن کیا۔ فی الحال وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ اللہ وسایا جلد از جلد یہاں سے چلا جائے اور اس بحث سے اس کی جان چھوٹے۔

"تو پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی۔" وہ ابھی تک اس بات پہ ڈٹا تھا۔

"مغل کس حیثیت سے یہاں رہنے آ رہا ہے؟"

"مہمان کی حیثیت سے۔" دعا نے بالآخر ہار مان لی۔

"اور اگر یہ حیثیت ناکافی ہے تو پھر ہونے والے داماد کی حیثیت سے۔"

"ہونے والا ہی' ہے تو نہیں۔ جب ہو جائے گا' تب بسم جم آئے۔ ابھی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت تو ہے' اسی لیے میں نے خود بلوایا ہے۔ وہ تو آنا نہیں چاہ رہے اور ابھی بھی مجھے پکا پتا نہیں کہ وہ رہنے رضامند بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر رکے بھی تو ایک دو روز سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ کوئی مستقل نہیں آ رہے جو آپ گھبرا رہے ہیں۔"

"ایک دو دن تک بھی مناسب نہیں' لوگ کیا کہیں گے۔"

"کون سے لوگ؟"

دعا نے تنک کر سوال کیا۔

"کیا وہ لوگ جن کے بارے میں آپ نے ہی کہا تھا کہ کہنے دو جو کہتے ہیں' ہمیں کیا۔ ان کی پروا کرنے لگے تو اپنی زندگی کب جئیں گے۔ تو جب آپ نے پہلے کبھی لوگوں کے کہنے کی پروا نہیں کی تو اب کیوں کر رہے ہیں۔"

"تیری بڑی زبان چلنے لگی ہے۔"

جب وہ لاجواب ہو گیا تو بڑبڑا کے باہر نکل گیا۔

کھچڑی اور ہلکے نمک مرچ والا قیمہ تیار کرنے کے بعد اس نے نہا کر ذرا معقول لباس پہنا' ورنہ گھر میں وہ عموماً ملگجے اور پرانے کپڑوں میں ہی رہا کرتی تھی۔ باہر کی چکا چوند کی دنیا میں بن سنور کر رہنے کے بعد گھر میں اسے ایسے ہی رہنا پسند تھا۔

فاسئی رنگ کا کاٹن کا جدید اسٹائل میں سلا سوٹ آج اس نے پہلی بار پہنا تھا اور بلاشبہ گہرے جامنی اور ہلکے گلابی دھاگوں کی ہلکی پھلکی کڑھائی سے سجا یہ سوٹ اس پہ خاصا جچ رہا تھا۔

گیلے بال' سلجھا کے اس نے خشک ہونے کے لیے ایسے ہی چھوڑ دیے۔ موئسچرائزنگ لوشن ہاتھوں اور چہرے پہ لگا کے وہ سوٹ سے ہمرنگ نیل پالش لے کر لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

ابھی ایک ہی ہاتھ کے ناخنوں پہ پالش لگائی تھی کہ کال بیل کی آواز پہ اسے اٹھنا پڑا۔

"کام والی ماسی نے تو آج چھٹی کرنا تھی۔ ابا جی کہہ کے گئے تھے کہ اتنی جلدی واپس نہیں آنے والے۔ پھر؟ بابر صاحب نے بھی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آنے کا کہا تھا' ہو سکتا ہے جلدی آ گئے ہوں۔۔۔ ہاں شاید وہی ہوں گے۔"

وہ قیاس کرتی۔ مین ڈور کی جانب بڑھی۔ لاک میں لگے چھوٹے سے عدسہ نما شیشے سے اس نے آنے والے کو دیکھنا چاہا۔

سامنے شہزاد ملک کھڑا بے زاری سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"چھا جی!"

دعا کا دل جیسے اچھل کے حلق میں آ گیا۔ اور نبضیں تیز ہو گئیں۔ گہرے گہرے سانس لے کر اس نے اپنی حالت پہ قابو پانے کی کوشش کی۔ اس دوران ایک بار پھر کال بیل کو دبا دیا گیا تھا۔

"بھلا چھا جی' یہاں کس لیے آئے ہوں گے۔"

وہ اپنی ہتھیلیاں مسلتے ہوئے سوچ رہی تھی' جس سے گھبراہٹ کے مارے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

"میں اتنی نروس کیوں ہو رہی ہوں۔ چھاجی سے پہلی بار تو سامنا نہیں ہو رہا۔ اور ابھی کچھ دن پہلے میں کتنا ہی وقت ان کے ساتھ ایک چھت کے نیچے ایک ہی گھر میں گزار کے آئی ہوں۔ گھبرانے والی ایسی کون سی بات ہے۔"

تیسری بار بیل دبائے جانے پر اس نے بالآخر ہلکی سی کلک کے ساتھ ڈور ان لاک کر ہی دیا۔

"السلام علیکم چھاجی!"

اس نے نارمل رہنے۔۔۔ اور نارمل نظر آنے کی پوری پوری کوشش کی۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ سامنے کھڑا شخص ایسی کسی کوشش کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

وہ نارمل نہیں تھا اور یہ بات اس پہ پہلی نظر ڈالتے ہی دعا کو محسوس ہو گئی تھی۔

"تایا جی ٹھیک ہیں ناں۔"

اسے پریشانی ہوئی۔

"ہاں۔۔۔"

شہزاد نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔ یہ نکھرا نکھرا وجود۔۔۔ حیرانی بھری معصوم نگاہیں۔ اور تازگی سے بھرپور چہرہ اس کی توجہ بھٹکا رہا تھا۔

"اور سب خیریت ہے۔"

دعا نے اس کا نظریں چرانا بھی محسوس کیا۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی۔"

"جی۔۔۔ کیوں نہیں۔ آیئے۔"

خجل سی ہو کر وہ پرے ہٹی اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ لاک لگا کے وہ مڑی تو شہزاد گردن گھما گھما کے لاؤنج کی آرائش کا جائزہ لے رہا تھا۔

"اچھا ذوق ہے تمہارا۔"

"شکریہ۔"

ہنوز الجھے الجھے انداز میں کہتی وہ اسے صوفے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد خود بھی بیٹھ گئی۔ یہ الجھن شہزاد ملک کے یہاں اچانک آنے اور سب سے بڑھ کے اس کے سرسری اور معمولی نظر آتے انداز پہ تھی۔

"یہ معمولی پن ہی کسی "غیر معمولی" بات کا اعلان کر رہا تھا۔

"لیکن ہر معاملے میں نہیں۔"

"جی۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ اسی شش و پنج میں تھی۔ اس لیے شہزاد کی بات اس کے سر پہ سے گزر گئی۔

"میں تمہارے ذوق کی تعریف کر رہا تھا۔"

شہزاد نے اس کی بے دھیانی نوٹ کرتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔

"اور یہ بھی کہ۔۔۔ کاش اپنے اعلا ذوق کا مظاہرہ تم زندگی کے ہر معاملے میں کرتیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"اور میں بھی نہیں سمجھا کہ بابر ہمایوں مغل کو تم نے کس بنیاد پہ منتخب کیا۔"

"منتخب۔۔۔؟" وہ ہنس پڑی۔

"انتخاب کرنے کے لیے آپ کے سامنے بہت سی چیزیں ہونی چاہئیں اس کے بعد کسی ایک کو چنا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ بابر ہمایوں مغل میرے سامنے ایک ایسے راستے کی طرح تھے۔ جس پہ قدم رکھے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔"

"ایسی بھی کیا مجبوری تھی؟"

"دل۔۔۔ دل ہی تو سب سے بڑی مجبوری ہوتی ہے چھاجی۔"

"یعنی تم تسلیم کرتی ہو کہ بابر کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے پہ تمہارے دل نے تمہیں مجبور کیا۔ اسی کو تو پسند یا محبت کہتے ہیں 'غالباً' اور اسی چیز سے تم مکر بھی رہی ہو۔"

"دل سے وابستہ جذبات صرف محبت اور پسندیدگی کے ہی نہیں ہوتے چھاجی۔"

وہ بڑے مدبرانہ انداز میں اسے دیکھ کے مسکراتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"دل کی کچھ ضرورتیں بھی ہوتی ہیں۔۔۔ کچھ حسرتیں بھی ہوتی ہیں اور کچھ تشنگیاں بھی۔ میرے دل کو عزت کی بڑی بھوک ہے چھاجی۔۔۔ مٹائے نہیں مٹتی۔ کبھی پیٹ بھر اور نیت بھر عزت ملی بھی تو نہیں۔ اسی حرص میں بابر جی کا ہاتھ تھاما تھا۔"

"جو خود اس معاملے میں کنگال ہو، وہ تمہیں کیا خاک عزت دے گا احمق لڑکی۔"

شہزاد کو اس پہ دوبارہ سے غصہ آ رہا تھا۔ جس کو دبانے کی اب وہ کوئی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

"اس لیے تو میں تمہاری بدذوقی کا رونا رو رہا ہوں۔ دیکھ بھال کے، سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا تھا زندگی کے اس اہم معاملے کا۔ تمہارے دل نے تمہارے لیے سراسر گھاٹے کا سودا کیا ہے۔"

"میرا دل تو ہے ہی سدا کا میرا دشمن۔ اس نے میرا بھلا کب چاہا ہے۔ ہمیشہ خسارے میں ہی رکھا ہے۔"

وہ سر نیچا کیے سوچتی رہی۔۔۔ سوچتی رہی۔

"اور رہا میری بدذوقی کا سوال۔۔۔ تو چھاجی۔۔۔ اس دل نے کس ذوق کا مظاہرہ کیا تھا، کبھی دیکھیے تو سہی۔ بڑی اونچی جگہ لگا بیٹھا تھا خود کو۔ اپنی اوقات سے کہیں بڑھ کے۔"

"بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

وہ اس کی سوچوں سے بے خبر۔۔۔ اور بے نیازی سے اپنی کہتا رہا۔

"تمہیں یہ رشتہ ختم کرنا ہو گا۔"

اس نے گویا فیصلہ صادر کر دیا۔

دعا چونک اٹھی تھی۔

اس نے بغور شہزاد کی گمبھیر سنجیدگی کو دیکھا۔ پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ محض آپ کے اشارے پہ میں دوسری بار اپنے دل کی آواز نہیں کچل سکتی۔"

"تمہیں ایسا کرنا ہو گا، دعائی، ورنہ خدانخواستہ تم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی ہو۔"

اس کے صاف انکار پہ شہزاد کو تاؤ تو بہت آیا مگر وہ جانتا تھا کہ اس طرح وہ مزید ضد میں آ سکتی ہے۔ اس لیے دانستہ اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نرم کیا۔

اب یہ اس کے نرم الفاظ کا اثر تھا۔۔۔ یا پھر "دعائی" کہنے کا جادو کہ دعا اس کی بات غور سے سننے پہ راضی ہو گئی۔

"وہ ایک فراڈ شخص ہے، نوسرباز۔۔۔ مطلبی، خود غرض اور بے غیرت بھی۔ چار پیسوں کی خاطر کچھ بھی کرنے پہ تیار ہو جاتا ہے۔ ملک مقبول کا پٹھو ہے وہ۔ اور کیا تمہیں یہ بھی نہیں کھٹکا کہ جس کام کے لیے تم ملک مقبول کو انکار کر چکی ہو، اب وہی کام یہ شخص بڑے سلیقے سے تم سے کروانے والا ہے۔ اور تم اس پہ راضی بھی ہو۔"

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ بابر صاحب مقبول کے کہنے پہ مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔"

"میں صرف یہ نہیں کہنا چاہتا۔۔۔ بلکہ تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ اس شخص کے جھانسے سے نکل آؤ۔ جو اپنی بیوی بچوں کا نہیں بنا۔ وہ تمہارے ساتھ کیا بھلائی کرے گا۔ اور میں تو اس بات پہ بھی حیران ہوں کہ تم جیسی لڑکی کسی دوسری عورت کا گھر برباد کرنے کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتی ہے۔"

"چھاجی آپ نہیں جانتے۔ بابر صاحب کی بیگم نا صرف ان سے عمر میں بڑی ہیں بلکہ بد مزاج، جھگڑالو اور۔۔۔"

"چپ رہو تم۔۔۔"

شہزاد نے اس کی بات مکمل نا ہونے دی۔

"کچھ نہیں جانتیں تم۔ ارے یہ تو بہت پرانا داؤ ہے ان شادی شدہ مردوں کے پاس، جس کے ذریعے وہ کم عمر اور نادان لڑکیوں کو گھیرتے ہیں۔ تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تم اس جال میں پھنس سکتی ہو۔ میں تو تمہیں بہت سمجھ دار سمجھتا تھا۔"

"اچھا۔۔۔؟ مگر آپ نے کبھی بتایا نہیں۔"

وہ جی بھر کے حیران ہوئی، مگر حیرت کے اس بناوٹی مظاہرے پہ شہزاد چڑ گیا۔

"فضول باتیں مت کرو، میں اس وقت جو بات کرنے آیا ہوں، اس پہ سنجیدگی سے غور کرو۔ اور نا صرف غور کرو بلکہ جلد از جلد عملی قدم اٹھاؤ۔۔۔ میں تمہیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"مگر کیوں۔۔۔؟"

وہ شاید کچھ سننا چاہتی تھی۔

"وہ اس لیے۔۔۔ کہ میرے باپ نے مرتے وقت مجھ سے تمہاری حفاظت اور تمہاری بہتری کا وعدہ لیا تھا۔۔۔ اس لیے۔۔۔ سمجھیں۔"

وہ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے کہتا ہوا اس کی ساری خوش گمانیوں کے پرخچے اڑا رہا تھا۔

"گویا آپ کی نظروں میں معتبر ٹھہرنے کے لیے اولین شرط "مرنا" ہے۔۔۔ کیونکہ زندہ لوگوں کی خاطر آپ کو یوں وقت ضائع کرتے کبھی نہیں دیکھا۔"

اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ جتانا چاہا کہ جس باپ سے آخری وقت میں کیے وعدے کی بات وہ کر رہا ہے اسی باپ کی زندگی میں اس کا ان سے رویہ کیا تھا۔

"وقت تم ضائع کر رہی ہو۔ اپنا بھی۔۔۔ اور میرا بھی۔"

شہزاد نے اس کی کڑوی بات صبر سے پی لی تھی۔

"مجھ سے تمہیں جو گلے شکوے ہیں ان کا حساب کتاب کسی اور وقت پہ اٹھا رکھو۔ اس وقت میں تمہیں جو بتا رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔ محض میری ضد میں آکر۔۔۔ یا مجھ پہ کوئی بھڑاس نکالنے کی خاطر اگر تم اس بے بنیاد رشتے سے جڑی رہو گی تو اپنا نقصان کر بیٹھو گی۔۔۔ ناقابل تلافی نقصان۔"

"آپ یہ سب اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ بابر صاحب سے واقف ہیں؟"

"نا صرف اس سے۔۔۔ بلکہ اس کے سارے خاندان سے۔"

"وہ کس طرح؟" دعا نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ جب کہ یہ بات وہ بابر ہی کی زبانی تبھی جان گئی تھی جب وہ اپنی اصلیت کھلنے سے بس کچھ دیر پہلے نواب صاحب کے ہاں ان کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ تفصیل غیر ضروری ہے۔"

وہ سنبھل گیا۔ اس کے پہلو بدلنے سے اس کا اضطراب ظاہر ہوتا تھا۔

"اس وقت ضروری صرف یہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں پہ بندھی یہ خوش رنگ پٹی اتار پھینکو جو اس دھوکے باز شخص نے اس لیے باندھی ہے تاکہ تمہیں اس کی سیاہ کاریاں نظر نا آئیں۔ وہ ایک بد قماش شخص ہے۔ جس سے تم عزت کی طالب ہو۔ وہ تو اس چیز کا مطلب تک نہیں جانتا۔ عورت ذات کی نا تو اس کی نظر میں عزت ہے، نا اہمیت۔ بلکہ وہ تو سرے سے انسانیت کو ہی اہم نہیں جانتا۔ ہر رشتہ، ہر تعلق اس کے نزدیک ایک سیڑھی ہے۔ جسے وہ جب چاہے آگے بڑھنے کے لیے قدم رکھنے کے طور پر استعمال کر لیتا ہے۔ اس کی بیچاری بیوی جسے اس نے ایک بد زبان عورت کے طور پر مشہور کر رکھا ہے صرف تم جیسی لڑکیوں کی ہمدردیاں پانے کے لیے، اس سے وہ اپنا تعلق صرف اس لیے برقرار رکھا ہوا ہے کہ وہ ایک عزت دار اور نامی گرامی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کا حسب نسب بھی کم نہیں، مگر اپنے آباؤ اجداد کی عزت وہ عرصہ پہلے اپنے ہاتھوں ڈبو چکا ہے۔ اب اگر معاشرے میں اس کی تھوڑی بہت عزت ہے وہ اسی حوالے سے ہے۔ اس لیے یہ بات تو جانے ہی دو کہ وہ اپنی

شرافت کی وجہ سے یہ رشتہ نبھا رہا ہے۔ اصل میں اس کے پیچھے بھی اس کی غرض چھپی ہے ورنہ وہ چودہ پندرہ سال تک اس رشتے کا بوجھ برداشت کرنے والا آدمی نہیں۔"

"میں۔۔۔ میں آپ کی بات کا یقین کیسے کر لوں؟"

وہ تذبذب کا شکار تھی۔ بابر ہمایوں مغل کے حوالے سے ابتدا میں اس کے دل میں جو وسوسے پیدا ہوئے تھے، انہیں اس نے سختی سے دبا دیا تھا اور اسے اسی طرح دیکھنے لگی تھی جیسے وہ دکھا رہا تھا لیکن اب شہزاد ملک ان وسوسوں کو پھر سے زندگی دے رہا تھا۔

"تمہیں کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لیے میں تمہیں ثبوت بھی پیش کر سکتا ہوں۔ اور اگر تم چاہو تو تمہارے اس کاغذی نواب کو گریبان سے پکڑ کر تمہارے سامنے لا سکتا ہوں۔ وہ اپنے منہ سے قبول کرے گا کہ تم سے شادی کرنے کے پیچھے اس کا کیا مقصد ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی ہمت کتنی ہے۔ وہ شخص بھونکنے والا کتا ہے۔"

"آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ آپ انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا آپ ان سے ملتے رہے ہیں؟"

"ایک بار ملا تھا۔"

شہزاد کی یادداشت میں وہ۔۔۔ شام۔۔۔ وہ وقت وہ ملاقات تازہ ہوئی تو جیسے سوچوں میں دور تک زہر پھیل گیا۔ اس کی تلخی اس کے لہجے سے بھی چھلک رہی تھی۔

"اور اس ایک بار کا ملنا ہی کافی تھا۔ اس نے خود ہی اپنا آپ مجھ پر کھول دیا تھا۔ وہ ایسا نا کرتا تب بھی اسے پہچاننے میں مجھے کچھ زیادہ وقت نا لگتا۔ ایسے بہروپیے دن میں ستر بار ٹکراتے ہیں۔ وہ مجھے بلیک میل کرنے چلا تھا۔ یہ تو اوقات ہے اس کی۔"

جوش جذبات میں شہزاد وہ کہہ گیا، جو کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ دعا ٹھٹھک گئی تھی۔

"بلیک میل۔۔۔؟ مگر کیسے؟ کس سلسلے میں؟"

"وہ۔۔۔ بس۔۔۔" وہ اپنے کی رنگ سے ماتھا کھجانے لگا۔ جیسے ٹال مٹول کرنے کے لیے کوئی مناسب بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔

پھر جیسے اس نے سب کچھ سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"وہ مجھے گل مہر کے سلسلے میں بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گل مہر۔۔۔ وہ میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اور اس کے گھر ابا جی اور اماں جی میرے رشتے کی بات کرنے گئے تھے۔ جانتی ہو وہ اس گھرانے کا داماد ہے۔ یعنی گل مہر کا بہنوئی لگتا ہے۔ اور اس خاندان سے کتنا مخلص ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ جس وقت میرے ماں باپ اس گھر میں بیٹھے تھے، ٹھیک اسی وقت وہ اس جگہ سے ذرا ہی فاصلے پہ مجھ سے اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت طلب کر رہا تھا۔ مجھے دھمکا رہا تھا کہ اگر میں اسے اس کی مطلوبہ رقم ادا نہیں کروں گا تو وہ میری اصلیت سب کو بتا دے گا یعنی۔۔۔ یعنی یہ بتا دے گا کہ میرے۔۔۔ والدین۔۔۔"

کچھ ہچکچا کے وہ چپ ہو گیا۔

اس حقیقت کو اپنی زبان سے بیان کرنا اسے بہت کٹھن محسوس ہوا۔ عام حالات میں وہ کبھی بھی یوں دعا کے۔۔۔ یا کسی اور کے سامنے یہ ساری باتیں نا کرتا۔۔۔ لیکن اس وقت اسے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دعا، بابر کے بارے میں کچھ بھی سننے پہ تیار نا تھی، یقین کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ وہ شہزاد کی بات منٹ میں جھٹلا دیتی۔ اگر وہ اسے اس ساری تفصیل سے آگاہ نا کرتا۔

"جو شخص اپنے اتنے قریبی عزیزوں سے مخلص نہیں، بلکہ ان کے جذبات کو بھی کیش کرانے کا سوچتا ہے، وہ کسی غیر کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اب تو تمہاری سمجھ میں یہ بات آ جانی چاہیے۔"

اس نے پوری امید کے ساتھ دعا کو دیکھا۔ جس کے چہرے پہ اس وقت ناقابل فہم تاثرات تھے۔

"ہاں، سمجھ گئی ہوں۔۔۔ ساری بات سمجھ گئی ہوں۔"
دعا نے شہزاد کے چہرے پہ نظر جما کے کہا۔
اس وقت ان نظروں میں اسے ایسی بے گانگی اور بے اعتباری نظر آئی کہ وہ ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔
"اب سمجھی ہوں کہ بابر صاحب سے مجھے متنفر کرنے کی آپ کی ان کوششوں کا مقصد کیا ہے۔ انتقام۔۔۔ صرف اور صرف انتقام۔۔۔ بابر صاحب کی بروقت مداخلت کی وجہ سے آپ کے ارمان ادھورے رہ گئے۔ کسی اور کے کاندھوں پہ سوار ہو کے اپنا قد بلند کرنے کے آپ کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے اور اب اپنی کھسیاہٹ دور کرنے کے لیے آپ کو اور کوئی بہانہ نہیں ملا تو آن اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔"
"شٹ اپ۔۔۔" وہ دھاڑ اٹھا۔
"سچ سننا بہت مشکل ہوتا ہے ناچھاجی۔۔۔ اور آپ کو تو خیر اوروں سے کہیں بڑھ کے مشکل لگتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ آپ کو یہ عادت ڈال لینی چاہیے۔ آئندہ کام آئے گی۔ کون جانے ابھی اور کتنے کڑوے سچ سننا باقی ہوں گے۔"
"مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم بول رہی ہو۔۔۔ تم۔۔۔ دوئی۔"
غصے کی شدت کم ہوئی تو دکھ نے اس پہ غلبہ پالیا۔
"یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا چھاجی کہ آپ میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔"
دعا کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں کے فرش دھندلا سے گئے۔
"آپ مجھے پسند نہیں کرتے، مجھ سے چڑنے لگے ہیں۔ یہ تو میں جانتی تھی لیکن کہیں نا کہیں یہ رتی بھر خوش فہمی بھی مقصود تھی۔ کہ آپ کبھی میرا برا نہیں چاہ سکتے۔ اور میری یہ خوش فہمی آج میرا منہ چڑا رہی ہے۔ آپ کی ناپسندیدگی نفرت میں کب بدلی میں جان ہی نا پائی۔ آپ اپنی ناکامی کا غصہ نکالنے کے لیے مجھے استعمال کر سکتے ہیں۔ اپنی دشمنی میں۔۔۔ اپنے انتقام کی خاطر میری زندگی سے یہ واحد امید چھین سکتے ہیں۔ مجھے بھی یقین نہیں آرہا چھاجی۔"
وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رو پڑی۔
شہزاد تاسف سے اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا۔
خاموشی سے اس کے الزامات سنتا اور اس کی بدگمانیوں کی انتہا میں جانچتا رہا۔
"کتنا زہر بھرا ہے تمہارے اندر؟"
بہت دیر بعد اس نے کہا تو صرف اتنا۔
"جو ملتا گیا وہ دامن میں بھرتی گئی۔"
"یہی تو حماقت تھی تمہاری۔ من چاہی چیز حاصل نا کر سکنے کا مطلب یہ نہیں کہ خانہ پری کے لیے انسان کانٹے بھی دامن میں بھر لے۔ تم جو چاہتی تھیں وہ پانے پہ تمہارا اختیار بے شک نہیں۔ لیکن خود کو بچانے پہ تو تمہارا اختیار ہے نا۔ مجھ سے تمہیں جو بھی بدگمانیاں ہیں، وہ تو سو ہیں۔ ان کی وضاحت میں کر سکتا ہوں لیکن اس وقت زیادہ ضروری ہے تمہاری ان خوش گمانیوں کو دور کرنا جو تمہیں بابر ہمایوں مغل سے ہیں۔ کمال ہے تم نے میرے بارے میں ایسی ایسی باتیں سوچ لیں۔ جن کا کوئی وجود ہی نہیں اور سامنے رکھی حقیقت پہ تم غور نہیں کر رہیں۔ چلو ایک منٹ کے لیے میں مان بھی لوں کہ یہ سب میں نے بابر سے انتقام لینے کے لیے کہا ہے۔ تب بھی تم یہ تو مانتی ہو کہ بابر نے ایسا کچھ کیا ہے۔ جس نے مجھے انتقام لینے پہ مجبور کر دیا۔ مجھے اس بات کا غم ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا۔ پھر بھی میں اس بات کو بھلا دوں گا۔ تم بھلے مجھے غلط سمجھتی رہو۔ لیکن اس شخص کی غلطی کو بھی تو غلط مانو۔"
"صرف آپ کے کہنے سے میں ایسا نہیں کر سکتی۔"
"تم کس قدر ضدی ہو گئی ہو۔"

وہ زچ ہو اٹھا۔
"میں ابھی ضد پہ آئی ہی کب ہوں۔"
اس کے لبوں پہ ایک تاؤ دلانے والی مسکراہٹ تھی۔ جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ شہزاد واقعی تاؤ کھا گیا۔
"دماغ خراب ہے میرا جو گھنٹا بھر سے خود کو کھپا رہا ہوں۔ تم ماننے والی نہیں ہو۔"
"بس۔۔۔ اتنا ہی حوصلہ ہے؟"
دعا کی یہ دل جلا دینے والی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔
"گھنٹا بھر میں ہی ہمت جواب دے گئی۔ میرے حوصلے کی داد دیجیے جو ایک عمر سے خود کو کھپا رہی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ آپ ماننے والے نہیں۔"
شہزاد جو اپنی بات کہہ دینے کے بعد غصے کے مارے کھڑا ہو چکا تھا اور بس نکلنے ہی والا تھا۔ دعا کی اس بات پہ سن ہو کے رہ گیا۔ اس کے قدم جم گئے۔ اس نے دعا کی جانب غور سے دیکھا اور حیرت سے سوچنے لگا۔
"کیا چیز ہو تم دوئی! کبھی یوں لگتا ہے جیسے تمہیں مجھ پہ اتنا غصہ ہے۔۔۔ کہ بس چلنے پہ مجھے بھسم ہی تو کر ڈالو گی اور کبھی لگتا ہے جیسے تم ابھی تک وہیں کی وہیں ہو۔ جہاں میں نے تمہیں آج سے نو سال پہلے چھوڑا تھا۔ کبھی تو تمہاری باتوں میں نفرت کے ایسے لپکے ہوتے ہیں کہ میرا اندر باہر جھلس جاتا ہے اور کبھی۔۔۔ کبھی تمہاری آنکھوں میں وہ شبنم اتر آتی ہے جو پور پور میں ٹھنڈک بھر دیتی ہے۔۔۔ کیا چیز ہو تم دوئی۔"
وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا جو روئی روئی سرخ آنکھوں، بھیگے رخساروں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔
اچانک ماحول پہ چھانے والے اس وقتی سکوت کو کال بیل کی آواز نے توڑ ڈالا۔
"ابا جی آ گئے۔۔۔"
دعا اطلاع دیتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی۔
"یہ اچھی بات ہے۔"
شہزاد واپس جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے ایک بار پھر صوفے پہ بیٹھ گیا۔
"ان سے بھی اس مسئلے پر بات ہو جائے تو بہتر ہے۔ تمہارے مقابلے میں تو کچھ زیادہ ہی عقل ہو گی ان کے پاس۔ ویسے ان سے بات کیے بغیر میرا اندازہ ہے کہ اس رشتے میں ان کی رضامندی نا ہونے کے برابر ہو گی۔"
دعا نے کوئی جواب دینا مناسب نا سمجھا۔

☼ ☼ ☼

رکشے سے اترتے ہوئے بابر ہمایوں مغل نے گھر کے باہر کھڑی وائٹ کرولا دیکھی۔ مگر زیادہ غور نا کیا۔ اندر مختصر سے کار پورچ میں دعا کی سیکنڈ ہینڈ سوزوکی ایف ایکس بھی کھڑی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ گھر پہ ہی موجود ہے۔
"ہمیں اصرار کے ساتھ بلا کے وہ جائیں گی بھی کہاں؟" وہ خود بخود مسکرا اٹھا۔
"اور یہ۔۔۔ آیا ہو گا کوئی نا کوئی پروڈیوسر، میوزک ڈائریکٹر۔۔۔"
لاپروائی سے شانے اچکاتے ہوئے اس نے کال بیل پہ ہاتھ دھرا۔
آج اس کی شامت اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔

● ● ●

ایک چٹیل کھلا میدان تھا۔
سرخ مٹی سے اٹا ہوا۔۔۔ آسمان کا رنگ بھی سرخی مائل مٹیالا سا تھا۔
اچانک انہوں نے اس گرد گرد فضا میں ایک معطر آسمانی آنچل پھڑپھڑاتے دیکھا۔
وہ جو اس منظر کی دہشت سے سہمے ہوئے ایک جانب چپ چاپ کھڑے تھے اس آسمانی جھلک کو دیکھ کر جی اٹھے

تھے۔ اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو بمشکل جماتے وہ اس جانب بڑھنے لگے تھے مگر۔ مگر وہ آنچل دور۔۔۔ اور دور بہت دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اس آنچل کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ ایک باغیچے میں آن پہنچے۔ تپتی سلگتی ریت کی بجائے ٹھنڈی گھاس کی نمی پیروں تلے محسوس ہوئی تو قدم ایک دم رک گئے۔ ان کی نظریں تو مسلسل اس آگے آگے اڑتے آنچل پر جمی تھیں۔ اپنے گرد و اطراف کی تبدیلی کی جانب دیکھ ہی نہ سکے۔ اب جو پل بھر کو رک کے دیکھا تو سارا منظر تبدیل ہو چکا تھا۔

آسمان پہ سرخی کی بجائے نیلاہٹ کا راج تھا۔ اتنا ہی نیلا۔۔۔ جتنا کہ یہ آنچل تھا جس کی کشش انہیں دوڑائے جا رہی تھی۔

وہ ریتلا جھلستا میدان کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ یہ تو ایک سرسبز و شاداب، بھینی مہک سے سانسوں میں اور گل و برگ کی رنگینی سے نظروں میں سماتا ایک حسین و دلکش سماں تھا۔ مگر ان کی بے چین نظریں کسی بھی منظر پہ جم نہ پا رہی تھیں۔ وہ تو اب بھی متلاشی انداز میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

ان کی نگاہوں نے وہ پالیا جس کی تلاش میں بھٹکتے وہ یہاں تک آن پہنچے تھے۔ وہ آنچل سرخ پھولوں سے لدے ایک پیڑ کی اوٹ سے دوبارہ لہرایا تھا۔ وہ مقناطیسی انداز میں اس طرف بڑھے۔

"فرحت!"

زندگی میں پہلی بار انہوں نے اتنی بے ساختگی اور بے تکلفی سے یہ نام پکارا تھا ورنہ رعب حسن نے ہمیشہ احترام ملحوظ خاطر رکھنے پہ مجبور کیا۔

"فرحت! آپ کہاں تھیں؟ میں کب سے آپ کو تلاش کر رہا تھا۔"

انہوں نے آنچل کی اوٹ میں چھپے اس چہرے کو اپنی نظروں میں اتارتے ہوئے کہا جس کا ایک بھی نقش واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک دھندلاہٹ میں ڈوبا ہوا عکس تھا اور بس۔۔۔

ہوا کے دوش پہ لہراتے اس آسمانی آنچل کو دو نازک ہاتھوں نے بڑھ کے سمیٹا اور دوبارہ اچھی طرح اپنے وجود کو اس سے ڈھانپ لیا۔

"آپ نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔ آپ اتنا عرصہ آخر کہاں چھپی رہیں؟"

مگر ان کے سوال کا جواب دیے بغیر آسمانی پردے میں ملفوف وہ وجود دوسری جانب مڑ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی طاقت اسے کھینچ رہی ہو۔ وہ بھی بے ارادہ پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

ان کی نظریں اسی وجود پہ ٹکی تھیں جیسے نظروں کو یہ بے اعتباری ہو کہ ان کے پلٹتے ہی یہ وجود اوجھل ہو جائے گا۔ وہ کسی اور طرف دیکھ ہی نہ پا رہے تھے۔ اس کے باوجود اچانک کچھ فاصلے پہ آگے آگے چلتا وہ وجود یکدم غائب ہو گیا۔

انہوں نے بے قراری سے ادھر ادھر پلٹ کر دیکھا تو منظر کو ایک بار پھر تبدیل پایا۔

یہ کسی گاؤں کا منظر تھا۔ تین جانب سے کچی پکی گلیاں نکل رہی تھیں جبکہ سامنے وہ بڑی سی حویلی تھی جو رنگین جھنڈیوں اور پھولوں سے سجی تھی۔ اس کھلے سے میدان کے آثار بتا رہے تھے کہ کچھ دیر قبل یہاں خاصی رونق تھی مگر اب وہ کسی ذی روح کو یہاں نہ پا رہے تھے سوائے اپنے۔

زمین پہ پھٹے ہوئے غبارے۔۔۔ روندی ہوئی جھنڈیاں، ٹوٹی چوڑیوں کے کانچ۔۔۔ چورا چورا ہوئے پاپڑ۔۔۔ یہ بتا رہے تھے کہ یہاں کتنی بھگدڑ مچی تھی۔ قلفی والے، غبارے والے اور گولا گنڈا بنانے والوں کی ریڑھیاں کھڑی تھیں مگر نہ بیچنے والے موجود تھے نہ خریدنے والے نظر آ رہے تھے۔

شکر قندی والے اور پاپڑ والے کے خوانچے اوندھے بکھرے پڑے تھے۔ پلاؤ اور زردے کی دیگیں بھی الٹی ہوئی تھیں۔ ہر جانب گرد کا راج تھا۔۔۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے گھوڑے سرپٹ دوڑتے یہاں سے گزرے ہوں۔

اچانک حویلی کے اندر سے ماتم کی آوازیں آنے لگیں۔ ان کی وحشت سوا ہو گئی۔

"فرحت۔۔۔ فرحت۔"

وہ اپنا گریبان نوچتے چلانے لگے۔ اس ماتم میں ان کو ایسی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں جو ان کی بے حد عزیز ہستیوں کی تھی۔ جن کے متوقع غم کے خیال سے وہ بے حال ہو رہے تھے۔

"ہم یہاں ہیں۔۔۔ آپ کے بے حد پاس۔"

اس دھیمی آواز پہ وہ پلٹے۔

فرحت کہیں نظر نہ آئی مگر وہ آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

"اپنے آس پاس ہمیں تلاشیے، ڈھونڈیے ہمیں۔ ہم یہیں ہیں۔ یہیں کہیں، آپ کے ارد گرد۔"

پہلی بار انہوں نے اتنی لمبی بات کی تھی ورنہ ایک دو لفظ بھی وہ بمشکل ادا کر پاتی تھیں۔

"فرحت، فرحت۔۔۔ خدارا سامنے آ جائیے۔ چچی حضور اس صدمے کو سہہ نہیں پا رہیں۔ چچا حضور کا دل پھٹ جائے گا اور ہم۔۔۔ ہم تو۔" ان کی آواز گھٹ گئی۔

"ہمیں تلاش کیجیے۔ ہمیں آپ کی، آپ سب کی ضرورت ہے۔ آپ سب کی مدد کی۔ ہماری مدد کیجیے۔ آپ سب ہمارے اپنے ہیں اور اپنے ہی مشکل وقت میں مدد کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت آپ سب کی مدد چاہیے 'یہ ہمارا حق ہے' یہ حق ادا کر دیجیے۔"

وہ آواز مدد پکارتی رفتہ رفتہ دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

"فرحت!" انہوں نے پوری شدت سے چلانا چاہا مگر ان کی آواز اندر ہی گھٹ کے رہ گئی۔ گلے میں خراشیں ہی خراشیں محسوس ہو رہی تھیں۔

"نواب صاحب۔۔۔ نواب صاحب۔"

انہیں اپنے اوپر کوئی مہربان وجود جھکا ہوا محسوس ہوا۔

"نواب صاحب۔۔۔ کیا ہوا؟۔۔۔ آنکھیں کھولیے۔" انہوں نے شل ہوتے ہوئے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے صاحبزادی حرمت النساء کا متفکر چہرہ تھا۔

منظر ایک بار پھر تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھے اپنے بستر پہ۔

ان کا وجود پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور دل جیسے ناتواں سینے سے ٹکریں مار رہا تھا۔ وہ کہنی کا سہارا لے کر ذرا سا اٹھے۔

"طبیعت ناساز ہو رہی ہے آپ کی؟" انہیں اپنا سینہ مسلتے ہوئے دیکھ کر صاحبزادی حرمت النساء نے پوچھا۔

"پہلو میں وہی درد تو پھر محسوس نہیں ہو رہا۔"

"نہیں۔" بدقت انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"شاید کوئی برا خواب دیکھ لیا تھا آپ نے۔"

آہستہ سے کہتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر گاؤ تکیے سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ اس خواب کے تمام منظر ایک ایک کر کے دوبارہ بند پلکوں کے پیچھے منعکس ہونے لگے۔

"برا نہیں بلکہ بہت برا۔"

"خدانخواستہ ایسا کیا دیکھ لیا۔۔۔ نہیں نہیں ہمیں نہ بتائیے گا۔"

پوچھتے پوچھتے وہ خود ہی منع کرنے لگیں۔

"بلکہ کسی کو بھی نہ بتائیے گا کہتے ہیں برے خوابوں کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ کسی نہ کسی صورت سچ ہو کر سامنے آتے ہیں۔"

"اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ خواب سچا ہو۔"

"کیا؟۔۔۔ برا خواب اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ سچ ثابت ہو۔"

اچنبھے سے کیے سوال پہ نواب صاحب کچھ نہ کہہ سکے۔ کہتے بھی تو کیا۔ کیا یہ کہتے کہ۔

"ہم نے خواب میں صاحبزادی فرحت النساء کو مجسم دیکھا ہے۔ انہیں یہ کہتے سنا ہے کہ وہ ہمارے آس پاس بہت نزدیک موجود ہیں اور تب سے ہمارا دل پکار رہا ہے کہ کاش یہ خواب پورا نہ سہی مگر اس حد تک سچا ثابت ہو کہ وہ آج بھی زندہ سلامت ہمارے آس پاس موجود ہوں۔"

مگر یہ بات وہ ان سے کہہ نہیں سکتے تھے' وہ ان کی شریک حیات تھیں۔۔۔ ہر دکھ درد کی ساجھی۔۔۔ مگر کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی ساجھی نہیں ہوتا۔ دل انہیں بانٹنے پہ آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس درد کو تین عشروں سے بھی زیادہ عرصے سے دل میں چھپائے اکیلے سہتے آ رہے تھے لیکن یہ جو احساس تھا۔۔۔ اسے بانٹنا ضروری ہو گیا تھا۔۔۔ فرحت کی موجودگی کا احساس یہ احساس جو اس انجان مگر آشنا نقوش والے چہرے کو دیکھ کر دل میں جاگا تھا اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ یہ راز اپنی نصف بہتر سے بانٹیں یا نہیں۔

"وہ صاحبزادی فرحت النساء کی ہمشیرہ بھی تو ہیں۔ یہ بات ہم کیوں فراموش کر جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ہمارے یعنی اپنے شوہر کی زبانی ان کے دل میں چھپی اس اولین محبت کی یاد سن کر ملول اور دلگرفتہ ہی ہوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی اپنی ہمشیرہ کے ذکر سے بے قرار ہو جائیں۔ وہ بھی اس چہرے کو دیکھنا' اس ہستی سے ملنا چاہیں۔"

یہ سوچ کر بالآخر انہوں نے اپنی بیگم سے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"ہم نے۔۔۔ تم نے صاحبزادی فرحت النساء۔۔۔" یہ نام لینے کے بعد ایک ثانیے کو رک کر انہوں نے اپنی بیگم کا چہرہ دیکھنا چاہا جو ماسوائے تفکر کے۔۔۔ ہر تاثر سے پاک تھا۔ یہ نام سن لینے کے بعد بھی وہاں کوئی مدوجزر نہیں ابھرے تھے۔

"ہم نے انہیں دیکھا ہے۔"

ایک بار پھر انہوں نے نظریں سامنے اٹھا کر دیکھا۔

اب اس چہرے سے تفکر کی آخری پرچھائیں تک غائب تھی۔ بے حد سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھیں۔

نواب صاحب کو حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی بات پہ بھی انہوں نے کوئی ردعمل کیوں نہیں ظاہر کیا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

کچھ دیر بعد انہوں نے ایک گہری اور طویل سانس بھر کے کہا۔ نواب صاحب شدت سے اس غلط فہمی والی بات کو جھٹلانا چاہتے تھے لیکن ابھی انہوں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ مزید گویا ہوئیں۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے حضور۔۔۔ وہ آپا حضور نہیں ہیں۔ ہو بھی نہیں سکتیں۔۔۔ ہاں وہ ان جیسی لگتی ضرور ہیں اور اس اتفاق پہ حیرت ہمیں بھی ہے۔"

"آپ۔۔۔ آپ نے بھی۔"

"جی۔۔۔ ہم نے بھی یہ تصویر اخبار میں دیکھی تھی اور کوشش کی تھی کہ یہ اخبار آپ تک نہ پہنچے مگر۔"

"نہ پہنچتا تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا بیگم صاحبہ۔۔۔ اس تصویر کے اخبار میں شائع ہونے سے پہلے ہی ہم اس چہرے کو دیکھ چکے تھے۔۔۔ روبرو ہی کوئی مہینہ بھر پہلے۔"

"اور ہم آج سے چار مہینے قبل انہیں روبرو دیکھ چکے ہیں۔"

اس انکشاف پہ نواب صاحب نے استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

صاحبزادی حرمت النساء نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی ہم درست کہہ رہے ہیں۔ لیکن ہمیں آپ کی طرح یہ شائبہ نہیں ہوا کہ وہ آپا حضور ہوں گی۔ یہ تو ناممکنات میں سے ہے۔ اگر اللہ نے کوئی کرشمہ کر دکھایا تب بھی ان پہ عمر ٹھہر تو نہ گئی ہو گی۔ کیونکہ وہ دوشیزہ بمشکل بیس بائیس برس کی رہی ہوں گی۔ ہاں ہمیں اس درجہ مشابہت پہ حیرت ضرور ہوئی تھی۔ بغیر کسی تعلق یا رشتہ کے اتنی مشابہت کبھی دیکھنے میں نہیں آتی۔"

"اور آپ نے ان پانچ مہینوں میں ہم سے ذکر کرنا تک گوارا نہ کیا۔"

ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"کیا ذکر کرتے ہاں آپا بیگم سے ضرور تذکرہ کیا تھا اور انہوں نے اسے ہماری غلط فہمی قرار دے کر سختی سے متنبہ کیا تھا کہ ہم یہ بات آپ سے کر کے آپ کے ذہن کو پراگندہ کرنے کی کوشش مت کریں۔ لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ قدرت خود اس بات کو نہاں رکھنے پہ آمادہ نہیں۔"

"قدرت کا ہی ایک اشارہ ہمیں اس خواب میں ملا ہے۔"

وہ مختصر الفاظ میں اپنے خواب کا ذکر کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"احمق۔۔۔ گدھا۔"

گل مہر نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے شانوں پہ بکھرے بالوں میں تیزی سے برش چلاتے ہوئے بڑبڑا کے کہا تو دلگیر جو وہیں فرش پہ پوچا لگا رہا تھا' منہ پہ ہاتھ رکھ کے کمر لچکانے لگا۔

"آج سے پہلے تک تو آپ دوسروں کو ہی سناتی آئی تھیں بی بی۔۔۔ یہ آج چاند کہاں سے نکلا جو آئینے کے روبرو کھڑے ہو کے اپنے آپ کو ہی۔۔۔ کھی کھی کھی۔۔۔"

وہ ہنسی دبانے لگا۔ کہیں اس کی ہنسی سے مشتعل ہو کے اس کی آتش مزاج بی بی بڑا سا ہیئر برش اس کے دانتوں پہ ہی نہ دے مارے۔

"لیکن بی بی۔۔۔ احمق کی حد تک تو گوارا ہے۔ یہ آپ خود کو گدھا کس غلط فہمی میں کہہ رہی ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ ہم اپنے آپ کو نہیں بلکہ۔۔۔ تمہیں کیا؟! اپنا کام کرو چپ چاپ اور دفعان ہو جاؤ۔"

وہ پلٹ کر دھاڑی اور دلگیر سہم کر کام مکمل کرنے کی بجائے وہاں سے کھسک گیا۔

گل مہر نے ایک بار پھر آئینے کو گھورا۔ اس کے صبیح و گل رنگ چہرے پہ سجی دو بڑی بڑی آنکھوں میں غصہ تھا گلہ تھا۔۔۔ اور بے زاری بھی۔

"کبھی جب تم غصے میں نہیں ہوتیں تو بڑی اوپری اوپری۔۔۔ الگ الگ سی دکھتی ہو۔ یہ ہلکا ہلکا سا غصہ ہی تمہاری سرمئی آنکھوں کا سارا حسن ہے اس لیے مجھے کبھی برا نہیں لگا۔"

ایک بار عمیص نے اس کے کسی بات پہ چیخنے چلانے پر بڑے سکون بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہی انداز جو اسے کبھی ڈھٹائی اور بے غیرتی لگا کرتا تھا۔

"گدھا۔۔۔ یہ سارے مرد ہوتے ہی گدھے ہیں۔ سارا دن ہمارے عشق کی قسمیں کھاتا تھکتا نہیں تھا اور اب وہی عہد و پیمان اسی گھر میں' ہمارے سامنے ہماری ہی بہن کے ساتھ باندھتے ہوئے اسے ذرا سی شرم بھی نہیں آتی۔ ہمارا اس کے بارے میں اندازہ بالکل درست ہے۔۔۔ یہ شخص ہے ہی ڈھیٹ اور۔۔۔ اور یہ موتیا' صاحبزادی الماس خاتون بڑی قابلہ بنتی ہیں' علامہ جیسے زمانے بھر کی دانش و فراست ان محترمہ نے گھول کر پی رکھی ہو اور اس دوغلے کی باتوں میں فنافٹ آ گئی۔ ہنسی نہیں آتی ہو گی اسے اپنے منگیتر سے یہ سب باتیں سنتے ہوئے جو کبھی وہ اس کے سامنے ہی ہمارے لیے کہا کرتا تھا۔"

وہ بلاوجہ جھنجھلا رہی تھی۔

پہلے پہل اسے موتیا کی عمیص سے نسبت ٹھہرائے جانے پہ اعتراض اس لیے ہوا تھا کہ انہی دنوں شہزاد کے مسئلے کی وجہ سے وہ بکھری ہوئی تھی۔ اسے گھر والوں کا یہ فیصلہ بے رحمانہ لگا تھا کہ ایک طرف تو وہ ٹوٹے دل اور مجروح انا کو لیے سسکتی رہی اور دوسری جانب گھر میں خوشیاں منائی جائیں۔

اگر شہزاد کی حقیقت اتنی مکروہ نہ نکلتی۔۔۔ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جاتا تو اسے اس نئے رشتے پہ کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن اب جبکہ وہ اپنا اعتبار کھو چکی تھی۔ اس کی پسند' اس کی پرکھ جس پر اسے بہت مان تھا' اس کا کھوکھلا پن سب پہ واضح ہو چکا تھا ایسے میں عمیص' جسے وہ ٹھکرا چکی تھی' اس کا اپنی بہن سے وابستہ ہو جانا اسے لگتا سب بڑا سر جتانا چاہتے ہوں کہ ان کا انتخاب عمیص بہتر رہا' جبکہ اس کی ضد۔۔۔

اپنی غلطی کو وہ بھی تسلیم کرتی تھی مگر دل ہی دل میں۔ کوئی اور اسے اس کی غلطی کا احساس دلائے' یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

عمیص اب بھی اسے نظر انداز نہیں کرتا تھا نہ ہی اس کے ٹھکرائے جانے پہ وہ منہ چھپائے پھرا تھا اور نہ اب اس کی بہن سے وابستہ ہو جانے پہ کتراتا تھا۔ اس کے برعکس اس کا رویہ اب گل سے بے حد نارمل ہو چکا تھا۔ وہ معمول کے مطابق اس سے وہی روزمرہ کی عام باتیں کیا کرتا تھا۔۔۔ باقاعدگی سے حال چال بھی دریافت کیا کرتا۔۔۔ یہ رویہ گل کو اور مشتعل کر رہا تھا۔ اس کی تنگ نظری اسے یہ سمجھنے پہ مجبور کر رہی تھی کہ عمیص کے یہ انداز سراسر اسے چڑانے کی خاطر ہیں۔

"ہمیں دیکھ کے ہی خوامخواہ دانت نکل آتے ہیں موصوف کے۔ جہاں ہمیں پاتا ہے' موتیا سے ہنس ہنس کے باتیں کرنے لگتا ہے۔ ہونہہ' اس کا خیال ہوگا جیسے ہم ان دونوں کو دیکھ کے جل مریں گے۔ ہاں جلتے تو ہم ہیں مگر حسد سے یا رقابت سے نہیں بلکہ یہ سوچ کر کہ موتیا بے چاری کس احمق اور بے کار شخص کے نرغے میں آ گئی۔ توبہ' ذرا جو اس شخص میں کوئی مردوں والی بات ہو۔ ہر وقت گھر میں گھسے رہنا اور بی بیوں کی طرح گھریلو معاملات اور جھگڑوں میں خود کو ہلکان کیے رکھنا۔ سارے زنانہ شوق۔"

تلملاتی ہوئی وہ کمرے میں ٹہلتی رہی۔

☼ ☼ ☼

اپنے مخصوص لاپروا انداز میں بابر ہمایوں مغل نے دعا کے گیٹ پہ لگی کال بیل پہ انگلی رکھی۔

آج اس کی شامت اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔

"اس سے پہلے کہ آپ بیمار کا حال اچھا ہونے کا فتویٰ صادر کر دیں' ہم بتاتے چلیں کہ ان کے آنے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق۔۔۔"

سامنے دعا کا چہرہ دیکھتے ہی اس کی طبیعت چونچالی پہ آمادہ ہوئی مگر دعا کی سنجیدگی اور روکھا پن محسوس کر کے وہ سنبھلا۔

"خیریت؟ آپ کی پیشانی پہ یہ تردد کی شکن؟" کالے چوروں کی طرح دعا کے سامنے آتے ہی وہ اندر ہی اندر ہر وقت ڈرتا رہتا تھا کہ اس کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اب بھی اس کی گمبھیر سنجیدگی اسے کھٹکے میں ڈال رہی تھی۔

"کچھ دیر پہلے فون پہ بات ہوئی تو آپ بہت تر و تازہ محسوس ہو رہی تھیں اور اب۔۔۔"

دعا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ عقب سے شہزاد کی آواز ابھری جو کب سے انتظار کر رہا تھا کہ بابر کے ڈرامے ختم ہوں تو وہ اندر آئے۔

"ساری باتیں باہر کھڑے کھڑے کر لیں گے نواب صاحب یا اندر بھی تشریف آوری ہوگی؟"

اس چبھتے لہجے پہ بڑا عاشقانہ سا پوز بنائے کھڑا بابر ہمایوں مغل اچھل کے رہ گیا۔

دعا ایک طرف ہٹی تو اسے سامنے صوفے پہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا شہزاد ملک نظر آ گیا جو چہرے پہ جارحانہ

تاثرات لیے خونخوار نظروں سے اسی کو گھور رہا تھا۔

پچھلے دو روز کے بخار نے ویسے ہی بابر کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ اس نئی صورت حال پہ اس کا تو گلا خشک ہو گیا۔ ٹانگیں باقاعدہ کپکپانے لگیں۔

"سہارے کی ضرورت تو نہیں نواب صاحب؟"

شہزاد کے لبوں پہ بڑی زہریلی مسکراہٹ پھیلی۔

بابر نے دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ دعا کو مڑ کر دیکھنا چاہا جس کی آنکھوں کی الجھن رفتہ رفتہ بے یقینی میں بدل رہی تھی۔

"اندر جائیں یا پلٹ جائیں۔"

اس نے فیصلہ کرنا چاہا۔۔۔ عین دروازے کے بیچوں بیچ ان دونوں کے سامنے کھڑا وہ واپس پلٹنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ بالآخر طوعاً" و کرہاً" اس نے قدم اندر کی جانب بڑھا ہی دیا۔

"جو ہو سو ہو۔۔۔ دیکھ لیں گے اس بھانڈا بن بھانڈ کو بھی۔"

☼ ☼ ☼

"کیا اشارہ ملتا ہے اس خواب میں؟"

نواب صاحب سے ان کے خواب کا تذکرہ سن کے صاحبزادی حرمت النساء بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

"یہی تو سمجھ نہیں پا رہے۔ ایک جانب ہمارا وجدان ہمیں کہتا ہے کہ یہ خواب ایک غیبی اشارہ ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ہمارا وجدان ایسے خوابوں کے متعلق غلط بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے اکثر خواب سچ ثابت ہوتے ہیں۔ جب ان کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا تھا تب بھی کئی روز پہلے ہم نے خواب میں سیلاب اور دریا کی طغیانی دیکھی تھی۔ چچا حضور کی وفات سے ایک دن پہلے ہم نے خواب میں اس حویلی کے ستون بھر بھرے ہو کر گرتے دیکھے تھے۔"

"بجا فرمایا۔۔۔ ہمیں یاد ہے یہ خواب' آپ نے بہت پریشانی کے عالم میں سنایا تھا۔"

"ایسی اور بھی ان گنت مثالیں ہیں اس لیے ہمارا تشویش میں مبتلا ہونا فطری ہے۔ ہم اس خواب کو چاہ کر بھی جھٹلا نہیں پا رہے لیکن دوسری طرف عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ بھلا صاحبزادی فرحت کو اب ہم سے کس مدد کی حاجت ہے۔ جب تھی۔۔۔ تب تو ہم کام نہ آ سکے اور اب وہ ہر حاجت۔۔۔ ہر طلب سے ماورا ہو چکی ہیں۔"

"ہماری ناقص رائے کے مطابق تو۔۔۔"

وہ بات کرتے کرتے ذرا سا ہچکچائیں تو نواب صاحب نے حوصلہ افزا نظروں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے گویا بات مکمل کرنے کا عندیہ دیا۔

"ہمارا خیال تو یہ ہے کہ قرآن خوانی کا اہتمام کروا کے ان کی مغفرت اور ایصال ثواب کے لیے حاجت مندوں میں دو وقت کا کھانا تقسیم کروا دیا جائے۔"

"آپ کا مشورہ درست اور قابل قبول ہے لیکن معذرت کے ساتھ۔۔۔ ہمارا نہیں خیال کہ اس عمل سے ہماری تشفی ہو پائے گی۔ نجانے کیوں مگر ہر بار ہمارے دل و دماغ میں ایک ہی راہ سجھائی دیتی ہے اور وہ ہے اس بچی سے ملنا۔ ہمیں یہ پتا تو لگانا چاہیے کہ آخر وہ ہیں کون؟"

"آپ جانتے تو ہیں۔"

صاحبزادی حرمت النساء کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔ شاید شہزاد ملک کا حوالہ دینا انہیں ناگوار امر محسوس ہو رہا ہو۔

"انہی حضرت کی عزیزہ ہیں جو آئے تھے جھوٹ کے پلندے اٹھائے ہوئے۔"

ان کے انداز میں اکتاہٹ تھی۔

صاحبزادہ نفیس علی خان نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"ناممکن' دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صورت' وہ آواز' وہ انداز۔۔۔ سب کسی اور کی یاد دلاتا ہے۔" بے خودی میں کہے گئے ان کے یہ اپنے الفاظ انہیں بیگم کے سامنے محجوب کر گئے۔ جھینپ کر انہوں نے نظریں چرائیں اور اپنے عصا پہ گرفت مضبوط کر کے اس کیفیت سے نکلنے کی کوشش کی۔

"بہر حال ہمیں اپنی اس الجھن کا سرا ڈھونڈنا ہے۔ آپ برائے مہربانی عمیص میاں کو ہمارے پاس بجھوائیے۔ ہمیں ان سے بات کرنا ہے۔"

"اس معاملے میں؟"

وہ غلط حیران نہیں ہوئی تھیں۔ آج تک بچوں کو ان کی بڑی خالہ کے ساتھ گزرنے والے حادثے سے دانستہ بے خبر رکھا گیا تھا۔

"جی۔" انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

"ہمیں امید ہے وہ معاملے کی تہ تک پہنچنے میں ہماری مدد کریں گے۔"

"لیکن وہ تو آپا حضور والی بات سے لاعلم ہیں۔"

"دیکھیں بیگم۔۔۔ اگر ہم نے بچوں کو اس بات سے آگاہ نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم اس بات کو راز رکھنا چاہتے تھے یا اس میں ذلت و رسوائی محسوس کرتے تھے۔ واللہ ہمیں ناز ہے کہ ہمارے خاندان کی عفت مآب خاتون نے جان دینا خوشی خوشی گوارا کر لیا مگر اپنی عزت اور اپنے بزرگوں کی ناموس پہ آنچ نہ آنے دی۔ ان کی ناگہانی وفات ایک سانحہ سہی لیکن جو مثال انہوں نے قائم کی وہ قابل فخر ہے۔ اگر ہم نے اپنی نئی نسل کو اس سے بے خبر رکھا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ کبھی اس گھر کی فضا میں یہ تکلیف دہ ذکر دوبارہ چھڑے اور آج۔۔۔ آج اتنے سالوں بعد نہ چاہتے ہوئے بھی صاحبزادی فرحت النساء ایک بار پھر ہمارے دل و دماغ میں زندہ ہو رہی ہیں تو کیا مضائقہ ہے اگر ہم اپنی اس الجھن کو رفع کر لیں اور اس سلسلے میں صاحبزادہ عمیص ہی ہمارے مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں آپ انہیں کہلوا دیجیے کہ ہم نے یاد کیا ہے۔"

"یہ تے شہزاد باؤ دی گڈی لگدی اے۔" (یہ تو شہزاد کی گاڑی لگتی ہے)

نیم وا گیٹ دھکیل کر اندر آتے اللہ وسایا کی نگاہ گاڑی پہ گئی تو اس کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا۔

"کہیں فیر نہ کوئی بہانہ لگا کے بالو بھرجائی نے دوئی کو لینے بھیج دیا ہو۔ خیر۔۔۔ ڈرنے کی کیا لوڑ۔۔۔ کوئی ان کا دیا کھاتا ہوں۔ آج تو سناؤں گا کھری کھری۔۔۔ بڑا آیا ہمارے رزق کا بیڑہ غرق کرنے والا۔۔۔ میری کڑی کا کام دھندہ چھوٹ کرنا چاہتا ہے' وڈا چوہدری سارے شہر کا۔"

بڑبڑاتے ہوئے بڑے بڑے تیوروں کے ساتھ اس نے گھر میں قدم رکھا مگر۔۔۔

مگر اندر کا منظر اس کی توقع سے بہت آگے تھا۔

بابر ہمایوں مغل باقاعدہ گھگھیا رہا تھا اور اس کا پھٹا ہوا گریبان شہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ سب سے حیرت انگیز چیز دعا کا رد عمل تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے "اس کا کوئی رد عمل نہ ہونا ہی حیرت انگیز امر تھا۔

وہ سپاٹ چہرہ لیے خالی خالی نظروں سے سامنے یوں تک رہی تھی جیسے اس کے آگے کوئی بہت ہی غیر دلچسپ تماشا ہو رہا ہو جسے زبردستی دیکھنا پڑ رہا ہو۔

"اوئے شہزادے۔۔۔"

اللہ وسائے نے سودے کے تھیلے وہیں فرش پہ پھینکے اور للکارتا ہوا آگے بڑھا۔

"اوئے چھڈ میرے جوائی کا گلا۔۔۔ حیا کر بے غیرتا۔ دعا کے رشتے سے یہ تیرا بھی کچھ لگتا ہے اور تو اس پہ ہاتھ اٹھا رہا ہے۔ ویسے تو بڑا عزت والا خاندانی بنتا ہے۔ اوئے ہم میراثی اچھے۔۔۔ جو جوائی کو عزت تو دیتے ہیں۔"

"پوری بات پہلے سن لے۔۔۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ یہ کتنی عزت کے قابل ہے اور کتنی بے عزتی کے لائق۔"

"اور تو کیا چپ چاپ تماشا دیکھ رہی ہے کڑیے۔" اس نے پلٹ کے دعا کو ڈپٹا۔

وہ حیران تھا کہ ویسے تو وہ بابر کے خلاف اس کی ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کر پاتی اور اب شہزاد کے ہاتھوں اس کی عزت افزائی پہ خاموش بیٹھی ہے۔ زیادہ تاؤ اسے اسی بات پہ تھا' ورنہ بابر کے لیے اس کے سینے میں بھی کوئی پدرانہ شفقت نہیں امنڈ رہی تھی۔ اسے لگا جیسے ایک بار پھر اس کی بیٹی نے اس کے مقابلے میں کرم الٰہی اور اس کے خاندان کو فوقیت دی ہے۔ ان لوگوں کی بڑی سے بڑی زیادتی بھی وہ ایسے ہی نظر انداز کر دیا کرتی ہے۔ (اس کی ذاتی رائے کے مطابق)

"آپ ہی انہیں سمجھایئے' ہماری تو یہ ایک سننے پہ تیار۔۔۔"

بابر نے ایک حمایتی پا کے مزید ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر شہزاد کے الٹے ہاتھ کے کرارے تھپڑ نے اسے اپنا فقرہ پورا نہ کرنے دیا۔

وہ الٹ کے میز پہ جا گرا تھا۔

اللہ وسایا جو آگ بگولا ہو رہا تھا' شہزاد کے اس انتہائی اقدام پہ سن ہو کے رہ گیا۔ اب اسے احساس ہونے لگا کہ کوئی بہت ہی سنگین وجہ ہو گی جو وہ اس طرح کے طرز عمل پہ اتر آیا ہے اور پھر بابر ہمایوں کی کمزوری بھی اسے وسوسے میں ڈال رہی تھی۔ سچا بندہ یوں چپ چاپ مار نہیں کھاتا۔ یہ خیال اسے اپنے اس متوقع داماد کی جانب شکی نظروں سے دیکھنے پہ مجبور کر گیا۔

خود بابر کو بھی توقع نہیں تھی کہ شہزاد اس پہ یوں ہاتھ تک اٹھا لے گا۔ وہ اپنے سنسناتے گال پہ ہاتھ رکھے بے یقینی کے عالم میں کتنی ہی دیر تک وہیں اوندھا گرا یہ سوچتا رہا کہ آخر یہ نوبت یہاں تک پہنچی کیسے۔

پچھلے دس بارہ منٹ سے وہ شہزاد کی ہر بات ہر الزام بڑی ڈھٹائی سے جھٹلاتا آ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ثابت قدمی سے اپنے جھوٹ پہ ڈٹے رہنے کی وجہ سے وہ دعا کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے گا کہ شہزاد اس پہ غلط الزام تراشیاں کر رہا ہے مگر لیکن شہزاد کا پروثوق انداز یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ آج معاملہ پاک کر کے رہے گا۔ اور اب اس کا یہ تھپڑ اسے دعا کے سامنے اور ہلکا کر رہا تھا۔

کسی موہوم سی آس کے سہارے اس نے پیچھے مڑ کے دعا کو دیکھنا چاہا۔

اس کی نگاہیں سرد تھیں۔

چہرہ بے تاثر تھا۔۔۔ شناسائی اور اپنائیت کے کسی بھی احساس سے یکسر پاک۔

یقین اور اعتبار سے کوسوں دور۔

اور پھر اگلے ہی لمحے دعا نے یہ سرد اجنبی نگاہیں بھی پھیر لیں۔ اپنا بے تاثر چہرہ بھی دوسری جانب کر لیا۔

بابر ہمایوں مغل کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اب اسے کسی قسم کا کوئی آسرا نہیں رہا۔

"یہ دنیا بھی ہار گئی۔"

یہ خیال اسے توڑنے کی بجائے دلیر بنا گیا۔ یہ ایک ایسی دلیری تھی جو بے غیرتی اور بے حسی کی انتہا پہ جا کر حاصل ہوتی تھی۔ جب سب پردے چاک ہو جائیں تو ڈر کس بات کا۔

اب ایسا کیا رہا تھا جسے چھپانے کے لیے وہ شہزاد کے سامنے گھگھیاتا۔ جس کی نظروں میں مقام برقرار رکھنے کی خاطر سو سو بہانے بنا کے اسے جھٹلا رہا تھا۔ اس کے رویے میں تبدیلی وہ بھانپ چکا تھا۔

"تم دو کوڑی کے بھانڈ۔۔۔ سالے ہم پر ہاتھ اٹھایا۔۔۔؟"

اب شہزاد کا گریبان اس کے ہاتھ میں تھا۔ جسے شہزاد نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔ اور اسے دوبارہ پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑایا۔ مگر پھر دیوار کا سہارا لے کر سنبھل گیا۔

اس بار اس نے ہاتھا پائی سے گریز کیا کہ مقابل کا خود سے تگڑا ہونا صاف ثابت تھا۔ اس نے محض زبان کے گوہر اگلنے پہ اکتفا کیا۔

"ارے ہم تھوکتے ہیں تم پہ۔ اور تمہارے خاندان پہ۔" اس نے تھوک نہیں گویا زہر اگلا تھا۔

"یہ خاندان، جس کی لڑکیوں کو پہلے تو خود بنا سنوار کر بازار میں لاتے ہو۔ گاہک ڈھونڈتے ہو اور اس کے اور خریدار کی جیب جانچنے کی بجائے اس کا اگلا پچھلا کھنگالنے لگتے ہو۔ اتنا تردد کس چیز کا۔۔۔؟ نئے تو نہیں ہو۔ اس دھندے میں۔ جدی پشتی بازاری لوگ ہو۔ اتنا بھی۔۔۔ نہیں جانتے کہ خریدنے والا چاہے کالا چور ہو، اگر منہ مانگی رقم دے تو بیچنے والے کی کیا مجال کہ اس پر انگلی اٹھائے۔"

اتنا ہذیان بکنے کا مقصد صرف اور صرف شہزاد کو مشتعل کرنا تھا اور اس کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔

"بکواس بند کرو۔۔۔ بند کرو اپنی یہ فضول گوئی، ورنہ خدا کی قسم۔۔۔ آج میرے ہاتھوں تمہارا قتل ہو جائے گا۔"

"واللہ۔۔۔ بہت خوب، آج یہ نظارہ بھی دنیا کو دیکھ لینے دو۔ کسی میراثی کے ہاتھوں قتل ہونا بھی اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہوگا۔ ارے میاں جاؤ۔۔۔ ان ہاتھوں میں طبلہ، سارنگی ہی بھلی لگتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ہوں میں ذات کا بھانڈ۔۔۔ نسل کا میراثی۔ ایک گڑوی بجانے والی عورت کا بیٹا۔۔۔ مانتا ہوں میں۔ کیا تم میں ہے اتنی ہمت کہ یہ اقرار کر سکو کہ تم کیا ہو؟"

وہ حلق پھاڑ کے دھاڑا۔ اس کی آواز اس کی اپنی نہ لگ رہی تھی۔۔۔ نہ یہ الفاظ۔ اپنا آپ اس نے کبھی آئینے کے روبرو نہ تسلیم کیا تھا کجا کہ تین افراد کے سامنے کرنا۔

"ہم۔۔۔ ہم کیا ہیں؟" بابر نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"ہم کیا ہیں۔۔۔ یہ ہمیں منہ سے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میاں۔ ایک زمانہ جانتا ہے، ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو۔ اس ملک کا کوئی سا بھی شہر کھود ڈالو۔ ہر شہر میں ایسے بیسیوں افراد مل جائیں گے جو خود یا ان کے بڑے کبھی ہمارے محل کے دربان، خادم یا محافظ رہ چکے ہوں گے۔ تم کیا جاننا چاہتے ہو ہمارے متعلق؟"

"وہ جو تم اصل میں ہو۔ تم نے میرے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ میرا اصل نہیں ہے۔ انسان کا اصل وہ نہیں ہوتا جو وہ یا اس کے باپ دادا پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ اصل پہچان وہی ہے۔ جو وہ خود بناتا ہے۔ وہی حوالہ درست ہے۔ جس سے وہ جانا جاتا ہے۔ میرا اصل یہ ہے شہزاد ملک۔۔۔ ایک کامیاب، نامور اور عزت دار بزنس مین۔ جس کی معاشرے میں اچھی ساکھ ہے۔ لوگ اسے تعظیم دیتے ہیں اور تم۔۔۔ تمہاری اصلیت کیا ہے؟ میرے بڑے جو کچھ کرتے تھے میں نے اس پہ لعنت بھیج کر اپنی راہ خود منتخب کی، کٹھن محنت کر کے یہ مقام حاصل کیا کہ آج مجھے حاصل ہونے والی عزت و توقیر کی وجہ سے ان کی روحیں بھی شاد ہوں گی، اور تم۔۔۔ تم نے اپنی گزری سات نسلوں کا نام ڈبو دیا ہے۔ جس کمین کام کے طعنے تم مجھے دے رہے ہو وہ تم خود کرتے ہو۔ زمانہ جانتا ہے کہ تم ملک مقبول کے پٹھو ہو، اس کے لیے دلالی جیسا مکروہ کام کرتے ہو۔ ناچنے گانے والیوں اور جسم فروش عورتوں کی "بخشش" پہ گزارا ہے تمہارا۔ بولو ہے تم میں اتنی ہمت کہ یہ اقرار کر سکو۔"

"ہاں ہے۔" شہزاد کے تاؤ دلانے پہ وہ مان گیا۔

"مانتے ہیں ہم کہ بابر ہمایوں مغل ویسی ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ تمہاری اس سگی کے پیچھے ہم وقت ضائع کر رہے ہیں، تو صرف ملک مقبول کے کہنے پہ، لیکن تمہیں اس کا اتنا درد ہے تو اسے بازار میں سجا کیوں رکھا ہے۔ بازار میں سجی چیز کے ساتھ جس کا جو جی چاہے گا وہ کرے گا۔ چاہے خریدے، چاہے روندے۔ چاہے دلالی کرے۔"

شہزاد تو شہزاد۔۔۔ اللہ وسایا بھی اس بات پہ کانپ کے رہ گیا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دعا کو دیکھنا چاہا، جو سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔

اپنی بات کہہ چکنے کے بعد بابر نے باہر نکلنے میں دیر نہ لگائی۔ اب یہاں اس کے لیے رہ بھی کیا گیا تھا۔ سوائے ذلت کے۔

☆ ☆ ☆

عمیص کافی دیر سے سامنے رکھی نوٹ بک میں لکھے نمبر کو گھور رہا تھا۔

یہ نمبر شہزاد ملک کا تھا اور اس نے پتا نہیں کیا سوچ کے اپنے ٹیلی فون سیٹ کی اسکرین سے یہ نمبر تب نوٹ کیا تھا جب کل مہراں کے اسٹور پہ پہلی بار شہزاد کو فون کرنے آئی تھی۔ تب سے یہ نمبر یہاں محفوظ تھا اور اس نے دوبارہ اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ لیکن آج اسے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

چچا حضور نے جو کام اسے سونپا تھا، اس سلسلے میں پہلا قدم اٹھانے کے لیے اسے فی الحال یہی ایک راہ سوجھ رہی تھی۔

"لیکن جو کچھ چچا حضور نے بتایا ہے، پہلے میں جی بھر کے اس پہ حیران تو ہو لوں۔"

اس نے نوٹ بک میں پین رکھ کے اسے بند کر دیا۔ جو انکشاف کل رات صاحبزادہ نفیس علی خان نے اس کے سامنے کیا تھا، اس پہ یہ یقین کر کے بھی نہ کر رہا تھا۔ یہ بات اس کے چچا حضور جیسے معتبر انسان نے نہ کی ہوتی تو وہ اسے نری گپ سمجھتا لیکن اب۔۔۔

"عجیب سی بات ہے، ایسا تو کہانیوں، فلموں میں ہوتا ہے۔ فلمی اور ڈرامائی سی سچویشن ہے۔ ہم شکل، عجیب اتفاق ہے۔ مگر جو بھی ہے، چچا حضور کی اس الجھن کو رفع کرنا تو ہوگا۔ پہلی بار انہوں نے مجھ پہ اعتماد کرتے ہوئے اپنا کوئی ذاتی کام مجھے کہا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ محض ان کی غلط فہمی نہ ہو، بلکہ ویسا ہی ہو جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں۔ یعنی قدرت کا کوئی اشارہ۔۔۔ لیکن کیا شہزاد کو براہ راست فون کر کے اس کی کزن کے بارے میں دریافت کرنا مناسب ہوگا؟ کہیں وہ برا ہی نہ مان جائے۔ خود مجھے برا لگ رہا ہے پھر۔۔۔ پھر اور کیا کیا جائے۔"

اس نے نوٹ بک ایک بار پھر کھولی۔ اور دوبارہ بند کر دی۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ شہزاد کو فون کر کے دعا کے متعلق دریافت کرے یا اس تک پہنچنے کی کوئی اور راہ تلاش کی جائے۔

کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد بالآخر اسے راستہ مل ہی گیا۔

"ہاں تنویر ریاض۔۔۔"

اپنے زمانہ طالب علمی کے اس دوست کا نام یاد آتے ہی وہ اس وزیٹنگ کارڈ کو تلاشنے لگا جو کچھ عرصہ قبل ایک اتفاقیہ ملاقات میں تنویر نے اسے دیا تھا۔ وہ اب شعبہ صحافت سے منسلک تھا اور صحافت بھی شوبز کی صحافت۔

"ہاں یہ رہا وہ کارڈ۔۔۔" اس نے کارڈ نکال کے اس پہ لکھے فون نمبرز پر نظر دوڑائی۔

"یقیناً" تنویر، دعا کے متعلق کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا۔ اور زیادہ تفصیل سے نہیں تو کم از کم اس کا پتہ ٹھکانا تو بتا ہی دے گا۔ فلمی صنعت سے وابستہ صحافی کو اتنا علم تو ہونا چاہیے۔"

اس نے پورے یقین کے ساتھ تنویر ریاض کا سیل نمبر ڈائل کیا۔

بابر ہمایوں مغل ماؤف ہوتے ذہن اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ سڑکوں پہ بے مقصد گھوم رہا تھا۔

ہر طرح کی ٹریفک پورے زور و شور سے رواں تھی۔ ٹریفک کے شور سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے لیکن وہ۔۔۔ ان آوازوں سے بہت دور تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار شہزاد ملک کے جملے گونج رہے تھے۔ اور ہر بار وہ نئے سرے سے سلگ جاتا۔

"خدائی فوجدار۔۔۔ بھلا کیا ملا اس نامعقول شخص کو، ہماری راہ میں روڑے اٹکا کے۔ اچھا بھلا کام بگاڑ کے رکھ دیا۔ خبیث نے۔۔۔ ہا۔۔۔ زندگی بننے جا رہی تھی۔ دبئی کی آزاد فضا بے فکر زندگی۔۔۔ روپے پیسے کی فراوانی۔ پھر ذمہ داری سے آزادی اور۔۔۔ اور سب سے بڑھ کے اس پری وش کا ساتھ۔"

اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ وہ ابھی ابھی کیا کچھ ہار کے آ رہا ہے۔ اس نے محض ایک پر تعیش زندگی گزارنے کا موقع ہی نہیں گنوایا بلکہ ادا کا اعتبار، اس کا خلوص اور اس کی محبت بھی کھو دی ہے۔ اسے اپنا آپ ایکدم تہی داماں محسوس ہونے لگا۔

"اب ہم کریں گے کیا۔۔۔ کہاں جائیں گے۔۔۔ ملک مقبول اتنے مہینوں سے ہمیں مفت کی نہیں کھلا رہا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ ہم نے اس کی سرمایہ کاری ڈبو کے رکھ دی ہے تو وہ آئندہ ہمیں قریب بھی نہ بھٹکنے دے گا۔۔۔ پہلے

ہی قرضوں کا اتنا بوجھ ہے۔ اور گھر۔۔۔ گھر میں ہم نے اداجی کی وجہ سے الگ بگاڑ پیدا کر رکھا ہے۔ زیورات بھی بکوا دیے۔۔۔ اف۔۔۔ ہم تو نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ اب جائیں تو کہاں جائیں۔۔۔ لے دے کے ایک یاروں کا ڈیرہ بچتا ہے۔ گھر جا کر بیچ بیچ کرنے یا ملک مقبول کے سوالوں کا جواب دینے سے بہتر ہے کہ ہم وہیں جا پڑیں۔۔۔ دو چار روز کے سگریٹ پانی کا خرچہ تو دے ہی۔"

وہ اپنے ہی جیسے آوارہ نکمے اور نشئی دوستوں کے اس مخصوص ڈیرے پہ جا پہنچا جسے اس نے اپنی عارضی پناہ گاہ کے طور پہ منتخب کیا تھا۔ وہاں جا کے نشے میں ڈوبنے کے بعد اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا۔

سارے تفکرات بھک سے اڑ گئے۔ اسے نہ اپنی ناکامی یاد رہی' نہ بے عزتی۔ نہ مستقبل کا خوف ستا رہا تھا' نہ ہی اخراجات کے اندیشے۔ اب وہ بے خودی کے گہرے بادلوں میں جا چھپا تھا۔

اچانک ان گہرے سایوں میں سے اس نے دو شکوہ کناں آنکھیں ابھرتی دیکھیں۔

یہ روئی روئی سی آنکھیں دعا کی تھیں۔

"اداجی۔۔۔" اس نے بے ربط سانسوں کے ساتھ یہ نام ادا کیا اور اٹھنے کی کوشش میں دوبارہ ڈھیر ہو گیا۔

"غصے میں اس بھانڈ کے بچے کو ہم نے پتہ نہیں کیا کیا سنا ڈالا' یہ بھی نہ سوچا کہ اداجی کے دل پہ کیا گزرے گی۔" اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی دوبارہ کوشش کرتے ہوئے سوچا جس پہ اس کے اندر کسی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"تمہیں دوسروں کے دل کی پروا کب سے ہونے لگی بابر ہمایوں مغل۔"

وہ خجل ہو گیا۔

بے شک اس سے کوئی جواب نہ بن پایا تھا مگر یہ سچ تھا کہ اپنی ناکامی کے بعد اب اسے دعا کی نظروں سے گرنے اور اس کو پہنچنے والی ٹھیس کی خلش ستا رہی تھی۔

"بڑے عرصے بعد آنا ہوا نگاہ بائی۔"

نیاز کھوکھر کی مکروہ ہنسی میں ملفوف آواز سن کر نگاہ کی ہائی ہیل کی ٹک ٹک تھم گئی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے مڑی۔

ملک مقبول کا خاص کارندہ نیاز کھوکھر جو ایک ناکام فلمی موسیقار بھی رہ چکا تھا۔ سگریٹ کے کش لگاتا اس کے بنے سنورے سراپے پہ حریص نظریں دوڑا رہا تھا۔

"کتنی بار تمہیں کہا ہے کھوکھر کہ مجھے بائی کہہ کے مت پکارا کرو مگر تمہارے گندے دماغ میں اس ایک لفظ کی تکرار کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔۔۔؟ مجھے تو لگتا ہے گھر میں اپنی ماں بہنوں کے نام کے آگے بھی یہی لفظ ٹانک دیتے ہو گے۔"

کوئی اور ہوتا تو اس بے حد طیش دلا دینے والے طعنے پہ مرنے مارنے پہ تل جاتا مگر یہ دنیا ہی اور تھی۔ ماں بہنوں کو سب گھر تک رکھ کے آتے تھے اور ساتھ ہی اپنی غیرت کو بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اتنا سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے پیلے دانتوں اور نیلے مسوڑھوں کی نمائش کرتا رہا۔

"میڈم بننے کی چاہ ہے؟ تو ہاں تو کہتی میری رانی۔۔۔ لائف بنا دی ہوتی تیری۔ آج مزے کرنے کے لیے ادھر ادھر چکر لگا کے کام نہ مانگ رہی ہوتی۔ تیری کوٹھی کے آگے لائنیں لگی ہوتیں فلموں میں سائن کرنے کے لیے۔ میڈم نگاہ ہوتی۔۔۔ میڈم نگاہ۔"

"چل چل۔۔۔ اپنی لائف تو بنا نہ سکا میری کیا بنائے گا۔ میرا راستہ کھوٹا مت کر دو کھوکھر! کان پک چکے ہیں تمہاری بکواس سن کر۔ تمہاری کیا اوقات ہے جو تم کسی کی زندگی سنوار سکو یا بگاڑ سکو۔"

"ارے میڈم۔۔۔ اس راستے پہ ہم جیسے لوگوں کا پنجا پکڑ کر ہی منزل ملتی ہے۔ بڑی بڑی بائیاں ہم جیسے راستے میں پڑے لوگوں کی انگلی تھام کے میڈم بنی ہیں۔ چاہیے ثبوت تو بتاؤں دو چار نام۔"

"فی الحال تو یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ہونہہ۔۔۔ تمہاری انگلی پکڑ لوں۔ تم نے نگاہ کو سمجھا کیا ہے کھوکھر! میں سارے زمانے کو عقلیں سکھاتی ہوں اور تم چلے ہو مجھے الو بنانے۔ جاؤ کسی اور کا دماغ کھاؤ جا کے۔"

"واہ۔ واہ۔ سارے زمانے کو عقل۔۔۔ تو تمہاری وہ سہیلی کیوں محروم رہ گئی تمہاری اس خیرات سے۔ تھوڑی سی عقل اس بیچاری کو بھی دے دیتی تھی جو مغل جیسے بندے کی انگلی پکڑ کر میڈم تو نہیں البتہ بیگم صاحبہ بننے کے خواب ضرور دیکھ رہی ہے۔"

"وہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اور بابر جیسا بھی ہے' بہر حال ادا سے مخلص ہے۔ شادی کر رہا ہے وہ اس سے۔" نگاہ نے وہ بات کی جس پہ خود اسے بھی کم ہی یقین تھا۔ اس کا اظہار اس کے کھوکھلے لہجے سے ہو رہا تھا۔

"چارہ ڈال رہا ہے۔" کھوکھر نے ہنکارا بھر کے کہا۔

"چارہ ڈالنے کے لیے اس بیچارے کے پاس ہے ہی کیا؟"

"ہاں اس کے پاس کچھ نہیں۔ یہ چارہ وہ ملک صاحب سے مانگ کر دے رہا ہے۔"

نیاز کھوکھر نے ذرا جھک کے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"اور ملک صاحب تو مانگے پہ کسی کو اپنا تھوک بھی نہ دیں۔ یہ چارہ وہ بابر کے ذریعے ادا تک کیوں پہنچا رہے ہیں۔ اس کا مطلب تم صاف سمجھ جاؤ۔ مغل چڑیا کو گھیر گھار کے ملک صاحب کے پنجرے تک لا رہا ہے۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ تم تو ملک مقبول کے خاص چمچے ہو پھر اس کے راز سرعام کیوں اگل رہے ہو؟ مجھے تمہاری کسی بات کا یقین نہیں۔"

"نہ کرو یقین۔۔۔ تمہیں یقین دلا کے کیا مجھے میڈل لینے ہیں۔ یہاں تو کسی کے پیچھے زندگی گلا لو میڈل تب بھی نہیں ملتا۔ کیا نہیں کیا میں نے ملک صاحب کے لیے اور جب ایسا سنہری موقع ملا تو اس ناکارہ اور باتونی مغل کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ ناقدروں کی دنیا ہے یہ۔"

نگاہ سمجھ گئی کہ یہ سارا چکر حسد کا ہے۔

"تو میرا شک درست نکلا۔ یہ مغل یونہی ادا کے پیچھے نہیں پڑا۔ مجھے ادا سے بات کرنا ہو گی۔"

تب تک وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے کچھ بتانے سے قبل ہی دعا پہ سب کچھ آشکار ہو چکا ہے۔

وہ یہاں کسی اور کام سے آئی تھی مگر اب نیاز کھوکھر سے بات کرنے کے بعد وہ وہیں سے پلٹ گئی۔ اس کا رخ دعا کے گھر کی جانب تھا۔

● ● ●

"کوئی نئی بات کرو نگاہ!"

نگاہ کی زبانی ساری بات سننے کے بعد دعا نے پھیکی سی مسکراہٹ اپنے افسردہ لبوں پہ سجا کے کہا۔

"ایک تو تمہاری ہٹ دھرمی۔"

نگاہ سمجھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی بابر کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں اس لیے بات کا رخ پلٹ رہی ہے۔ اسے بھی غصہ آ گیا۔ اب وہ پہلے سے تیز لہجے اور تند الفاظ میں بابر کا اگلا پچھلا کھنگالنے لگی۔

"اس بدذات کے ساتھ میں تمہیں ہرگز مقدر نہیں پھوڑنے دوں گی۔ اس سے تو اچھا ہے تو خودکشی کر لے۔ حرام کی زندگی جینے سے کہیں بہتر حرام کی موت مرنا ہے۔"

"خودکشی تو میں روز کرتی ہوں دوست۔ کبھی کبھی دن میں کئی بار اور ہر بار نئے انداز کی خودکشی۔"

دعا کی مسکراہٹ کچھ اور گہری کچھ اور پراسرار ہوئی۔

"میری محبت خودکشی۔۔۔ میرا فن خودکشی' میرا روزگار خودکشی' میرا ماحول خودکشی' میرا ماضی' میرا حال اور میرا مستقبل سب خودکشی میرے جذبات میرے احساسات یہ بھی خودکشی' میرا ہر عمل' ہر سوچ بس میری ذات کو مارنے کا دوسرا نام ہے۔ صبح خودکشی شام خودکشی۔"

"پی رکھی ہے کیا؟"

وہ مشکوک ہو کے اس کے بہکے بہکے انداز دیکھنے لگی۔

"ہاں پی رکھا ہے۔۔۔ زہر کا گھونٹ پی رکھا ہے۔۔۔ صبر کا جام پی رکھا ہے۔ خوش فہمیوں کا رس پی رکھا ہے۔۔۔ بہت کچھ پیا ہے۔"

"لعنت ہے تم پہ۔ میں اتنا سیریس مسئلہ لے کر آئی ہوں اور تم الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بک دیتیں کہ جاؤ نگاہ بی بی' دفعان ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری ایک نہیں سننی۔" وہ ناراض ہو کے اپنا پرس اٹھانے لگی۔

"دوست۔۔۔ خفا مت ہونا میں تو بس یونہی ہم الٹا مطلب مت نکالو۔"

"الٹی باتوں کا کوئی سیدھا مطلب کیسے نکالے۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ بابر کی حقیقت کیا ہے اور تم واہی تباہی بکے جا رہی ہو۔"

"میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں نگاہ۔ بابر کی حقیقت تم سے پہلے کوئی اور مجھ پر کھول گیا ہے۔"

"مجھے تو فی الحال تمہاری باتوں سے زیادہ عجیب باتیں کچھ اور نہیں لگ رہیں۔ شاید اچانک صدمے سے تمہارا دماغ۔۔۔ خیر ابھی میں چلتی ہوں۔ اس وقت تم نہ ڈھنگ کی بات کرنے کی حالت میں ہو نہ سننے کی۔ بعد میں اس بارے میں تفصیلی بات کریں گے خصوصاً "اس بندے کے بارے میں۔"

باہر جاتے جاتے وہ رکی اور ایک دم مڑ کے پھر سے اسے مخاطب کیا۔

"ایک مشورہ اور دوں گی اب اس فراڈیے نواب کے متھے نہ ہی لگنا تو بہتر ہے۔ وہ لیچڑ آدمی ہے آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا۔ تمہاری صورت اس کی لاٹری نکلنے والی تھی۔ ایک ٹرائی تو اور مارے گا تمہیں گھیرنے میں اور تمہاری جو دماغی حالت ہے اس کے بعد مجھے ڈر ہے کہ تم دوبارہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آجاؤ۔ اس سے بچنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ اس سے دور رہو۔ وہ کتنا بھی ملنے یا بات کرنے کی کوشش کرے بالکل مت سننا اس کی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس نے ان الزامات سے صاف مکر جانا ہے۔ ایک نئی کہانی سنا ڈالنی ہے اور تم ایک نمبر کی احمق' پھر سے یقین کر لو گی اس کے جھوٹ اور فریب پہ۔"

"وہ ایسا نہیں کرے گا نگاہ' بے فکر رہو۔ اس کا بھانڈہ بیچ چوراہے پہ پھوٹا ہے۔ جو کسر رہتی تھی وہ اس نے خود اپنے منہ سے اگل کر پوری کر دی ہے۔ اب مکرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ وہ سب کچھ قبول کر بیٹھا ہے۔"

"حیرت انگیز۔۔۔ کیا یہ کارنامہ بھی تمہارے اسی بندے دے پتر کا ہے؟"

"ہاں ان کے دوسرے بہت سے کارناموں کی طرح یہ بھی۔"

"ملنا پڑے گا بھئی اس بندے سے۔"

"وہ تم سے ملنے والے بندوں میں سے نہیں۔ میں نے کہا نا کہ وہ بندے دا پتر ہے۔"

"نگاہ بڑے سے بڑے بندے کے پتر کو لائن پہ لگا لیتی ہے۔"

"میرا حال دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔ مذاق میں بھی اس کو اپنی لائن پہ لگانے کے بارے میں مت سوچنا ورنہ تمہاری اپنی لائن کیا ہے یہ بھی بھول جاؤ گی۔۔۔ میری طرح۔"

نگاہ کچھ دیر اسے پر سوچ انداز میں دیکھتی رہی پھر فیصلہ کن انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

"ملنا پڑے گا۔۔۔ دیکھنا پڑے گا اس شخص کو۔ جس نے تمہارا یہ حال کیا ہے اور نگاہ بھی تیری دوست نہیں اگر دونوں کی لائن ایک نہ کر دی تو۔"

باہر نکل کر اس نے مختصر سے لان میں سر نیہوڑے بیٹھے اللہ وسائے کو دیکھا۔ جب وہ آئی تھی تب بھی وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے نگاہ سے خوشدلی سے بات بھی نہیں کی۔ نہ ہی دعا کی کوئی شکایت کی

تھی۔ نگاہ کو اس کی خاموشی اور بجھا پن پہلے بھی کھٹکا تھا۔ مگر تب وہ دعا سے بات کرنے کی جلدی میں تھی۔

اگر وہ ایک عام سا باپ ہوتا۔۔۔ ایک جوان لڑکی کا عام سا باپ تو وہ یہی سوچتی کہ بیٹی کا گھر بستے بستے رہ گیا ہے' منگنی ٹوٹ گئی ہے' منگیتر فراڈ نکلا ہے اسی لیے اس بیچارے بوڑھے شخص کا دل ٹوٹ گیا ہے مگر وہ کسی بھی عام سی لڑکی کا عام سا باپ نہیں تھا۔

وہ ایک فنکارہ کا باپ کم سیکرٹری تھا جسے اس صورت حال سے خوش ہونا چاہیے تھا کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکلتے نکلتے ایک بار پھر یہیں رہ گئی۔ وہ تو پہلے بھی بابر ہمایوں مغل سے اپنی بیٹی کے بڑھتے تعلقات پہ زیادہ خوش نہ تھا۔ بس اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے چاچا جی' آپ اکیلے کیوں بیٹھے ہیں۔"

"کیا کروں' یہاں ہے کون۔۔۔ ایک میری دھی ہے تو وہ مجھ سے بھی زیادہ اکیلی۔۔۔ وہ میرا اکیلا پن کیا بانٹے گی میں نے خود اکیلا کیا ہے۔"

"جو ہوا اچھا ہوا چاچا۔ وہ دعا کے لائق ہی نہیں تھا۔" نگاہ نے تسلی دینا چاہی۔

"اس نمانی کے لائق تو کچھ بھی نہیں۔ نہ یہ زندگی جو میں نے اسے دی۔ نہ یہ پہچان جو اس نے پائی۔ وہ بہت دکھی بہت الگ بہت پاک روح تھی۔ میں نے اسے رول دیا۔ کیا منہ دکھاؤں گا اس کی بہشتن ماں کو۔"

"کایا پلٹ۔" وہ بڑبڑا کے رہ گئی اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

"اسے بازار میں کیوں سجا رکھا ہے۔ بازار میں سجی چیز کے ساتھ جس کا جو جی چاہے گا وہ کرے گا۔ چاہے خریدے' چاہے روندے۔۔۔ چاہے دلالی کرے۔"

بابر ہمایوں مغل کے سنگ سنگ الفاظ اسے رہ رہ کر یاد آتے تھے۔ اس کا دل و دماغ اس پتھراؤ سے لہولہان ہو رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

"پتا کرو' یہ مغل' نواب کا بچہ کدھر منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ آج ایک ہفتے سے اوپر ہو گیا ہے اس نے چکر نہیں لگایا۔"

ملک مقبول نے نیاز کھوکھر سے کہا۔

"اب اس نے کیا چکر لگانا ہے ملک صاحب۔"

"کیوں؟ کیا کسی دوسرے چکر میں ہے؟"

"فی الحال تو اس کے سارے چکر ختم سمجھو وہ تو خود چکرایا ہوا ہو گا۔"

"کیا مطلب؟ صاف صاف بات کرو کھوکھر۔"

ملک مقبول کی چڑھی تیوریاں دیکھ کے کھوکھر ذرا سنبھلا۔

دراصل وہ نگاہ کے کان جس انداز میں بھر چکا تھا اور جس طرح تنتناتی ہوئی وہ وہاں سے نکلی تھی اس کے بعد کھوکھر کو پوری امید تھی کہ اسے بریک ادا کے گھر جا کے ہی لگے ہوں گے اور جو جو اطلاعات اس نے نگاہ کو دی تھیں' وہ اس نے من و عن دھرا دی ہوں گی۔ اس کے بعد ادا نے بھی بابر کی اچھی عزت افزائی کی ہو گی۔ آگ لگانے کے بعد وہ خود ہی دور بیٹھا بابر کی جلن کا مزا لے رہا تھا۔ اب اپنے منہ سے اپنے کارنامے تو ملک مقبول کو سنانے سے رہا اس لیے فوراً "بات بنائی۔

"اسے سکون تب ہی ملتا ہے جب یا تو اس کی جیب بھری ہو یا پھر اس نے منہ چھپا کے بیٹھنے والا کوئی کام کیا ہو۔ جیب بھرنے والے تو آپ ہو مائی باپ۔۔۔ اور آپ سے وہ ہفتہ بھر سے ملا نہیں پھر سوچنے والی بات ہے آخر وہ چھپتا کیوں پھر رہا ہے؟"

اس نے وسوسہ جگانے کی کوشش کی۔

"بیٹھا ہو گا اس بے وقوف لڑکی کے دوپٹے میں منہ چھپا کے، بس اسی ایک معاملے میں اس کھوٹے سکے کی قسمت کام کر گئی ورنہ زندگی کے باقی ہر معاملے میں تو برے نصیب رہے بیچارے کے۔"

"مگر میں نے سنا ہے ملک صاحب! ادا سے آج کل اس کے تعلقات کچھ ٹھیک نہیں۔ دو تین دن پہلے کچھ سرد گرمی ہو گئی تھی دونوں میں۔ ادا نے ٹھیک ٹھاک بے عزتی کی تھی مغل کی۔"

نیاز کھوکھر کے پیٹ میں بات نہیں رہ رہی تھی۔ آخر گھما پھرا کے اس نے کہہ ہی ڈالا۔

"واقعی؟ — نہیں یار اس لڑکی کو تو مانو مغل نے الو کا گوشت کھلا رکھا تھا کچا ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ بات نکاح تک پہنچ گئی تھی۔ ویسے ہی کسی نے اڑائی ہو گی۔"

ملک کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔ دیر تک اس فقرے کے مزے لے لے کر ہنستے رہنے کے بعد وہ ایک دم کوئی خیال آجانے پہ سنجیدہ ہوا۔

"یہ تو اچھی خبر نہیں۔ ادا سے مغل کے تعلقات پہ ہی تو میرے سارے پلان کا دارومدار تھا۔ میں نے تو اسی آس پہ بابر جیسے ست گھوڑے پہ لمبی رقمیں لگائی تھیں۔ بابر میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ یوں عین موقع پہ ہار کے وہ میرے سارے پلان کو فیل نہیں کر سکتا۔"

"وہ ایسا کر چکا ہے ملک صاحب۔ آپ نے بھی پتا نہیں کیسے اس پہ یقین کر لیا۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا وہ آپ کو نقصان پہنچائے گا۔"

"او بکواس بند کر تو پہلے سے جانتا تھا۔" وہ منہ بگاڑ کے اس کی نقل اتارنے لگا۔

"کیا خاک جانتا تھا تو پہلے سے بڑا آیا کہیں کا ولی اور یہ بابر کیا سمجھتا ہے؟ ایسے مجھے لاکھوں کا چونا لگائے عورتوں کی طرح منہ چھپا کے گھر بیٹھ جائے گا۔ میں تو اس کے حلق میں سے نکال لاؤں گا سب کچھ۔"

"اس کے حلق میں کچھ ہو گا تو نکال لیں گے جواری اور شرابی بندے کے پاس رہتا کیا ہے۔"

"او میں کہہ رہا ہوں تو اپنی منحوس زبان بند کر۔ فضول کی پیشن گوئیاں کر کر کے میرا دماغ اور خراب نہ کرو۔ جاؤ جا کے پتہ کرو کدھر مرا ہے یہ نواب زادہ۔ گھر میں دبکا بیٹھا ہے یا کسی اور جگہ؟"

"ایسے لوگ گھر کہاں رہتے ہیں جی۔"

"گھر کیا — میں تو اسے دنیا کے کسی بھی کونے میں چین سے نہیں رہنے دوں گا۔ میں کسی پہ دمڑی لگانے کا روادار نہیں۔ وہ کوئی میرے مامے کا پتر نہیں جو اس کی جیبیں بھرتا۔ ولایتی پلاتا رہا۔ میرے پیسے کی اکڑ میں بوسکی اور راسلک پہن کر پھرتا رہا۔ کڑاہی کھاتا رہا گولڈ لیف کے کش لگاتا رہا۔ اب تم دیکھنا میں کیسے وصولتا ہوں۔ چاہے اس کی خاطر مجھے اس کی عورت کو ہی کیوں نہ نچانا پڑے۔"

وہ طیش کے عالم میں کہہ رہا تھا اور اس کی آخری بات سن کر باوجود اس کے شدید غصے کے، نیاز کھوکھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

"مغل کی عورت؟ ملک صاحب ایک اور گھاٹے کا سودا؟ سالے کی چکنی صورت پہ نہ جانا۔ عمر چور ہے پورا۔ اتنا لڑکا بالا بھی نہیں ہے۔ سنا ہے بیٹا لونڈا اس کے کاندھوں تک آتا ہے۔ یعنی شادی کو کوئی پندرہ سولہ سال تو ہو گئے ہوں گے اور یہ بھی سنا ہے کہ اس کی گھر والی اس سے بھی تین چار سال بڑی ہے عمر میں۔ اب اس مائی کو کیا نچائیں گے آپ اور کہاں نچائیں گے؟"

"تیرے سر پہ — منحوس، جب سے یہاں آیا ہے۔ ایک سے بڑھ کے ایک بکواس خبر سنائے جا رہا ہے۔ فوراً جا بابر کے گھر اور اس کو کالر سے پکڑ کے میرے پاس گھسیٹ لا — اگر قمیص نہ پہنے ہو تو کالر سے نہیں بلکہ گردن سے پکڑ کے لے آنا۔"

"جو حکم جناب ابھی گیا اور ابھی آیا۔"

نیاز کھوکھر بڑا مسرور، بڑا مستعد ہو کے اٹھا۔ بابر پہ اپنی خار نکالنے کا سنہری موقع ہاتھ لگ رہا تھا۔

"او ویسے ہی — رہنے دے۔"

ملک نے فوراً اسے پکار کر اپنا ارادہ تبدیل کیا تو وہ بد مزہ ہو گیا۔

"یہ زیادتی ہے ملک صاحب! اسے آپ ہر بار معاف کر دیتے ہیں۔"

"معاف کے پتر، میں کوئی اس کے بوتھے پہ عاشق نہیں ہوں جو معاف کر دوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ تیرے ہاتھ وہ آنے والا نہیں۔"

"لو جی، کر لو گل — اویں نہیں آئے گا۔ کھوکھر کے ہاتھ سے بچ کے کہاں جائے گا۔"

"او وے سرکاری سانڈ! اپنے ڈیل ڈول پہ نہ اترا اور نہ اس کی ڈھائی پسلیوں پہ جا۔ ہر کام اکھاڑے میں اتر کے نہیں کیا جاتا۔ وہ ایک کائیاں شخص ہے۔ اس کا دماغ ایسی چک پھیریاں کھاتا ہے کہ سامنے والا بوکھلا کے رہ جائے۔ تیرے جیسا موٹی عقل والا اس کی ایک چال کی مار نہیں۔ اس نے تیرے ہاتھ تو آنا نہیں، الٹا نقصان یہ ہو گا کہ وہ ہوشیار ہو جائے گا اور پھر میرے ہاتھ بھی نہیں آنے والا۔ اس کا علاج میں خود کروں گا۔ مجھے لکھواؤ اس کا پتا ٹھکانا آج میں خود نکلتا ہوں۔"

"آپ خود؟ آپ خود جائیں گے ملک صاحب؟"

"او نچا سنائی دیتا ہے؟"

"وہ کنٹری میں رہتا ہے جی، تنگ تنگ گلیاں، کچا پکا راستہ ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں۔"

"میں وہاں بسنے نہیں جا رہا۔ وہ چاہے جہنم میں ہی رہتا ہو — میں خود جاؤں گا اور اسے کتے کی طرح کھینچ کر لاؤں گا۔ ملک مقبول سے بچ کے وہ جائے گا کہاں اور کچھ نہیں تو جتنا اس پہ لگایا ہے، اس کے بدلے مفت کے کام ہی لوں گا دو چار سال۔"

اس نے ایک پرچی پہ نیاز کھوکھر کا بتایا پتا جلدی جلدی لکھا۔

☼ ☼ ☼

تنویر ریاض کی بدولت اسے جلد ہی دعا کا ایڈریس، گھر کا فون نمبر اور سیل نمبر وغیرہ سب مل گئے تھے۔ اس نے عمیص کی مطلوبہ معلومات اسے پکڑاتے ہوئے چھیڑا بھی تھا۔

"یہ پنکھوں کا کاروبار کب سے شروع کیا؟"

"کون سے پنکھوں کا؟"

اس کا ذہن ہنوز بری طرح الجھا ہوا تھا اس لیے تنویر کا مخصوص پرپیچ مذاق سمجھ نہیں سکا۔

"انہی پنکھوں کا — جو شوبزنس کے خوب صورت چہروں پہ ہوا میں بکھیرتے رہتے ہیں۔ ویسے اس قسم کے جانثار پرستار تو تم کسی کے تب بھی نہیں رہے تھے جب دیوانگی کے مظاہرے کی عمر بھی تھی۔ میرا مطلب ہے کالج لائف میں، یاد ہے تب میں سری دیوی کا اور مقصود جوہی چاولہ کا کتنا بڑا فین ہوا کرتا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی پسندیدہ فنکاراؤں کی نئی فلمیں دیکھنے کے بعد ان کی صلاحیتوں پہ بڑھ چڑھ کے تبصرے اور تجزیے پیش کیا کرتے تھے، ایڑی چوٹی کا زور لگایا کرتے تھے انہیں ایک دوسرے سے برتر ثابت کرنے کے لیے اور تم اس ساری بحث سے یوں الگ تھلگ ہوا کرتے تھے جیسے ان بچکانہ سرگرمیوں میں نہ تمہاری دلچسپی ہو نہ تمہارا تعلق۔ اب یہ نیا جنون کیا سوار ہوا ہے تمہارے سر پہ؟"

عمیص اس کے بے بنیاد اندازے کو جھٹلانا چاہتا تھا۔ واضح کرنا چاہتا تھا کہ وہ ادا نامی گلوکارہ کا پرستار نہیں نہ ہی کسی عقیدت مند فین کی طرح اس کا فون نمبر اور ایڈریس حاصل کرنے کے لیے مرا جا رہا ہے تاکہ اس کی جھلک دیکھ کے — یا آواز سن کر اپنی تسکین کر سکے۔ مگر وہ اسے سچ نہ بتا سکا کیونکہ اس صورت میں تنویر ریاض کے پاس اور بہت سے کریدتے ہوئے سوال ہوتے۔

وہ نہ تصدیق کر سکا نہ تردید۔۔۔ بس مسکرا کے رہ گیا۔

شام کو ادا۔۔۔ یعنی دعا کے بارے میں حاصل کی گئی معلومات کی پرچی جیب میں ڈال کر وہ گھر پہنچا تو جلدی اس بات کی تھی کہ جلد از جلد وہ اسے چچا حضور تک پہنچا دے ان کا تجسس تم اب اس کا بھی تجسس بن چکا تھا۔

"پتا تو چلے' یہ مسٹری کیا ہے۔۔۔ ہم شکل افراد کے بارے میں کہانیوں' فلموں میں سنتے آئے تھے۔ چچا حضور نے یہ بات نہ کی ہوتی تو میں اسے غلط فہمی یا مغالطہ کہہ کر جھٹلا سکتا تھا مگر چچا حضور۔۔۔ نہیں ان کی نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔ اب تو یہ معمہ حل ہو تو چین آئے۔"

"او میرے دل کے چین

چین آئے میرے دل کو دعا کیجیے"

چچا حضور بیٹھک میں تھے۔ منشی کے ساتھ حساب کتاب میں مصروف ایک دو دوست اور بھی تھے۔ ابھی وہ اس موضوع پہ ان سے بات نہیں کر سکتا تھا اس لیے اندر نہ گیا۔ بیٹھک کے بند دروازے کو بے چینی سے دیکھتا۔۔۔ وہ برآمدے کے آخری سرے پہ موجود کرسی پہ بیٹھ کے گنگنانے لگا۔

"یہ موتیا کے کمرے کا دروازہ نہیں۔"

صحن سے آتی گل مہر نے اس کی گنگناہٹ سنی۔۔۔ اس کی بے تاب نظروں کا بیٹھک کے دروازے پہ طواف دیکھا اور بڑے اطمینان بھرے انداز میں گویا اسے اطلاع دی۔

عمیص اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔۔۔ پھر؟"

"تم غلط جگہ پہ غلط صدا لگا رہے ہو۔"

"یہ کام تو میں نے ایک عرصے تک کیا ہے۔"

نہ چاہتے ہوئے اس کی زبان پھسل پڑی۔

"کون سا کام؟"

اس کا دیا ہوا طنز پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی گل کی بھنویں تن گئیں۔

"یہی۔۔۔ غلط جگہ پر غلط صدا لگانے کا کام۔"

"اول درجے کے ڈھیٹ انسان ہو تم۔"

وہ فوراً" تپ گئی۔

"چلو درجہ اول کا تسلیم تو کیا تم نے۔"

آج **عمیص** کو بھی اسے تپا کے مزا آ رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس مزاج کا شخص تھا تو نہیں لیکن ادھر کچھ دنوں سے گل مہر کے انداز بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ صاف محسوس ہو رہا تھا وہ پنگا لینے کے موڈ میں تھی۔ اسے اور موتیا کو اکٹھا دیکھ کے خوامخواہ اپنی زبان تیز دھار کر لیا کرتی تھی۔ آج **عمیص** نے اس کی طبیعت صاف کرنے کا سوچا۔

"تمہارے سرٹیفکیٹ کا کیا کرو گے۔ جاؤ اس سے طلب کرو اپنے بارے میں سرٹیفکیٹ' جسے ان دنوں الو بنا رہے ہو۔"

"دیکھو گل مہر' اول تو یہ کہ نہ میں ان دنوں کسی کو الو بنا رہا تھا نہ ان دنوں بنا رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ مجھے موتیا سے اپنے بارے میں کسی سرٹیفکیٹ کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کے۔۔۔ ہوں' یہ اسے بتانے کی یا مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔ وہی پرانی مکالمے بازی۔۔۔ کچھ نیا نہیں ہے تمہارے پاس؟ نئی محبتوں کے لیے مکالموں کا اسٹاک تو تیار رکھتے۔"

"موتیا سے میری محبت قدیم ہے گل۔۔۔ اتنی قدیم کہ ہم دونوں خود نہیں جانتے۔"

"تو وہ سب کیا تھا؟"

غصے سے بل کھاتے ہوئے اس نے پوشیدہ الفاظ میں پوچھا۔

"حماقتیں۔۔۔ بے وقوفیاں۔"

عمیص اطمینان سے بولا۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ اب بھی دل سے مانتا تھا کہ گل مہر کے بارے میں اس کے جذبات صدفی صد کھرے تھے۔ وہ واقعی اس کے عشق میں دیوانہ ہو چلا تھا۔ اب موتیا کے ساتھ پوری دیانتداری سے کمٹڈ ہونے کے باوجود بھی وہ گل سے اپنی محبت کو وقتی پسندیدگی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اگرچہ کہ وہ اس محبت سے کب کا دست بردار ہو چکا تھا۔ اپنے دل سے اس کے سارے رنگ دھو چکا تھا۔ گل کے سامنے اپنی پرخلوص محبت کو حماقت اور بے وقوفی کا نام اس نے محض اس کے دل کو کھٹک سے بچانے کے لیے دیا تھا۔

"بڑی جلدی عقل آ گئی۔ کاش موتیا کو بھی آ جائے۔ وہ بھی سمجھ جائے کہ جو شخص اتنی آسانی سے اپنی پرانی باتوں کو حماقت قرار دے کر دامن چھڑا لیتا ہو' اس کی سچائی کیا ہو سکتی ہے۔"

"میں نے کسی سے دامن نہیں چھڑایا گل مہر اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم چاہتی کیا ہو؟"

"ہم بھلا تم سے کیا چاہیں گے؟ تم اس قابل کب ہو؟" اس کی گردن پھر سے تن گئی۔

"تو یہاں کھڑی اپنا اور میرا وقت کس لیے ضائع کر رہی ہو۔"

عمیص نے ہاتھ جوڑے۔

"میں اس قابل کہاں۔۔۔ بخشو مجھے۔"

وہ اب سچ مچ زچ نظر آ رہا تھا۔

گل مہر گردن نخوت سے جھٹکتی۔ اونہہ کہتی' اپنی ہیل کی ٹک ٹک پہ سوار وہاں سے ٹلی تو **عمیص** نے شکر کا سانس بھرا۔

"نفسیاتی کیس بنتی جا رہی ہے۔ نہ خود خوش رہتی ہے نہ کسی کو خوش دیکھ سکتی ہے۔ نہ خود محبت نبھا سکی نہ کسی دوسرے کو نبھاتے دیکھ سکتی ہے۔ مسٹر شہزاد ملک' یہ تمہارا ہی کیس تھا۔ تم ہی ہینڈل کر سکتے تھے مگر قسمت۔۔۔"

شہزاد ملک کے نام پہ اسے پھر سے دعا کا خیال آ گیا۔ بیٹھک سے ایک ایک کر کے تینوں افراد باہر نکلے۔ وہ جیب تھپتھپاتا اندر داخل ہوا۔

☆ ☆ ☆

"یہ کس گندے محلے میں پھنس گیا ہوں۔"

ملک مقبول کو گاڑی بہت دور کھڑی کر کے پیدل ان تنگ اور گندی گلیوں میں سے گزرنا پڑ رہا تھا اور اس وقت بڑبڑاتے ہوئے وہ گوجرانوالہ کا وہ پسماندہ محلہ بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا جہاں اس کے بچپن اور لڑکپن کے کئی سال بھوک' افلاس اور جہالت میں گزرے تھے۔

"اوئے لڑکے' بات سن۔۔۔"

قریب سے گزرتے غبارے بیچنے والے نوعمر لڑکے کو روک کے اس نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"یہ مغل حویلی کس طرف ہے؟"

"یہاں سے کھبے (بائیں) ہو جاؤ۔۔۔ وہاں سے سجے (دائیں) آگے مسجد نظر آئے گی' جمعے کا ٹیم ہو رہا ہے' ادھر جماعت میں کھڑے ہو جانا۔"

"او میں مسجد کا نہیں' مغل حویلی کا پوچھ رہا ہوں۔" ملک بگڑا ہوا۔

"وہی دس (بتا) رہا ہوں۔ اب راستے میں مسجد آئے گی تو کیا جمعہ پڑھنے نہ رکو گے؟ مسلمان ہو یا نہیں؟ اگر نہیں تو خیر ہے۔ پھر سیدھے سیدھے آگے چلے جانا۔ بابے کی ہٹی سے سجے ہو جانا۔ لمبی گلی آئے گی' جدھر جھورے

کاا کھاڑہ ہے اور ادھر کھمبا ہے کی تنگ گلی میں مڑ جانا۔"

"کھبے‘ سجے ہی مڑ تا رہوں یا کبھی مغل حویلی نظر بھی آئے گی چوچے (چوزے۔)"

"جا باؤ‘ راہ لگ۔۔۔ اک تو ٹیم کھوٹا کر کے رستہ بتاؤ۔ اوپر سے ٹکے ٹکے کی باتیں بھی سنو۔"

وہ بالشت بھر کا چھوکرا خفا ہو کے آگے بڑھنے لگا۔

"اچھا پھر۔۔۔ آگے؟ اکھاڑے کے بائیں والی تنگ گلی میں مڑ گیا‘ آگے کیا حکم ہے سرکار؟"

"ادھر ماکھے گجر کی منجی پڑی ہوگی۔ اس سے پوچھ لینا۔"

"منجی سے پوچھوں؟ دماغ خراب ہے میرا۔"

"منجی کے اوپر ماکھا گجر بھی توڑا ہوگا۔ حویلی اس کی ہے۔ وہ ادھر بیٹھا سارا حساب کتاب رکھتا ہے۔ کوئی کرائے دار اس کی نظر بچا کے وہاں سے لنگ نہیں سکتا۔"

"اچھا اچھا۔"

وہ اپنے سفاری سوٹ پہ سے نامعلوم گرد جھاڑتا آگے بڑھنے لگا تو لڑکے نے اس کی آستین کا کف پکڑ لیا۔

"کدھر باؤ؟ دس کا نوٹ پکڑاؤ۔"

"وہ کس خوشی میں؟ راستہ بتانے کا ریٹ فکس کر رکھا ہے تم نے؟"

"رستہ بتانا تو ثواب کا کام ہے جی توبہ استغفار‘ اس کے پیسے لوں گا میں۔۔۔ توبہ توبہ۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا توبہ کرنے لگا۔

"یہ تو اتنی دیر تک مغز کھپایا ہے۔ اپنا ٹیم ضائع کیا ہے اس کا ہرجانہ مانگ رہا ہوں۔ سویرے سویرے دیہاڑی لگانے نکل رہا تھا‘ آگے تسی متھے لگ گئے۔ یونہی کا ٹیم مارا گیا۔ اب تک کتنے پکانے (غبارے) بک گئے ہوتے۔"

"بڑی شے ہے تو۔"

ملک مقبول نے اس کی ہوشیاری کو قابل قدر نظروں سے دیکھتے ہوئے جیب سے پرس نکالا۔

"دس روپے کے کل غبارے ڈھنڈے پہ سجا کے لگا پھرتا ہے۔ پانچ منٹوں میں ایک غبارہ نہیں بکنا تھا تیرا اور میرے سے ہرجانہ ایسے منہ پھاڑ کے مانگ رہا ہے جیسے کروڑوں کا نقصان ہو گیا ہو۔ بڑا مصروف بندہ ہو جیسے۔۔۔ لے مر عیش کر۔"

دس کا نوٹ ڈھونڈنے پہ بھی نہ نکلا تو اس نے پچاس کا کڑکتا نوٹ نکال کے اسے تھمایا۔

"باؤ‘ شکل سے شہدے‘ چول سے لگتے ہو‘ پر ہو نہیں۔"

اس تعریف پہ ملک مقبول اسے مارنے کو لپکا مگر وہ دھان پان سا لڑکا اس کے ہاتھ کب آتا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ نجانے کون سی سجے‘ کھبے والی گلیوں میں گم ہو چکا تھا۔

"اللہ کرے‘ اب یہ بابر کا بچہ مل جائے۔۔۔ کھوکھر ٹھیک کہتا تھا‘ وہ گھر بیٹھنے والوں میں سے نہیں۔ پھر بھی ایک بار دیکھنا تو چاہیے۔ بیٹھے بٹھائے اچھی مصیبت گلے پڑ گئی۔ میں تو پہلے ہی کھٹک گیا تھا جب ادا کے بارے میں پتا چلا کہ وہ شہزاد ملک کی رشتے دار ہے۔ شہزاد‘ اسے آسانی سے بابر کے ہاتھ کب لگنے دے گا۔ میں نے بابر کو کہا بھی تھا کہ شہزاد سے ہوشیار رہنا۔ وہ ضرور رنگ میں بھنگ گھولے گا۔ پتا نہیں کن ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔"

سامنے بڑی سی رنگین پایوں والی چارپائی ہی ماکھے کی مشہور منجی لگ رہی تھی۔

"یہ ماکھے کی منجی ہے؟"

"اوئے‘ یہ تجھے منجی نظر آ رہی ہے۔ منجا ہے منجا۔" کالے سیاہ پہلوان نما شخص کے شانے دباتے اس خستہ حال خواجہ سرا نے اپنی کھڑکھڑاتی آواز میں جھڑک کے کہا۔

"ماکھا گجر کون ہے؟"

"خیر ہے باؤ۔۔۔ کیا کام پڑ گیا ہم سے۔"

اسی پہلوان نما شخص نے اپنی مخمور بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کے پوچھا۔

"میں ہی ہوں ماکھا گجر۔"

"مغل حویلی کے بارے میں پوچھنا تھا۔"

"کمرہ چاہیے؟۔۔۔ لگتا تو نہیں۔"

اس نے خود ہی اپنے قیاس کی تردید کی اور بغور اس کے بسکٹی رنگ کے استرہ شدہ سفاری سوٹ‘ چم چم کرتے براؤن جوتوں‘ سونے کی موٹی موٹی انگوٹھیوں‘ اللہ والے لاکٹ اور قیمتی گھڑی کو دیکھا۔

"بابر سے ملنا تھا‘ بابر ہمایوں مغل سے۔"

"کتنے دبا کے بیٹھا ہے؟ ویسے وصولی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ فضول ہے۔"

"تم پتا بتاؤ‘ کس جگہ ملے گا؟"

"اگر تمہاری رقم لے کر گیا ہے تب تو کہیں بھی نہیں ملے گا۔" وہ ہنس پڑا۔

"وہ میرا کام ہے‘ میں قبر سے بھی کھینچ لاؤں گا اگر قبر کا پتا چل جائے۔ تم مجھے وہاں پہنچا دو۔"

"جانور جہاں۔۔۔ باؤ کو آگے کر آ۔۔۔ دروازہ دکھا کر واپس آ جانا۔ ابھی تیل لگوانا ہے۔ ادھر تماشا دیکھنے نہ کھڑے ہو جانا۔"

مہندی رنگے شانوں تک آتے بکھرے بالوں۔۔۔ سبز تہبند اور سرخ ریشمی کرتے والے ادھیڑ عمر نور جہاں کے پیچھے پیچھے چلتا ملک مقبول کنٹری کی دوسری منزل پہ پہنچ گیا۔

"وہ تیسرا کمرہ بابر کا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے اماں۔"

اس نے اتنے دھیمے آہنگ اور نرم لہجے میں کہا کہ بلقیس بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"سو بسم اللہ۔۔۔ خیر نال کرو۔"

وہ اپنے برابر اس کے لیے جگہ بنانے لگی۔

"میں پرسوں دوئی سے ملنے گیا تھا۔"

اس نے تمہید باندھی۔

"اچھا۔۔۔؟" وہ حیران ہوئی کہ شہزاد کا خود وہاں جانا باعث حیرت ہی تھا۔

"کیسی ہے دوئی؟ بھلی چنگی تو ہے؟ کتنے دن سے فون پہ بھی بات نہیں ہوئی اس سے۔ اور دسایا۔۔۔ اس کی سنا؟ بڑا بو تھا پتا ہوگا آج کل اس کا۔ سونے کی چڑیا اپنا گھونسلہ جو بنانے جا رہی ہے۔ میں جانتی ہوں اسے دوئی کے بیاہ کی ذرا خوشی نہیں۔ اوپر اوپر سے راضی ہوا ہے۔ لیکن میں بھی اس کی ایک نہ چلنے دوں گی۔ میں نے دوئی سے کہا تھا کہ میرے ہونے والی جوائی سے میری ایک ملاقات تو کرا۔ اسے اپنے گھر دعوت پہ بلا لیتے ہیں۔ ذرا آرام سے۔ ساری بات ہو۔ تاریخ و غیرہ رکھی جائے۔ دسائے کے بھروسے رہنا تو بے وقوفی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ۔۔۔"

"اماں‘ مجھے آپ سے بات کرنا تھی۔"

اس نے "مجھے" پہ زور دے کر کچھ جتانا چاہا۔

"تو کرنا پتر۔ میں نے کب روکا ہے۔ جم جم کرو۔ ماں صدقے‘ ماں قربان۔"

"میں بھی اسی وجہ سے وہاں گیا تھا‘ بابر کے بارے میں بات کرنے کے لیے ہی۔"

"بابر بھی آیا تھا وہاں۔"

بالو نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔"

شہزاد نے کڑوا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ماں کا بار بار ٹوک کر دخل دینا۔ اسے بات کرنا مشکل بنا رہا تھا۔

"خیر۔ رعب ڈالنا تھا تو نے۔۔۔ اسے پتا چلتا کہ کسی ایرے غیرے کی لڑکی نہیں لے جا رہا وہ۔ بڑا کچھ دے دلا کر رخصت کریں گے ہم۔ پوری شان کے ساتھ۔۔۔ ہے نا؟ کرمے کی بھی یہی وصیت تھی۔ یاد ہے' اس نے مرنے سے پہلے تیرا ذمہ لگایا تھا کہ تو دوئی کو اس گھر سے رخصت کرے گا۔"

"ابا نے صرف اسے رخصت کرنے کی ذمہ داری نہیں سونپی تھی' بلکہ اس کا ہر اچھا برا دیکھنے' ہر فیصلہ کرنے کا اختیار دیا تھا۔ اور۔۔۔ اور میں نے اماں اپنا یہی حق استعمال کیا ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"میں نے بابر سے دوئی کا رشتہ ختم کر دیا ہے۔"

"ہائے ہائے پتر' یہ کیا کیا؟ رشتہ ختم کر دیا۔ اب کیا بنے گا دوئی کا؟ یہ تو نے کیا غضب کیا۔ کون سا غصہ نکالا ہے اس بے چاری پر ضرور روسائے نے تجھے چابی دی ہوگی۔"

"اماں' وہ شخص کسی طرح بھی دوئی کے لائق نہیں تھا۔ میں نے سب سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اسی میں دوئی کی بہتری ہے۔"

"سواہ بہتری ہے۔" بالو غصے میں آگئی۔

"کسی طرح لائق نہیں ہے وہ۔ عمر میں زیادہ ہے اس لیے؟ یا کمانا کم ہے اس لیے۔ یا پھر پہلے سے زنانی اور بچے ہیں اس کے' اس لیے؟ مگر اپنے دل سے بتا کہ کسی اچھے خاندان کے کنوارے' ہلکی عمر کے اور کھاتے کماتے منڈے کا رشتہ آخر ایک طبلہ بجانے والے کی اس لڑکی کے لیے کیوں آئے گا جو محفلوں میں مائیک پکڑ کے گانے گاتی ہے۔ اس پہ شکر کر کہ وہ عزت سے اپنے گھر کی ہو رہی ہے۔ ان حالات میں یہی بہت ہے کہ کوئی اسے بیاہنے آ رہا ہے۔ او نچے خواب وچاری دیکھے بھی تو کیسے؟ باہر سے کسی شہزادے نے آکر اسے لے جانا ہے جب اس کے اپنے خاندان کے لڑکے کو اس میں سو عیب نظر آتے ہیں۔"

"منے دینے کی ضرورت نہیں۔ اور دوئی پہ ایسے برے حالات بھی نہیں کہ اسے بابر جیسے بندے کے پلے باندھ دیا جائے۔ وہ دھوکے باز شخص ہے۔ دوئی کو گھر کی عزت بنانے نہیں بلکہ کمائی کا ذریعہ سمجھ کے لے جا رہا تھا وہ مفت خورا۔ عمر بھر کا عذاب گلے پڑ جاتا۔ ابھی تو صرف گاتی ہے۔ کیا عجب کہ وہ بے غیرت شخص اسے نچانے یا بکنے پہ مجبور کر دیتا۔"

"ہائے میرے ربا۔۔۔" بالو نے دل کے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"سچی مچی۔۔۔؟ ایسا بد بخت تھا وہ؟ پھر تو اچھا کیا تو نے جو رشتہ ختم کر ڈالا۔ دوئی کچھ نہیں بولی؟ اور وہ مسٹنڈا وہ بابر۔۔۔ آسانی سے مان گیا؟"

"جھوٹے بندے میں اتنا دم خم نہیں ہوتا کہ وہ اڑ سکے اور دعا نے بھلا کیا کہنا تھا۔ دکھی ہے بہت۔"

شہزاد کا اپنا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

"پتا نہیں کیا لکھا ہے اس کے نصیبوں میں۔ کوئی خوشی راس نہیں آتی۔ ہائے کرمے۔۔۔ تیرے سے کیا وعدہ کیسے نبھائیں۔"

بالو آہیں بھرنے لگی۔

"ابا سے کیا وعدہ ہر حال میں پورا ہو گا۔ دعا کو اس کے حصے کی خوشیاں ضرور ملیں گی اور وہ میں دوں گا۔"

اس کا پرعزم لہجہ سن کر بالو پر امید ہوئی۔

"پھر ہے کوئی اور رشتہ نظر میں؟"

"ہاں۔۔۔؟"

"کون ہے؟ دوست یار ہے تیرا۔۔۔ یا تیرے دفتر میں کام کرتا ہے؟ منڈا سوہنا ہونا چاہیے بس۔۔۔ میری دوئی کے ساتھ سجے۔"

"تو پھر تو آپ کو پسند آئے گا۔ ظاہر ہے ماں کی نظر میں اس کا بیٹا خوبصورت ہی ہوتا ہے۔"

"کی مطلب؟"

"مطلب یہ اماں کہ میں دعا سے شادی کروں گا۔ ہر بار اس کا دل توڑنے کا۔۔۔ سبب میں بنتا ہوں' حالانکہ کبھی بھی میں نے ایسا نہیں چاہا۔ ہر بار میں اس کی بہتری ہی کے لیے' لیکن پھر بھی اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر بار میں اسے دکھی کر دیتا ہوں جیسے اس بار۔۔۔ میں نے تو اسے عمر بھر کے دکھوں سے بچانے کے لیے اور ابا سے کیے وعدے کو نبھانے کے لیے ایسا کیا ہے' مگر میں جانتا ہوں اسے کتنی ٹھیس پہنچی ہے۔ اس بار میں ہی اس کا ازالہ کروں گا۔"

"کیا۔۔۔؟ کیا واقعی تو۔۔۔ تو کرے گا اس سے شادی؟"

مارے خوشی کے بالو کے منہ سے لفظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"ہاں' اس کے ٹوٹے دل کو جوڑنے کے لیے بھی اور ابا کی روح کی تسکین کے لیے بھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا نا کہ دعا کا خیال رکھوں گا۔ اسے ہر غم' ہر پریشانی سے بچاؤں گا۔ ساری خوشیاں دوں گا۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اگر میں اسے عمر بھر کا ساتھ دوں' اسی طرح میں اس کی ڈھال بن سکتا ہوں ہر غم کے آگے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"اعتراض۔۔۔؟ میرا کیا مغز پھر گیا ہے جو میں کوئی اعتراض کروں گی۔ اعتراض کرنے والے کو کسی کی آئی آئے۔" خوش جذبات میں وہ زیادہ ہی جوشیلی ہو گئی۔

"میری اور کرمے کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی کہ دوئی ہمارے گھر کی رونق بنے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کرمے کی مری ہوئی بہن کی آخری نشانی ہے' بلکہ اس لیے کہ وہ ہے ہی اس قابل کہ اسے دیکھتے ہی اپنا بنانے کو دل چاہتا ہے۔ ہر گن ہے اس میں۔ شکل وصورت دیکھو تو لاکھوں میں ایک۔۔۔ دل دیکھو تو ہر کسی سے محبت کرنے والا۔ چھوٹے بڑے کی عزت اور لحاظ کرنا جانتی ہے۔ گھر سے باہر نکل کر مجبوری میں کام کر رہی ہے' لیکن آنکھ میں شرم صاف نظر آتی ہے۔ بولی ہے تو اتنی میٹھی۔ کہ بس دل چاہتا ہے وہ بولتی رہے اور بندہ سنتا رہے۔ ہاتھ میں اتنا سواد کہ وہ پکاتی رہے اور بندہ کھا کھا کے نہ تھکے۔"

اس نے دعا کے بارے میں پورا قصیدہ ہی سنا ڈالا۔ شہزاد ماں کی خوشی دیکھ کے مسکرایا۔

"یاد ہے اک واری پہلے۔ کرمے کی حیاتی میں ہی ہم دونوں نے تجھ سے دوئی سے شادی کرنے کے لیے کہا تھا۔ اسی سے اندازہ کر لے کہ یہ ہماری کتنی پرانی خواہش ہے' اس وقت پتا نہیں تیرے دماغ میں کیا ٹیڑھ تھی۔ تو تو اس کا نام سننے پر راضی نہ تھا۔"

شہزاد کو بھی وہ واقعہ یاد آگیا۔ اور ساتھ ہی اپنا بدصورت رویہ بھی۔ اس نے صرف انکار نہیں کیا تھا بلکہ بہت سخت اور تلخ الفاظ استعمال کرتے ہوئے دعا کی بے عزتی کی تھی اور اپنے ماں باپ کو بھی نہ بخشا تھا کہ ان کی جرات کیسے ہوئی' یہ خیال پیش کرنے کی۔

اس نے ایک نظر بھر کے دوبارہ اپنی ماں کے خوشی سے جگمگاتے چہرے کو دیکھا مگر اس بار وہ طمانیت سے مسکرا نہ سکا۔ بلکہ افسردہ ہو گیا۔

"کاش یہ خوشی دینے کی سعادت میں تب حاصل کرتا۔ ابا بھی آخری وقت میں مجھ سے خوش ہوتے۔"

اس خیال نے اس کے دل کو بوجھل کر دیا۔

"کیا ہوا شہزادے! اداس کیوں ہو گیا ہے؟" بالو نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کے لاڈ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس یونہی ابا کی یاد آگئی تھی۔"

اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا اور آنکھوں میں نمی تھی۔

بالو نے شہزاد کا۔۔۔ اپنے بیٹے کا یہ روپ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ممتا کے مارے دل کو کچھ ہونے لگا' اس نے اس کی پیشانی پہ اپنے لب رکھ دیے۔

"ماں صدقے' تیرے جیسا پتر مجھ کوڑھی بدذات کو کیسے دے دیا اللہ سوہنے نے۔ کاش کہ ماد یکھ پاتا اس کا بیٹا۔ اس کو کتنا پیار کرتا ہے۔۔۔ مگر وہ جانتا ہی ہوگا۔ اس کی روح بڑی خوش ہوتی ہوگی۔"

وہ دل ہی دل میں دعا کو بھی دعائیں دے رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شہزاد شاید دعا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اور اس محبت نے ہی اس پتھر دل کو موم کر دیا ہے۔

"دعا تو ہزاروں سال جیے۔۔۔ تیرا سہاگ جیے۔ تیری گود بھری رہے۔ تیری محبت کے صدقے مجھے بھی بیٹے کی محبت دیکھنے کا موقع ملا۔ تیری محبت نے میرے بیٹے کے دل کا زہر دھو دیا۔ اللہ تجھے ہر خوشی دے۔"

وہ سچے دل سے اسے دعائیں دے رہی تھی۔

اور سچے دل سے دی جانے والی دعائیں عرش تک اپنا راستہ خود بناتی ہیں۔

یہ دعائیں بھی دعا کے لیے سوغاتیں لانے والی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ادا جی۔۔۔ ہمارا یقین کیجئے۔ ہم آپ کے۔۔۔"

"اوئے ہوش کر جوانا۔"

بابر ہمایوں مغل نشے میں دھت ادا کے تصور سے باتیں کرنے میں مگن تھا۔ جب بابا پائلٹ نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑ ڈالا۔

بابا پائلٹ' بابر کے ایک قریبی دوست امجد کے اس ڈیرے کا رکھوالا۔۔۔ چوکیدار۔۔۔ باورچی۔۔۔ سب کچھ تھا۔ ان دوستوں کو اپنی خاص محفلیں سجانی ہوتیں' اسی ڈیرے کا رخ کرتے اور سب انتظام یہ مجہول سا نظر آنے والا نشئی' بابا بڑے عمدہ طریقے سے کرتا۔ بالخصوص اسے مختلف قسم کی نشہ آور ادویات کے سگریٹ اور مشروبات تیار کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ اسی بنا پہ اسے "پائلٹ" کا خطاب دے دیا گیا تھا کہ اس کے تیار کردہ "جہاز" گھنٹوں نہیں بلکہ دنوں مدہوشی کی فضاؤں میں اڑاتے پھرتے تھے۔

اس نے اپنے مالک کا جگری دوست جان کے بابر کو اس ڈیرے پہ خوش آمدید کہا تھا۔ کھانا بھی تیار کیا تھا' حسب خواہش اس کا مطلوبہ نشہ بھی فراہم کیا تھا' مگر اب گزشتہ دو روز سے اس کے یہاں دن رات کے مستقل قیام سے وہ تذبذب کا شکار تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اپنے مالک کی اجازت کے بغیر اسے لمبے قیام کا موقع دینا کہیں اس کی نوکری نہ ختم کرا دے۔

"باؤ۔۔۔ ہوش کر' تو تو پرسوں سے ٹن ہوا پڑا ہے۔ میں سمجھا شاید امجد صاحب بھی آنے والے ہوں گے۔ سارے یار دوست اکٹھے ہونے ہوں گے۔ لیکن تسی تے اکیلے ہی آئے اور ابھی تک اکیلے ہی ہو۔ تساں کی کوئی گل بات ہوئی ہے امجد صاحب سے' کہ کوئی نا؟"

وہ اپنے سرائیکی لہجے میں کہتا اسے ہوش میں لانے کی اپنی سی کوششیں کر رہا تھا اور بابر تھا کہ مسلسل دو روز سے ادا کو اپنی وفاؤں اور لازوال عشق کا یقین دلانے کی تگ و دو میں لگا تھا۔

اس کی مدہوشی اور خود فراموشی عروج پہ تھی۔

کبھی وہ ادا کے حسن کے قصیدے پڑھنے لگتا۔

کبھی اپنی محبت اور وفا کی قسمیں کھانے لگتا۔

کبھی اس بے اعتباری اور بے وفائی کے نوحے پڑھتا۔

کبھی دماغ زیادہ گھومتا تو شہزاد ملک کو بے نقط گالیاں سنانے لگتا۔

نشے سے ڈوبے دماغ کی تاریکیوں میں ان سب باتوں کے علاوہ کہیں ملک مقبول کا خوفناک سایہ بھی موجود تھا۔ جو نشہ کم ہونے پہ ابھر آتا اور اسے خوفزدہ کر جاتا۔ اسی عفریت کے ڈر سے وہ ایک بار پھر خود کو نشے کی سیاہی میں ڈبو لیتا۔

"لگتا ہے امجد صاحب سے گل کرنی پڑے گی۔"

اس کے منہ سے کوئی ڈھنگ کی بات نکلوانے میں ناکام ہونے کے بعد بابا پائلٹ نے بالآخر اپنے صاحب کو فون کرنے کا حتمی ارادہ کر لیا۔ یہ سوچ اسے کل سے بار بار آ رہی تھی' مگر وہ ہچکچا رہا تھا کہ ایک غلطی تو کر بیٹھا ہے بابر کو بغیر اجازت ٹھہرانے کی۔۔۔ کہیں اب اپنے صاحب سے جھاڑ ہی نہ پڑ جائے۔

ڈرتے ڈرتے اس نے امجد کا نمبر ملایا۔

"کون وہ مغل؟ کب سے آیا ہوا ہے؟"

"وہ جی۔۔۔ دو دن ہو گئے۔"

"دو دن۔۔۔؟ تم نے اسے اندر کیوں گھسنے دیا۔ اب اسے نکالنا مشکل ہوگا۔ یہ تو ہے ہی مفت خورا۔"

"وہ جی میں نے سوچا کہ تساں دے یار دوست ہیں۔ آگے بھی آتے رہتے ہیں کدی کدی رات وی رک جاندے ہیں۔ میرا یہ بھی اندازہ تھا جی کہ ان کے پیچھے پیچھے تساں تے تساں دے دوست وی آن والے ہوں گے۔ کوئی پارٹی شارٹی ہوگی اس لیے آنے دیا۔ تساں کے ڈر سے ان کی خدمت ودمت کی۔ ورنہ میرا ماے دا پتر تو نہیں ہے وہ۔ پر جی وہ تو پرسوں سے سوٹے لگا کے' چار بوتلیں چڑھا کے ٹن ہوا پڑا ہے' گند پھیلا رکھا ہے۔ بیٹھک میں' ہوش میں آئے تو میں جانے کا آکھوں۔"

"اس بدذات کو تو کوڑے کی طرح اٹھا کے باہر پھینک دینا چاہیے' مگر کبھی کبھی یہ کھوٹا سکہ بھی کام ہی آ جاتا ہے۔ اور جو بھی ہے۔ امجد یاروں کا یار ہے۔ اتنا بدلحاظ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرو بابا اس کا نشہ پانی بند کرو۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو کہنا' امجد صاحب کے سسرال والے ادھر چھٹی گزارنے آ رہے ہیں۔ ڈیرہ خالی کر دیں۔ کہنا' اس کے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا۔ خاندانی بندہ ہے' نزاکت جان کے کھسک لے گا۔"

"جو حکم سرکار۔۔۔ جو تساں دی مرضی۔"

وہ خود بھی اس بن بلائے مہمان سے تنگ آ گیا تھا جس نے قالین کا تو ناس مارا ہی تھا' پان کی پیک' تھوک۔۔۔ بچا کچھا کھانا۔۔۔ یہ سب صاف کرنے میں اس کا پورا دن لگتا۔

امجد نے جو کہا تھا' بابا پائلٹ نے ویسا ہی کیا۔ پہلے تو بابر کے مدہوش و مخمور ذہن نے اس کا مفہوم ہی سمجھنے سے انکار کر دیا۔ وہ سرخ سرخ آنکھیں نکالے اسے گھورتا رہا۔

"مغل صاحب' گل سمجھ نہیں آئی تو دوبارہ بتا دیتا ہوں' امجد صاحب ہیں ناں' تساں دے بیلی۔ (دوست) جناں کا یہ ڈیرہ ہے۔ اور جدھر تساں ڈیرے ڈال کے بیٹھ گئے ہو۔۔۔ وہ والے امجد صاحب۔۔۔"

وہ اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ساتھ اس کے نشے کی زیادتی سے ڈولتے وجود کو مسلسل جھنجوڑتا بھی جا رہا تھا۔

"اناں نے آکھیا اے کہ اناں کے سوہرے ادھر بال بچوں سمیت چھٹی گزارنے آ رہے ہیں۔ اناں کے نال زنانیاں بھی ہوں گی اور کوئی دو چار دن وہ ادھر ہی رہیں گے۔ تساں ہن چل پاؤ۔" (چل پڑو)

بہت مشکل سے وہ بابر کے دماغ میں یہ بات ڈال پایا۔ صبح سے اس نے بابر کے بار بار طلب کرنے کے باوجود اسے نشہ آور سگریٹ دیا تھا' نہ ہی شراب' اب بابر کا نشہ بھی ٹوٹنے لگا تھا اس لیے وہ یہ بھانپ گیا کہ اب یہاں سے روانگی کا وقت آ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ امجد خود آ کر اسے ذلیل کر کے نکالے اور پھر اس ڈیرے کے دروازے اس پہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں اس سے بہتر ہے کہ وہ خود ہی عزت سے یہ جگہ چھوڑ دے۔

"بابا' ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی مہلت تو ملے گی ہمیں؟ ذرا حواس ٹھکانے آ جائیں۔"

وہ ہمیشہ بڑے اسٹائل اور لہجے سے بات کرنے کا عادی تھا۔ مگر آج اس کے لہجے سے وہ کروفر ناپید تھا۔ اس

کی بجائے ایک عجیب بے کسی اور بے بسی تھی۔ جس نے بابا کا دل موم کردیا' ورنہ امجد نے بابر کو فی الفور روانہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

"تساں نہالو' میں گرم پانی کی بالٹی رکھ دیتا ہوں غسل خانے میں۔ کوئی داڑھی شاڑھی ہے تو نواں بلیڈ بھی رکھ دیتا ہوں۔ تساں نہا کے تازہ دم ہوجاؤ' میں گرم چاء تے ناشتا تیار کرتا ہوں۔"

گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد وہ واقعی خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اب اسے دوبارہ وہ غلیظ لباس پہنتے ہوئے گھن آرہی تھی۔ اپنی گھناؤنی فطرت کے برعکس اس کا ظاہر بہت نفاست پسند تھا۔ وہ دن میں دو دو بار دھلا ہوا اور کلف زدہ' امتری شدہ لباس پہننے کا عادی تھا مگر دعا کے گھر ہونے والے حادثے نے اسے اتنا شدید جذباتی دھچکا پہنچایا کہ وہ اس وقت سے اپنے آپ سے غافل تھا یا پھر مسلسل نشہ کرکے ایسا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"لو جی' تساں ناشتا وی کرلیا۔۔۔۔ ہن جلو۔" بابا نے مزید تعاون کرنے سے صاف کردیا۔

بابر سرد آہ بھرتا وہاں سے نکلا۔

"کس منہ سے اب ہم گھر جائیں۔ کتنے دعوے کرکے نکلے تھے۔ سوچا تھا' بگڑتی ہے تو بگڑ جائے گھر ہستی۔ ہم نے کون سا دبارہ پلٹ کے یہاں دیکھنا ہے۔ ہاں بچے ہیں تو اولاد کو بھیج دیا کریں گے چند ہزار ہر مہینے۔ بیٹے بڑے ہوجائیں تو ایک ایک کرکے ان کو باہر بھی ادھر سیٹ کرادیں گے۔ چند سال بعد لڑکی کو رخصت کرنے کے لیے رقم بھی بھیج دیں گے اور بھلا ایک باپ کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔ رہی وہ سالی بڈھی۔۔۔۔ تو نہ ہمیں پہلے اس کی پروا تھی نہ اب' اس لیے دیدہ دلیری سے اس کا زیور بھی بیچا۔ ادا جی سے اپنے تعلق کا اقرار بھی کیا' اور تو اور اس سالے شہزاد ملک سے رقم اینٹھنے کی خاطر اس کے آگے کھل بھی گئے۔

"سوچا' زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ یہ بھانڈ جاکر ہمارے خسر کو سب بتادے گا۔۔۔ تو بتادے۔ ہم کون سا ان کا سامنا کرنے والے ہیں۔۔۔ مگر حیف۔۔۔۔ ہماری اڑان نہ بھری جاسکی۔ ایسے پر کترے ہیں قسمت نے کہ اوندھے منہ جاگرے ہیں۔ دل پہ چوٹ لگی ہے سو الگ۔۔۔۔ بھرم کھویا سو الگ اور سب سے خوفناک چیز۔ جواب سب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس بڑھیا کا جس سے ہمارے والد محترم ہمارا نصیب پھوڑ گئے۔ ان خسر صاحب کا جن کو سامنے پاکر نجانے کیوں ہماری گھگھی بندھ جاتی ہے اور سب سے بڑھ کے ملک مقبول کا۔ پتا نہیں وہ ہمارا کیا حشر کرنے والا ہے۔ کس کس سے چھپیں گے ہم۔ ملک مقبول سے چھپنے کی خاطر گھر میں بندھ کر بیٹھ جاتے ہیں مگر گھر میں بیوی بچوں سے منہ کیسے چھپائیں۔ اب جو بھی ہے' جانا تو اسی جگہ ہے۔ اسی گھر میں۔"

اس نے مردہ دلی سے چلتے ہوئے راستے میں پڑے ایک پتھر کو ٹھوکر سے دور تک لڑھکا دیا۔

اب اس کی نظریں سامنے سڑک پہ تھیں' جہاں سے شہر کی طرف جانے والی بس کی آمد متوقع تھی۔ یہ ڈیرہ مضافاتی علاقے میں تھا۔

"اس گھر میں جائے بغیر چارہ بھی کوئی نہیں۔ مصیبت میں کام آنے والے دوست اب کہاں رہے ہیں۔ سب نے آنکھیں پھیرلی ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے۔ گھر جیسا بھی ہو' اپنا ہوتا ہے۔ جب کہیں پناہ نہ ملے تو اپنے گھر میں تو مل ہی جاتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"یہ کام تو آپ نے بہت عمدہ کیا **عمیص** میاں!"

صاحبزادہ نفیس علی خان نے ستائش بھرے انداز میں کہنے کے بعد دوبارہ اس کاغذ کو بغور پڑھنا شروع کیا۔ جس پہ دعا کے گھر کے پتے کے علاوہ اس کے دونوں فون نمبرز بھی درج تھے' گھر کا بھی اور سیل فون کا بھی۔

"ہم تو یہ سوچتے ہی رہ گئے تھے کہ اب دوبارہ اس بچی کو کبھی دیکھ بھی پائیں گے یا نہیں؟ اس سے رابطہ کیسے ممکن ہوگا؟ اس کا مطلب ہے کہ آپ سے بات کرنے کا ہمارا فیصلہ بالکل درست تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا دل ہلکا پھلکا ہوگیا بلکہ آپ نے ہمارے مسئلے کا حل بھی چند گھنٹوں میں ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔"

وہ بلا تکلف اس کی تعریف کر رہے تھے۔ **عمیص** کے لیے یہ رویہ نیا تھا یا ان کا سراہنا اس لیے بجائے خوش ہونے کے وہ بے آرام ہوا۔ وہ ان کے منہ سے اعتراضات سننے کا شاید عادی ہوگیا تھا۔

"چچا حضور! آج کے دور میں کسی کا نام پتا معلوم کرنا ایسا مشکل کام بھی نہیں رہا اور یہ تو خاصی معروف و مقبول ہستی ہیں' ان سے کون ناواقف ہے' اس لیے میں نے کوئی ایسا معرکہ بھی انجام نہیں دیا۔ آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔ یہ دراصل میرے ایک دیرینہ دوست کی مہربانی ہے' وہ شوبز کا صحافی ہے۔ شوبزنس سے وابستہ افراد کا پتا لگانا اس کے لیے آسان ترین کام تھا۔"

وہ انکساری سے کہہ رہا تھا مگر اس کے الفاظ نادانستگی میں نواب صاحب کو ٹھیس پہنچا رہے تھے۔ ان کا دل باقاعدہ کراہنے لگا۔

"**عمیص** میاں! ہماری استدعا ہے کہ بار بار ہمارے سامنے اس بات کا ذکر مت کیجیے کہ یہ بی بی کس پیشے سے منسلک ہیں۔ ہمیں اس ذکر سے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ ہماری گزارش ہے کہ۔۔۔"

"چچا حضور۔۔۔" وہ ان کے انداز پہ دنگ رہ گیا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! استدعا اور گزارش جیسے الفاظ استعمال کرکے آپ اب مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ آپ تو حکم کیا کیجیے۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ان محترمہ سے آپ کی جذباتی وابستگی کا دھیان کیے بغیر بہت کچھ کہہ دیا۔"

"چلیے' جانے دیجیے اس ذکر کو۔"

نواب صاحب نے موضوع بدلنا چاہا بلکہ ایک طرح سے **عمیص** کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے سائیڈ پہ رکھی کتاب دوبارہ کھول لی۔

وہ تذبذب کے عالم میں وہاں کھڑا رہا۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا جو پوچھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی کیفیت بھانپ کر صاحبزادہ نفیس علی خان نے کتاب سے نظریں اٹھا کے اس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں صاحبزادے؟"

"جی چچا حضور! میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے کہنے پہ میں نے یہ معلومات آپ کی خدمت میں پیش تو کردی ہیں مگر آپ ان کا کریں گے کیا؟"

نواب صاحب اس کے بے محل سوال پہ مسکرائے۔

"ان معلومات کا مقصد یہ جاننا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہیں' کون ہیں' ان سے رابطہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہم ان سے رابطہ کرنا چاہیں گے۔ مل کر ان سے کچھ دریافت کرنا چاہیں گے تاکہ ہماری الجھنیں دور ہوں۔"

"جی درست فرمایا مگر میری ناقص رائے یہ تھی کہ آپ براہ راست ان سے رابطہ یا ملاقات کرکے یہ سوال جواب کرنے کی بجائے مجھے ایک بار پھر خدمت کا موقع دیجیے۔ میں اپنے انداز میں پتا لگاتا ہوں۔"

اس نے اپنی خدمت پیش کیں۔

"آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

نواب صاحب نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

"دراصل۔۔۔ دراصل مجھے یہ آپ کے شایان شان نہیں لگ رہا۔"

کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے اصل وجہ بیان کی۔

وہ بات کو سمجھتے ہوئے سر ہلانے لگے۔

"ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں لیکن یہ کام ہمیں خود ہی کرنا ہوگا' اس سے ہماری تسلی و تشفی ہوپائے

گی ورنہ ایک خلش۔۔۔ ایک ملال عمر بھر رہ جائے گا۔ آپ فکر مت کیجیے، ہمیں بخوبی علم ہے کہ ہمیں یہ کام کیسے کرنا ہوگا۔"

ان کا انداز حتمی تھا۔ عمیص مزید کچھ نہ کہہ سکا اور شب بخیر کہتا کمرے سے نکل گیا۔

صاحبزادہ نفیس علی خان نے کتاب واپس میز پہ رکھی اور پرچی اٹھا کے دوبارہ اسے پڑھنے لگے۔

"آپ جو بھی ہیں، ہماری الجھن کا جواب ہیں اور ہم یہ جواب جلد از جلد حاصل کرنا چاہیں گے، شاید کل صبح ہی۔"

☼ ☼ ☼

دعا کے سیل فون پہ بہت مدھم بزر بج رہی تھی۔ وہ بیڈ پہ دوسری جانب کروٹ لیے لیٹی تھی۔ آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی مگر دل فون اٹینڈ کرنے پہ مائل نہ ہو رہا تھا۔ وہ بے حسی کی چادر اوڑھے سامنے کی دیوار پہ بے تاثر نگاہیں جمائے لیٹی رہی۔ یہاں تک کہ نمبر ملانے والا خود ہی تھک گیا یا پھر شاید مایوس ہوگیا۔

بہت دیر کے بعد اس نے کروٹ بدلی اور بیڈ پہ ذرا فاصلہ پہ پڑے اپنے موبائل پہ اس کی نظر گئی تو بے ارادہ ہی اسے اٹھا لیا۔ ان باکس میں مسڈ کال کے حرف جگمگا رہے تھے۔ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس نے جاننا چاہا کہ کون تھا جو اتنی مستقل مزاجی سے اس سے رابطہ کرنے کی تگ و دو میں تھا۔

"چھا جی!"

نام پڑھنے کے بعد وہ اچھل کے بیٹھ گئی۔

"اب آپ کیا چاہتے ہیں چھا جی! جو چاہتے تھے، وہ کر گزرے۔ اب اور کیا رہ گیا ہے۔"

وہ موبائل دوبارہ ایک جانب پھینک کر بڑبڑا رہی تھی۔

"پتا نہیں وہ کون سا جذبہ تھا جو آپ کو یہاں تک کھینچ لایا تھا۔ پتا نہیں آپ بابر صاحب سے اپنی کھسیاہٹ اور ناکامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ماما جی سے کیے وعدے کی لاج رکھتے ہوئے واقعتاً "میرا بھلا کرنا چاہتے تھے۔ مجھ سے ہمدردی جتاتے ہوئے یا خدا ترسی کے جذبے کے تحت مجھے بابر جیسے شخص کے چنگل میں جانے سے بچانا چاہتے تھے یا پھر آپ کو اپنی نیک نامی عزیز تھی۔ میرا آپ سے رشتہ منظر عام پہ آچکا ہے۔ ایسے میں میرے ساتھ پیش آنے والا کوئی بھی تلخ حادثہ آپ کے لیے اسکینڈل بن سکتا ہے۔ جو بھی ہے، میری ذات پہ یہ آپ کا ایک اور احسان ہے۔ وجہ چاہے کوئی بھی رہی ہو لیکن آپ کا کام ختم ہوا پھر آپ دوبارہ مجھ سے رابطہ کیوں کر رہے ہیں۔ یہ بات میں سمجھ نہیں پا رہی۔ آپ کے حوالے سے خوش فہم ہونا اس دل نے کب کا چھوڑ رکھا ہے، ورنہ میں کوئی حوصلہ افزا خواب بھی بُن سکتی تھی۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں چھا جی!"

الجھ کر اس نے شہزاد ملک کا نمبر ملایا مگر بیل جانے سے پہلے ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

"نجانے اب آپ کی پٹاری میں میرے لیے کیا چھپا ہے۔ میرا دل اتنے جھٹکوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے، دو چار طعنے سنانے ہوں گے۔ اپنے اندازوں کی درستگی کی داد وصولنا ہوگا۔ پہلے ہی شرمندہ ہوں، اب مرے ہوئے کو کیا مارنا چھا جی! پھر کبھی سن لیں گے آپ کی کڑوی باتیں اور تبرک کی طرح روح پہ سجا بھی لیں گے۔ آپ کی ذات سے ہمیں یہ بھی مل جائے۔ بہت ہے مگر ابھی نہیں، ابھی کچھ دن نہیں۔"

اس نے فون آف کر کے پھینک دیا اور دوبارہ سے تکیے پہ سر گرا لیا۔

باہر سے گھر کے فون کی کرخت بیل کی آواز گونجی۔ دعا گمان بھی نہ کر سکتی ہوگی کہ یہاں سے مایوس ہونے کے بعد شہزاد گھر کا نمبر ملا سکتا ہے، اس لیے وہ یونہی بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

چھٹی بیل کے بعد اسے اللہ وسائے کی بیزار سی "ہیلو" سنائی دی۔

"ہاں بھرجائی! سنا کیا حال ہے؟"

باپ کی آواز پہ وہ چونکی اور تکیے سے سر اٹھا کے کان باہر لگائے۔

"بس کی سنایئے۔ رب دا شکر اے۔" اللہ وسائے نے ایک تھکی ماندہ سی سانس بھری۔

"تسی سناؤ بھرجائی! چنگے او؟ اچھا اچھا۔۔۔ افسوس کے لیے فون کیا ہوگا۔ شہزادے نے خبر پہنچا دی ہوگی، میری دھی کی بربادی کی۔"

اس کے کڑوے کسیلے لہجے پہ دعا کی پیشانی پہ ناگوار سی شکنیں نمودار ہوئیں۔ اسے اپنے لیے لفظ "بربادی" پسند نہیں آیا تھا۔

"نہیں بھرجائی! اوکھا کیا بولنا ہے میں نے۔ میرے تو سارے کس بل نکل گئے ساری آکڑ (اکڑ) توڑ کے رکھ دی ہے تیسے نے۔ اب پتا چلا ہے کہ کڑی کا پیو ہونا کیا ہوتا ہے۔ دعا کے اتھرو مجھے اندروں اندری (اندر ہی اندر) گلا رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میری وجہ سے وہ اس مصیبت میں پھنسنے لگی تھی۔"

اس کا درد سچا محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت دعا کو اس پہ اداکاری کا ذرا برابر گمان نہ تھا۔

"سچی کہہ رہا ہوں بھرجایئے! میں لالچ میں انا (اندھا) ہوگیا تھا۔ میری مت ماری گئی تھی۔ میں اسے نوٹ چھاپنے والے مشین بنانے پہ تلا بیٹھا تھا۔ شاید مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے، ایک چین سکون اور عزت والی زندگی کی چاہ میں وہ بابر کے جال میں پھنس گئی، ورنہ وہ تو بڑی سیانی دھی تھی۔۔۔ ہاں بھرجائی! میرے سے زیادہ دنیا جانتی تھی۔ گھر کے اندر بیٹھ کر بھی سارا اچھا برا پتا تھا اسے۔ میری وجہ سے وہ عقل کے دروازے بند کر کے اس کے پیچھے چل پڑی۔ میں تو اس دن کے بارے میں سوچ سوچ کے کانپ جاتا ہوں، جب بابر کے ارادے کامیاب ہو جاتے۔ میں تو تمہاری نناں (نند) کو اوپر جا کے منہ دکھانے کے جوگا نہ رہتا۔ اللہ کا کرم ہے اس نے بچا لیا۔ مجھے گناہ گار ہونے سے بھی بچا لیا، ورنہ بیٹی کی بربادی کا ذمہ مجھ پہ لگتا اور شہزادے پتر کا بھی احسان ہے کہ اس نے بڑے موقع پہ مدد کی اور تو کہتی ہے بھرجائی کہ میں تیرے ساتھ اوکھا بول رہا ہوں۔ میں تو ساری عمر تیرے اور تیرے پتر کے آگے گردن نہیں اٹھا سکتا۔"

دعا کو پتا بھی نہیں چلا کب اس کے چہرے پہ سے گرم گرم آنسو پھسلتے گئے اور کب اس کے گریبان میں جذب ہوگئے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ "باپ" کے رشتے سے آج ہی آشنا ہوئی ہو اور یہ سچ بھی تھا۔ اللہ وسائے کے اندر کا باپ بھی کچھ دیر قبل جاگا تھا۔ اس وقت جب بابر جاتے جاتے زہر اگل گیا تھا۔

"بس بھرجائی! جھلا ہو گیا ہوں، اپنی مارتا جا رہا ہوں، تمہاری تو سن ہی نہیں رہا۔ ہاں بولو جی، کس لیے فون کیا تھا؟

ہیں۔۔۔؟ تو اس میں پچھنے والی کون سی بات ہے۔ تمہارا اپنا گھر ہے بھرجائی! جم جم آؤ، سو سو واری آؤ۔ خاص بات؟ کیسی خاص بات؟ کھل کر بات کرو بھرجائی! خیر تو ہے نا۔ میرا دل پہلاں ہی بڑا وہمی ہو رہا ہے۔

چلو بھرجائی! تم کہتی ہو تو تسلی رکھتا ہوں کہ خیر کی بات ہی ہوگی۔ ہاں ہاں۔۔۔ آج ہی آجاؤ۔ نہیں نہیں ہم نے کہاں جانا ہے۔ میرا تو دل ہی نہیں کرتا باہر نکلنے کو۔ اس دن سے ایسی ہمت ٹوٹی ہے، چپ کی بکل مار کے بیٹھا ہوں۔ بس آج تجھے اپنا جان کے دل ہلکا کر بیٹھا اور دعا بھی گھر پہ ہی ہے۔ میں نے خود ہی اس کی ریکارڈنگ کینسل کرائی ہے۔ ابھی اس کا جی ماڑا ہے۔ کیا کرے گی ریکارڈنگ پہ جا کے اور پھر ایک اور بات بھی ہے۔ مجھے ڈر ہے وہ کمینہ پھر سے دعا کو گھیر گھار کے چکنی چپڑی نہ مارنے لگ جائے۔ اچھا ہے کہ وہ دو تین دن گھر پہ ہی رہے اور تمہارے آنے سے ویسے بھی اس کا دل بہلے گا۔ تجھے دیکھ کے اسے خوشی ہوگی اور دلاسا بھی ملے گا۔ میرا تو منہ نہیں اس کے سامنے جانے کا۔ اب بھرجائی! تم ہی آکر اسے ذرا سمجھاؤ کہ دنیا اس ذلیل بندے پہ ختم نہیں ہوگئی۔ اسے یہ بھی بتانا کہ اب اپنے پیو پہ بھروسہ رکھے۔ وہ صرف اس کی خوشیوں کا دھیان رکھے گا اور کسی بات کا نہیں۔"

اللہ وسایا اور بلقیس دونوں فون پہ لمبی بات کرنے کے عادی تھے، اس لیے دعا نے اکتا کر اپنا دھیان اس طرف سے ہٹا لیا۔ البتہ مامی کے آنے کی خبر سن کر اس کے دل کو خوشی کا ہلکا سا احساس ضرور ہوا تھا۔

"لیکن پتا نہیں چھا جی! مجھے کیا کہنا چاہتے تھے اور وہ کون سی بات ہے۔ جس کے لیے مامی جی نے خاص طور پہ فون

کر کے اپنے آنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ تو بے تکلفانہ آتی جاتی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"تو یہ نخرے دیکھو اس بندے کے اور اوقات دیکھو۔"
ملک مقبول نے بوسیدہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ناک چڑھا کے کہا۔
"اکڑا تنی ہے جیسے محلوں میں رہتا ہو۔ ویسے کٹڑی کی پیداوار ہے۔ بات ایسے کرتا ہے جیسے کہیں کا شہزادہ ہو۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ فقیروں کا نواب۔"
وہ مسلسل بڑبڑاتا رہا۔
"صاحب! وہ تیسرا کمرہ بابر کا ہے۔"
نور جہاں نشان دہی کر کے واپس لوٹ گیا تھا۔ ملک مقبول ادھر ادھر دیکھتا آگے بڑھا۔ کھلے سے صحن میں بہت سے بچے زمین پہ بیٹھے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کئی چارپائیاں بچھی تھیں جن پہ ضعیف عورتیں بیٹھی مختلف مشاغل میں مگن تھیں۔ کوئی حقہ گڑگڑا رہی تھی' کوئی کسی بچی کو گھٹنوں میں دبوچے اس کا سر صاف کر رہی تھی' کوئی ہری بھری سبزی کا ڈھیر آگے لگائے بیٹھی تھی۔ بہت کم عمر بچوں اور بہت بوڑھے لوگوں کے علاوہ اور کسی عمر کا بندہ نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ اس طبقے کے محنت کش افراد میں بیٹھنے کا رواج نہ تھا۔ عورت ہو یا مرد۔۔۔ لڑکا ہو یا لڑکی۔۔۔ سب رزق کی تلاش میں گھر سے نکل چکے تھے۔
ملک مقبول نے اس لکڑی کے دروازے پہ لٹکی لوہے کی زنجیر ہلائی۔
"کون ہے؟" بہت سی کھانسی کے ساتھ کسی عورت کی کمزور سی آواز سنائی دی۔
"ملک مقبول' بابر ہمایوں مغل کا دوست۔"
اس نے جان بوجھ کے لفظ "دوست" استعمال کیا تاکہ اگر بابر سن رہا ہے تو خوش امید ہو کے دروازہ کھول دے۔
"بھیا! وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔" وہی کمزور سی ہانپتی کانپتی آواز سنائی دی۔ اتنا بولنے کے بعد اسے دوبارہ کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر اس کھانسی کے رکنے کا انتظار کرتا رہا پھر اکتاہٹ بھرے لہجے میں دوبارہ پوچھا۔
"کب تک آئیں گے مغل صاحب؟" اس کے ہر لفظ سے طنز ٹپک رہا تھا۔
"جی علم نہیں اور وہ تو گزشتہ دو تین روز سے گھر نہیں آئے۔"
یہ ایک اور آواز تھی' بے حد کم عمر۔۔۔ لوچ دار اور پرکشش۔ شاید پہلے بولنے والی عورت کو کھانسی کا دورہ بولنے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ اس کم عمر اور حسین آواز نے ملک مقبول کے اشتیاق کو بڑھا دیا۔
"اس کا مطلب ہے اس مغل نے گدڑی میں لعل ہی چھپا رکھا ہے۔ کسی بہانے اس تنگ کو کھنگالنا چاہیے۔"
اس کے ہونٹوں پہ مکروہ ہنسی پھیل گئی۔

● ● ●

وہ لوچ دار' رسیلی نوعمر آواز ملک مقبول کے اشتیاق کو بھڑکا کر خاموش ہو چکی تھی۔ اب اندر سے اس تھکی ہوئی بیمار عورت کی مسلسل کھانسی کی آوازیں آرہی تھیں۔ کھانسی پل دو پل رکتی تو دھونکنی کی طرح چلتی سانس کی کھڑ کھڑ دروازے کے اس پار کھڑے ملک مقبول تک با آسانی پہنچ جاتی۔
اس نے ان بیمار آوازوں پہ کوفت محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر لکڑی کے کواڑ پہ دستک دی' جو ہر دستک پہ لرز کے جھولنے لگتا تھا۔ مگر اس کی اس دوسری دستک کا کوئی ردعمل نہ ملا اسے۔ البتہ اندر ہوتی کھڑ بڑ سے وہاں کی افراتفری صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ شاید اس عورت کی بگڑتی حالت اندر بیٹھے نفوس کو اتنی مہلت نہیں دے رہی تھی کہ وہ دستک پہ توجہ دیتے۔
"امی حضور۔۔۔ امی حضور!"
کھانسی کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہوئی تو وہی مدھر' میٹھی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس بار اس آواز میں

سراسیمگی تھی گھبراہٹ اور بے چینی تھی۔
یہی بے چینی ملک مقبول نے بھی محسوس کی مگر اس بے چینی کا پس منظر سراسر دوسرا تھا۔
وہ ایک بار پھر شدت سے بے تاب ہو گیا اس مدھر آواز والی کی صورت دیکھنے کے لیے۔
لکڑی کے کواڑ میں ان گنت چھوٹی بڑی درزیں تھیں۔ وہ ان میں جھانکنے سے بھی نہ جھجکا مگر اس کوشش کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔
"امی حضور۔۔۔ خدارا آنکھیں کھولیں۔"
دوسری جانب آنسوؤں سے بھیگی یہ آواز اسے گویا تپتی ریت پہ ننگے پاؤں نچا رہی تھی۔
"دروازہ کھولو۔۔۔ میں ہوں ملک مقبول' بابر ہمایوں مغل کا قریبی دوست' اس کا باس۔" اس بار اس نے صرف دستک دینے پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک بار اور اپنا تعارف کرایا۔ کچھ اضافے کے ساتھ۔
چند منٹ اسی طرح گزرے تو اس نے جھنجلا کر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ بایاں ہاتھ کا مکا بنا کر مارتے ہوئے یونہی ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ جھلنگا سی چارپائی پہ بیٹھی وہ بوڑھی عورت جس نے گھٹنوں میں ایک تین چار سالہ بچی کو دبوچ رکھا تھا۔ اس کے جوؤں سے بھرے بال کھنگالنے کی بجائے اب اپنی چندی آنکھیں سکوڑ کے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔
پیروں کے بل زمین پہ بیٹھ کے حقہ گڑگڑاتا وہ انتہائی نحیف و ضعیف بابا بھی اسے ہی گھور رہا تھا۔
ذرا فاصلے پہ "کیڑی کاٹا" کھیلتے تین سے چھ سال تک کی عمر کے پانچ بچے اپنا کھیل روک کے متجسسانہ نظروں سے کبھی اسے کبھی دروازے کو دیکھ رہے تھے' جیسے یہ اندازہ لگانا چاہ رہے ہوں کہ کبھی یہ دروازہ کھلے گا بھی یا نہیں یا پھر یہ باؤ یونہی ہتھیلیوں پہ مکے مارتا' پیر پٹختا رہے گا۔
ملک مقبول کو احساس ہوا کہ وہ پچھلے دس پندرہ منٹ سے یہاں اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ اسے ان ٹکے ٹکے کے لوگوں کے سامنے تماشا بنتے ہوئے سخت خفت محسوس ہوئی۔
"جیسا بابر۔۔۔ ویسے نخریلے اس کے گھر والے۔ کوٹھڑی کا دروازہ نہ ہوا' قسمت کا دروازہ ہو گیا جو کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔"
وہ قریب تھا کہ اس دروازے اور اس کے پیچھے گم اس ان دیکھے حسین راز پہ لعنت بھیج کر پلٹ جاتا کہ وہی آواز پھر سنائی دی۔ واضح طور پہ وہ اسے ہی مخاطب کر رہی تھی۔
"ہماری امی حضور۔۔۔ وہ وہ۔ بے ہوش ہو گئی ہیں۔" پندرہ منٹ میں اسے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اندر ان ماں بیٹی کے علاوہ تیسرا کوئی نہیں۔ اس لیے یہ فقرہ اسے ہی سنایا گیا ہے۔
"او ہو۔۔۔ چچ! اور تم اس وقت اکیلی بھی ہو۔ بھئی یہ بابر تو بہت غیر ذمہ دار نکلا۔ اس حالت میں ان خاتون کو چھوڑ گیا ہو۔"
اس نے ہمدردی جتاتے جتاتے اسے اکیلے پن اور بے بسی کا اور بھی زیادہ احساس دلایا۔ یقیناً اس کی سراسیمگی میں مزید اضافہ ہو گیا ہو گا۔ آواز سے تو پہلے ہی لگ رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔
"ویسے تم بابر کی کون ہو؟"
اندازہ تو وہ لگا ہی چکا تھا۔۔۔ اس کھانسنے والی عورت کے بارے میں بھی اور رونے والی لڑکی کے بارے میں بھی مگر تصدیق کے لیے سوال کیا۔
"جی۔۔۔ ہم ان کی صاحبزادی ہیں۔"
بے حد مدھم آواز میں اس نے اپنا تعارف کرایا۔
یہ شاہانہ لب و لہجہ اس نے پہلی بار نہیں سنا تھا۔ یہ نوابی انداز۔۔۔ اسے کسی کی یاد دلا رہے تھے۔
بابر ہمایوں مغل کی۔

مگر عجیب بات تھی کہ اس کی جس ہم۔۔۔ ہم سے ملک مقبول چڑتا تھا' بدک جاتا تھا اس کے شاہانہ لہجے پہ۔۔۔ وہ انداز اس رسیلی آواز والی میں محسوس کر کے وہ جھوم اٹھا۔

"ہاں بھئی جچتا ہے یہ انداز بھی کسی کسی پر ہی جچتا ہے۔" اس نے اپنی تلوار مار کہ مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوئے زیر لب مسکرا کر سوچا۔

اس وقت اس کے سیاہی میں ڈوبے' مکروہ بھدے نقوش والے چہرے پہ خباثت کا تاثر عروج پہ تھا۔ اگر صاحبزادی دلکش اسے ایک نظر اس وقت دیکھ لیتی تو اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود اس کے اندر کی غلاظت بھانپ لیتی مگر وہ تو صرف سن رہی تھی۔

اس کی ہمدردی کے تاثر میں ڈوبی آواز۔

اور فی الحال بیچاری کے حواس ویسے ہی ماں کی بے ہوشی سے مختل ہوئے جا رہے تھے۔ سخت مجبوری کے عالم میں وہ کسی اجنبی شخص سے ہم کلام تھی ورنہ نہ تو اسے اس کی اجازت تھی نہ یہ اس کی ماں کی تربیت تھی نہ ہی اس کی اپنی فطرت۔

"اوہو۔۔۔ بابر کی بیٹی ہو۔ بھئی پھر تو ہماری بھی ہوئیں۔"

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں یہ ادھورا فقرہ کہا۔ لفظ بیٹی حذف کر کے اس نے صرف ہماری کہا تھا مگر کچھ اس طرح کہ دلکش کو اس کی ذات سے ڈھارس ہوئی۔ یوں بھی ایک تو وہ اس کے والد سے آشنائی بلکہ گہری دوستی کا دعوی کر رہا تھا اور دوسرے آواز سے بھی کوئی ادھیڑ عمر شخص لگ رہا تھا' اس کے والد سے بھی زیادہ عمر کا۔

"میرے پاس گاڑی ہے۔ میں تمہاری والدہ کو ہسپتال لے جاتا ہوں اور فون کرتا ہوں اپنے کسی ملازم کو۔۔۔ وہ بابر کو ڈھونڈ لاتا ہے۔"

"فون ون ہے آپ کے پاس؟"

"ہاں بھئی' کیمرے والا نیا ماڈل ہے' دبئی سے منگوایا ہے۔" وہ اس سچویشن میں بھی اپنا چھچھورپن بگھارنے سے باز نہ آیا۔

"کیا آپ ہمارے ماموں جان کو فون کر کے اطلاع دے سکتے ہیں؟"

اسے دبئی سے منگوائے مہنگے اور جدید ماڈل کے سیل فون اور اس میں لگے کیمرے سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں فوری طور پر عمیص کو فون کرنے کا خیال آیا تھا۔

"ہم ان کا نمبر ڈھونڈتے ہیں۔"

ملک مقبول تلملا کے رہ گیا۔

"کمال کرتی ہو۔ تمہاری والدہ بے ہوش ہیں اور تم ادھر ادھر فون اچھا بھئی کر دیتے ہیں فون بھی۔ مگر انہیں ہسپتال لے جانے میں دیر مت کرو۔ تمہارے ماموں بہت جلدی بھی آئے تو دس پندرہ منٹ تو لگیں گے۔ اتنی طویل بے ہوشی نقصان دہ ثابت نہ ہو۔"

اگرچہ اس کے چہرے پہ ایک شاطرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں میں ایک سازش پل رہی تھی مگر اس کی آواز میں غضب کی اداکارانہ صلاحیت تھی۔ وہ بڑی مہارت سے دلکش کی گھبراہٹ میں اضافے کرتا ہوا اسے خود پہ اعتماد کرنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

مٹھی میں فون نمبر والی پرچی لیے وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"یہ صاحب درست کہہ رہے ہیں لیکن ماموں جان کو اطلاع دینا بھی ضروری ہے اور پھر وہ درست مشورہ بھی دیں گے کہ ہمیں ابا حضور کے ان دوست کی مدد لینی چاہیے یا نہیں۔ اگر ہم نے اپنے بل بوتے پہ ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تو کہیں بعد میں امی حضور یا نانا حضور کی خفگی نہ دیکھنی پڑے۔"

اندر سے چیخنی گرانے کی آواز آئی۔

مگر اس وقت نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا وہ تخیل تصور اور امکان کی حد سے بہت آگے کی چیز تھا۔

ہلکے سبز سوتی بڑے سے دوپٹے میں لپٹا وہ کم سن' اچھوتا وجود ملک مقبول کی تجربہ کار آنکھوں کا اب تک دیکھا سب سے حسین سراپا تھا۔

ایک ایسا چہرہ جو پندرہ سولہ برس کی ایک لڑکی کا تھا مگر جو زمانوں کا حسن سمیٹے ہوا تھا۔

ایسی آنکھیں جن میں حزن و ملال کا سحر انگیز تاثر بھی تھا اور مقابل کو چت کر دینے والی معصومیت بھی۔

ایسے بھولے نقش تھے جو دیکھنے والے کا دل موہ کر لے جائیں۔ ان دراز پلکوں کے سرے پہ موتی ایسے آنسو ٹنگے تھے جو ان آنکھوں کی زیبائش کا کام دے رہے تھے۔

وہ کسی بھی مصنوعی رنگ۔۔۔۔ آرائش اور سنگھار سے بے نیاز تھی۔۔۔۔ درحقیقت اسے ان میں سے کسی کی بھی حاجت نہ تھی۔

"جی یہ رہا نمبر۔" اس کے ہاتھ میں کاپی تھی جس کا ایک صفحہ پھاڑ کے اس نے آگے بڑھایا اور ملک مقبول جیسے کسی سحر کے عالم سے آزاد ہوا۔

اس جیسے ہوس کے مارے غلیظ انسان کی آنکھوں میں بھی اس وقت صرف اور صرف ستائش تھی مرعوبیت تھی۔ ایک بے حد معمولی لباس والی لڑکی جس کی صورت اور آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے کئی گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا اور جو ایک ٹوٹی ہوئی خستہ حال کوٹھری کے باہر ننگے پیر کھڑی تھی' وہ اس لڑکی سے مرعوب ہو رہا تھا۔

صاحبزادی دلکش کی توجہ ابھی تب کاپی کے اس ورق پہ تھی جس پہ عمیص کا نمبر درج تھا' وہ اس کی محویت نہ دیکھ پائی ورنہ باپ کی عمر سے بڑے شخص کی نظریں اسے ضرور چونکا دیتیں جسے اس کے والد سے دوستانے کا بھی دعوی تھا۔ اسے اپنے جانب متوجہ دیکھ کر ملک ذرا سنبھلا۔

ہاتھ آگے بڑھا کے اس نے وہ ورق تھامنا چاہا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ بیلے کی کلیوں سے نازک انگلیاں چھو کر دیکھے مگر ضبط کر گیا۔

"یہ نمبر غلط تو نہیں؟ کوئی اٹھا نہیں رہا۔"

یقیناً" اس نے نمبر غلط ملایا تھا۔

"جی پتا نہیں۔" وہ اس سے بات کرتے ہوئے نروس نظر آ رہی تھی۔ کسی اجنبی کے روبرو آنا اس سے مخاطب ہونا اس کے لیے پہلا تجربہ تھا۔

"یہ ماموں جان کے اسٹور کا نمبر ہے ہو سکتا ہے وہ اب تک اسٹور پہ نہ پہنچے ہوں۔"

"پھر یہاں کھڑے ہو کر وقت ضائع کرنا بے وقوفی ہے۔ میں راستے میں بار بار نمبر ملاتا رہوں گا۔ تم جلدی کرو ماں کو ہسپتال لے جانے کی تیاری کرو۔"

اسے مشورہ دینے کے بعد اس نے اندر کی جانب جھانکا اور زبردست قسم کی پریشانی چہرے پہ سجا کے بوکھلا کر کہنے لگا۔

"اوئے ہوئے ان کی تو حالت بڑی نازک ہے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ بلاؤ کسی کو ان کو نیچے تک لے جانے میں مدد کریں۔"

اس کے انداز پہ تذبذب میں کھڑی دلکش نے فوری فیصلہ کر لیا اس کے ساتھ جانے کا اور ایک قدم آگے بڑھا کر دلبیزپار کی' بڑے سے صحن میں موجود بہت سی جان پہچان والی خواتین سے مدد طلب کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

دعا اسی بے دلی کے عالم میں اب تک اپنے کمرے میں نیم تاریکی پیدا کیے چپ چاپ لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔

مامی بلقیس کے آنے کی خبر نے بھی اس کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں کی تھی ورنہ وہ ان کے ۔۔۔ یا ان کے ہاں سے آنے والے کسی بھی فرد کی آمد پہ بچپن سے ہی خوشی کے مارے بے قابو ہو جایا کرتی تھی۔

باہر سے آتے ہارن کی آواز پہ بھی اس میں کوئی حرکت نہ پیدا ہوئی۔ گیٹ کھلنے ۔۔۔ پھر بند ہونے اور لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے مامی کے بلند و بانگ قہقہوں نے بھی اسے اٹھنے پہ آمادہ نہ کیا۔ بلکہ اسے مامی کے ان قہقہوں سے بے زاری محسوس ہوئی جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھے اور اسے ہمیشہ سے پسند بھی تھے۔ وہ خود کبھی اس طرح کھل کے ہنس نہ پائی تھی۔ نہ ہنس سکتی تھی مگر ان کے ان قہقہوں کو اس بے ساختہ ہنسی کو رشک سے سنا ضرور کرتی تھی۔ آج اس کے دل پہ وہ مردنی چھائی تھی کہ مامی کا ہنسنا بھی اسے برا لگ رہا تھا۔

ڈرائیور کی بجائے وہ شہزاد کے ہمراہ آئی تھی۔ شہزاد کی آواز سے اس اندازے کی تصدیق کا ہونا بھی اسے پر جوش نہ کر سکا البتہ حیران ضرور کر گیا۔

"اب کون سا فرض نبھانا رہ گیا تھا چھاجی آپ اپنا آخری فرض بخوبی ادا کر گئے تھے پھر اب 'اب کیا کرنے آئے ہیں؟ کیا یہ دیکھنے کے لیے کہ دوسری بار عشق میں چوٹ کھانے کے بعد میرا کیا حال ہے؟ آپ کا خیال غلط ہے چھاجی ۔۔۔ عشق تو میں نے صرف اور صرف آپ سے کیا تھا۔ پہلا بھی ۔۔۔ دوسرا بھی اور آخری بھی۔ بابر تو میری محبت تک نہ تھا ۔۔۔ نہ ہی پسند نہ چاہ نہ ضرورت اور نہ ہی وہ میری ضد تھا۔ مجھ کم مایہ لڑکی کا ضد سے کیا واسطہ؟ میری ضد ایسی پکی ہوتی ۔۔۔ یا اس ضد کے پورا ہونے کا امکان ہوتا تو میں آپ کی ضد نہ کرتی؟ بابر تو کچھ بھی نہیں تھا سوائے ایک کوشش کے۔ اپنا وجود منوانے کی ایک ناکام کوشش کے علاوہ کچھ نہیں تھا یہ سب اور میری بہت سی دوسری کوششوں کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی ناکام ٹھہری ۔۔۔ میری دوسری بہت سی کوششوں کی ناکامی کی وجہ بھی آپ تھے اور اس کوشش کی ناکامی کی وجہ بھی آپ بنے۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ آپ کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیسے واسطہ نہیں؟ واسطہ تو ہے چھاجی! بہت گہرا واسطہ ہے۔ میں دنیا میں کوششیں کرنے آئی ہوں۔ جی جینے کی کبھی کچھ پانے کی اور آپ میری ہر کوشش کو مسمار کرنے کے لیے ہیں' واسطہ تو ہوا نا۔"

"دوئی کدھر ہے؟ کدھر ہے میری رانی دھی؟ میری شہزادی' میری سوہنی۔"

بالو کی آواز ہمیشہ سے بڑھ کے جذبات سے لبریز تھی۔ محبتوں کے اس مخصوص بے ساختہ اور والہانہ اظہار نے دعا کے اندر ذرا سی گرمجوشی پیدا کی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"طبیعت ول نہیں ہے اس کی سویرے سے کمرے میں لیٹی ہے' نہ باہر نکلی ہے نہ کچ کھایا پیا ہے۔ میں اندر چاء کے ساتھ تھوڑا بہت لے کر گیا۔ وہ بھی بغیر چکھے واپس کر دیا۔ پتا نہیں کیا ہو گیا میری کڑی کو ہنسنا بھول گئی ہے۔ ہو رے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔" اللہ وسایا کی آواز میں فکر مندی گھلی تھی۔ اسے سن کر ملال سا ہونے لگا کہ وہ اپنی یاسیت میں اور بھی کتنے دل دکھا رہی ہے۔

"میں بلا کر لاتا ہوں دوئی کو۔"

"نہیں رہن دے بھراوسائے آرام کرنے دے۔" بالو نے روک دیا۔

"تیرے آنے کا سن کر کیسا آرام بھرجائی۔ ابھی دوڑتی آئے گی۔ میں تو شکر کر رہا ہوں تیرے آنے پہ۔ اب وہ کسی بہانے کمرے سے تو نکلے گی۔ نئی جان ڈل جاتی ہے اس میں تجھے اور کرمے کو دیکھ کر ۔۔۔ ہاہ کرما تو اب رہا نہیں۔ اب تو تم ہی لوگ ہو اس کے اپنے۔" بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔

"بھرجائی' میں کتنا غلط تھا۔ کتنا برا کیا میں نے اپنی کڑی کے ساتھ۔ میں اس سے کوئی غلط کام نہیں کرانا چاہتا تھا۔ اب بھی میں گانے وجانے کو برا نہیں کہتا۔ یہ ہمارا جدی پشتی کام ہے۔ ہاں غلطی میرے سے یہ ہوئی کہ میں نے دوئی سے یہ کام کرانا چاہا۔ وہ ایسی روح ہی نہیں تھی۔ وہ اس کام کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔ اس کے دل کو تنگی ہوتی تھی جس کام سے میں وہی کام اس سے کروانے کی کوشش کرتا۔ کتنا سمجھایا مجھے کرمے نے کتنا روکا شہزادے نے میں اپنی کر کے رہا۔ بیڑہ غرق کر کے چھوڑا اپنی اکو اک اولاد کا۔"

"ہائے ہائے بھراوسائے کتنی بار کہا ہے کہ منہ اچھا نہیں تو گل اچھی کر لے۔"

اللہ وسایا کے برعکس بالو کے لہجے اور الفاظ میں کہیں بھی غم کی ہلکی سی جھلک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے برعکس ایک دبا دبا سا جوش اور سرشاری تھی جو محسوس تو صاف ہو رہی تھی مگر فی الحال ان دونوں باپ بیٹی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"اللہ خیر کرے' بیڑا غرق ہو دوئی کے دشمنوں کا' میرے شہزادے کے حاسدوں کا۔ ان دونوں کے لیے تو رب سوہنا خیر ہی خیر لکھے۔ ان کے نصیب اچھے کرے۔ دونوں ہمارے کلیجوں میں آخیر حیاتی تک ٹھنڈ ڈالتے رہیں۔"

"آمین۔" اللہ وسائے نے کچھ الجھ کر بالو کو دیکھا۔

"تیری محبت ہے بھرجائی کرمے کا تو خون کا رشتہ تھا۔ دوئی اس کی لاڈو بہن کی آخری نشانی تھی۔ پر تو نے بھی کم پیار نہیں دیا میری بچی کو۔ میری بن ماں کی دھی کو ماں بن کے دکھایا۔ کبھی اس میں اور شہزادے میں فرق نہیں رکھا۔"

"اور نہ رکھوں گی۔ جیسے شہزاد میرا پتر ہے اسی طرح دوئی میری دھی ہے اور میں اسے ہمیشہ اپنی دھی ہی بنا کے رکھوں گی عتوں (بہو) کبھی نہیں سمجھوں گی۔"

اس کی بات پہ جہاں اللہ وسایا ہڑبڑا کے رہ گیا وہاں اندر لیٹی دعا' جو کتنی دیر سے مامی کی باتیں سنتی ہوئی اپنے سستی اور غنودگی کے شکار جسم کو اٹھنے پہ آمادہ کر رہی تھی' ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کے بیٹھ گئی۔

اسے اپنے کانوں پہ یقین نہ آ رہا تھا ۔۔۔ یہ کیسے الفاظ سنے تھے اس نے۔ وہ شدت سے چاہنے لگی کہ مامی اپنی بات دہرائے تاکہ اس سے سننے میں جو غلطی ہوئی ہو وہ دور ہو جائے۔

شہزاد بھی گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

"اتنی خوب صورت بات ۔۔۔ اور اماں نے کسی گولی کی طرح داغ دی ۔۔۔ کتنا سمجھا کے لایا تھا مگر ۔۔۔"

وہ شاکی نگاہوں سے ماں کو دیکھنے لگا جو اتنی بڑی بات اتنے اچانک اور نامناسب انداز میں کہنے کے بعد اب سامنے رکھی فروٹ کی باسکٹ میں سے کوئی تگڑا سا سنگترا منتخب کر رہی تھی۔

"کی مطلب بھرجائی؟"

کچھ دیر تک اللہ وسایا انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ خود ہی اپنی بات کی وضاحت کرے مگر پھر اسے بڑے شوق سے سنگترے کو چھیلنے میں مگن دیکھ کر اس نے خود ڈھیٹ بن کر بات آگے بڑھائی۔

"مطلب کی ہوتا اے؟ ۔۔۔ تو بھی نا بھراوسائے ۔۔۔ ساری عمر جھلا ہی رہے گا۔"

بالو نے منہ سے بیج تھوکتے ہوئے کہا۔

"جوان دھی کا پیو ہے اور اتنی سی بات نہیں سمجھتا ۔۔۔ بھئی میں کہہ رہی تھی۔" اس نے ایک اور پھانک منہ میں رکھ کے ذرا توقف کیا جو سامنے صوفے پہ بیٹھے اللہ وسائے اور اندر بیڈ کے کونے پہ اٹکی بیٹھی دعا پہ بہت بھاری گزرا۔ شہزاد نے بھی دعا کو ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کالا لون (نمک) ہوتا تو سواد اور آتا۔"

"اماں' آپ ادھر نمک لگا کر سنگترے کھانے نہیں کوئی اور بات کرنے آئی ہو۔" اس نے ذرا جھک کے سرگوشی کی۔ جس میں چھپی تنبیہہ بھانپ کے وہ سیدھی ہوئی۔ ہاتھ میں رکھا آدھا سنگترا واپس میز پہ رکھا اور دوپٹے سے ہی منہ پونچھنے لگی۔

"کھاؤ بھرجائی ۔۔۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

اللہ وسائے نے اندر امڈتے سوالوں کو دبا کر آداب میزبانی نبھانا چاہا ہے مگر اب بالو شہزاد کا موڈ بھانپ چکی تھی۔

"بھئی سیدھی بات ہے' گھر بھی اپنا ہے' تو بھی اپنا ویر ہے اور دوئی بھی اپنی بچی کوئی غیروں والی بات نہیں جو میں گھما پھرا کے کہوں' صاف صاف کہہ رہی ہوں' مجھے دوئی اپنے شہزادے کے لیے پسند ہے' تجھے میرا شہزاد پسند ہے

تو ہاں کر۔۔۔ ابھی ہم دیور بھالی سے سانڈ (سمدھی) بن جاتے ہیں۔"

"ہیں یعنی کہ بھرجائی۔"

پتا نہیں یہ حیرت کی زیادتی تھی یا خوشی ہی بھرپور تھی کہ اس کے منہ سے الفاظ نہ ادا ہو رہے تھے۔

دعا بھی اچھل کے کھڑی ہوگئی۔ اس کے قدم بے ساختہ بے ارادہ دروازے کی جانب بڑھے تھے مگر پھر وہیں رک گئے۔ کسی انجانے سے جذبے نے اسے باہر نکلنے سے روک دیا۔

"میری اور کرمے کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی۔۔۔ اب یہ میرے شہزادے پتر کی بھی خواہش ہے اس لیے میں نے دیر نہیں کی تو بھی سوچنے میں دیر نہ کر۔ شہزادہ تیرے سامنے پلا بڑھا ہے۔ اس کی اچھائیاں' برائیاں سب تیرے آگے ہیں۔"

"نہ بھرجائی نہ کون شودا سوچنے میں دیر کر رہا ہے۔ میں تو ایئے آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ اللہ نے میرے پہ ایسا کرم کیا۔۔۔ میرے پہ؟ میں نے تو ایسی کوئی نیکی بھی نہیں کی۔۔۔ مجھے نہیں یاد میں نے ایسا کون سا اچھا کام کیا ہے جو اللہ کو پسند آگیا ہوگا۔"

"مجھے پتا ہے۔" بالو نے دوبارہ سنگترا اٹھالیا۔

"تو نے زندگی میں ایک ہی سواد کا کام کیا ہے۔ دوئی جیسی کرموں والی دھی پیدا کی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ایہہ کی ہو ریا اے؟"

ماکھا گجر نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے سامنے کی جانب اشارہ کیا جہاں ایک جھلنگا سی چارپائی پہ یاسمین کے نیم بے ہوش وجود کو ڈال کر سیڑھیوں سے نیچے اتارا جا رہا تھا۔

دھوپ تیز ہو جانے کے بعد ماکھے گجر کا منجا گلی سے کٹڑی کے اندر' بڑے سے احاطے میں برگد کے اس بوڑھے مگر دور دور تک سایہ پھیلائے درخت کے نیچے منتقل ہو جاتا تھا۔ یہاں سے وہ کٹڑی کے اندر باہر آنے جانے والے ہر بندے پہ نظر رکھتا ہوا' سلام دعا میں بھی مصروف رہتا اور کرائے اور سود کا تقاضا بھی کرتا رہا۔ کسی کے لیے بھی یہ مشکل تھا کہ وہ کٹڑی کے بڑے سے لکڑی کے پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے بعد اس کی نظروں سے بچ کر آگے جا سکے۔

نور جہاں چند سیکنڈ میں خبر لے بھی آیا۔

"مغل کی گھر والی بیمار ہے' اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔" اس نے پھولے سانسوں کے ساتھ اطلاع دی۔

"آدھا لہور لے جا رہا ہے؟" ماکھے گجر نے تیوری چڑھا کے ان درجن بھر مائیوں اور بابوں کو دیکھا جو ہانپتے کانپتے یہ چارپائی تنگ و تاریک ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں سے اتارنے کے بعد ایک جانب رکھ کے اب ملک مقبول کا منہ تک رہے تھے۔

"میری گاڑی گلیاں چھوڑ کے کھڑی ہے' وہاں تک لے جانا ہوگا۔"

اس نے نیا آرڈر دیا۔ بار بار اپنے سفاری سوٹ سے نامعلوم سی گرد جھاڑتے ہوئے وہ مسلسل صاحبزادی دلکش کو دیکھنے بلکہ نظروں ہی نظروں میں ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو پوری طرح سے کئی گز لمبی چوڑی سیاہ چادر میں اپنا وجود لپیٹنے کے بعد بھی اس کی نظروں سے بچ نہیں پا رہی تھی۔ اس وقت اس کی ساری توجہ اپنی ماں کی جانب تھی اس لیے وہ نہ تو ملک مقبول کی چبھتی بے ایمان نظریں محسوس کر سکی نہ ہی اکیلی اتنے لوگوں کے درمیان گھر سے باہر کھڑی ہونے پہ گھبرانے تک کی فرصت مل سکی۔ یاسمین دمے کی شدید دورے سے نبرد آزما ہونے کے بعد اب نیم بے ہوشی کے عالم میں بار بار آنکھیں کھولتی غائب دماغی سے ہر جانب دیکھتی صورت حال کو جاننے کی کوشش کرتی اور پھر ناکامی ہونے پہ حواس ایک بار پھر ساتھ چھوڑ جاتے اور وہ غشی کی حالت میں چلی جاتی۔

ملک مقبول کو یہ بے ہوشی غنیمت لگ رہی تھی بلکہ وہ اندر ہی اندر اس بات سے خوفزدہ تھا کہ کہیں ہوش میں

آنے کے بعد وہ بیٹی کو منع نہ کر دے ساتھ جانے سے اور کیا عجب خود ہی اس کی مدد لینے سے انکار کر دے۔ وہ جلد از جلد اپنے اس شیطانی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا اس لیے ہڑبڑاہٹ اور بوکھلاہٹ کے عالم میں اسے گاڑی تک لے جانے کی فکر میں تھا۔

ماکھے گجر کی گھاگ نگاہوں سے اس کے یہ بوکھلائے ہوئے انداز چھپ نہ سکے' گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا شخص تھا وہ۔۔۔ اور خود کون سا بڑا پارسا تھا۔ ملک جیسے بندوں کی صورت دیکھ کے اندر تک اتر سکتا تھا۔ اگلی نگاہ اس نے چادر میں لپٹی گھبرائی گھبرائی سی اس لڑکی پہ ڈالی اور اسے ملک کی بے باک نظروں کی زد میں دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"یہ کڑی؟" حقہ ایک جانب کرتے ہوئے اس نے نور جہاں سے استفسار کیا۔

"مغل کی کڑی ہے' آپ نے پہلی بار دیکھا ہوگا پتا تو ہے مغل کتنا ڈاڈا بندہ ہے' وہ کدھر ہوا لگاتا ہے اپنے گھر کی زنانیوں کو۔"

"گھر کی حفاظت کے لیے تالا لگا دینا کافی نہیں ہوتا' تالا تو کوئی بھی توڑ سکتا ہے۔ بندے کو آپ بھی رکھوالی کے قابل ہونا چاہیے۔"

وہ اپنی تلے کے کام والی سلیم شاہی چپل میں پیر پھنساتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا ریشمی کرتا دامن سے پکڑ کر جھٹکا اور ٹھسکے سے چلتا وہاں تک پہنچا۔

"کیا دچھڑ ہے؟" اس نے آواز میں دبدبہ پیدا کر کے سوال کیا۔ اتنا دبدبہ دکھانا اس کا حق بنتا تھا۔ آخر یہ کٹڑی اور اس کے ارد گرد کی زمین اس کی ملکیت تھی۔ سامنے کھڑے بیشتر افراد اس کے مقروض تھے مگر یہ دبدبہ ملک مقبول کے چہرے کے زاویے بگاڑ گیا۔

"اپنا کام کر جا کر۔۔۔" اس نے تحقیر بھرے انداز میں ہاتھ جھٹک کے کہا تو گجر کو تپ چڑھ گئی۔

"اپنا کام ہی کر رہا ہوں۔" اس کے باوجود اس نے مقدور بھر تحمل سے کام لیا۔

"تمہارا کام منجا توڑنا ہے' جا کر توڑو۔۔۔ تمہارا کام ہیجڑوں سے مالش کروانا ہے' جا کے کرواؤ۔۔۔"

اپنی جانب سے اس نے ٹھٹھا لگا کر مذاق کیا اور داد چاہنے والے انداز میں دوسروں کو دیکھا مگر ان میں سے کوئی اس کے مذاق پہ مسکرانے تک کی جرأت نہ کر سکا۔ وہ سب سہمے ہوئے انداز میں ماکھے گجر کو دیکھنے لگے جس کے سیاہ چمکتے چہرے پہ لالی پھیل کے اسے اور بھی ہیبت ناک بنانے لگی تھی۔

"زبان سنبھال کے شوخیا۔۔۔ زیادہ اچھل اچھل کے بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ زمین جدھر تو کھڑا ہے ماکھے گجر کی ہے۔ یہ بندے جو تیرے آلے دوالے (ارد گرد) کھڑے ہیں ماکھے گجر کے بندے ہیں۔ ادھر کیا ہو رہا ہے' کون آ رہا ہے' کون جا رہا ہے اور کون کس کو لے کر جا رہا ہے' اس بات کا پتا رکھنا ماکھے گجر کا حق ہے' سمجھے؟ آیا دماغ میں یا کسی ہور طریقے سے سمجھاؤں۔"

اس کے اکھڑ اور دبنگ لہجے میں چھپی دھمکی بھانپ کر ملک مقبول جیسے کاغذی شیر کی ساری شیخی ہوا ہو گئی۔

"اچھا اچھا مجھے کیا پتا کون کیا ہے میں کون سا ادھر کا رہنے والا ہوں۔ چلو بھئی جلدی کرو بیمار بندہ کب سے ادھر پڑا ہے۔ اٹھاؤ ہمت کرو۔۔۔ زیادہ دور نہیں ہے میری گاڑی۔"

"کون سے ہسپتال لے جا رہے ہو؟" ماکھے نے اپنے چند خاص آدمیوں کو اشارہ کیا چارپائی اٹھانے کا اور ساتھ ہی سوال بھی کر دیا۔ ملک مقبول نے فوری طور پہ ذہن میں جو نام آیا' وہ کہہ ڈالا۔

"ہوں۔۔۔ اماں رحمتے تو بچی کو اندر لے کر جا۔۔۔ یا اسے اپنے گھر لے جا یا پھر اس کے ساتھ اس کے گھر بیٹھ اور مختار' تو اپنی گھر والی کو کہہ' مغل کی گھر والی کے ساتھ ہسپتال جائے۔"

یہ پروگرام سن کر ملک جز بز ہو کے رہ گیا۔ دلکش کے ساتھ نہ جانے اور ایک دوسری عورت کے ہمراہ ہونے کی صورت میں اس کا یہ منصوبہ تہس نہس ہو کر رہ سکتا تھا جو اس نے بابر کے دروازے پہ دلکش کی ایک جھلک دیکھتے ہی کھڑے کھڑے بنا ڈالا تھا۔

"اسے واپس کیوں بھیج رہے ہو۔ اکیلی گھبرا جائے گی۔ ماں کے ساتھ رہے گی تو ڈھارس بندھی رہے گی۔"

"اکیلی نہیں ہے' سارے لوگ یہیں ہیں اور اس کے بھائی بھی اسکول سے آنے والے ہوں گے۔ یہ ذرا سی بچی ۔۔۔ یہ کیا ڈھارس بندھائے گی کسی کی' الٹا ہسپتال کے ماحول میں گھبرا جائے گی۔ اسے کیوں خوار کرتے ہو ساتھ رہنے دو یہیں۔"

اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ ملک جواب دینے کا سوچتا ہی رہ گیا۔

اماں رحمتے نے دلکش کو شانوں سے تھام کر واپس لے جانا چاہا۔

"چل آجا دھیے' کچھ نہیں ہوتا تیری ماں کو۔"

صاحبزادی دلکش نے ایک نظر پھاٹک عبور کرتی اس چارپائی کو دیکھا جس پہ اس کی بیمار ماں بے سدھ پڑی تھی۔

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے اضطراری کیفیت میں مائی کا ہاتھ اپنے شانے سے جھٹک دیا۔

"ہم امی حضور کے ساتھ جائیں گے ہم انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔"

اس کی بات نے گویا ملک مقبول کے اندر نئی روح پھونک دی۔

"کیوں راستہ روک کے کھڑے ہو۔ تمہارا کیا تعلق یا واسطہ اس بات سے' میں بابر کا گہرا اور پرانا دوست ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں اس کے خاندان کی مدد اس کی غیر موجودگی میں کروں اور میرا حق بنتا ہے کہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو تفصیل بتائے بغیر ان لوگوں کو جہاں مرضی لے جاؤں۔ بابر نے مجھے اختیار دیا ہوا ہے۔"

"اچھا؟" اس کے لہجے میں تمسخرانہ حیرت تھی۔

"لاؤ' دکھاؤ' کدھر ہے مختار نامہ ۔۔۔؟"

"تم ہامے لگتے ہو؟"

ملک بھی ہتھے سے اکھڑ گیا اور گھوریاں ڈال کے اپنے سے کہیں تنومند اور قد آور اس گجر کو تکنے لگا جس کی بے موقع بحث اس کا قیمتی وقت ضائع کر رہی تھی۔

وقت جس نے آج ہی اسے یہ سنہرا موقع عطا کیا تھا ایک تیر سے دو شکار کرنے کا۔

ایک تو بابر جیسے بندے کو مطیع کرنے کا۔

دوسرا دلکش جیسا کم عمر' حسین تگ ملنے کا۔ جس سے وہ سالوں منافع کما سکتا تھا۔

اور ایک یہ گجر تھا' خوامخواہ رخنہ ڈال رہا تھا۔ ملک کا بس نہ چل رہا تھا اس پہ پل پڑے ۔۔۔ یا اور کچھ نہیں تو دلکش کا ہاتھ تھام کر اسے دھکے کے ساتھ پرے ہٹاتے ہوئے چل پڑے۔ مگر وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی دلکش اس کی دسترس سے باہر تھی اور مصلحت پسندی کا تقاضا تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے بنتا ہوا کھیل بگڑ جائے۔

یہاں سے نکلنے کی بے چینی اور خود پہ قابو پانے کی مصیبت ماکھے گجر پہ آنے والا غصہ۔

ان سب نے مل کر اس وقت اس کی عجیب حالت کر رکھی تھی اور یہ حالت ماکھے گجر کے خدشات کو یقین میں بدل رہی تھی۔

"ایسا کرو' اس سے پوچھ لو' یہ خود ماں کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔" اب اس نے دلکش کی مرضی پہ چھوڑنا چاہا۔

کیونکہ ماں کے لیے اس کی بے تابی وہ دیکھ چکا تھا۔

"ویسے بھی تم کس رشتے سے اسے روک رہے ہو؟ کیا لگتے ہو اس کے جو جانے سے منع کر رہے ہو۔ کیا یہ تمہارے والد کا کوئی دوست یا عزیز ہے؟"

ماکھے سے سوال کرنے کے بعد اس نے اگلا فقرہ دلکش کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"جی نہیں ابا حضور کا تو ان سے اکثر جھگڑا رہا کرتا تھا۔" دبی ہوئی آواز میں اس نے بتایا تو ملک اور شیر ہو گیا۔

"پھر یہ کون ہوتا ہے مشورے دینے والا۔ بابر کے دشمن کی موجودگی میں تو میں کبھی بھی تمہیں یہاں اکیلا نہیں

چھوڑوں گا۔ تمہارے بھائیوں کے اسکول سے آنے میں ابھی وقت ہے۔ میں تمہارے ماموں سے فون پہ رابطہ کرنے کی ایک اور کوشش کرتا ہوں۔ وہ آجائیں گے ان بچوں کے پاس' وہاں سے کسی کو ہسپتال بھی بلوا لیں گے۔"

اس کے تسلی بھرے الفاظ پہ صاحبزادی دلکش نے بالآخر قدم بڑھا دیا۔

وہ تیز تیز قدموں سے اسے ساتھ لیے پھاٹک سے نکلنے لگا۔ ماکھا گجر پر سوچ آنکھوں کے ساتھ ماتھے پہ ان گنت بل لیے انہیں دیکھتا رہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ اتنے میں مختار اپنی بیوی کو لے کر بھاگتا آیا۔

"بانو بہن' اس باؤ کے پیچھے جانا۔ اس کی گاڑی میں بابر مغل کی گھر والی کو ہسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ تم ساتھ ساتھ رہنا۔ اس کی بچی کم عمر ہے اور زیادہ سیانی بھی نہیں ۔۔۔"

اس نے مبہم الفاظ میں کہا مگر مختار کی بیوی بانو نے سارا معاملہ اچھی طرح سمجھ کے سر ہلایا۔

"تسی فکر نہ کرو بانو سائے کی طرح ساتھ لگی رہے گی۔"

یہ دعوی کرنے کے بعد وہ اپنا بھاری بھر کم جسم گھسیٹتی مقدور بھر تیز قدم اٹھاتی باہر کو نکلی۔

مگر پانچ چھ منٹ بعد ہی جب ماکھا گجر قدرے اطمینان سے بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے پھاٹک سے ان لوگوں کو اندر آتے دیکھا جو یاسمین کو چارپائی پہ ڈال کے ملک کی گاڑی تک لے کر گئے تھے۔ وہ ان سے سوال جواب کرنے کے لیے ان کے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ ان سب سے پیچھے ہانپتی ہوئی بانو کو واپس آتے دیکھ کر چونک کر کھڑا ہو گیا۔

"واپس کیوں آگئی ہے؟ میں نے کہا تھا نا کہ ۔۔۔" وہ وہیں سے چلانے لگا۔

"میں بالکل پاس پہنچ گئی تھی کہ وہ مردود گاڑی میں بیٹھ کے' ٹھک سے دروازہ بند کر کے دفعان بھی ہو گیا۔ میں نے تو آواز بھی دی تھی موئے کے کان بند تھے۔"

اس کی آواز اب تک پھولی ہوئی تھی۔ جس سے اس کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی کہ اس نے واقعی جلد از جلد پہنچنے کی پوری کوشش کی تھی۔

وہ تھکے تھکے انداز میں دوبارہ منجے پہ بیٹھ گیا۔

"سرکار' بندہ بھیجوں ہسپتال؟" مختار نے پوچھا۔

"کوئی فائدہ نہیں' وہ اسے ہسپتال نہیں لے کر گیا ہو گا' ماکھے گجر نے بندہ پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کی۔"

ہمیشہ کی طرح اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں جو فخر اور اکڑ ہوتی تھی' وہ اس بار مفقود تھی۔

داد طلب انداز میں اپنے حواریوں کو دیکھنے کی بجائے وہ تاسف سے سر ہلا رہا تھا۔

"اس بار بابر کو ہاتھ لگ گیا ہے۔" اس نے پیشن گوئی کی۔

"سارے زمانے کو چونا لگانے والے فراڈیے کو بھی آخر کوئی ۔۔۔ پر ۔۔۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ یہ جو بھی تھا' اس نے کام مردوں والا نہیں کیا۔ مختار ۔۔۔ جا' جا کر بابر کا کوئی اتا پتا لا ۔۔۔ اور جھورے پہلوان کو کہہ' اپنے بندے سارے ہسپتالوں میں بھیج کر پتا کرائے۔"

☼ ☼ ☼

گل مہر نے الماری میں سے اپنے سارے سامان کو نکال کر نیچے فرش پہ اور بیڈ پہ ڈھیر لگایا ہوا تھا۔

"یہ تم اتوار بازار لگا کے کیوں بیٹھی ہو۔ آج تو جمعہ ہے۔"

موتیا کچن کا کام نبٹا کے جیسے ہی کمرے میں آئی' وہاں کی ابتر حالت دیکھ کے ایک منٹ کے لیے چکرا کے رہ گئی۔

"بہت سی بے کار چیزیں جمع ہو گئی تھیں' سوچا آج فرصت ہے' نکال ہی دیں۔"

"آج؟" موتیا کو ہنسی آگئی۔ جب سے اس نے آفس جانا چھوڑا تھا' کون سا دن تھا جب اسے فرصت نہیں ہوتی تھی۔

"سنو' ان میں سے کوئی ڈریس تمہارے کام کا ہے تو نکال کر الگ کر لو۔ پھر نہ سنانا ہمیں کہ پوچھے بغیر پھینک

دیے ہیں۔"

"اف' تمہارا دماغ خراب ہے گل.... اتنے نئے اور ایک آدھ بار کے پہنے جوڑے تم پھینکنا چاہ رہی ہو۔"

موتیا الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سب لباس وہ تھے جو اس نے جاب پہ جانے کے لیے بنوائے تھے۔ سادہ .... مگر آرام دہ اور نفیس۔

"اسی لیے تو کہہ رہے ہیں تم لے لو۔ ہمارا دل بھر گیا ہے۔"

اب وہ ایک دراز الٹ کر زمین پر ڈھیر کر رہی تھی۔ اس میں سے مختلف کی رنگز گریٹنگ کارڈز' وزیٹنگ کارڈز' کئی ایک چھوٹی بڑی تصاویر پھسل کر ادھر ادھر پھیل گئیں۔

"اس بار کچھ زیادہ ہی جلدی دل بھر گیا ہے۔" اس نے دو تین اچھے جوڑے ایک طرف رکھ لیے۔ گل مہر پہلے سے خوش لباس تھی' بعد میں جاب کرنے اور ہاتھ میں زیادہ پیسے آجانے کی وجہ سے اس کا یہ شوق جنون میں بدل گیا تھا۔

اگرچہ وہ ہر نئے فیشن کی اندھا دھند تقلید نہیں کرتی تھی۔ اس کا لباس سادہ اور باوقار ہوتا تھا مگر اس سادگی میں بھی اس کی خوش لباسی اپنی مثال آپ تھی۔ جاب کے دوران پچھلے تین چار ماہ میں اس نے درجنوں کپڑے سلوائے تھے۔ سات آٹھ پچھلے ماہ نکال کر الگ کیے تھے' ان میں سے بھی تین موتیا نے اپنے ناپ کے مطابق ٹھیک کر لیے تھے۔ اس بار بھی کئی ایک ایسے تھے جو بالکل نئے تھے۔ موتیا نے گل کے دل سے اترے لباس اور چپلیں استعمال کرنے میں کبھی جھجک سے کام نہیں لیا تھا۔ نہ ہی کبھی ان کا مسئلہ بنایا تھا۔

"کم از کم یہ والا تو رکھ لو گل.... میرا خیال ہے یہ تم نے ایک ہی بار پہنا تھا' آفس کے کسی فنکشن پہ۔"

اس کے کہنے پہ تصویریں الگ کرتی گل مہر نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں اور اس سفید اور گلابی لباس کو دیکھتے ہی گم صم ہو گئی۔

بہت سی ان چاہی.... بن بلائی یادیں ذہن کے پردے پہ چبھنے لگی تھیں۔

"دفع کرو اسے' زہر لگتا ہے ہمیں۔"

وہ سر جھٹک کے پھر سے مصروف نظر آنے لگی مگر اب اس کے چہرے پہ جھنجلاہٹ اور ماتھے پہ ناگوار سی شکنیں تھیں۔

"ہائے.... ایسا تو مت کہو۔ اتنی محنت سے میں نے اس پہ کڑھائی کی تھی' کتنی راتیں جاگ کر۔"

وہ سفید لباس پہ ابھرے ہوئے دھاگے کے کام کے گلاب کے پھولوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"ہاں تو رکھ لو۔ کہہ تو رہے ہیں ہم۔"

"وہ تو خیر میں تمہارے کہے بغیر بھی رکھ لوں گی۔ اپنی اتنی پیار سے کی گئی محنت کو پھینک تو نہیں سکتی۔ ویسے ہی مشورہ دے رہی تھی کہ یہ رنگ بھی تمہارا پسندیدہ ہے اور تم پہ جچتا بھی ہے۔"

"یہ رنگ ہمارے لیے خاصا منحوس ثابت ہوا ہے موتیا۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا تو موتیا نے کچھ اور کہے بغیر وہ لباس بھی الگ کر لیا۔

"امی حضور سے کہہ دینا' باقی کی چیزیں جس کو دل چاہے دے دیں۔"

الماری آدھی سے زیادہ خالی کرنے کے بعد اس نے ہاتھ جھاڑے۔

"اور یہ گندگی کون صاف کرے گا؟" موتیا نے فرش پہ پھیلی بے کار چیزوں کو دیکھ کر ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم تو تھک گئے ہیں بھئی۔"

ایک زوردار انگڑائی لے کر وہ بستر کی جانب بڑھی۔

"اور میں تو جیسے صبح سے آرام فرما رہی ہوں۔ مجھ سے یہ امید مت رکھنا۔ میں نہانے جا رہی ہوں نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ تم بھی کم از کم جمعہ کے دن تو اللہ کا نام لے لیا کرو۔ امی حضور بھی اس دن پوچھ رہی تھیں' کہ صاحبزادی

گل مہر کی نمازیں آج کل بہت قضا ہونے لگی ہیں۔ اب میں انہیں کیا بتاتی کہ قضا نہیں ہونے لگیں۔ آپ کی صاحبزادی نے سرے سے اللہ کو یاد کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کچھ تو شرم کرو۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"پہلے تو بہت کچھ ایسا نہیں تھا۔" وہ بڑبڑائی۔ پھر نیچے گرے کاغذات کے ڈھیر میں سے چند کارڈز نکال کر اس کی جانب بڑھائے۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ تولیہ اٹھائے نکل رہی تھی جب ان رنگین خوب صورت کارڈز کا پلندہ سامنے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئی۔

"رکھ لو.... یہ بھی اب ہمارے کام کے نہیں بلکہ یہ تو کبھی بھی ہمارے کام کے نہیں رہے۔ شاید ان کپڑوں کی طرح یہ بھی تمہیں اپنے کام کے لگیں۔"

کچھ نہ سمجھتے ہوئے موتیا نے وہ کارڈ ہاتھ میں لیے اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

وہ عمیص کی جانب سے گل کو مختلف مواقع پہ دیے گئے کارڈز تھے۔

کوئی نئے سال کے موقع پہ نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوا۔

کوئی جنم دن کے موقع پہ صدق دل سے دی گئی دعاؤں سے بھرا ہوا۔

اور کوئی عید پر اسے سب سے اہم.... سب سے عزیز ہستی قرار دیتا ہوا۔

موتیا سر سے پیر تک سلگ کر رہ گئی۔ اس کے اندر رقابت کا جذبہ تو بہت کم تھا.... اور حسد کا مادہ تو اس کے اندر جیسے تھا ہی نہیں رہا رشک تو وہ گئے دنوں میں عمیص کی گل سے وابستگی کو دل سے قبول کرنے کے بعد اپنی آب و تاب کھو چکا تھا اور اب تو بات بھی دوسری تھی۔ اس نے عمیص کو ان سب پرانی یادوں کے بغیر قبول کر لیا تھا۔ اس کا کبھی گل سے کیا رشتہ رہا تھا یہ وہ یکسر بھلا چکی تھی۔ عمیص نے اپنے رویے سے اسے وہ سب یاد دلانے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش بھی کبھی نہیں کی تھی۔

مگر یہ گل تھی جو وقتاً فوقتاً ایسی کوششیں کرتی رہتی تھی جو کبھی تو کامیاب ہوتیں کبھی ناکام۔

اس کی آج کی کوشش کامیاب ٹھہری۔

عمیص کی ہینڈ رائٹنگ میں جذبے لٹاتی تحریریں وعدے اقرار اس کی جلتی آنکھوں پہ تیل چھڑکنے لگے۔

"یہ کیا بکواس ہے۔" اس نے فوراً وہ کارڈز اس کی جانب پھینکے جیسے وہ کوئی سانپ ہوں جو اسے ڈسنے والے ہوں۔

"دیکھ تو رہی ہو۔" گل نے بے اعتنائی سے شانے اچکائے۔

"کمال ہے جب ہم انہیں بکواس کہتے تھے' تب تم اپنے عزیز دوست کی خاطر ہم سے جھگڑ پڑتی تھیں اور اب خود بکواس کہہ رہی ہو.... چہ چہ بے چارہ عمیص اس کی لفاظی کسی کو بھی متاثر نہیں کر سکی.... تمہیں بھی نہیں۔ وہ تو سمجھ بیٹھا تھا کہ ہمیں نہ سہی' کم از کم تمہیں تو شیشے میں اتار ہی بیٹھا ہے مگر....."

وہ افسوس سے سر ہلاتی۔ موتیا کو زہر سے بھی زہریلی لگ رہی تھی۔

"کتنا افسوس ہو گا بے چارے کو جب اسے پتا چلے گا کہ اس کی اس بکواس کو صرف ہم نے ہی بکواس نہیں کہا بلکہ تمہیں بھی یہ سراسر بکواس ہی لگی ہے۔"

اس کے غصے سے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے مزا لے رہی تھی اور اس کے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ کہے اس فقرے نے موتیا کا ضبط رخصت کر دیا۔

"شٹ اپ گل۔"

اور ایک جھٹکے کے ساتھ اسے اپنے آگے سے ہٹا کر آگے بڑھنے لگی۔

"بی ہیو یور سیلف موتیا۔"

وہ لڑکھڑا کے گرنے لگی تو چلا اٹھی۔

"یہ تم مجھے کہہ رہی ہو؟" موتیا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"اس کی ضرورت تمہیں ہے۔ تمہاری عادتیں خراب ہوتے ہوتے اب گل سڑ چکی ہیں اور ان سے متعفن قسم کی بدبو آنے لگی ہے صاحبزادی گل مہر۔ اس کا بروقت علاج کرو ورنہ وہ دن دور نہیں جب تمہاری گلی سڑی بدبودار شخصیت سے گھبرا کے لوگ تمہارے آس پاس تک پھٹکنا چھوڑ دیں گے۔"

"بکواس بند کرو موتیا۔ ہم نے تمہیں کہا کیا ہے۔ صرف یہ کارڈز ہی تو واپس کیے ہیں۔ اب یہ ہمارے کسی کام کے نہیں اس لیے سوچا پھینکنے سے پہلے تم سے پوچھ لیں شاید تم اپنی کسی جذباتی وجہ سے انہیں سینے سے لگا کر رکھنا چاہو۔ اس میں اتنا تن فن کرنے والی کون سی بات ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ ہمارے دل سے اتری۔۔۔ ہمارے لیے بے کار' ناکارہ ہو جانے والی چیزیں تم بہت خوشی سے استعمال کرنے کی عادی ہو' ہر وہ چیز جسے ہم نے رد کیا ہو تم نے اسے صبر شکر کے ساتھ قبول کیا ہے۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

موتیا نے اس کے اشتعال انگیز بیان پہ کمال صبر سے کام لیا اور چند قدم اٹھا کے اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔

"میں تمہاری اس فضول بکواس پہ آگ بگولا ہو کر نہ تو تم پہ چلاؤں گی نہ اپنی الماری سے وہ سب چیزیں نکال کر تمہارے منہ پہ ماروں گی جو کبھی تم سے لی تھیں ہاں مگر تمہاری یہ غلط فہمی ضرور دور کرنا چاہوں گی کہ مجھے تمہارا جھوٹا کھانے یا اترن پہننے کا شوق رہا ہے۔ یہ جو تم نے ڈھیر میرے سامنے رکھا تھا نا کپڑوں کا' ان میں ایک سے ایک عمدہ جوڑا تھا۔ مگر میں نے وہی تین لیے جو میرے ابا حضور کی کمائی کے تھے' تمہاری تنخواہ سے خریدے گئے کپڑوں پہ میں نے نظر تک ڈالنا گوارا نہیں کیا اور ایسا آج نہیں ہوا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ میرا بھی دل چاہتا تھا اپنی پسند پہ ضد کروں لڑ جھگڑ کے اپنی منواؤں۔۔۔ مگر میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ایسا کرنے کے لیے تم تھیں۔ امی حضور اور ابا حضور کو پریشان کرنے کا ٹھیکا تو تم نے لے رکھا تھا میں کیوں ان پریشانیوں میں اضافہ کرتی۔ یہ جو تم نے طعنہ دیا ہے ناں کہ تمہاری رد کی ہوئی ہر چیز کو میں نے شکر کے ساتھ قبول کیا ہے تو مجھے تمہاری ناپسند کی ہوئی یا ٹھکرائی ہوئی چیزوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ میں صرف ان چیزوں کو ان کپڑوں ان جوتیوں ان کتابوں کاپیوں اور بندے چوڑیوں کو ضائع نہیں ہوتے دیکھنا چاہتی تھی جو ابا حضور کی قلیل آمدنی میں سے امی حضور ہمارے شوق پورے کرنے کے لیے بنایا کرتی تھیں۔ میں نے ایسا کرکے صرف انہیں اضافی خرچے سے بچانا چاہا۔۔۔ بچپن سے ایسا کرتی آرہی ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ جو تم دو تین بار استعمال کرنے کے بعد اچھی بھلی چیزیں پھینک دیتی تھیں تو صرف اپنے والدین کے پیسے کو کوڑے میں جاتا دیکھنے سے بچنے کے لیے میں انہیں شکر کے ساتھ اٹھا لیتی تھی اور رہا عمیص۔۔۔"

یہاں رک کے اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی نظریں گل مہر کے تلملاتے چہرے پہ گاڑ دیں۔

"عمیص کوئی چیز نہیں ہے گل مہر۔ وہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اسے استعمال کے قابل نہیں سمجھا۔۔۔ تمہاری خود پسندی اور غرور کے ہاتھوں ہی سہی مگر وہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ یہ کارڈز دکھا کر تم یہ ثابت نہیں کر سکتیں کہ میرا ہونے والا شوہر کبھی تمہارا اسیر تھا۔ میں اس عمیص کو بھی اچھی طرح جانتی ہوں جو کبھی گل مہر کا دم بھرا کرتا تھا اس لیے کہ وہ عمیص میرا سب سے قریبی دوست تھا۔ میں اس کے ہر جذبے کی گواہ رہی ہوں۔۔۔ اور اس بات کی شاہد بھی کہ اس نے کس وقار سے تم سے دست برداری کا اعلان کیا۔ خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے راہ نکالی ورنہ ابا حضور تو زبردستی تمہارا اس سے نکاح پڑھانے پہ تلے بیٹھے تھے۔ یہ وہی تھا جس نے تمہاری خوشی کو مقدم رکھا اب آگے تمہاری قسمت۔"

اس بار افسوس سے سرہلانے کی باری موتیا کی تھی۔

"چچ چچ۔۔۔ بدقسمتی ہی دھوکا دے گئی اور اس عمیص کو بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں کیونکہ یہ میرا منگیتر ہے۔ اس کے ہر لفظ پہ میں ایمان لا چکی ہوں۔ مجھے بھٹکانے کی کوشش مت کرنا۔"

پہلی بار وہ اتنا کچھ کہہ رہی تھی اور جواب میں کہنے کے لیے گل کے پاس ایک لفظ تک نہ تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

ہوش تب آیا جب باتھ روم کا دروازہ ٹھک سے بند ہوا۔ اس کا ساکت وجود ہلکا سا کپکپا کے رہ گیا۔ اس نے بے چارگی سے ادھر ادھر نظریں گھما کے اپنا خشک ہوتا حلق تر کرنا چاہا۔

اسے لگا کمرے میں موجود ہر چیز اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔ زمین پہ بکھرے کارڈز دیوار پہ لگا کیلنڈر وال کلاک اور سیزی سائیڈ ٹیبل پہ فریم میں لگی تصاویر۔۔۔ ڈریسنگ پہ رکھے پرفیومز اور لوشن۔۔۔ بیڈ پہ تہہ لگا کے رکھے اس کے کپڑے اور' اور باتھ روم کا بند دروازہ۔

یہ دروازہ بھی اسے خود پہ قہقہے لگاتا محسوس ہو رہا تھا اور وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس دروازے کے اس پار کوئی ہے' جو قہقہے نہیں لگا رہا بلکہ پانی کے ساتھ ساتھ اپنے سارے آنسو بھی بہا رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

"تیرے نیناں نیں کیتا ایسا جادو میرے تے"

عمیص جیسے ہی اندر داخل ہوا۔ ہلکے سبز ستون کے پیچھے سے دلگیر نکل کر اس کے سامنے آگیا اور اپنے بازو ہلا ہلا کر تان لگانے لگا۔

تیرے نیناں نیں کیتا ایسا جادو میرے تے
جا' سوہنیاں اکھاں والیا' میں رہ گئی تیرے تے

اب وہ کمر لچکا لچکا کے باقاعدہ ٹھمکے لگا رہا تھا' جن کو عمیص اس کے دھان پان سے وجود کی وجہ سے "ٹھمکیاں" کا نام دیتا تھا۔

"تم کیا میرے انتظار میں ہوتے ہو کہ جیسے ہی میں اندر آؤں تم اپنے فن کا مظاہرہ پیش کرو۔"

"ایک ہی تو قدردان ہے ہمارے فن کا۔"

وہ جھک کر کورنش بجالانے لگا۔

"بڑی خاموشی ہے گھر میں؟ سب سو رہے ہیں کیا؟"

دوپہر دو ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ ویسے تو عمیص رات گئے اسٹور بند کرتا تھا۔ کبھی تھوڑی دیر کے لیے گھر کھانا کھانے آجاتا' زیادہ تر دوپہر کا کھانا دلگیر ٹفن میں بھر کے اسٹور پہ ہی دے جاتا تھا۔ مگر آج جمعے کا دن تھا۔ وہ بارہ بجے ہی اسٹور بند کر دیتا۔ جمعے کی نماز ادا کرنے کے بعد گھر آجاتا۔

"بڑی بیگم تو حسب معمول قیلولہ کر رہی ہیں۔ چھوٹی بیگم کو ہم نے سلائی مشین پہ کچھ کرتے پایا تھا ابھی کچھ دیر پہلے' بڑی بی بی کا مزاج گرم ہے' کھانا کھانے بھی نہیں نکلیں کمرے سے اور رہیں چھوٹی بی بی تو ان کو ہم ابھی ابھی پچھلے دالان میں بڑا افسردہ سا بیٹھے دیکھ کر آئے ہیں۔"

اس نے فردا" فردا" سب کی رپورٹ دی جبکہ نواب صاحب کے بارے میں عمیص پہلے سے جانتا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کے بلانے پہ ان کے ہاں تشریف لے جا چکے ہیں۔ وہ ابھی گھر پہ ہی تھا جب ان کے دوست نے گاڑی بمعہ ڈرائیور بھیجی تھی۔ نواب صاحب خاصے جزبز ہو رہے تھے۔ ان کا دل کہیں چاہ رہا تھا جانے کو۔

"ہمارا تو ارادہ تھا آج کہیں اور جانے کا اب حیات صاحب نے بلاوا بھیجا ہے اور گاڑی بھی' انکار کرنا بھی مناسب نہیں۔"

انہیں متذبذب دیکھ کے عمیص نے پیشکش کی۔

"کوئی کام ہے چچا حضور تو مجھے بتائیے۔ میں آج تقریبا" فارغ ہی ہوں۔ میں کر دیتا ہوں آپ بے فکر ہو کے حیات صاحب کی طرف چلے جائیں۔"

اس کا اندازہ تھا باغات سے متعلق کوئی مسئلہ ہوگا۔ مگر نواب صاحب نے انکار میں سرہلا دیا۔

"نہیں عمیص میاں' یہ وہی کام ہے جس کے بارے میں ہم نے کہا تھا کہ ہم خود کریں گے۔"

"اوہ۔"

"چلئے' ہر بات میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے آج کا دن اس کام کے لیے مناسب نہ ہو۔"

وہ حسب عادت اس میں خدا کی مصلحت تلاشتے ہوئے جانے کے لیے تیار ہونے لگے تھے۔

عمیص وہاں سے سیدھا پچھلے والان کی جانب آگیا جہاں کیاریوں میں موتیا نے مختلف سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ اس کا خیال تھا' وہ انہی کے لاڈ اٹھانے میں مصروف ہوگی مگر وہ ہری مرچوں کے پودے کے پاس چپ چاپ بیٹھی انگلی سے گیلی مٹی کرید رہی تھی۔

اس کے چہرے پہ اتنی زیادہ اداسی اور دکھ رقم تھا کہ عمیص کو معاملہ بھانپنے میں چند سیکنڈ بھی نہ لگے۔

"گل سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟"

اس کی آواز پہ موتیا نے سر اٹھایا۔ اس مزاج آشنا کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اس نے الف سے یے تک سارا معاملہ اس کے گوش گزار کر دیا۔ ویسے بھی اپنی طرف سے خاصا بول کر بھڑاس نکال دینے کے باوجود اندر سے وہ اب تک بھری ہوئی تھی۔ اسے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی جس کو دل پہ لگا وہ زخم دکھا سکے جو گل کی باتوں نے لگایا تھا۔

ساری بات سن لینے کے بعد عمیص کے ماتھے پہ شکنوں کا جال پھیل گیا۔ وہ لب سختی سے بھینچ کر سامنے دیکھنے لگا۔

"تم تو ہمیشہ کی طرح یہی کہو گے کہ اس کی عادت ہی ایسی ہے۔ جانے دو مگر جو عادتیں دوسروں کو اتنی تکلیف پہنچاتی ہوں' ان کو کوئی کیسے جانے دے۔"

"نہیں موتیا میں ایسا نہیں کہوں گا۔ اب بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ میں مانتا ہوں دوسروں کے احساسات کی پروا نہ کرنا اور ہمیشہ اپنی ذات' اپنی خوشی اور اپنے مفاد کو مقدم رکھنا گل مہر کی فطرت ہے اور میں نے ہی نہیں' اس گھر کے سب لوگوں نے اس کی ان عادات و فطرت سے سمجھوتہ کر لیا تھا لیکن اب' اب اس کی فطرت ڈسنے کا فن بھی سیکھ رہی ہے۔ اس کا تدارک نہ کیا گیا تو وہ خطرناک اور مہلک ہوتی چلی جائے گی۔ میں کافی دنوں سے اس میں آنے والی اس ناخوشگوار تبدیلی کو دیکھ رہا ہوں۔ پہلے وہ صرف تب زہر اگلتی تھی جب اس کی کسی بات میں دخل دیا جائے یا اس کی کسی مرضی کو اہمیت نہ دی جائے لیکن اب وہ ان معاملات میں بھی رخنے ڈالنے لگی ہے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اب' اب تو اس نے حد کر دی ہے۔ اس نے تمہارے اور میرے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارے دل میں میرے لیے وسوسہ جگانا چاہا ہے۔"

"کوشش ہی تو کی ہے' کون سا کامیاب ہو گئی ہے اور اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے مجھے تم پہ اعتماد ہے عمیص۔"

موتیا نے اسے یقین دلانا چاہا۔

"اور مجھے اس اعتماد پہ فخر ہے۔" وہ مسکرایا۔

"یہ فخر ہی تو میرا سرمایہ ہے موتیا میں جانتا ہوں تمہارے شفاف دل پہ وہ گرد نہیں ڈال سکتی۔ مگر وہ گرد ڈالنے کی کوشش بھی کیوں کرے؟۔۔۔ میں اسے تمہاری آنکھوں میں آنسو لانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

☼ ☼ ☼

بالو کے بلانے پہ وہ باہر آئی تھی۔ یہاں آتے ہوئے اس کے احساسات بہت عجیب سے ہو رہے تھے۔ کبھی اپنا مقدر کھلنے پہ اچانک ڈھیر ساری حیرت اسے گھیر لیتی کبھی خوشیاں اس کے گرد جمگھٹا بنا کے رقص کرنے لگتیں۔

کبھی بے یقینی کی کیفیت اسے جکڑ لیتی اور وہ ایک بار پھر باہر سے آتی آوازوں پہ کان لگاتی۔

"کہیں مجھے سننے میں غلطی تو نہیں ہو رہی؟"

وہ غور سے سننے لگتی مگر اس کا اندیشہ بے نام نکلتا۔

وہاں واقعی اسے اور شہزاد کو ایک کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"پھر اللہ وسایا' بس جلدی سے منہ میٹھا کرا۔ آج تو خوشیاں صرف ادھر ہی نہیں پھیلیں۔۔۔ اوپر میرا کریا اور اس کی بہن' وہ دونوں بھی بڑے خوش ہوں گے۔ کرمے کی مرضی تو میں جانتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے دوئی کو اپنے گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ بک ہا۔۔۔ رب نے اسے اتنی حیاتی نہ دی کہ وہ اپنی اکھی (آنکھوں سے) یہ ویلا دیکھ پاتا اور دوئی کی ماں تو خیر لکھوا کے ہی چار دن لائی تھی۔ پر مجھے یقین ہے وہ ہوتی تو اس کی بھی مرضی یہی ہوتی۔ جا شہزاد گڈی سے مٹھائی کا ٹوکرا لے کر آ۔ منہ میٹھا کرنے میں دیر کیسی۔"

اب دعا کو پھر خطرہ محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے شہزاد پتا نہیں کیسے ماں کی یہ باتیں برداشت کر رہا ہوگا اور اب مٹھائی لانے کے حکم پہ اچانک بھڑک جائے گا۔ ابھی اس کی آواز آئے گی۔

"کیسی مٹھائی۔۔۔ کیسی خوشی مجھ سے کسی نے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔" مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

"ابھی لاتا ہوں۔" شہزاد کی مطمئن و مسرور آواز اسے بے ہوش کرنے لگی پھپھی کی صداؤں پہ ہوش میں آئی۔

"دوئی کو بھی تو بلاؤ۔ سب سے پہلے میں اپنی کرموں والی دھی کا منہ میٹھا کراؤں گی۔ فیر یہ مٹھائی اور بھی میٹھی ہو جائے گی۔" وہ قہقہے لگانے لگی تھی۔ آج اس کے قہقہوں کا تسلسل معمول سے زیادہ ہی رواں تھا۔

ابا کی آوازوں پہ اس نے باہر آنے کی ہمت مجتمع کی۔ اپنے بکھرے بال سنوارے اور اچٹتی سی نظر آئینے پہ ڈالی۔ اس کا لباس خاصا ملگجا اور سلوٹوں سے پر تھا اور چہرہ مضمحل کب سے ماں اور شہزاد آئے ہوئے تھے مگر اس سے اتنا نہ ہوا کہ اپنا حلیہ ہی سنوار لیتی۔ اس حالت میں اس موقع پہ باہر نکلنا اسے عجیب محسوس ہوا مگر وقت بھی تو نہیں تھا۔ دوپٹا اچھی طرح پھیلاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔

بے پناہ خوشی۔۔۔ بے حد شرم اور بہت سی جھجک کے ساتھ اس نے وہاں پہلا قدم رکھا تھا مگر سامنے نظر اٹھاتے ہی جیسے اسے شہزاد کا چہرہ نظر آیا۔۔۔ ساری خوشی' ساری شرم اور ساری جھجک بھک سے اڑ گئی۔

اسے وہ سارے نوکیلے' زہریلے فقرے یاد آنے لگے جو کبھی اس نے دعا کی سماعتوں میں انڈیلے تھے۔

اسے وہ دھکا یاد آیا جو اس نے عمر کے پندرہویں برس میں کھایا تھا۔

اسے اپنے ہونٹ سے نکلتے خون کے وہ قطرے نظر آئے جو مٹی میں جذب ہو رہے تھے اس کے آنسوؤں کے ساتھ مل کر۔

اسے وہ گالیاں گونجتی ہوئی سنائی دیں' جو شہزاد کی ذات سے اس کی ذات کو ملی تھیں۔

وہ ساری تحقیر وہ ساری نفرت وہ ساری ذلت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ کچھ اس طرح کہ اس کا راستہ رک گیا۔ اب وہ آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔۔۔ نہ ہی دیکھ سکتی تھی نہ شہزاد کا منتظر چہرہ نہ اپنے ابا اور ماں کے خوشی سے دمکتے چہرے۔

"رک کیوں گئی ہے دھیے آگے آ دیکھ تیری ماں کیا کہہ رہی ہے۔" اللہ وسایا خوشی سے کپکپاتے لہجے میں اسے جتانے لگا۔

"دوئی' آج سے تو میری دھی ہے۔ میرے شہزادے کی ووہٹی۔۔۔ گج وج کے تجھے لے کر جاؤں گی۔"

"آجا' آ کے منہ میٹھا کر لے اور یہ شگن کی مندری (انگوٹھی) پہن لے۔" اس نے اسے چھوٹے چھوٹے قدم اپنی جانب بڑھاتے دیکھ کر سرخ مخملیں ڈبیا ہاتھ میں پکڑی جس کے اندر وہ انگوٹھی جگمگا رہی تھی' جو کل شہزاد پورا شہر چھان کے خرید کے لایا تھا۔

"میں یہ انگوٹھی نہیں پہنوں گی ماما اور نہ منہ میٹھا کروں گی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ایسا کہتے ہوئے دانستہ نگاہیں نیچی رکھیں۔ شاید وہ اپنے باپ کی اڑتی رنگت اور ماما کی خوشی کو پھیکا پڑتے دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ البتہ شہزاد کو دیکھنے کی خواہش ضرور جاگی تھی دل میں کہ اس پہ یہ انکار کیسا اثر کرتا ہے مگر وہ اس خواہش کو دبا گئی۔ کاش کہ وہ ایک بار نظریں اٹھا لیتی تو جان جاتی کہ اس کا ردعمل اللہ دسائے اور بلقیس سے کہیں بڑھ کے تھا۔

"کیونکہ ــــ کیونکہ میں اس قابل نہیں ہوں ماما۔ آپ کا بیٹا بہت قابل' بہت نامور اور بہت عزت والا ہے۔ آپ کو ایک سے ایک اچھی لڑکی مل جائے گی۔ اچھے گھرانے کی' شریف اور عزت دار۔ آپ مجھے اپنے بیٹے کے سر تھوپ کر اس کی زندگی برباد مت کریں۔ مجھ سے ہمدردی کرتے ہوئے چھاجی کے ساتھ ظلم تو مت کریں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہے دوئی؟" بالو نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر کہا۔

"ہمدردی کیسی؟ تجھ میں کس بات کی کمی ہے۔ میں تو ہمیشہ تجھے اپنے شہزادے کی دوہٹی کے روپ میں دیکھتی آئی ہوں۔ اس کے ساتھ زبردستی کرنی ہوتی تو کرا اپنی زندگی میں کر لیتا یہ تو شہزاد کی اپنی مرضی ہے ــــ"

"نہیں ماما' یہ ان کی خوشی نہیں خدا ترسی ہے یا پھر اپنے مرحوم والد کو دیے عہد کا پاس۔ میں چھاجی کے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں۔ چھاجی' آپ سرخرو ہوئے آپ نے اس عہد کی پاسداری کے جو پوچھ کیا' وہ ماما جی کی روح کو تسکین پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن ــــ لیکن میں خود کو کسی ایثار کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو دوئی اور غلط ہی کر رہی ہو۔" پہلی بار شہزاد نے اسے مخاطب کیا۔ وہی تھا جو اس انکار کا پس منظر جانتا تھا۔ جیسا رویہ وہ دعا کے ساتھ ماضی میں برت چکا تھا اس کے بعد وہی تھا جو یہ باتیں سمجھ سکتا تھا اور کسی حد تک دعا اسے حق بجانب بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کے دل میں دعا کی کھوئی ہوئی قدر رفتہ رفتہ بحال ہو رہی تھی۔ مگر اس وقت یہ قدر و منزلت یکایک بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

"خودداری کا پہلا سبق آپ نے ہی تو پڑھایا تھا چھاجی۔" اس نے اپنے رخسار پہ ہاتھ پھیر کے کچھ یاد دلایا۔ شہزاد پہلو بدل کے رہ گیا۔ اسے اپنے بے رحم ہاتھ کا وہ وار یاد آ گیا تھا جو اس نے ایک ناتجربے کار' کم سن جذباتی سی لڑکی کی حماقت پہ بغیر سوچے سمجھے کر ڈالا تھا۔ وہ اسے پیار سے بھی سمجھا سکتا تھا' اس کی حرکت پہ شرمندہ کر سکتا تھا۔ یہ خیال بعد میں اسے آیا ضرور مگر دیر ہو چکی تھی۔ اس دیر کا ازالہ اب اسے کرنا تھا۔

"عزت نفس کسے کہتے ہیں' انا کو سربلند کیسے رکھا جاتا ہے' دل کی خوشی پہ دماغ کے فیصلے کو مقدم کیسے رکھا جاتا ہے' یہ سارے سبق آپ ہی کے پڑھائے ہوئے ہیں۔ آپ کی اتنی محنت ضائع جانے دوں چھاجی؟ نہیں میں ایسی بھی نالائق شاگرد نہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ماما کے قریب جا کے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"مجھے معاف کر دینا ماں ــــ اور ــــ اور ابا آپ بھی' میں ہاں کر کے آپ کو خوشی نہیں دے سکتی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو خوش ضرور دیکھنا چاہتی۔ مگر اس طرح نہیں' اس طرح نہیں کر سکتی میں اور ابھی شاید آپ کو میرے انکار سے دکھ ہو رہا ہو مگر بعد میں آپ بھی کہیں گے کہ یہ ٹھیک تھا۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں آپ بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ آپ کی وقتی خوشی کے لیے میں ایک ذلت بھری زندگی قبول کر لوں۔ جس شخص کے سامنے میں کبھی سر نہیں اٹھا کے کھڑی ہو سکتی اس کے ساتھ زندگی کیسے گزاروں گی۔ کم مائیگی کا احساس مجھے مار ڈالے گا۔ میں ــــ میں تو شاید ــــ میں تو شاید بابر جیسے لوگوں کی تفریح طبع کے لیے ہی بنی ہوں۔ چند روزہ کھلونا ــــ مجھے گھر کی زینت مت بنائیں ماما۔ آپ کا گھر ناپاک ہو جائے گا۔"

"دوئی۔" بالو تڑپ گئی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے لیے' اس کے بیٹے کے لیے اور اس کے گھر کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ کتنی اہم اور ضروری ہے وہ مگر شہزاد نے اس کا ہاتھ دبا کے اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

اللہ دسایا سر جھکا کے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی سیاہی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جھریوں میں یکایک اضافہ ہو گیا

تھا۔ دعا نے اپنی نظر باپ کے افسردہ ہارے وجود سے پل بھر میں ہٹا لی تھی اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"نہیں' میں دوئی کو یہ بے وقوفی نہیں کرنے دوں گی۔"

بالو بڑے جوش سے اٹھ کے اس کے پیچھے جانے لگی مگر شہزاد نے ہاتھ نہ چھوڑا۔ وہ پلٹ کے شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"دوئی سے بات میں کرتا ہوں اور آپ کو زیادہ اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مٹھائی کھائیں آپ اور پھوپھا جی کو بھی کھلائیں ہاں مگر میرا اور دوئی کا حصہ ضرور رکھیے گا ہم ابھی آ کر منہ میٹھا کرتے ہیں۔"

اس کے لہجے میں اتنا اعتماد تھا ــــ مسکراہٹ میں اتنا نکھار تھا اور اس کے دعا کے کمرے کے جانب بڑھتے قدموں میں اتنی مضبوطی تھی کہ بالو نے ہر فکر کو فوراً جھٹک دیا اور مٹھائی کے ٹوکرے میں سے نکال نکال کر پلیٹ سجانے لگی۔

"چھاجی آپ ــــ"

وہ ہلکی سی دستک دے کر اندر آیا تو دعا حیران ہو کے کھڑی ہو گئی۔ حیرت کے مارے وہ اپنے چہرے کو بھگوتے آنسو تک نہ صاف کر سکی۔

"جن حرکتوں سے دل دکھتا ہے' وہ حرکتیں کرتی کیوں ہو۔"

اس کا اشارہ ان آنسوؤں کی جانب تھا۔

"عادت ہے ــــ بچپن کی۔"

دعا نے منہ پھیر لیا۔ اس کی آواز کپکپا گئی۔

"اب عادتیں بدلنا ہوں گی دوئی۔ جیسے میں نے بدلی ہیں۔ میں تمہارے لیے بدل سکتا ہوں تو تم میرے لیے کیوں نہیں بدل سکتیں۔ میری زندگی بہت بے کشش بڑی روکھی سی ہے دوئی۔ ان آنسوؤں کو کہیں دور دفنا کے میری زندگی میں آنا۔ بہت سے رنگ لے کر ــــ بہت سی مہک لے کر۔"

"میرے پاس ایسا کچھ نہیں چھاجی۔ کسی اور سے آس لگائیے میں تو وہی دے سکتی ہوں جو مجھے آپ نے دیا۔"

"اور اب میں یہ دینے آیا ہوں۔"

اس نے ڈبیا کھول کے آگے بڑھائی۔ انتہائی خوب صورت پلاٹینم کی انگوٹھی میں ہیرا جگمگا رہا تھا۔

"چلو اب تم بھی بدلے میں یہی پہنا دینا۔ میرا مطلب ہے انگوٹھی۔ رسم کی رسم ہو جائے گی اور تمہارا بدلہ بھی پورا ہو جائے گا۔"

"چھاجی ــــ" وہ جھنجلا گئی۔ شہزاد کی یہ بے تکلفی یہ چھیڑ چھاڑ اس کے لیے اجنبی سی تھی۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ ایسا لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

"آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ یقین کیجیے' بابر سے مجھے رتی برابر دلچسپی نہیں تھی۔ اس حادثے کے بعد بھی میرا دل زندہ سلامت ہے' کوئی روگ نہیں لگا مجھے جو آپ سنبھالنے آ گئے ہیں۔ کوئی ایسی چوٹ نہیں کھائی میں نے جو آپ مرہم لگانے آئے ہیں۔"

"روگ تو تمہیں لگا ہے دوئی ــــ تم مانو یا نہ مانو۔ چوٹ بھی کھائی۔ چاہے تم چھپانے کی کوشش کرو۔"

وہ جھٹلانا چاہتی تھی مگر شہزاد نے موقع نہ دیا۔

"اور یہ چوٹ میں نے ہی لگائی تھی۔ اس لیے مرہم لگانا میرا فرض ہے اور حق بھی' تم کیسے روکو گی؟"

"بڑی جلدی یاد آ گیا آپ کو یہ فرض نبھانا۔ اب زخم پہ کھرنڈ آ چکا ہے چھاجی۔ اب اسے مرہم کی حاجت نہیں۔"

"ہاں مجھ سے دیر ہوئی مگر اس کی سزا مجھے یوں مت دو۔ چلو تم میرے ساتھ وہ کر لو' جو میں نے کیا ــــ لو تھپڑ مار لو دھکے دے دو گالیاں دے لو برا بھلا کہہ لو۔ جتنا میں نے رلایا ہے تمہیں اتنا رلا لو' مگر اپنے ساتھ ظلم مت کرو۔ میں

جانتا ہوں تمہاری خوشی صرف میرے ساتھ میں ہے۔ مجھے قبول نہیں کرتا۔ مگر اپنے آپ کو اس خوشی سے محروم مت کرو۔"

وہ بیڈ کے آخری سرے پہ ٹکی تھی۔ شہزاد اس کے نزدیک نیچے کارپٹ پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"اور اگر یہ سب کرنے کا حوصلہ نہیں تو پھر مجھے معاف ہی کر دو۔"

اس کے ہاتھ بندھے دیکھ کر دعا نے نظریں اٹھائیں۔

لہجے کی بے چارگی اور مسکینی کے برعکس شہزاد کی آنکھوں میں جوت تھی۔۔۔ مدھم سی شرارت تھی۔

"اس جوت کو کیسے بجھنے دوں میں۔ زندگی میں پہلی بار ان پتھر آنکھوں میں مسکراہٹ دیکھی ہے۔ کیسے مرنے دوں اس مسکراہٹ کو۔ میں اتنی بے درد نہیں ہو سکتی۔"

اس نے فیصلہ کر لیا مگر یہ فیصلہ سنانے کی ہمت کرنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

"اور میں یہ یقین کیسے کر لوں چھاجی کہ آپ ہمدردی میں مجھے اپنا تو رہے ہیں بعد میں پچھتائیں گے نہیں۔"

"پہلے تم یہ یقین کر لو کہ میں تم سے ہمدردی نہیں جتا رہا۔ ہاں ٹھیک ہے میں کسی اچانک نمودار ہونے والے لافانی قسم کے عشق کا دعویٰ نہیں کروں گا کہ یکایک' راتوں رات میرا دل تمہارے سامنے بے بس ہو گیا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میرے دل نے تمہارے معاملے میں نرم پڑنا تو عرصے سے شروع کر دیا تھا اور اب مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ تم سے انجانے میں کی زیادتیوں کی تلافی نہ کی تو کبھی کھلے دل سے جی نہیں پاؤں گا۔ میں نے ہمدردی کے ناتے نہیں' صرف اپنے ضمیر کی آواز پہ تمہیں اپنانے کا فیصلہ کیا تھا اور پتا ہے دوئی۔۔۔ جب میں نے تمہارے لیے یہ انگوٹھی خریدی تب میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اسے میں خود اپنے ہاتھ سے تمہاری انگلی میں پہناؤں اور دیکھوں کہ تمہارے چہرے پہ جو مسکراہٹ پھیلتی ہے وہ میرے اندر کہاں تک اترتی ہے پتا نہیں یہ خواہش کیسی ہے' کہیں عشق کی تمہید تو نہیں؟"

دعا سر جھکا کے مسکرا دی اور اپنا ہاتھ دھیرے سے آگے بڑھا دیا۔

● ● ●

چادر کی بکل مارے' ایک کونا دانتوں میں دبائے ہوئے وہ اپنا چہرہ ڈھانپنے کا بھی اہتمام کیے ہوئے تھی' مگر اس کے باوجود اس کی پیشانی کا ایک حصہ اور دائیں آنکھ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ملک مقبول گاہے بگاہے' اس پہ ایک نظر ڈال لیتا تھا۔

یاسمین کو ہسپتال لائے ہوئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو رہا تھا۔ وارڈ کی بجائے پرائیویٹ کمرہ حاصل کیا گیا اور اب کافی دیر سے اس کے مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے۔

"پتا نہیں ماموں جان ابھی تک اسٹور کیوں نہیں آئے؟ اب ہم ان سے کہاں رابطہ کریں۔ اسٹور کا فون نمبر ہی تو رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔"

وہ بے حد پریشانی کے عالم میں گھری یہی سوچ رہی تھی۔ اس نے رخ بدلے بغیر ذرا سی نظر گھما کے ملک مقبول کی جانب دیکھنا چاہا۔ وہ ذرا فاصلے پہ بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا رہا تھا۔

اس کا دل چاہا' ایک بار پھر اس سے نمبر ملانے کا کہے۔ مگر کہتے کہتے جھجک گئی۔

پچھلے ایک گھنٹے میں وہ بلا مبالغہ پندرہ مرتبہ اس کے کہنے پہ نمبر ملا چکا تھا اور ہر بار مایوسی سے سر ہلا دیتا۔

"اب اور کتنی بار زحمت دوں ان کو۔ ایک تو وہ سارے کام وام چھوڑ کے ہماری امی حضور کی خاطر کب سے یہاں بیٹھے ہیں۔ نہ ابا حضور کی کوئی خیر خبر ہے' نہ ہی ماموں جان کا اتا پتا ہے۔ ایسے میں ہم بار بار انہیں تنگ کریں یہ مناسب نہیں لگتا۔ اگر وہ زچ آ کر یہاں سے چل دیئے تو۔۔۔" یہ خیال آتے ہی وہ گھبرا گئی۔ بے چینی سے اپنی انگلیاں موڑتی ہوئی وہ زور زور سے پلکیں جھپک کے اپنے آنسو پیچھے دھکیلنے لگی۔ اس کا یہ اضطراب ملک مقبول کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکا بلکہ وہ تو ویسے بھی اس پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔

"ابا حضور یا ماموں کے آنے سے پہلے پہلے ان کا یہاں سے جانا ہمارے لیے ٹھیک نہیں۔ نجانے امی حضور کو کیا ہوا ہے' ڈاکٹرز مختلف ٹیسٹ کروا رہے ہیں۔ کبھی خون کا' کبھی ایکسرے کا' یہی صاحب دوڑ بھاگ کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا پتا چلے گا۔ اللہ میاں! ہماری امی حضور کو ٹھیک کر دیں۔ ہمارے ماموں جانی سے ہماری بات کروا دیں۔ ہمارے ابو حضور کو کہیں سے واپس بھجوا دیں اور۔ اور۔ اللہ تعالیٰ جی یہ صاحب' یہ جو ابا حضور کے دوست ہیں جن کو آپ نے ہماری مدد کے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے' ان کے دل میں اسی طرح رحم ڈالے رکھیں۔ انہیں ابھی یہاں سے جانے نہ دیجئے۔"

بہت ساری دعائیں مانگتے ہوئے وہ یہ دعا بھی مانگ بیٹھی جو کسی طرح اس کے حق میں اچھی نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس دعا کے قبول ہونے پہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن انجان تو وہ تھی بے خبر تو وہ تھی۔ اس لیے یہ دعا مانگ بیٹھی۔

جس سے یہ دعا مانگی گئی تھی وہ بے خبر نہیں تھا۔ وہ تو وہ ذات پاک ہے۔ جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور لوح پہ تحریر تقدیر۔ تبھی کہ وہ اسی کی رضا سے رقم ہوتی ہے۔

وہ تو جانتا ہے کہ اس کے بندے کے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔

موبائل پہ نمبر پش کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آیا۔

"اب تک تو تمہارے ماموں کو آ جانا چاہیے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ تمہاری والدہ کی طبیعت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری اکیلے کیسے اٹھا سکتا ہوں بہتر ہو گا تمہارا کوئی اپنا یہاں اس وقت ساتھ ہو۔"

موبائل کانوں سے لگائے وہ اپنی تشویش کا اظہار کرتا ہوا اس کی گھبراہٹ اور پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا درحقیقت یہی اس کا مقصد تھا۔ جتنا پریشان وہ ہو گی۔ اتنا ہی اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں شل ہو جائیں گی۔ پھر وہ اپنے حسب منشا نتائج حاصل کر سکتا تھا۔

دلکش آنکھوں میں امید لیے اس کا چہرہ تک رہی تھی کہ ابھی دوسری جانب سے فون اٹھا کر ہیلو کہا جائے گا۔ ابھی وہ اسے فون تھمائے گا مگر۔۔۔ پورا سر اٹھا کر اسے ایک بے بس سی آس لیے دیکھتی وہ اس وقت اپنے سر سے سرک کر نیچے ہوتی چادر سے بھی بے نیاز تھی۔

"عجیب بات ہے۔" بالآخر ملک مقبول نے رابطہ منقطع کر دیا۔

درحقیقت وہ بار بار اپنے ہی آفس کا پرسنل نمبر ملا رہا تھا۔

"بابر میاں سے مجھے اس غیر ذمہ داری کی توقع نہیں تھی کیا اس کا رویہ اپنے بیوی' بچوں کے ساتھ ایسا ہی ہے۔"

اس نے ہمدردی جتاتے ہوئے اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ مقصد صرف اپنے اور اس کے درمیان بے تکلفی پیدا کرنا تھا۔ لیکن دلکش جس کا دل یہ سوال سن کر بھر آیا تھا' سوائے سر جھکا کے آنسو پینے کے' اور کچھ نہ کر سکی۔ پردہ پوشی اور بھرم قائم رکھنے کا سبق صاحبزادی یاسمین نے اسے گھول کے پلا رکھا تھا۔

"ذرا ملاقات ہو جائے اس سے خبر لیتا ہوں۔ یہ کوئی بات ہے بھلا۔ اتنے اتنے دن گھر سے غائب رہنا اور وہ بھی اس حال میں کہ نہ بال بچوں کی کوئی خبر ہے نہ اپنے ٹھکانے کا بتا رکھا ہے۔ اتنا تو پتا ہو گا کہ بھابی کتنی بیمار ہیں۔ کم از کم اس حال میں تو ٹک جاتا گھر پہ۔۔۔ تم فکر مت کرو میں سمجھاؤں گا اسے۔ وہ صرف میرا دوست ہی نہیں ہے بہت مانتا ہے میری بہت عزت کرتا ہے۔"

وہ ایک بار پھر اپنی اہمیت بڑھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اعتبار بھی۔ اس کی بات سے دلکش کو سہارا محسوس ہوا۔

"مجھے تو تمہارے یہ ماموں اور نانا وغیرہ بھی عجیب سے لوگ محسوس ہو رہے ہیں۔"

اپنی پہلی بات کا ردعمل خاطر خواہ دیکھ کے وہ اور پھیلا اس بار اس نے دلکش کا اعتماد اس کے ننھیال والوں پر سے بھی ڈگمگانا چاہا تاکہ وہ اس مشکل وقت میں صرف اور صرف اسے ہی اپنا نجات دہندہ سمجھے لیکن اس بات پہ

دلکش کی موتی ایسی شفاف پیشانی پہ ایک ناگوار شکن نمودار ہوئی جیسے اسے اپنے نانا اور ماموں کے بارے میں یہ تبصرہ برا لگا ہو۔ ملک مقبول بروقت سنبھل گیا۔

"میرا مطلب ہے آج کے دور میں گھر پہ فون جیسی سہولت کا نہ ہونا..... یہ کتنی عجیب سی بات ہے۔" وہ بات بدل چکا تھا۔

پھر اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کے دوبارہ پرے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اب وہ اپنی کھردری جلد والی ٹھوڑی کو کھجاتے ہوئے اگلے پلان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"اگر میں اس چھوکری کو کہوں کہ وہ کچھ دیر میرے گھر چل کے آرام کر لے یا..... یا میرے ساتھ ہوٹل جا کے کچھ کھا پی لے تو کیا یہ مان جائے گی؟؟"

اپنے سوال کا جواب اس نے خود ہی نفی میں سر ہلا کر دے دیا۔

"بہت پکی لگتی ہے۔ میرا تو خیال تھا' چودہ پندرہ کا سن ہے۔ بھولی 'الہڑ سی لڑکی ہے۔ جو کہوں گا مان جائے گی مگر ہاں بھئی بابر کی اولاد ہے 'اڑیل تو ہو گی' ٹیڑھا پن تو دکھائے گی لونڈیا..... خیر ملک بھی انگلی ٹیڑھی کرنا جانتا ہے۔" اس کے شاطر دماغ نے گھڑی بھر میں ایک اور سازش ترتیب دے ڈالی۔

وہ نیاز کھوکھر کا نمبر ملا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دعا اپنے ہاتھ کو آنکھوں کے سامنے پھیلائے ہوئے تھی ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود انگوٹھی کو وہ نظروں میں اتار رہی تھی۔ نظریں سیر نہ ہوئیں تو اس نے اپنے لب اس پہ رکھ لیے۔ ایک امرت سا اس کے اندر اترنے لگا۔

"میں رانجھے کی منگ ہوں۔

لوگو..... میں رانجھے کی منگ۔"

انگوٹھی کو لبوں سے لگائے وہ دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی۔ اپنی آواز آج سے پہلے کبھی بھی اسے اتنی اچھی نہ لگی تھی۔

"کیا یہ کسی عشق کی تمہید تو نہیں؟"

شہزادی کی آواز اس کے کانوں کے آس پاس ابھری۔ اس کی گنگناہٹ ٹھٹک کے تھم گئی۔

"ہاں چھا جی..... آپ نے ٹھیک پہچانا۔ یہ عشق ہی تو ہے اور جسے آپ تمہید یا آغاز سمجھ رہے ہیں 'وہ آپ کی جانب سے ہو گا۔ میں نے تو اس کی بنیاد تب رکھی تھی جب میرے ہاتھوں میں اس کا سنگ بنیاد اٹھانے کی سکت تک نہ تھی۔ میں نے برسوں تپتی دھوپ میں جل کر عشق کی یہ وادی آپ کے لیے سجائی ہے۔ اس کا چپا چپا میری دیوانگی کا گواہ ہے۔ آپ نے تو اب پہلا قدم دھرا ہے چھا جی آیئے 'آجایئے اس سجی سجائی وادی میں بس ایک آپ ہی کی کمی تھی اور میں کب جانتی تھی کہ یہ کمی کبھی دور بھی ہو گی۔"

وہ سرشاری سے مسکرا دی۔

تکیے پہ اپنے گیلے گیلے مہکتے بال پھیلا کر لیٹتے ہوئے اس نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔ اس کا انگوٹھی والا ہاتھ ایک بار پھر اس کے لبوں تک ٹھہر گیا۔

"میں رانجھے کی منگ ہوں لوگو....."

اس کا بس نہ چل رہا تھا زمانے بھر میں یہ اعلان نشر کر دے۔

☼ ☼ ☼

"کھوکھر..... آج کیا خبر ہے؟"

نگاہ نے اس کی آواز سن کر بظاہر کڑوا سا منہ بناتے ہوئے 'مگر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سوال کیا۔ کافی دنوں سے اسے کوئی نیا پروگرام نہیں ملا تھا۔ نیاز کھوکھر کے فون سے کچھ آس بندھی۔

"اور خدا کا واسطہ ہے کوئی اچھی خبر سنانا۔ ویسی مت سنانا' جیسی تمہاری شکل ہے۔"

"میں کوئی شام کا اخبار ہوں نگاہ بائی 'جو خبریں سناؤں گا۔"

نگاہ کی آواز سنتے ہی اسے دل لگی سوجھی ورنہ ملک مقبول نے تو سخت ایمرجنسی نافذ کر دی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر کام کرنے کا کہا تھا۔

"تم نے پھر مجھے بائی کہا؟ تمہاری بچپن کی عادت چھوٹ نہیں سکتی کھوکھر؟..... یا ماں کی گود سے ہی یہ لفظ سن سن کر..... اور یوں بول کر زبان پہ چڑھ گیا ہے۔"

نگاہ نے چبا چبا کر اسے ذلیل کرنا چاہا۔

ذلیل کو کوئی اور کیا ذلیل کرے گا اور کتنا کرے گا۔ وہ بھی یہ کڑوا طنز ہنس کے پی گیا۔

"میری تو چلو' شکل بری ہے وہ بھی بقول تمہارے 'اس لیے بات بھی ایسی کرتا ہوں مگر سوہنیو! آپ کی تو صورت بھی سبحان اللہ ہے پھر باتیں بھی سوہنی سوہنی کرو۔"

"جس طرح میری سوہنی صورت بکتی ہے ناں کھوکھر 'اس طرح سوہنی سوہنی باتیں بھی میں دام وصولنے کے بعد کرتی ہوں۔ تم جیسے ففتوں (کنگلوں) پہ نہیں ضائع کرتی۔ بس اتنی عزت افزائی بہت ہے یا اور حسرت باقی ہے۔ میرا خیال ہے چند دن تک تمہاری بے عزتی نہ ہو تو تمہیں کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فون کیا ہو گا۔ تسلی ہو گئی ہو تو میں فون رکھتی ہوں۔"

اس سے قبل کہ وہ واقعی ریسیور رکھ دیتی 'نیاز کھوکھر لائن پہ آگیا اور سارا چونچال پن ایک طرف رکھتے ہوئے مطلب کی بات کرنے لگا۔

"ملک مقبول نے مجھے آرڈر دیا ہے 'پندرہ منٹ کے اندر اندر تمہیں لے کر پہنچنے کا۔"

"ایسا کون سا اچانک پروگرام طے ہو گیا ہے۔ ابھی کل تک تو کوئی تذکرہ نہیں کیا انہوں نے۔"

"ذاتی کام ہے۔"

"اوہ..... پرائیویٹ محفل۔" نگاہ نے گہری سانس بھری۔

"یعنی کہ کسی سرمایہ دار کے ہاں برسنے والے اللہ کے فضل کی خوشی میں ناچنا ہے اچھا طریقہ ڈھونڈا ہے ان لوگوں نے شکرانہ ادا کرنے کا۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا کھوکھر..... اور ساتھ میں تمہارے ملک صاحب کا بھی۔ مجرو کرنے جانا ہے 'کسی کی موت کا افسوس کرنے نہیں جانا۔ ایسے کیسے چل پڑوں۔ تیاری میں خاصا وقت لگتا ہے اور مجھے تو یہ سمجھ نہیں آرہا کہ بھری دوپہروں میں مجرے کرانے کا کیا نیا رواج نکلا ہے؟"

"دماغ تمہارا خراب ہے نگاہ بائی..... مجرے اور نمائش بینوں کے علاوہ تمہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اگر نو سو کھا چکی ہو تو کوئی ثواب اور آخرت وغیرہ کے بارے میں بھی سوچو۔ ایک نیک کام ہے جس میں مدد کے لیے ملک صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔"

"ملک..... اور نیک کام؟"

"بس بس..... اور وقت ضائع مت کرو۔ جیسی ہو' جہاں ہو' نکل پڑو بلکہ ہو سکے تو جو تھوڑا بہت زیور لتا پہنا ہے یا میک اپ شیک اپ کیا ہوا ہے 'اسے بھی اتار آؤ۔ یہی سمجھ لو' کسی کے ہاں افسوس کرنے ہی جانا ہے۔"

"واہ..... خواہ مخواہ سمجھ لوں۔ فالتو وقت نہیں ہے میرا جو ملک کے ایک اشارے پہ نکل پڑوں۔"

"پتا ہے مجھے تم تو بین ڈالنے کے بھی پیسے لو گی۔ فکر مت کرو۔ کسی مجرے کے برابر ہی معاوضہ ملے گا۔"

"مرا کون ہے؟"

نگاہ بالآخر دلچسپی لینے پہ مجبور ہو گئی۔ مگر یہ نیاز کھوکھر کے صبر کی انتہا تھی۔

"اگر دو منٹ بھی اور گزرے تو شاید میں ہی مارا جاؤں۔ پندرہ منٹ میں سے نو منٹ تم نے اپنی تفتیش میں ضائع کر دیے۔ فوراً یہاں سے نکلو' رکشا پکڑو اور کلمہ چوک تک پہنچو میں وہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی اور اگلا نمبر ملک مقبول کا ملایا۔
"اوئے' الو کے پٹھے۔۔۔ تو ابھی تک وہیں ہے' میں تو سمجھا بس پہنچنے والا ہوگا اور تو فون پہ اپنی منحوس آواز سنا رہا ہے۔" ملک نے غرا کے پوچھا۔
"میرا کیا قصور ہے ملک صاحب۔۔۔ بس یہ عورت ذات پتا تو ہے آپ کو۔" وہ منمنا کے صفائی پیش کرنے لگا۔
"تو اب کس عورت کے گوڈے سے لگ کے بیٹھا ہے۔ تیری گھر والی تو کب کی تجھ پہ لعنت بھیج کے دفع ہو چکی ہے اس بٹ کے ساتھ۔"
"میں اپنی عورت کی نہیں' اس اڑیل عورت کی بات کر رہا تھا۔ آپ نے ہی تو حکم دیا تھا کسی کو لے کر پہنچو۔ نگاہ سے بات کی ہے میں نے ظاہر ہے ایک دم سے میرا آرڈر سن کر کیسے نکل پڑتی۔ میں کوئی اس کا خصم تو نہیں۔ سو سوال کیے اس نے فضول میں ٹیم ضائع کیا۔"
"اوئے! نگاہ سے متھا ماری کرنے کے لیے کس نے کہا تھا۔ وہ تو بڑی خطرناک زنانی ہے۔ کہیں سارے کیے کرائے پہ پانی نہ پھیر دے۔ اگر یہاں آکر اڑ گئی کہ جاؤ میں نہیں کرتی یہ ڈرامے بازی تو پھر؟ ساری بات بتائی ہے اسے؟"
"نہیں جی مگر راستے میں بتا دوں گا۔"
"اوئے ناما نیا۔۔۔ ابھی راستہ بھی شروع نہیں ہوا تیرا اور وہ جو اس بڈھی کو ہوش آگیا تو میرا تو ہو گیا نا خانہ خراب بڑی مشکل سے قابو کیا ہوا ہے حالات کو۔"
"فکر نہ کریں جی' میں ہاسپٹل سے ذرا ہی فاصلے پہ ہوں۔ ٹیم بچانے کے لیے ہی نگاہ کو لینے خود نہیں گیا۔ وہ دو تین منٹ تک ادھر پہنچے گی' اس رکشے میں اس کے ساتھ میں پانچ منٹ تک آپ کے پاس بات میں اس طرح سمجھاؤں گا کہ وہ ناں کر ہی نہیں سکتی۔ دراصل اس کا نام ہی ذہن میں پہلے آیا اور پھر ملک صاحب وہ ضرورت مند بھی ہے' ضرورت انسان سے سب کچھ کروا لیتی ہے۔ آپ بے فکر رہو' وہ کوئی اڑی نہیں کرے گی۔"
اس کے تسلی دلانے پہ ملک نے سر ہلا کے موبائل آف کیا' جیب میں ڈالا ایک بار پھر رسٹ واچ پہ وقت دیکھا۔ دل ہی دل میں سارے ڈائیلاگ دوہراتا وہ دلکش کی جانب چلا آیا۔
"مجھے ایک بے حد ضروری کام سے اپنے آفس جانا ہے۔ میرے سیکرٹری کا فون آیا ہے۔"
دلکش متوحش ہو کے اسے تکنے لگی۔
اگرچہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی ملتجی نگاہیں ایک ہی تکرار کر رہی تھیں۔
"مت جائیے' ہمیں یہاں اکیلے چھوڑ کے مت جائیے۔"
"بلکہ فون تو مسلسل آدھے گھنٹے سے آ رہے ہیں مگر میرا دل نہیں مانا جانے کو۔ آخر بابر کے لیے میرے دل میں جو جذبات ہیں ان کے حوالے سے میرا فرض بنتا ہے کہ میں۔۔۔ بھئی کیسے جاتا بھائی کو اس حال میں چھوڑ کے۔ ڈاکٹرز کو کسی بھی چیز' دوا یا ٹیسٹ کی ضرورت پڑ سکتی ہے دوسری طرف کام ایسا ہے کہ میرے نہ جانے سے لاکھوں کا نقصان ہوگا اس لیے آخر کار مجھے جانا پڑ رہا ہے۔"
دلکش نے بے بسی سے سر جھکا لیا اندر ہی اندر وہ گھٹ رہی تھی مگر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔
"یہ بھلا کیوں ہمارے لیے لاکھوں کا نقصان کروائیں گے' کس رشتے سے کروائیں گے۔" یہ سوچ کر اس نے اپنی التجا آنکھوں تک ہی رہنے دی۔
"میں نے اپنے ایک بہت خاص آدمی کو یہاں بلا لیا ہے تاکہ وہ میری غیر موجودگی میں ایک ڈیڑھ گھنٹا یہاں رہے۔ ڈاکٹرز کو جب بھی کسی دوا یا انجکشن کی ضرورت ہو' وہ فوری طور پہ لا سکے اور مجھے منٹ منٹ بعد بھائی کی حالت سے باخبر بھی کرتا رہے۔ ٹھیک ہے نا؟"
وہ اس بار بھی خاموش رہی۔ دل کو کچھ ڈھارس دینا بھی چاہی مگر ناکامی ہوئی۔ پتا نہیں دل اتنا ناامید اور بجھا بجھا سا کیوں تھا۔

ہر جانب ایک اندھیرا سا بڑھتا ہوا کیوں محسوس ہو رہا تھا' یہ جاننے سے وہ قاصر تھی۔ ملک کی اس مہربانی پہ بھی وہ مطمئن نہ ہو سکی۔
"لیکن ایک مسئلہ ہے۔ میں تمہیں کسی انجان آدمی کے بھروسے پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ بے شک وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے مگر۔۔۔ اور تمہارے ماموں یا ابا کا بھی پتا نہیں چل رہا۔ اس لیے میں نے اسے کہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آئے۔ وہ تمہارے ساتھ رہے گی تو تمہیں آسرا رہے گا۔ بڑی بھلی عورت ہے۔ یہیں قریب گھر ہے اس کا۔ میرا تو کہنا ہے کہ تم کچھ دیر اس کے ساتھ اس کے گھر ہو آنا۔ کچھ آرام کر لینا۔ بھابی ہوش میں آئیں گی تو تمہاری تھکی تھکی صورت دیکھ کر پریشان ہوں گی۔"
"نہیں ہم یہیں رہیں گے۔"
اسے واقعی کسی خاتون کے یہاں آنے سے تسلی ہوئی تھی مگر وہ کہیں جانے کا سوچ کے ہی گھبرا اٹھی۔
"تمہاری مرضی ہمیں وقفے وقفے سے تمہارے ماموں کا نمبر ملاتا رہوں گا' ایسا کرو ان کا ایڈریس بھی دے دو۔ ہو سکتا ہے فون خراب ہو۔ میں کسی کو بھیج کر اطلاع کروا دیتا ہوں۔"
"یہ خیال ہمیں پہلے کیوں نہیں آیا۔" وہ جلدی جلدی اس کے دیے کارڈ کی پشت پہ پتا لکھنے لگی۔
"خیال آتا کیسے؟ ہوش کب ٹھکانے ہیں تمہارے۔ اسی لیے تو مشورہ دیا تھا کہ وہ بی بی آئیں تو ان کے ساتھ گھنٹا بھر کو آرام کرنے چلی جاؤ۔ چلو آرام نہ سہی' منہ ہاتھ دھو کر ترو تازہ ہی ہو جانا۔ خود بھی بیمار لگ رہی ہو۔"
اگرچہ دلکش کا کوئی ارادہ نہ تھا یہاں سے ہلنے کا پھر بھی اس نے سر ہلا دیا۔
اتنے میں اسے نیاز کھوکھر کے ہمراہ سیاہ چادر میں لپٹی نگاہ آتی نظر آئی۔
اگرچہ اس نے ایک عام عورت نظر آنے کی بھرپور کوشش کی تھی پھر بھی اس کا اندر چھلک چھلک جا رہا تھا۔
ملک نے کئی مردوں کو مڑ مڑ کے اس کا جائزہ لیتے دیکھا۔
"سالی کا جوبن ہے کہ چادر میں سے بھی لشکارے مار رہا ہے اور پھر چال دیکھو ورنہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں کتنی ہی خوب صورت عورتیں یہاں سے گزرتے دیکھ چکا ہوں۔ اس طرح کسی کے اوپر بھی لوگوں کی نظریں گڑتی نہیں دیکھیں۔۔۔ سچ ہے بازاری عورت بارہ مسالے کی چاٹ ہوتی ہے' اس کا چسکہ ہی سب سے الگ ہے۔۔۔ مگر کیا کریں جس طرح دن میں تینوں وقت گھر کی پھیکی ہانڈی کھانے والوں کا دل بازار کے چٹ پٹے پکوان کھانے پہ مچل جاتا ہے اسی طرح مجھ جیسے ہر وقت باہر منہ ماری کرنے والے کا دل بھی کبھی کبھار گھر کی سادہ دال روٹی کھانے کو چاہتا ہے۔"
اس نے نگاہ سے نظریں ہٹا کے کن انکھیوں سے دلکش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔
"اور باہر کی چیز دیکھنے میں چاہے کتنی بھی سجی سجائی ہو' اشتہا انگیز خوشبوؤں والی ہو' کیا پتا کتنے دن کی باسی ہے۔۔۔ نیا تڑکا لگا کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔۔۔ گھر کی دال روٹی کم از کم تازہ تو ہوتی ہے۔"
"سلام صاحب یہ میری گھر والی' آپ کے کہنے پہ لے آیا ہوں۔"
کھوکھر کی آواز پہ وہ اپنے نادر خیالات کی دنیا سے نکلا۔
اگرچہ وہ راستے میں ضروری تفصیلات سے نگاہ کو آگاہ کر چکا تھا۔ یہاں ہونے والے ڈرامے کا سارا اسکرپٹ اسے سنا آیا تھا پھر بھی نگاہ اسے گھر والی کہنے پہ گھورنے سے باز نہ آئی۔
"اوقات تو تمہاری یہی ہے کھوکھر' تمہاری سگی گھر والی بھی ہوتی تو تم ملک کے ایک اشارے پہ اسے حاضر کر دیتے۔"
وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔
کھوکھر نے ٹھوکا دے کر اسے یاد دلایا کہ وہ یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ وہ فوراً آگے بڑھی اور ریلا کی تشویش اور

ہمدردی اپنے چہرے پہ سجا کے دلکش کے پاس آئی۔

"اللہ اتنی سی بچی اور یہ افتاد' کیسا غضب ہے کوئی اپنا سگا رشتہ دار اس وقت پاس نہیں ہے۔"

اس ہمدردی پہ دلکش کا جی' جو پہلے ہی بھرا ہوا تھا اور بھی بھر آیا۔ باوجود بہت ضبط کے بھی اس کے آنسو بہہ نکلے

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ ملک صاحب کوئی غیر نہیں۔ آخر یہ بابر بھائی کا معاملہ ہے۔ جس کو ملک صاحب اپنا سب سے قریبی دوست اور بھائی مانتے ہیں۔" تیاز نے لقمہ دیا۔

"ہاں ۔۔۔ یہ تو ہے۔ بس میری بچی مت رو۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں صحیح وقت پہ صحیح بندے سے ملوا دیا۔" وہ دلکش کو اپنے ساتھ لپٹا کر تسلی دے رہی تھی۔

دلکش کا ہچکیاں لیتا نازک سا وجود اس کے ساتھ کیا لگا' نگاہ کے اندر عجیب سے احساسات نے جنم لیا' جن کو پہچاننے سے وہ فی الحال قاصر تھی۔ ہاں اتنا ہوا کہ چند منٹ کے اندر رٹ لینے والے مکالمے اس کے ذہن سے فوراً ہی مٹ گئے۔ مزید کچھ کہنے کی بجائے اب وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے اس کی پشت سہلانے لگی۔

"تو بھئی' یہ اب تمہارے حوالے ہے' خیال رکھنا اس کا میں جلد واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں بلکہ ہو سکا تو بابر کو لے کر ہی آؤں گا۔ اچھا ہو گا اگر اس دوران اس کے ماموں اور نانا بھی آ جائیں۔ مجھ سے تو اس کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی اور کھوکھر' یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ جتنے پیسوں کی ضرورت پڑے نکلوا لینا!"

دلکش کو زیر بار کرنے کے لیے اس نے مزید کہا اور ہاتھ آگے بڑھا کے کھوکھر کے ہاتھ تک جو چیز منتقل کی وہ درحقیقت کارڈ نہیں بلکہ اس کا اور نگاہ کا پیشگی معاوضہ تھا۔

"باقی کام ہونے کے بعد۔" اس نے سرگوشی کی اور ایک گہری نظر دلکش پہ ڈالتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے گل مہر۔"

عمیص نے بے حد سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

وہ اچنبھے میں پڑ گئی۔

ایک تو وہ کبھی اسے اس کے مکمل نام سے مخاطب کیا کرتا تھا۔ اسے گل کہنا ہی پسند تھا ہمیشہ سے۔

اور دوسرا یہ کہ اس کے لہجے میں سنجیدگی کے علاوہ بھی کوئی احساس تھا' کوئی بہت ہی سنگین احساس جو اسے کسی چیز سے خبردار کر رہا تھا۔

لامحالہ وہ گھبرا اٹھی۔ مگر اس گھبراہٹ کو اپنے اوپر حاوی کرنے کی بجائے اپنی فطری رعونت سے بولی۔

"ہم کب سے ضروری باتیں کرنے لگے خیر دیر آید' درست آید ہم ضرور سنتے کہ تم ضروری باتیں کرتے ہوئے کیسے لگتے ہو مگر اس وقت ہم مصروف ہیں۔"

وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں جانا چاہ رہی تھی کہ عمیص لپک کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کے کمرے کے دروازے کے عین بیچ میں کھڑا ہو کے اس کا راستہ روک دیا۔ وہ بری طرح جز بز ہوئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"یہ وہ واحد حربہ ہے جو تم جیسوں کے ساتھ برتا جا سکتا ہے' اب چاہے تم اسے بدتمیزی کہو' چاہے کچھ اور۔۔۔"

عمیص نے ڈھیٹ بنتے ہوئے جواب دیا۔

"اس حرکت کا مقصد؟" اس نے اپنے مغرور ابرو اچکا کے پوچھا۔

"مقصد تمہیں وارن کرنا ہے صاحبزادی گل مہر۔ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ تم۔ ورنہ مجبوراً مجھے کوئی اور لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔"

بلاشبہ زندگی میں پہلی بار وہ اتنے درشت لہجے اور سخت الفاظ کے ساتھ اس سے بات کر رہا تھا' اس پہ مستزاد اس

کی تند و تیز غضب ناک نگاہیں جو گل مہر کے چہرے پہ ٹکی ہوئی تھیں۔

وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اس نے غالباً کبھی اس صورت حال کا تصور بھی نہ کیا ہو گا کہ عمیص اور یہ تیور' فوری طور پہ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"موتیا سے الجھنا' میرے خلاف اس کے دل میں زہر بھرنا اور ہمارے تعلق کو کمزور کرنے کی کوششیں کرنا چھوڑ دو۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری ایسی کوئی بھی کوشش' چاہے تم اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور ہی کیوں نہ لگا لو' کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اس کے باوجود میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ یہ حرکتیں چھوڑ دو۔ اس کے نتیجے میں سوائے ذلت اور خواری کے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ جو تھوڑی بہت عزت اور بھرم باقی ہے اسے بھی گنوا بیٹھو گی۔ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی لوگوں میں بے وقعت ہو کے رہ جاؤ گی۔"

گل مہر کا سانس تک رک گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی۔۔۔ بے یقینی سے اس کی کڑوی باتیں سنتی رہی۔ کتنی بار اس نے اس گمان میں پناہ لینی چاہی کہ وہ اس سے نہیں' کسی اور سے مخاطب ہے۔۔۔ مگر یہاں اس کے سوا دوسرا کوئی نہیں تھا جس کی سماعتوں میں وہ یہ زہر انڈیل رہا تھا۔

"میرا خیال ہے میرا اتنا کہنا کافی ہو گا۔ سمجھ دار ہو گی تو باز آ جاؤ گی۔"

اس کی حالت دیکھ کر عمیص نے اندازہ لگایا کہ اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی ہے۔ اس لیے مطمئن ہو کر پیچھے ہٹا۔ اسے واپس پلٹتا دیکھ کے گل مہر جیسے کسی شاک سے باہر آئی۔

"اے۔۔۔ رکو۔"

عمیص اپنی پیشانی پہ ناگواری شکن لے کر پیچھے مڑا اسے یہ انداز تخاطب بری طرح چبھا تھا۔

"کیا سمجھ کر تم ہمیں ٹکے ٹکے کی باتیں سنا رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے ہم یہ بدتمیزی اور جسارت برداشت کر سکیں گے؟ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

وہ پھنکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اوہ۔۔۔ کیا واقعی؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"اچھا' تو پھر بجاؤ تالی۔ میں بھی دیکھوں گا' کس کونے سے نکلتے ہیں تمہارے جاں نثار سیاہ فام محافظ اور کس زنداں میں ڈالتے ہیں مجھے۔ چلئے شہزادی عالم نظارہ کرایئے اپنی سلطنت اور شہنشاہی کا۔۔۔ بندہ ناچیز منتظر ہے۔"

وہ سراسر مذاق اڑا رہا تھا اور گل مہر کا وجود طیش کے مارے ہلکے ہلکے جھٹکے کھانے لگا۔

"تو اس الماس خاتون نے تمہیں بھر کے بھیجا ہے۔"

"اپنی بکواس بند کرو۔" وہ آواز دبا کے ہلکا سا غرائی تھی۔

"یہ غراہٹ شیرنیوں کو بجتی ہے گل مہر' مکار لومڑیاں ایسی نقلیں اتارتی اچھی نہیں لگتیں۔"

"تم۔۔۔ تم نے ہم' ہمیں مکار لومڑی کہا۔" غصے سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

"جو کچھ تم کرتی پھر رہی ہو' اس کے بعد تمہیں یہی ٹائٹل سوٹ کرتا ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ ورنہ مجھے چھوڑ لوگ پتا نہیں تمہیں اور کن کن ناموں سے یاد کریں گے۔"

اس کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک گل وہیں اپنے کمرے کے دروازے پہ سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

نازک لب پھڑپھڑا رہے تھے اور چہرے کی گلابی رنگت اس وقت آتشیں ہو چلی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا کیا تم نے؟" موتیا ساری تفصیل سے آگاہ ہوئی تو افسوس سے سرہلا کے کہنے لگی۔

"کیوں؟"

"اب تو وہ اور غضب ناک ہو جائے گی یہ سب اور کچھ نہیں' اس کی جھلاہٹ' کھسیاہٹ یا غصہ۔۔۔ جو بھی کہہ

لوہ تھا۔ اسے پیار سے طریقے سے سمجھایا جاتا تو بات بن جاتی۔"

"ماشاء اللہ! کیا زبردست تبدیلی آئی ہے آپ کے خیالات و نظریات میں سبحان اللہ... پیار سے طریقے سے۔" عمیص طنزیہ انداز میں سر دھن کر اسے داد دینے لگا۔

"پہلے جب اس کی چڑچڑاہٹ قدرے بے ضرر اور چند مخصوص معاملات کے لیے تھی تب تم اس کی معمولی سی بات پہ بھی پنجے تیز کر لیتی تھیں اور یہ پیار سے سمجھانے والا مشورہ کبھی میں دے دیتا تو تمہارا نعرہ ہوتا تھا 'لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔' اب اس بھوت سے میں نبٹنا چاہتا ہوں تو تم مجھے لاتوں کی بجائے باتوں والا طریقہ علاج تجویز کر رہی ہو اور وہ بھی پیار بھری باتوں کا۔"

"پہلے کی بات اور تھی عمیص۔"

"یہی تو میں بکواس کر رہا ہوں کہ پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے وہ صرف میری ذات پہ طنز کرتی تھی، ہر کسی کی بلاوجہ تضحیک کر ڈالتی تھی لیکن اب بات بہت بڑھ چکی ہے۔ وہ ہماری زندگی میں زہر گھول رہی ہے، غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ چیز گھر کے ماحول پہ کتنا برا اثر ڈالے گی کیا تمہیں اس کا اندازہ ہے۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک تم بھی اس پہ عمل کرتی تھیں۔ اب میری بات کیوں بری لگ رہی ہے"

"تمہاری بات اور ہے میرا معاملہ الگ۔ ہمارا رشتہ ہی دوسرا ہے عمیص۔ ہم لڑ جھگڑ کے پھر ایک ہو جاتے ہیں لیکن تمہارا اتنا سخت رویہ وہ برداشت نہیں کر پائی ہوگی۔ پتا نہیں کیا گزر رہی ہوگی اس پہ۔"

صاحبزادی گل مہر نے کھڑکی سے انہیں دیکھا تھا اور یہ سوچ کر بڑے خطرناک تیور لیے کمرے سے نکلی تھی کہ عمیص کے سامنے موتیا کو کھری کھری سنائے گی۔ قریب آنے پہ اس نے موتیا کی بات سنی تو سر سے پیر تک سلگ اٹھی۔

"کس قدر دوغلا پن ہے اس میں، پہلے ہمارے بارے میں نجانے کیا کچھ کہہ کر اسے اکسایا، اب ہماری طرفداری کر کے اس کی نظروں میں اچھی بن رہی ہے۔ کیسی جھوٹی ہمدردی جتائی جا رہی ہے اور اس۔ کے باوجود اس عقل کے اندھے عمیص کو دیکھو، ہمیں مکار لومڑی کہہ رہا تھا۔ اس کی مکاریاں نہیں دیکھ رہا۔"

وہ وہیں رک کے ستون کی آڑ میں ان کی باتیں سننے لگی تاکہ عین موقع پہ انہیں آڑے ہاتھوں لے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ تک نہ سکیں۔

"تمہیں اب بھی اس کی فکر ہے؟" عمیص نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرے حوصلے کی داد نہیں دیتیں، جو زخمی شیرنی کو اس کو منہ پہ مکار لومڑی کہہ کر آیا ہوں، شاباشی دینے کی بجائے الٹا شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"بس کرو عمیص!" موتیا کو یہ سن کر ہنسی آنے کی بجائے تکلیف محسوس ہوئی... ناگوار سی تکلیف۔

"میں نے سوچا تھا تم اسے سمجھاؤ گے، احساس دلاؤ گے کہ وہ خود کو اکیلا مت سمجھے آج کل وہ جن حالات سے گزر رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اسے ہمدردی اور توجہ دی جائے نہ کہ مزید مشتعل کیا جائے۔ ٹھیک ہے کہ کل مجھے بھی غصہ آیا تھا، بہت غصہ آیا تھا مگر میں نے صرف اس سے چند حقائق بیان کیے تھے، اس کی دل پہ پیر نہیں رکھا تھا۔ اپنا غصہ دبا کے میں وہاں سے چلی گئی تھی کہ کہیں کچھ الٹا سیدھا نہ کہہ دوں، کچھ ایسا جس سے اس کے اندر کی تپش کھولن میں بدل جائے مگر تم... حیرت ہے تم نے اتنی سخت باتیں کیسے کہہ دیں۔"

"مجھ سے اس کی حرکت برداشت نہیں ہوئی تھی واقعی مجھے بھی حیرت ہے۔ میں بھی شاید کچھ زیادہ ہی... خیر جانے دو۔"

"ایک بات ایمانداری سے بتاؤ عمیص، کچھ عرصہ پہلے یعنی ہماری نسبت طے ہونے سے پہلے شہزاد ملک کے تمہارے اور گل کے درمیان آنے سے پہلے کیا اس وقت تم گل سے اس طرح پیش آنے کا سوچ سکتے تھے؟" اس نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا تھا۔

عمیص نے چند لمحے غور کیا جیسے سوچ رہا ہو اس سوال کا جواب دے یا ٹال جائے۔ ان کے پیچھے ذرا فاصلے پہ کھڑی گل بھی ہمہ تن گوش تھی۔

"اوکے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دینے پہ رضامندی ظاہر کی۔

"اگرچہ ہم یہ طے کر چکے تھے کہ اب اس دور کی کوئی بات زیر بحث نہیں آئے گی۔ پھر بھی تم پوچھ رہی ہو تو بتا دوں کہ شاید... نہیں یقیناً" میں ایسا کبھی نہیں کرتا۔"

"کیونکہ تب تم اس سے محبت کرتے تھے؟"

خود اذیتی کی حد سے گزرتے ہوئے موتیا نے یہ اگلا سوال کیا جس پہ عمیص کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"اس ذکر کو جانے دو موتیا۔" اس کے لہجے میں گمبھیر سنجیدگی تھی۔

"جانے دوں گی۔ لیکن اب ذکر چل ہی نکلا ہے تو جواب دے دو تم اس سے محبت کرتے تھے اس لیے اس وقت تم ایسا..."

"بس کرو موتیا۔ گل جو چاہتی تھی، وہ کر گزری اور اس کا نتیجہ میرے سامنے ہے۔ آج تم اس کی لگائی چنگاری کی وجہ سے یہ سوال مجھ سے کر رہی ہو اور ہماری دوستی اور محبت کو کثیف کر رہی ہو۔" وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

"سوری عمیص، تمہیں برا لگا مگر میرا یہ مقصد قطعاً نہیں تھا۔" موتیا نے اس کا ہاتھ تھام کے اسے بٹھانا چاہا۔ وہ روٹھا روٹھا دوبارہ بیٹھ گیا۔

"میں نہیں جانتی گل نے وہ سب کیا سوچ کر کہا مگر میں اس کے کہنے میں آکر اپنے اور تمہارے درمیان کوئی تلخی پیدا نہیں کرنا چاہ رہی صرف دوستانہ فضا میں ایک حقیقت تم پہ واضح کرنا چاہ رہی ہوں۔ تم نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا نا کہ میں اب بھی گل سے نرمی کیوں برتنا چاہ رہی ہوں، میں صرف اتنا ہی واضح کرنا چاہتی تھی۔ تم چاہ کے بھی اس سے درشت لہجے میں نہیں بول سکتے تھے، اس کی ہر نا روا بات بھی صبر کے ساتھ پی جاتے تھے، درد ہوتا تھا مگر گلہ نہیں کرتے تھے صرف اس لیے کہ تمہیں اس سے محبت تھی۔ اب نہیں رہی... یا یوں کہو کہ تمہاری محبت نے رستہ بدل کر اپنی درست منزل پالی ہے اب تم اس کی ہر بات پی جانے کے پابند نہیں۔ تمہیں کوئی مجبوری نہیں رہی اس کے ساتھ نرمی برتنے کی مگر عمیص میں اب بھی مجبور ہوں میں نے کہا ہے نا کہ تمہاری بات اور ہے میرا معاملہ الگ ہے۔ میں بہن ہوں اس کی میری محبت اپنا رستہ نہیں بدل سکتی۔"

اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

اور ستون کی اوٹ میں کھڑی گل مہر کے رخسار...

"میری اس کی محبت وقت کے ساتھ بدلنے والی نہیں ہے۔ مجھے اس پہ غصہ آتا ہے۔ ترس آتا ہے، جھلاہٹ ہوتی ہے اس کی حرکتوں پہ تنگ بھی آجاتی ہوں مگر عمیص ان میں سے کوئی بھی رویہ یا جذبہ اتنا دیرپا نہیں ہوتا کہ وہ میری اس سے محبت پہ حاوی ہو سکے۔"

گل مہر بے آواز واپس پلٹ گئی۔

اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کا ایک آنسو گر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں موتیا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"وہ میری بہن ہے۔ میری اور اس کی محبت اپنا رستہ نہیں بدل سکتی۔ کوئی بھی چیز میری اس سے محبت پہ حاوی نہیں ہو سکتی۔"

"اور ہم نے..." گل مہر نے اپنے کمرے کی تنہائی میں آکر خود سے سوال کیا۔

"ہم نے کیسے حاوی ہونے دیا ایک گھٹیا سے جذبے کو اس رشتے پہ... یہ جذبہ، جو ہر جذبے سے کم تر ہے اور جسے حسد کا جذبہ کہتے ہیں اسے ہم نے محبت جیسے اعلیٰ و ارفع جذبے پہ کیسے حاوی ہونے دیا۔ کتنے کمزور ہیں ہم۔"

وہ دیر تک اپنا محاسبہ کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

جھورا پہلوان اندرون شہر لاہور کا ایک مخصوص روایتی کردار تھا جو اب خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہنے کو وہ بدمعاش تھا "اڈے والا" مگر اس کی بدمعاشی کے طریقے بھی روایتی تھے اور اڈے کے اصول بھی "خاندانی" "اڈوں والے۔" پہلوانی کرتا بھی تھا اور سکھاتا بھی تھا' علاقے کی سب ماں بہنوں کو خود بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتا...... دوسروں کو بھی اس پر مجبور کرتا' جو کوئی ٹیڑھی حرکت کرتا نظر آتا' اس کی گردن جھورے کی مٹھی میں ہوتی۔ خاص طور پر لونڈوں لپاڑوں پہ اس کا بہت رعب تھا۔ محلے کے کسی بھی گھر کی چار دیواری کے اندر اس کی بدمعاشی نہیں چلتی تھی نہ ہی اس نے کبھی چلانے کی کوشش کی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس علاقے میں امن و امان کا مسئلہ قائم رکھنے کا بڑا سہرا اسی جھورا پہلوان کے سر جاتا تھا۔

پتا نہیں لوگ اسے بدمعاش کیوں کہتے تھے۔ بدمعاشوں والا کون سا کام کرتا تھا وہ...... بس یہی تھا نا کہ کسی کے کرائے دار نے مہینوں سے کرایہ ادا نہیں کیا تو وہ مدد کے لیے جھورے کو بلا لایا' جس کی ایک بڑھک پہ کرائے دار رقم مالک مکان کے حوالے کر جاتا۔

کسی کی بیٹی کو سسرال والے ناجائز طور پہ تنگ کر رہے ہوں' وہ ثالث کے طور پہ پنچایت میں جھورے کو لے گیا جس کی دہشت سے لڑکی والوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔

کسی کی بیوی بے کار کی ضد لگا کر میکے جا بیٹھے اور سالے مسکین بہنوئی کو تڑیاں لگا رہے ہوں' وہ جھورے کے پاس آتا اور جھورا سارے سالوں کی تڑی ایک منٹ میں نکال دیتا۔ وہ خود بہن کو اس کے گھر چھوڑ کے آتے۔

کسی کی بچی کو پڑوسی کے لڑکے نے چھیڑا ہے تو چھینٹی لگانے کے لیے جھورا حاضر۔

سارے رفاہ عامہ کے کام تھے' اچھے الفاظ میں اسے سوشل ورکر بھی کہا جا سکتا تھا مگر فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے اس سوشل ورک کا معاوضہ وصول کیا کرتا تھا۔

ایک اور فرق اس میں اور شہر کے دوسرے بدمعاشوں میں بھی تھا کہ وہ معاوضہ لے کر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے جبکہ جھورے کی کمائی کا یہ واحد ذریعہ ضرور تھا مگر اس نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی نہیں ہونے دی۔ ہمیشہ اس فریق کا ساتھ دیا جو حق پہ ہوتا اور مظلوم ہوتا۔

ماکھے گجر نے بھی ملک مقبول پہ شبہ ہونے پر اسی کی خدمات حاصل کیں۔

وہ بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ نہ صرف اس کا بلکہ اپنے دوسرے بندے کا بھی' جسے اس نے بابر کا اتا پتا ڈھونڈنے بھیجا تھا۔ جب اس سے احاطے کے اندر بچھی چارپائی پہ پہلو بدل بدل کر انتظار کرنا محال ہو گیا تو وہ اٹھ کے بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے خود جھورے کے اڈے جانے کا فیصلہ کیا۔

"آ بھئی ماکھیا۔"

جھورا اپنے ایک پٹھے سے اپنی پر گوشت پنڈلیوں کو سرسوں کا تیل پلوا رہا تھا۔

"میرے کام کا کیا بنا؟"

"آتے ہوں گے بندے چار بھیجے ہیں شہر کے ہر کونے میں۔ ابھی سارے ہسپتالوں کی چھانٹی کر کے آتے ہوں گے لو وہ فیقا تو آ گیا۔ آیا بھی جلدی۔ ہے اور لو تھا بھی اٹکا ہوا نہیں۔ ہے' اس کا مطلب ہے اچھی خبر لایا ہے۔"

"پتا چل گیا استاد مغل کی گھر والی کا۔"

"کدھر ہے کون سے ہسپتال؟" ماکھے نے بے تابی سے پوچھا۔ اس کے تصور میں بار بار چادر میں لپٹے چہرے کی ایک جھلک آ رہی تھی۔ وہ اس بچی کے لیے فکر مند تھا۔

"بہت وڈا ہسپتال ہے جی بہت وڈا۔ اسی لیے جاری پتا چل گیا۔ نورا' کریم اور گاموتو دھکے کھا رہے ہوں گے سرکاری ہسپتالوں میں رات تک خجل خوار ہوتے رہیں گے میں تو جی سیدھا وڈے وڈے مہنگے ہسپتالوں میں گیا۔ اودر خواری نہیں ہوتی۔ نرسوں کے پاس جاؤ' تمیز سے بات کرو' سارا کچھ بتا دیتی ہیں کدھر سے مریضوں کا پتا کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"اوئے مطلب دی گل کر۔" جھورے نے ڈپٹا۔

"آہو جی...... " وہ جو اپنی کارگزاری پہ داد کا منتظر تھا' اس ڈانٹ کے بعد سنبھل کے تفصیل بتانے لگا۔

"وہ جو بندہ ہوتا ہے نا جی جو سارے آنے جانے والوں کا حساب رکھتا ہے' اس نے اکو منٹ میں مجھے بتا دیا کہ دو گھنٹے پہلے کوئی ملک نام کا بندہ' اک بیمار زنانی کو داخل کرا کے گیا ہے۔ میں پتا کر کے اس طرف گیا جیسا ماکھے گجر نے بتایا تھا ویسی چادر میں اک ہولی (ہلکی) عمر کی کڑی بھی بیٹھی تھی اور ویسا ہی بندہ تھا' لعنتی سی شکل والا۔"

"تو میرے ساتھ چل۔" ماکھے نے اسے اشارہ کیا۔

"میری خدمت کی ضرورت؟" جھورے نے پیشکش کی۔

"میرا خیال ہے ابھی نہیں۔" ماکھے نے کچھ سوچ کر نفی میں جواب دیا۔

"ابھی تو خالی خولی شک ہے مجھے' فوج لے کر کیسے چلا جاؤں۔ ہو رے وہ سچی مچی مغل کا یار ہو اور علاج ہی کر دا رہا ہو اس کی عورت کا۔ پہلاں مجھے جا کر اصل گل پتا چلانے دے۔"

"اور اگر تیرا شک صحیح نکلا؟" جھورے نے اسے شش و پنج میں ڈال دیا۔

"میری مان' مجھے نہ سہی' میرے دو پٹھے ساتھ لے جا۔ ہسپتال کے گیٹ کے باہر کھڑے رہیں گے۔ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو سنبھال لیں گے ورنہ رب بھلی کرے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" ماکھا رضامند ہو گیا۔

"پہلے میں ڈیرے سے ہو آؤں۔ مختار کی گھر والی یا کسی اور زنانی کو ساتھ لے لیتے ہیں۔"

وہ کوٹھڑی پہنچا تو نئی خبر اس کی منتظر تھی۔

"بابر آ گیا۔"

مختار نے تیر کی طرح اسے اطلاع دی۔

بابر کا نام کبھی بھی اس کے لیے اتنا جاں افزا نہیں رہا تھا نہ ہی اس کا آنا کوئی خوشگوار بات تھی...... اس کے باوجود آج اس اطلاع پہ ماکھے کو اپنے اندر سکون اترتا محسوس ہوا۔

"کون لایا؟"

"آپ ہی آ گیا جی میں نے روکنا چاہا مگر سڑا ہوا بیٹھا تھا۔ منہ دو جھپا سے کر کے اوپر چڑھ گیا۔ میں پیچھے گیا تو کمرہ بند کر کے سو بھی گیا تھا۔"

"حرام خور...... گھر خالی دیکھ کے بھی فکر مند نہیں ہوا۔ بڑے پتھر توڑ کے مزدوریاں کر کے آیا ہے جو بستر پہ گرتے ہی سو گیا۔ میں خود جاتا ہوں اس کی نیندیں بھگانے۔" وہ برے برے تیور لیے اوپر چڑھنے لگا۔

"دروازہ کھول اوئے......"

ماکھے نے باہر کھڑے ہو کر للکارا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پاؤں سے زوردار ٹھوکر رسید کی۔ چٹخنی نہیں لگائی گئی تھی۔ خستہ حال لکڑی کا دروازہ ایک کریہہ آواز کے ساتھ کھل گیا۔

سامنے بستر پہ بابر ہمایوں مغل اوندھا گرا ہوا تھا۔ اس کے پیروں میں جوتے موجود تھے اور وہ گرد' دھول اور کیچڑ سے اٹے ہوئے تھے۔ اس کا لباس بھی خلاف معمول و خلاف عادت خاصا میلا کچیلا تھا۔

"بابر......!"

ماکھے گجر کو اس کی بے ہوش نیند پہ تاؤ آ گیا جو دروازہ کھلنے کی آواز پہ بھی نہیں ٹوٹی تھی اس لیے اس نے اس کے سر پہ کھڑے ہو کے باآواز بلند للکارا۔

بابر ہلکا سا کسمسایا کروٹ بدلنے کی کوشش کرنے میں اس کی سسکاری بھی نکل گئی۔ شاید نشہ نہ ملنے کی وجہ سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ماکھے نے آگے بڑھ کے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"کون ہے بد تمیز......؟" اس کی غنودگی سے بوجھل آواز ابھری۔

"ہوش کر بدبخت انسان۔" ماکھے نے اسے کالر سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور سیدھا کر کے چھوڑ دیا۔ اب وہ بستر پر چت پڑا پوری آنکھیں پھاڑ کے اسے تک رہا تھا۔ شاید ہوش و حواس کی دنیا میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر اس نے ایک جھرجھری لی۔۔۔ شاید اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔

کہنیوں کے بل وہ اٹھنے لگا۔ چہرے کے تاثرات سے جی بھر کے کوفت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔" لڑکھڑاتے ہوئے وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ماکھا گجر اپنے کرائے کی رقم کی وصولی کے لیے دندناتا ہوا اس کے سر پہ آ کھڑا ہوا ہے۔ وہ کچھ کچھ حیران بھی تھا کیونکہ اس سے قبل اس نے بابر کے تو کیا کسی کے بھی گھر کے اندر گھس کے ایسا مطالبہ کرنے کی جرات نہیں کی تھی۔ شاید آج ایسا اس لیے کر گزرا ہو کہ گھر خالی تھا۔ بابر، صاحبزادی یاسمین اور بچوں کی غیر موجودگی سے بھی پریشان نہ ہوا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ وہ اپنے میکے گئی ہو گی ویسے بھی طبیعت گری گری تھی، تھکاوٹ بھی بے حد محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آتے ہی بستر پہ گر کے بے سدھ ہو گیا تھا۔

"تم ہمیں مارو، پیٹو، کچھ بھی کر لو، کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ ہمارے پاس واقعی کچھ نہیں ہے۔"

"سچ کہہ رہا ہے تو تیرے پاس واقعی کچھ بھی نہیں ہے، کچھ بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسی غیر معمولی بات تھی کہ بابر کو چونکنا پڑا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس وقت تم سے زیادہ بدنصیب شخص اور کوئی نہیں، مصیبتیں تو سب پہ ٹوٹتی ہیں مگر تو وہ بدنصیب بندہ ہے مغل، جسے اپنے گھر کے لٹنے کی خبر تک نہیں ہے اور نہ ہی پروا کیا تو نے ایک دفعہ بھی گھر آنے کے بعد یہ نہیں سوچا کہ یہ گھر اتنا خالی خالی کیوں ہے؟"

"تمہیں کیا؟ تمہیں اس گھر کے کرائے سے مطلب ہونا چاہیے، اس گھر کے افراد کے کہیں آنے جانے میں دلچسپی لینا تمہارا کام نہیں۔"

بابر نے تیوریاں چڑھا کے اپنی ناگواری جتائی۔ اس کے حواس جیسے جیسے واپس لوٹ رہے تھے، اس کی رعونت اور اکڑ بھی سر اٹھا رہی تھی۔

"جب گھر کے راکھے (رکھوالے) یہ کام کرنا چھوڑ دیں تو مجبوراً باہر والوں کو خبر رکھنا پڑتی ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ تمہاری بیوی کہاں ہے اس وقت؟"

"خبردار۔۔۔ خبردار، ہماری بیگم کا نام مت لینا۔ تم ایسی بات کر کے ہمیں مشتعل کرنا چاہتے ہو۔ بہت خوب اب یہ کام ڈھونڈ لیا ہے تم نے گھروں میں آگ لگانے کا؟ ہمیں اپنی بیگم پہ مکمل اعتماد ہے، ہمارے دل میں وسوسہ پیدا کر کے بھڑکانے کی کوشش مت کرو۔"

"اور وہ تمہارا دوست جو اپنا نام ملک مقبول بتا رہا تھا، اس پہ کتنا اعتماد ہے؟"

اس نے یہ بے سروپا الزام نظرانداز کرتے ہوئے اگلا سوال کیا جسے سن کر بابر ایک لمحے کے لیے سن ہو گیا۔

"ملک مقبول؟" بہت دیر بعد اس کے لبوں سے یہ نام سرسراتا ہوا نکلا۔

"ہاں دوست ہے وہ تمہارا؟"

"تم کیسے جانتے ہو اسے؟ اور۔۔۔ اور کیا وہ یہاں آیا تھا؟ تم اس کا نام ہماری بیگم کے ساتھ لینے کی جرات کر رہے ہو؟"

بابر نے اس پہ تابڑتوڑ سوال کر ڈالے۔

"آرام سے مغل۔۔۔ آرام سے ماکھا اتنا بے غیرت نہیں۔ اس نے دنیا میں جھک نہیں ماری اتنے سال، بندے کی بھی پہچان ہے اور عورت ذات کی بھی۔ جس بندے پہ ایک گہری نظر ڈالوں اس کا اگلا پچھلا جان جاتا ہوں اور جو عورت نظر ہی نہ آئے، اس کے بارے میں بھی جان جاتا ہوں کہ کتنی "سچی" خالص ہو گی۔ تو میری

نظر میں کیا ہے، یہ جانے دے مگر تیری گھر والی کی صرف میری نظر میں ہی نہیں اس پوری کنٹری میں بڑی عزت ہے۔ میں اس بھلی اور شریف عورت کا نام کسی کے ساتھ نہیں لے رہا صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ کیا ملک مقبول واقعی تیرا دوست ہے؟ تیرا اعتباری دوست؟"

"ہاں۔ اور اعتباری دوست؟ ہونہہ۔۔۔ وہ نہ کسی کا دوست ہو سکتا ہے نہ اس پہ کسی کو اعتبار ہو سکتا ہے۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جب وہ ایسا ہی بے اعتبار ہے تو اسے اپنے گھر کا رستہ کیوں دکھا دیا کم عقلا۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ گھر میں تو رکھوالی کے لیے ہوتا بھی نہیں ہے۔"

ماکھے گجر نے تاسف سے سر ہلایا۔

بابر ہمایوں مغل کے ذہن میں اندیشے سرسرانے لگے۔

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ صاف بات کرو ہم سے۔ ہم نے کبھی ملک کو گھر تک نہیں آنے دیا۔ اس سے ہمارا جو بھی تعلق ہے وہ باہر کی حد تک ہے۔"

"وہ آیا تھا یہاں۔۔۔ اور تمہاری بیوی کو بے ہوشی کی حالت میں لے کر چلا گیا۔"

"چلا گیا؟۔۔۔ لے کر چلا گیا؟ کیا۔ طلب؟ اور بے ہوشی؟ کیا ہوا تھا انہیں؟" وہ حقیقتاً ہکا بکا ہو گیا۔

"تمہیں پتا ہونا چاہیے، مجھے کیا خبر کیا ہوا تھا۔ اتنا پتا چلا کہ طبیعت خراب ہے۔ میں نے اور آس پاس کے چند لوگوں نے دخل دینے کی کوشش کی مگر وہ تمہاری اور اپنی دوستی کی دھونس دے کر چلا گیا اور ساتھ میں تمہاری بیٹی بھی تھی۔"

یہ سنتے ہی بابر کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

✡ ✡ ✡

نیاز کھوکھر کے اشارہ کرنے پہ وہ نامحسوس انداز میں دلکش کے پاس سے اٹھ گئی۔ ویسے بھی وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

"ہاں، کیا بات ہے پھوٹو۔۔۔"

"بڑی مدبر معتبر قسم کی خالہ جان بنی ہوئی ہو۔ ایمان سے نگاہ بائی، تمہارا یہ روپ بھی بڑا قاتل ہے۔ تم تو ہر انداز میں جچتی ہو یہ ڈھیلا ڈھالا سادہ سا جوڑا بڑی سی چادر بغیر میک اپ اور زیور کے تم بالکل خالہ جان یا چچی جان ٹائپ چیز لگ رہی ہو اور پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ نیاز کھوکھر کا دل کسی خالہ، ماسی یا چچی پھوپھی جیسی چیز کو دیکھ کے بھی مچل رہا ہے۔"

"تم نے یہ بکواس کرنے کے لیے مجھے ادھر بلایا ہے۔ چند منٹ سے زیادہ منہ بند کر کے رکھنا مشکل لگ رہا ہو گا۔"

نگاہ نے دانت کچکچا کے اسے دیکھا۔ وہ بڑی خباثت کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔

"نہیں خیر، بلایا تو کسی اور بات کے لیے ہے۔ وہ تو تمہیں دیکھ کے ایک خیال آیا، سو کہہ ڈالا۔ کہنے پہ کون سے پیسے لگتے ہیں۔"

"اور تمہیں ہر وہ کام کرنا ہے جس پہ پیسے نہ لگتے ہوں۔"

وہ ایک اور طنز کر کے واپس مڑنے لگی۔

"ایک منٹ نگاہ بائی۔۔۔؟"

"تم نے پھر مجھے بائی کہا۔" وہ پھنکاری۔

"کتنی بار منع کیا ہے مجھے بائی مت کہا کرو۔ میں کوٹھے کی پیداوار نہیں سمجھے۔"

"چلو، بیگم کہہ لیتا ہوں، زوجہ محترمہ یا بھلئے لوکے کہہ لیتا ہوں۔ اس وقت تو اس ڈرامے میں تمہارا یہی کردار

ہے اور میں نے اصل میں یہی بات کرنی تھی تم سے ویسے تو تمہارے ساتھ اس میٹھی تکرار کا مزہ ہی اور ہے مگر پھر کبھی سہی فی الحال کام کی بات اور وہ یہ ہے کہ ڈرامے کا اگلا ایکٹ شروع کرو تاکہ جلدی جلدی کلائمکس ہو۔ اسے ساتھ لے کر نکلو۔ ابھی اس کا کوئی سگا آ گیا تو بنا بنایا کھیل خراب ہو جائے گا۔"

"مہانے سے کئی بار کہا ہے کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے کچھ کھا پی لو وغیرہ وغیرہ۔۔۔ مگر سن ہی نہیں رہی۔ ڈائریکٹ اپنے ساتھ لے جانے کی تکرار کی تو شک میں بھی پڑ سکتی ہے۔ عمر کم ہے اور تجربہ بھی مگر سمجھ دار بہت ہے سیانی ماں کی اولاد ہے۔"

"ماں ہی سیانی ہوگی باپ تو۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"میں کوئی ترکیب لڑاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

نگاہ واپس آئی تو دلکش کو اپنی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے پایا۔ اس کی نگاہوں میں کوئی ایسا احساس تھا کہ وہ گڑبڑا اٹھی۔

"تمہاری امی حضور کو کب ہوش آئے گا؟"

بالآخر اس نے خود سوال کیا۔

"جانے مجھ کا فکر مت کرو۔ ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ اتنی جلدی ہوش میں آنا ان کے لیے اچھا نہیں۔ یہ بے ہوشی غنیمت ہے۔"

اس نے بات بنائی ورنہ یاسمین یہاں آنے کے کچھ دیر بعد ہی ہوش میں آ چکی تھی۔ اسے صرف دمے کا اٹیک ہوا تھا اور اگرچہ یہ دورہ شدید نوعیت کا تھا مگر بے ہوشی کمزوری اور بھوک کی وجہ سے تھی۔ چند انجکشن اور ڈرپ لگنے کے بعد اسے خاصا افاقہ ہو گیا تھا اور اسے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ یہی جانتی تھی کہ بابر کے کسی جاننے والے نے اسے یہاں داخل کرایا ہے۔ اسے یہ خبر بالکل نہ تھی کہ اسی ہسپتال میں اس سے ذرا ہی دور اس کی معصوم بچی بھی موجود ہے۔ وہ تو اپنے بستر پہ چپ چاپ پڑی اس انجان فرشتے کو دعائیں دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ دل ہی دل میں فکر مند ہوتی بابر، عمیص یا اپنے چچا حضور میں سے کسی کی آمد کی منتظر بھی تھی۔ یہ انتظار جتنا طویل ہوتا جا رہا تھا اس کی تشویش اتنی ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

"ایک اچھی خبر ہے۔ بی بی ہوش میں آ گئی ہیں۔"

نیاز کھوکھر نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاس آتے ہوئے خوشی سے بتایا۔

دلکش فوراً کھڑی ہو گئی۔ شدت جذبات سے اس کے آنسو بہہ نکلے اور نازک کلی سے گلابی لب پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ شاید وہ خاموشی کی زبان سے اپنے پروردگار کا شکرانہ ادا کر رہی تھی۔

"ہم۔۔۔ ہم ابھی ان سے ملنا چاہیں گے۔"

"آپ ہمیں ان کے پاس لے چلیں۔" وہ نگاہ کا ہاتھ تھام کے التجا کرنے لگی تو وہ اس الجھن سے اپنا ذہن ہٹا کر اس کا شانہ تھپکنے لگی۔

"نہیں ابھی تو وہ آئی سی یو میں ہیں اور وہاں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ ایک گھنٹے تک انہیں کمرے میں منتقل کر دیں گے اور کچھ ہلکی پھلکی غذا بھی کھانے کو دیں گے۔ تم ایسا کرو، جلدی سے جا کر کوئی دلیہ، یخنی اور چائے وغیرہ لے آؤ۔ کوئی اپنا دھلا ہوا جوڑا بھی لے آنا بی بی کے واسطے ان کے گھر سے تو اب تک کوئی آیا نہیں۔ میں ذرا یہ دوائیں لے کر آتا ہوں۔ تم جلدی جاؤ اور جلدی واپس آؤ۔"

وہ دوبارہ کسی جانب نکل گیا۔

"اب کیا کروں۔" نگاہ نے فکر مندی چہرے پہ سجا کے دلکش کو دیکھا۔

"ویسے تو میرا گھر ادھر سے نزدیک ہی ہے۔ رکشے پہ آنے جانے میں پندرہ منٹ لگیں گے اور دلیہ اور چائے بنانے میں بھی بھلا کتنا وقت لگتا ہے پھر بھی آدھے گھنٹے سے اوپر لگ جائے گا۔ تمہیں کیسے ادھر اکیلا چھوڑ دوں۔

اس کے حسب توقع دلکش کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ میرے ساتھ ہی چلی آؤ۔ میرے گھر میں ہم دونوں میاں بیوی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا گھبراؤ مت بس یہ گئے اور یہ واپس آئے۔"

"مگر ہم۔" وہ متذبذب تھی۔ اس نے اب تک اپنے گھر اور نانا کے گھر کے علاوہ کسی اور کے گھر میں جھانک کے بھی نہ دیکھا تھا۔

"تمہیں یہاں چھوڑ نہ دوں۔ نیاز یعنی میرا بندہ ابھی دس بارہ منٹ تک دوا لے کر آ جائے گا مگر سچی بات ہے مجھے آج کل کے زمانے کا اعتبار نہیں، اپنے خاوند کا بھی نہیں۔ طرح طرح کے مسٹنڈے ادھر سے گزر رہے ہیں، سارے ہی تمہیں گھورتے ہوئے۔ کس دل سے تمہیں اکیلا چھوڑ کے جاؤں۔"

اس کے احساس دلانے پہ وہ گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ ہاسپٹل کی چار دیواری کے اندر نہیں کسی پر ہیبت ویران جنگل میں تنہا کھڑی ہے۔

آس پاس سے ہلکی نیلی وردی میں ملبوس وارڈ بوائز اور سفید اوور آل میں ڈاکٹر نہیں گزر رہے بلکہ کوئی خونخوار درندے ٹہل رہے ہیں۔

وہ سراسیمگی سے پہلے ہی اچھی طرح اوڑھی چادر اور بھی کس کے لپیٹنے لگی۔

"تم بھولی بھی تو بہت ہو۔ دنیا کا کوئی پتا ہی نہیں۔ ایسے جیسے پہلی بار آنکھ کھولی ہے۔"

یہ بات نگاہ نے صحیح کی تھی۔

"چلو تم میرے ساتھ۔ نہ بابا نہ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔"

اس بار وہ مشورہ نہیں کر رہی تھی، نہ پوچھ رہی تھی بلکہ اپنا فیصلہ سنا رہی تھی اور دلکش نے اس فیصلے پہ چپ چاپ سر تسلیم خم کر دیا۔

وہ اسے کہنی سے تھام کے اپنے ساتھ لے جانے لگی۔

ہسپتال کی وسیع و عریض پارکنگ سے باہر نکلتے ہی اسے نیاز کھوکھر پھر مل گیا۔

"لو، رکشا آ گیا ہے، ایڈریس میں نے سمجھا دیا ہے۔ جلدی کرو۔" نگاہ نے ایک نظر اسے دیکھا، ایک نظر رکشے کو پھر کچھ سوچ کر دلکش کا بازو چھوڑا۔

"ذرا ایک منٹ، میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ نیاز کھوکھر کو ایک طرف کونے میں لے گئی۔

دلکش کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ اتنے ہجوم میں بالکل تنہا کھڑی تھی۔ سامنے سڑک پہ ٹریفک بہہ رہی تھی۔ آس پاس بہت سے لوگ گاڑیاں پارک کر رہے تھے یا نکال لے جا رہے تھے۔۔۔ کچھ ہسپتال کے اندر کی جانب لپک رہے تھے، کچھ باہر آ رہے تھے۔ کسی کی توجہ بھی اس چھوٹی سی لڑکی کی جانب نہیں تھی لیکن اسے لگ رہا تھا ہر کوئی اسے ہی گھور رہا ہے۔ اسے اپنے بدن پہ چھید ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

یہ چادر اسے اپنے وجود کی نگہبانی کے لیے ناکافی محسوس ہو رہی تھی۔

"اب کیا ہے نگاہ بائی، دل نہیں لگ رہا میرے ساتھ تو تو میں میں کیے بغیر؟"

وہ مسکرا رہا تھا۔ وہی خبیث، ذلیل اور مکروہ سی مسکراہٹ۔

"یہ تو بتاؤ اسے چھوڑنا کہاں ہے، ملک مقبول کے اڈے یا تمہارے ڈیرے؟"

"جہاں یہ رکشے والا لے جائے۔" وہ اسے کلسانے کو پھر مسکرایا۔

"خوامخواہ؟" اس نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

"وہ چاہے جہنم میں لے جائے؟"

"بری بات اپنے گھر کو جہنم نہیں کہتے۔"

"ہاں بھئی' ملک صاحب کے آرڈر ہیں۔ گھبراؤ نہیں' کوئی عمر بھر کا بوجھ نہیں ڈھونا۔ یہی کوئی دو تین دن کی بات ہے۔"

"ایسا کوئی ذکر تم نے پہلے نہیں کیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ پکڑو اپنے دس ہزار' دس ہزار روپلی کے لیے کوئی ایسا رسک نہیں لے سکتا۔"

"کیسا رسک؟ ذرا سی چھوکری ہے' کوئی ہیروئن یا کوکین کی تھیلی نہیں جو اپنے مکان میں رکھنے سے گھبرا رہی ہو۔"

"یہ ذرا سی چھوکری نہیں ہے' یہ کسی ہیروئن کی پڑیا سے کم نہیں کھوکھر۔ اغوا کا معاملہ ہے اور وہ بھی نابالغ لڑکی کا' پتا نہیں اس کے والی وارث کون ہیں کہیں چھلانہ پڑوا دینا۔ بڑی مشکل سے سر چھپا کے بیٹھی ہوں۔ اس سال میں یہ آٹھواں ٹھکانہ ہے۔ اب ادھر سے بھی بے دخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں نہیں رکھنے والی اسے۔"

اس نے صاف انکار کر دیا۔

"مان جاؤ' بائی' فائدے میں رہو گی۔ بات صرف دس ہزار کی نہیں یہ تو ایڈوانس ہے اور وہ بھی صرف اس ڈرامے کا جو تم نے ابھی اس لڑکی کے سامنے کیا ہے۔ اسے اپنے گھر میں دو دن رکھنے کا معاوضہ الگ ہو گا اور وہ تمہاری امید سے زیادہ ہو گا۔ باقی چھاپے وغیرہ کی فکر تم مت کرو۔ کوئی اتنے بھی پہنچ والوں کی لڑکی نہیں ہے۔ بابر مغل کی لونڈیا ہے' جسے اپنی خبر نہیں ہوتی وہ کیا تیر مار لے گا۔"

"مغل صاحب کی؟" نگاہ حیرت زدہ ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر مڑ کے اس لڑکی کو دیکھنے پہ مجبور ہو گئی۔ اب اسے یاد آیا اس کا لب و لہجہ کس کی یاد دلا تا تھا۔

"مگر ملک نے مغل کی پیٹھ میں وار کیوں کیا؟"

"وہی لین دین کا معاملہ۔۔۔ کوئی اغوا وغیرہ نہیں ہے یہ۔ ایسا ہوتا تو ملک صاحب تمہارے پاس کیوں رکھواتے اسے۔ اب تک دبئی بھجوا چکے ہوتے دراصل مغل نے بڑا زبردست فراڈ کیا ہے۔ وہ ملک صاحب کی رقم شرافت سے واپس کر جائے اس لیے ملک صاحب نے اسے تڑی لگانے کے لیے یہ کھیل کھیلا ہے۔ تمہارے پاس اس لیے بچی چھوڑ رہے ہیں تاکہ یہ محفوظ رہے۔"

"تمہاری اس بات پہ تو میں یقین کر لوں مگر یہ یقین نہیں ہے کہ بابر اس دھمکی میں آئے گا یا نہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ پیسہ لے کر فرار ہو جانا زیادہ بہتر سمجھے؟"

"آئے گا کیسے نہیں' باپ ہے لڑکی کا۔"

"ایسے بڑے باپ دیکھے ہیں۔" وہ زہریلے انداز میں ہنس پڑی۔

اسے اپنا باپ یاد آ گیا تھا۔

جھورے پہلوان کے جس آدمی نے ہسپتال کی خبر دی تھی' اسی کے ساتھ ماکھا گجر اور بابر ہمایوں مغل یہاں پہنچے۔

"جی ہاں' اس نام کی خاتون آج ہی ایڈمٹ ہوئی تھیں۔ روم نمبر الیون میں لیکن ابھی کچھ دیر قبل ان کا ڈسچارج آرڈر آ گیا ہے اور جو صاحب انہیں ایڈمٹ کروا کے گئے تھے ان کا کافی دیر سے کچھ پتا نہیں۔ جو نمبر انہوں نے لکھوایا تھا' اس پہ بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔"

انکوائری کاؤنٹر سے جو اطلاع ملی اس نے بابر کے رہے سہے حواس بھی چھین لیے۔

اس کی کانپتی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

● ● ●

"لے گیا۔۔۔ وہ لے گیا۔"

بابر ہمایوں کے کانپتے ہونٹوں سے سسکاری کی مانند یہ فقرہ نکلا۔ ماکھے گجر نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی مگر وہ کسی بے جان چیز کی طرح لہرا کر نیچے آ رہا تھا۔

"ہوش کر جوان ہمت پکڑ۔"

ماکھے نے نیچے پکے فرش پہ ٹانگیں' بازو پھیلا کے سکتے کی حالت میں بیٹھے بابر کا شانہ تھپتھپا کے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ لے گیا ہماری صاحب زادی کو' ملک مقبول انہیں لے گیا ہم کیا ہمت پکڑیں اور کیا ہوش کریں۔ اب کیا ہوش کریں گے ہم۔"

وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ یقیناً" وہ اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ ماکھے گجر نے اسے بری طرح جھنجھوڑا۔

"یہ وقت زنانیوں کی طرح زمین پہ بیٹھ کے سیاپے ڈالنے کا نہیں ہے اٹھ اور چل میرے ساتھ اپنے اس بے غیرت یار کے پاس۔ تیری دھی میری دھی جھورے پہلوان کی دھی ہم سب کی دھی' غریب کی عزت سانجھی ہوتی ہے مغل۔ ہمت پکڑ ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔"

بابر نے خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھنا چاہا۔ اس کی آنکھوں میں اب تک امید کی رمق نہ جاگی تھی۔

"ایسا کرو' پہلے بھابی کا پتا کرتے ہیں۔ دیکھو تو سہی ان کی حالت کیسی ہے اور انہیں اپنی بچی کے بارے میں کچھ علم ہے یا نہیں۔" اس بات پہ بابر نے اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ وہ جھرجھری لے کر چونک گیا۔

"نہیں ان کو مت بتایئے ہم جانتے ہیں انہیں اس قیامت کی خبر نہیں ہو گی ورنہ کیسی بھی حالت ہو وہ اس وقت بستر پہ آرام نہ کر رہی ہوتیں۔ وہ بے خبر ہیں۔ انہیں بے خبر رہنے دو انہیں بے خبر ہی رہنا چاہیے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ایک نظر دیکھ تو آؤ' حالت کیسی ہے اب؟"

"کس منہ سے جائیں۔ ہم ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اگر انہوں نے بچوں کے بارے میں کچھ پوچھ لیا تو؟"

"تو کیا؟۔۔۔ بہانہ بنا دینا کوئی جھوٹ بول دینا۔ کون سا نئی بات ہے تمہارے لیے۔"

ماکھے کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کی آمیزش ہو گئی۔ بعد میں اسے احساس ہوا تو وہ دل ہی دل میں ذرا شرمندہ سا بھی ہوا کہ یہ نہ تو موقع تھا' نہ ہی بابر کی حالت ایسی تھی کہ اسے طعنوں کی مار ماری جاتی۔ وہ شخص جو ہر کسی کی لعنت ملامت کا حقدار تھا' اس وقت قابل رحم حالت میں لٹا پٹا اس کے سامنے تھا۔

"یہ جھوٹ نہیں بولا جائے گا ہم سے۔" بابر نے اس کا طعنہ خاموشی سے پی لیا تھا۔

"تو یوں منہ چھپا کے بیٹھنے سے کیا ہو گا۔ بھابی کا سامنا کرنے کی ہمت کرو اور ایسا تب ہی ہو گا مغل جب تو اپنی دھی کو صحیح سلامت واپس لے کر آئے گا۔ سوچ کیا رہا ہے؟ دیر مت کر جھورے کے پٹھے میرے ساتھ ہیں۔ وہ پٹخنیاں دیں گے شیرے ملک کو' حرام خور کا دم نکل جائے گا۔"

ماکھے کی اس بات پر بابر ہمایوں مغل کے زرد پپڑی زدہ لبوں پہ ایک موہوم سی تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم ملک کو کیا سمجھ رہے ہو۔ کیا وہ جھورے جیسے گلی محلے کے بدمعاش کے ان ٹکے ٹکے کے شاگردوں کے ہتھے چڑھ جائے گا؟ وہ اتنی ہی آسانی سے اس کے ساتھ اٹھا پٹخ کر لیں گے؟ دس مسلح باڈی گارڈ کھڑے ہوتے ہیں اس مردود کے دفتر کے باہر۔ اور اب تک تو وہ پتا نہیں کہاں اپنی منحوس شکل لے کر رفوچکر ہو چکا ہو گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس کا دل ایک بار پھر ڈوبنے لگا۔ اپنی معصوم بیٹی کی پاکیزہ صورت اس کے ذہن کے پردے پہ لہرائی تھی۔

وہ اپنی جلتی ہوئی آنکھیں مسل کر فیصلہ کن انداز میں باہر کی جانب پلٹا۔

"ہم جانتے ہیں وہ کہاں ہو گا۔"

"ٹھہرو مغل' اکیلے مت جاؤ۔ ہم چلتے ہیں تمہارے ساتھ۔" ماکھے نے اس کا بازو تھام کے روکا۔

"تیرے یار بیلی نہ سہی ہمسائے تو ہیں اور ہمسائے کا بڑا حق ہوتا ہے۔"

اس کے اس سیاہ چہرے پہ طمع سے بھری مکروہ مسکراہٹ کی بجائے خلوص ہی خلوص تھا وہ اس وقت ایک سود خور کی بجائے بابر کا سچا ہمدرد اور خیر خواہ لگ رہا تھا۔ بابر لامحالہ اس کی محبت سے متاثر ہوا مگر ساتھ لے جانے سے

نرمی کے ساتھ انکار کر دیا۔

"وہ بدک جائے گا۔ ہم اس مردود کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ اسے اللہ کا ڈر نہیں' ہمارا کیا ہو گا۔ ہمیں پتا ہے وہ آسانی سے یہ مانے گا ہی نہیں۔ تم لوگ ساتھ ہو گے تو معاملہ الٹ بھی سکتا ہے۔ ہمیں اپنے طریقے سے بات کرنے دو۔"

"پتا ہے تمہارا طریقہ کوئی سودے بازی کرو گے؟" ماکھے نے تیوری چڑھا کے پوچھا۔

"مجھے تو پہلے ہی شک ہے تمہاری کاکی تمہارے ہی کسی کرتوتوں کی بھینٹ چڑھی ہے۔ یا تو تم اس کا مال دبا کے بیٹھ گئے' یا کوئی فراڈ کیا ہے یا پھر وہ کوئی بڑا کام کروانا چاہتا ہے تم سے اور اب تم بے غیرتوں کی طرح اس سے سودے بازی کرنے جاؤ گے۔ بیٹی کے معاملے میں یوں من من کر کے بات کرتے تمہیں حیا نہیں آئے گی۔ پیٹ چیر کے رکھ دے کتے کا۔ شہ رگ ادھیڑ دے۔ کوئی مردوں والا کام کر یا پھر تیرے اندر مغلوں کا خون دوڑ رہا ہے۔"

ماکھے نے اس کے اندر غیرت و حمیت جگانے کی کوشش کی۔ وہ اب اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہسپتال سے باہر نکل رہا تھا۔

"خون۔" اس کے قدم ثانیے بھر کو تھم سے گئے۔ اس نے اپنا ڈولتا ہوا بھاری ہوتا سر تھاما...... جو شدت سے اس وقت نشے کا طلب گار ہو رہا تھا۔ اس نازک وقت میں بھی۔

"خون نہیں ہماری رگوں میں تو شراب دوڑ رہی ہے۔" وہ بڑبڑایا اور اپنے من من بھر کے قدم ایک بار پھر آگے بڑھا دیے۔ نزدیک سے گزرتے رکشے کو اس نے ہاتھ دیا تو ماکھے نے ایک بار اسے روکنا چاہا۔

"ضد نہ کر مغل' یہ تیرے بس کی بات نہیں۔"

"ضد تم کر رہے ہو ماکھے ہم نہیں۔ ہمیں تمہارے خلوص پہ شبہ نہیں لیکن تم کتنے بھی بڑے سورما ہو۔ چھورا کتنا ہی بڑا بدمعاش ہو' تم لوگ ملک مقبول جیسے بے غیرت نہیں ہو اس لیے نہیں جانتے کہ کسی بے غیرت سے کیسے نبٹتا ہے۔ ایک بے غیرت کو دوسرا بے غیرت ہی صحیح پرکھ سکتا ہے۔ یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ ہمیں اپنی بے قصور بچی کو اپنے گناہوں کی بھینٹ چڑھنے سے کیسے بچانا ہے۔"

وہ لپک کے رکشے میں سوار ہو گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پہ ایسے تاثرات تھے کہ ماکھا گجر جو اس کے منع کرنے کے باوجود زبردستی اس کے ساتھ رکشے میں سوار ہونے کا ارادہ رکھتا تھا' وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"آؤ گھبراؤ نہیں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

نگاہ نے پچکارتے ہوئے دلکش سے کہا جو اس کے تنگ و تاریک فلیٹ میں داخل ہوتے ہی جھجک کے رک گئی تھی۔ اب اس کا اگلا قدم اٹھنے سے انکاری تھا۔

اس کی جھجک کی وجہ اس فلیٹ کی بوسیدگی یا قدرے بے سروسامانی کی کیفیت نہیں تھی۔ وہ کون سا محلوں میں رہنے کی عادی تھی۔ اس کا ایک کمرے اور مختصر سے برآمدے والا گھر اس فلیٹ سے بھی آدھے رقبے پہ تھا۔ ہاں مگر وہ گھر تو تھا اس کے ایک کمرے کے چپے چپے سے آبادی کا اظہار ہوتا تھا جبکہ ایسا کوئی احساس اسے اس دو ڈبہ نما کمروں سیلن زدہ چھوٹے سے گندے کچن اور برآمدے والے فلیٹ سے نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اندر داخل تو ہو گئی تھی مگر اب رک رک کر گھبرائی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ مستطیل نما برآمدہ تھا' جس کے ایک کونے میں کچن تھا جس میں ابھی ابھی نگاہ گھسی تھی اور کھٹر پٹر کرتی نظر آ رہی تھی۔ سامنے دونوں کمروں کے دروازے کھلے تھے اور اپنی مکمل حالت کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔

ایک کمرے میں زمین پہ بچھا قالین...... یا دری اپنی خستگی کا حال سنا رہا تھا' پرانے سے صوفے کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی مگر جو چیز دلکش کو متوحش کر رہی تھی وہ اس کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے لگی تصویر تھی سستی سی پینٹنگ۔

جس میں ایک نیم عریاں رقاصہ' چند انسانی ہڈیوں پہ رقص کے سے انداز میں بیٹھی تھی اس کے عریاں شانے پہ ایک کھوپڑی بھی دھری تھی اور ناخنوں سے خون رس رہا تھا۔

ایک تو یہ وحشی انداز...... اس پہ یہ عریانی وہ نظریں چرانے پہ مجبور ہوئی۔

اور یہ چور نظریں دوسرے کھلے دروازے پہ بے ارادہ ہی جا پڑیں۔ شاید یہ بیڈ روم تھا...... میلی کثیف سی چادر سنگل بیڈ سے جھول کر نیچے آ رہی تھی تکیے بے ترتیب تھے اور بستر پہ ایک زنانہ شب خوابی کا لباس بھی دھرا نظر آ رہا تھا۔

زمین پہ بھی چند جوڑے کپڑے' جوتے وغیرہ بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے اور بھی ایک سے ایک چمکیلے بھڑکیلے۔ سنگھار میز پہ آرائش حسن کی اشیا کا ایک ڈھیر لگا تھا اور دیوار پہ لگی تصویر۔ یہ تصویر نگاہ کی ہی تھی مگر دلکش کو ذرا غور سے دیکھنے پہ پتا چلا وہ اچنبھے میں پڑ گئی۔

کہاں یہ چادر کی بکل میں سادہ چہرے اور گھریلو حلیے والی عام سی عورت اور کہاں تصویر میں لشکارے مارتے حسن کی مالک یہ حسینہ جس کے بال بال میں موتی پروئے ہوئے تھے اور جو کسی ماہر مشاطہ کے فن کا نچوڑ پیش کر رہی تھی۔ جس کے ابرو کی جنبش تصویر میں بھی متحرک نظر آ رہی تھی۔

دلکش اس تصویر کے حسن سے مرعوب ہو گئی۔ اس کے کم عمر اور ناپختہ ذہن میں کہیں اس تضاد نے کوئی سوال نہ اٹھایا۔

"اب تک کھڑی ہو بیٹھو نا۔" نگاہ بالآخر کچن سے برآمد ہو ہی گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی ٹرے تھی جس میں دو گلاس شربت سے بھرے تھے۔

"لو تم یہ پیو میں جلدی سے دلیہ تیار کرتی ہوں۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ ہم بھی آپ کے ساتھ مدد کرتے ہیں۔"

"تکلف کی کون سی بات ہے۔ موسم بھی تو اتنا گرم ہو رہا ہے اور تم ذرا شکل دیکھو اپنی بارہ بج رہے ہیں۔ یہ پی کر ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ گھڑی بھر کو کمر ٹکانا چاہو تو اندر بستر پہ چلی جاؤ۔"

دلکش اس پیشکش پہ سلیقے سے انکار کرنا چاہتی تھی کہ نگاہ نے خود ہاتھوں سے گلاس تھام کے اس کے لب سے لگا دیا۔

"بھئی تم تو بہت تکلف کر رہی ہو۔" اس کے یوں جھکنے پہ انتہائی کھلا گریبان دلکش کو نظر چرانے پہ مجبور کر گیا۔

وہ چپ چاپ شربت پینے لگی۔ نگاہ اٹھ کے دوبارہ کچن تک گئی۔

چادر وہ آتے ہی اتار کے ایک جانب پھینک چکی تھی جس نے اس کی مخصوص چال اور چٹک مٹک کا کافی حد تک پردہ رکھا ہوا تھا۔ اب دلکش کو اس کے فٹنگ والے لباس میں قید بدن کی بے باک حرکتیں اور ہر اٹھتے قدم کے ساتھ بل کھاتے ناز و ادا حیرت میں ڈال رہے تھے۔ اسے وہ بہت الگ سی لگ رہی تھی۔

اپنے گرد و پیش کی ان تمام عورتوں سے الگ' جن کو وہ جانتی تھی۔ بالکل اس گھر کی طرح جو ان باقی سب گھروں سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جو اس نے اپنی اب تک زندگی میں دیکھ رکھے تھے۔

"آپ کے بچے؟"

چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے مبہم سا سوال کیا۔ وہ برآمدے میں رکھی کرسی پہ بیٹھی تھی اور نگاہ کچن میں اس کی جانب پیٹھ موڑے کچھ کر رہی تھی مگر دونوں کا درمیانی فاصلہ چند قدم سے زیادہ نہیں تھا اس لیے نہایت مدھم آواز میں کیا اس کا سوال با آسانی نگاہ تک پہنچ گیا۔

اور اس عام سے ادھورے' بظاہر بے ضرر سے سوال نے نجانے نگاہ پہ کیسا اثر کیا کہ اس کے متحرک ہاتھ تھم گئے۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کے اس چھوٹی سی لڑکی کی جانب دیکھا جو اپنے پاکیزہ' مقدس وجود کے ساتھ اس کے متعفن گھر میں بیٹھی بہت اوپری' بہت اجنبی سی لگ رہی تھی جیسے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق۔

"کیا کہا تم نے؟"

شاید پہلی بار کسی نے اس سے یہ سوال کیا تھا اس لیے جواب دینا یا نہ دینا تو بعد کی بات تھی' پہلے وہ اس سوال کو ایک بار پھر سننے کی چاہ کرنے لگی۔

ننھے منے ہاتھ اسے اپنے وجود پہ دستک دیتے محسوس ہوئے۔ ایسے ننھے منے ہاتھ جو مٹی میں لتھڑے تھے۔ قبر کی مٹی میں۔

"ہم نے آپ کے بچوں کے بارے میں پوچھا ہے؟"

دلکش نے اس بار ذرا بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ وہ سمجھی کہ شاید اس کی آواز اس تک نہیں پہنچی۔

"وہ کہیں گئے ہوئے ہیں؟"

نگاہ کا گلا رندھ گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے پہ اکتفا کیا اور منہ پھیر لیا۔

"اندر چلی جاؤ باتھ روم کا دروازہ اس طرف ہے۔ اس کمرے کے اندر سے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے مڑ کے دیکھا۔ گلاس خالی ہو چکا تھا۔ اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا اور اسے باتھ روم جانے کی ہدایت کی۔

دلکش خاموشی سے اٹھ کے اندر چلی گئی۔

اندر جاتے ہوئے اسے اپنے قدم معمول سے بھاری محسوس ہوئے۔ چند قدم کا فاصلہ اسے خاصا طویل لگا۔

"لگتا ہے ہمارا ذہن واقعی تھکن کا شکار ہے۔"

اس نے کمرے میں آ کر ملحقہ باتھ روم کے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے سر جھٹک کے اس بھاری پن کو دور کرنے کی کوشش کی اور زور زور سے پلکیں جھپک کے کمرے کا جائزہ لینا چاہا۔

اس کمرے میں ایک لوہے کی رنگ اڑی دیوار گیر الماری' ایک لکڑی کے سال خوردہ سنگل بیڈ اور ایسی ہی حالت کے ایک دھندلے آئینے والے سنگھار میز کے علاوہ اگر کچھ تھا تو وہ دیوار پہ لگی تصویر تھی جس میں نگاہ امراؤ جان ادا کا سا روپ اپنائے ہوئے تھی۔

چھت کا پنکھا بند تھا مگر وہ بھی دلکش کو گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ باتھ روم آ کر اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے جی بھر کے منہ پہ ڈالے اس کے پپوٹے جل رہے تھے اور یقیناً "متورم بھی ہو رہے تھے کیونکہ اسے پلک جھپکنے میں بھی بوجھل پن کا احساس ہو رہا تھا۔ باتھ روم میں ایک عجیب سی بدبو تھی جس سے اس کا جی متلانے لگا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ دیر تک منہ پہ پانی کے چھپاکے مارتی رہے تاکہ ہوش ٹھکانے آئیں۔ بلکہ سر پہ بھی پانی ڈالے تاکہ طبیعت ہشاش بشاش ہو جائے مگر اس بدبو نے دیر تک وہاں ٹکنے نہ دیا۔ وہ فوراً "باہر نکل آئی۔

وہی ڈولتے ہوئے قدم۔

نگاہ سامنے ہی کھڑی تھی اور متجسسانہ نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"ہمارا۔۔۔ ہمارا سر چکرا۔"

بولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی زبان میں بھی لکنت آ چکی تھی اور الفاظ ادا کرنا سخت مشکل لگ رہا تھا۔ زبان جیسے ربڑ کا کوئی موٹا ٹکڑا بن چکی تھی جو دانتوں کے درمیان بری طرح پھنسا ہوا تھا۔

اپنی اس حالت نے اسے سخت متوحش کر دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

"میں نے کہا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ایک تو صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں [illegible] پوری نہیں ہوئی اور اوپر سے پریشانی اور ماں کی فکر الگ' لگتا ہے بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے اس لیے چکر آ رہے ہوں۔"

دلکش کا دماغ تقریباً "ماؤف ہو رہا تھا۔ اس تک نگاہ کے الفاظ پہنچ رہے تھے مگر خاص اثر نہ کر رہے تھے۔ غافل ہوتے ذہن کے ساتھ اس نے خود کو یقین دلانا چاہا کہ ضرور ایسی ہی کوئی بات ہو گی۔

"آؤ تم یہاں بیٹھو بلکہ لیٹ جاؤ۔"

اس کے لڑکھڑانے پہ نگاہ نے جلدی سے آگے بڑھ کے سہارا دیا اور اپنے بستر پہ لیٹنے میں مدد دینے لگی۔

"میں تمہارے لیے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

"امی' امی حضور ہم وہاں۔"

آنکھیں کھولے رکھنا محال ہو رہا تھا اور زبان تھی کہ کچھ بیان کرنے سے قاصر تھی مگر اس کا دھیان اب تک ماں میں اٹکا تھا۔

"ہاں' ہاں بس چلتے ہیں۔"

نگاہ نے اسے چمکارتے ہوئے تسلی دی اور پیر پکڑ کے اوپر کر دیے۔ تکیہ درست کر کے اس کے سر کے نیچے کیا۔

"بس پندرہ بیس منٹ تک نکلتے ہیں۔ تب تک تم آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔ بہتر محسوس کرو گی۔"

اس کے ہدایت دینے پر دلکش نے جیسے ہی آنکھیں بند کیں۔ بے ہوشی اس پہ مکمل طور پہ غالب آ گئی۔

نگاہ پر سکون ہو کے اٹھی۔

اب وہ نیاز کھوکھر کا نمبر ملا رہی تھی۔

"ہاں' سلا دیا ہے ہوں' کم از کم آٹھ دس گھنٹے تو سوئے گی بچی۔ اور سنو اسے اکیلا چھوڑ کے میں جا نہیں سکتی اور آج شام بارہ ہزار روپے کا پروگرام تھا۔ میری یہ دیہاڑی الگ سے پہنچ جانی چاہیے۔"

فون بند کر کے اس نے ایک بار پھر احتیاطاً "دلکش کو دیکھنا چاہا۔ وہ کم عمر تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ سال کے درمیان عمر رہی ہو گی مگر سوتے ہوئے اس کے خوب صورت چہرے پہ پھیلی فرشتوں کی سی معصومیت اسے بالکل بچہ ثابت کر رہی تھی۔

نگاہ کا دل بے اختیار ہو گیا۔ اس کا ہاتھ بے ارادہ اس کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی۔ اکیلے ہونے کے باوجود اس نے سر سے دوپٹا نہ سرکنے دیا تھا اور اب بے ہوشی کے عالم میں اپنے آپ سے بھی بے خبر وہ ہاتھ پیر ڈالے ہوئے تھی اور دوپٹا بستر سے نیچے جھول رہا تھا۔ ریشمی سنہری بال کندن سی دمکتی پیشانی پہ پھیلے تھے۔ نگاہ کا ہاتھ انہیں سمیٹنے لگا۔

"اللہ بھی کیسے کیسے ناقدروں کو کیا کیا ہیرے سونپ دیتا ہے مغل کیا اس کے قابل تھا؟ خیر سوہنا رب ہی جانے۔" اس نے آہ بھری۔

☼ ☼ ☼

آج پہلی بار منگنی کے بعد وہ شہزاد ملک سے ملنے جا رہی تھی اور وہ بھی اس کے بلانے پہ۔

یعنی صرف منگنی کے بعد پہلی بار نہیں' بلکہ زندگی میں پہلی بار وہ شہزاد کے بلانے پہ اس سے ملنے جا رہی تھی۔

اس لیے فطری طور پہ کچھ نروس بھی تھی اور بہت زیادہ ایکسائیٹڈ بھی۔

"اف کیا پہنوں؟ کچھ ایسا جو خوب صورت بھی ہو' منفرد بھی اور اس کے ساتھ ساتھ ایسا کیا کہ جس میں ہمیں دعا لگوں ادا نہیں۔"

اس نے ساری وارڈ روب چھان ماری مگر ایسا کوئی ڈریس نہ ملا گھر پہ وہ لباس کا خاص اہتمام کرنے کی عادی نہ تھی۔ نہ شوبزنس میں آنے سے پہلے اور نہ اب۔

پہلے تنگ دستی اس کی اجازت نہ دیتی تھی اور اب گھر سے باہر اسٹوڈیوز میں یا اسٹیج پروگرامز پہ پیشہ ورانہ تقاضے نبھانے کی خاطر اسے بننا سنورنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات اپنے مزاج کے اور ذوق کے بالکل برعکس پہناوا پہننا پڑتا تھا۔ اس کا دل اس چمک دمک اور بناؤ سنگھار سے اوب جاتا تھا اور اس کے رد عمل کے طور پہ وہ گھر پہ جتنا وقت گزارتی اس بناوٹی آرائش سے کوسوں دور رہنے کی کوشش کرتی۔ پرانے مگر آرام دہ لباس پہنتی' کبھی دوپٹا کسی اور سوٹ کا۔ شلوار کسی اور رنگ کی اور قمیص کسی اور ڈیزائن کی۔ کہیں خاص آنا جانا یا ملنا ملانا بھی نہ تھا اس لیے صرف انہی ملبوسات سے الماری اٹی پڑی تھی جو تھے تو بے حد قیمتی اور خوب صورت مگر ادا کے لیے تھے' دعا کے

لیے نہیں۔

"کیا مصیبت ہے؟" اس نے جھنجلا کے الماری کے پٹ زور سے بند کیے، جہاں ہینگرز پہ درجنوں لباس لٹک رہے تھے مگر آج کی شام کے مناسبت سے پہننے کے لیے ان میں سے ایک لباس بھی معقول نہ لگ رہا تھا۔ اچانک ایک خیال آنے پہ اس نے نچلا دراز جلدی سے کھولا۔ خوب صورت ریپنگ پیپر میں ایک ڈریس ان چھوا رکھا تھا۔ اس نے نکالا اور دیکھنے لگی۔

یہ وہ لباس تھا جو اس کی پچھلی سالگرہ پہ مامی نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس نے کھول کے دیکھا تھا اور بجھ کے رہ گئی۔ اندر سفید رنگ کا ایک خوب صورت شلوار قمیص تھا۔ مامی جانتی تھیں کہ اسے سفید رنگ کتنا پسند ہے اسی لیے انہوں نے اسے تحفہ دینے کے لیے اس رنگ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اسے سفید رنگ کسی حوالے سے پسند تھا۔ یہ رنگ اسے اس دن کی یاد دلاتا تھا جب اس کی آنکھوں نے پہلی بار چھاجی کو دیکھ کے پلکیں جھپکنا بھولی تھیں، یہ وہ دن تھا جب اس کے دل نے پہلی بار چھاجی کے لیے گداز محسوس کیا تھا۔ اور یہ وہ دن تھا جب پہلی بار اس نے چھاجی کے لیے ایک خواب بنا تھا۔

اور اس دن اس نے یہی سفید رنگ پہنا تھا۔ اور اسی سفید رنگ میں اسے دیکھ کر چھاجی نے اس کی بے ساختہ تعریف بھی کی تھی۔ پہلی اور اب تک کی آخری تعریف۔

اس وقت اس لباس کو دیکھ کر دعا کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے بجھے دل کے ساتھ اس تحفے کو یونہی رکھ دیا تھا۔۔۔ دوبارہ سے گفٹ پیپر میں لپیٹ کے۔

آج یہی تحفہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔

آج بھی اس کے ہونٹوں پہ اسے دیکھ کے مسکراہٹ پھیلی تھی مگر اس مسکراہٹ میں طنز اور بے بسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ آج یہ مسکراہٹ اظہار تشکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تھینک یو مامی! آپ کی محبت اور شفقت زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں میرے کام آتی ہے۔"

اس نے نفیس شیفون کا یہ سفید لباس پہنا جس کے دوپٹے کے سرے اور قمیص کے دامن پہ ہلکے آسمانی اور ہلکے گلابی پھول یوں پرنٹ تھے جیسے کسی نے سفید جھولی میں ہلکے رنگوں کے ننھے منے پھول بھر رکھے ہوں۔ اپنے گھنے دراز بال اس نے کھلے چھوڑ دیے اور کانوں میں ہلکے سے ٹاپس پہن کر ہاتھ کی تیسری انگلی میں وہی انگوٹھی سجائی جس نے اس کا سب کچھ بدل ڈالا تھا۔

اس کی تقدیر بھی۔

اس کے سوچنے کا ڈھنگ بھی۔

اور اس کے شب و روز کا قرینہ بھی۔

اس انگوٹھی کا اس کے ہاتھ کا حصہ بنے دن ہی کتنے ہوئے تھے، شاید دو دن۔۔۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ تین یا چار دن۔۔۔ مگر زندگی کا سارا ابو جھل پن، ناامیدی، خوف اور یاسیت پنکھ لگا کے اڑ گئی تھی۔

"میں رانجھے دی منگ ہوں لوکو۔۔۔ میں رانجھے دی منگ۔۔۔"

ہلکی سی گنگناہٹ کے ساتھ اس نے پرفیوم اسپرے کیا اور وہاں سے نکل آئی اتنے میں چھاجی کی کار کا مخصوص ہارن سنائی دیا۔

"اچھا اباجی۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔"

اسے کمرے میں جھانک کے اللہ وسائے سے اتنی سی بات کہتے ہوئے خاصا حجاب محسوس ہوا۔ حالانکہ وہ دن میں کتنی ہی بار گھر سے نکلتی تھی، کتنے ہی پروڈیوسرز کی گاڑیاں اسے لینے آتی تھیں۔۔۔ مگر نہ تو اس نے کبھی جھجک محسوس کی نہ اللہ وسائے نے اس کے خوشی اور حیا سے چمکتے چہرے کو دیکھ کر اتنی سرشاری کبھی محسوس کی تھی۔

"خیر نال جا پتر اور خیر نال آ۔ اللہ خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔"

ان دعاؤں سے دامن بھر کے وہ بڑی مسرور سی گھر سے نکلی۔

"سفید لباس میں تم ہمیشہ سے بہت حسین لگتی ہو۔"

شہزاد نے بے ساختہ سراہا۔ وہ حیران رہ گئی۔

"مگر میں نے تو اس رنگ کا لباس مدتوں سے نہیں پہنا۔"

"مدتوں پہلے تو پہنا تھا نا۔"

اس کے آنچ دیتے لہجے پہ وہ محجوب ہو کے خاموش ہو گئی۔

گاڑی دبیج ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں آ کے ٹھہر گئی۔

اس کے ہمراہ قدم بہ قدم چلتے ہوئے دعا کو اپنا آپ بڑا معتبر لگا۔ رفتہ رفتہ اس کا اعتماد بحال ہو گیا۔ اس میں کچھ ہاتھ شہزاد کی شعوری کاوش کا بھی تھا۔ اس نے دانستہ اپنی گفتگو کے دوران گزشتہ کسی تلخ یاد کا حوالہ نہ آنے دیا۔ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتوں میں دعا نے بہت جلد اپنی گھبراہٹ پہ قابو پا لیا تھا۔

"میں نے بہت سے لوگوں کا ایڈوانس واپس کر دیا ہے چھاجی، مگر کچھ کمٹ منٹس ایسی بھی ہیں جن کو پورا کرنے کی میں قانوناً پابند ہوں، ایگری منٹ پہ سائن کر چکی ہوں۔ محض ایڈوانس لوٹانے سے معاملہ رفع دفع نہیں ہو گا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں چھاجی؟"

"نہیں، بہرحال کمٹ منٹ تو نبھانی پڑتی ہے اور دوئی مجھے تو خیر تمہاری گلوکاری پہ بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اگر تم اسے جاری رکھنا چاہو تو رکھ سکتی ہو۔"

اس کے فراخدلانہ اجازت دینے پہ دعا کو سچ مچ حیرت ہوئی۔

"کیا؟ آپ سچ کہہ رہے ہیں چھاجی؟"

"ہاں اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے۔"

"نہیں خوشی نہیں مجھے دراصل حیرت ہوئی ہے آپ کی اس بات پر۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ میں اس پروفیشن میں اپنی مرضی سے یا شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کے نہیں آئی۔ مجھے شوبز کی رنگینی نے بھی قطعاً "متاثر نہیں کیا۔ ہاں البتہ گلوکاری سیکھنے کے دوران میرا اس فن میں دل ضرور لگ گیا تھا اور میں نے پوری لگن سے اسے سیکھا۔۔۔ لیکن یقین کیجیے کبھی بھی اسے ذریعہ معاش بنانے پہ نہ میرا دل مطمئن ہوا نہ ہی ضمیر راضی ہوا۔"

"تم فلموں یا ڈراموں کے لیے پلے بیک گانا چاہو تو مجھے واقعی کوئی اعتراض نہیں۔ تم اپنا البم نکالنا چاہو تو میں خود اس میں تمہاری مدد کروں گا ہاں البتہ میں اسٹیج شوز میں یا پرائیویٹ فنکشنز میں تمہارا گانا پسند نہیں کروں گا۔ اس کی اجازت نہیں ہے تمہیں۔"

"مجھے البم نکالنے یا پلے بیک گانے کی اجازت کی بھی کوئی ضرورت نہیں چھاجی۔"

اس نے ہنستے ہوئے شہزاد کی بات اسے لوٹائی۔

"مگر میری سیرلز اور سیریز کے لیے پلے بیک ٹریک تو تمہیں گانا ہوں گے۔ اتنا کنٹری بیوشن تو تمہارا ہونا چاہیے اپنے شوہر کے بزنس میں۔"

لفظ شوہر پہ وہ بری طرح لجا کے رہ گئی۔ شہزاد اس کے اس روپ سے محظوظ ہوتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگا۔

"اور ہاں آپ کو بھی اب سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے شہزاد کے لبوں میں دبا سگریٹ کھینچ لیا اور ٹیبل پہ رکھی ایش ٹرے میں مسل دیا۔

شہزاد اپنائیت بھری اس جسارت پہ ابرو اچکا کے رہ گیا۔

"یعنی پابندیاں بھی دو طرفہ ہیں اور اجازتیں بھی؟"

"بالکل۔"

"اور چاہتیں؟" اس کے اس سوال کا جواب دعا نے ایک شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ دیا تھا۔

"تم تو وہی ہو دوئی... بالکل وہی جسے میں اپنے آپ سے بھی چھپا کے اتنے برسوں سے چاہتا آ رہا ہوں۔"
شہزادے نے حیا اور تبسم کے اس حسین امتزاج کو دیکھ کر مسحور ہوتے ہوئے کہا۔
"مگر میں جانتا نہ تھا کہ وہ تم ہو۔ جس کا میرا دل تمنائی ہے۔ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی بہت دیر کی۔ مگر اب احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنا غلط تھا۔ تم وہی تو ہو... بالکل وہی۔ جس کو میرے تصور نے دل میں بسایا تھا۔ وہی معصوم ان چھوئی' پاکیزہ' معطر' مقدس شرمیلی سی' گھبرائی گھبرائی سی وہی ہو تم۔"
وہ ایک سحر کے عالم میں کہہ رہا تھا اور طمانیت دعا کے اندر بہت دور تک اتر رہی تھی۔
اس کا وجود ہلکا سا ہو کے فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔
اس پل اسے لگا تھا جیسے اب زندگی میں مزید کوئی مسئلہ' کوئی پریشانی' کوئی امتحان اس کے سامنے نہیں آئے گا۔
مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ گھر واپسی پہ اسے اپنی زندگی کے سب سے بڑے امتحان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

☼ ☼ ☼

"ری صاحبزادی کہاں ہیں ملک مقبول؟"
بابر نے اس کے سامنے آتے ہی یہ سوال کیا۔ اپنی جانب سے تو اس نے ملک کو سنبھلنے کا موقع تک نہ دیا تھا مگر وہ بھی ہر قسم کی صورت حال کے لیے ذہنی طور پہ تیار تھا بلکہ سب کچھ سوچے بیٹھا تھا۔
"رکھوا کے گئے تھے میرے پاس؟"
اس نے بے ہودگی سے الٹا سوال کیا۔
"اپنی لغو گوئی بند کرو ملک۔ ہم اس کے آگے مزید کوئی لفظ برداشت نہ کریں گے۔"
اس نے بساط بھر جلال دکھانے کی کوشش کی تھی مگر ملک اس کا مضحکہ اڑانے لگا۔
"اچھا... پھر کیا کرو گے؟ برداشت نہیں کرو گے تو اور کیا کرو گے؟ پھڑک کے نیچے گرو گے اور مر جاؤ گے... ہا' ہا۔" وہ بے ہنگم طور پہ ہنسنے لگا۔
"اس سے زیادہ تم اور کیا کر سکتے ہو جگر؟"
"ہم تمہیں قتل بھی کر سکتے ہیں؟" اس بار بابر کے لہجے کی سفاکی نے اسے پل بھر کو خاموش کر دیا مگر پھر کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر اس نے دائیں ہاتھ سے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے سوال کیا۔
"اس کے بعد؟"
"ہمیں نتائج سے خوفزدہ کرنے کی ضرورت نہیں ملک۔ عزت کی خاطر ہم جان دے بھی سکتے ہیں اور لے بھی سکتے ہیں۔"
وہ بپھرے ہوئے انداز میں آگے بڑھا اور اس کا گریبان تھام لیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کا گلا دبوچ لیتا کہ ملک نے ایک جھٹکے سے اپنا کالر اس کی گرفت سے چھڑایا اور اپنے بھاری ہاتھ سے اس کے شانے کو زور سے دھکا دے کر پیچھے کیا وہ لڑکھڑا کے میز پہ جا گرا۔
"اور اگر جان دینے یا لینے کے بعد بھی عزت نہ بچتی ہو تو پھر؟"
"کیا مطلب؟" وہ اٹھ کر سنبھلتے ہوئے پوچھنے لگا۔
"اتنے بھولے مت بنو بابر۔ جانتے ہو اچھی طرح کہ ہر طرح کی کالک کا دھندہ کرنے کے بعد بھی ملک نے اپنے ہاتھ کتنے صاف رکھے ہیں۔ کوئی مائی کا لعل مجھ پہ انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اگر الزام لگا بھی لے تو ثابت نہیں کر سکتا۔ میں نے کچے کام کبھی نہیں کیے' تم اس کے سب سے بڑے گواہ ہو۔ ایسے ہی تو مارکیٹ میں میری ساکھ نہیں بنی ہوئی۔ جب تک میں نہ چاہوں تم اپنے لونڈیا کی گرد تک نہیں پا سکتے۔ تم نے میرا نقصان کیا ہے' یا تو اس نقصان کو تم پورا کر دو یا میں تمہاری بیٹی کے ذریعے پورا کر لیتا ہوں۔"

"رحم کرو ملک مقبول' ہماری حالت پہ نہ سہی' اس معصوم بے قصور بچی پہ ہی رحم کرو۔"
وہ گڑگڑا اٹھا تھا۔
بڑے طنطنے سے آیا تھا جیسے تہس نہس ہی تو کر ڈالے گا ملک مقبول کی اس کالی سلطنت کو' مگر اب اپنے حقیر ہونے کا احساس اسے گھٹنوں کے بل جھک کر گڑگڑانے' منت کرنے اور رحم کی بھیک مانگنے پہ مجبور کر رہا تھا۔
"میں یہاں رحم کی عدالت لگانے نہیں بیٹھا اوئے۔ تو کیا دو دن میں میرے دھندے کو بھی بھلا بیٹھا ہے اسی دھندے کا کارندہ تو خود بھی رہا ہے۔"
اس نے بابر کو مزید دبانے کے لیے جھڑکنے کے سے انداز میں کہا۔
"ہم تمہارے قصور وار ہیں' ہمیں سزا دے لو چاہے کھال میں بھس بھروالو مگر ہماری صاحبزادی کو بخش دو۔ ان کا کیا قصور ہے وہ کیوں ہمارے گناہوں کی سزا بھگتیں۔"
"اولاد ماں باپ کے حصے کا تاوان بھرتی آئی ہے۔ اس میں نئی بات کون سی ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ ٹھیک ہے تم نقصان پورا کر دو' میرا' مگر تم ہو کہ کھال میں بھس بھروانے پہ تیار بیٹھے ہو۔"
ملک نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔
"تجھ زندہ کو کوئی نہیں پوچھتا' کھال بھروانے کے بعد کیا مول لگے گا' کم ذات۔"
یہ طعنہ چابک کی طرح بابر کو لگا۔ لفظ کم ذات پہ وہ بری طرح بلبلا اٹھا۔ اسے اپنا وہ سارا فخر وہ غرور وہ بھرم' مٹی میں رلتا محسوس ہوا جو وہ ہمیشہ سے اپنے اعلا حسب نسب کے حوالے سے محسوس کرتا آیا تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ فی زمانہ جس کے پاس' نہ دولت ہے نہ طاقت' نہ ہی اختیار وہی سب سے بڑا کم ذات ہے۔ جیسے کہ وہ خود اس وقت تھا۔
"ہم کیسے یہ نقصان بھر سکتے ہیں؟"
"جیسے کر سکتے ہو۔ تمہارے لارے پہ میں ادا کا ایڈوانس پکڑ بیٹھا ہوں عرب کے شیخوں سے' خود تم پہ کتنے پیسے لگا چکا ہوں چلو وہ ڈیڑھ لاکھ تو میں صدقہ خیرات سمجھ کے معاف کر دوں مگر ادا کے لیے جو پارٹیاں پھنسائی تھیں ان کا منہ کیسے بند کر دوں یا تو مجھے ادا لا کر دو' یا پھر وہ لاکھوں روپیہ جو میں ایڈوانس لے کر لگا چکا ہوں۔"
"ان میں سے کچھ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ادا جی ہمارا نام سننے کی روادار نہیں اور لاکھوں روپیہ ہم تو پیسے کے محتاج ہیں۔ اتنا بندوبست کیسے کریں۔"
"تو ٹھیک ہے ان پارٹیوں کا منہ بند کروانے کے لیے میں تمہاری لونڈیا وہاں بھیج دیتا ہوں۔"
"نہیں۔" وہ تڑپ اٹھا اس کے بدن پہ جیسے ہزاروں خنجر چل گئے تھے۔
اب وہ ملک مقبول کے پیروں پہ سر رکھ کے سسک رہا تھا۔
"خدارا ایسا مت کرو۔ وہ بہت معصوم ہیں بہت پاک' کسی ایسے ویسے خاندان کی نہیں ہے ان کے نانا دادا کی روح بے چین ہو جائے گی۔ ان کی والدہ جیتے جی مر جائیں گی۔ ہم ختم ہو جائیں گے۔"
"بکواس بند کراوئے کھوتے دے پتر۔"
ملک نے اپنے اکھڑ اور اجڈ انداز میں کہتے ہوئے حقارت سے پاؤں کی ٹھوکر مار کے اسے پرے کیا۔
"اس کے نانے' دادے کی روح سے مجھے کیا؟ وہ کیا میرے مامے چاچے لگتے ہیں... رہی اس کی ماں تو وہ زندہ کب ہے؟ جیتے جی تو کب کا تو اسے خود مار چکا ہے اور آپس کی بات ہے مغل' ایسی تھکی ہوئی دمے کی ماری بجھی ہوئی عورت کا تو نے کرنا بھی کیا ہے۔ مرنے دے سالی کو... اور رہا تو ہاں بھی تیرا دھیان کرنا پڑے گا۔ تو ختم ہو گیا تو میرے دلالوں میں سے ایک بہترین دلال کی کمی ہو جائے گی۔ مگر جاتے جاتے بھی بڑا اچھا تنگ میرے ہاتھ دے کر جا رہا ہے تو۔"
بابر کا بس نہ چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

مگر یہ بھی سچ تھا کہ اللہ کو اس کی حالت پہ رحم آجاتا اور قدرت اس کا پردہ رکھنے کے لیے زمین کا شگاف کھول بھی دیتی تو وہ اس میں سمانے سے انکار کر دیتا اپنی بیٹی کو ملک کے چنگل سے نکالے بغیر تو وہاں بھی نہ جاتا۔

"رحم' رحم کرو ملک ایسا مت کرو ہمارے ساتھ۔"

ملک نے اسے ٹھوکر مار کے جہاں گرایا تھا' وہ وہیں اوندھا گرا اب تک سسک رہا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے مکمل بھیگا ہوا تھا۔

"چلو' دے دیتے ہیں تمہیں رعایت۔ آج کی رات اور کل کا سارا دن یہ وقت تمہیں دیتا ہوں۔ اتنے وقت تک تمہاری لڑکی میرے پاس امانت کے طور پہ محفوظ رہے گی' ہاں اس کے بعد کی میں ضمانت نہیں دے سکتا۔ یا تو میرا نقصان پورا کر کے لڑکی چھڑوا کر لے جاؤ' یا پھر ـــــ یا پھر نقصان میں اپنے انداز میں پورا کر لوں گا۔"

"نن ـــــ نہیں' نہیں۔"

امید کی ایک کرن نظر آنے پہ وہ سیدھا ہوا۔

"مگر ہمیں کرنا کیا ہے؟ کیسے نقصان پورا کریں گے ہم؟" اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر مایوسی کی دلدل میں دھنس گیا۔

"ایک دن اور ایک رات کم وقت نہیں ہوتا مغل کل رات تک مجھے ادا ادھر چاہیے اور وہ بھی تمہارے اور اس کے نکاح نامے کے ساتھ کیونکہ پاسپورٹ میں نے اسی نام سے بنوایا ہے۔ یوں بھی تمہارے ساتھ بندھی رہے گی تو تم بھی قابو میں رہو گے اور وہ بھی رسی نہیں تڑوائے گی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تمہیں اسے لے کر دبئی پہنچنا ہو گا اور مجھے میرا مال سود سمیت لوٹانا ہو گا۔ چار کے آٹھ بنا کر دینے ہوں گے۔ ورنہ' ورنہ تمہاری بیٹی اتنی کم عمر اور حسین تو ہے کہ آٹھ کے دس بنا کر دے سکے۔"

"تمہاری بیٹی کا نام بار بار مت لو ملک۔" وہ کراہ اٹھا۔ اس کی غیرت جو یہاں آنے سے قبل للکار رہی تھی۔ اب زخمی پڑی آہیں بھر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے نہیں لیتا تم مجھے ادا لا دو ـــــ اسی کے نام کی مالا جپ لوں گا ٹھیک ہے شہزادے؟ اب خوش؟"

بابر جانتا تھا وہ یہ کام کبھی نہیں کر سکے گا۔ ادا کا ماننا تو بہت دور کی بات تھی' وہ خود اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پائے گا۔ شاید اپنی بیٹی کے لیے اتنا کر بھی لے ـــــ مگر ادا وہ کیوں اس کی خاطر کچھ کرے گی؟ دلکش اس کی کیا لگتی ہے؟ ـــــ کیا اچھائی کی تھی اس نے ادا کے ساتھ جو وہ اس کی مدد کرے گی۔

یہ سب کچھ اس کے سامنے تھا اس لیے وہ پر امید نہ ہو سکا البتہ اتنی سی مہلت کو بھی غنیمت جانا اور رضامندی سے سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے ہم کچھ کرتے ہیں مگر ہماری صاحبزادی۔"

"اوئے کیا صاحبزادی' صاحبزادی لگا رکھا ہے؟ اکڑ نہیں گئی تمہاری؟ سیدھی طرح بول ہاں یا ناں کچھ نہیں ہو گا اسے اور بات سن۔ یہ رات اور کل کا دن دل لگا کر اپنا کام کرنا۔ ادا کو لائن پہ لگانے کی کوشش کرو چاہے پیار سے' چاہے ڈرا دھمکا کے مگر خبردار' اس مہلت کو اپنی بیٹی کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر کے ضائع مت کرنا۔ تمہارے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے۔"

☆ ☆ ☆

"آج کی شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔" شہزاد نے گھر کے آگے کار روکتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور مجھے بھی۔" دعا نے تائید کی۔

"میری زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت شام کبھی نہیں آئی اور لگتا ہے نہ ہی آئے گی۔"

"ایسی بات مت کرو دعا۔" شہزاد نے فوراً ٹوکا۔

"ہمیں ایسی بہت سی شامیں دیکھنا ہیں اور اکٹھے دیکھنا ہیں۔"

"ان شاء اللہ!" اس نے صدق دل سے کہا۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے چھا جی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس یونہی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ جب کوئی وجہ نہیں ہے تو کچھ دیر کے لیے اندر آجائیے نا۔" اس نے مزید اصرار کیا۔

"یہی تو بات ہے دعا۔ کچھ دیر والی۔ یعنی میں اندر آگیا تو جلدی اٹھ نہ پاؤں گا ہو سکتا ہے واپس جا ہی نہ سکوں۔"

"ہوں یہ تو خاصی خطرناک بات ہے۔" وہ ہولے سے ہنسی۔

"تو پھر بہتر یہی ہے کہ آپ کو یہیں سے خدا حافظ کہہ دیا جائے۔ ماں جی گھر میں اکیلی بیٹھی آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"وہ تو تمہاری راہ بھی دیکھ رہی ہیں نجانے کتنے سالوں سے' پھر کیا ارادہ ہے؟ تمہیں بھی ساتھ بٹھا کے نہ لے جاؤں؟"

شہزاد کا دل شرارت پہ آمادہ ہوا۔

"آپ تو کہہ رہے تھے' اندر آ کر واپس نہ جایا جائے گا لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ باہر بھی آپ کے ملنے کے ارادے نہیں۔ یوں بات سے بات نکالے جا رہے ہیں جیسے دوبارہ کبھی بات کرنے کا موقع نہ ملنے والا ہو۔"

"یہ تم کس قسم کی منحوس باتیں منہ سے نکال رہی ہو۔ خبردار جو دوبارہ کبھی ایسا کہا۔"

شہزاد نے پیار بھرے غصے سے اسے گھورا۔

"او کے سر ـــــ غلطی ہو گئی' سوری اب آپ اچھے بچوں کی طرح گھر جائیے۔ بہت دیر ہو گئی ہے ہمیں سڑک پہ کھڑے ہو کر گپیں لگاتے۔"

اس کے احساس دلانے پہ بالآخر شہزاد نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گلی کا موڑ مڑنے کے بعد دعا نے اپنی مسکراتی نظریں وہاں سے ہٹائیں اور قدم گھر کے اندر کی جانب بڑھائے۔

"دفع کیوں نہیں ہو جاتا ـــــ ٹھڈے مار مار کے نکالوں گا تب اچھا رہے گا۔"

دروازے کے ہینڈل پہ دباؤ ڈالتے ہوئے اس نے اللہ وسایا کی غضب ناک آواز سنی۔

"یہ ابا جی کس کے ساتھ اتنا درشتی سے بول رہے ہیں؟ کون آیا ہے گھر؟"

وہ متجسس ہوئی۔

مگر دروازہ کھولنے کے بعد پہلی نظر سامنے پڑتے ہی اس کا یہ سارا تجسس' حیرت میں تبدیل ہو گیا۔

وہ بابر تھا ـــــ بابر ہمایوں مغل۔

وہی بابر' جس کی خوش اطواری' خوش گفتاری اور خوش ذوقی نے دعا کے دل کو دھوکا دیا تھا اور جو اس کی لچھے دار باتوں میں آ کے اسے ایک نفیس طبع شریف زادہ سمجھ بیٹھی تھی۔

وہی بابر جو ایک اعلیٰ خاندان کا پروردہ تھا' مگر جس کے کرتوت نیچ ذات والوں کو مات کرتے تھے اور جس کا کردار اس کے طبلہ نواز باپ' سارنگی نواز چچا سے بھی گیا گزرا تھا اور جس بابر نے اسے استعمال کر کے راتوں رات امیر ہونا چاہا تھا۔

وہی بابر اس وقت برے حالوں میں اس کے سامنے تھا۔ میلا کچیلا' سلوٹوں اور گرد و غبار سے بھرا بے ترتیب لباس' بکھرے ہوئے خاک آلود بال' متورم سرخ نمناک آنکھیں' کپکپاتے خشک ہونٹ' بندھے ہاتھ جھکا ہوا سر اور چہرے سے برستی بیچارگی مظلومیت اور دکھ کے سائے۔

"کیا یہ اس کا کوئی نیا بہروپ ہے؟" وہ سوچنے لگی۔

وہ اسے دیکھ کے جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔ فوراً اس کی جانب لپکا۔ دعا غیر ارادی طور پہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا لینے آئے ہیں آپ یہاں؟"

اس کے لہجے میں رکھائی اور اجنبیت تھی۔

"یہی تو میں اس سے پوچھ رہا ہوں۔ ڈھیٹ ہڈی منہ سے کچھ پھوٹ ہی نہیں رہا۔ لیچڑ کہیں کا' گھنٹا ہو گیا ہے اسے لیس ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ نہ دفع ہوتا ہے نہ بات بتاتا ہے۔"

"اس سے کہہ دیجئے آپا جی کہ اب میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں انہیں جانتی تک نہیں ہوں۔ یہ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔"

وہ اتنا کہتی اس کے قریب سے گزر کر اندر جانے لگی کہ بابر نے اس کا راستہ روک لیا۔

"ادا جی' ایسا ظلم مت کیجئے' خدارا ہماری بات سن لیجئے۔"

"ظلم؟۔۔۔ میں ظلم کر رہی ہوں؟" وہ حیرت سے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"اور وہ کیا تھا جو آپ میرے ساتھ کرنے جا رہے تھے؟ کیا صلہ دیا آپ نے میرے اعتبار کا۔ میں آپ کو ایک بھلا شخص سمجھ بیٹھی تھی۔ سوچا تھا آپ مجھے اس مصنوعی روشنیوں کی دنیا سے دور لے جائیں گے میں بھی عزت دار زندگی گزارنے کا خواب پورا کر لوں گی لیکن آپ کیا کرنے والے تھے؟ مجھے عمر بھر کے لیے کیچڑ میں دھنسانا چاہتے تھے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ جس کے پاس خود عزت نہ ہو وہ کسی دوسرے کو کیا دے گا۔ اب میں آپ کا اصل روپ دیکھ چکی ہوں۔ اب مجھ پہ آپ کی ان لچھے دار خوب صورت باتوں کا اثر نہیں ہو گا بابر صاحب برائے کرم آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ مجھے بدتمیزی پہ مجبور مت کیجئے۔"

"چلے جائیں گے ہم۔۔۔ چلے جائیں گے مگر آپ ہمارے بات تو سن لیں۔ مانا کہ ہم عزت کے قابل نہیں مگر' مگر ادا جی آپ وہ ہستی ہیں جو ہماری عزت بچا سکتی ہیں۔۔۔ سچ کہا ہے آپ نے کہ جس کے پاس جو ہوتا ہے' وہی وہ لوٹاتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ آپ جتنے نازک اور خوب صورت دل کی مالک ہیں۔ آپ ہماری درخواست رد کر ہی نہیں سکتیں۔ آپ ہماری مدد ضرور کریں گی۔ ہم بہت امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔"

وہ ہاتھ باندھے ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ دعا نے اس سے پہلے اس کا یہ روپ نہ دیکھا تھا اس لیے کچھ پسیج گئی البتہ اللہ وسایا بڑبڑا رہا تھا۔

"چرسی ڈرامے کر رہا ہے۔ یہ تو ہم میراثیوں سے چار ہاتھ آگے ہے سوانگ بھرنے میں۔" اچانک بابر نے جھک کر دعا کے پیر چھونے چاہے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"ہم آپ کی منت کر رہے ہیں۔ آپ کو خدا' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے رہے ہیں۔ آپ کے پیروں کو ہاتھ لگا کر آپ سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہمیں ناامید مت لوٹائیے۔ خدا کی قسم ہم عمر بھر آپ کے غلام رہیں گے یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔"

وہ اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے گڑگڑا رہا تھا۔ پھر وہ اپنی کہنی موڑ کے آستین سے اپنے بہتے آنسو صاف کرنے لگا۔ دعا نے ایک گہری سانس لی۔

وہ سمجھی کہ شاید شہزاد نے اس پہ حلقہ تنگ کیا ہو گا دھوکہ دہی کا کوئی مقدمہ وغیرہ کر دیا ہو گا اور اب وہ اس کے ذریعے معافی چاہ رہا ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے قدموں میں گرے اس نواب کو دیکھا جس کا طنطنہ اور غرور اپنی مثال آپ تھا۔ اسے اس کی حالت پہ ترس آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ شہزاد سے بات کر کے اس کی خلاصی کرا دے گی۔۔۔ وہ اس کا برا چاہتا ضرور تھا مگر برا ہوا تو نہیں۔

"پلیز آپ اٹھیے ایسا مت کریں۔"

"نہیں' جب تک ہمیں یقین نہیں ہو جاتا کہ ہماری درخواست قبول کر لی گئی ہم آپ کے قدموں میں پڑے

رہیں گے۔ چاہے یہیں ہماری جان نکل جائے ویسے بھی اگر آپ نے ہماری حالت پہ رحم نہ کیا تو ہم جی کے کریں گے کیا؟"

"اوہ خدایا۔۔۔" وہ پریشانی ہو اٹھی۔

"یہ بندہ نہیں' لسوڑھا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے دوئی یہ ڈھائی بوتل چڑھا کے ادھر خرمستی کرنے آگھسا ہے۔ تو اندر چل اس سے میں نبٹتا ہوں۔"

اللہ وسائے نے کف الٹ کر آگے آتے ہوئے کہا۔

"پتا تو چلنے دیں کہ مسئلہ کیا ہے۔" دعا نے روک دیا اور پھر سے بابر کو مخاطب کیا۔

"دیکھئے میں تھکی ہوئی ہوں' زیادہ وقت بھی نہیں ہے میرے پاس آپ کو جو کہنا ہے جلدی کہیں اور پلیز یہاں سے جائیں۔ میرے منگیتر کو آپ کی یہاں موجودگی کا علم ہوا تو وہ برا مانیں گے۔"

اس نے دانستہ شہزاد کا نام لے کر اس کا رعب قائم کرنے کی کوشش کی مگر بابر کی حالت میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ وہ اب بھی اپنی ہی الجھن میں گرفتار ہونٹ کاٹ رہا تھا البتہ دعا کے بار بار کہنے پہ وہ اس کے قدموں سے اٹھ گیا تھا اور سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔

"ہاں کہئے' کیا کر سکتی ہوں میں آپ کے لیے؟"

"آپ ہماری زندگی' ہماری آبرو' ہمارے خاندان کے ناموس کو بچا سکتی ہیں۔"

"بات کو گھما پھرا کے مت کہیں' صاف بتائیں کیا چاہتے ہیں آپ؟"

اس بار وہ رکھائی سے پوچھتی ہوئی رسٹ واچ پہ نظر دوڑا رہی تھی۔

"ہم آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کے مدھم آواز میں کہنے پہ دعا نے ایک جھٹکے کے ساتھ سر اٹھا کے دیکھا۔

وہاں مذاق یا دل لگی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

"ہاں ہم شادی کرنا چاہتے ہیں آپ سے اور وہ بھی چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر۔"

☼ ☼ ☼

اس نے اپنے سوئے سوئے دماغ کو آنکھیں کھولنے پہ بمشکل آمادہ کیا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ گہری نیند میں ہے۔۔۔ ایسی گہری نیند میں کہ اس کا دماغ نیند پوری کر کے کچھ کچھ جاگ رہا ہے مگر آنکھیں پپوٹے اس قدر بھاری ہو گئے تھے اور پلکیں تو گویا ایک دوسرے سے چپک کے رہ گئی تھیں۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس کا ذہن پہلے بھی دو بار اس غنودگی سے نکلنے کی کوشش کر چکا تھا مگر نگاہ کی دی بے ہوشی کی دوا اس قدر پر اثر اور طاقت ور تھی کہ آنکھیں کھول کر ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آنے سے قبل ہی اس کا ذہن دوبارہ تاریکی میں کھو جاتا۔

"نجانے یہ کون سا پہر ہے؟ صبح ہونے والی ہے یا شام؟" کبھی کبھی وہ دوپہر کو بھی قیلولہ کر لیا کرتی تھی۔ اس لیے سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اس وقت رات کی نیند لے رہی ہے یا دوپہر کی۔

"امی حضور کی طبیعت ٹھیک نہیں' ہمیں اب اٹھنا چاہیے۔"

اس کے ذہن نے ایک اور بات یاد کر لی۔

بہت دقت کے ساتھ اس نے پلکیں کھول کے سامنے دیکھا۔

ایک غیر مانوس سا منظر دھندلا دھندلا سا اور ڈگمگاتا ہوا نظر آیا۔ اس پر کیف نیند سے نکلنے کو اس کا دل نہ مانا اور اس نے بند ہوتی پلکوں کو پھر سے بند ہونے کی اجازت دے دی۔

"کیا ہو گیا ہمیں؟۔۔۔ اور کتنا سوئیں گے؟" اس نے جھرجھری لے کر اس غلبے سے نکلنا چاہا اور اب کی بار

آنکھیں ایک جھٹکے سے کھول دیں۔

اب بھی سب کچھ ہلتا ہوا اور گھومتا ہوا نظر آرہا تھا پھر بھی اس نے پلکیں جھپک جھپک کے اطراف میں نظر دوڑانا چاہی۔ منظر اجنبی تھا ہر چیز نا آشنا تھی اس مکمل اجنبیت کے احساس نے اسے ہراساں کردیا۔ وہ بوکھلا کے اٹھنے لگی تو زبردست چکر نے ایک بار پھر بستر پر گر جانے پہ مجبور کردیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے رہ گئی جو منوں وزنی ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے ہمیں؟...... ایسی نیند' ایسی حالت؟ اور یہ جگہ؟ کہاں ہیں ہم؟"

رفتہ رفتہ پیدا ہوتے سوال یہ ظاہر کررہے تھے کہ وہ ہوش میں آرہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر جائزہ لینا چاہا۔ اس بار تمام چیزیں اتنی اجنبی نہ لگیں...... خاص طور پہ دیوار پہ آویزاں وہ تصویر۔ اس تصویر کو دیکھ کے دلکش کو سب کچھ یاد آنے لگا۔

یاسمین کی اچانک بگڑتی حالت۔

بابر کے دوست کا اتفاقاً" گھر آجانا اور مدد کرنا۔

ہسپتال کے کوریڈور میں انتظار اور بے چینی سے گزارے وہ چند گھنٹے۔

ملک کا اس کی مدد کے لیے اپنی دوست کو بمعہ بیگم کے بلانا۔

اور پھر اس کا اس عورت کے ساتھ اس گھر تک آنا۔

"بس دس پندرہ منٹ لگیں گے مجھے سب کام نبٹانے میں۔ تب تک تم آرام کرلو۔" اسے اس مہربان عورت کا مشورہ یاد آیا۔

"تو کیا ہم سچ مچ سوگئے تھے اور وہ بھی اتنی گہری نیند۔" وہ جی بھر کے حیران ہوئی کہ ایسی غیر ذمہ دار تو کبھی بھی نہ رہی کہ ماں ہسپتال میں پڑی ہو اور وہ بے فکری کی نیند سوتی رہ جائے...... وہ بھی کسی غیر کے انجان گھر میں۔

سراسیمگی کے انداز میں وہ کمرے سے نکلی۔

"آپ' آپ نے ہمیں۔" کچن میں نگاہ اس کی جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ دلکش نے اسے مخاطب کیا مگر نشہ آور دوا کے اثرات کی وجہ سے اب تک وہ بات مکمل کرنے کے قابل نہ ہوئی تھی اس لیے اٹک کر خاموش ہو گئی۔ منہ کا ذائقہ الگ کسیلا سا ہو رہا تھا۔

"اوہ...... آگیا ہوش؟" نگاہ پلٹی اور اسے حواس باختہ انداز میں ایستادہ دیکھ کے مسکرائی۔ دل ہی دل میں اس نے وہ مکالمے بھی ترتیب دے رکھے تھے جو اسے دلکش کی متوقع الزام تراشیوں کے جواب میں سنانے تھے مثلاً"۔

"اور کرو بھروسہ' اب بھگتو یا۔ ہونہہ' میرا تو کام ہی یہی ہے چار پیسوں کے لیے کچھ بھی کرلوں گی۔ تم ہی عقل سے کام کرلیتیں نا۔ اب رونا دھونا چھوڑو۔ ان آنسوؤں کا مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہونے والا کہ میں تمہاری بددعاؤں اور کوسنوں سے ڈر کے تم پہ ترس کھا بیٹھوں گی۔ خیریت چاہتی ہو تو آرام سے چپکی بیٹھی رہو۔"

مگر ان سب کی نوبت نہ آئی۔

دلکش اب تک یہ نہ بھانپ سکی تھی کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ رونما ہو چکا ہے۔

"آ' آپ نے ہمیں جگایا کیوں نہیں؟" ہمت کر کے اس نے یہ فقرہ ادا کیا تو زبان کی گرہیں کھلتی محسوس ہوئی۔ ذہن پہ چھایا گرد آلود دھواں بھی چھٹنے لگا۔ یقیناً" اس مدہوش اور نشے کی کیفیت میں سے وہ اسی طرح باہر نکل سکتی تھی کہ خود کوشش کرتی۔

"کتنی دیر ہوگئی ہے۔ پتا نہیں امی حضور کی طبیعت اب کیسی ہو ہم چلیں؟"

نگاہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پہلے تو اسے گھورتی رہی' پھر اس کے سادہ سے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ بھی جاننے میں قطعی ناکام رہی ہے تو گہری سانس لے کر سر ہلاتی دوبارہ سے رخ پھیر کے کھڑی ہوگئی۔

"ہوگی چھٹی' سوچا تھا ڈرامہ ختم مگر اب پھر وہی ایکٹنگ کرنی پڑے گی۔ توبہ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔"

"وہ ہمارا انتظار کررہی ہوں گی۔ پتا نہیں ہم اتنے غافل کیسے رہے۔ کتنا سوئے ہیں ہم؟"

"ساڑھے سات گھنٹے۔" نگاہ نے اطمینان سے جواب دیا اور اپنا چائے کا کپ لے کر پلٹی۔

"تمہارے لیے بناؤں چائے؟ شاید ہوش ٹھکانے آجائیں؟"

مگر اس نے شاید نگاہ کا یہ سوال سنا ہی نہیں۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی۔

"سات گھنٹے سے اوپر اتنی دیر؟ آپ نے ہمیں جگایا کیوں نہیں؟"

یہ سوال وہ ایک تواتر کے ساتھ کررہی تھی آخر چڑ کر اسے جواب دینا ہی پڑا۔

"کیوں جگاتی' مشکل سے تو سلایا تھا۔"

"لیکن وہاں ہماری امی حضور۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ موٹی موٹی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ نگاہ کو وہ اس وقت میلے میں کھوئی کوئی ڈیڑھ دو سال کی بچی لگی جسے سوائے لفظ "مما" کے اور کچھ بولنا نہ آتا ہو۔

"وہاں جانا تھا۔ پتا نہیں وہ کیسی ہیں؟"

"مرگئیں۔" بلا ارادہ ہی نگاہ کے منہ سے نکلا۔ وہ اس بک بک سے تنگ آچکی تھی۔

"کیا؟" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی تو نگاہ کو اپنی زبان کی سفاکی کا احساس ہوا اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرتی' دلکش بند ہوتی آنکھوں اور ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ لہرا کے نیچے آرہی۔

"چلو' یہ بھی نمٹا مکا۔"

نگاہ نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ اس کے سوالوں کا جواب دینے کی کوفت سے آزاد ہوئی۔

"چل بھئی مغل بچی' پٹھان بچی کی میزبانی کے مزے لوٹ۔" اس نے دلکش کے ہلکے پھلکے نازک سے وجود کو سہولت کے ساتھ اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور کمرے کے اندر لے جانے لگی۔ اس کے بازوؤں میں سمٹی وہ اور بھی مختصر وجود لگ رہی تھی۔

اسے بستر پہ لٹاتے ہوئے نگاہ کا دل ایک بار اس کے کبوتر سے نرم گرم لمس سے موم ہونے لگا۔

وہ وہیں اس کے سرہانے بیٹھ کے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

"اللہ بیٹیاں کیوں پیدا کرتا ہے؟ کم از کم مغل جیسے لوگوں کو تو بیٹی نہ دیتا یا میرے باپ جیسے گدھ کو۔"

☼ ☼ ☼

"ہمیں تم سے ایک بات کرنی ہے موتیا۔"

گل مہر اضطراب سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

"کہو۔" موتیا نے روکھے انداز میں کہا۔

"وہ دراصل' بات نہیں کرنی ہمیں تم سے معافی مانگنا ہے۔" بہت مشکل کے ساتھ یہ لفظ گل مہر کے لبوں سے ادا ہوئے۔ خود موتیا بھی ششدر رہ گئی۔ گل اور معافی؟ اور وہ بھی اس سے۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟ ذرا دوہرانا کہیں مجھے سننے میں غلطی تو نہیں ہوئی۔"

اس نے سوئی دھاگا ایک جانب رکھا اور پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوئی جو آج بہت الگ الگ سی لگ رہی تھی۔

بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ۔

بدلا ہوا لب ولہجہ۔

نہ مزاج میں طنطنہ تھا' نہ نگاہوں میں طنز کے لپکے۔

"معافی مانگنے کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی آپ کو عزت مآب صاحبزادی گل مہر خانم۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا سوال کٹیلا اور زہریلا سا ہو گیا۔

"ہمیں اپنے رویے پہ شرمساری ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"مثلاً کیا؟ کیا کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا؟" موتیا نے تفصیل جاننا چاہی۔ وہ اب تک گل کے اس رویے کو سمجھنے سے قاصر تھی اس لیے بات بڑھا رہی تھی کہ پتا چلے آیا یہ مذاق ہے یا واقعی؟

"تم سے متنفر نہیں ہونا چاہیے تھا اور نہ تمہیں عمیص سے متنفر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ یقین کرو، عمیص کے لئے ہمارے دل میں کچھ نہیں نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ خدا کی قسم ہم تم سے حسد نہیں کرتے اور نہ اس بات کا ملال ہے کہ عمیص کی شادی تم سے کیوں ہو رہی ہے۔ بس حالات نے کچھ اتنی تلخی بھر دی مزاج میں کہ۔۔۔"

وہ لب بے دردی سے کچل رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ندامت کے رنگ اتنے گہرے اور واضح تھے کہ موتیا کو یقین کرتے ہی بنی۔

"چلو چھوڑو۔ جانے دو اس بات کو۔" اس نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اعلا ظرفی دکھائی۔

"نہیں ایسے نہیں پہلے تم صاف لفظوں میں کہو کہ تم نے ہمیں معاف کر دیا۔" وہ مصر تھی اور اس کا یہ اصرار موتیا کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ یہ معافی مانگنے والی پچویشن بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ آڈ سی تھی۔

"کہا نا جانے دو اب بڑی بہن سے معافی منگواتے کیا میں اچھی لگوں گی۔"

"آج ہمارے بڑی بہن ہونے کا بہت لحاظ آ رہا ہے؟" گل کے کہنے پہ موتیا نے چونک کے دوبارہ مشین سے سر اٹھایا۔ وہ سنجیدہ لگ رہی تھی اور اسی سنجیدگی کے ساتھ گویا تھی۔

"تم چھوٹی بہن ہو، یہ آج ہی یاد آیا ہے کیا؟ ہمیشہ تو ہم سے لڑنے ہماری ہر بات میں نقص نکالنے اور ہماری غلطیاں ڈھونڈنے پہ تیار رہتی ہو۔"

موتیا کی جو ہنسی چھوٹی تو ہنستی ہی چلی گئی۔

"کیا ہم نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟"

"لطیفہ ہی تو ہے ایک تو معافی مانگ رہی ہو، دوسرا میرے جرائم کی فہرست گنوا رہی ہو۔" ہنس ہنس کے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ گل کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے اپنے الفاظ پہ غور کیا اور خفت سے سر جھٹک کے رہ گئی۔

"یعنی تمہارا کہنا ہے ہم فطرتاً "عادتاً" برے ہیں؟" گل کی تیوری چڑھ گئی۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" وہ صاف مکر گئی۔

"مطلب تو یہی نکلتا ہے۔ یہی کہنا چاہتی ہو تم کہ ہم ہیں ہی برے بلاوجہ تم سے بھڑنا ہماری عادت ہے ہر جھگڑے میں پہل بھی ہم کرتے ہیں اور غلطی بھی ساری ہماری ہوتی ہے۔"

"میں نے ان میں سے ایک الزام بھی لگایا ہو تو میری زبان جل جائے۔" موتیا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"یہ سب تمہاری اپنی قیاس آرائیاں ہیں اور وہ بھی ایک دم بوگس۔ پھر بھی ہمشیرہ صاحبہ، میں ان سب باتوں کے لیے معذرت خواہ ہوں جو اگرچہ میں نے زبان سے ادا نہیں کیں، نہ میرے دل سے ان کا گزر ہوا نہ دماغ میں سرسرائیں اس کے باوجود آپ کے کانوں تک ان کی بھنک نجانے کیسے پڑ گئی۔ معاف کر دو یار۔"

"دگر ہم معافی مانگنے تو ہم آئے ہیں۔" اس نے پورے استحقاق سے زور دے کر کہا۔

"ہم بڑے ہیں اصولاً "پہلا حق ہمارا ہے اس لیے پہلے تم ہمیں معاف کرو پھر تمہاری معافی پہ غور کیا جائے گا۔"

اتنا کہہ کر وہ بھی اتنا ہی بے اختیار ہنسنے لگی جتنا کچھ دیر پہلے موتیا ہنس رہی تھی۔

موتیا نے بھی سلائی مشین کو پرے سرکایا اور اس کے شانے سے لگ کر کھل کر اس کی ہنسی کا ساتھ دینے لگی۔

● ● ●

پہلے تو دعا قطعاً "یہ سمجھ نہ سکی کہ اس نے کہا کیا ہے۔ پھر دل ہی دل میں اس کے کہے الفاظ دہرائے۔ خود کو یقین

دلانا چاہا کہ کیا واقعی بابر نے یہی کچھ کہا ہے جو اس کے کانوں نے ابھی سنا ہے۔

یہی حال اللہ وسائے کا تھا اور جب بات دعا کی سمجھ میں آئی تو اس کا دماغ ہی الٹ گیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیا واہی تباہی بک رہے ہو؟"

وہ پل بھر میں ساری مروت، تمیز، اخلاق، لحاظ۔۔۔۔ سب کچھ بھول بھال گئی۔

"تیرا دماغ تو میں درست کرتا ہوں۔" اللہ وسایا اس پہ پل پڑا اور اس کا پہلے سے کھلا گریبان ایک جھٹکے سے چاک کر دیا۔ تابڑتوڑ پانچ چھ طمانچے کس کے اس کے منہ پہ مارے۔

"کچھ نشہ ہرن ہوا کہ لگاؤں اور پھینٹی؟"

مگر وہ اتنی تذلیل کے بعد بھی زمین پہ نظریں گاڑے کھڑا رہا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے یہاں تک کہ وہ سفید پڑنے لگے۔ نقاہت کے مارے چہرے پہ اللہ وسائے کے بھاری ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے سرخ سرخ نشانات واضح ہو رہے تھے۔ ان تھپڑوں کی زد میں آ کر اس کے قدم اکھڑے ضرور تھے۔ وہ لڑکھڑایا بھی تھا مگر اب پھر دعا کے سامنے یوں ستون کی طرح جما کھڑا تھا جیسے جواب لے کر ہی ٹلے گا۔

"چل اوئے نکل۔۔۔ سیدھی طرح شکل گم کر اپنی ورنہ پلس (پولیس) بلاتا ہوں۔"

"ہم اپنے سوال کا جواب لیے بغیر نہیں جائیں گے۔"

"عجیب ڈھٹائی بلکہ بے غیرتی ہے۔" دعا کو بھی طیش آنے لگا۔ جتنا غصہ اسے اس وقت بابر پہ آ رہا تھا اتنا تو تب بھی نہ آیا تھا جب اس کی حقیقت کھلی تھی۔

"اتنے ہی ارمان ہیں اپنے سوال کا جواب جاننے کے تو سنو، نہیں ہزار بار نہیں، لاکھ بار نہیں کروڑوں بار نہیں اپنی موت کے بدلے بھی نہیں۔ سمجھے اب جاؤ یہاں سے۔"

"اگر یہ سوال کا جواب ہے تو ٹھیک ہے ہم سوال نہیں کرتے آپ سے ہم بھیک مانگتے ہیں اور بھیک تو مل ہی جاتی ہے ادا جی۔"

وہ ایک بار پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ہاتھ عاجزی سے اس کے سامنے باندھ دیے۔

"ہم آپ سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہم سے نکاح کر لیجیے ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے۔ ایک معصوم کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ خدا کے لیے ادا جی، رحم کیجیے۔ ہمیں اپنا آپ بھیک میں بخش دیجیے۔"

"ایسی بھیک نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ اب تو تم پہ غصہ آنے کی بجائے ترس آ رہا ہے بابر ہمایوں مغل۔"

"نہ پتر نہ۔۔۔۔ یہ لعنتی اس کے قابل نہیں۔ مجھے لگتا ہے یا تو اس کا مغز پھر گیا ہے یا پھر آج یہ سب سے سستی والا چڑھا کے آیا ہے۔ میں اسے اٹھا کے گلی میں پھینکتا ہوں۔ زیادہ بک بک کی تو چوک سے سنتری بادشاہ کو پکڑ لاؤں گا اس کی چھتروں سے نشہ اترے گا اس فراڈیے کا۔"

"آج کی ساری رات اور کل کا دن بس یہ ہے تمہاری مہلت۔"

ملک مقبول کے سفاک الفاظ اسے یاد آئے۔ اس نے تڑپ کے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات کا ایک پہر بیت چکا تھا۔ بے بسی کے شدید ترین احساس نے اسے چلانے پہ مجبور کر دیا۔

"آپ لوگ ہماری بات مان کیوں نہیں لیتے کیوں نہیں مان لیتے۔" وہ سسک اٹھا۔

"ہم آپ کو یقین دلانے کے لیے کیا کیا کریں۔ کس طرح یقین دلائیں کہ یہ شادی کتنی ضروری ہے۔ کسی معصوم روح کی زندگی وابستہ ہے اس سے یہ ہمارا عشق نہیں ہے جو ہمیں آپ کے آگے گڑگڑانے پہ مجبور کر رہا ہے یہ ہمارا لالچ بھی نہیں ہے جو ہمیں خوار کرا رہا ہے یہ ہماری سب سے بڑی مجبوری ہے ہمارے سیاہ اعمال کا نتیجہ ہے جو ہمارے بجائے کسی اور کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا ہے۔ ہم ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہیں مگر ہمارے گناہوں کی سزا اس معصوم بے قصور کو ملے نہیں ہرگز نہیں۔"

وہ چالیس بیالیس سالہ مرد ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ دعا دم سادھے اس کی یہ حالت دیکھ رہی تھی۔ اللہ وسایا

بھی سارا غیض و غضب وقتی طور پہ بھلا بیٹھا تھا۔

"صرف آپ اسے بچا سکتی ہیں ادا جی۔۔۔ صرف آپ۔"

"کون ہے وہ؟" دعا کے لبوں سے سرسراتا ہوا سوال نکلا۔

"ہماری صاحبزادی' ہماری بیٹی ہماری پندرہ سال کی با پردہ معصوم اور پاکیزہ بچی اس وقت ملک مقبول کے پاس بطور یرغمال ہے اور ہم اور وہ ہمیں اسے آپ کے بدلے سونپے گا۔"

"مطلب؟" کچھ کچھ سمجھتی دعا اب ایک منٹ میں سب کچھ سمجھنا چاہتی تھی۔

"مطلب یہ کہ آپ کو شادی کر کے دبئی نہ لے جانے کی صورت میں ہم نے اس کے منصوبوں پہ جو خاک ڈالی ہے اور اس کے گھناؤنے کاروبار کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے بدلے وہ ہماری بچی سے اپنا خسارہ پورا کرنا چاہتا ہے اور ہم اور ادا جی اس وقت آپ ہیں جو اسے بچا سکتی ہیں۔"

"میں اسے بچا سکتی ہوں؟" دعا نے اپنی جانب اشارہ کیا۔

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ میں ہی اسے بچا سکتی ہوں مگر سوال یہ ہے بابر ہمایوں مغل کہ میں اسے کیوں بچاؤں گی؟"

وہ سینے پہ دونوں ہاتھ باندھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے یہ سوال کر رہی تھی۔

● ● ●

بابر ہمایوں مغل کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ اس لیے ہم اس لیے۔۔۔ کیونکہ۔۔۔"

اس نے بہت ہمت کر کے اٹک اٹک کر کہنے کی کوشش کی۔

"بولو بابر ہمایوں مغل۔۔۔ میں کیوں کروں گی تمہاری مدد؟ کس لیے بچاؤں گی تمہاری بیٹی کو؟ کیا سوچ کر تم مجھ سے اتنی بڑی قربانی طلب کرنے چلے آئے۔ میں تمہاری لگتی ہی کیا ہوں؟ تم نے آخر ایسا کون سا احسان کیا ہے مجھ پہ جس کا بدلہ چکانے کے لیے میں اپنا آپ بھینٹ چڑھا دوں۔۔۔؟ بولو۔۔۔ جواب دو؟"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے' سوال کر رہی تھی اور وہ زمین میں گڑتا جا رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہم واقعی اس قابل نہیں کہ ہماری مدد کی جائے یا ہم پہ ترس ہی کھا لیا جائے' ہم آپ پہ کیا احسان دھریں گے ادا جی' ہم تو آپ کے گناہ گار ہیں آپ کو حق ہے ہمارے ساتھ ہر برا سلوک کرنے کا۔ ہم ہمدردی اور ترس کے قابل ہی نہیں۔ لیکن ہماری بیٹی' ادا جی۔"

اس کی سسکیاں پھر جاری ہو گئیں بندھے ہاتھوں پہ آنسو پھر سے گرنے لگے۔

"تمہاری بیٹی بے قصور ہے اسے کس جرم کی سزا ملے؟"

"ہو گی۔۔۔ ضرور بے قصور ہو گی۔ واقعی اسے یہ سزا نہیں ملنی چاہیے لیکن اسے اس سزا سے بچانا تمہارا فرض ہے۔ وہ میری کچھ نہیں لگتی' پھر میں اس کی خاطر اپنا آپ کیسے داؤ پہ لگا سکتی ہوں۔"

"ہم یہی سوچ کے یہاں آئے تھے کہ بے شک وہ آپ کی کچھ نہیں لگتی لیکن آپ ایک اور دعا کو پامال ہونے سے ضرور بچانا چاہیں گی۔ ایک اور دعا کو ادا بننے سے ضرور روکنا چاہیں گی۔"

دعا کے اندر کچھ چیخنے لگا' چیخ چیخ کر گرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھربھری ہو کے ڈھے جاتی۔ اس نے اپنے چھاجی کا تصور بند پلکوں کی اوٹ سے کیا اور اپنا دل کڑا کر کے چلا اٹھی۔

"میں ہی کیوں؟ آخر میں ہی کیوں؟ میں ہی کیوں کروں گی ایسا؟ میری بار کون آگے بڑھا تھا۔ کس نے روکا تھا مجھے دعا سے ادا بننے میں۔ کسی نے بھی نہیں۔ میرے باپ نے بھی نہیں۔۔۔ چھاجی نے بھی نہیں۔ بلکہ سب نے بڑھ چڑھ کے مجھے اس تباہی تک لانے میں مدد کی تھی۔"

"تو اندر جا دیے میں آپ نمٹتا ہوں اس گدھے سے۔"

اللہ وسایا نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا اور بابر کی جانب جارحانہ انداز میں بڑھا جیسے اس پہ پل ہی تو پڑے گا۔ مگر اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ بابر کے گریبان تک پہنچتے وہ اس کے پیروں میں گر گیا۔

"تم بھی ایک بیٹی کے باپ ہو ہماری مجبوری سمجھو۔ خدا کا واسطہ ہے ہماری بات مان لو۔"

وہ اللہ وسایا کے پیروں پہ اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ ٹکائے ہوا تھا۔ اس کے آنسو اللہ وسائے کے سیاہ ہوتی انگلیوں' خشک اور کٹی ہوئی ایڑیوں والے پیروں کو بھی گیلے کر رہے تھے۔ یہ اللہ وسائے کے لیے ایک عجیب و غریب احساس تھا۔

ایسا احساس جو اس سے پہلے کبھی زندگی میں نہ ہوا تھا۔

وہ سحر کے سے عالم میں بت بن کے رہ گیا۔

پہلی بار کوئی اس کے پیروں پہ سر رکھ کے گڑگڑا رہا تھا۔

ہمیشہ دوسروں کی جوتیاں سیدھی کر کے کام نکلوانے والے اللہ وسائے کو آج کسی کی عاجزانہ التجا سننے کو مل رہی تھی۔

وہ ہق دق تھا۔

تقدیر کی اس نرالی مہربانی پہ حیران پریشان تھا۔ ایک جانب دل خوشی میں اوقات سے باہر ہوتے ہوئے یہ چاہ رہا تھا کہ قسمت سے پہلی بار آئے اس بھکاری کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا جائے۔ ہمیشہ ہاتھ پھیلا کر لینے والے کو آج دینے کا موقع ملا ہے تو سخی بنا جائے۔ کیا پتا پھر یہ دن دوبارہ زندگی میں آئے یا نہ آئے۔

لیکن جب یہ یاد آتا کہ پیروں میں گرا یہ شخص ایک حقیر کیڑا بنا۔ آخر کس چیز کا طلب گار ہے تو وہ خود دل میں امنڈتی سخاوت کا مظاہرہ کرنے کی اس خواہش کو سختی سے دبا دیتا۔

"میں نے کہا نا کڑیے تو اندر چل۔"

اپنے دل کی بدلتی حالت سے وہ خوفزدہ ہوا اور زیادہ شدت سے دعا کو منظر سے غائب ہونے پہ اصرار کرنے لگا۔ اسے ڈر سا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس کا دل بابر کی منت سماجت سے موم ہو سکتا ہے تو دعا' وہ تو اس کے آنسوؤں سے پگھل بھی سکتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیٹی کتنی حساس اور نرم دل کی مالک ہے۔

"نہیں ادا جی نہیں۔" بابر نے تڑپ کے سر اٹھایا اور اسی طرح رینگ کے دعا کے پیروں تک آپہنچا۔ اب وہ اس کے دونوں پیر اپنے ٹھنڈے لرزیدہ ہاتھوں سے تھامے اللہ رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔

"وہ بہت چھوٹی ہے۔ وہ بہت معصوم ہے۔ وہ بہت۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ ہماری بیٹی ادا جی۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے کبھی اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا ہو' ہمیں یہ بھی یاد نہیں کہ ہم نے اس کی پرنور پیشانی پہ کبھی بوسہ دیا ہو۔ اسے وہ پیار تو نہ مل سکا جو ایک باپ سے ملنا چاہیے تھا۔ اب کم از کم ہم اسے اس عذاب سے بچانا چاہتے ہیں جو ایک گناہ گار باپ کی وجہ سے اس پہ نازل ہونے جا رہا ہے۔"

"تو مردن' شرم نہیں آتی اپنی لڑکی کی عزت تک تو اپنے بل بوتے پہ نہیں بچا سکتا۔ اس کے لیے بھی تجھے ایک عورت کے پیروں پہ گرنا پڑ رہا ہے۔ جا۔۔۔ جا کے خود کوئی بندوبست کر۔ چھوڑ دے میری بیٹی کا کھیڑا (دامن)" اللہ وسایا نے دعا کا باپ بنتے ہوئے اپنے دل کو سخت کیا اور اسے دھکا دے کر نکالنے کی کوشش کی۔

"کہا تو ہے کہ مجبور ہیں ہم اپنی ساری مجبوری بیان کر چکے ہیں۔"

وہ بھی شاید بلک بلک کر واسطے دیتا اب تنگ آ گیا تھا یا مایوس ہو گیا تھا اس لیے چیخنے چلانے پہ اتر آیا۔ یہ الگ بات کہ اس کی اس چیخ و پکار سے بھی اس کی بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیوں نہیں یقین آتا آپ لوگوں کو۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے ہم جو کر سکتے تھے ہم نے کیا۔ ملک مقبول کو اللہ اور رسولؐ کے ڈراوے دیے۔ منت کی' دھمکایا بھی۔ آپ دونوں کے پیروں پہ باری باری سر بھی گرایا۔ اور کیا کریں ہم؟ ادا جی' ہماری بیٹی کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

"نعوذ باللہ' میں خود ایک حقیر' بے مایہ انسان' میری اپنی تقدیر مجھے قدم قدم پہ حیران کر جاتی ہے۔ میں کیا کسی کی

قسمت سنواروں گی۔"

"ہمارے لیے تو آپ ہی اس وقت سب کچھ ہیں۔"

شاید اس کے حواس قابو میں نہ تھے یا اس کی دماغی کیفیت درست نہ تھی جو وہ کفر بکنے پہ اتر آیا۔

"اگر آپ نے ہماری مدد نہ کی تو ہم اپنی جان لے لیں گے۔"

"اوئے' یہ دھمکیاں جا کے اپنے ابے کو دے۔ تیرے مرنے کی تکلیف اسے ہوگی۔ ہمیں نہیں۔ اور مرنا ہے تو جا۔ جا کے مر۔ لیکن باہر جا کے۔ ہمارے محلے سے بھی دور نکل کے۔"

اللہ وسایا' دعا کے چہرے کے بدلتے تاثرات بھی بھانپ رہا تھا اور اس کے لہجے میں اترتی نرمی بھی محسوس کر چکا تھا اس لیے جلد از جلد بابر کو یہاں سے چلتا کرنے کی فکر میں تھا۔

"ہم جانتے ہیں ہمارے مرنے سے آپ کو تو کیا' کسی کو بھی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری بیٹی تک کو نہیں۔ ہماری زندگی اسے کیا دے رہی ہے جو موت کوئی نقصان دے گی۔ اسی لیے اسی لیے تو... اگر ہم اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے تو ہمیں مرجانا چاہیے اور اس موت کا ذمہ دار کوئی نہ ہوگا۔ ہم آپ کو الزام نہیں دیں گے اپنی موت کا اوا جی! لیکن اگر ہمارے مرنے کے بعد ہماری بیٹی جیتے جی مرگئی تو اس کی ذمہ دار آپ ضرور ہوں گی۔ آپ کو موقع مل رہا ہے اس کی زندگی بچانے کا۔ مگر آپ' آپ یہ نہیں کررہیں۔ کیسے خود کو معاف کرپائیں گی آپ اس گناہ پر۔"

وہ درد بھرے لہجے میں کہتا۔ اپنی آستین کے میلے اور کھلے کف سے آنسو صاف کرتا ہوا۔ شکستہ قدموں سے پلٹنے لگا۔

"ٹھہرو۔"

دعا کی مضبوط آواز پہ جہاں اس کے کھنڈر سے وجود کی ساری دراڑیں یکایک بھرنے لگیں وہیں اللہ وسایا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے قدم بے جان ہوگئے اور وہ دیوار کا سہارا لے کر قریب رکھی کرسی پہ آہستگی سے بیٹھ گیا۔

"میں تم سے نکاح کرنے پہ تیار ہوں۔"

وہیں یہ بات سن کر اللہ وسایا کو اپنی بیٹی زنداں کی تاریکیوں میں اترتی نظر آئی۔

اس نے تڑپ کے اسے دیکھا' وہ اسے اس غلط فیصلے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس حماقت اور غیر ضروری جذباتیت سے باز رکھنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا مگر دعا کے چہرے پہ ایک نظر ڈالتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس کی ایسی تمام کوششیں بالآخر بے سود ٹھہریں گی۔

☼ ☼ ☼

"وساں دا راجہ... میرے بابل دا پیارا۔"

بلقیس اپنی پاٹ دار آواز میں غالباً" کوئی برتن بجاتی ہوئی گا رہی تھی۔

شہزاد نے جیسے ہی مین ڈور کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھا اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

"شہزادہ میرا گھوڑی چڑھیا... گھوڑی چڑھیا..."

اس کے پہلے سے مسکراتے گنگناتے لب کچھ اور کھل گئے اور ماں کی گلوکاری کے ایسے مظاہرے پہ اس کا یہ ردعمل پہلی بار ظاہر ہوا تھا ورنہ جب بھی وہ گلے کے زنگ اتارنے' یا پھر پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے گڑوی بجاتی ہوئی کوئی تان بلند کرتی' شہزاد کی بھنویں تن جاتی تھیں۔ پیشانی سلوٹوں سے اٹ جاتی تھی۔ کبھی تو وہ خاموش احتجاج کرتا گھر سے نکل جاتا تو کبھی ضبط توڑتے ہوئے ماں سے تلخ کلامی کر بیٹھتا مگر آج۔

وہ بے آواز قدموں سے چلتا اندر داخل ہوا۔

بالو سامنے قالین پہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی بغل میں پیتل کی چم چم کرتی گڑوی دبی تھی اور بائیں ہاتھ کی تھاپ سے بڑی مہارت کے ساتھ وہ اسے بجا رہی تھی۔ اس کی موٹی موٹی انگلیوں میں پھنسی سونے کی

انگوٹھیاں اس ردھم کو ایک نئی تھاپ بھی دے رہی تھیں۔ ساتھ بیٹھی دونوں ملازمائیں جو اپنی مالکن کی خوشی میں شریک ہونے کے لیے تالیاں بجا رہی تھیں۔ اب ساکت بیٹھی تھیں۔ ان کی نظروں میں شہزاد کا وجود آچکا تھا۔ جب کہ بالو کی پشت اس جانب تھی اس لیے وہ ابھی تک بڑے مگن انداز میں گیت گا رہی تھی۔ اچانک اسے اپنی ملازماؤں کے سہمے ہوئے انداز پہ ٹھٹھکنا پڑا۔

"کی ہویا کڑیو؟ سانپ سونگھ گیا ہے؟ کھاتی دو ٹبروں جتنا ہو۔ اور تالی بجاتے موت پڑتی ہے۔ موئیاں' میرے شہزادے کا شگن ہے اور یہ اتنی جلدی تھک گئی ہیں۔"

وہ انہیں گھرکنے لگی۔

"وہ... بی بی جی... وہ باؤ جی..."

آخر ایک نے ہمت کر کے بھنویں اچکاتے ہوئے بالو کی پشت کی جانب اشارہ کر کے اسے شہزاد کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہمت اسے دراصل شہزاد کی مسلسل مسکراہٹ نے بھی عطا کی تھی۔ اس کا حوصلہ بندھا تھا کہ کم از کم ان کی یہ جسارت مالک کو ناگوار نہیں گزری۔

"او مہندی تاں سجدی اے جے نچے منڈے دی ماں۔"

وہ گھٹنوں پہ دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتی اٹھی اور اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ ٹھمکنے لگی۔ ملازمائیں ہنسی چھپانے کے لیے دوپٹا منہ میں ٹھونسنے پہ مجبور ہوگئیں۔

"کیا ہوگیا اماں..."

بالو نے ناچتے گاتے جب شہزاد کا ہاتھ تھام کر اسے بھی دو چار بل دینے کی کوشش کی تو وہ ذرا خفیف سا ہوگیا۔ اگرچہ اس وقت وہ بہت سرشار سا گھر لوٹا تھا۔ ماں نے بھی اس کی خوشی بڑھا دی تھی مگر اس کا شرمیلا پن اسے خوشی کے اس بے ساختہ اظہار سے جھجکنے اور ہچکچانے پہ مجبور کرتا تھا۔

"جھلی ہوگئی ہوں... شیدائن ہوگئی ہوں۔ میرے پتر دی جنج نکلنے لگی ہے۔ اوئے پھل بتاشے ونڈو (بانٹو) باجے بجاؤ' سہرے لاؤ۔ میں لڈیاں ڈالتی بھنگڑے ڈالتی جنج لے کر جاؤں گی۔ مہینہ پہلے ڈھولک رکھوں گی۔ کل سے روز رات ساری برادری اور سارا محلہ اکٹھا ہو کے شگنوں کے گانے گائے گا اور رات کی روٹی میں خود ساروں کے لیے پکاؤں گی۔ تو کل ہی سارا گھر۔ اور ساری سڑک بتیوں سے سجا دے۔"

اس نے بیٹے کو تاکید کی اور اس کے وعدے پہ ایک بار پھر اس نے نوکرانیوں کو تالیاں بجانے کا اشارہ کیا اور اپنے ہاتھوں میں شہزاد کے ہاتھ پکڑ کے اوپر اٹھائے اور پھر سے گانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کی طبیعت ناساز ہے' ایسی حالت میں اور ایسی تباہ کن گرمی میں آپ کہاں جانے کا قصد فرما رہے ہیں؟"

صاحبزادی حرمت النساء نے صاحبزادہ نفیس علی خان کو خاکستری رنگ کی ہلکی والی شیروانی زیب تن کرنے کے بعد عطر لگاتے دیکھا تو خود کو سوال کرنے سے روک نہ پائیں۔

"ہے ایک بہت ضروری کام' جو نجانے کس مصلحت کے تحت ٹلتا جا رہا ہے۔ لیکن اب ہم اسے مزید ٹالنا نہیں چاہتے۔ کبھی کوئی وجہ آڑے آئی ہے تو کبھی کوئی۔ بہرحال یہ حکم خداوندی بھی ہوسکتا ہے۔ جب تک اس کی ذات اقدس نہ چاہے بندہ حقیر اپنے کسی ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے' ہم نے سوچا ہے آج اللہ کا نام لے کر نکلا جائے۔ اگر قسمت میں ہوا' اللہ نے چاہا تو یہ گتھی بھی سلجھالیں گے۔"

لفظ "گتھی" پہ صاحبزادی حرمت النساء کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کس معاملے کو سلجھانے کے لیے گھر سے نکل رہے ہیں وہ خود شدت سے یہ معمہ حل کرنا چاہتی تھیں لیکن پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ آج انہیں اس مقصد کے تحت باہر نکلتا دیکھ کر انہیں ایک اضطراب نے آن گھیرا۔

وہ شدت سے یہ چاہنے لگیں کہ انہیں کسی نہ کسی بہانے روک لیں۔

"اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مصلحت خداوندی یا مشیت الٰہی کے تحت یہ کام مسلسل التوا کا شکار ہو رہا ہے تو میری ناچیز رائے ہے کہ آپ اس کام کو رہنے دیجیے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ بیگم حرمت النساء' جب تک واضح حکم نہ ہو' انسان کو کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اور ہم خدانخواستہ کوئی ایسا کام تو نہیں کرنے جا رہے جس سے خلق خدا میں سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔"

انہوں نے کنگھا کرنے کے بعد ٹوپی سر پہ جمائی اور اپنی عصا پہ ہاتھ رکھا۔

ان کی تسلی کرانے کے باوجود صاحبزادی حرمت النساء کے اندیشے کم نہ ہوئے۔ وہ اپنے دل کی گھبراہٹ کو کوئی واضح نام دینے سے قاصر تھیں مگر یہ بات ضرور محسوس کر رہی تھیں کہ یہ گھبراہٹ کسی آنے والی بڑی پریشانی کا پیش خیمہ ہے۔

"آج موسم بے حد گرم ہے۔ باہر آگ برس رہی ہے۔"

"نجانے اتنی گرمی میں آپ کو ٹیکسی' بس کب تک ملے۔ کم از کم عمیص میاں کے آنے کا انتظار کر لیجیے۔ وہ آپ کو لے جائیں گے تب تک دھوپ بھی ڈھل چکی ہو گی۔"

"ہم انہیں پہلے ہی منع کر چکے ہیں۔"

"آپ کی طبیعت بہتر نہیں' خدانخواستہ بگڑ گئی تو کسی نہ کسی کا ساتھ ہونا ضروری......"

"بات کیا ہے بیگم صاحبہ!"

اس بار بار کی رخنہ اندازی پہ انہوں نے بات کاٹ کر سوال کیا ورنہ مقابل کی بات کاٹنا وہ حد درجہ بدتہذیبی خیال کرتے تھے۔

"جی...... جی کچھ نہیں ہم تو بس یونہی۔"

وہ گڑبڑا اٹھیں۔

"صرف اتنا چاہ رہے تھے کہ یا تو آپ اپنا آج جانا موخر کر دیجیے یا پھر عمیص میاں کو ہمراہ لے جائیے۔"

کچھ توقف کے بعد انہوں نے ہمت کر کے اپنا مدعا پھر دہرایا۔

"افسوس ہم فی الوقت آپ کی کسی بھی ہدایت پہ عمل نہیں کر سکتے۔"

بے لچک انداز میں کہتے ہوئے وہ بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

"نواب صاحب! ہم کیا اور ہماری بساط کیا...... اس سے پہلے آپ ہماری کون سی ہدایت پر عمل کرتے رہے ہیں۔"

وہ کڑھنے لگیں۔

"یا اللہ ہمارے تمام وسوسوں کو دھو ڈالنا...... نواب صاحب کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔ انہیں ان کے مقصد میں کامیاب فرمانا اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں کسی بڑے ذہنی و جذباتی دھچکے سے محفوظ رکھنا' ان کی صحت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔"

وہ دعائیں مانگنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"وولی...... میری گل سن۔"

"جس ابا......"

اللہ وسائی کی آواز مارے جھنجھلاہٹ کے تیز ہو گئی۔

"اس فیصلے میں تیری خوشی بھی شامل تھی۔ سب تیری رضامندی سے ہوا تھا اور اب تو خود مکر رہی ہے۔ بڑوں کا

فیصلہ توڑ کے اپنا فیصلہ آپ کر رہی ہے اور وہ بھی اتنا کم عقلی کا فیصلہ۔"

"ہاں اس فیصلے میں میری خوشی اور مرضی شامل تھی۔ مگر کچھ فیصلے تقدیر بھی کرتی ہے اور انسان کو ماننے پڑتے ہیں چاہے اس میں اس کی خوشی شامل ہو یا نہ ہو۔ اور پھر ابا جی' وہ فیصلہ صرف میری ذات کو خوشی دے سکتا تھا اس فیصلے کو توڑنے سے نقصان بھی صرف میری ذات کو پہنچے گا لیکن اگر میں یہ دوسرا فیصلہ نہ کرتی تو کسی اور کی زندگی برباد ہو سکتی تھی۔"

"یہ تو کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس فیصلے سے صرف تجھے خوشی ملنی تھی اور تجھے نقصان ہونا تھا کیا ہم سب تیرے کچھ نہیں لگتے' کیا ہم خوش نہیں تھے۔؟ اور اس وقت جو حالت میری ہے کیا یہ ساری بات جان کر تیری مامی اور شہزادے کو بھی اتنا ہی دکھ نہیں ہو گا۔ بول...... بتا اب' جواب دے میری بات کا؟ کیا اور کسی کا نقصان نہیں ہو گا' ہے تیرے میں اتنا حوصلہ کہ تو اپنے منہ سے اپنی مامی کو بتا سکے کہ وہ تجھے نوں بنانے کا خوب چھوڑ دے کیونکہ تو کسی اور جگہ ویاہ کرنے والی ہے۔"

اللہ وسائی نے اسے خوفزدہ کرنا چاہا اور وہ واقعی ہو بھی گئی۔ آنے والا وقت اسے ہولانے لگا۔ کہ کس طرح سامنا کرے گی وہ مامی کا...... خصوصاً "چھا جی" کیا توجیہ پیش کرے گی وہ اپنے اس اقدام کی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور آنکھیں زور سے میچ لیں۔

"بے وقوفے' ساری عمر کلستی رہی سکون اور عزت والی زندگی کے لیے' اب اللہ سوہنے نے رنگ لگائے ہیں تو آپ ناشکری کر رہی ہے۔ یہ جو تو کرنے جا رہی ہے۔ نری خودکشی ہے اور خودکشی حرام ہے۔ جس زندگی سے تو نفرت کرتی ہے وہ زندگی جان بوجھ کے جینا خودکشی ہی ہے۔ میں تجھ سے' ایک پکڑ کر گانا گانے کو کہتا تھا تو تو مرنے لگتی تھی اب کیسے تو ملک کے اشاروں پہ......"

اچانک کال بیل کی تیز آواز پہ اسے اپنا لیکچر موقوف کرنا پڑا۔

"یہ ستی سویرے کون آ گیا ہے۔"

وہ اٹھ کے دروازہ کھولنے گیا اور جاتے جاتے اس نے اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے اندر جھانکا جہاں بابر ہمایوں مغل اس کے بستر پہ جوتوں سمیت چت پڑا تھا۔ رات دعا کی مہمانی شاید وہ سہہ نہیں پایا اور گھر سے نکلتے نکلتے لہرا کے یہیں گر گیا۔ اللہ وسائی نے اس کے بے ہوش وجود کو بمشکل اٹھا کے اندر ڈالا تھا۔

"منحوس' خبیث انسان' آپ بے ہوش پڑا ہے۔ ادھر تھرتھلی مچا کے رکھ دی ہے۔ آدھی رات سے شروع ہوا ہوں اسے سمجھانے' اب سورج سر پہ آن کھولتا ہے۔ ہورے کیا جادو آتا ہے اس ذلیل بندے کو۔ وولی کی مت ہی مار کے رکھ دی ہے۔"

بے سدھ پڑے بابر کو کینہ توز نظروں سے گھورنے کے بعد وہ مسلسل بڑبڑاتا' اسے گالیاں دیتا آگے بڑھ رہا تھا مگر گیٹ کھولتے ہی اس کی خود کلامی کو بریک لگ گئی۔

سامنے ٹیکسی سے بالو اتر رہی تھی۔

اللہ وسائی نے بے ساختہ پلٹ کے پیچھے دیکھا جیسے کسی منتر کے ذریعے اپنے گھر سے بابر کے بے ہوش وجود کو غائب کرنا چاہتا ہو۔

"ہا...... ہائے بھرا اللہ وسایا' تو ایسے پروہنوں کی طرح کھڑا ہے جیسے میں تیرے دروازے پہ نہیں تو میرے گھر آیا ہے۔"

ڈیڑھ سو روپیہ ڈرائیور کے متھے مار کے وہ اب پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

"چنگا بھلا صبح نکلتے ہوئے شہزادے نے میرے سے پوچھا تھا کہ کہیں جانا تو نہیں گڈی ڈرائیور گھر چھوڑ دوں؟ پر اک تو تب میرا ارادہ نہیں تھا' دو جے میں نیند میں تھی۔ شہزادہ آج نکلا بھی تو ازانوں ویلے تھا۔ کے دو جے شہر

شوٹنگ واسطے نکلنا تھا۔ اور میں دھیان آیا۔ کہ ہا۔ ہائے میں نے تو ووٹی کا ناپ لینے جانا تھا کپڑوں کا جوتی کا چوڑی کا۔"

وہ خود ہی اپنے آنے کا مقصد بتاتی اندر بڑھنے لگی۔ وہ اسے روک بھی نہ سکا۔

"ناپ؟"

"آہو ناپ۔۔۔ بری نہیں بنانی میں نے اپنے پتر کی؟ دکھناوے بھرا۔ سارا شہر تک تک کے سڑے گا۔ میں ایسی شاندار بری بناؤں گی سو جوڑے سارے جھلمل جھلمل ست لڑا ہار۔ گلوبند پونڈوں والا ہار سورج مکھی ہار جھمکے سہارے والے ہیرے کا سیٹ کڑے باہی (بازوبند) پنجانگلہ پازیبیں بارہ چوڑیاں سر سے پیر تک سونے سے بھروں گی انشاء اللہ تعالیٰ اپنی دھی رانی کو۔"

اللہ وسائے کا دل ارمانوں بھرے اس کے جوشیلے لہجے کو سن سن کر کٹ رہا تھا۔

جیسے جیسے وہ قریب پہنچتی جا رہی تھی اس کی بلند آواز بھی اندر بیٹھی دعا تک پہنچنے لگی۔ وہ مضطرب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

یہ وہ وقت تھا وہ آنے والا وقت جس کا نقشہ اس کے سامنے کھینچ کر اس کا باپ اسے خوفزدہ کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ وقت پنکھ لگا کر اتنی جلدی آن پہنچے گا۔ ابھی تو اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار بھی نہیں کیا تھا۔

"لے تو بھی اپنے پیو کی طرح ہٹر ہٹر (ٹکر ٹکر) میرا منہ تک رہی ہے۔ لے دس تجھے کس بات پہ حیرت ہے۔ میرے اچانک بغیر بتائے آنے کی گڈی کی بجائے ٹیکسی پر آنے کی؟ یا پھر۔" وہ شرارت سے دعا کے سر پہ چپت لگانے لگی۔

"یا پھر شہزادے کے ساتھ آنے کی بجائے اکیلے آنے پر؟ یہی بات ہوگی ہے نا۔"

وہ چھیڑ رہی تھی اور دعا دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ ماں اکیلی آئی ہے۔

"بھئی سچی بات ہے مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مولا سلامت رکھے۔ گڈیوں والے پتر کی ماں ہوں۔ اللہ اسے دو کی بجائے چار چار گڈیاں موٹریں دیں۔ ہوائی جہاز دے لیکن آج میرا اتنا جی کر رہا تھا آنے کو۔ کہ ٹیکسی چھوڑ مجھے کھوتا ریڑھی پہ بھی آنا پڑتا تو میں آتی۔"

ٹھٹھا لگا کر ہنستے ہوئے اس نے اللہ وسائے کے کمرے کے سامنے رکھے صوفے پہ بیٹھنا چاہا ابھی تک اسے ان دونوں میں سے کسی نے بھی بیٹھنے کو نہیں کہا تھا جسے وہ ان کی حیرت سمجھ رہی تھی۔

"چلو بیٹھ بھی جاؤ اب ایسی بھی کیا حیرت؟ میں کوئی مر کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد تو نہیں آئی؟"

اس کے قہقہے تھم نہیں رہے تھے اور دونوں ٹانگیں اونچی کر کے صوفے پہ رکھتے ہوئے جب اس کی نظر بلا ارادہ ہی کھلے دروازے سے اندر پڑی تو خود بخود اور بات بے بات وجہ بے وجہ ابلتے یہ بے ساختہ قہقہے خود ہی تھم گئے۔

اس نے گردن ذرا آگے کر کے آنکھیں سکوڑ کے دیکھا۔ دعا کی سانس جیسے تھم گئی مگر بابر اوندھا گرا پڑا تھا۔ اس لیے وہ نہ جان پائی کہ اندر کون ہے۔

"ایہہ کون اے بھرا؟ پنڈ سے آیا ہے کوئی بندہ؟" چونکہ اللہ وسایا اس کے سسرال سے تھا برادری ایک تھی۔ اس لیے اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں نہیں کوئی نہیں۔ ایویں کوئی جاننے والا ہے۔" وہ بوکھلا کے دروازہ بند کرنے آگے بڑھا۔

"ٹھہر ذرا کون جاننے والا جوان دھی والا گھر ہے اور تو ایویں سی جان پہچان والے کو اندر سلا رہا ہے۔"

اسے اللہ وسائے کی ہڑبڑاہٹ مشکوک سی لگی اور اس کے حیران پریشان رویے سے مربوط بھی اس لیے وہ صوفے پہ بیٹھتے ہی دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اگرچہ اس وقت تک وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔

"دے تک ذرا کیسا ڈشکرا بندہ ہے مرداروں کی طرح سویا پڑا ہے۔ جوتی تک نہیں اتاری۔ ہے کون شودا۔"

اس نے دروازہ کھول کے ذرا قریب سے جھانکا اور یہ تبصرہ کرنے کے بعد پلٹ کے سوال کیا۔

اللہ وسائے کے چہرے پہ عجیب ہی تاثرات تھے جیسے وہ یا تو اس کے بھاگنے کے چکر میں ہو یا خود رفو چکر ہونا چاہتا ہو۔ اور دعا اس کا تو رنگ ہی فق ہو چکا تھا۔ اب بالو کو بھی اس کا رویہ غیر معمولی لگنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ حیرت دراصل اس کے بغیر اطلاع کے اچانک آنے کی نہیں تھی۔ یہ حیرت شدید قسم کی گھبراہٹ میں چھپی ہوئی تھی۔

"ایسا کیا ہو سکتا ہے جو یہ دونوں مجھ سے چھپانا چاہ رہے ہیں۔" اس نے اچنبھے سے سوچا۔

"بھرجائی۔ کھلو جا (ٹھہر جا)" اللہ وسائے نے اسے بابر کی جانب بڑھتا دیکھ کے روکنا چاہا۔ پھر بت بنی کھڑی دعا کو جھنجھوڑا۔

"آواز دے اسے۔" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی جو ہونے جا رہا تھا اس کے بعد وہ ماں کی نظر میں بے حد ہلکی ہو سکتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ نہ تو اس ہونے کو روکنے کی خواہش مند تھی۔ نہ ہونے سے روکنے پہ قادر۔ اس کا دل چاہ رہا تھا جو ہونا ہے اور جو جو بھی ہونا ہے وہ ایک ہی بار ہو جائے جلدی سے ہو جائے۔

"توبہ۔۔۔ یہ تو شراب چڑھا کے سویا ہوا ہے۔" اس کے قریب پہنچنے پہ بدبو کے بھبکے اٹھتے محسوس ہوئے تو بالو نے ناک پہ دوپٹا رکھا پھر اللہ وسائے کو غصے سے دیکھنے لگی۔

"کیسا بے وقوف انسان ہے تو بھرا۔ ایسے نشئی آوارہ یاروں کو کوئی گھر میں گھساتا ہے اور وہ بھی رات رات بھر کے لیے؟ جوان دھی کا پیو ہے مگر عقل ماشہ برابر بھی نہیں ہے۔ اب دیکھ اگر شہزادے کو خبر ہوئی تو کتنا برا لگے گا اسے۔ اب وہ صرف تیرا بھتیجا نہیں ہے۔ ہونے والا جوائی ہے۔ جوائی پتر سے بڑھ کے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ آڈا لگانا کوئی عقل والی بات تو نہیں ہے۔"

وہ حسب عادت اپنی بلند آواز میں بگڑ رہی تھی۔ کہ بابر اپنے سر کے عین اوپر ہونے والی اس بمباری سے ہوش کی دنیا میں آگیا۔

لڑکھڑاتے ڈگمگاتے ہوئے وہ بستر سے اتر کر کھڑا ہو رہا تھا۔ اور دعا اور اللہ وسایا بالو کے عقب سے نمودار ہوتے اس کے مضمحل۔ وجود کو دیکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنے والی قیامت کا تصور کر رہے تھے۔

"اوہ۔۔۔ ہم ہم اب تک یہیں ہیں۔"

وہ ہوش میں ضرور آ چکا تھا مگر ذہن پوری طرح بیدار نہیں تھا اس لیے صورت حال کی سنگینی کو بھانپ نہیں سکا نہ دعا کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی نوٹ کر سکا صرف اسے اتنا ہی اندازہ ہو پایا کہ اب تک وہ ان کے گھر میں ہے حالانکہ وہ تو رات کو ہی چل نکلا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ نکلتے ہوئے اسے خاصا زبردست چکر آیا تھا۔

"تو کیا ہم رات بھر یہیں تھے؟"

اس کی آواز پہ بالو اچھل کے پلٹ تو چکی تھی اب اس کے لہجے پہ غور کر کے اور اس کے چہرے کو کھوج کر یہ جان چکی تھی کہ سامنے کھڑا شخص کون ہے۔ اس کے باوجود اسے یقین نہ ہوا۔ اس نے تصدیق طلب نگاہوں سے دعا کو دیکھا۔ اس نے مجرمانہ اعتراف کے ساتھ گردن جھکالی۔

یہ بالو کے ان سوالوں کا جواب تھا جو اس نے ابھی کیے بھی نہیں تھے۔

"دوئی۔۔۔؟"

صدمے اور بے یقینی سے اس کی آواز گھٹ گئی۔

"یہ کیا ہے؟ کیوں پڑا ہے یہ اس گھر میں؟"

بہت جلدی اس کا یہ صدمہ طیش میں بدل گیا اور وہ حلق پھاڑ کے چلانے لگی۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ یہاں موجود سب کے پرخچے اڑا کے رکھ دے۔

اس نشئی بابر کے بھی۔

اس ذلیل لالچی اللہ وسائے کے۔

اور اس بے وفا اور دھوکے باز لڑکی دعا کے بھی۔

یہ سب اسے اپنے لاڈلے اکلوتے بیٹے شہزاد کی خوشیوں کے قاتل لگ رہے تھے۔ سب نے مل کے اس کی محبت اور اعتماد کو لوٹا تھا۔

"دیکھیے محترمہ، ہم آپ کو بتاتے ہیں۔۔۔"

ان دونوں کو کسی قسم کا جواب دینے کی صلاحیت سے عاری دیکھ کر بابر نے ہی ہمت پکڑی اور وضاحت کرنے لگا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ۔"

"وے، پراں مرتو۔"

بالو نے دونوں ہاتھوں سے اسے دھکا دے کر پیچھے کیا۔

"فراڈیا۔۔۔ چار سو بیس اور تو۔۔۔ تو دوئی تجھے شرم نہیں آئی، میرے شہزادے کی منگ ہو کر اسی کے مرضی کے خلاف جاری ہے۔ تجھے پتا نہیں کہ وہ اس بندے سے کتنی خار کھاتا ہے اور تو نے اپنے پیو کو منع تک نہیں کیا کہ وہ اسے گھر میں نہ آنے دے۔ مجھے تو تیری خاموشی سے لگ رہا ہے کہ یہ جو بے غیرتوں کی طرح یہاں ٹن ہو کے پڑا ہے تیری وجہ سے ہی پڑا ہے۔"

دعا نے اس الزام کی تردید نہیں کی جو بالو نے شاید وقتی اشتعال کے تحت لگایا تھا ورنہ اس کا دل ابھی تک یہ نہیں مان رہا تھا کہ وہ اس کے یا شہزاد کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے لیکن دعا کی خاموشی اس کے شک کو تقویت پہنچا رہی تھی۔ وہ اور بھی بھڑ گئی۔

"بے حیا بے فیض ہاتھ میں انگوٹھی میرے پتر کی پہنی ہوئی ہے اور گھر میں یہ شرابی تو سرباز گھسایا ہوا ہے۔"

جواباً دعا نے اپنی انگلی سے شہزاد کی پہنائی انگوٹھی اتاری اور مرے مرے قدم اٹھاتی بالو کے سامنے آئی۔ اس کا ہاتھ ایک میکانکی انداز میں آگے بڑھا اس کی ہتھیلی پہ وہ انگوٹھی دھری تھی۔

مگر بالو اس انگوٹھی کو اٹھانے کی بجائے صدمے اور بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

"دوئی یہ۔۔۔ تو نے انگوٹھی اتار دی ایک بار بھی نہیں سوچا کہ شہزاد نے یہ کتنے ارمانوں سے خریدی تھی کیا ہو گیا ہے دوئی تجھے؟ مجھے بتا کیا کوئی تجھے مجبور کر رہا ہے، اللہ وسایا دھمکا رہا ہے؟ بتا مجھے چندریئے۔"

وہ پل میں تولہ پل میں ماشہ کی تفسیر بنی اب دلار سے بھیگے لہجے میں اسے چمکار رہی تھی۔

اس نئے الزام پہ اللہ وسایا نے بدبدا کر کچھ کہنا چاہا مگر بالو نے اس کا موقع نہ دیا۔

"مجھے پتا ہے تو ایسی نہیں ہے، تو تو میری بڑی بیبی بچی ہے۔ ضرور تجھے کسی نے ورغلایا ہے۔ دفع کر تو ساروں کو کیا لوڑ ہے کسی سے دبنے کی، چل تو میرے ساتھ میرے گھر چل۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

بالآخر وہ بول ہی پڑی۔۔۔ اسے بولنا ہی پڑا ورنہ ماسی کی محبتیں اسے کمزور کرنے لگی تھیں۔

"آپ یہ انگوٹھی واپس لے لیجیے ماسی جی۔"

اتنے واضح بیان کے بعد بھی بالو کا ہاتھ اسے لینے کے لیے نہ بڑھا تو دعا نے خود انگوٹھی اس کے ہاتھ میں رکھ کے مٹھی بند کر دی۔

"چھاجی سے میری جانب سے معافی مانگ لیجیے گا مگر میں ان سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"مگر کیوں پتر؟ کوئی ناراضگی ہوئی ہے؟ کچھ کہا ہے شہزادے نے؟ مجھے بتا، میں اس کی خبر لیتی ہوں۔ کان پکڑ کر آئے گا۔۔۔ ناک رگڑتے ہوئے۔"

"اس کی ضرورت نہیں انہیں منع کر دیجیے، یہاں مت آئیں ویسے بھی کل کے بعد شاید میں یہاں نظر نہ آؤں۔ بابر صاحب سے شادی کے بعد میں فوراً" یہ ملک چھوڑ رہی ہوں۔"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے بدبختے تو اس سے شادی کرے گی؟ مجھے لگتا ہے اس نے تجھ پہ کالے جادو کا بڑا ابھرا وار کیا ہے، کچھ ہوش کر دوئی۔"

بالو اسے جھنجھوڑنے لگی۔

دعا کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ وہ اب ماسی کے کسی بھی مزید سوال کا جواب دینے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی۔

"چھوڑیے مجھے آپ کو سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کہہ رہی ہوں۔ نہیں کرنی مجھے آپ کے بیٹے سے شادی کوئی زبردستی ہے کیا؟"

وہ بدتمیزی سے اپنا آپ چھڑاتی وہاں سے نکلی۔

"دوئی پتر۔" اللہ وسایا اس کے پیچھے لپکا۔

"مجھے جانے دیں ابا جی۔۔۔ کچھ دیر تک آ جاؤں گی۔ تب تک آپ ماسی کو سمجھا بجھا کے واپس بھیج دیں پلیز۔"

وہ تیزی سے کہتی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ فرار سے بہتر راستہ کوئی نظر نہ آ رہا تھا۔

وہ تھکے ہارے قدموں سے اندر لوٹا تو بالو خشمگیں نگاہوں سے بابر کو تک رہی تھی جو بستر کے سرے پہ نڈھال انداز میں سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

"بھرجائی تو اب گھر جا معاف کر دے، ہم دونوں کو۔"

اس نے عاجزانہ انداز میں اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑے۔

"معاف؟۔۔۔ معاف تو تجھے میں مر کے بھی نہ کروں گی۔ تو نے ہورے کون سی دشمنی نکالی ہے"

"میں نے کج نہیں کیا بھرجائی۔ رب دی سوں۔۔۔ میں نے بڑا سمجھایا دوئی کو مگر۔۔۔ مگر یہ جو نیش (منحوس) انسان ہے نا۔۔۔ اس نے میری کڑی کو کج سوچنے سمجھنے جوگا ہی نہیں چھوڑا۔"

وہ پتا نہیں اور کتنی دیر تک اپنی صفائیاں پیش کرتا رہتا کہ کال بیل کی آواز پہ اسے پھر سے کمرے سے نکلنا پڑا۔

"دوئی آ گئی۔۔۔"

بالو ایک بار پھر خوش امید ہوئی۔

"اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو گا۔ دیکھنا ابھی آ کر کہے گی، ماسی میں نے تو مخول کیا تھا"

"وہ گڈی پہ گئی ہے بھرجائی، باہر رکشے کی آواز آئی ہے۔"

اللہ وسائے نے نکلتے نکلتے اس کی اس آخری خوش فہمی کا گلا گھونٹنا ضروری جانا۔

"ہاں جی، کس سے ملنا ہے آپ جناب ہوراں نے؟"

اگرچہ اس کا مزاج اس وقت انتہائی گرا ہوا تھا مگر دروازے پہ کھڑی شخصیت اتنی بارعب، محترم اور بزرگ تھی کہ خود بخود اس کا اجڈ لہجہ مہذب ہو گیا۔

"ہم صاحبزادہ نفیس علی خان ہیں اور ہمیں محترمہ دعا صاحبہ سے ملنا ہے۔"

اتنا شائستہ لب و لہجہ۔۔۔ ایسا قابل عزت انداز دعا کے نام کے ساتھ محترمہ اور صاحبہ۔

اللہ وسایا اندر ہورہے ڈرامے کو بھول بھال ایک دم ریشہ خطمی ہو گیا۔

"محترم کیا ہم ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکتے ہیں؟"

اس طرز تخاطب پہ وہ اور ہواؤں میں اڑنے لگا۔

"وہ۔۔۔ گھر پہ نہیں ہے اس وقت۔"

"آپ کی تعریف۔۔۔ اسم گرامی؟"

اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا کہ گھما پھرا کے تعارف مانگا جا رہا ہے اس لیے فوراً" اپنا نام بتایا اور فخریہ دعا سے اپنا رشتہ بھی۔ "میں باپ ہوں جی اس کا۔"

"تو پھر ہم جس مقصد کے تحت آئے ہیں، وہ آپ سے گفتگو کر کے بھی پورا ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا ہم آپ کا کچھ وقت لے سکتے ہیں۔"

"وہ جی۔۔۔ دعا نے پروگرام لینا کچھ دنوں کے لیے بند کر دیے ہیں۔"

اس نے یہ جواب اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنے تئیں بڑی متانت سے دیا تھا جو نواب صاحب کو سخت گراں گزرا۔

"لاحول ولا۔۔۔ برادرم ہم یہاں ایک بے حد ذاتی مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔"

"آج سارے مسئلے ہمارے گھر ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔" وہ بڑبڑایا، پھر کوئی خیال آنے پہ راستہ دینے کے لیے ذرا سا پیچھے ہٹا۔

"چلو جی، آؤ تسی وی۔۔۔"

اس کا خیال تھا شاید کسی مہمان کی آمد کی وجہ سے بالو اپنا لڑنے جھگڑنے کا پروگرام موقوف کر کے گھر سدھارے اور وہ مزید کسی قسم کی صفائی دینے کی زحمت سے بچ جائے۔

"تشریف لاؤ جناب، آپ کا مسئلہ بھی سن لیتے ہیں۔" وہ یوں مدبر بن کے احسان جتا رہا تھا جیسے اس سے قبل باقاعدہ پنچایت لگا کر لوگوں کے مسائل حل کرواتا رہا ہو۔

صاحبزادہ نفیس علی خان دھڑکتے دل کے ساتھ سج سج قدم اٹھاتے اس کے پیچھے اندر داخل ہونے لگے۔

☆ ☆ ☆

دعا وہاں سے سیدھی نگاہ کے فلیٹ جا پہنچی۔

"ارے تم اتنی صبح سویرے؟"

دن کے گیارہ بجنے والے تھے مگر اس کے لیے یہ صبح سویرے کا وقت ہی تھا۔ اس کی آنکھ ہی کال بیل پہ کھلی تھی۔ آنکھیں مسلتے، جمائیاں لیتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے دعا تھی۔

"تم سے ایک بہت ضروری کام تھا۔"

اس نے سنجیدہ انداز میں اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

"تو اللہ کی بندی، صبح تک کا انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ دن تو چڑھ لینے دیتیں ارے دھوپ نکل آئی؟"

اس سے بات کرتے کرتے اس نے برآمدے کے پردے کھینچے تو باہر سے آتی چلچلاتی دھوپ اور تیز روشنی سے اندازہ ہوا کہ کیا وقت ہو چلا ہے۔

"کمال ہے، پتا ہی نہیں چلا۔ آؤ بیٹھو تم۔ چائے تو پیو گی؟ ناشتا منگواؤں تمہارے لیے۔"

وہ آداب مہمان نوازی نبھانے لگی۔

"یہ سب رہنے دے، میری بات سنو بیٹھ کے۔"

مگر وہ ان سنی کرتے ہوئے برآمدے کے چھجے سے آدھی باہر لٹک کر نیچے والی دکانوں کے چھوکروں کو آوازیں دینے لگی۔

"دو تین کلچے لگا کر ذرا نرم نرم سے، ایک پاؤ دہی۔۔۔ میٹھا ڈالا ہو اور ایک پلیٹ چنے۔۔۔ ذرا جلدی بھیجنا۔"

"نگاہ میں ناشتا نہیں کروں گی۔"

اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"ہاں ہاں پتا ہے، تمہیں تو یوں بھی کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بندوں کا ناشتا اس لیے منگوایا ہے کیونکہ گھر میں ایک مہمان موجود ہے، اب سب لوگ تمہاری طرح چائے پہ گزارا کرنے والے تو نہیں ہوتے۔۔۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں، پھر کرتے ہیں غور تمہاری ضروری بات پہ۔"

مگر دعا کا ذہن تو لفظ "مہمان" پہ ہی اٹک گیا تھا۔ اس نے چائے بنانے کے لیے اٹھتی نگاہ کا ہاتھ تھام کر اسے دوبارہ بٹھایا۔

"کون مہمان؟"

"ہے کوئی۔۔۔ مہمان بھی کیا، بلائے جان سمجھ لو، مفت کا عذاب۔" اس نے منہ بنایا پھر خود ہی ہنس پڑی۔

"خیر مفت کا تو نہیں ہے یوں سمجھ لو، پے انگ گیسٹ ہے۔"

"پھر تو مشکل ہو جائے گی۔" وہ بڑبڑائی۔

"کیوں؟ خیریت؟"

"دراصل مجھے تمہاری مدد کی ضرورت تھی تمہاری بھی اور تمہارے گھر کی بھی لیکن یہاں تو تمہارے مہمان موجود ہیں۔ شاید میرا کام نہ ہو سکے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ تمہیں میری مدد کی یا میرے گھر کی ضرورت ہو تو کس کی مجال ہے، جو بیچ میں آ سکے، میں لات مار کے باہر نہ نکال پھینکوں اور دوسری بات کہ اس کی نوبت ہی نہیں آنے والی بے ضرر سی لڑکی پڑی ہوئی ہے اندر۔۔۔ تم بتاؤ، کیا بات ہے؟ ایسا کیا کام ہے؟"

"نگاہ، بات یہ ہے کہ مجھے نکاح کرنا ہے، آج ہی کرنا ہے اور وہ میں اپنے گھر یا کسی بھی اور جگہ کرنے کی بجائے یہاں، تمہارے فلیٹ پہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"نکاح؟" نگاہ اچھل ہی تو پڑی۔

"تم تو بتا رہی تھیں کہ تمہاری شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ اگلے ماہ کی ستائیس۔۔۔ پھر ایکا ایکی نکاح کا فیصلہ۔۔۔ اور وہ بھی اتنا خفیہ اور ہنگامی۔۔۔ کیا لڑکا بھاگا جا رہا ہے؟۔۔۔ مجھے بتاؤ، کسی رقیب روسیاہ کا چکر تو نہیں۔۔۔ میں دو ہاتھ لگا کے مزاج ٹھکانے لگا دوں اس چھمک چھلو کے۔"

وہ غیر سنجیدہ تھی اور دعا کو اس کی لن ترانی ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ تم آرام سے میری بات سنو۔"

"اور کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔ گھر والے بھی تم دونوں کے ہی رضامند تھے بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے بتایا تھا کہ تمہاری ہامی شہزاد صاحب سے بڑھ کے اتاولی ہو رہی ہیں تمہیں اپنے گھر لے جانے کے لیے۔"

وہ اندازے قائم کرنے کے موڈ میں تھی۔۔۔ دعا نے زچ ہو کر سر تھام لیا۔

"خیر۔۔۔ ان آج کل کی ساسوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ہو گا کوئی مسئلہ ڈال دیا ہو گا کوئی پھڈا اور اب تم دونوں اس خفیہ اور ایمرجنسی نکاح کے ذریعے اگلے ماہ ہونے والی اپنی شادی کو محفوظ کرا رہے ہو۔۔۔ تم بے شک مت بتاؤ مجھے پتا چل گیا ہے کہ تمہیں شہزاد صاحب کی والدہ کی دخل اندازی سے خطرہ ہے۔"

"خطرہ ان کی والدہ سے نہیں، خود شہزاد صاحب کی جانب سے ہے۔ میں ان کی کسی بھی قسم کی رخنہ اندازی کے ڈر سے ہی یہ نکاح اپنے گھر کی بجائے تمہارے گھر کر رہی ہوں۔"

"وہ ایسا کیوں کریں گے۔۔۔ اور ان سے چھپ کر ان سے ہی نکاح؟ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تم کیا انہیں اغوا کر کے لاؤ گی، آنکھوں پہ پٹی باندھ کے وغیرہ وغیرہ۔"

اس کا خیال تھا، دعا کوئی مذاق کر رہی ہے اس لیے وہ بھی اس بات کو مذاق کی طرح ہی لے رہی تھی۔

"بکواس بند کرو نگاہ، میں شہزاد سے نہیں کسی اور سے نکاح کرنے والی ہوں۔ اب تم ایک سوال بھی مزید مت کرنا ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

وہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ دعا کی دھمکی سے ڈر گئی تھی بلکہ واقعی اس کے پاس پوچھنے کو کچھ نہ رہا تھا۔

دعا کی بلند آواز نے اندر موجود دلکش کی نقاہت بھری غنودگی میں بھی خلل ڈالا۔ کل سے وہ کتنی ہی بار ہوش میں آچکی تھی اور ہر بار کبھی صدمے سے۔۔۔ کبھی نقاہت سے تو کبھی نگاہ کی مہربانی سے دوبارہ بے ہوشی کی آغوش میں چلی جاتی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اٹھی اور کمرے کے دروازے میں ایستادہ ہو گئی۔

چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر صدیوں کی تھکن اس کے چہرے پر رقم ہو چکی تھی۔ اب تک وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ وہ کس سانحے سے گزر چکی ہے مگر اس کا معصوم اور نا تجربے کار ذہن یہ قبول نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ایسا تو اس نے کبھی سنا ہی نہ تھا۔ ایک سیدھی سادی سپاٹ اور محدود زندگی گزارتی آئی تھی وہ۔ اور اب اکٹھے ہی کئی افتادیں اس پہ ٹوٹ پڑی تھیں۔ گھر سے دربدری محسوس ہونے کا خوف بیمار ماں سے لاعلمی بھائیوں اور باپ سے دوری اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ آگے کیا ہونے والا ہے اور جب اس کا کچا ذہن ہلکان ہونے لگتا تھا تو تھک کے اسے دوبارہ غفلت کی نیند سلا دیتا تھا۔

ہوش اسے رہتا ہی کیا تھا آنسو۔

جو اس وقت اس کی ویران آنکھوں میں بھرے تھے اور جن کو دیکھ کر دعا اپنی بات کرتے کرتے بھول گئی تھی۔

"یہ بچی کون ہے؟"

"یہ۔۔۔ بچی آفت ہے پوری۔" نگاہ نے گردن گھما کے اسے دیکھا اور بڑبڑا کے کہا۔

"ساری آفتیں میرے ہی متھے لگتی ہیں کوئی تیرے جیسی بن بلائی اور کوئی اس جیسی مول خریدی ہوئی۔"

"مول خریدی ہوئی؟"

"ہاں یہی وہ مہمان ہے جس کی بات کر رہی ہوں میں ملک مقبول نے دو دن کے لیے اسے ٹھہرایا ہے میری طرف اور تم جانو' میرا یہ کام نہیں۔ ایسی معصوم من موہنی صورت' سختی سے کام لیا نہیں جاتا میرے سے۔۔۔ اور پیار کی زبان یہ ڈھیٹ سمجھتی نہیں۔ بس ایک حربہ ہے میرے پاس۔ اس کی اپنی معصومیت تو اس کے ساتھ کچھ برا کرنے نہیں دیتی۔ صورت دیکھتے ہی دل موم ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں اس کے باپ کی شکل تصور میں لاتی ہوں۔۔۔ پھر مجھے لگ جاتی ہے آگ۔۔۔ پھر تو میں اس کے ساتھ جو بھی کروں وہ کم ہے۔"

"ہے کون وہ۔۔۔ جس کا تصور ہی تمہیں اس قدر بھڑکا دیتا ہے؟ کوئی پرانی دشمنی؟"

دعا بھی اپنا مسئلہ بھول بھال دلکش کے بارے میں دلچسپی لے رہی تھی اس کا وجود تھا ہی توجہ کے قابل۔

"میری کیا دشمنی ہونی ہے۔ وہ ہے ہی زمانے بھر کا دشمن اور پھر جو میری دوست کے ساتھ دشمنی کرے گا وہ میرا بھی تو دشمن ہی ہوا نا۔۔۔ یہ بابر ہمایوں مغل کی لونڈیا ہے اسی بابر کی جو تجھے بیچنے نکلا تھا' آج اس کی اپنی لڑکی کے بھاؤ لگ رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں مکافات عمل۔"

"بابر کی بیٹی۔۔۔ یہ؟"

یہ انکشاف دعا کے لیے ایک غیر متوقع معجزہ تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اسے تم مجھے دے دو نگاہ۔۔۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔"

"تم کیا کرو گی' جو کرنا ہے ملک کرے گا۔ تمہیں بھی کلیجے میں ٹھنڈ ڈالنا ہو گی' بس یہ دیکھ کر ڈال لینا کہ جیسے تمہارے دام کھرے کر رہا تھا مغل کا بچہ ویسے اس کی بیٹی کی بولی لگنے والی ہے اور قدرت انتقام لے رہی ہو تو اپنے ہاتھ گندے کیا کرنے۔"

وہ سمجھی کہ دعا بابر ہمایوں مغل کی کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لینے کی خاطر دلکش کو ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ دوسری طرف دلکش یہ سب گفتگو سن کر کپکپا رہی تھی۔ اپنے باپ کے بارے میں نت نئے انکشافات اس پہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس کے ساتھ جو بھی ہوا ہے اور جو کچھ ہونے جا رہا ہے' ان سب کا ذمہ دار وہی ہے۔ وہ کانپتی لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

"چہ چہ۔۔۔ چڑیا ہی تو ہے۔"

نگاہ نے ایک تاسف بھری نظر اس پہ ڈالی۔ اس کی کل سے عجیب متضاد حالت تھی۔ کبھی دلکش پہ رحم آتا۔ کبھی پیار کبھی وہ ایک دم سنگدل ہو جاتی۔

"اس کی شکل دیکھو تو خود بخود دل موم ہونے لگتا ہے یہ اگر بابر کی لڑکی نہ ہوتی تو میں اسے اب تک بھگا چکی

ہوتی۔ سچ کہہ رہی ہوں شاید میں تب نہ پیسے کی پروا کرتی نہ اپنی جان کی اور کچھ نہیں تو کم از کم چار پیسے کے لالچ میں اس گناہ کی حصہ دار نہ بنتی۔ لیکن میں کہتی ہوں اس بابر کے ساتھ جو بھی ہو وہ کم ہے۔"

"سچ کہتی ہو۔۔۔ بابر کے ساتھ جو ہو وہ کم ہے' مگر صرف بابر کے ساتھ کیونکہ وہ اسی قابل ہے۔"

"تو تم اسے ساتھ کیوں لے جانا چاہ رہی ہو۔"

"کیونکہ میں آج شام تمہارے گھر میں اسی کے باپ کے ساتھ نکاح کرنے والی ہوں۔"

اس نے نگاہ کے سر پہ دھماکا کیا تھا مگر تیورا کر زمین پر دلکش آگری تھی۔

☼ ☼ ☼

آج گرمی معمول سے زیادہ تھی۔ گرمیوں کی طویل تپتی دوپہروں میں اکثر عمیص' اسٹور چند گھنٹوں کے لیے بند کر کے گھر آجایا کرتا تھا مگر آج اسے نجانے کیا ہوا تھا کہ ظہر سے کافی پہلے ہی آ گیا۔

"خیریت' آج تم اتنی جلدی آ گئے۔ بھوک لگی ہو گی۔ صبح ناشتا بھی تو نہیں کیا۔۔۔ صرف لسی پی کر گئے تھے۔"

موتیا نے اسے دیکھ کر وجہ دریافت کی پھر خود ہی قیاس ظاہر کیا۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر ایئر کولر کے بالکل سامنے بچھے تخت پر نڈھال سے انداز میں ڈھیر ہو گیا جہاں صاحبزادی حرمت النساء اچار کے لیے مسالا تیار کر رہی تھیں۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے عمیص میاں؟ بہت تھکے تھکے محسوس ہو رہے ہیں۔"

انہوں نے سب سامان سمیٹ کر ایک طرف کیا اور اپنے ہاتھ پونچھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

"بس چچی حضور عجیب سی کسلمندی ہے اور عجیب سی بے دلی ہے' کسی کام میں دل نہیں لگ رہا۔"

وہ بالوں کو مٹھیوں میں بھینچ کر ہلکے ہلکے جھٹکے دیتا خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آج دن بھی تو بہت گرم ہے۔ میں فالسے کا شربت لاتی ہوں تمہارے لیے۔"

موتیا کچن کی جانب مڑی تو عمیص سر جھٹک کے ہنس دیا۔

"یہ موتیا بھی نا چچی حضور۔۔۔ اس کے نزدیک ہر مسئلے کا حل کوئی نہ کوئی شربت' اور ہر پریشانی کی دوا کوئی نہ کوئی حلوہ ہوتا ہے' بتا ہے کیا چچی حضور۔"

وہ ذرا سا سرک کے ان کے زانو تک آیا اور اپنا سر لاڈ سے وہاں ٹکا دیا۔

"بے دلی تو جو ہے سو ہے' ایک بے کلی بھی ہے۔ جس کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"عجیب بات ہے' اسی بے کلی نے تو ہمارا بھی احاطہ کیا ہوا ہے آج سویرے سے دل ہے کہ گویا پنکھے لگے ہوں جیسے۔۔۔ ہزار و سو سے' اندیشے۔۔۔ انہی سے گھبرا کے تو ہم نے آپ کے چچا حضور کو روکنا چاہا تھا کہ آج وہ گھر سے نہ نکلیں مگر آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہے۔ ہماری بات کو خاطر میں کب لاتے ہیں۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں چچی حضور؟ حیرت ہے۔۔۔ کوئی اور کچھ کہتا تو آپ نے اپنے مجازی خدا کی وکالت کرنے میں گھنٹوں لگا دینے تھے آج مجھے سہیلی بنا کے دل کا بوجھ ہلکا کیا جا رہا ہے' کوئی تو خاص بات ہے۔ بائی دا وے' یہ چچا حضور آج گئے کہاں ہیں؟"

"وہیں۔۔۔ جو سودا سر میں سمایا ہے۔ ہم تو بات کر کے پچھتائے۔ مانا کہ وہ صورت دیکھ کر ہمارے دل میں بھی کھد بد ہوئی تھی مگر آپا حضور نے سمجھایا تھا کہ سربستہ رازوں کو راز رہنے دینا چاہیے۔ اب تو ہمارا دل بھی نہیں مان رہا کہ نواب صاحب اس قصے کو چھیڑتے۔ واقعی شکل و صورت کی مشابہت تو ایک عام سی بات ہے۔ کیوں عمیص میاں؟"

مگر وہ اس سوال کا جواب دینے کی بجائے یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کی بے نام سی گھبراہٹ بھی اسی وجہ سے تو نہیں کیونکہ چچا حضور کے جانے کا سن کر اسے یکدم ایک وحشت نے آن گھیرا تھا۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔

اسے جھٹکے سے اٹھتا... اور عجلت میں جوتے پہنتا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"میں ابھی آتا ہوں چچی حضور۔"

"کیا آپ اپنے چچا حضور کے پاس۔"

"جی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا گھر سے وہ زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے' ڈانٹیں گے' ناراض ہوں گے' پروا نہیں مگر میں ان کے پیچھے ضرور جاؤں گا۔"

وہ تیر کی طرح نکلا اور صاحبزادی حرمت النساء اس کی پشت پہ دعائیں پڑھ کے پھونکتی رہیں۔

"ہائیں۔۔۔ یہ عمیص کہاں گیا؟"

موتیا شربت بنا کے لائی تو اسے غائب پایا۔

"بس چلے گئے۔" انہوں نے بھی تفصیل سے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

صاحبزادہ نفیس علی خان خود نہیں جانتے تھے کہ وہ جہاں جا رہے ہیں' وہاں سے انہیں اپنے کن کن سوالوں کا کیا کیا جواب ملنے والا ہے مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ پہلا قدم اندر رکھتے ہی ان کے سوالوں میں ایک کا اضافہ اور ہونے والا ہے۔

داخلی دروازے پہ ہی ان کی مڈبھیڑ بابر ہمایوں مغل سے ہو گئی۔۔۔ ان کے اطلانس داماد سے۔

جو بلقیس بیگم کی طعنہ زنی سے گھبرا کے وہاں سے کھسک رہا تھا اور اب اپنے سسر کو سامنے دیکھ کے نہ آگے بڑھ سکتا تھا' نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ خود نواب صاحب بھی دم بخود تھے۔

"بابر میاں آپ؟۔۔۔ آپ اور یہاں؟"

بابر کی گردن سینے سے جا لگی۔

بالو نے بھی نواب صاحب کو فوراً" پہچان لیا۔ اس کے سینے میں پہلے ہی آگ بھری تھی۔ بھڑاس نکالنے کا ایک بہانہ مل گیا۔

"یہ یہاں نہیں ہو گا تو کیا تمہاری اونچے چوباروں والی حویلی میں ہو گا۔ بڑے میاں۔۔۔ دن لد گئے تمہاری لاڈو رانی کے اب یہ نئی نئی بلبلوں کے چکر میں ہے اور تم بھی تیری میری بے عزتی کرنے کی بجائے اپنی لڑکی کے گھر پہ توجہ دو۔ اپنی اولادوں کے کرتوت سنوارو۔۔۔ میرا میاں' میرا کیا تمہاری کالی زبان کے وار نہ سہہ سکا اور اوپر چلا گیا غیرت والا تھا نا۔۔۔ اب اگر تم میں غیرت ہے تو جاؤ تم بھی چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔"

"بھر جائی۔۔۔ بھر جائی کیا کہہ رہی ہے تو۔ ہوش کر۔ گھر پروہنا آیا ہے۔ کچھ تو عقل کر۔"

اللہ وسائے نے روکنا چاہا۔

خود نواب صاحب کا یہ حال تھا کہ اس عورت کی زہر افشانی کے بعد ایک پل یہاں رکنے کے روادار نہیں تھے مگر بابر کی یہاں موجودگی انہیں اب تک روکے ہوئے تھی۔

"کیا ہم پوچھ سکتے ہیں بابر میاں کہ آپ یہاں اس گھر میں کیا کر رہے ہیں؟"

پہلی بار انہوں نے اپنے داماد سے اتنی بلند آواز میں بات کی تھی اور اگرچہ وہ بالو کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھے اسے بھی اور اس کی مشتعل کرنے والی گفتگو کو بھی مگر وہ جواب دیے بغیر نہ رہ سکی۔

"یہ کیا بتائے گا مووا۔۔۔ دلال۔۔۔ میں بتاتی ہوں' یہ اپنی شادی کی تاریخ رکھنے آیا ہے ادھر۔۔۔ بڈھا گھوڑا۔۔۔ اور چاہ چڑھا ہے سرا باندھنے کا۔ پہلے بھی تمہاری وجہ سے میرے پتر کی زندگی بنتے بنتے خراب ہوئی' اس کا دل ٹوٹا اور اب اگر وہ دوبارہ ہمت کر کے گھر بسانا چاہ رہا تھا تو تم نے اپنے جوائی کو پیچھے لگا دیا۔ شاباش ہے بھئی تم عزت داروں پہ۔۔۔ اپنی دشمنی نکالنے کے لیے بیٹی تک کی پروا نہیں کی۔ اس کا گھر خراب کر کے جوائی کو دوسری شادی کروا رہے ہو تاکہ میرے پتر سے دشمنی پوری کر سکو۔"

"خاتون آپ کیا کہہ رہی ہیں ہم کچھ سمجھ نہیں پا رہے خدارا آپ خاموش ہو جائیے۔"

وہ عاجزی سے کہنے پہ مجبور ہوئے۔

"اچھا تو تسی بابر کے سسر صاحب ہو اور اسی لیے آئے ہو گے ہمارے گھر۔ میری دوئی کو الزام دینے۔"

اب کے اللہ وسائے نے زبان کھولی۔

"مگر میں صاف بات بتاتا ہوں جناب۔ میری بچی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ کی بیٹی کا گھر خراب نہیں کر رہی۔ اچھا بھلا اس کا ویاہ اس کے مامے کے پتر سے ہونے والا تھا۔ وہ خوش تھی۔ راضی تھی۔ یہ بیچ میں بابر آ گیا اور ایسا مسئلہ لے کر آیا کہ سارا کچھ خراب ہو گیا۔"

"خدا کا واسطہ ہے' آپ خاموش۔"

بابر نے اسے خاموش کرانا چاہا۔

"اوئے چپ کر یہ نانا ہے تیری لڑکی کا۔ اس سے چھپا کر کیا کرنا ہے۔ اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اس کی دوتری (نواسی) کو بچانے کے لیے میری بیٹی اپنی زندگی خراب کر رہی ہے۔"

وہ سب بتانے پہ آمادہ تھا اور بابر جیسے بھربھری مٹی کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔

صاحبزادہ نفیس علی خان نے بے تابی سے پوچھنا چاہا۔

"ہماری نواسی۔۔۔ ہماری صاحبزادی دلکش خانم۔۔۔ کیا ہوا انہیں' کہاں ہیں وہ؟"

"یہی تو پتا نہیں ہے۔ تمہارے جوائی کے کرتوتوں کی وجہ سے اس کی لڑکی کو بدمعاش اٹھا کے لے گئے اور بدلے میں۔"

مگر پوری بات سنے بغیر ہی صاحبزادہ نفیس علی خان اپنے سینے پہ ہاتھ رکھتے دوہرے ہو گئے۔

● ● ●

"چچا حضور۔۔۔"

بابر اس نئی افتاد پہ گھبرا گیا۔

وہ جانتا تھا کہ صاحبزادہ نفیس عارضہ قلب میں مبتلا ہیں لیکن وہ فقط اسی وجہ سے دلکش والا معاملہ ان سے نہیں چھپانا چاہتا تھا بلکہ اس کے بعد نازل ہونے والے ان کے عتاب سے خوفزدہ تھا۔ جانتا تھا کہ وہ بابر سے اپنے رشتے کے بارے میں کتنے بھی روایت پسند کیوں نہ ہوں مگر اپنی جوان نواسی کو اس کی وجہ سے تباہی کے دہانے پہ پا کر سب کچھ فراموش کر دیں گے' اسی لیے اس نے اللہ وسائے کو روکنے کی اپنی سی کوشش کی مگر وہ بتا کے ہی رہا۔

اس کے ساتھ جو ہوتا' سو ہوتا' وہ بعد کی بات تھی۔ فی الحال تو ان سے اپنا آپ سنبھالنا مشکل تھا۔

"صاحبزادی دلکش ہماری بچی' ہماری یاسمین بٹیا۔" وہ سفید پڑتے ہونٹوں کو دانتوں سے کچل کچل کر پہلو میں اٹھتے ظالم درد کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے اور آہوں' کراہ کی بجائے ان کے منہ سے یہ دو نام بار بار ادا ہو رہے تھے۔

"چچا حضور! آپ چنداں فکر نہ کیجیے' ہم انہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ ہم انہیں لینے ہی جا رہے ہیں۔"

بابر نے ان کا سینہ مسلتے ہوئے تسلی دینا چاہی جو اللہ وسائے کو بری طرح کھولا گئی۔

"اوئے بے غیرتا! تو کیا بچائے گا۔ تیرے میں اتنی جان ہوتی تو تو میری دھی کی مدد نا مانگنے آتا۔ اوئے' تیری تو دال روٹی چلانے والی بھی زنانیاں۔۔۔ تیرے ٹبر کی راکھی (رکھوالی) کرنے والی بھی زنانیاں' وڈا مغل بنا پھرتا ہے۔"

اس کے بعد اس نے نواب صاحب کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

"لمبی لمبی چھوڑنا بند کر' تجھے پتا ہے کہ تو کچھ نہیں کر سکتا جب تک میری دوئی نہیں آ جاتی۔ نامرد۔۔۔ نکھٹے' ادھر کھڑے ہو کر ڈینگیں مارنے کی بجائے اپنے سوہرے کو اٹھا کے بستر پہ ڈالنے میں میری مدد کر۔۔۔ بھئی بڑا بھارا ہے بھئی۔"

"بھر جائی ذرا یہ سرہانہ سیدھا کرنا۔"

اللہ وسائے کے کہنے پہ بالو نے ایک زہر میں ڈوبی ہونہہ کی اور منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی نم آنکھوں میں

وہ بے بس سا منظر گھوم گیا جب اسی کرو فر والے نواب کی دہلیز پہ وہ بے یار و مددگار پڑے اپنے کرے کو گھسیٹ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اونچے مضبوط مگر بند دروازوں کے پیچھے ایسے ہی بند دل والے لوگوں سے مدد کی فریادیں کر رہی تھی بین ڈال رہی تھی مگر کوئی ہاتھ آگے نہ بڑھا تھا۔

اتنے میں بالو کی بغل میں دبے بیگ میں رکھا وہ موبائل فون بج اٹھا جو شہزادے نے اسے لے کر دیا تھا اور سختی سے تاکید کی تھی کہ گھر سے باہر جاتے ہوئے وہ اسے "لازما" ساتھ رکھا کرے تاکہ ہر وقت رابطہ ممکن ہو جبکہ بالو اس سے بیزار تھی۔ اب بھی اچانک بج اٹھنے والی تیز رنگ ٹون پہ وہ خود ہی بدک اٹھی۔

"ہائے ہائے۔ بابا!" اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں بیگ کھول کر اندر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ ہڑبڑاہٹ میں وہ کبھی روپوں والا بٹوہ باہر نکل لیتی، کبھی اپنی دواؤں کی شیشی تو کبھی کنگھا۔ اتنے میں وہ کسی مشہور پنجابی گیت والی رنگ ٹون کمرے کے سکوت کو ڈسٹرب کرتی رہی۔

صاحبزادہ نفیس علی خان کے درد سے نڈھال ہوتے، نیم خوابیدہ ذہن کو اس تیز آواز نے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ آنکھیں بمشکل کھول کر خود کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کرنے لگے ویسے بھی وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ اب تک اپنی [illegible] بڑی سے بڑی تکلیف کو پچھاڑتے آئے تھے۔

"ہاں۔۔۔ ہیلو۔ [illegible] فون ہاتھ آیا تو [illegible] یہ سمجھ نہ آیا کہ کون سا بٹن دبایا جائے۔۔۔ دو تین جگہ ہاتھ مار کے اس نے [illegible]۔

"ہاں شہزادے! میں ایدھر ای آں۔" ایک سرد آہ بھر کے اس نے جواب دیا تھا۔ دوئی کے جملے ایک بار پھر سماعتوں میں گونجنے لگے تھے دوسری جانب شہزاد خوشدلی سے کہہ رہا تھا۔

"شوٹنگ کینسل ہو گئی، اس اہم شوٹنگ کی وجہ سے میں نے آج کوئی میٹنگ وغیرہ بھی نہیں رکھی تھی۔ تقریباً فارغ ہی تھا آج کا دن اس لیے سوچا آپ کو شاپنگ پہ لے جاؤں، آپ بہت دنوں سے کہہ رہی تھیں۔ گھر آیا تو آپ غائب۔ مجھے پہلے ہی شک تھا، ہو نہ ہو آپ یہیں ہوں گی۔"

اس نے سرشاری میں ڈوبا قہقہہ لگایا جسے سن کر بالو کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ عرصے بعد اس نے بیٹے کی ہنسی سننا شروع کی تھی اور اب کچھ ہی دیر میں یہ مسکراہٹ ایک بار پھر اس سے چھین جانے والی تھی۔

"ہاں پتر بس آ گئی کوئی پتا ہوتا ہے ویلے کا۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"نہ ہی آتیں تو اچھا تھا کم از کم۔"

"او ہو! کیا فرق پڑتا ہے۔ میں یہاں سے لے لیتا ہوں آپ کو بلکہ میں راستے میں ہی ہوں بس یہ آخری موڑ کاٹنے والا ہوں۔ دوئی کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں، وہ اپنی پسند سے اپنی شاپنگ کر لے گی۔"

"رہن دے تونہ آ دوئی کی طبیعت ٹھیک نہیں، میں رکشے پہ آ جاتی ہوں۔"

اس نے آنسو پیتے ہوئے آنے سے روکنا چاہا، ادھر اللہ وسائے نے بالو کے نزدیک آ کر بلند آواز میں کہا۔

"نہیں شہزادے پتر تو آ۔۔۔ اور اپنے ساتھ وڈے ڈاکٹر ہوراں جی کو بھی لے آ۔ بڑی سخت ضرورت ہے۔"

"ڈاکٹر۔۔۔؟ کیا ہوا دوئی کو؟" وہ بری طرح چونکا۔ "پیر آپ ہی آپ بریک پہ جا پڑے۔

"کجھ نہیں، تو جا اپنے کام پر۔" بالو نے ٹالنا چاہا مگر وہ فون بند کر چکا تھا اور اب گاڑی موڑ کر کلینک کا رخ کر چکا تھا۔

"کیوں لائے او [illegible] اس نواب زادے کا۔" بالو نے چمک کے کہا۔

"خیر کی بات نکال [illegible] بھر جائی۔ میرے گھر کے اندر بے گناہ بندہ مرا تو میں غریب تو مارا جاؤں گا نا تھانہ کچہری اور وہ بھی اس عمر۔۔۔"

"یہ کھڑا ہے نا ڈشکرا، اس کا جوائی، اسے کہہ اٹھا اپنے بڈھے کو اور چلتا بنے یہاں سے، مگر تو کیوں کہے گا اب تو یہ تیرا بھی جوائی بننے والا ہے اللہ کی شان محلوں سے گھسیٹ کر اپنی بیٹی کو روڑی پہ ڈال رہا ہے وڈا سیانا۔"

وہ پھر اسے کوسنے اور بلک بلک کے رونے لگی۔

نواب صاحب کو اس کی کچھ باتیں سمجھ آ رہی تھیں، کچھ نہیں مگر دلکش والی بات بری طرح دل و دماغ میں چبھ رہی تھی۔

"یہ محترمہ درست فرما رہی ہیں۔" بابر نے بھی زبان کھولی تو اللہ وسایا جو نواب صاحب کو پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا، اس کو کھا جانے والے انداز میں ڈپٹنے لگا۔

"چپ کر تو فرما رہی ہیں۔" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے اس کی نقل اتاری۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ شہزاد صاحب کا یہاں آنا ہم سب کے لیے برا ثابت ہو سکتا ہے خاص طور پہ ہمارے لیے، وہ غیض و غضب میں آ کر۔۔۔"

"تیری چھینٹی لگائے گا اور کیا؟۔۔۔ اچھی بات ہے، تجھے دو چار تو لگنی چاہئیں۔"

اس نے بابر کی تشویش کی پروا نہیں کی۔ اتنے میں شہزاد کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ باہر کی جانب لپکا۔ اپنے پیچھے اس نے بالو کی آواز سنی۔

"یہ تو نے اچھا نہیں کیا وسائے۔ ایک تو میرے پتر کی زندگی بگاڑی۔ اس کی منگ کا ہاتھ اس مسٹنڈے کے ہاتھ میں دے دیا اور اب اسی کو اپنے باپ کے قاتل کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر لانے کا کہہ دیا۔ اب اگر وہ تیرا سر کھول دے تو مجھ سے نہ رونے رونا۔"

اگلے ہی منٹ اللہ وسایا ڈاکٹر کو لیے اندر داخل ہوا۔ اس سے دو قدم پیچھے پیچھے شہزاد ملک تھا مگر اس کے قدم دروازے پہ جمے تھے اور حیرت زدہ نگاہیں بستر پہ پڑے نواب صاحب اور ان کے سرہانے برے حالوں میں کھڑے بابر ہمایوں تغل پہ جمی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"مجھے اسے لے جانے دو نگاہ۔"

"نہیں ادا میں ایسا نہیں کر سکتی۔ ملک مجھے نہیں چھوڑے گا۔"

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ اگر تمہارے بس میں ہوتا تو اس بچی کی مدد ضرور کرتیں، پیسوں کی پروا کیے بغیر اسے بھگا دیتیں۔"

"ویسے بھی یہ میری لگتی کیا ہے جو میں اس کی خاطر ملک سے پنگا لوں۔"

"یہ نہیں تو میں تو تمہاری کچھ لگتی ہوں۔ کیا تم میری خاطر بھی یہ نہیں کر سکتیں۔" دعا نے اس کے ہاتھ تھام کے التجا کی۔ اس وقت اسے نگاہ کے پیر بھی پکڑنا ہوتے تو کر گزرتی۔

"تمہاری خاطر۔۔۔" وہ متذبذب ہوئی۔

"ادا، میری جان! تو کچھ اور مانگ لے نگاہ کی جان مانگ لے مگر یہ نہیں۔"

"جھوٹے ڈائیلاگ مت جھاڑو نگاہ۔" دعا نے سر جھٹکا۔

"ابھی تم کہہ رہی تھیں میں کسی کی خاطر اپنی جان داؤ پہ نہیں لگا سکتی۔ ابھی تم جان وارنے کی پیشکش کر رہی ہو مجھے تمہاری جان سے کوئی لینا دینا نہیں، مجھے یہ لڑکی دے دو بس۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں۔ دوستی اتنی انمول چیز ہے ادا کہ اس کے سامنے جان جیسی چیز کیا معنی رکھتی ہے اور وہ بھی میری جان، جو کسی کے کام نہ آ سکی اب تک۔ میں ہنسی خوشی یہ جان تمہاری خاطر لٹا سکتی ہوں۔ یہ جھوٹا ڈائیلاگ نہیں ہے میری سہیلی، میں کسی ملک کی ہرگز پروا نہ کروں۔۔۔ میں نے جی کے کرنا بھی کیا ہے، کون بیٹھا ہے یہاں میرا جو۔۔۔ لیکن تم تمہارے سامنے ساری زندگی پڑی ہے۔ ابھی تو تمہارا سب سے اچھا دور شروع ہونے والا ہے۔ بہت سی خوشیاں دیکھنی ہیں تمہیں، کیوں اپنی دشمن بنتی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے ملک بس میری گردن دبا کے خاموش بیٹھ جائے گا۔ یہ پتا لگانے کی کوشش نہیں کرے گا کہ آخر میں نے اس لڑکی کو کہاں غائب کیا۔ پھر جو حشر میرا ہو شاید تمہارا اس سے بھی زیادہ برا ہو۔"

"اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تب بھی میری تباہی یقینی ہے۔ جن خوشیوں کی تم بات کر رہی ہو، وہ ویسے بھی میرے

ساتھ چھوڑنے والی ہیں۔ جب تک یہ لڑکی ملک کے قبضے میں ہے' وہ بابر کو مجبور کرتا رہے گا اور بابر مجھے۔ اسے چھڑانے کے لیے مجھے بابر سے نکاح کرنا پڑے گا کیا یہ تمہیں منظور ہے؟"

"ہرگز نہیں' اس مردود کا نام بھی نہ لینا میرے سامنے۔"

"تو پھر اسے لے جانے دو' یہی سب سے بہتر حل ہے۔ اسے لے جا کے اس کے باپ کے ہاتھ میں تھما کر کہوں گی کہ اب میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

"وہ پیچھا چھوڑ دے گا اور ملک پکڑ لے گا۔ ایسا پکڑے گا کہ تو ساری عمر چھڑوا نہ پائے گی۔ کنویں سے نکل کر کھائی میں گرے گی۔ ضد نہ کر' سب سے اچھا حل یہ ہے کہ اپنے گھر جا اپنی شادی کی تیاریاں کر اپنی اور شہزاد ملک کی۔ مت سوچ کسی کے متعلق کچھ نہیں ملتا دوسروں کے لیے اپنی زندگی وار کے' مجھے دیکھو میں نے کیا نہیں کیا اپنے گھر والوں کے لیے' اپنے اس باپ کے لیے جس نے مجھے چودہ سال کی عمر میں اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے بیچا۔ اس کے آخری دن تک اسے اچھے سے اچھے ہسپتال میں رکھا۔ اسی گندی کمائی سے بھائیوں کو سیٹل کرایا' کاروبار جمائے ان کے' جو دوسروں کے سامنے مجھے بہن کہتے شرماتے ہیں۔ سب کو یہ بتا رکھا ہے کہ تو ریلی بی بچپن میں ہی ہیضے سے مرگئی۔ میرے جیسی ناچنے گانے والی' بکنے والی عورت کو بہن بتاتے ہوئے بڑی غیرت آتی ہے ان خان زادوں کو۔ اس بہن کی حرام کی کمائی سے اپنی زندگیاں سنوارتے ہوئے غیرت نہیں آتی۔ بہنوں کی شادیاں اپنا آپ بیچ کر اچھے گھرانوں میں کرائیں' دل کھول کے جہیز دیا' مگر نہ مجھے شادی میں بلایا نہ کوئی رابطہ رکھا۔ میں مر جاؤں گی ادا تب بھی کوئی میرے جنازے میں بھی نہیں آئے گا۔ بھلا ان شریف لوگوں کا ایک بازاری عورت سے کیا ناتا۔ یہ میرے اپنے تھے' میرے سگے۔ ان سب نے میرا کیا کرایا فراموش کر دیا تو تو غیروں کے لیے اتنی بڑی قربانی کس لیے دے رہی ہے' کچھ ہوش کروادا۔ صرف اپنے لیے سوچو' اپنی زندگی' اپنی خوشی کے بارے میں' دفع کرو اس بابر کو اور اس کی بیٹی کو۔ تمہاری بلا سے' جو مرضی ہوتا رہے اس کے ساتھ۔ اب وہ آئے تو صاف جواب دے دینا۔ کوئی زبردستی ہے' جو وہ تم سے بدلے کر ہی رہے گا۔"

نگاہ نے اسے اچھا خاصا لمبا لیکچر دیا' مگر سب بے کار گیا۔

"مجھے کچھ نہیں سننا' یہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو۔ اس کے بارے میں میں نے بھی سوچنا چاہا تھا۔ اسی خود غرضی اور سفاکی سے سوچنا چاہا تھا' مگر میں اپنی سوچ پہ عمل نہیں کر سکی تھی۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتی نگاہ۔ اگر بات صرف بابر کی ہوتی تو میں بڑے آرام سے لاتعلق ہو سکتی تھی لیکن اس لڑکی کے معاملے میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اس درد سے گزر چکی ہوں' یہ تو میرے مقابلے میں بہت ہی کم عمر ہے۔ پتا نہیں' یہ اس درد کو سہار بھی پائے گی یا نہیں۔ اگر میں اس کے کام آسکتی ہوں تو آؤں گی۔"

"میں دوست ہوں تمہاری۔ تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا' میں نے سمجھا دیا' تم نہیں مانیں تو تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑنے کی بجائے اب میں اپنا حق استعمال کروں گی..... تمہیں زبردستی اس حماقت کو کرنے سے روکوں گی۔ تم اس لڑکی کو یہاں سے لے جا کر تو دکھاؤ۔"

نگاہ کے انداز میں چیلنج تھا۔ دعا ایک طویل سانس بھر کے رہ گئی۔

"ضد مت کرو۔" اس کی آواز مدھم اور تھکی ہوئی تھی۔

"ضد تم کر رہی ہو۔"

"یہ بچی محفوظ ہو جائے گی تو تمہارا کیا جاتا ہے نگاہ۔"

"میری دوست برباد ہو جائے گی وہ غیر محفوظ ہو جائے گی' یہ جاتا ہے میرا۔"

"زبردستی کیا صرف تم کر سکتی ہو۔" اسے غصہ سا آگیا۔

"تو کیا تم بھی کرو گی؟" نگاہ تن کے اس کے مقابل آگئی۔

"مجھے تنگ مت کرو نگاہ! تمہیں میری دوستی کی قسم ہے۔"

پیار' منت' سماجت' دھمکی سب بے اثر دیکھ کر اس نے قسم کا واسطہ دینا چاہا۔

نگاہ ڈھیلی پڑ گئی۔

"تو تم نہیں مانو گی؟..... اپنی کر کے رہو گی؟" اس بار اس کے انداز پسپائی کے تھے۔

"ٹھیک ہے' لے جانا اسے مگر ابھی نہیں۔"

"کیوں؟ ابھی کیوں نہیں۔" وہ اس کمرے کی جانب تیر کی طرح لپکی جہاں دلکش چھپی بیٹھی تھی لیکن اس کے جملے کا اگلا حصہ سن کر رک گئی۔

"ابھی اسے لے جانا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو سب دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ نہ یہ لڑکی بچ سکے گی' نہ تم اور نہ ہی میں۔"

"تو پھر؟"

"اگر مجھ پہ اعتبار ہے تو ابھی اس وقت چپ چاپ واپس چلی جاؤ۔ میں رات کو اسے لے کر' چھپ چھپا کے نکلوں گی اور تم سے فون پہ رابطہ کروں گی' تب طے کر لیں گے کہ اسے بابر کے سپرد کہاں کیا جائے۔ یہ کام تمہارے گھر پہ کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کسی بھی طرح تمہارا نام اس سارے قصے میں نہ آئے۔ میری خیر ہے جاتے جاتے تو نہ سہی' ایک واحد نیکی ہی سہی شاید اللہ کو پسند آجائے۔"

دعا دوڑ کے اس کے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔

"نگاہ تم اللہ کی جانب سے مجھے عطا ہوئی چند نعمتوں میں سے ایک ہو۔"

"یہ بہت بڑی بات کہہ دی تم نے۔" نگاہ نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کے اپنے آنسو رخساروں پہ بہہ رہے تھے۔

"جاؤ' فی امان اللہ اور مجھ پہ اپنا اعتبار قائم رکھنا۔ کسی دیر سویر کی صورت میں دل میں وسوسہ مت آنے دینا۔ نگاہ تمہیں دیے عہد سے پھر نہیں سکتی۔"

"میں جانتی ہوں۔" دعا نے اس کے حدت آمیز ہاتھوں پہ ایک ممنون بوسہ دیا۔

"اپنا خیال رکھنا' تم میری خاطر خود کو مشکل میں ڈال رہی ہو۔"

"تم سے ہی سیکھا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"تم ایک بالکل انجان اور پرائی لڑکی کے لیے خود کو مشکل میں ڈال رہی ہو میں تو جو کروں گی اپنی سہیلی کے لیے کروں گی۔"

اس کے تذکرہ کرنے پہ دعا کو اندر بیٹھی بابر کی بیٹی کا دھیان آیا۔

"میں اس سے مل لوں؟"

"ہاں مگر جلدی کرو۔"

دعا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی جہاں زمین پہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی دلکش سسکیاں لے رہی تھی اس کا نازک مختصر وجود لرز رہا تھا۔

"تم نے ساری باتیں سن تو لی ہوں گی جب میں وہاں کھڑی تمہاری سسکیاں سن سکتی ہوں تو تم نے بھی ہم دونوں کی گفتگو سن لی ہو گی۔ اب رونا بند کرو اور یہ دعا کرو کہ ہم نے جو پلان بنایا ہے' اللہ ہمیں اس میں کامیاب کرے اور تم خیریت کے ساتھ اپنے گھر پہنچو۔"

دلکش نے اپنا سر اٹھا کے اس کی جانب دیکھا۔ سامنے کھڑی لڑکی جو بے حد حسین تھی' نرم ملائم لہجے اور حسن نرم آواز کی مالک تھی اور جو عمر میں اس سے تقریباً" آٹھ دس سال بڑی تھی لیکن جس کے چہرے پہ نوعمری کی معصومیت اب تک برقرار تھی۔ اور وہ جو اس کی کچھ نہیں لگتی تھی اس وقت اس کے لیے سب سے زیادہ فکرمند نظر آرہی تھی۔ اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی جبکہ وہ سب جو اس کے کچھ نہ کچھ لگتے

تھے' اس کے سارے اپنے' وہ نجانے کہاں تھے۔ نجانے وہ اس سارے معاملے سے پوری طرح واقف تھے بھی یا نہیں پتا نہیں اسے کہاں کہاں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔

"آپ کون ہیں؟" اس کی آنسوؤں سے بھیگی آواز سن کر دعا مسکرا دی۔

"دعا۔"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی اور گھٹنے زمین پہ ٹیک کے اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس کے بکھرے بال آنسوؤں کی وجہ سے رخساروں سے چپک رہے تھے' انہیں پیار سے سمیٹ کر پیچھے کیا۔

"بس آج شام تک تمہیں یہاں رہنا ہے۔ اچھی اور بہادر بچی بن کے رہنا۔ یہ جو آنٹی ہے ناں جو باہر کھڑی ہیں بہت اچھی ہیں اونچا بولتی ہیں' غصہ کرتی ہیں مگر ہیں بہت اچھی' ان کی ساری باتیں ماننا کھانا آرام سے کھا لینا اور یہ تمہیں جہاں لے کر جانا چاہیں' چپ چاپ چلی جانا۔۔۔ ٹھیک۔"

وہ بڑے استحقاق سے اسے نصیحتیں کر رہی تھی جیسے اس کی بڑی بزرگ ہو۔

اور ایسا کرتے ہوئے دلکش کو وہ بالکل موتیا جیسی لگی۔

"آپ بالکل ہماری خالہ حضور جیسی ہیں۔"

وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

اس نے آگے بڑھ کے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

"اللہ تمہاری معصومیت ہمیشہ برقرار رکھے۔"

وہ بابر ہمایوں مغل کی بیٹی تھی' جس سے ان کا قدم قدم نفرت کرتا تھا پھر پتا نہیں کیوں اس کا دل اس پندرہ سالہ لڑکی کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔ جب وہ اس کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھانے چلی تھی یعنی اس قابل نفرت شخص سے نکاح کرنے' تب اس کے دل میں اس انجان لڑکی کے لیے صرف ہمدردی تھی۔ وہ اس پہ ترس کھا رہی تھی' نیکی کے ارادے سے قربانی دینے جا رہی تھی لیکن اب اسے دیکھنے کے بعد وہ اپنے دل میں ہمدردی اور ترس کی بجائے صرف محبت محسوس کر رہی تھی۔

"تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر گزروں گی۔"

اسے سینے سے بھینچتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی اور وہاں سے نکل آئی۔

مگر صاحبزادی دلکش خانم اس تسلی کے سہارے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس کے دل کو یک بیک بے پناہ تقویت کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ جو بھی تھی اس کی ذات پہ دلکش کو بہت اعتماد ہو گیا تھا۔ اتنا اعتماد جتنا شاید وہ اپنی ماں پہ کرتی۔

☼ ☼ ☼

صاحبزادی یاسمین کی ظاہری صحت اب سنبھل چکی تھی' اس لیے انہیں رخصت دے دی گئی [illegible] لیکن ان کے دل کی دنیا تہس نہس تھی اور اس کا کوئی علاج کسی بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔ رہ رہ کے دلکش کا خیال ان کی روح کو کچل جاتا تھا ان کے آنسو تک سوکھ چکے تھے۔۔۔ کسی کا بھی چہرہ دیکھتیں' یہی فریاد لبوں تک آ جاتی۔

"خدارا! ہماری صاحبزادی دلکش کو ہمارے پاس لے آیئے۔"

اور سامنے والا نظریں چرانے پہ مجبور ہو جاتا۔

ان کے ارد گرد لوگ بھی کون تھے۔

ماکھا گجر۔۔۔ برابر والی کوثر۔۔۔ سامنے والی شاداں اور بہت سے دوسرے لوگ۔ جن سے خون کا نہیں' صرف خلوص کا رشتہ تھا۔ جن سے خون کا رشتہ تھا وہ تو بے خبر بیٹھے تھے۔

"یاسمین بہن! اپنے میکوں کا کوئی نمبر وغیرہ دے' میں کسی کو بھیج کر فون ہی کروا دوں۔ ان کو بھی تو پتا چلے ادھر کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔"

کسی نے کہا تو وہ کچھ ہوش میں آئیں۔ ادھر ادھر دیکھا۔ نایاب سمجھدار تھا' فوراً ایک چٹ پہ نمبر لکھ لایا۔

"یہ مت بتایئے گا کہ۔۔۔" بات کرتے کرتے وہ ضبط کھو بیٹھیں اور سسک پڑیں۔

"ہاں' ہاں' فکر مت کرو۔ طریقے سے بات کریں۔ گے۔ دیکھو نا کسی کو تو ایسے وقت پاس ہونا چاہیے۔ تم سارا دن اور ساری رات ہسپتال بھی گزار آئیں' کوئی نہ آیا۔ آتا بھی کیسے۔۔۔ جب کسی کو اطلاع نہ ہو سکی۔ مرد تمہارا کل سے غائب ہے۔ دربدر پھر رہا ہو گا' بدنصیب اپنی بچی کی تلاش میں۔ تمہارے بھائی وغیرہ بھی آ جائیں تو شاید وہ جلدی مل جائے' تمہیں بھی سہارا ہو گا۔"

کوثر نے تسلی دی۔

یہاں زیادہ تر لوگ' جن میں خود صاحبزادی یاسمین بھی شامل تھیں' یہی جانتے تھے کہ ہسپتال میں دلکش اکیلی تھی اس لیے شاید راستہ بھٹک کے کہیں چلی گئی یا کوئی دھوکے سے لے گیا۔ اصل قصے سے ماکھے گجر نے مصلحتاً سب کو لاعلم رکھا تھا کہ بابر سے دشمنی میں ملک مقبول کے کارندے اسے اٹھا لے گئے ہیں۔ یہ بات جاننے کے بعد نہ صرف یاسمین کا دکھ مزید بڑھ جاتا بلکہ وہ اپنے شوہر سے اور متنفر ہو جاتیں۔ یہ وقت اس قسم کے جھگڑوں کو ہوا دینے کا نہیں تھا اس لیے ماکھے جیسا فسادی بندہ بھی یہ بات چھپا گیا۔

☼ ☼ ☼

"مائنر ہارٹ اٹیک تھا۔ بس یوں سمجھیں' خطرہ آتے آتے ٹل گیا ہے۔ پھر بھی آپ کو انہیں ہاسپٹل لے جا کر پراپر چیک اپ اور ٹریٹ منٹ کروا لینا چاہیے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے' فی الحال یہ دوائیں منگوا کر دے دیں۔"

ڈاکٹر میکانکی انداز میں بتاتا ہوا اب کاغذ پہ قلم سے تیز تیز کچھ گھسیٹ رہا تھا۔

صاحبزادہ نفیس علی خان کی خالی خالی نظریں چھت پہ گڑی تھیں اور ذہن نامعلوم الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔

بابر ہمایوں مغل ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ کچھ ایسی کشمکش میں کھڑا تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہاں سے غائب نہیں ہو سکتا تھا۔ بار بار وہ شہزاد کی چبھتی نظریں خود پہ محسوس کرتا اور اس کا سر کچھ اور نیچے جھک جاتا وہ کچھ اور بھی دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہو جاتا جبکہ شہزاد ابھی تک اس سارے تماشے سے انجان تھا۔

نہ وہ نواب صاحب کی یہاں موجودگی اور ان کی حالت کی وجہ سے واقف تھا' نہ ہی بابر کا یہاں نظر آنا اسے سمجھ آ رہا تھا۔ اپنی ماں کا مسلسل آنسو بہانا اور زیر لب بڑبڑانا بھی اسے الجھا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ کمال ضبط و برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی بلقیس نے اس کے گلے لگ کے زار و قطار روتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر اندر موجود بابر اور نواب صاحب کو دیکھ کے اسے جو اچانک ذہنی جھٹکا لگا تھا اس کے بعد اسے ماں کا ایک لفظ پلے نہ پڑا تھا۔ اور پھر ڈاکٹر نے بھی اسے فوراً خاموش کرا دیا تھا۔

"پلیز' خاموش رہیے' مریض کے پاس اتنا ہجوم اور شور ٹھیک نہیں ہے۔"

بالو' نواب صاحب کو گھورتی پرے ہٹ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا غصہ واحد چیز تھا جو شہزاد کی سمجھ میں آ رہا تھا باقی سب کچھ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ صاحب یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے پوچھا تھا اس کے باوجود بابر کی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ وہ شہزاد ملک سے بے حد خوفزدہ تھا۔

اتنا زیادہ تو تب بھی نہیں تھا جب اس نے پہلی بار دعا پہ اس کی اصلیت کھولی تھی۔

آج اس کے خوف کی وجہ نہ تو شہزاد کی مار تھی نہ ذلت وہ خوفزدہ تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے دعا اپنے وعدے سے پھر نہ جائے۔

آج وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے اتنا کمزور پڑ گیا تھا کہ ایک کونے سے لگا تھر تھر کانپتا ہوا دل ہی دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ وشہزاد کو نظر ہی نہ آئے۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا شہزادے مگر یہ دوئی کا پتا کرتے آئے تھے۔“ اللہ وسائے نے جواب دیا۔

”دوئی کا؟... ان کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو یہ جناب ہوراں جی ہی بتائیں گے؟“

اللہ وسایا منتظر سوالیہ نظروں سے نواب صاحب کو تکنے لگا۔ وہ اس کا مدعا بھانپ کر تکیے سے سر اٹھانے لگے۔ بابر نے بڑھ کر ان کو ٹیک لگانے میں مدد دینا چاہی مگر انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”میں بتاتی ہوں‘ یہ ڈھیلا کیا بتائے گا اور کب بتائے گا؟“ بالو نے انہیں آہستہ آہستہ اٹھتے دیکھ کر ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

”آیا ہو گا اپنے جوائی کے پیچھے... دوئی کا لامہ (طعنہ) وسائے کو دینے‘ اصل بات تو تو نے پوچھی ہی نہیں‘ پہلے یہ تو پوچھ کہ یہ نشئی بندہ ادھر کیا کر رہا ہے۔ یہ کل رات سے ادھر ہے۔“

”کل رات سے؟“ بابر کی موجودگی اسے بے چین تو کر رہی تھی۔ لیکن اس کا ساری رات یہاں گزارنا اسے اچھل جانے پہ مجبور کر گیا۔

”دیکھیے ہم آپ کو سب کچھ بتا دیں گے لیکن۔“

بابر نے نواب صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ملتجی انداز میں کہا۔

”آؤ جی‘ باہر چل کے بات کرتے ہیں۔ اب بیمار بندے کے سرہانے کیا کھپ ڈالنی؟“

اللہ وسائے نے بھی باہر جانے کی صلاح دی جو بالو کو طیش دلا گئی۔

”بیمار ہے تو اپنی وڈی‘ اچی حویلی میں جا کے بیٹھے‘ اپنی لاڈو رانی‘ وہ نواب زادی‘ اس سے خدمتیں کرائے ادھر کیوں پھیل کے بیٹھا ہے۔ ہمارا پروہنا ہے کوئی؟ جو گل بات ہو گی وہ ادھر ہی ہو گی۔“

وہ اکڑ گئی اور تائید طلب انداز میں بیٹے کو دیکھا لیکن وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے ہم باہر چل کے بیٹھتے ہیں۔ لیکن مجھے ساری بات صاف... خاص طور پہ تم...“

اس نے بابر کی جانب اشارہ کیا۔

”تم مجھے کوئی چکر دینے کی کوشش مت کرنا۔“

”اس نے جو کرنا تھا وہ کر چکا۔“ بالو نے لقمہ دیا۔

”چلیں انہیں آرام کرنے دیں۔“ شہزاد نے نواب صاحب کو دیکھ کر کہا اور پلٹ کر باہر نکلنے لگا۔

”آرام... یہ۔“ بالو نے جز بز ہو کے کچھ کہنا چاہا لیکن شہزاد نے روک دیا۔

”مجھے یاد ہے... سب کچھ یاد ہے‘ بھولا نہیں ہوں میں لیکن اس وقت کمینگی کا مظاہرہ کر کے ہم یہ ثابت کیوں کریں کہ ہم کمین ہی ہیں۔“

اس کی اس بات نے نواب صاحب کو بہت کچھ یاد دلا دیا۔ وہ ہمت کر کے اٹھ تو بیٹھے تھے‘ اب بول بھی اٹھے۔

”ہم بالکل ٹھیک ہیں۔“

اس وقت بھی نقاہت کے باوجود ان کی آواز میں رعب کا وہی عالم تھا البتہ وہ گھن گرج اور کروفر ناپید تھا۔

”ہم بھی معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اتنے ہی بے چین ہیں‘ جتنے آپ۔“

انہوں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

”اگرچہ ہم یہاں کسی اور گتھی کو سلجھانے آئے تھے لیکن یہ معمہ بھی حل طلب ہے۔ آپ ہماری صحت کی فکر مت کیجیے‘ صرف یہ بتائیے کہ آپ کچھ دیر قبل ہماری نواسی کے بارے میں کیا بتا رہے تھے اور ہمارے داماد ان کی۔“

”او جی... یہ ہی تو فساد کی جڑ ہے۔“ اللہ وسایا ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے بول اٹھا۔

”کرتوت اس کے اپنے ایسے ہیں کہ ہر چوک پہ دس بندے اکٹھے ہو کے اس کو کٹ لگائیں تب بھی جائز ہے لیکن بھگتنا پڑ رہا ہے میری بیچاری بچی کو اور اس کی اپنی دھی کو۔ چلو ماں پیو کے کرتوتوں کی سزا اولاد بھگتتی آئی ہے لیکن میری دوئی کا کیا قصور ہے‘ وہ کیوں اس کی خاطر اور اس کی اولاد کی خاطر اپنا آپ وار رہی ہے۔“

”آپ اصل بات بتاتے کیوں نہیں؟“

اب اس کی طولانی تمہید شہزاد کی برداشت سے باہر ہو گئی۔

”اس نے ہو رے کسی کے ساتھ فراڈ کیا ہے یا اس کا پیسہ دبا گیا ہے۔ اللہ جانے‘ بدلے میں وہ اس کی لڑکی اٹھا کے لے گئے ہیں۔ شہزادے تو تو جانتا ہو گا۔ وہی ملک مقبول... اس کا کام ہے یہ۔ اب اس نے لڑکی چھوڑنے کی شرط رکھی ہے کہ دوئی سے شادی کر کے جو یہ اسے دبئی لے جانے والا تھا‘ اس سے شو کروا کے اور حرام کام کروا کے ملک کا کاروبار چمکانے والا تھا‘ اب دوبارہ وہی پروگرام بنا لے تو اس کی لڑکی چھٹ سکتی ہے۔ اب یہ جانے اور اس کا کام۔ ہمارا کیا لینا دینا۔ اللہ کا کرم رہا جو دوئی اس کے جھانسے میں آنے سے بچ گئی۔ اب خیر سے تمہارے ساتھ اس کا گھر بسنے جا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ کہاں سے پھر بیچ میں آ گیا ہے اسے ورغلانے اور دوئی بھی ایسی بدھو‘ ایسی بے وقوف‘ آ گئی اس کی باتوں میں۔“

”کیا مطلب؟“ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

”یہ انگوٹھی واپس کر گئی ہے‘ وہ پاگل دی پتر۔“ بالو نے انگوٹھی لہرا کے دکھائی۔

”کل کا دن چڑھنے سے پہلے وہ اس سے ویاہ کرنے والی ہے۔ صاف جواب دے گئی ہے‘ مجھے ہائے یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی۔“ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں دوئی کو ایسا کرنے نہیں دوں گا۔“ شہزاد ایک عزم کے ساتھ اٹھا۔

”خدارا! ایسا مت کیجیے‘ ہماری معصوم بچی کا سوال ہے۔“ بابر نے گڑگڑا کر اس کی منت کی۔

”رک جائیے بابر!“ صاحبزادہ نفیس علی خان کی آواز گونجی۔

”انہیں مت روکیے‘ جانے دیجیے۔ اس بچی کا اتنا ایثار ہی کافی ہے کہ وہ آپ جیسے شخص کے لیے یہ کرنے پہ تیار ہو گئیں۔ ہمارا ضمیر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ہم اپنے مفاد کے لیے کسی اور بے قصور کو بھینٹ چڑھنے دیں۔ صاحبزادی دلکش خانم ہمارا خون ہیں اور آپ کی ذمہ داری ہیں۔ ان کو بچانا ہمارا فرض ہے اور اس فرض کے لیے ہم کچھ بھی کر گزریں گے مگر کسی اور کی بیٹی کو قربان نہیں ہونے دیں گے۔“

”ملک مقبول بہت ٹیڑھا آدمی ہے نواب صاحب۔ آپ صرف قانون کی مدد سے اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ پہنچ بھی گئے تو اپنی نواسی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ بچی اس کے پاس ہے۔“

شہزاد نے انہیں آگاہ کرنا چاہا۔

”میں دعا کو روکنے ضرور جا رہا ہوں۔ مگر آپ کی مدد کرنے سے روکنے کے لیے نہیں۔ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مدد کا جو راستہ اس نے نکالا ہے وہ واحد حل نہیں ہے اور بھی کوئی ایسا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے ہم بابر کی بیٹی کو بھی ملک کے چنگل سے بچا لائیں گے اور دعا کو اتنی بڑی قربانی بھی نہیں دینی پڑے گی۔“

”وقت بہت کم ہے۔“ بابر نے نہایت کمزور آواز میں احساس دلانا چاہا

”پہلے مجھے یہ دیکھنا ہے کہ دعا کہاں ہے۔“

”ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہمیں ان محترمہ سے ملنے کا اشتیاق پہلے سے تھا جو اب مزید بڑھ چکا ہے۔ ہم قریب سے جاننا چاہیں گے اس قدر نفیس طبع والی بچی کو‘ ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے کہ انہوں نے ایک غیر کے لیے اس حد تک جا کر سوچا۔“

”کیا جاننا چاہتے ہو؟“ بالو نے نواب صاحب کی بات کے جواب میں تنک کر کہا۔

”اس وسائے کی بیٹی ہے وہ... اس ہیرا منڈی میں طبلہ بجانے والے میراثی کی بیٹی‘ خود وہ محفلوں میں گانے

بجانے کا کام کرتی ہے اور میں اس کی ماں۔۔۔ وہی گڑوی والی میراثن اس کا ماما وہی بھانڈ‘ جسے تونے دھکے دے کر ذلیل کر کے نکالا تھا۔ یہی خون ہے اس کا یہی اس کی نسل۔“

زندگی میں پہلی بار نواب صاحب کو اپنے ہی کہے الفاظ ان کا سر جھکانے پہ مجبور کر گئے۔

وہ کتنے غلط ثابت ہوئے تھے‘ ان کے نظریات‘ انسان کو پرکھنے کی ان کی کسوٹی کتنی بودی تھی‘ یہ احساس آج ہو رہا تھا۔

”لیکن یہ مت بھولیں اماں کہ اس کی تربیت کرنے والے ہاتھ اس نسل سے نہیں تھے اوروں کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ‘ کسی غیر کے لیے اپنی خوشیاں قربان کر دینے کا حوصلہ احسان کر کے بھی نہ جتانے کا ظرف‘ یہ سبق سکھانے والی ہستی نہ اس خاندان سے تھی نہ اس نسل سے۔“

شہزاد کے دھیمے سے کہے یہ الفاظ نواب صاحب کو چونکا گئے۔ انہیں یاد آگیا کہ وہ یہاں اصل میں کس مقصد سے آئے تھے۔

”آیئے میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں؟“

شہزاد کی پیشکش پہ انہوں نے نظر بھر کے اسے دیکھا۔

کیا کیا نہ سنایا تھا انہوں نے اس شخص کو۔

کیا سلوک کیا تھا اس کے باپ کے ساتھ کہ اس کی جان ہی چلی گئی۔

کس بری طرح ٹھکرایا تھا اسے۔

اور آج وہ سامنے کھڑا بے شک بہت اعلا ظرف لگ رہا تھا‘ اس کی آنکھوں میں سرد مہری ضرور تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنی ماں کی طرح گن گن کے بدلے بھی لے سکتا تھا۔

شہزاد دعا کے لیے اس قدر فکر مند تھا کہ اس نے اس بات پہ زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

”ٹھیک ہے لیکن آپ اپنے گھر کا نمبر وغیرہ بتایئے تاکہ میں وہاں اطلاع دے دوں۔ وہ آپ کا بھتیجا کیا نام ہے اس کا‘ وہ آپ کو آکے لے جائے گا۔“

یابر ہمایوں نے عمیص کے اسٹور کا نمبر بتایا۔

☼ ☼ ☼

عمیص چچی حضور سے بات کرنے کے بعد سخت بے چینی کے عالم میں گھر سے نکلا تھا۔ بے شک دعا کا ایڈریس اور فون نمبر وہ اپنے دوست سے لایا تھا مگر اس نے انہیں ایک بار سرسری سا دیکھنے کے بعد نواب صاحب کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اب اسے صحیح طور سے یاد نہیں آرہا تھا کہ مکمل پتا کیا تھا۔ دوسری جانب چچا حضور کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر اس کی تشویش بھی بجا تھی۔ اس سے نہ گھر پہ رکا گیا نہ ہی دکان پہ ٹھہرا جاسکا تھا۔ وہ ایک دوست کو وہاں بٹھا کے آیا تھا جس نے اس کے آتے ہی ایک چٹ تھمائی۔

”اس نمبر سے تمہارے لیے فون آیا تھا کہ تمہارے چچا حضور یہاں موجود ہیں۔ انہیں آکر لے جاؤ۔“

”لے جاؤ؟۔۔۔ کیا مطلب؟ وہ خود گئے تھے تو کیا اب ان کی طبیعت خراب ہے جو۔“

اسے ہزار دھڑکے لگ گئے۔ وہ جان گیا کہ کون سی چیز تھی جو اسے اسٹور تک واپس کھینچ لائی تھی۔ شاید اسی پیغام تک پہنچنے کی جلدی تھی اسے۔

”پتا نہیں‘ اطلاع دینے والا بھی عجلت میں لگ رہا تھا۔ بس نمبر اور پتا لکھوایا اور فون رکھ دیا۔“

وہ چابیاں کاؤنٹر سے اٹھا کر پلٹا کہ فون کی بیل نے اسے رک جانے پہ مجبور کر دیا۔

”کہیں اسی نمبر سے دوبارہ فون تو نہیں آیا؟“ وہ تصدیق کرنے رکا مگر سی ایل آئی اسکرین پہ چمکتا وہ نمبر کوئی اور تھا وہ دوبارہ مڑنے والا تھا کہ کسی خیال کے تحت تھم گیا۔

یہ نمبر انجانا تھا مگر اس کے شروع کے چند ہندسے بہت جانے پہچانے تھے۔ یہ اس علاقے کا نمبر تھا جہاں

صاحبزادی یاسمین رہتی تھیں۔ اگرچہ انہیں عمیص کو فون کرنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی مگر کبھی کبھار وہ نایاب یا اقدس سے کسی پی سی او سے فون کروا کے کوئی پیغام دیتیں تو ایسا ہی کوئی نمبر ہوتا۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے بے تابی سے ریسیور اٹھا کے کہا مگر دوسری جانب سے آنے والی آواز قطعی ناآشنا تھی۔

”جی‘ عمیص ہی بول رہا ہوں۔“ اس نے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے فون کرنے والی خاتون کے سوال کا جواب دیا تھا۔

”میں کوثر۔۔۔ یاسمین بہن کی گوانڈن (ہمسائی)۔“

”جی فرمایئے۔“ اس کی آواز میں اب تک الجھن مترشح تھی۔

”یاسمین بہن کی طبیعت بڑی خراب ہے جی‘ ہسپتال سے لے کر آئے ہیں اسے۔“

”ہسپتال؟۔۔۔ کیا ہوا انہیں؟“

”بیمار تھی جی اب پہلے سے بہتر ہے‘ لیکن میں نے سوچا‘ اس کے پیکے نو خبر کر دوں۔“

”بڑی مہربانی آپ کی۔“ وہ حیران تھا کہ اس کی آپا ہسپتال بھی رہ آئیں اور یابر نے خبر تک دینا ضروری نہیں سمجھا۔

چچا حضور کو لینے۔

پھر آپا حضور کو لینے۔

کسی خیال کے تحت اس نے ہاتھ میں دبی چٹ پہ لکھا نمبر ملایا۔

”میں عمیص بات کر رہا ہوں۔ کیا میرے چچا حضور صاحبزادہ نفیس علی خان یہیں موجود ہیں؟“

اس نے تصدیق طلب کی۔

”نواب ہوراں؟ آہو جی‘ ایدھر ہی بیٹھے ہیں۔“ اللہ وسائے نے فون ریسیو کیا تھا۔ شہزاد ملک ابھی ابھی دعا کی تلاش میں نکلا تھا۔

”برائے مہربانی میری ان سے بات کرا دیجیے۔“

”مہربانی والی کون سی گل اے جی اک تے سارے ٹبر کو اوکھے لفظ بولنے کا چاء ہے۔“

اس نے بڑبڑاتے ہوئے ریسیور نواب صاحب کو تھمایا۔

”ہم یہاں خیریت سے ہیں اور انشاء اللہ کچھ دیر میں خود ہی واپس آجائیں گے۔ آپ زحمت نہ کیجیے۔“

عمیص نے صاحبزادی یاسمین کے بارے میں بتایا اور اسے نواب صاحب کے رد عمل پہ حیرت ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پہلے سے اس بارے میں جانتے ہوں۔

”آپ وہیں چلے جائیں۔ اس وقت آپ کی وہاں زیادہ ضرورت ہے۔“

وہ ان کی ہدایت پہ وہاں کے لیے روانہ تو ہو گیا

”کیا چچا حضور پہلے سے یاسمین آپا کی طبیعت کی خرابی کے متعلق جانتے تھے؟“

انہوں نے زور دے کر یہ کیوں کہا کہ وہاں۔ میری ضرورت ہے؟ ان کے لہجے میں وہ غیر معمولی پن کس لیے تھا اور۔۔۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟۔۔۔ کس کا گھر ہے وہ؟ جہاں چچا حضور اس حالت میں بھی اتنی دیر تک بیٹھے ہیں اور مجھے آنے سے روک رہے ہیں۔“

ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کا نہ اس کے پاس وقت تھا اور نہ ہی فرصت۔ وہ جلد از جلد یاسمین کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

● ● ●

نگاہ نے بمشکل دلکش کو ہاتھ منہ دھونے پہ رضامند کیا تھا۔ اب وہ اس کے لمبے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے چٹیا کرنے والی تھی کہ کال بیل کی آواز پہ اسے ہاتھ میں رکھا کنگھا ایک طرف رکھنا پڑا۔

اس نے ایک نظر بند دروازے کو دیکھا اور دوسری نظر دلکش کے چہرے پہ ڈالی۔

ڈھلے ڈھلے چہرے پہ خوف و ہراس کی پرچھائیاں پھیل رہی تھیں۔
نگاہ نے اس کے شانے پہ ہاتھ کا دباؤ ڈال کے تسلی دینا چاہی۔
"کوئی بات نہیں' تم اندر جاؤ۔"
"میں نے کہا نا' کچھ نہیں ہوتا' تم کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ ٹھیک طرح سے بند کر لینا اور جب تک میں
کہوں مت کھولنا اور دیکھو اندر سے کسی قسم کی کوئی آواز نہ باہر آنے پائے۔"
وہ آواز دبا کے ہدایت دے رہی تھی اور اس کا یہ انداز دلکش کو اور بھی متوحش کر رہا تھا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں کے
ساتھ اس کی ہدایت کے عین مطابق کمرے میں چلی گئی۔ لکڑی کے دروازے کی چٹخنی لگائے جانے کی آواز آنے
کے بعد ہی نگاہ باہر کا دروازہ کھولنے اٹھی۔ تب تک وقفے وقفے سے تین بار بیل بجائی جا چکی تھی۔
دروازے کے قریب رک کر نگاہ نے ایک بار پھر اندازہ کرنا چاہا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ وہ دم سادھے کسی
بھی قسم کی آواز کی منتظر تھی اچانک مردانہ بوٹوں کی چرچراہٹ اور پھر چاپ سنائی دی۔ وہ جو بھی تھا بے چینی سے
ٹہل رہا تھا۔ یوں تو نگاہ خاصی بے خوف اور نڈر قسم کی تھی مگر اس وقت سوال صرف اس کی ذات کا نہیں تھا۔ اسے
ڈر تھا کہ کہیں ملک کے کسی بندے نے دعا کو اس کے گھر آتے یا جاتے نہ دیکھ لیا ہو۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ
اس نے کسی نہ کسی کو اس پہ نظر رکھنے کا کہہ رکھا ہو۔ اس لیے ہی تو اس نے دعا کے ساتھ دلکش کو نہیں جانے دیا
تھا۔ "کون؟" اپنے اندر کے خوف اور وہم کو دباتے ہوئے اس نے آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔
"شہزاد ملک۔"
یہ آواز سن کے وہ بری طرح چونک گئی۔ غیر ارادتاً وہ دونوں پٹ وا کر بیٹھی۔
"آپ.... یہاں؟"
"کیا دعا یہاں ہے؟"
شہزاد نے بغیر کسی تمہید کے سوال داغا۔
"نہیں۔"
"کیا وہ یہاں آئی تھی؟"
اس بار وہ فوری طور پہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ شہزاد کو اس کے یہاں آنے کے
متعلق بتائے یا چھپا لے۔
اس کے اس تذبذب کو دیکھ کر شہزاد نے خود ہی کوئی رائے قائم کر لی۔
"مجھے اس سے ملنا ہے۔"
اس کے جواب میں بھی وہ خاموش کھڑی لب کچلتی رہی تو اسے خود قدم بڑھا کے اندر داخل ہونا پڑا۔
"وہ.... وہ یہاں نہیں ہے۔ میں نے بتایا تو ہے۔" نگاہ بوکھلا گئی۔
"اور کہاں جا سکتی ہے وہ؟"
شہزاد نے پلٹ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
"تم اس کی واحد دوست ہو' اگر وہ اپنے گھر نہیں ہے' اپنے کام کے سلسلے میں کہیں نہیں گئی' میرے گھر میں
نہیں ہے' میرے ساتھ نہیں ہے۔ تو پھر سوائے تمہارے وہ اور کس کے پاس ہو سکتی ہے۔"
"مگر میں سچ کہہ رہی ہوں' وہ یہاں نہیں ہے۔"
"میں تمہاری بات مان لوں گا اگر یہ ثابت ہو گیا تو اور اس کے لیے مجھے تمہارے گھر کی تلاشی لینا ہوگی۔"
"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔"
وہ بری طرح گھبرا گئی۔
"جب میں کہہ رہی ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے تو آپ کو ماننا ہوگا۔ مجھے کسی بات کو ثابت کرنے کی ضرورت

نہیں ہے نہ ہی آپ کوئی پولیس والے ہیں جو بغیر اجازت میرے گھر میں دندناتے ہوئے گھس جائیں گے او
تلاشی کے نام پہ میری پرائیویسی میں دخل دیں گے۔"
"سوری.... مگر مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ تم دعا کی دوست ہو' اس لحاظ سے مجھے تمہارے ساتھ اتنی بے مروتی برتنی
نہیں چاہیے اور نہ ہی زیادہ سختی سے کام لینا چاہیے' مگر مجبوری ہے۔"
اس نے شانے اچکائے اور دائیں بائیں نظریں گھماتے ہوئے جائزہ لینے لگا۔
"مجبوری ہے کہ مجھے ایسا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ بھی صرف دعا کے لیے۔ امید ہے تم زیادہ برا نہیں مانو گی۔"
بات کرتے کرتے اس نے ایک کمرے کے دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر سے کھول دیا۔ پرانی [illegible] کے کواڑ
چرچر کی آواز کے ساتھ ہلنے لگے۔ مختصر سا کمرہ اپنے خالی پن کے ساتھ سامنے تھا۔ یہ وہ کمرہ تھا جسے نگاہ
ڈرائننگ روم یا بیٹھک کے طور پہ استعمال کرتی تھی اس لیے اس میں سامان بے حد کم تھا۔ شہزاد نے ایک
سرسری نظر ڈال کے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔
"بس ہو گئی تسلی' اب تو یقین آ گیا کہ یہاں دعا نہیں ہے۔ اب پلیز آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔"
نگاہ اس کے دوسرے دروازے تک جانے سے پہلے تیر کی طرح لپک کے اس کے سامنے آئی اور ہاتھ جوڑتے
ہوئے سخت انداز میں کہا۔
"ابھی کہاں؟ ایک کمرہ رہتا ہے نگاہ بی بی۔ اس کے بعد تسلی ہوگی اور تسلی ہوگی تو چلا بھی جاؤں گا۔"
اس نے شہزاد کا راستہ روک لیا۔
اب شہزاد کے اندازوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔ یہ خیال اس کے دل کو تقویت پہنچانے لگا کہ چند قدم کے فاصلے
پہ موجود دروازے کے پیچھے دعا ہی ہے۔
"سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے' میں تو یہ مانتا ہوں تم کیسی سالی ہو جو اپنے ہونے والے بہنوئی کو اپنے گھر سے
کھڑے کھڑے نکال رہی ہو۔"
اس کی مسکراہٹ نے نگاہ کو زچ کر ڈالا۔
کوئی بہانہ کام نہ آتے دیکھ کر وہ روہانسی ہو گئی اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
"آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔ ہاں وہ آئی تھی میرے پاس کچھ دیر بیٹھی تھی مگر پھر چلی گئی۔ اب
اس بات کو کئی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ میں نہیں جانتی وہ اس وقت کہاں ہوگی۔"
شہزاد نے ایک لمحہ رک کے اس کی بات سنی اور پھر سر جھٹکتے ہوئے پہلے دروازے کی طرح اس پہ بھی پاؤں کی
ٹھوکر رسید کی مگر اندر سے بند دروازہ صرف ہل کے رہ گیا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے نگاہ کے گھبرائے چہرے کی
جانب دیکھا اور ہاتھ کا دباؤ دروازے پہ ڈالا۔
"دعا اندر نہیں ہے۔"
یکبارگی وہ چلا اٹھی۔
"میں قسم کھا کے کہتی ہوں' وہ اندر نہیں ہے۔ وہ میرے گھر پہ نہیں ہے اور میں واقعی نہیں جانتی وہ کہاں ہے
میں دعا کی قسم کھا کے کہتی ہوں اور اور میں اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔"
شہزاد کے ہاتھ ایک بار پھر رک گئے۔
اس نے غور سے نگاہ کے چہرے پہ کچھ تلاشنا چاہا۔
وہ اتنی بڑی قسم یونہی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اس چہرے پہ جھوٹ کا شائبہ تک نہ تھا لیکن ان آنکھوں میں جو
خوف تھا وہ خوف بھی بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا۔
اس خوف کی وجہ تلاشنے کے لیے اس نے دروازے کو دو تین ٹھوکریں رسید کیں۔
زنگ آلود سا خوردہ چٹخنی ٹوٹ کر دور جا گری۔

”وہ اندر نہیں ہے۔“
نگاہ کا چلانا خود بخود مدھم سرگوشی میں ڈھل گیا اور وہ ہارے ہوئے انداز میں دیوار سے لگ گئی۔
”دعا!“
شہزادے نے اندر داخل ہوتے ہی بے تابی سے پکارا۔
”دوئی۔۔۔ کیوں چھپ رہی ہو تم؟“
اس نے پردے کی اوٹ میں اسے چھپتے دیکھ لیا تھا اور اب آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتا پیار سے کہہ رہا تھا۔
”حالات سے فرار کا یہ کون سا طریقہ ہے دوئی‘ کمال ہے تم اب تک خود کو اکیلا سمجھتی ہو۔ خود ہی اتنے بڑے بڑے فیصلے کرنے لگیں اور وہ بھی سخت احمقانہ اور جذباتی۔ ہم مل کے کوئی حل نکال سکتے ہیں۔ میں تمہاری خاطر اس بار بھی۔۔۔“
کہتے کہتے اچانک اس نے پردہ پرے کھینچا تو اس کی زبان تھم گئی۔
وہ واقعی دعا نہیں تھی۔
نگاہ سچ کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

”آپ ہمیں غلط مت سمجھیے ہم صرف اتنا جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کی زوجہ۔“
”اس بہشتن سے آپ کا کیا لینا دینا بادشاہ ہو‘ وہ تو سالوں پہلے مرکھپ گئی۔“
اللہ وسائے نے نواب صاحب کی پوری بات سنے بغیر بے زاری سے کہا۔
عمیص کا فون آنے کے بعد بابر ہمایوں مغل کو احساس ہوا کہ دلکش کی پریشانی میں وہ صاحبزادی یاسمین کو تو بھلا ہی بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت بیٹی کی گمشدگی سے کتنی بے حال ہوں گی‘ اس کا تصور ہی اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر گیا۔ اب تک وہ بزدلوں کی طرح منہ چھپاتا پھر رہا تھا لیکن اب اس نے یاسمین کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
ویسے بھی وہ یاسمین سے خوفزدہ نہیں تھا۔۔۔ صرف نادم تھا‘ شرمسار تھا۔
خوفزدہ تو وہ اپنے سسر صاحبزادہ نفیس علی خان سے تھا‘ حد سے زیادہ خوفزدہ کل سے لے کر اب تک یہ خیال جب بھی اسے آیا کہ یہ ساری بات ان کے علم میں آنے کے بعد کیا ہوگا‘ اتنی ہی بار وہ خوف سے لرز اٹھا تھا لیکن جب ان کا سامنا بھی کر لیا۔ اس طوفان کا خطرہ بھی دل سے نکل گیا تو وہ قدرے نڈر ہو گیا۔
”سب کیا دھرا ہمارا ہے تو ہمیں سب کی لعن طعن کے لیے تیار بھی رہنا چاہیے‘ کم از کم اتنی بڑی ٹھوکر کے بعد تو سنبھلنا چاہیے ساری عمر فرائض سے منہ موڑے گزر گئی مگر اب اور نہیں۔ اب ہمیں ایسا نہیں کرنا۔ اس وقت یاسمین بیگم کو ہماری ضرورت ہے۔ ہمیں یوں فرار حاصل کرنے کی بجائے ان کے پاس ہونا چاہیے۔ ان کی دلجوئی کی خاطر ان کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ جو کام وہ ساری عمر نہ کر سکیں وہ ہماری بیٹی کی چند گھنٹے کی جدائی نے کر دیا۔“
وہ اسی وقت وہاں سے نکل گیا تھا۔
اور نواب صاحب نے جھجکتے ہوئے اللہ وسائے سے دعا کی ماں کے بارے میں سوال کیا تھا۔
”تو اس سے پوچھ وسائے! یہ بڑا خاندانی بنا پھرتا ہے اسے اتنی تمیز نہیں کہ کسی کے گھر کی عورتوں کے بارے میں زیادہ پچھ پریت (تفتیش) نہیں کرتے۔“
بالو کے طعنے پہ نواب صاحب کا وقار ڈگمگا گیا۔ وہ جب سے یہاں آئے تھے‘ اس خاتون کی کڑوی کسیلی باتیں بڑے حوصلے سے برداشت کر رہے تھے صرف اور صرف اپنے اس ایک سوال کا جواب جاننے کی غرض سے۔
ورنہ ایک تو ایسا بہت کم ہوا تھا کہ وہ کسی غیر کے گھر جائیں اور غیر بھی وہ جو ان کے برابر کا ہوتا تو دور کی بات‘ ایسے خاندان و حیثیت کا تھا جسے اپنی حویلی کے آس پاس بھی پھٹکنے نہ دیں۔ دوسری خلاف معمول بات یہ تھی کہ وہ مسلسل ضبط سے کام لے رہے تھے۔ اپنی خودداری اور غیرت کو پس پشت ڈالتے ہوئے زندگی میں پہلی بار ڈھٹائی سے کام لے رہے تھے۔ شہزاد کے کہنے پہ بھی وہ اس کے ساتھ نہ گئے تھے اور **عمیص** کو بھی آنے سے منع کر دیا

تھا۔ وہ اپنے سوال کا جواب لیے بغیر یہاں سے تنہا نہیں لوٹنا چاہتے تھے۔
”ہم جانتے ہیں ہمارا سوال آپ کو کچھ معیوب لگا ہوگا‘ بہت بہتر‘ ان مرحومہ کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کرتے۔ فقط اتنا فرما دیجئے‘ آپ کی بیٹی کی شکل و صورت ہمارا مطلب ہے‘ وہ کس سے مشابہ ہیں؟“
انہوں نے بالو کو سراسر نظرانداز کرتے ہوئے اللہ وسائے سے ہی اگلا سوال کیا۔
”اپنی ماں سے اور کس سے۔“
اس بار بھی تنتناتا ہوا جواب بالو کی جانب سے آیا۔
”ہم غریب کم ذات لوگوں کے بچے تو اپنی ماں پیو میں سے ہی کسی پہ جاتے ہیں‘ آپ اونچے لوگوں کا پتا نہیں‘ شاید ولایت کے شہزادے شہزادیوں پہ چلے جاتے ہوں۔“
”اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا ہم ان کی والدہ مرحومہ کا نام جان سکتے ہیں؟“
نواب صاحب بالو کی اشتعال انگیز گفتگو مسلسل نظرانداز کرتے ہوئے لجاحت سے کہہ رہے تھے۔
”لو۔۔۔ ابھی کہہ رہا تھا اس کے بارے میں نہیں پوچھوں گا‘ اب پھر گھما پھرا کے اسی طرف۔“
”تو چپ کر بھرجائی۔ تیری زبان بولنے سے نہیں رہتی۔ پروہنا ہے وہ ہمارا قسمت سے تو ایسے لوگ ہم جیسوں کے گھر آتے ہیں۔“
وہ نواب صاحب کی پروقار اور بارعب شخصیت سے خاصا مرعوب تھا۔
”نواب صاحب‘ اگر تسی برا نہ مانو تو میں آپ سے پوچھ لوں کہ آپ یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟“
اس نے ان کا سوال گھما کے ان کی جانب لوٹا دیا۔
”دراصل ان کی صورت ہماری ایک عزیزہ سے ملتی ہے۔“
”تو وہ کدھر ہیں جی؟“
”وہ۔۔۔ وہ تو۔“
”فوت ہو گئیں؟“
”ہاں۔۔۔ شاید۔“
”شاید؟ یہ کیا بات ہوئی؟ یا کوئی زندہ ہوتا ہے یا فوت ہوتا ہے‘ شاید تو نہیں ہوتا۔“
اللہ وسائے نے اعتراض کیا۔ بلقیس نے بھی ایک طنزیہ ہنکارا بھرا تھا۔
”ایک عرصہ قبل ہم نے بھی یہ فرض کر لیا تھا کہ وہ وفات پا چکی ہیں‘ لیکن آپ کی صاحبزادی کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے ہماری یہ عزیزہ مجسم ہو کے سامنے آ گئی ہوں۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے نواب صاحب۔ دو لوگوں کی شکل اتنی نہیں مل سکتی اور وہ بھی بالکل غیر لوگوں کی۔ ایسا تو جڑواں بہن بھائیوں میں ہوتا ہے اور مجھے چنگی طرح پتا ہے کہ میری دوئی کی کوئی جڑواں بہن نہیں۔ یہ تو آپ بڑی منتوں مرادوں کے بعد شادی کے کئی سالوں بعد پیدا ہوئی تھی۔“
”ہم جانتے ہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“
نواب صاحب مبہم سا مسکرائے۔
”وہ آپ کی بیٹی کی جڑواں ہو بھی نہیں سکتیں۔ آج سے پینتیس سال پہلے جب ان کی ایک حادثے میں وفات ہوئی تو وہ اٹھارہ بیس سال کی تھیں۔“
”پینتیس سال پہلے؟“ اس نے دہرایا۔
”اور آپ ابھی تک انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟“
”نہیں‘ ہم جانتے ہیں وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دریا کی طوفانی لہروں نے ان کو ہم سے اور زندگی سے بہت دور کر دیا تھا۔ ہم صبر کر چکے تھے مگر اتنے عرصے کے بعد اسی شکل و صورت کو دوبارہ دیکھنا ہمیں الجھن میں مبتلا کر گیا

ہے، نہ صرف ہمیں بلکہ ہماری بیگم کو بھی۔ جوان مرحومہ کی سگی ہمشیرہ ہیں۔ ہم سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس حد درجہ مماثلت کی وجہ کیا ہے' حالانکہ۔۔۔ حالانکہ دماغ یہ کہتا ہے یہ محض اتفاق ہے' سو فیصدی اتفاق' یہ پینتیس سال پرانی بات ہے تب آپ کی بیٹی اس دنیا میں بھی نہیں آئی تھی۔ بھلا ان کا ہماری عزیزہ سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے جوان کی پیدائش سے کئی سال پہلے آنے والے سیلاب میں۔۔۔۔"

"ایک منٹ۔" بالو نے گفتگو میں دخل دیا۔

"کون سا سیلاب؟ وہ جو راوی میں آیا تھا؟"

"او چھڈ بھرجائی' راوی میں کون سا سیلاب آنا ہے' اب تو ادھر چلو بھر پانی نہیں ہوتا۔ مجع نہلانے جوگا پانی نہیں تو پوری زنانی ڈبونے کی بات کرتی ہے۔"

اللہ وسائے نے اپنی عادت کے مطابق بے پر کی ہانکی۔

"وہ آج کے راوی کی نہیں' پینتیس سال پہلاں کے راوی کی بات کر رہا ہے جو اس وقت اتنا بڈھا بھی نہیں تھا۔ جب جلال میں آتا تھا تو پنڈ کے پنڈ روھڑ (بہا) کے لے جاتا تھا' ادھر شاہدرے کے پاس کے کتنے پنڈ اجاڑے تھے اس نے۔ تو تو ساری عمر لاہور رہا۔ اپنے پنڈ کی خبر نہیں لی' مجھے کرمے نے بڑی دفعہ بتایا تھا اس کا پنڈ بھی ادھر شاہدرے کے پاس ہی تھا' وہی جوان کا تھا۔"

اس نے نواب صاحب کی جانب اشارہ کیا جو گم صم بیٹھے یہ سب سن رہے تھے۔ انہیں یاد آ رہا تھا کہ کرمے سے ملاقات میں یہی قدر مشترک تو اسے پہچاننے کا سبب بنی تھی۔

"ہاں ہم اسی سیلاب کی بات کر رہے ہیں۔"

"وہ سیلاب جس میں نورے ڈاکو' اس کے بیلی اور کئی پلس (پولیس) والے بھی ڈوب گئے تھے؟"

"ہاں۔۔۔ وہی۔"

انہوں نے سر جھکا لیا۔ نورے ڈاکو کا نام انہیں یونہی پسپا کر دیتا تھا۔

کمرے میں کئی منٹ تک سکوت پھیلا رہا۔

اس معنی خیز خاموشی سے گھبرا کے نواب صاحب نے سر اٹھا کے دیکھا تو بلقیس کمرے سے غائب تھی۔ پھر انہوں نے اسے اندر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

"یہ تھی وہ؟"

وہ ایک پرانی اڑے ہوئے رنگوں والی گروپ فوٹو تھی۔ جس میں دو بوڑھے مرد اور عورت کے ساتھ دو جوان مرد اور دو جوان عورتیں کھڑی تھیں۔

نواب صاحب کی نظریں باری باری ایک ایک چہرے پہ پھسلنے لگیں۔

وہ بوڑھے چہرے اجنبی تھے۔ مگر وہ جوان مرد مرحوم کرم الہٰی اور اللہ وسایا تھے زرق برق لباس اور زیورات میں ملبوس دونوں عورتیں وہ آنکھیں سکوڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ سانولی ہٹی کٹی عورت یقیناً بالو تھی اپنی جوانی کے دنوں میں۔ اور یہ دوسری ان کی آنکھوں کے آگے یکدم اندھیرا چھا گیا۔

"یہ والی؟" اس تصویر پہ بالو نے اب انگلی رکھ کے پوچھا۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکے فقط سر اثبات میں ہلا دیا۔

"یہ ڈوبی مری نہیں تھی' وگتی وگتی (بہتی بہتی) دریا کے دوجے کنڈے (کنارے) آ لگی تھی۔ اسے میرے سوہرے نے یعنی بہشتی کرمے کے ابا جی اللہ بخشے نے نکالا تھا۔"

● ● ●

"مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میں چاچے کے پاس ملنے گیا ہوا تھا۔ چلا جاتا تھا اکثر ہی مہینے دو مہینے بعد ایویں ہی اک آدھ دن کے لیے۔ کرمے میرا ہانی (ہم عمر) تھا اور بیلی بھی۔ بڑا یارانہ تھا ہمارے بیچ جوانی کے دنوں میں۔ سیلاب

نے بڑے کچے مکان ڈھائے تھے۔ ذرا زور اترا تو پنڈ کے دوسرے جوانوں کے ساتھ ساتھ ہم بھی کنڈا جمانے (بند باندھنے) گئے تاکہ اک اور مینہ پڑے تو سارے کا سارا پنڈ ہی نہ رہڑ جائے۔ ادھر بیلے کے پاس فٹ فٹ اونچے گارے والے پانی میں ہم تینوں نے اس کو بے ہوش پڑے دیکھا تھا۔"

اللہ وسائے نے مزید بتایا۔

نواب صاحب سانس روکے یہ سب سن رہے تھے۔

حتیٰ کہ بلقیس کی محویت کا بھی وہی عالم تھا' حالانکہ وہ شادی کے بعد یہ قصہ کئی بار اپنی ساس سسر اور شوہر سے سن چکی تھی۔

"پہلاں تو ہم یہی سمجھے کہ لاش ہو گی کسی کی۔ سویرے سے کئی لوگوں کی لاشیں پنڈ والوں نے نکالی تھیں۔ کوئی اپنے ہی گرائیں تھے تو کوئی آلے دوالے کے پنڈوں والے۔ وہ زندہ تھی۔ اس کا پیٹ بھی زیادہ پھولا ہوا نہیں تھا' یعنی زیادہ دیر پانی میں نہیں رہی تھی۔ ڈوبنے کے فوراً بعد کوئی اونچی چھل (لہر) اسے ادھر چکڑ (کیچڑ) میں پھینک گئی اور ادھر اگے کانوں (بانس) میں پھنس گئی۔ یہ ہمارے پنڈ کی نہیں تھی۔ بلکہ شکل سے ہی لگ رہا تھا کسی اونچے گھر کی ہے۔ اونچے بھی اور شریف گھر کی بھی۔ اس حالت میں بھی اس کی چدر رچنگی طراں لپٹی ہوئی تھی۔ چاچا اسے چک کے اپنے گھر لے گیا۔ چاچی کو حکیمی ٹونے بڑے آتے تھے۔ منٹ میں اسے ہوش میں لے آئی۔ وہ تو جی بالکل گم صم نہ بولے نہ چالے' بس اتھرو گرتے جاتے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنا نام پتا بتایا۔ چاچا نورا' اٹھا وہ جانا تھا اس کے رشتے داروں کو۔ جا کے خبر دینے والا تھا کہ اس کڑی نے روک لیا۔ کہنے لگی میں سیلاب کی وجہ سے نہیں بچھڑی' مجھے نورا ڈاکو چک کے لے جا رہا تھا۔"

یہاں تک پہنچ کے وہ رکا اور نواب صاحب کا چہرہ دیکھا جو سرخ پڑتا جا رہا تھا اور گردن سینے سے لگتی جا رہی تھی۔ بیڈ کے کناروں پہ سختی سے جمی ان کی انگلیاں اب مرتعش تھیں۔

"رونے لگی کہ پتا نہیں اب میرے گھر والوں کا کیا حال ہو گا۔ وہ مجھے قبولیں گے بھی یا نہیں۔ کہیں ساروں نے شرم کے مارے خودکشی نہ کر لی ہو۔ چاچے نے اسے چپ کرانے کے لیے کہہ دیا کہ اچھا نہیں جاتا بعد میں دیکھیں گے مگر چپکے سے مجھے اور کرمے کو بھیج دیا۔ ہم جی ادھر پہنچے تو پتا چلا نورے نے بڑی "ات" مچائی ہے۔ چوہدری کے گھر بھی دو بندے مار دیے' وہاں سے دو ہٹی اٹھائی ڈاکہ مارا اور پروہنوں سے بھی اک لڑکی لے گیا۔ اس لڑکی کی ماں بے چاری غم سے ویسے ہی مر گئی۔ پنڈ میں مشہور ہو گیا کہ سیلاب میں رہڑ کے نہ نورا بچا نہ وہ دونوں لڑکیاں۔

کسی نے یہ بھی بتایا کہ آج شام کو دونوں لڑکیوں کی نماز جنازہ غائبانہ بھی پڑھائی جانے والی ہے۔ وہ زمانہ اور تھا دھی بہن کی عزت بڑی نازک سمجھی جاتی تھی۔ خاص طور پہ پنڈ تھاں میں تو بہت ہی مرنے مارنے والی بات تھی۔ یہ ہم غریب کمی ہی عزت بے عزتی پہ مرجاتے تھے تو یہ تو حویلی والوں کی بات تھی۔ کرمے نے کہا۔ اب لڑکی کے بارے میں بتانے کا فائدہ نہیں۔ یہ تو اسے رو بھی چکے ہیں' فاتحہ بھی پڑھ چکے ہیں' ہم نے لا کے زندہ سامنے کر دی تو کہیں اپنی عزت رکھنے کے لیے سچی مچی ہی نہ مار دیں' سارا گناہ ہمارے سر ہو گا۔ اس لیے کرمے کے کہنے پر ہم اس کڑی کے رشتے داروں سے ملے بغیر واپس آ گئے۔ ساری بات اسے بتائی اور پوچھا۔ اب تو کیا کہتی ہے؟ جانا ہے اپنے سگوں کے پاس تو لے جاتے ہیں مگر وہ خود انکار کر گئی۔

اس کا رونا نہیں دیکھا جاتا تھا۔ پیاروں کے مرنے پہ لوگوں کو بڑا روتے دیکھا ہے' لیکن وہ اکیلی تھی جو اپنے مرنے پہ رو رہی تھی۔ میرے چاچے چاچی کا دل پھٹ گیا' انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ دھی ان کو اللہ نے کوئی دی نہیں تھی' بس اسی کو اپنی دھی بنا لیا تھا۔ کرمے نے بھی سر پہ ہاتھ رکھ ساری عمر بھائی کا فرض نبھانے کی قسم کھائی۔ پھر انہوں نے پنڈ والوں کے سوال جواب سے بچنے کے لیے جلدی سے وہ پنڈ چھوڑ دیا اور ملتان سائیڈ پہ آ کے رہنے لگے۔"

وہ ساری بات بتا کے نواب صاحب کا منہ تکنے لگا۔ جن کی عجیب کیفیت تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے ان

کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ انہیں یہ تک احساس نہ ہوا کہ اللہ وسایا کب کا خاموش ہو چکا ہے۔ وہ اب تک اس کی آواز سن رہے تھے' فرق اتنا تھا کہ اب الفاظ سمجھ نہیں آرہے تھے۔

ان کا ذہن اسی پچھتاوے میں غوطے لگا رہا تھا۔

"صاحبزادی فرحت النساء زندہ تھیں۔ اللہ نے ہم پر اتنا کرم کیا اور ہم انجان رہے۔ وہ حیات تھیں مگر روپوش رہیں کیونکہ ـــــ کیونکہ ہم نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے ان کا سوگ منانے میں کچھ زیادہ ہی جلدی کرلی۔ اسی میں ہم سب کو اپنے خاندان کی عافیت نظر آئی تھی۔"

انہیں یاد آنے لگا کہ غم سے چور چور' مایوسی اور دکھ کے شدید عالم میں جب انہیں خبر ملی کہ نورے ڈاکو کا پورا گروہ بمعہ مال مسروقہ اور مغوین کے دریا برد ہو چکا ہے تو ایک سفاک اور خود غرض سا سکون ان کے اندر اتر گیا تھا۔ کسی حد تک ہلکا پھلکا ہو کے انہوں نے آخری رسومات کی تیاری شروع کردی تھی ـــــ نعش ڈھونڈنے کی بھی بس واجبی سی کوشش کی گئی۔

"آہ! کتنا عرصہ وہ زندہ رہیں مگر ہم سب سے انجان ہم سب سے دور اپنے سارے رشتوں سے محروم رہ کے۔"

"کرما خیر سے بڑا پیار کرتا تھا اپنی بہن سے۔"

بالو کی آواز پہ وہ اپنے خیالوں سے نکلے۔

"شادی کے شروع شروع کے دنوں میں تو مجھے پتا ہی نہ چل سکا کہ وہ اس کی سگی بہن نہیں ہے۔ ہر جگہ اسے آگے کرتا۔ چھوٹی بہن والا پیار بھی دیتا اور کسی بڑے کی طرح عزت بھی۔ بڑی مانتا تھا اس کی۔ کہتا تھا میری بہن میرے لیے برکت والی ہے۔ اس کی وجہ سے میرا رزق بڑھا ہے۔ کوئی اور شوہدی ہوتی تو پھٹ پڑتی اتنا لاڈ دیکھ کے' لیکن وہ کرماں والی بڑی بھلی تھی۔ اسی لیے تو مجھے بھی اس سے بہنوں والا پیار ہو گیا' ورنہ عورت کی فطرت ہے' ساس' نند سونے کی بھی ہو تو نظر پہ نہیں چڑھتی خاص طور پہ کسی کا بندہ اپنی بہن کا اتنا دیوانہ ہو تو زنانی آپے آپ نند سے حسد کرنے لگ جاتی ہے پر جی وہ کوئی حسد کرنے والی چیز تھی؟ اللہ کی نیک بندی بس مصلہ بچھائے اللہ اللہ کرتی' آلے دوالے کے بچوں کو سیپارے پڑھاتی' گھر کے کام کرتی اور میرے ساس سسر کی خدمت کر کے ان کی دعائیں لیتی۔ بڑی سوہنی بھی تھی' لیکن شادی نہیں ہوئی تھی تب تک اس کی۔ حالانکہ عمر میرے جتنی ہی تھی۔ میں اکثر کرمے سے وجہ پوچھتی وہ ٹال جاتا۔

میں اور کرما اپنے کام کی وجہ سے لاہور شہر میں رہتے تھے' مہینے دو مہینے بعد ملنے آتے تھے۔ پھر جب خیر سے اللہ نے شہزادہ میری جھولی میں ڈالا تو اسے کاکے سے اتنا پیار کرتے دیکھ کے مجھے بڑا محسوس ہوا۔ میں نے سوچا ماں بن کے میں خود کو بڑا کچھ سمجھنے لگی ہوں۔ کیا اس کا دل نہیں چاہتا ہوگا ایک ہنستے بستے گھر کو' بال بچوں کو۔ میں نے کرمے سے ٹھیک ٹھاک لڑائی کی کہ وہ اپنی بہن کی شادی کیوں نہیں کرتا' اس کی عمر گزر رہی ہے۔ اپنے ساس سسر سے بھی بات کی۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ ان کی اپنی دھی نہیں ہے۔ ساری بات بتا کے کرمے نے پوچھا' بتا اس نیک بی بی کا ویاہ کدھر کروں' ہمارے گھر تو ہمارے جیسوں کے رشتے ہی آسکتے ہیں' جو اس کے قابل نہیں۔ تب میں نے پہلی بار اسے کھل کے بولتے سنا۔ وہ کمرے سے نکلی اور میرے سسر کے پیروں میں سر رکھ کے رونے لگی۔ کہتی تھی کرمے بھرا نے یہ کیوں کہا کہ وہ یا ان جیسے لوگ میرے مقابلے کے نہیں۔ آپ لوگوں نے میری زندگی ہی نہیں بچائی' مجھے پیار اور عزت بھی دیا۔ مجھے آپ ساروں سے اچھا' آپ ساروں سے عزت دار کوئی اور نہیں لگتا۔ مجھے اپنا آپ آپ کے سامنے بڑا چھوٹا لگتا ہے' اس لیے دوبارہ ایسی بات نہ کرنا۔"

اتنا کہہ کے اس نے نواب صاحب کی جانب جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"یقین نہیں آتا اتنے اچھے خیالوں والی' اتنے نرم دل والی اور اتنی محبت دینے والی وہ عورت آپ کی رشتے دار تھی۔ خیر میں بے وقوف۔ میں نے اس اللہ وسائے سے اس کی شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ مجھ سے بڑی بے وقوف صرف کرمے اور اس کے پیو کو خوش اور راضی کرنے کے لیے فٹ مان گئی۔ کاش وہ ہی نہ مانتی ـــــ یا میرے دماغ

میں ہی ایسا الٹا خیال نہ آتا۔ یہ شادی نہ ہوتی تو شاید وہ کچھ سال ہور جی لیتی۔"

اس نے اللہ وسائے کے سامنے ہی اپنی رائے کا برملا اور دوٹوک اظہار کیا۔ آج اللہ وسائے کو اس کی بات بری نہ لگی بلکہ وہ اداسی سے سر جھکا کے کہنے لگا۔

"سچ کہتی ہو بھرجائی' میں اس کے قابل نہ تھا۔ نہ میں نے اس کی قدر کی۔ ہمارا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔"

صاحبزادہ نفیس علی خان عجیب سے تاثرات چہرے پہ لیے اسے دیکھتے رہے اس کم مایہ' بے حیثیت شخص کو ـــــ جو حقیقتاً "کسی بھی طرح صاحبزادی فرحت النساء کے قابل نہ تھا وہ ان کا نصیب بنا۔ ان کا ہم سفر ٹھہرا۔ چاہے یہ ہم سفری چند لڑکھڑاتے قدموں تک ہی محدود تھی۔ وہ صاحبزادی فرحت النساء کے طلب گار تھے۔ جن کی جدائی کے الم سے اتنے سالوں بعد بھی خود کو نکال نہ سکے تھے۔ جوانی مٹ گئی' مگر بڑھتی عمر کے اثرات بھی دل سے اولین عمر کی چاہت کی کسک کو مٹا نہ سکے۔

"بعد میں کرما بھی بہت پچھتایا۔ پیار تو وہ پہلے ہی اپنی بہن سے بڑا کرتا تھا پر اس کے بعد اور بھی خیال رکھنے لگا۔ وہ کہتا تھا' میں نے اس کی شادی کر کے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا اور وہ بھی وسائے جیسے طبلہ پیٹنے والے کے ساتھ۔ وہ اور ہی روح تھی۔ ایسے گند میں زیادہ دن رہ نہیں سکی۔ اور وہی ہوا وہ جلدی مرگئی۔ ابھی دوئی آٹھ نو سال کی تھی جب وہ ـــــ ہک ہا! مگر میں کرمے کو یہی تسلی دیتی رہی کہ ہم نے جو کیا اس کے ساتھ بھلا کرنے کی نیت سے کیا۔ ہم اس کی شادی شاہوں میں یا کسی مولوی سے تو نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اصل میں جو بھی تھی' دنیا کے سامنے تو رونق شہزادے کی بیٹی اور کرمے کی بہن تھی۔ جو رشتہ آتا ہمارے جیسے بھانڈ میراثی کا ہی آتا۔ مگر کرما خود کو معاف نہیں کر سکا' وہ چلی گئی تو دوئی کے لیے فکر مند رہنے لگا ـــــ آخری وقت میں بھی اس کی فکر تھی کرمے کو۔"

بالو دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو خشک کرنے لگی۔

صاحبزادہ نفیس علی خان کی نظروں کے سامنے اس شخص کا نقشہ پھر گیا جو ان کی نفرت و تضحیک کا نشانہ بنا تھا حقیقت میں وہ اس ساری عزت اور شان کا اہل تھا جو ایک محسن کو ملنی چاہیے تھی۔ نہ صرف وہ' بلکہ ان کا سارا خاندان اس شخص کا مقروض تھا جس نے ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھا تھا۔ اسے بساط سے بڑھ کے محبت دی تھی۔ نہ صرف اسے' بلکہ اس کے جانے کے بعد اس کی اولاد کو جو حقیقت میں ان کا ہی خون ہے اسے بھی عزیز جانا اور وہ بجائے اس کے احسان کو ماننے کے اس کے آگے سر جھکانے کے' اسے برا بھلا کہتے تھے۔

اب شرمندگی کا اظہار بے معنی تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہے' لیکن ان کا روم روم پکار کے یہ اعلان کر رہا تھا کہ وہ اس وقت خود کو اس شخص کے مقابلے میں کتنا حقیر محسوس کر رہے ہیں۔

اس کا احساس بلقیس کو بھی ہو گیا تھا۔ اسے اپنے اندر ایک سکون سا اترتا محسوس ہوا۔ کرم الٰہی وفات کے بعد اس سے دائمی جدائی کا صدمہ تو جو تھا سو تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کی موت سے وابستہ جو ذلت کا احساس تھا وہ اسے کچل دیتا تھا لیکن آج کرم الٰہی کو سرخرو ہوتے دیکھ کے اور نواب صاحب کی نظروں میں اس کے لیے عقیدت و احترام کے سائے دیکھ کے وہ احساس زائل ہو رہا تھا۔ اب اس کے اندر نواب صاحب کے لیے موجود نفرت کی آگ کے لپکے بھی کچھ کم ہوئے۔ اسی لیے جب وہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھی

"اس حالت میں' اکیلے کدھر جاؤ گے؟ آ لینے دو اپنے بیٹے کو یا پھر میرے شہزادے کو' آپ کو چھوڑ آئے گا۔"

"نہیں بہت بہت شکریہ! حالانکہ بہت سے احسان ایسے ہیں جن کا شکریہ تک ادا کرنے کے قابل نہیں رہے ہم پھر بھی اس ایک اور عنایت کا شکریہ جو اتنی دیر تک ہمارے وجود کو خندہ پیشانی سے جھیل کر آپ نے کی۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے اپنے عصا پہ ہاتھ جمایا اور قدم بڑھا دیے۔

☼ ☼ ☼

شہزاد بے حد سنجیدگی کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پچھلی سیٹوں پہ چادر میں اچھی طرح لپٹی ہوئی نگاہ اور دلکش تھیں۔ دونوں کے چہرے پہ ہراس تھا۔

"شہزاد صاحب' آپ' آپ ایک بار اور سوچ لیں۔"

نگاہ نے ڈرتے ڈرتے بے حد مدھم آواز میں کہا اور اگر شہزاد کی تمام تر حسیات اپنے پیچھے بیٹھی ان دونوں کی جانب متوجہ نہ ہوتیں' تو شاید وہ اس کی آواز سن نہ پاتا۔

"کیا اب بھی مزید کچھ سوچنے کی ضرورت ہے؟" اس نے نگاہ سے الٹا سوال کیا۔

وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گئی لیکن پھر اسے دعا کی ناراضگی کا احساس دلانا چاہا۔

"اگر دعا۔۔۔ میرا مطلب ہے' اس نے مجھے قسم دی تھی۔۔۔ آپ نے میری دوستی کے قسم بھی تڑوا ڈالی۔ وہ بہت غصے میں آجائے گی۔ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ۔"

"میں اس کے غصے کی پروا نہیں کرتا۔"

"کہیں اسے شک تو نہیں ہوا تم سے بات کرتے ہوئے۔"

"مجھے کیا پتا۔" وہ بڑبڑا کے رہ گئی۔

"وہ آتو جائے گی؟"

"مجھے نہیں پتا۔" نگاہ اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھی' جسے وہ خاطر میں نہ لایا۔

"خیر۔۔۔ آئے گی تو ضرور۔ جس کی خاطر وہ اپنے آپ کو آگ میں جھونکنے لگی تھی۔ ایک عمر پرانی خواہش سے دست بردار ہو گئی تھی' اس کے لیے آئے گی تو ضرور۔"

شہزاد نے نگاہ سے سب کچھ اگلوا لینے کے بعد اسے مجبور کیا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہی دعا کو فون کرے اور دلکش کو اس کے حوالے کرنے کے لیے کسی جگہ پہ بلائے۔ نگاہ نے اسے ایک مصروف اور مشہور شاپنگ مال کی پارکنگ میں بلایا تھا۔

"اتنے ہجوم والی جگہ؟" اس نے حیرت سے وہی سوال کیا' جو نگاہ نے شہزاد سے کیا تھا جب اس نے یہ مقام تجویز کیا تھا۔

"ہاں' میرا خیال ہے پر ہجوم مقام پہ پہچانے جانے یا نظر میں آنے کا خطرہ ویران اور سنسان جگہ سے کم ہوتا ہے" اس نے جواب بھی وہی دیا' جو شہزاد سے سنا تھا۔

شہزاد نے نسبتاً "ایک کونے میں ایک بڑی وین کے پیچھے اپنی کار پارک کی اور نگاہ کو اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے' وہ ابھی نہیں آئی۔ تم نکل کر اس طرف کھڑی ہو جاؤ۔"

"ہو سکتا ہے' وہ ہم سے پہلے آچکی ہو اور اب آپ کی گاڑی دیکھ کر سب کچھ بھانپ لینے کے بعد چلی گئی ہو۔"

"نہیں۔۔۔" شہزاد نے پورے وثوق کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"یاد نہیں' تم نے اسے دوسرے گیٹ سے داخل ہونے کا کہا تھا۔ وہ وہیں کھڑی ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔۔۔ یا کرنے والی ہو گی۔ تم وہیں چلو اور جیسے ہی وہ آجائے اسے لے کر یہاں پہنچو"

اس نے انگشت شہادت کھڑی کر کے وارن کیا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ یہاں تک تو لا سکتی ہوں مگر۔۔۔ آپ کی گاڑی دیکھنے کے بعد وہ مزید بے وقوف نہیں بن سکے گی۔"

"اس سے آگے میں سنبھال لوں گا۔" شہزاد کو خود پہ پورا اعتماد تھا۔

نگاہ برے برے منہ بناتی نیچے اترنے لگی تو گھبرائی ہوئی دلکش نے اس کی چادر کا کونا تھام لیا۔

اس کی آنسو بھری آنکھوں میں نہ جانے کی التجا تھی۔ نگاہ کو ایک اور عذر تراشا تراشایا مل گیا۔

"بیٹا گھبراؤ مت۔" شہزاد نے پلٹ کر نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ اس بچی کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اس میں خود بخود نرمی پیدا ہو جاتی تھی۔

"فکر والی کوئی بات نہیں ہے۔ اب کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ انشاء اللہ! میں خیریت سے تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار اور تھوڑی سی ہمت۔۔۔ شاباش۔"

اس نے دلکش کو کسی بچے کی طرح چمکارتے ہوئے تسلی دی اور ساتھ ہی نگاہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

☼ ☼ ☼

عمیص تو ابھی اپنی آپا حضور کی حالت دیکھنے کے بعد ہی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ انہوں نے بھائی کو دیکھتے ہی جو ضبط کھویا اور اس کے سینے سے لگ کر بلکتے ہوئے دلکش کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں بتایا تو جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین ہی کھسک گئی۔

کتنی ہی دیر تک وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہا حتی کہ سوچنے کے بھی نہیں۔

وہ اتنے ہوش میں بھی نہیں تھا کہ کب؟ کیوں؟ اور کہاں؟ جیسے سوال اٹھا پاتا۔ انہیں تسلی یا دلاسا دینا تو بہت دور کی بات تھی۔

بڑی بے یقینی کی کیفیت میں اس نے صاحبزادی یاسمین کا چہرہ بغور دیکھا کہ شاید کسی مذاق کی رمق نظر آجائے' حالانکہ وہ ان کے مزاج سے واقف تھا جو کسی ایسے بے ہودہ مذاق کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود وہ شدت سے منتظر تھا کہ وہ کہہ اٹھیں "یہ سب مذاق تھا عمیص۔"

"ابا حضور آگئے۔"

نایاب نے دبا دبا سا نعرہ بلند کیا۔

عمیص نے اسی کھوئے ہوئے انداز میں سر پیچھے کی جانب گھمایا۔ صاحبزادی یاسمین تو بیماری کی نقاہت اور پھر اس ناگہانی صدمے کے باعث نڈھال سی تھیں' یکایک ایک جوش سے اٹھیں۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بابر ہمایوں مغل پہ جھپٹ پڑیں گی۔۔۔ لیکن اگلے ہی لمحے عمیص نے انہیں سست انداز میں دوبارہ بیٹھتے دیکھا۔ اس نے ایک نظر اندر داخل ہوتے بابر پہ ڈالی اور ساری وجہ جان گیا۔

اس کے لاپروا' غیر ذمہ دار' بے حس اور خود غرض بہنوئی کے اترے ہوئے چہرے پہ یہ کیسے تاثرات تھے جو اس کی آپا حضور کا سارا طیش بہا کے لے گئے۔۔۔ عمیص کو زندگی میں پہلی بار بابر کا چہرہ کسی باپ کا چہرہ لگا۔

اس کے لڑکھڑاتے قدم' سرخ متورم آنکھیں' بکھرے پریشان بال اور کپکپاتے ہونٹ اس کا سارا تفکر و تردد واضح کر رہے تھے۔

وہ آتے ہی بستر پہ ٹانگیں لٹکا کے بیٹھی یاسمین کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا اور ان کے پیروں پہ ہاتھ رکھ دیے۔

صاحبزادی یاسمین جو دوپٹے منہ میں دبیے سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھیں' اچانک کرنٹ کھا کے بری طرح بدکیں۔ انہوں نے اپنے پیر سمیٹ کے اونچے کر لیے۔

"یہ' یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"ہمیں معاف کر دیجیے! خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم' ہم اپنی ذمہ داری نبھا نہیں سکے۔ ہماری وجہ سے ہماری صاحبزادی' ہماری بٹیا۔"

وہ سسک سسک کے یوں رویا کہ یاسمین کو اپنا رونا بھول گیا۔ وہ حیرت سے اس پتھر کو موم ہوتا اور پھر اس موم کو قطرہ قطرہ پگھلتا دیکھ رہی تھیں۔

"اس میں آپ کا کیا قصور۔" کچھ دیر بعد وہ نحیف سی آواز میں بولیں تو بابر سر اٹھا کے انہیں دیکھنے لگا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کی بیوی تمام حقائق سے باخبر نہیں ہے۔

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ' آپ اپنی ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ برآنہ ہو پائے۔ آپ نے گھر پہ توجہ دی ہوتی ہم سب کو تحفظ اور وقت دیا ہوتا تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ ہمیں لاوارثوں کی طرح غیروں کا سہارا لے کر ہسپتال میں نہ جانا پڑتا۔ ہماری معصوم بٹی انسانوں کے جنگل میں نجانے کہاں کھو گئی۔ وہ تو کبھی گھر سے باہر اکیلی نہیں نکلی

تھی۔ نجانے ہماری دوا لینے نکلی اور راستہ بھول گئی' یا کوئی بہکا کے......"

وہ ایک بار پھر رونے لگیں اور بابر کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہیں دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آسمان کی جانب نظر اٹھائی۔ زندگی میں شاید پہلی بار اس کی نظریں اللہ سے رابطہ کرنے کی تمنائی تھیں۔ وہ خاموشی کی زبان میں اپنے رب سے مخاطب تھا۔

"یا اللہ' ہم تو تیرے نہایت گناہ گار بندے ہیں..... پھر' پھر' پھر ہمارے ساتھ یہ کرم کیوں؟ ہمارا پردہ کیوں رکھا گیا؟ ہمارا بھرم قائم کیوں رہنے دیا؟ ہمیں ہمارے بچوں کے سامنے ذلت سے دوچار ہونے سے کیوں بچایا گیا؟"

اللہ کی جانب سے اس عنایت کے ملنے پہ اس کی ہمت بڑھی۔ اب اسے امید بندھ چلی تھی کہ اس کی بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔

"جب ہمارے جیسے گناہ گار کو اللہ کریم بے عزت ہونے سے بچا سکتا ہے تو ہماری صاحبزادی دلکش' وہ تو ایک معصوم روح ہے۔ ان کی حفاظت بھی اللہ کی پاک ذات کرے گی۔"

اب وہ صاحبزادی یاسمین سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز میں شکستگی اور شرمساری کی بجائے آس اور امید تھی۔

"آپ فکر نہ کیجیے' ہماری بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ صحیح سلامت واپس آجائیں گی انشاءاللہ!"

"کیسے واپس آجائے گی؟" اب تک خاموش گم صم بیٹھا عمیص پھٹ پڑا۔

"خود بخود کیسے واپس آجائے گی؟ آپ اور میں' یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور وہ خود واپس آجائے گی۔ آپ اب بھی نہیں سنبھل رہے بابر بھائی صاحب' کم از کم اب تو اپنے فرائض پہچانیے' کچھ تو احساس کیجیے۔"

اس کے تیز لہجے اور بلند آواز پہ بھی وہ طیش میں نہ آیا' بلکہ مجرمانہ اعتراف کے ساتھ سر جھکا لیا۔

صاحبزادی یاسمین سے اپنے بے حد کروفر والے شوہر کے یہ شکست خوردہ انداز سہے نہیں گئے۔ انہوں نے بھائی کا ہاتھ دبا کر اسے مزید کچھ نہ کہنے۔ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ وہ خود بھی چپ کر گیا تھا اپنے بہنوئی کی خاموشی محسوس کرکے۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا آپا حضور۔ اگر بھائی صاحب حسب عادت گھر سے باہر کی رنگینیوں میں مگن نہ ہوتے تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔"

اٹھتے اٹھتے بھی وہ دبے لہجے میں یہ الزام دینے سے باز نہ آیا۔ بابر نے اس بار بھی وضاحت یا صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں عمیص میاں؟"

"دلکش کو تلاش کرنے۔"

"آپ اس وقت گھر جائیے۔ چچا حضور کی طبیعت ناساز ہے۔ ابھی آپ کی ضرورت انہیں زیادہ ہے۔ دلکش کے لیے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم گھر پہ دبک کے بیٹھنے کے لیے نہیں آئے۔ صرف بیگم کو تسلی دینے آئے تھے۔"

"آپ کو چچا حضور کی طبیعت کے بارے میں کیسے علم ہوا؟" وہ چونک گیا۔

"یہ سوال غیر ضروری ہے۔ آپ فی الحال جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔"

عمیص کے سوال پہ اس نے نظریں چرا کے ٹالنے والا جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

صاحبزادی خلعت النساء اور صاحبزادی حرمت النساء' دونوں کے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ تکلیف دہ بھی تھا۔ ساری بات تفصیل سے انہیں بتانے کے بعد نواب صاحب خاموش سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔

"اور وہ بچی..... جن کی ایک ہی جھلک دیکھنے کے بعد آپ چونک گئی تھیں اور آپ کو لگا تھا جیسے آپ کی ہمشیرہ مجسم ہو کے سامنے آگئی ہیں اور جن سے سامنا ہونے کے بعد ہمیں بھی اس مماثلت کا سبب جاننے کی دھن سمائی وہ کوئی غیر نہیں' ہماری اپنی ہیں۔ آپ دونوں کی سگی بھانجی۔"

"ہم تو آپا حضور کا سوگ برسوں پہلے کر چکے۔"

ایک طویل سرد آہ بھرنے کے بعد بالآخر صاحبزادی خلعت النساء نے کہا۔

"اس کے باوجود آج ان کے بارے میں یہ اندوہناک خبر سننے کے بعد دل نئے سرے سے دکھ رہا ہے۔"

"شاید اس لیے آپا حضور کہ یہ غم صرف ان کی وفات کا نہیں بلکہ اس زندگی کا ہے جو انہوں نے گمنامی میں' کسمپرسی میں اور اپنے سب رشتوں سے کٹ کر گزاری۔ وہ زندہ تھیں' زندہ رہیں اور ہم ان سے بے خبر اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف رہے۔"

"جو بیت گیا اس کو بھلا دینے کے علاوہ ہم کچھ نہیں کر سکتے بیگم صاحب۔"

نواب صاحب نے آنسو بہاتی ہوئی صاحبزادی حرمت النساء کو دیکھ کے کہا۔

"اپنی لاعلمی کا ازالہ ہم فقط اسی طور کر سکتے ہیں کہ اب ان کی صاحبزادی کو وہ ساری شفقت اور محبت دیں' جن کی وہ حق دار ہیں مگر اب تک محروم رہی ہیں۔"

"بے شک بے شک۔" صاحبزادی خلعت النساء نے شدومد سے تائید کی۔

"جب سے ان کے بارے میں سنا ہے' دل انہیں دیکھنے کو بے تاب ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ ہو بہو اپنی والدہ کی تصویر ہیں' اگر ایسا ہے تو ان آنکھوں کو کس قدر تسکین ہوگی وہ چہرہ روبرو دیکھ کے۔ ہمارے لیے وہ صاحبزادی گل مہر' صاحبزادی الماس خاتون اور صاحبزادی یاسمین خانم سے کم نہیں۔"

ان کے یاسمین کا نام لینے پہ نواب صاحب کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھر لیا۔ وہ دلکش کی گمشدگی والا معاملہ اب تک ان کے سامنے نہیں لائے تھے۔ لیکن یہ معاملہ ایسا بھی نہیں تھا جسے وہ بھول پاتے یا نظر انداز کر سکتے۔ ان کا دھیان تو ہر دم وہیں اٹکا تھا۔

وہ اپنا عصا تھام کے ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب آپ کہاں چل دیے؟"

ان کا ارادہ بھانپ کے صاحبزادی حرمت النساء نے سوال کیا۔ وہ سوال کو نظر انداز کر کے نکلنا چاہتے تھے۔

"دم بھر تو بیٹھیے' آپ کی طبیعت ہرگز ایسی نہیں لگ رہی کہ آخر بتائیے تو کہاں کا قصد ہے۔"

"صاحبزادی یاسمین کے ہاں گئے عرصہ ہوا۔ کیا کہتی ہوں گی وہ بھی کہ میکے سے کوئی خیریت دریافت کرنے تک نہیں آیا۔ دل کہہ رہا ہے کہ ان سے مل آیا جائے۔"

بہت کوشش کے بعد وہ اپنے لہجے اور انداز کو نارمل رکھ پائے تھے۔

"لیکن یوں اچانک اور وہ بھی اس حالت میں جب کہ۔" انہوں نے ایک اور کوشش کی روکنے کی۔

"کیا ہوا ہے ہماری حالت کو؟" اس بار وہ قدرے بلند اور دبنگ لہجے میں بولے۔

"وہ ہماری بٹیا ہیں بیاہی گئی ہیں' لیکن اب بھی ہماری ذمہ داری ہیں۔ ان کے حالات سے باخبر رہنا اور ان کی خبر گیری کرتے رہنا ہمارا فرض ہے۔ اس فرض سے ہم چشم پوشی کسی بھی حالت میں نہیں کر سکتے۔"

☼ ☼ ☼

شہزاد نے بیک ویو مرر سے دعا کو نگاہ کی ہمراہی میں آتے دیکھا۔ پارکنگ میں اس ماڈل اور اس کلر کی اتنی گاڑیاں موجود تھیں کہ دعا کا دھیان اس جانب نہیں گیا۔

جب وہ متلاشی نظروں سے چاروں جانب دیکھتی اور قریب آئی تو وہ دروازہ کھول کے ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

دعا بری طرح ٹھٹھک کے رک گئی۔
وہ اس طرح سامنے راستہ روکے کھڑا تھا کہ وہ آگے نہیں جا سکتی تھی جب کہ پیچھے نگاہ تھی۔
دعا نے پلٹ کے شکایت کرتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ پشیمانی کے انداز میں سر جھکا کے رہ گئی۔
"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی نگاہ..... تم نے دوستی کے نام پہ دھوکا دیا ہے۔ بس یہ کسر باقی رہ گئی تھی۔"
"نہیں ادا! مجھے غلط نہ سمجھو میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے شہزاد صاحب کو نہیں بلایا' یہ خود ہی....."
"بس....." شہزاد نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔
"وضاحت کی نہ ضرورت ہے' نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہے جسے صفائیاں دینے میں ضائع کیا جائے۔ چلو دعا جلدی کرو بیٹھو گاڑی میں۔ باقی سوال جواب راستے میں ہو سکتے ہیں۔"
اس نے حکمیہ انداز میں کہا دعا ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ اس کا انداز ہنوز اکھڑا اکھڑا تھا۔
"میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"
اس سے پہلے کہ وہ پلٹ جاتی شہزاد نے اس کا بازو کہنی کے نزدیک مضبوطی سے پکڑ لیا۔
"تم کسی کے نہیں' میرے ساتھ جا رہی ہو' اپنے منگیتر کے ساتھ۔ منگیتر یعنی ہونے والا شوہر۔"
اسے کھینچ کے اپنے قریب کرنے کے بعد وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چبا چبا کے کہہ رہا تھا۔
"ہونہہ..... منگیتر۔" دعا نے اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش کی۔
"شاید ماما نے اب تک وہ انگوٹھی آپ کو واپس نہیں کی جو میں نے انہیں لوٹائی تھی۔"
"دے دی تھی۔" شہزاد مزے لیتا ہوا مسکرایا۔ دعا کا یہ روپ نیا تھا اس کے لیے اور ساری بات جاننے کے بعد اسے یہ تیور دکھانے پہ غصہ نہیں پیار آ رہا تھا۔
"اور میں نے لے کر سنبھال لی ہے۔" اس نے اپنی جیب تھپتھپائی۔
"ذرا فرصت ملے تو پہناتا ہوں..... ویسے مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہیں میرے ہاتھ سے انگوٹھی پہننے کا اتنا شوق ہے
"چلو شاباش بیٹھو' تنگ مت کرو۔" اس نے بازو چھوڑ کے اسے کمر سے تھاما اور زبردستی دروازہ کھول کے اندر بٹھانا چاہا۔
پہلے سے گاڑی میں بیٹھی دلکش کو دیکھ کے اسے حیرت کا ایک اور دھچکا لگا۔
"یہ..... آپ..... مگر۔" جھنجلا کے وہ کچھ بول ہی نہ پائی۔
"نگاہ تم نے تو روکا ہوتا۔" اب اس نے نگاہ کو ٹوکا جو اس کے ساتھ بیٹھ رہی تھی۔ وہ بے بسی سے شانے اچکا کے رہ گئی۔
"آپ یہ تو سوچتے کہ اسے کوئی دیکھ لیتا تو..... کیوں لائے ہیں آپ اسے اپنے ساتھ؟"
"میں کوئی سامری جادوگر یا شعبدہ باز نہیں جو کوئی منتر پھونک دینے سے ا[illegible] نگاہ کے فلیٹ سے اس کے گھر تک پہنچا دیتا۔"
"اس کے گھر؟"
"ہاں۔" اب وہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔
"لیکن یہ وہاں محفوظ نہیں ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ ایک معصوم کی زندگی داؤ پر لگ سکتی ہے آپ کی ضد کی وجہ سے۔ میں جس مقصد کے لیے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کر چکی ہوں' آپ اس کے راستے کی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کے اس اقدام سے....."
"شٹ اپ دعا اینڈ ناؤ کیپ کوائٹ!"
شہزاد نے بریک لگایا اور پلٹ کے اسے گھورا۔
"مجھے ڈرائیونگ کے دوران بحث پسند نہیں۔ میں کیا جانتا ہوں کیا نہیں' کیا اچھا کر رہا ہوں اور کیا برا..... ان پہ

اپنے ماہرانہ تجزیے اور تبصرے بعد میں پیش کرتی رہنا اور بے فکر رہو تمہارا یہ جو نیا نیا شوق ہے نا سوشل ورک کا' اس کی تسکین کے مواقع بھی میں وقتاً فوقتاً فراہم کرتا رہوں گا تمہیں اور یہ بھی گائیڈ کرتا رہوں گا کہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر بھی کسی کی مدد کی جا سکتی ہے۔ خود کو گھاٹے میں رکھے بغیر بھی دوسرے کو نفع پہنچایا جا سکتا ہے۔"
اسے اچھی طرح جھاڑ کے رکھ دینے کے بعد اس نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی۔
"اب مجھے سکون سے ڈرائیو کرنے دو۔ ہم اسے اس کے گھر نہیں' اس کے نانا کے گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ وہاں یہ محفوظ رہے گی۔"

☼ ☼ ☼

بابر ہمایوں مغل ایک پی سی او پہ کھڑا بار بار دعا کا نمبر ملا رہا تھا جو مسلسل بند مل رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی بے چینی میں اور بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی انگلیاں نمبر ملا ملا کے تھک چکی تھیں لیکن وہ ہمت نہیں ہار رہا تھا۔
آخر کچھ سوچ کے اس نے دعا کی بجائے شہزاد ملک کا نمبر ملایا۔
"ہیلو!" دوسری بیل پہ ہی اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔
"ہم بابر ہمایوں مغل عرض کر رہے ہیں۔"
وقت اور حالات نے خود بخود اس کے لہجے کی رعونت اور غرور چھین کر لجاجت اور عاجزی بھر دی تھی۔
"جی..... تو کیجیے عرض۔"
"ہم دعا صاحبہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہ رہے تھے۔"
شہزاد کے طنزیہ جواب پہ بھی وہ ڈھیٹ بنا پوچھ رہا تھا۔
"ان حالات میں بھی آپ دعا صاحبہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہ رہے ہیں' جب کہ آپ کو اپنی بیٹی کی فکر ہونی چاہیے۔" شہزاد نے کٹیلے پن سے کہا۔
"ہم ان سے اپنی صاحبزادی کے بارے میں ہی پوچھنا چاہتے ہیں شہزاد صاحب۔" اس نے تحمل کا مظاہرہ کیا کہ اس کے سوا اور کچھ اس کے بس میں بھی نہ تھا۔
"تمہاری بیٹی خیریت سے ہے بابر۔" بالآخر اسے اس کی حالت پہ ترس آ گیا۔
"اور ہم لوگوں کے پاس ہے' ہمارے ساتھ اور میں اسے اگلے کچھ منٹوں میں اس کے نانا جان کے سپرد کرنے والا ہوں۔ رہا ملک مقبول' تو اسے ہینڈل کرنا میرا کام ہے۔ اگر میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا تو میں یقیناً "قانونی کارروائی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا لیکن..... فی الحال میں دعا کو بھول جانے اور تمہیں اور تمہاری بیٹی کو اس سارے جھمیلے سے الگ رکھنے کے سلسلے میں اس پہ دباؤ ضرور ڈال سکتا ہوں۔"
بابر کے سینے سے منوں بوجھ سرک گیا۔
اس کی پلکیں بھیگ گئیں..... دل چاہا یہیں سڑک پہ خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے' جس نے اس جیسے گناہ گار شخص کو اس آنے والی بری گھڑی سے بچا لیا۔
وہ جو عزتوں سے کھیلتا تھا' اس کی عزت رسوا ہونے سے بچ گئی۔
بابر ہمایوں مغل یہ خوش خبری یاسمین کو سنانے سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے قدم سیدھے مسجد کی جانب بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"دلگیر' دیکھو تو کون آیا ہے۔"
مسلسل بجتے ہارن کے بعد دوبارہ کال بیل بھی بجائی گئی تو موتیا نے دلگیر کو بھیجا۔

"چچا حضور کا کوئی ملنے والا اس وقت آتا نہیں ہے۔۔۔ پھر یہ کون ہے جو اتنے بے صبرے پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔"

وہ اچک کے کچن کی کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگی جہاں سے سامنے دالان۔۔۔ سرخ اینٹوں کی روش اور اس کے بعد بانس کی گھنی باڑھ اور لکڑی کے گیٹ کے پار سے صرف اس گاڑی کی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی تھی۔

اس نے دلگیر کو گیٹ تک جاتے، کچھ بات کرتے اور پھر سراسیمہ سے انداز میں الٹے قدموں اندر بھاگتے دیکھا۔ وہ خود بھی بوکھلا کے کچن سے نکل آئی۔

"کون ہے، صاحبزادی الماس خاتون؟"

صاحبزادی حرمت النساء بھی کمرے سے نکلیں۔

"پتا نہیں امی حضور دلگیر گیا تو ہے دیکھنے۔۔۔ لیجیے وہ آ گیا۔"

"بڑی بیگم! بڑی بیگم عجوبہ ہو گیا۔ کمال ہو گیا۔"

"کیا افتاد آن پڑی۔" انہوں نے ناگواری سے اسے گھورا۔

"وہ۔۔۔ وہ صاحب آئے ہیں۔"

"صاف صاف بتاؤ کون آیا ہے اور اسے کس سے ملنا ہے۔"

"جی وہ نواب صاحب سے ملنے کا کہہ رہے ہیں، لیکن نواب صاحب بھلا ان سے کہاں ملنا پسند کریں گے۔ انہوں نے تو پہلے بھی ان کو گھر سے نکل جانے کا کہہ دیا تھا۔ حیرت ہے یہ پھر آ گئے اور نہ صرف آئے، بلکہ چھوٹی بی بی ان کے ساتھ۔۔۔ تو۔"

"اوہو، دلگیر نام پوچھ کے آؤ ان کا، بلکہ سنو کوئی ضرورت نہیں۔ کہہ دو نواب صاحب گھر پہ نہیں ہیں۔" موتیا نے بات ختم کی۔

"پتا نہیں کون ہے جسے ابا حضور نے پہلے بھی گھر سے نکل جانے کا کہا تھا۔ کہیں وہ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔۔۔ جاؤ، جاؤ چلتا کرو حضرت کو۔"

"یہ وہی حضرت ہیں چھوٹی بی بی جو، جو بڑی بی بی کا پیام لے کر آئے تھے۔" دلگیر نے انکشاف کیا۔

"کیا؟۔۔۔ وہ، وہ گل مہر کا باس؟" موتیا واپس جاتے جاتے ایک جھٹکے سے مڑی۔

صاحبزادی حرمت النساء بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"وہ اب یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

گل مہر نجانے کب سے یہ باتیں سن رہی تھی، اچانک سامنے آ کے تیز لہجے میں بولی۔

"فوراً" انہیں واپس بھیجو اور کہہ دو کہ یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان سے ملنا یا ان کی صورت بھی دیکھنا چاہتا ہو۔"

"ہم تو کہہ دیں گے بڑی بی بی لیکن۔۔۔" وہ اٹھلا کے بولا۔

"لیکن واپس جانے کا صرف ان کو بولیں یا ان کے ساتھ آئی دلکش بٹیا کو بھی!"

"کیا کہا دلکش۔۔۔ اور وہ بھی شہزاد ملک کے ساتھ؟" گل مہر لکا سا چیخ اٹھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے دلگیر یا پھر نظر؟" موتیا بھی ڈپٹنے لگی تو اس نے منہ بسورا اور مہندی سے رچا پیر زمین پہ پٹخا۔

"ہونہہ کوئی ہماری بات پہ یقین ہی نہیں کرتا۔ ہوتے ہمارے عمیص میاں گھر پہ تو بتاتے۔ بس ایک وہی ہیں جو ہماری بات سنتے بھی ہیں، مانتے بھی ہیں اور اس پہ یقین بھی کرتے ہیں اوئی، میں قربان۔۔۔ ماشاء اللہ، ہزار برس کی عمر ہے، نام لیا اور حاضر۔"

عمیص کے موٹر سائیکل کی آواز وہ دور سے سن لیا کرتا تھا اب بھی سن کر باہر بھاگا اور موتیا، گل مہر اور ان کی امی

حضور الجھن بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کا منہ تک کے رہ گئے۔

"دلکش اور۔۔۔ نہیں نہیں دلگیر کو ضرور کوئی مغالطہ ہوا ہو گا۔" موتیا نے اپنا خیال خود ہی سر جھٹک کے رد کیا۔

"چچی حضور۔۔۔ موتیا دیکھو، دیکھو یہ کون آیا ہے۔" کچھ دیر کے بعد عمیص کی خوشی سے معمور اور جوش سے لرزتی آواز سنائی دی۔

وہ دلکش کا ہاتھ تھامے اندر آ رہا تھا اور اس کا چہرہ کسی اچانک مل جانے والی خوشی کے احساس سے چمک رہا تھا۔

"ارے یہ تو۔۔۔ یہ تو واقعی دلکش ہے۔"

موتیا تیزی سے آگے بڑھی۔

عمیص کی خوشی پہ غور کرنے کا فی الحال وقت نہیں تھا۔ ابھی غور طلب مسئلہ تھا دلکش کی یہاں عجیب و غریب حالات میں آمد اور سب سے بڑھ کے اس کی حالت، جو عجیب دگرگوں ہو رہی تھی۔

وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔۔۔ اس کی صورت سے ہی پتا چل رہا تھا کہ وہ دو تین دن سے نہ ٹھیک طرح سوئی ہے نہ کچھ ڈھنگ سے کھایا پیا ہے اور رو رو کے سوجی آنکھیں بھی کسی غیر معمولی پن کا اشارہ دے رہی تھیں۔

"خالہ حضور۔" وہ موتیا کے سینے سے لگ کے پھپک کے رو دی۔ صاحبزادی حرمت النساء کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

"الٰہی خیر۔۔۔ سب خیریت تو ہے؟"

"اللہ نے کرم کیا ہے چچی حضور۔" عمیص انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے آبدیدہ ہو گیا۔

"اب سب خیریت ہے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب سب خیریت ہے۔"

"مگر یہ، یہ صاحبزادی دلکش کی حالت۔ یہ ان کا زار زار رونا۔ یہ ایک انجان غیر شخص کے ہمراہ یہاں آنا۔ یہ ہم سمجھ نہیں پا رہے، کیا معمہ ہے یہ؟"

"دلکش جان چپ ہو جاؤ، تم کیوں رو رو کے ہلکان ہو رہی ہو۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے۔ تم اکیلی یہاں تک کیسے آئیں، آپا حضور کہاں ہیں؟"

صاحبزادی حرمت النساء عمیص سے سوال کر رہی تھیں تو موتیا اپنے ساتھ لگی ہچکیوں کے ساتھ روتی ہوئی دلکش سے استفسار کر رہی تھی۔ گل مہر جلدی سے پانی کا گلاس لے کر آئی اور اس کے لبوں سے لگانے لگی۔

"اس سے کوئی سوال مت کریں۔ یہ پہلے ہی بہت سہمی ہوئی ہے۔ اپنی عمر اور تجربے سے کہیں زیادہ اذیت جھیل کے آئی ہے۔ آئیں اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔ میں ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"چچا حضور ہماری دلکش کو لے آیئے، کہیں سے ہماری بٹیا کو لے آیئے، ورنہ ہمارا دل پھٹ جائے گا۔ نجانے ہماری معصوم بچی کن حالوں میں ہوں گی، کیسے لوگوں میں ہوں گی۔ کیا گزر رہی ہو گی ان پہ۔ اپنے گھر اور والدین سے دور ہو کے جو کبھی گھر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال پائیں ان کے بغیر اور جواب تک ہماری انگلی پکڑ کے چلتی تھیں۔ چچا حضور، دنیا کی بھیڑ میں نجانے کیسے ہماری انگلی اس ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ہمارے دل کو ایک پل کے لیے بھی چین نہیں مل رہا خدارا کچھ کیجیے، ہماری بٹیا کو واپس لا دیجیے، ورنہ ہم مر جائیں گے۔"

صاحبزادہ نفیس علی خان سے یاسمین کا بلکنا نہ دیکھا جا رہا تھا۔ ان کا چٹان سا وجود جیسے بھر بھرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ انگلیوں سے اپنی آنکھوں میں آئی نمی صاف کرنے لگے۔

"ہمت اور حوصلے سے کام لیجیے، صاحبزادی یاسمین، انشاء اللہ تعالیٰ! ہماری دلکش بٹیا جہاں بھی ہوں گی خیریت سے ہوں گی۔"

"ایسا نہیں ہے صاحبزادی یاسمین خانم۔ یہ دنیا اتنی بری نہیں جتنا ہم فرض کر بیٹھے ہیں۔ یہ دنیا اگر اتنی ہی بری ہوتی اور اس کے تمام باسی درندے بن چکے ہوتے تو خالق حقیقی قیامت لانے میں اتنی دیر نہ کرتا۔ یہ دنیا کب کی فنا ہو چکی ہوتی۔ لیکن ابھی بھی یہاں اچھے لوگوں کی کمی نہیں۔ کیا آپ اپنی مرحومہ خالہ محترمہ کو بھول گئیں۔۔۔ کیا دلکش کی گمشدگی نے آپ کو اپنے خاندان کے اس المیے کی یاد نہیں دلائی؟۔۔۔ ہم پہلے بھی اس سانحے سے گزر چکے ہیں اس وقت ہم جتنے مایوس اور دل گرفتہ تھے آج اتنے نہیں اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ دکھ اور ملال تو ہمیں صاحبزادی دلکش کے لیے بھی محسوس ہو رہا ہے' بلکہ اس سے کہیں بڑھ کے کیونکہ وہ ہمارے ہاتھوں میں پل کر بڑی ہوئی ہیں۔ لیکن ہم خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ ہمارے اللہ نے ہمیں تب بھی مایوس نہیں رہنے دیا تھا اور ہمارے خاندان کی عزت کو بچا لیا تھا۔

"لیکن چچا حضور۔۔۔" صاحبزادی یاسمین اپنی والدہ کی زبانی اس سارے قصے سے واقف تھیں اس لیے نواب صاحب کے تسلی دینے پہ اور بھی متوحش ہو گئیں۔

"لیکن ان کا تو اللہ تعالیٰ نے پردہ رکھ لیا تھا' دریا کی لہروں نے انہیں شیطانیت سے بچانے کے لیے پناہ دے دی تھی تو کیا' تو کیا ہماری دلکش۔۔۔ وہ بھی؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیں۔

"نہیں خدانخواستہ۔۔۔" نواب صاحب جلدی سے کہہ اٹھے۔

"اللہ انہیں سلامت رکھے اور وہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنی رہیں۔ آپ کی خالہ محترمہ دریا برد نہیں ہوئی تھیں۔ اللہ کے کرم سے ایک نیک فطرت شخص وسیلہ بنا اور وہ بچ گئیں۔"

"لیکن ہم تو بچپن سے یہی سنتے آئے تھے۔" ان کا دھیان وقتی طور پہ رونے دھونے سے ہٹانے میں نواب صاحب کامیاب رہے تھے۔

"ہم بھی اسی گمان میں تھے۔" انہوں نے اداسی سے سر جھکا لیا۔

"لیکن اللہ نے ان کی زندگی لکھی تھی۔ وہ کئی سال جیتی رہیں اللہ کی مہربانی اور رحمت کے طفیل اور کچھ بھلے لوگوں کی مدد سے ایک گھرانہ تھا' جس نے ہمارے خاندان کی آبرو کو عزت دی' انہیں بیٹی بنا کے عزیز رکھا' بہن والا مان دیا اور آج ان کی وفات کو برسوں گزر جانے کے بعد بھی انہیں محبت سے یاد کرتے ہیں۔ ہماری دلکش کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی مدد کا فرشتہ مقرر کر رکھا ہو گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

"انشاء اللہ تعالیٰ اور جانتی ہیں صاحبزادی یاسمین' وہ لوگ جن کے ہم احسان مند ہیں' وہ کون ہیں؟"

صاحبزادی یاسمین سراپا سوال بن گئیں۔

"یہ وہی خاندان ہے جس کے سربراہ کی دل آزاری ہم نے کی۔۔۔ ان کی اس حد تک سبکی کی کہ وہ اس ذلت اور بے عزتی کو دل پہ لے گئے۔ ان کا دل یہ غم سہار نہ سکا اور وہ۔۔۔ کتنے احسان فراموش ٹھہرے ہم' جو زندگی بچانے والے کو بدلے میں موت دے دی۔"

"ہم کچھ سمجھے نہیں چچا حضور۔"

"وہ صاحب جو اپنے فرزند کے لیے صاحبزادی گل مہر خانم کا پیام لائے تھے' وہی ہمارے محسن تھے جن کو ہماری کوتاہ نظر پہچان نہ سکی۔ ہم نے دیکھا تو صرف ان کا خاندان سنا تو صرف ان کا نام۔ جانا تو صرف ان کا مقام۔۔۔ ان کا اندر نہ بھانپ سکے۔ ہم نے ہمیشہ انسان کی پرکھ اس کے حسب نسب سے کی' ہمیشہ اس کو اس کے خاندان سے پہچانا۔ عمر کے اس حصے پہ آ کے احساس ہوا ہے ہماری کسوٹی کتنی کھوکھلی تھی۔ وہ لوگ جن کا کوئی حسب نسب نہیں' نہ ہی معاشرے میں کوئی مقام۔ وہ انسانیت کے کتنے بلند درجے پہ فائز ہیں۔ انہوں نے ایک انجان اور غیر لڑکی کو اپنا کے کتنا بڑا احسان کیا تھا۔"

"صرف یہی نہیں چچا حضور۔" بابر کچھ دیر قبل ہی آیا تھا اور انہیں بات کرتا دیکھ کے دروازے میں ہی رک گیا۔

"آج وہ ایک اور احسان کر کے ہم سے کچھ اور بھی اوپر آ گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شہزاد ملک نے ہماری دلکش کو بچا لیا ہے اور وہ ملک مقبول جیسے مکروہ شخص کے پاس نہیں' بلکہ ایک مہربان صفت خاتون کے پاس پوری طرح محفوظ تھیں۔ ان خاتون نے جو دعا صاحبہ کی قریبی دوست ہیں' ہماری بٹیا کو تحفظ اور پناہ دی اور شہزاد ملک انہیں پوری حفاظت کے ساتھ آپ کے گھر چھوڑ آئے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

یہ خوشخبری سننے کے بعد نہ نواب صاحب سے وہاں رکا گیا نہ صاحبزادی یاسمین سے۔ سارے رستے وہ اللہ کے حضور شکر کا کلمہ پڑھتے وہاں پہنچے۔

ٹیکسی گیٹ کے آگے رکی تو شہزاد ملک گاڑی ریورس کر کے موڑ رہا تھا۔ نواب صاحب کے اشارے پہ بابر پھرتی سے نکلا اور اسے روکا۔

"آپ چپکے سے کہاں چل دیے برخوردار۔"

اسے پس و پیش کرتا دیکھ کے گروہ خود ہی ٹیکسی سے اتر کے سامنے آئے۔ پچھلی نشست پہ نظر پڑی تو دعا کو روٹھے روٹھے انداز میں خاموش بیٹھے پایا۔

"اپنے گھر آ کے چپ چاپ دروازے سے نہیں لوٹا کرتے بیٹا۔"

اس بار انہوں نے دعا کو کہا۔

وہ چونک کے نا سمجھنے کے سے انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

● ● ●

"اپنے گھر؟"

وہ چونک کے نا سمجھنے کے سے انداز میں انہیں دیکھنے لگی' انہیں جو جانے پہچانے ضرور لگ رہے تھے مگر تھے تو اس کے لیے اجنبی' یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس نے ان کی نواسی کی مدد کی تھی' اس لیے احسان مندی سے مغلوب ہو کے یا اپنائیت جتاتے ہوئے وہ ایسا کہہ رہے ہوں۔ اس نے شائستگی سے معذرت کر لی۔

"بہت بہت شکریہ۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں' آئندہ کبھی سہی' انشاء اللہ۔"

اس کی بات کے جواب میں نواب صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے شاید مزید اصرار کرنا چاہتے ہوں مگر ان کے کچھ بولنے سے قبل شہزاد کہہ اٹھا۔

"آئندہ کبھی' شاید تم یہاں نہ آ سکو دعا۔"

اس کے لہجے میں کھولتا ہوا طنز تھا۔

"آنا بھی چاہو تو شاید تمہیں اذن نہ ملے' کیونکہ عنقریب تم مسز شہزاد بننے والی ہو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میاں؟"

نواب صاحب شرمندہ ہو گئے۔ شاید اس کا طنز بھانپ گئے تھے۔

"میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں محترم۔ شاید آپ بھول گئے ہیں کہ میں وہی شہزاد ملک ہوں جو ایک بار اس دہلیز سے دھتکارا جا چکا ہے۔ اس کرم الٰہی کا بیٹا ہوں' جس نے بے بسی کے عالم میں آپ کے دروازے پہ جاں کنی کا عذاب سہتے ہوئے ایڑیاں رگڑی تھیں اور یہ دعا۔۔۔ یہ نہ صرف اسی خاندان کی ایک فرد ہے' بلکہ میری ہونے والی بیوی بھی ہے اس لیے آپ کی دعوت کا شکریہ' لیکن ہم اندر آ کے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔ یہ نہ ہو کہ اچانک آپ کو یاد آ جائے کہ دعا' اللہ وسائے کا اور میں کرم الٰہی کا خون ہوں اور آپ اپنی اعلانسب حویلی سے ہمیں دھکے مار مار کے۔۔۔"

”بس کیجیے میاں۔۔۔۔“
نواب صاحب نے کراہ کے درخواست کی۔ نجانے انہیں کہاں درد اٹھا تھا کہ ان کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ تکلیف کی شدت دبانے کے لیے وہ اپنے لب کچل رہے تھے۔
چند قدم پیچھے کھڑے **عمیص** نے بڑھ کے انہیں سہارا دیا اور شاکی نظروں سے شہزاد کو دیکھا۔
”معاف کیجیے گا! میں شاید کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گیا۔ مجھے آپ جیسے محترم بزرگ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ امید ہے آپ۔۔“
اس سے زیادہ کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔
نواب صاحب اپنا سینہ مسلتے ہوئے پیاسی نظروں سے دعا کو گزرتا دیکھتے رہے۔ گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ دور تک اسے دیکھتے رہے اور دعا کا چہرہ تصور میں لا کے اس پہ نجانے کون کون سی دعائیں پڑھ کے پھونکتے رہے۔
”چچا حضور۔۔۔!“ **عمیص** نے ان کے ہلتے لب اور دور تک کھوجتی نظروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے چچا حضور۔ آیئے اندر تشریف لے چلیے۔“
”ہماری طبیعت ٹھیک ہے **عمیص** میاں، بس ہمارے نصیب خراب ہیں۔“
”کیسی باتیں کر رہے ہیں چچا حضور!“
وہ انہیں سہارا دے کر اندر لے جاتے ہوئے کہنے لگا۔
”اللہ کے کرم سے اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ دلکش بھی خیریت سے لوٹ آئی ہے۔ آپا حضور کی طبیعت بھی اب سنبھل جائے گی اور بابر بھائی صاحب، مجھے لگتا ہے وہ بھی بدل گئے ہیں۔ اس تلخ حادثے نے ان کے اندر خاصی مثبت تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔“
”ہاں۔۔۔۔ شکر ہے اللہ کا۔ ہمیں بھی ان میں بہتری کے آثار نظر آ رہے ہیں مگر صاحبزادہ **عمیص علی خان** ابھی بہت کچھ بہتر ہونا باقی ہے۔ بہت سے معاملات ہیں جن کو سلجھانا ہے۔“
”میں سمجھا نہیں چچا حضور!“
وہ دونوں اندر آ چکے تھے۔ تخت پہ دلکش اپنی نانی حضور کی گود میں سر رکھ کے لیٹی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ اب تک اس جھٹکے سے سنبھل نہیں سکی تھی۔ خوف و ہراس اب بھی اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ موتیا اس کے بال سہلا رہی تھی اور صاحبزادی یاسمین اس کے ہاتھ چوم رہی تھیں۔
نواب صاحب نے اپنے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ دلگیر لپک کے انہیں تھامنے آیا اور ان کے کمرے کی جانب لے جانے لگا۔ دروازے پہ پہنچ کر وہ رکے۔ مڑ کے **عمیص** کو دیکھا اور کہنے لگے۔
”اپنی والدہ سے سمجھ لیجیے گا اور اس کے بعد ہو سکے تو ہمیں یہ ضرور بتایئے گا کہ ہم یہ معاملہ سلجھائیں تو کیسے؟“

☼ ☼ ☼

”اوہ۔۔۔ تو یہی وہ لوگ تھے اور یہی وہ گھر تھا۔“
اس چوڑی گلی سے نکلتے ہی جیسے ہی گاڑی نے ٹرن لیا، دعا نے گردن گھما کے اس پرانی مگر پرشکوہ لال اینٹوں والی حویلی کو دیکھا جس کی بیرونی دیوار سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔
”اور اسی گھر میں رہتی ہے وہ۔“
اس کے لبوں نے ہلکی سی سرگوشی کی۔ شہر کے اس پرسکون گوشے سے نکل کر مال روڈ کی پرہنگم ٹریفک میں داخل ہوتے ہوئے شہزاد نے ایک نظر اس پہ ڈالی اور مبہم سا مسکرا دیا۔
یوں تو بابر ہمایوں مغل کی اصلیت جس دن دعا پہ ظاہر ہوئی تھی اسی دن وہ جان گئی تھی کہ وہ لڑکی جس سے شہزاد ملک شادی کرنا چاہتا تھا اور اس حد تک سنجیدہ تھا کہ اسے ٹھکرا کے اپنے ماں باپ کو وہاں رشتے کے لیے بھیج بھی چکا تھا، وہ لڑکی در حقیقت بابر کی عزیزہ ہے۔ لیکن اس کا دھیان اس جانب گیا ہی نہیں تھا اور اب نواب صاحب اور

شہزاد کے مابین ہونے والی گفتگو نے اسے احساس دلایا۔
وہ پہلی بار اس ان دیکھی لڑکی کے بارے میں اپنے دل میں ایک رقیبانہ سی کسک محسوس کر رہی تھی۔ اس حویلی کو دیکھ کے۔۔۔ نواب صاحب کی عجیب پرجلال اور پرشفقت شخصیت کو دیکھ کر اور دلکش کا باحیا، پرنور چہرہ دیکھ کے۔
”وہ بھی ایسی ہی ہو گی۔۔۔۔ دلکش جیسی معصوم، پاکیزہ، مبہوت کر دینے والا حسن رکھنے والی۔“
وہ اپنی ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے سوچتی جا رہی تھی۔
شہزاد ڈرائیونگ کے دوران گاہے بگاہے اس پہ نظر ڈال رہا تھا۔ اس نے گاڑی ایک کولڈ اسپاٹ کے نزدیک روکی۔ گاڑی رکنے سے لے کر اس کے آرڈر دینے تک وہ ہنوز اپنے خیالوں میں گم تھی۔
”یہ لو خاصا گرم دن ہے آج۔“
شہزاد نے کولڈ ڈرنک اس کی جانب بڑھائی۔ وہ چونکی اور پھر خاموشی سے تھام کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔
”کیا سوچ رہی ہو دعا؟“
شہزاد نے اسے کریدنا چاہا۔ حالانکہ وہ اس کی سوچ سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس کا چہرہ ایسا آئینہ تھا جو سب کچھ ظاہر کر دیتا تھا پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ دعا خود بولے جو کچھ اس کے دل میں ہے، سب کہہ ڈالے تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔
”کچھ خاص نہیں۔“ اس نے گہری سانس لی پھر اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
”سوچتی ہوں چھاجی۔۔۔ اگر نواب صاحب انکار نہ کرتے تو آج صورت حال کتنی مختلف ہوتی۔“
”مگر وہ انکار کیوں نہ کرتے؟ بھئی وہ تو انہیں کرنا ہی تھا۔“
اس نے ہلکے پھلکے انداز میں شانے اچکاتے ہوئے کہا۔
”وہ۔۔۔ وہ کیسی ہے چھاجی؟“
”کون؟“
اس نے انجان بننا چاہا۔
”آپ جانتے ہیں چھاجی، میں کس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“
”اچھا، یہ بتایئے کیا وہ بالکل دلکش جیسی ہے؟ اتنی ہی معصوم، اتنی ہی حسین۔۔۔۔“
اس کے لہجے میں رشک، حسد، احساس کمتری سب کچھ تھا۔ شہزاد نے اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔
”نہیں، حسین تو وہ ہے بلاشبہ، شاید دلکش سے بھی زیادہ۔“
اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا۔
”دلکش تو ایک پیاری سی معصوم بچی ہے اور صاحبزادی گل مہر ایک بائیس سال کی حسین و جمیل لڑکی جو حسن کے تمام پیمانوں اور معیار پہ ہر زاویے سے پوری اترتی ہے لیکن دعا، صرف حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اتنی معصوم، اتنی پاکیزہ اور اتنی پرنور نہیں ہے جتنا تمہیں گمان ہے۔“
”آپ مجھے بہلانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“
وہ ماننے سے انکاری ہو گئی۔
”پہلی بات تو یہ کہ میں جانتی ہوں آپ اس کے حسن سے تو ہرگز متاثر نہیں ہوئے ہوں گے۔ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوتی تو آپ اس کی خاطر ماما جی کے آگے کیوں کھڑے ہوتے اور دوسرا یہ کہ وہ ان نواب صاحب کی بیٹی ہے، اس حویلی میں پرورش پائی ہے اس نے اگر اس چار دیواری میں رہنے کے بعد بھی وہ پاکیزہ نہ تھی تو کیوں مشہور کر رکھا ہے دنیا نے چادر اور چار دیواری کے تقدس کو؟“
”میں اس کے کردار یا بہتر الفاظ میں اس کی پاک دامنی پہ شبہ ظاہر نہیں کر رہا۔ ہاں، اس کے کردار میں کوئی کمی نہیں تھی۔ بحیثیت ایک عورت وہ ایک مضبوط کردار کی مالک تھی۔ باحیا بھی تھی مگر میں بحیثیت ایک انسان کے،

اس کے عمومی کردار کی بات کر رہا ہوں دوئی' وہ ایک سطحی ذہنیت والی لڑکی تھی۔ اس کے والد نے جو کیا' میں اسے تسلیم کر سکتا ہوں۔ جس شخص نے ایک عمر تک جن اصولوں کو سینے سے لگا کر رکھا ہو' کوئی باہر سے آکے انہیں ٹھیس پہنچانے کی کوشش کرے تو شاید اس کا فطری ردعمل ایسا ہی ہو' مگر جو گل مہر نے کیا۔۔۔ وہ' وہ میں برداشت نہیں کر سکا۔ اسے محبت اور دوستی کا دعوا تھا' مگر میں نواب صاحب کے لیے غیر تھا' میرے اباجی ان کے لیے اجنبی تھے' مگر گل مہر کا مجھ سے ایک رشتہ رہ چکا تھا' اس رشتے کا ذرہ برابر لحاظ نہ کرتے ہوئے اس نے مجھ سے جو الفاظ کہے وہ مجھے آج تک یاد ہیں۔ وہ بے شک اپنے والد کی مرضی کا احترام کرتی' بے شک انکار کر دیتی میرے ساتھ شادی کرنے سے مگر وضع داری بھی کوئی چیز ہے' دل رکھنا بھی ایک ہنر ہے۔ اس کو اور مجھے الگ ہونا ہی تھا دوئی' ہم ایک راستے کے مسافر نہیں تھے' یہ کام تقدیر نے کر دیا تھا' پھر اسے اپنے ہاتھ آلودہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے یہ کام بڑی سنگ دلی اور سفاکی سے کیا ہے۔ میں حیران ہوں کوئی عورت اس حد تک بے رحم بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے دوئی۔"

"کیسے نہ سوچوں چھاجی۔۔۔ وہ آپ کی پہلی محبت تھی۔"

"ارے نہیں بھئی۔۔۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اور میں۔۔۔!"

"تم۔۔۔" اس نے ایک آسودہ سانس بھرتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر ٹیک لیا اور آنکھیں موند لیں اس کے ہونٹوں پہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جو دعا کو اس کے سارے سوالوں کے بڑے مکمل' بڑے جامع اور بڑے تفصیلی جواب دے رہی تھی۔ اس نے دعا کا ہاتھ تھاما اور اپنی بند آنکھوں سے لگانا چاہا۔ دعا نے جھجک کے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

شہزاد نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ اس کی چند منٹ قبل والی یاسیت ہوا ہو چکی تھی' اب وہ قدرے مطمئن انداز میں اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملا رہی تھی۔

"یہ کس نامعقول کی یاد تمہیں اس وقت ستا رہی ہے؟"

"نگاہ کا پتا کرنا تھا۔" وہ مسکراہٹ چھپا گئی۔

"اس کی ضد پہ اسے اس کے گھر ڈراپ تو کر دیا تھا مگر فکر ہو رہی ہے۔ نیاز کھوکھر مستقل اس پہ نظر رکھے ہوئے ہے اور ملک تو۔۔۔"

شاید دوسری جانب کال ریسیو کر لی گئی تھی اسی لیے وہ اب شہزاد سے بات ادھوری چھوڑ کے نگاہ سے خیریت دریافت کر رہی تھی۔ شہزاد نے کولڈ ڈرنک لانے والے لڑکے کو پیسے تھمائے اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

"فکر کیسے نہ کروں؟ بات ہی فکر والی ہے۔ پتا نہیں کون سے خزانے دبے تھے تمہارے فلیٹ پہ۔۔۔ جو جانے کی جلدی تھی۔ ورنہ میں تمہیں ہرگز وہاں اکیلے چھوڑنے پہ راضی نہیں تھی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ اس صورت حال میں بھی تمہیں ہری ہری سوجھ رہی ہے۔"

پتا نہیں نگاہ نے کیا کہا تھا کہ جو وہ سرخ ہوتے ہوئے سر جھٹک رہی تھی۔

"میں تو چاہتی تھی کہ تم دو چار روز تک میرے ساتھ میرے گھر پہ رہو۔ چھاجی کا بھی یہی کہنا تھا۔ تمہارا اکیلے اس فلیٹ پہ رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ نیاز کھوکھر کسی بھی وقت دلکش کا پتا کرنے آ سکتا ہے۔ اسے نہ پا کے وہ کیا کر سکتا ہے اس کا اندازہ ہے تمہیں؟"

"اچھا اچھا زیادہ پھولن دیوی بننے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں تمہیں لینے آ رہے ہیں۔"

شاید نگاہ نے پھر کچھ کہا تھا جو وہ شرمیلی۔۔۔ مسکراہٹ کے ساتھ چور نظروں سے برابر بیٹھے شہزاد کو دیکھ کے رہ گئی تھی۔

"مجھے کیا ہوا ہے جو میں آرام کروں؟"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے' پھر میں چھاجی کو بھیج دیتی ہوں۔ وہ مجھے گھر اتار کے تمہیں لینے آ رہے ہیں۔ تم دو تین دن

تک میرے ساتھ رہو گی۔"

"ہاں' میں چھوڑنے والی میں تمہارا پیچھا۔"

"ساری عمر کیوں؟ چھاجی ملک مقبول کے خلاف اسٹینڈ لینے والے ہیں۔ صرف دلکش کو پہلے اس کے گھر خیریت سے پہنچانا ضروری تھا تاکہ ساری پولیس کارروائی میں اس بے چاری کا نام نہ آئے۔ کمشنر صاحب چھاجی کے جاننے والے ہیں' ان سے بات ہو چکی ہے۔ اگلے چند گھنٹوں میں وہاں ریڈ ہونے والی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ سنو تم دروازہ مت کھولنا۔۔۔ بلکہ باہر سے تالا لگا دو۔ یہی تاثر دو کہ تم گھر پہ نہیں ہو۔ چھاجی بیس پچیس منٹ تک پہنچتے ہیں۔ وہ تمہارے گھر کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کے تمہیں فون کریں گے تب باہر نکلنا سمجھیں۔"

اس نے فون بند کیا اور شہزاد کو مخاطب کیا۔

"بے حد ضدی ہے۔"

"سچے لوگ اکثر ضدی ہوتے ہیں۔" شہزاد نے تبصرہ کیا۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے بیگم صاحبہ؟"

"ابھی میں آپ کی بیگم صاحبہ نہیں بنی۔"

"تمہیں مغرور ہونے کا پورا پورا حق ہے دوئی۔ تم ماشاء اللہ سے محبت کے معاملے میں بہت خوش نصیب ہو۔ میرے اماں اور ابا تو تھے ہی تمہارے دیوانے۔۔۔ شوہر ایسا ملنے والا ہے جو تمہارے ہر حکم کا غلام پہلے سے ہے اور دوست۔۔۔ دوست بھی وہ جو تمہارے لیے جان تک نثار کرنے پہ تیار ہے۔"

"مغرور بھی ہو لوں گی' پہلے مطمئن تو ہو جاؤں۔۔۔ اور اطمینان مجھے تب ہو گا جب ملک مقبول اپنے انجام تک پہنچے گا' ایک برے انجام تک۔"

"ہاں انشاء اللہ اور آج رات تک ایسا ہو جائے گا۔ میں کمشنر صاحب سے بات کرتا ہوں' انہوں نے کیا ہدایات دی ہیں اپنے ماتحتوں کو یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ جیب سے سیل فون نکال کر نمبر ملانے لگا۔

☼ ☼ ☼

اسے گھر آنے کی جلدی تھی۔ کل بینک بند تھا اور اسے آج ہی اپنے باپ کو پیسے بھجوانے تھے' بلکہ باپ کو نہیں اسے تو وہ ایک پیسہ بھی بھیجنے کی اب روادار نہیں رہی تھی۔ گھر بنوا دیا تھا' بہنیں بیاہ دی تھیں' بھائیوں کو تھوڑا بہت پڑھا لکھا کے کسی نہ کسی کام پہ جما دیا تھا۔ اب وہ کہاں تک خود کو اور رد دلتی اتنا سب کر کر کے اس کے پاس رہا کیا تھا۔ یہ بوسیدہ فلیٹ' تنہا زندگی اور معاشرے میں ایک ذلت بھرا مقام جن بہن بھائیوں کے لیے بکتی رہی' وہی اب اسے اپنانے سے انکاری تھے اور ایک اس کا دل تھا اب بھی اسی امید پہ جیے جا رہا تھا کہ شاید وہ لوگ اسے اپنا لیں اور اس کی باقی کی زندگی یوں بے در و بے سائباں گزرنے کی بجائے اپنوں کے ساتھ گزرے' یہی وجہ تھی کہ جب بھی اس کا باپ اس کی کسی بہن یا بھائی کا نام لے کر کچھ مانگتا' وہ انکار نہ کر پاتی اور سارا جمع جتھا فراخ دلی سے بھیج دیتی مگر نہیں فراخ دلی سے نہیں لالچ سے' اس لالچ کے تحت کہ شاید اس بار ان کا دل موم ہو جائے' اس بار ان کی سوئی ہوئی محبت جاگ جائے۔۔۔ شاید اب وہ اسے پکار لیں کہہ اٹھیں کہ باجی بس کرو بہت کر لیا تم نے ہم سب کے لیے' اب ہماری باری ہے۔ تم عزت سے بیٹھو ہمارے گھر۔

تین دن پہلے اس کے باپ نے سب سے چھوٹی والی بہن کے شوہر کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کی نوکری خطرے میں ہے' نوکری برقرار رکھنے کے لیے اسے رشوت دینے کی ضرورت پڑ رہی ہے مگر وہ تین لاکھ کی رشوت وہ کہاں سے دے۔ نگاہ کے پاس کچھ بچتا ہی کہاں تھا کہ وہ جمع کر سکتی بمشکل تیس چالیس ہزار نقد تھے' اس نے اپنا سارا زیور بیچا۔ کسی نہ کسی طرح ڈھائی لاکھ جمع کیے اور اب وہ انہیں جلد از جلد نوشہرہ بھجوانا چاہ رہی تھی اس لیے

دعا کی بات نہ مانتے ہوئے اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ اصل بات اسے اس لیے نہ بتائی کہ پھر وہ ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگتی۔

منہ ہاتھ دھو کر بال بنانے کے بعد وہ باہر نکلنے کے لیے چپل پہن ہی رہی تھی کہ فون کی بیل بج اٹھی۔

"دعا۔۔۔ اسے چین نہیں۔"

اسکرین پہ دعا کا نام دیکھ کے وہ بڑبڑائی اور فون کان سے لگایا۔

"مجھے اچھی طرح پتا ہے تم نے فون کیوں کیا ہے؟ ارے بابا' فکر مت کرو میں گھر پہ ہوں اور بحفاظت بخیریت ہوں۔"

اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل نگاہ نے جلدی سے اسے تسلی دینا چاہی۔

"فکر کیسے نہ کروں؟ پتا نہیں کون سے خزانے دبے تھے تمہارے فلیٹ پہ جو جانے کی جلدی تھی ورنہ میں تمہیں ہرگز وہاں اکیلے چھوڑنے پہ راضی نہیں تھی۔"

دعا کی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ کتنے غصے میں ہے۔ اس غصے کی وجہ نگاہ کے لیے فکر مندی تھی' یہ احساس ہوتے ہی اسے دعا کے غصے پہ پیار سا آنے لگا۔

"اور میں کباب میں ہڈی بننے کے لیے راضی نہیں تھی۔ بھئی وہ کیا کہتے ہیں بڑا مزا اس ملن میں ہے جو شاید لڑائی کے بعد ہوتا ہے کچھ ایسا ہی شعر تھا نا۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ اس صورت حال میں بھی تمہیں ہری ہری سوجھ رہی ہے۔"

وہ یقیناً "شرم سے سرخ ہو گئی ہو گی۔ نگاہ نے تصور میں اسے دیکھتے ہوئے مزا لیا اور ہنس پڑی۔

"میں تو چاہتی تھی کہ تم دو چار روز تک میرے گھر پر رہو۔ تمہارا اس فلیٹ پہ رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ نیاز کھوکھر کسی بھی وقت آسکتا ہے اور دلکش کو نہ پا کے وہ کیا کر سکتا ہے اس کا اندازہ ہے تمہیں؟"

وہ اسے ڈرا رہی تھی۔ نگاہ کو بھی اچانک خطرے کا احساس تو ہوا مگر اس کا اظہار کر کے وہ دعا کی تشویش کو اور گہرا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے قصداً "نڈر بن کے کہنے لگی۔

"ارے نیاز کھوکھر کی تو۔۔۔ وہ میرے ایک تھپڑ کی مار کا نہیں ہے۔ ایسے دس کھوکھروں اور پندرہ ملکوں پہ میں اکیلی بھاری ہوں۔"

"اچھا' جھانسی کی رانی زیادہ پھولن دیوی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم دونوں تمہیں لینے آرہے ہیں۔"

نگاہ نے گھڑی کی جانب نظر ڈالی۔ دعا کے آنے کا سن کر وہ سٹپٹا گئی۔ وہ اس کے علم میں نہیں لانا چاہتی تھی کہ وہ ڈھائی لاکھ روپے اپنے بہنوئی کی مدد کے لیے بھیج رہی ہے کیونکہ دعا کو اچھی طرح پتا تھا اس کے پاس اتنی رقم نہیں۔ لامحالہ اسے زیورات بیچنے کے بارے میں بھی بتانا پڑتا اور پھر نتیجے کے طور پہ اس کی نصیحتیں۔

"یار تم کہاں سڑکوں پہ خوار ہوتی پھر رہی ہو۔ ایک کو پہنچا دیا نا اس کے ٹھکانے پہ۔۔۔ اب میری فکر چھوڑو اور اپنے گھر جا کے آرام کرو۔ ویسے بھی وہ تمہاری مامی صاحبہ۔۔۔ ان کو بھی ٹھنڈا کرنا ہو گا۔ یہ کام زیادہ اہم ہے میری جان۔"

"اچھا' پھر میں چھاجی کو بھیج دیتی ہوں۔ وہ مجھے گھر چھوڑ کے تمہیں لینے آرہے ہیں۔ تم دو تین دن تک میرے ساتھ رہو گی۔"

نگاہ نے ایک بار پھر وقت دیکھا۔ یعنی اس کے پاس کم از کم آدھا گھنٹا تھا۔ وہ آسانی سے اپنا کام نبٹا سکتی تھی۔

"مگر میں کب تک ان لوگوں سے چھپتی رہوں گی؟ ساری عمر تو یوں ڈر ڈر کے نہیں گزاری جا سکتی۔"

"ساری عمر کیوں؟ چھاجی ملک مقبول کے خلاف اسٹینڈ لینے والے ہیں۔ صرف دلکش کو پہلے اس کے گھر خیریت سے پہنچانا زیادہ ضروری تھا تاکہ پولیس کارروائی میں اس کا ذکر نہ آئے۔ کمشنر صاحب چھاجی کے جاننے والے ہیں' ان سے بات ہو چکی ہے۔ اگلے چند گھنٹوں میں وہاں ریڈ ہونے والی ہے۔"

"واقعی؟ یہ تو زبردست خبر ہے۔ بہت بڑا گند ختم ہو جائے گا معاشرے سے' اگر یہ شخص جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تو۔"

"سنو! تم دروازہ بالکل مت کھولنا' بلکہ باہر سے تالا لگا دو۔ یہی تاثر دو کہ تم گھر پہ نہیں ہو۔ چھاجی تمہارے گھر کے باہر کھڑے ہو کے تمہیں فون کریں گے تب باہر نکلنا سمجھیں۔"

وہ محبت سے مسکرا دی۔

"اماں ہے پوری۔۔۔ دوست کم اور ماں زیادہ۔"

دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے چٹخنی گرا دی۔ دروازے کا پٹ کھولتے ہی اس کو نیاز کھوکھر کا مکروہ چہرہ نظر آیا۔ گھبرا کے اس نے فوراً "دروازہ بند کرنا چاہا مگر وہ اپنا پاؤں آگے کر کے اس کی یہ کوشش ناکام بنا چکا تھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے میں کہہ رہی ہوں چلے جاؤ۔" وہ پورا زور لگا کے دروازہ بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر نیاز نے ایک ہی دھکے سے دروازہ پورا کھول دیا۔

وہ پرے جا کے گری اس کی ٹھوڑی زمین سے لگ کر بری طرح زخمی ہوئی تھی' خون ٹپک کے نیچے گر رہا تھا مگر وہ درد کی شدت سے بے نیاز فوراً "اٹھی اور کھلے دروازے میں سے باہر نکلنا چاہا مگر نیاز نے آگے ہو کے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ پلٹ کر پاؤں کی ضرب سے دروازہ بند کیا اور چٹخنی لگا دی۔

"کہاں غائب کی ہے لونڈیا؟" وہ غرایا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔ وہ' وہ بھاگ گئی۔"

اس نے ٹھوڑی سے ٹپکتے خون پہ دوپٹا رکھا اور سسکی بھر کے کہا۔

"تو کسی کی سگی نہیں ہو سکتی۔"

نیاز کھوکھر نے اسے زور کا تھپڑ دے مارا۔

"کتے۔۔۔ تیری یہ ہمت مجھ پہ ہاتھ اٹھایا تو نے۔"

وہ تھپڑ کھا کے زخمی شیرنی کی طرح اس پہ پل پڑی۔ اس کا منہ نوچنے لگی۔ نیاز پہلے ہی دلکش کی غیر موجودگی سے بوکھلایا ہوا تھا۔۔۔ نگاہ کی مزاحمت نے اسے اور مشتعل کر دیا۔ وہ بھی بے دردی سے اس کے نازک وجود کو دھنکنے لگا۔ وہ درد سے دوہری ہوتی ہوئی بھی ہار نہ مان رہی تھی ایک بار پھر نظر بچا کے اس نے نیاز کے پہلو سے کھسک کے دروازے کی جانب نکلنا چاہا۔ نیاز نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو کھینچ کے پیچھے کی جانب دھکا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب میں سے لمبا سا نوکدار چاقو نکالا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

گھر پہنچتے ہی بلقیس اور اللہ وسایا کی زبانی ساری حقیقت جاننے کے بعد وہ بے یقینی سے کہنے لگی۔ شہزاد کے لیے بھی یہ ساری صورت حال غیر یقینی تھی۔ وہ تو دعا کو گھر کے باہر ہی اتار کے اب نگاہ کی طرف نکلنے والا تھا مگر بلقیس کے بلانے پہ چند منٹ کے لیے اندر آگیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ آخر وہ کون سی خاص اور ضروری بات کرنا چاہتی ہے اور اب یہ چند منٹ تقریباً "آدھے گھنٹے پہ محیط ہو چکے تھے۔

"دوئی پتر' ہمیں ابھی ابھی ایک بات پتا چلی ہے اور میرا اور تیرے ابے کا خیال ہے کہ تجھ سے زیادہ دیر تک وہ بات چھپا کے رکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے کہ وہ لوگ خود آ کے تجھے بتائیں ہم خود ساری سچائی تجھے بتانا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی یہ کوئی چھپانے والی بات ہے بھی نہیں' یہ تو خوشی کی بات ہے۔"

دعا جو ماں کی بات سن کر گھبرا رہی تھی' اس کی تشویش کم کرنے کے لیے بلو نے ساتھ ہی تسلی بھی دی۔

شہزاد کا تجسس بھی عروج پہ پہنچ گیا۔

"یہ جو نواب صاحب [illegible] تھے باہر کے [illegible] نا وہ دراصل۔"

اور ساری بات تفصیل سے جان لینے کے بعد بھی وہ بے یقین تھی۔

"یہی سچ ہے پتر۔" اللہ وسائی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"مگر ابا اگر وہ میری ماں کے سگے ہیں تو اتنی دیر تک، ان سے بے خبر اور لاتعلق کیوں رہے؟"

اس کی نگاہ میں اپنی ماں کے آخری ایام گزر گئے جو اس نے خاصی لاچاری اور کسمپرسی میں گزارے تھے۔

"پتر بتایا تو ہے کہ کیا مجبوری تھی۔ وہ جان کے بے خبر نہیں رہے بس قسمت میں ایسا لکھا تھا اب تو بھی قسمت کے لکھے کو قبول کر لے۔ وہ تیرے رشتے دار ہیں۔ تیرے نانکے تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ تیرے رشتے دار ایسے عزت دار اور اونچے نام والے ہیں آن بان والے۔"

اللہ وسائی کی بات پہ شہزاد نے چونک کر سر اٹھایا۔

ابھی تک وہ انکشاف پہ صرف حیران ہی ہو رہا تھا۔ اس کی گہرائی میں نہ اترا تھا لیکن اب اس کی بات اس سارے معاملے کو ایک الگ ہی رخ سے دکھا رہی تھی۔

وہ نڈھال انداز میں بیٹھ گیا۔

دعا اب تک آنسو بہا رہی تھی۔ بالو نے اسے چپ کراتے ہوئے بہلانا چاہا۔

"کرمے کا مان رکھنے کو ہی اس سچائی کو مان جا دوئی ..... اسے بڑی چاہ تھی کہ اس کی بہن اپنے اصل کو لوٹ جائے۔ وہ دل سے اسے اپنی بہن مانتا تھا' بڑا چاہتا تھا اسے لیکن یہ بھی کہتا تھا کہ بھلیے لوکے! میں اسے جتنی بھی عزت اور محبت دے لوں' جو عزت اسے اپنے اصل سے مل سکتی ہے وہ نہیں دے سکتا۔ اس کا دیر بڑا کی ہے۔ اللہ کرے کوئی معجزہ ہو جائے اور اس کے اپنے اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

کرم الٰہی کو یاد کر کے اس کی خواہش دوہرا کے وہ اپنے آنسو دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

"اس کی یہ چاہ نہ اس کی زندگی میں پوری ہو سکی نہ اس کی بہن کی زندگی میں 'مگر تجھے اللہ نے یہ موقع دیا ہے۔ کیا اپنے ماے کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے بھی تو اپنے دل کو راضی نہیں کر سکتی۔"

"مای ..... جو لوگ میری زندہ ماں کو صرف اپنے خاندان کی عزت بچائے رکھنے کے لیے دفنا بیٹھے تھے' ان کو اپنا ماننے کو دل تو نہیں کرتا لیکن ماما جی کے لیے' صرف ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے' اور اپنی ماں کے لیے' کیونکہ جو بھی ہے ان کے دل سے ان کے اپنوں کی محبت کبھی ختم نہیں ہو سکی ہو گی۔ ان دونوں کی خاطر میں اس سچائی کو تسلیم کر لیتی ہوں۔"

"نہ پتر' وہ بڑے لوگ ہیں۔ اپنا دل صاف رکھ کے ان سے ملنا۔ بڑے بھلے مانس' بیبے لوگ ہیں بس غلط فہمیاں بندے سے کیا کیا نہیں کرواتیں۔ اگر انہیں اپنی بہن سے محبت نہ ہوتی تو تجھے دیکھ کے اس کی یاد کیوں آتی' کیوں دل کھنچتا تیری طرف کیوں تیرے پیچھے پیچھے ادھر تک آتے۔"

اللہ وسائی نے ان کی جانب سے صفائی پیش کی۔

"ہاں دوئی' پہلی دفعہ مجھے تیرے پیو کی بات صحیح لگ رہی ہے۔ وہی تیرا ماما ہے' تیرا سگا ماما کرماتو...."

بالو سسک پڑی۔ شہزاد بے چین ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دعا نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ شکستہ قدموں جھکے ہوئے سر کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔

دعا نے اپنے چھاجی کا یہ ہارا ہارا مایوس روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے دھلی اس کی شفاف آنکھوں میں ایک تحیر بھرا سوال ابھرا جو خود ہی معدوم ہو تا گیا۔ شاید اسے جواب بھی مل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عرصہ دراز کے بعد آج سارا گھرانہ اکٹھے ہو کے کہیں جانے کے لیے نکل رہا تھا۔ وہ سب اپنی بیٹی' اپنی دعا کو لینے جا رہے تھے۔ نواب صاحب نے عمیص کو کہہ کر وہاں فون کروا دیا تھا اور اپنے آنے کی اطلاع بھجوا دی تھی۔

"صاحبزادی گل مہر آپ تیار نہیں ہوئیں؟" "جی نہیں امی حضور ہم نہیں جا سکیں گے۔"

وہ اٹھی اور سر جھکا کے آہستہ سے جواب دیا۔

"مگر آپ کے ابا حضور کی خواہش ہے کہ دعا بٹیا کو لانے کے لیے ہم سب کو جانا چاہیے۔"

"آپ ہماری مجبوری اور کشمکش کو سمجھنے کی کوشش کیجیے' وہاں' وہاں پہ ....."

صاحبزادی حرمت النساء بھانپ گئیں کہ وہ شہزاد ملک کا سامنا کرنے سے خائف ہو رہی ہے۔

"ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں 'مگر آپ کے ابا حضور وہ یہ نزاکت شاید ہی محسوس کر پائیں۔ اور ویسے بھی صاحبزادی گل مہر خانم' جو بیت گیا سو بیت گیا اب رشتوں اور تعلق کی نوعیت یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ آپ کی بہن ہیں..... ایک عرصے تک ایک عمر تک ان محبتوں سے محروم رہی ہیں جو ان کا حق تھا۔ ہمیں وہ سب سود سمیت انہیں لوٹانا ہے۔ آپ کو بھی سب بھلا کے اس نئے رشتے کو قبول کرنا ہو گا۔"

"ہم مانتے ہیں' تسلیم کرتے ہیں اس رشتے کو۔"

گل مہر نے ماں کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے انہیں تسلی دینا چاہی۔

"صرف اس وقت آپ ہمیں وہاں جانے پہ مجبور نہ کیجیے۔ ہمیں بھی دعا کا انتظار ہے' ہمیں بھی ان کے یہاں آنے کی اتنی ہی مسرت ہو گی جتنی آپ سب کو ہے۔ آپ ابا حضور سے کہہ دیجیے گا کہ ہم گھر پہ ان کے استقبال کی تیاری کریں گے۔ آخر ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے بھی تو کسی کا یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔"

☼ ☼ ☼

"شہزادے اٹھ پتر کی ہو گیا اے؟"

بالو نے شہزاد کو جھنجھوڑتے ہوئے جگانے کی کوشش کی۔

"پٹھی عادتاں۔" تھک کے وہ بڑبڑانے لگی۔

"آدھی رات تک باہر پھرتا رہا باقی آدھی رات سگریٹ پھونک کے برباد کرتے گزار دی سویرے بانگ ویلے سو گیا یہ کوئی طریقہ ہے۔ سویرے سے تیرے فون سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ کبھی کسی صدیقی کا ہورے کمشنر ڈشنر بتا رہا تھا خود کو' کبھی تیرے دفتر سے فون پہ فون کبھی دوئی کے فون اٹھ خود جواب دے جس کو جو جواب دینا ہے۔"

بالآخر وہ مشکل سے ہی سہی' بستر سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ماں سے فون کالز کی تفصیل تو سن چکا تھا' اب اس نے سیل فون پہ بھی مسڈ کالز کی لسٹ چیک کی' جس کی رنگ وہ سونے سے پہلے Mute کر چکا تھا۔ تقریباً" یہی نام تھے جو گھر کے فون پہ اس کے نہ ملنے پہ سیل فون پہ ٹرائی کرتے رہے تھے۔ دعا کی کالز سب سے زیادہ تھیں۔

"او مائی گاڈ..... یقیناً" وہ نگاہ کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی ہو گی۔ کل مجھے اسے لینے جانا تھا۔"

وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔

"میں چاء بھجواتی ہوں تیرے لیے' تیرے کوئی ہوش حواس ٹھکانے آئیں۔"

بالو اسے جگا کے مطمئن ہو کے کمرے سے چلی گئی۔

"شہزادے چاء ناشتا۔" بالو نے اسے نکلتا دیکھ کر آوازیں دیں 'مگر وہ چند سیکنڈ میں گاڑی نکال کر ہوا ہو چکا تھا۔

کل ملنے والی خبر نے اسے ایسا ذہنی دھچکا دیا تھا کہ وہ نگاہ کو یکسر بھول ہی گیا۔ اسے بالکل دھیان نہ رہا کہ دعا نے اسے بحفاظت یہاں لانے کی کتنی سختی سے تاکید کی تھی۔ اس نے دعا کا SMS بھی پڑھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ نگاہ اس کا فون ریسیو نہیں کر رہی۔ اب وہ بھی اس کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ اس کے گھر تک پہنچا تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کے اس کے فلیٹ کے دروازے تک پہنچا۔ کال بیل بجائی زور زور سے دستک دی۔ سیل فون سے بار بار اس کے گھر کے نمبر اور موبائل نمبر پہ رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ بیل کی آواز گھر کے باہر تک آ رہی تھی۔

"سیل فون اندر بج رہا ہے تو نگاہ اٹھا کیوں نہیں رہی....." اس نے اور شدت سے لکڑی کا بوسیدہ دروازہ پیٹنا

شروع کر دیا۔ آس پاس کے دروازے کھلنے لگے۔۔۔ سیڑھیاں اترتے چڑھتے لوگ رک کے جمع ہونے لگے۔ اس نے نزدیک کھڑے تماشا تکتے دو لڑکوں کو اپنی مدد کے لیے بلایا اور دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ تین چار دھکوں کے بعد دروازہ اکھڑ گیا۔ لڑکوں نے اسے ہٹا کے ایک جانب پھینکا اور سامنے کا منظر دیکھ کے اس مجمع میں موجود عورتوں کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔

دروازے کے بالکل سامنے مختصر سے برآمدے میں دو لاشیں گری ہوئی تھیں۔ ایک عورت کی اور ایک مرد کی عورت کے پیٹ میں کئی انچ گہرا چاقو پیوست تھا اور وہ چت لیٹی تھی اس کے ہاتھ میں پیتل کا گلدان تھا جبکہ مرد اوندھا گرا ہوا تھا اور اس کا سر کھل کے بھیجہ باہر نکلا ہوا تھا۔ شاید اس پیتل کے گلدان سے اس پہ کئی ضربیں لگائی گئی تھیں۔ دونوں کا خون بہہ بہہ کر جم چکا تھا۔ لاشیں اکڑ چکی تھیں شاید کل کسی پہر یہ حادثہ ہوا تھا۔

دروازے کے باہر ہجوم بڑھتا گیا اور مختلف آوازوں کا شور بھی شہزاد دھڑکتے دل کے ساتھ پولیس اسٹیشن فون کر کے اطلاع دینے کے بعد آگے بڑھا۔ نگاہ کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔۔۔ شاید وہ کسی کی منتظر تھی نجانے کس کی شاید کسی اپنے کی۔

☆ ☆ ☆

گل مہر اس وقت گھر پہ بالکل اکیلی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ اگرچہ نواب صاحب جاتے ہوئے دلگیر کو اس کے پاس چھوڑ گئے تھے لیکن اس نے کچھ دیر پہلے دلگیر کو مارکیٹ روانہ کیا تھا' ایک خوب صورت سا بوکے لانے کے لیے۔

"نہ چھوٹی بی بی' ہم نہیں جانے والے نواب صاحب ہماری چمڑیا ادھیڑ ڈالیں گے اگر انہیں پتا چلا کہ ہم آپ کو اکیلا چھوڑ کے کہیں باہر گئے تھے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"انہیں کیسے پتا چلے گا' جب ہم بتائیں گے ہی نہیں۔"

"آہاہا آپ نہیں بتائیں گی تو کیا ہوا' آپ کا وہ گلدستہ اپنا اعلان خود کر دے گا' ظاہر ہے وہ پھول ہم گھر پہ بنانے سے تو رہے ارے رے! کیا یاد دلایا' چھوٹی بی بی' آپ مہمان بی بی کا استقبال پھولوں سے ہی کرنا چاہتی ہیں تو ہمارے انگنا میں کیا کم پھول ہیں گلاب' موتیا' سورج مکھی' گیندا' چھوئی موئی' گل داؤدی قسم قسم کے گل کھلے ہیں۔"

"لیجیے ایک دلگیر ہی تو کام کا ہے اس گھر میں لائیے دیکھیے روپے ابھی لاتے ہیں آپ کے بوٹے۔"

"بوٹے نہیں بدھو بوکے۔"

مارکیٹ نزدیک ہی تھی لیکن نجانے وہ کیا انکھیلیاں کرتا ہوا گیا تھا کہ بیس منٹ ہو چکے تھے واپس نہیں آیا تھا۔ گل مہر کو اتنے بڑے بڑے خالی کمروں سے خوف آنے لگا۔ ایک نامانوس سا سناٹا ہر جانب چھایا تھا جس کی وجہ سے اسے ہول اٹھنے لگے۔ وہ گھبرا کے دالان میں نکل آئی اور سب سے آخری سیڑھی پہ بیٹھ کے باہر تکتے ہوئے دلگیر کا انتظار کرنے لگی۔ باڑھ کے اس طرف گلی میں خاصی چہل پہل تھی' مختلف آوازوں کو سنتے ہوئے اس کا دھیان بٹنے لگا۔ اچانک کال بیل کی آواز پہ اس نے چونک کے گیٹ کی جانب دیکھا۔ دلگیر کبھی بیل نہیں بجاتا تھا۔ اچک کے گیٹ کے اوپر والا لاک ہٹا دیتا تھا اور اندر آجاتا تھا۔ ویسے بھی گیٹ کے نیچے سے نظر آنے والے سیاہ بوٹ بھی اس کے نہیں ہو سکتے تھے اور گیٹ کے دوسری جانب نظر آتی گاڑی بھی اس کی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" وہ گیٹ تک آتو گئی مگر پوچھتے ہوئے ہچکچا رہی تھی کہ کہیں آنے والا اس کے ابا حضور کا کوئی جاننے والا نہ ہو۔ نواب صاحب گھر کی خواتین کا گیٹ پہ آکر پوچھ گچھ کرنا معیوب جانتے تھے اور ان میں سے کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا تھا مگر اب صورت حال کچھ اور تھی۔ گھر میں سوائے اس کے اس وقت کوئی اور نہ تھا۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے؟" "جی مجھے چچی جان سے ملنا ہے پلیز آپ ان سے کہیے بہروز علی چغتائی آئے ہیں۔"

"چچی جان؟۔۔۔ بہروز علی چغتائی؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اتنے میں گاڑی کا ہارن بجا۔ گل مہر نے دوبارہ کی ہول

سے جھانکا۔ بہروز نامی وہ شخص پلٹ کر ذرا بلند آواز میں گاڑی میں موجود کسی فرد سے کہہ رہا تھا۔

"جی والدہ۔۔۔ کوئی خاتون آئی تو ہیں۔"

کسی خاتون کی بے حد ہلکی آواز سنائی دی۔ باوجود کوشش کے وہ الفاظ نہ سمجھ پائی البتہ اس شخص کے ساتھ اس کی والدہ کی موجودگی نے اس کا خوف ضرور کم کیا۔

"جی بہتر۔" کہہ کر وہ گیٹ کی طرف مڑا تو وہ بوکھلا کے کی ہول سے پیچھے ہٹ گئی۔

"اور چچی جان سے کہیے کہ بہروز علی چغتائی کی والدہ بیگم نصیبن چغتائی بھی تشریف لائی ہیں۔"

"لیکن آپ کی چچی جان ہیں کون؟"

"غالباً" آپ کی والدہ۔۔۔ ارے والدہ' آپ کیوں باہر آگئیں؟" اب شاید وہ اپنی والدہ سے مخاطب تھا۔

"ہم بات کرتے ہیں' زیبا خاتون کی دختر ہوں گی ہمیں بخوبی پہچانتی ہیں۔"

ایک خاتون کی نحیف' بزرگ مگر بارعب اور شائستہ سی آواز سنائی دی۔

"مگر آپ کی طبیعت۔" وہ تشویش سے کہہ رہا تھا اب گل مہر کو زیادہ دیر تک بند گیٹ کے پیچھے سے جرح کرنا بداخلاقی محسوس ہوا اس نے جھجکتے ہوئے گیٹ کا بغلی دروازہ وا کر دیا۔

بادامی رنگ کی ساڑھی نفاست سے باندھے' سچے موتیوں کی لڑی گلے میں ڈالے ایک مہربان اور دلکش نقوش والی عمر رسیدہ خاتون اسے دیکھ کے شفقت سے مسکرا رہی تھیں۔ اس نحیف و مختصرالوجود خاتون کے ساتھ کھڑا وہ دراز قامت شخص بھی کم خوش رو نہیں تھا۔

"آداب۔" اس نے تہذیب جھاڑی۔ جواباً" وہ مسکرا کے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"جیتی رہیے۔۔۔ آپ زیبا خاتون کی صاحبزادی تو نہیں لگتیں۔" ساتھ ہی شبہ ظاہر کیا گیا۔

"جی ہمارا بھی یہی خیال ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاید یہ آپ کا مطلوبہ گھر نہیں ہے۔"

"کیا جناب حشمت چغتائی یہاں نہیں رہتے؟"

"جی نہیں یہ صاحبزادہ نفیس علی خان کی رہائش گاہ ہے۔"

"اور آپ یقیناً" ان کی صاحبزادی۔" خاتون غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد بھی اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ بہروز علی چغتائی جیب سے کوئی رقعہ نکال کے پڑھ رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ والدہ' یہاں اسٹریٹ نمبر سیون درج ہے۔ ہم نمبر ایٹ میں کھڑے ہیں۔ محترمہ ہم معذرت خواہ ہیں آپ کو بلاوجہ زحمت دی۔"

"کوئی بات نہیں آپ آہی گئی ہیں تو اسے بھی اپنی عزیزہ کا گھر جانیے اندر تشریف لائیے خاصی گرمی ہے کم از کم کوئی مشروب ہی لے لیجیے۔"

اس نے آداب مہمان نوازی نبھانے چاہے۔ یہ خاتون اسے بلاوجہ ہی متاثر کر رہی تھیں شاید اپنے مانوس اور جانے پہچانے اطوار کی وجہ سے دوسری جانب بھی غالباً" یہی احساسات تھے۔ ان کی نگاہوں میں بھی پسندیدگی تھی۔

"بے حد شکریہ بیٹی۔ آپ کی محبت کے جواب میں انکار کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔ مگر ہم یہاں کسی کی عیادت کے لیے آئے ہیں۔ البتہ یہ وعدہ رہا کہ جلدی ہی دوبارہ آئیں گے' بطور خاص آپ سے صرف اور صرف آپ سے ملنے کے لیے۔"

بہروز نے چونک کے اپنی والدہ کو دیکھا جیسے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کے بعد ایک نظر سلیقے سے سر ڈھانپ کے' نظریں جھکائے کھڑی اس دوشیزہ پہ ڈالی۔ سادگی میں بھی جس کا پر تمکنت حسن دمک رہا تھا۔

● ● ●

دعا چادر لپیٹے متورم آنکھوں کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس کی آواز پہ کبھی کبھی رقت طاری ہو جاتی تھی۔

"دوئی پتر!"

اللہ وسایا کچھ دیر اس کے نزدیک خاموشی سے کھڑا اس کا سوگوار مگر پر تقدس چہرہ دیکھتا رہا۔ اور جب اس نے قرآن پاک کو چومتے ہوئے بند کیا تو آواز دی۔

"تجھ سے ایک بات کرنی ہے پتر۔"

"جی ابا جی!"

اس نے مقدس کتاب کو غلاف میں لپیٹا ایک بار پھر عقیدت سے بوسہ دیا' دونوں آنکھوں سے چھوا۔ اور اٹھ کر الماری پہ رکھنے لگی۔

"نگاہ کی فوتگی کی وجہ سے تیرے دل پہ بڑا اثر تھا غم کا' اس لیے ہم میں سے کسی نے تجھے نہیں چھیڑا۔ اور تو اور تیری مامیاں اور وہ تیرا ماما' نواب صاحب وہ بھی آئے تو تجھے لینے تھے لیکن تیری سہیلی کی فوتگی کا سن کے اور تیری حالت دیکھ کے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ کہہ گئے تھے ابھی اسے لے جانا اس کے لیے اچھا نہ ہوگا' سنبھل جائے گی تو پھر لینے آجائیں گے۔ اور تیری مامی بالو۔ وہ بھی انتظار میں ہے کہ کب بیاہ کی تاریخ رکھنے آئے۔"

اس ذکر پہ اس نے بیٹی کی شفاف پیشانی پہ ناگوار شکن نمودار ہوتے دیکھی تو فوراً وضاحت کرنے لگا۔

"زندگی موت تو ساتھ ساتھ ہے پتر' نگاہ کے جانے کا دکھ ساروں کو ہی ہے۔ مجھے بھی پتا ہے اور بالو بھرجائی کو بھی کہ تیری بڑی اچھی سہیلی تھی۔ ظاہری بات ہے تجھے اس موقع پہ ایسی باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہوں گی۔ لیکن شادی بیاہ تو دنیا کا دستور ہے۔ بیٹی کو کتنی دیر بٹھا سکتے ہیں۔ تو کہے گی تو بیاہ زیادہ دھوم دھڑکے سے نہیں کریں گے۔ بھرجائی اور شہزادے کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"لیکن ابا مجھے تو۔"

ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ بے جان انداز میں پھیلی۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے سر جھٹک کے خواہ مخواہ بستر کی شکنیں دور کرنا شروع کردیں۔

"تیرا اب کیا خیال ہے' تیری مامی کو؟" وہ جواب کا منتظر تھا۔

"آپ نواب صاحب۔ میرا مطلب ہے ماموں جان کو پیغام بھجوا دیجیے۔ میں تیاری کر رکھتی ہوں' وہ آکے لے جائیں۔"

"پھر یقین۔" وہ بوکھلایا ہوا نظر آیا۔

"گھبرا کیوں رہے ہیں ابا جی۔ میں کچھ دن وہاں رہنے ہی تو جا رہی ہوں' صرف ان کی خوشی کے لیے۔ اور وہ بھی آپ کے سمجھانے پہ ہی راضی ہوئی تھی۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ ان کا مجھ پر حق ہے' پھر آپ حیران و پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ سو دفعہ جا۔ ہزار دفعہ جاؤ۔"

اللہ وسائے نے فوراً ہی اپنی حیرانی پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"وہ میں تو۔ دراصل میں نے تجھ سے کچھ اور پوچھا تھا' تیری مامی کو کیا جواب دوں؟"

"جواب۔؟"

وہ ایک مصنوعی حیرت چہرے پہ سجا کر باپ کو دیکھنے لگی۔

"وہ انگوٹھی انہیں واپس نہیں کردی میں نے؟"

اللہ وسایا کرنٹ کھا کے اچھلا۔

"ہوش میں رہ دھی۔ وہ بات کب کی ختم ہوچکی۔ وہ تو تو نے اس بار کی۔ خیر مٹی پاؤ۔ اب سب صحیح ہوگیا تھا۔ شہزاد تجھے انگوٹھی دوبارہ پہنا گیا تھا نا۔"

"اچھا۔؟ شاید مجھے یاد نہیں' کہیں رکھی ہوگی۔"

وہ اپنے ہاتھ الٹ پلٹ کے دیکھنے لگی' پھر سائیڈ ٹیبل کا دراز کھول کے چیک کرنے لگی۔

اس دوران اللہ وسایا منہ کھولے یہ سب دیکھتا رہا۔

"یہ رہی۔ دوبارہ واپس بھجوا دیجیے۔"

اس نے دراز میں سے انگوٹھی نکال کے آگے بڑھائی۔

وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ جو نہ تو مذاق کر رہی تھی نہ ہوش سے بیگانہ لگ رہی تھی۔

"ایسے کیسے یہ۔ دماغ خراب ہوگیا ہے۔ رکھ واپس اسے' نہیں انگلی میں ڈال' چل شاوا۔"

"یہ رکھیں اور واپس کرکے آئیں۔"

باپ کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ نارمل انداز میں کہتی انگوٹھی اس کی ہتھیلی پہ رکھ چکی تھی۔

وہ کبھی انگوٹھی تو کبھی بیٹی کو دیکھنے لگا۔

"کیا کر رہی ہے تو دھی۔ دیکھ ایسے تماشوں سے دل میں گرہ پڑ جاتی ہے۔ اگر شہزادے سے کوئی گرمی سردی اونچ نیچ ہوگئی ہے تو مل کے بات چیت کر کے صلح کرلے۔ ایسے بے وقوفیاں نہ کر۔"

"رشتہ؟ کون سا رشتہ؟ فی الحال۔ سردست ہم میں کوئی رشتہ نہیں۔"

"اور میں کیا جواب دوں گا دنیا کو۔ بھرجائی کو۔ شہزادے کو۔"

اس بار وہ بھڑک کے چلایا تھا۔

"کسی کو جواب دینے کی ضرورت نہیں۔"

"ہاں سارے مٹی کے مادھو ہیں نا۔ جو چپ کرکے انگوٹھی واپس رکھ کے صبر سے بیٹھ جائیں گے۔ شہزادہ اس کی وجہ نہیں پوچھے گا؟"

"ضرور پوچھیں گے چھاجی۔ اور انہیں پوچھنا بھی چاہیے۔"

اس کے اطمینان بھرے لہجے نے اللہ وسائے کو اور بھڑکا دیا۔

"اور جواب دینے کے لیے رہ جائے میری بڈھی جان' ہے نا۔"

"نہیں' آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ چھاجی کے ہر سوال کا جواب میں دوں گی۔"

"تو یہ انگوٹھی بھی آپ واپس کر۔ میں کیوں چٹے سر کے ساتھ اپنی بے عزتی کراؤں۔ وہ تو پہلے ہی سمجھتا ہے کہ میں تیرا ویاہ نہیں کرانا چاہتا۔"

"وہ کچھ بھی پوچھیں آپ کہہ دیں کہ دعا کو فون کرکے بات کرلیں۔"

"مجھے سمجھ نہیں آرہا تو کر کیا رہی ہے۔"

وہ بے چارگی سے کہنے لگا۔

"آجائے گا سمجھ۔"

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

"نگاہ کی موت نے مت مار کے رکھ دی ہے۔ ستیاناس کر رہی ہے اپنی زندگی کا۔ ویسے بڑی عقل والی بنتی ہے۔ ذرا میرے "آکھے" (کہنے) میں نہیں۔"

وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا چیز ہے پھوپھا جی۔"

وہ حواس باختہ سا دعا کے گھر میں گھسا۔

اللہ وسایا جو جان بوجھ کے انگوٹھی واپس کرنے اس وقت گیا تھا جب شہزاد گھر میں نہیں ہوتا۔ اس کی اچانک آمد پہ ہڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اگرچہ بالو نے بھی کم دماغ نہیں چاٹا تھا اس کا۔ مگر شہزاد کے کسی بھی سوال کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔

"اماں نے بتایا کہ۔۔۔ کہ یہ انگوٹھی۔"

"ہاں وہ دوئی نے واپس بھجوادی تھی۔"

وہ سر جھکا کے کہہ رہا تھا' جیسے بیٹی کی اس حماقت کا ذمہ دار وہی ہو۔

"مگر کیوں؟" وہ احتجاجاً" چلایا۔

"اسی سے پوچھ۔"

اس نے بھی چلا کر جواب دیا۔ وہ اب چڑ رہا تھا' وضاحتیں پیش کرتے کرتے' ویسے بھی جس عمل کے پس پردہ عوامل سے وہ خود ناواقف تھا اسے کیا واضح کرتا۔

"کہاں ہے دوئی۔۔۔؟" وہ اس کے کمرے کی جانب بڑھنے لگا مگر اللہ وسائے نے روک دیا۔

"وہ اندر نہیں ہے۔ بلکہ گھر پہ نہیں ہے۔"

"کب تک آئے گی؟"

وہ صوفے پہ بیٹھ گیا' جیسے اس کا انتظار کرنے کا ارادہ ہو۔ اس کے ہر عمل اور حرکات و سکنات سے اتنی بے چینی چھلک رہی تھی کہ اللہ وسائے کو اس پر بے اختیار ترس اور دعا پر غصہ آنے لگا۔

"وہ تو۔۔۔ ابھی کچھ دن وہیں رہے گی وہاں یہ۔۔۔ دہ۔۔۔" وہ پتا نہیں کیوں بتاتے ہوئے اٹک رہا تھا۔

"کہاں ہے؟"

"نواب ہوراں کی حویلی۔۔۔ وہ لے گئے تھے' رہنے گئی ہے۔"

"اوہ۔۔۔!"

شہزاد نے ایک طویل سانس بھری۔ وہ ایک دم ڈھے گیا۔

پھر اس نے اپنے مضمحل وجود کو صوفے سے اٹھایا اور باہر کی جانب قدم بڑھایا۔

"شہزاد پتر ایک منٹ۔"

اللہ وسائے نے تڑپ کے اس کو روکا۔

"تو دوئی کو فون کرلے' وہ کہہ رہی تھی کہ انگوٹھی واپس کرنے کی وجہ وہ آپ تجھے بتائے گی۔"

شہزاد نے ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی مگر کوئی بات کیے بغیر دوبارہ پلٹا۔

اللہ وسائے نے اسے روکنے کی ایک اور کوشش کی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس گھر سے شہزاد واپس نہیں جا رہا' اس کی بیٹی کا مقدر روٹھ رہا ہے۔

"تو ادھر ہی بیٹھ کے فون کرلے پوچھ لے اس سے وجہ۔"

"جو بات میں جان گیا ہوں' وہ اب کیا پوچھوں۔"

"جان گیا ہے؟ کیا۔۔۔؟"

"یہی' اس رشتے کو ختم کرنے کی وجہ۔ میں جان گیا ہوں کہ اس گھر سے اسے بیاہ کے میں اپنے گھر لے جا سکتا تھا' لیکن اب وہ جس گھر میں رہ رہی ہے وہاں سے میرے گھر تک کا سفر اسے پستی کی جانب سفر لگ رہا ہوگا۔"

اتنا کہہ کے وہ اللہ وسائے کے روکنے کے باوجود نہ رکا۔

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا دوئی۔"

وہ بڑبڑایا اور اسی وقت فون پہ دعا کا سیل نمبر ملانے لگا۔

"آیا تھا شہزاد۔۔۔ اور خوش ہوجا۔۔۔ ٹوٹا دل لے کر واپس گیا ہے۔"

اس کے "ہیلو" کے جواب میں وہ پھٹ پڑا۔

"لیکن ابا جی' میں نے کہا تو تھا کہ وہ مجھے فون کرلیں۔ میں سب۔۔۔"

"کیوں فون کرے وہ' کوئی کسر رہ گئی ہے باقی؟ تو نے آج ثابت کردیا ہے دوئی کہ تو جدی پشتی کمی کمین میراثی اللہ وسایا طبلے والے کی بیٹی ہے۔"

"ابا جی!"

"غلط نہیں کہہ رہا میں مجھے نہیں پتا تھا کہ تو ایسی ذلیل اور احسان فراموش نکلے گی۔ حالانکہ خون تو تو میرا ہی ہے۔ اور میں خود زمانے بھر کا ذلیل' کمینہ اور احسان فراموش ہوں' لیکن۔۔۔ لیکن میرا ایمان تھا کہ تیری بہشتن ماں کا صبر والا اچھا خون میرے بد خون کی تاثیر ختم کردے گا۔ تو نے تو اپنی ماں کا مان بھی نہ رکھا۔"

"میں نے تو صرف۔۔۔"

اس نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ لیکن اللہ وسایا نے اس کا موقع دیے بغیر فون بند کردیا۔

وہ غائب دماغی کی کیفیت میں فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ پھر بہت ہمت کرکے اس نے شہزاد کا نمبر ملایا۔

"آپ کو میرا پیغام نہیں ملا تھا چھا جی؟"

اس کی آواز سن کے دعا نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا مگر دوسری جانب سے اتنے ہی خشک اور اجنبی انداز میں جواب ملا۔

"ہاں' میرے سامنے ہی پڑا ہے ٹیبل پہ' تمہارا پیغام یا پھر تمہارا جواب۔"

"میں اس کی بات نہیں کررہی' میں نے آپ کو کہلوایا تھا کہ مجھے فون کرلیں۔"

وہ پھر بھی نرمی سے بات کرتی رہی۔ جانتی تھی انجانے میں کتنا بڑا چرکا لگا بیٹھی ہے۔

"کس لیے؟ جب ہمارے درمیان کوئی رشتہ ہی نہ رہا تو یہ رابطے کس لیے؟"

"میں نے کوئی رشتہ ختم نہیں کیا۔"

"تو پھر یہ انگوٹھی۔"

"انگوٹھی واپس بھجوائی تھی مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ۔"

"کیا مطلب ہے پھر اس بات کا؟ مذاق بنا رکھا ہے تم نے اس انگوٹھی کو' کبھی واپس بھجواتی ہوں' کب پہنتی ہو' کبھی دوبارہ بھجواتی ہو اور پھر مکر جاتی ہو کہ تمہارا کوئی غلط مقصد نہیں تھا۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں عزت پانا چاہتی ہوں چھا جی۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ اور وہ شاید دینا اب میرے لیے ناممکن ہوگا' کم از کم تمہاری نظروں میں۔"

اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا تو دعا کا دل تڑپ گیا۔

"میں عزت پانا چاہتی ہوں مگر آپ کے حوالے سے چھا جی۔"

"میں تمہاری بات میں سمجھ نہیں پا رہا دوئی آخر تم۔۔۔"

وہ بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔ اب دعا نے واضح بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"آپ کی عزت میں ہی میری عزت پوشیدہ ہے۔ آپ کا سر اونچا ہوگا تو میں بھی شان سے سر اٹھا سکوں گی۔ ہماری شادی طے ہے' مگر اسے طے کرنے والے میرے ابا جی اور مامی جی تھے' اب میری زندگی میں کچھ اور لوگ شامل ہوچکے ہیں جنہیں مجھ سے محبت اور اپنائیت کا دعوا ہے۔ میں یہ دعوا بھی آزمانا چاہتی ہوں اور اپنے اور آپ کے رشتے کو ان کے ہاتھوں استوار ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"یعنی۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔"

"جی چھا جی۔۔۔ یہ انگوٹھی میں نے اس لیے بھجوائی ہے کہ آپ مامی جی کے ساتھ اسے مجھے پہنانے دوبارہ آئیں۔ مگر اس حویلی میں۔۔۔ آپ یہاں آکے ان سے میرا ہاتھ طلب کریں۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

کسی خیال نے اسے خوفزدہ کردیا اور وہ فوراً" کہہ اٹھا۔

"آپ کو ایسا کرنا ہوگا چھا جی۔۔۔ میری خاطر۔"

☆ ☆ ☆

یہ درودیوار اس کے لیے قطعی اجنبی تھے۔

یہاں کے لوگ یہاں کا ماحول اس کے لیے نامانوس تھا۔ مگر ہر قدم ... اس والا رہا تھا۔

اور وہ جو یہاں آنے سے پہلے— خوفزدہ تھی۔ گھبرا رہی تھی ... چند ... گزارے گی۔ آتے ہی مطمئن ہو گئی تھی۔

کچھ یہ بھی تھا کہ آتے ہی اسے چھاجی سے بات کر کے ... ورنہ جو قدم وہ اٹھا آئی تھی اس کے بعد طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی۔ اب ایسا کچھ نہیں ... بہت خوش تھی۔

یہاں ہر وقت اسے اپنی ماں کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔

حالانکہ صاحبزادی فرحت النساء نے بہت کم وقت اس حویلی میں ... اس حویلی سے جدا ہوئے انہیں تین دہائیوں سے زیادہ کا وقت بیت چکا تھا۔ شاید یہ ... جان اور دیوار نہیں بلکہ صاحبزادی حرمت النساء اور صاحبزادی خلعت النساء کے وجود سے ... محسوس ہوتی تھی جو اس کی ماں کی ماں جایاں تھیں۔ ان کی پُر محبت آغوش میں اسے وہی نرمی ملتی جو ... کو ملی تھی۔

اور صاحبزادہ نفیس علی خان جو اس کے بزرگ تھے۔ قابل احترام بزرگ مگر ... عجیب عقیدت بھری نگاہوں سے تکتے تھے جن میں ایک باپ کی شفقت ... محبت ... تی تھی مگر ایک عقیدت و احترام کا سا احساس۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ وہ الجھ جاتی تھی اور پیر ان کا ... ہاتھ اپنے سر پہ کسی سائبان کی طرح محسوس کر کے یہ الجھن خود بخود دور ہونے پہ ہلکی پھلکی بھی ہو جاتی تھی۔

اور صاحبزادہ عمیص علی خان جس کے روپ میں اس نے پہلی بار یہ جانا کہ بھائی کیسے ہوتے ہیں۔ یہ بے حد صاف دل، محبت کرنے والا، حساس سا بھائی اسے دنوں میں عزیز ہو گیا اور اسی کے حوالے سے موتیا بھی، موتیا جس نے اس کے اندر سے اس اجنبیت بھری جھجک کو ختم کرنے میں پہلا قدم اٹھایا تھا۔ موتیا جو اس چھت کے نیچے اس کی پہلی دوست اور دمساز بنی۔

صاحبزادی یاسمین خانم، جن کا سامنا کرنے میں اسے بہت دقت ہوئی تھی۔ بابر ہمایوں مغل سے شادی کرنے کا فیصلہ اس نے چاہے کیسے ہی حالات میں کیا ہو مگر یہ فیصلہ اسے ان کے سامنے نظریں نہیں اٹھانے دے رہا تھا۔ اگر زندگی میں کبھی بھی اس کا سامنا ان سے ہوتا، چاہے دونوں کے درمیان یہ رشتہ کبھی کھل کے واضح ہوتا یا نہ ہوتا، تب بھی وہ ان کے سامنے شرمندہ ہی نظر آتی، آخر وہ ایک ایسی عورت تھی جس کا شوہر اس کا دیوانہ رہ چکا ہے لیکن صاحبزادی یاسمین نے ایک بار بھی اسے اس کا احساس نہ ہونے دیا، وہ سب جانتی تھیں مگر انجان بن گئیں۔ بھولے سے بھی بابر کا ذکر ان کے درمیان نہیں آیا۔ وہ دلکش کے لیے دل سے دعا کی ممنون اور احسان مند تھیں مگر انہوں نے اس احسان کا بدلہ چکانے یا اسے شکریہ تک کہنے سے گریز کیا کہ کہیں بات کھلتے کھلتے وہاں تک نہ پہنچے۔

اور— اور صاحبزادی گل مہر، جس سے وہ سب سے زیادہ خائف تھی۔ جس کے بارے میں شہزاد ملک سے سنی باتوں کی بنیاد پہ اس نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ ایک بے حد مغرور، بے حس اور کٹھور لڑکی ہے اور یہ دیکھ کے اسے حیرت ہوئی کہ وہ سارے گھرانے سے الگ ضرور ہے۔ بلاشبہ اتنی ٹوٹ کر محبت کرنے والی نہیں جیسے کہ باقی سب ہیں مگر اس کا رویہ اتنا خراب بھی نہیں تھا جتنا وہ توقع کر رہی تھی۔ وہ الگ تھلگ رہنے کی عادی تھی۔ اپنے جذبات کے اظہار میں بے حد محتاط تھی۔ اور بس۔

"تو کیا چھاجی غلط کہہ رہے تھے۔" وہ سوچنے لگی۔

موتیا سے اس کی بے تکلفی بڑھی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

"تمہیں غلط معلومات نہیں پہنچائی گئیں۔ گل ایسی ہی تھی۔"

اس نے سچائی سے بتایا۔

"تھی؟" "ہاں، اب بہت حد تک بدل گئی ہے۔"

"کیا واقعی انسان بدل جایا کرتے ہیں؟"

"گل کو اور خاص طور پر اب بابر بھائی صاحب کو دیکھ کے تو یہی لگتا ہے کہ واقعی انسان بدل بھی جایا کرتے ہیں۔"

"کیا ملک مقبول جیسا انسان بھی بدل سکتا ہے؟"

"میں انسان کی بات کر رہی ہوں تم حیوان کا ذکر لے بیٹھیں۔"

موتیا نے برا سا منہ بنا کے کہا تو دعا کو ہنسی آ گئی۔

"سارا موڈ خراب کر دیا اتنا واہیات ذکر چھیڑ کے۔ اب میرے موڈ میں رنگ بھرو۔"

"عمیص بھائی کا ذکر چھیڑ کے؟"

اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

ایسی ہی مسکراہٹیں اور اپنائیت کے درمیان اس کے دن بیت رہے تھے، اس کے باوجود دل کو ایک بے چینی سی لاحق تھی۔ کتنے دن ہو گئے مگر چھاجی کی جانب سے خاموشی تھی۔ اس نے انہیں اپنا موقف سمجھانے اور دلائل دے کر قائل کرنے کی کتنی کوشش کی تھی اور وہ خاصی حد تک قائل ہو بھی گئے تھے مگر ان کا تامل نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنے دل سے سب کچھ ایک بار پھر کھو دینے کے خوف کو کم نہیں کر پا رہے تھے۔

"اور اگر چھاجی کبھی بھی اس خوف سے ابھر نہ سکے تو؟"

اس کے آگے اس کی سوچ کے دروازے سہم کے بند ہو جاتے۔

بالآخر اس کا کئی روز کا انتظار رنگ لایا۔

چھاجی کا فون آ ہی گیا۔

"دوئی— میں نے تمہاری بات ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پہلے میں اسے تمہاری بے کار کی ضد سمجھ کے ٹالتا رہا لیکن پھر میں نے بہت سوچا اور مجھے احساس ہوا تمہارا فیصلہ بالکل درست ہے تم اب بھی میری ہو۔ یقیناً" نواب صاحب تمہارے ابا کے کیے گئے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے۔ یا تمہاری خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے یا پھر اپنی نواسی کے لیے میرے احسان مند ہوتے ہوئے اس پہلے سے طے شدہ رشتے کو ختم کرنے کی بات کبھی نہ کریں گے لیکن جو بات اس رشتے کے ان کے ہاتھوں طے ہو جانے میں ہے وہ شاید اسے مجبوراً" تسلیم کر لینے میں نہیں۔ میں تمہارا سر اٹھا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، چاہے میں تمہارے ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔"

"آپ میرے ساتھ ہی ہوں گے چھاجی— انشاء اللہ۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا اور طمانیت سے مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔

"اس سے میرا نہیں آپ کا سر اونچا ہو گا اور میری خوشی تو اسی میں ہے۔"

* * *

"سب کچھ کتنا بدل گیا ہے موتیا—"

"ہاں ہاں تم نہیں بدلے۔"

عمیص کی سنجیدگی سے کہی بات پہ موتیا نے مصنوعی اداسی سے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بدل گیا تو خود ہی الیہ گیت گاتی پھرو گی۔ موہے بھول گئے بالم—"

"اچھا اچھا— زیادہ دلگیر ثانی بننے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے الاپتے ہی موتیا نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"اچھا— ؟ اب ہماری آواز بھی بری لگنے لگی۔ بدل تو تم گئی ہو سجنی؟" وہ چھیڑنے لگا۔

"بس بس— زیادہ اور ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ایک ذرا سے لفظ سجنی نے موتیا کی ساری شوخی ہوا کر دی اور وہ پل میں بیر بہوٹی بن گئی۔

عمیق دلچسپی سے اس کا ایک دم بدلتا روپ دیکھنے لگا۔ موتیا اسے اس روپ میں سب سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔

"کیوں شریف بندے پہ بہتان باندھتی ہو؟ اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ کبھی اوور ہوا ہوں؟"

وہ معنی خیز انداز میں پوچھنے لگا۔

موتیا بلاوجہ ہی چٹیا کے بل گننے لگی۔

"دل چاہا بھی اوور ہونے کو تو سمجھالیا دل کو اور تم نے کھڑے کھڑے الزام عائد کردیا۔ چہ چہ شرافت کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں ہے۔ اس سے اچھا تھا میں اوور ہی ہو جاتا۔"

"اب تم چپ کرو گے یا میں کوئی اور طریقہ آزماؤں؟"

"مجھے چپ کرانے کے کون کون سے طریقے ہیں تمہارے پاس آنسہ موتیا صاحبہ؟"

"ایک تو یہ ہے۔" اس نے اپنے لمبے لمبے نوکیلے ناخن دکھائے۔

"دوسرا یہ۔" اس نے نزدیک رکھا ڈنڈا اٹھا کے لہرایا۔

"اور تیسرا میرے ابا حضور۔"

"باپ رے' تیسرا ہتھیار زیادہ مہلک اور جان لیوا ہے۔"

وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

"حد ادب۔" موتیا نے ٹوکا۔

"ویسے مذاق سے قطع نظر گھر کے ماحول میں واقعی بہت تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور خوشگوار تبدیلیاں' آپا حضور اب کتنی خوش رہنے لگی ہیں۔ انہیں دیکھ کے احساس ہوتا ہے کہ دل کی خوشی مالی آسودگی کی محتاج نہیں ہے۔ بابر بھائی صاحب کے راہ راست پہ آنے سے گویا انہیں دو جہاں کے خزانے مل گئے ہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہو' دعا کے آنے سے بھی بہت فرق پڑا ہے' بہت اچھی لڑکی ہے وہ۔ میں نے ہمیشہ ابا حضور کو جس دل گرفتگی کے احساس تلے دبا پایا تھا اب وہ اس سے آزاد نظر آتے ہیں۔ شاید وہ اندر سے مطمئن نہیں تھے۔ خالہ حضور کا مجرم سمجھتے تھے خود کو اور اب دعا کو اس گھر میں لا کے وہ اپنے بزرگوں اور خالہ حضور کی روحوں کے سامنے خود کو سرخرو سمجھنے لگے ہیں۔"

"حیرت تو مجھے گل پہ ہے۔ کہ وہ بدل گئی ہے؟"

اس نے حیرت سے اپنی بات دہرائی۔

"ارے وہ۔۔۔ وہ۔ کیسے بدل گئی' جو اپنی مرضی سے کم پہ کبھی راضی ہی نہیں ہوتی تھی۔"

"تمہیں اس کے بدلنے پہ اعتراض ہے یا حیرت؟"

موتیا نے ٹٹولا۔

"خوشی۔"

اس نے بنا کسی تامل کے صاف گوئی سے بتایا۔

"اس کا بدلنا اس گھر کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے تو اچھا ہے ہی موتیا مگر یہ خود اس کے لیے بھی بہت اچھا رہے گا۔ تم دیکھنا اب اس کی زندگی میں صرف اچھا ہی اچھا ہوگا۔"

"ان شاءاللہ!" موتیا نے سچے دل سے کہا پھر پرجوش ہو کے کہنے لگی۔

"بس اب کہیں سے ایک اچھا سا رشتہ آجائے جو گل مہر کے لائق ہو' تو اس کے ساتھ جچے۔"

"ہاں تاکہ تمہارا نمبر لگے' باری جلدی آئے تمہاری۔"

"مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں' جب پتا ہے کہ نصیبوں میں ساری عمر تمہارے ساتھ دماغ کھپانا لکھا ہے۔ تو سوائے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ تو نہیں لیکن ایسی بے قراری بھی نہیں ہے' ویسے سوچو ذرا اگر اس گھر

میں تین تین شادیاں اکٹھی ہوں تو کیسا لگے گا؟ عرصے سے یہاں ڈھولک کی تھاپ نہیں پڑی۔ اب تو آپا حضور کی شادی بھی ذہن سے بھولنے لگی ہے۔"

"ہوں۔۔۔ عمر کا تقاضا۔۔۔ اس عمر میں یادداشت یونہی ساتھ چھوڑ جایا کرتی ہے۔"

"فضول شوشے مت چھوڑو۔ سوچو نا کیسا لگے گا؟ کتنی رونق ہوگی اس حویلی میں۔"

"اس رونق سے کم ہی ہوگی' جس رونق کے بارے میں' میں سوچ رہا ہوں۔"

"وہ کیا؟" اس کی سنجیدگی پہ وہ ٹھٹکی۔

"وہ رونق جو تمہارے اور میرے بچے گل اور دعا کے بچوں کے ساتھ مل کے لگائیں گے۔"

"ایک نمبر کے لفنگے ہو تم۔"

وہ ناراض ہو کے اٹھ گئی۔

"امی حضور کو پتا چلا کہ ان کی ہونے والی بہو اس قدر بدزبان ہے اور اپنے ہونے والے مجازی خدا کے سامنے اتنی گستاخی اور بے ادبی کا مظاہرہ کرتی ہے تو کتنا صدمہ ہوگا انہیں۔"

وہ اسے روکنے کے لیے اور بھی اکساتا رہا مگر اس بار اس نے کسی قسم کی شرانگیزی پہ کان نہ دھرا اور سیدھی اپنے کمرے میں آ کے رکی۔

☆ ☆ ☆

"ثقافتی طائفے کی آڑ میں انسانی اسمگلنگ اور جسم فروشی کا مذموم کاروبار کرنے والا ملک مقبول رات گئے اسپیشل ٹاسک فورس کے آپریشن میں گرفتار۔"

دعا اخبار اٹھاتے ہی اس سرخی پہ اٹک گئی تھی۔

اس کی نظریں بے قراری سے تفصیلی خبر پہ پھسلنے لگیں۔

"ملک مقبول جو ایک مشہور فلمساز' اسٹیج آرگنائزر اور پروموٹر ہے' درحقیقت ان سب کی آڑ میں ایک عرصے سے وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ کمشنر پولیس کی خاص ہدایت پہ رات دو بجے ایک خاص آپریشن کے نتیجے میں نہ صرف اسے اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا بلکہ بہت سی مغوی خواتین کو بازیاب بھی کرالیا گیا۔ ملک مقبول کے اس خفیہ ٹھکانے سے بھاری مقدار میں منشیات اور اسلحہ بھی برآمد ہوا ہے اور اس کے علاوہ جعلی کرنسی اور جعلی پاسپورٹ کی ایک بڑی تعداد بھی۔ اس خفیہ اڈے کی نشاندہی کرنے والے شخص نے پولیس سے اپنا نام صیغۂ راز میں رکھنے کی گزارش کی تھی لیکن پولیس اور عوام اس کے اس تعاون پہ دل سے ممنون ہیں۔"

"کون ہو سکتا ہے؟"

دعا اخبار ایک طرف رکھ کے سوچنے لگی۔

اتنے میں صاحبزادی یاسمین تلاوت کرنے کے بعد قرآن پاک اٹھائے اس طرف آئیں۔ قرآن پاک جزدان میں رکھنے کے بعد وہ دعا کے پاس بیٹھیں۔ اور اخبار اٹھا کے پڑھنے لگیں۔ دعا نے نظر اٹھا کے دیکھا ان کی دلچسپی بھی اسی خبر میں تھی۔

صاحبزادی یاسمین اخبار پڑھتی جارہی تھیں اور دعا ان کا چہرہ' جس پہ لحہ بہ لحہ فخر و انبساط کے رنگ اتر رہے تھے۔ ایک طمانیت بھرا احساس ہر نقش پہ چھاتا جارہا تھا۔

دعا اگلے ہی پل سمجھ گئی کہ پولیس کے ساتھ یہ تعاون کرنے والا شخص کون تھا۔

یہ یقیناً "بابر ہمایوں مغل" تھا۔ جس نے اپنے گناہوں کی تلافی خاص حد تک کردی تھی۔ وہ توبہ کی راہ پہ اپنا قدم اٹھا چکا تھا۔ کفارہ ادا کر چکا تھا۔

کسے خبر ہے کب اللہ کسے ہدایت دے۔ اس پہ اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

☼ ☼ ☼

عمیص الجھن میں تھا کہ نواب صاحب تک بلقیس بیگم کا یہ پیغام کیسے پہنچائے۔
پہلے تو وہ خود ہی اس عجیب و غریب پیغام پہ دنگ رہ گیا۔
"میں بالو بول رہی ہوں۔ بلقیس بیگم' شہزاد ملک کی ماں' پتر اپنے ابا جی کو پیغام دے دینا کہ اس اتوار کو میں اپنے بیٹے کا رشتہ ان کی بھانجی دعا کے لیے لے کر آ رہی ہوں۔"
وہ حیران اس بات پہ تھا کہ شہزاد اور دعا کی شادی تو تقریباً" طے تھی پھر نئے سرے سے یہ رشتہ مانگنے کا سلسلہ شروع کرنا اور وہ بھی چچا حضور سے۔ انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا' یہ سب جانتے تھے مگر کس دل سے اس کا اندازہ کسی کو نہ تھا۔ کیونکہ انہوں نے اب تک کسی پہ اپنا رد عمل ظاہر نہ کیا تھا۔ نہ ناگوار' نہ خوش گوار لیکن شہزاد ملک کو ایک بار پھر اپنی دہلیز پہ سوال کرتے ہوئے پانا یقیناً" ان کے لیے خوشگوار نہیں ہوگا۔
اس نے اپنی الجھن رفع کرنے کے لیے دعا سے رابطہ کیا جس نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے ساری بات بتا دی۔
"میں چھاجی کا اعتماد انہیں لوٹانا چاہتی ہوں عمیص بھائی! اور اس کا یہی ایک راستہ ہے۔"
"مگر۔۔۔ مگر چچا حضور۔۔۔ تمہیں ان کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے تھا۔ شہزاد کے لیے تمہاری فیلنگز کی میں قدر کرتا ہوں لیکن کوئی بھی محبت اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی کہ۔۔۔"
"محبت خود غرض ہو ہی نہیں سکتی عمیص بھائی!"
دعا نے فوراً" بات کاٹی اور اپنے عمل کی مزید وضاحت پیش کی۔
"میں نے ہر طرف سے سوچ کر ہی یہ قدم اٹھایا تھا۔ اگر مجھے ذرا سا بھی اندیشہ ہوتا کہ ماموں جان کو اس سے رنج پہنچ سکتا ہے' یا ان کے دل کو ٹھیس لگ سکتی ہے۔ تو میں کبھی ایسا نہ کرتی۔ لیکن میرے ایسا کرنے سے صرف چھاجی کا ڈانوا ڈول ہوتا اعتماد ہی مستحکم نہیں ہوگا بلکہ ماما جی کی وفات کے بعد ماموں جان کو جو پشیمانی ہے' اس کا خاتمہ بھی ہوگا۔ اگر انہیں اب بھی چھاجی سے کوئی پرخاش ہوتی یا میرے ان کے رشتے پہ اعتراض ہوتا تو وہ یہ اعتراض اب تک ظاہر کر چکے ہوتے مگر ایسا نہیں ہے۔ یعنی اب ان کا نظریہ' ان کی سوچ سب بدل چکے ہیں۔ صرف اس تبدیلی کو ظاہر کرنے کے لیے انہیں موقع چاہیے اور یہ موقع انہیں اس طرح ہی مل سکتا ہے۔"
"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"
وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"اور چھاجی۔۔۔ ان کے لیے یہ بہت ضروری ہے' ورنہ میں کبھی بھی ان کے اور آپ لوگوں کے درمیان رشتہ قائم نہیں کر پاتی۔ مجھ سے شادی کر لینے کے بعد بھی' اس خاندان سے ناتا جڑ جانے کے بعد بھی وہ خود کو الگ تھلگ ہی سمجھتے لیکن اگر یہ رشتہ ماموں جان کے ہاتھوں استوار ہوگا تو شاید۔۔۔"
عمیص پسندیدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس میں اسے بڑی حد تک موتیا کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ ویسی ہی حساس۔۔۔ ویسی ہی ٹوٹ کر چاہنے والی۔۔۔ ویسی ہی پرخلوص اور پرجوش۔۔۔ ہاں' موتیا میں دعا کی طرح فوراً" فیصلہ کر لینے اور پھر اس پہ ڈٹ جانے والی صلاحیت نہیں تھی۔
"کیا دیکھ رہے ہیں عمیص بھائی؟"
"دیکھ رہا ہوں کہ تم ہم سب سے اتنی چھوٹی ہونے کے باوجود کتنی سمجھ دار اور معاملہ فہم ہو۔"
"اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔"
وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
"یہ کمال تو اس دنیا کا ہے جس نے معصوم اور سیدھی سادی دعا کو ادا بنانے کے لیے زمانے کے سارے داؤ پیچ سکھا ڈالے' ورنہ مجھے تو ماں کی تربیت بھی ڈھنگ سے میسر نہ آسکی جو مجھے کوئی اونچ نیچ سمجھاتی' دنیا برتنے کا سلیقہ

بتلاتی۔ ابھی گڑیوں سے کھیلنے کی عمر تھی کہ امی۔۔۔ ساری دنیا سے کٹ کر ایک دو کمروں کے چھوٹے سے کوارٹر میں پلنے بڑھنے والی اٹھارہ سالہ دعا ایسی نہ تھی جو آج آپ کے سامنے ہے۔ اس دعا کو تو کسی کے عام سے سوال تک کا جواب نہ دینا آتا تھا۔ یہ دو سال۔۔۔ ان دو سالوں نے بہت کچھ سکھایا ہے مجھے۔"
"ان دو سالوں کو بھول جاؤ دعا۔۔۔ اگر یاد ہی رکھنا ہے تو ان دو سالوں کے حوالے سے صرف کچھ اچھی باتیں یاد رکھو۔۔۔ کہ ان دو سالوں نے تمہیں وہ دیا ہے جو ساری دنیا سے کٹ کر دو کمروں کے کوارٹر میں رہتے ہوئے تمہیں کبھی نہ مل سکتا۔ یہ عقل و شعور۔۔۔ یہ زمانہ شناسی۔۔۔ اور۔۔۔"
"اور چھاجی۔۔۔ نگاہ۔۔۔ اور آپ سب۔"
وہ کھل کے مسکرائی۔
"یہ ہوئی نا بات۔۔۔ اب لگ رہی ہو تم صاحبزادہ عمیص علی خان کی ہمشیرہ۔۔۔ بالکل اسی کی طرح ہر چیز کا روشن اور مثبت پہلو دیکھنے والی۔"
وہ اس کا سر تھپک کر پوچھنے لگا۔
"مگر اب چچا حضور تک یہ اطلاع۔۔۔ کیا یہ مرحلہ بھی مجھے ہی سر کرنا ہوگا۔"
"کرنا تو ہوگا۔"
اس نے شانے اچکائے۔
"یار۔۔۔ یہ تم سب کی سب بہنیں ہر مشکل اور کڑے مرحلے میں مجھ بے چارے کو کیوں آگے کر دیتی ہو۔ کیا تم' کیا موتیا اور کیا گل۔" وہ بے چارگی سے کان کھجانے لگا۔
"بھائی ہوتے کس لیے ہیں۔" اس کی مسکراہٹ میں مان تھا۔
"قربانی کا بکرا بنانے کے لیے۔"
عمیص نے جل کے کہا پھر کچھ خیال آنے پہ چونک گیا۔
"ارے لڑکی۔۔۔ یہ کیا۔۔۔؟ تم نے موتیا کو بھی میری بہنوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ میں بلاوجہ ہی تمہاری سمجھ داری کے گن گا رہا تھا۔ تم تو ایکدم کوری ہو عقل سے۔"
وہ ہنسنے لگی۔
عمیص اللہ کا نام لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
"چل بھئی عمیص۔۔۔ دے امتحان۔"
اس شام صاحبزادہ نفیس علی خان گھر لوٹے تو عرصے بعد خاصے خوشگوار موڈ میں تھے بلکہ بہت پرجوش بھی لگ رہے تھے جیسے کوئی خاص خبر سنانے کو بے چین ہوں۔ ان کی اس کیفیت کو صاحبزادی حرمت النساء نے بھی محسوس کیا۔ آخر اتنے برسوں کے ساتھ نے مزاج آشنا تو بنا ہی دیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ بات کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو۔ وہ بے تابی کا مظاہرہ کبھی نہیں کرتے۔ گھر آتے ہی باہر کی کوئی خبر فوراً" سنا دینا ان کی عادت نہیں۔ یقیناً" وہ اپنے تمام معمولات سے فارغ ہونے کے بعد ہی تفصیل سے گفتگو کریں گے۔
وہ کچن میں جا کے موتیا کو ہدایات دینے لگیں۔
"چائے کا پانی چڑھا دیجیے' آپ کے ابا حضور تشریف لے آئے ہیں۔ غسل سے فارغ ہو کے وہ چائے پئیں گے مگر ہمارا اندازہ ہے کہ آج وہ کھانا بھی معمول سے ذرا جلدی ہی تناول کرنا چاہیں گے۔"
"جی امی حضور' دال کو بگھار لگا رہی ہوں۔ چاول دم پہ ہیں اور کباب آج دعا نے خود بنائے ہیں۔ بس سلاد وغیرہ رہ گیا ہے' وہ میں چائے بنا کے تیار کر لیتی ہوں۔"
"ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا دینا۔"
عمیص نے اندر جھانک کے کہا۔

"اور چچا حضور کی چائے کے ساتھ بیٹھک میں ہی بھجوا دینا۔"

"یہیں پی لو۔ تھکے ہوئے آئے ہیں ابا حضور، اب تم جا کے دماغ چاٹو گے۔"

وہ اس کے اس اہتمام سے ان کے ساتھ چائے پینے کا سن کر ہی ٹھٹک گئی تھی مگر صاحبزادی حرمت النساء نے گھور کے دیکھا۔

"اوں ہوں۔"

وہ دونوں کے رشتے کی نوعیت بدل جانے کے بعد موتیا کا اس طرح **عمیص** سے دوبدو تڑتڑ کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

چائے لے کر خود **عمیص** اندر گیا۔

نیم دراز نواب صاحب اسے دیکھ کر چونکے اور ذرا سا سیدھے ہوئے۔

"آئیے آئیے **عمیص** میاں! اب تو آپ اپنی چچی حضور کی طرح ہمارے دل کی بات بھانپنے لگے ہیں۔"

ان کے خوش دلی سے کہنے پہ وہ جھینپ سا گیا۔

"وہ یہ چائے۔۔۔ یہ تو دراصل چچی حضور نے ہی بھجوائی ہے۔"

"ہم چائے کی نہیں، آپ کی یہاں آمد کی بات کر رہے ہیں۔ دراصل ہم ایک اہم بات کرنے کے لیے آپ کو یہاں بلوانے ہی والے تھے۔"

عمیص نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔ فکر، پریشانی یا تشویش والی کوئی علامت نظر نہ آئی، وہ مطمئن ہو گیا۔

"یعنی یہ بات کرنے کا اس سے مناسب موقع کوئی اور نہیں۔ آج تو چچا حضور کا موڈ بھی اچھا ہے۔"

اس نے دل میں سوچا اور گلا **کھنکھار** کے تمہید باندھی۔

"ضرور کیجیے لیکن وہ۔۔۔ میں نے بھی آپ سے ایک بات۔۔۔ بلکہ بات کیا صرف اتنا پوچھنا تھا چچا حضور کہ اس اتوار کو آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"اس اتوار کو تو بہت اہم مصروفیت ہے۔ نہ صرف ہم بلکہ آپ بھی خاص۔۔۔"

"قطع کلامی کی معذرت چچا حضور مگر اس اتوار کو آپ کا تھوڑا سا وقت چاہتا ہوں۔"

"اتوار کو؟ نہیں میاں۔۔۔ اتوار کو تو ہمیں آپ کا وقت درکار ہے۔ کچھ خاص الخاص مہمان تشریف لا رہے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ان کا استقبال اور خاطر مدارات ان کے شایان شان اور ہماری روایات کے مطابق ہوں۔"

عمیص کا دل بجھ گیا۔ ظاہر ہے اگر وہ اپنے دوستوں کو اس دن دعوت دے بیٹھے ہیں تو شہزاد ملک یا اس کی والدہ سے ملاقات کیسے کریں گے؟ اسی بے دلی کے ساتھ اس نے پوچھا۔

"کیسے مہمان چچا حضور؟"

"صاحبزادی گل مہر خانم کا پیام لے کر آ رہے ہیں۔"

"گل کے لیے؟"

اس کی ساری بے زاری ہوا ہو گئی۔

"کون لوگ ہیں؟ کیسے جانتے ہیں گل کو؟"

"نواب حشمت چغتائی، جو عرصے سے اسی علاقے میں رہتے ہیں۔ ان کے۔۔۔"

"مگر ان کے سب بیٹے تو شادی شدہ ہیں چچا حضور۔۔۔ میں اچھی طرح واقف ہوں ان سے۔"

اس کے بات کاٹنے پہ نواب صاحب نے ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ان کے اپنے صاحبزادے نہیں بلکہ ان کے بھائی کے اکلوتے نور چشم کا پیام آیا ہے۔"

"واقعی۔۔۔؟ مگر۔۔۔"

"نواب بہروز علی چغتائی نام سے ہی دل کو بھا رہے ہیں۔ ان کے والد حیات نہیں ہیں۔ والدہ **نصیبن** چغتائی

نے بڑی عمدہ تربیت کی ہے اور اعلا تعلیم دلائی ہے۔" نواب صاحب بتا رہے تھے کہ ان کی یہ بھاوج خود بھی اپنے وقتوں کی اعلا تعلیم یافتہ اور بڑے اعلا ذوق کی خاتون ہیں۔ "آپ گھر کے باقی لوگوں کو بھی اطلاع کر دیجیے اور اپنی چچی حضور کو ہمارے پاس بھیج دیجیے، ہم ان سے تفصیلی بات کرتے ہیں اور اتوار کے لیے مناسب انتظامات کراتے ہیں۔" وہ چائے کا کپ خالی کر کے رکھنے کے بعد پھر سے لیٹنے کی تیاری کرنے لگے تو **عمیص** کو جیسے ہوش آیا کہ وہ یہاں کیا بات کرنے آیا تھا۔

"مگر چچا حضور، میری بات تو رہ ہی گئی۔"

"فرمائیے۔"

"اتوار کو کچھ اور لوگ بھی ہمارے ہاں آنا چاہ رہے تھے اور۔۔۔ اور اسی سلسلے میں آنا چاہ رہے تھے۔"

"اسی سلسلے میں؟"

ان کے ماتھے پہ سوچ کی شکن نمودار ہوئی پھر آہستہ آہستہ تھوڑی سہلاتے ہوئے کہنے لگے۔

"مہمانوں کو آنے سے روکنا شرفاء کے اطوار میں شامل نہیں لیکن وہ کیا ہے کہ بہروز علی چغتائی کے لیے ہمارا دل گواہی دے رہا ہے کہ صاحبزادی گل کے لیے اس سے بہتر رشتہ کوئی اور نہیں ہو گا۔ ہم کسی دوسرے رشتے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے تو ملنے سے فائدہ؟ وہ بھی اسی روز جب وہ لوگ آ رہے ہیں۔ **عمیص** میاں! آپ مناسب الفاظ میں ان سے معذرت کر لیجیے۔"

وہ خود ہی اندازہ قائم کر کے اتنی لمبی بات کر گئے اور **عمیص** کھڑا بزبز ہوتا رہا۔

"چچا حضور! وہ رشتے کے سلسلے میں ضرور آ رہے ہیں مگر گل کے لیے نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔"

"تو پھر۔۔۔؟" وہ حیران تھے، ان کی دانست میں تو موتیا اور دعا کے جوڑ مکمل تھے۔

"دعا کے لیے۔"

"صاحبزادی دعا۔۔۔"

وہ اچنبھے سے دہرا کے رہ گئے۔

"تو آپ انہیں بتا دیجیے کہ ان کی نسبت۔۔۔"

وہ بات مکمل نہ کر سکے اور سر جھکا کے کچھ سوچنے لگے۔

"شہزاد ملک کی والدہ ہی ہیں جو دعا کا ہاتھ مانگنے آپ کے پاس آنا چاہ رہی ہیں۔"

بالآخر اس نے کہہ ہی دیا اور خواہش کے باوجود وہ نواب صاحب کا ردعمل دیکھنے کے لیے رک نہ سکا۔ آخری لفظ ادا کرنے کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ "آج" جو کل میں زندہ تھا
وہ "کل" جو آج میں زندہ ہے
وہ "کل" جو "کل" کے ساتھ گیا
وہ "کل" جو ابھی آئندہ ہے
گزر چکے اور آنے والے جتنے "کل" ہیں، جتنے "کل" تھے!
ان کا کوئی وجود نہ ہوتا
ہم اور تم بے اسم ہی رہتے
"آج" اگر موجود نہ ہوتا
ممکن ہے "آئندہ" صرف اک خواب ہو جس کی
تعبیروں میں جینے والی ساری آنکھیں ڈوب چکی ہوں!
ہو سکتا ہے

"رفتہ" کی دہلیز پہ ٹھہری
بھید بھری اس آنکھ کے اندر
چھپا ہوا آئندہ ہو!
"آئندہ" کے منہ پہ پڑی یہ غیب کی چادر ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
اٹھ جائے تو ہو سکتا ہے
اس میں ہمارا اور تمہارا
اک اک لمحہ زندہ ہو
(روشن اور تابندہ ہو!)
لیکن یہ بھی دھیان میں رکھنا
ہو سکتا ہے آنے والے کل میں ہمارا "آج" نہ ہو
اور اس کی جگہ
ایک ایسے وقت کا سایہ سا رقصندہ ہو' جو
ماضی' حال اور مستقبل کے
تین کناروں والے اس دریا سے یکسر باہر ہو
ماضی' حال اور مستقبل
تین کناروں والے اس دریا کے اندر
اپنی اپنی موجیں مارتے چلتے ہیں
پھر اس لہر میں ڈھلتے ہیں
"آج" کے پل پہ رک کر آگے پیچھے دیکھ
روشنی اور تاریکی شاید
ایک ہی ڈال کے پتے ہیں
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکا ہے
وقت کی اس "تا وقتی" کے سیلاب میں شاید
"آج" ہی واحد لمحہ ہے!!!
عمر رواں کی وحشت میں کھو جانے والی آنکھ' ٹھہر!

"آج ـــــ"

اس شہر میں اترنے والی آج کی صبح کتنی منفرد' کتنی سہانی ہے۔ سب دھندلے آئینے جگمگا رہے ہیں اور ہر جگمگاتے آئینے میں ایک الگ ہی منظر نظر آ رہا ہے۔

یہ منظر ہے اندرون شہر کے اس پر رونق قدیم محلے کا جس کی تنگ و طویل سی گلی کے آخری سرے پہ بنی اس کٹھڑی کے ایک کمرے میں بابر ہمایوں مغل کا کنبہ آباد ہے۔

وہی مختصر کمرہ ہے۔۔۔ وہی گنتی کا سامان ہے۔۔۔ وہی سفید پوشی مگر آج اس آئینے میں نظر آنے والے سارے چہرے دمک رہے ہیں۔

اقدس' نایاب اور شمشیر ایک جانب بیٹھے اپنا ہوم ورک کر رہے ہیں۔ باپ کی موجودگی نے بھی ان کے چہروں پہ خوف و ہراس نہیں پیدا کیا تھا بلکہ ان کے چہروں پہ پھیلی مسکراہٹ بابر کے اندر تک طمانیت اتار رہی تھی۔

صاحبزادی یاسمین دلکش کے پاس بیٹھی اسے آلو بڑیوں کا مسالا تیار کرنا سکھا رہی تھیں۔

"اچھی طرح بھوننے کے بعد آلو اور بڑیاں ڈال لیے اور دوبارہ بھونیے۔ اس کے بعد ایک ڈیڑھ پیالی ڈال کر

درمیانی آنچ میں رکھ دیجیے اور جا کے اپنا اور بھائیوں کا اسکول کا یونیفارم استری کر لیجیے۔"

"وہ تو ہم نے دوپہر کو ہی کر لیا تھا۔"

بیٹی کے اس جواب پہ وہ مطمئن ہو کے دھنیا کترنے لگیں۔ دلکش کا آٹھویں جماعت کا نتیجہ خاصا اچھا رہا تھا جو امتحانات اس نے اپنے نانا جان کے گھر قیام کے دوران دیے تھے۔ اپنے باپ سے چھپ کر۔۔۔ اور اس تسلی بخش نتیجے کے بعد بابر خود جا کے علاقے کے گرلز ہائی اسکول میں نویں جماعت میں اس کا داخلہ کرا کے آیا تھا۔

صاحبزادی یاسمین نے دھنیا اس کے آگے رکھا اور خود بابر تک آئیں جو بستر پہ نیم دراز خاموشی سے سب کی سرگرمیاں دیکھ رہا تھا۔

"لائیے ہم آپ کی ٹانگیں دبا دیں۔"

بابر کے نزدیک بیٹھ کے انھوں نے اس کے پیر اپنی گود میں دبانے کی غرض سے رکھنے چاہے مگر اس نے فوراً سمیٹ لیے۔

"کچھ نہیں ہوا میری ٹانگوں کو' تم لیٹو۔۔۔ آرام کرو۔ کمر اکڑ گئی ہو گی۔"

"ہماری کمر کو کیا ہوتا ہے۔"

"سارا دن تخت پہ بیٹھی سلائی کرتی ہو۔ اب فرصت ملی ہے تو میری ٹانگیں دبانے آ گئی ہو۔"

"آپ بھی تو سارا سارا دن ٹیکسی چلاتے ہیں۔"

"ٹیکسی چلاتا ہوں' سائیکل نہیں۔ ٹانگوں کو کیا تکلیف ہونی ہے۔ مزے سے پڑی رہتی ہیں۔"

"ہم بھی سلائی ہاتھ سے کرتے ہیں' کمر سے نہیں۔"

"ارے واہ یاسمین بیگم! تمہیں تو جواب دینا بھی آ گئے اور وہ بھی کرارے۔۔۔ چلیے تیار ہو جائیے' ہمیں اپنے سسرال حاضری لگوانا ہے۔"

وہ خوش دلی سے ہنسا۔ اس کی ہنسی کا ساتھ دینے کے لیے صاحبزادی یاسمین دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کے مسکرائیں۔

● ● ●

اور یہ منظر ہے صاحبزادہ نفیس علی خان کی حویلی کا جس کی رونق اور چہل پہل کا آج ڈھنگ ہی اور ہے۔

دلگیر سرخ پوتھ کے پاجامے' دھاری دار جامہ وار کے سرخ' زرد اور سبز کرتے میں ملبوس چنا ہوا دوپٹا لیے مہندی سے ہاتھ پیر اور غازہ سے لب و رخسار رنگے یہاں سے وہاں پھر رہا ہے۔ صاحبزادی خلعت النساء سفید براق غرارہ پہنے سب مہمانوں کے درمیان بیٹھی ہیں۔ سفید چنے دوپٹے پہ کل ہی موتیا نے مقیش ٹانک کے دی تھی۔

"صاحبزادی یاسمین اب تک نہیں آئیں؟"

"آ جائیں گی' انھوں نے بتایا تھا کہ سہ پہر کو نکلیں گی۔"

"مہمان آ چکے ہیں۔"

نواب حشمت چغتائی اپنی بیگم اور بھاوج نصیبن چغتائی کے ہمراہ بیٹھے خوش گپیاں لگا رہے ہیں۔ گل مہر کو پہلی نظر میں دیکھنے کے بعد ہی انھوں نے اپنا عندیہ دے دیا ہے۔

اللہ وسائے اور شہزاد ملک کے درمیان بیٹھی بلقیس بیگم کو جب تیسری بار اللہ وسائے نے ٹہوکا دیا تو وہ کہنے لگی۔

"بھائی صاحب! چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے مگر آپ کی محبت اور عزت افزائی کہنے کا حوصلہ دلا رہی ہے اور۔۔۔ کہ میں اپنے بیٹے شہزاد ملک کے لیے آپ کی دوئی۔۔۔ میرا مطلب ہے دعا کا ہاتھ مانگ رہی ہوں۔"

نواب صاحب کو "آپ کی دوئی" کہتے ہوئے اس کا دل بری طرح ڈوب گیا تھا جسے کلیجے سے لگا کے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ آج پرائی ہو گئی تھی اور اسے ہی کسی اور سے مانگنا پڑ رہا تھا۔

نواب صاحب کے مسکراتے چہرے پہ سنجیدگی چھا گئی۔ وہ سر نیہواڑے کچھ سوچنے لگے۔

شہزاد ملک کے چہرے پہ سفیدی اترتے ہوئے سب کو نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپانے

کے لیے چیئر پہ اپنی گرفت اور بھی مضبوط کرلی۔

"بہن صاحبہ! صاحبزادی دعا آپ کی امانت ہیں۔ جب آپ کا دل چاہے' لے جائیے۔ ہمیں انہیں آپ جیسی شفیق خاتون کو سونپتے ہوئے اور شہزاد میاں جیسے بلند اقبال اور اعلا کردار نوجوان سے ان کا رشتہ استوار کرتے ہوئے حد درجہ خوشی ہوگی۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے جواب دیا تو محفل میں جیسے نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ شہزاد ملک کے چہرے پر بے حد آسودہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی نگاہیں دعا کو تلاش کررہی تھیں۔

مبارک سلامت کا شور کونے میں دبکی بیٹھی دعا اور گل تک بھی جا پہنچا اور دیوان خاص کے پردے کی اوٹ میں کھڑی موتیا نے تو گھبرا کے آنکھیں میچ لیں اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"اوہو تو چھپ کے باتیں سنی جارہی ہیں۔"

عمیص نجانے کس وقت اندر سے نکلا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"شش۔" موتیا نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ کان اندر لگادیے۔

اس بار عمیص بھی اس حرکت میں اس کے ساتھ شامل تھا۔

"ہمارا خیال ہے عید کے اگلے ہفتہ شادی کی تاریخ طے کرلیتے ہیں' بجائے منگنی وغیرہ کا سلسلہ شروع کرنے کے۔" "جب ہم نے آپ کی امانت آپ کو سونپ دی تو پھر اپنی رائے کیا پیش کریں۔ آپ کی بٹیا ہیں' جب جی چاہے لے جائیے۔"

"تو بھائی صاحب' دونوں فرض ایک ساتھ ادا کردیں۔" بالو نے بھی مچل کے کہا۔

"اگر بھائی اللہ وسائے کو کوئی اعتراض نہیں تو ہم راضی ہیں۔"

"مم... میں... میں کون جی اعتراض کرنے والا۔"

وہ ہڑبڑا کے بوکھلا کے رہ گیا۔

"آپ والد ہیں دعا بٹیا کے... آپ کا حق سب سے پہلا ہے۔" نواب صاحب نے اس کی عزت ہی دوگنی کردی۔

"یہ کیا... بڑی کی بھی کردی... چھوٹی بھی نبٹادی... منجھلی کا کسی کو دھیان ہی نہیں۔"

عمیص نے احتجاجاً آواز بلند کی۔

"شش... چپ..."

"یہ چپ رہنے کا وقت نہیں' جانے دو مجھے۔" وہ مچلنے لگا۔

"پاگل مت بنو۔" وہ آواز دبا کے ڈپٹ رہی تھی۔

"ہم نے اپنی صاحبزادی الماس خاتون کا عقد اپنے بھتیجے صاحبزادہ عمیص علی خان سے کرنے کا ارادہ بھی انہی دنوں میں کیا تھا۔ یعنی عید کے فوراً بعد... سوچ رہے ہیں اب ایک نہیں' تین تین فرائض سے سبکدوش ہونے کا موقع پروردگار نے دیا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں ہم۔"

نواب صاحب کی آواز پہ اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ سکون کا سانس لیتے ہوئے موتیا کو دیکھنے لگا۔

"شکر ہے بزرگوں کو بروقت خیال آگیا' ورنہ میں تو بغاوت کا سوچ رہا تھا۔ کورٹ میرج تک کا خیال ذہن میں آگیا تھا۔"

"ہشت بد تمیز!"

دونوں کی نہ خوشی چھپائے چھپ رہی تھی' نہ ہی ہنسی۔

مگر نواب صاحب کو شکستہ قدموں کے ساتھ پلٹتا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ ان کے انداز میں ہار تھی' دکھ تھا اور شاید شرمندگی بھی۔

اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد اب عمیص کو احساس ہوا کہ اس کے الفاظ اس کے چچا حضور پہ کس بے رحم انداز میں اثر انداز ہوئے ہوں گے۔ وہ سر گرا کے بیٹھ گیا۔ فضا میں بس صاحبزادی یاسمین کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"یار' یہ بوتیک زبردست ہے' ایک تو عام پہننے والے درمیانے درجے کے سوٹ کی قیمت ساڑھے چھ سو تک ہے جو میرے خیال میں مناسب ترین ہے' دوسرا دو سوٹ خریدنے پہ تیسرا فری ملے گا۔" نگاہ نے سارا جائزہ لینے کے بعد بالآخر ایک بوتیک کے حق میں فیصلہ سنا دیا اور دعا تو ویسے بھی اسی کے مشورے سے شاپنگ کرنے آئی تھی۔ اس نے کاٹن کے دو سوٹ منتخب کیے ایک ہلکا کاسنی جس پہ نسبتاً گہرے رنگ کے دھاگے کا ہلکا سا کام دامن اور آستینوں پہ تھا' ٹائی اینڈ ڈائی دوپٹے کے ساتھ' دوسرا لیمون کلر کا شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر والا سوٹ جس پہ بلیک پیچ ورک تھا۔ تیسرا سوٹ جو فری ملا وہ وائٹ لان کا کرتا شلوار تھا جس کی کلیوں اور گلے پہ سفید ہی دھاگے اور سلور تلے کا مشینی کام تھا۔ وہ سستے میں اچھی شاپنگ ہو جانے پہ مسرور ہو گئی۔

"یہ اچھا کام کیا میں نے جو تمہارے ساتھ چلی آئی۔۔۔ میں سمجھتی تھی کہ اچھے ریڈی میڈ سوٹ مہنگے پڑتے ہوں گے لیکن اس کی بجائے میں ان سلا کپڑا لیتی' کڑھائی یا کام کرواتی' میچنگ کے دوپٹے لیتی' پھر درزی کے پیسے دیتی تو شاید ساڑھے چھ سو سے اوپر ہی لگتے ایک جوڑے پہ۔"

"اور اب تو ہر سوٹ چار ساڑھے چار سو روپے میں پڑا ہے۔ یار فنکشن کی حد تک تو ٹھیک ہے' پیسے کمانے کے لیے پیسے لگانے بھی پڑتے ہیں لیکن عام پہننے کے لیے یہی ٹھیک ہیں۔ البتہ چپلیں اور سینڈلیں یہاں مہنگی ہیں۔ ایسا کرتے ہیں اگر تم تھکی نہیں ہو تو یہاں سے لبرٹی چلتے ہیں' آج اتوار ہے' وہاں کے مہنگے شو اسٹور ویسے تو بند ہوتے ہیں مگر سیل لگا کر دو ڈھائی سو والی خاصی معیاری چپلیں باہر اسٹال لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ کچھ آرٹی فیشل جیولری بھی چیک کرلیں گے۔ اور وہاں گول گپے تو ضرور ہی کھانے ہیں۔"

"ایک منٹ۔ ذرا۔۔۔ بس کچھ دیر کے لیے' ٹیکسی کی تلاش میں شاپنگ بیگز اٹھائے چلتی دعا اچانک "مپورٹ پوری" کے سامنے رک گئی اور نگاہ سے جھجکتے ہوئے اندر جانے کا کہا۔

"ارے یار' یہاں جاکے کیا کرو گی؟ زیادہ تر مردانہ استعمال کی چیزیں ہوتی ہیں کپڑے' جوتے بیلٹ وغیرہ۔ ہاں لیڈیز کے لیے امپورٹڈ شوز' بیگز اور کاسمیٹکس کی خاصی ورائٹی ہے لیکن اپنی پہنچ سے باہر ہے بھئی۔ ساری بچت پوری ہو جائے گی اگر تو نے یہاں سے ایک معمولی سا کلپ بھی خریدا تو۔"

"تم آؤ تو سہی" وہ زبردستی اسے اندر لے گئی۔

نگاہ یونہی وقت گزاری کو پرفیومز چیک کرنے لگی جنہیں خریدنے کا اس کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا اور دعا جینٹس والے پورشن میں چلی گئی۔ جب وہ پے منٹ کر رہی تھی تو نگاہ تجسس کے مارے کاؤنٹر پہ آ گئی۔ ایک بڑی نفیس اور یقیناً بیش قیمت ٹائی کف لنکس اور ٹائی پن کے ہمراہ خوب صورت پیکنگ میں تھی۔ وہ حیران رہ گئی اور جب دعا کو اس کے لیے ساڑھے تین ہزار کی ادائیگی کرتے دیکھا تو رہ نہ سکی۔

"یہ یقیناً تم نے اپنے اباجی کے لیے تو نہیں لی ہو گی۔"

"ظاہر ہے۔" وہ مسکرائی۔

"یعنی کہ یہ تحفہ ان دوسرے صاحب کے لیے ہے جسے ہم سے پوشیدہ رکھا جا رہا ہے۔"

"شاید۔" مختصراً کہہ کے اس نے ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔

"لگتا ہے کوئی مالدار آسامی ہے۔ بھئی جسے تین چار ہزار کا تحفہ محبوبہ کی جانب سے گفٹ ملے۔ ایک ایسی محبوبہ کی جانب سے' جس کی اپنی مالی حالت مخدوش ہو اور وہ سستی سے سستی شاپنگ کرنے کی کوشش میں ماری ماری

پھر رہی ہو وہ تو ضرور اس محبوبہ پہ کھڑے کھڑے چالیس پچاس ہزار وار دیتا ہو گا۔"

"ہاں چالیس پچاس ہزار گالیاں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

✡ ✡ ✡

"ہمیں اپنی شکست کے آثار واضح نظر آ رہے ہیں بیگم حرمت النساء۔" نواب صاحب نے بہت دیر بعد کہا تو فقط اتنا کہا۔ صاحبزادی حرمت النساء کافی دیر سے ان کی دلجوئی میں مصروف تھیں۔ وہ عمیص سے اس تلخ گفتگو کے بعد سے اپنے کمرے میں بند تھے اور کسی کی ہمت نہ ہوئی اندر جانے کی۔ سب خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھے۔ یاسمین جو خوش خوش بچوں کو لے کر میکے میں چند دن فراغت اور سکون کے گزارنے آئی تھیں اس تلخی اور بدمزگی پہ سہمے ہوئے بچوں کو لے کر سرشام ہی کمرے میں سلانے چلی گئیں۔ دلگیر نے بچوں کے لیے چنے کی دال کی کھچڑی اور شامی کباب بنائے تھے' وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دلگیر بھی ایک کونے میں سر نیہوڑائے بیٹھا تھا' آج اس کی گنگناہٹیں بھی تھمی ہوئی تھیں۔ صاحبزادی خلعت النساء نے بھی کھانا نہ کھایا اور عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے بستر پہ چلی گئیں' یہ الگ بات کہ سب جانتے تھے' آج ان کی آنکھوں میں نیند کہاں۔

عمیص تو اس کے فوراً بعد گھر سے نکل گیا تاکہ مزید کسی سوال جواب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آج رات حویلی کے در و دیوار ہمیشہ سے زیادہ سنسان اور اداس لگ رہے تھے۔ یہی ہولناک اداسی نواب صاحب کے لہجے میں بھی در آئی جب انہوں نے اپنی شکست کا اعلان کیا۔

"قیامت کہیے نواب صاحب۔" بیگم حرمت النساء دہل گئیں۔

"نصیب دشمناں شکست کیسی۔۔۔ بستے گھرانوں میں ایسی اونچ نیچ ہو جایا کرتی ہے نواب صاحب اور پھر بڑھتی عمر کے بچے' بزرگوں کے ساتھ ایسے اختلافات ان کی اور ہماری عمر کا تقاضا ہیں اور بدلتے وقت کی مجبوری بھی۔ اسے یوں دل پہ مت لیجیے۔"

"اختلافات؟ آپ اسے اختلافات کا نام دے کر اس حادثے کی سنگینی کم کرنا چاہ رہی ہیں جو ابھی ابھی ہو گزرا ہے لیکن بیگم صاحبہ' حادثوں کا ازالہ یوں پل بھر میں نہیں ہو جایا کرتا۔ جن حادثوں میں ایسے عظیم نقصانات ہوں ان کا خراج بھی عظیم ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔ آج ہمیں احساس دلایا گیا ہے کہ ہم ایک ناکام انسان ہیں' ہر معاملے میں ناکام۔۔۔ اپنے بچوں کی تربیت کرنے میں۔۔۔ انہیں بہتر زندگی دینے میں' ان کے مستقبل کے بارے میں درست فیصلہ کرنے میں ناکام رہنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے بزرگوں کی میراث کو سنبھالنے اور ان سے کیے گئے عہد نبھانے میں بھی سراسر ناکام رہے ہیں۔"

"یہ غلط ہے نواب صاحب' زمانہ گواہ ہے' کیسے نامساعد حالات میں آپ نے سیسہ پلائی دیوار کی طرح تن کے سارے کنبے کو نہ صرف سنبھالا بلکہ بڑی آن' بان اور شان کے ساتھ ہمارا خاندانی تشخص برقرار رکھتے ہوئے۔۔۔"

"یہی تو الزام ہے ہم پہ۔" وہ کراہ اٹھے۔

"اسی خاندانی تشخص کی حفاظت کرنے کی پاداش میں ہی تو ہمیں ناکام انسان ٹھہرایا جا رہا ہے۔ آپ نے سنا نہیں' عمیص میاں کیسے کیسے انکشافات کر گئے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم ان الزامات کو غلط قرار دیتے ہوئے بھی غلط ثابت نہیں کر سکتے۔ کیسے ہم انہیں اپنی نیک نیتی کا یقین دلائیں کہ ہم نے تو محض صاحبزادی یاسمین کی بھلائی چاہی تھی۔ جس طرح مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا اسی طرح شرفا کی نجیب الطرفین ہیرا سی صاحبزادیاں بھی اوچھے لوگوں کو سونپ دینا شرم کی بات ہے۔ اب ہم کیا جانتے تھے کہ مخمل کے لبادے میں چھپا بابر میاں کا وجود اس قدر گھناونا ہو گا۔ ہم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں مگر آہ اس کا ازالہ کرنے کا وقت گزر گیا۔ آج زندگی میں دوسری بار ہم خود کو مجرم محسوس کر رہے ہیں۔"

"دوسری بار؟"